DUE DATE

Cl. No. ____________ *Acc. No.* ____________

Late Fine **Rs. 1.00** per day for first 15 days.
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.


1-12 1999 3/2/99

بسم الله الرحمن الرحيم

اقرا باسم ربك الذى خلق خلق الانسان من علق اقرا وربك

الاكرم الذى علم بالقلم علم الانسان ما لم يعلم كلا ان الانسان

ليطغى ان راه استغنى ان الى ربك الرجعى ارايت الذى ينهى

عبدا اذا صلى ارايت ان كان على الهدى او امر بالتقوى ارايت ان كذب

وتولى الم يعلم بان الله يرى كلا لئن لم ينته لنسفعا بالناصية ناصية كاذبة

خاطئة فليدع ناديه سندع الزبانية كلا لا تطعه واسجد واقترب

"سب رس"

کے

قارئین اور قلم کاروں

کو

نیا سال مبارک

بانی: ڈاکٹر محی الدین قادری زور

فون: 3310469 — سن اجراء: ۱۹۳۸ء

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۶۱ — جنوری ۱۹۹۹ء — شمارہ: ۱

مدیر
مغنی تبسم

معاونین
غلام جیلانی ، بیگ احساس

فی پرچہ	:	۱۵	روپے
زرسالانہ	:	۱۵۰	روپے
کتب خانوں سے	:	۱۷۵	روپے

مشرق وسطی اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان ، برما ، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۸ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر: ادارہ ادبیاتِ اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا

کمپیوٹر کتابت ، شعبہ کمپیوٹرس ادارہ ادبیات اردو

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر ، پرنٹر پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے او ۔ ایس ۔ گرافکس ، نارائن گوڑہ میں طبع کرواکے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

پون ورما
ترجمہ : اُسامہ فاروقی

کتاب : غالب، شخصیت اور عہد

باب : دوم ___ شہرِ ناز و نعمت
(قسط : ۴)

خالص مادّی اعتبار سے دلی میں انگریزوں کی موجودگی برائے نام تھی۔ انگریز رزیڈنٹ شہر کی فصیل کے باہر رہتا تھا اور شہر کا نظم و نسق مٹھی بھر انگریز غیر فوجی عہدہ داروں کے ذریعے چلاتا تھا۔ انگریز فوجی افسروں اور ان کے ماتحت سپاہیوں کو سمجھ بوجھ کر نگاہوں سے دور پہاڑی سلسلے پر چھاؤنیوں میں رکھا گیا تھا۔ اس سے ان لوگوں کے لیے جو اپنے دل کو اس خیال سے بہلانا چاہتے تھے کہ کچھ بھی تو نہیں بدلا ہے اپنے خیال پر جمے رہنے کا موقع ملتا تھا۔ لیکن درحقیقت شہر کی نفسیاتی ساخت پر برطانوی اثر صریحاً محسوس کیا جاسکتا تھا اور اس طاقت کے پیشِ نظر جو اس کی پشت پناہ تھی اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ جب انگریز رزیڈنٹ طامس مٹکاف "صاحب" (۱۸۵۳ء میں) مرے تو غالب کو اپنے ایک خط میں لکھنا پڑا کہ ایک لاکھ آدمیوں نے جنازے میں شرکت کی۔ انگریز مددگار رزیڈنٹ کا سرکاری مسکن لال قلعے کے صدر دروازے کے اوپر تھا، یعنی ایسے مقامِ تفوق پر جس کا علامتی مفہوم لامحالہ کسی بھی دلی والے کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ انگریز رزیڈنٹ خود کشمیری دروازے کے باہر ایک شان دار کوٹھی "مٹکاف ہاؤس" میں رہتا تھا جس کا وسیع و عریض احاطہ جمنا کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا۔ انگریز سوسائٹی کے خواص کا طبقہ جج، ڈاکٹر، پادری، چند فوجی افسروں اور رزیڈنٹ کو نظم و نسق چلانے میں مدد دینے والے مٹھی بھر عہدہ داروں پر مشتمل تھا۔ رتبے میں تمام بلاؤں سے محفوظ و مامون اس حلقے کے بعد تاجر، بینک مالکین اور انتظامیہ کا ماتحت عملہ آتا تھا۔ بجائے خود ایک طبقہ قسمت آزماؤں کا تھا مثلاً اسکاچ باپ اور راج پوت ماں کا بیٹا مشہور و معروف کرنل جیمس اسکنرؔ، جس نے دوغلا ہونے کے باوجود اپنے کروفر اور انگریزوں کے مفاد سے وفاداری کی بہ دولت اس سوسائٹی میں اونچا رتبہ حاصل کر لیا تھا۔ اپنے زرد خفتان، لال پگڑی اور کمر بند کی بہ دولت نمایاں، کرنل اسکنرؔ کے بے قاعدہ رسالے کے سوار (جن کے بارے میں بشپ ہیبر پکار اٹھے کہ "جنوبی روس میں جب میں تھا اس کے بعد استے انتہائی دل آویز اور بھڑکیلے گھڑسوار میں نے اب دیکھے ہیں") غالب کی دلی میں اکثر دکھائی دیتے تھے۔ کرنل اسکنرؔ نے کشمیری دروازے کے پاس سینٹ جیمس گرجا تعمیر کروایا جو دلی میں عیسائی فرقے کا سب سے اہم گرجا بن گیا۔ یہ سب اپنی جگہ پر اس کے باوجود اسکنرؔ کو انگریزوں نے اپنی سوسائٹی میں کھلے دل سے قبول نہیں کیا تھا، اس کے تعلق سے ان کے رویّے میں مروت کی جھلک آسانی سے دیکھی جاسکتی تھی۔ ایمیلی بیلی اپنی یادداشتوں میں لکھتی

ہیں ۔ " کرنل اسکنر کالے خون کے آدمی تھے ، ان کی بیوی ایک دیسی خاتون تھیں اور ان کے بچے لامحالہ گہری سانولی رنگت کے تھے اور انگریزی ایک انوکھے لہجے میں بولتے تھے ۔ اور انگلستان سے نووارد لوگوں کے لیے سارا خاندان ایک عجیب غریب انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا ۔ ۔ ۔ حالاں کہ وہ خود کو انگریز سمجھتے تھے اور دلی کی سوسائٹی میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے جانے عام تعلیم یافتہ تھے اور اپنے طور طریقوں میں انگریز سے زیادہ دیسی تھے ۔" ایسی ہی تمسخر آمیز مروت کا برتاؤ بہ ظاہر سبھی اینگلو انڈین افراد سے کیا جاتا تھا جو انگریزی معاشرے میں قبولیت کے دوامی لیکن مذبذب امیدوار ہی رہے ۔ گو کہ پادری ڈا طامسن کی طامس مٹکاف بڑی عزت کرتے تھے ایمیلی اس امر پر دھیان دیے بغیر نہ رہیں کہ موصوف " گہری سانولی رنگت کے تھے ، ان کی رگوں میں بہت سارا دیسی خون تھا ، یہی وجہ ہے کہ وہ اور ان کے گھر والے لباس کے تعلق سے انگریزوں کے رسم رواج سے بالکل ناواقف تھے ۔" اس گروہ کی ایک اور اہم رکن نامی گرامی افسر کرنل فارسٹر کی بیوی مسز فارسٹر اور ان کی بہ کے بارے میں کہا گیا کہ حالاں کہ وہ بہت اچھی عمر رسیدہ خواتین ہیں مگر " مخلوط النسل ہیں ، گہری سانولی رنگت کی ہیں ا انگریزی بہت ہی عجیب و غریب لہجے میں بولتی ہیں ۔" اکثر" شب خوابی کے چوغے جیسا لباس پہنتی ہیں ۔"

انگریز سوسائٹی سے دور کا تعلق رکھنے والے بعض ارکان دریا گنج میں رہتے تھے ۔ لیکن اصل برطانوی عیسائی نوآباد شہر کے شمال میں کشمیری دروازے کے قرب و جوار کے علاقے میں قائم ہوئی تھی ۔ رزیڈنٹ کمشنر کی کوٹھی کو بجا طور پر شا فضیلت حاصل تھی ۔ سرجن ڈاکٹر لڈلو کے بنوائے ہوئے لڈلو محل یا کرنل اسکنر کے بنوائے ہوئے سینٹ جیمس گرجا جیسی دوسری عمارتیں بھی قابل توجہ تھیں ۔ گرجا کے عقب میں ایک سلاح خانہ اور ایک ڈاک گھر بھی تعمیر کیا گیا تھا ۔ بعض انگریز عہدہ د فصیل بند شہر کے کچھ ہی اندر کشمیری دروازے کے علاقے میں مکان کرائے پر لے کر رہتے تھے ۔ اس طرح سے انگریزوں ۔ " چھوٹے پیمانے پر لندن کی وضع پر خود اپنا ایک طریقہ ، ماند و بود ایجاد کرلیا تھا ، جس میں رزیڈنٹ (بعد میں کمشنر ا ایجنٹ) کی حیثیت مرکزی کی تھی ، لڈلو محل یہاں کا بکنگھم پیلیس تھا ، مٹکاف ہاؤس یہاں کا ونڈ سر تھا ، قطب کے پا مہرولی میں مٹکاف کا دیہاتی کنجِ عزلت " دل کشا " یہاں کا سار ڈ نگھم تھا اور کشمیری دروازے کے پاس سینٹ جیمس گرجا یہاں کا کلیسہ ، اسقف تھا ۔"

انگریزوں کی کوشش یہ رہتی تھی کہ اُس وقت انگلستان میں مروجہ معاشرتی رسم و راہ کے مسلمہ قاعدوں کی د میں ہو بہ ہو نقل کریں ۔ ہر سال ملکہ وکٹوریہ کی سال گرہ کے موقع پر محفل خانوں میں اجتماعی محفلِ رقص منعقد ہوتی تھی ہر ماہ رزیڈنٹ کی طرف سے بارہ یا سولہ مدعوئین کے لیے میز کرسی پر بڑے کھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا جس کے دور کھانا ڈربی یا وورسیسٹر کے چینی کے برتنوں میں چنا جاتا تھا ، " مہمان کے طور پر ایک دوسرے کے پاس رسمی ملاقات کے لیے دوپہر کے کھانے سے پہلے ایک مقررہ وقت پر جاتے تھے ، اور لباس کے تعلق سے بڑے سخت قاعدے تھے جو اکثر و بیش تر " دوغلوں " کو (جس نام سے ایمیلی نے اینگلو انڈین گروہ سے متعلق افراد کا ذکر کیا ہے) الجھن میں ڈال دیتے تھے ۔ ا پر برطانوی نوآبادیاتی طرزِ زندگی کے بعض ناگزیر عناصر اضافہ تھے ۔ مثلاً چھاؤنی میں فوجی بینڈ باجا سننے کے لیے اکٹھا ہو اہم موقعوں پر رسمی پوشاک میں ملبوس صاحب لوگ ایک گاڑی سے دوسری گاڑی کو منتقل ہوتے اور خواتین سے خوش گ باتیں چیت کرتے ۔

لیکن اس کے باوجود کہ "وطن" سے جوڑنے والے تہذیبی رشتوں کو صحیح و سالم رکھنے کی بڑی تن دہی سے کوشش کی جاتی تھی دیسی اثر کا نفوذ بھی واضح تھا۔ طامس مٹکاف کے ملبوس سینٹ جیمس اسٹریٹ لندن کے اونچے درجے کے میا ماسٹر پال فورڈ کے ہاں سے باقاعدہ ہر سال آتے رہے ہوں یا وہ انگلستان سے صندوق بھر کتابیں سال میں دوبار منگواتے رہے ہوں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر صبح ناشتے کے بعد ڈھلی ہوئی چاندی کی ٹیک والا حقہ لاکر ان کی کرسی کے پیچھے رکھا جاتا تھا ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کی بیٹی اس کی سریلی قل قل کی آواز کی وضاحت سے یاد تازہ کریں گی۔ ہندستان کے موسمی حالات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انھوں نے اپنی کوٹھی میں ایک تہہ خانے اور ایک چبوترے کا اہتمام کیا تھا جس وہ روزانہ شام کے وقت بیٹھتے اور اپنے بہت سارے کبوتروں کی اٹ کھیلیوں سے اپنا دل بہلاتے۔ بہت سے ہندستانی امر کی طرح انھوں نے بھی شہر کے باہر ایک گھر بنوالیا تھا اور خاصے پُر معنی انداز سے اسے اردو نام "دل کشا" دیا تھا طامس مٹکاف کے بڑے بھائی چارلس کا دیہاتی کنج عزلت شالی مار باغ میں تھا، جہاں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے ہندستانی خاندان کی رہائش کے لیے ایک مکان بنوایا تھا۔ (یہ چارلس مٹکاف دوبار دلی کے رزیڈنٹ رہ چکے تھے) کرنل اسکنز کے کشمیری دروازے والے شہر کے مکان میں ساری انگریزی ٹیپ ٹاپ کے باوجود مغل طرز کے حمام گھر تھے اور صریحی طور پر "دیسی" وضع کا ایک زنان خانہ بھی تھا۔ حرم کا رواج بلا تامل مستعار لے لیا جاتا تھا۔ دو مٹکاف برادران جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جن کے ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے اخلاقی اصول قدرے زیادہ غیر تغیر پذیر تھے، نسبتاً اعتدال پسند تھے۔ لیکن ان کے ہم سروں کے اس معاملے میں بڑے ٹھاٹ تھے۔ فرانسیسی سیاح جیک مان، جو اسی زمانے میں دلی آیا تھا، لکھتا ہے کہ غالب کے دوست اور ۱۸۳۰ء کے دہے میں دلی کے انگریز رزیڈنٹ ولیم فریزر کی "چھے یا سات باقاعدہ بیویاں ہیں لیکن وہ دلی سے کم و بیش پچاس فرسخ کے فاصلے پر اکٹھے رہتی ہیں اور جیسا چاہتی ہیں کرتی ہیں۔ اس کے اتنے ہی بال بچے ہوں گے جتنے شاہِ ایران کے لیکن وہ سب اپنی اماؤں کے مذہب اور ذات پات کے لحاظ سے مسلمان یا ہندو ہیں۔" دو بار دلی میں رزیڈنٹ کے عہدے پر مامور سر ڈیوڈ اختر لونی کی تیرہ بیویاں تھیں اور جب تیرہ کی تیرہ ہاتھیوں پر سوار ہوا خوری کے لیے نکلتی تھیں تو دلی والے اس جلوس کو دیکھتے اور بہ مشکل اپنی ہنسی روک پاتے۔ عین ممکن ہے کہ غالب نے بھی یہ تماشہ دیکھا ہوگا۔

ہر ایک انگریز "بڑے صاحب" کے پاس نوکروں یعنی چپراسیوں، ہرکاروں، چوب داروں، حقہ برداروں، خان ساماؤں، صدر بیروں، جمع داروں، مالیوں، دھوبیوں، چوکی داروں وغیرہ کی ایک پوری فوج ہوتی تھی، جس کے پیشِ نظر ایک نووارد انگریز تاجر نے رائے زنی کی کہ ہندوستان میں مقیم انگریزوں کے پاس "انھیں موزے پہنانے کے لیے نوکر ہوتے ہیں۔ مجھے بس یہ تعجب ہے کہ وہ اُن کی طرف سے اُن کی غذا چبانے کے لیے خدمت گار نہیں رکھتے۔" چناں چہ ان لوگوں کا پُر تکلّف نوابی طور طریقے اختیار کرنا کوئی تعجّب کی بات نہیں تھا، خاص طور سے اس اجنبی ماحول میں جہاں "وطن" سے مادّی بُعد بہ جائے خود، چال چلن کو متعین کرنے والے قاعدوں سے انحراف کے خلاف پابندیوں کو ڈھیل دینے میں ممد تھا۔ مقامی زبان، رسوم و رواج اور طرزِ معاشرت سے واقفیت بھی اچھی نوآبادیاتی حکمت عملی تھی اور دیسی طور طریقوں کو اپنانے کی بہت سی باتوں کو انگریز اسی وجہ سے معقول قرار دیتے تھے۔ لیکن یہاں ایک اور امر واقعہ بھی تھا، ابتدائی دور میں کم از کم

انگریز اپنے زیرِ حکومت شہر کی اصلی تہذیب و ثقافت کو حقیقی احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انگریز عہدہ دار کرنل سلیمن، جس نے ۱۸۳۶ء میں دلی کا سفر کیا، لکھتا ہے:

"ذہنِ انسانی کی صلاحیتوں اور اس کے افعال پر انسان کے جذبات اور ذہنی کیفیات پر، اور زندگی کے تمام تعلقات میں اس کے فرائض پر اثر کے لحاظ سے امام محمد غزالی اور نصیر الدین۔۔۔ کی تصانیف افلاطون اور ارسطو کی یا کسی بھی ملک میں انھیں موضوعات پر دیگر مصنفین کی کسی بھی زمانے اور کسی بھی ملک میں لکھی ہوئی تصانیف سے شائد ہی کم تر ہوں۔ یہ تصانیف۔۔۔ سعدی کے نصیحت آمیز کلام کے بہ شمول اخلاقی تعلیمات کا عظیم "ایرانی سرچشمہ" ہیں جس سے ایک مسلمان اپنی خوردسالی سے لے کر کبر سنی تک ڈٹ کر پینے کا لطف اٹھاتا ہے اور کسی بھی تین آدمیوں کی تصانیف میں اس سے بہتر سرچشمہ تلاش کرلینا شائد ہی ممکن ہو۔"

چارلس مٹکاف کے لیے فارسی مستند کتابوں کا مطالعہ تفریح کا ایک ذریعہ تھا۔ دلی میں رزیڈنٹ کے عہدے سے حیدرآباد میں اسی عہدے پر تبادلے کے بعد وہ "میلوں تک ہر طرف پھیلے ہوئے عظمتِ رفتہ کے کھنڈروں۔۔۔ خاک میں ملتے ہوئے ایوانوں اور دلی کے وسیع و عریض مقبروں" کو یادِ ماضی کی افسردگی کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ "ان امور کو بے اعتنائی سے نہیں دیکھا جاسکتا۔" ولیم فریزر اردو اور فارسی سے ایک اہلِ زبان کی طرح واقف تھا اور اس کے پاس فارسی اور عربی کتابوں کا ایک نہایت عمدہ کتب خانہ تھا۔ متعدد انگریز فارسی اور اردو میں اشعار لکھتے تھے۔ بعض نے اپنے تخلص بھی رکھ لیے تھے مثلاً جنرل جوزف بینسلی فنا، جارج پوئج شور اور الیگزینڈر ہیدرلی آزاد۔ ڈاکٹر ہووارڈ اور ڈاکٹر ہوسے کی طرح دوسروں نے اردو آموزش و تعلیم کے اولین پیش رو ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کا کام جاری رکھا اور معروف اردو فضلا کی صف میں اپنی جگہ بنائی۔

یہ امر واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ہندستانی روداروں نے انگریزوں کے طرزِ زندگی کی نقل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بے شک اِکّا دُکّا مستثنیات بھی تھیں مثلاً بہادر شاہ ظفر کے چھوٹے بھائی مرزا بابر۔ وہ یورپین لباس پہنتے تھے، انھوں نے لال قلعے میں "رنگ محل" کے عقب میں یورپین وضع کا مکان بنوالیا تھا اور فُل بُوٹ پہنے ہوئے اور دونوں طرف سینے پر تارے ٹکے ہوئے یورپین یونی فارم میں ملبوس جب وہ انگریزی کوچ گاڑی میں بیٹھ کر ہوا خوری کو نکلتے تو دلی کے بذلہ سنجوں کے لیے خندۂ زیرِ لب کا کافی سامان مہیّا ہوجاتا۔ بہ حیثیت ایک گروہ اینگلو انڈین اور ایک حد تک متوسط طبقے کے معدودے چند نو عیسائی بھی ان دیگر افراد میں شامل تھے جو شعوری طور پر انگریزوں کے پُرتکلف طور طریقے اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن بالعموم ہندوستانی روداروں کا طرزِ زندگی روایتی اور مقرّرہ راستوں پر خاصا غیر متغیّر اور ثابت قدم رہا۔ "اس عہد کے ممتاز شعرا مثلاً غالب، مومن اور ذوق۔۔۔۔ ایک بالکل الگ تھلگ ہوا بند ماحول میں زندگی گزارتے، چلتے پھرتے اور اپنا وجود رکھتے تھے۔۔۔ اور انھیں اشرافی روایت کی قائم مقام مغل تہذیب کے آخری نمائندے سمجھنا چاہیے۔" جہاں تک کہ برطانوی موجودگی ناگزیر تھی اسے تسلیم کیا جاتا تھا لیکن سماجی اور تہذیبی سطح پر اس سے شہر کے خود اعتقاد، ملکی معاشرتی مزاج کو کبھی کوئی بڑا خطرہ لاحق نہیں ہوا تھا۔ بہتیرے ہندستانیوں نے دلی کالج میں انگریزی

سیکھی ضرور تھی لیکن غیر ملکی زبان کی یہ تحصیل بالعموم روزگار کے امکانات کو بہتر بنانے کی غرض سے کی جاتی تھی اور روایتی نصاب درس کے تمام پہلوؤں سے کامل واقفیت کے علاوہ ہوتی تھی ۔

اس ابتدائی عہد میں انگریز خود اردو کی اُس ابھرتی ہوئی تہذیب کے رگ و پے میں سرایت کرنے والے ماحول کے قدرے گرویدہ ہوگئے تھے جو ہندستانی طبقہ ۔ اُمرا کے طرزِ زندگی سے بادی النظر میں اتنی مناسبت رکھتی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ شروع میں امرا اور انگریزوں کا ربط باہمی ایک حد تک برابری بلکہ بے تکلّفی کا تھا ۔ وہ دعوتوں یا دوسری سماجی تقاریب کے موقعوں پر ملتے ۔ یا دہلی بینک یا انجمن آثارِ قدیمہ جیسے اداروں کی مشترک رکنیت کے ناطے ایک دوسرے سے خلا ملا پیدا کرتے ۔ خود غالب کی بیشتر انگریز عہدہ داروں کے ساتھ بے تکلفی تھی اور ولیم فریزر سے ان کے تعلقات بالخصوص بہت پُر تپاک تھے ۔ لیکن ہندستانی امرا اور انگریزوں کے یہ تعلّقات کُلّیۃً خوش گوار بھی نہیں تھے ۔ دیوانی نزاعات میں حکَم کی حیثیت سے انگریز عُمّال اکثر دشمنی بھی مول لیتے تھے ۔ غالب کے دوست اور مداح فریزر کا ۱۸۳۵ء میں ایک ممتاز امیر نواب شمس الدّین کے حُکم سے سنسنی خیز قتل ۔ جو جائداد کے جھگڑے میں اپنے بھائی کے دعوے کی فریزر کی طرف سے حمایت پر ناخوش تھے ۔ زیرِ بحث مسئلے سے تعلّق رکھنے والے ایک ڈرامائی واقعے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ انگریزوں نے ہندستان کے تہذیبی ماحول کی چمک دمک کو جذب تو ضرور کیا لیکن انتہائی نیک طبیعت انگریز بھی اسے محض جزوی طور پر ہندستانی سماج کے بہ احتیاط نمو دیے ہوئے قدیم و مقدس آدابِ مجلس اور ریت رسم کے تبّع ادراک کی شکل دے سکے ۔ ۱۸۳۷ء کے قحطِ عظیم کے دوران طامس مٹکاف نے غلّے کے بیوپاریوں کو قیمتیں کم کرنے پر مجبور کرنے سے اس بنا پر انکار کیا کہ یہ بات ضوابطِ بنگال کے خلاف ہوگی ۔ لیکن باشندگانِ دہلی کا خیال تھا کہ حاکم کے لئے قوانین کی ان کے ظاہری معنی کے لحاظ سے آنکھ بند کر کے تعمیل ضروری نہیں ۔ اُسے تو عدل گستری کرنی چاہیے ۔ غیر سیاسی شعبوں میں بھی دو جدا گانہ نظام ہائے اقدار کا اختلاف برقرار رہا ۔ اسی لیے پراونشل سکریٹری طامسن کی سمجھ سے یہ بات بالا تر تھی کہ اس صورت میں جب کہ غالب اُس سے ملاقات کو نوکری کے امیدوار کی حیثیت سے آرہے ہیں تو اسے ہمیشہ کی طرح دروازے پر غالب کی پذیرائی کی کیا ضرورت ہے ۔ جہاں تک غالب کا تعلّق ہے تو طبقہ ۔ اُمرا کے ایک رکن ہونے کے ناطے وہ طامسن کی اس ناشائستگی کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر تھے جو اُس کی طرف سے خوش خلقی کے لازمی قواعد کی خلاف ورزی کی شکل میں ظاہر ہوئی ۔ اس خلاف ورزی کے بالمقابل نوکری کی کوئی اہمیت نہیں تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ جب نواب شمس الدّین نے ۔ جنھیں ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں سزائے موت سُنائی گئی تھی ۔ انگریزوں سے درخواست کی کہ ان کو پھانسی ان کے ذاتی کپڑوں میں دی جائے تو درخواست نامنظور کردی گئی ۔ انگریز ایک جدید اخلاقِ عامہ اور اخلاقیات کے بہم پہنچانے والے بن گئے جو برطانوی صورتِ حال سے تو مناسبت رکھتی تھی لیکن ہندستان کے سیاق و سباق سے اکثر میل نہیں کھاتی تھی ۔ اکثر ان خیالات کی تہہ میں کارفرما اصول کا تعلق ایک جدید معاشرے سے تھا لیکن "اصلاحات" کے نفاذ کے لیے افادیت پسندانہ بے قراری کے جذبے سے سرشار ان کو اس معاشرے کی پروا نہ کرتے ہوئے جس کے اپنے پوری طرح سے متعین اور حالات سے بالکل ہم آہنگ چال چلن کے مسلمہ قاعدے تھے ۔ مبلّغانہ مستقل مزاجی کے ساتھ روبہ عمل لایا جاتا تھا ۔ ۱۸۴۷ء غالب قمار بازی کے الزام میں گرفتار کیے گئے اور انھیں دو سو روپیہ جرمانے اور چھ ماہ قید با مشقت کی سزا سنائی گئی ۔

ہندستانی اُمرا اتنی غیر معمولی سخت سزا سے حیرت زدہ تھے ۔ غالب اُس انگریز سشن جج سے جس نے مقدمے کی سماعت کی تھی اچھی طرح واقف تھے ۔ مگر وہ واقعی حیران تھے کہ جج یوں عمل پیرا ہوا جیسے وہ انھیں جانتا ہی نہ ہو ۔ اطوار کی " درشتگی " کا انگریزوں کے نئے نئے دریافت شدہ زور کا تعلق ، ہندستان کے بارے میں ان کے رویّے میں ایک بنیادی تبدیلی سے تھا جو ۱۸۵۷ ء سے عین قبل کے چند سالوں میں روز افزوں نمایاں ہوتی گئی ۔ ہر " دیسی " چیز کے شدید نظریاتی استرداد کی بنیاد انگلستان میں خود مختار مبلغینِ انجیل چارلس گرانٹ اور ولیم ولبر فورس اور کلیپ ہیم فرقے کے دیگر اراکین نے ڈالی ۔ ان سب سے مقدّم نصب العین عیسائی حکومت کی ضرورت کو ثابت کرنا تھا تاکہ " ہودگی سے پاک کرنے والے عامل کی حیثیت سے وہ قعرِ ذلت میں گرے ہوئے اور پست ہمت ہندستان کو اس پر چھائی ہوئی " اخلاقی " معصیت سے چھٹکارا دلاسکے ۔ اس رجحان کو فلسفیانہ تقویت نظریۂ افادیت اجتماعی سے ملی ، جس کے حامی جیمس مل اور ان کے بیٹے جان مل تھے ۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دونوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے ۔ ہندستانی رواداروں سے ابتدائی دور کے بے تکلفانہ تعلقات کو اب ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جانے لگا ۔ بیگم سمرو جیسے خصوصی موردِ عنایت کو بھی ، جس نے آبائی مذہب ترک کر کے عیسائیت اختیار کرلی تھی ، جس نے اپنی کوٹھی (موجودہ بھاگیرت محل) میں خود لارڈ لیک کی مہمان نوازی کی تھی اور جس کی دعوتیں انگریزوں کے لئے مقبولِ عام تقریب کی حیثیت رکھتی تھیں ، اب اس لائق نہیں سمجھا جاتا تھا کہ انگریز اُن سے غلاملا پیدا کریں ۔ " ۔ ۔ اس سرزمین کی فاتح انگریز برداری کو اس کے (یعنی بیگم سمرو کے) سامنے اظہارِ عقیدت کرتے ہوئے اور اس کی پاؤں رکھنے کی تپائی کے سامنے اس کی نظرِ عنایت حاصل کرنے کے لیے چاپلوسی کرتے ہوئے یا پھر اپنے رتبے سے گر کر اس کی دعوتیں قبول کرتے ہوئے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے ۔" یہ ایک اہم عصر انگریز کا قول ہے اور اس سے نئے برطانوی نظریے کی بالکل صحیح ترجمانی ہوتی ہے ۔ کرنل سلی مین کی یادداشتوں کے محولہ صدر اقتباس کے برعکس اب ہندستانی تہذیب کو لارڈ میکالے یہ کہہ کر مسترد کردیتے ہیں کہ « محض مجموعہ ہے " ان طبی عقائد کا جو ایک انگریز بیطار کے لیے بھی باعثِ شرم ہیں ، ایسی فلکیات کا جس کی انگلستان کے اقامتی اسکول کی لڑکیاں بھی ہنسی اڑائیں گی ، ایسی تاریخ کا جو تیس فٹ لمبے اور تیس ہزار سال تک حکم رانی کرنے والے بادشاہوں سے بھری ہوئی ہے اور ایسی جغرافیہ کا ، جو مشتمل ہے شیرے اور مکھن کے سمندروں پر ۔"

جب غالب عنفوانِ شباب ہی میں تھے ، چارلس مٹکاف نے انگریز رزیڈنٹ کی حیثیت سے اپنے پہلے دور میں ستی کے انسداد اور سزائے موت کی موقوفی کا اعلان کردیا تھا ۔ موخر الذکر اقدام کا محرک بادی النظر میں انسان دوستی کا نظریہ بھی تھا اور حکمتِ عملی بھی ؛ سزائے موت کی توثیق مغل بادشاہ سے کروانی پڑتی تھی اور اس کی موقوفی سے بادشاہ اقتدار کے ایک اور پہلو سے محروم ہوگیا ۔ بالعموم انگریز انتظامیہ نے موجودہ قوانین اور رواج کی کسی بنیادی تشکیلِ جدید کی فوراً کوئی کوشش نہیں کی لیکن ان کی رائج کی ہوئی بعض جدتوں نے شہر کی زندگی کے جوار بھاٹے میں ہلکورے ضرور پیدا کئے ۔ اس طرح کا ایک ہلکورا ۱۸۵۰ ء کے دہے میں محصولِ آمدنی کی ابتدا تھی ۔ ۱۸۵۳ ء کے ایک خط میں غالب اس کا ذکر کرتے ہیں :

" ۔ ۔ ۔ شہر میں ایک وبا آئی ، یعنی وکیلِ (ایسٹ انڈیا) کمپنی نے سینِ مافیہ کے کاغذ دیکھ کر رسومِ سرکاری جس شخص پر نکلتی تھیں ، اُس کا مطالبہ کیا ہے اور مطالبہ کیا ، مواخذہ یعنی بہت شدت ۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کے [illegible] کو ان کی
[illegible] لایا گیا
۔ ایک حالیہ مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۰ء تک قوانین اور اخلاقی تصورات کا وہ نظام ، جس کو [illegible] سے مثالی
[illegible]
[illegible]
کے [illegible]
[illegible] کے
جانے [illegible] کے ذریعے [illegible] سے
محروم کر دیا گیا [illegible] نہیں تھا ۔
حقیقت کے انکشاف سے زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہو گئی کہ اسے ثابت کیسے کیا جائے [illegible] کیا جائے ۔
[illegible] اس متین
چہرہ بنا کر کوئی بھی حلفیہ بیان دے سکتے ہیں ۔ بہ شرطے کہ [illegible]
زمین کے [illegible] بڑھتی ہی گئی ۔
فی الحقیقت [illegible] لوگوں کے لیے
عدالت میں شہادت دینا نازیبا سمجھا جانے لگا ۔ غالب جن پر بقایا [illegible] الزام میں
[illegible] کے
اخراجات اور پیچیدگیوں کے پیش نظر [illegible]
پر ہی روایتی [illegible] ۔ تاہم عوام اور
برطانوی [illegible] ناموں
[illegible] Stamp papers [illegible] Staff of Council [illegible] کے لیے کاغذ
اسٹامپ ۔ [illegible] Residence official [illegible] Second Report [illegible] Report on Law [illegible]
Suit کے [illegible] انگریز حکام ۔
پاس پیش کی جانے والی غالب کی اپنی درخواستوں اور [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

قول بھی اس سے ملتا جلتا ہے : " دلی کی آبادی اندرون فصیل گھنی ہوئی ہے ۔ فصیل کے باہر ویرانوں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (duties) [illegible]

[illegible]

[illegible]

شدہ محصول چنگی کا سات فی صد پکی سڑکوں کی نگہداشت اور مرمت پر خرچ کرنا چاہیے ۔ اکثر مقامی جوش او فروگذاشت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۔ [illegible] شہر کی جنوب [illegible] ۔ [illegible] اس کے بعد انھوں نے [illegible] ۔ [illegible] اور انھیں تعمیر کروایا ۔ بادشاہ اکثر [illegible] ہوتا ہے کہ اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں انگریزوں نے [illegible] کی کوشش کی ۔ متعدد افسروں نے [illegible] باغوں اور دیہات میں کوٹھیاں [illegible] چاندنی چوک کی سڑک کے کنارے [illegible] ہو گیا ہے ۔

یہ حقیقت ایک شہر کے طور پر سب سے بڑھ کر تسلسل کی علامت تھا ۔ شاہ جہاں کے تعمیر کردہ جنوبی بند شہر کے ابتدائی حدود [illegible] شناخت تو تھے لیکن [illegible] کے فطری عمل کے نتیجے میں ۔ جو کہ کئی مرکزی شہروں کی ایک ناگزیر خصوصیت ہے ، بڑی حد تک دھندلے گئے تھے ۔ شاہ جہاں نے محل سے نکلنے والی دو اہم سڑکیں چاندنی چوک اور فیض بازار [illegible] ۔ ایک بادشاہ نے شہر کے گرد فصیل بھی بنوائی تھی (انگریزوں کے بعد میں اسے خاصا مضبوط بنا دیا گیا) اور ضروریات کے لئے کافی آب رسانی کا اور پانی کے نکاس کا عمدہ اہتمام کیا تھا ۔ آگے چل کر وقتاً فوقتاً کسی واضح منصوبے کے مطابق نہیں بلکہ شہر کی ضرورتوں اور ترقی کے ساتھ ساتھ ۔ حویلیاں ، کٹرے ، کوچے ، محلے ، بازار ، [illegible] ، چوک اور باغ [illegible] وجود میں آتے گئے ۔ مثال کے طور پر چاوڑی بازار اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کی بستیوں کی [illegible] کرنے والے واڑے (سیواڑا ، تانی واڑا ، دھوبی واڑا وغیرہ) مرہٹوں کی دین ہے ۔ [illegible] مختصر دور کی یادگار [illegible] جب شہر پر ان کا تسلط تھا ۔ مرہٹے تو چلے گئے لیکن شہر نے ان کا اثر ہمیشہ کے لیے قبول کر لیا ، اسے ایک [illegible] تسلسل کا جزو لاینفک بنا دیا ۔ غالب کی دلی میں [illegible] جدید شہروں کے [illegible] ۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے عظیم شاعر میر نے اپنے اشعار میں دلی کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسے "عالم میں انتخاب" قرار دیا ہے ۔ شہر کا چپہ چپہ یادداشت یا روایات میں [illegible] افراد یا واقعات سے تعلق کی یاد [illegible] ، مثلاً [illegible] ، [illegible] ، حویلی حیدر قلی ، گلی قاسم جان ، جرنیل بی بی کی حویلی ، بیگم کا باغ ، کوچہ [illegible] وغیرہ [illegible] ۔

غالب کے زمانے میں شہر کی آبادی اس سے قبل کی صدی میں بار بار کی غارت گری اور تباہی کی وجہ سے گھٹ گئی تھی ۔ [illegible] انگریزوں کا [illegible] ۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] ۔ [illegible] ۔

شہر کے اہم مسائل تھے۔ [illegible] جہاں کے عہد میں نکالی گئی تھی اور شہر میں آب رسانی کا اہم
ذریعہ تھی۔ [illegible] ہو چکی تھی۔ چارلس [illegible] نے اس کی مرمت کروائی اور اسے دوبارہ کھولا اور ۳۰ / مئی [illegible] کو [illegible]
سال کے عرصے میں پہلی بار نہر کا پانی ایک بار پھر لال قلعہ تک شہر کے درمیان سے بہتے ہوئے [illegible]
مسجد اور چاندنی چوک سے ہوتا ہوا لال قلعہ کی طرف جاتا ہے۔ شہر کے باشندوں نے نہر کے صاف شفاف پانی کا خیر مقدم
[illegible] اور خوشی سے کیا۔ ایک بار پھر شہر کے بہترین باغوں کی آب پاشی [illegible]۔ [illegible] کے اپنا کام کرنے اور [illegible] کو
پانی کی باقاعدہ فراہمی کا انتظام ہو گیا۔ لیکن یہ خوشی زیادہ دن نہ رہ سکی۔ شہر کی طرف سے نہر کا پانی [illegible] آب پاشی کی
غرض سے کسانوں نے اتنا نکالا کہ شہر میں اس کا بہاؤ کم ہوتا گیا۔ [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

لیکن وہ جانے دلی کو مجبور کر [illegible] غالب [illegible]

[illegible]

بار کے اہم عہدہ دار حکیم احسن اللہ خان [illegible]

[illegible]

لیکن ہندستان پہنچنے کے لیے بھی [illegible] دنوں کے بعد لگتی ہیں: ابھی یاد رہے کہ گرمی [illegible] سے بچنے: [illegible] بعض جگہ آتا اس کی اطلاع کے لیے بھی بڑے بڑے ظروف استعمال کر رہے [illegible] خس کی ٹٹیاں بھی لازمی ہوتی تھیں۔ انھیں دروازوں اور کھڑکیوں کے پٹ [illegible] جاتا تھا [illegible] ایک آدمی [illegible] پانی چھڑکتے ہوئے ہمیشہ نم رکھتا تھا۔ جب ہوا [illegible] تو [illegible] کمرے کا اندرونی حصہ ٹھنڈا بھی ہو جاتا اور معطر بھی۔ لیکن انگریزوں کی مخصوص ایجاد [illegible] سارے ہندستان [illegible] سمجھنا چاہیے۔ Themantdotes (گرمی توڑ) تھے۔ ان میں بھی خس کی ٹٹیاں استعمال [illegible] ایک لکڑی کے بکس [illegible] نصب کر دیا جاتا تھا [illegible] طاقت سے گھماتے ہوئے ہوا کی رو پیدا کی جاتی تھی اور یہ کام [illegible] کی ٹٹیاں زیادہ خوش حال ہندستانی بھی استعمال کرتے تھے۔ گرمی سے بچاؤ کا روایتی ذریعہ [illegible] پائے جانے والے تہہ خانے تھے اور موٹی دیواروں والی [illegible] غالب [illegible] کے طویل دن اپنے گھر [illegible]

نہ صرف انگریزوں بلکہ ہندستانی امرا کے ہاں بھی برف کی بڑی مانگ [illegible] میں بڑی محنت سے تیار کیا جاتا تھا اور پھر اسے گرمیوں میں استعمال کے لیے [illegible] ذخیرہ کیا جاتا تھا [illegible] کی کڑاکے کی سردی والی راتوں میں پیشہ ور برف بنانے والے [illegible] معروف کار رہتے: [illegible] پانی بھر [illegible] ایک پتلی تہہ جم جاتی [illegible] گرمیوں کے آغاز [illegible] بچ جاتی وہ ناکافی بھی ہوتی اور [illegible] ایک رباعی میں غالب اپنے [illegible] کرتے ہیں:

[illegible] سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں [illegible]

روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

جاگیردار اشرافیہ [illegible] غالب لکھتے ہیں:

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ایک [illegible] اور [illegible]

[illegible] تیسرا [illegible]

[illegible] اور [illegible] کر اپنے [illegible]

[illegible] اور [illegible] اور ساہوکاروں [illegible]

[illegible] کی ساہوکاروں [illegible]

[illegible]

مسلمانوں کی بہت سی جائداد [illegible] ساہوکاروں کے

[illegible]

[illegible] ایک [illegible] اور [illegible]

[illegible] اور [illegible]

ایک یا ایک سے زائد آنگنوں کے اطراف تعمیر کیے ہوئے کمرے اور (کبھی کبھی) جیسا کہ اس تاجر کے مکان میں بشپ ہیبر نے دیکھا، فواروں کے ساتھ ایک باغ۔ بلی ماراں اور گلی قاسم جان کے نکڑ پر واقع غالب کے گھر کی تعمیر بھی اسی نمونے کی تھی، گلی کی طرف عمارت کا اونچا بغیر کھڑکیوں کا ٗ———— بخشتی رخ، اوپر تین طرف، کھلے آنگن کا احاطہ کیے ہوئے، محراب دار غلام گردشیں۔ اس نوعیت کی تعمیر کی اوّلین وجہ خلوت نے اہتمام کی ضرورت تھی (بالخصوص زنانے کے لیے) اور یہ اس بنگلے والی طرزِ تعمیر کے بالکل برخلاف تھی جسے بعد میں انگریزوں نے رواج دیا اور جو آج کل بھی رائج ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شہر کے نظامِ تجارت کا سب سے زیادہ باوقار مرکز چاندنی چوک تھا۔ یورپینوں کو غلط فہمی تھی کہ اس نام کا مفہوم چاندی کا کام کرنے والوں کا چوک ہے۔ دراصل یہاں پرکھنے والے پھل، کپڑے، گچھے، ہتھیار، چڑیاں اور جانور اور ہر قسم کی بیش قیمت دست کاری کی اشیا خرید سکتے تھے۔ ایک ہم عصر نے لکھا ہے کہ یہاں صرف جڑاؤ زیور بیچنے والے اور چاندی کا کام کرنے اولے آباد ہیں۔ اس تاثر کی وجہ غالباً یہ امر واقعہ تھا کہ یہاں جوہریوں اور جڑاؤ زیور بیچنے والوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ " بلاشبہ وہ اپنی مصنوعات کی عام نمائش کبھی نہیں کرتے تھے، تمام قیمتی اشیاء گھروں کے اندرونی کمروں میں رکھی جاتی تھیں، سامنے کا کمرہ، بغیر دروازوں کا، سڑک پر کھلتا تھا، یہاں سفید کپڑے کا فرش رہتا تھا جس پر چند سادہ اوزار اور اپنے دھات کے کام کے لیے ایک جلتی ہوئی چھوٹی سی کٹھالی پاس میں رکھے، وہ ایک کاری گر بیٹھے اپنے کام میں مشغول رہتے۔ اگر کوئی یورپین دکان پر رکتا تو وہ بالعموم سڑک سے چند فیٹ اونچے دکان کے فرش کے کنارے پر بیٹھتا اور مطلوبہ اشیا کے لیے سودا چکاتا۔" لیکن آخر الامر چاندنی چوک کی حیثیت صرف شہر کی سب سے اہم تجارتی سڑک کی نہیں اس سے کچھ بڑھ کر تھی۔ شہر سے محل کو جانے والی اہم ترین سایہ دار کشادہ سڑک کی حیثیت سے اس کے محلِ وقوع اور شہر کے ارتقا میں اس کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے اس کو مرکزی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ جیسے سورج سے شعاعیں نکلتی ہیں شہر کے سبھی اہم کوچے اور گلیاں اسی سے نکلتی تھیں اور امیر و غریب، بیوپاری اور امیرزادے، دانش ور اور اہلِ حرفہ، اہلِ علم اور شعرا اپنے اپنے مسائل حاضرہ پر گفتگو کے لیے اس کی نہر کی اس سنگ بستہ رہ گذر کے کنارے اکٹھے ہوتے جس پر شروع سے آخر تک درخت سایہ فگن تھے۔ جیسا کہ منشی ذکاء اللہ نے سی۔ ایف۔ اینڈریوز سے کہا، " آپ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ پرانے وقتوں میں چاندنی چوک کتنا شاندار دکھائی دیتا تھا۔ یہ شہر کا مرکز تھا۔۔۔"

شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد کم و بیش برابر تھی۔ ان دو مذاہب کے مابین کائستھ ایک رابطے کا کام دیتے تھے (غالب کے شاگردِ خاص ہرگوپال تفتہ کائستھ تھے)۔ کھتریوں کا شمار باہر سے آکر شہر میں نسبتاً حال میں بس جانے والوں میں تھا۔ یہ پنجاب سے آئے تھے۔ شہر کے غربا سبھی فرقوں کے تھے اور اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ وہ مٹی کے تنگ و تاریک گھروں میں رہتے تھے جو اکثر بارش یا سیلاب سے بہہ جاتے۔ غالب ۱۸۵۵ء میں لکھتے ہیں کہ شہر میں بہت سارے گھر بارش کی وجہ سے ڈھ گئے۔ ان کا اپنا گھر برسات میں بالکل چھلنی ہوگیا تھا اور ایک خط میں وہ فقرہ چست کرتے ہیں کہ اگر بارش دو گھنٹے ہوتی ہے تو میرے گھر کی چھت چار گھنٹے ٹپکتی ہے۔ جھونپڑ پٹیاں بیش تر شہر کی بیرونی حد کے پاس

موری دروازے، فراش خانے، اجمیری دروازے، ترکمان دروازے اور دلی دروازے کے علاقے میں تھیں۔ یہاں کمہار قصائی، نجار، رنگ ریز، متفرق دست کار، اہلِ حرفہ، نوآباد دیہاتی اور بے روزگار رہتے تھے۔ معاشی انحطاط اور افلاس جنازے کی چادر کی طرح سارے شہر پر چھایا ہوا تھا۔ خود محل میں یہ اتنا نمایاں تھا کہ اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ ایک غیر ملکی مہمان یاد کرتا ہے کہ جب وہ بادشاہ سے اپنے تعارف کی غرض سے گیا تو کیسے "خستہ حال بھکاریوں کے ایک اور ہجوم نے اسے دق کیا۔ محل کے "سلاطین" یعنی خانوادہ شاہی کے دور کے رشتہ دار اور دست نگر سراسر افلاس کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک انگریز عہدہ دار لکھتا ہے: "سلاطین کی جائے سکونت اتنی اونچی لق و دق دیوار کی آڑ میں ہے کہ اس کا منظر آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس کی حد کے اندر بہت سارے چٹائی کے جھونپڑے ہیں جن میں یہ بدنصیب رہتے ہیں۔ جب دروازہ کھولا گیا تو شکستہ حال، نیم برہنہ اور فاقہ زدہ اشخاص کے ایک ہجوم نے نکل کر ہمیں گھیر لیا۔" سلی مین تحقیر آمیز انداز میں یہ بھی لکھتا ہے کہ "خانوادہ تیموریہ کے سلاطین اور شاہ بیگمات بڑی بڑی تعداد میں حشرات الارض کے جھنڈ کی طرح پڑے ملیں گے، جن کے پاس نہ پیٹ بھرنے کو کھانا ہے اور نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔"

تاہم گزربسر کے اخراجات، زمانہ موجودہ کے مقابلے میں ناقابلِ یقین حد تک کم تھے۔ ایک روپیہ چالیس سیر گیہوں یا چار سیر گھی خریدنے کے لیے کافی تھا۔ ۱۸۵۲ء کے ایک خط میں غالب شکایت کرتے ہیں کہ گیہوں، بیسن اور چنے دلی میں روپیے میں چالیس پینتالیس پونڈ بک رہا ہے۔ انگریزوں کی نظر میں غربت کا معیار ایک کنبے کی تین روپے سے ماہانہ خالص آمدنی تھی۔ چناں چہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ماہانہ باسٹھ روپے آٹھ آنے کی کم و بیش بندھی ہوئی آمدنی میں غالب چار نوکر رکھنے اور ان کا خرچ اٹھانے کا مقدور رکھتے تھے۔ دور از قیاس ہے کہ قحط کے سالوں کو چھوڑ کر درجہ مفلس افراد بھی فاقہ کشی کی حد تک پہنچتے رہے ہوں۔

شہر کی گنگا جمنی چہل پہل کا تواتر اپنی رو میں سبھی گروہوں کو بہا لے جاتا تھا، اپنی محرومیوں کے باوجود غربا امرا کے دل بہلاووں اور تفریحوں میں بہ ہر حال سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ یہی وہ ناقابلِ تعین دل فریبی تھی جس نے غالب میر تقی میر کو افسوس کرنے پر مجبور کیا کہ: "جہان آباد کے کھنڈر لکھنؤ سے دس گنا بہتر تھے۔ کاش کہ میں وہیں رہتا پریشاں حالی کی زندگی گزارنے یہاں نہ آتا۔" شاید ہی کسی بھی شہر کی سیر کے لیے آنے والے کی توجہ، بالخصوص برسات کے موسم میں، آسمان میں جا بہ جا اُڑنے والے پتنگوں کی طرف مبذول نہ ہوتی۔ مہابت خاں کی ریتی یعنی دلی دروازے کے پاس جمنا کا ریتیلا ڈھلوان کنارہ پتنگ بازوں کا اکھاڑا تھا اور کہا جاتا ہے کہ یہاں پتنگ بازی کے مقابلے منعقد ہوتے، جن میں لکھنؤ تک سے ٹیمیں شریک ہوتیں۔ نیم شکایتی انداز میں غالب لکھتے ہیں کہ بادشاہ کے اصرار پر وہ (لال قلعے کے شمالی در) سلیم گڑھ پر پتنگ بازی کے لیے ان کے ساتھ شامل ہوئے (یہ بہ ظاہر روزانہ شام کا مشغلہ تھا)۔ ایک اور مقبولِ عام مشغلہ کبوتر بازی کا تھا۔ دلی کی سڑکوں سے گزرنے والے بہادر شاہ کے سرکاری جلوس میں ایک شاہی کبوتر بردار ہاتھی ہمیشہ شامل رہتا تھا۔ تیتر، بٹیر اور مرغ لڑانا بھی روز کا دل بہلاوا تھا۔ امرا اور قلعے کے شہزادوں کا کندھوں پر اپنے پسندیدہ تیتروں اور بٹیروں کو بٹھائے آتے جاتے دکھائی دینا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سال میں ایک تیراکی کا میلہ لگتا جس موقع پر تقریباً سارا شہر جمنا کنارے اکٹھا ہو جاتا۔ دل چسپی رکھنے والے گروہوں کی طرف سے شہر

کئی اکھاڑوں کا انتظام تھا ۔ شطرنج ، سٹے اور گنجفہ بھی مقبول عام مشغلے تھے ۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر داستان گویوں کو سننے کے لیے ہمیشہ بڑا اژدہام رہتا تھا ۔ چاندنی چوک ایک پسندیدہ ملاقات کی جگہ تھی جہاں لوگ تقریباً بغیر کسی خاص مقصد کے ، بس یوں ہی ایک دوسرے سے ملاقات اور باتیں کرنے اور دنیا بھر کے لوگوں کو راستہ چلتے دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوتے تھے ۔ شام میں کئی جاذب توجہ تفریحیں تھیں : جمنا پر کشتیوں کے پل پر چہل قدمی ، اردو بازار میں مل بیٹھنا ، جہاں مطالعے کے شائق پڑھ سکتے تھے اور دوسروں کے لیے کھانے کا معقول انتظام رہتا تھا ، یا پھر (خانم کے بازار اور خاص بازار کے درمیان کھلی جگہ میں واقع) گذری بازار کو دو ایک کباب چکھنے کے لیے اور کبابیوں کی دل فریب باتوں اور تشویق دلانے والی اپچ سے محظوظ ہونے کے لیے جانا ۔ بنت عنب کی طرف رجحان رکھنے والوں کے لیے شراب خانے تھے جو بہ ظاہر تقریباً ساری رات کھلے رہتے تھے ۔ دیسی ٹھرّے کے علاوہ غیر ملکی تیز خوش بودار شراب (بیش تر فرانسیسی شرابِ انگور اور شیمپین) ، جس کی خردہ فروشی زیادہ تر انگریز تاجر کرتے تھے ، بہ آسانی اور ارزاں دست یاب تھی ۔ غالب کا ، جو روز شام میں پیتے تھے ، ادعا تھا کہ ان کی عادت صرف فرانسیسی شرابِ انگور پینے کی تھی ۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ شراب ، مے کدہ ، ساقی اور واعظ کی ظاہرداری و ریاکاری شعری اشاریت کے بار بار دہرائے جانے والے موضوعات ہیں ۔ صرف ۱۸۵۷ء کے بعد ہنگامی سیاسی حالات کے پیشِ نظر انگریزوں نے شراب کی کشید پر پابندیاں عائد کیں اور ساتھ ہی ساتھ غیر ملکی شراب کی قیمت (عارضی طور پر) اس قدر زیادہ ہوگئی کہ اس کا خریدنا ناممکن ہوگیا ۔ برسات میں پھول والوں کی سیر تھی اور جاڑوں میں سارا کنبہ فوّارے دیکھنے اور بڑھ بڑھ کر بیچنے والوں سے چنا جورگرم ، ریوڑے خریدنے کے لیے شہر کے بیشتر باغوں کی تفریح کو جاسکتا تھا ۔ بھانڈ ، بہروپیے یعنی نہایت تیزی سے بھیس بدلنے والے اداکار جو حیرت ناک سرعت کے ساتھ باری باری سے مختلف رول ادا کرسکتے تھے ، بھگت باز یعنی مذہبی رزمیوں کے مختلف کرداروں کا رول ادا کرنے والے ، کٹھ پتلی باز یعنی کٹھ پتلی کا تماشہ دکھانے والے ، نٹ اور مداری سب کے لیے بہ آسانی دست یاب تفریح کا موقع فراہم کرتے تھے ۔ ان فن کاروں کو انتہائی فروغ محمدشاہ رنگیلے کے عہد میں حاصل ہوا جب شاہی سرپرستی کی بہ دولت ان کی روایتی ہنرمندیوں کی ترقّی کو تحریک ملی ۔ لیکن بہادرشاہ ظفر کے عہد میں روزی کمانے کے لیے وہ پہلے سے کہیں زیادہ اپنے کھیل تماشے عوام کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہوگئے تھے ۔ متعدّد موقعوں پر شہر سے گزرنے والے شاہی جلوس عوام کے لیے خاص دل کشی رکھتے تھے ۔ اب یہ شاہ جہاں کے زمانے کے دولت اور طاقت کے پُر شوکت مظاہرے نہیں رہے تھے ۔ " آگے اور پیچھے محافظ پیادہ سپاہیوں کا بے قاعدہ ہجوم ہوتا تھا ۔ نفیری نواز نفیری بجاتے اور خوش خواں بادشاہ کی شان میں قصیدے سناتے ۔ " لیکن تماشا آنکھوں کو اچھا لگتا تھا اور بڑے تکلّف سے آراستہ کیے ہوئے ہاتھیوں کی لمبی قطار لازمی طور سے تماشائیوں کا دل موہ لیتی اور وہ بے ساختہ بہ آوازِ اظہارِ مسرت کرتے ۔ سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز لکھتے ہیں کہ : " پرانی دلی کے ان تذکروں میں سرکاری تقریبوں کے سلسلے میں منظّم کیے ہوئے ان ہاتھیوں کے جلوسوں کو ایک اہم مقام حاصل تھا ۔ جنھوں نے یہ کہانی مجھے سنائی وہ اُس پرانے زمانے میں خود کم سن بچّے تھے اور بہ ظاہر منظر کی رنگینی نے ان کے نوخیز تخیّل پر گہرا نقش چھوڑا ۔ " جمعہ کے دن ، جیسا کہ اب بھی ہوتا ہے ، جامع مسجد میں مسلمان حسبِ معمول نماز کے لیے اکٹھا ہوتے ۔ ایک انگریز ہم عصر خاتون جس نے ایک دفعہ یہ منظر دیکھا ، تعجّب کا اظہار کرتی ہے کہ بعد میں نمازیوں کی ...

جوتے کیسے مل جاتے ہیں " کیوں کہ جوتے پہلو بہ پہلو اوپر سے نیچے تک (جامع مسجد) کی سبھی سیڑھیوں پر رکھے ہوئے تھے اور سبھی تقریباً ایک ہی نمونے کے تھے ۔" ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ہاں شادیوں کو ایک طول طویل جشن کی تقریب سمجھا جاتا تھا اور یوں تو ان کی بہ دولت شہر کی زندگی میں رنگینی بڑھ جاتی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ قرض داری کا ایک عام سبب بھی تھیں ۔ روز مرّہ کی زندگی مذہبی رسوم کی ادائگی اور شگونوں کی پابندی کے حد سے زیادہ بوجھ سے لدی ہوئی تھی ۔ کہتے تھے کہ دلی میں تیوہار سال کے دنوں سے بھی زیادہ تھے ۔ " انتہائی عدم تحفّظ اور معاشی انحطاط کا ایک اہم نتیجہ زندگی پر گرفت کا بالکل ڈھیلا پڑجانا تھا ، جس کا اظہار جادو ٹونے اور فوق الفطرۃ باتوں پر عام اعتقاد سے ہوتا تھا ۔" جوتشیوں کی بہت مانگ تھی اور عطائیوں کی بہتات تھی ۔ ذات پات کا نظام مسلّمہ طرزِ زندگی تھا اور بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کے شعور کو بھی متاثر کیا تھا ۔ " (ہندوؤں اور مسلمانوں ، دونوں کے) شادی بیاہ ، دوسرے سماجی رسوم و رواج اور دستور کا جھکاؤ یکسانیت کی طرف تھا یا کم از کم اپنی اچھی اور بُری دونوں طرح کی خصوصیات میں وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے تھے ۔ ذات پات کے نظام کے بعض عناصر ، مثلاً بعض کھانے کی چیزوں کی ممانعت ، چُھوا چھات یا ناپاک کا تصوّر اور شادی بیاہ سے متعلّق بندشیں دونوں کے یے مشترک ہوگئی تھیں ۔ نواب شمس الدّین نے پھندے کو ٹھیک کروانے کے لیے پورے سکونِ قلب کے ساتھ اپنی گردن پیش کردی لیکن اُس وقت کراہت کے احساس کے ساتھ چونک کر پیچھے ہٹے جب انھوں نے دیکھا کہ پھانسی دینے والے ذات کے بھنگی ہیں ۔ بے جڑا پن اور اجنبیت ، معاشرے کی ریزہ ریزہ تقسیم اور علاحدگیت ، جو آج کل ہمارے شہروں کی عام بیماری ہے ، بڑی حدتک مفقود تھی ۔ راجستھان کے تباہ حال کسانوں جیسے نسبتاً حال میں ترکِ وطن کر کے دِلّی میں آباد ہوجانے والے بھی جلد ہی " جماعتی نظام " میں اپنی جگہ بنالیتے ۔ ہر شخص کو کسی سے جُڑے رہنے کا ، کسی عظیم تراکائی مثلاً کسی فرقے ، ذات ، محلّے یا پیشے کا ایک حصہ ہونے کا احساس ضرور رہتا ۔ بالآخر وہ اس شہر سے جُڑا ہوا ، بہ الفاظ دیگر دِلّی والا ہوتا ، " وہ لکیر کا فقیر جس سے بعض ایسی خصوصیات منسوب کی گئی ہیں مثلاً طرزِ نو سے اُس کی نفرت ، دوسرے کی رائے کا لحاظ کرنے سے گریز اور اپنے محدود دائرے کے باہر کے مسائل سے دل چسپی کا فقدان " جو اس کے اور دوسروں کے درمیان ما بہ الامتیاز بھی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ بعض اوقات رنگ ڈھنگ اور وضع قطع کی ایسی یکسانیت کو بھی فروغ دیتی تھیں جو اسی معاشرے کے انفرادیت پسند افراد کو ناگوار گزرتی تھیں ۔ غالب شکایت کرتے ہیں کہ : " . . . اِس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام ۔ مُلّا ، حافظ ، بساطی ، نیچہ بند ، دھوبی ، سَقّا ، بھٹیارہ ، جولاہا ، کنجڑا ، منہ پر ڈاڑھی سر پر بال ، فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر مُنڈایا ۔" (خط بہ نام مرزا حاتم علی بیگ مہر ۔ اواخر اپریل ۱۸۵۹ء) غالب کی جھلاہٹ کے باوجود ایسی یک رنگی مادّی سے زیادہ غالباً کوئی اور ہی گرفت میں نہ آنے والی اور ناقابلِ فہم شے تھی ۔ بہ ہرحال یہ سماجی پس منظر اور رتبے کے آئینہ دار لباس کے فرق کو مٹاتی نہیں تھی ۔ عوام کھادی کے کپڑے پہنتے تھے ، اُون قیمتی تھا اور اس کا رواج کم تھا ، اس کی بہ جائے روئی بھری رضائیوں وغیرہ سے کام لیا جاتا تھا ۔ خوش حال کرخن دار یعنی کاری گر بے داغ اُجلا لباس زیبِ تن کرتا اور سلمہ ستارہ ٹنکی ٹوپی پہننا پسند کرتا تھا ۔ دولت مند ریشمی لباس پہنتے اور پُر تکلّف کشیدہ کاری کی شالیں استعمال کرتے ۔ سفید کپڑے یا کام دانی کے بنے ہوئے چُوڑی دار اور چوڑی مہری دونوں طرح کے پائجاموں اور ڈھاکے کی ململ کے کُرتوں کا رواج تھا ۔ ململ ہی کا انگر کھا گو میوں

میں عام طور سے پہنا جاتا تھا۔ کرتے کے اوپر چوغا یعنی فرغل پہننے کا رواج تھا۔ اکثر و بیش تر یہ رنگین ہوتا اور اس پر پُرتکلف کشیدہ کاری ہوتی۔ جاڑوں میں جُبّہ یعنی قدیم روما میں مروّج ٹوگا جیسا لبادہ پہنا جاتا۔ سر کا لباس لازمی سمجھا جاتا تھا مخمل یا ململ کی بنی ہوئی اور زر دوزی کے کام کی ٹوپیاں گول یا چوگوشہ اور کبھی کبھی پنج گوشہ بھی ہوسکتی تھیں۔ مغلوں سے لیے مخصوص کھڑکی دار صافے اور منگولی ارک چین ٹوپیاں سر کے لباس کے دوسرے مروّج نمونے تھے۔ دست یاب تصویروں کے پیشِ نظر کہہ سکتے ہیں کہ غالب اکثر کلاہِ پپاخ یعنی ازبکستان اور ترکی میں عام طور سے مستعمل لمبی اور اوپر طرف تنگ مخروطی وضع کی ٹوپیوں سے مشابہ کوئی ٹوپی پہنتے تھے۔ چوں کہ طبقہ ، امرا کے مرد دن کا قابلِ لحاظ حصہ مردانے میں ملاقاتیوں کی پذیرائی ، خاطر مدارات یا اپنے فرائضِ منصبی کی بجا آوری میں گزارتے تقریبات کا پُرتکلف لباس پہنے رہنا اُن کے لیے معمول کی بات تھی۔ روداروں میں لباس کی جزئیات پر کافی توجہ دی جاتی۔ اپنے ایک خط میں غالبؔ اس بارے میں کہ ان کو کس وضع کی پگڑی چاہیے تفصیلی ہدایات دیتے ہیں: "میں کلاہ کا جویا ہوں اور اس کے ساتھ میں ابریشمی لُنگی کی فکر میں ہوں جو پشاور و ملتان میں بنتی ہے اور وہاں کے بڑے لوگ اسے اپنے سر سے باندھتے ہیں لیکن وہ لُنگی ایسے شوخ رنگ نہ رکھتی ہو جو نوجوانوں ہی کو پھبتے ہیں ، اُس کا حاشیہ سرخ رنگ کا نہ ہو اس کے ساتھ اس کی پرواز اور اندا زیبائی بھی عمدہ ہو ، تار ہائے زر و سیم کو اس میں استعمال نہ کیا گیا ہو اور سیاہ ، سبز ، زرد اور نیلا ریشم اس کی بناوٹ میں صرف کیا گیا ہو۔" (فارسی خط بہ نام منشی جواہر سنگھ ، یکم دسمبر ۱۸۴۸ء۔ ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی) پابندِ وضع اپنی دھج قطع میں ریچ ریچ بڑے دُھن والے اور خوش سلیقہ بھی ہوسکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور شاعر اور غالب کے ہم عصر مومنؔ بھی ایسے ہی تھے۔ فرحت اللہ بیگ ان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں: "بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا لیکن اس کے نیچے کرتا نہ تھا اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ ، اُس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت ، پاؤں میں سرخ گل بدنی کا پے جامہ ، مہریوں پر سے تنگ اور اوپر جاکر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی ایک بر کا پے جامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستین آگے سے کٹی ہوئیں ، کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی اُلٹا کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی۔ اس کے کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈ کر آگئی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔"

ایک اہم ادارہ طوائف کا کوٹھا تھا ، جس نے شعری نشاۃ ثانیہ کی بیش تر اشاریت ، تشبیہوں اور استعاروں کے لیے ماحول فراہم کیا تھا۔ ایک بے حد قدامت پسند معاشرے میں ، جہاں پردے کا رواج اپنے عروج پر تھا اور نامحرم عورتوں اور مردوں کے میل جول کی قطعی ممانعت کُلیتہً مسلّمہ معاشرتی قاعدہ تھی ، صرف طوائف کا کوٹھا ہی وہ بہ آسانی قابلِ رسائی مقام تھا جہاں مرد بغیر کسی روک ٹوک کے اجتماعی حیثیت سے عورتوں سے راہ و رسم رکھ سکتے تھے اور اس طرح کی ملاقاتوں کو عشق و آرزو اور ہجر و وصال کے شاعرانہ جذبات کا رنگ دے سکتے تھے۔ اس طرح سے محبوبہ کا تصور ، طوائف کے تصور میں تبدیل ہوگیا: خاندان کے سیاق و سباق سے عاری ، بندھنوں اور اخلاقی پابندیوں سے آزاد ایسی عورت کے تصور میں

جس کی اس وجہ سے بہ ذاتِ خود ایک عورت تھی، ایک مطلقاً جمالیاتی تصور میں قلبِ ماہیت کی جاسکتی تھی۔"
طوائف سماج کا ایک مسلّمہ جزو تھی۔ غالب کے خطوط میں، جہاں اس موضوع کا ذکر ہے، اخلاقی نقطۂ نظر سے کسی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ لہجہ بیانیہ اور شعریت سے خالی ہے۔ ایک طوائف کے مرنے پر، جس کے ان کے ایک دوست مظفر حسین خاں دل سے عاشق تھے، اپنے ایک نہایت مشہور خط میں غالب انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ اس صدمے کو کیسے صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے۔ خود اس رواج کی مذمّت کا کہیں کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ مردوں کے لیے تعدّدِ ازدواج کو ایک خلقی بات سمجھا جاتا تھا۔ بالخصوص طبقۂ اُمرا اور دولت مندوں میں گھر کے باہر اس طرح کے دل بہلاوے کو نہ صرف معاشرتی طور پر قابلِ قبول سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کی ان سے توقع بھی کی جاتی تھی۔ کبھی کبھی اس تجربے کا انجام افسوس ناک بھی ہوسکتا تھا۔ طوائف کسی شخص کے دیوالیے کا بھی باعث ہوسکتی تھی۔ کسی خاندان کی کئی پیڑھیوں کی جمع کی ہوئی دولت کو اپنی مالی منفعت کے لیے ہڑپ بھی کرسکتی تھی یا کسی شخص کو اس کے کنبے سے جدا بھی کرسکتی تھی۔ غالب نے ایک دفعہ شکایت کی کہ کیسے اس طرح کی ایک طوائف نے (وہ اسے رنڈی کا نام دینے کو ترجیح دیتے ہیں) ان کے سالے کے ساتھ بالکل ایسا ہی سلوک کرکے گھر والوں کے چھکّے چھڑا دیے۔ لیکن اتنا خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا تھا۔ طوائف خود کو بے یار و مددگار نہیں محسوس کرتی تھی۔ اس امرِ واقعہ کا اس عہد کے لکھنؤ کے بارے میں مرزا رُسوا کے قابلِ اعتبار ناول امراؤجان ادا میں نہایت پُر اثر طریقے سے اظہار ہوا ہے۔ اس ناول میں باکمال طوائف امراؤجان ادا، اس کو ایک امرِ بدیہی سمجھتی ہے کہ اس دنیا میں شریف عورتوں اور طوائفوں کا وجود ہمیشہ رہے گا اور ان کے مابین ہمیشہ پریشان کن رقابت رہے گی۔۔۔ بہ ظاہر وہ یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں سے متعلق لوگوں کی طرح طوائف بھی چال چلن کے قوانین و ضوابط کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے اور چوں چہ وہ اپنے اصولِ اخلاقیات کی پکّی رہی ہے۔ جب وہ خود کو گنہ گار کہتی ہے وہ محض رسمی خوش بیانی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتی ہے کیوں کہ اس کے امرواقعہ پر مبنی، روکھے پھیکے اور معروضی لہجہ، بیان سے شاذ و نادر ہی کسی سچے احساسِ گناہ کا اظہار ہوتا ہے۔" معاشرہ طوائف کو اصل سماجی دھارے کے ایک جزو کی حیثیت سے قبول کرتا تھا۔ تقاریب میں مثلاً اولیا کے عرس میں گانے اور ناچنے کے لیے اس کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ نواب شمس الدین کے انگریزوں کے حکم سے پھانسی پانے کے بعد طوائفوں نے نواب کے انجام پر افسوس کرتے ہوئے ایک گیت تصنیف کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں طوائف کا کوٹھا شائستہ طور طریقے سیکھنے کا ایک دبستان تھا جہاں متموّل خاندانوں کے نوعمر اراکینِ خاندان ٹھیک اسی طرح بھیجے جاتے تھے جیسے آج کل دولت مندوں کی بیٹیوں کو شائستہ اطوار سکھانے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ اسے تہذیبی مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور اس نے خیال، گائکی اور کتھک کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔ غالب کے زمانے میں جاگیرداری نظام کے انحطاط کی وجہ سے قدردانوں کی تعداد بھی کم ہوگئی تھی اور اُن کے پاس روپیہ پیسہ بھی اتنا نہیں رہا تھا۔ نتیجۃً طوائفوں کا بھی اپنے تہذیبی کمالات کے تعلق سے کم یا زیادہ بین ہوجانا لازمی تھا۔ پھر بھی سماج طوائف کو ایک نری رنڈی کے برابر نہیں گردانتا تھا۔ یہ تو کئی سال بعد کی بات ہے جب صدی کے اختتام پر ہندو اور مسلم احیاءِ مذہب کی تحریکوں کی نئی اخلاقیات کے زیرِ اثر انھیں موخر الذکر کے برابر گردانا جانے لگا۔ اُس وقت تک طوائف ایک

مخصوص طرزِ زندگی کے جزو لاینفک کی حیثیت سے برقرار رہی اور اُس کے اور اسی طرح اس کے قدردانوں کے وجود کو محض اُس اخلاقی رُسوائی کے سیاق و سباق میں نہیں سمجھا جاسکتا جو آج کل کوٹھے سے جُڑی ہوئی ہے۔

مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ غالب کی دلی خود اپنے اس اِدّعا کی لطافت اور تمکنت کی وجہ سے یاد رکھی جائے گی جو ایک تہذیب کا جواز فراہم کرتا تھا۔ وہ اِدّعا جس پر شائستگی سے قائم رہا جاتا تھا اور بعض اوقات اس کو نشوونما دینے والے سیاسی و معاشی نظام کی بے رحمانہ بیخ کنی کے باوجود قابلِ رحم ڈھیلے پن کے ساتھ اس پر اصرار بھی کیا جاتا تھا۔ برطانوی موجودگی کے استحکام سے علانیہ سیاسی سرگرمیاں عارضی طور پر معرضِ التوا میں پڑ گئی تھیں۔ ان کے بہ جائے تہذیبی زندگی کی خوبی روواروں کی مساعی کا خاص مرکزِ توجہ بن گئی۔ نتیجتاً ایسے قابلِ تقلید معیار معرضِ وجود میں آئے جنھوں نے اوپر سے لے کر نیچے تک سماج کے ہر طبقے کو متاثر کیا۔ رائج قاعدوں کی رو سے شائستہ سماجی میل جول بجائے خود ایک مقصدِ اصلی تھا اور اس مقصد کے حصول میں ان کے استعمال سے ہی ان تہذیبی کمالات کا بہترین اور انتہائی اطمینان بخش اظہار ممکن تھا۔ نرم مزاج، مہذب سخن ور بادشاہ ظفر اس عہد کی ایک فطری پیداوار بھی تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی حیثیت اس کی کامیابیوں کے لیے ایک عامل یا اثر آفریں قوت کی بھی تھی۔ ان کا دربار تہذیب و شائستگی کا ایک دبستان تھا جس کے آدابِ مجلس اور طور طریقوں کی تقلید دکن جیسے دور دراز علاقوں تک میں کی جاتی تھی۔ دلی کی اقتدار کے پیرس کی حیثیت کے ختم ہوجانے کے بعد بھی ایک عرصہ دراز تک اُس کی تہذیب و شائستگی کے درسگاہ کی حیثیت برقرار رہی۔ "کہا جاتا ہے کہ مشاعرے میں "اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں ۔۔۔ اس کو نہ بیٹھنا چاہیے تھا ☆ تو (میزبان یا صدر منتظم) بہ جائے اس کے کہ اُس کو وہاں سے اٹھاتے خود ایسی جگہ جا بیٹھتے جہاں اس کو بٹھانا چاہتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہتے: ارے بھئی ذرا ایک بات تو سننا۔ وہ آکر اُن کے پاس بیٹھ جاتا۔ اُن سے باتیں کرتے رہتے۔ اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جس کو وہ خالی جگہ کے لیے موزوں سمجھتے، ان سے کہتے: تشریف رکھیے وہ خالی جگہ ہے۔ جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اٹھ جاتے" (فرحت اللہ بیگ: دلی کا ایک مشاعرہ) باریک بینی سے ملحوظِ خاطر رکھی جانے والی تمام نفاستوں کے ساتھ شائستگی کا یہ مظاہرہ آخر تک اُن قوتوں سے بہ ظاہر بے خبری کے عالم میں جاری تھا جو کچھ ہی سالوں میں ۱۸۵۷ء کے طوفانِ عظیم کا باعث بننے والی تھیں۔ ۱۸۵۷ء اور بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کے ساتھ سارا معاشرتی ماحول فنا ہوگیا۔ غالب کی دلی کے اپنے عیوب بھی تھے مثلاً رشوت ستانی، انحطاط، ظلمت پسندی، لاحاصل سازشیں اور بلاشبہ معاشی استحصال اور غربت۔ لیکن یہ اُس معاشرتی اور ثقافتی نظام کا ایک جزو تھے جو انفرادی ردِّ عمل اور رویّے کے لیے لنگر گاہ کا کام دیتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے عہد میں اس نظام کی باقاعدہ شکست و ریخت عمل میں آئی اور یہ غالب کے لیے مقدّر تھا کہ وہ اس کے مشاہدے کے لیے زندہ رہیں۔

○●○

☆ نشستوں کا نقشہ مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعرا کے رتبے کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بنایا جاتا تھا۔ ناگزیر طور پر یہ کام کافی پیچیدہ اور جھگڑے کا تھا۔

یوسف میخائلوچ ارانسکی

ترجمہ: اُسامہ فاروقی

حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان (وسط ایشیا) ماسکو ۱۹۷۰ء

حصاری پریا لوگوں کی زبان، ہند آریائی زبانوں کے وسطی زمرے کی ایک بولی

(قسط: ۵)

شخصی ضمائرِ اضافی

زبانِ پریا کے شخصی ضمائرِ اضافی سندھی، پنجابی، اور لہندا کے ان ضمائر سے مختلف ہیں اور اس کے برعکس ہندستانی، نیپالی، گجراتی، راجستھانی اور بالخصوص موخر الذکر کی مختلف بولیوں کے متعلقہ ضمائر سے مماثلت رکھتے ہیں (دیکھیے جدول ۳)

جدول ۳

شخصی ضمائرِ اضافی (مذکر)

عدد / صیغہ	زبان	زبانِ پریا	ہندستانی	پنجابی	لہندا	راجستھانی (میواڑی)	گجراتی	سندھی	نیپالی
واحد	متکلم	مُرو muro	میرا mērā	میرا merā	میرا mērā	میرو mērō	مارو māro	مُوںجو mūh-jo	میرو mero
	حاضر	تُرو turo	تیرا tērā	تیرا tērā	تیرا tērā	تیرو tērō	تارو tāro	تُوںجو tuh-jo	تیرو tero
جمع	متکلم	مارو maro	☆☆ ہمارا hamārā	ساڈا sāḍā	ساڈا sāḍā	مھارو mhārō	امارو amāro	اساںجو asā̃-jo	ہامرو hamro
	حاضر	تارو tāro	☆☆ تمھارا tumhārā	تہاڈا tuhāḍā	تساڈا tusāḍā	تھارو thārō	تمارو tamāro	توہاںجو tavhā̃-jo	تمرو timro

☆☆ موازنہ کیجیے بانگرو بولی کی اشکال mhara, thara سے

زبانِ پریا کے شخصی ضمائرِ اضافی اس لفظ کے قبل بھی استعمال میں آسکتے ہیں جس کی وہ توصیف کرتے ہیں اور اس کے بعد بھی۔

شخصی ضمائرِ اضافی واحد متکلم

الف جنسِ مذکر۔ muro / -muro مُرو، muro kurta مُرو کُرتا (میرا کرتا)۔ muro poṭo مُرو پوٹو (میرا پوتا)۔ aba -muro آبا مُرو (میرا باپ)۔ pai -muro پائی مُرو (میرا بھائی)۔ (میرا چھوٹا بھائی)۔

دان مُرو ڈکھائی dan -muro dukʰ ai (میرا دانت دکھ رہا ہے)۔

غیر فاعلی شکل : m(a)re - m(a)re / mire / -mire mire sinya -ta habaš mar saṭai مرے سیّاں تا حبش مارسٹائی (میرے مالک کو حبشی مار ڈالے گا)۔ ägär mre guna -ta langá me keke اگر میرے گُناتا لنگاے کے کے دو دام duvã(m) (اگر تو میرا گناہ / قصور / معاف کرے تو میں / سب صاف صاف کہہ دوں گا)۔ m(a)re jag-ta sat مرے جاگ تاسٹ (میرا بستر بچھا)۔ ti -pa -ta de mare beṭa -ta تی پے تا دے مرے بیٹاتا (اپنی بیٹی میرے بیٹے کو / بیاہ / دے)

ب) جنسِ مونث : miri / -miri / -m(a)ri فلاں توڑائی ما falan toṛai -ma miri peṇ cʰe میری پینٹر چھے (فلاں جنگل میں میری چھوٹی بہن ہے)۔ ji -mari kár-a kam karái جی مری کرا کام کرائی (میری ماں گھر میں کام کرتی ہے)۔ ran -miri... gã -ta ničovai رن میری گاں تا نچووائی (میری بیوی گائے دودھ رہی ہے)۔ miri peṇ najor giyo میری پینٹر ناجور گیو (میری چھوٹی بہن بیمار پڑ گئی)۔

غیر فاعلی شکل : mire / -mire / mere / -mere / -muri مِرے ، میرے ، مُری mire ayi-na مِرے رن نا جاگ بچایو ran -(n)a jag bačayo (میری بیوی نے بیٹھنے کی جگہ تیار کی / بستر بچھایا) das jatak jaṛyo مرے آئی نا دس جاتک جڑیو (میری ماں نے دس بچے پیدا کیے / جنے) oda pe(n) -muri -ke اودے پینٹر مُری کے کر kar (یہ میری چھوٹی بہن کا گھر ہے)۔

ت) جمع جنسِ مشترک : mare / -mare / mire / -mire ye jatak mare apre cʰi یے جاتک مرے اپرے چھی (یہ بچے میرے اپنے ہیں)۔ mire jatak parya či مرے جاتک پریا چھی (میرے بچے پریا ہیں)۔ bityaxel -mire aye بیٹا خیل مرے آیے (میری بیٹیاں آئیں)۔

غیر فاعلی شکل : mare e, ustâ, mare šax-ta polâd kar اے اُستا، مرے شاخ تا پولاد کر (اے استاد / لوہار / میرے سینگھ فولاد کے بنا دے)۔ ya mare nazrun -tal -a erzayiltaná malum howai یا مرے نظرُن تلا عزرائیل تنا مالوم ہوائی (یہ میری نظروں / آنکھوں / کے سامنے عزرائیل دکھائی دے رہا ہے)۔

شخصی ضمیر اضافی واحد حاضر

الف) جنسِ مذکر : t(u)ro / tero / -turo turo na kai ? تُرو نا کائی؟ (تیرا نام کیا ہے؟)۔ ya susro-turo یا سُسرو تُرو (یہ تیرا سسر ہے)۔ turo hat duk giyo تُرو ہات ڈک گیو (تیرا ہاتھ دکھ رہا ہے)۔ ya ami turo اُس تا پائی ترو لے کے اووا us-ta pai -turo leke ova (تیرا بھیّا اُسے / بلبل ... لے کے آوے)۔ bajo lagâi یا آمی ترو باجو لگائی (یہ آدمی تیرا ساڑھو / ہم زلف / لگتا ہے)۔

ب) جنسِ مونث : t(a)ri / -t(i)ri آئی تری پاشا کی کنیزی ayi -tari pâšâ -ki kaniz -i (تیری ماں بادشاہ کی کنیز ہے)۔ ya ti -tari, ya ran -tari ya sasu -tari یا تی تری، یا رن تری، یا ساسو تری (یہ

تیری تیل ہے۔ یہ تیری بیوی ہے۔ یہ تیری ساس ہے)۔ tā-ta ji tari balovai تا تا جی تری بلووائی (تجھے تیری ماں بلاتی ہے)۔ آئی تری کوئی ayi -tri kūī? (تیری ماں کون ہے؟)۔ var -tiri وار تیری (تیری باڑی)۔

نث واحد مشترک کی غیر فاعلی اشکال: t(ə)re ترے (اس لفظ سے قبل جس کی یہ ضمیر اضافی توصیف کرتا ہے)، -tare ترے (اس لفظ کے بعد جس کی یہ ضمیر اضافی توصیف کرتا ہے اور جس کے ساتھ جار موخر استعمال نہیں ہوتا)، تُر، تر، ترے، تری -tur- / -tare- / -tra- / -tri- (اس لفظ کے، جس کی یہ ضمائر اضافی توصیف کرتے ہیں اور جار موخر کے درمیان)، ō tere kâm -ta tuira karái او ترے کام تا تُرے کرائی (وہ تیرا کام کردے گی / تیری خواہش پوری کردے گی)۔ du su mal-tare mija raki fazara. دو سو مال ترے می جا رکی (میں تیرے دو سو مویشی چراتا تھا)۔ ta-ta pilan kar-tare keta dūvái تا تا پِلان کر ترے کیتا دوں وائی (کل تیرے گھر کے لیے قطعہ، زمین / پلان منظور کرکے / تجھے دیں گے)۔ aba -tar -na hič apre xudai -ta na-dineo ابا تر نا ہچ اپرے خُدائی تا نہ دِنے او (تیرے باپ نے کبھی خیرات نہیں دی)۔ da -tar -ko (aka -tur -ko) na kai ? دا تر کو (آکا تر کو) ناکائی؟ (تیرے بڑے بھائی کا نام کیا ہے؟)۔ ayi -tra -ki nâ kai آئی ترے کی ناکائی؟ (تیری ماں کا نام کیا ہے؟) pe(n) -tri -ki na k... پین تری کی ناکائی؟ (تیری چھوٹی بہن کا نام کیا ہے؟)۔

ش) عدد جمع -t(ə)re، آ؟ beta - tare ran mangin بیٹا ترے رن مانگین چھین (تیرے بیٹے بیویاں مانگتے ہیں / شادی کرنا چاہتے ہیں)؟ jaták -maták -tre xub -jur či ? جتاک متاک ترے خوب جوڑ چی؟ (تیرے جانور موٹے تازے ہیں؟)۔

فقص ضمیر اضافی جمع متکلم جنس مشترک maro / -maro مارو، maro pâšâ nâdân -i مارو پاشا نادان ای (ہمارا بادشاہ نادان / نا سمجھ / ہے)۔ maro bazar hor rayon -ko bazar -mta bakar -i مارو بازار ہور رایون کو بازار متا بکار ای (ہمارا بازار دوسرے علاقوں کے بازاروں سے بہتر ہے)۔ maro kalxos bot paxta bijai مارو کلخوز بوت پختا بجائی (ہمارا کلخوز / اجتماعی کھیت / بہت کپاس بوتا ہے)۔ ebe abá -maró juvab dövi ہے آبا مارو جواب دووا (اب ہمارے صاحب / ہمیں جانے دیں)۔ tu pai -maro تو پائی مارو (تمہارا بھائی ہے)۔

غیر فاعلی شکل mare / -mare مارے، mare qala -ma ya kur gâl -i مارے قلعہ ما یا کُر گال ای۔ (ہمارے محلے میں اس طرح کی گفتگو ہے...)۔ tam mare bore -ta ni-pəšantō(u?)? تم مارے بورے تا نی پشانتو؟ (تم ہمارے سربراہ کو نہیں پہچانتے؟ / جانتے؟)۔ mare kar-a sutó مارے کرا سُتو (وہ / ہمارے گھر میں سو رہا تھا)۔ pai -mare -ko hat -ə -so sargi پائی مارے کو ہاتا سو سَرگی (میرے چھوٹے بھائی کا ہاتھ جل گیا)۔ abo. -mare -na mare -la ka vasiyat kare čo? ابو مارے نا مارے لا کا وصیّت کرے چو (ہمارے باپ نے ہمارے لیے کیا وصیت کی؟)۔

عدد جمع -mare مارے، pandya -mare saré pij ge پاندیا مارے سارے پیج گے (ہمارے کپڑے سارے بھیگ گئے)۔

مخصوص ضمیر اضافی جمع حاضر جنس مشترک taro / -taro : تارو taro kalxoz lal bairaq tarai تارو کلخوز لال بیرق ترائی (تمہارا کلخوز / پنچایتی کھیت / سرخ پرچم کا حامل ہے) ۔ is kâm -nala kam -taro na -va اس نالا کام تارو ناوا (اس کام سے تمہارا کوئی مطلب نہیں ہے) ۔

غیر فاعلی شکل tare / -tare : تارے tare šahar -ma kino che ? تارے شہر ما کنو چھے ؟ (تمہارے شہر میں سنیما گھر ہے ؟) ۔ pai -tare -ke hat -(t)a jor karuĩ پائی تارے کے ہات تا جوڑ کروں ای (تمہارے چھوٹے بھائی کا ہاتھ اچھا کر دوں گا) ۔

ضمائر استفہامی و موصولہ

زبانِ پریا کے ضمائر استفہامی و موصولہ ہندستانی اور دیگر ہم رشتہ زبانوں مثلاً پنجابی میں پائی جانے والی اشکال سے ..ن مماثلت رکھتے ہیں (دیکھیے جدول ۵) ۔

ضمیر استفہامی kõ(n)? کون (کون ؟) : kani, kurro -ta kõ leke -leke javai کانی کُرّو تا کوں لے کے لے کے جاوائی (اچھا تو گھوڑوں کو کون لے کر جاتا ہے ؟) ۔ tu kõ(n) -i تو کوں ای ؟ (تو کون ہے) ۔ ya kõ ay یا کوں آیو (یہ کون آیا ؟) ۔

غیر فاعلی اشکال کی ساق kis -(kis) کِس ، کِز : tu kis -ki bityai ? تو کِس کی بٹیا ای (تو کس کی بیٹی ہے ؟) ۔ tu kis -ko poto lagái تو کِس کو پوتو لگائی ؟ (تو کس کا پوتا لگتا ہے ؟) ۔ is kai -ta kis -na kiyo ? اس کائی تا کس نا کیو ؟ (اس کہانی کو کس نے کہا ؟ / یہ کہانی کس نے سنائی ؟) ۔ ya kitab kis -koĩ ? یا کتاب کس کوائی ؟ (یہ کتاب کس کی ہے ؟) ۔ heč kis -ta na-dekʰo ہیچ کِس تا نہ دیکھو (اُس نے / کسی کو نہیں دیکھا) ۔ kis -na kari کِس نا کری ؟ (/ یہ / کس نے کیا ؟) ۔

جدول : ۵

ضمائر استفہامی و موصولہ

نمبر	شکل	زبانِ پریا	ہندوستانی	پنجابی
کون ؟	فاعلی شکل	kõ(n), kuṇ کوں، کون	کون Kaun	Kauṇ کونڑ
	غیر فاعلی اشکال کی ساق	Kis کِس	Kis- کِس	Kis-, Kih- کِس، کِہ
کیا ؟	فاعلی شکل	Ka کا	Kya کیا	Ki کی
	غیر فاعلی اشکال کی ساق		Kis- کِس	Kās-, Kāh- کاس، کاہ
	فاعلی شکل	Jo جو	Jo جو	Jo جو
	غیر فاعلی اشکال کی ساق	Jis- جِس	Jis- جِس	Jis-, Jih- جِس، جِہ

ضمیر استفہامی ka? کا ؟ (کیا ؟) : ya kai ? یا کا ای ؟ (یہ کیا ہے ؟) ۔ is -ke gal -a -sa ka ĉʰo ? اس کے گلاسے کا چھو ؟ (اس کے تن پر کیا ہے ؟) ۔ ya ka sâz -i ? یا کا سازای (یہ کیا طریقہ ہے ؟) ۔ ka gal ? کا گال ؟ (کیا بات ہے ؟) ۔ ya ka rang auqât -i یا کا رنگ اوقات ای ؟ (یہ کیسا / کس قسم کا / کھاتا ہے ؟) ۔ k-ayo ? کا یو ؟ (کیا ہوا ؟) ۔ taja ka lege čo ? تجا کا لے گے چو ؟ (تو کیا لے جارہا تھا ؟) ۔ is- anmi -na ka kiyo ? اس آنمی نا کا کیو ؟ (ان آدمیوں نے کیا کہا ؟) ۔ ka kâm karii či ? کا کام کرن چی ؟ (/ وہ / کیا کام کرتے ہیں ؟) ۔

جیسا کہ اوپر دی گئی مثالوں سے ظاہر ہے ضمیر استفہامی کی شکل ka ? (کا ؟) میں کوئی تبدیلی نہیں آتی خواہ جملے میں اس کی حیثیت فاعل کی ہو یا مفعولِ اول کی۔

ضمیر موصولہ ju جُو (جو۔ جیسے) ju kur ke ... جو کُر کے ۔ ۔ ۔ (جیسے بھی) : ju kur ke juwab dúvai, déto ja جُو کُر کے جُواب دو وائی دے تو جا ۔ ۔ ۔ (جیسے بھی / تو انھیں / رخصت کر / بس / رخصت کردے) ۔

غیر فاعلی اشکال کی ساق -jis جس : jis -na ke mari ... جس نا کے ماری ۔ ۔ ۔ (جس نے بھی مارا ۔ ۔ ۔) ۔

ضمیری ماقبل منحصر Pronominal enclitics

زبانِ پریا میں ضمیری ماقبل منحصر واحد غائب و جمع غائب (جنسِ مذکر -sō ، -so سُو، جنسِ مونث -si سی) کی موجودگی اس زبان کو لہندا کی بولیوں (واحد غائب -s س) ، سندھی (واحد غائب -se سے) اور پنجابی کے قریب لاتی ہے۔ دوسری جدید ہند آریائی زبانوں میں ضمیری ماقبل منحصر مستعمل نہیں ہیں۔

ماقبل منحصر اُس لفظ کی فاعلی اشکال کے ساتھ جوڑا جاتا ہے جس کی توصیف کی جارہی ہو۔ جنسِ مذکر کے لیے اس کی شکل -so / -sō / -su سو، سُو ہے اور جنسِ مونث کے لیے -si سی ۔ اس شکل کا انحصار اس لفظ کی جنس پر ہوتا ہے جس کی توصیف کی جارہی ہے :

الف) : جنسِ مذکر -so / -so سو، سُو : beta -so jake, rata sutíyo بیٹا سو جا کے راتا سُتیو (اُس کا بیٹا / پہرہ دینے / جا کے رات کو سو گیا) ۔ boro da -so darke mare kabar -pare na -giyo بوڑو داسو ڈر کے مارے کبر پرے نا گیو (اُس کا بڑا بھائی ڈر کے مارے قبر پر نہیں گیا) ۔ čáča -so samjai, mâma -so samjai, چاچا سو سمجائی، ماما سو سمجائی (اُس / لڑکی / کا چچا جانتا ہے، اُس / لڑکی / کا ماموں جانتا ہے) aba -sō razi vâ, me mi razi ابا سو راضی وا، مے می راضی (اگر / اُس / لڑکی / کا باپ راضی ہوجاتا ہے تو میں بھی راضی ہوں) ۔

ب) : جنسِ مونث -si سی : ran -i -si pâšâ -ke kaniz -i رن ای سی پاشا کے کنیز ی (اس کی بیوی پادشاہ کی کنیز ہے) ۔ ayi -si ayo آی سی آیو (اس کی ماں آئی) ۔ hadi -si -hi na -ri ہڑی سی ہی نا ری (ہڈیاں تک نہ بچیں) ۔

توصیف کار لفظ یعنی اس لفظ کی جنس اور عدد، جس کی نمائندگی ضمیری ماقبل منحصر کرتا ہے، اس کی شکل پر اثر انداز نہیں

ہوتے۔ موازنہ کیجیے: aba -so آبا سو (اُس / لڑکے / کا باپ) اور aba - sō آبا سو (اُس / لڑکی / کا باپ) ۔aba -so آبا سو (اُن / لڑکوں / کا باپ) اور bit(iy)un -ko aba -so بیٹیُن کو آبا سو (لڑکیوں کا باپ) ۔na -so Xolmahmad نا سو خال محمد (اُس کا نام خال محمد ہے) اور na -so Mairam -i نا سو میرم ای (اُس / عورت / کا نام میرم ہے)۔

زیرِ توصیف لفظ کی غیر فاعلی اشکال کے ساتھ جُڑ کر ضمیری ماقبل منحصر (بلا لحاظ اس کے کہ زیرِ توصیف یا توصیف کار لفظ کی جنس یا عدد کیا ہے) si- / -sə / -se- کی شکل رکھتا ہے: hat -a -se ... yek six 'ɔyo -ko ču ہاتا سے ... یک سیخ لویو کو چُو (اس کے / یعنی حبشی کے / ہاتھ میں ایک لوہے کی سیخ تھی)۔ sat maịnun -ko jatak post -a -se re gio ساتا مَینُن کو جاتک پوستا سے رے گیو (سات مہینے کا بچہ اُس کے پیٹ میں رہ گیا تھا)۔ kar -a -se me giyo کارا سے مے گیو (میں اُس کے گھر گیا) dum -i -se ran -ta bandiyo دُمی سے رَن تا باندیو (عورت کو اُن کی / یعنی گھوڑوں کی / دُموں سے باندھ دیا)۔ beṭa -se -ko na -so kaị ? بیٹا سے کو نا سو کائی؟ (اس کے بیٹے کا نام کیا ہے؟)۔ ran -i -se -ko na -so kaị ? رن ای سے کونا سو کائی؟ (اس بیوی کا نام کیا ہے؟) ۔ranun -se -na avqât pakáyo رَنُن سے نا اوقات پکایو (اُس کی بیویوں نے کھانا پکایا) ۔kale -sə -ta ap -ə -na lino کالے سے تا آپے نا لِنو (اُس کا / یعنی بیل کا / سر / اس نے / خود لیا)۔ dasmal -e -sa -ta munḍe -na lino دسمالے ساتا مُنڈے نالینو (نوجوان نے اس کی دستی / رومال / لی)۔ kis -kẹ aba -ta beṭun -si -na rake čo ? کِس کے ابا تا بیٹن سی نار کے چو؟ (اِنھیں / اپنے باپ / کی قبر / کی رکھوالی / کبھی / اس کے بیٹوں نے کی ہے؟) ۔havli -sə -ma حَولی سے ماں (اُن کی / یعنی ان کی لڑکیوں کی / حویلی / آنگن / میں)۔

اسماءِ عدد

جدول: ۶ سے زبانِ پریا کے نظام اسماءِ عدد کا ہندستانی اور دیگر ہم رشتہ زبانوں کے اسماءِ عدد سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ پہلی دہائی کے اسماءِ عدد بہ حیثیت مجموعی ہندستانی، پنجابی، راجستھانی اور نیپالی کے باہم دگر کافی مشابہ اسماءِ عدد سے مماثلت رکھتے ہیں لیکن سندھی، گجراتی اور لہندا کے اسماءِ عدد سے مختلف ہیں (خاص طور سے اسماءِ عدد "دو" اور "تین")۔ مگر دوسری دہائی کے اسماءِ عدد کا موازنہ کریں تو معلوم ہوگا کہ جہاں ہندستانی، راجستھانی اور نیپالی کافی حد تک پنجابی، لہندا اور سندھی سے مختلف ہیں، زبانِ پریا موخرالذکر زبانوں سے قریب تر ہے۔ دہائیوں کے لیے مستعمل اسماءِ عدد میں "بیس" (۲۰) اور "تری" (۳۰) خاص طور سے لائقِ توجہ ہیں۔ اول الذکر زبان پریا کو ہندستانی اور نیپالی کے قریب لاتا ہے مگر اسے پنجابی، لہندا اور سندھی سے دور لے جاتا ہے، اس کے برعکس موخرالذکر اسے لہندا کے قریب لاتا ہے مگر ہندستانی اور نیپالی سے دور لے جاتا ہے۔ اسماءِ عدد ۴۰، ۶۰، ۸۰، ۱۰۰ اور ان سے ماخوذ دیگر اسماءِ عدد کی تشکیل بیس کی بنیاد پر قائم طریق شمار کے مطابق ہوتی ہے: tin -bisi تین بیسی۔ ۶۰، sare tinbisi ساڑھے تین بیسی۔ ۷۰ وغیرہ۔ مرکب اسماءِ عدد کی تشکیل، ہندستانی اور برِّ صغیر ہندستان کی دوسری قریبی ہم رشتہ زبانوں کے برعکس حسبِ ذیل نہج پر ہوتی ہے: دہائیوں کے لیے مستعمل اسمِ عدد + عطف ماقبل منحصر ti(te) تی (تے) + اکائیوں کے لیے مستعمل اسمِ عدد: bis -ti -at بیس تی آٹ۔ ۲۸، tri -ti -yek تری تی یک۔

وغیرہ۔ (اس کا موازنہ زبانِ تاجک میں مستعمل ملتی جلتی ترکیب bist -u hašt بست و ہشت۔ ۲۸ وغیرہ سے اور شمالی ہی کے ہندستانی الاصل خانہ بدوش جپسیوں کی زبان میں مستعمل biš -te -oxto بش تے اوختو ۲۸ وغیرہ سے کریں)۔ نیز ... اعداد پر مشتمل اسماءِ عدد کی تشکیل بھی اسی نہج پر ہوتی ہے، yek so -ti pandᵊran یک سو تی پندران (ایک سو ...) yek hazor -u nu su -te tri -ti yek یک ہزور و نُو سُو تے تری تی یک (ایک ہزار نو سو اکتیس) وغیرہ۔ ... کہ آخری مثال سے ظاہر ہے حلف ماقبل مختصر ti (te) تی (تے) کی بجائے / ہزار کے عدد کے بعد / ہم معنی تاجک ... -u (و) استعمال کیا جاسکتا ہے)۔ بعض اوقات دوسری دہائی کے اسماءِ عدد کی تشکیل کے لیے بھی اسی تحلیلی ترکیب سے ... ہے، das -ti -yek دس تی یک۔ گیارہ، das -ti -do دس تی دو۔ بارہ وغیرہ yârân, bârân یاران، باران بھی مفرد اسماءِ عدد کے ساتھ ساتھ)۔

اعدادِ ترتیبی اعدادِ مطلق میں تاجک لاحقے -um کی مدد سے تشکیل پاتے ہیں، yek -um یکُم (پہلا) tin -um تِنُم (تیسرا)، čali -te panj -um چالی تے پنجُم (پینتالیسواں) وغیرہ۔

(جدول ۱۰)

اسماءِ عدد

اسماءِ عدد	زبانِ پریا	ہندستانی	پنجابی	لہندا (ملتانی)	سندھی	گجراتی	نیپالی
۱	یک yek	ایک ek	اِکّ ikk	ہیکّ hekk	ہِکو hiku	ایک ek	ایک ek
۲	دو do	دو do	دو do	دوں dū̃	ٻا ba	بے be	دُئی dui
[illegible]	تِن tin	تین tin	تِنّ tinn	ترائے trāe	ٽِ ṭi	ترنڑ tran	تین tin
۴	چَر čar	چار čār	چار čār	چار čār	چار čār	چار čār	چار čār
۵	پنج panj	پانچ pā̃č	پنج panj	پنج panj	پنجا panja	پانچ pā̃č	پانچ pā̃č
۶	[illegible]	چھ čha	چھے čhe	چھے čhe	چھه čhe	چھا čha	چھہ čha
۷	[illegible]	سات sāt	سَت satt	سَتّ satt	سَتا sata	سات sāt	سات sāt
۸	[illegible]	آٹھ āṭh	اَٹھ aṭṭh	اَٹھ aṭṭh	اَٹھا aṭha	آٹھ āṭh	آٹھ āṭh

اعداد	[illegible]	ہندستانی	پنجابی	لہندا (ملتانی)	سندھی	گجراتی	نیپالی
۹	nu نو	nau نو	nau نو	nũ نوں	nav نو	nav نو	nau نو
۱۰	das دس	das دس	das دس	dah ڈاہ	ḍaha ڈاہا	das دس	das دس
۱۱	yārān یاراں	gyārah گیارہ	yārā̃ یاراں	yārhā̃ یارھاں	yārhī̃ یرھیں	agiār اگیار	eghāra اگیارا
۱۲	bārān باراں	bārah بارہ	bārā̃ باراں	bārhā̃ بارھاں	bārahī̃ بارہیں	bār بار	bāhra بہرا
۱۳	terān تراں	terah تیرہ	terā̃ تیراں	terhā̃ تیرھاں	tīrahī̃ تیرہیں	ter تیر	tehra تہرا
۱۴	čaudān چوداں	čaudah چودہ	caudā̃ چوداں	čōdā̃ چوڈاں	cadahī̃ چوڈاہیں	čaud چود	čaudha چودھا
۱۵	pandrān پندراں	pandrah پندرہ	pandarā̃ پندراں	pandhrā̃ پندھراں	pandharahī̃ پندھرہیں	pandar پندر	pandhra پندھرا
۱۶	solān سولاں	solah سولہ	solā̃ سولاں	solhā̃ سولہاں	sorahī̃ سورہیں	sol سول	sorha سورھا
۱۷	satārān ستاراں	satrah سترہ	satārā̃ ستاراں	satārhā̃ ستارھاں	satarahī̃ سترہیں	satar ستر	satra سترا
۱۸	aṭhārān اٹھاراں	aṭhārah اٹھارہ	aṭhāra اٹھاراں	aṭhārā̃ اٹھاراں	aṇarahī̃ ارڑہیں	aṛaḍh اراڈھ	aṭhāra اٹھارا
۱۹	unī انی	unnīs انیس	unnī انی	unvī انوی	ūṇēha اونیھا	ogaṇis اوگنس	unnāis انائس

اسمائے عدد	زبانِ پریا	ہندوستانی	پنجابی	لہندا (ملتانی)	سندھی	گجراتی	نیپالی
۲۰	bis بِس	bīs بیس	vīh ویہ	vīh ویہ	vēha وے ہا	vīs ویس	bīs بیس
۳۰	tri تری	tīs تیس	tīh تیہ	trīh تریہ	ṭēha ٹے ہا	trīs تریس	tīs تیس
۴۰	Čal (l)i چلی، چلّی	cālīs چالیس	Cālī چالی	čāl (h)ī چالی، چالھی	Cālih چالیہ	Čālīs چالیس	Čalīs چالیس
۵۰	Pinjah پنجہ	Pačās پچاس	Panjāh پنجاہ	Panjāh پنجاہ	Panjāh پنجاہ	Pačās پچاس	Pačās پچاس
۶۰	tinbisi ترن بیسی	Sāṭh ساٹھ	Saṭh سٹھ	Saṭṭh سٹھ	Saṭha سٹھا	Sāṭh ساٹھ	Sāṭhī ساٹھی
۷۰	Sare tinbisi سڑے ترن بیسی	Sattar ستّر	Sattar ستّر	Sattar ستّر	Satar ستر	Siter سیتر	Sattari ستری
۸۰	Čarbisi چربیسی	assī اسّی	assī اسّی	assī اسّی	asī اسی	ēsī ایسی	asī آسی
۹۰	Sare Čarbisi سڑے چربیسی	navve نوّے	navve نوے	nivve نوّے	navē نوے	nevū نیوو	nabbe نبّے
۱۰۰	so, sō سو	Sau سو	Saô سو	sô سو	Sau سو	so سو	Sāu سو

ڈاکٹر اختر سلطانہ

اہرام کی کہانی تصویروں کی زبانی

جب آپ دہلی کے "انڈین نیشنل میوزیم" میں داخل ہوں گے تو ممکن ہے آپ کی توجہ اس کی جانب مبذول ہوجائے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ تین سو نایاب نمونوں کو دیکھنے کے لیے سرعت سے آگے بڑھتے ہوئے اسے نظر انداز کردیں ۔ وہ ان نادر نمونوں میں سے ایک ہے جو لندن کے "برٹش میوزیم" سے اس نمائش میں رکھنے کے لیے خاص طور سے ہندستان لائے گئے ۔ جس چیز کا ذکر کیا جارہا ہے وہ "ONIX" کا بنا ہوا زمردی رنگ کا ایک چھوٹا سا تعویذ ہے جو ۱۴۰۰ قبل مسیح میں مصر میں بنایا گیا تھا ۔ جس کی لمبائی بہ مشکل ۳ء۶ سینٹی میٹر ہوگی ۔ اس کی اندرونی جانب قدیم مصری عبارت کندہ ہے جو ماضی کے مصری باشندوں کے بارے میں روشنی ڈالتی ہے ۔ اس تحریر سے ہم قیاس کرسکتے ہیں کہ وہ غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے ان کے تخیل کی اڑان بہت اونچی تھی اور وہ موجد بھی تھے ۔

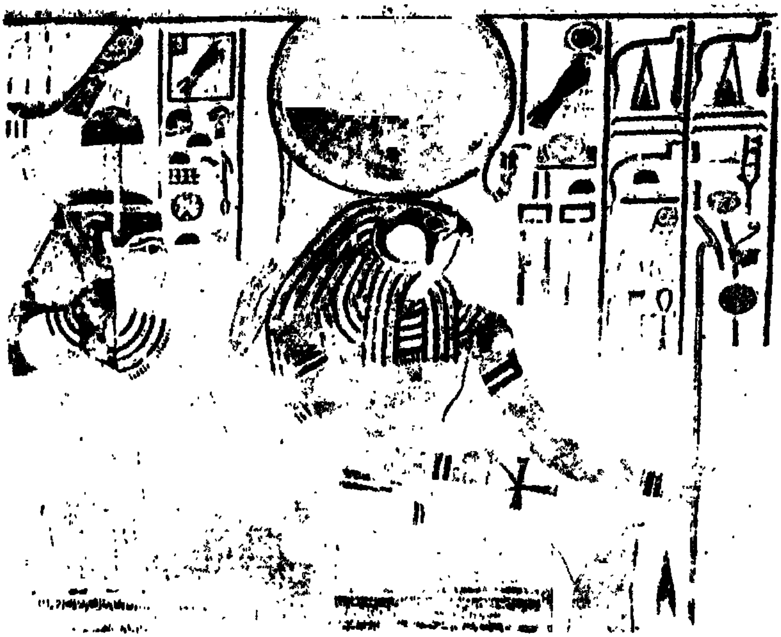
وہ دل کو عقل و فہم کی آماج گاہ اور تمام محسوسات کا مرکز ، اختراعی قوت کا منبع اور یادداشت کا مسکن سمجھتے تھے ۔ جب کسی مردہ شخص کے جسم کی ممی بنائی جاتی تھی تب اس عمل کے دوران دل کے سوا اس کے جسم کے تمام اندرونی اعضا کو دماغ کے ساتھ نکال کر ڈھکن والے نیم قیمتی پتھروں سے بنے ہوئے "JARS" نما ظروف میں محفوظ کردیتے تھے ۔ ان کا ایقان تھا کہ دل ہی وہ عضو ہے جسے عالم بالا کے میزان عدل میں تولا جاتا ہے اور اس کے ذریعے ہی اس بات کا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ مرنے والا جنت میں داخلے کا اہل ہے یا نہیں ۔ ۔ ۔ ؟ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ دل ہی ہے جو اپنے مالک کے کارہائے نمایاں اور اس کے اچھے افعال کے یادوں کے سرمائے کو محفوظ رکھتا ہے جو اس نے اس دنیا میں انجام دیے ۔ شاید اسی لیے وہ متوفی فرد کے دل کے متبادل کے طور پر اس کے ہم وضع تعویذ بناکر اس میں اس کے اچھے اعمال لکھ دیا کرتے تھے ۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوگی کہ اگر مرنے والے کا جسم یا دل کسی وجہ سے ضائع ہوجائے تو اس صورت میں اس شخص کی کارکردگیوں کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں رہے گا ۔ دل کو نیست و نابود ہونے سے بچانے کی خاطر ہی وہ اسے انسانی جسم میں محفوظ رہنے کے لیے چھوڑ دیتے تھے ۔

اس سرزمین پر جہاں سونے کے پتھروں سے مینا کاری کیے ہوئے رنگ بہ رنگی مختلف وضع کے خوش نما نگلیس ، بریسلیٹس اور ایر رنگس کے علاوہ انگلیوں میں پہنی جانے والی خوب صورت انگوٹھیاں صدیوں پہلے بنائی جاتی تھی (یہ آرائشی زیور اس زمانے کے فن کاروں کے شاہ کاروں کی حیثیت رکھتے ہیں) لیکن ان اشیا کو بنانے والوں سے بہت پہلے وہاں ایسے اعلیٰ درجے کے صناع اور کاری گر بھی موجود تھے جنھوں نے دل کی شکل کے یہ تعویذ بنائے تھے جن سے ان کی غیر معمولی فن کارانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے جو ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود آج بھی بے مثال ہیں یہ مختلف دھاتوں اور ہر اقسام کے قیمتی پتھروں سے بنائے اور تراشے گئے ہیں ۔ یہی نہیں دل کی شکل کے بنے ہوئے یہ لاکٹس بلوریں اور سرخ شیشے کے بھی ہیں ۔ جن کی بیرونی سطح مسطح اور

چسپ دار ہے (تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس زمانے کے لوگ شیشہ سازی کے فن سے بھی واقف تھے ۔) جیسا کہ قبل ازیں کہا جاچکا ہے کہ ان تعویذوں میں کندہ تحریریں مرحوم ہستیوں کے جنت میں داخلے کا اجازت نامہ تصور کی جاتی تھیں لیکن یہ تحریریں دنیاوی سرحد سے عدم کی سرزمین میں داخلے کے بارے میں کچھ نہیں بتاتیں ۔ نہ ہی مرنے والے کے بد اعمال کس طرح تولے جاتے تھے اس پر کوئی روشنی ڈالتی ہیں ۔ کسی فرد کی موت کے بعد جنت میں داخلے میں معاونت کے لیے ان تعویذوں کو ان کے مقبروں میں رکھ دیا جاتا تھا ۔ ان کے مقبروں میں لیے "PAPARI" بھی لے لیے ہیں جس میں "موت کی کتاب" کے ابواب تحریر شدہ تھے جنھیں "HIEROGLYPHICS" کہا جاتا ہے ۔ یہی نہیں تمام مذہبی رسوم کی ادائیگی اور دل کو تولنے کے عمل کو وہ "THEBES" کے (سرکنڈوں) سے بنے ہوئے اوراق پر لکھتے یا مقبروں کی اندرونی دیواروں پر پینٹ کر دیتے تھے ۔ اہرام میں ممی بنانے کے عمل کی جو پینٹ شدہ تصویریں ملی ہیں ان میں سب سے مقدس تصور کی جانے والی ایک کاہن خاتون "INHAY" کی تصویر اس طرح اتاری گئی ہے کہ وہ "HORUS" کو دیکھ رہی ہے جو "ISISA" دیوتا کا لڑکا ہے جس کے سر پر عقاب نما نقاب ہے ۔ "INHAY" کا دل نمونے یا نشانی کے طور پر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا ہے اور دوسرے پلڑے میں "MA'AT" ہے ۔ وہاں حق کی دیوی "ANUBIS" بھی ہے ۔ ممی بنانے والی دیوی بھیڑیے کا خود زیب سر کیے ہوئے ہے ۔ اس کی نظریں شاخوں پر ہیں اور "THOT" جو خدا کے کاتب ہیں وہ بہ غور ترازو کا مشاہدہ اس طرح کر رہے ہیں جیسے کہ نتیجے کو قلم بند کرنے کے منتظر ہوں ۔ اس سازی کارروائی کو دیکھنے والا ایک عجیب الخلقت جانور "AMMIT" بھی ہے جس کے جسم کا کچھ حصہ مگرمچھ، کچھ ببر اور باقی دریائی گھوڑے سے مشابہ ہے ۔ اس کی تصویر اس طرح اتاری گئی ہے جیسے وہ دل کو جلدی سے ہڑپ کر جانے کا خواہاں ہو ۔ تمام دیویوں اور دیوتاؤں کے جسم انسانی شکل کے ہیں جن کے سر مختلف جانوروں کے نقابوں سے ڈھکے ہوئے ہیں ۔ ان کو انھوں نے جن جانوروں کے خول زیب سر کیے ہوئے دکھایا ہے ۔ ان کے خیال کے مطابق وہ ان ہی جانوروں اور پرندوں کی شکل میں پہلے پہل اس دنیا میں وارد ہوئے تھے ۔

نہ نہیں موجود مصری ڈھنگ کو دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح کے یہ قدیم مصری باشندے جو دریائے نیل کے کناروں پر آباد تھے، اپنی زندگی کا زیادہ وقت موت کے بعد کی زندگی کی تیاری میں صرف کردیتے تھے کیوں کہ اس زندگی کی ان کے پاس بہت زیادہ اہمیت تھی ۔ وہاں بنائی گئی ممیاں، ان کے تابوت، ان کے تراشے ہوئے سنگی بت اور ان کی پینٹ کی ہوئی تصویریں اور دوسری قدیم اشیا اور کہنہ باقیات جنھیں نہ صرف بہت مہارت سے بنایا گیا بلکہ انھیں اچھی طرح محفوظ بھی رکھا گیا ۔ ان اشیا کی اچھی حالت میں باقی رہ جانے کی ایک وجہ شمال مشرقی افریقہ کی خشک آب و ہوا بھی کہی جاسکتی ہے ۔ وہاں کے مقبروں سے حاصل شدہ چیزیں اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ قدیم زمانے کے یہ لوگ ہر چیز کا بہ غور مطالعہ اور مشاہدہ کرنے کے عادی تھے ۔

ممی بناتے وقت خاص طور سے اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ اسے اس شخص کے ہم شبیہ بنایا جائے جیسا کہ وہ اپنی زندگی میں تھا ۔ وہ بہت بڑے بڑے سنگی بت بھی بناکر ان کے سامنے اشیائے خورد و نوش کو بہ طور نذر رکھ چھوڑتے تھے ۔ عظیم الجثہ ہنر کا بنانا ان کے لیے اس لیے آسان تھا کیوں کہ وہ انسانی جسم کے بارے میں بہ خوبی علم رکھتے تھے ۔ اس کا ایک سبب ممی بنانے کے فن میں ان کی مہارت بھی کہی جاسکتی ہے ۔ جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ وہ ممی بناکر جسم کو محفوظ کرنے سے پہلے جسم کے تمام اندرونی اعضاء رئیسہ کو باہر نکال دیتے تھے ۔ دماغ کو ناک کے راستے سے باہر نکالا جاتا تھا ۔ شاید اسی لیے وہ مکمل شکل میں کہیں بھی دکھایا نہیں گیا ہے ۔ جگر، پھیپھڑے، معدہ اور آنتوں وغیرہ کو نکال کر انھیں چار مرتبانوں میں محفوظ کر کے مقبرہ



اس دیواری تصویر میں RE - HARAKHTI کو مجسم انسانی شکل میں اتارا گیا ہے۔ وہ عقاب نما نقاب پہنے ہوئے ہے۔ اس نقاب کے اوپر قرص نما سورج کی سی علامت ہے جو HORUS دیوتا کا علامتی نشان تھا۔ اس کے عقب میں دیوی HATHOR کو بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے جو محبت اور شادمانی کی دیوی خیال کی جاتی تھی



اخناتن (AKHEN - ATON) کی جانشین توتن خامن TOUTAN - KHAMON اور
اس کی ملکہ کی ایک شاہانہ شان دار تصویر

میں رکھ دیا جاتا تھا ۔ یہ ظروف پتھر ، لکڑی چینی یا روغنی چکنی مٹی سے بنائے جاتے تھے ۔ ان مرتبانوں پر انسانی سروں سے مشابہ ڈھکن لگائے جاتے تھے ۔ ان چاروں برتنوں کے اجتماع کو مصری آثار قدیمہ کے ایک ماہر نے "PILOT OF MENELOVS" کا نام دیا تھا ۔ اکثر ڈھکنوں پر "HORUS" کے لڑکوں کی سی صورتیں بنائی گئی ہیں ۔ شاید ان کا فرض یہ تھا کہ وہ ان میں موجود اعضا کی حفاظت کریں ۔ جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے یہاں کے باشندے جن کی ساری توجہ موت کے بعد کی زندگی پر مرکوز ہوا کرتی تھی ۔ ان کے لیے مرنے والے کا جسم اس کا تابوت اور اس کی تدفین سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میت کی حفاظت ان کے پیش نظر نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ اس کو محفوظ کرنے کے جتن صرف اس لیے کرتے تھے کہ جب روح دوبارہ نئی زندگی پائے گی تو مرنے والے کا جسم اور اس کا مقبرہ اس کا مسکن ہوگا ۔ وہ تابوت مستطیلی شکل کے بناتے تھے اور ان کو جن کمروں میں رکھا جاتا تھا وہ بھی مستطیلی وضع کے ہی ہوتے تھے مقبروں اور تابوتوں کی اندرونی جانب قصداً ایسی تصویریں بنائی جاتی تھیں جو مذہبی مصوری سے مشابہت رکھتی ہوں ، جن سے ان کے اس عقیدے کا اظہار ہوتا ہے کہ مردہ جسم ضرور دوبارہ زندگی پائے گا ۔

مرنے والے کے لیے ان کے جذبات و احساسات یہ ہوتے تھے کہ وہ مرنے کے بعد دیوتاؤں کے سے اونچے درجے پر فائز ہوگا اور اسے دائمی زندگی بھی ملے گی ۔ اس کی امتیازی خصوصیات کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا تھا جیسے کہ اس کی خوبیاں "OSIRIS" دیوتا سے مشابہت رکھتی ہوں ۔ اگر تابوت مرد کا ہوتا تو اس کے ہاتھ سینے پر کراس کی طرح رکھے ہوتے اور اس کے چہرے کے نیچے لٹکی ہوئی گھنگھریالے بالوں کی داڑھی بنائی جاتی تھی ۔ ایسی شبیہ جس تابوت پر ہی ہوتی وہ کسی اعلیٰ درجے کی شخصیت کے حامل شخص کا تابوت تصور کیا جاتا تھا ۔ اگر میت کسی خوب صورت عورت کی ہوتی تو مرنے والی کے ہاتھ بھی سینے پر بندھے ہوتے البتہ انگلیوں کو چھاتیوں کے نیچے کی جانب بڑی نزاکت کے ساتھ اس طرح رکھا جاتا تھا کہ کفن کی پٹیوں میں لپٹے ہونے کے باوجود وہ واضح انداز میں نظر آئیں ۔ اس انداز میں رکھے ہوئے ہاتھ مرنے والی کی خوب صورتی کا ثبوت فراہم کرتے تھے ۔ آنکھوں کی تصویرکشی کرنے میں بھی وہاں کے مصور اپنی فن کاری کے پورے جوہر صرف کردیے تھے ۔ وہ آنکھوں کے اطراف کاجل کی لکیریں بھی بڑی مہارت سے بناتے تھے ۔"HENUTMEHYT" جو "AMON" کی مغنیہ تھی اس کے تابوت کے مشاہدے سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ اگر مرنے والا کوئی امیرزادہ یا اعلیٰ خاندان کا فرد ہوتا تو اس صورت میں وہ قابلِ پرستش سمجھا جاتا تھا ۔

یہ بھی قیاس کیا گیا ہے کہ مرنے والے کے ساتھ اس کے ملازمین کو بھی اس کے مقبرے میں دفنا دیا جاتا ہوگا تاکہ وہ جب دوبارہ زندگی پائے تو اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مرنے والے کو ہر ممکنہ سہولت بہم پہنچانے کی کوشش کرتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ اسے آنے والی زندگی میں زرعی ملازمین ، روٹی بنانے والے خادموں اور کشتی کھے کر دریائے نیل کے اس پار لے جانے والے ملاحوں کی ضرورت ہوگی ۔ ایسے کئی چھوٹے سے نما تصویریں بھی مقبروں میں ملی ہیں جو ہوسکتا ہے ملازمین کے متبادل کے طور پر بنائی گئی ہوں ۔ ان خدمت گاروں کو جب آواز دے کر طلب کیا جاتا تو وہ جواب میں کہتے "USHBTI" جس کا مطلب تھا " حاضر ہوں "SHABTIS" " جناب " اس کے بعد وہ مالک کا نام لیتے تھے ۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۰۵۰ اور ۱۰۶۰ ق ۔ کے درمیان ہر تدفین کے وقت ملازمین کو دفن کرنے کی تعداد میں ایک دو کا اضافہ ہی ہوا ہے ۴۰۱ سے پہلی صدی قبل مسیح میں سال کے ہر دن کے حساب سے یعنی ۳۶۵ ملازمین اور ۳۶ نگران کاروں کی تدفین عمل میں آئی ہوگی ۔

وہ تمام اشیا جن کی انسان کو زندگی میں ضرورت ہوتی ہے مرنے کے بعد ان کے مقبروں میں رکھ دی جاتی تھیں ۔ اہرام میں ایسی تصویریں بھی ملی ہیں جیسے بادشاہوں اور امرا کو کھانا اور شراب پیش کی جارہی ہو (بادشاہوں کے پیر دریائے نیل کے پانی

سے دھلوائے اور کپڑے تبدیل کروائے جارہے ہیں ۔ مقبروں میں کھانے پینے کی چیزیں بھی وافر مقدار میں رکھ دی جاتی تھیں ۔ نمائش میں جو تصویریں رکھی گئی ہیں اس میں روٹی بنانے کے دو مرحلوں کی عکاسی کی گئی ہے ۔ ایک تو آٹا گوندھتے ہوئے اور دوسرے روٹی پکانے کے لیے آگ جلاتے ہوئے ۔ اسی طرح ماڈل کشتیوں کے ذریعے میت کے تابوت کو مقدس شہر "ABYDOS" کو لے جاتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے ۔ ایک مغنیہ جو رباب بجارہی ہے اس کے پینٹ شدہ چوبی مجسمے کو مدفن کے قریب کھڑے ہوئے دکھایا گیا ہے ۔ شاید اس کی موجودگی وہاں ضروری خیال کی جاتی تھی ۔ اس سے یہ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ ان کے پاس رقص اور موسیقی کو بھی خاص اہمیت کی حامل چیزیں سمجھا جاتا تھا ۔ موسیقی چوں کہ جنسی جذبات کو ابھارنے میں معاون ہوتی ہے ۔ اس کی وہاں موجودگی محض اتفاقیہ نہیں کہی جاسکتی ۔ یقیناً وہ مطربہ رومانی اور عشقیہ گیت گاتی ہوگی ۔ اس کا مجسمہ برہنہ ہے وہ صرف ایک گلوبند زیب تن کیے ہوئے ہے اور اس کے پیروں میں پازیب ہیں ۔ اگر اس کے کولھے بھرے بھرے دکھائے گئے ہوں اور اس کے سینے کو زیادہ ابھار کر پیش کیا گیا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ موت کے بعد کی زندگی میں بھی وہ مرنے والے کی جنسی زندگی میں اس کی معاون و مددگار ہوگی ۔

چند مقبروں میں اعلیٰ درجے کے کاہنوں اور انتظامی شخصیتوں کے مجسمے بھی رکھے ہوئے ملے ہیں ۔ صاحبِ حیثیت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جانے والی ان شخصیتوں کے مجسمے نہایت عمدگی سے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ وہ صناعی اور سنگ تراشی کے بہترین شاہ کار کہے جاسکتے ہیں "TJETI" کے مجسمے کی جو چوبی شبیہ بنائی گئی ہے اس میں اس کے مسلسل اور دیگر جسمانی خصوصیات کی غیر معمولی فن کارانہ انداز سے وضاحت کی گئی ہے ۔ اس کی آنکھیں سنگ سیلو کی ہیں لیکن کانچ یا "BRONZE" کے مشابہ دکھائی دیتی ہیں ۔ "LADY NEFRET ' ITI" کا مجسمہ نسوانی خوب صورتی کے پورے اوصاف سے مزین ہے ۔ وہ جس کرسی پر متمکن ہے اسے اس انداز سے پینٹ کیا گیا ہے جیسے کہ وہ سرخ گرانائیٹ سے بنائی گئی ہو ۔ گرانائیٹ سنگ سیلو کی بہ نسبت بہت سخت ہوتا ہے جس کا تراشنا کچھ آسان نہیں ۔ صاحبِ حیثیت اور شاہی خاندان کی ہونے کے سبب اس کے چہرے اور گردن کو ہلکے زرد رنگ سے پینٹ کیا گیا ہے ۔ جس کے ذریعے اس کے اور کھلی فضا میں کام کرنے والی مزدور عورتوں کے رنگ میں جو فرق ہوتا ہے اس کو بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے ۔

"KA ' APER" کے مقبرے میں جو مجسمے رکھے ہوئے ملے ہیں یقیناً وہ اس کے گھر کے خدمت گار ہی ہوں گے ۔ اگر "KA" کا مجسمہ کسی مندر یا مقبرے میں رکھا ہوگا تو یہ اسی وقت ہوگا جب کہ اس کی روح کی وہاں موجودگی کو تسلیم کیا گیا ہو ۔ جو نذرانوں کو قبول کرے گی ۔ اس زمانے کے وہ اشخاص جو مالی حیثیت سے خوش حال تھے وہ اس غیبی روحانی طاقت کے لیے قربانیاں دیتے اور نذریں پیش کرتے تھے ۔ بادشاہ اور صاحبِ حیثیت افراد جو مقبروں میں دفن تھے ان کے لیے بھی وہ متواتر قربانیاں دیتے اور ان کے مجسموں کے سامنے اشیاءِ خور و نوش نذر کی صورت میں رکھتے تھے ۔ ان کا اپنا عقیدہ تھا کہ یہ غیبی روحانی طاقتوں کے مالک ہیں اور نذرانوں کو قبول کرتے ہیں ۔ یہ مذہبی رسومات روزانہ ادا کی جاتی تھیں ۔

"AMENHOTEP - III" جو سربراہِ حکومت تھا اس کی شخصیت مثالی حیثیت میں سامنے آتی ہے ۔ اس کا عظیم بت بادشاہوں کے مندر میں استادہ ملا ہے ۔ اگر اس کے سر کو بدن سے الگ کر کے وزن کیا جائے تو وہ ڈیڑھ ٹن کا تو ضرور ہوگا ۔ تصور کیجیے کہ اس کے پورے جسم کا وزن کتنا ہوگا ۔ ۔ ۔ ؟ اس کی جسامت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے دورِ حکومت میں کس حیثیت کا حامل تھا AMENHOTEP کے دورِ حکومت میں فلاح و بہبود کے کام اور استحکام حکومت کے انتظامات بام عروج پر



قدیم مصر کی شاہی حکومت کا ایک شہزادہ RAHOTEPO اور اس کی زوجہ NEFRET کا (ہو بہو زندگی سے بھرپور پورٹریٹ) جسے سنگ سیلو پر پینٹ کیا گیا ہے۔ اس تصویر میں شکل آنکھیں ہمارے سے مشابہ معلوم ہوتی ہیں۔ جب ۱۸۷۱ء میں کھنڈروں (کھدائی کرنے والوں) نے اس پینٹنگ کو دیکھا تھا تو وہ دنگ رہ گئے تھے۔



چرواہے کا آنکس اور ہاتھوں سے اناج نکالنے کے آلے کو تھامے ہوئے "حیات بعد الموت" کا دیوتا ORISIS اس تصویر میں اسے ایک خاص وضع کا شاندار تاج زیب سر کیے ہوئے دکھایا گیا ہے جو اس کی برتر حیثیت کا غماز ہے۔



(ضیافت طعام میں منعقدہ رقص و موسیقی کا ایک منظر) جس میں دو کمسن رقاصہ لڑکیوں کو قدرتی لباس میں رقص کرتے ہوئے پینٹ کیا گیا ہے۔ آلاتِ موسیقی کو تھامی ہوئی لڑکیوں کے سروں پر مخروطی وضع کی عطر سے بھری ہوئی شیشیوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔

[illegible]

تھے ۔ شاہی مردہ گھر کی عمارت میں جو مندر ہے اس کی دیواروں پر شاہی مذہبی رسومات کی ادائیگی اور اسی نوع کی مختلف سلسلہ وار تفصیلات کی پینٹ شدہ کئی تصویریں ملی ہیں ۔

"AMENHOTEP" نے اپنے دورِ حکومت میں ماہر سنگ تراشوں اور مجسمہ سازوں کو حکم دیا تھا کہ وہ ایک ہزار شان دار دیوہیکر ، متناسب ، سنگی مجسمے تراشیں ۔ یہ مجسمے "BLACK BRANO" "DIORITE" اور "BROWN QUARTIZE" میں بنائے گئے ہیں جن کو تراشنے کے لیے غیر معمولی فنی مہارت درکار ہوتی ہے ۔

"AMENHOTEP - III" کے مجسمے کی آنکھوں کی بناوٹ متناسب اور موزوں انداز کی ہے لیکن اس کے دیکھنے کا انداز ایسا ہے جیسے اس کی نظریں نیچے کی طرف ہوں (اس زمانے کے اکثر بادشاہ خود کو خدا تصور کرتے تھے) شاید اس لیے کہ جب ناظر ، پجاری یا عبادت گزار اس کے دیوہیکر مجسمے کے آگے جھکیں تو وہ خود کو کوتاہ قد اور چھوٹا محسوس کریں ۔ وہ نیچے سے جب اس کی جانب دیکھیں تو یہ محسوس کریں کہ وہ ان کی جانب دیکھ رہا ہے (گویا کہ وہ کوئی الوہی طاقت ہے اور پرستش کرنے والے عبادت گزاروں کی دلی تمناؤں و آرزوؤں کو جانتا ہے ان کی دعاؤں کو سنتا ہے اور ان کے نذرانوں کو قبول بھی کرے گا ۔ جس طرح بادشاہوں کو ان کا حکم ماننے والے اور ان کے آگے جھکنے والے درکار ہوتے ہیں ۔ شاید اسی طرح چپ چاپ شاہانہ داستانوں کو دہراتے ہوئے خود کو خدا کا درجہ دینے والے بادشاہوں کے ان عظیم سنگی بتوں کو بھی ان کے آگے جھکنے والوں اور ان کی پرستش کرنے والوں کی ضرورت تھی ۔ ۔ ۔ ؟

ooo

حوالے

1. Ratnattama Sengupta, "Tales From The Tombs" Famina Oct. 1997.
2. "The Marvels of Egypt's Past Life" June 10, 1968.
3. "A Nation Under God Kings" The Epic of Man - Life Magazine.

ooo

(سلسلہ ص : ۴۷ سے)

اقبال مجید ایک اہم افسانہ نگار ہیں ۔ ان کی زبان عمدہ ہے ۔ سیکس کا استعمال ی وہ برموقع اور بے ساختہ کرتے ہیں ۔ زبان کی پختگی اور مسائل کے ذرک نے اس ناولٹ کو ایک امتیازی حیثیت دی ہے ۔ یہ مسلم نقطہ نظر سے لکھا گیا ایک بولڈ ناول ہے ۔

اقبال مجید نئے افسانہ نگاروں سے سینئر ہیں ۔ ادھر افسانے کی بدلتی ہوئی صورتِ حال سے گھبرا کر یا کسی اور وجہ سے ہمارے تمام نئے افسانہ نگار ناول لکھنے لگے ہیں ۔ لیکن ایک آدھ تخلیق کو چھوڑ کر کسی نے بھرپور ناول نہیں لکھا سب کے سب ناولٹ ہیں جو ساخت کے اعتبار سے طویل افسانے کہے جاسکتے ہیں ۔ "کسی دن" بھی ناولٹ کے زمرے میں آتا ہے ۔ اقبال مجید جیسے پختہ قلم کار سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ عصری مسائل پر ایک بھرپور ناول لکھیں گے ۔

ooo

بال سیتا رام مرڈھیکر

ترجمہ: پروفیسر عبدالستار دلوی

جو زندہ ہے ضمیر

بھول جاؤ کیا ہوا
آرزوئیں چھوڑ دو
جو زندہ ہے ضمیر
ڈھونڈ لو خود اپنے اندر موت کو
روز لاکھوں لوگ مرتے ہیں مگر
آخری رسمیں بدلتی ہی نہیں
دھڑکنیں ان کے دلوں کی رک گئیں
ان میں پوشیدہ ہیں لیکن قہقہے
جن کا لفظوں میں بیان ممکن نہیں
قہقہوں کا زیر و بم ہے مستقل
زبان اپنی پرانی بولتے ہیں
اعتماد نو کے ساتھ
پرانی بات کہتے ہیں نئے انداز میں
پرانے ہل چلاتے ہیں کئی کھیتوں میں وہ
کم سے کم اس دفعہ تو بھول جاؤ کیا ہوا
آرزوئیں چھوڑ دو
تم اپنے کان چاہے بند کر لو
مگر نبضیں تو چلتی ہی رہیں گی

○●○

یہی نظام ہے

یہی نظام ہے اک تاریک دنیا کا
کاجل کی ایک بتی ہے تاریکی کے دل میں
اک سیاہ طیارہ
کالی ہواؤں سے گزر کر
جھپٹتا ہے اندھیرے کی طرف
کوئی بھی سگنل نہیں ہے
نہ لال نہ ہرا
کوئی کھو نہیں سکتا ہے
کسی موہوم دنیا میں
میں جہاں بھی جاتا ہوں
خود اپنا ہم سفر ہوتا ہوں میں
میری آنکھیں
ایسی دیواروں سے جا ٹکرائی ہیں

○●○

بال سیتا رام مرڈھیکر

ترجمہ : پروفیسر عبدالستار دلوی

راستہ کہتا ہے

راستہ کہتا ہے
میں اپنے آپ چلتا ہوں
مگر راہی تو کوئی اور ہے
ہوا یہ دعویٰ کرتی ہے
میری آواز میں پتھر چھپے ہیں
کسی صحرا کے اندر
اگا ہے ناریل کا ایک درخت
جو اپنا سر کھجاتا ہے
وہ طیارہ
فضا میں اڑ رہا ہے
تیز رفتاری پہ نازاں
فضا میں اس کی چیخیں گونجتی ہیں
جو یہ کہتی ہیں
ہم نے ان پہاڑوں کو جگایا ہے
شفا خانوں نے کتنی
ہڈیوں کی تہہ لگا کر
بسائی ہے نئی دنیا

پرستش کر کے پتھر کے خدا کی
لوگ اب انسانیت کو پوجتے ہیں
عبادت گاہوں میں ان کی دعاؤں کا
ابھرتا ہے نیا چہرے
دفن تم نے کر دیا ہے پتھروں کو
چٹانوں پہ ہڈیاں بھی دفن کر دو
جو ان کی سرخ رنگت ڈھل چکی
تو خون اپنا
گلے میں پہن لے طوقِ جہالت
جیو اور جینے دو
پائپوں کی دنیا
پائپوں میں رہتی ہے
بہہ رہا ہے ان کے اندر جو رقیق
آدمیوں کی طرح کرتا ہے شور
ہے فضول انسان کا اپنا مفاد
اور بے آواز ساز اقتدار

○●○

[illegible]

ترجمہ: پروفیسر عبدالستار دلوی

میں نے روزی کمائی

میں نے روزی تو کمائی
اور روٹی کے لیے سوچا
بالآخر میں ہوں ناکارہ
خود اپنے واسطے
اب مری آنکھیں رگڑتی ہیں
اندھے پن کے اک نوکیلے تار سے
علم سارا بن گیا ہے جیسے اک اوہامی فصیل
کیا یہ کوئی میز ہے؟ کیا یہ کرسی ہے؟
کیا یہ کوئی مرچ ہے وہ جس سے میری ناک جلتی ہے
اک فریبِ نظر
کہاں مری قسمت پہ خنجر رہے
میں کہ ہوں سائنس کا جید عالم
اور بڑا ہی ایک سادھو ہوں
پھر بھی لیکن بچ نہیں سکتا ہوں میں
زندگی اور موت کے غم سے کبھی

آج میں نے دیکھ لی ہے ایک موت
اور میری روح بھی گھبرا گئی
اب تو میرے علم کی ساری حدیں ہیں
صرف قبرستان تک
آسماں کی جانب اٹھاؤ دوربین
توڑ ڈالو جوہری ذروں کا ڈھیر
کیا ہمیں بھوک لگی ہے؟ ہم فاقے سے ہیں؟
ہم نہیں کچھ جانتے
جب کہ میری ماں مری تھی
ایک بوڑھے نے مجھے دی تھی پناہ
آج میری بیوی اور ہمشیرہ مری
حوصلہ دیتی ہیں جینے کا مجھے
دونوں بھی چل جائیں گی اک دن، اے خدا!
تب یہ اندھا کس طرح
ڈھونڈے گا ان کے نقشِ پا

○●○

بال سیتا رام مرڈھیکر

ترجمہ : پروفیسر عبدالستار دلوی

کوئی تک نہیں

بھلا اس بات کی کیا تک ہے اے میرے خدا
فنا ہو جاؤں تیرے عشق میں
بھلا پروانہ بن سکتا ہے کیسے کاکروچ ؟
جہاں اللہ والے رات دن میں
میں کوئی امید رکھوں کس طرح
میں کہ پیچھے رہ گیا اس دوڑ میں
اور کوشش کر رہا ہوں تجھ کو پالینے کی میں
بس اک موہوم سے جذبے کے ساتھ
اب بھلا میں اس سے زیادہ کیا کہوں ؟
میں کہ اک احمق ہوں واضح طور پر
اور جس کے ذہن میں
یہ تاثر ہے کہ تو ناراض ہے

○●○

وقت کی دستک

وقت نے سر پر مرے
ہولے سے ماری تھی چپت
میں سمجھ بھی نہیں پایا کہ کون
سر پہ تھی اک شعاعِ پُر سکون
اک سمندر میں ہو جیسے
روشنی کا ایک مینارِ بلند
پھر مرے افکار کو گویا جمائی آ گئی
جیسے اک بچہ کسی چلتی ہوئی گاڑی میں ہو
میرے گنجے سر پہ تھی وہ شعاعِ پُر سکوں
بال اک اک کر کے سارے اڑ گئے
ان کو سلجھانے سے بھی کیا فائدہ
لوگ اک اک کر کے کہتے جا رہے ہیں الوداع
اس طرح سے گھولتے رہنا واقعی بے سود ہے

○●○

مصطفیٰ شہاب

استفادہ

سمندر دو طرح کے ہیں
ہوا کا اک سمندر ہے
جو ہر آبی سمندر پر مسلط ہے
مگر آبی سمندر کی
ہر اک مچھلی کے سینے میں
ہوا کی ایک تھیلی ہے
وہ سطحِ آب پر آتی ہے
اس میں سانس بھر کر
ڈوب جاتی ہے
ادھر ہم لوگ پانی کے نکالے ہیں
سمندر میں ہوا کے جی رہے ہیں
ہمارے جسم میں بھی
ایک مشکیزہ ہے پانی کا
کہ جس کو دم بہ دم
ہم بھرتے رہتے ہیں
سمندر بہتے رہتے ہیں

○●○

برین ڈرین (Brain Drain)

ہوا میں شر پسندی ہے
دیوں کو چین سے رہنے نہیں دیتی
تبھی تو سب دیے
اب آسمان میں ٹمٹماتے ہیں
وہیں پر چاند جلتا ہے
ہوا کا زور ٹوٹا
اب ہوا سے کون ڈرتا ہے

○●○

شاداب رضی

حمد

ہے ذات تو
ہے پاک تو
ہے ذات تو ۔ ہے پاک تو
حمد و ثنا
صبح و مسا
کرتی رہی ہے فاختہ
جب تک ہے یہ بزمِ جہاں
اک صوفیانہ جذب میں
اک عارفانہ لحن میں
ہے ذات تو ۔ ہے پاک تو
ہے ذات تو
ہے پاک تو
رٹتی رہے گی فاختہ
خوشس ہو کہ دل بر داشتہ !

○●○

ماٹی کہے کمھار سے

کوزہ گر !

روز و شب رقص کرتے ہوئے چاک پر

گیلی مٹی کا تودہ ہوں میں

تیرا دستِ ہنر

تیرا ذوقِ نظر

جیسی ہئیت مجھے چاہے دے

ہاں مگر ۔ ۔ ۔ تیرا فن بھی

پرکھ کے عمل سے نہیں بالا تر

یاد اتنا رہے ۔ ۔ ۔ کوزہ گر !!

○●○

ڈاکٹر محمد علی اثر

قلبِ ماہیت

○

کالی کالی
ناگ بن کے
سایوں کو جیسے گھیرنے لگیں
دھوپ
سینے میں زخموں کو چھپائے
لمحہ لمحہ
اتر رہی ہے
سایوں کی گود میں

○●○

تلاش

○

چلچلاتی دھوپ میں
اجلی سڑکیں دہک اٹھی ہیں
اونچی اونچی حویلیوں میں لوگ
ہر لحظہ گردش میں
گرم گرم سانسوں کے بستر پر
منزل کی تلاش میں سرگرداں ہیں
وہ منزل . . .
جس کا کوئی نام نہیں

○●○

شہاب اختر

جو میں نے سوچا تھا

میں نے سوچا تھا پہلے
پھر کہا تھا
جو کہا تھا
شاید
وہی سوچا تھا
جو سوچا تھا
وہی کچھ کہا تھا میں نے
جس نے سنا
اسی نے
وہی سمجھا
جو میں نے کہا تھا
لیکن
سننے والے کے لیے
بدل گئی بات
بدل گئی تھی
جو سوچا تھا میں نے
ویسا کچھ بھی نہیں
پہنچا تھا اس تک
○●○

نظم

دل سے ہزار خیال نکلے
جب سے
تمہیں دیکھا ہے
تم سے پہلے
زندگی میں کوئی
چمک نہیں تھی
اب ہاتھ بھی
دعا کو اٹھتے ہیں
اب نماز بھی میں پڑھتا ہوں
تم سے پہلے
میں ایسا نہیں تھا
تم کو دیکھا تو
دست سوال ہوا میں
○●○

خواب

خواب میں
ہے زندگی میری
سب ستاروں کی دمک
آسماں
سورج
چاند
کائنات میری
خواب میں
سب میرا ہے
ڈر نہیں ہاتھوں کا
تیرے یہ کہنے سے
دنیا کیا ہے
وہاں کیا رکھا ہے
خواب میں میرے سب کچھ میرا ہے
○●○

دوہے

بھگوان داس اعجاز

سایہ سر کرنے چلے ۔ ہم ڈوبے منجدھار
پاؤں مرے اس پار تھے ۔ سر میرا اس پار

کہہ دو لے جائیں کہیں ۔ سینے اپنا روپ
دیواروں کو پھاند کر ۔ آنگن آئی دھوپ

کھیت جلے گلشن جلے ۔ مرجھا گئے گلاب
برکھا ہو تو دیکھیے ۔ دھرتی دبا شباب

دھوپ تاپ مچھلی مری ۔ کچھوا دوڑا نیر
آگ لگی آکاش میں ۔ پنچھی ہوئے ادھیر

سپنا سبزہ زار کا ۔ کس بدھ ہو ساکار
چکنے چوری میں گئے ۔ بیل پڑے بیمار

ہر پنّے میں چکر ویوہ ۔ شبد شبد میں راز
اکشر جلی کتاب کے ۔ پھر سے پڑھ اعجاز

کاوش پرتاپ گڑھی

تتلی نے ہم سے کہا ۔ تب آؤں گی ہاتھ
پنکھ لگا کر آئیے ۔ اڑیے میرے ساتھ

پہنوں گا میں کب تلک ۔ گندہ پھٹا لباس
کھل کر بتلاتا نہیں ۔ کوئی دست شناس

گھاٹ گھاٹ کے نیر کا ۔ اپنا اپنا سواد
برے بھلے کا فیصلہ ۔ کون کرے استاد

دنیا کی سب نعمتیں ۔ ہوں تو اس کے پاس
پھر کاہے وہ عمر بھر ۔ اتنا رہا اداس

سر پہ بستر بوریا ۔ بیوی بچے ساتھ
نیا ٹھکانہ ڈھونڈنے ۔ در در بھٹکا رات

الھڑ پیاسی چاتکی ۔ ہے کب سے بے چین
بدرا پر ہیں رات دن ۔ کاوش اس کے نین

ریاست علی تاج

ٮ

یہ کیا ہے شام و سحر اضطرار کی صورت
کوئی سکون کا پہلو ؟ قرار کی صورت !
یہی تو ہیں کہ جنھوں نے ہے آگ بھڑکائی
بنائے بیٹھے ہیں کیا غمگسار کی صورت !
چمک رہے ہیں یہ "داغ" آفتاب کے مانند
کھلے ہیں "زخمِ جگر" لالہ زار کی صورت
غمِ حیات میں ۔ ممکن نہیں کہ مل جائے
گریز کا کوئی پہلو ۔ فرار کی صورت
ہمارے دشتِ تمنا میں پھول کھلتے ہیں ۔
نکھر رہا ہے دل ۔ اب لالہ زار کی صورت
عجیب دور ہے ؟ ! ہر شے کا نام الٹا ہے
خزاں کی شکل میں دیکھی ۔ بہار کی صورت
ہمارے سامنے کتنے عجیب چہرے ہیں !
بہ قیدِ زیست مجسم مزار کی صورت
کوئی کشش ہو تو اے تاج ٹھیر بھی جائیں
نہ دشتِ کرب ۔ نہ محفل ۔ نہ دار کی صورت !

○●○

ٮ

محنت سے محبت سے جو کام نہیں ہوتا
اچھا بھی کوئی اس کا انجام نہیں ہوتا

دنیائے محبت میں ۔ اک بات نرالی ہے
آغاز تو ہوتا ہے انجام نہیں ہوتا

ہر شخص نہیں ہوتا شائستۂ دل جوئی
ہر شخص سزاوارِ اکرام نہیں ہوتا

فیضان ہو دنیا کا عرفاں کہ ہے خاص عطا دونوں
دنیائے محبت میں کچھ عام نہیں ہوتا

کرنا ہوں تو دنیا میں ۔ ہیں کام بہت سارے
شکوہ یہ ہے کہ خود ہم سے کچھ کام نہیں ہوتا

ہر شخص کی ہوتی ہے کب تاج پذیرائی
ہر شخص کے حصے میں انعام نہیں ہوتا

○●○

٥

پہلا عشق کا منظر سامنے تھا
سلسلہ نیند جز سامنے تھا

ہم تو جھٹکے کر کر کے اڑتے تھے
پھر کوئی جنگل نہ منظر سامنے تھا

دفعتاً سب کچھ اڑا کر لے گیا وہ
وہ بچھڑا صرف دم بھر سامنے تھا

قافلے لے کر بڑھے تھے ہم کہ اک دن
ہم سفر دیکھا پلا کر سامنے تھا

جانے بھی گفتگو چلتی رہی تھی
کون جانب تھا جز سامنے تھا

پھر نئی بنیاد کی سوجھی تھی ہم کو
پھر کوئی ویران منظر سامنے تھا

جانے خود زنی تھا شغل اپنا
بے پناہی کا سمندر سامنے تھا

٥٥٥

٥

پہلے کی طرح بیٹھنے کی لذت کہاں ہے
دروازہ کہاں ہے : فرش کہاں ہے چھت کہاں ہے

کیا کھو گئے، چمن کی فصلیں ہیں ٹھہرائی ہوئی
بستی کوئی آبادی کی دولت ہے کہاں

کن جنگلوں کے جنگل میں الجھا رہتا ہوں
کچھ اپنی بھی آواز سنوں ، فرصت ہے کہاں

سنسان مناظر کو جو کچھ و گزار کرے
اس بارشِ ہوسِ موسم میں وہ رنگت ہے کہاں

میں آپ بھی شامل ہوں طوفان کی موجوں میں
اور اپنے آپ کو جھٹکنے کی قدرت ہے کہاں

پھر دیکھو یہی آثار ابھرتے آتے ہیں
اپنے ہاتھوں لٹ جانے کی ساعت ہے کہاں

اک ہاتھ میں تیشہ دوسرے میں روشن مشعل
میں ڈھونڈ رہا ہوں شاہ رگِ عظمت ہے کہاں

٥٥٥

غزلیں

○

کیا گیا دل کو پایا کہاں ہے
وہ پوچھی کہ بتا کہاں ہے

ابھی تک خود کو پایا کہاں ہے
پھر اپنے آپ کو پایا کہاں ہے

تمہیں حیرت ہے جو ہم ہیں کہاں کے
ہمیں حیرت ہے جو پایا کہاں ہے

صدا اپنی ہے سن کے ہو گئیں ہی
کہ سب نے کبھی پایا کہاں ہے

اٹھاتے پاؤں پایا بھی دستہ بھی
جو جانے خود کو پایا کہاں ہے

تمہیں کرنا ہے کرلو ہم کہیں ہو پوچھو
کہاں سے آئے تھے پایا کہاں ہے

اگر یہ سچ ہے تو پوچھا ہے
مگر وہ پیچھے سا پوچھا کہاں ہے

○

ہمارے دل پہ کوئی پہرہ سا ہے
یہ سب کہتے سے لگتے کیا ہے

مرا سر ہر کوئی کیا دیکھتا ہے
کبھی بجھتے ہو تو پھر سے کیا ہے

ہمارے دل میں کیا ستم کیا ہے
کہیں جاتے ہوئے ہی ٹوٹا ہے

برسے بیٹھے ہیں تمہیں کو چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ اٹھا ہی بیٹا ہے

یہ خود کو واسطہ کر کے ملتے آتے ہیں پھر
کر کبھی تو بات کسی کے ہی جیا کیا ہے

کہا ستم نے یہ چاہتے ہم کو
کر یہ اٹھ بی اٹھ کیا ہے

[illegible]
[illegible]

ڈاکٹر محمد علی اثر

○

تنہا [illegible] ہونا پڑے گا
[illegible] ہونا پڑے گا
کسی کو روبرو ہونا پڑے گا
اجالا [illegible] ہونا پڑے گا
[illegible] تیرہ بختی کو مٹانے
منور ہو بہ ہو ہونا پڑے گا
[illegible] پانے کی گر خواہش ہے تجھ کو
مجسم آرزو ہونا پڑے گا
پتہ کیا تھا ہماری رنجشوں کو
کسی دن کو بہ کو ہونا پڑے گا
بھٹک کر اپنے [illegible] فائدہ کیا
بکھر کر چار سو ہونا پڑے گا
[illegible] بنایا تجھ جب آدمی [illegible] کی
[illegible] ہونا پڑے گا
بڑے مضبوط ہیں اپنے عزائم
[illegible] کو سرخ رو ہونا پڑے گا
مہم تحقیق کی یوں سر نہ ہوگی
سراپا جستجو ہونا پڑے گا
غزل کہنا نہیں آسان اتنا
اثر [illegible] کو لہو ہونا پڑے گا

○●○

○

راستے تاریک ہیں اور لمبے بھی
ہیں نمایاں نقش پا دھندلے بھی

اور کی خوشیاں کریں کیوں زیب تن
خواب اپنے ہی تو ہیں میلے بھی

بات میری بھی مگر جھوٹی نہیں
آپ کے احکام سب سچے سہی

منزلیں خود چل کے آئیں گی یہاں
منزلوں سے ہم پلٹ پیچھے سہی

دیکھنے والا کوئی تو ہو یہاں
آپ ہی کے ہر طرف جلوے سہی

اپنے ہاتھوں سے فلک کب دور ہے
قد ہمارے اے اثر چھوٹے سہی

○●○

مصطفیٰ شہاب

○

کچھ تو ایسے ہیں کہ جن سے پھر ملا جاتا نہیں
ایک وہ بھی ہے بنا جس کے رہا جاتا نہیں

ہوتے ہوتے میں پہنچ جاتا ہوں تیرے خواب تک
اس سے ہٹ کر اور کوئی راستا جاتا نہیں

سارا منظر دیکھتا ہے اپنی لو کی آنکھ سے
لیکن اپنی آگ سے آگے دیا جاتا نہیں

ایک جھونکا ۔ ایک کھٹکا ۔ ایک دھوکا اور بس
اس شکستِ آرزو کا سلسلہ جاتا نہیں

کچی لکڑی میں لگی ہو آگ جیسے پیار کی
ہم دھواں تو دے رہے ہیں اور جلا جاتا نہیں

جو بھی ملتا ہے وہ اپنے گھر بلاتا ہے شہاب
میرے گھر شاید کوئی میرے سوا جاتا نہیں

○●○

حسن داؤد خان

○

ہر چند لطفِ نظر سے دامن کشیدہ ہوں
سن لو کہ میں بھی اک غزلِ ناشنیدہ ہوں
اک خار جس کے تھا کبھی پیچیدہ پیرہن
اک پھول ہوں میں اور خزاں آفریدہ ہوں
مرجھا گیا ہوں بہت بود و نابود سے
باغِ جہاں میں غنچۂ شبنم گزیدہ ہوں
بکھرا ہوا ہوں اپنی انا کی تلاش میں
مت ڈھونڈھنا مجھے کہ ابھی چیدہ چیدہ ہوں
مشکل سے جب آسکا ہوں تری جلوہ گاہ تک
دامن ذرا بڑھا کہ بہت آبدیدہ ہوں
تو مثلِ بوئے گل نظر آیا نہ آج تک
میں یادِ تند خو کہ ابھی تک رمیدہ ہوں
رہیئے حسن کسی کی طرف ہو تو بدگماں؟
میں آپ اپنی جو ہوں اپنا قصیدہ ہوں
کانٹے بھی چن لیے ہیں حسن ہم نے گل کے ساتھ
الزام ہم پہ ہے کہ دامن دریدہ ہوں

○●○

[illegible]

○

[illegible] کے جانے کا بڑا چرچا رہا
[illegible] قصیدہ دل کو بہلاتا رہا

کس ادا سے غم کو ٹالتا رہا
زندگی سے جب تک رشتہ رہا

خواہشیں کھل رہیں ، جاگتی رہیں
میں بھری دنیا میں تنہا رہا

زندگی غائب نہ کوئی وقت پر
زندگی بھر وقت سے لڑتا رہا

ایک ہی عالم نظر آیا مجھے
جب تلک میں ہوش میں کھویا رہا

آئینہ خانے میں وہ سنورا کیے
میں تماشے میں صدا دیتا رہا

رنگ لاکر ہی رہی دیوانگی
[illegible] ہی رات بھر میں تنہا رہا

[illegible] غم کا کوئی اندازہ نہ تھا
حسرتوں کی آگ میں جلتا رہا

[illegible] تو کچھ سے ان کے رخصت ہوگئے
[illegible] تک سناٹا نظر آتا رہا

[illegible] میں جہاں نظر وہ آگئے
[illegible] تک منظر مرا سکتا رہا

○○○

○

تنہا میں تنہا ، مگر جہان میں تنہا
صرف تو ہی تو بھرے دنیاں میں تنہا

ایک وہ جہاں میں ، زمین پر جانے
جب ستارہ تنہا ، آسمان میں تنہا

کچھ لیلیٰ میں مجنوں کا بدلہ
میرا دشمن مری امان میں تنہا

کتنی سرحدیں پر ہوگیا سب کھیلا
ایک گھر بھی امتحان میں تنہا

اس کو آیا نہ آئینے پہ یقیں
جانے وہ شخص کس گمان میں تنہا

کس نے چونکا دیا مجھے جاناں
جانے کس گھر کی اڑان میں تنہا

○○○

مسعود صدیقی مسعود

ہر نقش ماسوا کو تو جلوہ بنا کے دیکھ
قطرے کو بحر ذرے کو صحرا بنا کے دیکھ

ہر منظر میں وادیٔ سینا کی وسعتیں
پائے نگاہ کو ید بیضا بنا کے دیکھ

اک رہگزر ہے تیری جبیں نازِ حسن کی
نقشِ کف و نقشِ کفِ پا بنا کے دیکھ

ترکیبِ اسم میں بھی ہے جلوہ اسم کا
ترکیبِ اسم میں تماشا بنا کے دیکھ

ہر وقت دیکھتا ہے اگر ان کو سامنے
خود شوق کو نگاہِ تماشا بنا کے دیکھ

ہے خامشی بجائے خود اک نغمۂ طلب
ہر سانس کو سرودِ تمنا بنا کے دیکھ

قطرے کی موج میں بھی تلاطم ہے بحر کا
کیفِ محال کشف و صحرا بنا کے دیکھ

دل جلوہ گاہِ حسن ہے مسعود عشق سے
ہر داغِ دل کو گل رعنا بنا کے دیکھ

○●○

جمیل احمد

یہ درد وہ ہے کسی کو قبول کوئی نہیں
لہولہان سبھی ہیں رسول کوئی نہیں

گزشتہ دھوپ میں آنکھوں کے سپنے سوکھ گئے
کسی کے واسطے اب کے طول کوئی نہیں

جلوں کی آگ جلوں ہی میں جل بجھی ہے
یہ کیسا قرض ہے جس کا وصول کوئی نہیں

مجھے نہ ڈھونڈ کہ بکھرے خزاں کا موسم ہے
مرے علاوہ ترے پیڑ میں پھول کوئی نہیں

عجیب رت ہے ہوائیں بھی خیمہ زن ہیں جمیل
اڑانے والا بیاباں میں دھول کوئی نہیں

○●○

غلام جیلانی

فریب زار

(قسط : ۶)

(۲۶)

رضیہ کی کار کے ہارن نے رما کی یادوں کی محفل کو درہم برہم کر دیا۔ شام ڈھل چکی تھی۔ مگر اس دھندلکے میں رضیہ نے رما کو دور سے دیکھ لیا تھا۔ کار سے اتر کر سیدھی پہنچ گئی۔ ۔ ۔ "چلو رما۔ ۔ ۔ میں آگئی ہوں۔ ۔ ۔ یہاں اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہو ؟"

رضیہ پرانی دلی کے محلہ بلی ماران میں رہتی تھی۔ پرانی وضع کا شاندار گھر تھا۔ جدید اور قدیم دونوں طرح کے فرنیچر سے آراستہ دیوان خانہ۔ چاروں طرف دالان جن میں شاہ جہانی محرابیں اور در۔ اوپر چوبارا اور ہال۔ اندر کمروں میں چاندنیاں، چاندنیں، اور گاؤ تکیے۔ درمیانی کمرے میں آتش دان، کارنس پر چینی اور مراد آبادی وضع کے زیبائشی برتن۔ ۔ ۔ گھر میں چار بچوں کی موجودگی کے باوجود ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی۔ ۔ ۔ رما نے رضیہ کی تعریف کی تو پھولی نہیں سمائی۔ ۔ ۔ کہنے لگی۔

"تعریف کی حق دار تو ہماری ساس ہیں۔ ۔ ۔ جنھوں نے اس گھر کو سلیقے سے بسایا، سجایا۔ اب وہ نہیں رہیں۔ یہ ذمہ داری میں سنبھال رہی ہوں۔ ۔ ۔ منیر کے پاس پیسے کی کمی نہیں، میرے پاس وقت کی کمی نہیں۔ ۔ ۔ منیر سے تم نہیں ملیں۔ آگرے گئے ہوئے ہیں۔ ۔ ۔ بزنس کے سلسلے میں۔ کسی وجہ سے دیر ہو گئی، ورنہ اب تک واپس آجاتے۔"

"یہ منیر وہی ہیں نا رضیہ، جن سے شادی کے لیے تو کتراتی تھی ؟ کہتی تھی، بڑے سیدھے ہیں۔ ۔ ۔ بچوں کی طرح فرماں بردار۔ ۔ ۔ بالکل۔ ۔ ۔"

"چرچ کے غلام کی طرح۔" رضیہ نے جلدی سے جملہ مکمل کر دیا۔

"ہاں۔ چرچ کے غلام کی طرح۔" اور دونوں کھل کھلا کر ہنسنے لگیں۔ جیسے کالج کے زمانے میں ہنستی تھیں۔

رضیہ نے اپنے بچوں کے بارے میں بتایا، کون کالج میں ہے، اور کون کون اسکولوں میں۔ ان کی ذہانتوں کے قصے سنائے۔ سب سے چھوٹی بچی سے انگلش رہائمس اور پوئمس سنوائیں۔ آخر میں بولی۔ ۔ ۔ "اچھا رما۔ یہ تو ہوا۔ کھانے میں ابھی وقت پڑا ہے۔ تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ۔ ۔ ہماری پچھلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب آنند زندہ تھے۔ تمھارے ڈیڈی کے انتقال کو چند ہی مہینے گذرے تھے۔ اس کے بعد تم لوگ حیدرآباد چلے گئے۔ اور بس۔"

مگر پھر خود ہی اک دم سنجیدہ ہو کر چپ ہو گئی۔ سوچنے لگی، یہ بات نہیں پوچھنی چاہیے تھی۔ آنند کا ذکر رما کے زخموں کو تازہ کر دے گا۔ مگر رما اسی طرح پرسکون رہی۔ بڑے مختصر انداز میں اپنی آگے کی کہانی سنا دی۔ آخر میں بولی۔

"رضیہ۔ لوگ ہمدردی کا اظہار کرتے تھے تو مجھے الجھن سی ہوتی تھی۔ کیا کوئی کسی کا دکھ بانٹ سکتا ہے؟ ... اور میرا دکھ تو ایک امانت ہے، اس پر کیسے ۔۔ زندگی کی جو آنند کے ساتھ گزری۔ حقیقی مسرتوں سے بھرپور زندگی ... جو کسی کسی کو ملتی ہے۔ میں اب بھی خوش ہوں رضیہ۔ خوش اور مطمئن۔" کچھ دیر رما چپ رہی۔ پھر بولی۔ "... اب کچھ دنوں میں نیل کمل بھی امریکہ سے آ رہی ہے، اپنے منگیتر کے ساتھ۔ میں اسے پسند کرلوں تو شادی بھی ہو جائے گی۔۔۔"

رضیہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس وقت بچی نے آکر اعلان کر دیا کہ ... "ابو آگئے۔"

منیر کو رما نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ کہنے لگا ... "رضیہ سے آپ کے بارے میں سنتا رہا ہوں۔ بڑی تعریفیں کرتی ہے آپ کی۔"

"دوست جو ہوئی۔" رما نے جواب دیا ... "ویسے تعریفیں تو آپ کی بھی کرتی رہی ہے رضیہ ..."

رضیہ نے گھبرا کر رما کو دیکھا۔ مگر بات آگے نہ بڑھی۔ منیر اسی میں خوش تھا کہ رضیہ نے اس کی تعریفیں کی تھیں۔ رما کے جملے میں چھپی ہوئی شرارت اس کے پلے ہی نہیں پڑی ... جب چلا گیا تو رضیہ بولی ... "کاٹھ کا الو ... میں نے کہا تھا نا؟"

کھانا سب نے ساتھ کھایا۔ منیر اپنے کاروبار کا حال سناتا رہا۔ جو روز افزوں ترقی پر تھا۔ چمڑے کی ٹیننگ کا ایک نیا کارخانہ قائم کیا تھا، جسے کسی دن ساتھ چل کر دیکھنے کی دعوت بھی رما کو دے دی۔

کھانے کے بعد رضیہ اور رما الگ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ رضیہ نے اپنی باتیں سنائیں۔ شادی کے چند دن بعد ہی ماں اور باپ دونوں آگے پیچھے چل بسے۔ چھوٹی بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ شوہر کے ساتھ دوبائی میں ہے۔

"اور وہ تمہارا بھائی ... ناصر، جو تم سے بے حد پیار کرتا تھا، وہ کہاں ہے؟"

جواب دینے کی بجائے رضیہ یکایک چپ ہو گئی۔ رما تعجب سے دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے، رضیہ؟"

رضیہ پھر بھی کچھ نہیں بولی تو رما کو تشویش ہونے لگی ... "بتاؤ رضیہ ... کیا ہوا ناصر کو؟"

"کچھ نہیں ہوا اسے۔ وہ اچھی طرح ہے ..." بالآخر رضیہ بولی۔ "مگر رما، تم اس کے لیے اتنی بے چین کیوں ہو گئیں؟"

"تم جانتی ہو رضیہ ... وہ مجھے ہمیشہ اچھا لگا ... خاموش، سنجیدہ ... اور ذہین، تمہارے لیے جب بھی کالج آتا، مجھ سے ملے بنا نہیں جاتا تھا۔"

"وہ میرے لیے نہیں، تمہارے لیے آتا تھا، رما۔" رضیہ اک دم رما کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"میرے لیے آتا تھا ... ؟"

"ہاں، تمہارے لیے رما ... وہ تمہیں دل و جان سے چاہنے لگا تھا۔"

"کیا کہہ رہی ہو، رضیہ؟" رما حق دق ہو کر دیکھنے لگی۔

"یہ بات بس میں جانتی ہوں رما۔ اس نے خود کبھی کہا نہیں کسی سے ... میں خاموشی پرستش کرتا تھا تمہاری ... تمہاری ذہانت کی ... تمہارے ٹیلنٹ کی ... تم اس کی آئیڈیل بن گئی تھیں رما۔"

ما کہ تم بچی تھیں۔ مجھے رضیہ کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔
مگر اس نے کبھی تمہیں کچھ کہا ہے؟ ۔۔۔ میں اسے بھائی سمجھتی تھی۔
"شاید اس نے کبھی اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ اور کہتا بھی تو تم کیا کر لیتیں؟ ۔۔۔ کیا اس کا ہاتھ تھام لیتیں؟"۔
رضیہ کچھ دیر رکی۔ پھر خود ہی بولی "۔۔۔ نہیں ما۔ وہ جانتا تھا آسمان کو چھوا نہیں جا سکتا۔ مگر دل پر کسے قابو ہے؟ ۔۔۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا۔ اور وہ تمہارے عشق میں ہوش گنوا بیٹھا۔۔۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔۔۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔"

ما چپ چاپ۔ کھوئی کھوئی نظروں سے رضیہ کو دیکھتی رہی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے رضیہ کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہے اور وہ کسی غیر ملکی زبان میں بات کر رہی ہے۔۔۔۔

"اتنے میں تمہاری شادی ہو گئی۔۔ مگر اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ آہیں بھریں، نہ گریباں چاک کیا۔ تمہیں مسرور دیکھ کر وہ بھی مسرور رہتا۔ شاید تمہیں یاد ہو شادی کے بعد بھی وہ ہر تیسرے چوتھے دن کسی نہ کسی بہانے تمہارے گھر آ کر تمہیں ایک نظر ضرور دیکھ جاتا تھا۔۔۔ کئی بار تم نے اسے روک بھی لیا۔ باتیں بھی کیں۔۔۔ ان دنوں وہ انجینئرنگ کر رہا تھا۔ دوسرے سال میں تھا۔"

"پھر کیا ہوا۔۔۔؟" رضیہ رکنے لگی تو ما نے آہستہ سے پوچھا۔ اب اس کی آنکھوں میں بے چینی جھلک رہی تھی۔

"پھر تم جرمنی یا امریکہ چلی گئیں۔۔۔ اور ناصر کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ کالج چھوڑ دیا۔ گھر سے اکثر باہر رہنے لگا۔ دوستوں سے ملنا جلنا پہلے ہی کم ہو گیا تھا۔ جب میں نے پوچھا تو کہنے لگا پڑھنے سے جی اچاٹ ہو گیا ہے۔ اس کا زیادہ وقت بٹے شاہ کے تکیے میں گزرتا تھا۔ عجیب بے سروپا باتیں کرتا۔۔۔ وہ بھی صرف مجھ سے۔ ورنہ ہر وقت خاموش رہتا۔ کھویا کھویا سا۔۔۔۔ نہ کھانے کی فکر، نہ کپڑوں کا خیال۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اباجی نے اس کی شادی کر دینی چاہی مگر وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ کسی کو نہیں بتایا کہاں جا رہا ہے۔ مجھے بھی نہیں۔"

ما بت بنی سن رہی تھی۔ رضیہ پھر رک گئی تو بولی۔۔۔
"ستاتی چلو رضیہ۔۔۔ پھر کیا ہوا؟"

"اس کے بعد کچھ نہیں ہے سنانے کو۔ کوشش کے باوجود کچھ پتہ نہ چلا وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے۔ کبھی سننے میں آتا وہ راجستھان میں کسی صوفی بزرگ کے یہاں ہے۔ کبھی کوئی کہتا وہ مانک گڑھ کے جنگل میں کسی سنت مہاراج کے آشرم میں نظر آیا۔ ایک دو جگہ اباجی اس کے لیے گئے بھی مگر سب غلط نکلا۔ وہ پھر کبھی گھر نہیں آیا۔"

ما ایک ٹک رضیہ کو تک رہی تھی۔ دفعتاً اسے لگا جیسے اس کی نظروں کے سامنے رضیہ نہیں ہے۔ خلا کی ایک بے کراں سمندر ہے جو اس کی طرف بڑھتی آ رہی ہے۔ اور ابھی کچھ دیر میں خلا کا سمندر اس کے احساس اور شعور کو بھی نگل لے گا۔ تنا کھڑے گا۔ وہ چونک پڑی جیسے کوئی خواب میں ٹھوکر کھا کر چونک پڑتا ہے۔

"میں جانتی تھی تم یہ سب سن کر پریشان ہو جاؤ گی۔ اسی لیے کبھی ذکر نہیں کیا۔" رضیہ بولی۔
کیا کبھی اس نے تمہیں کوئی خط بھی لکھا؟ "۔۔۔ ما نے پوچھا۔

"آیا تھا ایک خط۔ کوئی ایک سال پہلے۔"

"کہاں سے آیا؟"

اڈریس میں کوئی غلطی تھی۔ اور یہاں یہ وہ خط آیا کس پتے پر؟ مختوری والی کوٹھی کے پتے پر۔" رما نے چونک کر دیکھا ... کہنے لگی۔ "ناصر نے لکھا تھا۔ سامنے میں پتے کے جھگڑے میں کوئی اور پتہ یاد نہیں آتا ہے۔ امید ہے خط تم تک [illegible] جائے گا۔۔۔ وہ خط بندو نے لاکر مجھے دیا۔

"اور کیا لکھا تھا؟"

رضیہ چپ ہو گئی۔ دیر تک سوچتی رہی کہ سنائے یا نہ سنائے۔ بالآخر بولی۔

"بڑے بے ربط سے جملے تھے۔ کچھ بھی مجھے یاد نہیں۔۔۔ میں جان گیا تھا تجھے کب سے کی تلاش تھی۔۔۔ احساس کی منزل جہاں دکھ اور سکھ میں کوئی فرق نہ رہے۔ جیسے شام کا دھندلکا جس میں نہ دن ہوتا ہے اور نہ رات۔۔۔ نجات اسی میں ہے کہ دکھ کی کوکھ سے سکھ جنم لے۔۔۔ مجھے نجات کا راستہ نظر آگیا ہے۔۔۔ اور مجھے وہاں جانا ہے۔۔۔ راہبوں کے اس گروہ کے ساتھ۔ کل ہم یہاں نہیں رہیں گے۔۔۔ کہاں ہوں گے؟ یہ بھی نہیں معلوم۔۔۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔۔۔ مگر رک نہیں سکتا۔ کیا معلوم [illegible] ہی جاؤں۔۔۔"

(۲۸)

اس رات رما کو پل بھر بھی نیند نہ آسکی۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ ناصر کا بھولا بھالا معصوم سا چہرہ دل میں پھرتا رہا جیسے وہ تقریباً بھول گئی تھی۔۔۔ ناصر، وہ ذہین اور سنجیدہ لڑکا، جو ابھی عنفوانِ شباب کی منزلوں سے گزر رہا تھا، اس کے عشق میں ہوش و حواس کھو بیٹھے گا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ جتنا سوچتی اس کا اضطراب بڑھتا جاتا۔ ایک اذیت ناک احساس اس کے شعور میں اترتا جارہا تھا کہ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصور وار ہے، مجرم ہے۔ وہ اعتماد، بھروسہ، جو اسے اپنی فہم اور ادراک پر تھا، پارہ پارہ ہوا جارہا تھا۔۔۔ وہ ڈیڈی کے کمرے میں چلی گئی مگر وہاں بھی سکون نہیں ملا۔۔۔ کوٹھی کے ہر گوشے سے ایک آواز تھی جو رہ رہ کر اس سے کہہ رہی تھی۔۔۔ تو بے وفا ہے! تو دھوکے باز ہے۔ اور ناصر تباہی کے راستے پر بڑھتا چلا گیا۔۔۔ اس قلندر کی طرف جہاں صرف دکھ ہی دکھ ہے۔۔۔ اور ساری راہیں گم ہو جاتی ہیں۔

خدایا یہ کیسا عذاب ہے! یہ کیسی سزا ہے۔ ناکردہ گناہوں کی! ۔۔۔ اس کا جی کرتا وہ بچوں کی طرح پھوٹ کر رو دے۔

صبح ہوئی تو رما کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ حلق میں درد ہو رہا تھا۔ بندو نے گھبرا کر ڈاکٹر کو بلانا چاہا۔ مگر رما نے منع کردیا۔ ایک عجیب جذبہ اس کے دل و دماغ پر مسلط ہوتا چلا گیا۔ ایک عجیب خواہش۔۔۔ ان لمحوں کو سہنے کی جن میں اس کا دل ہر آن اس وقت جل رہا تھا۔ جیسے وہ خود کو ایذا پہنچا کر اپنے آپ سے انتقام لے رہی ہے۔ آگ میں جھونک دے گا۔۔۔ نہ جانے وہ کے ان لمحوں کو اسی طرح جسم و جان میں سمیٹ۔۔۔ [illegible] کی شدت بڑھتی گئی مگر رما نے پھر بھی ڈاکٹر کو بلانے سے منع کردیا۔۔۔ عجیب کیفیت میں جلنے کو زبان سے کہتا رہا۔۔۔ [illegible] دکھ اور درد۔۔۔ یہی تو اصل ہے!۔۔۔ [illegible] صرف دکھ۔ اور سکھ اسی دکھ کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔۔۔ اور

جب دکھ اور سکھ میں فرق نہ رہے، تو . . . وہی ہے نجات کی منزل . . .

وہ دن اور رات رما نے تیز بخار میں گزار دیا . . . دوسرے دن ہندو نے گھبرا کر رضیہ کو بلالیا۔ مگر اس کے آنے تک رما کی حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی۔ رضیہ آئی تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ رما ہاتھ میں قلم تھامے کرسی پر بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ رضیہ کو دیکھا تو رک گئی۔ پھر ذرا سے پس و پیش کے بعد میز پر سے کاغذوں کو ایسے اٹھانے لگی جیسے پھاڑ دینا چاہتی ہو۔ رضیہ نے ہاتھ بڑھا کر روک دیا۔

"نہیں رما۔ پھاڑو مت . . . رہنے دو اپنے پاس۔ میں جانتی ہوں تم کیا لکھ رہی ہوگی۔"

رما رک گئی۔ چپ چاپ کاغذوں کو دیکھنے لگی۔ رضیہ بولی . . . "ناصر کی بات سنا کر میں نے بڑی بھول کی۔"

"میں اس سے ایک بار ملنا چاہتی ہوں رضیہ۔ ورنہ سب ادھورا رہ جائے گا۔"

"جب بھی کوئی خبر ملے، میں تمھیں اطلاع کردوں گی۔"

رضیہ نے رما کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے . . . "تم نے کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلایا؟ . . . یا مجھے فوراً اطلاع کیوں نہیں کروائی؟ . . . اتنے تیز بخار میں تپتی پڑی رہیں! . . . کیا ملا تمھیں؟"

"کچھ نہیں۔ کہیں رگ و پے میں سلگتی آنچ سے احساس کی شاخ بھی جلی ہے۔"

(۲۹)

تین دن ہو گئے تھے۔ نہ رما کا پتہ تھا، اور نہ منوج کا۔ آرتی اپنی آگ میں بل کھاتی، ہر جگہ جاکر، دونوں کے اس طرح غائب ہو جانے کو اسکینڈل کا روپ دیتی پھری۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ایسی باتوں میں کسے دلچسپی نہیں ہوتی ہے! آرتی کا بس چلتا تو اخباروں میں چھپوا دیتی۔

"تمہارے دماغ میں شک کا کیڑا گھس گیا ہے . . . اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔" . . . دھیرج گھوش آرتی سے بولا جس پر اندرانی بگڑ کر اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی . . .

آرتی بولی "... مگر اب مجھے شک نہیں، یقین ہو چلا ہے۔ آپ خود جلدی ہی دیکھ لیں گے کہ . . ."

بیچ میں اندرانی بول پڑی "چپ ہو جاؤ آرتی . . . ان سے کہنا بے کار ہے . . . تم نہیں جانتیں رما کے خلاف کچھ سننے والوں میں مسٹر گھوش بھی ہیں!"

چوتھے دن صبح کو منوج آفس آیا تو لی نا نے بتایا کہ وہ گزشتہ روز بھی آفس آئی تھی۔ اور آرتی نے دو بار فون پوچھا تھا کہ تمہارے باس کہاں گئے ہیں؟ . . . واپس آئے یا نہیں اب تک؟ . . .

منوج اپنی ڈاک دیکھنے میں مصروف رہا جو ان دنوں جمع ہو گئی تھی۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے، سر؟" لی نا نے پوچھا۔

"اچھی ہے . . . کیوں؟ ایسے کیوں پوچھ رہی ہو؟" منوج اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کچھ نہیں سر . . . ایسے ہی . . ."

"تم کیا کرتی رہیں ان چھٹیوں میں؟" . . . منوج درمیان میں بول پڑا . . . "شفٹ ہو گئیں اپنے نئے گھر میں؟

"جی ہاں۔" لی نا نے جواب دیا۔۔۔ "اب آپ کب آئیں گے ہمارا نیا گھر دیکھنے ؟۔۔۔ آپ نے وعدہ کیا تھا ؟"

"ہاں۔ ضرور آؤں گا۔۔۔ تمھاری ممی سے بھی ملوں گا۔۔۔ تمھارے لنلی کا کیا حال ہے ؟"

"ٹھیک ہے۔۔۔ اس ویک اینڈ پر آنے کا پونا ہے۔" لی نا نے مسکرا کر کہا۔

یکایک ٹیلی فون کی گھنٹی نے باتوں کا سلسلہ توڑ دیا۔ فون اسوانی کا تھا۔ کہنے لگا۔ "اچھا ہوا آپ مل گئے۔۔۔ میں نے سنا تھا کہیں باہر گئے ہوئے تھے ؟"

"گیا تو تھا۔۔۔ آج ہی لوٹا ہوں۔"

"یہاں لوگوں کو بڑی فکر ہو رہی تھی ، آپ کی۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"آپ آرتی کو ڈانٹ کیوں نہیں دیتے ؟۔۔۔ آپ میڈیا کے آدمی ہیں۔"

"اسوانی صاحب۔ ان باتوں کی نہ کوئی اہمیت ہے اور نہ ان کے لیے میرے پاس وقت ہے۔ آپ کیوں پرواہ کرتے ہیں ؟۔۔۔ خود رما دیوی نے ایسی باتوں کی کبھی پرواہ نہیں کی۔۔۔ چھوڑیئے اسے۔۔۔ رما دیوی کا کیا حال ہے ؟ کب واپس آرہی ہیں ؟"

اسوانی نے جواب دیا۔۔۔ "یہی بتانے فون کیا تھا آپ کو۔ دلی میں ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔"

منوج دفعتاً سنجیدہ ہو گیا۔۔۔ "کیا ہو گیا تھا ؟"

ٹھیک سے نہیں معلوم۔۔۔ ہمارے دلی والے منیجر نے اتنا ہی بتایا کہ بیمار ہو گئی تھیں۔ اب ٹھیک ہیں۔۔۔ کل صبح واپس آرہی ہیں۔"

منوج نے فون واپس رکھ دیا تو لی نا اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا سر ؟۔۔۔ کیا رما دیوی کی طبیعت۔۔۔" وہ رک گئی۔

"اب ٹھیک ہے۔ کل صبح واپس آرہی ہیں۔" منوج نے ہمیشہ کی طرح دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ چند سکنڈ دونوں خاموش رہے۔

"کل صبح۔۔۔ آپ ، ایرپورٹ جائیں گے۔۔۔ ؟" یک بارگی لی نا پوچھ بیٹھی تو منوج نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ "آنند کے حادثے کے بعد رما پلین میں سفر نہیں کرتیں۔"

لی نا اپنے خول میں واپس چلی گئی۔

(۳۰)

سکندرآباد کے اسٹیشن پر اسوانی اور منوج دونوں کو کھڑا دیکھ کر رما کے چہرے پر ایک طمانیت آمیز مسکراہٹ آگئی۔

۔۔۔ "کچھ نہیں ہوا تھا مجھے۔ ٹھیک ہوں بالکل۔۔۔ پتہ نہیں اس منیجر نے کیا کہہ دیا آپ سے !۔۔۔ بس ذرا سا ٹمپریچر آگیا تھا۔" وہ کہنے لگی۔

"ذرا سا ٹمپریچر اتنا کمزور تھوڑی کر دیتا ہے ؟ بہت آپ کمزور لگ رہی ہیں۔" اسوانی بولا۔

اس کے بعد رما کی حالت کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اسٹیشن پہنچتے ہوئے اسوانی نے منوج کو پک کرلیا تھا۔ اسی کی جیپ میں ٹیکسی واپس ہوئے۔ راستے میں زیادہ تر خاموش ہی رہے۔ باتیں ہوئیں بھی تو بس سرسری اور رسمی۔۔۔ دلی کا موسم کیسا رہا؟۔۔۔ کسی سے ملاقات ہوئی؟۔۔۔ ٹرین کے سفر میں آرام رہا؟۔۔۔ ایک دفعہ منوج پوچھ بیٹھا۔۔۔ جوہری والی کوٹھی سے بھی آئیں؟۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ مگر پھر اس بے موقع سوال کے بھونڈے پن پر خود ہی فوراً جھینپ گیا۔ رما نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

رما کے گھر پر منوج اور اسوانی زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ اسے آرام کا مشورہ دے کر لوٹ گئے۔

ان کے جانے کے بعد رما نے میز پر سے نیل کمل کا خط کھول کر پڑھا۔ جو اس کے حساب میں امریکہ سے آیا دوسرا بہت مختصر سا خط تھا۔ بس یہ کہ پندرہ دن بعد وہ حیدرآباد میں ہوگی۔ ماں کے دل میں خوشی کی لہر سی اٹھی۔ رما کو خوش ہوئے ایک عرصہ ہوچکا تھا۔

آرتی کو اپنی خبر رساں ایجنسی کے ذریعے فوراً خبر مل گئی کہ رما واپس آگئی ہے۔ اور اس نے ان تمام لوگوں کو اطلاع کردی جنہیں اس خبر سے دلچسپی ہوسکتی تھی۔۔۔ شام کو پروفیسر راجن کا فون آگیا۔ کہنے لگا وہ ملنے کو بے چین ہے۔ کوئی ضروری بات کہنی ہے۔ کب آئے ملنے؟۔۔۔ رما نے اس کو آنے سے منع کرتے ہوئے کہا، وہ خود کالج آکر مل لے گی۔

تھوڑی دیر بعد اندرانی گھوش کا فون آیا۔۔۔ کیسی ہو؟ کب آئیں؟۔۔۔ کہاں چلی گئیں تھیں؟ اور آخر میں "اکیلی گئی تھیں؟"

"میں اکیلی کبھی نہیں رہتی مسز گھوش۔" اور رما نے کھٹ سے فون رکھ دیا۔ اندرانی کو لگا جیسے رما نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ کھسیانی ہوکر آرتی کی طرف دیکھا جو بڑے انہماک سے رما سے اس کی گفتگو سن رہی تھی۔۔۔ "کہتی ہے میں اکیلی کبھی نہیں رہتی۔" اندرانی غصے میں بھری ہوئی بولی۔

دلی سے چلتے وقت رضیہ کے لاکھ سمجھانے پر بھی رما کے دل کا بوجھ کم نہیں ہوا تھا۔ سارے راستے ناصر کا خیال پھانس کی طرح اس کے ذہن میں اٹکتا رہا۔۔۔ ماضی کے کہرے سے نکل کر اس کا معصوم سا چہرہ نظروں میں پھر جاتا۔ اور وہ [illegible] اٹھی کہ اس سے اتنی بڑی بھول کیسے ہوگئی جو وہ ان جھکی جھکی ہوئی نگاہوں اور پھولی ہوئی سانسوں میں الجھ کر بے ربط ہوجانے والی گفتگو کے پیچھے چھپے ہوئے اضطراب کو نہ جان سکی!۔۔۔ اسے تو بڑا زعم تھا، لوگوں کے ذہنوں کو ذرا سی دیر میں کتاب کی طرح پڑھ لینے کا! وہ لاکھ اس سے چھوٹا تھا، مگر لڑکپن کا وہی دور تو ہوتا ہے بے بھروسہ!۔۔۔۔

اور پھر ایک عجیب موہوم سے خوف کا احساس اس کے شعور میں پھیلنے لگا۔ ایک سرد لہر دبے پاؤں اس کے اعصاب میں تیر گئی۔۔۔

رما سہم گئی۔۔۔ نہیں، نہیں۔۔۔ ابھی وقت ہے۔۔۔ بس کاش وہ مل جائے ایک دفعہ۔۔۔

شام کی چائے کے ساتھ اسپرو کی دو ٹکیاں کھا کر رما اپنی کار میں گھر سے نکل گئی۔ جوبلی ہلز کی پہاڑیوں پر بے مقصد گھومتی پھری۔ پھر آگے کھلے میدانوں میں دور تک چلی گئی۔ جب لوٹی تو سورج غروب ہوچکا تھا۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ کھلی اور

تازہ ہوا کے جھونکوں میں رما کے سر کا بھاری پن کم ہو چلا تھا۔

گھر پہنچی تو سیڑھیوں پر منوج کو کھڑا پایا۔

"عجیب بات ہے ۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے میں آپ کو فون کرتے کرتے رک گئی اچھا ہوا آپ آگئے۔"

"میں تو یوں ہی چلا آیا تھا۔ اور اب واپس جارہا تھا۔" منوج بولا "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔۔۔ چلیے۔ اندر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

رما نے ڈرائنگ روم کو جس قرینے اور نفاست کے ساتھ آنند کی زندگی میں آراستہ کیا تھا، اب بھی وہ سلیقہ برقرار رکھا تھا۔ اور اب یہ بات کئی خواتین کی نظروں میں کھٹکتی بھی تھی۔ مگر رما نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ منوج جانتا تھا، موت آنند کو رما سے کبھی جدا نہ کرسکے گی۔

خادمہ سے کافی لانے کے لیے کہہ کر رما منوج سے مخاطب ہوئی۔۔۔

"منوج صاحب۔ نیل کمل کا خط آیا ہے؟" وہ پندرہ دن بعد امریکہ سے آجائے گی۔

"اور وہ۔۔۔ اس کا منگیتر؟" منوج نے پوچھا۔

"دونوں ساتھ آرہے ہیں۔ شادی کی اجازت کے لیے۔ آپ کو بتایا تھا نا میں نے؟"

"بڑی اچھی خبر ہے۔" منوج کہنے لگا۔۔۔ "رما دیوی۔ نیل کمل بڑی اچھی لڑکی ہے مجھے یقین ہے اس کا انتخاب آپ کو بھی پسند آئے گا۔"

اس کے بعد ذرا سی دیر کے لیے دونوں خاموش ہوگئے۔ یک بارگی رما بولی۔۔۔۔

"منوج صاحب!۔۔۔ آپ نے اب تک یہ نہیں پوچھا کہ دلی میں مجھ پر کیا بیتی؟۔۔۔ حالانکہ یہی جاننے کے لیے آپ آئے تھے۔ اور یہی سنانے کے لیے میں آپ کو بلانے والی تھی۔

منوج نے اب بھی کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ رما کو دیکھتا رہا۔ جس کے ہونٹوں پر ایک بہت خفیف اور پھیکی، بے مقصد مسکراہٹ نمودار ہونے لگی تھی۔۔۔

"آپ نے سوچا ہوگا، چھتری والی کوٹھی کا آخری دیدار مجھے بے قرار کردے گا۔ یادوں کا طوفان امڈ کر مجھے درد کے سمندر میں بہا لے جائے گا۔۔۔ مگر ایسا نہیں ہوا! شاید اس لیے کہ میں اس دیدار کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ مگر منوج صاحب۔۔۔ دلی میں جس ذہنی حادثے نے مجھے دکھ اور درد کے سمندر میں دھکیل دیا، اس کے لیے میں قطعی تیار نہیں تھی۔ اور اس حادثے کا تعلق چھتری والی کوٹھی سے نہیں، ایک ایسی ہستی سے ہے، جس کے وجود کا احساس بھی کبھی یادوں کے ابھار میں کہیں نہیں تھا!۔۔۔ وہ اندھیاروں سے نکل کر ایک نوعمر لڑکے کا شرمیلا سا چہرہ لیے میری نظروں میں آکر بس گیا ہے۔۔۔ ایسے کہ دم بھر کو بھی اوجھل نہیں ہوتا! ایک نشتر بن کر میرے احساس کی تہوں میں اترا جارہا ہے خود جس کے درد کی ہر کسک مجھ سے کہتی ہے۔۔۔ تو ہے خطاوار۔۔۔ تیری ہی وجہ سے اس کی زندگی ایک مسلسل عذاب بن کر رہ گئی ہے! تو ہے خطاوار

وہ کیا کہ رہی ہے ! ۔۔ بعد پھر رما کو اپنی بے دلی کا احساس ہوا ۔۔۔ " منوج صاحب ۔ وہ چہرہ ناصر کا تھا ۔۔۔ رضیہ کے چھوٹے بھائی ناصر کا ۔ رضیہ کالج میں میرے ساتھ تھی ۔ اور میری قریبی دوست ۔ ناصر ان دنوں بی ۔ اے میں آگیا تھا ۔ اکثر اپنی بہن سے ملنے کے بہانے کالج آجاتا تھا ۔۔۔ اب پتہ چلا کہ وہ دراصل میرے لیے آتا تھا ۔۔۔ ! آپ کو یاد ہوگا ان دنوں افسانوں اور ڈراموں کی دنیا میں میں بھی ایک اچھی خاصی Celibrity بنتی جارہی تھی ۔ ناصر میرا مداح تھا ۔ دھیرے دھیرے میرا پرستار بن گیا ۔۔۔ اور مجھے کبھی اس کا پتہ نہیں چلا ۔ ہاں منوج صاحب ! وہ اپنی خاموشی میں لپٹا ہوا اس والہانہ محبت کے سحر میں گرفتار ہوگیا جو آدمی کے سوچنے سمجھنے کی ساری قوتوں کو مفلوج کردیتا ہے ۔۔ وہ بے بس ہوکر رہ جاتا ہے ۔ ناصر کا بھی وہی حشر ہوا اور میں اس سحر سے اس کو آزاد کرانے میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکی ! ۔۔"

آخری جملہ رما نے ایسے کہا جیسے وہ خود کو سنارہی ہو ۔ وہ چپ ہوگئی ۔ منوج اسی طرح بت بنا خاموشی میں سن رہا تھا اور پھر رما آہستہ آہستہ ناصر کی خاموش محبت کی نرالی داستاں منوج کو سنانے لگی ، جو اس نے رضیہ سے سنی تھی ۔۔۔ عجیب محبت تھی وہ بھی ! ، جس میں چاہنے والا منتہا کو پالینے کا تصور بھی کبھی نہیں کرسکتا اور جو دبے پاؤں پرستش میں تبدیل ہوتی چلی گئی ۔۔۔ جیسے کوئی بھگت دیوی دیوتاؤں کو چاہتا ہے ۔۔۔ ان کے عشق میں دنیا کو تیاگ کر دکھوں کو اپنا لیتا ہے ۔ رما نے بتایا کہ جب وہ برمنی چلی گئی تو ناصر بھی گھر چھوڑ کر چلا گیا ، اور اپنے دردِ پنہاں سے نجات کی تلاش میں در بہ در پھرتا رہا ۔۔۔

" وہ میری آنکھوں کے سامنے ، میری ہی وجہ سے ، اس خطرناک راستے پر آگے بڑھتا گیا اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی ۔ ۔۔۔ ! " رما ذرا دیر کے لیے رکی تو منوج نے اتنی دیر بعد کچھ کہنا چاہا ۔ مگر رما نے کہنے نہیں دیا ۔۔۔ " نہیں منوج صاحب ۔ میں بے قصور نہیں ہوں ۔ میں اپنے کو معاف نہیں کرسکتی ۔ معلوم نہیں وہ آج کل کہاں ہے ! ۔۔۔ کس اذیت میں جی رہا ہے ! ۔۔۔ جی بھی رہا ہے یا ۔۔۔ ۔ ؟"

رما یک لخت چپ ہوگئی ۔ منوج نے بھی کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی ۔ خاموشی میں کمرے کی فضا ، ایک بوجھل سیل کی طرح اعصاب پر سوار ہونے لگی ۔ رما نے چونک کر دیکھا ، تپائی پر کافی رکھے رکھے ٹھنڈی ہوتی جارہی تھی ۔ دونوں نے ایک ایک پیالی اٹھالی ۔۔۔

" اس رات میں صبح تک سو نہ سکی ۔۔۔ ہر لمحہ بے چینی بڑھتی ہی گئی ۔ اٹھ کر آدھی رات کو ڈیڈی کے کمرے میں بھی گئی ، مگر وہاں بھی سکون نہیں ملا اور پھر عجیب بات ہوئی ۔ ذہن کے نہاں خانوں سے نکل کر کسی نے چپکے سے میرے ہاتھ میں قلم تھما دیا ۔۔۔ اور میں لکھتی گئی ۔۔۔ لکھتی چلی گئی ، صبح تک ۔۔۔ ۔"

منوج نے چونک کر رما کی طرف دیکھا ۔ ذرا سی کافی چھلک کر طشتری میں گرگئی ۔۔۔ " اور صبح ہوئی تو سارا جسم بخار میں پھنک رہا تھا ۔ جوڑ جوڑ میں اتنا شدید درد تھا کہ کروٹ بھی لینا مشکل ہوگیا تھا ۔ مگر ۔۔۔ عجیب بات ہے ، میرا جی کر رہا تھا میں اسی درد میں تڑپتی رہوں ، میری تکلیف کبھی کم نہ ہو ! ۔۔۔ ۔

اور اس کے بعد وہ رک گئی ۔ دیر سے باتیں کیے جارہی تھی ، تھک کر بے حال سی ہوگئی ۔

" تم نے اس رات جتنا کچھ لکھا ۔۔۔ اس کا کیا ہوا ؟ " رکتے رکتے منوج نے پوچھا ۔

" رما کچھ دیر اسی طرح خاموش بیٹھی رہی ۔ پھر دھیمی آواز میں بولی ۔ ۔ ۔ " کئی دفعہ خیال آیا کہ اسے پھاڑ کر پھینک دوں ۔ ۔ ایک بوجھ بن گیا ہے ذہن پر ! ۔ ۔ ۔ کیوں کہ اب میں آگے نہیں لکھ سکتی ۔ ۔ ۔"

" اسے ضائع مت کردیجیے ، رما دیوی ۔ یہی بڑی بات ہے کہ اتنے دن بعد آپ نے کچھ لکھا ۔" منوج نے کہا ۔ " مگر ایسا کیوں سوچتی ہیں کہ آگے نہیں لکھ سکیں گی ؟

" منوج صاحب ۔ ۔ ۔ اس رات ان جانے میں جو کچھ لکھ گئی ، وہ ایک ناول کی شروعات بن گئی تھی ۔ ۔ ۔ ناصر پر ۔ شائد میرے شعور کی اندرونی تہوں میں یہ خیال کار فرما رہا ہو کہ اس طرح مجھے اپنے جرم کے احساس سے فرار کی راہ مل جائے ۔ ۔ ۔ ۔"

" کون جانے آپ کے سب کانشنس نے آپ کو صحیح روشنی دکھائی ہو ! " منوج بولا ۔

" نہیں منوج صاحب ۔ ۔ ۔ خود فریبی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔"

" مگر کبھی کبھی خود فریبی ہی علاج بنتی ہے ۔ ۔ ۔ آپ آگے لکھنے کی کوشش تو کیجیے ۔"

رما بے چین ہوکر منوج کو دیکھنے لگی ۔ اور جب بولی تو آواز سے قدرے جھلاہٹ جھلک رہی تھی ۔ ۔ ۔ " آپ سمجھتے یوں نہیں ، میں جب تک ناصر سے اک دفعہ مل نہ لوں ، اس کی کہانی کیسے لکھ سکتی ہوں ؟ ۔ ۔ ۔ فرضی داستان لکھ ڈالنا ، وہ ں ناصر پر ۔ ۔ ۔ ایک اور جرم کے احساس کو جنم دے گا ۔ کاش میں اس سے ایک دفعہ مل سکوں ! "

○●○

شعرائے کرام سے گزارش

میں اقبال سے موجودہ دور تک کے مشہور و معروف شعرا کے کلام کا ایک نتخاب مرتب کرکے کتابی صورت میں اسے منظرِ عام پر لانے کا متمنی ہوں ۔ اس نتخاب کی خصوصیت یہ ہوگی کہ شعرا کا جو کلام اس میں شامل ہوگا وہ خود ان کی ہینڈ ائٹنگ میں ہوگا ۔ میں اپنے عہد کے شعرا و شاعرات سے ملتمس ہوں کہ وہ اپنی دو فلیقات مختصر تعارف اور تصویر کے ساتھ مجھے بھجوانے کی زحمت کریں ۔ کلام اور وانگی اشارے سیاہ روشنائی سے فل اسکیپ سائز کے پیپر پر لکھنے کی زحمت کریں ۔ لاوہ ازیں مرحوم شعرا و شاعرات کا کلام خود ان کی ہینڈ رائٹنگ میں جن حضرات کے اس محفوظ ہو وہ اس کی فوٹو کاپی ارسال کرنے کی زحمت فرمائیں ۔ ایسے تمام افراد کا ام شکریے کے ساتھ کتاب میں شائع کیا جائے گا ۔

اس کام میں اردو کی کئی معتبر شخصیتیں میری مدد کر رہی ہیں ۔ اس لیے مجھے مید ہے کہ یہ مثالی انتخاب ہوگا ۔

آپ کی نوازشات کا متمنی

فصیح دہلوی

مکان نمبر ۲۰۰۰ گلی اونچی مسجد ، کلاں مسجد ، ترکمان گیٹ ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ضروری گزارش

میں ایم ۔ جے ۔ پی روہیلکھنڈ یونیورسٹی ، بریلی سے ملحق گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج ، رام پور کے شعبہ ، اردو کے ریڈر و صدر ڈاکٹر حسن احمد نظامی صاحب کی زیرِ نگرانی " واجدہ تبسم کی تخلیقات کا سماجی و نفسیاتی مطالعہ " کے عنوان سے پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ تیار کر رہی ہوں ۔

اس سلسلے میں کسی صاحب کے پاس کوئی مواد موجود ہو یا کسی طرح کی مفید اور کارآمد اطلاع وہ فراہم کرسکتے ہوں تو براہِ کرم درجِ ذیل پتہ پر مطلع فرمائیں ۔ عین نوازش ہوگی ۔

(آنسہ) عائشہ عالم بنتِ جناب قمیر عالم صاحب
کٹرہ جلال الدین ، رام پور (یو ۔ پی) ۲۴۴۹۰۱

سید خالد قادری

سمجھوتہ

صبح کا اخبار پڑھتے ہوئے اچانک میری نظر اس اشتہار پر پڑی ۔ یہ تو اسی مکان کے کرائے پر دیے جانے کا اشتہار ہے جس میں میں اپنی بیوی کے ساتھ دو سال تک رہ چکا ہوں ! ۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا ۔ کیا وہ اسے چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی ! اس سے پہلے کہ یادوں کے ریلے مجھے بہا کر بیتے دنوں کی طرف ڈھکیل دیں میں اٹھ کھڑا ہوا اور کپڑے تبدیل کر کے اس پتے پر روانہ ہو گیا ۔

ٹیکسی سے یہ فاصلہ مشکل سے پندرہ منٹ کا رہا ہوگا ۔

سڑک سے شمال کی جانب ایک چھوٹے سے باغیچے کے بعد چند سیڑھیاں تھیں اور پھر دیوان خانے کا پہلا دروازہ ۔ ۔ ۔ دو سال کے طویل عرصے کے بعد اچانک اپنے آپ کو پھر وہاں کھڑا پا کر میں نے عجیب سا محسوس کیا ۔ ۔ ۔ ایک عجیب سی اداسی کا احساس جس سے میں کسی طرح پیچھا چھڑانا چاہتا تھا ۔

میرے کال بیل پر انگلی رکھنے کے چند منٹ بعد دروازہ کھلا ۔ سامنے کھڑی عورت کے چہرے پر حیرت کے ساتھ خوشی کی چمک تھی ۔

" کیا یہ مکان کرائے پر دیا جانا ہے ؟ "

" ہاں ۔ ۔ ۔ مگر آپ ۔ ۔ ۔ ! ! "

" مجھے کرایے کے مکان کی ضرورت تھی ۔ اخبار میں اشتہار دیکھ کر چلا آیا ۔ "

اس نے بازو ہٹ کر مجھے اندر آنے کا راستہ دے دیا تھا ۔

اب ہم ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے ۔

میں نے اسے غور سے دیکھنے کی کوشش کی ۔ وہ بالکل پہلے جیسی تھی وہی بڑی بڑی سفید آنکھیں ، صفائی سے باندھے بال اور اوپری ہونٹ کے کنارے پر لرزتا ہوا وہ کالا تل ۔

" تو کیا میں مکان دیکھ سکتا ہوں ؟ "

وہ تھوڑا جھجکی جیسے سوچ رہی ہو کہ اس ڈرامے میں شامل ہو یا نہ ہو پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی ۔

" ہاں ۔ کیوں نہیں ۔ آئیے ۔ " اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا ۔

" دیوان خانہ تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں ۔ یہ ادھر بیڈ روم ہے ۔ " اس نے سامنے کے کمرے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا ۔ یہ ایک بڑا سا ہوادار کمرہ تھا جس کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں ۔ اسے بڑے سلیقے سے آراستہ کیا گیا تھا ۔

"آپ کا بیڈ روم بڑا خوب صورت ہے۔ کیا اسے آپ نے خود سجایا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ اس میں موجود زیادہ تر چیزیں میرے شوہر کی پسند کی ہیں۔"

یہ سچ تھا۔۔۔ کبھی وہ تمام چیزیں جن کو بڑے اہتمام سے میں اپنے گھر کے لیے لایا تھا۔ اب وہ کمرا کسی قدر غیر آباد سا لگ رہا تھا۔

"آپ اس کمرے میں نہیں سوتیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ اب اس تمام پرانے کاٹھ کباڑ کو سنبھالنا مجھے مشکل لگنے لگا ہے۔ میں ادھر برآمدے کے دوسری طرف سب سے چھوٹے کمرے میں سوتی ہوں جو پہلے ملازمہ کے لیے ہوتا تھا۔"

میں بیڈ روم کی اس کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جو باہر کھلتی تھی۔ خاردار گلاب کی کچھ ٹہنیاں کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کررہی تھیں۔ صبح سو کر اٹھنے کے بعد میں اکثر یہاں کھڑا ہو کر تازہ ہوا کا لطف لیا کرتا تھا۔

اس دوران وہ میرے قریب آگئی تھی۔ مجھے لگا اس نے میرے ہاتھوں کو دھیرے سے چھوا ہے۔

"بس کچھ دنوں بعد ہی ان شاخوں پر گلاب کھلیں گے اور ان کی خوشبو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اندر آئے گی۔"

وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھی۔ اب اس کا چہرہ میرے جسم کے اتنا قریب آچکا تھا کہ میں اپنے بازوؤں پر اس کے رخسار کی تپش محسوس کرسکتا تھا۔

"آپ اپنے شوہر سے الگ کیوں ہوگئیں؟" میں اچانک پوچھ بیٹھا۔

"ان سب تفصیلات میں آپ جا کر کیا کریں گے؟" اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"بس یوں ہی جاننے کی خاطر" میں نے کمرے سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کو واقعی جاننے میں دل چسپی ہے تو یوں سمجھ لیجیے کہ ہمارے مزاج مختلف تھے۔"

"مزاج مختلف ہونے کے باوجود کیا لوگ ساتھ نہیں رہتے؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ میں اور میرے شوہر دو بالکل الگ قسم کے انسان تھے۔ میں ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی نیم تعلیم یافتہ عام سی لڑکی۔۔۔ اور وہ خشک مزاج اور پڑھے لکھے۔ مجھے خالی وقت میں لوگوں سے ملنا جلنا اور گھومنا پھرنا اچھا لگتا تھا یعنی کہ میں چنچل اور زندہ دلی پسند کرتی ہوں۔ جب کہ وہ پڑھنے لکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے تھے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ وہ انتہا درجہ تنہائی پسند اور الگ تھلگ رہنے والے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کے لیے زندگی کا مصرف صرف پڑھنا اور کتابوں میں ڈوبے رہنا ہے۔"

"مگر اس میں تو ایسا کچھ نہیں جس کی وجہ سے۔۔۔"

"ہاں ٹھیک ہے" اس نے مجھے جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ "اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ شادی کے بعد جب مجھے سب باتوں کا احساس ہوا تو مجھے امید تھی کہ وہ مجھ کو اچھی طرح قابل اور پڑھا لکھا بنانے کی کوشش کریں گے۔ مگر انھوں نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ اس کے بالکل برعکس مجھے صرف گھر کی دیکھ ریکھ کرنے اور ان کی عام ضروریات پوری کرنے والی خادمہ کی طرح رہنے دیا۔ مجھے اور بھی اس بات سے تکلیف تھی کہ وہ میری اس حیثیت کو بدلنے کے بجائے الٹا اس سے مطمئن نظر آتے تھے۔"

"اچھا . . . تو پھر آپ دونوں کا رشتہ ختم کیسے ہوگیا ؟"

"بہت بھونڈے انداز میں" . . . اس نے اداس لہجے میں کہا۔

اب ہم مکان کے اس حصے کی طرف جارہے تھے جہاں کچن اور ملازمہ کے رہنے کا کمرہ تھا۔

"میرے شوہر نہ صرف خود مجھے بے وقعت سمجھتے تھے بلکہ مجھے بھی چاہتے تھے کہ میں اپنے آپ کو اس سے زیادہ کسی اور قابل نہ سمجھوں . . ." اس نے اپنی بات جاری رکھی . . .

"وہ دن بھر میں کئی بار یہ ضرور دہراتے تھے کہ میں جاہل اور بے وقوف ہوں . . ."

بے وقوف عورت ! جاہل عورت ! . . . تمہارے پاس عقل نہیں . . . تمہیں کچھ معلوم نہیں ! . . . یہاں تک کہ میری خوب صورتی کی تعریف کرتے وقت بھی وہ مجھے بے وقوف کہنا نہ بھولتے تھے . . ."

"تم بے وقوف ہو مگر تم خوب صورت ہو اور مجھے پسند ہو . . . وہ اکثر پیار جتاتے ہوئے کہتے تھے . . ."

"تمہارے شوہر تم سے محبت نہیں کرتے تھے ؟"

"میں نے ایسا کب کہا" . . . وہ سرد لہجے میں بولی۔

"مگر صبح سے شام تک بے وقوف کہلانا . . . یہ بھی تو . . ."

"تمہارے شوہر کیا کرتے ہیں ؟" میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"وہ پروفیسر ہیں۔ پڑھتے لکھتے رہتے ہیں۔ کتابیں مضامین کہانیاں اور ایسی ہی دوسری چیزیں . . ."

"تم ان کی لکھی چیزیں پڑھتی تھیں ؟"

"نہیں . . . وہ خود بھی مجھے ان کے بارے میں زیادہ نہیں بتاتے تھے۔ شاید وہ سوچتے تھے کہ میں اسے سمجھنے کے قابل نہیں۔"

"تمہارے شوہر بہت پڑھتے تھے . . ."

"بہت کیا . . . وہ تو ہر وقت وہی کرتے رہتے تھے . . . دن بھر اس کرسی میں بیٹھے رہتے تھے۔" اس نے برآمدے میں پڑی آرام کرسی کی طرف اشارہ کیا . . .

"اور رات کو بستر میں . . . وہاں بھی ان کا وہی حال تھا۔ ایک طرف ہاتھوں میں کتاب لیے وہ لیٹے رہتے تھے۔ دوسری طرف آنکھیں بند کیے میں . . ."

"تمہارے شوہر کی عمر کیا ہوگی ؟"

"ویسے ان کی عمر زیادہ نہیں۔ یہی کوئی چالیس بیالیس سال کے قریب ہوگی۔ مگر ان کے ساتھ رہنے والے کو لگتا ہے جیسے وہ اسی نوے کے ہوں . . ."

"کبھی جب وہ اپنی کتاب میں کھوئے ہوئے ہوتے اور میں ان کی طرف کروٹ لے کر ان سے قریب ہونے کی کوشش کرتی تو معلوم ہے وہ کیا کہتے تھے . . . یہ کیا بے وقوفی ہے ذرا دور ہٹو۔ مجھے پڑھنے دو . . ."

اب ہم برآمدے میں پڑی ڈائننگ ٹیبل کے سامنے کھڑے تھے۔

"آپ یہیں بیٹھ کر کھانا کھاتی ہیں ؟"

" نہیں ۔۔۔ اب تو میں کچن میں ہی کھالیتی ہوں ۔" یہ جگہ مجھے اپنی شادی شدہ زندگی کے ختم ہو جانے کا احساس دلاتی ہے ۔"

" وہ کیسے ؟ "

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر نظریں جھکا کر کہنے لگی ۔ " ہمارے یہاں ایک ملازمہ ضرور تھی مگر پھر بھی کھانا میں ہی پکاتی تھی کیوں کہ میں کھانا اچھا پکالیتی ہوں ۔۔۔ چاہے آپ اسے خود ستائی ہی سمجھیں ۔ ویسے میرے شوہر بھی یہی چاہتے تھے کہ یہ سب کام میں ہی کروں اس لیے کہ ان کی نظروں میں میں ایسے ہی کاموں کے قابل تھی ۔۔۔ تو ہوا یہ کہ ایک دن میں نے بڑی محنت سے اپنی خاص ڈشس سرسوں کے تیل اور رائی میں پکی مچھلی تیار کی تھی ۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر اپنی مخصوص جگہ بیٹھے تھے ۔ اس وقت بھی ان کے ایک ہاتھ میں کوئی کتاب تھی ۔۔۔"

" یہ مچھلی واقعی بڑی مزے دار ہے ۔" انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر مچھلی کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا ۔ ان کی توجہ اب بھی پوری طرح اپنی کتاب پر تھی ۔۔۔"

" تبھی مجھے اچانک پتہ نہیں کیا ہو گیا ۔۔۔ میں طیش میں اٹھی اور ان کے کچھ سمجھ پانے سے پہلے دونوں ہاتھوں سے ٹیبل کلاتھ سمیت کر میز پر رکھا سارا سامان الٹ دیا ۔۔۔ مچھلی کی پوری پلیٹ ان کے کپڑوں پر گر گئی تھی ۔۔۔"

" کیا تم نے سچ سچ ایسا کیا تھا ؟ ۔۔۔ "

" ہاں ۔"

" پھر اس کے بعد ۔۔۔ ! "

" اس کے بعد سوال جواب ہوئے اور آخر میں سچائی باہر آگئی ۔ میں نے انھیں اپنا فیصلہ سنا دیا کہ میں ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اور اپنے والدین کے پاس جارہی ہوں ۔ اس پر انھوں نے کہا کہ مجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ۔ وہ خود میرے ساتھ نہیں رہیں گے ۔۔۔ پھر انھوں نے اپنا کچھ سامان لیا اور کسی ہوٹل میں رہنے چلے گئے ۔۔۔"

" اس کے بعد تم ان سے ملیں ؟ "

" میں ۔۔۔ اس بات کو اب دو سال سے زیادہ ہو چلے ہیں ۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ کیا وہ اب بھی ایسے ہی ہیں یا انھوں نے اپنے آپ کو بدل لیا ہے ۔ ویسے وہ بدل گئے ہوں گے اس کا یقین نہیں آتا ۔۔۔"

" اگر وہ بدل گئے ہیں تو کیا تم ان کے ساتھ رہنا چاہو گی ؟ "

" شاید ۔۔۔"

ہم برآمدے سے گزر کر اب ایک نسبتاً چھوٹے کمرے کے سامنے آگئے تھے ۔

" یہ ملازمہ کا کمرہ ہے ۔ اب میں یہیں سوتی ہوں ۔" اس نے مجھے بتایا ۔

یہ کمرہ انتہائی چھوٹا تھا ۔ اتنا کہ اس میں بہ مشکل ایک بیڈ اور ایک کرسی یا میز رکھے جا سکتے تھے ۔ سامنے بستر پر اس کی گلابی نائیٹی پڑی تھی اور کرسی کے بازو پر ایک تولیہ ۔

اچانک اس نے عجیب حرکت کی ۔

وہ بستر پر جا کر لیٹ گئی اور اپنی بانہیں گردن کے نیچے رکھ کر میری طرف دیکھنے لگی ۔ اس کی بڑی بڑی سفید آنکھوں میں

ضرورت لاحق ہوئی تھی۔

"میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ ضرور..." شاید یہ اب اس گھرانے میں میرا اور ساتھ نہیں دے سکتی۔ میں سوچ رہا تھا۔ مگر میری بات غلط ثابت ہوئی۔

"آپ شادی شدہ ہیں؟"

"ہاں... مگر میں بھی تمہاری طرح اپنی بیوی سے الگ رہ رہا ہوں۔"

"اچھا... شاید اسی لیے آپ کرایہ دار بننا چاہتے ہیں۔ خیر اب اگر آپ اس مکان میں کرایہ دار کی طرح رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو میری ایک شرط ماننی ہوگی"... وہ بستر پر لیٹی ہوئی میری طرف اسی انداز میں دیکھے جارہی تھی۔

"وہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ میرے لیے یہ کمرہ اور کچن رہنے دیں گے۔ اس کے بدلے میں میں آپ کے لیے کھانا پکانے کے علاوہ گھر کے دوسرے سب کام بھی کردوں گی..."

"یعنی کہ اس گھر میں تم میری ملازمہ کی طرح رہو گی!..."

"اگر آپ اسے یوں ہی سمجھنا چاہتے ہیں تو بھی۔ میرا جواب "ہاں" میں ہے..."

"لیکن کیا ابھی ابھی تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم اپنے شوہر سے اس بات کے لیے الگ ہوئیں کہ وہ تم کو ایک ملازمہ سے بہتر نہیں سمجھتے تھے!..."

"ہاں... لیکن آپ میرے شوہر سے مختلف ہیں۔ آپ میں زیادہ انسانیت اور ہمدردی دکھائی دیتی ہے۔ آپ کے ساتھ میں اپنی مرضی سے ملازمہ کی طرح رہنا چاہتی ہوں"... اس نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنی باہیں اوپر اٹھا کر ایک طویل انگڑائی لی... اس کی آنکھوں کی سفیدی میں سرخی گھلنے لگی تھی...

"ویسے تو تمہاری شرط بری نہیں مگر مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے"... میں نے واپسی کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔ "میں کل تک تم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردوں گا..."

باہر سڑک پر آکر مجھے اچانک خیال آیا کہ میں اس کا فون نمبر لینا بھول گیا ہوں۔ میں دوبارہ اندر گیا۔ فون پر اس کی کسی سے بات کرنے کی آواز سن کر میں کھڑکی کے پاس ٹھہر گیا... وہ اپنی کسی دوست سے مخاطب تھی۔

"کیا تو سوچ سکتی ہے کہ ابھی ابھی مجھ سے ملنے کون آیا تھا؟... ہاں وہی... تیرا دماغ واقعی بہت تیز ہے... سنو!... وہ جلد ہی دوبارہ یہاں میرے ساتھ رہنے کے لیے آرہے ہیں..."

اور کچھ سنے بغیر میں بے آواز قدموں سے چلتا ہوا تیزی سے مکان کے باہر آگیا... ۔

○●○

ڈاکٹر بیگ احساس

مطالعہ

کسی دن (ناولٹ)

مصنف : اقبال مجید

اقبال مجید کا ناولٹ " کسی دن " موجودہ عہد کی سیاسی و سماجی زندگی کا احاطہ کرتا ہے ۔ آج ہندستانی مسلمانوں کی مجموعاً اور شمالی ہند کے مسلمانوں کی خصوصاً جو حالت زار ہے اسے بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے ۔ تقسیم کے بعد مسلمان پنڈت نہرو پر بہت زیادہ بھروسا کرتے تھے لیکن راجیو گاندھی کے دور تک پہنچتے پہنچتے فرقہ پرستوں نے کانگریس پر جس طرح اپنا تسلط جمالیا اور سیکولرازم کے معنیٰ جس تیزی سے بدلے ، مسلمانوں کی تہذیب و اقدار کو پامال کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کا نقطہ ، عروج بابری مسجد کی شہادت ثابت ہوا ۔ مسلمان کانگریس سے بد دل ہوئے تو کانگریس کی جگہ فرقہ پرست جماعتوں نے اپنے پنجے گاڑ دیے ۔ یو۔ پی اور ایم ۔ پی کا مسلمان کس طرح شکست خوردہ زندگی گزار رہا ہے یہی اس ناولٹ کا موضوع ہے ۔ (یہاں یہ تذکرہ بے موقع نہیں ہوگا کہ جنوبی ہند کے مسلمانوں کا موقف بالکل مختلف ہے ۔ حیدرآباد میں مسلمانوں کے اپنے اخبارات جدید تکنیک سے بزین شائع ہوتے ہیں ۔ مسلمانوں کے عصری سہولتوں سے آراستہ مدارس ، میڈیکل و انجینئرنگ کالجس ، متوسط درجے کے نرسنگ ہومس سے لے کر سوپر اسپاشیلیٹی ہسپتال ہیں ۔ اور اب اردو ٹی ۔ وی چیانل کی منصوبہ بندی بھی کی جارہی ہے ۔)

کہانی شوکت جہاں سے شروع ہوتی ہے جو راج نیتی میں اپنے قدم جمانے کی جدوجہد کر رہی ہے وہ ایک سماجی کارکن بھی ہے جس کا سوتیلا بھائی سستے غلے کی دکان کا پرمٹ حاصل کرنے کی امید میں ہندو فرقہ پرست پارٹی کے اخبار میں کام کرنے لگتا ہے ۔ اس اخبار کا مقصد مسلمانوں کے خلاف زہر پھیلانا ہے ۔ اس کا کام ایسے مسلم دانش وروں کے بیانات تلاش کرنا ہے جو مسلمانوں کو ٹکراؤ کی سیاست سے دور رکھنا چاہتے ہیں ۔ اس کام کے لیے اسے تنخواہ ملتی ہے ۔ جمیل جو قصاب ہے قدرت اللہ پر طنز کرتا ہے ۔ قدرت اللہ بھی سخت جواب دیتا ہے ۔ بات اس قدر بڑھتی ہے کہ قدرت اللہ کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ جمیل سے معافی مانگے ۔ شوکت جہاں کو اس بات کا غم ہے کہ بکر قصابوں کے ووٹ کی خاطر اس کے بھائی کو اس ذلت آمیز معافی مانگنے پر مجبور کیا گیا ۔ شوکت اپنے شناسا کانگریسی لیڈر پرتاپ سے اس سلسلے میں بات کرتی ہے لیکن وہ اس کے لیے کچھ نہیں کرتا ۔ وہ شیراز سے ملتی ہے جو سوشیل ورکر اور فیمنسٹ دانشہ کا شوہر ہے ۔ جو کینسر کا شکار ہوکر مر گئی ۔ شوکت ، دانشہ سے اس وقت ملی تھی جب وہ خوف سے بے حد سہمی ہوئی تھی ۔ یہ خوف اس جنسی عمل کا نتیجہ تھا جو اشفاق نے اس کے ساتھ کیا تھا ۔

دانشہ اسے اس خوف کے اثر سے نکالتی ہے اور اپنی فلاحی تنظیم " کہکشاں " سے وابستہ کر دیتی ہے ۔ لیکن دانشہ کی بے وقت موت سے سارے کام ادھورے رہ جاتے ہیں ۔ شوکت ، دانشہ کے مشن کو پورا کرنا چاہتی ہے ۔ شیراز ایک انگریزی کا ایک ممتاز انقلابی ہے اس کا اچھا اثر ہے ۔ شوکت ، شیراز سے کہتی ہے کہ وہ جمیل کو معافی مانگنے پر آمادہ کرے ۔ جہاں تک ہو سکے اس کے

عادل کو اس بد تو سے معافی مانگنی پڑی، کیوں کہ نیتاؤں نے قریش برادری کا ساتھ دیا۔ شبہاز خود بھی کچھ نہیں کرتا اسے بھی خاموش رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔ لیکن ممو خاں جن کا اپنا مینگو ازم (Mangoism) ہے۔ ساری روداد سننے کے بعد حبل کو سزا دینے کا ارادہ کرلیتے ہیں۔ اور بڑے عجیب انداز میں سزا دیتے ہیں۔ پرتاپ کو جب پتہ چلتا ہے کہ حبل کے معاملے میں شوکت جہاں اور شبہاز کا ہاتھ ہے تو وہ غصے میں تلملا جاتا ہے اور شوکت کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ شوکت اس کے منہ پر تھوک دیتی ہے۔ پرتاپ اس بے عزتی کے جواب میں شوکت کو ختم کروادیتا ہے۔ عیدالاضحیٰ کے تین دن بعد شبہاز کے باغیچے کے پیچھے ایک بورے میں شوکت کی لاش ملتی ہے۔ شبہاز تو کچھ نہیں کرتا لیکن ممو خاں اپنے انداز سے پرتاپ کا خاتمہ کردیتے ہیں۔

قدرت اللہ اخبار کی ملازمت چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی بیٹی کنو جوان ہوتی ہے تو محشر ماموں کا ایک دوست داؤد رشتہ لاتا ہے اور وہ لندن کے ایک تاجر کے ہاتھوں بیاہ دی جاتی ہے کنو کا شوہر نشہ آور دواؤں کا ایجنٹ ہے۔ چار سال لندن میں رہ کر پیسہ کمانے کے بعد اپنے شوہر سے طلاق لے کر وہ ہندستان واپس آجاتی ہے اور مسلمانوں کے لیے کوئی فلاحی کام کرنا چاہتی ہے اپنی امارت قائم رکھنے کے لیے وہ ہوٹل چلاتی ہے۔ وہ اشوک سے متاثر ہے جو فلم کے طاقتور میڈیا کے ذریعے اپنی بات لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ کنو کو اشوک کا لیٹر ملتا ہے تو اسے کھولے بغیر، کہتی ہے کسی دن فرصت ہوئی تو کھولوں گی۔"

اس طرح یہ کہانی شوکت جہاں کے خوف سے شروع ہوتی ہے اور کنو کے اطمینان پر ختم ہوتی ہے۔

یہ کہانی مسلمانوں کے مختلف طبقات کو پیش کرتی ہے۔ ہندوستانی مسلمان انھیں طبقات میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جس سے شوکت جہاں تعلق رکھتی ہے۔ جس کی بوڑھی نانی نہرو جی کو سڑک سے گزرتے دیکھتیں تو دعاؤں کی بارش کرتیں اور دونوں ہاتھوں سے بلائیں لیتیں اور کہتیں میرا لعل آگیا۔ اس کے باپ کی لکڑی کی ٹال ہے۔ اس کو اس بات پر فخر تھا کہ اس نے لال بہادر شاستری جی سے کئی بار ہاتھ ملایا تھا اسے خوشی تھی کہ ہیلی کوپٹر پر بیٹھتے وقت اس نے گرم پانی کی بوتل اندرا جی کی کمر کے پیچھے رکھی تھی۔ کیوں کہ مسلسل دورہ کرنے سے ان کی پیٹھ درد کرنے لگی تھی۔ اس کے گھر پرتاپ جیسے نوجوان سیاسی کارکن اپنی غرض سے آتے ہیں عائشہ جیسی سماجی کارکن اس سے ملتی رہتی ہے۔ لیکن جو اپنے بیٹے کے لیے سستے غلے کی دکان کا پرمٹ حاصل نہیں کرسکتا۔ ردِ عمل کے طور پر اس کا بیٹا فرقہ پرست جماعت کے اخبار میں ملازم ہوجاتا ہے۔

شوکت جہاں ایک معصوم سی لڑکی جو بڑی عقیدت کے ساتھ سر پر ڈوپٹہ ڈال کر جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ سلام پڑھا کرتی زندگی اس کے ساتھ عجیب سلوک کرتی ہے۔ اس کا باپ سیاسی کارکن ہے اس کی ماں کے مرنے کے بعد وہ ایک اسکول سے شادی کرلیتا ہے۔ شوکت جہاں جوانی میں اچانک ایک حادثے کا شکار ہوجاتی ہے اپنی سہیلیوں کی سازش سے وہ شادی مذاق کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے۔ وہ عمل اس کے لیے اتنا بھیانک ثابت ہوتا ہے کہ وہ خوف زدہ رہنے لگتی ہے۔ اپنی عصمت کا اسے سخت صدمہ ہے اور ہمیشہ ایک خوف اس کی پیٹھ پر چھپکلی کی طرح نیچے گاڑے رہتا ہے۔ عائشہ اسے اس خوف سے نکالتی ہے پھر اشفاق کی اچانک موت سے بھی وہ ایک طرح کا ریلیف محسوس کرتی ہے۔ وہ عائشہ کے ساتھ اس کی تنظیم کے لیے کام کرنا چاہتی ہے، لیکن عائشہ کی بے وقت موت سے اسے پھر ایک بار جھٹکا لگتا ہے۔ اس کا بھائی حافظ ہے لیکن فرقہ پرست جماعت کا آلہ بنا ہوا ہے۔ اس کی سوتیلی ماں بد کردار ہے۔ وہ راج نیتی کی چمک دمک سے متاثر ہوکر اس میں آنا چاہتی ہے۔ لیکن پرتاپ اسے صرف ایک عورت سمجھتا ہے ایسی عورت جس کا تعلق مسلم گھرانے سے ہے۔ جو اپنی گوری کلائیوں میں چوڑیاں کھنکاتی ایک

کے ساتھ تسلیم اور آداب کرتی ہے ۔ جس کو بغل میں لے کر گھومنا اور اپنے قدم بوسوں میں لیے جانا ہندو زمینداروں کا (Status symbol) بنا جاتا ہے شوکت جہاں پرتاپ سے نفرت کرتی ہے لیکن سیاست میں قدم جمانے کے لیے وہ مصلحت آمیز رویہ اپنا لیتی ہے ۔ وہ بقول صبول نخوت دار ساڑیاں پہنتی ہے نیلی چوڑیوں اور کھلی بانہوں کی بلاؤز میں چولی بھی اندر نہیں پہنتی ۔ وہ اپنے بھائی کے سبب ہتک عزتی کا بدلہ لینا چاہتی ہے ۔ اور ممو خاں کے ذریعے وہ بدلہ لینے میں کامیاب بھی ہوجاتی ہے ۔ پرتاپ کو جب پتہ چلتا ہے کہ وہ شہباز کے ساتھ ہے تو وہ اس کے ساتھ زبردستی کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے منھ پر تھوک دیتی ہے پرتاپ اس بے عزتی کے جواب میں اسے قتل کروا دیتا ہے ۔

مسلمانوں کا ایک طبقہ شہباز کا ہے جو ایک فیکٹری کا مالک ہے ۔ وہ نام والوں اور صاحب حیثیت لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے ۔ مقامی انتظامیہ پر اپنا تسلط رکھنا چاہتا ہے ۔ پولیس کے عہدہ داروں اور کلکٹروں کی دعوت کرتا ہے ۔ انکم ٹیکس والوں کو ولایتی شراب پلاتا ہے ۔ جماعت اسلامی اور ہندو وشوا پریشد کو ایک ساتھ چندہ دیتا ہے ۔ ہندوؤں کو چوری چھپے ہندو قیمیں سپلائی کرانے کے لیے اپنی گاڑی استعمال کرواتا ہے ۔ اسے کبھی غصہ نہیں آتا وہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہے ۔ اپنی بیوی سے پیار کرتا ہے جو کینسر کا شکار ہوکر مرگئی اس کے کہنے پر شوکت پرتاپ کے منھ پر تھوکتی ہے اور اپنی جان گنواتی ہے ۔ وہ کچھ نہیں کرتا ۔

ایک طبقے کی نمائندگی ممو خاں بھی کرتے ہیں ۔ وہ آم کے کئی باغوں کے مالک ہیں وہ اپنے فیصلے خود ہی کرتے ہیں ۔ وہ ایسی اسکیم بناتے ہیں کہ کسی کو ان پر شبہ نہیں ہوتا ۔ بڑے صبر اور احتیاط کے ساتھ اپنا مشن پورا کرتے ہیں ۔ وہ صبول اور راحت میاں کو سبق سکھاتے ہیں اور پرتاپ کو ختم کرواتے ہیں ۔ انھیں اپنا محاسبہ کرنے کی بھی عادت ہے ۔ وہ ہمیشہ پرسکون رہتے ہیں ۔

مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس سے تعلق رکھنے والی عورتیں امیتابھ بچن کی فلم دیکھنے کے لیے گھنٹوں لائن میں کھڑی رہتی ہیں ۔ لائن میں ذرا بھی آگے پیچھے ہوجانے پر ایک دوسرے کی نقابیں نوچتی ہیں گریبانوں پر ہاتھ ڈالتی ہیں ۔ جوئیں ، تمباکو پھانکتے بچوں سے چھاتیاں نچرواتے ، کانسٹیبل کے ڈنڈے کھاتے ٹکٹ لیتی اور فلم دیکھتی ہیں ۔ عرس میں لگنے والے میلے میں بھنے کی کلیجی کے ٹکڑوں کو سیخوں میں پیوست کرکے کوئلوں پر سینک کر بیچنے والے گلے میں رومال باندھے اور بالوں میں سستا خوشبو دار تیل چپڑے لونڈے بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔

ایک خوش حال طبقہ کرخنداروں کا ہے جو ڈرائنگ روم میں نصر من اللہ فتح قریب لے طغرے سجاتے ہیں ۔ روزنامہ افزا حسن کا Status symbol ہے اردو ڈائجسٹ کو سینٹر ٹیبل پر رکھ کر خود کو تعلیم یافتہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں ۔ لڑکیاں ہائر سکنڈری تک پڑھتی ہیں سبز دوپٹے میں قرآن ختم کرتی ہیں پھر سہیلیوں کے عاشقوں کو لکھے جانے والے خطوط کے لیے مشاعروں اور ڈائجسٹوں سے نقل کیے گیے اشعار فراہم کرتی ہیں ۔ اپنی بہنوں ، بھتیجوں کے شوہروں کی دست درازی اور چھا چاٹی کا احوال چٹخارے لے کر بیان کرتی ہیں ۔ ننگی تصویروں والے میگزین دیکھتی ہیں اور جذباتی ہوجاتی ہیں ۔

مسلمانوں کے ایک طبقے کی نمائندگی کمو کرتی ہے جو لندن جاکر پیسہ کماتے ہیں ۔ اور خیرات سے کمائی ہوئی دولت سے مسلمانوں کے لیے فلاحی کام کرنا چاہتے ہیں ۔

(بڑے شہروں میں کانونٹ اسکولوں کی لڑکیوں کا بھی ایک طبقہ ہے ۔ خلیجی ممالک میں کام کرنے والے میاں کا بھی ایک الگ گروہ ہے)

اس ناولٹ میں شوکت جہاں کے علاوہ بھی کچھ کردار ابھرتے ہیں ۔ پرتاپ شکلا ہے جو آر ۔ ایس ۔ ایس ذہنیت کا آدمی ہے لیکن کانگریس میں شامل ہے ۔ جو نہرو اور آزاد کے سیکولرازم پر یقین نہیں رکھتا ۔ جو عورت کو صرف ایسی چیز سمجھتا ہے جو مرد کے استعمال کے لیے بنائی گئی ہے ۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کو روٹی تو مل نہیں رہی ہے اور وہ اردو بولنے کی عیاشی میں مرے جارہے ہیں ، جس کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کو مین اسٹریم میں شامل ہونے کے لیے اردو اور علی گڑھ کو گالی دینا ضروری ہے ۔ وہ گاؤ کشا کی حمایت کرتا ہے ۔ عورت کے مقابلے میں گائے کو پاکیزہ سمجھتا ہے ۔ کیوں کہ وہ سال میں بارہ بار گندی ہوتی ہے ۔ بچہ رکھتی ہے تو بھی گندی رہتی ہے اور زچگی کے بعد بہت دنوں تک گندی رہتی ہے ۔ وہ مرد کو پالنے اور بھوگنے کے لیے کہیں بھی داشتہ بن جانے میں دریغ نہیں کرتی ۔ جب عبدل اسے یہ کہتا ہے کہ شوکت شہباز کی رکھیل ہے تو وہ برداشت نہیں کرسکتا اور شوکت پر دست درازی کرتا ہے شوکت اس کے منھ پر تھوک دیتی ہے ۔ اور پرتاپ اسے ختم کروادیتا ہے ۔ اسے اس بات غصہ تھا کہ شوکت صرف اس کے ساتھ پارسائی کا ڈھونگ کر رہی تھی ۔ پرتاپ شکلا کا کردار ایسے تمام کانگریسیوں کی نمائندگی کرتا ہے جو آر ۔ ایس ۔ ایس ذہنیت کے حامل ہیں ۔

قدرت اللہ ہے جو حافظ قرآن ہے ۔ پانچ وقت پابندی سے نماز پڑھتا ہے لیکن فرقہ پرست ہندو جماعت کا آلہ ٔ کار بنا ہوا ہے ۔ لیکن ملازمت چھوڑنے کے بعد جب اس کی بیٹی گمو اپنی کمائی سے مسلمانوں کے لیے فلاحی کام کرنا چاہتی ہے تو کہتا ہے "کیا تجھے معلوم ہے ایسی کوئی اصلاح اسلام کو قبول نہ ہوگی جو شریعت کے حدود سے باہر ہو" . . . بعد میں وہ اپنی لڑکی کے منانے پر اس کا پیسہ قبول کرنے لگتا ہے ۔ قدرت اللہ کے کردار کا تضاد موجودہ دور کے مسلمانوں کی علامت ہے ۔

قدرت اللہ کی ماں ہے جو کسی اسکول میں ٹیچر تھی شوہر کے انتقال کے بعد جسم فروشی پر مجبور ہوجاتی ہے ۔ وہ پولیس کی مخبری کرتی ہے اعلیٰ حکام اور ماتحتوں کے درمیان رشوت کے لین دین میں دلالی کا کام انجام دیتی ہے ۔

گمو والا حصہ ناول سے میل نہیں کھاتا ۔ وہ بالکل الگ سی کہانی لگتی ہے ۔ شوکت جہاں کی موت پر ناولٹ ختم ہوجاتا ہے ۔ اقبال مجید غالباً لندن جانے والی نچلے متوسط طبقے کی لڑکیوں کے لندن جاکر دولت کمانے اور وطن واپس آنے پر دولت کا استعمال کرنے کے بارے میں بھی لکھنا چاہتے تھے ۔ انھوں نے نے ممبئی کے مسائل بھی اشوک کی زبانی سمیٹ لیے ۔ گمو والے حصے میں کہانی واحد متکلم کی تکنیک میں لکھی گئی ہے جب کہ باقی ناولٹ راوی بیان کرتا ہے ۔

اقبال مجید کے ناول کا اصل لطف اس کے جملوں اور مکالموں میں ہے ۔ اقبال مجید ایک کامیاب ڈراما نگار بھی ہیں اس لیے وہ مکالمے کی طاقت سے اچھی طرح واقف ہیں ۔ پورا ناول انھیں جملوں سے تعمیر ہوتا ہے ۔ اس میں کانگریس کا موجودہ نقطہ ٔ نظر فرقہ پرست جماعتوں کے سوچنے کا انداز ، علی گڑھ کا حال ، ایک نئے سرسید کی ضرورت کا احساس ، اردو اور مسلمانوں کی حالت زار بڑے جاندار اقتباسات لکھے گئے ہیں ۔ اقبال مجید نے وحیدالدین خاں ، اصغر علی انجینیر ، سعید نقوی اور موہن گو سوامی کے مضامین کا عمدہ استعمال کیا ہے ۔ یہ اقتباسات موجودہ سیاست کے گھناؤنے پن کا پردہ چاک کرتے ہیں ۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ان تمام باتوں سے بے خبر ان اخباروں سے بچوں کی غلاظت صاف کرنے کا کام لیتا ہے ۔ اس میں ایسے مسلمانوں کا ذکر بھی ہے جو اس خیال کے ہیں کہ ٹی ۔ وی ان کے بچوں اور بہو بیٹیوں کو خراب کررہا ہے ، اسے بیچ کر اس کی رقم شہباز کے حوالے کرتے ہیں تاکہ وہ رقم بے سہارا خواتین کے ہوم میں لگائی جائے ۔

(باقی ص : ۷۹ پر)

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں روانہ کی جائیں۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

○ کتاب کا نام: اردو افسانے کا پس منظر مغرب و مشرق کے حوالے سے ○ مصنف: فیاض رفعت
○ تبصرہ نگار: ڈاکٹر بیگ احساس

قصہ گوئی کی روایت بہت قدیم ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے خیال کے مطابق ــــ "یونانی نقطۂ نظر سے یہ فن شاعری اور موسیقی کی دیویوں MUSES سے بھی قدیم ہے کیوں کہ جس وقت وہ پیدا ہوئیں یہ موجود تھا۔ یہ ہمیشہ ان کا مونس رہتا اور اپنے دل فریب قصوں سے ان کے کانوں کو لذت اندوز کرتا تھا۔ اس کی جہاں گیری کا یہ حال ہے کہ کائنات کے کسی گوشے میں بھی ایسی قوم کا پتہ نہیں چلتا جس کے کان قصوں سے ناآشنا ہوں۔"

انسان اس وقت سے کہانی پیش کرتا ہے جب وہ صرف اشاروں میں مافی الضمیر ادا کرتا تھا۔ کہانی اشاروں میں سمجھی جاتی تھی پھر سنی جانے لگی۔ پھر پڑھی جانے لگی اور اب سنی اور دیکھی جاتی ہے۔ انسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ کہانی کی ہیئتیں بدلتی رہیں۔ روایت، حکایت، قصہ، کہانی، داستان، افسانہ ایک ہی سلسلے کی تدریجی کڑیاں ہیں۔ کہانی کا سراغ لگانے کے لیے محققین بہت پیچھے تک گئے۔ فضل حق قریشی کے مطابق سب سے پہلا افسانہ مصر کے شاہ فاخری (۳۸۰۰ ق۔م) کے عہد کا ہے۔ اس کا مسودہ ۳۳۵۹ ق۔م کا ہے۔ اس افسانے میں بادشاہ، بیگم، غلام اور داستان گو کا ذکر ہے۔ بیگم اور غلام میں ناجائز تعلقات ہیں۔ (کتھا ساگر۔ ساقی جولائی ۱۹۳۶ء۔ بہ حوالہ "اردو کی نثری داستانیں" پروفیسر گیان چند جین، ص: ۲۴)۔

جنوبی عراق میں سمیریائی عہد (تین ہزار تا دو ہزار قبلِ مسیح) کے تین ہیروؤں ان میکر لوگل باندہ اور گل گامش کے اوصاف رزمیہ نظموں میں بیان کی گئی ہیں جو اکڈی زبان اور میخی رسم الخط میں کچی مٹی کے لوحوں پر محفوظ ہے۔ جناب سبط حسن نے گل گامش کی مکمل داستان نقوش لاہور۔ دسمبر ۱۹۶۱ء و مئی ۱۹۶۲ء میں شائع کروائی (بہ حوالہ "اردو کی نثری داستانیں" پروفیسر گیان چند جین، ص: ۲۴) مصر میں ۲۳۰۰ ق۔م میں کشتی شکستہ ملاح ایک پیپرس PAPYRUS پر لکھا ہوا مسودہ لینن گراڈ میں محفوظ ہے۔ ایک بہت قدیم قصہ تاؤچین کا لکھا "شفتالو کے پھول" بھی ہے۔ فلسطین اور اس کے اطراف میں بھی ۱۰۰۰ ق۔م سے پہلے قصہ گوئی کی روایت قائم ہو چکی تھی۔ بہ ہرحال یہ سلسلہ دراز ہے۔

فیاض رفعت ہندستان میں قصوں کی روایت کے سلسلے میں دوسرے محققوں سے متفق ہیں کہ وید، براہمن، اپنیشد، پران، مہابھارت سے ہمارا قصہ شروع ہوتا ہے۔

قدیم سنسکرت قصوں پنچ تنتر، برہت کتھا، سرت ساگر، ہت اپدیش، شک ست پتی، بیتال پچیسی، بیتال بتیسی، جاتک سے بھی اختلاف نہیں ہے۔ اردو نظم و نثر میں تصنیف و تالیف کے ابتدائی کام کے سلسلے میں وہ دکن کی اولیت بھی تسلیم کرتے ہیں۔ شکار نامہ، کربل کتھا، سب رس، فورٹ ولیم کالج کی داستانیں، نوطرز مرصع، باغ و بہار، آرائشِ محفل، رانی کیتکی

کی کہانی اور فسانہ ۔ کتاب میں نثر کے مختلف اسالیب اور ادبیت سے بھی واقف و باخبر ہیں اور مغرب میں فرانس، روس، یونان، عرب کی کہانیاں (حکایات لقمان) کی اہمیت کے اعتراف کے بعد وہ تاریخ نگار لیوی LIVI کو روم کا پہلا قصہ گو قرار دیتے ہیں ۔ عرب و ایران میں قرآن مجید ، الف لیلیٰ ، شاہ نامہ ، کے مقام سے بھی واقف کرواتے ہیں ۔

" داستان طرازی سے افسانہ و افسوں تک " والا باب بے حد اہم ہے ۔ اس باب سے فیاض رفعت کی تحقیق اور ایک نئی تھیوری شروع ہوتی ہے ۔ وہ " طلسمِ ہوش ربا " کو افسانے کی بنیاد تسلیم کرتے ہوئے یہ ڈسکورس قائم کرتے ہیں کہ انگریزی ناولوں کے بغیر بھی ہمارے یہاں ناول پیدا ہوجاتا اور یہی بات اردو کے مختصر افسانے پر بھی صادق آتی ہے کیوں کہ طلسم ہوش ربا میں ہماری نثر کا خمیر تیار ہوچکا تھا ۔ الف لیلیٰ ، آرائشِ محفل ، رسومِ ہند اور نیرنگِ خیال کے رمزیاتی مضامین ، میر ناصر علی دہلوی کے رسالے " تیرھویں صدی " کے مضامین ان کے علاوہ صلائے عام اور " زمانہ " کے بعض تمثیلی مضامین ، دل گداز ، تحفہ ، مخزن ، میں سجاد حیدر یلدرم سے عبدالعزیز فلک پیما تک کے مضامین ، سید ناصرالدین فراق کے انشائیے ۔ اردو اخبار سید الاخبار ، صادق الاخبار ، کریم الاخبار ، ضیا الاخبار ، وحید الاخبار ، کوہ نور اخبار ، اصلاحی تحریکیں ، وہابی و سرسید تحریک ، کلکتہ اور حیدرآباد میں تراجم کے مراکز ، ماسٹر رام چندر موتی لال ، محمد حسین آزاد ، ذکاء اللہ ، بھگوان داس ، خواجہ ضیاء الدین ، کی انشا پردازی ، شبلی اور شرر کے انشائیے کے ذریعے فیاض رفعت بڑی خوب صورتی سے کہانی کی زنجیر بناتے ہیں ۔ فیاض رفعت آزاد کے مضامین میں افسانے کے اولین نقوش تلاش کرتے ہیں ۔ ان کی تحقیق کے مطابق " رسومِ ہند " ایسی تصنیف ہے جس میں افسانوی ادب کے نقوش سب سے زیادہ ملتے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم نذیر احمد ، سرشار اور شرر کے ناولوں کو نظر انداز کرسکتے ہیں جب کہ توبۃ النصوح میں مرزا ظاہر دار بیگ والا قصہ ایک مکمل افسانہ لگتا ہے ۔ اسی طرح فسانہ ، آزاد کے بعض حصے اپنی جگہ مکمل کہانی لگتے ہیں ۔ ویسے بھی ناول اور افسانے کے درمیان صرف ۳۴ برس کا فرق ہے ۔ نذیر احمد نے پہلا ناول ۱۸۶۹ء میں لکھا تھا اور ابتدائی افسانے راشد الخیری کا نصیر اور خدیجہ (مخزن دسمبر ۱۹۰۳ء) خواجہ حسن نظامی کا شہزادے کا بازار میں گھسیٹنا (۱۹۰۶ء) محمد علی محمود مانگی پوری کا چھاؤں (مخزن جنوری ۱۹۰۴ء) سلطان حیدر جوش کا مساوات (۱۹۰۴ء) یوسف حسین کا پُر اسرار عمارت (۱۹۰۵ء) یلدرم کے غریب وطن دوست کا خط (۱۹۰۶ء) پریم چند " دنیا کا سب سے انمول رتن " (زمانہ ۱۹۰۷ء) ہیں ۔

رسومِ ہند کو افسانے کا اولین نقش سمجھنے میں کوئی حرج نہیں ۔ ظاہر ہے افسانے کی جڑیں داستان سے لے کر انشائیے تک مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی ہیں ۔

اس کتاب کی دو اہم خوبیاں ہیں ۔ پہلی خوبی اس کا اختصار ہے ۔ اتنے وسیع موضوع کو انھوں نے صرف ۱۱۵ صفحات میں سمیٹ لیا ۔ دوسری خوبی انھوں نے اس کا پیش لفظ نوجوان نقاد ڈاکٹر ارتضیٰ کریم سے لکھوایا ۔ ورنہ اگر وہ چاہتے تو بڑے سے بڑا نقاد پیش لفظ لکھنے تیار ہوجاتا ۔ کتاب کمپوزنگ کی غلطیوں سے پاک ہے ۔

○ سائز ۸/۱۶ × ۱۸ ڈیمائی ○ قیمت : ۱۰۰ روپے ○ ضخامت : ۱۱۵ صفحات ○ ملنے کا پتہ : تخلیق کار پبلیشرز ۱۹۶۹ ، کوچہ چیلان ، دریا گنج ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲ ●●●

○ کتاب کا نام : افکارِ تازہ (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ○ مصنف اور ناشر : ڈاکٹر سید عبدالباری
○ تبصرہ نگار : ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

ادب کے مختلف نظریات میں ایک نظریہ تعمیری ادب کا بھی ہے جس میں توازن، شائستگی، خیر اور صداقت جیسے اقدار کی پاس داری کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری اسی نظریہ فکر کے علم بردار ہیں جن کے تنقیدی مضامین کا تیسرا مجموعہ " افکارِ تازہ " کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ جس کے چند مشمولات میں ادب کی تفہیم کے کچھ اہم مباحث قاری کو سوچنے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہیں۔

سترہ مضامین کے اس مجموعے میں سب سے پہلا مضمون " سرکارِ دوعالمؐ کا حسنِ کلام " ہے اور اپنے موضوع و مواد کے اعتبار سے اسے یقیناً اولیت حاصل ہونی چاہیے۔ نبی کریمؐ کی زبانِ مبارک سے نکلا ہوا ہر لفظ ہمارے لیے مقدس تو ہے ہی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عہدِ نبیؐ کے بلاغت اور فصاحت کے مروجہ معیارات سے آگے بڑھ کر نہ صرف آج تک کے بلکہ قیامت تک کے معیارات کے اعتبار سے بھی حضور نبی کریمؐ کے ارشادات اعلیٰ ترین، تام کے حامل ہیں۔ اس معجز نما کلام کے رموز تک رسائی آسان نہیں پھر بھی ڈاکٹر عبدالباری نے چند نکات کی طرف توجہ دلا کر مزید غور و فکر کی راہیں ہموار کی ہیں۔ دوسرا مضمون مراتب کے اعتبار سے حضرت علیؓ کی فرمودات " نہج البلاغہ " پر مبنی ہے۔ حضرت علیؓ علم کے شہر کا دروازہ ہیں اس لیے بلاشک و شبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کے خطبات اور اقوال میں جو حکمت و فکر کی شمعیں فروزاں ہیں، ان کی روشنی رہتی دنیا کے لیے منبعِ فیض ہے۔ اپنے اگلے مضمون " ادب کی تخلیق و تنقید کا اسلامی منہاج " میں ڈاکٹر باری نے ارسطو سے لے کر بیسویں صدی کے تنقیدی نظریات کے پس منظر میں ادب اسلامی کے بنیادی اصولوں کے خدوخال واضح کرتے ہوئے تنقید کے اسلامی منہاج کی نشان دہی کی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ یونانی فلسفہ نے دنیا بھر کے تنقیدی نظریات کو متاثر کیا ہے۔ چناں چہ خود عرب و عجم کے مسلم علما و حکما نے ان نظریات سے اثر قبول کیا اور منطقی استدلال کو اہمیت دی جس کی وجہ یہ تھی کہ انسانی ذہن منطقی استدلال کو آسانی سے قبول کرلیتا ہے۔ اپنی بات کہنے کے لیے اظہار کا اسلوب بھی کافی اہم ہوتا ہے۔ اسی لیے ابن المعتز، ابنِ رشیق، عبدالقادر جرجانی اور ابن خلدون جیسے علما نے فصاحت اور بلاغت کو اہمیت دی لیکن ڈاکٹر باری کے خیال کے مطابق ایسی شاعری " کوئی پیغام " ادا نہ کرسکی اور ادب برائے ادب کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہی۔ انھیں اس بات پر ملال ہے کہ عہدِ وسطی کے علمائے کے ہاں لفظ و معنی کے مباحث، صنائع و بدائع، فصاحت و بلاغت اور مروضی نظامِ نقد کی ہما ہمی نظر آتی ہے۔ یہاں یہ بات عرض کرنی ہے کہ رشید وطواط یا قیس رازی یا دوسروں نے ادبی نظریات کے ضمن میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان پر بہ ظاہر یونانی فلسفے کا اثر محسوس ہوتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے کہ ان علما نے صالح اقدار اور فکر کی پاکیزگی کو فصاحت اور بلاغت پر قربان کردیا ہو۔

اس مجموعے کا چوتھا مضمون " ادب کی صورتِ حال اشتراکیت کے زوال سے پہلے زوال کے بعد " ہے جس میں ڈاکٹر باری نے ترقی پسند تحریک کے آغاز، ارتقا، زوال اور بعد زوال ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر اپنے مخصوص اندازِ فکر کی روشنی میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے بعد " مولانا فراہی اور شعریات مشرق " کے زیرِ عنوان مضمون ہے۔ مولانا حمیدالدین فراہی کی نکتہ رسی اور ادبی مقام کے بارے میں اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی کتاب کا تعارف مولانا شبلی نے

تھا اور اگر ادبی تمیز کی پہچان بھی کی جائے تو شاید مولانا فراہی وہ پہلے عالم ہیں جنھوں نے تنقید کے لیے اسلامی نظریات کو اہمیت دی اور ارسطو کی شعریات کو رد کیا۔ مولانا فراہی کے مطابق بلاغت شجرِ ممنوعہ ہے۔ انھوں نے علمائے بلاغت و بیان سے اور باتوں کے علاوہ اس بنا پر بھی اختلاف کیا کہ تشبیہ و تمثیل اور استعارے کی بنیاد جھوٹ پر رکھی جاتی ہے اور ڈاکٹر باری بھی اسی نظریے کے حامی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ انتہاپسندانہ فکر نہیں . . . اور اگر ادب سے تشبیہ، استعارہ اور علامت خارج کردی جائے تو پھر باقی کیا رہ جائے گا۔ کیا سپاٹ قسم کا اظہار ہی ادب ہے . . . ویسے خود مولانا فراہی کے مطابق تشبیہ و تمثیل معنی کی توضیح و تشریح کے لیے ہوتی ہیں نہ کہ فقط کلام میں حسن پیدا کرنے کے لیے۔ یعنی کم از کم معنی کی تشریح و توضیح کے لیے ہی سہی وہ تشبیہ و تمثیل اور استعارے کی اہمیت سے انکار نہ کرسکے۔ اس مجموعے کا اگلا مضمون اقبال کی اسلامی فکر سے متعلق ہے جس میں ڈاکٹر باری نے اقبال کے اضطراب اور آرزو مندی سے مملو فلسفیانہ افکار کی وضاحت کی ہے۔

"مجروح کا تغزل" کے زیرِ عنوان مضمون میں مجروح کے کلام پر قدرے سخت تبصرہ ملتا ہے لیکن ساتھ ہی مجروح کی درد مندی، بصیرت اور طلبِ حقیقت کی خواہش کا جائزہ بھی ہے۔ خصوصاً اس مضمون کے بعد ضمیمہ کے عنوان سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر باری نے جہاں ایک طرف مجروح کی ترقی پسندی کو آڑے ہاتھوں لیا وہیں مجروح کی صاحب نظری کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اسی طرح معین احسن جذبی پر تحریر کردہ مضمون میں وہ جذبی کے ترقی پسند تصورات پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے دوسرے دور کے متوازن رویے اور ان کے تغزل کی جوئے نرم خرام کو سراہتے ہیں۔ داغ کے لیے ڈاکٹر باری کا خیال ہے کہ بیسویں صدی نے اس کی قادر الکلامی اور زبان دانی کی داد تو دی مگر اس کی فکری زنبیل، بڑی حد تک خالی ہونے کے سبب اس کو صفِ اول کے شعرا میں جگہ نہ مل سکی۔ جب کہ جگر کو انھوں نے بیدار مغز اور مشرقیت کی جملہ دل کش قدروں کا مرقع قرار دیتے ہوئے اس کی فکری بالیدگی اور عصری شعور کی نشان دہی کی ہے۔

"افکارِ تازہ" میں اسلامی ادب کے نمائندہ شعرا حفیظ میرٹھی، منیر سلطان پوری اور فاروق بانسپاری کی شعری تخلیقات پر اپنی رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر باری نے ان شعرا کی وسعتِ نظر، سیاسی بصیرت اور سوز و گداز پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں ابنِ فرید اور پروفیسر مشیرالحق کی افسانہ نگاری پر بھی مضامین شامل ہیں جن میں ان کے فکری منہاج اور تخلیقات میں اس کے اظہار کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

"اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت" کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں طنز و مزاح کے معاشرے پر اثر انداز ہونے والی مثبت کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل "اردو لسانی جارحیت کا نشانہ کیوں" ایک اہم مضمون ہے جس میں اردو کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے اربابِ اقتدار کے اردو دشمن رویے پر کڑی اور بے باکانہ تنقید ہے۔
مجموعی طور پر ڈاکٹر سید عبدالباری کے مضامین کا یہ مجموعہ "افکارِ تازہ" قاری کو ادبی منظر نامے کے اس پہلو کی طرف متوجہ کرتا ہے جہاں خیر و صداقت، درد مندی، اخلاص اور فکر کی پاکیزگی بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شستہ اور دل کش انداز تحریر اور مباحث کے اسلوب سے یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر باری اپنی بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ نقد علمی و ادبی حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

○ سائز: ۸/۱ ڈیمائی ○ قیمت: ۱۰۰ روپے ○ ضخامت: ۲۸۵ صفحات ○ اشاعت: دسمبر ۱۹۹۶ء ●●●

○ کتاب کا نام : جادو ٹونا سایہ (شاعری) ○ مصنف : رضوان سعید ○ تبصرہ نگار : سید خالد قادری

سلطان پور کے بزرگ اور معروف شعرا مجوز سلطان پوری مجروح سلطان پوری اور نیر سلطان پوری کے بعد وہاں نئی نسل کے جن شعرا نے بزمِ شعر و ادب میں پہلی سی ہماہمی برقرار رکھی ہے ان میں حبیب اجمل اور رضوان سعید کے نام نمایاں ہیں ۔ یہ وہ نوجوان ہیں جن کے دم سے اس چھوٹے سے الگ تھلگ شہر میں شمعِ شعر و سخن آج بھی فروزاں نظر آتی ہے ۔

رضوان سعید کا زیرِ نظر مجموعہ کلام " جادو ٹونا سایہ " جیسا کہ انہوں نے اعتراف کیا ہے شاعر کی خود اپنی بے اعتنائی کے باعث تاخیر سے منظرِ عام پر آیا ہے ۔ اسے بہت پہلے شائع ہونا چاہیے تھا ۔ مجموعے کا عنوان انھوں نے خود اپنے اس شعر سے اخذ کیا ہے ۔

کیا کیا فتنے توڑ رہی ہے بیٹھی شام کی جوگن   لب چتون رد کھے کاکل جادو ٹونا سایہ

مگر بہ ظاہر جادو ٹونا سایہ یا اوہام سے ان کی شاعری کا کوئی سیدھا رشتہ دکھائی نہیں دیتا ۔ البتہ ابہام کے تعلق سے یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری کو اپنا تجربہ بنانے کے لیے قاری کو کبھی کبھی ابہام و تفہیم کے مشکل مراحل سے گزرنا پڑسکتا ہے ۔

رضوان سعید ایک حساس اور گداز قلب کے مالک ہیں ۔ ان کی تمام شاعری ایک ایسے شدتِ احساس سے عبارت ہے جس کی اعلیٰ مثالیں ناصر کاظمی اور شکیب جلالی کے یہاں پائی جاتی ہیں ۔ اداسی ، تشنگی ، تنہائی اور نارسائی ، ویسے تو ہر دور میں قلبِ شاعر ان احساسات سے معمور رہا ہے مگر رضوان سعید کی شاعری میں ان کے اظہار کا اپنا منفرد رنگ ہے ۔

ہو کے عالم سے تنہائیاں بھر گئیں
کیا کروں وحشتیں مجھ میں گھر کر گئیں
راستے سو گئے گردشیں اوڑھ کر
میرے آسیب سے وادیاں ڈر گئیں

○

یہ سوچتا ہوں کبھی اس قدر تپش بڑھ جائے
کہ اپنے جسم پہ ابھروں اور آبلے بن جاؤں
کسی بھی راہ میں بے آس ہو کے بیٹھ رہوں
ڈھلے جو شام تو اشکوں کے قمقمے بن جاؤں

○

غمِ دل اب کہاں پائے گا مجھ کو
یہ سناٹا نگل جائے گا مجھ کو
کہو طوفاں سے دیکھے شہرِ خوباں
میں اک صحرا ہوں کیا ڈھائے گا مجھ کو

اپنے منفرد اسلوب اور موضوع میں تنوع کے ساتھ ساتھ رضوان سعید نے اپنی شاعری میں علاقائی بولی اور عوامی محاورے کے

کی کامیابی تجربہ کیا ہے ۔ شاید یہی تمام خوبیاں مل کر ان کی شاعری کو ایک الگ لہجہ اور آہنگ عطا کرتی ہیں ۔

اس مجموعے کی ابتدا میں جو اعتراف وہ خود اپنی ذات کے بارے میں کرتے ہیں کہ بے سمتی اور آوارگی کے ایک طویل سلسلے کے بعد ہی وہ منزل کا نشان پاسکے شاید وہی کچھ بہ حیثیت شاعر ان کے تخلیقی سفر پر بھی صادق آتا ہے ۔ یعنی یہ کہ ابھی بھی تجربات و تنظیم کے مزید مراحل سے گزرنا ہے ہرچند کہ اب تک شاید یہ راز ان پر آشکار ہوچکا ہے کہ :

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

مجھے یقین ہے کہ رضوان صفیہ کی شاعری اپنی تخلیقی توانائی اور ندرت کے سبب اہلِ ذوق حضرات کو اپنی طرف متوجہ کرسکے گی ۔

○ سائز : ۸/۱ ڈیمائی　○ قیمت : ۱۰۰ روپے　○ ضخامت : ۱۴۴ صفحات　○ ملنے کا پتہ : دانش محل ، امین آباد ، کتابستان الہ آباد ، ناز بک ڈپو کوروانڈ ناکہ ، سلطان پور ، یو ۔ پی ۔ ●●●

○ کتاب کا نام : تکمیل (شاعری)　○ مصنف : من موہن تلخ　○ تبصرہ نگار : مغنی تبسم

من موہن تلخ گزشتہ چار دہائیوں سے شعر کہہ رہے ہیں ۔ ان کے تخلیقی سفر کے دوران ہمارے ادب میں مختلف میلانات اور تحریکیں ابھریں لیکن وہ کسی تحریک کے ساتھ بہہ نہیں گئے ، کسی رجحان کو فیشن کے طور پر نہیں اپنایا ۔ وقتی شہرت کے پیچھے نہیں دوڑے ، بھیڑ بھاڑ سے خود کو الگ رکھا ، ذاتی فکر کو اپنا رہنما بنایا اور انفرادی تجربے اور احساس پر اپنی شاعری کی اساس رکھی ۔ بڑھتی ہوئی عمر اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا اثر ان کی شاعری پر ضرور ہوا اور ایک فطری انداز میں ان کی شاعری ارتقا پذیر رہی ۔

من موہن تلخ کے تین شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں ۔ پہلا شعری مجموعہ " چراغِ فکر " ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا جب ترقی پسند تحریک کا زور ٹوٹ چکا تھا اور جدیدیت کے رجحان کا آغاز تھا ۔ ۱۹۷۰ء میں ان کا دوسرا مجموعہ ، کلام " جذبہ و آواز " کے نام سے شائع ہوا ۔ اس وقت تک تلخ جدید اردو شاعری میں ایک نمایاں اور اہم مقام حاصل کرچکے تھے ۔ پھر اس کے بعد ایک طویل خاموشی کا دور گزرا ۔ رسائل میں ان کا کلام بہت کم کہیں نظر آتا ۔ ان کے کلام کے مجموعے بھی کم یاب ہوگئے ۔ بالآخر انھوں نے سکوت توڑا اور ازسرِ نو شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور اب ان کا نیا مجموعہ ، کلام " تکمیل " منظرِ عام پر آیا ہے اور رسائل میں بھی ان کی تخلیقات شائع ہونے لگی ہیں ۔ " تکمیل " کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب ان کے فن میں زیادہ رچاؤ اور پختگی آ گئی ہے ۔

من موہن تلخ نے جب شعر گوئی کی ابتدا کی اس وقت بھی ان کے لہجے اور اسلوب میں انفرادیت تھی اور یہ محسوس ہورہا تھا کہ اردو کی شاعری میں ایک نئی آواز ابھر رہی ہے ۔ انھوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے لیے ایک نئی راہ بنانے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب رہے ۔ وہ منفرد انداز میں سوچتے اور محسوس کرتے ہیں ۔ اسی لیے ان کے اظہار کے پیرائے بھی منفرد ہیں ۔ انھوں نے اپنے اظہار کے لیے بعض نئے علائم و رموز وضع کیے ہیں اور مانوس علامتوں اور استعاروں کو نئے مفاہیم دیے ہیں ۔ آواز اور سکوت کے علائم ان کی شاعری میں بار بار آتے ہیں ۔ ان علائم سے انھوں نے شاعرانہ کام لیا ہے ۔

من موہن تلخ کی شاعری میں غمِ ذات اکثر غمِ حیات اور غمِ کائنات کی شکل اختیار کرجاتا ہے ۔ اس میں عصری حسیت کا بڑا دخل ہے ۔ کبھی ان کی فکر مابعد الطبیعاتی سطح کو چھولیتی ہے ۔

من موہن تلخ کی شاعری کا بہتر تعارف چند منتخب اشعار سے ہوجائے گا جو ذیل میں پیش ہیں :

بولتا رہتا ہے مجھ سے یہ تعلق تیرا ان کہی سی تری باتوں کی کسک ہے مجھ میں
پہچان تو کچھ اپنی بنادی ہے اسی سے یہ جو بھی تعلق ہے برا ہے کہ بھلا ہے
جیسے رات کو دریا کا سویا سویا سا پانی پچھلے چند دنوں سے جانے کیسے اپنا جی ہے
ہم نے چراغِ فکر لہو سے جلا دیا لیکن ملا نہیں ترا نقشِ قدم ابھی
دیوانہ وار ہنس بھی دیے اپنے حال پر پھر چپ بھی ہوگئے کہ کوئی دیکھتا نہ ہو
نہ بھاگنے کے رہے ہم نہ اب ٹھہرنے کے وہ لمحے آئے جو آکر نہیں گزرنے کے
بنوں گا اب سجاوٹ اپنے گھر کی کہ پتھر کی سی مورت ہو گیا ہوں
اکیلا ہوں مگر ہر لحظہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ جیسے کوئی گزرا ہے ابھی میرے برابر سے
جب تک دکھائی دوں تو ادھورا کہو مجھے ہو جاؤں گم تو مجھکو مکمل ہوا ہوں میں
میں تیری آہٹ کا سفر ہوں رہ رہ کر دھیان آئے جیسے میرے عین برابر تیرے پاؤں پڑے ہیں
کس قدر ہوگئے یہ فاصلے اب ہم کو عزیز تم جو برسوں نہ ملو ہم سے تو حیرت نہ کریں
اک تمنائے تعلق کے سہارے تم سے کیا تعلق سا بنا رکھا ہے دل ہی دل میں
خود سے دم بھر کو یہ ملنے کا بھی ہے خوب سماں سانس ہے یا کوئی پل بھر کا ملاقاتی ہے
اور رکھا ہی یہاں کیا تھا بہانوں کے سوا زندگی آج بہانوں سے بھی کتراتی ہے
گزار کر تری یادوں میں چار دن ہم نے سمجھ لیا کہ کوئی خاص بات کر دی ہے
بس ہمیں بھی تھا یہی اپنا پتہ تا در دوست کبھی آواز کبھی گوش بر آواز تھے ہم
فاش ہم خود پہ ہوئے راز کھلا کیوں تیرا راز جو تھے ترے یا خود ہی ترا راز تھے ہم
خود اپنے آپ کو رد کررہا ہے ہر لمحہ یہ دور ہاتھ سے بے دکھائی دیتا ہے
جی رو اٹھا ہے دیکھ کے دنیا کو شوخ و شنگ قبل از سکوت تھے یہی میرے بھی رنگ ڈھنگ
دن چڑھے پھر وہی اجڑا ہوا ویران کھنڈر رات کو خواب میں ڈولی ہوئی بستی سی لگے
اب راہ میں گم سم سے کھڑے ہیں کہ کدھر جائیں گھر سے تو چلے آئے بہت شور مچا کر
حیران سے کیا میرا کھنڈر دیکھ رہے ہو جس کا بھی جو پتھر ہے وہ لے جائے اٹھا کر

○ ۸ / ۱ ڈیمائی سائز ○ مجلد ○ صفحات : ۱۲۸ ○ قیمت : ساٹھ روپے ○ ناشر : مصنف ، بی ۱۸۰، گل مہر پارک ، نئی دلی ۱۱۰۰۴۹ ●●●

○ کتاب کا نام : اقرا (شاعری) ○ مصنف : حمدون عثمانی ○ تبصرہ نگار : سید خالد قادری

حمدون عثمانی کا زیر نظر مجموعہ کلام "اقرا" جو اب ۱۹۹۸ میں ان کے ورثاء اور الہ آباد رائٹرس گلڈ کی مجموعی مساعی کے نتیجہ میں اشاعت کے مراحل طے کر پایا ہے دراصل بہت پہلے شائع ہونا چاہیے تھا۔ مگر جس شاعر نے خود اپنی زندگی ایک حرف غلط

فن کارگزاری ہو اس کے سلسلے میں ان باتوں کی گنجائش کہاں پیدا ہوتی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے حمدون عثمانی کا نام ان شاعروں کی فہرست میں شامل رہا ہے جن کے کلام کو ساٹھ کے دہے میں اردو شاعری کی نئی آواز کے طور پر پہچانا گیا تھا۔ ان کا وطن الہ آباد ہے اور حسنِ اتفاق سے یہ وہی شہر ہے جہاں سے انھی دنوں "شب خون" کا اجرا عمل میں آیا تھا۔ جدیدیت کی تحریک سے جڑے اردو شاعری کے افق پر ابھرنے والے ان نئے ناموں کی شناخت میں اس پرچے نے جو اہم رول ادا کیا تھا اس سے اعتراف سے آج کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اس وقت گو کہ ایسے شاعروں کی فہرست کچھ زیادہ طویل نہ تھی مگر ان میں سے زیادہ تر اپنے لب و لہجے کی ندرت اور غیر روایتی طرزِ اظہار کے سبب پہچانے جاتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ۸۰ کے دہے تک آتے آتے یہ اردو شاعری کا یہ مختصر قافلہ ایک ایسی بھیڑ میں تبدیل ہوگیا جہاں اچھے برے کی تمیز کرنا دشوار ہو چلا۔

حمدون عثمانی کا کلام ان دنوں "شب خون" اور چند دوسرے جرائد میں شائع ہو کر اہلِ نظر حضرات کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا چکا تھا۔ وہ ان دنوں الہ آباد کی شعری محفلوں میں بھی پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ مگر پھر اس کے بعد ان کی بے ترتیب حیات کا شیرازہ کچھ یوں منتشر ہوا کہ یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ انھیں قریب سے جاننے والے جانتے ہیں کہ بعد کے دنوں میں کس طرح ان کی زندگی خود کشی کی ایک طویل کوشش بن کر رہ گئی تھی اور شاعری ایک چیز یا کراہ۔ اور یوں حمدون عثمانی جلد ہی ان فن کاروں میں شامل ہوگئے جو ذہنی و جذباتی نا آسودگی اور ناموافق حالات کا شکار ہو کر خود اپنے ادراک کی سولی پر لٹک گئے۔

آج سے تقریباً بیس سال قبل جب صاحبِ کتاب سے میری ملاقات اچانک الہ آباد میں ہوئی تھی تو میں ان کے اشعار سن کر چونک پڑا تھا۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ الہ آباد میں اب صرف مشاعروں کے شاعر ہی پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ شاعروں کے شاعر فراق بھی ان دنوں مشاعروں کے شاعر بن کر رہ گئے تھے۔ الہ آباد میں حمدون عثمانی جیسا کوئی شاعر بھی ہوگا، یہ میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ ان کی تخلیقی زندگی یوں اس قدر جلد انتشار کا شکار نہ ہوجاتی تو ان سے دنیائے شعر وادب میں بڑی توقعات وابستہ کی جاسکتی تھیں۔

ساحل احمد نے اپنے پیش لفظ میں بہ حیثیت شاعر حمدون عثمانی کی ہنر مندی، خلاقی اور ذہنی تونگری کی بجا طور پر ستائش کی ہے۔ اس مجموعے میں شامل ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں ہی اپنے اسلوب، تازہ تراکیب اور نئے استعاروں کے استعمال کے سبب قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

اپنے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے ایک لہو خوار شجر لگتا ہے
آبدن چھوڑ کے ڈھونڈیں اس کو گھر تو یہ ریت کا گھر لگتا ہے
جانے کیا بات ہے اکثر مجھ کو چاندنی [illegible] سر لگتا ہے

٥

یہ کرب یہ نیرنگیٔ احساس نہ رہ جائے ایسا تو کبھی ہو کہ تری آس نہ رہ جائے
کچھ اور لہو تھوک مرے ڈوبتے سورج احساس کے ہونٹوں پہ کہیں پیاس نہ رہ جائے
آ کود کے دیکھیں تو ذرا وقت کی چھت سے شاید یہ جنوں خیزیٔ احساس نہ رہ جائے

٥

اور سلگاؤ سانسوں کی یہ مردہ شاخیں کچھ تو خمیازہ، سیاہیِ جاں رہ جائے
جراءت طبعِ پراگندہ کوئی جست لگا تاکہ پیچھے خلشِ دیدہ و جاں رہ جائے
اب تو ایسی ہی کوئی شام ملے جس کے بعد ہر طرف صرف دھواں صرف دھواں رہ جائے

○

حمدون عثمانی کی شاعری میں احساسِ تشنگی، احتجاج، بے اطمینانی اور کرب و مایوسی کے ساتھ حد سے بڑھی ہوئی قنوطیت کا رنگ غالب ہے۔ شاعری کا یہ رنگ اردو کے کئی اور اہم شاعروں جیسے فانی اور مجاز اور بعد میں ناصر کاظمی اور شکیب جلالی کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ بہ ظاہر تو اسے ہم شاعر کے نجی تجربات، داخلی احساس اور زندگی کے ایک مخصوص قسم کے شعور کا منطقی نتیجہ کہہ سکتے ہیں مگر یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ آگے سوچا جائے تو یہاں نہ صرف فرد اور سماج کے رشتہ کی پیچیدگیاں اور انسان کا انفرادی مقدر بلکہ ادب میں داخلیت اور معروضیت سے متعلق بھی کئی ایسے سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو ایک طویل مباحثے کا متقاضی ہیں۔

○ ۸/۱ ڈیمائی سائز ○ مجلد ○ صفحات : ۱۲۰ ○ قیمت : پچھتر روپے ○ ناشر : اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد۔ ●●●

○ کتاب کا نام: شہرِ بدنصیب ○ مصنف: اقبال مجید ○ تبصرہ نگار: ڈاکٹر بیگ احساس

"شہرِ بدنصیب" اقبال مجید کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اقبال مجید کا تعلق افسانہ نگاروں کی اس نسل سے ہے جس نے آزادی کے بعد لکھنا شروع کیا اور ترقی پسند تحریک کے دیو قامت افسانہ نگاروں کے درمیان اپنی شناخت بنائی اور جدیدیت کے طوفان سے بھی متاثر نہیں ہوئے۔ اقبال مجید کی کہانی "دو بھیگے ہوئے لوگ" اس زمانے میں مشہور ہوئی جب نقاد جدید افسانہ نگاروں کی بے ہنگم تحریروں کو نئے نئے معنی دے کر انھیں عظیم افسانہ نگار قرار دینے کی سعیِ لاحاصل میں مصروف تھے۔

"شہرِ بدنصیب" میں پندرہ کہانیاں شامل ہیں۔ یہ مختلف موضوعات پر جدا جدا اسلوب میں لکھی گئی کہانیاں ہیں۔ کہیں لوک کہانیوں کا، کہیں اساطیر کا، کہیں سیدھے سادے بیانیہ کا اور کہیں ڈرامائیت کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ہر کہانی اپنی جگہ مکمل حیثیت رکھتی ہے اور پڑھنے والے کو ایک تحیر خیز مسرت سے ہم کنار کرتی ہے۔

"حکایت ایک نیزے کی"، "شہرِ بدنصیب"، "سکون کی نیند"، "مچھلیوں کا کھیت" حکایتوں اور داستانوں کے اسلوب میں لکھی گئی کہانیاں ہیں۔

نیزہ نادر شاہ کا ہے جو ایک درزن کو سڑک کے کنارے پڑا ملتا ہے۔ پھر انسانی ہوس کی کہانی شروع ہوجاتی ہے۔ دولت کی لالچ میں اس نیزے سے چار خون ہوتے ہیں اور آخر میں خود درزن اس نیزے کا شکار ہوجاتی ہے۔ اس کہانی میں گہری معنویت ہے۔ واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ بزرگ درزن سے پوچھتے ہیں:

"اب تک کتنے خون کرچکی ہے اس نیزے سے؟"

"چار"

"اور مار۔۔۔" بزرگ دھیرے سے بولا

"نہیں میں نے اس کے پیچھے اپنا گھر برباد کیا، شوہر کو مارا، دغاباز عاشق کی جان لی، قزاق کی موت آئی، ظفر خاں کا خون

کیا، کتنی جانیں جا چکی ہیں ان چند دنوں میں۔"

"اور جانیں لے جو نیزہ ایک دن میں چار سو جانیں چاٹ لے وہ تیرے ہاتھوں بھوکا مر رہا ہے۔"

"لیکن میں سلطان نہیں ہوں جو ایسا کر سکوں۔"

"تو پھر بادشاہوں کے کھلونوں سے کیوں کھیل رہی ہے۔"

وہ اسے بتاتا ہے کہ تاریخ جب چالیس ہزار نیزہ کھانے والے پیدا کر چکتی ہے تب ایک نیزہ مارنے والا پیدا کرتی ہے۔

"شہرِ بدنصیب" کا مرکزی کردار حاتم ہے۔ ایک شہرِ بدنصیب وہ ہے جہاں کسی کو کسی بات پر غصہ نہیں آتا اور ایک شہرِ بدنصیب وہ ہے جہاں ذرا سی بات پر لوگ خون کر دیتے ہیں۔ حاتم شہرِ خوش نصیب پہنچتا ہے جہاں غصہ حسبِ ضرورت ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن پرانا غصہ گودام میں رکھے رکھے سڑ جاتا ہے۔ یہ اس بڑے ملک کی کہانی ہے جہاں غیر طبقاتی نظام کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور جذبوں کو ناپ تول کر استعمال کیا جانے لگا تھا جہاں جذبے سڑ گئے اور کوئی شہرِ خوش نصیب وجود میں نہ آ سکا۔

انسانی جذبات کو موضوع بنا کر اخلاقی نتائج اخذ کرنے کی روایت اردو کی پہلی داستان "سب رس" سے شروع ہوئی تھی اقبال مجید نے اس کا بہت ہی خوب صورت استعمال کیا۔ سوالوں کے جواب تلاش کرنے کے لیے حاتم سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا کردار ہماری نثر کی روایت میں موجود نہیں ہے۔

"سکون کی نیند" صارفیت کے شکار معاشرے کی کہانی ہے۔ مفت کی دولت کیسی لعنتیں ساتھ لاتی ہے اور پھر جب وہ پر بن آتی ہے تو دولت کس طرح بے مصرف ہو جاتی ہے اسے داستانی اسلوب میں پیش کیا گیا۔ "مچھلیوں کا کھیت"، "اعتبار" اور "اختیارات" کی کہانی ہے۔ مرد جب اختیارات کے چھن جانے کے خوف سے عورت پر ظلم کرتا ہے تو عورت بھی مکاری پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

"حکایتوں اور داستانوں کے اسلوب میں لکھی گئی یہ کہانیاں دراصل اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ زمانہ کتنا ہی بدل جائے انسان مادی اور عقلی اعتبار سے کتنا ہی ترقی کر لے اس کی جبلت اور کچھ بنیادی جذبے کبھی نہیں بدلتے۔

اقبال مجید چوں کہ میڈیا سے وابستہ رہے اس لیے وہ آج کی موڈرن عورت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ "کہیں کچھ کم ہے"، "فقد بھگتان" اور "سیما" آج کی عورت کی کہانیاں ہیں۔ "کہیں کچھ کم ہے" میں ڈرامائیت ہے اور چونکانے والا کلائمکس ہے دل چسپ مکالمے ہیں اور کہانی میں ہر لحظہ تجسس برقرار رہتا ہے۔ ہر واقعہ خلاف توقع ثابت ہوتا ہے۔ یہ ایک موڈرن عورت کی کہانی ہے جسے اپنے شوہر کے مٹی کے مادھو پن سے گھن آتی ہے۔ وہ کوئی ہنگامہ چاہتی ہے اور ہنگامہ برپا کرنے میں اس کی ڈسیلی مدد کرتی ہے اور خود ہی ان حالات کا شکار ہو کر موت سے ہم کنار ہوتی ہے۔

"فقد بھگتان" میں انھوں نے عورت کے جسم اور کارخانے کو ایک سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ کارخانوں میں آدمی کو نہیں Skill کو دیکھا جا رہا ہے کہ کون کس قدر کام آ سکتا ہے اسی طرح جسم کا بھی کون سا حصہ کام آ سکتا ہے اور کون سا ناکارہ ہے سے واقفیت کے بعد ہی عورت اور کارخانے ترقی کر سکتے ہیں۔

"سیما" بھی آج کی عورت ہے جس کا شوہر دل پھینک ہے۔ جس نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ وہ بچوں کی پرورش کے

چھوٹی موٹی مفاہمتیں کرتی ہے۔ ایک مرد سے تعلقات استوار رکھتی ہے جو عمر میں اس کے باپ کے برابر ہے لیکن ان کے بچوں کو باپ کا نام دینا چاہتی ہے۔

"سرنگیں" ان ممالک کی کہانی ہے جہاں عوام پر جنگ مسلط کردی گئی ہے اور جو ظلم و استبداد کے سامنے میں جی رہے ہیں۔ ہر طرف بارود کی سرنگیں بچھی ہیں۔ اس اندھیرے میں نیکیاں بھی ضائع جارہی ہیں اور نیکی کی قدر کرنے والے بھی دنیا سے اٹھتے جارہے ہیں۔

"میرے خوف" انشائیہ ہے۔ "سڑی ہوئی مٹھائی" اور "موٹی کھال" ناول "کسی دن" کے ابواب ہیں۔ "چودہ نمبر والی" اور "بخشش" ان ترقی پسند کہانیوں کی یاد دلاتے ہیں جب ساری خوبیاں صرف نچلے طبقے کے کردار میں ہوتی تھیں۔

"سوئیاں والی بی بی" اوپر سے دولت مند اور آسودہ نظر آنے والی بیبیاں اندر سے کتنی کھوکھلی اور توہم پرست ہیں اس کا احاطہ کرتی ہے۔

قمر رئیس نے سچ لکھا ہے کہ اقبال مجید نے داستانوں سے لے کر کرشن اور منٹو تک اردو فکشن کی روایت سے استفادہ کیا ہے اور شمس الرحمن فاروقی کی بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے افسانوں پر کسی پیش رو مثلاً بیدی، منٹو یا قرۃ العین حیدر کا اثر نظر نہیں آتا۔

اقبال مجید نے روایتوں سے استفادہ بھی کیا اور کسی کی تقلید بھی نہیں کی۔ وہ جس طرزِ تحریر کے موجد ہیں۔ آج کے عہد میں اسی کی ضرورت ہے۔ ساری کہانیاں صاف و شفاف کہیں ترسیل کا المیہ نہیں بنتیں لیکن ان میں اکہرا پن بالکل نہیں ہے۔

○ ۸/۱ ڈیمائی سائز ○ مجلد ○ صفحات: ۱۹۰ ○ قیمت: سو روپے ○ ناشر: معیار پبلی کیشنز، کے۔ ۳۰۲، تاج انکلیو، گیتا کالونی، نئی دلی ۱۱۰۰۳۱۔ ●●●

○ کتاب کا نام: پیامِ مشرق ○ منظوم ترجمہ: سید احمد نثار ○ تبصرہ نگار: بی۔ ایچ۔ سید

جس زمانے میں اقبال شعر کہہ رہے تھے اس وقت فارسی سے تقریباً ہر پڑھے لکھے آدمی کو واقفیت ہوتی تھی لیکن پچھلے پچاس سالوں میں علم و داب کا منظر نامہ کافی بدل چکا ہے۔ شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب ہماری نئی نسل خود اردو ہی سے نابلد ہوچکی ہے۔ اب تو اردو کی حیثیت ایک بولی کی طرح ہوتی جارہی ہے یعنی صرف بولی جاتی ہے اور لکھی پڑھی نہیں جاتی۔ وہ دن بھی زیادہ دور نہیں جب اردو بھی جامعات میں سنسکرت، پالی اور عربی و فارسی کی طرح چند مخصوص اسکالرز کی دل چسپی کی چیز رہ جائے گی۔ ان حالات میں اقبال سے محبت رکھنے والوں نے سوچا کہ فارسی تو اب ماضی بعید کی چیز ہوچکی ہے۔ تاہم اردو کا کسی قدر چلن باقی ہے اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بنگلور جیسے اردو کے مرکز سے دور دراز مقام پر بیٹھے ہوئے سید احمد نثار صاحب نے یہ مشکل ذمہ داری اپنے اوپر عائد کرلی اور اقبال کی شہرہ آفاق کتاب "پیامِ مشرق" کا منظوم ترجمہ کردیا۔ "پیامِ مشرق" کے اب تک پانچ تراجم شائع ہوچکے ہیں اور یہ چھٹا ترجمہ ہے۔ ابھی حال حال میں (جولائی ۱۹۹۶ء) میں حیدرآباد سے مظفر مجاز نے اسی پیامِ مشرق کا منظوم ترجمہ شائع کیا ہے۔ زیرِ نظر ترجمہ اس کے ٹھیک ایک سال بعد سامنے آیا ہے۔ مترجم نے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے جس کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔ ہمارے خیال میں اٹھارویں درجے کی طبع زاد شاعری کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ کسی اعلیٰ درجے کی شاعری کا تیسرے درجے کا ترجمہ ہی کردیا جائے۔ چوں کہ مترجم صاحبِ تخلص بھی ہیں اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ

انھوں نے خود شعر گوئی میں کافی مشق و مزاولت بہم پہنچائی ہے ۔ انھیں زبان و بیان پر خاصہ عبور حاصل ہے ۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کام کے مکلف ہیں ۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے ایک سیر حاصل پیش لفظ لکھ کر ترجمے کی وقعت میں اضافہ کردیا ہے ۔ تمام زبانوں کے مقابلے میں صرف فارسی ہی ایسی زبان ہے جس کا ترجمہ اردو میں بہ آسانی کیا جاسکتا ہے ۔ مشترک اوزان ، مشترک استعارات و علائم اور مشترک تراکیب و لفظیات نے اس کام کو بہت سہل کردیا ہے مگر اس راہ میں صرف ایک ہی منزل آتی ہے اور وہی بہ قول عرفی قیامت کی منزل ہے یعنی اردو محاورے کی برقراری ۔ مترجم نے بڑی حد تک اس کی پاس داری کی ہے دوسرا اہتمام مترجم نے یہ کیا ہے کہ اصل کی بحر کو برقرار رکھا ہے جس سے نظم ہو یا غزل یا قطعہ اصل کے موڈ کی برقراری میں کوئی خلل نہیں پڑا ہے اور ترجمے میں تخلیق کی شان پیدا ہوگئی ہے ۔ ویسے بھی ترجمہ اصل کا نعم البدل تو کسی صورت میں بھی نہیں ہوسکتا البتہ معاون ضرور ہوسکتا ہے ۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ زیرِ نظر ترجمہ کسی حد تک متبادل اور بڑی حد تک معاون ہے ۔ اصل کے حسن کا ترجمے میں آنا تقریباً ایک امر محال ہے ۔ سائنس (حیاتیات) کی دنیا میں یہ انقلاب ضرور آچکا ہے کہ جانور (بھیڑ) کی ہو بہ ہو نقل نکالی جاچکی ہے جسے کلوننگ کا نام دیا گیا ہے ۔ لیکن علم و ادب اور خصوصاً تخلیق کی دنیا میں ترجمے کی مدد سے کلوننگ ممکن نہیں ۔ اس لیے جو لوگ ترجمے کو اصل کا نعم البدل سمجھتے ہیں وہ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں ۔ ترجمہ بڑی حد تک اصل کی تفہیم میں معاون کا کام انجام دیتا ہے ۔ ہمیں اس پر اکتفا کرلینا چاہیے ۔ ترجمے میں ایک اہم سوال حسن اور وفا کا بھی اٹھایا جاتا ہے ۔ ان دونوں کا یک جا ہونا بھی مشکل ہے ۔ تاہم مترجم نے بڑی کدو کاوش کی ہے اور ترجمے کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی ہے ۔ تمام نظموں کے تراجم مسلح اور ایک ہی پایے اور مرتبے کے ہونا ممکن بھی نہیں ۔ لیکن مترجم نے بعض ایسے فارسی الفاظ کا ترجمہ بھی کردیا ہے جنھیں اردو نے پورے طور پر اپنالیا ہے جیسے تبر کے لیے کلہاڑی اور اغوا کے لیے بہکانا یا کنجشک کے لیے چڑیا ۔ اقبال نے خود اپنے اردو کلام میں یہ تمام الفاظ استعمال کیے ہیں (کنجشک فرو مایہ کو شاہین سے لڑادو) ۔ اس قسم کے الفاظ اقبال کا ڈکشن نہیں ۔ چوں کہ اقبال کا کلام خود اردو میں موجود ہے اس لیے ان کے فارسی کلام کا ترجمہ اور مشکل ہوجاتا ہے تاہم مترجم کی کوشش قابلِ داد ہے جس کے لیے اہلِ اردو کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے ۔ کتاب کی وقعت میں اضافہ اصل متن کے شامل کرنے سے بھی ہوگیا ہے ۔

○ ۸/۱ ڈیمائی سائز ○ مجلد ○ صفحات : ۵۵۲ ○ قیمت : دو سو بیس روپے ○ ناشر : دی بنگلور اکیڈمی ، فرسٹ کراس ، انی پورہ ، کے ہنومنتیا روڈ ، بنگلور ، ۵۶۰۰۲۷ ۔ ●●●

بہ یادگار سید محی الدین قادری زورؔ

سن اجراء : ۱۹۳۸ء فون : 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۶۱ فروری، مارچ ۱۹۹۹ء شمارہ : ۲، ۳

فی پرچہ	: ۱۵	روپے
زرسالانہ	: ۱۵۰	روپے
کتب خانوں سے	: ۱۷۵	روپے

مشرق وسطیٰ اور امریکہ	: ۲۵	ڈالر
پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	: ۱۰	ڈالر
انگلستان	: ۱۵	پونڈ

ناشر : ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا۔

کمپیوٹر کتابت : شعبۂ کمپیوٹرس ادارۂ ادبیات اردو

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے او۔ ایس۔ گرافکس، ودان گڑہ میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

ooo

ooo

پہلی بات

بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس بار "سب رس" کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔ "سب رس" کا یہ شمارہ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے موقع پر شائع کیا جارہا ہے۔ اس شمارے میں وہ مقالے بھی شامل ہیں جو تقاریب کے سلسلے میں منعقدہ سمینار میں پیش کیے گئے اور چند مقالے خاص اس شمارے کے لیے لکھوائے گئے ہیں۔ ان میں قطب شاہی عہد کے بارے میں بہت سی اہم معلومات پہلی بار سامنے آئی ہیں۔ اردو کے ممتاز شاعر اور ذہن جدید کے ایڈیٹر جناب زبیر رضوی کا اوپیرا "پیا باج پیالا" کئی سال پہلے اسٹیج پر پیش کیا گیا تھا جو بہت مقبول ہوا اسی طرح محترمہ بلقیس علاء الدین صاحبہ کا ڈراما "محمد قلی" انگریزی میں تحریر کیا تھا جسے حیدرآباد کے ممتاز مزاح نگار رشید قریشی مرحوم نے جو آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے اردو کا جامہ پہنایا تھا۔ یہ ڈراما بھی کئی سال پہلے قلعہ گولکنڈہ میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ "یوم محمد قلی قطب شاہ" تقاریب کے سلسلے میں اس ڈرامے کو فائن آرٹس اکیڈیمی کے فن کار ۹ / اپریل ۱۹۹۹ء کو گنبدانِ قطب شاہی میں پیش کریں گے۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ آئندہ "سب رس" کی اشاعت میں تاخیر نہ ہو اور قارئین کو انتظار کی زحمت نہ ہو۔

o

مسرت کی بات ہے کہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن نے ادارہ ادبیات اردو کے امتحان اردو فاضل کو انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے دو سال قبل درخواست دی گئی تھی اور مسلسل نمائندگی کی جارہی تھی۔ جناب بشیرالدین بابو خاں صاحب نے جب وہ اعلیٰ تعلیم کے وزیر تھے اس مسئلے سے دل چسپی لی تھی بعدازاں جناب زاہد علی خاں صاحب ایڈیٹر روزنامہ سیاست نے مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے ارکانِ اسمبلی کو اس بارے میں مکتوب لکھے جس کی بنا پر اسمبلی میں یہ مسئلہ پیش ہوا اور تمام سیاسی جماعتوں نے اس کی تائید کی۔ ان جماعتوں کے ارکان مسرز جناب بشیر الدین بابو خاں، جناب آر۔ سریش ریڈی، جناب ڈی۔ ناگیندر، جناب این۔ نرسمہا ریڈی، جناب سی۔ ایچ۔ راجیشور راؤ، جناب آر۔ چندر شیکھر ریڈی، جناب اسدالدین اویسی، جناب ممتاز احمد خاں اور جناب امان اللہ خاں، نے بہ طورِ خاص حکومت پر دباؤ ڈالا۔ اردو فاضل کو انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دینے کے فیصلے میں شریمتی پرتیبھا بھارتی وزیر اعلیٰ تعلیم، جناب اے۔ کے۔ گوئیل پرنسپل سکریٹری، جناب ونود کے۔ اگروال کمشنر و سکریٹری بورڈ آف انٹرمیڈیٹ نے اہم حصہ لیا۔ ڈاکٹر عبدالرزاق، جناب عبدالستار اردو اسپیشل آفیسر (رٹائرڈ)، جناب لئیق الرحمٰن انصاری ڈپٹی سکریٹری اسمبلی (رٹائرڈ) اور ڈاکٹر محمد جہاں گیر علی (بورڈ آف انٹرمیڈیٹ) نے بھی اس کاروائی کو تکمیل تک پہنچانے میں ادارے سے بھرپور تعاون کیا۔ ادارہ ادبیاتِ اردو اور اردو زبان کی ترقی سے دل چسپی رکھنے والے ان تمام اصحاب کے ممنون ہیں۔

(ادارہ)

ooo

ڈاکٹر سید داؤد اشرف

عہد اورنگ زیب کے مغل وقائع

قطب شاہی تاریخ کے اہم ماخذ

مغل وقائع نویسی کے بارے میں سب سے پہلے ممتاز مورخ ابوالفضل اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس کی معرکتہ الآرا تصنیف "آئینہ اکبری" کے مطابق دربار اکبری میں ۱۴ وقائع نویس متعین تھے۔ اکبر دربار میں جو کچھ کہتا اور دربار میں مختلف عہدیداروں کی جانب سے فراہم کردہ اطلاعات پر وہ جو کچھ احکام صادر کرتا تھا یہ وقائع نویس ان سب باتوں کو درج وقائع کیا کرتے تھے۔ اکبر کے عہد میں مغل سلطنت کے حدود میں غیر معمولی توسیع ہوئی۔ اس وسیع و عریض سلطنت کو قابو میں رکھنے اور تمام علاقوں کے حالات سے پوری طرح باخبر رہنے کے لیے ایسے سرکاری عہدے داروں کی ضرورت تھی جو ملک کے مختلف صوبوں سے شہنشاہ اور مرکزی حکومت کو پابندی کے ساتھ اطلاعات روانہ کریں۔ چنانچہ جب اکبر نے ۱۵۸۶ء میں مغل سلطنت کے صوبوں میں یکساں نوعیت کا نظم و نسق نافذ کیا تو اس نے ہر صوبہ میں ایک وقائع نویس بھی مقرر کیا جو اپنے وقائع بڑی پابندی سے مرکز کو روانہ کرتے تھے۔ مختلف صوبوں سے روانہ کردہ وقائع دربار میں آتے اور وہ جن امور پر ضروری سمجھتا احکام صادر کیا کرتا تھا۔ معاصر تاریخ کی کتابوں میں ایسے متعدد واقعات درج ہیں جن سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں وقائع نویس بڑی مستعدی، خوش اسلوبی اور محنت سے اپنے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ صوبائی وقائع نویسوں کی رپورٹیں صوبہ کے اعلیٰ عہدے داروں کے توسط سے مرکزی حکومت کو روانہ کی جاتی تھیں۔ ان رپورٹوں میں درج بعض واقعات اور اطلاعات پر وقائع نویسوں اور صوبہ کے اعلیٰ عہدے داروں کے مابین اختلافات اور تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوجاتا تھا۔ نظم و نسق کے اس نقص کو دور کرنے کے لیے شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں ایک نیا خبر رساں عہدہ قائم کیا گیا جسے سوانح نگار یا خفیہ نویس کہا جاتا تھا۔ سوانح نگار یا خفیہ نویس اپنا نام اور شخصیت پوشیدہ رکھتے تھے اور وہ کسی درمیانی واسطہ کے بغیر اپنی رپورٹیں بلاراست شہنشاہ کو روانہ کیا کرتے تھے۔ اس نئے عہدے کے قائم ہونے کے باوجود وقائع نویس بہ دستور اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ صوبائی وقائع نویسوں کو اپنے وقائع یا رپورٹیں تیار کرنے کے لئے اطلاعات اور واقعات کی ضرورت ہوتی تھی۔ چناں چہ وہ اپنے گماشتے (ایجنٹ) صوبہ دار، دیوان اور فوج دار کے دفتروں، عدالتوں اور چبوترے کو توالی پر مقرر کرتے تھے۔ تاکہ وہ وہاں کی اہم اطلاعات وقائع نویس کو روانہ کریں۔ وقائع نویس گماشتوں کی روانہ کردہ اطلاعات اور مواد کی بنیاد پر اپنی رپورٹیں تیار کرتے اور مرکز کو روانہ کرتے تھے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے کہ اکبر کے عہد سے صوبوں میں وقائع نویس مقرر کئے جانے لگے تھے لیکن بعد کے دور میں صوبائی وقائع نویسوں کے علاوہ اہم شہروں، قلعوں، ضلعوں اور پرگنوں میں بھی وقائع نویس مقرر کئے جانے لگے۔ فوج میں بھی وقائع نویس متعین ہوتے تھے۔ صوبوں اور دیگر مغل علاقوں میں متعین وقائع نویس اپنے اپنے علاقوں کے حالات اور عہدے داروں کے

بارے میں اطلاعات بھیجتے تھے۔ وقائع نویسوں کی جانب سے روانہ کردہ ایسی اطلاعات جن پر کارروائی کرنا ضروری ہوتا مناسب چارہ جوئی کے لیے ہدایات جاری کی جاتی تھیں۔ اسی طرح کسی مغل صدرے دار کے خلاف رپورٹ ملنے پر اس کو سزا دینے کے لئے فوراً احکام صادر کئے جاتے تھے۔

مغل علاقوں کی طرح باج گذار ریاستوں میں بھی مغل وقائع نویس مقرر کئے جانے لگے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وقائع نویس باج گذار ریاستوں کی تمام سرگرمیوں سے مغل سلطنت کی مرکزی حکومت یا شہنشاہ کو باخبر رکھیں۔ قطب شاہی سلطنت مغلوں کی باج گذار تھی اور اورنگ زیب کے عہد میں زوال گولکنڈہ سے قبل حیدرآباد میں مغل وقائع نویس متعین تھے۔ اس کا دستاویزی ثبوت موجود ہے۔ آندھراپردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اہم اور بیش قیمت ریکارڈ کے جو مختلف زمرے (categories) محفوظ ہیں ان میں مغل ریکارڈ کا زمرہ سب سے قدیم ہے جو تحقیقی کاموں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ قدیم کاغذات کا یہ ذخیرہ عہد شاہ جہاں (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) اور عہد اورنگ زیب (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں بیسیوں نوعیت کے کاغذات ہیں۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ مغل کاغذات کا اتنا بڑا ذخیرہ نہ تو نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں محفوظ ہے اور نہ ہی کسی ریاستی آرکائیوز میں۔ عہد اورنگ زیب کے کاغذات میں سینکڑوں وقائع روزنامچہ وقائع کی شکل میں محفوظ ہیں۔ یہ وقائع دکن کے مختلف مغل علاقوں اور قطب شاہی سلطنت کے دارالخلافہ حیدرآباد میں متعین وقائع نویسوں کے تحریر کردہ ہیں۔ اس مضمون میں حیدرآباد میں متعین مغل وقائع نویسوں کے روانہ کردہ چند وقائع پیش کئے جارہے ہیں جو عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔

مغل وقائع نویس نے اپنے وقائع ۹ محرم ۱۰۷۲ھ م ۲۴ / اگست ۱۶۶۱ء میں جو واقعہ درج کیا ہے اس سے قطب شاہی صدرے داروں کی کمزوری اور بے بسی کا پتہ چلتا ہے۔ مغل وقائع نویس لکھتا ہے کہ ولندیزیوں اور ڈنمارک کے باشندوں نے بندرگاہ سیکاکو پر ملک بیگ کے جہاز پر قبضہ کرلیا ہے۔ قطب الملک نے سوری راؤ حوالدار مچھلی پٹن کو لکھا تھا کہ وہ اس جہاز کو ولندیزی کپتان سے چھین لے۔ ولندیزی اور ڈنمارک کے باشندے سوری راؤ کے اختیار میں نہیں ہیں اس لیے سوری راؤ عذر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ چوں کہ یہ واقعہ بندرگاہ سیکاکول میں پیش آیا تھا اس لیے وہاں کے فوج دار حیدر کو چاہیے کہ اس جہاز پر دوبارہ قبضہ کرلے۔ وقائع نویس آگے لکھتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ اس جماعت کے افراد قطب الملک کی بندگی ہوں پر جو چاہے کرگذرتے ہیں اور قطب شاہی صدرے داروں کا ان پر کوئی قابو اور اختیار نہیں ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ حیدر فوج دار خود بھی اس واقعہ میں اس جماعت کے ساتھ شریک تھا۔ تب وہ ملک بیگ کا جہاز کس طرح واپس لے سکتا ہے؟ اگر ولندیزی کپتان کو تاکید کرنے کے لیے بندرگاہ بنگالہ اور سورت کے حکام کے نام حضور یعنی اورنگ زیب کا فرمان صادر ہو تو جہاز اور مال واسباب واپس مل سکتا ہے۔

مغل وقائع نویس متعینہ حیدرآباد کے روانہ کردہ کئی وقائع ایسے ہیں جن کے ذریعہ گولکنڈہ کی جانب سے ادا کی جانے والی پیش کش کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ذیل میں تین وقائع پیش کئے جاتے ہیں۔

روزنامہ وقائع مورخہ غرہ محرم ۱۰۷۲ھ م ۱۰ / اگست ۱۶۶۱ء میں دیگر اطلاعات کے علاوہ یہ اطلاع بھی درج ہے کہ عبداللہ قطب شاہ نے موہن داس کا ایک الماس خان زماں کو بھیجا ہے کہ اسے امانت خان کے ذریعہ مغل شہنشاہ اورنگ زیب کو پیش کیا جائے۔ وقائع نویس لکھتا ہے کہ یہ الماس شہنشاہ اورنگ زیب کو پسند اور قبول ہے یا نہیں۔ الماس قبول ہونے کی صورت میں اس کی قیمت

پیش کش میں سے منہا کرلی جائے بصورت دیگر وہ الماس اس کے مالک کو واپس کردیا جائے ۔

وقائع مورخہ ۹ محرم ۱۰۷۲ھ م ۲۵/اگست ۱۶۶۱ء میں حسب ذیل اطلاع درج ہے۔

تلوم تحریر پانچ ہزار روپے اور ایک لاکھ بیس ہزار ہون پیش کش کی بابت وصول ہوئے ۔ اس میں سے پچاس ہزار روپے اور دس ہزار ہون کی رقم رکن السلطنت امیر الامراء (شائستہ خان) کے ملازم خان محمد کو اس ہدایت کے ساتھ دی گئی کہ ہون کو سکہ عالمگیری میں تبدیل کیا جائے اور اس رقم کو خزانہ عامرہ اورنگ آباد میں داخل کردیا جائے ۔ شہنشاہ کے حکم کے مطابق باقی ہون اندرون دو یوم بعد ازدس محرم خزانہ عامرہ اورنگ آباد ارسال کردیئے جائیں گے ۔

وقائع نویس وقائع مورخہ ۴ شوال ۱۰۷۲ھ م ۱۳ مئی ۱۶۶۲ء کے ذریعہ یہ اطلاع بہم پہنچاتا ہے کہ پیش کش کی جملہ رقم دس لاکھ روپے میں سے جس کے لیے عبدالصمد نے ضمانت دی تھی مندرجہ بالا تاریخ کو انسٹھ ہزار آٹھ سو گیارہ روپے بارہ آنہ سکہ عالمگیری داخلہ خزانہ کئے گئے ۔

حسب ذیل چند وقائع بیجاپور ۔ گول کنڈہ تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں :

وقائع مورخہ ۳ محرم ۱۰۷۲ھ م ۱۹ اگست ۱۶۶۱ء میں دیگر اطلاعات کے علاوہ یہ اطلاع بھی درج ہے کہ عبد اللہ قطب شاہ کی والدہ حیات بخش بیگم نے پھلوں کا ایک ٹوکرا علی عادل شاہ دوم کے لیے روانہ کیا ۔

وقائع مورخہ ۲۲ محرم ۱۰۷۲ھ م ۷ ستمبر ۱۶۶۱ء میں وقائع نویس اطلاع دیتا ہے کہ علی عادل شاہ دوم نے گول کنڈہ کے دربار میں اپنے وکیل محمد علی کو لکھا کہ والیِ بیجاپور اور سیدی جوہر کے مابین سخت اختلافات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس لیے اس بات سے قطب الملک کو آگاہ کردیا جائے اور درخواست کی جائے کہ حیدرآباد میں سیدی جوہر کا جو ہرکارہ ہے اسے حیدرآباد سے نکال دیا جائے ۔ محمد علی نے یہ پیغام حکیم نظام الدین کو پہنچایا جس نے اس بارے میں قطب الملک سے گفتگو کی ۔ بعد ازاں حکیم نظام الدین نے محمد علی کو بلاکر قطب الملک سے اپنی گفتگو کے نتائج سے واقف کروایا ۔ اس موقع پر دونوں کے مابین کیا گفتگو ہوئی معلوم نہ ہوسکا ۔

وقائع مورخہ ۱۵ صفر ۱۰۷۲ھ مطابق ۳۰ ستمبر ۱۶۶۱ء میں دیگر اطلاعات کے علاوہ یہ اطلاع بھی تحریر کی گئی ہے کہ قطب الملک (عبداللہ قطب شاہ) کے جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ سیدی جوہر کا انتقال ہوچکا ہے اور علی عادل شاہ دوم نے قلعہ کرنول کی سمت پیش قدمی کی ہے ۔

وقائع مورخہ ۱۳ صفر ۱۰۷۲ھ م ۲۹ ستمبر ۱۶۶۱ء کی اطلاع کے مطابق عبداللہ قطب شاہ گول کنڈہ اور بیجاپور کی سلطنت میں تعلقات کو بہتر اور مضبوط بنانے کے لیے اپنی لڑکی کی شادی علی عادل شاہ دوم سے کرنے کا خواہش مند ہے ۔ وقائع نویس یہ بھی لکھتا ہے کہ اس سلسلہ میں جو بھی پیش رفت ہوگی بعد ازاں اس کی اطلاع دی جائے گی ۔

قطب شاہی سلطنت کے ایران سے قریبی اور گہرے مراسم تھے ۔ یہ وقائع عبداللہ قطب شاہ اور شاہ ایران کے وکیل یا ایلچی کے مابین تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ روزنامچہ وقائع مورخہ ۲ محرم ۱۰۷۲ھ م ۱۸ اگست ۱۶۶۱ء میں یہ اطلاع بھی درج ہے کہ عبداللہ قطب شاہ نے محمد مقیم وکیل شاہ ایران کے لیے پھلوں کی دو کشتیاں روانہ کیں۔ وقائع نویس ، وقائع مورخہ ۲۳ صفر ۱۰۷۲ھ م ۸/ اگست ۱۶۶۱ء کے ذریعہ یہ رپورٹ روانہ کرتا ہے کہ محمد مقیم وکیل شاہ ایران کا ایک ملازم ایران سے بہ راہ مچھلی پٹن حیدرآباد پہنچا۔ محمد مقیم نے ایرانی پھلوں کی بیس کشتیاں قطب الملک (عبداللہ قطب شاہ) کے لیے بھیجیں ۔ محمد مقیم کا جو ملازم پھل لایا تھا

بادشاہ نے اسے سراپا عطا کیا اور ابراہیم بیگ سرنوبت کو بھیج کر محمد مقیم کو طلب کیا۔ محمد مقیم کو حیدرآباد کی حویلی دکھلائی اور اس کی پان سے تواضع کی۔ محمد مقیم کے ایران سے آئے ہوئے دو ملازمین کو عبداللہ قطب شاہ نے سراپا عطا کیا۔

حسب ذیل وقائع اس دور کے حیدرآباد کی معاشی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ان میں درج اطلاعات سے پتہ چلتا ہے اس دور میں ہاتھیوں کی مختلف قسموں کے کیا دام تھے۔

وقائع مورخہ ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۷۱ ھ م ۱۶ اگست ۱۶۶۱ ۔ میں لکھا گیا ہے کہ علی عالم فوج دار کرناٹک نے محمد زمان اور محمد رضا تاجران فیل سے تین ہزار تین سو ہون میں چار ہاتھی خریدے۔

وقائع نویس متعینہ حیدرآباد اپنے وقائع مورخہ ۲۰ محرم ۱۰۷۲ ھ مطابق ۱۲ ستمبر ۱۶۶۱ ۔ میں لکھتا ہے کہ عمدۃ الملک جعفر خان اور لشکر خان کے آدمیوں نے تین ہاتھی حسب ذیل نرخ پر خریدے۔ ایک دنتیلا ہاتھی۔ ۹۰۰ ہون دو مادہ ہاتھی۔ ۱۶۱۰ روپے۔

روزنامچہ وقائع مورخہ ۶ صفر ۱۰۷۲ ھ م ۲۱ ستمبر ۱۶۶۱ ۔ میں وقائع نویس لکھتا ہے کہ شاہی احکام کے مطابق بخشی الملک صفی خان نے اسے یعنی وقائع نویس کو خاصہ شریفہ کے لیے ہاتھی خریدنے کے احکام دیئے۔ وہ اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ ابھی جہازوں کی آمد کا سلسلہ شروع نہیں ہوا مگر اس نے میر قاسم کو شاہی خدمت کے لیے مناسب ہاتھی تلاش کرنے کی ہدایات دے دی ہیں۔

قطب شاہی سلطنت میں مختلف درجوں کے عہدے دار بادشاہ کی خدمت میں بھاری رقمیں اور قیمتی تحفے روانہ کرتے یا بار یاب ہو کر پیش کرتے تھے۔ بادشاہ انھیں سراپا اور قیمتی اشیاء کے علاوہ مطلوبہ مراعات سے بھی نوازتا تھا۔ حسب ذیل وقائع اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔

وقائع مورخہ ۹ شوال ۱۰۷۲ ۔ م ۱۸ مئی ۱۶۶۲ ۔ میں یہ اطلاع درج ہے کہ محمد قلی قلعہ دار دینکنڈہ نے تین ہزار ہون گھوڑوں کے لیے دو چاندی کی کلغیاں اور ایک چاندی کی صراحی سید مظفر کے پاس روانہ کی تا کہ وہ یہ اشیا قطب الملک کی خدمت میں پیش کریں۔ اسی وقائع کے ذریعے یہ اطلاع بھی روانہ کی گئی ہے کہ اننت ریڈی دیشمکھ کونل کونڈہ نے عبدالصمد کے ہم راہ قطب الملک سے مل کر پانچ سو ہون پیش کئے۔ قطب الملک نے اسے ایک سراپا ایک مرصع طرہ ایک شمشیر اور ایک گھوڑا عطا کیا۔ وقائع نویس وقائع مورخہ ۱۵ شوال ۱۰۷۲ ۔ م ۲۴ مئی ۱۶۶۲ ۔ میں لکھتا ہے کہ ریڈی دیشمکھ راچرلہ جس کو عبدالجبار ۔ ۔ آدمیوں نے قتل کردیا تھا اس کا بیٹا حیدر آباد آیا تھا۔ اس نے موسیٰ محل دار کے ہم راہ قطب الملک سے مل کر پانچ ہزار ہون پیش کئے۔ قطب الملک نے اسے ایک سراپا ایک مرصع طرہ ایک مرصع دگدگی آٹھ موتی دو گھوڑے اور ایک شمشیر عطا کی اور اسے قلعہ گول کنڈہ میں پناہ لینے کی اجازت دی۔

مغل وقائع نویس حیدرآباد سے جو وقائع روانہ کرتے تھے ان میں بعض وقائع اس دور کے رسم و رواج کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس بات کی شہادت کے لیے حسب ذیل وقائع پیش کئے جاتے ہیں۔

وقائع مورخہ ۶ محرم ۱۰۷۳ ھ م ۲۲ / اگست ۱۶۶۲ ۔ کی اطلاع کے مطابق عبداللہ قطب شاہ نے اپنے داماد میرزا احمد ایرانی ایلچی میر مقیم ، سید مظفر اور دوسروں کو ۱۰ محرم کے لیے ماتمی لباس عنایت کئے۔ اس کے علاوہ عبداللہ قطب شاہ کی والدہ نے بھی رضا قلی کو ۱۰ محرم کے لیے ماتمی لباس عطا کیا۔

۱۴ جمادی الثانی ۱۰۷۲ ھ م ۲۵ جنوری ۱۶۶۲ ۔ کے روزنامچے وقائع میں یہ اطلاع درج ہے کہ عبداللہ قطب شاہ قلعہ گول کنڈہ کے نزدیک جہاں دو ندیوں کا سنگم ہے ہر سال غسل کرتا ہے۔ اس سال آج وہ اپنی محل کے ساتھ وہاں گیا اور اس نے غسل کیا۔

(باقی ص: ۲۹ پر)

نواب سید عابد حسین خاں

قطب شاہی بادشاہوں کے مختلف سلاطین سے خارجہ تعلقات

سلطان قلی قطب شاہ ایک اچھا سیاست داں تھا ۔ گول کنڈے کا خود مختار بادشاہ بننے کے بعد اس کے لیے ایک طرف برید شاہیوں اور عادل شاہیوں سے اور دوسری طرف وجیانگر سے اپنی حکومت کو بچانا ضروری تھا ۔ قوام الملک ییگنڈل اور مالنگر کے حصے پر قابض ہوا تو سلطان قلی قطب شاہ نے برار پر چڑھائی کی ۔ اس مقابلے کی تاب نہ لاکر قوام الملک نے دریا عماد الملک کے پاس پناہ لی ۔ سلطان قلی نے اپنا ایلچی دریا عمادالملک کے پاس روانہ کیا اور تاکید کی کہ قوام الملک کو پناہ نہ دے ۔ اس کے علاوہ " ہفت پٹہ " جو سلطان محمود شاہ کے دور سے گول کنڈے کا علاقہ تھا ۔ ۔ ۔ اس پر برار کا قبضہ ہوگیا تھا ۔ عمادالملک سے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا ۔

" جنگِ پالنچپور " کے بعد گوداوری و کرشنا کا دو آب اور یلور اور شمال میں راجمندری سلطنت قطب شاہیہ کا حصہ بن گئیں ۔ اڑیسہ کے راجہ پرتاب ردرا نے اپنے ایلچی گول کنڈہ روانہ کیے اور عہد نامہ کے مطابق گوداوری پر ان دونوں ملکوں کی سرحد تعین ہوئی ۔ (۱)

سلطان قلی ۲ جمادی الثانی ۹۵۰ ھ م ۲ ستمبر ۱۵۴۳ء (۲) کو میر محمد ہمدانی کے ہاتھوں قتل ہوا اور یہ امر یار قلی جمشید کی ترغیب سے ہوا لیکن جب علی برید کو جمشید کے مقابلے میں پے در پے ناکامیاں ہوئیں تو اس نے بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ سے شکایت کی کہ سلطان قلی کے قتل میں جمشید کا ہاتھ تھا ۔ ابراہیم عادل شاہ اول نے یہ جواب دیا کہ " قتل کچھ خانگی وجہ سے ہوا اور اس قتل سے جمشید کو کچھ لینا دینا نہیں ۔" (۳)

تاریخ قطب شاہی کے مطابق سلطان قلی کو چھ شہزادے اور چار شہزادیاں تھیں (۴) ۔ بڑا ، حیدرخاں جو سلطان قلی کے عین حیات انتقال کر گیا ۔ دوسرا قطب الدین جو ولی عہد تھا جمشید نے اس کو اندھا کرادیا تھا اس بات سے ناراض ہوکر سلطان قلی نے جمشید کو گول کنڈہ میں قید کردیا تھا ۔ تیسرا یار قلی جمشید ۔ چوتھا عبدالکریم جس نے سلطان قلی کے خلاف بغاوت کی اور مارا گیا ۔ پانچواں دولت قلی تھا جو " مجنوں شہزادے " کے لقب سے مشہور تھا ۔ چھٹا ابراہیم قلی ۔

ابراہیم قلی یکم شوال ۹۲۶ ھ م ۲۹ مئی ۱۵۲۰ء کو پیدا ہوا اور اسی سال سلطان قلی قطب شاہ نے بیجاپوری اسماعیل عادل شاہ سے قلعہ کوئل کنڈہ جیتا تھا ۔

سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے شہزادوں بالخصوص ابراہیم قلی کی تعلیم و تربیت میں بے حد دل چسپی لی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ابراہیم کے دور میں علماء ، فضلاء ، صوفیا اور تجار نے گول کنڈہ کو اپنا وطن بنایا (۵) ۔ ابراہیم ابھی نابالغ تھا کہ سلطان قلی قطب شاہ نے اس کا تقرر قلعہ دیورکنڈہ پر کیا جو انھیں دنوں قطب شاہی سلطنت میں شامل کیا گیا تھا ۔ اس سے شہزادہ ابراہیم کی شجاعت

و قابلیت کا پتہ چلتا ہے ۔

جمشید سلطان قلی کے انتقال کے چوتھے دن یعنی ۵ جمادی الثانی ۹۵۰ ھ م ۵ ستمبر ۱۵۴۳ء تخت نشین ہوا (۲) ۔ جمشید قلی کی تخت نشینی سیاسی بے چینی کے حالات میں ہوئی ۔ امرا کی ایک کثیر جماعت کسی اور شہزادے کو گدی پر بٹھانا چاہتی تھی لہٰذا جمشید اپنے بھائیوں کے خلاف سازشیں کرنے لگا ۔ اس نے دولت قلی کو قلعہ بھونگیر میں قید رکھا اور ابراہیم کو دیور کنڈہ سے طلب کیا ۔ ابراہیم قلی بہ خوبی واقف تھا کہ جمشید اس کو بھی اپنے راستہ سے ہٹانا چاہتا ہے ۔ ابراہیم قلی کو حامد خاں حبشی ، سیدجی اور داؤد خاں نے رائے دی کہ گول کنڈہ نہ جائیں (۷) ابراہیم قلی نے فوج کے ساتھ بیدر کی راہ لی (۸) ۔ علی برید نے شہزادہ ابراہیم قلی کی آمد کی خبر سنی تو اس نے اپنے امرا اور اپنے فرزند کو شہر سے باہر کچھ فاصلے پر استقبال کے لیے روانہ کیا ۔ ابراہیم ۱۰ جمادی الثانی ۹۵۰ھ م ۱۰ ستمبر ۱۵۴۳ء کو بیدر پہنچا ۔ علی برید اور ابراہیم قلی نے فیصلہ کیا کہ گول کنڈہ پر حملہ کریں لہٰذا ۲۵ جمادی الثانی ۹۵۰ھ م ۲۵ ستمبر ۱۵۴۳ کو ایک بڑی فوج لے کر ابراہیم قلی اور علی برید نے گول کنڈہ کا رخ کیا ۔ قلعہ گول کنڈہ سے ۲ میل کی دوری پر بہ مقام نارسنگی جمشید قلی کی افواج نے مقابلہ کیا ۔ دشمن کے مقابلے میں جمشید کو اپنی کمزوری کا احساس ہوا اور میدانِ جنگ چھوڑ کر قلعہ گول کنڈہ میں داخل ہوگیا اور قلعہ کے دروازے بند کروادیے ۔ محاصرہ تین ماہ تک رہا ۔ اسی دوران شاہ طاہر گول کنڈہ میں سلطان برہان نظام شاہ کی طرف سے جمشید قلی کے تخت نشینی کی مبارک باد کا پیغام لے کر آیا ۔ جمشید نے کہلایا کہ وہ برہان نظام شاہ کی مدد کا طلب گار ہے (۹) ان دونوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا ۔ دراصل برہان کا اصل مقصد شولاپور اور پنج ٹپہ واپس لینا اور مغربی تلنگ میں اپنا سکہ جمانا تھا ۔ ایک معاہدہ ۱۵۴۳ء میں دریا عماد شاہ ، جمشید قلی اور رام راج کے درمیان عمل میں آیا (۱۰) ۔

برہان نظام شاہ نے گول کنڈہ آتے ہوئے بیدر کی سرحد میں داخل ہوکر کوہیر پر اپنا قبضہ جمالیا (۱۱) جس کی وجہ سے علی برید کو محاصرہ چھوڑ کر بیدر واپس جانا پڑا (۱۲) لہٰذا ابراہیم قلی اکیلے میدانِ جنگ میں رہ گیا ۔ ان حالات میں ابراہیم قلی نے یہ طے کیا کہ وہ وجیانگر جائے ۔ اپنے ہم راہ سیدجی سلحدار ، حامد خاں حبشی اور برہمن سردار کالوجی کو معہ چارسو سوار ۲۰۰ ہاتھی اور سو گھوڑے لے گیا ۔ رام راج کو شہزادہ ابراہیم قلی کی آمد کی اطلاع ملی تو اپنے افسر ناراستا کو رستہ دینے کا حکم دیا ۔ ابراہیم قلی وجیانگر کے دارالخلافہ پہنچا ۔ اس کا استقبال بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ہوا اور رام راج نے ہاتھی سے اتر کر شہزادے سے ملاقات کی ۔ ابراہیم قلی تین ہفتہ تک راجا کا شاہی مہمان رہا پھر ایک محل جو پر تکلف سجایا گیا تھا اس میں منتقل ہوا ۔

شہزادہ ابراہیم قلی کو جاگیر بھی دی گئی تھی ۔ یہ جاگیر اول ایک شخص عنبر خان حبشی کو رام راج نے دی تھی ۔ عنبر خان حبشی نے شہزادہ ابراہیم قلی سے بدکلامی کی اور دونوں میں دست بہ دست لڑائی ہوئی اور عنبر خاں مارا گیا ۔ ابراہیم قلی نے اس کا نشان جو نیلے رنگ کا تھا لے لیا اور قصد کیا کہ اسے آئندہ گول کنڈہ کا امتیازی رنگ قرار دے گا ۔ ابراہیم قلی وجیانگر میں سات سال پناہ گزیں رہا اس نے وہاں کی ایک خاتون جس کا نام بھاگ رتی تھا شادی کی ۔

جمشید قلی کے دور کے حالات ہمیں سلسلہ وار نہیں ملتے تذکروں کو دیکھ کر سنہ کا تعین کرنا پڑتا ہے (۱۳) ۔ ۱۵۴۳ء میں نظام شاہ اول والیِ سلطنت احمد نگر نے جمشید قلی سے مدد مانگی تاکہ وہ والیِ بیجاپور ابراہیم عادل شاہ اول سے شولاپور واپس لے ۔ علی برید والیِ بیدر بیجاپور کی کمک پر آمادہ ہوا تو برہان نظام شاہ نے دریا عماد شاہ سے دوستی کی اور تینوں میں معاہدہ ہوا (۱۴) ۔

علی برید شاہ کولاس کی طرف بڑھنا شروع کیا ۔ اس کا مقابلہ نارائن کھیڑ پر جمشید قلی سے ہوا اور بیدر کی افواج کو پیچھے ہٹنا پڑا ۔

ابراہیم عادل شاہ نے یہ سوچا کہ علی برید والیٔ بیدر کا ساتھ دینا بے کار ہے اس نے برہان شاہ کو سراعتی دی اور ... پر واپس دے دیا رام راج کو بھی مانجد پر حملہ آور ہو کر بیجاپوری افواج کو شکست دینے کے صلے میں انعام و اکرام دیے گئے۔ اس طرح یہ عہدنامہ ٹوٹ گیا (۱۷)۔

۱۵۴۳ء میں اس عہدنامے کی بنا پر اس نے اسد خاں لاری کے مشورے سے گلبرگہ پر حملہ کیا اور کامیاب ہوا۔ ۹۵۵ ھ ۱۵۴۸ء میں علی برید کو ابراہیم عادل شاہ سے رہائی دلوانے اور دوبارہ تخت نشین کرنے کی وجہ سے جمشید کی عزت و حرمت میں اضافہ ہوا۔ ابراہیم عادل شاہ اپنے تعلقات جمشید سے اچھے کرنا چاہتا تھا اور تحائف روانہ کیا جس میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کا نام "ہوا قیم" تھا۔ شولاپور کی جنگ کے بعد جمشید قلی سرطان میں مبتلا ہوا اور ۲ سال بعد ۳ محرم ۹۵۷ ھ م ۲۲ جنوری ۱۵۵۰ء کو انتقال کیا۔

جمشید کے انتقال کے بعد سید کمال الدین اردستانی المعروف مصطفیٰ خاں اور صلابت خاں نے جمشید کے ۲ سالہ لڑکے سبحان قلی کو مسند نشین کیا لیکن جمشید کی بیوی خانم آغا کو اطمینان نہ تھا اس نے سیف خاں عین الملک کو احمد نگر سے بلا کر پیشوا بنایا۔ عین الملک بہت جلد اپنے تکبر کی وجہ سے بدنام ہو گیا تب امرا نے ابراہیم قلی کو گول کنڈہ آنے کی دعوت دی (۱۸)۔

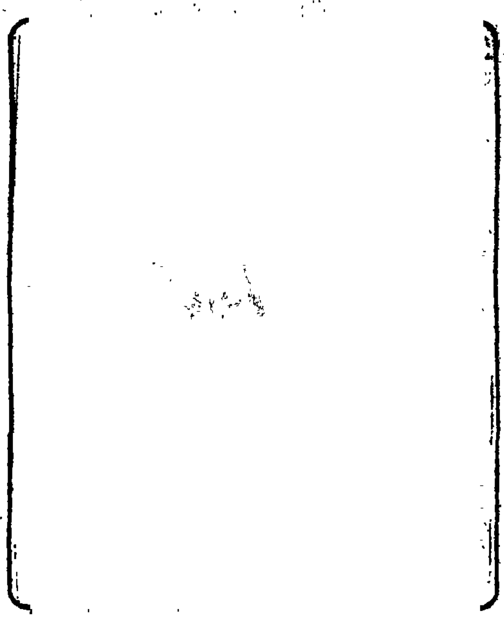
ابراہیم قلی نے گول کنڈہ کا قصد کیا، رام راج ۲۵ میل ساتھ آکر اسے وداع کیا۔ گول کنڈے میں ابراہیم کا استقبال مصطفیٰ خاں نے کیا۔ ابراہیم نے اسے میر جملہ کے عہدے پر فائز کیا۔ وہ سلطنتِ گول کنڈہ کا پہلا میر جملہ ہے۔ ایک وفد جس میں ہر مذہب کے لوگ اور ماہرِ فن بھی شامل تھے، رجب ۹۵۷ ھ م ۲۲ جولائی ۱۵۵۰ء کو کوئل کنڈہ پہنچا انھوں نے حلف لیا کہ وہ حضرت خواجہ بندہ مسندِ اعلیٰ مسندِ معالی ملک ابراہیم شاہ قطب الملک ودیا" کے ساتھ ہیں۔ ابراہیم ۱۲ رجب ۹۵۷ ھ م ۲۷ جولائی ۱۵۵۰ء کو گول کنڈہ میں داخل ہوا اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی (۱۹)۔

ابراہیم قطب شاہ نے خارجہ حکمت عملی میں درمیانی راہ اپنائی اور تلنگ کے حد تک اپنی سلطنت کو محدود رکھا۔ سلاطین قطب شاہی، عادل شاہی اور نظام شاہی کی جنگوں میں کبھی کوئی فاتح تو کبھی کوئی مفتوح ہوتا تھا۔ یہ ساری سرگرمیاں رام راج دیکھ رہا اور موقع کی تلاش میں تھا۔ ایسے میں علی عادل شاہ نے رام راج سے مدد مانگی تاکہ شولاپور اور کلیانی اسے واپس مل جائیں۔ احمد نگر کی افواج کو پیچھے ہٹنا پڑا یہاں تک کہ وجیانگر کی افواج نے احمد نگر کے دارالخلافے میں مساجد و قرآن کی بے حرمتی اور بے حد غارت گری کی۔

حسین نظام شاہ نے جب کلیانی کو واپس لے کر اپنے وقار کو بحال کرنا چاہا اور اس سلسلے میں ابراہیم قطب شاہ سے مدد طالب ہوا تو اسے حسین نظام شاہ سے اپنے تعلقات مضبوط بنانے کے لیے اپنی دختر "جمال بی بی" کا پیام قائم بیگ، شاہ جعفر (برا شاہ طاہر) اور مولانا عنایت اللہ نیاتی کے ذریعے روانہ کیا۔ ۹۷۱ ھ م ۱۵۶۳ء ابراہیم قلی اور جمال بی بی کی شادی ہوئی (۲۰)۔ ۹۷۱ م ۱۵۶۳ء میں شاہ طہماسپ نے کعبہ بیگ کرچی کو اپنے ایلچی کی حیثیت سے روانہ کیا۔ شاہ نے اپنے خط میں اس کی زندگی اور ترکو سے جنگ تک کے حالات قلم بند کیے تھے (۲۱)۔

مصطفیٰ خاں نے ابراہیم کو قلعہ گول کنڈہ کو مستحکم کرنے کی رائے دی۔ قلعہ کی فصیلوں اور عمارتوں کو مضبوط کیا گیا او بیرونی فصیل اور نئے قلعہ کی تعمیر عمل میں آئی (۲۲)۔

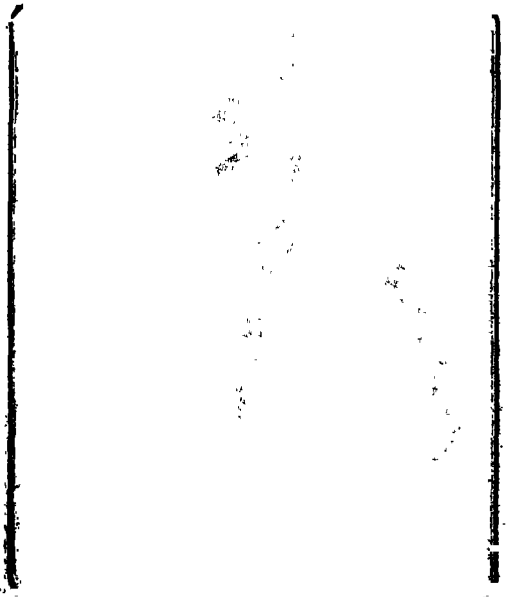
رام راج اپنی کامیابیوں اور طاقت کے غرور میں سفیروں کے ساتھ اپنا رویہ بدل دیا اور انھیں ذلیل کرنے لگا۔ حسین شاہ نے ابراہیم قطب شاہ سے ربط قائم کیا اور ابراہیم قلی نے اپنے ایلچی مصطفیٰ خاں کو احمد نگر بھیجا (۲۳)۔ اسی وجہ سے تمام سلاطین دکن نے اپنے باہمی اختلافات دور کر کے وجیانگر پر حملہ آور ہونے کی ٹھانی۔



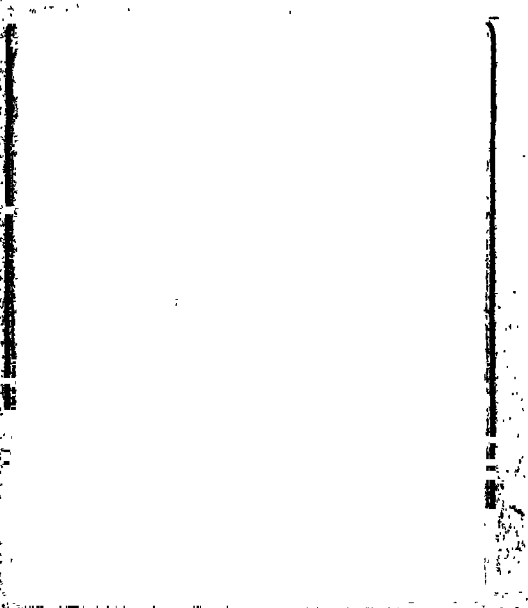
سلطان قلی قطب الملک (۱۵۱۸ء تا ۱۵۴۳ء)



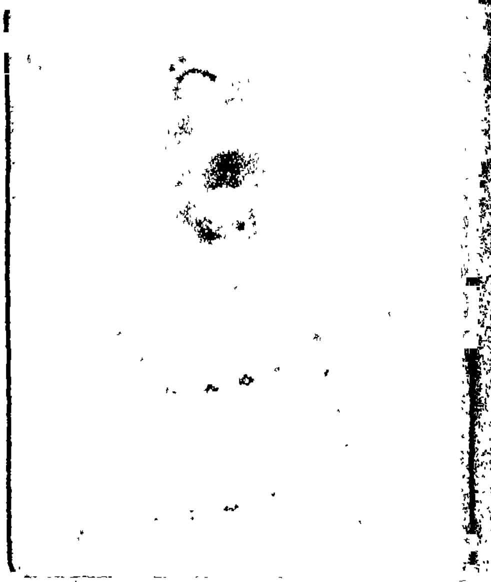
جمشید قلی قطب شاہ (۱۵۴۳ء تا ۱۵۵۰ء)



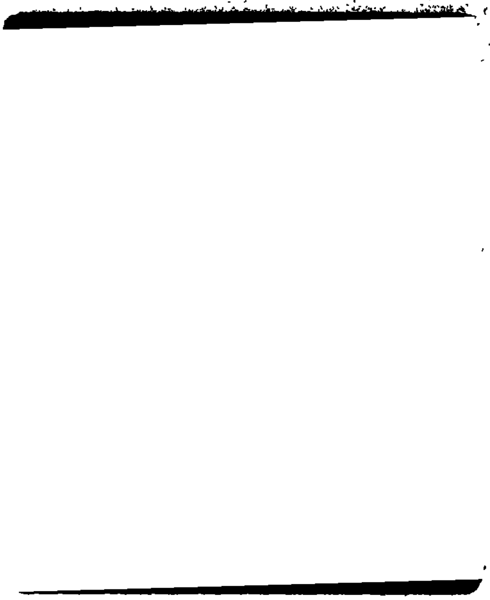
ابراہیم قلی قطب شاہ (۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء)



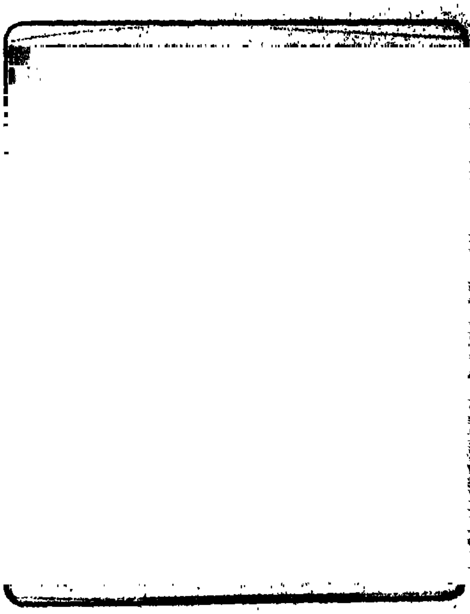
[illegible] قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۲ء)



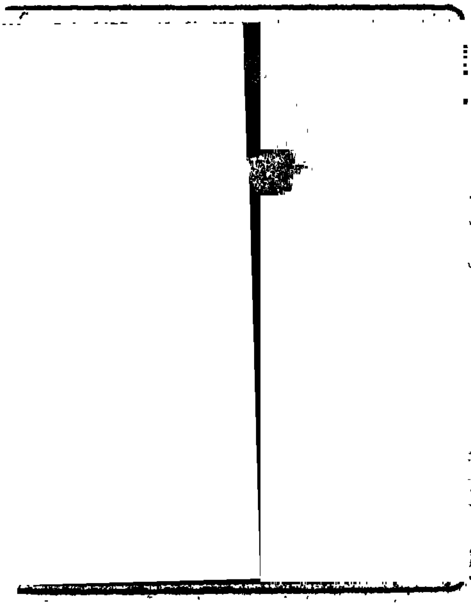
عبداللہ قطب (۱۶۲۶ء تا ۱۶۷۲ء)



ابوالحسن تانا شاہ (۱۶۷۲ء تا ۱۶۸۶ء)



[illegible] خیرات خاں



علامہ شیخ محمد ابن خاتون

حسین نظام شاہ، علی عادل شاہ اول، علی برید شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کی افواج وجیا نگر کے علاقے میں گھس گئیں اور تالی کوٹہ کے ۲۴ میل جنوب میں بہ مقام " بنی ہٹی " ۹۷۲ ھ م ۲۳ جنوری ۱۵۶۵ء کو " مسکی " اور ہکیری کے سنگم پر مقابلہ ہوا ۔ اس جنگ کو بعضوں نے " جنگِ تالی کوٹہ " یا " جنگِ رکساس تنگاڈی " یا " جنگِ کرشنا " سے یاد کیا ہے لیکن Kingdom of Ahmednager کے مؤلف ڈاکٹر رادھے شیام نے اس جنگ کو " جنگ بنی ہٹی " کا نام دیا اور یہی صحیح ہے ۔ رام راج میدانِ جنگ میں چلپی رومی خاں کی گولہ باری کے گرد و غبار میں کھو گیا ۔ حسین نظام شاہ کے ہاتھی (آتش خاں) نے اپنا کمال رام راج کو نامبے کرنے میں دکھایا اور رام راج مارا گیا (۲۴) ۔ فاتح افواج دس دن میدانِ جنگ میں رہیں اور پھر وجیا نگر کے دارالخلافہ میں چھ مہینے تک مقیم رہیں ۔ ابراہیم نے مصطفیٰ خاں اردستانی کو اپنی طرف سے مالِ غنیمت اور ملک وجیا نگر کی تقسیم کے لیے متعین کیا (۲۵) ۔

مختلف معاہدوں کے بعد ایک دوسرے کے پاس ایلچیوں کو بھیجے جانے کا ذکر ملتا ہے لیکن کم ہی ایلچیوں کے نام ملتے ہیں ۔ ایرانی طرز پر قطب شاہوں کے پاس سفیر کو مختلف نام دیے گئے جیسے ایلچی، سفیر، وکیل، رسولان اور حاجب اور ان کے کام کو ایلچی گری، سفارت، وکالت، رسالت اور حجابت کہتے ہیں ۔ ان کے کام کے لحاظ سے ان کی چار قسمیں تھیں مستقل، عارضی، معمولی اور غیر معمولی (۲۶) ۔ بیجاپور کے سفیر رفیع الدین شیرازی نے اپنی کتاب " تذکرۃ الملوک " میں ابراہیم قلی کا بہت ہی احترام سے ذکر کیا ہے (۲۷) ۔

۹۷۷ ھ م ۱۵۶۹ء علی عادل شاہ اول اپنے میر جملہ ابوالحسن کو مرتضیٰ نظام شاہ اول کے پاس روانہ کیا اور ادھر ابراہیم قلی کو لکھا کہ وہ مرتضیٰ نظام شاہ اول کی مدد نہ کرے ۔ ابراہیم قلی کا جواب مرتضیٰ نظام شاہ اول کے آدمیوں کو دستیاب ہوا اور قطب شاہی افواج کو گول کنڈہ کی راہ لینا پڑی ۔ اس طرح یہ عظیم معاہدہ ختم ہو گیا (۲۸) ۔ علی عادل شاہ اول او مرتضیٰ نظام شاہ اول قطب شاہی علاقہ پر حملہ آور ہوئے اور ناکام ہوئے ۔ قطب شاہی افواج کولاس تک بڑھ آئیں اور ۹ محرم ۹۸۱ ھ م ۱۱ مئی ۱۵۷۳ء کو جنگ ہوئی ۔ اس دوران مرتضیٰ نظام شاہ اول نے بیدر پر حملہ کرنے کا ایک نیا منصوبہ بنایا ۔ اس نے ابراہیم قطب شاہ سے مدد لینے کے لیے میر ابوالقاسم کو گول کنڈہ روانہ کیا اور ابراہیم قطب شاہ احمد نگر کی کمک کرنے آمادہ ہوا (۲۹) ۔

۹۹۸ ھ م ۱۵۸۰ء میں مرتضیٰ نظام شاہ اول نے اپنے سفیر میر میرک سبزواری کو محمد قلی قطب شاہ کے پاس ابراہیم قلی قطب شاہ کے انتقال کی تعزیت دینے روانہ کیا (۳۰) ۔ محمد قلی قطب شاہ بہ تاریخ ۵ مئی ۱۵۸۰ء کو تخت نشین ہوا ۔

امرلو، سلطان شاہ عباس کا پہلا سفیر ہے جو ۱۰۱۲ ھ م ۱۶۰۳ء میں گول کنڈہ آیا ۔ قنبر قلی و مہدی قلی سلطان گول کنڈہ کی طرف سے ایران گئے ۔ محمد قلی قطب شاہ کا دورِ سلطنت گول کنڈہ کا سنہرا دور ہے ۔ منس بادشاہ اکبر اپنے ایلچی میر جمال الدین حسین کو بیجاپور اور گول کنڈہ روانہ کیا تاکہ وہ رقم اور تحائف وصول کرے ۔ وہ چار سال دکن میں رہا اور اکبر کو کوئی اطلاع نہیں بھیجی لہٰذا ۱۶۰۴ء میں اکبر نے دوسرے ایلچی اسدبیگ کو گول کنڈہ روانہ کیا (۳۱) ۔

جب ابراہیم عادل شاہ پانچ ہزار افواج کو ملا محمد لاری کی کمان میں احمد نگر پر حملہ کرنے کے لیے مغلوں کے پاس بھیجا، ملک عنبر کھڑکی (اورنگ آباد) سے گول کنڈہ آیا اور محمد قلی قطب شاہ کی مدد مانگی (۳۲) ۔

احمد نگر مغلوں کے قبضہ میں آنے سے محمد قلی ۹۸۸ ھ م ۱۵۸۰ء شہنشاہ اکبر سے مخالفانہ تعلقات پیدا کر لیے تھے (۳۳) ۔ گول کنڈہ کے مخالفانہ تعلقات ایران سے بھی تھے ۔ محمد قلی قطب شاہ اپنے ایلچی ایران کو بھیجا کرتا تھا (۳۴) ۱۶۰۳ء میں اکبر بادشاہ اپنے سفرا شیخ فیضی، خواجہ امیرالدین، میر محمد امین مشہدی اور ملا مسعود کو خاندیش، احمد نگر، بیجاپور اور گول کنڈہ کو روانہ کیا اور ان

کیونکہ اگر یہ سلاطین اکبر کی بادشاہت کی پناہ میں آئیں تو ان کی حفاظت کی جائے گی (۳۵) ۔

۱۰۱۰ ھ م ۱۶۰۱ء میں مغل سفیر مسعود بیگ اکبر بادشاہ کا پیغام لے کر گول کنڈہ آیا ۔ ۱۰۱۳ ھ م ۱۶۰۴ء میں محمد قلی قطب شاہ نے مغل بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے تیس اعلیٰ سجے ہوئے ہاتھی اور تلنگانہ کے نوادر روانہ کیا (۳۶) ۔ میر شریف گول کنڈہ کا وکیل بنایا گیا ۔ جہانگیر نے اسے ہاتھی انعام دیا اور اس کی روانگی کے وقت محمد قلی قطب شاہ کے لیے اپنی تصویر ، مرصع کپواہ اور پھول کٹارا ، مرصع گھوڑا اور خلعت بہ طور تحفہ عطا کیا ۔ یہ واقعہ اس کے ۱۳ سال جلوس کا ہے (A ۳۶) ۔

احمد نگر کے سفیر میرک معین سبزواری نے خداداد محل کے افتتاحی جشن کے موقع پر ایک تاریخ کہی :

این قصر کہ ہست رشک فرمائے بہشت
ایام بہ آب زندگانیش سرشت
تاریخ مرتب شدندش کلک قضا
بر لوح بقا بنائے جاں بخش نوشت (۳۷)

محمد قلی کے بعد اس کا داماد سلطان محمد قطب شاہ نے ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء کو عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی ۔ مغلوں کے دکن پر حملوں کی وجہ سے سلطان محمد قطب شاہ نے اپنی حکومت کو پھیلانا چاہا ۔ سلطان محمد قطب شاہ کو تخت نشینی کی مبارک باد دینے کے لیے بیجاپور اور دولت آباد سے (جو نظام شاہیوں کا دارالخلافہ تھا) گول کنڈہ کو سفیر آئے (۳۸) ۔ ۱۰۲۳ ھ م ۱۶۱۴ء شاہ عباس اول والیِ ایران کا ایلچی حسین بیگ قبچاقی تبریزی شاہ کا خط جس میں رکھ کر ان کی فتح کی خبر تھی ۔ لے کر گول کنڈہ آیا ۔ خط میں اس کی فتح کی وجہ سے ان دونوں ممالک کے ایلچیوں کے آمد و رفت میں آسانی ہونے کا ذکر تھا ۔ حسین بیگ قریب دو سال گول کنڈہ میں مقیم رہا ۔ ۱۶۱۹ء میں شہزادہ خرم (شاہ جہاں) نے ملک عنبر کو شکست دی ۔ سلطان محمد اور ابراہیم عادل شاہ ثانی نے میر کی اور مرجادو داس سفراء دہلی کو پندرہ لاکھ کے تحائف دیے (۳۹) ۔ ربیع الاول ۱۰۲۶ ھ م مارچ ۱۶۱۷ء حسین بیگ کی ایران کو واپسی کے وقت محمد ابنِ خاتون کو ایلچی بناکر ایران بھیجا گیا ۔ ان دونوں کی ملاقات جہانگیر سے مانڈو میں ہوئی ۔ ایران سے سفارت کی وجہ سے تلنگ ۔ ایران کے تعلقات پیدا ہوئے (۴۰) ۔

محمد ابنِ خاتون نے نو یا دس برس ایران میں سفارتی فرائض انجام دیے ۔ وہ ۱۰۳۵ ھ م ۱۶۲۹ء حیدرآباد واپس ہوا ۔

گول کنڈہ سے سفارتی تعلقات صفوی دورِ حکومت کے بادشاہانِ شاہ اسمٰعیل اول ، شاہ طہماسپ ، شاہ اسمٰعیل ثانی کے بعد شاہ عباس اول نے قائم رکھے ۔ ۔ شاہ عباس نے سلطان محمد قطب شاہ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ اس نے ایک خط جہانگیر کو روانہ کیا ہے جس میں تحریر کیا تھا کہ وہ دکن کے سلاطین بالخصوص گول کنڈہ پر نظرِ خاطر رہے (۴۱) ۔ ۱۰۲۹ ھ م ۱۶۲۰ء میں شیخ محمد خاتون کی وداعی کے موقع پر شاہ عباس تین ایلچیوں کو بیجاپور ، گول کنڈہ اور احمد نگر روانہ کیا (۴۲) ۔ قاسم بیگ سپہ سالار مازندران ایران کا ایلچی تھا جس نے شاہِ ایران کے گول کنڈہ سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کا ذکر کیا ہے ۔ قاسم بیگ کا انتقال گول کنڈہ میں عبداللہ قطب شاہ کے دورِ حکومت میں ہوا ۔

شہزادہ خرم نے ۱۰۳۵ ھ م ۱۶۲۶ء میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر مبارک باد دی اور ایران کی طرف سے قاسم بیگ نے بھی مبارک باد دی (۴۳) ۔ ۱۶۲۰ء میں سلطان محمد قطب شاہ نے حکم دیا تھا کہ جب شہزادہ خرم (شاہ

[illegible]

۱۶۲۹ء میں عبداللہ قطب شاہ نے ایک باعزت ایرانی النسل امیر خیرات خاں کو اپنا ایلچی بنا کر ایران بھیجا ۔ خیرات خاں خیر مقدم شاہ صفی نے بڑے تزک و احتشام سے کیا ۔ امام قلی کو ایرانی سفیر بنا کر گول کنڈہ بھیجا گیا (۴۵) ۱۰۴۰ھ م ۱۶۳۰ء میں ں سفیر شیخ محی الدین پیر زادہ اجینی کا استقبال غیر معمولی انداز میں کیا گیا جس کی وجہ سے اس نے شاہانہ رویہ اختیار کیا اور حکومتی معاملات میں دخل اندازی کرنے لگا ۔ ایسے موقعوں پر شیخ محمد ابنِ خاتون نے اس کو دربارِ شاہانہ کی تہذیب کا خیال رکھنے کہا اور اس غلط طرزِ عمل کی اطلاع ، فنس خاں کو دی شیخ محی الدین پیرزادہ ۱۰۴۰ھ م ۱۶۳۰ء میں واپس بلالیا گیا ۔ وفا خاں المخاطب یوسف کو بداللہ قطب شاہ نے ایلچی کی حیثیت سے برہان پور میں شاہ جہاں کے پاس مقرر کیا گیا (۴۶)

شاہ جہاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد اپنے دوستانہ رویہ کو بدل دیا ۔ اس نے عبداللہ قطب شاہ سے تحفے طلب کیے ۔ بداللہ اپنے ایلچی ملاتقی کو تحائف دے کر دولت آباد روانہ کیا جب کہ مغل حاجب عبداللطیف گول کنڈہ میں داخل نہیں ہوا تھا ۴۷) ۔ ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۵ء میں عبداللہ قطب شاہ کو مغل ایلچی عبداللطیف کی آمد کی خبر نہیں تھی لیکن امراءِ دربار نے اس کا ں پیمانے پر استقبال کیا ۔ عبداللہ قطب شاہ نے نصیر الملک ، معین الملک یولچی بیگ اور شجاع الملک کو حکم دیا کہ ریاست کے وقائع معقول انتظام کریں (۴۸) ۔ لیکن عبداللطیف گول کنڈہ آیا ، شیخ محمد ابنِ خاتون نے نی باغ میں اس کی ضیافت کی اور ایک ماہدہ لکھا گیا جس کو تاریخ " انقیاد نامہ " کے نام سے یاد کرتی ہے شاہ جہاں نے ، ربیع الثانی ۱۰۴۶ھ م ۲۹ / اگسٹ ۱۶۳۶ء اس ماہدے کو تسلیم کیا (۴۹) ۔ اس معاہدے سے قطب شاہی سلطنت مغلوں کے تابع ہو گئی ۔ عبداللہ اپنے بیش بہا مرصع ہاتھی " گج تی " اور ایک یاقوت کی نہایت آب دار اور قیمتی انگوٹھی شاہ جہاں کی خدمت میں حاجب خواجہ زاہد کے ذریعے روانہ کیا (۵۰)

شیخ محمد طاہر گول کنڈہ کا سفیر بن کر دولت آباد گیا ۔ ۱۰۴۹ھ م ۱۶۳۹ء میں عبداللہ قطب شاہ کے شاہی خواتین اور چند دسرے اہلِ خاندان عزائین پہنچے اور شاہ سے ملاقات کی ۔ عبداللہ نے اپنی پھوپی (Aunt) کے ذریعے خفیہ پیام شاہ عباس ثانی کے پاس روانہ کیا ۔ اپنے ایک خط میں عبداللہ نے اپنی پھوپی کو لکھا کہ اگر وہ مغلوں کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس کرے تو اس کے ل کنڈہ سے ایران کو فرار ہونے کا انتظام کیا جائے ۔

۱۰ھ م ۱۶۴۱ء میں حکیم نظام الدین محمود حکیم الملک کو عبداللہ قطب شاہ نے اپنا ایلچی بنا کر ایرانی سفیر امام قلی کے ساتھ ایران روانہ یا ۔ شاہ صفی تجار کو شاہی خریدی کے لیے بھیجا اور وہ ایک خط عبداللہ قطب شاہ کے لیے اپنے ہم راہ لائے ۔ مغلوں کو یہ سفارتی لقات اور حکیم الملک کی سفارت پر اعتراض تھا لہذا ایران اور گول کنڈہ سے سفارتی تعلقات منقطع ہوئے جس کی وجہ سے عبداللہ لب شاہ عباس ثانی کی تخت نشینی پر مبارک باد نہیں دے سکے (۵۱) ۔

محمد سعید میر جملہ کی شاہ عباس ثانی اور ایرانی وزیر خلیفہ سلطان سے مراسلت تھی خلیفہ سلطان کی شاید میر جملہ سے ستی رہی ہوگی ۔ جب محمد سعید میر جملہ نے بغاوت کی اور مغلوں کو حیدرآباد پر حملہ کرنے کی ترغیب دی ، عبداللہ قطب شاہی نے یہ پیام شاہ عباس ثانی کو روانہ کیا ۔ جب شاہ جہاں کے بعد اس کے بیٹوں میں جنگ ہونے لگی ، شاہ عباس نے عبداللہ لب شاہ اور عادل شاہ کو مغلوں کے خلاف متحد ہونے کی صلاح دی ۔ یہ خط و کتابت مرزا مقیم شاہی محافظ کتب خانہ کے ذریعے ئے ۔ یہ شخص دونوں درباروں سے واقف تھا (۵۲) ۔ ہمیں ایک فرمان قطب شاہ کا ملتا ہے جس میں شاہ شجاع کے نام مراد ش کا عطا ہونے کا ذکر ہے (۵۳) ۔ شاہ صفی نے حکم دیا گھوڑوں کا تحفہ اورنگ زیب کے لیے تربیت خاں کے ساتھ بھیجا ئے ۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے حکم دیا کہ ایرانی امراء کے گھروں کے سامنے ان گھوڑوں کو کاٹیں ۔ خافی خان لکھتا ہے کہ

[illegible] ہے گول کنڈہ میں اس حرکت کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ لوگوں میں بانٹنے کے لیے مختلف جگہ گھوڑے
[illegible] کے تاکہ معلوم نہ ہو اور یہ تھا کہ شاہ جہان آباد میں ہر محلہ ایک ایرانی امیر کے نام سے موسوم ہے (۵۴) ۔ ابوالحسن ۲۱ /
[illegible] ۱۶۷۲ء کو تخت نشین ہوا ۔ ۱۶۷۷ء میں شیر خاں نے ابوالحسن سے مدد مانگی ۱۶۶۸ء میں سدی مسعود حیدرآباد آیا اور بیجاپور کے نظم و
[illegible] درست کرنے کے سلسلے میں ابوالحسن تاناشاہ سے مدد مانگی ابوالحسن قطب شاہ نے اکنا کو مشیر بنا کر بیجاپور روانہ کیا (۵۵) ۔
شہنشاہ عالم گیر نے میر عبدالرحمن اور خواجہ عثمان کو ابوالحسن کے پاس روانہ کیا ۔ ابوالحسن کے پاس مغل حاجب دلاور
خاں کو بھیجا گیا جب معلوم ہوا کہ ابوالحسن نے شیواجی کے ساتھ تعلقات پیدا کرلیے ہیں اور مغلوں کے باغی شیخ منہاج کو پناہ دی ہے تو
ابوالحسن سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ہرجانے کے طور پر ایک کروڑ روپیہ ادا کرے ۔ آخرکار سلطنت گول کنڈہ کا خاتمہ بہ تاریخ ۲۴ ذیقعدہ
۱۰۹۸ھ م ۲۱ ستمبر ۱۶۸۷ء کو عبداللہ خاں پنی کی نمک حرامی کی وجہ سے ہوگیا (۵۶) ۔

o●o

حوالے :

1. Historyof medieval Deccan p. 418-149, Vol - I, Shenvani.
2. History of the Qutb Sh~hi Dynasty p.81.
3. History of Medival Deccan Vol - I, p.426. Shenvani.
4. Golconda and Qutb Shah p.7, Sha Rocco.
5. Mohd Quli Qutb Shah Founder of Hyderabad p.55. Shenvani
6. Histry of the Qutb Shahi Dynasty p.82. 7. Ibid. p.83
8. History of Medival Vol - I, p.424
9. The Mughal Empire p.470, R.C.Majumdar.
10. Ibid p.84. 11. Ibid p.85.
12. Ibid p.100 13. History of Medival Deccan p.424.
14 History of Medival Deccan p.425 - 426. & Enternal Relations of Bijapur Kingdom p.99 By M.A. Nayeem.
15. History of Medival Deccan Vol - I. p.426
16. Ibid p.87. 17. History of Medival Deccan Vol-I, p.427
18. History of the Qutb Shahi Dynasty p.98
19. History of Medival Deccan p.427 - 428.
20. History of Medival Vol - I, p.423. & History of Golconda p.77 & History of Ahmednagar p.114. Dr. Radhey Shyam.

21. History of Persia p.193 Vol - I, Eskander Beg Munsi.
22. History of Golconda p.81, Abdul Majeed Siddiqui.
23. Ibid p.74 & Mohd Qutb Shah p.10 & History of Medival Deccan p.432.
24. Ibid p.331, 433, 435. & History of Golconda p.84 - 85.
25. Ibid p.66 foot note.
26. External Relations of the Bijapur Kingdom p.40
27. History o f Golconda p.64
28. History of the Medival Deccan p.438
29. Ibid p.440 & History of Golconda p.111 - 112.
30. History of Golconda p.113.
31. History of Medival Deccan p.344.
32. History of Medival Deccan p.349.
33. Ibid p.448
34. Indo Persian Relations p.94 Riayazul-Islam.
35. History of Golconda p.119
36. Ibid p.125 & Akbernama Vol-III, p.1171 note 782.
36A. Tazk-e-Jahangiri Vol-II, p.54, 90.
37. Mohd Quli Qutb Shah the Founder of Hyderabad p.24
38. History of Medival Deccan p.460.
39. History of Golconda p.126 - 127
40. History of Medival Deccan p.460 - 461.
41. Indo Persian Relation p.93 - 94.
42. Ibid p.25
43. Ibid p.171
44. History of Golconda p.128, 153.
45. Indo Persian Relations p.116.
46. History of Golconda p.155
47. Ibid p 161
48. Ibid p.162
49. History of Golconda p.165, 166.
50. Ibid p.168
51. Indo Persian Relations p.118 foot note.
52. Ibid p.119, 121.
53. Ibid p.122
54. Ibid p.130
55. History of Medival Deccan p.387.
56. History of Medival Deccan p.490

o●o

موہن پرشاد

حیدرآباد ، مخطوطات کی روشنی میں

قطب شاہی تاریخ گول کنڈہ پر اب بھی بہت سے مخطوطات مختلف کتب خانوں اور اہل ذوق حضرات کے پاس محفوظ ہیں ۔ جناب عبدالمجید صدیقی مرحوم اور جناب ہارون خاں شیروانی مرحوم سابق پروفیسر تاریخ نے اپنی تصانیف تاریخ گول کنڈہ میں کئی مخطوطات کا ذکر کیا ہے ۔ یہ مخطوطات تلگو اور فارسی دونوں زبانوں میں دست یاب ہیں ۔ انھوں نے لکھا ہے کہ تلگو زبان میں قطب شاہی مخطوطات کا ذخیرہ مسٹر کے وی بھوپال راؤ مقیم ہنمکنڈہ ضلع ورنگل آندھرا پردیش میں دست یاب ہے ۔ مسٹر کے وی بھوپال راؤ اپنے آپ کو وزراء قطب شاہی اکنا و مادنا کے قریبی رشتہ دار بتاتے ہیں ۔ ان کے مخطوطات سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ ابوالحسن تانا شاہ آخری بادشاہ قطب شاہی کے وزراء اکنا مادنا کے ایک قریبی رشتہ دار گوپنا ، تعلقہ بھدرا چلم میں تحصیلدار تھے اور یہ علاقہ سلطنت قطب شاہی کے Jurisdiction تحت تھا ۔ گوپنا تحصیلدار بھگوان رام چندر جی کا بھگت تھا اور ہمیشہ ریاضت میں مصروف رہتا تھا ۔ اس نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ بھگوان رام چندر جی ، سیتا جی اور لکشمن جی نے بشارت دی اور کہا کہ اس مقام بھدرا چلم پر ایک مندر تعمیر کیا جائے ۔ یہ خواب دیکھنے کے بعد گوپنا تحصیلدار نے سرکاری رقومات سے بہ مقام بھدرا چلم ایک مندر رام چندر جی ، سیتا جی اور لکشمن جی کا بنوایا ، جب بادشاہ وقت ابوالحسن تانا شاہ کو یہ اطلاع ملی کہ سرکاری رقم سے یہ مندر تعمیر ہوا اور اس کی اجازت کے بغیر تغلب و تصرف کیا گیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ گوپنا تحصیلدار کو پاپیادہ بھدرا چلم سے گول کنڈہ لایا جائے (ان دونوں مقامات کا فاصلہ 350 کیلو میٹر ہے) اس کے بعد گوپنا کو قلعہ گول کنڈہ کے ایک حجرہ میں بند کردیا گیا ۔ گوپنا تقریباً 12 سال تک اس حجرہ میں ریاضت کرتا رہا ۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ بھگوان رام چندر جی اس سے کہہ رہے ہیں کہ گوپنا کو رہا کر دیا جائے اور جو رقم مندر کی تعمیر میں خرچ ہوئی وہ واپس کردی جارہی ہے ۔ جب بادشاہ صبح کو اٹھا تو پوری رقم اپنے بستر کے قریب رکھی ہوئی پایا ۔ بادشاہ نے فوراً گوپنا کو رہا کردیا اور اس رقم کے زیور بنوا کر اس مندر کو دان کیا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس مندر کے موجودہ زیور اس زمانے کی یاد دلاتے ہیں ۔ ہر سال رام نومی کے دن اس مندر میں بہت بڑی جاترا ہوتی ہے ۔ اس لیے گوپنا کو سب لوگ رام کے بھگت رام داس کے نام سے پکارتے ہیں ۔ رواداری کوئی مادی شئے تو نہیں مگر بادشاہ کے اس عطیہ سے واضح طور پر نظر آتی ہے ۔

یوں تو شہر حیدرآباد کی عمر دنیا کے قدیم شہروں کے بمقابلہ میں کچھ زیادہ نہیں لیکن اس عرصے میں یہ شہر ایسے صاحب کمالوں ، فن کاروں اور اہل ذوق انسانوں کا مرجع رہا ہے جنھوں نے اسے ایک خاص تمدن اور معاشرت کا گہوارہ بنا دیا ۔ ایک اعلا تہذیب اور شائستگی یہاں پیدا ہوئی کہ اس ملک کے جملہ باشندوں میں خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں معاشرتی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے کوئی فرق نہیں ۔ حیدرآباد کے ایک قدیم ترین محلہ کا ذکر پیش ہے جو باعث دل چسپی ہوگا ۔

سعید آباد یہ شہر حیدرآباد کا قدیم ترین محلہ ہے اس کے بانی حضرت میر مومن پیشوائے حکومت قطب شاہی رہے ہیں۔ آج سے ۴۰۰ سال قبل یعنی ۱۰۱۳ھ کو یہ محلہ بسایا گیا تھا اس کا اصلی نام سید آباد تھا جو مرورِ ایام کی وجہ سے مسخ ہوکر بعد میں سعیدہ باغ اور اب سعید آباد ہوگیا ہے۔ یہاں پر میر صاحب کی بنائی ہوئی مسجد اب بھی آباد ہے۔ اس کے متصل سرائے ہے۔ یہ محلہ حیدرآباد کے پرانے محلوں میں سے ایک ہے۔ سعید آباد سالار جنگ میوزیم کی جانب مشرق ۸ کیلو میٹر پر واقع ہے اسی پر چند کیلو میٹر آگے سلطان محمد قطب شاہ نے سلطان نگر اور حیات بخش بیگم نے شہر حیات نگر بسایا تھا۔ قلعہ نامکمل رہا؛ بستی حیات نگر آباد ہے۔ سعید آباد کی مسجد کے قریب ایک دیول بھی ہے جو آباد ہے اور یہ ابوالحسن تانا شاہ کے آخری زمانے میں مادنا اور اکنا وزراء کی بنوائی ہوئی ہے۔ سعید آباد کی مسجد میں ایک کتبہ بھی ہے اس پر تاریخ ۱۰۱۳ھ درج ہے اس میں تین کمانیں ہیں جو بہت خوش نما ہیں اور چھجے اوپر جو منڈیر بنائی گئی ہے، اس پر ۲۱ چھوٹی چھوٹی کمانیں اور پھر طلوں کی شکل کا حاشیہ دے کر عمارت میں دیدہ زیبی پیدا کی گئی ہے۔ درمیانی کمان کے آگے تھوڑے فاصلے پر ایک لمبا حوض بنایا گیا جس میں اب مٹی بھری ہوئی ہے۔ اس کے قریب سرائے بنائی گئی جس کی جملہ ۱۸ کمانیں ہیں جو اب بھی باقی ہیں۔ شہر حیدرآباد کی بنیاد کے ساتھ ساتھ ایک شفاخانہ یعنی بیمارستان جس میں بیمار رکھے جاتے تھے اور جہاں مقیم اور غیر مقیم ہر دو قسم کے بیماروں کا علاج ہوتا تھا، قائم کیا گیا اس کے لئے ایک عظیم الشان عمارت بنائی گئی جس کے قریب ہی ایک عمارت بناکر حضرت میر محمد مومن استرآبادی کو ٹھہرایا گیا۔ یہ عمارت دارالشفاء کہلانے لگی جس کی تعمیر ۱۰۰۴ھ میں ہوئی۔ اس شفاخانہ کی وجہ سے اطراف کی آبادی بھی اسی نام سے موسوم ہوگئی اور ایک محلہ ہی آباد ہوگیا اس کے ساتھ ساتھ حسینی محلہ بھی آباد ہوگیا مگر اب انھیں علاحدہ کرنا مشکل ہے چوں کہ پرانی حویلی بھی اس سے ملحق ہے اس لئے یہ محلہ بھی اس میں مل گیا اور اب دارالشفاء، حسینی محلہ، پرانی حویلی تقریباً ایک ہی محلہ بن گئے ہیں جن میں کوچہ اعجاز حسین، کوچہ توپ خانہ، کوچہ مرزا علی، کوچہ دریچہ، کوچہ مرثیہ خوان، احاطہ نظام یار جنگ اور احاطہ علی یاور الدولہ شامل ہیں اور یہ سب اب تک بہت ہی آباد و گنجان ہیں، دارالشفاء جہاں بنایا گیا تھا اس کے کھنڈر میں بعد میں ایک عاشور خانہ بن گیا مگر اس کی عمارت اب بھی باقی ہے جس میں الاوہ سرطوق ہے جو سالار جنگ میوزیم کے عقب میں ہے۔ ادارہ ادبیات اردو اور سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے کے مخطوطات سے پتہ چلتا ہے کہ قطب شاہی حکومت کے صرف چند محکمے یا دفاتر ہوتے تھے جو حکومت کا سب ہی کام کر لیتے تھے اور ان محکموں کے دفاتر پیشوا (صدر اعظم) کے دفتر کے قریب ہوتے تھے۔ وزیر اعلیٰ جس کو پیشوا بھی کہا جاتا تھا، اگرچہ بادشاہ سلطنت کا نفس ناطقہ ہوا کرتا تھا لیکن حکومت کے عاملانہ فرائض کے لئے مرکز میں کئی وزیر مقرر ہوتے تھے اور فرائض و اختیارات کی تقسیم کی جاتی تھی۔ حکمران پیشوا، وزیر اعظم، وکیل مطلق یا پیشوا کہلاتا تھا جس کے ہاتھ میں امور سلطنت کی نگرانی؛ داخلی اور خارجی امور سلطنت رہتے تھے۔ بادشاہ بالعموم اسی پیشوا (وزیر اعظم) سے مشورہ کرتے تھے، اس خدمت پر اکثر بڑے پائے کی شخصیتیں مامور کی جاتی تھیں۔ جن کی علمی اور عملی قابلیت مسلمہ ہوتی تھی اور بالعموم میر جملہ کے عہدہ سے پیشوائی پر ترقی دی جاتی تھی۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ میر جملہ کسی وزیر کا نام ہے حالاں کہ یہ ایک عہدے کا نام ہے جس کا درجہ پیشوا کے بعد آتا ہے اور اس کو جملۃ الملک کا خطاب عطا ہوتا تھا اور اس عہدہ کو وزارت جملۃ الملکی کہتے تھے۔ اس کے تحت وزارت مالیات رہتی تھی جس کے ذمہ سلطنت کی تمام مال گزاری کی گرفت (جمع بندی) اور ہر محکمہ کے خرچ کی تنقیح تھی۔ تمام سلطنت کے داخل اور مصارف کی جانچ پڑتال ان کے سپرد رہتی تھی کیوں کہ مالیات کے ساتھ بالعموم حسابی تنقیح شامل رہ

تھی ۔ وہ حسب منصب کے مطابق یہ بالخصوص کوتوال اور فوج کی بھی تنقیح کرتا تھا ۔ اس طریقہ سے اس عہدہ دار کے اختیارات اور اثرات دوسرں بہت وسیع تھے جو خود پیشوا کو بھی دستیاب نہیں تھے ۔ قدیم شہر حیدرآباد میں جو میر جملہ کا تالاب ہے وہ محمد سعید اردستانی کا بنایا ہوا ہے جو اس وقت قطب شاہی حکومت کے میر جملہ کے عہدے پر فائز تھے ۔ وزیر یمین الملک ، یہ محکمہ فوج کا صدر ہوتا تھا ، جس کو سپہ سالار بھی کہتے تھے ۔ یہ امور خارجہ اور امور دستوری کو بھی دیکھتا تھا ۔ مجموعہ دار ، یہ حکومت کی مالگزاری جمع کرتا اور سرکاری خزانہ میں داخل کرتا تھا ۔ یہ میر جملہ کے تحت ہوتا تھا اور شریک کار رہتا تھا اس کا درجہ وزیر سے کم ہوتا تھا ۔

ناظر ، اس کو عام طور پر ناظر الملک کا خطاب دیا جاتا تھا اس کا درجہ بھی وزیر سے کم رہتا تھا ۔ آمد و خرچ کا حساب رکھتا تھا ۔ یہ جمع بندی بھی کرتا تھا اور خرچ کی تنقیح بھی ۔ آج کل جو عدالتوں میں ناظر ہوتے ہیں اس سے اس کی کوئی مناسبت نہیں ہے ۔

دبیر ، اس کو دبیر الملک اور کبھی منشی الملک کا خطاب عطا ہوتا تھا ۔ یہ بادشاہ کے خاص فرائض انجام دیتا تھا ۔ یعنی شاہی فرامین اور احکام شائع کرتا تھا اور یہ فرامین فارسی اور مقامی زبانوں میں شائع ہوتے تھے ، اب بھی بہت سے فرامین دیوانی اور ملکی و مالی (موجودہ اسٹیٹ آرکائیوز) تار ناکہ حیدرآباد میں موجود ہیں ۔

کوتوال ، گو یہ وزیر نہیں ہوتا تھا مگر شہر میں قیام امن کے لیے اس کی بڑی اہمیت تھی اس کی نظر باہر کے سیاحوں پر رہتی تھی بغیر اس کی اجازت کے کوئی اجنبی شہر میں داخل نہیں ہوسکتا تھا ۔ شہر کے تمام فوجداری امور قابل دست اندازی اور ناقابل دست اندازی اس کے ذمہ تھے ۔ اس کے بعد بہت سے چھوٹے عہدہ دار ہوتے تھے ۔ مثلاً جو سرخیل کہلاتے تھے خاص بادشاہ کی حفاظت کرتے تھے جیسے آج کل اے ڈی سی کہا جاتا ہے ۔ اس کے تحت حوالدار اور سپاہی ہوتے تھے ۔

مقامی حکومت ، سلطنت مختلف صوبوں میں منقسم ہوتی تھی ۔ ہر صوبہ میں ایک صوبہ دار ہوتا تھا جو مرکزی حکومت کو جواب دہ ہوتا تھا ۔

محکمہ عدالت ، زمانہ قدیم میں عدالت کا کوئی محکمہ الگ نہیں تھا ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد ایک علحدہ دفتر عدالت قائم ہوا بعد میں دیوانی اور فوجداری عدالتیں قائم ہوئیں ۔ تعزیرات ہند اور ضوابط فوجداری نافذ و شائع ہوئیں اور انگریزی عدالتی عہدہ دار مقامی روایات کے مطابق فیصلہ کرتے تھے ورنہ پہلے بڑے بڑے مقدمات میں خود بادشاہ سماعت کر کے فیصلہ یا فرمان جاری کرتا تھا ۔ شہرہ آفاق مورخ فرشتہ بھی اپنی تاریخ میں حیدرآباد اور اس کے جاہ و جلال کی تعریف کی ہے ۔ تاریخ سے ان اقتباسات کا ترجمہ پیش ہے جن کا تعلق شہر حیدرآباد سے ہے ۔

گولکنڈہ کا ملک اپنی عام حالت کے لحاظ سے ایک سیراب و شاداب خطہ ہے جہاں قسم قسم کا غلہ چاول ، بھینس ، بھیڑ ، بکری اور طرح طرح کے پودے اور بہت سے اجناس و کرانہ جو زندگی کے لیے ضروری ہیں پیدا ہوتے ہیں چوں کہ تالاب بہ کثرت ہیں اس لئے وہاں مچھلی بھی بہ افراط ہوتی ہے ۔ خاص کر ایک قسم کی مچھلی جس کا نام مرل ہے بہت ہی مزے دار ہوتی ہے اس ملک کا صدر مقام بھاگ نگر (موجودہ شہر حیدرآباد) ہے یہاں ایک ندی ہے جس کا نام موسی ندی ہے جو مسولی پٹنم کے پاس خلیج بنگال میں گرتی ہے ۔ اس کے اوپر ایک مضبوط پل ہے (موجودہ پرانا پل) اس ندی کے شمال میں ایک بڑی بستی ہے اس میں تمام تاجر اور ساہوکار و اہل حرفہ وغیرہ ہر طرح کے ادنیٰ لوگ بستے ہیں ۔ (موجودہ بیگم بازار) یہاں پر ہاتھی ، گھوڑے اور اونٹ فروخت

ہوتے ہیں ۔ موسیٰ ندی کے جنوب میں ایک بڑی مسجد بن رہی ہے (موجودہ مکہ مسجد) اگر یہ پوری بن جائے تو ہندوستان کے تمام ساجد سے شان دار ہوگی ۔ یہ پوری مسجد ایک خاص پتھر سے بن رہی ہے ۔ اس پتھر کو پانچ چھ سو آدمی ایک کان سے نکال کر ہاتھیوں کے ذریعہ یہاں بھیجتے ہیں قلعہ گول کنڈہ کے جانب شمال مغرب یہاں کے بادشاہوں کی قبریں ہیں شام کے چار بجے ہر روز غریبوں کو روٹی قورمہ پلاؤ مفت تقسیم ہوتا ہے ۔ یہاں کا بادشاہ ہر سال دلی کے مغلوں کو دو لاکھ پگوڈا (موجودہ نو (۹) لاکھ روپے) ادا کرتا ہے یہاں کا کپڑا مکمل بہ راہ دبے واڑہ ضلع کرشنا پانی کے جہاز کے ذریعہ مسولی پٹم سے باہر جاتا ہے ۔ یہاں مقامی شراب گڑ مہوا ور شکر سے بنتی ہے ۔ یہ بڑی اچھی ہوتی ہے ۔ قلعہ گول کنڈہ میں ایک ڈچ شاہی ڈاکٹر ہے جو جراحی کا کام کرتا ہے اس کا نام پیٹر ڈی للان ہے اسس کے تقرر سے پہلے یہاں پر جراحی کا طریقہ ۔ علاج نہیں تھا ۔ تمام جواہرات میں ہیرا سب سے قیمتی جوہر ہے ۔ ول کنڈہ تو جواہرات کی منڈی ہے ۔ میں نے ارادہ کیا کہ ان کانوں کو دیکھوں جہاں سے یہ ہیرے نکلتے ہیں ۔ ہم گول کنڈہ کے جنوب میں کرناٹک کی طرف چلے ہیروں کی کانیں ان مقامات پر تھیں ۔ بلاری ، رائے درگ اور کولار ۔ یہاں کی کانوں سے ہیرے ل کر میر جملہ کی نگرانی میں گول کنڈہ لائے جاتے ہیں ۔ چٹانوں میں شگاف ہوتے ہیں ان کانوں کے مزدور ان میں برما لگاتے ہیں ور لوہے کی سلاخوں سے ان میں ہیرے ڈھونڈتے ہیں ۔ اس کے بعد ہیروں کو تراشتے ہیں ۔ کان کھودنے والے اور ہیرے تراشنے الے مزدور کی تنخواہ سالانہ صرف تین پگوڈا (موجودہ 21 روپے) ہوتی ہے ۔ ہیرے تول کر بیچے جاتے ہیں ۔ دنیا کا مشہور ترین ہیرا وہ نور انھیں کانوں سے نکال کر گول کنڈہ لایا گیا تھا ۔ کوہ نور کو للر کی کان سے نکلا تھا جو دریائے کرشنا پر واقع ہے اس کے ملنے کی صل تاریخ تو معلوم نہیں مگر اتنا معلوم ہے کہ وہ ۱۶۵۶ ء یا ۱۶۵۷ ء میں جب کہ تراشا بھی نہیں گیا تھا میر جملہ نے حاصل کیا تھا ۔ س وقت اس کا وزن ۹۰۰ رتی ۷۸۰ یا قیراط تھا ۔ ۱۶۵۸ ء ہیرا کوہ نور کو میں نے اورنگ زیب کے جواہر خانے میں دیکھا تھا ۔ لومت ہند کے شائع شدہ بلیٹن دی انڈین انسٹیٹیوٹ آف ہسٹری آف ، انڈین میڈیسن کے بہ موجب نظام الدین احمد گیلانی ، بداللہ قطب شاہ کے دور میں بہ حیثیت حکیم حاذق کافی شہرت رکھتے تھے ۔ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اپنے فرخندہ نیاد حیدرآباد میں حکیم گیلانی کے واقعات زندگی بیان کئے ہیں اور علم طب پر جو کام کیے اور جدوجہد کی اس کی صراحت کرتے ہوئے تایا ہے کہ نظام الدین گیلانی کے علمِ طب میں ایک سو تصانیف ہیں ۔ حکیم نظام الدین گیلانی ایران کے باشندے اور عبداللہ شیرازی کے بیٹے تھے ان کے ایک مخطوطے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۶۳۰ ء میں جب کہ شاہ جہاں حکمران تھے ان کے ایک سپہ سالار ثابت خاں کے پاس ملازمت شروع کی ۔ ان کے بہت سے فارسی مخطوطات ، ادارہ ادبیات اردو و سالار جنگ میوزیم کے کتب خانوں میں موجود ہیں مثلاً فلسفہ شاہی فارسی ہے جس کو جناب سید علی اصغر بلگرامی نواب عنایت جنگ بہادر نے ترتیب دیا ۔ اس مخطوط میں عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے اہم واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے ۔ اس فارسی مخطوط کا ایک سال قبل جناب خواجہ محمد مرود مہتمم کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نے اردو میں ترجمہ کر کے اس کو شائع کیا ۔ نظام الدین نے گول کنڈہ سلطنت میں مستقل رہائش اختیار کی اور دربار سے منسلک رہے ان کی وفات ۱۶۵۰ ء م ۱۰۵۹ ھ میں ہوئی ۔ محلہ نولی چوکی کے شمال میں ایک بستی حکیم پیٹھ کے نام سے بنائی ہی حکیم پیٹھ کے شمالی پہاڑی پر متصل موجودہ اپالو اسپتال (جوبلی ہلز) ان کا مقبرہ ہے ۔ نظام الدین بلند پایہ شاعر تھے ۔ ان کا تعلق شیعہ مذہب سے تھا ۔ ان کے تحریر کردہ مخطوطات خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں ۔ جانوروں کے متعلق بھی انھوں نے ایک معلوماتی مضمون لکھا ۔ جناب رہبر فاروقی نے لکھا ہے کہ یہ مقالہ ایک نادر و نایاب نسخہ ہے ۔

٥●٥

موہن پرشاد

گولکنڈہ کا پانی اور گنبدوں کا عود دان

گولکنڈہ کا پانی

سلطنت قطب شاہی گولکنڈہ کے بارے میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں کسی میں بھی اس گم نام تالاب کا ذکر نہیں ملتا۔ جہاں سے گولکنڈہ کی جملہ آبادی، شاہی محلات اور مقبروں کی تعمیر میں پانی لیا جاتا تھا۔ ویسے تو موسیٰ ندی وقار آباد کی پہاڑیوں اور موقع پہاڑپور ضلع رنگاریڈی سے نکلتی ہے اس کے ساتھ ایک اور ندی "عیسیٰ" بھی نکلتی ہے۔ ان دونوں ندیوں کا سنگم قلعہ گولکنڈہ کے جنوب میں لنگر حوض کے قریب ہوتا ہے۔ موسیٰ ندی ایک اتھلی ندی ہے اس کا شباب اور زور ہر سال ماہ ستمبر میں رہتا ہے۔ ہمیشہ برسات کے موسم میں اس ندی میں پانی آتا ہے کہ طغیانی کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے بعد ... ماہ تک یہ ندی صرف ایک برساتی نالے کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ انہی وجوہات کی بنا پر موسیٰ ندی کا پانی گولکنڈہ کی جملہ آبادی، شاہی محلات اور مقبروں کی تعمیر کے لیے سودمند نہ تھا۔ اسی لیے اس تالاب کے پانی سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ اس تالاب کا نام وزد کا تالاب ہے۔ یہ بہت ہی گم نام اور قدیم تالاب ہے۔ شہر حیدرآباد کے جانب مغرب، مہدی پٹنم سے ۱۲ کیلو میٹر پر بیجاپور ممبئی شاہ راہ پر موضع شیخ پیٹ ٹولی چوکی میں واقع ہے۔ سلطان قلی بانی سلطنت قطب شاہی نے ۹۲۴ ھ مطابق ۱۵۱۸ء یعنی آج سے (۴۸۴) سال قبل خود مختاری کا اعلان کیا۔ یہ تالاب اس تاریخ سے کئی سال پہلے موجود تھا۔ اس کو ورنگل کے کاکتیہ راجاؤں نے قلعہ گولکنڈہ کو پانی کی سربراہی کے لیے بنایا تھا۔ بعد میں جب قلعہ گولکنڈہ کی ازسرِ نو تعمیر ہوئی تو اس تالاب سے پانی مٹی کے نالوں کے ذریعہ قلعہ گولکنڈہ اور اس کے اطراف کے محلات کو پہنچایا جاتا تھا۔ یہ تالاب قلعہ سے تقریباً (۴) ... جانبِ شمال مغرب واقع ہے۔ بلند سے بلند اونچی سے اونچی چوٹی پر بھی پانی "سائیفن سسٹم" سے پہنچایا جاتا تھا۔ اس باریک مٹی کے پائپ حال حال تک قلعہ کے محلات کے کھنڈروں میں پائے جاتے تھے۔ تمام قطب شاہی گنبدوں کی تعمیر وقت اسی تالاب سے پانی لیا جاتا تھا۔ حالیہ کھدوائی جو قطب شاہی مقبروں کے عقب میں ہوئی وہاں پر بڑے بڑے حوض پائے گئے۔ حتیٰ کہ قلعہ کی چوٹی پر بھی پانی کے پہنچنے کا انتظام تھا جس کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ تالاب موجودہ حیدرآباد ممبئی قدیم شاہ راہ سے آدھا کیلو میٹر جانبِ شمال اور بنجارہ ہلز کے عقب میں جانبِ مغرب ہے۔ اس تالاب کا کٹہ پہلے سڑک سے نظر آتا تھا مگر حال ہی میں لیدر انڈسٹریز کی عمارت تعمیر ہونے کے بعد سڑک سے صرف کٹہ کا کچھ حصہ اور وہاں کی قدیم ترین مسجد نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس تالاب کے پانی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں گندک اور سلاجیت کے شائبے پائے جاتے ہیں جس سے خارش اور امراض خبیثہ کے مریضوں کو شفا ہوتی ہے۔ آج کل اس تالاب میں سنگھاڑے کی کاشت ہوتی ہے۔ سنگھاڑے کے استعمال سے قوتِ باہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس تالاب میں جونک پائی جاتی ہیں۔ قدیم زمانے میں جونک سے مریض کا خون

چاٹنے سے سرطان کے مریض کو شفا ہوتی تھی ۔

گنبدوں کا عود دان

یہ ناتمام گنبد ، عبداللہ قطب شاہ کے گنبد کے سامنے جانبِ جنوب مغرب واقع ہے ۔ اس میں عبداللہ قطب شاہ کے بڑے داماد نظام الدین احمد اور اس کی بیٹی فاطمہ خانم کی مزاریں ہیں ۔ اتفاق کی بات ہے کہ میاں اور بیوی دونوں کی وفات ایک ہی سال یعنی ۱۰۸۵ ھ مطابق ۱۶۷۴ ء میں ہوئی ۔ اس بڑے داماد کو قضا و قدر نے تختِ شاہی سے محروم رکھا ۔

گنبدانِ قطب شاہی کا عود دان

یہ ناتمام گنبد عوام میں ابوالحسن تاناشاہ کا گنبد مشہور ہے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابوالحسن کی وفات جو دولت آباد میں ہوئی تو تب اس کی نمازِ غائبانہ اور فاتحہ کے لیے اس گنبد کو اہلِ گولکنڈہ نے بہ طورِ عود دان استعمال کیا تھا ۔ اس کے علاوہ بھی یہ ناتمام گنبد دور سے عود دان ہی نظر آتی ہے ۔

زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے
(علامہ اقبال)

○●○

زبیر رضوی

پیا باج پیالا (اوپیرا)

محمد قلی قطب شاہ کی حیات معاشقہ کا ایک ورق

(دکنی شعری حصے بہ طرزِ قطب شاہ لکھے گئے)

گانا

یہ عکسِ سرِ پردہ
محبت کی نشانی
تاریخ کے اوراق کی
اک زندہ کہانی
تابندہ نشانی
یہ عکسِ سرِ پردہ
تعمیر کے ہونٹوں پہ یہ اک بوسۂ شیریں
اور وقت کے ہاتھوں میں یہ گنجینۂ سیمیں
اک شہر کے آغاز کی
دل چسپ کہانی
یہ عکسِ سرِ پردہ
محبت کی نشانی
تاریخ کے اوراق کی
اک زندہ کہانی
یہ عکسِ سرِ پردہ

برسوں پہلے گول کنڈے میں
اک سلطان تھا ایسا
سب ہونٹوں پر نام اسی کا
سب ہاتھوں میں جام اسی کا

جبیں جبیں پہ سجدے اس کے
کوچہ کوچہ قصے اس کے
ابراہیم قلی قطب شاہ
نام تھا اس کا پیارا
برسوں پہلے گول کنڈے میں
خوشیاں بانٹنے والا
اپنے غم کی آگ میں جلتا
پہروں چپ چپ رہتا
بزم میں اس کی
ساز بہت تھے
راگ بہت تھے
غم خوار و دمِ ساز بہت تھے
وہ پھر بھی تنہا تنہا تھا
جیسے شاخ بِنا پھولوں کے
جیسے راگ بِنا سازوں کے
تاج کا وارث ، ر
تخت کا والی
اس کا نہیں تھا کوئی
اس کے لب پر یہی دعا تھی
شب بے داری ، حمد و ثنا تھی
(مرد اور عورتوں کی Humming میں نعت کا Effect)

س :

یا خدا یا خدا یا خدا یا خدا

یا نبیؐ یا نبیؐ یا نبیؐ یا نبیؐ

(مدھم روشنی میں بادشاہ کی شبیہہ دکھائی دیتی ہے۔ ہاتھ دعا کے لیے اوپر کو اٹھتے ہیں Humming پر حاوی اس کی پُر سوز آواز گونجتی ہے)

ا : (ڈرامائی لہجے میں)

خدائے برتر۔ حضور تیرے میں آ گیا ہوں
مری مرادوں کے سونے آنگن کو
اک مہکتا گلاب دے دے
خدائے برتر۔ خدائے برتر

(موسیقی لے ساتھ)

الٰہی الٰہی گنہگار ہوں
گناہوں میں اپنے گرفتار ہوں
گنہ کی گرفتاری تھی دور کر
ثوابوں سوں تول منج کو پُر نور کر
عمل کا تو تیں گنج کچھ میرے پاس
دلے تیری بخشش کی ہے بہوت آس
دلا منج میرے دلِ مقصود توں
کہ مولا سچا ہور معبود توں

(بادشاہ کی شبیہہ اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔ سائیکلو رامہ پر مسجد کے مینار اور اذان کی گونج۔ دوسری جانب ناقوس اور گھڑیال کی آواز۔۔۔ لمحہ بھر بعد خاموشی اور سورج کی شعاعیں پھوٹنے کے ساتھ نوزائیدہ بچے کی رونے کی آواز۔ مردنگ پر تھاپ اور دل کش موسیقی۔۔۔ خوب صورت کنیزیں رقص کرتی ہوئی داخل ہوتی ہیں اور خوشی کے لہجے میں ایک دوسرے سے کہتی ہیں۔)

سنو کنیزو

خدائے برتر نے

ہم سبھوں کی دعائیں سن لیں

چلو

یہ مژدہ سنائیں سب کو

(کنیزیں ایک دوسرے کو CROSS کرتی ہوئی اونچے لیول پر جا کھڑی ہوتی ہیں اور دنگر میں جھانک کر کہتی ہیں۔)

کنیزیں :

سنو اے ساکنانِ گول کنڈہ
در و دیوار محرابیں سجاؤ
زمیں فرشِ مہتابی بچھاؤ
ہوا کے ہاتھ میں مضراب دے دو
نظر کو منظرِ شاداب دے دو
یہ فرمان بادشاہِ وقت کا ہے
امینِ مملکت پیدا ہوا ہے
قلعے کے سارے دروازے کھلے ہیں
چلے آؤ کہ سب پہرے ہٹے ہیں
نویدِ قلی بھائی مبارک
امینِ مملکت تم کو مبارک

(اچانک نقارے پر چوٹ پڑتی ہے۔ جو دھیرے دھیرے فیڈ آؤٹ ہوتی ہے۔ کنیزیں ناچتی ہوئی باہر نکل جاتی ہیں۔ نسوانی قہقہوں کی کھنک اور پھر نوجوان مرد عورتوں کی قطاریں دونوں طرف داخل ہوتی ہیں اور رقص و موسیقی کی خوش نما محفل جم جاتی ہے)

مولود خوشیاں آئی یاں مولود کی خوشیاں کرو
خوشیاں میں ناچو جھوم کر ۔۔۔ سیر بھی شادان کرو

مولود خوشیاں آئی ہاں

جو نور سارا جگ ہوا ۔ ۔ ۔ ہیں گو نجتی شہنائیاں !
جھم جھم کرے پائل کہیں ، رقاص کوں رقصاں کرو !

مولود خوشیاں آئی یاں

ساقی کہے ہر ایک سے جی بھر کے مے خواراں پیو !
سازوں سروں میں ڈوب کر سنگیت کا ساماں کرو !

مولود خوشیاں آئی یاں

رنگوں کی چنری اوڑھ کر اتری گگن سے اپسرا !
ساجن کہیں اس دل اپر سب مل کے دل قرباں کرو !

مولود خوشیاں آئی یاں

(سبھی ناچتے گاتے باہر نکل جاتے ہیں اور راوی داخل ہوتا ہے)

راوی :

تاج کا وارث
تخت کا والی
سیم بدن شہ زادہ
پیارا محمد قلی قطب شاہ
کہہ کر اسے پکارا
چہرہ اس کا صبحوں جیسا
رنگت روپ حسینوں جیسا
دیکھ کے اس کو
ماہ وشوں نے
دل بھی سوغاتیں بھیجیں
جنتوں کی یادیں بھیجیں
مگر کوئی ان جانا دکھ
سایہ سایہ محفل محفل
شہ زادے کا میت بنا تھا

دل کا نگر برباد ہوا تھا

(غم و یاس کی مجسم تصویر بنا شہ زادہ STAGE کے لیول پر بیٹھا ہے ۔ طبلے کی تھاپ اور پرکیف موسیقی کے تال پر رقص کرتی دو کنیزیں آپس میں باتیں کرتی ہوئی داخل ہوتی ہیں)

چلو چل کر ذرا خلوت میں
شاہ زادے کو جا دیکھیں
اداسی کا سبب پوچھیں
مے و مینا سے اس کے جی کو بہلائیں

(کنیزیں اس مکالمے کے بعد مے و مینا کے ساتھ رقص کے انداز میں شاہ زادے کے رو بہ رو آ کھڑی ہوتی ہیں)

محمد قلی :

نہیں نہیں
تم مرے تصور کے خواب زاروں میں یوں نہ آؤ
یہ بادہ و جام سب ہٹاؤ
مجھے نہ تم اپنی جنتوں کی چمکتی دہلیز پر بلاؤ
میں آبلہ پا ہوں میری راہوں میں یوں نہ تم
فرشِ گل بچھاؤ
نہیں نہیں
تم مرے تصور کے خواب زاروں میں یوں نہ آؤ

(کنیزیں ڈری سہمی باہر نکل جاتی ہیں ۔ پھر طبلے پر تھاپ (۲) دو اور کنیزیں دل رُبایانہ انداز میں رقص کرتی ہوئی پہلی دو کنیزوں سے ملتی ہیں)

پہلی کنیز :

سنو کنیزو
حسین جسموں ، گلاب ہونٹوں کا وار خالی چلا گیا ۔
نہ کام آئی اداسے دل پر

سنگم آئی تھرکتی پائل

دوسری کنیزیں :

تمہیں آتا نہیں حسینوں کے وار خالی چلے گئے ہیں
تمہارے ترکش کے تیر خالی چلے گئے ہیں

پہلی کنیز :

تو جاؤ تم بھی نظر کے تیر ڈالو
ادائے دل بر تھرکتی پائل کو آزماؤ

(دونوں کنیزیں رقص کرتی ہوئی بڑے اعتماد سے شاہ زادے کے قریب آتی ہیں شاہ زادہ اٹھ کر حکم دیتا ہے)

محمد قلی :

میں حکم دیتا ہوں
بند کردو
تھرکتی پائل کا رقصِ پیہم
مجھے خموشی کا ساز دے دو
اکیلے پن میں
خود اپنی ہی آگ میں سلگنے کی رات دے دو
رات دے دو
میں رات ۔ تیری پناہ چاہتا ہوں

(کنیزیں سجدہ کرتی باہر نکل جاتی ہیں ۔ شاہ زادہ سونے کا POSE بنالیتا ہے اور اس کی درد بھری آواز گونجتی ہے)

محمد قلی :

رات سینے پھر دل میرا بے تاب کیا
آنکھ کو میری عجب بے خواب کیا
رات سینے پھر دل میرا بے تاب کیا
یاد تیری نے نیند سونے نہ دیے
[illegible] نیناں سب کے سب نایاب کیا
رات سینے پھر دل میرا بے تاب کیا
آنکھ کو میری عجب بے خواب کیا

(مکمل تاریکی ۔ پھر خواب جیسی روشنی اور موسیقی ۔ نسوانی آواز میں گیت ۔ بھاگ متی شاہ زادے کی مضطرب نگاہیں جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہیں ۔ سفید ریشمی لباس پہنے پہلی حسینہ ہوا میں تیرنے کے Action کرتی ہوئی آتی ہے)

محمد قلی :

یہ کون خوابوں میں
سایہ سایہ اتر رہا ہے
یہ کس کا آنچل ہوا کے
ہاتھوں میں مل رہا ہے
یہ کون مہکا ہے
میری سانسوں سے دور
خوشبو لٹا رہا ہے

(پری چہرہ اسٹیج کے درمیان پہنچ کر ناچنے اور گانے لگتی ہے ہر انترے کے بعد شاہ زادہ اس کی طرف بڑھتا ہے اور اسے بانہوں میں سمیٹ لینے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ ہر بار ہوا کے جھونکے کی طرح نکل جاتی ہے ۔)

پیا آج پیالہ اتند کا پلا منج
نین کی تشیلی گلابی پلا منج
پیا آج پیالا اتند کا پلا منج
تیرے عشق بن زندگانی نہ بھاوے
مسیحا کی صورت پیا تو جلا منج
پیا آج پیالا اتند کا پلا منج
گگن سے طبق موتیاں سو بھری ہوں
سجن پاس آ ۔ جوڑ خود کو ملا منج
پیا آج پیالا اتند کا پلا منج
تیرے بن نہ بھاوے گلاباں گلستاں
سجن جام بانٹ شرابی پلا منج

[illegible]

(پھر وہی بجلی سی لہرا گئی۔ اب صرف حسینہ دکھائی دیتی ہے۔
[illegible] کے ہاتھ پر چھپا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ درباری
BANG کے ساتھ شہزادہ [illegible] عالم خواب سے
بیدار ہوتا نظر آتا ہے وہ چاروں طرف نظر ڈالتا ہے اور مایوس
ہوکر سر تھام لیتا ہے)

حسین خواب تو کیوں اس طرح سے ٹوٹ گیا
کھلی ہے آنکھ تو تنہائیوں کے دامن ہیں

(اسٹیج پر پل بھر کی خاموشی کے بعد شہزادے کا دوست داخل ہوتا ہے)

دوست :

جہاں پناہ کو آداب پیش کرتا ہوں

(مغموم شہزادہ نظریں اٹھا کر دوست کی طرف دیکھتا ہے)

کیوں رفیق مری خلوت میں کیوں آئے

دوست :

یہ کیا ستم ہے لبوں سے سخن کا ربط مٹا
نہ کوئی شاخ ہنسی ہے نہ کوئی پھول کھلا
رخ حبیب کی یہ سردگی نہ دیکھی جائے
اداس اداس سی یہ زندگی نہ دیکھی جائے
وہ کون ہے جو نگاہوں میں بس گیا ایسا
ہر ایک ربط فراموشیوں میں کھو سا گیا

میں اس کو ڈھونڈتا ہوں جو خواب جیسا ہے
وہ اک سراپا کہ جو ماہتاب جیسا ہے ...!
جہاں بھی جاؤں وہ مجھ کو بہت ستاتے ہے
ہزار طرح سے اپنی جھلک دکھاتے ہے!

وہ رنگ و روپ کا عکس ہے سر سے تا پا
وہ ایک چہرہ کہ قرباں ہزار اس پہ حسن

دوست :

میں سوچتا ہوں کہ اس سیم تن کا نام و نشاں
خیال و خواب کی دنیا میں مل نہ پائے گا
میرا خیال ہے میں اپنے دوست عطارد کو
جو ایک عظیم مصور ہے
لے کے آتا ہوں
مجھے یقین ہے وہ خواب کے دھندلکوں کو
دمکتے رنگوں کی صورت میں ڈھال سکتا ہے
حسین زندہ شبیہوں میں ڈھال سکتا ہے

محمد قلی :

اگر وہ ایسا مصور ہے اس کو لے آؤ
لباس رنگ مری چاہتوں کو پہناؤ

(عطارد کے انتظار میں بے چین شہزادہ ٹہل رہا ہے۔ عطارد
داخل ہوتا ہے اور جھک کر آداب بجالاتا ہے)

محمد قلی :

تمہارا نام عطارد ہے
تم مصور ہو ؟

عطارد :

جہاں پناہ کا میں عمر بھر غلام رہوں
زمیں سے عرش کی ان جنتوں میں لایا گیا

محمد قلی :

سنا ہے ہم نے کہ نادیدہ پیکروں کو تم
زباں سے سن کے
شبیہوں میں ڈھال دیتے ہو
لباس رنگ میں ان کو ابھار لیتے ہو

عطارد :

(گاتا ہے)

یہ سچ ہے کہ نادیدہ پیکر
رنگوں میں اتارے ہیں میں نے
خوابوں میں جو دھندلا جاتے ہیں
وہ نقش سنوارے ہیں میں نے
یہ سچ ہے کہ نادیدہ پیکر
میں قریہ قریہ گھوما ہوں
کتنے ہی سراپے دیکھے ہیں
مخمور نگاہیں دیکھی ہیں
اور جسم رسیلے دیکھے ہیں
یہ سچ ہے کہ نادیدہ پیکر

(شاہ زادہ تالی بجاتا ہے ۔ دل کش موسیقی کے تال پر رقص کرتی ہوئی ایک کنیز ہاتھوں میں فریم لیے داخل ہوتی ہے ۔ فریم مخصوص جگہ رکھ کر کھڑی ہوجاتی ہے ۔ عطارد فریم کی جانب بڑھ کر شاہزادے کی طرف دیکھتا ہے ۔)

عطارد :

جہاں پناہ عطا ہو بیاں سراپے کا
جو دن کا چین شبوں کا قرار لے کے گیا

(شاہ زادہ غزل چھیڑ دیتا ہے جس کے اشعار پری چہرہ کی خوب صورتی بیان کرتے ہیں ۔ عطارد تصویر بنانے کا MIME کرتا ہے اور کنیز اشعار کی عکاسی کرنے والے بھاؤ پیش کرتی ہوئی رقص میں محو ہوجاتی ہے)

چندر مکھی وہ پھول بدن اور تیتریاں تیرے [illegible] ہیں
اس کی صورت دیکھ کے جن آسماں چاند [illegible] ہیں
چندر مکھی وہ پھول بدن

اس سندر کو کون سب شاعر دیتے تشبیہ گلابوں سے
ولے جو پوچھیں مجھ کو تو اس آگے یہ سب ہارے ہیں
چندر مکھی وہ پھول بدن

متوالے مدھیالا پیالے نین کٹاری اس کے ہیں
سرو صنوبر حور و غزالاں سب کو تیراں مارے ہیں
چندر مکھی وہ پھول بدن

کوئی مصور اس کا بدن رنگوں میں نہیں ڈھال سکا
سارے جگت کے خوباں اس کے آگے ہاتھ پسارے ہیں
چندر مکھی وہ پھول بدن

(غزل کے ہر شعر کے بعد فریم میں شبیہ ابھرتی چلی جاتی ہے اور غزل ختم ہوتے ہی فریم میں بھاگ متی Freeze ہوئی آتی ہے مگر شاہ زادہ جب ذیل کے مکالمہ ادا کرتا ہوا اس کی جانب لپکتا ہے تو اچانک بھاگ متی کی جگہ میں اسی Pose میں اس کی تصویر نظر آتی ہے)

محمد قلی :

سنو عطارد

یہی ہے وہ خوش جمال پیکر
جو میرے خوابوں میں ناچتا تھا
یہی ہے وہ بے وفا حسینہ
جو مجھ سے دامن چھڑا کے اکثر
طلسم خانوں میں کھو گئی ہے

(عطارد تصویر کو غور سے دیکھتا ہوا کسی ذہنی کش مکش میں مبتلا نظر آتا ہے ۔)

عطارد :

جہاں پناہ مجھے یاد آرہا ہے یہ چہرہ
کہیں پہ دیکھا ہے
جانا ہوا سا لگتا ہے

محمد قلی :

نہیں نہیں، تمہیں شاید گمان گزرا ہے

عطارد : (اپنے آپ سے)

کہاں پہ دیکھا تھا

کچھ یاد ہی نہیں آتا

یہ چہرہ کس کا ہے؟ یہ کون ہے؟

اسے میں نے ۔ کہاں پہ دیکھا تھا؟ کچھ یاد ہی

نہیں آتا ۔

(دھیرے دھیرے قریب آتی ہوئی گھنگھروں کی آواز اور

پھر اچانک رقص کا ایک ٹکڑا ۔)

عطارد :

جہاں پناہ مجھے یاد آ گیا ۔ یہ رقاصہ

جو حسین بھاگ متی ہے

نواح چنچلم کی

محمد قلی : (سوالیہ انداز میں) بھاگ متی؟

خوش ادا یہ رقاصہ؟

عطارد :

جہاں پناہ یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے ۔

محمد قلی :

سنو حسینہ ۔ چنچلم بلا رہی ہے ہمیں

ہمارے خواب حقیقت کو دیکھنا چاہیں

ہمیں نہ روکو ہماری ہیں منتظر راہیں

(شہزادہ تیزی سے نکل جاتا ہے ۔ عطارد اس کے پیچھے ہو لیتا

ہے ۔ مکمل تاریکی اور پھر بجلی کوندنے کی آواز اور چمک تیز

ہوا اور لہروں کا شور ۔ عطارد ایک اونچے ٹیلے پر جھانکتے

ہوئے دیکھتا ہے ۔)

عطارد :

جہاں پناہ قدم روکیے کہ موسیٰ ندی میں

ہر ایک سمت سے اٹھی ہوئی ہے طغیانی

بپھرتی موجوں میں سب خواب ڈوب جائیں گے

خدا کے واسطے

لوٹ آئیے

ندی کا سیل

ہمارے خوابوں کی سب بستیاں بہا دے گا

(دریا میں چھلانگ کا EFFECT بادلوں کی گرج ۔

درباریوں کے ساتھ بادشاہ کی آمد ۔)

ابراہیم :

یہ کیسا شور ہے ہنگامہ کیا مچایا ہے ۔

عطارد :

حضور ۔ جان کی اماں پاؤں میں تو عرض کروں ۔

ابراہیم :

کہو جو کہنا ہے ۔

عطارد :

طرح ڈھونڈ لیا اور سبب بھی جان لیا

ابراہیم :

ہمیں یقین نہیں

عطارد :

حضور ایک حسینہ نواحِ چنچلم کی ۔

کہ نام بھاگ متی ۔

ٹکل کے نور کا سارا قرار لوٹ گئی ۔

ابراہیم :

ہمارا لختِ جگر اور اسیر رقاصہ یقین نہیں آتا ۔

عطارد :

حضور عشق کا شعلہ بھڑک چکا کب کا
ندی کی لہروں پہ دیوانہ جا چکا کب کا
غضب کا سیل ہے طوفانِ بادوباراں ہے
محل کی جلتی ہوئی شمع بجھ نہ جائے کہیں

ابراہیم : (درباریوں سے)
کھڑے ہو کیا
مرے لختِ جگر کو
موسیٰ کے شدید سیل سے
زندہ بچا کے لے آؤ
ندی میں کود پڑو
حسنِ نو شگفتہ کو
خزاں کے پنجہ ، بے داد سے چھڑا لاؤ
محبتوں کو ابھی شادکام ہونا ہے ،
دلوں کے راز کو صرفِ دوام ہونا ہے ۔

(درباری تیزی سے باہر نکل جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ اسٹیج پر مکمل تاریکی اور پھر راوی پر روشنی پڑتی ہے ۔)

راوی :

قلی قطب شاہ بھاگ متی میں
عشق ہوا پھر ایسا
دریا ان کے بیچ نہ آیا
پانی کبھی نہ تھا
بھاگ متی چنچلم سے اکثر
گول کنڈے کے محل میں آتی
راس رچاتی
ناچ دکھاتی
قلی قطب شاہ تخت پہ بیٹھا
جس کا دامن
انعام و اکرام سے بھرتا
تھا قطب شاہ
عاشق شاعر
اس کے مصاحب اور درباری
عالم ، فاضل اہلِ فن تھے ۔
اس کا عہد فراواں زوائی
فن ، تخلیق کا سنگم تھا
تہذیبوں کی جوت جلی تھی
ارضِ دکن دلہن سی بنی تھی
قشقہ ، ٹیکہ ، تسبیح ، مالا
نعت ، بھجن ، قرآن اور گیتا
سب آوازیں بول رہی تھیں
کانوں میں رس گھول رہی تھیں
قلی قطب شاہ
گنگا جمنی تہذیبوں کی
ایک علامت
زندہ و جاوید علامت

(محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا رنگین ماحول ، وہ خود تخت پر جلوہ افروز ہے ۔ دونوں طرف درباری عزت و احترام سے بیٹھے ہیں ۔ بھاگ متی کی آمد کا اعلان ۔ کنیزیں قطاریں ایک طرف اٹھتی ہیں ۔ دلہن جیسا لباس پہنے بھاگ متی اور دوسری رقاصائیں داخل ہو کر آداب بجالاتی ہیں ۔ ۔ ۔ طبلے مردنگ بج اٹھتے ہیں اور رقص شروع ہوتا ہے ۔)

پیا باج پیالا پیا جائے نا
پیا باج یک پل جیا جائے نا
کہن عشق میں پیر تو تجہ بن
گریباں کوں لوکاں سیا جائے نا

کئی رنگ اس کے کئی روپ ہیں
اسے نام کوئی دیا جائے نا
قطب شہ کی یہ بات ہر بات کی
دیوانے کو کچھ بند دیا جائے نا
پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک پل جیا جائے نا

(گانا ختم ہونے پر بھاگ متی بادشاہ کے قدموں میں جا گرتی ہے اور وہ نیچے اتر کر بھاگ متی کو اٹھاتے ہوئے کہتا ہے ۔ سبھی درباری نظریں جھکائے کھڑے ہیں ۔)

محمد قلی :

اٹھو حیدہ، بیگم
ہمارا فرماں ہے
کہ ہم نے مسندِ شاہی عطا کیا تم کو

بھاگ متی :

حضور اتنی نوازش نہ مجھ پہ فرمائیں
یہ بے حساب کرم
میں تو سہ نہ پاؤں گی
یہ اک کنیز کہاں اور مسندِ شاہی

محمد قلی :

تمھیں غرور ہے کہ ہم تم سے پیار کرتے ہیں
کہ تم بہار کے ہونٹوں پہ نغمہ گل ہو
شفق بھی، کنول بھی، شبنم بھی، ماہ تاب بھی تم
صبا بھی، موسیقی بھی، خوش بو بھی، آفتاب بھی تم
ہم آج سے تمھیں حیدر محل پکاریں گے
(بھاگ متی کو تخت پہ بٹھاتا ہے)
ہم اپنے عشق کو اک داستاں بنا دیں گے
تمھارے گاؤں کا نقشہ نیا بنا دیں گے
تمھارے نام سے دنیا اسے پکارے گی
سحر کی پہلی کرن آرتی اتارے گی

(بادشاہ اور بھاگ متی کے کھڑے ہوتے ہی درباری سجدہ کرتے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں ۔ بادشاہ بھاگ متی کے شانوں پر ہاتھ رکھتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے FREEZ ہوجاتے ہیں ۔ پس منظر موسیقی کے ساتھ سائیک پر چار مینار کا عکس ابھرتا ہے اور عقب سے راوی کی آواز سنائی دیتی ہے ۔)

راوی :

یہ عکس سر پردہ
محبت کی نشانی
تاریخ کے اوراق کی
اک زندہ کہانی
تابندہ نشانی
یہ عکس سر پردہ ۔ ۔ ۔ ۔

(راوی کے اس گانے کے دوران بادشاہ اور بھاگ متی دھیرے دھیرے لیول کی اونچائی کی جانب بڑھتے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں ۔ سائیک پر حیدرآباد کی چیدہ چیدہ عمارات دکھائی دیتی ہیں اور آخر میں چار مینار کا عکس ابھرتا ہے ۔)

راوی :

تعمیر کے ہونٹوں پہ یہ اک بوسہ شیریں
اور وقت کے ہاتھوں میں یہ گنجینہ رنگیں
اک شہر آغاز کی
دل چسپ کہانی
یہ عکس سر پردہ
محبت کی نشانی
تاریخ کے اوراق کی

اک زندہ کہانی

یہ عکس سر پردہ

وی کی بیک گراونڈ سے ابھرنے والی یہ آواز ڈوبتی ہے رقص کرتی ہوئی خوب صورت کنیزیں اسٹیج پر آجاتی ہیں ۔)

یارب ، یارب ، یارب

یارب تو میرے شہر کو آباد ہی رکھنا

اور اس کے مکینوں کو تو دل شاد ہی رکھنا

یارب

جب تک رہے موسیٰ میں مچلتا ہوا پانی

اس شہر قطب شاہ کو آباد ہی رکھنا

یارب

جاگے ہی رہیں بھاگ میرے بھاگ نگر کے

ہر ایک بلا سے اسے آزاد ہی رکھنا

یارب یارب

یارب تو مرے شہر کو آباد ہی رکھنا

○●○ ۔

دکنی شعری حصے بہ طرز قطب شاہ لکھے گئے ۔

یہ اوپیرا جموں کشمیر ریاستی کلچرل اکاڈمی سے سری نگر ، اور حیدرآباد میں کامیابی سے کئی بار اسٹیج کیا ۔

بلقیس علاء الدین

ترجمہ : رشید قریشی

محمد قلی (ڈرامہ)

کردار :

۱ محمد قلی	۲ ملکہ	۳ بھاگ متی	۴ حیات بخشی بیگم
۵ جوراں	۶ ابراہیم قلی قطب شاہ	۷ رائے راؤ	۸ نعمت اللہ خاں
۹ رحمت اللہ خاں	۱۰ حفیظہ	۱۱ جوراں کی ماں	۱۲ لوبان
۱۳ فضیلت نواب	۱۴ ہکلا مصاحب	۱۵ ضعیف مصاحب	۱۶ شاعر
۱۷ درباری قاصد	۱۸ کنیز	۱۹ شہزادہ سلطان مرزا	۲۰ نقارچی
۲۱ حکا	۲۲ ترکی لڑکی	۲۳ ایرانی لڑکی	۲۴ کشمیری لڑکی
۲۵ کچھ مصاحب اور کچھ مرد سپاہی			

ooo

(جوراں رنگوں میں نہائی ہوئی اسٹیج پر آتی ہے۔
کونے میں اس کی ماں اس کو حیرت اور محبت کے ملے جلے جذبات کے زیر اثر دیکھتی ہے۔)

جوراں : ماں مزہ آگیا۔ مزہ آگیا۔ میں اور چمپا۔ چمپا اور میں! ! ہم دونوں۔ ہم دونوں رنگوں میں بس اڑتے رہے۔

ماں : جوراں۔ جوراں۔ ذرا اپنی حالت دیکھ۔۔۔۔ بھلی اس طرح کھیلتے ہیں کیا کہ اپنے ہی رنگ سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

جوراں : ماں۔ چمپا کہہ رہی تھی اگر میں لٹک کر دوہری ہوجاؤں تو آسمان مجھے قوس قزح سمجھ کر اوپر اٹھالے۔

ماں : جن ڈالیوں میں پھول کھلتے ہیں۔ انھیں ڈالیوں میں ہوا جھومتی ہے اور جب ہوا جھومتی ہے۔ پھولوں کی کٹوریوں میں آسمان سماجاتا ہے۔ تم دونوں۔ تم اور چمپا اپنی رنگوں کو تھامو اب۔

جوراں : اور ماں جب میں چمپا کے گھر سے چلی۔ سڑک پر بڑی دھوم تھی۔ بادشاہ سلامت کی سواری آرہی تھی اور جب میں نے دیکھا۔ اتنا بڑا ہاتھی۔ میں بھاگی اور بھاگتے بھاگتے مجھے ٹھوکر لگی۔ ایک آوارہ پتھر کہیں سے میرے راستے میں آپڑا تھا۔ میں گرتے گرتے بچی۔ ماں کہیں تو بادشاہ سلامت کے ہاتھی سے ٹکرا گئی ہوتی میں۔

ماں : اگر تو بادشاہ سلامت کے ہاتھی سے ٹکرا گئی ہوتی۔ ہاتھی بڑی شفقت سے تیرے سر پر اپنا پاؤں پھیر تا اور تو ٹوٹی

پھوٹی ہڈیوں کا ڈھیر بن جاتی۔

حوراں : تو کیا بادشاہ سلامت مجھے نہ بچاتے ؟

ماں : کیوں نہیں ضرور۔ وہ اگر تجھے دیکھ لیتے اور تو نظروں میں بچ جاتی۔ وہ ہاتھی کو حکم دیتے رک جا۔ اور خود نیچے اتر کر مسکراتے۔ گھورتے گھورتے تجھ پر اپنا پاؤں رکھ دیتے۔ اور تو کچل کر رہ جاتی۔ ہاتھی اور بادشاہ سے ٹکر کا ایک ہی انجام ہوتا ہے بیٹا : فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ کسی کو مٹی میں ملاتے ہوئے ہاتھی مسکراتے نہیں اور بادشاہ مسکراتے ہیں۔

حوراں : ارے باپ رے !! اللہ بچائے۔ سن ماں، بادشاہ سلامت کی سواری کا شور قریب آتا جارہا ہے۔ ہم بھی دیکھیں۔

(پس منظر میں شور کی آواز)۔

ماں : چل تو اپنا برقع پہن لے۔

حوراں : برقع۔ کیوں ماں ؟

ماں : اس لیے کہ تو اس وقت ہولی کی البیلی ہے اور اور کبھی رنگ سے رنگ مل کر نکھر اٹھتا ہے تو بہت جلد نظر لگ جاتی ہے۔ ذرا آئینہ دیکھ۔ رنگ برنگی بدلیوں کی اوٹ میں چاند جھلملا رہا ہے۔

حوراں : ماں تو تو مجھے ممتا کی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ ذرا دیکھ باہر کیا تماشہ ہے۔ ماں وہ دیکھ بادشاہ سلامت کے پاس کوئی کتنا خوب صورت بیٹھا ہے ! کون ہوگا ماں وہ ؟ شہزادہ محمد قلی ہے کیا وہ ؟

ماں : ہاں بیٹا وہی ہے شہزادہ محمد قلی۔

حوراں : وہ جب میری طرف دیکھ رہا تھا، ایسا نظر آیا جیسے بجلی سی کوند گئی۔

ماں : شہزادہ تجھے نہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ تو کچھ کھویا کھویا سا ہے۔ ادھر ادھر نظریں گھماتا اس طرح بے چین ہے، جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہے اور کوئی چھپتا ہی چلا جارہا ہے۔ اری ذرا پیچھے ہٹ جا بادشاہ سلامت کی نظریں تجھ پر پڑ گئیں۔ پیچھے ہٹ کم بخت۔

حوراں : ماں ذرا شہزادے کی ابرو کا خم دیکھ ؛ کمان کھنچ رہی ہے . . . . بس یہ تیر چلا . . . یہ تیر لگا۔

ماں : اری دیوانی چپ بھی رہ، بادشاہ سلامت نے ہمارے گھر کے آگے ہاتھی رکوادیا ہے۔

حوراں : دیکھ ماں، شہزادہ اڑتی ہوئی مینا کو دیکھنے لگا۔ ماں دیکھ وہ مینا میں ہوں، مینا میں ہوں ماں !!

ماں : پاگل ہو گئی ہے کیا ؟

ایک مصاحب : (ہکلاتے ہوئے) محترمہ اس کا نام کیا ؛ بادشاہ سلامت آپ کی صاحب زادی کو ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ اس کا نام کیا ان سے کہیے تسلیمات بجالائیں۔ (چلا جاتا ہے)

ماں : حوراں، سر جھکادے بیٹا۔ بادشاہ سلامت تجھے ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

حوراں : ماں۔ ماں۔ شہزادہ میری طرف دیکھتا ہی نہیں، وہ میری طرف کیوں نہیں دیکھتا ماں، دم بھر کے لیے سواری کا ہاتھی رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ ماں شہزادہ کیا پلٹ کر دیکھے گا ادھر۔

ماں : بہت ہوئی گھاس۔ شہزادہ ؛ شہزادہ !! وہ تو ایک نظر کا بھی روادار نہ تھا اور میاں اسی کی رٹ لگی ہے بس اب تیری زبان سے شہزادے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گی۔

حوراں :

ماں : (غصے سے) منھ بند کر اپنا۔

مصاحب : اس کا نام کیا۔ ایک خوش خبری لے کر حاضر ہوا ہوں۔

ماں : کہیے۔

مصاحب : بادشاہ سلامت کو۔۔۔ اس کا نام کیا؟

ماں : حوراں تم اندر جاؤ۔ (حوراں چلی جاتی ہے) جی بادشاہ سلامت کو۔۔۔۔

مصاحب : اس کا نام کیا؟ بادشاہ سلامت کو اس کا نام کیا؟ آپ کی صاحب زادی بہت پسند آئی ہے۔ اس کا نام کیا؟ مبارک ہو آپ کو بھی اور ہم کو بھی اس کا نام کیا سمجھ گئیں نا آپ؟

ماں : ذرہ نوازی!!

مصاحب : حکم ہوا ہے (ایک تھیلی نکالتا ہے) اس کا نام کیا؟ یہ اشرفیاں صاحب، دی پر سے وار کر خیرات کروی جائیں۔ اس کا نام کیا؟

ماں : لیکن کیوں؟

مصاحب : ابھی اس لیے کہ۔۔۔ بادشاہ سلامت۔۔۔ اس کا نام کیا؟

حفیظ : (داخل ہو کر) جی۔ خادم کو حفیظ کہتے ہیں اور آپ؟

مصاحب : جی میں۔ اس کا نام کیا؟ بادشاہ سلامت کا مصاحب ہوں۔

حفیظ : کہیے کیسے تشریف آوری ہوئی؟

مصاحب : اس کا نام کیا؟ آپ کی والدہ محترمہ سے عرض کر چکا ہوں۔ اس کا نام کیا؟

حفیظ : کیا بات ہے ماں؟

ماں : بادشاہ سلامت کو اپنی حوراں پسند آئی ہے۔

حفیظ : کب؟

ماں : ابھی ابھی جب شاہی سواری ادھر سے گزری۔

حفیظ : تو جناب مصاحب صاحب ہم اسے بادشاہ سلامت کی رعایا پروری سمجھتے ہیں۔ آپ ہماری شکر گزاری بادشاہ سلامت تک پہنچادیں۔ اس تھیلی میں کیا ہے؟

مصاحب : جی اس کا نام کیا؟ اس میں اشرفیاں ہیں۔ صاحب زادی پر سے وارنے کے لیے۔

حفیظ : اس عنایت کے ہم مستحق نہیں ہیں۔ آپ یہ اشرفیاں واپس لے جائیے۔

مصاحب : اس کا نام کیا؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی بہن کو شہزادہ محمد قلی کی ملکہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ اس کا نام کیا؟ جہاں پناہ چاہتے ہیں شہزادہ محمد قلی سے صاحب زادی صاحبہ کی باقاعدہ، اس کا نام کیا شادی۔

حفیظ : (طیش میں) خبیث۔ ان چند اشرفیوں کے عوض تو اپنے شہزادے کے حرم کے لیے ایک شریف لڑکی کی زندگی خریدنا چاہتا ہے؟ ملکہ بنانے کی لالچ دے کر تو نے اب تک نہ جانے کتنی بھولی بھالی نوخیز کلیوں کو پنکھڑی پنکھڑی نچوا دیا۔ مجھے

معلوم ہے محل کی باقاعدہ شادی کیا ہوتی ہے۔ چڑیا کے خوش رنگ آزاد پروں کے لیے سونے کا پنجرہ۔ ہرن کی چال و چہک چوکڑیوں کے لیے اونچی اونچی دیواروں کا قید خانہ۔

ماں : بیٹا۔ ان بے چاروں کا کیا قصور ہے۔ یہ تو حکم کے بندے ہیں۔

مصاحب : جی ہاں تقصیر۔ اس کا نام کیا ؟ بجا ارشاد فرماتی ہیں آپ۔ میں تو اس کا نام کیا، حکم کا بندہ ہوں۔

حنیفا : حکم کا بندہ۔ کوئی جانور، بے وقوف، گدھا تو نہیں ہوتا۔ انسانیت کے کچھ حقوق اس پر بھی عاید ہوتے ہیں۔ میں اسی حکم کے بندے سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس نے اپنی بیٹی کو گول لنڈہ کی ملکہ بنایا ؟ کیا اس نے اپنے بھائی کی بیٹی کو شاہی حرم میں داخل کیا ؟ جواب دیجیے حکم کے بندے صاحب !

مصاحب : اس کا کیا نام کیا ؟ میں کوئی زبردستی تو نہیں کر رہا ہوں . . اس کا نام کیا۔ آپ کی مرضی۔ آپ کیا کہتی ہیں اماں جان . . .

ماں : اپنے باپ کے بعد یہی گھر کا بڑا ہے۔ یہی فیصلہ کرے گا۔

حنیفا : سن لو کہ میری بہن کالک کے اس شاہی طاق میں کبھی نہیں جلے گی جہاں سے ہر صبح ایک نئی شمع کا جنازہ اٹھتا ہے۔

مصاحب : تو پھر اس کا نام کیا۔ میں کیا جواب جہاں پناہ کی بارگاہ میں عرض کروں ؟

حنیفا : تم جواب چاہتے ہو ؟ (تالی بجاتا ہے) آجاؤ۔ رحمت اندر آجاؤ۔

رحمت : (داخل ہو کر) تسلیم خالہ جان۔

ماں : جیتے رہو بیٹا۔

حنیفا : ماں ہم نے طے کر لیا ہے کہ دوستی کو رشتہ داری میں بدل دیں۔

ماں : میں کچھ سمجھی نہیں بیٹا۔

حنیفا : میں رحمت کی بہن سے شادی کروں گا اور رحمت میری بہن سے۔

ماں : لیکن۔ رحمت کیا یہ سچ ہے بیٹا ؟

رحمت : جی ہاں خالہ جان۔

حنیفا : رحمت کے والدین کو بھی یہ رشتہ داری پسند ہے اور اب آپ بھی رحمت کو دعاؤں سے نواز دیجیے۔ چلو رحمت جھک کر سلام کرو۔ (رحمت آگے جھک کر سلام کرتا ہے) شاباشش۔

ماں : خوش رہو بیٹا، پھولوں میں مسکو۔ چاندنی میں چمکو۔ تم دونوں سے محبت اور مسرت کی ایک سدا بہار دنیا آباد رہو۔

رحمت : اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ حنیفا جانتا ہے آج مجھے ابا جان نے کس قدر اہم کام تفویض کیا ہے۔ (ادھر جاتا ہے بدھر حوراں گئی)

حنیفا : مصاحب صاحب اب آپ بھی تشریف لے جائیں۔ عرض کر دیجیے۔ جس لڑکی کو جہاں پناہ نے اپنے شہزادے کے لیے پسند فرمایا اس کی شادی طے ہو گئی ہے۔

مصاحب : اس کا نام کیا۔ بہت مناسب ! (چلا جاتا ہے۔)

رحمت : (داخل ہوکر) حنیفہ ادھر تو ۔ ۔ ۔ ۔

ماں : ارے تم ادھر کدھر گئے بیٹا ۔ حوراں ہوگی وہاں !

رحمت : جی کچھ ایسا ہی نظر آیا ۔ میں اپنی خوش نصیبی سے ٹکرا گیا ۔ (پھر ادھر ہی کا رخ کرتا ہے ۔ حنیفہ اسے شانوں سے پکڑ کر باہر کے راستے پر ڈال دیتا ہے) ۔

ماں : بیٹا یہ تم نے کیا کر دیا ۔ نعمت اللہ خاں ، شہزادہ عبدالقادر شاہ کے سپہ سالار تو ہیں ۔ لیکن ان کی بیٹی لنگڑی ہے نا ۔

حنیفہ : مجھے معلوم ہے ماں ۔ لیکن حوراں کی خاطر میں اس لڑکی سے شادی کروں گا ۔ رحمت کے والد اسی شرط پر راضی ہوئے ہیں ۔ اچھا میں اب جاتا ہوں ۔ آج شہزادہ محمد قلی کی سال گرہ کا جشن ہے ۔

ماں : جاؤ خدا حافظ ۔ لیکن بیٹا رحمت کے سپرد کوئی خطرناک کام تو نہیں ۔ اب تو وہ اپنا بچہ ہے اس کی طرف سے فکر مند ہوں ۔

حنیفہ : ماں بادشاہت کے کاروبار خطرناک ہی ہوتے ہیں ۔ ایک نقشہ جم رہا ہے ۔ شہزادہ عبدالقادر شاہ کے لیے دعا کیجیے ۔ (چلا جاتا ہے) ۔

ماں : حوراں ۔ حوراں ۔

حوراں : (داخل ہوکر) جی ماں ؟

ماں : تو نے رحمت کو دیکھا ؟

حوراں : وہ کون تھا ماں ۔ بس دن دن گھستا ہی چلا آرہا ہے ۔

ماں : وہ نعمت اللہ خاں سپہ سالار کا بیٹا ہے ۔ ہاں اب تیرا بھائی بھی دلہا بنے گا ۔

حوراں : کب ۔

ماں : بس بہت جلد ۔

حوراں : اور میری دلہن بھابی کون ہوگی ۔

ماں : نعمت اللہ خاں سپہ سالار کی بیٹی ۔

حوراں : ہائے اللہ ۔ وہ تو لنگڑی ہے ۔

ماں : وہ لنگڑی ہے تو کیا ہوا ۔ تو تو اچھے گھر میں پہنچ جائے گی ۔ رحمت سے تیری شادی ہو جائے گی ۔

حوراں : ماں ، ماں ، میں نہیں کروں گی شادی وادی ۔

ماں : کیوں بیٹا ۔ قسمت تیرے لیے پھولوں کے ہار لیے کھڑی ہے اور تو منہ پھیر رہی ہے ؟

حوراں : وہ تو اندر گھس آیا تھا ۔ شہزادہ جیسا بالکل نہیں تھا ماں ۔

ماں : بیٹا ۔ شہزادوں سے خواب تو سنور سکتے ہیں زندگی نہیں سنور سکتی ۔ زندگی تو ایسے ہی ساتھی کے ساتھ چین سے بسر ہوتی ہے جو اپنے بازوؤں کی طاقت سے اس گاڑی کو منزل تک کھینچ سکے ۔

حوراں : نہیں ماں ۔ نہیں نہیں ۔

ماں : کیا نہیں نہیں کر رہی ہے ۔ اپنے بھائی کے ایثار کو ٹھکرائے گی کیا ؟ وہ اپنی خوشیوں کے بدلے تیری خوشیوں کا سودا

کرتا ہے۔ اور تو اک پرچھائیں کو گلے لگانے پر تلی رہی ہے۔ نادان نہ بن حوراں۔

حوراں : ماں۔ حنیفا بھائی ایسا کیوں کررہے ہیں۔

ماں : اس لیے کہ وہ تیرا بھائی ہے۔ تیرا چاہنے والا بھائی ۔۔۔ اور ۔۔۔ (روتے ہوئے) کیوں کہ تیرے باپ کا سایہ تیرے سر سے اٹھ گیا ہے۔

حوراں : میں کبھی بھی شادی نہیں کروں گی۔ حنیفا بھائی اپنی پسند کی کسی دوسری لڑکی سے شادی کرلیں۔

ماں : ضد نہ کرو حوراں۔ ایسے بھائی کی خوشی کے لیے تو جان دے دینا بھی کچھ نہیں۔ حوراں میری بیٹی۔

حوراں : (ماں سے لپٹ کر رونے لگتی ہے۔) ماں۔

(شہزادہ محمد قلی کرسی پر بیٹھا پھول سونگھ رہا ہے۔ دونوں طرف مصاحب کھڑے ہیں۔)

شہزادہ : اس پھول کو اگر ہم پھولوں کا بادشاہ کہیں تو کسی کو اعتراض ہوسکتا ہے؟

ایک مصاحب : کس کو اعتراض ہوسکتا ہے حضور۔ مجال ہے کسی کی۔ حضور کے ہاتھ میں یہ پھول اس وقت یقیناً پھولوں کا بادشاہ ہے۔

شہزادہ : یہاں روپ میں ادا میں رنگ میں خوش بو میں ہر بات میں بادشاہت کا اعلان ہے اور جب ہم غور سے دیکھتے ہیں ہمارا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ ہمیں اس پھول میں ایک چہرہ بھی نظر آتا ہے۔

دوسرا مصاحب : چہرہ۔ حضور پنکھڑیوں پر شبنم کی بوندیں لرز رہی ہوں تو ایک نہیں کئی چہرے نظر آتے ہیں۔ چشم بددور۔ پھول میں حضور ہی کا عکس جلوہ فرما ہوگا۔

شہزادہ : نہیں یہ بات نہیں۔ ہماری آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں اسے ہم نے ایک بار شفق کی سرخیوں میں شرماتا دیکھا تھا اور آج اس پھول میں مسکراتا دیکھ رہے ہیں۔

نفاست : (زنانہ انداز میں) میں۔ حضور کی اجازت ہو تو میں بھی جھانک دیکھوں۔ مجھے بھی ان دیکھی صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔

شہزادہ : لیکن نفاست تم دیکھو گے تو کسی ڈراؤنے مرد کی صورت دکھائی دے گی۔ (سب ہنستے ہیں)

نفاست : حضور گستاخی معاف۔ حسن کی میزبانی کے لیے عورت نہایت غیر موزوں مخلوق ہے۔ حسن کے شایانِ شان تو مردانہ وجاہت ہوتی ہے۔ حضور کسی حسین دوشیزہ کے چہرہ پر گھنی مونچھیں ہی لگاکر دیکھ لیں (سب ہنستے ہیں)

شہزادہ : تو حسن کو مونچھیں لگادیں تو کیا ہوگا نفاست؟

نفاست : حضور چار چاند ہی نہیں چار سورج بھی لگ جائیں گے حسن کو۔

ایک مصاحب : لیکن حضور نفاست نواب کو عورت نظر ہی نہیں آتی۔

شہزادہ : کیا یہ سچ ہے نفاست؟

نفاست : حضور قصہ یہ ہے کہ بچپن میں ہر عورت ماں نظر آئی اور جوانی میں ہر عورت بہن نظر آتی ہے۔ اب عورت کون سی رہ گئی؟

دوسرا مصاحب : اور وہ لونڈیاں؟

شہزادہ : یہ کیا قصہ ہے؟

دوسرا مصاحب : شاہی باورچی خانے کی سب سے شوخ اور سب سے وضع دار چھوکری۔ وہ باورچی خانے میں اس طرح نمونس گئی ہے جیسے پتا میں صندل کی لکڑی۔ نفاست نواب کی آنکھوں کا نور، دل کا سرور۔

نفاست : کیا بکتے ہو۔ حضور ان کی بات پر نہ جائیں مجھے صرف اس کے ہاتھ کے پکوان پسند ہیں اور وہ ......

پہلا مصاحب : اور وہ ان کی آن بان پر فدا ہے۔

شہزادہ : لوبان، یہ نام پکارنے کے لیے بہت پیارا ہے۔ لیکن ہمارا دھیان سلگتی آگ کے دھوئیں کی طرف بھی جاتا ہے۔

دوسرا مصاحب : حضور محبت آگ ہی ہوتی ہے۔

شہزادہ : آگ ہوتی ہے۔

پہلا مصاحب : ایسی آگ جو بھڑکتی ہے تو پھول اور سلگتی ہے تو دھواں۔

شہزادہ : نفاست اس آگ کو راکھ نہ بننے دو۔

نفاست : لیکن حضور میں نے عرض کیا نا کہ مجھے چولہے کی آگ پسند ہے جو لذیذ پکوان سربراہ کرتی ہے۔

شہزادہ : تمھیں پکوان سے زیادہ لوبان پر توجہ دینی چاہیے۔ تمھیں معلوم ہے جو آگ، لوبان کے اندر دہک رہی ہے کون سی آگ ہے وہ؟ موسیٰ کا دل جب تڑپ اٹھا تھا خدا کو اپنا جلوہ دکھانا پڑا تھا۔ تب طور جل گیا۔ لوبان کے دل کی آگ طور کی اسی آگ کا عطیہ ہے۔

سب لوگ : سبحان اللہ، کیا بلند خیال ہے، کیا حقیقت بیانی ہے۔ محبت خدا کی تجلی کی تقسیم واہ!

حقیقہ : (داخل ہوکر) سال گرہ کی مبارک باد کے لیے سو سلام قدم بوس ہیں۔ (سلام کرتا ہے)

شہزادہ : مبارک باد قبول ہوئی۔ ایک مبارک باد ہماری طرف سے بھی ہے۔ نعمت اللہ خاں کی دامادی تمھیں مبارک ہو۔

نفاست : لیکن حضور، یہ سالار صاحب کو جہیز کے علاوہ اپنی بیٹی کے لیے سونے کی ٹانگیں بھی دینی ہوں گی (انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے)

شہزادہ : خاموش۔ ہمیں پسند نہیں کسی کی گھریلو زندگی ہمارے دربار میں موضوعِ گفتگو بنے۔

حقیقہ : حضور عالی۔ نوازش، نوازش۔ بڑی مہربانی۔

شہزادہ : ہاں سال گرہ کچھ گونج نہیں رہی ہے۔

حقیقہ : حضور آج تو وہ قیامت برپا ہونے والی ہے جس کو خدا بھی نعوذ باللہ نہ روک سکے گا۔ آج حضور کے دربار میں بھاگ متی کا پہلا رقص پیش ہوگا۔

شہزادہ : بھاگ متی! لوگ کبھی کبھی خوب صورت ناموں کا بے جا استعمال بھی کرتے ہیں۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ بھاگ متی جس کا نام ہے وہ بھی خوب صورت ہے؟

پہلا مصاحب : حضور آج تک اسے کسی نے دیکھا نہیں۔ آج تک اس کا رقص نظر افروز نہیں ہوا۔

شہزادہ : دیکھیں گے۔

را مصاحب : حضور شاید آج اپنی عادتوں میں خالی ہاتھ رہ جائیں۔

زادہ : ہم سب کچھ لٹا کر بھی ایک دولت کے مالک رہیں گے اور اس دولت کو بھی کسی پر نچھاور کرنا پڑے تو ہم سمجھیں کہ ہم نے جو کچھ کھویا اس سے زیادہ ہی پالیا۔

: سبحان اللہ۔ آج حضور کی زبان سے کوئی اور بول رہا ہے۔

زادہ : کون ؟

اک متی رقص کرتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔ شہزادہ بے اختیاری میں کھڑا ہوجاتا ہے۔ بھاگ متی شہزادے کے قدموں میں ـ جاتی ہے۔ شہزادہ اپنے ہاتھ کا پھول اس کے جوڑے میں لگادیتا ہے اور خود اس کے جوڑے کا پھول نکال لیتا ہے۔ مصاحبین ـ ایک کرکے چلے جاتے ہیں۔)

زادہ : تم کون ہو ؟

ل متی : آپ کو یاد دلاؤں۔ ایک شام آپ سنگم کی طرف آنکلے تھے۔

زادہ : ہمیں یاد آیا۔

ـ متی : ایک لڑکی ندی میں پاؤں ڈالے ہاتھوں سے پانی اچھالتی بیٹھی تھی۔

زادہ : کیا تم وہی ہو ؟ ہمارا گھوڑا پیاسا ہوکر ندی کی طرف مڑگیا تھا۔ ہم نے دیکھا تھا ڈوبتے سورج پر شام اپنا سرخ ں لہرارہی تھی۔

ـ متی : میں شرمارہی تھی۔

زادہ : تم کیوں ؟

ـ متی : اس لیے کہ سرکار گھوڑا ہی نہیں سوار بھی پیاسا نظر آرہا تھا۔

زادہ : ہم دیکھ رہے تھے۔ تمہاری ہتھیلیوں سے پانی کی موجیں اس طرح اٹھ رہی تھیں جیسے تمہارے پیروں کی بلائیں لے رہی ہوں۔

ـ متی : پھر آپ چلے گئے۔

زادہ : دیکھو کب سے ہمیں تمہارا انتظار تھا۔

ـ متی : مجھے یہاں تک پہنچنے کے لیے سنورتے سنورتے اتنی دیر ہوگئی۔ میں کیا کروں۔ تتری کو اپنا پھول ڈھونڈتے ڈھونڈتے وقت لگ ہی جاتا ہے۔

ادہ : [illegible] اتنے سال تمہارے سنورنے کو لگے ہیں ؟ اتنے سال تمہیں اپنا پھول ڈھونڈنے کے لیے درکار ہوتے ہیں ؟ [illegible]

ـ متی : ایک شہزادے کے قابل بننا کیا آسان کام ہے ؟ [illegible] ایسا پھول [illegible] ـ توڑا جاتا سرکار۔

ادہ : (بھاگ متی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ایسا پھول بھی کسی ڈالی سے نہیں توڑا جاتا سرکار۔ یہ ہمارے [illegible] لیے کسی داتا کی دین ہے۔

بھاگ متی : آپ تو مجھے کچھ کہنے ہی نہیں دیتے۔

شہزادہ : ہم چاہتے ہیں تم صرف اقرار کرو۔

بھاگ متی : اس بار پانی نے ہمیں بھی نہال کر دیا عمر بھر کے لیے۔

شہزادہ : اس بار پانی نے مجھے نہال کر دیا عمر بھر کے لیے۔

بھاگ متی : میری بات کیوں دہرا رہے ہیں آپ؟ شہزادہ اور رقاصہ ایک ہی انداز سے گفتگو نہیں کرتے۔

شہزادہ : کون ہے شہزادہ؟

بھاگ متی : آپ۔!

شہزادہ : اور آپ؟

بھاگ متی : میں ایک رقاصہ۔ کنیز آپ کی

شہزادہ : نہیں تم ہماری ہو اور ہمیں ساری حد بندیاں مٹ جاتی ہیں۔ یہاں اب تم ہو۔ یہاں اب ہم ہیں۔ نہ کوئی شہزادہ ہے نہ کوئی رقاصہ۔

بھاگ متی : (ادھر ادھر دیکھتی ہے) ہائے یہاں تو کوئی بھی نہیں۔

شہزادہ : جہاں ہم دونوں ہوں وہاں کوئی بھی نہیں ہوتا۔

بھاگ متی : شہزادہ کو سالگرہ کی مبارک باد دینا تو بھول ہی گئی۔

شہزادہ : سالگرہ کیسی۔ ہماری زندگی تو آج ہی شروع ہوئی ہے۔

بھاگ متی : (گلوگیر آواز میں) لیکن یہ شام میری زندگی کی آخری شام ہے۔

شہزادہ : ایسا نہ کہو۔ اب ہر شام ہماری شام ہوگی۔ (گلے سے موتیوں کا ہار نکال کر) یہ لو... ہماری محبت کا نذرانہ۔

بھاگ متی : (سر جھکا لیتی ہے) اب پھر کب شہزادے کے درشن ہوں گے۔

شہزادہ : اب ہم خود آئیں گے تم سے ملنے۔

بھاگ متی : میں تو ندی کے اس پار رہتی ہوں۔

شہزادہ : ہم ندی کو پار کر کے آئیں گے۔

بھاگ متی : ندی میں طغیانی ہے۔

شہزادہ : ہم اس طغیانی کو روند ڈالیں گے۔

بھاگ متی : (شہزادے کے قدموں میں جھک جاتی ہے) میں شہزادے ان قدموں کے جو میری جھونپڑی کے مالک کو ہر تک آئیں گے۔ (جاتے جاتے مڑ کر) لیکن انتظار کو میری قسمت نہ بنا دینا۔

شہزادہ : نہیں نہیں۔ ہم ضرور آئیں گے۔

بھاگ متی : وعدہ۔

شہزادہ : وعدہ۔ (بھاگ متی چلی جاتی ہے)

ایک صاحب : حضور، جہاں پناہ تشریف لا رہے ہیں۔

(ابراہیم قلی قطب شاہ اور رائے راؤ داخل ہوتے ہیں۔)

ابراہیم : محمدی۔ یہ کیا حالت ہو گئی تمہاری۔ سال گرہ کے جشن سے تم کو تو رغبت ہی نہیں لگتی۔

شہزادہ : ابا حضور۔۔۔ جی وہ۔۔۔ ہم۔۔۔

ابراہیم : رقص و سرود کی محفل ہو کسی کی۔ شہزادوں کا انہماک تو امور سلطنت کے لیے وقف ہونا چاہیے۔ کیوں رائے راؤ

رائے راؤ : جہاں پناہ کا ارشاد عین حکمت ہے۔

ابراہیم : سنو۔۔۔ عورت کا حسن جوانی کے راستے پر چلتا ہے۔ تم اس کے ہم سفر نہ بنو۔

شہزادہ : ابا حضور۔ ہماری سمجھ بوجھ کچھ کام نہیں کرتی۔۔۔ ہمیں نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔

ابراہیم : عورت شاہی محل کی رات کا چاند تو بن سکتی ہے۔ یہاں کے دن کا سورج نہیں بن سکتی۔ جلال کو نہیں دیکھتے وہ شہزادے! رائے راؤ کیوں شہزادہ مرزا محمد امین نظر نہیں آئے۔

رائے راؤ : وہ ابھی کچھ دیر پہلے شہزادے کو سال گرہ کی مبارک دے کر گئے ہیں۔

ابراہیم : ہم نے سنا ہے۔ شہزادہ عبدالقادر ہمارے اس بیٹے کو سال گرہ کی مبارک باد کے لیے نہیں گئے۔ بادشاہ کے بیٹے بھائی نہیں ہوتے ایک دوسرے کے۔ ہے نا عجیب بات رائے راؤ۔

رائے راؤ : جہاں پناہ بات عجیب تو ہے لیکن ناقابل فہم نہیں۔ ایک میان میں صرف ایک تلوار ہی سما سکتی ہے۔ ایک سے زاید سر ہوں تو ٹکراؤ یقینی ہو گا۔ مخبروں نے خبر دی ہے کہ شہزادہ عبدالقادر بہت کم باہر نکلتے ہیں۔

ابراہیم : یہ کم آمیزی، یہ گوشہ نشینی اندیشہ ناک ہے۔

رائے راؤ : جہاں پناہ کی بصیرت حقیقت بیں ہے۔

شہزادہ : ابا حضور۔۔۔ زندگی میں پہلی بار ہم نے اپنے دل کی دھڑکن سنی۔

ابراہیم : وہ دل کی دھڑکن نہیں۔۔۔ ایک ناچنے والی کے گھنگھروؤں کی چھم چھم تھی۔ شہزادے ہو فرہاد نہیں ہو۔ دل کو دماغ کا تابع رکھو۔

شہزادہ : لیکن یہ دھڑکنیں آگ بن چکی ہیں ابا حضور۔ ہمارے اندر دھواں سا بھر رہا ہے۔ ہمارا دم گھٹ رہا ہے۔۔۔

ابراہیم : رائے راؤ تمہاری گشتی کا بندوبست ہو گیا ہے۔ کیا رائے راؤ؟

رائے راؤ : جہاں پناہ۔۔۔ سب انتظام ہو چکا ہے۔

ابراہیم : [illegible] رائے راؤ۔ [illegible] کے بیٹے کی [illegible] ہو گئی [illegible] کی [illegible] کے گھر کی [illegible] ہو گئی ہے۔ [illegible] کی ہو سکتا ہے۔ [illegible] کے [illegible] ہے [illegible] گئی ہے۔ [illegible] ہے۔ [illegible] کے گھر کی [illegible] کی [illegible]

[illegible] : (شہزادے کے سر پر ہاتھ رکھ کر) محمدی ہم نے [illegible] ہے [illegible] کے [illegible]

ہیں کہ تم نصیحت ہو جاؤ گے ۔ ۔ ۔ ۔

شہزادہ : ابا حضور ۔ ۔ ۔ ہم پر رحم کیجیے ۔

ابراہیم : ہم تمہاری بپتا کو سمجھتے ہیں ۔ اس کا علاج بھی جانتے ہیں ۔ ۔ ۔ پریشان نہ ہو ۔ ۔ ۔ اچھا اب ہم جاتے ہیں ۔ رانے راؤ ۔ تم ہمیں شہزادہ کی کیفیت سے آگاہ کرنا ۔

رانے راؤ : جو حکم عالی ! (ابراہیم گل اور رانے راؤ چلے جاتے ہیں ۔)

شہزادہ : ہمارے بے قرار دل کا علاج سنگین سیاست کے بس میں نہیں ۔ اس دل کا درد ہی اس کی دوا ہے ۔ اب ہم کس سے کہیں ہمیں ہمارے دل آرام سے ملادو ۔ ہم شانت ہو جائیں گے ۔ ہمیں ہمارے دل آرام سے ملادو ۔ ۔ ۔ ۔

ترکی دوشیزہ : (ایک لڑکی ترکی لباس پہنے داخل ہوتی ہے ۔ شہزادے کو اپنی اداؤں سے لبھاتی ہے ۔)

پس منظر میں : میں ترکستان کے نیلگوں آسمان کا روشن چاند ہوں ۔ میری چاندنی سے دلوں میں اجالا ہے ۔ میرے گیسوؤں میں تارے جگمگاتے ہیں ۔ میری مسکراہٹ چٹانوں کے دلوں میں شگاف ڈالتی ہے ۔ میں جس پر نظر ڈالوں وہ دیوانہ ہو جائے ۔ میرا دیوانہ ۔ مجھے دیکھو کر اگر حسن کو دیکھنا ہے ۔ مجھے اپنالو اگر کامیاب ہونا ہے ۔ دیکھو میری بانہوں میں نشاط کی دنیا ہے ۔ ۔ ۔ اس دنیا میں آجاؤ ۔ ۔ ۔ آجاؤ ۔ ۔ ۔ ! !

(شہزادہ غیر متاثر ۔ لڑکی چلی جاتی ہے)

ایرانی دوشیزہ : میں ایران کے گلشن کا سب سے شاداب گلاب میرے رنگ سے دنیا رنگین ۔ میری مہک سے دنیا معطر ۔ میں جھوتنوں تو بہار ۔ میں مہکوں تو شباب ! میں شبنم آلود آگ ۔ میں شعلہ صفت راگ ۔ مجھے دیکھو ۔ ۔ ۔ میں ہوش ربا ۔ میں دل ربا ۔ میری آنکھوں میں دیکھو ۔ ۔ ۔ شراب کی مستی ۔ میرے ہونٹوں میں پاؤ شہد میں ڈوبی پنکھڑی کا رس ۔ مجھے دیکھو ۔ ۔ ۔ مجھے فتح کرلو ۔ ۔ ۔

(شہزادہ ایک دوبار اچٹتی نگاہ ڈالتا ، پھر نظریں نیچی کرلیتا ہے ۔) (لڑکی چلی جاتی ہے)

کشمیری دوشیزہ : (ایک لڑکی کشمیری لباس پہنے داخل ہوتی ہے ۔ شہزادے پر اپنا جادو چلاتی ہے)

پس منظر میں : میں کشمیر کی کلی ۔ میرے رنگ میں شفق ہے ۔ میرے رنگ میں ترنگ ہے ۔ زعفران میری خوشبو ۔ نرگس میرا جادو ! میں عشوہ طراز ۔ میں تیر انداز ۔ میں شاخِ گل کی لچک ۔ میں مچلتے رنگوں کی دھنک ۔ میرا حسن جنت کی تصویر ۔ میرا جسم چاہت کی لکیر ۔ میں مہ جبین ۔ میں دل نشین ۔ میں نازنین ۔ مجھے دیکھو ۔ مجھے دل دے دو (شہزادہ بے تاب ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ لڑکی چلی جاتی ہے ۔)

شہزادہ : بس ، بس اب برداشت نہیں ہوتا یہ تماشہ ! اب کوئی ہمارے سامنے نہ آئے ۔ ہم ان جلوؤں پر ریجھ نہیں سکتے ۔ ان حسن کی پریوں سے بہل نہیں سکتے ۔ جس حسن کے سینے میں دل نہ ہو ، وہ پتھر کی مورتی ہے ۔ اس کی پرستش تو کی جاسکتی ہے ، اس سے محبت نہیں کی جاسکتی ۔ ۔ ۔ اور جن آنکھوں میں کوئی محبوب بسا ہو وہ آنکھیں کسی اور کو حسین نہیں دیکھ سکتیں ۔ ہم حسن کا بازار سجانا نہیں چاہتے ۔ ہم نے محبت کا سودا کیا ہے ۔ اور یہی سودا ہماری زندگی کا سرمایہ ہے ۔ ہم سے یہ جدائی برداشت نہیں ہوتی ۔ یہ جدائی ہمیں دیوانہ بنا دے گی ۔ محل کی دیوارو ، ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ ۔ ۔ ۔ ہمیں وہاں جانے دو جہاں ہماری محبت ہماری راہ دیکھتی کھڑی ہے ۔ (تیز تیز چلا جاتا ہے)

○○○

تیسرا سین

(ابراہیم قلی قطب شاہ کا دربار۔ رائے راؤ نعمت اللہ خاں، رحمت اور حنیفہ کھڑے ہیں۔)

ابراہیم : آج ہم ایک اہم حکم صادر کرنے والے ہیں۔ رائے راؤ کارروائی شروع کی جائے۔

رائے راؤ : جہاں پناہ۔ نعمت اللہ خاں بغاوت کی سازش کا سرغنہ رہا ہے۔ شہزادہ عبدالقادر شاہ کے سپہ سالار کی حیثیت سے اس نے شہزادے کے اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور بادشاہت کی امید دلا کر شب خون مارنے کی تیاریاں کی۔ جہاں پناہ کے اقبال یاوری سے سازش کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ اور بغاوت کو سر اٹھانے سے پہلے کچل دیا گیا۔ نعمت اللہ خاں بھاگ کر کوہ شکل میں قدم جمانے اور فوجیں اکٹھی کرنے لگا لیکن شاہی فوج نے اسے جالیا اور گرفتار کرلیا۔

ابراہیم : نعمت اللہ خاں تمھیں معلوم نہیں تھا ہر روزن سے ہماری آنکھ جھانکتی ہے۔ اور ہر دیوار پر ہمارے کان لگے ہوتے ہیں۔

نعمت اللہ : جہاں پناہ۔ شہزادے کے حکم کے آگے میں مجبور تھا۔

ابراہیم : شہزادہ کی سادہ لوحی سے زیادہ تم اپنی اقتدار پسندی کے حکم بردار تھے۔ تم جسے مجبوری کہہ رہے ہو۔ وہ تمھاری خود غرضی کے چہرے کا نقاب تھا۔ تمھارا فرض تھا کہ تم شہزادے کو کج روی سے روکتے۔ حالات کا حقیقی جائزہ پیش کرتے۔ وہ اگر ناسمجھ تھا تو تم پختہ کار تھے۔ لیکن تم کو اپنی طاقت پر بھروسہ تھا۔ فوجی مہارت پر گھمنڈ تھا۔ افسوس کہ تم نے اپنے کنکر سے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کردینا چاہا۔

نعمت اللہ : جہاں پناہ۔ میں صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے حاضر خدمت ہونا ہی چاہتا تھا کہ۔۔۔

ابراہیم تمہارے تساہل نے ہمیں اپنے بیٹے سے جدا کردیا۔ وہ شہر بدر ہوکر دیدہ کنڈہ کے راستے پر بڑھ رہا ہے اور ہمارا عتاب اس کے تعاقب میں ہے۔

نعمت : حقیقت یہ ہے جہاں پناہ۔ کہ قسمت نے میرے ساتھ غداری کی۔

ابراہیم : نعمت اللہ خاں، حیرت ہے۔ تم سا ہوش مند سازش کی چوکسی سے لاپرواہ ہوگیا۔ ہم تو اپنے سایہ پر بھی بھروسہ نہیں کرتے۔

نعمت : جہاں پناہ کا اشارہ میں کچھ نہیں پایا؟

ابراہیم : ہمیں اس سازش کا پتہ اس دھویں سے ملا جو تمہارے گھر کے چراغ سے اٹھ رہا تھا۔

(نعمت اللہ خاں اپنے بیٹے رحمت کی طرف دیکھتا ہے۔ رحمت سرجھکالیتا ہے۔ ابراہیم اپنی کمر سے خنجر نکال کر پھینکتا ہے۔ نعمت [illegible] اٹھا لیتا ہے۔)

حنیفہ : (آگے بڑھ کر) جہاں پناہ۔۔۔ قصوروار میں ہوں۔

ابراہیم : تم [illegible] کس طرح۔۔۔؟

[illegible] : جہاں پناہ۔ رحمت نے مجھے اپنا ہم راز بنایا اور میں نے اپنی ماں سے اس مہم کی کامیابی کے لیے دعاؤں کی درخواست کی۔ اس کی دعائیں آسمان تک پہنچنے سے پہلے [illegible] جہاں پناہ میں آ گئیں۔

ابراہیم : (قہقہہ لگاتا ہے) ... محبت صرف ایک راز کی متحمل ہو سکتی ہے اور وہ ہوتا ہے کہ اس کی عمر کا راز... اس راز کے علاوہ باقی چیزیں [illegible] نہیں۔ اس کے نزدیک خزاں کے سوکھے پتے ہیں۔ جن کو ہوا کے جھونکے اپنی لپیٹ میں لیے پھرتے ہیں۔ مگر نعمت اللہ خاں اس شخص کا کیا انجام ہونا چاہیے جس کو خود اس کے گھر کی دلہن سے ٹھوکر لگے... !

نعمت : (رحمت کی طرف بڑھتا ہے) بدبخت تم نے [illegible] کیا کیا؟

رحمت : [illegible] یہ جھوٹ ہے میں نے [illegible] کی زبان کو [illegible] نہیں ہونے دیا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔

حمیدہ : [illegible] یہ سچ ہے۔ اس خنجر کی حق دار یہ گردن ہے۔ (گردن جھکا دیتی ہے۔ نعمت اللہ خنجر اٹھا لیتا ہے۔ مگر ہاتھ نیچے لے آتا ہے۔)

راسے راؤ : [illegible] یہ باپ کی گردن اور بیٹے کے سینے کے مقابل۔ نعمت اللہ خاں کا ہاتھ کانپ رہا ہے... لیکن خنجر کے لیے تو ہر لہو حلال ہوتا ہے۔ (رحمت، حمیدہ کے خنجر گھونپ دیتا ہے)

حمیدہ : (ہائے کر) ... کہ ... یہ اپنی گردن پیش کرے۔ اس کی [illegible] میں خنجر نہیں گھونپتے۔ جہاں پناہ۔ میں رحمت کی [illegible] کی [illegible] کرتا ہوں (گر جاتا ہے) (حمیدہ کا خون دیکھ کر۔ نعمت اللہ رحمت پر حملہ آور ہوتا ہے۔)

نعمت : کمینے۔ غدار۔ تیری یہ جرات کہ اپنے جرم کا وبال ایک جاں نثار ہستی پر اتارے۔ (رحمت کے سینے میں خنجر اتار دیتا ہے۔ رحمت نیچے گر جاتا ہے) جہاں پناہ دیکھیے۔ دربار کے فرش پر میں اپنا خون چھڑک چکا۔ ہر کام اپنے انجام سے جانچا جاتا ہے۔ اگر شہزادہ عبداللہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا اس کی کامیابی کو فتح کا نام دیا جاتا اور اسی دربار میں میری قدر افزائیاں ہوتیں لیکن اس کی ناکامی بغاوت قرار پائی ہے اور میں ایک مجرم کی طرح سزا ہی پا رہا ہوں... جہاں پناہ آج مجھ پر ہر سزا واجب ہے۔ کوئی سزا مجھ سے محروم نہ رہ جائے۔ (روتا ہوا بیٹی کی لاش کے پاس بیٹھ جاتا ہے)

ابراہیم : (لاش [illegible] خنجر اٹھا لیتا ہے) راسے راؤ۔ نعمت اللہ خاں کی آستین سے اس کے بیٹے کا لہو ٹپک رہا ہے۔ یہ اچھا ہوا۔ اگر ہم خاموش ہوتے تو زمانہ ہم پر یہ تہمت دھرتا کہ ہم نے حکم عدولی کی پاداش میں ایک سرسبز سہاگ کو اجاڑ دیا۔ اس [illegible] ہے یہ [illegible] رحم آتا ہے جن کی قسمت میں شہزادہ محمد قلی کے حرم کی سرخ ریشمی [illegible] کی بجائے [illegible] کی [illegible] چادر لکھی تھی۔ راسے راؤ کبھی کبھی ہم قضا و قدر کے اشاروں پر حکم صادر کرتے ہیں لیکن لوگ سمجھتے نہیں۔ ہم نے جب حمید خاں لشکری کی بیٹی کو دیکھا ہم نے اسے شہزادہ محمد قلی کے لیے پسند کیا لیکن حمید خاں لشکری کے [illegible] لوگوں نے کہا ہم [illegible] حکم چلا رہے ہیں۔ ہمیں فکر آ گیا تھا۔ شہزادہ محمد قلی کے حاسدوں سے [illegible] کا کھیل [illegible] ہاتھوں میں [illegible] گیا ہے۔ سب دیکھو۔ ایک [illegible] دو دلوں کے درمیان آ گیا تھا کس طرح ہٹ گیا۔ یہ تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں [illegible] بادشاہوں کے فرمان [illegible] ہیں۔ اب ہم نعمت اللہ خاں کی قسمت کا فیصلہ سنائیں گے۔

راسے راؤ : نعمت اللہ خاں اپنی جگہ واپس جاؤ۔ (نعمت اللہ اپنی جگہ واپس جا کھڑا ہوتا ہے)

ابراہیم : نعمت اللہ خاں ہم سمجھتے ہیں کہ تم ہماری سوچی ہوئی سزا سے زیادہ سخت سزا بھگت چکے۔ تم اب قید کی زندگی بسر

اللہ کرتے کٹ رہ ۔ ۔ ۔ راسے راؤ ۔ کیا انتظامات ہمارے لیے بہت مطلق تھے ؟

راسے راؤ : جی ہاں جہاں پناہ ۔ (قسمت کو وہ صاحب لے جاتے ہیں اور وہ اللہ اللہ کرتا ہے)

ابراہیم : بیٹے کا ذہن دیکھ کر کون ما سوا اپنا دماغی توازن برقرار رکھ سکتا ہے ۔ خاص طور پر جب یہ خون اپنی کے ہاتھ کے خنجر سے ٹپک رہا ہو ۔ ہاں راسے راؤ شہزادہ محمد قلی کا کیا حال ہے ؟

راسے راؤ : جہاں پناہ ۔ محل پہنچنے کے لیے شہزادے نے بھری ہوئی ندی میں گھوڑا ڈال دیا ۔

ابراہیم : بھری ہوئی ندی میں گھوڑا ڈال دیا ۔ یہ محبت یقیناً سچی ہے ۔ کیوں کہ سچی محبت ہی سے ایسی حرکت سرزد ہو سکتی ہے ۔ لیکن وہ خیریت سے تو ہے نا ؟

راسے راؤ : جی ہاں بالکل خیریت سے ہیں وہ ۔

ابراہیم : ترکستان کے چاند کو ٹھکرا دیا ۔ ایران کے کعبے کو کچل دیا ۔ کشمیر کی کلی کو مسل دیا اور دیکھ لیا محل کی ایک جنگلی پھلواری پر ۔ وہاں نے شہزادے کا دماغ دل دشمن زادوں کو بے ذریعہ قربان محبت کرنا چاہیے ۔ یہ نہیں کہ آگ میں جل رہے ہیں ، دریا میں ڈوب رہے ہیں لیکن ہمیں اس طوفان سے زیادہ تشویش نہیں جو شہزادہ کے دل میں اٹھا ہے ۔ ہمیں خدشہ ہے موسیٰ ندی کی اسی طغیانی سے جو قطب شاہی تخت و تاج کو تاک رہی ہے ۔ راسے راؤ ۔ شہزادہ اب اپنی جان کو اس طرح جوکھم میں نہیں ڈال سکتا ۔ کیوں نہ ہم ان کنگوروں کو سدا کے لیے بے صدا کر دیں جن کی گونج سے گول کنڈہ کی بنیادیں لرز اٹھی ہیں ۔

راسے راؤ : جہاں پناہ ۔ شہزادہ کی طبیعت کا لحاظ کرتے یہ اقدام قرین مصلحت نہ ہوگا ۔

ابراہیم : ہم بھی یہی سمجھتے ہیں ۔ اب اس سمجھنے کے بعد اٹھانے ہی ہوں گے ۔ وقت سے ٹکرا کر ہر طغیانی ٹوٹ جاتی ہے ۔ تم دیکھو گے موسیٰ ندی ، اپنی چال پر آجائے گی اور شہزادہ کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا لیکن اس وقت تک ان کا راستہ نہ روکو ۔ انھیں جانے دو ، وہ جہاں تک جانا چاہتے ہیں ۔ لیکن ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے چلیں گے ۔

راسے راؤ : جہاں پناہ ! میں نے ایک کشتی اور ماہر پیراکوں کا انتظام کروا دیا ہے ۔ اب وہ شہزادے کی سلامتی کے ضامن ہوں گے ۔

ابراہیم : ہم چاہتے ہیں ۔ موسیٰ ندی پر ایک مضبوط پل تعمیر ہو جو شہزادے سے ہماری محبت کی گواہی دے گا ۔ ہم چاہتے ہیں کہ شہزادے ہماری محبت کو فراموش نہ کرے ۔

راسے راؤ : جہاں پناہ کا دل فرش عادلوں کا خزانہ ہے ۔

ابراہیم : ہم جو اپنی سلطنت کو سمندر تک پھیلا چکے ہیں ، تو کیا صرف دریا اور شمشیر سے ہی ممکن ہوا ہے ۔ ہم دلوں کو فتح کرتے ہوئے سمندر تک پہنچے ہیں ۔ راسے راؤ ۔

راسے راؤ : جہاں پناہ کی جے ۔ ۔ ۔

چوتھا سین

(ملکہ کا دربار۔۔۔ ملکہ اور اس کی بیٹی حیات بخش بیگم۔۔۔ حیات بخش بیگم کی گود میں بلی کا بچہ ہے)

حیات بخش بیگم : ماں پاشا! لوبان کہہ رہی تھی۔ میری بلی کے اندر شیطان ہے۔

ملکہ : خود لوبان کے اندر شیطان ہے۔ تم اس کی باتوں پر نہ جاؤ۔

حیات : ماں پاشا! میری بلی بڑی ہوکر شیرنی بنے گی نا۔

ملکہ : اس سوال کا جواب لوبان سے سنو۔۔۔ ٹھہرو۔ (تالی بجاتی ہے۔ لوبان آتی ہے)

لوبان : کیا ہے پاشا۔

حیات : (بلی کی آواز نکالتی ہے) میاؤں!

لوبان : اے لو! اماں مسکرا دیں۔ بیٹی جان میاؤں بول رہی۔ (اپنے آگے دیکھتی ہے) ارے کچھ تو بلی دکھ رائے۔ کیا تو بلی ہے!

ملکہ : (ہنستے ہوئے) اری دیکھ تیرے سر پر چڑھا!

لوبان : (لوبان اچھل پڑتی ہے) اماں میں مر گئی!۔۔۔ کاں تو بلی ہے چڑا، پاشا۔

ملکہ : وہ دیکھ کاندھے پر۔ (لوبان پھر اچھل پڑتی ہے)

لوبان : اوئی یہ کیا تو بلی مسخوری ہے۔ چھوٹے موٹے سے ڈرتیوں بول کر۔ کیا ذرا ذرا کو دم نکالتیں میرا۔ کوئی بلی تھیں ہے چڑا، دعا۔ فرماؤ کیا فرماتیں۔ انگر پو کباب کے شیشے چڑا کو آئیں۔

ملکہ : بات کچھ نہیں لوبان۔ شہزادی پوچھ رہی ہیں۔ ان کی بلی بڑی ہوکر شیرنی بنے گی کیا؟

لوبان : بلی تو بلی اچ رہیں گی۔ پن کی شہزادی اچ شیرنی بن کو رہیں گی۔

ملکہ : سن لیا اپنے سوال کا جواب۔

حیات : اگر میں شیرنی بنوں گی تو سب سے پہلے تجھے کھا جاؤں گی۔

لوبان : اے لو۔ میرے کو کیا کھاتیں۔ میرے کو کھا گئے تو میں چھوٹے سلطان کے پاس فریاد لے کو جاؤں گی۔

حیات : چھوٹے سلطان کون ماں پاشا!

ملکہ : لوبان۔ ذرا اپنی زبان کو قابو میں رکھ۔ ہاں آج کھانے میں تیرے ہاتھ کے کیا پکوان ہیں۔

لوبان : خدا آپ کو نیکی دے۔ بگھارے بیگن، قیمہ میتھی، کروندے کا دوپیازہ اور کیا ہاں۔ ہاں وہ شیخ کے کباب۔

ملکہ : شیخ کے کباب نہیں۔ سیخ کے کباب، شیخ میراں چوکیدار سے تیری جوتی کروانے لگا۔

لوبان : اب کچھ بی ہو۔ اپنے کو تو کباب سے کام ہے۔

ملکہ : کبھی کوئی خاص پکوان بی ہوگا؟

حیات : پاشا ماں، لوبان سے کہیے وہ میرے لیے سفید ہاتھی کا خاگینہ بنائے۔

بان : اسے لیو ۔ یہ نوادار خاگینہ ملنے میں آیا ۔ ہاں پاشا آپ خاص پکوان بولے تو برسات تک ٹھیر جاؤ ۔

یات : کیا برسات کا بھرتہ بنے گا ؟

بان : میرے کو بات تو پوری کرنے دیو شہ زادی الحا یچ میں کود تئیں یا ۔ آدمی ادھر کا رہتا نہ ادھر کا ۔ ہاں تو میں
ل ری تھی ۔ برسات آئے تو ابر بھی آتے ۔ انے منہ اندھیرے دریا پو پانی پینے اترتے ۔ اپن سپاہیوں کو بھیج دینا ۔ انوں تلواروں
سے شپاشپ ابر کے ٹکڑے کاٹ کو لاتیں پھر لیو ۔

ملکہ : کیا ابر کا سالن پکتا ہے لوبان ۔ ۔ ۔ ؟

بان : کیا مزے دار میں کیا بولوں ۔ اپنے مرل کے گوشت کا مزہ ۔ سین آنچ تیز ہو گئی تو ۔ ۔ ۔

یات : تو کیا ؟

بان : ذرا پانی پانی ہوتا جاتے ۔ (ملکہ اور حیات کھل کھل ہنسنے لگتے ہیں)

بان : پاشا ۔ بادشاہ سلامت کو بھاگ متی کا لقو جو ہے سو ہے ۔ ماشاءاللہ اب شہ زادی بڑی ہونے کو آگئی ۔ اگر اس کے
ن میں یہ بات پڑ گئی تو باپ پر جان دینے والی کے دل پر کیا کچھ نہ بیتے گی ۔ ۔ ۔ ذرا سوچیے پاشا آسمان کا سورج زمین پر گر کے مٹی
ی صحنک کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تو ۔ ۔ ۔ کیا قیامت ہوگی خیال تو کریے پاشا ۔ پاشا سلامت کی عمر نئیں یہ کاماں کی ۔

ملکہ : اب تیری بات الگ ہے ۔

بان : میری بات کیا پاشا ؟

ملکہ : وہ نفاست نواب ۔ ۔ ۔

لوبان : (رونے لگتی ہے) انوں میرے کو کاں چاہتیں ۔ میچ ان کی دیوانی ہوں ۔ میں چولہے میں کی لکڑی ہوں ۔ ایک ہی
طرف جلتی سو ۔ جلتا جلتا راکھ ہوجاتا ۔

ملکہ : لوبان ۔ ۔ ۔ ابھی ۔ ۔ ۔ تو اپنا دل پانی نہ کر ۔ ہم نفاست نواب سے تیری شادی کا ذمہ لیتے ہیں ۔

لوبان : (ملکہ کے قدموں میں گر جاتی ہے) سوکی ڈالی میں پھول کھلادیے پاشا اللہ آپ کو خوش رکھے ۔ شہ زادی کی
خوشیاں دکھائے ۔

ملکہ : شہ زادی کی خاطر ہی میں اس قدر پریشان ہوں ۔ لوبان سن تجھے ایک کام کرنا ہوگا ۔ نام بدل بھاگ متی کے پاس
ماما کی نوکری کرنی ہوگی ۔ سمجھ گئی نا ۔ ۔ ۔ ؟

لوبان : میں لال ریشمی جوڑا پہنوں گی پاشا ۔ ۔ ۔ ؟

ملکہ : تو میراست لڑا بھی پہنے گی ۔

لوبان : میں صدقے پاشا پو سے ۔

ملکہ : تو دیکھتی ہے نا لوبان ، بادشاہ سلامت دنوں ادھر کا رخ نہیں کرتے ۔ چھوٹی بیٹی کی خاطر بھی نہیں آتے ۔

لوبان : پاشاہ ۔ بھاگ متی کا جادو سانپ کے ناد ڈستاتے ۔ اس کو کوئی منتر نہیں مگر مجھے معلوم ہے اس کا منتر ۔

ملکہ : میں اب تک کہاں کہاں ان کے پیچھے پیچھے گئی لوبان ۔ وہ جہاں بھی گئے اپنے ہی گئے ۔

لوبان : بیگم صاحبہ آپ ابھی ان کے بیاہ کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ وہ لوٹ آئیں گے۔ اب بھی وہ ساتھ ہی ہیں تو۔

لوبان : (ملکہ روتی ہے) نہ رو۔ اللہ پاشا آپ کے آنسوؤں پر موتیوں کو واروں۔ آپ رنجیدہ نہ ہو۔ میں رستے رستے ٹھوکر نہیں کھاتی۔ تقدیر کو کیا معلوم دیکھنے والی ہوں۔ آپ خاطر جمع رکھو۔ میں کل اپنی خالہ کے گاؤں کو جاتی ہوں سب ٹھیک ہو جا۔

ایک آواز : بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں۔ (محمد علی، سلطان مرزا داخل ہوتے ہیں)

محمد علی : ملکہ دیکھیے ہم کسے ساتھ لائے ہیں۔

ملکہ : کون شہزادہ سلطان مرزا؟ (شہزادہ تسلیمات بجا لاتا ہے)

محمد علی : شہزادی۔ شہزادے کو سلام کرو۔

حیات : (اچٹتا ہوا سلام کر کے) کون ہیں یہ؟

محمد علی : یہ میرا بیٹا ہے۔

حیات : آپ کا بیٹا میں ہوں۔

محمد علی : (ہنس کر) کیوں نہیں۔ ہماری بیٹی ہزار بیٹوں کے برابر ہے۔

ملکہ : شہزادی تنگ کو چھوڑ دو۔ (حیات تنگی کو پھینک دیتی ہے۔)

محمد علی : ہاں۔ اب سلطان مرزا تمہارے ساتھ کھیلا کرے گا۔ بلکہ سلطان مرزا اب اسی محل میں رہے گا۔

(حیات بخشی، سلطان مرزا کے قد سے اپنا قد ناپنے لگتی ہے)

ملکہ : (مسکراتی ہوئی) خوب جوڑی ہے۔ چاند سورج کی جوڑی۔

محمد علی : آج ہم بے حد خوش ہیں ملکہ۔

ملکہ : خدا جہاں پناہ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

محمد علی : وہ جو ایک بوجھ ہم پر لدا ہوا تھا اب ہٹ گیا۔ اب یہ تخت یہ سلطنت کوئی چاہے کل ہم سے لے لے۔

حیات : شاہ بابا۔ میں بھی تخت پر بیٹھوں گی۔

محمد علی : ضرور۔ سلطان مرزا۔ حیات بخشی کی پرورش ہم نے ایک شہزادہ ہی کی طرح کی ہے اور تربیت میں کوئی کمی نہیں۔ اب وہ ایک شہزادے کے دماغ سے سوچتی ہے اور ایک شہزادی کی مستقل مزاجی سے عمل پیرا ہوتی ہے۔ آپ کبھی روشنی پائیں گے، کبھی آگ، کبھی آندھی پائیں گے۔ کبھی چنبیلی کی مہک۔ لیکن خبردار جو آپ انھیں چھوڑ کر آئے۔ ان کے ہم قدم رہو۔ پھر ہر منزل آپ کی منزل ہوگی۔

سلطان مرزا : وہ تو بہت غصیلی نظر آتی ہیں۔

محمد علی : زندگی کے دو روپ ہوتے ہیں۔ ایک روپ میں انسان اپنی ذاتی زندگی کا مالک ہوتا ہے اور دوسرے روپ کا معاملہ ہے کاملی سے ہوتا ہے۔ دونوں کے طور طریق جدا ہوتے ہیں۔ تم دھوپ کو دیکھ کر ہم رہتے ہو لیکن چاندنی سے نباہ پڑے گا۔

ملکہ : شہزادی سے بھی تو کچھ کہیے۔

محمد قلی : حیات بخشی بیگم کے نام سے قطب شاہوں کے نام کو دوام ملتا ہے۔ حیات بخشی بیگم کے کام سے قطب شاہوں کے خوابوں کو تعبیر پذیر ہونا ہے۔ گول کنڈے کی ملکہ بن کر وہ تخت پر اپنے آپ کو دیکھتی بیٹھی رہے گی تو تخت پر اس کا مقبرہ بن سکتا ہے۔ تخت کی دستیں پوری سلطنت پر پھیلی ہوتی ہیں اور رعایا کے سارے دلوں کی دھڑکنوں سے تخت نشین کا ایک دل بنتا ہے۔ ایک بھی دھڑکن کہیں مضمحل ہو تو یہ دل بے کل ہوجاتا ہے۔ گواہ ہیں پچھلے پہر کے بندے جب وہ اپنی جھلملاتی روشنیوں کے ساتھ زمین پر جھکے پڑتے ہیں کہ ہم نے اس وقت رعایا کی خوش حالی کے لیے دعاؤں کے ہاتھ عرش تک پہنچادیے۔ شہ زادی حیات بخشی بیگم یہ بات اپنے باپ کی یاد رکھو۔ انسان زندہ رہنا چاہتا ہے۔ تم اسے زندگی کی ضمانت دو۔ اگر ایسا ہوا تو بادشاہت تمہارے لیے سزاوار ہے۔۔۔ ورنہ۔۔۔ جیسا کہ ہم ابھی ملکہ سے کہہ رہے تھے ہم میں اس بوجھ کو سنبھالنے کی سکت گھٹتی جارہی ہے۔ اب کوئی آگے بڑھے تو ہم پیچھے ہٹ جائیں۔

ملکہ : تم دونوں جاؤ۔ باغ کی ہوا کھاؤ۔ دیکھو آم کی کیری کی طرف جب گلہری یلغار کرتی ہے تو وہ کس بے بسی سے اپنے بچانے والے کو ڈھونڈتی ہے۔ (حیات بخشی، سلطان مرزا چلے جاتے ہیں)

ملکہ : کچھ مجھے بھی عرض کرنا ہے۔

محمد قلی : جب ملکہ عرض کرنے کا ارادہ کرتی ہیں، ہمارا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

ملکہ : مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اگر میں بادشاہ سلامت کے دل تک رسائی پانے کے قابل نہیں ہوں تو کیا قدموں کی قربت کی بھی مستحق نہیں ہوں۔ مجھے خدا کے حضور سجدہ ریز رہنے کے سوا اب تک کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ لیکن اب ان سجدوں میں بھی سکون میسر نہیں ہورہا ہے۔ (روتے ہوئے) خدا بھی مجھ سے خفا ہے۔ آپ کو حیات بخشی کا واسطہ مجھ پر ظلم روا نہ رکھیے۔

محمد قلی : بے شک آپ کے ساتھ ہمارا سلوک ظالمانہ ہے لیکن کیا کریں آپ کو سجدوں میں سکون نہیں ملتا۔ ہمارا دل ہی دنیا سے اچٹ گیا ہے۔ کبھی کبھی تو ملکہ کچھ ایسی وحشت سوار ہوتی ہے، ہم چاہنے لگتے ہیں کوئی آئے اور ہمیں ہلاک کرڈالے۔ ملکہ ابھی ابھی ہم نے محسوس کیا کوئی سانپ ہماری گردن کو اپنی لپیٹوں میں کس رہا ہے۔

ملکہ : خدا نخواستہ آپ کی سلامتی میں سکھ کی دنیا آباد ہے لیکن کیا آپ شہ زادی کو بھی اس کا حق نہیں دیں گے؟ وہ آپ پر جان نچھاور کرتی ہے، کوئی بیٹی اپنے باپ سے اتنا پیار نہ کرتی ہوگی جتنا وہ آپ سے کرتی ہے اور ایک ایسے وقت جب وہ ایک نیا سفر شروع کرنے کو ہے آپ کی رہ نمائی اسے درکار ہوگی۔

محمد قلی : شہ زادی کو شہ زادہ سلطان مرزا مل گیا اب اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ آپ دیکھیں گی جب سلطان مرزا تخت پر بیٹھے گا، تخت پر بیٹھا ہی رہے گا اور حیات بخشی حکم رانی کرتی رہے گی۔

لوبان : (داخل ہوکر) اوئی پاشا۔ شہ زادی گرم گرم کباب کھاتے ہوئے تھے۔ نکل گئیں۔

ملکہ : مجھے تو یاد نہیں پڑتا، شہ زادی نے ایسی کوئی فرمائش کی تھی۔ (لوبان جانے لگتی ہے) لوبان۔

محمد قلی : ملکہ کیا یہی لوبان ہے؟

ملکہ : ہاں۔ کباب ادھر لا لوبان۔

محمد قلی : (کباب چکھتے ہوئے) لطافت نواب جو لوبان کے نام پر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہیں اب اس کی وجہ سمجھ میں آئی۔

ملکہ : ہم نے سوچا ہے۔ لوبان اور لطافت نواب کی شادی رچائیں۔

محمد قلی : مبارک خیال ہے۔ (لوبان شرماتی ہے)

ملکہ : لطافت نواب آپ کے لوبان میری!

محمد قلی : ہمیں منظور ہے۔ لیکن جب آپ شادی کا جوڑا بھیجیں، مونچھیں ضرور بھیجے۔

ملکہ : مونچھیں؟

محمد قلی : ہاں لطافت نواب مونچھوں پر مرتے ہیں۔ (محمد قلی چلا جاتا ہے)

OOO

پانچواں سین

(محمد قلی کا دربار۔ دائیں جانب شہزادہ سلطان مرزا اور بائیں جانب حیات بخشی بیگم۔

داستے راؤ۔ مصاحبین۔ شاعر۔ لطافت نواب موجود ہیں)

داستے راؤ : جہاں پناہ شاعرِ شیریں سخن رودرا کوی کے پوتے شرفِ باریابی چاہتے ہیں۔

محمد قلی : حاضر کیا جائے۔

شاعر (تلگو) : حضور یہ کویتا میرے دادا نے آپ کے پوجیہ پتاجی مرحوم شاہ ملک ابراہیم کی شان میں لکھی تھی میں اسے آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

محمد قلی : مرحبا، سناؤ ضرور سناؤ۔ ہمارا دل شاد کرو

شاعر : (رودرا کوی کا پوتا تلگو کلام سناتا ہے۔)

شاعر :

محمد قلی : واہ واہ سبحان اللہ۔ یہ لو۔ ہماری طرف سے نذرانہ۔

داستے راؤ : ایک اور شاعر کو جہاں پناہ کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کی اجازت ہو۔

محمد قلی : اجازت ہے۔

شاعر :

(مصاحبین واہ واہ، سبحان اللہ، ماشا اللہ کہتے ہیں۔)

محمد قلی : جو کچھ ہمارے بارے میں کہا گیا، ہم نے سنا۔ شاعری اظہارِ خیال کا ایک دل آویز ذریعہ ہے اور شاعر کا وجدان زندگی کی سادہ حقیقتوں کو حسن کی خلعتیں عطا کرتا ہے۔ جب تخلیق اپنی گہرائیوں میں گمبھیر ہوجاتی ہے تو شاعر کی حکمت آفرین ایک طلسمی سلجھاؤ دریافت کرلیتی ہے۔ یوں سمجھو۔ شاعر پہاڑ کی سنگینی کو چشمے کی روانی بخش سکتا ہے۔ شاعر کے لیے ہماری طرف سے یہ تحفہ۔ (گلے سے موتیوں کی مالا نکال کر دیتا ہے) ان موتیوں کی آب و تاب تمہاری خوش بیانی کے لیے موزوں سجاوٹ رہے گی۔

ہماری جن خوبیوں کا ذکر ہوا ہے اس کی روشنی میں ہم اپنا جائزہ لیں گے۔ اگر یہ خوبیاں درحقیقت ہم میں موجود ہیں تو ہم خوش ہوں گے کہ ہم حکم رانی کی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونے کی صلاحیتوں کے مالک بھی ہیں اور اگر ہم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ جن کارناموں کو ہم سے منسوب کیا گیا ہے وہ محض شاعر کی خیال آرائیاں ہیں تو ہم کوشش کریں گے کہ ان توقعات کو پورا کریں جو ہم سے وابستہ کی گئی ہیں۔ (مصاحبین کی آواز اقبال بلند۔ عمر دراز) اور اس ضمن میں ہم نے رائے راؤ کی رہ نمائیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

رائے راؤ : جہاں پناہ۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ چراغِ سحری ہوں۔ اب کوئی پناہ مجھے نہیں بچا سکتی۔ ہوا کا ایک جھونکا اور میں بجھے ہوئے شعلے سے بچھڑ کر پراگندہ ہونے والا دھواں۔

محمد قلی : بادشاہت صرف بادشاہ کے وجود سے قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کے لیے وفادار، دانش مند اور مصلحت شناس وزیر کی دست گیری بھی درکار ہوتی ہے۔ تمہارا تدبر اس سلطنت کے استحکام میں صرف ہوا ہے اور کوئی عمارت اپنے ستون سے جدائی پر رضامند نہیں ہو سکتی۔ ہم تم سے مخاطب ہیں رائے راؤ۔ سلطنت ایک عمارت ہے اور تم اس کے ستون۔ ۔ ۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ رائے راؤ کی جو تعریف ہم کر رہے ہیں تو تعریف خود بہت خوش ہوگی کیوں کہ ہم اسے ایک ایسے موزوں شخص کے حق میں استعمال کر رہے ہیں۔

رائے راؤ : جہاں پناہ کی قدر افزائی ہے۔ میری خدمت گزاری آخری دم تک جہاں پناہ کے قدموں میں سرنگوں رہے گی۔

محمد قلی : ہم اس تخت پر طاقت و جبروت کا پیکر ہیں ہمارا ہر حکم تعمیل طلب ہے۔ لیکن ہمیں آج یہ اعتراف کرنا ہے کہ ہم اپنی قدرتوں میں مجبور بھی ہیں۔ اس تخت نے ہم سے ایک وارث مانگا اور ایک شہ زادی حیات بخشی بیگم ہی سے ہماری آغوش گراں بار ہو سکی لیکن ہم مطمئن ہیں کیوں کہ قطب شاہوں سے ارادہ کا استقلال اور قطب شاہوں کے عمل کا جلال شہ زادی میں بہ درجہ اتم تخلیق پذیر ہوا ہے اور کسی دوسرے وجود کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا۔

رائے راؤ : جہاں پناہ کی نظر جوہر شناس ہے۔

محمد قلی : لیکن شاہی روایات کا احترام کرتے ہوئے ہم نے اپنی جانشینی کے لیے اپنے مرحوم بھائی محمد امین کے بیٹے شہ زادے سلطان مرزا کا انتخاب کیا ہے۔ شہ زادہ سلطان مرزا، شہ زادی حیات بخشی بیگم کا سرتاج اور گول کنڈے کا تاج دار ہوگا۔

ایک مصاحب : جہاں پناہ کا انتخاب لاجواب ہے۔

دوسرا مصاحب : گول کنڈے میں ایسا کوئی ہیرا نہیں جو شہزادہ سلطان مرزا کی ہم سری کر سکے۔

محمد قلی : شہ زادہ سلطان مرزا شاہی گلستان کا ایسا نونہال ہے جو سایہ دار بھی ہے اور ثمر بار بھی۔ شہ زادہ اس نوجوانی میں صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے اور ایسے عبادت گزار کے سجدوں کے لیے فرشتوں کے دامن فرش بنتے ہیں۔

مصاحبین : سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔

محمد قلی : اور ہمیں یقین ہے شہ زادہ خدا کے سایہ کی طرح اپنی رعایا کا نگہ بان ہوگا۔ رائے راؤ، تم شہ زادے کو کوئی نصیحت کرو۔

رائے راؤ : جہاں پناہ کا حکم سر آنکھوں پر۔ شہ زادے سنو، فرد واحد کا کردار اس کی ذاتی دیانت پر بنتا ہے لیکن جہاں رعایا کو ایک تنظیم کا پابند کرنا ہوتا ہے تنہا آرزو مندی کارگر نہیں ہوتی اس کے لیے مستعد اور فرض شناس کارندوں کو ساتھ کرنا چاہیے۔ اسی طرح جس طرح ہاتھ کسی چیز کو گرفت میں لینے کے لیے انگلیوں کو قربانی بنا دیتا ہے۔

محمد قلی : راجے راؤ کی باتیں حیران کن ہیں۔

راجے راؤ : جس کی زبان چلتی ہے وہ ان کے ہاتھ تلوار نہیں چلا سکتے۔ ایسے درباریوں کی سرگوشیوں کے لیے کان بند رکھے جائیں۔ جلد در بار سازشوں کا دنگل بن جاتا ہے۔ جس سلطنت کا بادشاہ بیدار ہو اس سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا۔

شہزادہ : میں ان نصیحتوں کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔

راجے راؤ : آخری بات۔ شاہی دستر خوان کے کھانوں کا لطف صرف اسی وقت چار ہوتا ہے۔ جب ہر جھونپڑی میں چولہا روشن ہو۔

محمد قلی : یہ بات ذہن نشین رہے۔

(ایک ضعیف مصاحب گر پڑتا ہے۔ سب خاموش رہتے ہیں۔ حیات بخشی ضعیف مصاحب کو سہارا دے کر اٹھاتی ہے۔)

ضعیف : شہزادی آپ کتنی دیالو ہیں۔۔۔ شکریہ! شکریہ۔۔

شہزادی : آپ اتنے ضعیف ہیں گھر کیوں نہیں بیٹھ رہتے۔

ضعیف : میں گھر میں رہ کر کیا کروں شہزادی۔

شہزادی : آرام کیجیے۔ جی نہ بہلے تو کتابیں پڑھیے۔

ضعیف : مجھے برابر دکھائی نہیں دیتا۔۔۔ شہزادی۔ پڑھوں تو کیوں کر۔

شہزادی : آپ کے ہاں بچے بچیاں نہیں ہیں؟

ضعیف : صرف ایک نواسی ہے۔ آپ ہی کی ہم سن ہوگی۔

شہزادی : تو اسی سے کہیے۔ وہ آپ کو پڑھ کر سنایا کرے۔

ضعیف : اسے پڑھنا نہیں آتا۔ گول کنڈے کی کسی بچی کو پڑھنا نہیں آتا۔ شہزادی۔

(شہزادی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتی ہے)

شہزادی : خدایا گول کنڈہ کی عورت جہالت کی کہر سے ڈھنکی ہوئی ہے۔ اس پر علم کا سورج بلند فرما۔ (تخت کی طرف پلٹ کر) جہاں پناہ ضعیفی پہاڑ کی برف پوش چوٹی ہے۔ اس کی عظمت کا احترام ہونا چاہیے۔ وہ جو دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں وہ ہی حسن سلوک کی آس رکھتے ہیں۔ وہ ایسے مہمان ہوتے ہیں جن کا سامان بندھ جاتا ہے۔ وہ دنیا کی خوش گوار یادیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں ان کو کس مپرسی کی موت کے حوالے نہ کیا جائے۔ میرے نزدیک نادار ضعیفوں کے لیے ایک آسائش مکان اس شاندار مقبرہ سے بہتر ہے جہاں کبوتر اور چمگادڑیں بسیرا کرتی ہیں۔

محمد قلی : راجے راؤ۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا قطب شاہوں نے یہ دستور کیوں بنا رکھا ہے کہ ہر نیا قطب شاہ اپنے پہلے فرمان کے ذریعہ اپنے مقبرے کی تعمیر کی منظوری صادر کرتا ہے۔

راجے راؤ : جہاں پناہ اس عمل در آمد میں یہ مصلحت پوشیدہ ہے کہ بادشاہ تخت پر بیٹھ کر تختے کو نہ بھولے اور ہر وقت اپنے آخری سفر کے لیے زاد راہ کا خیال رکھے۔

دو مصاحب : (بوڑھے درباری کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ شہزادی اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہے)

محمد قلی : شہزادی آپ کی تجویز عملی صورت اختیار کرے گی۔ ہم شرمندہ ہیں کہ گولکنڈہ کے بادشاہ ہیں ہندستان کے شہنشاہ نہیں ہیں۔ ہم اگر ہندستان کے شہنشاہ ہوتے، شہزادی کو ہماری طرف سے ہندستان ملتا اور ہندستان شہزادی کے شایان شان ہوتا۔

ہاں رائے راؤ۔ موسیٰ ندی کے کنارے ہم نے جس شہر کو آباد کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اس کا کیا ہوا۔

رائے راؤ : حضور منصوبے پر عمل درآمد شروع ہوچکا ہے۔

محمد قلی : کون کون سی عمارتیں مکمل ہوگئیں۔

رائے راؤ : حضور والا چندن محل، گگن محل مکمل ہوگیا اب چار مینار تکمیل کے قریب ہے۔ اس کا ایک نمونہ جہاں پناہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

(مصاحب چار مینار کا ماڈل لاتا ہے)

محمد قلی : واہ واہ بہت خوب صورت، بہت دل کش۔ رائے راؤ یہ عمارت کب تک تکمیل پاجائے گی؟

رائے راؤ : چودہ رمضان کو حضور کی سال گرہ کا دن ہے اس روز جہاں پناہ اس عمارت کی تکمیل کی خوش خبری سنیں گے۔

ایک مصاحب : جہاں پناہ۔ ملکہ، عالم کا خصوصی ہرکارہ ننکا شرفِ باریابی چاہتا ہے۔

محمد قلی : ننکا حاضر ہو۔ (ننکا ایک لحیم ڈراونا شخص آتا ہے)

ننکا : جہاں پناہ کا دبدبہ دوبالا۔ ملکہ عالم کا حکم ہوا ہے کہ جہاں پناہ کی خدمت میں یہ عرض کیا جائے کہ لوبان دلہن بن کر تیار بیٹھی ہے۔ قاضی صاحب بھی آگئے ہیں۔

محمد قلی : تو لوبان دلہن بن گئی۔

شہزادی : ابا حضور لوبان کی شادی اگر کسی چوہے سے ہوتی تو مزہ آتا۔

محمد قلی : ننکا ہماری طرف سے مبارک باد پہنچا دو۔

ننکا : جہاں پناہ۔ ملکہ، عالم کا حکم ہوا ہے کہ نفاست نواب کو دولہا بنا کر حاضر کیا جائے۔

محمد قلی : ہاں ہم بھول گئے۔ نفاست کہاں ہے؟

نفاست : جہاں۔۔۔ کہاں۔۔۔ پناہ۔۔۔ گر میں۔۔۔ کیوں؟ مجھے یہ شادی پسند نہیں۔۔۔ مجھے یہ شادی ہی پسند نہیں ہے۔ میں لوبان کو قبول نہیں کرتا۔ کسی کو بھی قبول نہیں کرتا۔

محمد قلی : نفاست ہم نے ملکہ سے وعدہ کیا ہے۔ تم کو لوبان سے شادی کرنی ہی ہوگی۔

نفاست : لیکن جہاں پناہ۔ میں کیوں کر۔۔۔ میں تو۔۔۔ جی ابھی تیار ہی نہیں ہوں۔

محمد قلی : شادی کے لیے تیار کون ہوتا ہے؟ یہ تو زبردستی کا پھندہ ہے۔

نفاست : اگر۔۔۔ مگر۔۔۔ چوں کہ۔۔۔ چنانچہ۔۔۔ چہ۔۔۔ چہ۔۔۔ چہ۔

ننکا : حضور دیر ہورہی ہے۔ قاضی کو کہیں اور جانا ہے وہ ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔

محمد قلی : آگے بڑھو ننکا۔ (ننکا آگے بڑھ کر نفاست کو اٹھا لیتا ہے اور جانے لگتا ہے)

نفاست : جہاں پناہ مجھے ہاتھی کے پاؤں سے بندھوا دیجیے۔ لیکن اس شادی سے بچا لیجیے۔ (چیختا ہے) میں نہیں کرتا شادی۔ نہیں نہیں۔ (ملکا نفاست کو اٹھائے چلا جاتا ہے) بچاؤ۔ بچاؤ۔

ooo

چھٹا سین

(حیدر محل بیٹھی سنگھار کر رہی ہے۔ ایک کنیز پھولوں کی ٹوکری لاکر رکھتی ہے۔ حیدر محل ٹوکری سے پھول نکالنے کے لیے اس میں ہاتھ ڈالتی ہے اسی لمحہ سانپ اسے ڈس لیتا ہے۔ اسی وقت محمد قلی داخل ہوتا ہے۔)

بھاگ متی : آئیے تشریف لائیے۔ میں آپ ہی کی منتظر تھی حضور۔ بڑے مناسب موقع پر جہاں پناہ کی تشریف آوری ہوئی۔

محمد قلی : آج ہم بہت اداس ہیں۔ نہ جانے کیوں ہمارا دل بے چین ہے۔ ہمیں ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے آج ہم پر قیامت ٹوٹنے والی ہے۔

بھاگ متی : حضور پر سے ہزار جان قربان ایسا نہ کہیے۔ رعایا کو ابھی آپ کے سائے کی ضرورت ہے۔

محمد قلی : ہوں۔ کوئی غزل سناؤ شاید اس سے ہمارے دل کو قرار آجائے۔

بھاگ متی : جو حکم میرے سرتاج۔ آج میں آپ ہی کی کہی ہوئی ایک غزل سناؤں گی۔ بھاگ متی پر بے ہوشی کا اثر ہونے لگتا ہے)

محمد قلی : ہم منتظر ہیں حیدر محل۔ (پیا باج پیالا پیا جائے نا)

o

(محمد قلی اداس بیٹھا ہے۔ کسی سوچ میں غرق ہے۔ پس منظر میں گھنگروں کی جھنکار)

محمد قلی : (چونک کر) کون! ۔۔۔ (اٹھ کر دور جاتا ہے۔ رک جاتا ہے) کوئی نہیں ہمارا ڈوبا ہوا سورج اب کبھی نہیں ابھرے گا۔ میرے اندھیرے اب کبھی صبحوں سے دوچار نہیں ہوں گے۔ کب تک میں ان اندھیروں میں یادوں کی شمعیں جلا۔ رکھوں۔ بجھی جارہی ہیں۔

(راسے راؤ افسردہ، سر جھکائے داخل ہوتا ہے)

راسے راؤ : (روانی آواز میں) جہاں پناہ لوبان۔

محمد قلی : ہم نے سنا ہے لوبان دلہن جل گئی۔ ہمیں اس کی تقدیر پہلے ہی آگ کی تحریر میں لکھی نظر آگئی تھی۔

راسے راؤ : جہاں پناہ۔ جلد، مردی میں اتنا سامان بھر گیا تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ اچانک چراغ بردار کے ہاتھ۔ چراغ گر گیا۔

محمد قلی : کیا تم وہاں موجود تھے؟

راسے راؤ : ملکہ عالم کا حکم تھا کہ میں ہی دلہن کو دولہا کے گھر پہنچاؤں۔

محمد قلی : پھر کیا ہوا ؟
رائے راؤ : مسہری کو آگ لگ گئی۔ جب آگ کے شعلوں نے لوبان کو گھیر لیا تو نفاست نواب اس کی طرف لپکے۔ لیکن لوبان نفاست نواب کو آگ سے دور رکھنے کے لیے مسہری سے کود پڑی۔ کودنے کودنے بھاگی پھری اور شعلوں میں لپٹی ہوئی پھر مسہری پر جا لیٹی اور پھر جہاں پناہ شعلوں کا ایک ستون اٹھا۔ ہر چیز جلنے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سہاگ کی سیج چتا بن گئی۔ ایسا تو ہونا ہی تھا ہے جہاں پناہ۔
محمد قلی : انتہا۔۔۔ انتہا۔۔۔ ایک دلہن کے لیے سیج کے پھول قبر کے پھول بنے اور خدا دیکھتا رہا۔ محبت کے چراغوں کو بجھانے والی اس زہریلی پھنکار کا گلا ہم گھونٹ دیتے، اگر ہم خدا ہوتے۔ رائے راؤ۔۔۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن آسمان جل نہیں اٹھا زمین پھٹ نہیں پڑی۔ یہ ہم ہی ہیں جو دنیا پر مرمٹتے ہیں کسی کو ہم سے کوئی سروکار نہیں۔ کوئی سروکار نہیں۔
رائے راؤ : جہاں پناہ۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے۔
محمد قلی : اب تم جاؤ لوبان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرو۔ جاؤ۔ (رائے راؤ چلا جاتا ہے) لوبان کا انجام ہمارے تصور پر اس طرح چھایا رہا ہے جیسے آگ کاغذ کو جلاتی چلی جائے۔ شراب۔ شراب۔ (ایک لڑکی شراب لاکر رکھتی ہے۔ محمد قلی پیالے کو دیکھتا ہے۔ پس منظر میں گھنگروؤں کی جھنکار) (محمد قلی چونک جاتا ہے) پیا باج پیالہ پیا جائے نا۔ غزل ہوتی ہے۔ حوراں سیاہ لباس میں داخل ہوتی ہے)۔
محمد قلی : کون ؟۔۔۔
حوراں : جہاں پناہ نے مجھے نہیں پہچانا ؟
محمد قلی : اب کسی پہچان کا چہرہ جوں کا توں نہیں رہا۔ سب چہرے مل جل کر مسخ ہو کر ایک بھیانک منظر کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اور یہ منظر سب کو ہڑپ کرتا چلا ہے۔ کہو، تم کون ہو ؟
حوراں : میں حوراں ہوں۔
محمد قلی : تم رحمت اللہ خاں کی بیوہ تو نہیں۔
حوراں : ہاں۔
محمد قلی : اتنی حسین۔۔۔ اتنی حسین۔۔۔ اور بیوہ۔۔۔ زندگی سے کوئی من مانا مذاق کرے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں۔ کس نے تمھیں یہ سیاہ کپڑے پہنائے ہیں ؟ کیا سیاہ لباس میں بیوگی سہل ہو سکتی ہے۔ تم نے پوچھا نہیں کسی سے۔
حوراں : یہ لباس میرا کفن ہے جہاں پناہ۔
محمد قلی : ہاں رحمت اللہ خاں کی جواں مرگی ایک اندوہ ناک سانحہ ہے۔
حوراں : رحمت اللہ خاں کی موت ایک اتفاق کا شاخسانہ ہے۔ برسوں پہلے جب آپ مرحوم سلطان کے ہاتھی پر سوار ہمارے گھر پر سے گزر رہے تھے۔ میں آپ کو دیکھ رہی تھی اور سلطان نے مجھے آپ کے لیے پسند کر لیا۔
محمد قلی : تم ہمیں دیکھ رہی تھیں۔۔۔ ابا حضور نے تم کو ہمارے لیے پسند کر لیا تھا۔
حوراں : جی ہاں میں نے آپ کو دیکھا۔۔۔ اور پھر میں نے کسی کو دیکھنا نہیں چاہا۔ لیکن میرے گھر والوں نے مجھے آپ

تک پہنچنے نہ دیا۔

محمد قلی : یہ سب کیا ہوا ہمیں کسی نے کچھ بتایا نہیں۔ ہمیں کچھ یاد آتا نہیں۔۔۔

حوراں : آپ ایک اڑتی ہوئی مینا پر تیر چلاتے ہوئے تھے اور میں یہ تمنا کرنے لگی کہ کاش وہ مینا میں ہوتی۔ محبت کے تیر اندھا دھند چلتے ہیں جہاں پناہ۔ کہاں آپ ایک شہزادے کہاں میں ایک غریب۔ لیکن تیر کو چلنا تھا چل گئے۔

محمد قلی : لیکن ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے تم ہمارے لیے اجنبی نہیں ہو۔ اجنبی نہیں ہو۔

حوراں : ایک دھڑکن کے دو دل اجنبی نہیں ہوتے جہاں پناہ۔

محمد قلی : حوراں۔ تم نے ہم تک پہنچنے میں بہت دیر کردی۔ اب بارش کے بادل، گرمیوں کی چاندنی، سردیوں کی دھوپ کچھ بھی ہماری زندگی میں نہیں۔ اب ہم پر موت کا موسم مسلط ہے اور یہ شراب اسی موسم کی بارش ہے۔

حوراں : شراب زندگی کو موت کے منہ سے بچتی ہے یہ زہر ہے جہاں پناہ۔

محمد قلی : اب ہمیں ہر وہ چیز پسند آتی ہے جس میں زہر کی آمیزش ہو۔ اس طرح ہم کسی کے انجام میں شریک ہوتے جاتے ہیں۔ کسی کے نزدیک پہنچتے جاتے ہیں۔

حوراں : زندگی بھی ایک بار۔ موت بھی ایک بار پھر موت سے پہلے موت کیوں۔ (حوراں آگے بڑھ کر جام پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ محمد قلی کا ہاتھ تھام کر اسٹیج کے کونے پر چلتی ہے) ذرا دیکھیے یہ روشن غبار کیسا ہے۔

محمد قلی : کس قدر خوب صورت ہے ہمارا شہر۔

حوراں : اس شہر کی بنیاد میں آپ کی محبت کا پھول جو مہک رہا ہے۔

محمد قلی : چاند تاروں کا ہمارا شہر۔ نگینوں کا ہمارا شہر۔ دیکھو۔ کوئی چراغ لیے ہماری طرف آرہا ہے۔

حوراں : کوئی چراغ ہے نہ کوئی آرہا ہے۔ آسمان سے ایک تارا ٹوٹا ہے اور ایک تارے کے ٹوٹنے سے آسمان نہیں گر پڑتا۔

محمد قلی : ٹھیک کہتی ہو۔ چار مینار کسی فرشتے کی طرح دعاؤں کے ہاتھ اٹھائے ہوئے اور اس کے کلس بشارتوں کی طرح روشن ہیں۔۔۔ حوراں۔۔۔ اس شہر نے ہمیں زندگی کے راستے پر کھینچ لیا۔ تم ہمارے ساتھ رہو۔ تم ہمارے ساتھ رہو۔ ہمارا اکیلا دل زندگی برداشت نہیں کرسکتا۔

حوراں : میں ٹوٹی ہوئی ڈالی سے لگا ہوا پھول ہوں۔

محمد قلی : یہ پھول ہمارے اجڑے ہوئے گلشن کی بہار بنے گا۔

حوراں : میں جس راستے پر ہوں۔ وہ منزل کو نہیں جاتا۔ میں سفر ختم کرچکی ہوں۔

محمد قلی : تمہاری ہماری منزل ایک ہے۔

حوراں : کیا ایک شکستہ کشتی کو ناخدا مل سکتا ہے۔

محمد قلی : ناخدا بھی اور ساحل بھی۔ لیکن تم کس کی آواز میں باتیں کرتی ہو۔ یہ تمہاری آواز، ایک جانی پہچانی آواز ہے۔

حوراں : یہ میری محبت کی آواز ہے۔

محمد قلی : تم ہمارے ٹوٹے ہوئے دل کی دھڑکن ہو۔ ادھر آؤ۔ (دونوں اسٹیج کے بیچ میں آتے ہیں) موسیٰ ندی کی ٹھنڈک،

سے لدے ہوئے ہوا کے جھونکے کس قدر راحت افزا ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے آب حیات کے گھونٹ حلق سے اترتے چلے آرہے ہیں۔۔۔ دیکھو۔۔۔ ہمارا شہر مستقبل کے خوابوں میں سو رہا ہے اور روشنیاں اس کی نگہبان ہیں۔ (محمد قلی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے) یا سمیع۔۔۔ ہمارے شہر کو انسانوں سے معمور کر۔ دریا میں مچھلی جس طرح۔ آسمان پر تارے جس طرح۔ یا سمیع۔ ہمارے شہر کے انسانوں کو محبت کا قرینہ دے۔ زندگی کا سلیقہ دے۔ یا سمیع۔ ہمارے شہر پر تیرے آسمانوں کی برکتوں کا نزول ہو۔ ہمارے شہر پر تیری زمین کی سخاوتوں کی ریل پیل ہو۔ یہاں خوشی کی فضائیں ہوں۔ خوش حالی کی بہاریں ہوں اور ایسا ہو کہ موسیٰ ندی کے دونوں کنارے سدا شاداب رہیں۔

حوراں : اے سننے والے۔ ایک بادشاہ تیری بارگاہ میں بھکاری۔ اس کی دعائیں سن لے۔

دونوں : سن یا سمیع۔۔۔ یا سمیع۔۔۔ یا سمیع۔

○●○

(سلسلہ ص ۷ سے)

مغل وقائع نویس قطب شاہی سلطان کی صحت اور اس کے خاندانی معاملات کے بارے میں بھی اطلاعات روانہ کرتا تھا۔ ۱۶ محرم ۱۰۷۳ھ م یکم ستمبر ۱۶۶۲ء کے روزنامچے میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ عبد اللہ قطب شاہ دانتوں کی تکلیف اور حلق کے درد میں مبتلا تھا۔ عارضی افاقہ کے بعد وہ پھر اسی عارضہ میں مبتلا ہوگیا ہے۔

وقائع مورخہ ۲۹ شوال ۱۰۷۲ھ م ۷ جون ۱۶۶۲ء میں یہ رپورٹ درج ہے کہ قطب الملک نے سید سلطان ولد سید وداج نجفی کو طلب کیا تھا۔ قطب الملک اس کے ساتھ اپنی لڑکی کا بیاہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ شادی اسی سال ۲۵ ذی الحجہ کو طے پائی ہے۔

حیدرآباد کر میں متعین وقائع نویس کے روانہ کردہ وقائع خاصی تعداد خاص تعداد میں موجود ہیں اس مختصر مضمون میں ان سب کاغذات کا تذکرہ اور تجزیہ ممکن نہیں۔ ان روزنامچوں کے علاوہ مغل ریکارڈز کے زمرے میں چند ایسے کاغذات بھی موجود ہیں جن سے قطب شاہی تاریخ کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اگر آندھرا پردیش سٹی آرکائیوز میں محفوظ ان مستند اور معتبر دستاویزات کا قطب شاہی تاریخ کے دیگر ماخذات سے تقابل کرتے ہوئے تجزیہ کیا جائے تو یقیناً قطب شاہی تاریخ کے چند نئے گوشے اجاگر ہوں گے۔

○●○

NARENDRA LUTHER

A MULTI – FACETED PRINCE

The founder of Hyderabad, Mohammed Quli Qutb Shah (b. 1565; d. 1611) was a prince, poet, lover and a builder. He ascended the throne in 1580 at the age of 15 and ruled for thirty-one years.

LOVER

As a young prince he fell in love with a Hindu maiden, Bhagmati by name. In 1591 he founded the new city 6 kilometers from Golconda across the river Musi and after his beloved, called it Bhagnagar. Its chronogrammatic title which yields the year of its completion, was *Farkhunda Buniyad* which in Persian means *'of fortunate foundation'* – the equivalent of the name Bhagnagar.

It was one of the first elaborately planned cities anywhere. The Sultan wanted it to be 'unparalleled in the world and a replica of heaven itself.' The inspiration for its architectural plans and layout was drawn from Iran – and in particular the then new city of Isfahan.

BUILDER

First of all, the Charminar was built as the city centre. Four roads were made to radiate from it in the four cardinal directions. Fourteen thousand shops, houses, inns, baths, schools and mosques were built as part of the original plan. Amongst the original public buildings was the Daru-ul-shifa or the general hospital. Some of the buildings including this hospital still stand today. However, none of the dozen-odd palaces, which were constructed by Mohammed Quli, has survived the ravages of the Mughal invasion and subsequent neglect. Some had as many as nine storeys. Aurangzeb, on his inspection of the city after the Mughal victory in 1687 was surprised to see such tall and magnificent structures.

The city had extensive gardens both within and without it and the names of some localities still carry the prefix or suffix of bagh (garden). The French traveller, Thevenot noted the garden-city character of Bhagnagar and wondered how the arches of mansions supported the weight of terrace – gardens. Tavernier, Barnier, Ferishta, Abbe Carre and other foreign visitors in the 17[th] century and subsequently sang paeans in praise of the city. Many believed that it was bigger and better that the Mughal cities of the day like Agra and Lahore !

Mohammed Quli was a great, if not a bigger builder than Shah Jahan the Mughal was. A recent study by a German architect has tried to prove with reference to the verses in the holy Quran that Mohammed Quli's injunction about the new city was not mere

figure of speech. The city was in fact laid on the pattern of the Garden of Eden in essential features.

POET

Mohammed Quli was a prolific and a versatile poet. He wrote nearly 1,00,00 lines of poetry in Persian and in every genre of what was later to be called Urdu.

Before him Dakhni poetry had been largely religious. Quli introduced th secular element into it. He talks of nature in its variegated aspects, seasons of the yea flowers, fruits, vegetables, gardens, social life, customs, and festivals. He sings of t pleasures of physical love with a rare candour and abandon. For him there is n difference between a Hindu and a Muslim:

Kufar reet kya hor Islam reeet
Har ek reet mein hai ishq ka raaz

(What is the heathen's creed - - and Muslim's.
Every practice is based on the secret of love.)

Further

Main n jamn kaba o but khana o maikhana koon
Dektha hoon par kahan diktha hai tuj mukh ka safa

(I don't knov the holy Kaaba, the idol's temple or the tavern,
I look everywhere but can't see a face as clear as yours)

On love he has some observations of universal truth:

Suno log meri prem ki kahani
Keh peela hai rang ashiqui ki nishani

(Listen folks to my tale of love,
A pale complexion signifies a lover)

FIGURES OF SPEECH

Quli often employs the devices of alliteration and onomatopoeia very effectivel Note the following:

Piya soon rat jagi hai so dikhti hai sudhan sarkhush
Madan sarkhush, sayan sarkhush, anjan sarkhush, nayan sarkhush

(Oh lady, you have kept the whole night awake with your lover.
Cupid is happy, so are the couch, the collyrium – and your eyes)

Dandana garje joban badal niman
Kangana jhankar minj sunno tum

(Youth thunders like a cloud,
Let's hear the jingle of bangles.)

Unfortunately, the rhythm and internal rhyme abounding in his poetry can't be ut across in translation adequately.

IINDI ELEMENT

Quli had a sound and extensive knowledge of the Hindi ragas. He mentions savari, Dhanashree, Gaur. Malahar, Kalyan, Basant and Ramkali in his poems. He eclares his preference for music in the following couplet:

Mere sang mil bajaati sankh gaati, Sankhara abhran
Sriraga jo gati istri to mujhko bhati hai

(She who plays the conch with me and sings Snakhrabhram,
The one who sings Sriraga - - that woman I like).

Quli's choice of subjects was unlimited.. He covered the entire range of life in its ariations. He idiom sprang from the soil and his language was the one spoken by the mmon people in their daily lives. He has been compared to Nazeer Akbar Abdai of gra (1740-1830) as a people's poet. But Nazeer was a plebian, whereas Quli was a uler.

IIS RANGE

Quli is a poet of sight and sound, of relish and savour, of fragrance and edolence, of spice and flavour, of sunrise and daylight, of rhyme and rhythm, of dance nd music – of the celebration of life. His poetry glorifies all phases of biological xistence. He rejoices in seasons of the year, the rhythmic succession of which makes e sum of our life-spring, monsoon, and winter, summer. He celebrates festivals, irthdays, weddings, New Year Days. On each topic, there is not one poem, but many, s life's cycle goes on, he reverts to each of these recurring events with renewed vigour. e doesn't get bored with life, because every aspect of it excites him. There is no essimism or cynicism in him. He in an extrovert whose reaction to events is always ositive. He gloats on being the favourite 'servant' of the Prophet and the Imams, which nade him a favourite of Fate, He glories in being a ruler and living a life of ease and ensuality. A pure sense of life pulsates through his writings.

MISCONCEPTION

Some people say that Mohhmmed Quli was also a poet in Telugu. No such laim has been substantiated. I have been able to find only three words of Telugu in his ntire anthology – "Em Mari em".

His invocation at the inauguration of the new city of Bhagnagar has become amous;

Mera shahar logan soon mamoor kar
Rakhya joon tun darya mein min Ya Sami

(O God, fill my city with people, as you have the river with fish)

Obviously this prayer was heard and the city now suffers from over-population. It has one the highest rates of growth in the country !

For his legendary love for Bhagmati and his rich and enchanting poetry, Mohammed Quli has won a permanent place in the hearts of the people of the city. An annual festival is held to commemorate him. Generations of singers have sung his poems. Amongst them the most popular is:

Piya baj pyala piya jai na; piya baj ik til jiya jai na
Kate hain piya bin saburi karo; kaha jai amma kiya jai na
Nahi ishq jis woh bada koodh hai; kadhin us say mil baisya jai na
Qutb shah na do mujh divane ko pand; kiwane ko kuch pand diya jai na.

(Without the lover one cannot drink the cup !
Without him one cannot live for a moment.
They counsel patience in the absence of lover.
Ah ! It is easier said than done.
One unacquainted with love is a half-wit !
Don't ever have anything to do with him.
Don't give any advice to a lunatic like me
You can't din sense into an insane person).

Mohammed Quli is regarded as the first Urdu poet with an anthology to his credit. Dr. Zore edited his anthology for the first time in 1940. Professor Syeda Jaffar brought out a more extensive volume in 1985. Such is the liberal use of Hindi expressions and idiom in his works that, but for the script, he might even be considered a poet of Hindi.

No wonder that of all the rulers of the Deccan, no one is remembered more fondly than this versatile man. He is commemorated every year on a befittingly grand scale.

00 000 00

Dr. N. VNEKATA RAMANAYYA

THE QUTB SHAHIS

The Qutb Shahi Sultans of Golkonda were the most enlightened of the Muslim rulers that ever held sway in any part of India. Sultan Quli Qutb Shah, the founder of the dynasty was a remarkable monarch. He was a great warrier and a statesman. Though he carved out his kingdom at the point of sword, he built it on such secure foundations that it flourished vigorously for well-nigh two centuries until it was forcibly overthrown by a power far mightier that itself. Sultan Quli was a foreign Musalman who came, like the host of adventurers from Arabia, Iraq, Iran and Central Asia that flocked to the court of the Bahmany Sultans, in search of careers and fortune.

Early in his career as the Governor of Telangana under the Bahmanys he discovered that force alone was not sufficient to establish his authority securely over a people, the vast majority of whom happend to be Hindus. He found that it was necessary to win their hearts and make his rule agreeable to them. When he became the master of an independent kingdom, he made it the main object of his policy to treat his Hindu subjects with kindness and consideration and make them forget as far as possible that he was an alien both in race and religion. The policy which he adopted in his relations with his Hindu subjects was based on two fundamental principles, viz., tolerance in religious matters and lack of discrimination in the exercise of political rights. While adhering scrupulously to the principles of the policy laid down by him, his successors went a step further and extended their patronage actively to Andhra culture, specially literature and music, so that their memory is still cherished by the Andhras with gratitude and love.

When we speak of the religious tolerance of the Qutb Shahi Kings, the fact that they were devout Mussalmans of the Shia persuasion must not be lost sight of. They did not tolerate the practice of Hinduism in their dominions on account of their belief that it was like Islam another path leading to the spiritual world, but that it was expedient to allow a large measure freedom to the Hindus, who formed the bulk of the people subject to their rule, so that they might establish their power on firm and lasting foundations. This fact perhaps explains why they condoned the acts of intolerance perpetrated occasionally by some of their over-zealous subordinates.

The Qutb Shahis seem to have drawn a line of distinction between their territories and those under the rule of the Hindu Kings. Whereas they scrupulously followed the policy of religious toleration in their own dominions they did not show any hesitation in plundering and destroying the Hindu temples in the territories of Hindu monarchs with whom they were at war. It is interesting to note that some of the Hindu officers in the service of the Qutb Shahi Sultans actually engineered the spoliation of the temples of their own faith in certain places. An instance of this kind is recorded by the author of the Tarikh-i-Mohammed Quli Qutb Shah. Murhari Rao, a Mahratta Brahman,

who was in every respect the second person in the state during the time of Ibrahim Qutb Shah, led an expedition against Vijayanagar Kingdom in A.D. 1579, when he attacked and plundered the rich temple of the God Narasimha at Ahobalam. This 'unprincipled infidel', declares the author of the Tarikh, proceeded with a force towards a famous temple near Adony (a mistake for Ahobalam), where he attacked the inhabitants, laid waste the country, and sacked it of its idols made of gold and silver and studded with rubies. At the sight of these idols, the king, i.e., Ibrahim Qutb Shah was taken seriously ill and never recovered. This is corroborated by the evidence of an inscription of Sriranga I dated A D 1584 at Ahobalam and the Kaifiyat of Peda-Pasupula both of which refer to the attack of the temple in A D 1578 – 9 by Malik Vibhuram, that is, Ibrahim Qutb Shah with the help of Hindu Chiefs who went over to his side. Similar acts of the destruction of temple by the Qutb Shahi armies at Udayagiri and other places in the coastal region during the reign of Abdulllah Qutb Shah are referred to in the inscriptions. It is also on record that when Mirjumla Muhammed Sayeed, the Cammander-in-Chief of Sultan Abdullah Qutb Shah, conquered Gandikota in A D 1657, he collected a large number of bronze and copper images from the temples in various places in the neighbourhood and caused them to be melted in order to manufacture cannon with the metal. It may be remembered that these instances of the destruction of temples and melting of the images of the deities took place at a time when the Qutb Shahi dominions did not extend far beyond the Krishna. When, however, the coastal region and the Rayalasima were finally subdued, and the whole of the Andhra Country came under their rule, the sporadic manifestations of the spirit of intolerance ceased completely and no attempt was afterwards made to hinder the observance of the Hindu religious practices at any place in their dominons.

The Qutb Shahi Sultans did not exclude any section of their subjects from employment under the state on the score of their race or religion. The nobility of the Kingdom which exercised considerable influence on the government of the country was largely made up of the Naikwaris or the hereditory Hindu Zamindars. They formed an important part of the Qutb Shahi army and held positions of trust and responsibility. As the Mussalmans showed little or no inclination to join the civil service it was manned more or less exclusively by the Hindus. From the humble clerkship in a provincial dafter to the highest ministership of the state there was no post too low for them disregarded or too high to aspire after. The instances of Jagdev Rao under Jemshid, Murhari Rao alias Raya Rao under Ibrahim Qutb Shah and Akkanna and Madanna under Abul Hasan Tana Shah show how Hindus of talent and ability could under the enlightened rule of the Qutb Shahi monarchs rise to and worthily occupy the highest positions in the State.

What really keeps the memory of the Qutb Shahi Sultans still green in the minds of the Andhras is not so much their enlightened policy regarding religion and political rights as the patronage which they extended to the indigenous letters and art. (The first two Sultans of the dynasty do not appear to have evinced any interest in the cultural advancement of their subjects.) Ibrahim Qutb Shah or Malikibharam or Vibhuram as his Hindu subjects loved to call him was the first prince of his family to display his fondness for Telugu. It is said that during the period of exile at Vijayanagar before his accessin to the throne he was profoundly influenced by the literary and cultural movements that were in vogue there at the time and acquired a genuine taste for Telugu poetry and literature.

On his return to Golkonda and accession to the throne, he gathered around him poets and men of letters, held frequently the durbars of the learned and presided over them like the Rayas of Vijayanagar and other Hindu potentates of the Telugu country. He would invite to his court poets who were under the patronage of the neighbouring Princes and Zamindars, command them to compose poetry and reward them according to their merits. Golkonda, his capital, became as a consequence a great seat of Telugu learning to which flocked poets and scholars eager to impress Malkibharam with their poetic genius and erudition and obtain rewards from him. He was lavish in his gifts, no one who went to his court returned unsatisfied or discontented. Some of the Chatu verses composed by his contemporaries praising his munificence, though couched in exaggerated language, give us an idea of the eminent position which Malkibharam occupied in the learned world of his day.

A poet who was stricken with grief on hearing of the death of Malkibharam composed a verse addressing Vidhahta (the Creator), in which he gives expression to his sorrow as follows: Sirrah, Vidhata, maker of mischief, come here and listen. Is it worth of you to kill King Malkibharam instead of the miserly princes? Now that you have killed him whose wealth is the shining fame and who is the abode of good qualities, what is to be the fate of the Arthis? Can you, even if you try, create another King like him, on earth again.

Two great PRABANDHAS the TAPATISAMVARANAM of Addanki Gangadhara and the YAYATI CHARITRAM of Ponnikanti Telaganarya were produced at his court. The former was dedicated to Malkibharam himself and the later to Amin Khan, one of the nobles of his court, who like his master, had acquired a taste for Telugu poetry. Both these Kavyas are best of their kind in Telugu literature and the later became the model for ACCHA TELUGU comoposition in later ages. The interest of Malkibharam in Telugu was so great that he made all his sons learn the language. Because of the patronage which the Sultan and, following his example, some of the important Muslim noblemen extended to Telugu, it became popular, and the ability to converse and write in the language was regarded as a mark of culture and enlightenment. Malkibharam was a great patron of literature and art, and takes rank with Rajarajanarendra, Manumasiddhi, Prolaya Vema, Sarvajna Singabhupala, Krishnadevaraya and Raghunatha Nayaka of Tanjore who are permanently enshrined in the hearts of the Andhara people.

Telugu perhaps lost its place of prominence at the Qutub Shahi court after the death of Ibrahim Qutb Shah. His son and successor Muhammed Quli Qutb Shah was no doubt well versed in Telugu; he like his father, was fond of the company of Telugu poets and scholars. The famous poet Sarangu Tammaya, the author of the celebrated love poem VAIJAYANTI VILASAM, proudly states that he was privileged to enjoy the friendship of the Sultan who would summon him ever now and then to the palace to converse with him. It is even said that Muhammed Quli even composed verses in Telugu, though unfortunately no specimen of it has come down to posterity. The main interest of the Sultan, however, lay elsewhere. He was fond of Persian and of Urdu, his mother tongue. As the latter, which was just then taking [illegible] own, he made the main aim of his life [illegible] the vehicle of his thought. He was the first Urdu poet who collected his works in to a

Diwan, and the interest which he displayed in the language gave an impetus to it development.

Sultan Muhammed Quli believed that the prosperity of his kingdom depended o the union of the Hindus and Muslims, the two great communities to which the peopl inhabiting his kingdom belonged. This is symbolished by the love which he bore towar his Hindu mistress Bhagmati. He was a great lover, and his love for the beautiful Hind courtesan surpassed that of Baz Bahadur for the lovely Rupmati. He was more fortunat than his Afghan parallel as his love saga had a happier denouement than that of th unlucky Malwese monarch. We learn from Ferishta that Muhammed Quli Qutb Sha became enamoured of a public singer of the name Bhagmati to whom he assigned on thousand cavalry as an escort for her attendance; and as the air of Golkonda had becom impure and unhealthy. he built a magnificent city at the distance of eight miles which h called Bhagnagar after his favourite mistress: but this city has since received the name o Hyderabad. although one part of it still retains the name of Bhagnagar. Some moder scholars who interpert our history in accordance with their political views deny th authenticity of Bhagamati: This, however, is no idle tale: for in the Telugu RAY VACHAKAM which was written in the closing decades of the 16th century the capital o the Qutb Shah is invariably spoken of as Bhagnagar.

Sultan Muhammed Qutb Shah. nephew of Muhammed Quli Qutb Shah. wh succeeded him on the throne was a shadowy monarch. who left nothing by which he ma be remembered. Though Abdullah Qutb Shah. his son and successor. was not mor vigorous than his father his long reign of forty six years saw the occurance of sever important events. Though in his struggle with the Moghuls he was worsted and lo much power and prestige. he effected the conquest of coastal districts of the Vijayanagar empire so that his kingdom extended as far as Gonjeevaram in the south and Gutti in th west. He had the unique distinction of bringing the whole of the Andhra Country unde the shadow of his umbrella. Abdullah Qutb Shah. like all his predecessors. was cultured monarch.

Like his grandfather Muhammed Quli Qutb Shah he was a poet of considerabl merit: he wrote Urdu verses himself and extended his patronage to several distinguishe poets and scholars. His reign is regarded by some as the Golden age of Urdu poetr Abdullah Qutb Shah was a lover of music. he used to invite to his court distinguishe musicians from various places in the country, preside over the entertainments in whic they exhibited their musical talents and distributed rewards among them according their merit. On one occasion the famous VAGGEYAKARA KSHETRAYA visited hi court, defeated the musicians in the Sultan's service, composed padas praising him an obtained from him a large sum of money as reward. Abdullah Qutb Shah was a broa minded Sultan. In the treatment of his Hindu subjects he surpassed all his predecessor. A unique inscription of the King still stands in one of the villages on the banks of th Krishna recording the gift of the entire village to a Brahman Vedic scholar to enable hin to perform sacrifices and teach Vedas and Sastras to his students. This inscriptio proclaims in unmistakable terms the broad-minded toleration of the Sultan which mus have endeared him to the large majority of his subjects.

Abul Hasan Tana Shah, the last of the Qutb Shahis, was a remarkable monarch. Though writers, dependent on the Moghal court, paint him in dark colours, he was undoubtedly a person of great moral courage and lofty character. In the Government of the Kingdom he scrupulously adhered to the policy laid down by his predecessors. Like them he treated the Hindus with kindness and consideration. He had so much faith in their loyalty that he entrusted the administration of the kingdom to Akkanna and Madanna-two prominent Hindus in his service, a fact which excited the indignation of the Moghal emperor Aurangzeb. It is interesting to note that Telugu and Sanskrit were studied by Muslims. Some of them like Shah Akbar, son of Shah Raju, spiritual preceptor of the Sultan, translated a Telugu work on the Alankara Sastra called Sringara Manjari by the poet Rangasayi into Sanskrit. Hindus of the period adopted the dress and manners of the Muslims and studied Arabic, Persian and Urdu so that they might not be at a disadvantage in their intercourse with the latter.

In discribing the attitude of Tana Shah towards the Hindus, it is necessary to refer to the treatment meted out by the Sultan to the Hindu Saint Ramdas who was devoted to the worship of the God Sri Rama Chandra at Bhadrachalam. Some modern scholars attribute it to the religious intolrance of the Sultan. This is far from the truth. Kancherla Gopanna, who was a devotee of Rama, was appointed by the Sultan as the Tahsildar of Bhadrachalam. He collected the revenue of the district, and instead of remitting it to the royal treasury, spent the amount in reparing Rama's temple, providing the images of the deities with costly jewels. As he misappropriated the Government money, he was prosecuted and was thrown into the prison, according the rules followed by the Sultan's government in such cases. When the money was paid to the Sultan by Rama and Lakshmana who came to the Sultan disguised as the servants of the imprisoned saint Ramdas was at once released from prison and allowed to resume the worship of the God at Bhadrachalam as before. In the whole extent of Ramadas Charitra which deals with this subject nowhere do we come across a syllable suggestive of religious intolerance. Tana Shah, on the countrary, is regarded as a saint who was born as a Mussalman on account of a trivial fault committed in his previous birth. He is still respected by the Andhras throughout the country as a saintly monarch. There is, therefore, no justification for the view that he persecuted Ramdas onaccount of his spirit of intolerance.

The foregoing account of the policy of the Qutb Shahi Sultans, though brief is enough to show how enlightened they were. They anticipated the great Moghal emperor Akbar, and persisted in adhering to the system of government which was based on wisdom and sound common sense notwithstanding the frowns of Akbar's successors who reversed his policy. Although their kingdom perished like that of the Moghals which swallowed it their memory lives in the minds of Andhras as a line of noble monarchs who ruled at one time their country and fostered with diligence and care their culture.

oo ooo oo

رپورٹ

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

(اکتوبر - دسمبر ۱۹۹۸ء)

قومی اردو کونسل کا سالانہ اجلاس:

۲۹/ اکتوبر کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی میٹنگ شاستری بھون کے کانفرنس روم میں منعقد ہوئی۔ میٹنگ کی صدارت مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی نے کی۔ ڈاکٹر جوشی نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس اردو کونسل نے قلیل مدت میں نہ صرف اردو دنیا بلکہ ملک کے تعلیمی حلقوں میں بھی اپنی شناخت قائم کرلی ہے جس کے لیے کونسل مبارک باد کی حق دار ہے۔ ایجنڈے پر بحث کے دوران مندرجہ ذیل نکات سامنے آئے۔

۱۔ ہندوستانی زبان کی ترویج: قومی اردو کونسل کا اہم منصوبہ یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیادوں کو ہندوستان کے تہذیبی پس منظر میں بازیافت کرکے اس کو ملک کے متنوع لسانی پس منظر میں ترقی دی جائے۔ اس سلسلے میں اکیسویں صدی میں فروغ اردو کے لیے کونسل نے جو منصوبہ تیار کیا ہے اس کی منظوری دی گئی۔

بہترین اردو ادب کی طرف توجہ دلانے کے لیے ماہی اور ۲ ماہی رسالے شائع کیے جائیں۔ کچھ اہم کتابوں کی تلخیص بھی شائع کی جائے جو ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی شائع کی جانی چاہیے تاکہ اردو کا یہ ادب قارئین کے وسیع حلقوں تک پہنچ سکے۔ کونسل کے اشاعتی پروگرام کی ستائش کرتے ہوئے ممبران نے مشورہ دیا کہ عالمی زبانوں میں کلاسیکی ادب کے جو ترجمے پائے جاتے ہیں انھیں اردو میں بھی منتقل کیا جائے اور گیان پیٹھ انعام پانے والے فنکاروں کے شاہکار اردو میں شائع کیے جائیں۔

۲۔ اردو میڈیم تعلیمی نظام کا استحکام: اردو زبان کے فروغ کے لیے اردو میڈیم تعلیم کا استحکام اولین شرط ہے۔ اردو میڈیم کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اس میڈیم کو قومی معیار اور قومی مقاصد سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اس لیے کونسل نے موجودہ نصابی کتابوں کا اکیڈمک آڈٹ (Academic Audit) شروع کیا ہے۔ معیاری نصابی کتب، معاون تعلیمی مواد، اساتذہ کی تربیت یہ وہ بنیادی (Inputs) ہیں جو کسی بھی میڈیم کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔ ممبران نے اس ضمن میں کونسل کے عالمی نظام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اردو میڈیم اساتذہ کی تربیت کے لیے مناسب پروگرام تشکیل دیے جائیں اور کونسل کی مالی معاونت کی اسکیموں کو نئے سرے سے استوار کیا جائے تاکہ یہ معاونت سرکاری، نیم سرکاری اور رضاکارانہ تعلیمی اداروں کا احاطہ کرسکے۔

[illegible] جاری تعلیم کی توسیع کو کونسل نے اولین مقصد قرار دیا ہے اور اردو تعلیم کے دائرے کو وسیع بنانے کے لیے مراسلاتی کورس [illegible] کیے گئے ہیں تمام ڈگریوں اور ڈپلوما کی معیار بندی کرنے کے سلسلے میں اہتمام کرتے ہوئے مختلف اداروں سے

دیئے جاتے ہیں۔

۳ ۔ ریاستی اردو اکادمیوں سے تال میل : ریاستی حکومتوں ، اردو اکادمیوں اور اداروں میں زیادہ سے زیادہ تال میل اور ان رابطوں کو بامعنی بنانے کی غرض سے ہی کونسل کے لیے نوڈل ایجنسی کا رول تفویض کیا گیا ہے ۔ ممبران کا خیال ہے کہ کونسل کو اردو کی ترویج کے سلسلے میں اٹھائے جارہے اقدام کے لیے نئے Monitory Mechanism وضع کرنے چاہیے

۴ ۔ ۲۰ / اکتوبر کو ایگزیکیٹیو بورڈ کی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کی ۔ اس میٹنگ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد ، پروفیسر سید سیدین ، پروفیسر سید منظور احمد کے علاوہ منسٹری کے نمائندے سے سنگھ ، ڈائرکٹر (لینگویجز) اور جناب ٹی ۔ آر ۔ پرساد (فائننس آفیسر) نے شرکت فرمائی ۔ اس میٹنگ میں کچھ اہم فیصلے کیے ۔ ایک سالہ کورس "Diploma in Computer Application and DTP (Urdu)" کی منظوری دی گئی جس کے تحت ملک کے مختلف ریاستوں میں تیس کمپیوٹر سینٹرس کھولے جائیں گے ۔ امید یہ کی جاتی ہے کہ یہ کورس روزگار کے نئے مواقع فراہم کرے گا اس کے علاوہ دو سالہ ڈپلومہ " Calligrahpy and Graphic Design" کی منظوری بھی دی گئی اس ڈپلومہ کورس کے نصاب کو جدید خطوط پر منظم کیا جارہا ہے اور نصاب میں روایتی کتابت اور خطاطی کے ساتھ جدید مضامین گرافک ڈیزائن اور کمرشیل آرٹ کی تربیت دی جائے گی ۔ اس کورس سے نہ صرف اردو خطاطی کو تحفظ ملے گا بلکہ روزگار کے باوقار ذرائع پیدا ہوں گے ۔

جامع اردو انسائیکلو پیڈیا :

قومی اردو کونسل مختصر نوشتوں پر مشتمل جامع اردو انسائیکلو پیڈیا تیار کررہی ہے ۔ کلیدی مضامین پر مبنی علیحدہ حیثیت سے اردو انسائیکلو پیڈیا تین جلدوں میں شائع ہوچکی ہے ۔ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا پروفیسر فضل الرحمن کی ادارت میں کافی پہلے تیار ہوا تھا ۔ کونسل یہ محسوس کرتی ہے کہ اس میں مزید ترمیم و اضافے کی گنجائش ہے ۔ ان ہی اغراض و مقاصد کے تحت انسائیکلوپیڈیا کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے صدر نشین جناب شمس الرحمن فاروقی ہیں ۔ ۱۸ / ستمبر ۲۰ ۔ ۲۱ اکتوبر ۵ ۔ ۶ / نومبر اور ۱۳ ۔ ۱۴ / دسمبر کو کمیٹی کی نشستوں میں مختصر نوشتوں پر نظرِ ثانی کی گئی ۔

ریاستی اردو اکادمیوں سے رابطے :

۲۳ / نومبر کو ریاستی اردو اکادمیوں کی رابطہ کمیٹی اور اکیڈیمک پینل کی مشترکہ میٹنگ جناب کشمیری لال ذاکر کی صدارت میں کونسل کے کمیٹی روم میں ہوئی اس میں شامل ہونے والے حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں ۔

جناب رضوان احمد (بہار اردو اکادمی ، پٹنہ) ، پروفیسر وارث علوی (گجرات اردو ساہتیہ اکادمی) ، پروفیسر صبا شکیل (کرناٹک اردو اکادمی ، بنگلور) ، ڈاکٹر شمیم رضوی (اترپردیش اردو اکادمی ، لکھنؤ) ، جناب ایم ۔ اے ۔ اندرابی (کشمیر کلچرل اکادمی) ، جناب یامین فاروقی (مہاراشٹرا ریاستی اردو اکادمی ، ممبئی) ، جناب حامد اے ۔ سیفی (کرناٹک اردو اکادمی بنگلور) ۔

بحث کی ابتدا کرتے ہوئے ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے میٹنگ کی نوعیت ، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جب لسانی بنیاد پر ۱۹۵۶ میں ریاستوں کی تشکیلِ جدید عمل میں آئی تو اردو کو براہِ راست کسی ریاست میں سرکاری زبان کی

ں پائی لیکن اسے ریاستوں میں سرکاری سرپرستی سے محروم ہونا پڑا ۔ حکومت ہند کی جانب سے ۱۹۴۸ میں ریاستی زبانوں کے کے لیے منصوبے بنائے گئے ۔ لیکن اردو کسی ریاست کی زبان نہیں تھی اس لیے مرکزی حکومت کی جانب سے اردو کے فروغ ـ توجہ بڑھی اور ۱۹۷۲ء میں اندر کمار گجرال کی نگرانی میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے حکومت ہند کو ۱۹۷۵ء میں اپنی رپورٹ اور کے فروغ کے لیے مرتب شدہ لائحہ عمل پیش کیا جس کے بعد مرکز میں اردو زبان کے فروغ کے لیے ترقی اردو بورڈ اور مختلف ں میں اردو اکادمیاں قائم ہوئیں جن کے اغراض و مقاصد کم و بیش یکساں تھے ۔ قومی اردو کونسل جو اب ایک مختار ادارہ ہے ، روع ہی سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ریاست میں اگر اکادمیاں اردو کے فروغ کے لئے مثبت رول ادا کرتی ہیں تو اس دو زبان کو عوام سے قریب کرنے میں آسانی ہوگی ۔ قومی اردو کونسل اور ریاستی اکادمیوں کے مابین رشتوں کو مزید استوار اور رنے کے لیے اکادمیوں کے فیصلہ جاتی Bodies میں NCPUL کی شمولیت کو یقینی بنائے جانے کی سفارش کی گئی ۔

میٹنگ میں جو فیصلے لیے گئے وہ درج ذیل ہیں :

بھارت سیریز کے حوالے سے تمام اکادمیوں کو " اردو زبان و ادب کا ارتقاء ۔ آزادی کے بعد " ۳۱ / مارچ تک دو روزہ پ کا انعقاد کرنا ہے ۔ ورکشاپ میں ۳۱ / دسمبر ۱۹۹۰ء تک کی صورت حال (بھارت سیریز) کا جائزہ لیا جائے گا ۔

دوسرے پروجیکٹ " اردو زبان اور مقامی زبانوں کا ارتباط " کے سلسلے میں ماہرینِ لسانیات پر مشتمل کمیٹی کو اکادمیاں دیں گی ۔

اردو اساتذہ (جز وقتی) کے لیے اردو اکادمیوں کو کونسل تعاون دینے پر غور کرے گی ۔

۱۵ / اکتوبر ۱۹۹۸ء کو دن میں تین بجے قومی اردو کونسل کے کمیٹی روم میں ریاستوں کی اردو اکادمیوں سے شائع ہونے والے کے مدیروں کی ایک میٹنگ ہوئی ۔

۳۰ / مئی ۱۹۹۸ میں منعقد ہونے والی اردو اکادمیوں کی رابطہ کمیٹی نے اس بات پر اتفاق رائے کیا تھا کہ اکادمیوں سے نے والے جرائد میں اردو کے بنیادی مسائل سے متعلق خبروں کو ترجیح دی جائے ۔ شعر و ادب کے علاوہ اردو زبان کی ترویج و زبان کے مسائل کے سلسلے میں وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل پیدا کرکے ایک مشترکہ حکمتِ عملی اختیار کی جائے ۔ اس میں ذیل مدیران نے شرکت کی ۔ جناب محمود بن سالم (آندھرا پردیش اردو اکادمی) ، جناب مسعود علی (دلی اردو اکادمی) ، شمس تبریزی (ہریانہ اردو اکادمی) ، جناب ایم ۔ اے اندرابی (جموں و کشمیر کلچرل اکادمی) ، جناب عبدالغفار شکیل ل اردو اکادمی) ، جناب وقیع احمد (مدھیہ پردیش اردو اکادمی) ، جناب احسن قدوائی (اترپردیش اردو اکادمی) ، جناب لد (مغربی بنگال اردو اکادمی) ۔

کونسل کا مدعا یہ ہے کہ اردو میڈیم میں بنیادی تعلیم کے لیے ریاستی اکادمیوں کو مشاورتی حیثیت دی جائے اس لیے ں سے شائع ہونے والے جرائد میں ادبی و تہذیبی مسائل کے علاوہ تعلیمی مسائل کو بھی جگہ ملنی چاہیے ۔ قومی اردو کونسل کی اں ریاستی اکادمیوں کے جرائد میں اردو اکادمیوں کی کارگزاریاں " اردو دنیا " میں شائع ہوں ۔ مضامین کے لیے معاوضے کی رقم نی چاہیے تاکہ شرح میں یکسانیت ہو ۔ اکادمیوں سے شائع ہونے والے جرائد کی سرکولیشن میں قومی اردو کونسل ہر طرح کا ے ۔

فائنانس کمیٹی کا اجلاس

۱۸ اکتوبر کو فائنانس کمیٹی کی میٹنگ کی صدارت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر قومی اردو کونسل نے کی۔ اس میں جناب منصور احمد، جناب احمد سعید ملیح آبادی کے علاوہ منسٹری کے نمائندوں مسز سے سنگھ (ڈائرکٹر لینگویجز) مسٹر بی۔ آر۔ پرساد، فائنانس آفیسر (ایل III) اور مسٹر ایس۔ ایس۔ صدانت (فائنانس آفیسر، IFD) نے بھی شرکت کی۔ میٹنگ میں ۹۹-۱۹۹۸ء کے Revised Budget کے علاوہ نئے مالی سال ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کا بجٹ بھی زیر بحث آیا اور دونوں بجٹ اتفاق رائے سے منظور کر لیے گئے اس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ کونسل کو اپنا کیمپس بنانے کے لیے زمین کے لیے حکومتِ ہند سرمایہ مہیا کرے گی۔

اردو اور علاقائی زبانوں کا ارتباط:

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں ۹ نومبر کو پروگرام کمیٹی کی ایک میٹنگ ہوئی اس میں ممبران کمیٹی کے علاوہ پروفیسر ٹی۔ آر۔ مجیب عالم، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر انویتا ابی، پروفیسر آر۔ ایس۔ گپتا، ڈاکٹر امتیاز حسین، ڈاکٹر عائشہ قدوائی، ڈاکٹر شیبا رضوی کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

پروگرام کمیٹی نے ایک اہم فیصلے میں قومی اردو کونسل کے پروجیکٹ بعنوان "اردو کا دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ ارتباط" کی منظوری دی۔ ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے کمیٹی کو مطلع کیا کہ اس پروجیکٹ پر اسٹینڈنگ کونسل کی میٹنگ میں اتفاق رائے تھا کہ پروفیسر انویتا ابی چونکہ ICSSR کے تعاون سے "ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اردو کی رابطے کی زبان کی حیثیت سے کس حد تک مقبول ہے" کے عنوان سے تحقیق کر رہی ہیں ان سے یہ گزارش بھی کی جائے کہ وہ کونسل کے مذکورہ پروجیکٹ کو Co-ordinate کریں۔ اس پروجیکٹ کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر بھٹ نے کہا کہ اس مطالعے کے نتائج کے ذریعے ہمیں پتا چل سکے گا کہ مختلف لسانی ماحول میں اردو کس طرح پروان چڑھ رہی ہے۔ یہ پروجیکٹ Socio-linguistic سروے کی بنیاد پر اہم معلومات بھی فراہم کرے گا جس سے مستقبل میں فروغِ اردو کے لیے مؤثر لائحہ عمل مرتب کیا جاسکے گا۔ اس سلسلے میں ایک Monitoring Committee بنائی جائے گی۔

اس میٹنگ میں جو تجاویز منظور ہوئیں وہ اس طرح ہیں:

اردو کے ساشا مرکز کو پونا کی بی۔ ڈی۔ اے۔ سی کے تعاون سے زیادہ کارآمد بنایا جائے۔ کمپیوٹر گرافکس میں دو سال کا ڈپلومہ کورس شروع کیا جائے۔ حیدرآباد، پونا اور دہلی میں نصاب کی کتابوں کے پروجیکٹ شروع کیے جائیں۔ الہ آباد میں فراق گورکھپوری پر قومی سمینار منعقد کیا جائے۔

پروگرام کمیٹی نے پروفیسر صباح الدین دہلوی کی تجویز کا مطالعہ کرنے کے لیے پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا نام اس مقصد سے تجویز کیا ہے کہ وہ اس امر کا مطالعہ کریں کہ غالب فیلوشپ نہرو فیلوشپ کے طرز پر Institute کی جائے۔

پروگرام کمیٹی کے ممبران جو اس نشست میں شامل تھے۔ یہ ہیں: پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر خلیق انجم، محترمہ جیلانی بانو، پروفیسر محمد زماں آزردہ، محترمہ مجید حکم حکمی، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، جناب راجندر ملہوترہ، پروفیسر سید مقصود

یاد عامہ مسب دری ، حیدرآباد۔

، جناب مجتبیٰ حسین ، پروفیسر ابوالکلام قاسمی۔

نئی نصابی کتابیں:

۳۰ / نومبر کو این ۔ سی ۔ ای ۔ آر ۔ ٹی کی نصاب کی کتابیں اور معاون کتب کے سلسلے میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی صدارت میں ورکشاپ کا انعقاد ہوا جس میں مندرجہ ذیل حضرات شریک ہوئے۔ محترمہ شمیم ریٹائرڈ وائس پرنسپل ، نئی دہلی ، جناب ریاض عمر ، ڈاکٹر ذاکر حسین کالج (ایوننگ) نئی دہلی ، سید مرغوب احمد ، سرودیہ بال ودیالیہ دہلی ، محترمہ عالیہ بیگم ، اجمل خاں گرلز ہائر سکنڈری اسکول ، نئی دہلی ، ڈاکٹر نسیم اجمل ، ڈاکٹر ذاکر حسین کالج ، نئی دہلی ، پروفیسر مولی بخش قادری ، نئی دہلی ، جناب منظور عثمانی ، دہلی ، محترمہ حلیمہ سعدیہ ، ہمدرد پبلک اسکول ، نئی دہلی ، جناب ایم ۔ اے ۔ ۔ ۔ انجمن ترقی اردو ، حیدرآباد ، جناب پی ۔ اے ۔ انصاری ، پونا ، ڈاکٹر ضیاء الرحمن صدیقی ، اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر ، سولن ، محترمہ رفیعہ علی (نمائندہ) محترمہ ساجدہ قادری ، گورنمنٹ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول ، دہلی اور ڈاکٹر جمیل اختر ، نئی دہلی۔

ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے ورکشاپ کے مقاصد پر روشنی ڈالی ۔ انھوں نے کہا کہ تعلیمی مواد اور موضوع سے متعلق اطلاعات کو اردو میں منتقل کرنا ضروری ہے لیکن اسلوب اور لفظیات کے انتخاب کی آزادی مترجم کو میسر ہونی چاہیے ۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ انگریزی عبارت کا ہو بہ ہو لفظی ترجمہ کیا جائے ۔ قومی کونسل مترجمین کا ایک Core Group تشکیل دے گی جن کے لئے اورینٹیشن کا انتظام کیا جائے گا اور ایسے مترجمین کو این ۔ سی ۔ ای ۔ آر ۔ ٹی کے ان ابتدائی مباحث میں مدعو کیا جائے گا جن میں اس علمی مواد کی منطقی ترکیبی متعین کی جاتی ہے جو مختلف عمر کے بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق منتخب کیا جاتا ہے۔

قومی کونسل نے مختلف علوم اور موضوعات کی جو اصطلاحات تیار کی ہیں ان کو مقبول عام بنانا ضروری ہے ۔ اس کے لیے اسکولوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں مباحثے کرائے جائیں ۔ لائبریریوں ، اخباروں اور رسالوں میں ان پر تبصرے اور بحثیں کرائی جائیں تاکہ ان کی روشنی میں کام کو آگے بڑھایا جاسکے ۔ اصطلاحی کتابوں پر اب تک جو تبصرے آئے ہیں ، اصطلاحی کمیٹی سے کہا جائے کہ ان تبصروں کی روشنی میں مزید غور کرے۔

اردو میڈیم سے تعلیم دینے والے اساتذہ کے لیے اورینٹیشن کورس شروع کیے جائیں۔

خطاطی اور گرافکس ڈیزائن

یکم اور ۲ / دسمبر ۱۹۹۸ ، کو کونسل کے کمیٹی روم میں ، دوروزہ ورکشاپ ہوا ۔ اس میں حصہ لینے والے حضرات کے اسمائے گرامی ہیں ۔ (۱) جناب ایس ۔ کے مہاتی ، سینٹر فار ڈیولپمنٹ آف ایڈوانس کمپیوٹنگ (C-DAC) ، پونا (۲) جناب ۔ ۔ ۔ پاٹیل ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ڈیزائن ، احمد آباد (۳) جناب ظہور احمد زرگر ، جامعہ ملیہ اسلامیہ ، نئی دہلی (۴) جناب ۔ ۔ ۔ قاسمی ، ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ آف اردو ، علی گڑھ (۵) جناب سرجیت گکھار ، ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ آف کمرشل آرٹ ، دہلی (۶) جناب انیس احمد چشتی ، پونا (۷) سید محمد خاں ، مظفر نگر (۸) جناب خورشید احمد ، ٹونک (۹) ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ ، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل۔

ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے اس موقع پر کہا کہ قومی اردو کونسل پہلے ملک میں اردو کیلی گرافی (فنِ خطاطی) کے مختلف

... پیدا کر چلا رہی ہے۔ لیکن اردو خطاطی (کیلی گرافی) روایتی اور پرانی روش پر چلتے رہنے کی وجہ سے نہ صرف اپنی اہمیت کھو رہی ہے بلکہ موجودہ تیز رفتار زمانے میں اردو خطاطی کا روایتی روش سے بھی کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو خطاطی کو صرف ایک فن کی حیثیت سے ذہن میں رکھ کر نہ سوچا جائے بلکہ اسے ایک ایسی نئی شکل دینی چاہیے ... کے بہتر مواقع پیدا کرسکے۔

... ورکشاپ کے دوسرے دن جو تجویزیں منظور ہوئیں وہ یوں ہیں: اردو کتابت کی مارکیٹ تنگ ہوتی جارہی ہے اس لیے خطاطی کو دوسرے ایسے ترقی یافتہ فنون سے جوڑ دیا جائے جو اقتصادی طور پر بھی فائدہ مند ہوں۔

اردو خطاطی کے مرکزوں میں داخلہ لینے والے طالب علموں کے لیے نیا نصاب تیار لیا گیا۔

مولانا آزاد فاؤنڈیشن سے اشتراک:

... / دسمبر ۱۹۹۸ء کو مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے سکریٹری ڈاکٹر ایف۔ یو۔ صدیقی کے ساتھ ایک تفصیلی میٹنگ منعقد ہوئی۔ تعلیمی میدان میں پسماندہ اقلیتوں کے فروغ کے لیے کام کررہی تنظیموں، خاص طور سے مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن سے ... اقلیتوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے۔ میٹنگ میں اصولی طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ قومی اردو کونسل ... سینٹروں میں اساتذہ کے اعزازیہ کا انتظام کرے گی جہاں مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن انفراسٹرکچر فراہم کررہی ہے۔ قومی اردو کونسل کی کمپیوٹر اور کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر کی اسکیم اور مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے ذریعے کمپیوٹر سینٹر کے قیام کے لیے دی ... مالی معاونت کی اسکیم میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کئی اقدامات پر غور ہوا۔ قومی اردو کونسل ان سینٹروں میں اساتذہ کا انتظام کرے گی جو فاؤنڈیشن کی مالی معاونت سے قائم ہوئے ہیں۔ یہ تمام سینٹر قومی اردو کونسل سے دیے جانے والے "Diploma in Computer Application and DTP Course" سے ملحق کیے جائیں گے۔

معاونت برائے فروغِ عربی اور فارسی:

گرانٹ ان ایڈ کمیٹی (عربی و فارسی) کی میٹنگ ۱۱ / دسمبر ۱۹۹۸ء کو منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر سیدہ سیدین نے کی۔ اس میٹنگ میں پروفیسر عبدالودود اظہر اور پروفیسر ہاشم علی کے علاوہ منسٹری کے نمائندے جناب ... سنگھ، ڈائرکٹر (لینگویجز) جناب بی۔ آر۔ پرساد نے شرکت فرمائی۔ میٹنگ میں مدارس کی تعلیمی معاونت کے سلسلے میں کونسل کی جانب سے کیے گئے امور پر بحث کرتے ہوئے یہ فیصلہ لیا گیا کہ مدارس کے متعلق معاملات پر بحث کرنے کے لیے مدرسہ بورڈ کے سکریٹریوں یا نوڈل ... کی میٹنگ منعقد کی جائے۔ عربی اور فارسی زبانوں کے فروغ کے لیے دی جانے والی اسکولرشپ کے لیے ایک نئی کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر چندر شیکھر شامل ہیں۔ اس میٹنگ میں ۹۲ مدارس کو عربی اور فارسی زبانوں کی ترویج کے لیے مالی امداد منظور کی گئی اور ان زبانوں کے فروغ کے لیے مسودوں پر سبسیڈی بھی منظوری ہوئی۔ ... کی عربی اور فارسی کتابوں کی بڑے پیمانے پر خریداری کو منظوری دی گئی۔ یہ تمام مالی معاونت تقریباً ... لاکھ روپیہ کی ہوگی۔

معاونت برائے فروغِ اردو زبان:

گرانٹ ان ایڈ کمیٹی (اردو) کی میٹنگ ۱۸ / دسمبر ۱۹۹۸ء کو منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کی

اس میٹنگ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ ، جناب عبدالکریم شاہ صدور اور منسٹری کے نمائندے جناب ٹی ۔ آر ۔ پرساد نے شرکت فرمائی ۔ اس میٹنگ میں ۳۰ رضاکارانہ تنظیموں کو اردو تدریس کے لیے مالی اعانت منظور کی گئی ۔ اس کے علاوہ پچاس کتابت مراکز کے لیے سالِ رواں کی گرانٹ بھی منظوری کی گئی ۔ ۳ نئے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سینٹرز کی منظوری دی گئی ۔ مختلف انجمنوں کی درخواست پر غور کرنے کے مختلف پروجیکٹوں اور سیمینار کے لیے مالی اعانت منظور کی گئی ۔ یہ مالی معاونت ۲۰ لاکھ روپیہ کی ہوگی ۔

قومی اردو کونسل کی اگزیکیٹیو بورڈ نے "Diploma in Computer Application and DTP Urdu" سالہ فیصلہ کیا ہے کہ سالِ رواں میں ۳۱ مارچ تک ۲۰ کمپیوٹر سینٹر کھولے جائیں جن سینٹروں کو اب تک منظوری دی گئی ہے وہ یہ ہیں ۔

(۱) ادارہ ، ادبیات اردو ، حیدرآباد ، (۲) بیسک کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر ، کرنول ، (۳) غالب اکادمی ، نئی دہلی ، (۴) دہلی اردو اکادمی ، نئی دہلی ، (۵) پیوپلس ایمپاور مینٹ مشن ، سری نگر ، (۶) کونٹیک کمپیوٹر ایجوکیشن ، بارہ مولہ ، (۷) مجلس اسلامیہ ، بنگلور (۸) اردو ساہتیہ اکادمی ، گاندھی نگر ، (گجرات) (۹) مدھیہ پردیش اردو اکادمی ، بھوپال ، (۱۰) ہلال انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد (اننت ناگ) ، (۱۱) مسلم مسافر خانہ ، سوپور (کشمیر) ، (۱۲) کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر ، کیرالا (۱۳) انجمن ترقی المسلمین ، گوار ، (۱۴) نیشنل ووصیس ویلفیئر سوسائٹی ، مہاراشٹرا ، (۱۵) گجرات مومن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ ، ممبئی ، (۱۶) ماڈرن شکشا پرسارک منڈل ، اورنگ آباد ، (۱۷) ناگپور مسلم ویلفیئر سوسائٹی ، مومن پورہ (ناگپور) ، (۱۸) دی دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ ، پونا ، (۱۹) اترپردیش اردو اکادمی ، لکھنؤ ، (۲۰) اڑیسہ اردو اکادمی ، بھونیشور ، (۲۱) رحمانی فاؤنڈیشن ، مونگیر ، (۲۲) مرتضادیہ ایجوکیشنل کلچر فاؤنڈیشن آف ساؤتھ انڈیا ، چنائی ، (۲۳) اورینٹل سوسائٹی ، گھنٹی شسید ، امروہہ ۔

اس کورس کے لیے نصاب ترتیب دینے کے لیے اور ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کو جلد از جلد سینٹروں میں مہیا کرنے کے لیے Monitoring Committee مرتب کی گئی کے اجلاس ۱۸ / نومبر اور ۱۰ / دسمبر کو منعقد ہوئے ۔ ان اجلاس میں شرکت کرنے والے حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں ۔

(۱) جناب دی ۔ دی راؤ ، سینئر ٹکنیکل ڈائرکٹر ، این ۔ آئی ۔ سی ۔ (۲) پروفیسر خالد حسین ، ڈائرکٹر کمپیوٹر ایجوکیشن جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔

سافٹ ویئر بنانے والی ایجنسی اور جن ایجنسیوں کے ذریعے یہ کورس چلایا جارہا ہے کے نمائندوں نے بھی ان میٹنگوں میں شرکت کی ۔

○●○

اپیل

ادبی حلقوں میں یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ میں سال بہ سال اردو کی وضاحتی کتابیات تیار کرتا ہوں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان انھیں شائع کرتی ہے ۔ ۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۷ء کی چار جلدیں عنقریب منظرِ عام پر آجائیں گی اور ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۵ء کے اندراجات اب ترتیب و تکمیل کی منزل میں ہیں۔ مصنفین سے استدعا ہے کہ جن کی کتابیں ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۵ء کی مدت کے درمیان شائع ہوئی ہیں ، مذکورہ بالا کتابیات میں ان سے متعلق اندراج کے لیے مندرجہ ذیل پتے پر ایک نسخہ مرحمت فرمائیں اور یہ ممکن نہ ہو تو اس تصنیف کے نام ، مصنف کے نام ، ضخامت ، سائز ، قیمت ، ایڈیشن ، ناشر کے پتے ، طباعت کے طریقے اور سالِ طباعت کے ساتھ کتاب کی نوعیت اور مضامین کی فہرست ارسال فرمائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ کتب کی تفصیل وضاحتی کتابیات میں شامل کی جاسکے ۔ موصولہ کتابیں اندراج کے بعد لائبریری کو دے دی جائیں گی ۔

تعاون کا خواستگار

مظفر حنفی

Prof. Muzaffar Hanfi
P - 1 / 7, C.I.T. Scheme VII M.
CALCUTTA - 700 054.
Phone: 3558126.

انجمن خواتین آندھرا پردیش کی زیرِ سرپرستی ۔ اجتماعی شادیوں کی اہمیت

موجودہ مسلم معاشرہ غیر ضروری رسومات کی جکڑ بندیوں میں گھرا ہوا ہے اس کی وجہ سے شادیوں کا مسئلہ کٹھن بنتا جارہا ہے۔ خصوصاً غریب گھرانوں کی باخلاق سلیقہ مند اور دینی تربیت یافتہ لڑکیاں جوڑے کی رقم، لین دین اور جہیز کے گراں بار اخراجات کی متحمل نہیں ہوسکتیں اس لیے وہ اپنے ماں باپ اور معاشرے پر ایک بوجھ بنتی جارہی ہیں ۔ یہ صورت حال عبرت ناک ہے اور مستقبل میں اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں مسلم قوم کے اخلاقی کردار نہ متاثر ہوجائیں ۔ اسلام نے تو شادی کو آسان اور قابلِ تقلید بناکر پیش کیا تھا مگر ہندوستان میں دیگر اقوام کے رسم و رواج سے متاثر ہوکر متمول گھرانوں میں بے جا نمائش اور نام و نمود کا جو رجحان پیدا ہوگیا ہے وہ آہستہ آہستہ پورے مسلم معاشرے پر اثر انداز ہوتا جارہا ہے۔

انجمن خواتین آندھرا پردیش نے عورتوں میں تعلیمی بیداری ، خود سپری کی صلاحیت اور دینی شعور پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی شادیوں کے اہتمام کا بھی بیڑا اٹھایا ہے۔ جہاں پر الصمد دینی اسکول کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم سے لڑکیوں کو سرکاری امتحانات میں شرکت کا موقع دیں تاکہ وہ بھی فن سے اعلیٰ تعلیم تک رسائی حاصل کریں ۔ نیز ٹیلرنگ اور ایمبرائڈری سکھاکر انھیں فنی تعلیم سے آراستہ کریں اور انھیں خود کفیل بناکر معاشرے میں ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے لیے اجتماعی شادیوں کا بھی اہتمام کریں۔

الحمدللہ کہ یہ تمام امور الصمد دینی اسکول ، ٹیلرنگ سنٹر اور ہر سال دس شادیوں کی ذمہ داری لے کر پایہ ، تکمیل کو پہنچاتے جارہے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ انجمن خواتین آندھرا پردیش کی سرپرستی میں اراکینِ انجمن اور قوم کے درد مند احباب اور مخیر اصحاب کا تعاون اور مالی تعاون حاصل رہے تو انشاء اللہ یہ کام آسانی سے انجام پاتے رہیں گے ۔ وما علینا الا البلاغ ○

بیادگار محی الدین قادری زور

سن اجرا : ۱۹۳۸ء — فون : 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۶۱ — اپریل ۱۹۹۹ء — شمارہ : ۴

فی پرچہ	:	۱۰ روپے
زر سالانہ	:	۱۰۰ روپے
کتب خانوں سے	:	۱۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان ، نیپال ، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۲ ڈالر
انگلستان	:	۱۰ پونڈ

ناشر : ادارہ ادبیات اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲ (اے۔پی) انڈیا

کمپیوٹر کتابت : [illegible]

رحمن راج سکسینہ پرنٹر و پبلشر نے [illegible] پریس [illegible] سے چھپوا کر ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

پہلی بات

گذشتہ ساٹھ ستر برسوں سے اردو زبان کے رسمِ خط کے بارے میں بحث چلتی رہی ہے۔ اس موضوع پر مضامین لکھے گئے۔ سمینار منعقد ہوئے۔ اردو کے لیے بعض اصحاب نے رومن رسم الخط اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور بعض نے دیوناگری رسم الخط کی تجویز پیش کی اور بہت سوں نے ان دونوں تجویزوں سے اختلاف کرتے ہوئے موجودہ رسمِ خط کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔ اب اردو والوں کی اکثریت موجودہ رسمِ خط کو ترک کرکے کوئی اور رسمِ خط اختیار کرنے کی سخت مخالف ہے۔

اردو کے موجودہ رسمِ خط کو برقرار رکھتے ہوئے دیوناگری کو ثانوی رسمِ خط بنانے کی تجویز کسی حد تک قابلِ غور یوں ہے کہ اردو بولنے والوں کی موجودہ نوجوان نسل اردو رسمِ خط سے ناواقف ہے اس کے علاوہ ہندی بولنے والے بھی اردو شعر و ادب سے دل چسپی رکھتے ہیں۔ اس تجویز پر ناک بھوں تو چڑھائے گئے لیکن عملاً ناگری اردو کا ثانوی رسمِ خط بن چکی ہے۔ ہندی کے پبلیشرز اردو کتابوں کو بالخصوص شعری اور افسانوی انتخابات کو ناگری میں چھاپ رہے ہیں۔ خود اردو کے ادیب اور شاعر بھی اپنی کتابوں کے ہندی ایڈیشن شائع کروا رہے ہیں لیکن قباحت یہ پیدا ہوتی ہے کہ اردو کی خاص آواز جیسے ز، ف، ز وغیرہ کے لیے ہندی حروف پر بندی نہیں لگائی جارہی ہے جس کی وجہ سے اردو الفاظ کا تلفظ بدل جارہا ہے۔ غالب کو گالب اور غزل کو گزل لکھا جارہا ہے جس کا تدارک ضروری ہے۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ یورپ، امریکہ اور دیگر مغربی ملکوں میں اردو مادری زبان رکھنے والی جو نئی نسل پروان چڑھ رہی ہے وہ نہ تو اردو رسمِ خط سے واقف ہے اور نہ ہندی رسمِ خط سے۔ اس نسل کے بچے گھروں میں اردو زبان میں بات چیت تو کرلیتے ہیں لیکن لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ ان بچوں کو اردو لکھنا پڑھنا سکھانا دشوار ہے۔ اس کے لیے کوشش تو کی جارہی ہے لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوسکی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس نسل تک اپنا تہذیبی اور ادبی ورثہ کس طرح پہنچایا جائے۔ اس کا واحد حل یہ نظر آتا ہے کہ رومن کو بھی اردو کا ثانوی رسمِ خط بنایا جائے۔ اردو ادب کے انتخابات اور ہماری تہذیب و تاریخ سے متعلق کتابیں رومن رسمِ خط میں شائع کی جائیں تاکہ وہ انھیں اردو زبان میں پڑھ سکیں اور اردو سے بالکل نابلد ہوکر نہ رہ جائیں۔ ای۔ میل کی سہولتیں ہمارے ملک میں بھی عام ہورہی ہیں ہم انگریزی میں ای۔ میل بھیجنے کے بجائے رومن اردو میں ای۔ میل بھیج سکتے ہیں اور اردو رسمِ خط نہ جاننے والوں سے خواہش کرسکتے ہیں کہ وہ بھی رومن اردو میں ای۔ میل بھیجیں۔ یہ ہماری رائے ہے۔ ایک طرح سے Loud thinking ہے۔ اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس خیال کی تائید میں اہلِ رائے اصحاب کی توجہ اس امر پر مبذول کرائیں گے کہ بیرونی ملکوں میں ایسے بہت سے افراد بالخصوص نوجوان اور بچے ہیں جو عربی رسمِ خط سے ناواقف ہیں۔ ان کے لیے قرآنی سورتیں اور دعائیں رومن رسمِ خط میں شائع کی گئی ہیں تاکہ وہ فریضہ نماز ادا کرسکیں۔

○○○

مغنی تبسم

پون ورما

ترجمہ : اُسامہ فاروقی

کتاب : غالب ، شخصیت اور عہد

باب : تین ایک مضطرب صاحبِ بصیرت

(قسط : ۵)

غالب آگرے میں ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو پیدا ہوئے۔ تاہم ان کا آگرے سے آبائی تعلق نہیں تھا۔ ان کے دادا قوقان بیگ خاں جو ، جیسا کہ غالب نے لکھا ہے کہ سمرقند سے ہندوستان آئے تھے ، ایک فوجی قسمت آزما تھے اور مختلف اوقات میں پنجاب کے صوبے دار ، مثل بادشاہ شاہ عالم اور مہاراجہ جے پور کی ملازمت میں تھے۔ قوقان بیگ کے خاصے بڑے خاندان کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ ان کے دو بیٹے عبداللہ بیگ خاں اور نصراللہ بیگ خاں اپنے باپ کے نقش قدم پر چلے ، انھوں نے بھی قسمت آزمائی کے لیے بھاڑے کے سپاہی کا وہ پیشہ اختیار کیا جس کے لیے اٹھارویں صدی عیسوی کی متلاطم اور بکھراؤ کی سیاست میں عمدہ مواقع کی بہتات تھی۔ یہ ایک غیر یقینی پیشہ بھی تھا اور خطرناک بھی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں غالب بہ مشکل چار سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد نصراللہ بیگ نے غالب ، ان کے چھوٹے بھائی اور بہن پر مشتمل اپنے بھائی کے خاندان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ دو سال بعد ۱۸۰۶ء میں نصراللہ بیگ بھی ، جو ترقی کر کے مرہٹوں کے تحت آگرے کے قلعہ دار بن گئے تھے اور پھر قلعہ انگریزوں کے حوالے کرنے کے صلے میں ان کی طرف سے انعام و اکرام کے مستحق قرار دیے گئے تھے ، انتقال کر گئے۔ اس طرح نو سال کی عمر کو پہنچنے تک غالب اپنے باپ اور چچا دونوں سے محروم ہوچکے تھے۔ لیکن ایک حد تک وہ اپنی عمر کے ان ابتدائی سالوں کی اصل تلخی سے محفوظ رہے۔ ان کے والد کی آگرے کے ایک متمول خاندان میں شادی ہوئی تھی۔ ایک بھاڑے کے سپاہی کی زندگی کی بے اعتباریوں کے پیش نظر انھوں نے دور اندیشی سے اپنی بیوی کو آگرے میں اپنے والدین کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ غالب اپنے ننہیال میں پیدا ہوئے تھے اور اپنے والد اور چچا کے انتقال کے بعد بھی وہاں بزرگوں کے سایہ عاطفت میں نسبتاً آسودہ زندگی گزارتے رہے۔ ان کے بعد کے خطوط میں پائے جانے والے اذکار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے یہ ابتدائی سال ان کو خاص وضاحت کے ساتھ یاد تھے۔ " میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے دو ایک برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا ، اس واسطے جب چاہتے تھے ، چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور " کالے محل " سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹڑہ کہ وہ " گڈریوں والا " مشہور تھا۔ اور ایک کٹڑہ کہ وہ " کشمیرن والا " کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے

پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔“ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے مرورِ زمانہ کے ساتھ ان کا بچپن کے بےفکری کے دنوں کا نقشہ دھندلا ہی گیا ۔ خاص طور سے مصیبت کے دنوں میں جن کی بعد میں ان کی زندگی میں کثرت تھی ۔ چنانچہ جب ان کے آگرہ چھوڑنے کے کافی عرصے کے بعد وہ اپنے ایک عزیز کے نام خط میں جو وہاں کسی کام سے گئے تھے آگرے کی شان میں یوں قصیدہ خوانی کرتے ہیں :

> ” خدا نہ کرے کہ میرا اکبرآباد کسی کو ناپسندِ خاطر ہو ۔ خدا کرے ہر مسافر جب وہاں سے گزرے تو خدا سے اس کی سلامتی اور آبادی کی دعا مانگے ۔ ۔ ۔ اس کی زمین کا ہر ذرہ ، ایک میرے وجود کے لیے مسرت بخش کشش رکھتا تھا اور اس گلشن کی ایک ایک پنکھڑی کو میں تہِ دل سے دعائیں دیتا تھا ۔“

یہ رحیم عبارت بادی النظر میں یادداشت سے زیادہ شاعرانہ خوش دلی پر مبنی دکھائی دیتی ہے ۔ وقت گزرنے یادوں کو دھندلا دیتا ہے ۔ دلی کا نقشہ یادوں کو ایک ہلکا خوش گوار رنگ عطا کرتا ہے ۔ ننھیال کے ساتھ گزرے دنوں سے غالب کو مادی آسائش ملی ہوگی اور اس کی بدولت وہ تغیر پذیر و غیر یقینی زمانے کے حالات سے براہِ راست متاثر ہونے سے بچ بھی گئے ہوں گے ۔ لیکن باپ اور چچا کی بے وقت موت کے صدمے نے انھیں مستقل احساسِ محرومی بھی عطا کر دیا ہوگا ۔ اپنے حسب نسب پر یوں حد سے زیادہ فخر کو یہ امر واقعہ کہ اس کے پاس اپنے ننھیال کے ساتھ گزر بسر کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا شعوری یا اتفاقی طور پر ناگوار گزرتا رہا ہوگا ۔ بہرحال ان کی زندگی کے ابتدائی سال خاصے ذہنی و جذباتی تناؤ کے تھے اور شاید یہ محض ایک امرِ اتفاقی نہیں ہے کہ انھوں نے کافی کم سنی ہی میں شعر کہنا شروع کیا ۔ شاید اسی سال (۱۸۰۶ء میں) جب ان کے چچا کا انتقال ہوا ۔ خوش قسمتی سے ان کی ابتدائی تعلیم ایسی تھی کہ اس کم سن طالبِ علم کی عمر کے لحاظ سے غیر معمولی ذکاوت کی نشوونما میں مددگار ثابت ہوئی ۔ شیخ معظم ، جن کا اس وقت آگرہ کے جید علما میں شمار ہوتا تھا ، ان کے استاد تھے ۔ شاید غالب نے میر اعظم علی کے مدرسے میں بھی تحصیلِ علم کی ۔ اس وقت چلائے جانے والے روایتی علوم منطق ، علمِ ہیئت ، طب اور مابعد الطبیعیات کے ابتدائی اصول کی انھیں بہت عمدہ تعلیم دی گئی ۔ لیکن ان کا اصل رجحان لسانیات اور ادب ۔ خصوصاً فارسی پر دست گاہ کی طرف تھا ۔ حسنِ اتفاق سے فارسی اور عربی دونوں زبانوں کے ایک نامور عالم عبدالصمد اسی زمانے میں آگرے میں وارد ہوئے ۔ (ان کا اصل نام ہرمزد تھا ۔ مذہباً زرتشتی تھے لیکن بعد میں مذہبِ اسلام قبول کر لیا تھا) ۔ غالب نے ان کی شاگردی اختیار کی ۔ عبدالصمد غالب کے گھر میں دو سال (۱۸۱۰ تا ۱۸۱۱) مقیم رہے ۔ غالب نے کبھی بھی کسی کو اپنا استاد تسلیم نہیں کیا لیکن جس پرجوش پیرائے میں انھوں نے بعد میں عبدالصمد کا ذکر کیا ہے اسے ایک حد تک ان کا اقرار کہا جا سکتا ہے ۔ یہ ہر طرح یہ تسلیم کرنا درست ہوگا کہ فارسی میں غالب کے بےمثل تبحر کی بنیاد انھیں ابتدائی سالوں میں پڑی ۔

غالب نے دس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی فارسی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا ۔ اسی سلسلے میں انھوں نے [illegible] فارسی کو اپنی [illegible] قرار دیا لیکن [illegible] شہادت ہے کہ اس ابتدائی عمر میں بھی وہ ساتھ ہی ساتھ اردو میں بھی کہتے تھے ۔ حالی نے لکھا ہے کہ [illegible] سال کی عمر میں غالب کی [illegible] ایک مثنوی اپنے ہاتھ [illegible] ۔ غالب اس [illegible] کے بعد جب [illegible] انھیں [illegible] مسرت کے [illegible] ۔ ظاہر ہے کہ [illegible] غالب کے [illegible] کہ [illegible] آگرے کے [illegible]

گئے۔ میر اپنی غیر معمولی شعری تخلیقی قوت کے لیے اتنے ہی مشہور تھے جتنے اپنی ترش روئی اور شاعری میں اعلیٰ معیار پر پوری نہ اترنے والی ہر تخلیق کو حقارت کے ساتھ مسترد کردینے کے لیے۔ یہ امر واقعہ ہی کہ کسی نے محسوس کیا کہ غالب کا لکھا ان کو دکھایا جاسکتا۔ غالب کی شعری استعداد کے اعتراف کی شہادت ہے۔ غزل پڑھنے کے بعد میر کا جچا تلا تبصرہ یہ تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ میر کے منہ سے نکلے ہوئے ایسے الفاظ کو حوصلہ افزائی پر ہی محمول کرنا چاہیے۔

۸/ اگست ۱۸۱۰ء کو جب غالب کچھ مہینے کم تیرہ سال کے تھے، ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں کی بیٹی امراؤ بیگم سے کر دی گئی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد انھوں نے آگرہ چھوڑ کر دلی کی مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اس واقعے کی صحیح تاریخ کا علم نہیں۔ ۱۸۶۲ء میں لکھے ہوئے ایک خط میں وہ کہتے ہیں کہ میں گزشتہ اکیاون سال سے دلی میں سکونت رکھتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ۱۸۱۱ء میں دلی کو منتقل ہوگئے۔ لیکن غالب کی وقت اور تواریخ کی یادداشت، بالخصوص زندگی کے آخری دور کے قریب، بہت صحیح نہیں رہ گئی تھی۔ عمومی اتفاق رائے اس پر ہے کہ وہ ۱۸۱۲ء اور ۱۸۱۵ء کے درمیان کسی وقت منتقل ہوئے۔ جو کچھ بھی ہو دلی ان کے لیے اجنبی شہر نہیں تھا۔ جیسا کہ وہ خود تسلیم کرتے ہیں وہ سات سال کی عمر ہی سے دلی اکثر جاتے رہتے تھے۔ ان کے خسر دلی کے طبقہ امرا کے اہم اور ذی اثر رکن تھے، معروف تخلص تھا اور یہ جانے خود ایک مسلّمہ شاعر تھے۔ ویسے بھی ایک حوصلہ مند شاعر کے لیے دربار کا مستقر دلی آگرے سے کہیں زیادہ مناسب ماحول فراہم کرتا تھا۔ گزشتہ صدی کی متواتر سیاسی افراتفری نے میر اور سودا کو اپنا پسندیدہ شہر جہاں آباد چھوڑنے پر مجبور کردیا تھا۔ لیکن انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں برطانوی استعماری موجودگی کی بدولت دلی میں سیاسی استحکام سے کم و بیش سکون قائم ہوگیا تھا اور شہر میں کسی نووارد کے لیے یہ کوئی کم قابلِ لحاظ امر نہیں تھا۔ سن بلوغ کو پہنچ کر بالخصوص شادی کے بعد ننھال میں سکونت غالب کے لیے یقیناً ناقابلِ قبول رہی ہوگی۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ ان کے نانا کے انتقال کے بعد ان کی ماں کے گھر میں مادی خوش حالی کو بھی امرِ بدیہی نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔

چناں چہ مختلف حقائق کی یک جائی غالب کے اس اقدام کا باعث ہوئی۔ وہ دلی وہاں کے طبقہ امرا میں اپنا مقام اور بہ حیثیت شاعر اپنا جائز حق حاصل کرنے کے عزمِ مصمم کے ساتھ آئے۔ ان کے باپ اور چچا کی بے وقت موت نے انھیں مثل پانے ت ہی میں اس اونچے مقام سے محروم کردیا جو بہ صورتِ دیگر انھیں یقیناً ملتا۔ طبقہ امرا کے ایک رکن ہونے کے اپنے حق پر اصرار کی ضرورت تھی۔ اپنی ساری عمر، لیکن نسبتاً کہیں زیادہ شدت سے ان ابتدائی سالوں میں جب کہ وہ اپنا ایک مقام بنانے میں لگے ہوئے تھے، غالب نے اپنے حسب نسب کے وصف و ثنا میں جی جان سے کوشش کی۔۔۔ بادی النظر میں یہ ایسے غیر معمولی ذہین اور ذکی الحس کی شخصیت کا ایک مضحکہ انگیز بلکہ خفت انگیز پہلو دکھائی دے سکتا ہے۔ لیکن ان کے زمانے میں اصل اور حسب نسب اور وہ رتبہ جو ان کی بدولت سماجی نظام میں ملتا تھا کسی شخص کی قابلیت کی مسلّمہ دلیل کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ غالب الفاظ و فکر کو صحیح سمجھتے تھے۔ بہ حیثیت شاعر اپنا حق حاصل کرنے کے معاملے میں ان کا ادعا کہیں زیادہ حق بہ جانب تھا اور اس کا انھیں علم تھا۔ اگر کوئی واحد شخص طلب امر ایسا تھا جس کے بارے میں غالب کبھی مذبذب نہ رہے ہوں تو یہ شاعری ہے۔ ان کی اپنی فطری مناسبت تھی۔ مختلف علوم کے اصول کی اس نہایت عمدہ بنیادی تعلیم کی بدولت جو انھیں عمر کے ابتدائی سالوں میں مل گئی تھی ان کی ذہانت اور تخیل نے ذہن کو ایسا تجربہ حاصل ہوگیا تھا جو ان کی کم سنی سے مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ اور دلی میں، جیسا کہ ہم دیکھ

کر چکے ہیں ۔ وہ ٹھان چکے تھے کہ اپنی شعری استعداد اور اپنے علم کو تسلیم کروا کر ہی چھوڑیں گے ۔ اس یقین کے ساتھ کہ یہ ان کی مساعی کی قوت پر مبنی کوئی بات نہیں بلکہ ان کا حق ہے ۔ ان کی ناقابلِ انکار غیر معمولی تخلیقی قوت کے پیش نظر یہ ذہنی تکبر شاید حق بجانب تھا ۔ لیکن بالکل آخر تک غالب کا خیال تھا کہ انھیں وہ ستائش اور قبولیت عامہ نہیں ملی جو اندھے انصاف ان کا حق تھی ۔ پھر بھی اس سے اپنی صلاحیت پر ان کا یقین کبھی متزلزل نہیں ہوا ۔ شاعری میں دوسرے درجے کی تخلیقات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے (جس رویے کی وجہ سے ساری عمر انھیں مناقشوں میں الجھنا پڑا) وہ شاید غیر شعوری طور پر خود کو اپنے پسندیدہ نام ور شاعر میر کی مشہور زمانہ نازک دماغی اور سخت گیری کے نمونے پر ڈھال رہے تھے ۔ تاہم ان کی دل کو موہ لینے والی خوش طبعی اور دردمندی نے انھیں اپنی خلوت پسندی اور دوسروں سے الگ تھلگ رکھنے کی خواہش کو پوری طرح سے کھل جانے پھیلنے کی اجازت کبھی نہیں دی ۔

دلی میں ورود کے بعد غالب نے فصیل بند شہر کے قلب میں چاندنی چوک کے پاس ایک حویلی کرایے سے لی ۔ اپنے خسر مرحوم ، جن کے ہاں اپنے ورودِ دلی کے بعد ممکن ہے کہ وہ کچھ عرصے کے لیے ٹھہرے ہوں ، انھوں نے طبقہ ، امرا اور رؤسا کے حلقوں میں حق داخلہ حاصل کیا ۔ تاہم دلی والے شاعری میں ان کی اولین پذیرائی کو خوش گوار کہنا مشکل ہے ۔ غالب کا ابتدائی اردو کلام بے حد مفرس تھا ۔ اردو کو زبردستی ٹکسالی فارسی کا جگر کوٹ پہنانے کی کوشش اس ادبی ماحول سے جس میں اردو عام رابطے کی زبان کی حیثیت سے فارسی کی جگہ لے رہی تھی اور ادبی اظہار کے نئے وسیلے کی حیثیت سے اعتبار اور مقبولیت حاصل کر رہی تھی تو الٹی ضد رکھتی تھی ۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار کے خیالات کی ساخت اغلاق کی حد تک پیچیدہ تھی ۔ بادی النظر میں غالب شوکت بخاری ، اسیر اور بیدل جیسے فارسی شعرا کے مجرد کلام سے بڑی حد تک متاثر دکھائی دیتے ہیں ۔ غالب کے فلسفیانہ رجحان اور مابعد الطبیعیات میں ان کی دل چسپی کے پیش نظر یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی ۔ لیکن ان کے اشعار کے بے حد دقیق مضامین اوسط سامع کو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے تھے ۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ شاعری میں مروجہ رسمی اشاریت اور فرسودہ تشبیہوں اور استعاروں کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے ۔ وہ تصرفِ شاعرانہ کے مسلّمہ دائروں سے بے زار تھے اور ان کے کلام پر نکتہ چینی کی جسارت کرنے والوں کے محدود مبلغ علم پر پیچ و تاب کھاتے تھے ۔ انھیں ایسی نئی تشبیہوں اور نئے استعاروں کی تلاش تھی جو ادب میں نئے نئے تجربوں کی آفاق کو وا کریں ۔ ان قابلِ تعریف مساعی کے ساتھ بہت ممکن ہے کہ ان کی طبیعت کی کسی طرح قابو میں نہ آنے والی ایک خصوصیت ، دوسروں سے مختلف ہونے کی خواہش ، بھی جڑی رہی ہو ۔ گمان ہوتا ہے کہ ایک مفہوم میں یہ توجہ حاصل کرنے کا وسیلہ تھا ۔ ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے غالب یقیناً یہ چاہتے تھے کہ ان پر توجہ دی جائے ۔ پامال روش سے بالکل الگ انداز میں شاعری کرنا ان کے ذہنی تکبر اور فنی اعتماد سے توافق رکھنے والی ایک تدبیر تھی اور ایسا تاثر ناگزیر ہے کہ انھیں اپنے اس رویے کی وجہ سے اٹھنے والے مناقشوں کے ہنگاموں سے ایک متمردانہ مسرت حاصل ہوتی تھی ۔ اپنے اشعار کے "ابہام" ہی سے وہ اپنی بے ربطی نہیں بلکہ اپنے ذہنوں کی فہم کے قصور کو ثابت کرنا چاہتے تھے ۔ ان کی نکتہ چینی دوسروں کے مقابلے میں بنیادی طور پر اپنی جداگانہ حیثیت پر ان کے یقین کو مستحکم ثابت کرتی تھی ، اور اپنی فطری قابلیت کو عامیانہ تعلق کی آلودگی سے محفوظ رکھنے کی ان کی خواہش کو تقویت بخشتی تھی ۔

لیکن ان کی خود اعتمادی سے بعض طبقے کچھ زیادہ محظوظ نہیں ہوا ۔ اس زمانے کے اہلِ جاہ و جلال و عروج کے ماحول میں ایک نوجوان کی انا کو اگر ٹھیس لگے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور غالب اس سے مستثنیٰ نہیں تھے ۔ اگر غالب کسی مقامی مشاعرے میں جو ہوتے تو جو جھوٹا بڑا تحفہ بھیجا جاتا اور کبھی پر خلوص لیکن بے معنی شعر جاتے ۔ ایک موقع پر دلی کے ایک مشہور [illegible]

مولوی جمیل نے طنز آمیز طریقے سے غالب کا ایک شعر سنایا اور بڑی عاجزی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا کہ ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔ وہ سب سے زیادہ فارسی سے کام لیتے تھے لیکن ان کے حلقے بھی اتنے ہی سخت ہوتے تھے۔ ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے غالب سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر مجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے ان کے سامنے پڑھے۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب یہ سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا "حاشا، یہ شعر میرا نہیں ہے"۔ مولوی عبدالقادر نے تو دیا مزاح کہا "میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے، اور دیوان ہو تو میں اب بھی دکھا سکتا ہوں۔" آخر غالب کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتلاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

جب آگرے میں ان پر بھی تنقید کی گئی تھی تو اسے غالب نے ان کے لیے مخصوص حقارت کے ساتھ اسے مسترد کر دیا تھا۔ دل میں بنیادی طور پر ان کا ردِ عمل ویسا ہی تھا اور صدمے کو پوشیدہ رکھنے کی ناکام کوشش میں انھوں نے خود کو اپنی قدر کرنے والے سامعین کو خوش کرنے کی خواہش سے بالاتر قرار دیا۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

بعض تنقیدوں سے انھیں کچھ کچھ حیرت بھی ہوتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ ان کے نقاد ان کی حسب حال میں تغیر پسندی اور کو پیش نظر رکھنے کو واجب نہیں سمجھتے تھے۔ اپنی ایک اردو رباعی میں وہ طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخن وران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

گو کہ ان کے بعض نہایت دل کش اشعار اپنی سادگی میں حقانیت سے مملو ہیں۔ اس امر کو وہ صحیح رنگ میں نہیں رکھتے کہ خود ان کی ترجیح کیا ہے۔

طرز سادہ دلم را نہ فریبد غالب — نکتہ چند ز پیچیدہ بیانی بہ من آر

(غالب طرز سادہ میرے دل فریبی کا سامان نہیں رکھتا میرے لیے تو پیچیدہ بیانی کے چند نکتے فراہم کرو)۔ بہرحال انھیں اپنے اشعار کی خوبی پر کبھی کوئی شک نہیں تھا اور ابتدا میں انھوں نے مختلف مسلز اپنی تحسینوں کو اپنے اس یقین کی کے غیر منکسرانہ الفاظ میں بیان بھی کیا تھا۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ان کی تنقید سے بے زاری کا باعث بالخصوص خود اپنی شعری صلاحیت پر ان کا غیر متزلزل یقین تھا اور جتنا یہ یقین تھا کہ چند ایک ہی اس لائق تھے کہ ان کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکیں۔

کرتا ہوں اسد سوزش دل سے سخن گرم — تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

تاہم ظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس وقت جب کہ وہ دنیائے شاعری میں نئے نئے متعارف ہو رہے تھے انھوں نے اپنے زمانے کو نظر میں رکھنے کے اپنے رجحان کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر اپنی ادبی پذیرائی کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ چاہتے تھے کہ

ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ ایک صحیح صورت حال بھی تھی اور نکتہ چینوں کے طنز و تعریض کی ایک حد تک معقولیت کا پہلو بھی موجود بھی تھا۔ اپنے انتقال سے کچھ سال قبل ایک دوست کے نام خط میں انھوں نے تسلیم کیا کہ پندرہ اور پچیس سال کی عمر کے درمیان لکھا ہوا ان کا کلام واقعی مہمل تھا اور جس ہی انھیں اس کا پورا اندازہ ہو گیا انھوں نے یہ پُرتکلف دیوان چاک کر دیا اور صرف دس یا بارہ اشعار نمونے کے لیے بچا لیے ۔ ۔ ۔ یہ ظاہر مرورِ زمانہ کے ساتھ ، جو کچھ ہوا اس کے بارے میں غالب نسبتاً زیادہ سکونِ قلب کے ساتھ کر سکتے تھے لیکن ان کی انا کے پیش نظر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس وقت جب یہ واقعہ در حقیقت پیش آیا اپنے نکتہ چینوں کے آگے سر تسلیم خم کرنا ان کے لیے بہت ہی زیادہ کڑوی گولی نگلنے کے برابر رہا ہوگا۔ یہاں مولوی فضلِ حق نے جن کی اپنی صلاحیتوں کے بارے میں غالب بہت عمدہ رائے رکھتے تھے ، بہت اہم کردار ادا کیا۔ مولوی فضلِ حق ہی کے مشورے سے غالب نے ۱۸۲۱ء میں اپنے اولین اردو دیوان سے (دو ثلث کے قریب) نسبتاً زیادہ مغلق کلام حذف کر دیا۔

پھر بھی دلی میں اس ابتدائی تجربے کے زخموں کو مندمل ہونے میں کافی وقت لگا۔ اس کی قطعی دلیل اس امر سے ملتی ہے کہ غالب نے اگلے تیس سال تک اردو میں لکھنا تقریباً ترک کر دیا اور مکمل فارسی کی اقلیمِ اعلیٰ و ارفع کو منتقل ہو گئے جہاں وہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے نقادوں سے بچنے کے بہتر موقف میں ہوں گے۔ تاہم جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے ، چاہے اردو ہو یا فارسی عجیب بات ہے کہ غالب ساری عمر بڑی آسانی سے شدید ترین ادبی مناقشوں کا مرکز بنتے رہے۔

ادبی محاذ پر نکتہ چینوں کی یورشیں غالب کو جلدی دلی کے طبقہ امرا کے طرزِ زندگی سے خود کو ہم آہنگ بنانے سے روک نہیں پائیں۔ وہ خود کو طبقہ امرا کا ایک رکن سمجھتے تھے اور شعوری طور پر انھوں نے اپنے اس سماجی رتبے سے تعلق رکھنے والا زندگی اختیار کیا۔ حالی نے لکھا ہے کہ وہ باہر ہمیشہ پالکی ہی میں جاتے ، اپنے ہاں ملاقات کے لیے آنے والوں کے پاس باقاعدہ کو جاتے اور جو ملاقات کے لیے نہ آتے اس کے ہاں کبھی نہ جاتے۔ جلد ہی نہ صرف یہ کہ انھیں اس طبقے میں حق داخلہ مل گیا بلکہ مقبولیتِ عام بھی ملی جس میں ایک حد تک وہم کا پہلو بھی شامل تھا۔ ان کی بذلہ سنجی اور ظرافت کے دلی کے بالائی حلقوں میں ہر طرف چرچے تھے۔ اس وقت حاضر جوابی کے فن کو نہ صرف تیز فہمی بلکہ عمدہ تعلیم و تربیت کا ثبوت مانا جاتا تھا۔ حاضر جوابی کا حق کوئی قریبی شخص بھی ہو تو بیش تر اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ، اس کا برا نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ مثال کے طور پر غالب کا وہ مشہور فقرہ برجستہ جواب ہی لیجیے جو انھوں نے اپنے قریبی دوست حکیم رضی الدین خاں کو دیا تھا جنھیں غالب کے برعکس آم پسند نہیں تھے۔ ایک دن جب غالب ان کے ساتھ اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے دیکھا گلی سے ایک گدھا جا رہا تھا۔ اس نے رک کر آم کے چھلکے جو وہاں پڑے ہوئے تھے سونگھے اور آگے بڑھ گیا۔ حکیم رضی الدین سے یہ کہے بغیر نہ رہا گیا "دیکھو بھلا آم ایسی چیز ہے کہ اسے گدھے بھی نہیں کھاتے۔" غالب نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جواب دیا : "جی ہاں بے شک گدھے آم نہیں کھاتے۔" ایک دفعہ غالب سے پوچھا گیا کہ آپ کے خیال میں لفظ "رتھ" مذکر ہے یا مونث۔ انھوں نے جواب دیا "بھیا ! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر کہو۔" وہ واقعہ بھی ہے جب غالب محمد علی سے کرایہ کے کلکتے تک گئے کہ ان کے ایک دوست جو عیادت چاہتے تھے روزے ہی کا احترام کر رہے تھے۔ جب دوست کہا کہ "قبلہ و کعبہ آپ نے کیسی تکلیف فرمائی ؟ میں یہ سمجھتا تھا آپ روزہ رکھتے" غالب نے ایک حیلہ نکال کر کہا : "میں آپ کا کھانے کو جی چاہتا نہیں ڈالتا بلکہ اس لیے ڈالتا ہوں کہ کہیں آپ میرا کھانا نہ دیکھ پائیں۔"

حالی کے بے شمار رشتوں سے باہم دگر مربوط رشتہ داروں کے حلقوں میں اس طرح کے واقعات زبان زدِ عام ہوگئے اور انھوں نے شاعر کی معاشرے میں اولین پذیرائی کی اعانت میں اہم کردار ادا کیا ۔ مزید برآں اپنے ذہنی تمیز اور نفترکی تیزی رکھنے والی بذلہ سنجی کے باوجود غالب بہ حیثیت ایک شخص سب سے محبت کا سلوک بھی کرتے تھے اور ملنسار بھی تھے ۔ دوستوں کا وہ اپنے گھر پر دل سے تپاک سے خیر مقدم کرتے تھے اور ان کی شخصیت میں ایسا جادو تھا کہ جو ان سے ایک بار بھی مل لے چاہتا تھا کہ شناسائی ہمیشہ برقرار رہے ۔ یقیناً ایک شاعر کے لیے مخصوص اکھڑ پن بھی ان کی فطرت میں شامل تھا ۔ وہ اپنے دوستوں پر مہربان تھے ، دوست آسانی سے بنالیتے تھے اور ان کے مخلص دوستوں کا ایک وسیع حلقہ تھا ۔ لیکن ان کی انا اور ان کے ذہن کی پیچیدگی ، مالی عدم تحفظ کے باعث ان کی کم زوریاں اور معاشرے میں اپنے وقار کے تعلق سے ان کی زود رنجی ان کی شخصیت کو بالکل پُرسکون رکھنے میں مدد بھی نہیں تھی ۔ ان کا اخلاقی بے چین اور حساس ذہن متضاد جذبات کی کش مکش اور کیفیتِ مزاج اور موڈ کی اچانک تبدیلیوں کو پوری آزادی دیتا تھا ۔ بے پناہ مسرت اور خوش دلی ، جو ایک شاعر کے لیے غیر فطری نہیں ہے ، چند ہی لمحوں میں افسردگی ، بددلی اور بے کلی کی طرف میلانِ خاطر سے زائل ہوسکتی تھی ۔ شاعرانہ دل گیری اتنی ہی آسانی سے طبیعت کے ہر بندش سے آزاد جوش و خروش اور حظِ نفس کے سراسر مادی رجحان سے دور ہوسکتی تھی ۔ ایسی ملنسار تو دوسرے ہی لمحے وہ علاحدگی پسند اور آدم بیزار بھی ہوسکتے تھے ۔ دوستوں کے ساتھ انتہا درجے کے چشم پوش تو اپنے مخالفین کے حق میں وہ کینہ پرور بھی ہوسکتے تھے ۔ ایک سطح پر عالمِ مادی کے ماورا اور اس کے کثافت سے بری تو دوسری سطح پر وہ سراسر عملی رجحان رکھنے والے دنیادار بھی ہوسکتے تھے ۔ وہ اپنی طبیعت کے متضاد امتیازی اوصاف کو اپنے زائچے میں طالع کے تضاد کا نتیجہ قرار دیتے تھے ۔ ایک فارسی شعر میں اپنے قدرے مخصوص انداز میں وہ اعتراف کرتے ہیں ۔

بہ دنیا ہم بہار دا نیسلے طبعِ خویشتن   موجِ آبِ گوہرِ من کردہ طوفانی مرا

(مجھے اپنی طبیعت کے اضطراب پر کوئی قابو حاصل نہیں ہے ، میرے گوہر کی موجِ آب نے مجھے طوفانی بنا دیا ہے) ۔

ساری عمر شخصیہ کے تعلق سے وہ انتہائی حساس رہے اور بعض دل بستگیوں کے باوجود خارجی دنیا سے ان کے تعلقات میں ایک بے اطمینانی کی کیفیت کو بھانپ لینا کچھ ایسا مشکل نہیں ہے ۔ شاعر کے مشاہدہ ، نفس سے ان کے اس یقینِ کلی میں شدت ہی پیدا ہوتی تھی کہ وہ مخالفتوں کا ہدف ہیں ، ایک ایسے ماحول میں ہیں جو ان کی صلاحیتوں سے عناد رکھتا ہے اور ان کی غیر معمولی ذہانت و بصیرت کے ادراک سے قاصر ہے ۔ بارہا ان کے اشعار میں ہم سروں کی ان کے تئیں مخالفت سے پہنچنے والے صدمے کا عکس دکھائی دیتا ہے ۔

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب   بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

شخصی طرزِ زندگی میں ان کے عادات و اطوار اور اشغال ان کے طبقے کے دیگر افراد کی وضع کے ہی تھے ۔ چناں چہ وہ شراب پیتے تھے اور تقویٰ فروش پارساؤں کو برہم کرنے کے لیے اپنی مے گساری کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے اور مذہبی ریاضتوں سے اپنی بے اعتنائی کا برملا اظہار کرتے تھے ۔

امامِ شہر بہ مسجد اگر رہم نہ دہد   نہ جائے من بہ نیایش گہِ مغاں خالی ست

(اگر امامِ شہر مجھے مسجد میں داخلے کی اجازت نہ دے تو کیا ہوا پیرِ مغاں کی بخشش گاہ میں تو میری جگہ خالی نہ رہے گی)

باہم

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید ۔۔۔ مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ ان کی موجودگی میں کسی نے شراب نوشی کی بہت زیادہ مذمت کی اور کہا کہ شرابی کی دعا کبھی قبول نہیں ہوتی تو غالب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ جس کے پاس شراب موجود ہے پھر اس کم بخت کو اور کون سی دعا کی ضرورت ہے۔ غالب کا ایک اردو شعر اسی خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز ۔۔۔ سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے؟

ان کے لیے واعظ کو برداشت کرنا مشکل تھا۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو ۔۔۔ کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

اگر انھیں کسی چیز سے نفرت تھی تو ریاکاری سے۔

آلودہ ریا نتواں بود غالبا ۔۔۔ پاکست خرقہ کہ بہ مے شست و شو کند

(غالب آلودہ ریا نہیں ہوسکتا۔ جس خرقے کو شراب میں دھویا گیا ہو پاک ہوتا ہے)

مذہبی جماعت کے تعلق سے اپنے حقارت آمیز رویے کو ذہن نشین کرانے کے لیے وہ اکثر جان بوجھ کر شراب کے ذکر میں مذہبی اصطلاحات کو کام میں لاتے تھے۔

زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے ۔۔۔ آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم ۔۔۔ دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

قطع نظر ان تمام طنز زنی کے باوجود حالی کا کہنا ہے کہ خود غالب اعتدال سے پیتے تھے۔ وہ روزانہ تھوڑی سی فرانسیسی شراب دو تین حصے عرقِ گلاب کے ساتھ پیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ جو حد انھوں نے اپنے لیے مقرر کی تھی اس سے تجاوز نہ کریں (اپنی اس کوشش میں وہ ہمیشہ کامیاب نہ ہوتے رہے ہوں، یہ دوسری بات ہے)۔ وہ اس صندوق کی کنجی جس میں شراب رکھی جاتی تھی، اپنے خان سامان کلو کو اس ہدایت کے ساتھ سپرد کر دیتے تھے کہ جب وہ اپنے مقررہ حصے کی پی لیں تو پھر صندوق نہ کھولا جائے۔ بلاشبہ ایسے بھی مواقع آتے تھے جب ان کی ہدایات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے پر کلو کو برا بھلا بھی کہتے اور وہ بھلا آدمی سنی ان سنی کر کے اپنے کام میں لگا رہتا۔ بہ ظاہر شراب کی مقدار موسم کے ساتھ بدلتی رہتی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں لکھے ہوئے ایک خط میں وہ یاد کرتے ہیں کہ جب وہ چالیس کے پیٹے میں تھے تو برسات کے موسم میں بالعموم ان کا معمول رات کے مقررہ حصے کے علاوہ دوپہر کے کھانے سے پہلے بالالتزام ہوتے ہوتے تین گلاس شراب پینے کا تھا۔

کیا خود پر عائد کی ہوئی ان پابندیوں پر وہ جوانی کے زمانے میں سختی کے ساتھ عمل بھی کرتے تھے، اس پر بحث کی کافی گنجائش ہے۔ تاہم غالب کے کلیاتِ فارسی اور اردو مجموعہ کلام دونوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں وہ حد سے تجاوز اور بے تحاشا مے نوشی کی مذمت کرتے ہیں۔

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر ۔۔۔ جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

[illegible] ۔۔۔ مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو

(غالب میں [illegible] شراب کا پینا حرام ہے [illegible] اپنی بات کا [illegible] نہیں تھا) [illegible]

تھیں کہ غالب کو شراب پسند تھی۔ حالانکہ وہ بادہ نوش نہیں تھے لیکن اگر بادہ میں عدم دست یابی کی وجہ سے (جیسا کہ [illegible] ۔ [illegible] تھا) یا اس صورت میں جب کہ خریدنے کے لیے پیسے نہ ہوں اور ادھار نہ مل رہی ہو انھیں ان کا [illegible] کا حصہ ۔ [illegible] [illegible] محض [illegible] ۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کے پاس مے نوشی کی کئی وجوہات کی [illegible] تاویلیں بھی تھی۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

[illegible] [illegible] و [illegible] ۔ [illegible] حلال و حرام نیست

([illegible]) [illegible] پر قوم کی جراءت ہے اور شراب جاری رہا ہے ۔ بچوں کے لیے حلال و حرام کی باتیں کیسی ؟ ۔ حالانکہ وہ ہمیشہ [illegible] تنگ دست رہتے انھوں نے شراب پر پیسہ خرچ کرنے کو یا جب بھی ممکن ہوا اسے ادھار خریدنے کو کبھی غلط نہ سمجھا ۔

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں — یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

اکثر اوقات شراب فروشوں کے پاس ان کے واجبات قرضوں کی مجموعی قیمت اچھی خاصی ہوتی۔ [illegible] میں اپنے شاگرد تفتہ کے نام خط میں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ایک دوست کی بھیجی ہوئی سو روپے کی ساری رقم ایک انگریز شراب فروش کا ادھار چکانے میں خرچ ہو گئی ۔

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی — تھے یہ ہی دو حساب ، سو یوں پاک ہو گئے

وہ خصوصی طور پر ترجیح فرانسیسی شراب شمپین کو دیتے تھے اور بہت بعد میں جب شراب کی قلت تھی انھیں گھٹیا کی شراب رم کی تسکین [illegible] کا علم ہوا ۔

صاف دُردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ — وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

غالب کے جیسے حساس ذہن والے شخص کے لیے شراب نوشی محض [illegible] کا ایک لازمی عنصر ، شگفتہ گفتگو میں مدد اور مذاقِ [illegible] زندگی کا سہارا تھی ۔

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

فارسی اور اردو شاعری میں ابر آلود دنوں اور چاندنی راتوں کو مے نوشی کے لیے بالخصوص موزوں [illegible] کی حیثیت حاصل ہے اور غالب اس [illegible] کی تائید کرتے ہیں ۔

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

بقول حالی غالب اکثر شام میں [illegible] وقت سے مے نوشی شروع کرتے ۔ تنہائی میں ان کی انگلیاں [illegible] کمربند سے کھیلتی رہتیں اور جب بھی کوئی شعر موزوں ہو جاتا وہ اس میں ایک گرہ باندھ دیتے ۔ سونے کا وقت ہونے تک کمربند پر متعدد گرہیں ہوتیں اور صبح کو گرہیں کھولتے ہوئے ان کو اشعار یاد آ جاتے اور وہ انھیں قلم بند کر لیتے ۔ شراب ان کی تخلیقی صلاحیت اور قوتِ تخیل کو بڑھا دیتی تھی ۔ [illegible] اس شعر میں وہ کہتے ہیں :

حیرت پیالہ ، جلوۂ ساقی ، [illegible] مست — وہم خیالِ میکدہ ، بے خروش ہے

اسی مفہوم میں وہ کہہ سکتے تھے کہ :

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش — شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

شراب ، ساقی اور میکدے کا ذکر غالب کے کلام میں بار بار آتا ہے لیکن اردو [illegible] شاعری کی بہترین روایات کی مناسبت سے [illegible] مفہوم میں ۔ شاعر کی [illegible] شراب نوشی کے عمل کی قلبِ ماہیت [illegible] ہے ۔ [illegible]

موضوعات بُجھے ہوئے ہیں۔ ساقی خضرِ صادق بن جاتا ہے۔ شراب خانۂ رز کی طرف سے زندگی کی روح بن جاتی ہے اور معنوی روشن ضمیر کی روحانی مسرت۔ اس تصور کی ساحلیت میں شراب انسان کو پستی کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ انسان کو [illegible] آرزوؤں اور تمناؤں کی سطح تک بلندی عطا کرتا ہے۔

نقشِ بادہ گرچہ ہمارا ہے لیکن اے اسد بے ولائے ساقیِ کوثر کیمین شیخ ہے

قمار بازی یعنی شرط بد کر چوسر کھیلنا غالب کا دوسرا شوق تھا۔ حسبِ معمول اسے بھی وہ کسی سے چھپاتے نہیں تھے۔ ایک دن موسم گرما میں رمضان کے روزے کے دوران غالب کے قریبی دوست، معروف شاعر اور اسلامی قانون کے عالم مفتی صدرالدین آزردہ ان سے ملنے کے لیے گئے اور دیکھا کہ غالب ایک دوست کے ساتھ چوسر کھیل رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر مفتی صاحب نے کہا کہ مرزا صاحب ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید ہوتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت میں کچھ شبہ سا ہو رہا ہے۔ غالب نے انھیں خوش آمدید کہا اور جواب دیا۔ "قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر بات یہ ہے کہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے!"

مذہبی قدامت پسندوں کو خاطر میں نہ لانے کے ان کے رجحان سے اکثر خود انھیں کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا راستہ کھل جاتا تھا۔ حالی ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں جب کہ غالب نے اپنے خسر الٰہی بخش معروف کو جن کی مذہبی تقلید پسندی سے سبھی واقف تھے، جان بوجھ کر خفا کیا۔ حالاں کہ اس وقت غالب کا بڑی حد تک ان کی سرپرستی پر انحصار تھا۔

معروف نے اپنے سلسلے کے مشائخ کا شجرہ غالب کے حوالے کیا تھا کہ اس کی نقل کر دو۔ غالب نے نقل تو تیار کر دی لیکن مشائخ کے نام اس طرح لکھے کہ ایک لکھا تو دوسرا حذف کر دیا۔ جب معروف نے اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ "حضرت، شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے سو زینے کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ سے نکال دی جائے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا۔ آدمی ذرا اچک کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔" معروف نے برہمی کے ساتھ نقل پھاڑ ڈالی۔

مسئلۂ عقائد کے تعلق سے غالب کی بے اعتنائی اس زمانے کے وسیع المشرب، صوفی مزاج سے بہ خوبی ہم آہنگ تھی۔ وہ کبھی رمضان کے روزے نہیں رکھتے تھے اور اس کا اعتراف کرنے کے لیے تیار تھے۔ وہ اپنے عیب کے معترف تھے۔ وہ عیش کی زندگی گزارتے تھے اور ایسا لگتا ہے کہ خاصی ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزارتے تھے۔ وہ شکیل و جمیل تھے اور اس کا انھیں احساس تھا۔ کئی سال بعد ایک دوست کے نام خط میں وہ اپنی دل کش شکل صورت کو اپنی مخصوص شوخی کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ "۔۔۔ یہ بہرحال تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔" حالی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ غالب بوڑھے ہو چکے تھے جب حالی کی ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی لیکن تب بھی دکھائی دیتا تھا کہ جوانی میں وہ بہت خوب صورت رہے ہوں گے اور متعدد لوگوں نے جنھوں نے غالب کو ان کی جوانی میں دیکھا تھا، حالی سے اس کا ذکر کیا۔ حقیقی بات ہے کہ محبوبوں (یا اغلباً دیگر عورتوں) کے ساتھ غالب کا راز و نیاز قصہ جلد، شاید آگرے ہی میں شروع ہو گیا۔ آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد لکھے ہوئے ایک خط میں وہ آگرے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یہ [illegible] شہر [illegible] سیر کی باتیں کرتا تھا ۔۔۔ ایسی گل زمینیں ہیں [illegible] اور کوئی [illegible] نہ ہوتا تھا۔" [illegible] بھی یہی حال تھا۔ جس شہر سے غالب کا تعلق تھا ان کے لیے کوئی بھی معمول بات نہیں تھی۔ عمر کے [illegible]

خصوصاً اس صورت میں کہ وہ ایک نیا نیا شاعر بھی ہو، یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ طوائف کے کوٹھے کی سیر کو بھی جایا کرے گا۔ یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ غالب نے اس مستحسن ضابطۂ اخلاق سے انحراف کیا ہوگا اور اس طرح کے معاملات کے ذکر سے انھیں پھر کسی احساسِ جرم کا اظہار نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ۱۸۶۱ء میں لکھے ہوئے ایک خط میں وہ قدرے غیر شاعرانہ انداز میں اس میں وہ ایک طوائف کے ساتھ اپنے قول قرار ربط ضبط کی یاد تازہ کرتے ہیں، جس کے ساتھ ان کی بے تکلفی تھی اور جس کے ساتھ وہ گھنٹوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے۔

بہت سے اتفاقیہ معاشقوں کے منجملہ ایک ایسا سچا عشق بھی تھا جس نے بظاہر ان کی نفسیاتی ساخت پر گہرے زخم کا نشان چھوڑا۔ اس واقعے کے بارے میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں بجز ان دو اذکار کے جو خود غالب کے بعد کے خطوط میں ملتے ہیں۔ اپنے ایک دوست مہر کے نام خط میں جن کی محبوبہ ان کو داغِ مفارقت دے گئی تھی وہ لکھتے ہیں، "بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآں کہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے میں بیگانہ محض ہو گیا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔۔۔" اس خط پر تاریخ نہیں ہے لیکن اس کا تعینِ زمانی ۱۸۶۰ء کے آس پاس کیا گیا ہے۔ چالیس بیالیس برس قبل کا مطلب ہوا کہ اس معاشقے کے وقت غالب تیئیس سال کے رہے ہوں گے۔ ایک قریبی دوست مظفر حسین خاں کے نام لکھے گئے ایک اور خط میں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ ان کی جوانی کا ہے، "عینِ جوانی میں جب میرے اعمال میرے بالوں سے بھی زیادہ سیاہ تھے اور سر میں پری رویوں کا سودا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، بدنصیبی نے تلخی سے بھرا ہوا ایک جام میرے سامنے بھی رکھا تھا اور دوست کے جنازے کی رہ گزار کے غم آمد غارت نے میرے صبر و ثبات کو بھی خیابانِ راہ کی طرح بکھیر دیا تھا۔" یہ بات واضح ہے کہ یہ لڑکی ڈومنی یعنی ناچنے گانے والی لڑکی تھی اور یہ کہ معاشقہ چند روزہ تھا کیوں کہ جلد ہی، شاید الم ناک حالات میں اور قطعی طور پر عنفوانِ شباب میں اس کی موت واقع ہوئی۔ یہ بات بھی اتنی ہی واضح ہے کہ تعلق چند روزہ ہی سہی، نہایت گہرا تھا۔ غالب، مظفر حسین خاں کے سامنے اپنے کرب کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں، "روزِ روشن میں سیاہ ماتمی کپڑے پہنے اپنی محبوبہ کے غم میں آنسو بہاتا ہوا میں بچھونے پر بیٹھا رہتا اور فراق کی شبِ تار میں اس کی شمعِ فانوس پر پروانے کی طرح شعلہ در آغوش رہتا۔ کیسی کھلی ناانصافی ہے کہ اس نازک اندام کو سپردِ خاک کرنا پڑا جو بسترِ راحت پر میری شریک تھی اور جس کو وقتِ رخصت رشک کے باعث خدا کو سونپنے میں بھی مجھے ڈر لگتا تھا۔" بالکل صریحی طور پر یہ تعلق اتنا ہی گہرا تھا جتنا کہ مادّی اور اس کی یاد کا سایہ غالب پر ساری عمر منڈلاتا رہا۔

ایسا لگتا ہے کہ ڈومنی کی موت کے بعد غالب کا فطری ردِ عمل یہ تھا کہ مستقبل میں خود کو ایسے کسی تجربے کے کرب سے محفوظ رکھیں۔ ساتھ ہی ساتھ، جیسا کہ ان کا خاصہ ہے، ان کی کوشش یہ رہی کہ اپنے شخصی تجربے کے صدمے کو ایک وسیع تر فلسفیانہ معاملے کے تحت لے آئیں۔ "محل میں کتنی شمعیں فروزاں ہیں اور چمن میں کتنے گلاب کھلے ہیں؛ تو کیا پروانہ ایک ہی شمع کے غم میں جل مرے اور بلبل ایک ہی گلاب کے مرجھانے پر آہ و زاری کرتا رہے؟ آدمی کو تماشائے حسن، تماشائے رنگ و بو کا دیوانہ ہونا چاہیے، کسی ایک اکیلی محبوبہ کا اسیر نہیں۔ بہتر ہے کہ محفلِ عشرت میں وہ پھر ترانۂ مسرت الاپے اور ان خوب رویوں کو اپنی آغوش میں بھینچنے کے لیے بازو پھیلائے جن میں یہ صلاحیت ہے کہ اپنے عشاق میں شوقِ حیات کو دوبارہ زندہ کریں اور خود بھی اس کا لطف اٹھائیں۔" [illegible]

غم کی شدت کم ہونے پر تھی ۔ لاادریت کا سہارا لینے کے مترادف نہیں تھا اور نہ ہی یہ کسی ایک سچے قلبی تجربے کی اہمیت کو گھٹاتے ہوئے اتفاقی تعلقات کو ضرورت سے زیادہ وقعت دینے کی کوئی کوشش تھی ۔ بلکہ یہ غم کے ناگزیر ہونے کو، مگر اس سے بھی زیادہ مسرت کے امکان کو تسلیم کرتے ہوئے ذاتی غم سے ماورا ہوجانے کی آرزو تھی ۔ خالقِ مطلق کے کرم کو محض کسی ایک تجربے تک محدود نہیں کیا جاسکتا ۔ اس نے اس کی تمام اشکال میں مسرت اندوز ہونا چاہیے ۔ وجود کے تنوع کا فلسفیانہ جواز ہے ۔ یہ سراسر مادی ۔ حسی انبساط کا لازوال سرچشمہ بھی ہے ۔ ہمارے پاس اس کے مطالبے کی صلاحیت ہونی چاہیے ۔ ہمیں خود اپنی نظر کی کوتاہی سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے :

صد جلوہ رو بہ رو ہے جو مژگاں اٹھائیے　　　طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

اس خاطر میں وہ رنج و الم کے ناپائدار لمحوں کا مذاق اڑا سکتے تھے اور اپنے دوست مہر کی سرزنش کرسکتے تھے کہ اگر ایسے ہی گرفتاری سے خوش ہو ، تو چُنّا جان نہ سہی ، منّا جان سہی ۔ وہ لکھتے ہیں ، "کسی کے مرنے کا وہ غم کرے ، جو آپ نہ مرے ۔ ۔ ۔ آزادی کا شکر بجالاؤ ۔ ۔ ۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی ۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے ۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی ۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی ۔ وہی زمردیں کاخ ، اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ ، چشمِ بددور ، وہی ایک حور ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ غالب کی مخصوص ظرافت تھی جس سے وہ افسردہ دلی سے بچاؤ کے لیے سپر کا اور غم کی تلخی کو کم کرنے کے لیے مٹھاس کا کام لیتے تھے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مکتوب الیہ سے محبوبہ کی موت کا ذکر اس لاابالی پن سے صرف چالیس سال بعد ہی کرسکتے تھے جب کہ وقت نے خود ان کے "زخمِ مرگِ دوست" کو ایک حد تک مندمل کردیا تھا ۔ پیرانہ سالی میں بھی انھیں اعتراف تھا کہ ان کی پہلی محبوبہ کی یاد کی کسک ان کے دل میں اب بھی برقرار ہے ۔ اس کی موت کے وقت ان کا بے ساختہ کرب اتفاقی جان لیوا تھا ، جس کی تلافی بعد کی حسی تمناؤں سے نہیں ہوئی تھی ۔ یہ اس دل گداز نوحے سے ظاہر ہے جو اس کے مرنے پر انھوں نے لکھا تھا (اس کے کچھ اشعار ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں) اور جو بہ قول پروفیسر مجیب "ایک ایسے امرِ واقعہ کی نشان دہی کرتا ہے جو ان کے ساتھ شاذ و نادر ہی پیش آتا تھا ، یعنی شاعرانہ عشق و الم کی لطیف فضاؤں سے شدت سے محسوس کیے جانے والے ارضی غم و اندوہ اور سراسر مادی جذبے کے سچے بیان کی طرف نزول ۔"

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ　　　تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ، ہائے ہائے !
کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال ؟　　　دشمنی اپنی تھی ، میری دوست داری ، ہائے ہائے !
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا ؟　　　عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ، ہائے ہائے !
گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا ؟　　　خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ، ہائے ہائے !
عشق نے پکڑا نہ تھا ، غالب ابھی وحشت کا رنگ　　　رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ، ہائے ہائے !

اس مطالعے کے رنج و الم سے قطع نظر کریں تو دلّی میں غالب کے ابتدائی سالوں کے اصل واقعات کو اس کی تکمیل ہی کہا جاسکتا ہے ۔ بہ حیثیت شاعر ان کی شہرت اب بھی محدود تھی ہونے کے باوجود مسلّم تھی اور روز افزوں تھی ۔ چاپلوس نقادوں کے طبقے میں انھیں قبول کرلیا گیا تھا اور اس نتیجے میں انھیں ایسی سماجی شہرت مل گئی جو انھیں دوستوں کے حلقے میں ایک امتیازی حیثیت بخشتی تھی ۔ ان کے بہت سے دوست تھے ، وہ بھی شراب پیتے تھے ، پابندی سے ملنے والی [illegible] کی [illegible] سے [illegible]

[illegible] اور طوائفوں کے کوٹھوں کو جایا کرتے تھے۔ بس ایک مسئلہ ابھرا تھا اور وہ تھا ان کے [illegible] مفلسی پن کا۔ غالب کی [illegible] آمدنی پانسو روپیہ ماہوار کی تھی۔ یہ اس موروثی پنشن میں ان کا حصہ تھا، جو انگریزوں کی طرف سے غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کے ورثا کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ اس زمانے کی ارزانی کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حقیر رقم نہیں تھی۔ لیکن اس معیارِ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے جو غالب نے اختیار کرنا پسند کیا تھا، یہ بالکل ناکافی تھی۔ ان کے شوق مہنگے تھے، فرانسیسی شراب اور قمار بازی۔ اور ان کا معاملہ نہ صرف اپنی ان لت کی شدت کی وجہ سے قابلِ توجہ ہے بلکہ محبوبہ کا خرچ برداشت کرنے کے لیے ان کی تنگی کی وجہ سے بھی۔ ایسا نہیں ہے کہ روپیہ پیسے کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس کے برعکس انھیں ساری عمر ان کی ضرورت کا شدت سے احساس رہا۔ روپیہ پیسوں کی بے شک اہمیت تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ ان کے دوسرے میلاناتِ طبع کو قابو میں لاسکے۔ پیسے کی کمی ان کو زندگی بسر کرنے کے صحیح طریقے کے بارے میں اپنے قطعی تصورات کو جوکھوں میں ڈالنے پر کبھی مجبور نہیں کرپائی۔ ساری عمر ان کی ضرورت تو انھوں نے ضرور محسوس کی لیکن انھیں مقصدِ اصلی کی حیثیت سے قابلِ قدر کبھی نہیں سمجھا اور آگے چل کر جب انھوں نے اقرار کیا کہ روپیہ پیسے کو انھوں نے ہاتھ کے میل سے زیادہ کبھی نہیں سمجھا تو اسے اظہارِ حقیقت ہی پر محمول کرنا چاہیے۔

ناگزیر طور پر قرض لینے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا اور اتنے ہی ناگزیر طور پر قرض چکانے کا بھی کوئی وسیلہ نہ تھا۔ اس امر کی شہادت ہے کہ ابتداءً قرض غالب کے لیے سہل الوصول تھا، رشتہ دار زیادہ مہربان تھے، دکان دار زیادہ با مروت تھے اور ساہوکار ان کے خاندانی اسبابِ روشناسی سے اور سماج میں بہ حیثیت مجموعی ان کے رتبے سے زیادہ مرعوب تھے۔ وفات سے کچھ سال پہلے وہ حسرت کے ساتھ ان گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتے ہیں جب وہ متھرا داس، دربای مل یا خوب چند چین سکھ جیسے بستیرے ساہوکاروں سے انھیں یہ موقع دیے تمسک مہری دے کر آسانی کے ساتھ قرض حاصل کرلیتے تھے۔ فی الحقیقت جنھیں ممنون رکھنے کی بھی ان ساہوکاروں کو زحمت نہیں اٹھانی چاہیے تھی۔ کیوں کہ آخرکار وہ نہ تو قرض کی اصل رقم وصول کرپاتے تھے اور نہ ہی سود؛ مزید برآں اس وقت ان کے گزارے کے اخراجات ان کی بیوی ادا کرتی تھیں۔ لوہارو سے احمد بخش خاں وقتِ ضرورت رقوم بھیج دیا کرتے تھے اور آگرے سے ان کی والدہ جو ابھی بہ قیدِ حیات تھیں روپیہ پیسے بھیجتی تھیں۔

لیکن جب ان کے قرضوں میں اضافہ ہوا اور ادائگی سے قاصر رہے ان کے قرض خواہوں کے صبر کا پیمانہ بھی بھرنے لگا۔ ۱۸۲۶ء تک ان کے معاملات کا یہ پہلو خطرناک حالت تک پہنچ چکا تھا۔ اس بارے میں ان کے تفکرات میں اب ان کے بھائی کے خللِ دماغ کا رنج و ملال بھی شامل ہوگیا۔ بعد میں وہ اپنی زندگی کے اس دور کا ایک حد تک چٹخارے کا رنگ لیے ہوئے مخصوص فصیح و بلیغ انداز میں ذکر کریں گے۔ اپنی "بے فکری" کے ان دنوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ناعاقبت اندیشانہ طرزِ زندگی پر مستقل مزاجی سے قائم رہتے ہوئے میں فرشِ سکوت پر ٹھوکر کھاکر جو گرا تو ایک طرف بھائی کی دیوانگی کے صدمے نے تو دوسری طرف قرض خواہوں کے مسلسل تقاضوں نے مجھے شدت کے ساتھ حقیقت کا احساس دلایا۔

چنانچہ بلاشبہ وقت آگیا تھا کہ اصلاحِ حال کے لیے کوئی تدبیر سوچی جائے۔ عادات و اطوار اور طرزِ زندگی میں تبدیلی بہت مشکل تھی۔ دوسرا واحد چارۂ کار آمدنی میں اضافہ تھا۔ یہی وہ حالات تھے جن میں انھوں نے انگریزوں کی عطا کی ہوئی پنشن میں اپنے حصے کے بارے میں تحقیقات شروع کیں۔ غالب اس نتیجے پر پہنچے کہ احمد بخش خاں نے جن کے ذریعے پنشن کی ادائگی ہوتی تھی، ورثے کے غالب کے حصے کو مقررہ دس ہزار روپے سے گھٹا کر پانچ ہزار روپے قرار دے کر انھیں عمداً ان کے جائز حق سے محروم کیا ہے۔ اس کے علاوہ

کے جائز حق دار یوسف خاں یعنی غالب کے چھوٹے بھائی کو حصہ داروں کی فہرست سے خارج کرتے ہوئے انھوں نے اس میں خواجہ
یبے دعوی داروں کو شامل کرلیا تھا جن کی غالب کے چچا سے کوئی رشتہ داری نہیں تھی ۔ ان کا پہلا ردِ عمل یہ تھا کہ احمد بخش خاں سے
کریں ۔ "ہر ممکنہ طریقے سے میں نے اپنے حقوق کے سوال کو حرکت میں لانے کی کوشش کی اور بار بار تحریری طور پر بھی اور زبانی
ہیم کے ذریعے بھی اپنے معاملے کے بارے میں احمد بخش خاں کو توجہ دلائی ۔ ۔ ۔ " شروع میں ایسا لگتا ہے کہ رشتہ داری کے پاس و لحاظ
ب کو علانیہ نزاع سے باز رکھا ۔ " چوں کہ احمد بخش خاں دو رشتوں سے میرے بزرگ اور قرابت دار تھے ، اولاً اس طرح سے کہ میرے
اللہ بیگ خاں ان کے داماد تھے ، ثانیاً اس طرح کہ میں ان کے بھائی الٰہی بخش خاں کا داماد ہوں ۔ ۔ ۔ ابت کو ملحوظِ خاطر رکھتے
میں احمد بخش خاں کی بزرگی اور قرابت داری کی عزت کرتا تھا اور اپنے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کی ۔ ۔ ۔ ر خاموشی سے برداشت
۔ میں نے اپنے بھائی کو بھی اپنی ناخوشی کا اظہار کرنے اور حکومت سے چارہ جوئی سے روکا ۔" لیکن پھر متعدد واقعات یکے بعد دیگرے
ئے ۔ ۱۸۲۲ء میں احمد بخش خاں نے اپنی گدی اپنے سب سے بڑے بیٹے شمس الدین خاں کے حق میں چھوڑ دی ۔ شمس الدین غالب پر
نہیں تھے کیوں کہ غالب کے شمس الدین خاں کے سوتیلے بھائیوں امین الدین اور ضیاء الدین سے زیادہ قریبی تعلقات تھے ۔ فی الحقیقت
ین غالب کے نہایت قریبی دوستوں میں سے تھے ۔ ۱۸۲۵ء میں غالب کے خسر کا انتقال ہوگیا اور اس طرح اندر ہی اندر بڑھتی ہوئی ہم
ی اس نزاع کو حد کے اندر رکھنے والا ہاتھ بھی اب نہ رہا ۔ اس وقت تک غالب کے قرضے نہایت تکلیف دہ ہوچکے تھے ۔ انھیں مزید
پیسوں کی ضرورت کا عین اس وقت احساس ہوا جب کہ شمس الدین خاں نے انھیں پنشن کی مقررہ ادائگیوں کے تعلق سے دق کرنا
لیا ۔ پھر بھی غالب پُر امید رہے کہ احمد بخش خاں بیچ میں پڑ کر معاملے کی یک سوئی کردیں گے ۔ لیکن بالکل صریحی طور پر موخر الذکر کا
ی ارادہ نہیں تھا اور وہ اپنے لیے غالب کے پاس و لحاظ کا ناجائز طور پر فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹال مٹول کی تدبیریں اختیار کرنے سے بھی
ں چکتے تھے ۔ غالب ایک واقعہ بیان کرتے ہیں ۔ جب اس انتظار کے بعد کہ احمد بخش خاں اپنا وعدہ پورا کریں گے وہ فیروز پور گئے اور
کہا ، " اب آپ اپنا وعدہ ایفا کریں اور قانونی مالکوں کو ان کے حقوق بحال کریں یا پھر مجھے اجازت دیں کہ میں اپنا معاملہ حکومت کے
پیش کروں ۔" غالب لکھتے ہیں کہ احمد بخش خاں " اس وقت ایک زخم کے نتیجے کے طور پر اپنے بسترِ علالت سے ابھی ابھی اٹھے تھے
کی مختاری سے محروم ہوجانے کی وجہ سے بے حد دل شکستہ تھے ۔ چناں چہ وہ میرے سامنے رونے اور سسکیاں بھرنے لگے اور کہا ،
، میاں ، تم میرے فرزند اور آنکھوں کی روشنی ہو ، دیکھو مجھے کیسا صدمہ پہنچا ہے ، کتنا ٹوٹ گیا ہوں اور کیسے میرا حق مارا گیا ہے ۔ اس
وہ میرے اور جنرل اخترلونی کے درمیان دوستی اور خلوص کا رشتہ بھی باقی نہیں رہا ۔ اور کچھ دن صبر کرو ، تمھارے حقوق بالآخر پوری
ل کردیے جائیں گے ۔" اخترلونی کے انتقال کے بعد احمد بخش خاں نے یہ امید دلائی کہ وہ اس کے جانشین چارلس مٹکاف سے ایک
سند جاری کروادیں گے ۔ مٹکاف کا قیام اس وقت بھرت پور میں تھا چناں چہ احمد بخش خاں نے غالب سے کہا کہ مٹکاف سے ملاقات
، وہ ان کے ساتھ وہاں چلیں ۔ غالب لکھتے ہیں کہ ، " باوجود اس کے کہ اس تمام عرصے کے دوران میں اپنے بھائی کی بیماری کی
، اور قرض خواہوں کے تقاضوں اور سخت اصرار سے پریشان تھا اور کسی طرح سے بھی سفر پر جانے کے لائق نہیں تھا ، پھر بھی صاحب
ے سے اظہارِ عقیدت کی امید میں اپنے بھائی کو میں نے بخار اور ہذیان کی حالت میں چھوڑا ، اس کی نگہ داشت اور نگہ بانی کا کام چار
، کے سپرد کیا ، اپنے بعض قرض خواہوں کو مختلف وعدوں سے دلاسا دیا ، دوسرے قرض خواہوں کی نظروں سے خود کو چھپایا اور پوشیدہ
کسی طرح کی سہولت کے بغیر ۔ ۔ ۔ بڑی مشکل سے احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور کے لیے روانہ ہوا ۔"

(باقی ص : ۸۶ پر)

یوسف میخائلوچ ارانسکی
ترجمہ: اُسامہ فاروقی

حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان (وسط ایشیا) ماسکو ۱۹۷۷ء

(قسط: ۶)

افعال:

زبانِ پریا کے ترقی یافتہ نظامِ افعال میں مفرد اور مرکب افعال کی ایک بڑی تعداد، حالیے اور مصادر شامل ہیں۔ فعل کی مفر ہیئتوں کی تشکیل ساق کی بنیاد پر شخصی اختتام کی مدد سے ہوتی ہے جب کہ مرکب ہیئتوں کی تشکیل حالیوں کی بنیاد پر مختلف معاون افعال ؤ مدد سے ہوتی ہے۔ ہندوستانی اور دیگر قریبی ہم رشتہ زبانوں سے موازنے کے لئے افعال کے شخصی اختتام کے نظام، رابطی فعل کی گردان حالیوں اور مصادر کی اقسام اور آلی فاعلی ساخت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

عام طور سے ایک یا دو صوت ارکان پر مشتمل، فعل کی ساق کا اختتام مصمتے یا مصوّتے پر ہو سکتا ہے:۔ mar مَر (مارنا، مار ڈالن چوٹ لگانا)'۔ kar- کر (کرنا)'۔ tar- تَر (رکھنا)'۔ ut اُٹ (اُٹھنا)'۔ dek^h دیکھ (دیکھنا)'۔ lik^h لکھ (لکھنا)'۔ par پڑ (پڑھنا)'۔ pešan- پشن (پہچاننا، جاننا)'۔ pugur- پُگر (پکڑنا)'۔ de- دے (دینا)'۔ le- لے (لینا)'۔ a- آ (آنا)'۔ ja جا (جانا)'۔ k^ha- کھا (کھانا)'۔ pi- پی (پینا)'۔ bala- بلا (بلانا، پکارنا) وغیرہ۔ مصمتے پر ختم ہونے والی ساقیں شخصی اختتام کے جُڑنے پر تغیر پذیر نہیں ہوتیں جبکہ مصوّتے پر اختتام کی صورت میں یہ (ہندوستانی کی طرح) مختلف صوتیاتی تبدیلیوں سے دوچار ہوتی ہیں۔

فعل کی محض ساق طورِ امر واحد مخاطب کے طور سے استعمال میں آتی ہے: lukuī (n) -ta balá لکوئن تابلا (لوگوں اُ بُلا)۔ patiji-par-ta mare beta-tade- پتیجی پر تا میرے بیٹا تادے (اپنی بھتیجی میرے بیٹے سے بیاہ دے)۔ ruti k^ha روٹی کھا (روٹی کھا)۔ ja- جا (جا)۔ kâm kar کام کر (کام کر) وغیرہ۔ جمع مخاطب کی تشکیل ساق کی بنیاد پر اختتام o,-ou- او، اوء کی مدد سے ہوتی ہے۔ (ہندوستانی o- او، پنجابی o- او): is ta palez- ma varou, apre- yaraša xarbuzo čunou, is ta javâl-ma kalou, اس تا پلیز ما وڑوء، اپرے یرَشا خربزہ چُنو، اِس تا جوال ما کلو (اس باغیچے میں داخل ہو، اپنے مطابق / یعنی اپنی مرضی کے مطابق / خربوزے چُنو، انھیں تھیلے میں رکھو)۔ sust karóu سُست کرو (ڈھیلا کرو / ہماری بیڑیوں کو / ...)۔ tamap ran karo تُم آپ رَن کرو (تم آپ اپنا بیاہ کرلو)۔ tin rat ma-ta rako تن رَت ما تا رَکو (تین رات میری رکھوالی کرو) وغیرہ۔

a- (آ) پر ختم ہونے والی ساقوں سے جب طورِ امر جمع مخاطب کا اختتام جوڑا جاتا ہے تو دُہرا مصوّتہ ou- اُوء بالعموم ساقط ہو جاتا ہے: —— jau جاؤ، ajou آجوء (... کے ساتھ ساتھ)۔ k^hau کھاؤ، lau لاؤ وغیرہ۔ ساق a- آ (آنا) کی بنیاد پر تشکیل پانے والا صیغہ امر صرف aja آجا (آجا واحد مخاطب) اور ajou اجوء، ajov اَجوو (آجاؤ جمع مخاطب) کی شکل میں مستعمل ہے۔

صیغہ امر کی منفی اشکال دو طرح کی ہو سکتی ہیں:

(۱) حرفِ نفی na+ فعل کا طورِ امر: na-ja نہ جا، na-k^ha نہ کھا۔ مرکب افعال کی صورت میں حرف نفی مرکب فعل کے اسمی اور فعلی اجزا کے درمیان استعمال ہوتا ہے: gal na -kar گل نہ کر (بات نہ کر)۔ larái ná karou لڑائی نا کرو (لڑائی نہ کرو)، gum na-kar گم نہ کر وغیرہ۔

(۲) فعل کا طورِ امر + حرف نفی ni: نی ni آ ya ja ni: آئیں یا جانی (یہاں نہ جا)۔ karavat- para-bet ni کروات پر ایبٹ نی (پلنگ پر مت بیٹھ)۔ irat-ke čuri-par-ta karõ (u) ni اِی رات کے چُری پر تا کرو ونی (یہ رات کی چوری چھوڑو)۔

طورِ امر کی زمانہ حال مستقبل کی ہئیتیں فعل کی ساق کی بنیاد پر شخصی اختتام کی مدد سے تشکیل پاتی ہیں۔ طورِ امر کے زمانہ حال مستقبل کے شخصی اختتام کا نظام ہندوستانی، گجراتی اور بالخصوص راجستھانی کے طورِ امر کے شخصی اختتام کے نظام سے مشابہت رکھتا ہے (دیکھیے جدول ۷)۔ نمایاں خصوصیت ہندوستانی کے ان موقعوں پر مستعمل یک مصوتوں (o-,ẽ-,e-,ũ-) کی بجائے دُہرے مصوتوں ui-(واحد متکلم)، ai-(واحد حاضر اور واحد غائب)، ai-(جمع متکلم) au-(جمع حاضر) کا اور ۔ رابطی فعل کی مدد سے تشکیل پانے والے جمع حاضر (؟) و غائب کے اختتام کا استعمال ہے۔ زبانِ پریا میں واحد متکلم کا اختتام (ũ-,ui,ũi) اُس ۔ ۔ ال طور سے پنجابی لہندا اور سندھی سے الگ کرتا ہے جہاں اس موقع پر ã مستعمل ہے۔

جدول ۷: طورِ بیانہ کے زمانہ حال مستقبل کے شخصی اختتامات:

عدد	صیغہ / زبان	زبانِ پریا	ہندوستانی	راجستھانی	گجراتی
واحد	متکلم	-ũi,-uĩ-ũ(n)-	-ũ	-ũ	-ū
	مخاطب	-ai	-ẽ	-e,-ai	-e
	غائب	-ai	-ẽ	-e,-ai	-e
جمع	متکلم	-aĩ, -ai	-e	-a	-ie
	مخاطب	-au(-aučo?)	-o	-o	-o
	غائب	-ĩ(-in') čʰi	-ẽ	-ẽ, -ai, -aĩ	-e

مصمتوں پر ختم ساق رکھنے والے افعال کی گردان کا نمونہ طورِ بیانہ زمانہ حال مستقبل کے لئے حسب ذیل ہے
(فعل -par پڑ یعنی پڑھنا):

	واحد	جمع
متکلم	me parũi مے پڑوں ئی	ham parai ہم پڑئی
حاضر	tu parái تو پڑائی	tam parau čo تم پڑو چو
غائب	e paraí او پڑائی	u parĩ čʰi اُپڑیں چھی

مصوتے پر ختم ساق رکھنے والے افعال کی شخصی ہیئتوں کی تشکیل کے دوران ساق کے اختتام اور فعل کے شخصی اختتام کے درمیان سکتہ (وقفہ) معرضِ وجود میں آتا ہے جو بالعموم مصمتے (v(w (و) سے دور کیا جاتا ہے۔ (یہی صورت حال ہندوستانی میں بھی ہے)۔ اس دوران ساق کا اختتامی مصوتہ مختلف صوتیاتی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا ہے (عموماً اگلے شفوی کے زیر اثر لبیانے کے عمل سے گزرتا ہے) اور اکثر بیشتر تخفیف کے عمل سے دوچار ہوتی ہے۔ اکثر انفیت کی اختتام سے بنیادی مصوتے کی طرف منتقلی بھی مشاہدے میں آتی ہے۔ اس طرح سے اس قسم کے افعال کی گردان میں ساق اور تصریف کے اجزا کے مقام کی تعیین تو عمل میں آتی ہے اور زمانہ حال مستقبل کی ساق اور فعل کی ساق میں مطابقت ضروری نہیں ہوتی اور عام طور سے نہیں ہوتی۔

مثل کے طور پر فعل de دے، (ti) لے le، (tu) جا ja، (ka) کھا kʰa (kʰa) کی گردان کا موازنہ کیجئے

واحد

متکلم: دووئی (دُووئی، دُوئی، دوں) dōvai (dūvai, dūi, dū) لووئی (لووئی) lōvai (lūvai) (لوں وئی، لوں وئی)

(jūvai) جوائی (جوں وئی)

حاضر: duid vai lū(n)vai لوں وئی jovai (jōvai) جووائی (جوں وائی) kovai کووئی

غائب: duvai دُوائی luvai/luwai لوائی jovai (jāvai jāwai juvai) جووائی (جوائی جوائی) kʰovai کھوو

جمع

متکلم: dōvai(dūvai) دوں وئی (دوں وئی) lūvai لوں وئی jovai (jāvai, joi) جوں وئی (جوائی، جوں ای)

(n)vai کھوئی

حاضر: kʰau (کھاؤ)

غائب: jain ši جائن شی kai(n) či/kain ši کائن چی / کائن شی

طور بیانیہ زمانہ حال مستقبل کی شخصی ہیئتوں کے استعمال کی مثالیں:

واحد متکلم: jatku-pare- ta bakar dekʰuī جتکو پرے تا بکر دیکھوئیں (اپنے بچوں کو چاہتا ہوں).

ek čača taruī۔ (ایک ...) vere-ta axta karuī وےرے تا اختا کروں ئی (میں اپنے رسانڈ کو آختہ کر رہا ہوں / کروں گا)۔

me mači -ta puguruī (میں ...) ے مچی تا پگروئیں (میں ایک مچھلی پکڑ رہا ہوں / ...) چار کھتا ہوں / ایک چھار کھتا ہوں ... (اس کا ایک چھاپے / حرف بہ حرف: ایک ...)

fadara me ayl-pare- xatra xat likūī فدرا رے آیل پرے خترا خط لکوں ئی (کل میں اپنی ماں کے لئے خط لکھوں گا)۔

me sar kâki karū ے سر کاکی کروں (میں اپنے بالوں کو (حرف بہ حرف: سر کو) کنگھی کر رہا ہوں۔

واحد حاضر: tu ruti kʰavai تو رُتی کھوئی (تو روٹی کھا رہا ہے / کھانا کھا رہا ہے)۔ tu kitab parai تو کتب پڑ (تو کتاب پڑھ رہا ہے)۔

tero ti-ta kadun murs-a ... tu ji tarai? تو جی ترئی؟ (تیری / کوئی / بڑی بہن ہے؟)۔

tu karing likʰai? تو کارنگ لکھائی؟ (تو کر لکھتا ہے؟)۔ duvai? تو اپروتی تائذن مرسا دوائی؟ (تو اپنی بیٹی کا بیاہ کب کرے گا؟)۔

Mansur, tu parya sazi samjai? منصور، تو پریا سزی سمجائی؟ (منصور، تو پریار زبان / سمجھتا ہے؟)۔

واحد غائب: ō kitab parai او کتب پڑائی (وہ کتاب پڑھتا ہے / پڑھتی ہے)۔ saya- ...

muro-be kar tarai سایہ مُرو بے کر ترئی ... (ہم سایہ کے پاس بھی گھر ہے / حروف بہ حرف: میرا ہم سایہ بھی گ...

siment- (t)a ji karai سمنٹ تا جی کرائی (رکرین / سمنٹ اٹھا رہا ہے)۔ mundo her din- a hat- ...

pe-ta tuvai پیتا توائی (یہ لڑکا ہر دن ہاتھ دھوتا ہے)۔ Mansur bakar načai منصور بکر نچائی (... اچھا ناچتا ہے)۔

mi parai می پرائی (بارش ہو رہی ہے / مینہ پڑ رہا ہے)۔ dumbi dut duvai ڈمبی دُت دُوائی (بھیڑ دودھ دیتی ہے)۔

جمع متکلم: ham kar tarai ہم کر ترئیں (ہمارے پاس گھر ہے / ہم گھر رکھتے ہیں)۔

betai čai piyai ہم بیتائیں، چاء پیائیں (ہم بیٹھے ہیں، چائے پی رہے ہیں)۔ zimin-ta bald-nala kulbó karai ... زمین تا بلد نلا کلبو کرائیں ...

(ر ہم رزمین بیلوں سے جوتے ہیں)۔ ٹاٹا ٹھ paxta-ta čunaĩ sukõval daulat-(t)a dũval۔ (کپاس) چنیں سکھوویں دولت تاڈوں دوے (ر ہم رکپاس چنتے ہیں سکھاتے ہیں ریاست کو دیتے ہیں)۔

جمع حاضر: tum har din-a kitab paraụ čõ۔ (تم کھاتا کھارہے ہو)۔ تم اَوقت کھو tam avqat kʰau تم ہر دنا کتب پڑھو چو (تم ہر دن کتاب پڑھتے ہو)۔

جمع غائب: asmân-a dev-upari farin čʰi اسمانا دیو وپری فرن چھی (آسمان میں دیو اور پریاں اُڑ رہی ہیں)۔ agar dekʰyó leke čale jaĩn š'i اگر دیکھیو لے کے چلے جئن شی (اگر دیکھ لیں گے' لے کر چلے جائیں گے)۔ kʰain čʰi کھائن چھی (روہ رکھارہے ہیں)۔ parĩ či پڑیں چی (روہ رپڑھ رہے ہیں)۔

مستقبل سے ممکنہ نسبت رکھنے والے حقیقی واقعے کے اظہار کے لیے جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے بالعموم طور بیانیہ' زمانہ حال مستقبل کی ہیئتیں استعمال میں آتی ہیں۔ زمانہ مستقبل حقیقی کی ہیئتیں بہت کم استعمال میں آتی ہیں...... زبان پریا' ہندوستانی اور پنجابی میں طور بیانیہ زمانہ مستقبل کی گردان کا تعین کرنے والے اور فعل کی ساق سے جڑنے والے تشکیلیوں کا موازنہ جدول ۸ میں کیا گیا ہے۔

جدول ۸ : زمانہ مستقبل کی تصریف:

عدد	صیغہ / زبان	زبان پریا	ہندوستانی	پنجابی
واحد	متکلم مذکر	-õgũ(?)	-ũga	-ãga
	حاضر مذکر	-ago,-ogo	-ega	-ẽgã
	غائب مذکر	-ago	-egã	-egã
	غائب مونث	-ingi	-egĩ	-egĩ
جمع	متکلم مذکر	-ange	-ẽge	-ãge
	حاضر مذکر	-âge	-oge	-oge
	غائب مذکر	-inge	-ẽge	-ange

طور بیانیہ زمانہ مستقبل کی شخصی ہیئتوں کے استعمال کی مثالیں:

واحد متکلم مذکر: bili kovaị ke :"paị, fadāra kõṛṛo-so maraị, hadi bot-o jovaị, tu kovago , mi kõgũ". بلی کووئی کہ: "پئی فدرا کوڑو سو مرئی ہڈی بو تو جووئی' تو کووگو' می کوں گو" (بلی رکہتی ہے رکہتی ہے کہ "ممیا' کل اُس کا گھوڑا مر جائے گا' ہڈی بہت ساری ہوگی' تو رجی بھر کے رکھائے گا' میں ربھی رکھاؤں گی)۔

واحد حاضر مذکر: چے خن' Petẽxan, čal jõva, pâčâ-nalá yaká-ma yaká laṛái karágo tu چل جوں وا' پاچا کلا یکا ما یکا لڑائی کراگو تو (پچی خان رفتح خان رچلتے ہیں' تو بادشاہ سے اکیلا لڑے گا)۔ tu rakago تو رکاگو (تو رکھوالی کرے گا)۔ yek din-a bâi baid-u-so maráị, hadi bõt jováị, tu kavogo, tu rajavogo. یک دنا بائی بلد و سو مرائی ہڈی بوت جوں وئی' تو کاوو گو' تو رجوگو (یک ہی دنوں میں مالک کا بیل مر جائے گا' ہڈی بہت سی ہوگی' تو رجی بھر کے کھائے گا' شکم سیر ہو جائے گا)۔

واحد غائب مذکر: [illegible] daulat-(t) a karo [illegible]

karage بائے مرے مرگ تا بر سے دولت تا کیٹرو بیٹا مڑو صاحب گری کراگو (میرے مرنے کے بعد میرا کون سا بیٹا میری دولت کا مالک ہوگا)۔ is munḍe-na ma-ta jak dovago اس منڈے نا ما تا جاک دوواگو (وہ ہمیں / مکان کے لئے / جگہ دے گا)۔ huwas karo ki: " e, xudoya, ka bala huva go ?" ہُواس کرو کہ "اے خدویا کا بلا ہُوا گو؟" (یہ دعا کم سر لیا "اے خدایا کیا بلا در پیش آئے گی؟")

واحد غائب مونث: vaxte ki jaṛingi, gã(n) hisab huvái وختے کہ جڑنگی گاں حساب ہُوائی (اُس وقت جب بڑے گی مر جائے گی / اس کا حساب / شمار رگایوں میں ہوگا)۔

جمع متکلم مذکر: in-na kiyo ke: "kin-ke aba-ta beṭun-si-na rake čo, ke ham rakange?" ان نا کیو کہ "کن کے ابا تا بیٹن سی نا رکے چو کہ ہم رکن گے؟" (انھوں نے کہا کہ "کس کے باپ / کی قبر / کی رکھوالی بیٹوں نے کی ہے کہ ہم رکھوالی کریں گے؟)۔

جمع حاضر مذکر: tin rat mere kabar-ka..... rakage تن رت مرے کبر کا..... رکاگے (تین رات میری قبر کی رکھوالی کرو گے)۔

جمع غائب مذکر: ya-se mata samjingé, aparé čale jainge یا سے متا سمجن گے اپرے چلے جئن گے (اس سے / لڑکے / سمجھ جائیں گے، آپ ہی چلے جائیں گے)۔

مسندی (خبری) افعالِ رابطہ: زبانِ پریا میں دو طرح کے مسندی (خبری) افعالِ رابطہ مستعمل ہیں۔ ساق۔ č̌ʰ (چھ) پر مشتمل فعل رابطہ کی تصریف کا دیگر ہند آریائی بولیوں کے افعال رابطہ کی تصریف سے موازنہ جدول ۷ میں کیا گیا ہے۔ پریا فعل رابطہ کی گردان سے پوری فعل رابطہ کی گردان سے (زمانہ حال اور ماضی دونوں میں) اور گجراتی فعل رابطہ کی گردان سے (صرف زمانہ حال کی حد تک) قریبی مشابہت رکھتی ہے۔

فعل رابطہ کی دوسری ہیئت -i (ای) غیر متبدل ہے اور صرف واحد متکلم، حاضر، غائب زمانہ حال کے لئے مستعمل ہے۔ اس کا موازنہ ہندوستانی، پنجابی اور لہندا کے فعل رابطہ کی واحد غائب زمانہ حال کے لیے مستعمل ہیئتوں hai, hẽ (ہَے، ہے) سے کیا جا سکتا ہے۔

فعل رابطہ کے زمانہ حال میں استعمال کی مثالیں:

(ا) فعل رابطہ -i (ای) (مصوتی اختتام کے بعد -i - ئ):

واحد متکلم: me bakar -i مے بکر ای (میں ٹھیک ہوں)۔ me kolxozči-ko beṭai مے کول خوزچی کو بیٹائی (میں کلخوزی کاشت کار کا بیٹا ہوں)۔ me bakar munḍoi مے بکر منڈوئی (میں اچھا لڑکا ہوں)۔ me kolxozči -ko biṭai مے کول خوزچی کو بِٹائی (میں کلخوزی کاشت کار کی بیٹی ہوں)۔

واحد حاضر: tu nukoi تو نکوئی (تو چھوٹا ہے)۔ tu pâčâi تو پاچائی (تو پادشاہ ہے)۔ tu kõ(n) -i? تو کونڑ ای؟ (تو کون ہے؟)۔ tu kur -i تو کُر ای (تو آتا گئی ہے؟)۔ tu... ziq -i? تو زِق ای؟ tu karing -i?* تو کرنگ ای؟ (تو کیسی ہے؟ / تیری طبیعت کیسی ہے؟ / مخاطب عورت سے)۔ tu kis- ki ran -i? تو کس کی رَن ای؟ (تو کس کی بیوی ہے؟)۔

واحد غائب: atarka rũ bot -i اترکا رُوں بوت ای (اس سال روئی بہت ہے)۔ vazir dânai وزیر دانائی (وزیر دانا ہے)۔ o pâšâ andoi او پاشا انڈوئی (وہ پادشاہ اندھا ہے)۔ tan zard -i تنگ زرد ای (گھوڑے کا تنگ زرد

* تو کرنگ ای؟ (تو کیسا ہے؟ / تیری طبیعت کیسی ہے؟ /)

ہے)۔ bitya ziq بیا زق ای (لڑکی نواس ہے ر آنا گی ہے)۔ ayi-tari pâšâ- ki kaniz تری بری پاشا کی کنیز ای (تیری ماں پادشاہ کی کنیز ہے)۔

فعل رابطہ- $\check{c}^h$ چھ:

واحد متکلم: me borro $\check{c}^h$ ū بے بوڑو چھوں (میں بڑا ہوں)۔ ū/$\check{c}^h$um/$\check{c}^h$õ چھوں/ چھُم/ چھوں:
me vazir $\check{c}^h$ū بے وزیر چھوں (میں وزیر ہوں)۔ me ... xursan $\check{c}^h$ ū بے خرسن چھوں (بے میں خوش رخوش ر ہوں)۔ me parya $\check{c}^h$ õ بے پریا چھوں (میں پریا ہوں)۔ me yek budi $\check{c}$um بے یک بُڈی چھُم (میں ایک بوڑھی ہوں)۔
واحد حاضر: $\check{c}^h$e چھے (مثالیں صرف مذکر کی): tu...ahmak anmi $\check{c}^h$e تو ...... احمک انمی چھے (تو احمق آدمی ہے)۔ tu parya qâm -(m) ata $\check{c}^h$e تو پریا قام ماتا چھے (تو پریا قوم کا ہے)۔
واحد غائب: che چے: Gunan dânâ $\check{c}^h$e گنن دانا چھے (گنن دانا ہے رگنن۔ مرد کا نام ر) ye hêr kâṇi بے ہور کانڑی چھے (یہ اور ایک کہانی ہے)۔ ya turra $\check{c}^h$e یا تُرّے چھے (یہ صحیح ہے ر یہ سچ ہے)۔ miri ayi če مری آیی چے (یہ رمیری ماں ہے)۔

جمع متکلم: $\check{c}^h$a (šá) $\check{c}^h$ī چھا' شا' چھیں (مثالیں صرف جنس مذکر کے لئے): ham na yau š'a, na el ہم نہ یو شا نہ ایل چھا (ہم نہ دشمن ہیں' نہ ہم قبیلہ ہیں رہم رمسافر) $\check{c}^h$a musafar.... lukui $\check{c}^h$a مُسافر...... لکوئیں چھا (ہم مسافر لوگ ہیں)۔ ham parya qam -(m) ata $\check{c}^h$ ī ہم پریا قم ماتا چھیں (اہم پریا قوم کے ہیں)۔
جمع حاضر: $\check{c}^h$o (šo) $\check{c}^h$ ī چھو' شو' چھیں (مثالیں صرف جنس مذکر کے لیے): tam yau šo, tam el تم یو شو' تم ایل چھو؟ (تم دشمن ہو ریار دوست رہم قبیلہ رہو؟)۔ $\check{c}^h$o? tam parya qam -(m) ata $\check{c}^h$ī تم پریا قم ماتا چھیں (تم پریا قوم کے ہو)۔
جمع غائب: $\check{c}^{(h)}$ i $\check{c}^{(h)}$ ī چیں' چھیں' چی' چھی: ye jatak mere apre $\check{c}^h$ i بے جتک مرے اپرے چھی (یہ بچے میرے اپنے ہیں)۔ inu haivan $\check{c}^h$ ī انو حیون چھیں (یہ رتو رحیوان ہیں)۔ mire jatak parya $\check{c}$ī مرے جتک پریا چیں (میرے بچے پریا ہیں)۔

جدول ۹: رابطی فعل $\check{c}^h$ (چھ) کی ہیئتیں

زمانہ	عدد	صیغہ	زبان پریا	ہندوستانی	گجراتی	راجستھانی (بیا وڑی)
حال	واحد	متکلم	$\check{c}^h$ū چھوں	ہوں hū	$\check{c}$hū چھوں	[illegible]
		حاضر	$\check{c}^h$e چھے	ہے hai	$\check{c}$he چھے	$\check{c}$hai, $\check{c}$he چھی' چھے
		غائب	$\check{c}^h$e چھے	ہے hai	$\check{c}$he چھے	$\check{c}$hai, $\check{c}$he چھی' چھے
	جمع	متکلم	$\check{c}$he, $\check{c}$ha, $\check{c}$hī چھے' چھا' چھیں	ہیں haĩ	$\check{c}$hie چھیے	$\check{c}$hā چھا
		حاضر	$\check{c}$ho, $\check{c}$hī چھو' چھیں	ہو ho	$\check{c}$ho چھو	$\check{c}$ho چھو
		غائب	$\check{c}$hī, $\check{c}$he چھیں' چھے	ہیں haĩ	$\check{c}$he چھے	$\check{c}$hai, $\check{c}$he چھی' چھے

زمانہ	عدد	صیغہ	زبان بھیا	ہندوستانی	گجراتی	راجستھانی (میواڑی)
ماضی	[redacted]	متکلم	[redacted]	[redacted]	[redacted]	چھو čhō
		حاضر	[redacted]	[redacted]	ہتو hatō	چھو čhō
		غائب	چھو $\check{c}^{h}$o	تھا thā	ہتو hatō	چھو čhō
	جمع	متکلم	چھے $\hat{c}^{h}$e	تھے thē	ہتا hatā	چھا čhā
		حاضر		تھے thē	ہتا hatā	چھا čhā
		غائب	چھے، چھی $\hat{c}^{h}$e, $\check{c}^{h}$i	تھے thē	ہتا hatā	چھا čhā

☆ نماوی بولی میں
☆☆ نماوی اور کسمنی بولیوں میں

رابطی فعل کے زمانۂ ماضی میں استعمال کی مثالیں:

واحد متکلم: چو، چھو، چھو (صرف جنسِ مذکر کی مثالیں): $\check{c}$o/$\check{c}^{h}$o/$\check{c}^{h}$ō me... bakar $\check{c}^{h}$o, baquvat $\check{c}^{h}$o — مے...... بکر چھو، بقوت چھو (میں...... خوب صورت تھا، طاقت ور تھا)۔ me kalla maktab-ma čo مے کلا مکتب ما چو (میں کل مکتب / اسکول / میں تھا)۔ me ra-ma $\check{c}^{h}$o مے راما چھو (میں راہ میں / سفر میں / تھا)۔

واحد حاضر: چو، چھو (صرف جنسِ مذکر کی مثالیں): o/$\check{c}^{h}$o tu kinya $\check{c}^{h}$o? تو کنیا چھو؟ (تو کہاں تھا؟)۔ tu kalla bazar-a čo تو کلا بزارا چو (تو کل بازار میں تھا)۔

واحد غائب: c(h)o چو، چھو: aba-so kambaral $\check{c}^{h}$o ابا سو کم بغل چھو (اُس کا باپ غریب تھا)۔ ran-a-so bakar ran $\check{c}^{h}$a رن اے سو بکر رن چھو (اُس کی بیوی اچھی عورت تھی)۔ ošpaz Berdaboi čo اوش پز بردبوئے چھو (بردبوئے باورچی تھا)۔

جمع متکلم: چھے، چے (مثالیں صرف جنسِ مذکر کی): $\check{c}^{(h)}$e ham panj jare $\check{c}^{h}$e ہم پنج جرے چھے (ہم پانچ جنے / آدمی تھے /)۔ ham apré-ma bakar če ہم اپرے ما بکر چے (ہم آپس میں متفق تھے)۔

جمع غائب: چھے، چھی: $\check{c}^{h}$e/$\check{c}^{h}$i unu butun boro-boro $\check{c}^{h}$e انو بتن بورو بورو چھے (وہ بہت بڑے بڑے تھے)۔ yek xei bitya, ki nakiri $\check{c}^{h}$i, pake čale gi, keri ke bakar $\check{c}^{h}$i, Bibi-Rabia kula beq ge یک خیل بتیا کی نکری چھی، پکے چلے گی، کیری کہ بکر چھی، بی بی ربیعہ کلا بیت گے (لڑکیوں کی ایک ٹکڑی، جو بدصورت تھیں، بھاگ گئی، جو خوب صورت تھیں بی بی رابعہ کے پاس بیٹھ گئیں)۔

مسندی (خبری) فعل رابطہ کی دونوں اقسام، واحد غائب کی ہیئتوں $\check{c}^{(h)}$e، چے، $\check{c}^{(h)}$i-i ای، چھو، چو، چھے میں، فعل رابطہ کے علاوہ اپنے قائم بالذات مفہوم (ہونا، موجود ہونا) میں بھی مستعمل ہیں:

(الف) زمانۂ حال: lei-ko kuto-soi ای کو کتو سوئی (ان کے پاس کتا ہے)۔ yek jag-a bulbul -i gaya $\check{c}^{h}$e یک جگا بلبل گیا چھے (ایک جگہ بلبل گیا ہے)۔ pesa-toro $\check{c}^{h}$e? پیسہ ترو چھے؟ (تیرے پاس پیسے ہیں؟)۔

(ب) زمانۂ ماضی: gal-a-so xunrezo $\check{c}^{h}$o گلے سو خونریزو چھو (اُس کے تن پر زرہ بکتر تھا)۔ o anmi-ko upar-a-so ni-$\check{c}^{h}$o او انمی کو اپرے سونی چھو (اُس آدمی کے پاس / ایک پیانو نہیں تھا)۔ paišo yek ti-eo $\check{c}^{h}$o پیشا یک تی

سو چھو (بادشاہ کے پاس ایک بیٹی تھی)۔

معنی خیز فعل کی مختلف صیغات حالیہ سے جڑ کر رابطی فعل- ملخ (چھ) مُرکّب فعلی ہیئتوں کی تشکیل کرتا ہے:

(الف) ماضی ناتمام (-o?) -a (پر ختم ہونے والا حالیہ) + رابطی فعل کی شخصی تمامی ہیئتیں:

واحد متکلم: (صرف جنسِ مذکر کی مثالیں): me us vaxt-a če-hum pará čʰ o مے اُس وختا چُھم پرا چھو (میں اُس وقت ششم میں پڑھتا تھا)۔ me bakar qenči kará čo مے بکر قینچی کرا چو (میں اُون عمدہ کترتا تھا)۔

واحد حاضر: (صرف جنسِ مونث کی مثال: tu ki (n)ya giyo čo? تو کیں یا گیو چو؟ (تو کہاں گئی تھی؟)

واحد غائب جنسِ مشترک: dumbra-nalá masq kará čʰ o ڈمبرا نلا مسق کرا چھو (وہ/ر تمبورے پر مشق کر رہا تھا)۔ us bakeri-ta ruti duva čo اُس بکری تا رُٹی دُوا چو (وہ/ر اُس بکری کو چارہ دے رہا تھا)۔ ...ya bitya پیانینو تا مرا چھو ... planino-ta mara čʰ o (یہ لڑکی پیانو بجا رہی تھی)۔ dad-vai kuva čo داد وئی کوا چو (ر بیوی ر کرا رہی تھی ر آہیں بھر رہی تھی ر)۔ o dayim bal-pa-ta-goti karki paš-paro bagova čʰ o او دائم بل پا تا گوتی کرکی پش پرو بگوواچو (وہ ہمیشہ اپنے بالوں کی چوٹی گوندھ کر انہیں اپنی پشت پر ڈال لیتی تھی)۔

جمع متکلم: (صرف جنسِ مذکر کی مثالیں): ham... angilsi-ko jib-ta hila čʰ e ہم ...... انگلیسی کو جب تا ہلا چھے (ہم انگریزی زبان سیکھ رہے تھے)۔ dumbun-ta ham bakar čarova čʰ e ڈمبن تا ہم بکر چروواچھے (ہم دُنبے خواب چراتے تھے)۔ ham har šam-a yek quzi kuva čʰ e, us-ki gušt-(t)a sixkabab kara če ہم ہر شما یک قُزی کوواچھے اُس کی گشت تا سیخ کباب کرا چے (ہم ہر شام ایک بھیڑ کا بچہ ذبح کرتے تھے اُس کے گوشت کا سیخ کباب بناتے تھے)۔

جمع حاضر: (واحد مثال زمانہ حال مستقبل کے مفہوم میں): tam taxčoma ka tara čo? تم تخچوما کا ترا چو؟ (تم طاقچے میں کیا رکھتے ہو؟)۔

جمع غائب جنسِ مشترک: unu doyim bakar fara čʰ e اُنو دویم بکر فرا چھے (وہ/ر لڑکیاں ر ہمیشہ اچھی طرح پیش آتی تھیں)۔ xalk ava če خلک آوا چے (لوگ آتے تھے) وغیرہ۔

(ب) زمانہ تمام [-e (واحد مونث -i ، جمع جنسِ مشترک -e/-i) + رابطی فعل کے زمانہ حال مستقبل کی شخصی ہیئتیں]

واحد متکلم جنسِ مذکر: me bulbul-i guyâ-pača aye čʰ ū مے بلبلِ گویا پچا آیے چھوں: (میں بلبل گویا کی خاطر آیا ہوں)۔ me tre-ta guná-ta lange čū مے ترے تا گنا تا لنگے چوں (میں نے تیرا گناہ درگزر کیا)۔

واحد متکلم جنسِ مونث (واحد مثال): me bara nikil(l)i či مے بارا نکلی چی ر نکلی چی (میں باہر نکلی تھی)۔

واحد حاضر: (صرف جنسِ مونث کی مثال): tu ka maré-para... ayi čʰ e? تو کا مرے پرا...... ائی چھے؟ (تو کیوں...... میرے پاس آئی ہے؟)۔

واحد غائب: (مثالیں صرف جنسِ مونث کے لیے): o buqi gi čʰ e او بُڈی گی چھے (وہ بوڑھی ہو گئی ہے)۔ ... bitya ba(i)i ča ... بتیا بئی چا (وہ لڑکی بیٹھی ہے)۔ o bitya kali ča او بتیا کلی چا (وہ لڑکی کھڑی ہے)۔

جمع متکلم: (صرف جنسِ مذکر کی مثالیں): ham kar-e baje čʰ e ہم کرا بیٹے چھے (ہم گھر بیٹھے ہیں)۔

جمع غائب جنسِ مشترک: memân aye čʰ i مہمان آیے چھی (مہمان آئے ہیں)۔ memân baje ... či [illegible]

[illegible] dane bitya ... [illegible] (ہمارے پاس ... عمدہ لڑکیاں ... آتی ہیں)۔

ایک موقعے پر تمام کے جزو کے طور سے بجیت حالیہ جمع مونث مخصوص اختتام (n)l- کے ساتھ مشاہدے میں آئی ہے: ran kar-a betine ... رن کرا بیٹن بی (عورتیں گھر بیٹھی ہیں)۔

... ماضی تمام [e- (جنس مونث واحد و جمع i-/ei-) پر ختم ہونے والا حالیہ + رابطی فعل کی ماضی مطلق کی ہیئتیں]:

واحد متکلم: (صرف جنس مذکر کی مثالیں): me šura(b)-ma bete čʰo: مے شُرب ما بیٹے چھو (میں شوراب میں ...)

me ye(k) vaxt -a yek rayis-nala âš-nâ oye čo مے یک وختا یک رئیس کلا آشنا اُویے چو (ایک وقت شورکے رااا اَمی کھیت کے راایک صدرر رئیس رے میری جان پہچان ہو گئی)۔ us-ki sali-ta minja kare čo اُس کی سالی تا منجا کرے چو (میں نے اُس کی سالی سے شادی کی)۔

واحد حاضر: (مثالیں صرف جنس مذکر کے لیے): tu kai-le aye čʰo? تو کیلے اَیے چھو؟ (تو کیوں آیا ہے؟)۔
taja ka lege čo? تجاکا لگے چو؟ (تو بازار رکیا لے گیا تھا؟)۔

واحد غائب جنس مذکر: dain yax kare čo دَین یخ کرے چو (دریار کا پانی جم کر ر برف ر یخ ر ہو گیا تھا)۔ abo-mare-na ka vasiyat kare čo? ابو مارے نا کا وصیت کرے چو؟ (ہمارے باپ نے کیا وصیت کی تھی؟)۔ abâ- murō maré čo ابا مُرو مرے چو (میرا دادا مر گیا)۔

واحد غائب جنس مونث: o yek budo-kulá beti čʰo او یک بُڈو کُلا بیٹی چھو (وہ ایک بوڑھے کے پاس بیٹھی تھی)

جمع متکلم: (صرف جنس مذکر کی مثالیں): berte čʰe بیڑتے چھے (ر ہم ر بیٹھے تھے)۔

جمع غائب جنس مشترک (؟): jataka-se ge čʰe جتکا سے گے چھے (اُس کے بیٹے چلے گئے)۔ yazū yek jag-e kali čʰe غزوں یک جاگی کلی چھے (قازیں ایک جگہ کھڑی تھیں)۔

عدد جمع کی ہیئتوں میں ماضی تمام کی گردان بنیادی طور سے زمانہ تمام کی گردان سے مختلف نہیں ہے۔ سیاق و سباق کی بنیاد پر ان ہیئتوں میں امتیاز کرنا ہمیشہ ممکن نہیں ہے۔

تخصیصی کیفیت کی ہیئتیں:

زبانِ پریا میں مخصوص قواعدی ہیئتیں پائی جاتی ہیں جو ایک معیّن وقت میں (زمانہ حال کے لیے۔ جملے کی ادائگی کے دوران) وقوع پذیر ہونے والے کسی عمل کو ظاہر کرتی ہیں۔

دوران گفتگو ظہور پذیر ہونے والے عمل کے اظہار کے لیے مستعمل قواعدی ہیئت کو "تخصیصی کیفیت والا زمانہ حال" اور زمانہ ماضی کے کسی معیّن وقت میں وقوع پذیر ہونے والے عمل کے اظہار کے لیے مستعمل قواعدی ہیئت کو "تخصیصی کیفیت والا زمانہ ماضی" کہہ سکتے ہیں۔ اپنے قواعدی مفہوم میں یہ ہیئتیں علی الترتیب زبانِ انگریزی کے present continuous اور past continuous سے مشابہت رکھتی ہیں

تخصیصی کیفیت کی ہیئتوں کی تشکیل لاحقہ ماقبل مختصر -de "دے" یا پھر معاون فعل lag "لگ" کی مدد سے عمل میں آتی ہے۔

(الف): تخصیصی کیفیت والے زمانہ حال کی شخصی ہیئتوں کی تشکیل زمانہ حال مستقبل میں فعل کی مختلف ہیئتوں کے بعد -de "دے" کے اضافے سے عمل میں آتی ہے:

واحد

متکلم: مے کتاب پڑوئیں دے mekitabparuĩ-de (میں کتاب پڑھ رہا ہوں)۔

حاضر: تو کتاب پڑائی دے tu kitab paráį-de (تو کتاب پڑھ رہا ہے)۔

غائب: یا انمی گزیت پڑائی دے ya anmi gazet paráį-de (یہ آدمی اخبار پڑھ رہا ہے)۔ kota harangas karăį-de کوتا ہرنگس کرائی دے (گدھا رینک رہا ہے)۔

یا منڈو اُستول تا تزو کرائی دے ya mundo ustol-ta tazō karáį-de (یہ لڑکا میز صاف کر رہا ہے)۔

جمع

متکلم: ہم کتاب پڑائیں دے ham kitab paráĩ-de (ہم کتاب پڑھ رہے ہیں)۔

حاضر: تم کتاب پڑا شودے / پڑو چے دے tam kitab para šoų-de (parau če de)۔ (تم کتاب پڑھ رہے ہو)۔

غائب: اُنوں کتاب پڑن شن دے unũ(n) kitab parin´šin´-de۔ (وہ کتاب پڑھ رہے ہیں)۔ ode do jaták larái kari (n´) či-de اودے دو جتاک لڑائی کرن چی دے (اُدھر دو لڑکے لڑ رہے ہیں)۔

بعض اوقات فعل کی یہ ہیئت لازمی طور سے دوران گفتگو وقوع پذیر ہونے والے تو نہیں لیکن بہر کیف زمانہ حال سے متعلق کسی عمل کے اظہار کے لیے بھی استعمال ہو سکتی ہے hazir me zav kulúb hoki Mirzo-riza-ko jamaa-ma kam karuį̃-de حاضر مے زو کلوب ہوکی مرزو رضا کو جماعہ ما کام کروئیں دے (اب کلب کا مینیجر ہو کر میں مرزا رضا کی سویت / جماعت / میں کام کر رہا ہوں) me házir texnekum-a ɣayibana paruį̃-de مے حاضر تخ نیکما غائبانہ پڑوئیں دے (میں آج کل ٹیکنکل اسکول میں غائبانہ پڑھ رہا ہوں)۔

(ب) تخصیصی کیفیت والے زمانہ ماضی کی شخصی ہیئتوں کی تشکیل زمانہ ماضی ناتمام میں فعل کی مختلف ہیئتوں کے بعد لاحقہ -de "دے" کے اضافے سے عمل میں آتی ہے:

واحد حاضر: (مثالیں صرف جنس مذکر کے لیے) minja rât-a kitâb para čo-de, isi vaxta keṛe kat-na darvaze-te taqás karyo منجا راتا کتاب پڑا چو دے، اِسی وختا کے ڑے کت نا دروزے تے تقاس کریو (کل رات میں کتاب پڑھ رہا تھا، اسی وقت کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا) me... kar-ma juva šo-de, yekini čaįxane-kula lari go مے...... کرما جوا شودے، یکنی چائے خانے کلا لری گو (میں...... گھر جا رہا تھا، ایک چائے خانے کے پاس لڑائی شروع ہو گئی)۔

واحد غائب جنس مشترک: kalo-so-mta lav juvai šo-de کلو سو متا لو جوائی شودے (اس کے سر سے لہو جا رہا تھا / بہہ رہا تھا) budi ak jâla šo-de, Bahram..paki čalogo, yek daraxt-pâra čaro بڈی اک جالا شودے، بہرام...... پکی چلوگو، یک درخت پرا چرو (رجب / بوڑھی آگ جل رہی تھی، بہرام...... بھاگ گیا، ایک درخت پر چڑھ گیا)۔

گیان چند

سیدہ جعفر، گیان چند جین: تاریخِ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک

کوئی ۱۹۸۴ء کی بات ہوگی کہ حکومتِ ہند کے ترقیِ اردو بیورو، دلی نے چار جلدوں میں اردو ادب کی تاریخ لکھوانے کا منصوبہ بنایا۔ میں مرکزی حیدرآباد یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ پہلی جلد میرے ذمے کی گئی۔ میں ان دنوں اقبال کے کلام کو تاریخی ترتیب سے مرتب کر رہا تھا۔ میں نے بیورو کو لکھا کہ حیدرآباد میں رہنے کے یہ معنی نہیں کہ میں دکنیات کا ماہر ہوں، یہ کام میرے بہ جائے ڈاکٹر سیدہ جعفر کے سپرد کردیا جائے۔ بیورو نے مجھے لکھا کہ آپ سیدہ جعفر کو اپنا اسسٹنٹ بنا کر یہ کام کردیجیے۔ اس وقت سیدہ جعفر ریڈر تھیں، پھر بھی میں نے ان کے مرتبے کی محقق کو اپنا نائب بنانا پسند نہیں کیا۔ بیورو کو لکھا کہ اگر سیدہ جعفر کو میرے ساتھ شریکِ مصنف مقرر کردیا جائے تو میں یہ کام کرسکتا ہوں۔ بیورو نے منظوری دے دی۔ میں نے تاریخ کے ابواب کا خاکہ بنایا جس میں آدھا کام سیدہ جعفر کے ذمے کیا، آدھا خود لیا۔ میں نے اوائل ۱۹۸۵ء میں اپنے حصے کا کام پورا کر کے بیورو کو بھیج دیا۔ سیدہ جعفر نے مزید دو سال لگائے اور ۱۹۸۸ء میں اپنے اوراق میرے سپرد کیے۔ میں نے بیورو سے اپنے لکھے ابواب واپس منگائے۔ نئی معلومات کی روشنی میں ان میں کہیں کہیں ترمیم کی، دونوں مصنفوں کے ابواب کو سمویا، مقدمہ لکھا جس پر ۱۴/اگست ۱۹۸۸ء کی تاریخ پڑی ہے اور پورا مسودہ بیورو کی شاخِ حیدرآباد میں دے دیا۔

بعد کی جلدیں جن علما کے ذمے کی گئی تھیں ان میں سے کسی نے کام نہیں کیا۔ بیورو نے مجھے لکھا کہ بقیہ جلدیں بھی میں لکھ دوں۔ میں تیار نہ ہوا۔ میں نے رائے دی کہ ہماری تصنیف کو تاریخ کی جلدِ اول کہنے کی بہ جائے آزاد اور مکمل کتاب کے طور پر شائع کردیا جائے۔ بیورو نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس بیورو کا نام پہلے ترقی اردو بورڈ تھا، بعد میں ترقی اردو بیورو ہوگیا۔ اب تیسرا نام قومی کونسل برائے فروغِ اردو ہے۔ اس کونسل نے یہ تاریخ ستمبر ۱۹۹۸ء میں پانچ جلدوں میں شائع کی یعنی آخری مسودہ داخل کرنے کے ۱۰ سال بعد۔ ڈاکٹر تنویر علوی نے اس کی ویٹنگ (Vetting) کی اور اس کے بعد ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بڑی محنت سے پروف ریڈنگ کی۔ سیدہ جعفر نے ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۸ء کو مجھے خط کے ذریعے مطلع کیا کہ میرا (گیان چند کا) لکھا آخری باب دکنی میں ہندی اور فارسی روایات کی آویزش و آمیزش غائب ہے۔ ڈاکٹر سیدہ نے خود دفتر میں تلاش کیا، نہ ملا۔ آخر کتاب اس کے بغیر چھاپ دی گئی۔ ناشر کی اس لاپروائی پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ میں یکم جنوری ۱۹۹۸ء تک لکھنؤ میں تھا۔ اگر ناشر مجھ سے اس باب کی نقل مانگ لیتا تو میں فوراً فراہم کردیتا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بھی کتاب چھپنے کے بعد مجھے اطلاع دی، پہلے نہ کہا۔ اب میں نے اس باب کو ناشر کے پاس بھیجنے کا انتظام کردیا ہے تاکہ ضمیمے کے طور پر چھاپ دیا جائے۔

۱۷۰۰ء تک کی تاریخ ادب زیادہ سے زیادہ ایک ہزار صفحوں کی ہونی چاہیے۔ مطبوعہ تاریخ کل ۲۳۳۴ صفحوں کو محیط ہے جن

ہیں، ۲۲۴ صفحے متن کے ہیں۔ میں نے متن کے ۱۰۲ صفحے لکھے ہیں، ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ۱۲۲۲۔ یہ دیکھ کر میں نے مقدمے میں مزاحاً لکھ دیا۔

" ڈاکٹر سیدہ جعفر کے متن کی تفصیل و ضخامت دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ تاریخ زیادہ تر ان کی تصنیف ہے جس میں چند صفحات میں نے بھی لکھ دیے ہیں۔" (ص: ۱۱)

خود کو سینیر سمجھ کر میں نے مصنفین میں پہلے اپنا نام اور بعد میں ڈاکٹر سیدہ جعفر کا نام لکھا تھا۔ کسی نے ترمیم کر کے سرِ ورق پر پہلے سیدہ جعفر کا اور بعد میں میرا نام لکھا ہے۔ یہ میرے مندرجہ بالا مشاہدے کے مطابق ہے۔ یہاں میرا نام "پروفیسر گیان چند جین" لکھا ہے۔ میں کبھی اپنے نام سے پہلے پروفیسر نہیں لکھتا، اردو کی حد تک "جزو" جین" لکھنے سے بھی پرہیز کرتا ہوں۔ میں نے اپنی کتاب اردو کی ادبی تاریخیں کئی سال پہلے اشاعت کے لیے دی تھی۔ اب میری اور سیدہ جعفر کی تاریخ بھی آگئی ہے۔ اپنی تاریخ پر تبصرہ کیوں کر لکھوں۔ سیدہ جعفر کے ابواب پر اپنے مختصر مشاہدات پیش کروں گا، اپنی تحریر کا مختصر تعارف دوں گا، تبصرہ کوئی اور کرے گا۔

اس تاریخ کو تقریباً برابر ضخامت کی پانچ جلدوں میں تقسیم کیا ہے جس میں موضوع یا باب کا خیال نہیں رکھا۔ ساتویں باب کا نصف حصہ جلد دوم میں اور بقیہ نصف جلد سوم میں ہے۔ آٹھواں باب بھی جلد سوم اور چہارم میں بٹا ہوا ہے۔ ایک باب کو دو جلدوں میں نہیں توڑنا چاہیے تھا، بھلے ہی ایک جلد کی ضخامت بڑھ جاتی۔ ۲۳۳۶ صفحوں کے مواد کو پانچ جلدوں کے بجائے بہ خوبی چار جلدوں میں دیا جاسکتا تھا، جن کی ایک جلد ۶۰۰ صفحوں سے کم رہتی۔

جلد کی ابتدا میں کونسل کے ڈائرکٹر محمد حمید اللہ بھٹ صاحب کا دو صفحوں کا دیباچہ ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ ہر جلد کی ابتدا میں دیا گیا ہے حالاں کہ پانچوں جلدیں مل کر ایک کتاب ہیں۔ دیباچہ مقدمہ، کتاب کی ابتدا میں ہوتا ہے بیچ بیچ میں نہیں۔ میں نے اصولاً اپنی کسی کتاب پر کسی سے مقدمہ نہیں لکھایا۔ ہندوستان اور پاکستان میں رواج ہے کہ سرکاری ادارے کوئی کتاب شائع کرتے ہیں تو اکثر ان کے اعلیٰ کارکن ایک رسمی مقدمہ لکھ دیتے ہیں۔ اپنی کتاب پر حمید اللہ بھٹ صاحب کے دیباچے کے تعلق سے مجھے دو مشاہدات پیش کرنے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ انبالے سے الہ آباد تک کے علاقے میں سب سے اہم پراکرت پالی کا فروغ ہوا۔ میری رائے میں علاقے کا یہ قطعی تعین قدرے مخدوش ہے۔ پالی کہاں کی زبان تھی، اس کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ مغربی مستشرقین اسے مگدھ (بہار) کی زبان قرار دیتے ہیں جب کہ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اور ڈاکٹر بابو رام سکسینہ اسے مدھیہ دیش کی کہتے ہیں۔ حمید اللہ بھٹ نے دوسری بات یہ کہی ہے کہ ۱۰۰۰ء تک کی تاریخ ادبِ اردو پر تین اہم کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ انھوں نے ان میں حامد حسن قادری کی داستانِ تاریخِ اردو کو بھی شامل کیا ہے حالاں کہ یہ دکنی کی تاریخ نہیں، بعد کی نثری ادب کی تاریخ ہے۔ میں نے اپنے مقدمے میں (ص: ۱۰-۹) پر اپنے موضوع کی چار کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈائرکٹر صاحب نے ان میں سے صرف چوتھی کتاب جمیل جالبی کی تاریخ کا نام لیا ہے۔ انھوں نے میرے اور سیدہ جعفر کے لیے جو کلمات خیر کہے ہیں۔ میں ان کے لیے مشکور ہوں۔ فہرست کتاب میں صرف متعلقہ جلد کے مشمولات کی فہرست ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پہلی جلد میں اگر پانچوں جلدوں کی مکمل فہرست ابواب بھی دے دی جاتی تو کتاب کا پورا خاکہ ایک نظر میں سامنے آجاتا۔

میں نے مقدمے میں کراچی کے ڈاکٹر عبدالقیوم کی مرتبہ تاریخ جلد اول کے لیے لکھا ہے کہ یہ میری نظر سے نہیں گزری۔ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ بعد میں میں نے اسے حاصل کر کے اس کا تفصیلی جائزہ لیا اور زیرِ نظر کتاب میں شامل کیا۔ مقدمے میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ بعض لفظوں کے ہجے بالکل ویسے نہیں جیسے میں نے لکھے تھے مثلاً میری تحریر کے رابرٹ کو روبرٹ اور علیحدہ کو علاحدہ لکھا ہے۔ شاید ویٹنگ کرنے والے صاحب نے کیا ہوگا۔ مقدمے میں ایک جملہ یوں ہے۔

"خاکہ ۱۲ بابوں پر مشتمل ہے۔ اس میں چھے چھے باب دونوں نے لیے۔" (ص: ۱۱)

اصل میں خاکہ ۱۳ بابوں کا تھا۔ اسے ۱۲ باب کا کہہ کر گم شدہ باب کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن دو صفحوں کے بعد لکھا ہے:

"۔۔۔ اصناف کے فنی پہلو اور ارتقا کو واضح کیا ہے اور آخر میں ہندی اور فارسی روایات کی آویزش و آمیزش پر نظر ڈالی ہے۔" (ص: ۱۳)

اصناف کا ارتقا مطبوعہ آخری باب ۱۲ کا موضوع ہے جب کہ ہندی اور فارسی روایات کی آویزش گم شدہ باب ۱۳ کا موضوع تھا۔ دفتر میں اس باب کو ضائع کرنے کے بعد ویٹنگ یا پروف ریڈنگ کرنے والے نے مقدمے میں ۱۳ بابوں کے بہ جائے ۱۲ باب کردیا۔

پہلا باب "اردو زبان کا آغاز و ارتقا" میرا لکھا ہوا ہے۔ یہ ۱۷۰۰ء تک کی تاریخِ ادب ہی کو نہیں، پورے اردو ادب کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ ۱۰۲ صفحوں پر پھیلا ہوا یہ باب بڑا جامع ہے۔ اس میں کہیں کہیں سہوِ کتابت در آئی ہے مثلاً ایک عنوان ہے "پراکرت دور: مولود مسیح سے ۱۵۰۰ء تک" (ص ۱۸)۔ ۱۵۰۰ء کے بہ جائے ۵۰۰ء چاہیے۔ ص ۴۴ پر مضمون کو مفہوم اور ص ۱۱۵ پر جلی عنوان میں مغنیات کو مصنفیات لکھا ہے۔ دوسرا باب "دکن میں اردو کا تاریخی و تہذیبی پس منظر" ڈاکٹر سیدہ جعفر نے لکھا ہے۔ پس منظر دینے کا رواج ترقی پسند تنقید کے زیرِ اثر ہوا۔ اس کی معراج ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر، حیات اور شاعری" تھی جہاں کئی سو صفحوں میں آخری مغلوں کی تاریخ انڈیل دی گئی تھی۔ بعد میں یہ محسوس ہوا کہ یہ پس منظر بہت مختصر ہونا چاہیے جس میں صرف انھیں تاریخی اور سماجی عوامل کا بیان ہونا چاہیے جو بہ راہِ راست متن کے مطالب پر اثر انداز ہوئے ہوں۔ متعدد عنوانات میں پس منظر کی ضرورت ہی نہیں۔

میں نے اردو مثنوی پر اپنے مقالے میں پس منظر مختصر لکھا تھا۔ ایک ممتحن ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے مقالے کو مسترد کرتے ہوئے اعتراض کیا کہ تاریخی پس منظر مختصر ہے۔ نتیجۃً نقشِ ثانی میں میں نے اسے مفصل لکھ دیا۔ مطبوعہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن نے اعتراض کیا کہ آج کل تحقیقی مقالوں میں تاریخی پس منظر اس طرح لازمی کرلیا گیا ہے جیسے غزل میں مطلع کے بعد حسنِ مطلع۔ کیا آپ تصور کرسکتے ہیں کہ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اس باب کے لیے کتنے صفحات لیے ہیں؟ ۲۵۲ اس کے بعد کتاب میں ہر علاقے کے بیان سے پہلے بھی مختصراً اس کا سیاسی، تہذیبی اور ادبی پس منظر دیا ہے۔ یہ مانتا ہوں کہ سیدہ جعفر نے پس منظری باب بڑی محنت سے، بہت ماٰخذ دیکھ کر لکھا ہے۔ یہ معلوماتی بھی ہے، دل چسپ بھی، کیا خوب ہوتا کہ وہ ۲۵۲ صفحوں کی ایک علیحدہ کتاب شائع کردیتیں اور موجودہ تاریخ میں صرف ۲۰ یا ۲۵ صفحوں کے پس منظر پر قناعت کرلیتیں۔ ۲۵۲ صفحوں کی ایک اور کتاب کا مصنف ہونا برا نہیں۔ اس باب کو لکھنے کے لیے ڈاکٹر سیدہ جعفر نے کیسے کیسے نادر ماٰخذ سے مدد لی ہے۔ اس

سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنی اچھی مورخ ہیں ۔ اس تحریر کی داد نہ دینا ظلم ہوگا کاش یہ ایک آزاد کتاب ہوتی ۔

انھوں نے فیروز شاہ بہمنی کی ایک رباعی دریافت کر کے لکھی ہے جو تا حال اس کے دکنی کلام کا واحد نمونہ ہے (ص ۱۴۰) ۔ سیدہ نے تاریخ فرشتہ اور خافی خاں کی سند پر لکھا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ نے شاہی دفاتر میں سے فارسی کو ہٹا کر ہندوی کو رائج کردیا ۔ لکھتی ہیں کہ مراہٹی ، تیلگو یا کنڑی کے لیے کبھی ہندوی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ، یہاں ہندوی سے مراد دکھنی ہی ہے (ص : ۲۰۱) ۔

میں اس غلط فہمی کی تصحیح بارہا کرچکا ہوں ۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے فرشتہ اور دوسروں کے بیانات کی روشنی میں طے کیا کہ فرشتہ نے ہندی یا ہندوی کا لفظ کسی بھی ہندستانی زبان مثلاً سنسکرت تک کے لیے استعمال کیا ہے ۔ ابراہیم کے دفاتر میں فارسی کے علاوہ مراٹھی اور بعض اوقات تیلگو کا بھی استعمال کیا گیا ، اردو کا کبھی نہیں (۱) صفحہ ۲۱۵ پر کوہِ نور ہیرے کی تفصیل بہت دل چسپ ہے ۔ میں عموماً سیدہ جعفر کے قابلِ تحسین بیانات کی نشان دہی نہ کرسکوں گا کیوں کہ یہ تو ہر باب میں بہ کثرت بھرے پڑے ہیں ۔ اگلا باب "شمالی ہند میں اردو شاعری ۱۷۰۰ ء تک" میرا لکھا ہوا ہے ۔ میں نے امیر خسرو کی مبینہ اردو شاعری کا بہت تفصیلی تجزیہ کیا ہے ۔ شمالی ہند کے اردو فارسی شعرا کے ریختوں اور کھڑی بولی نما شاعری کا ذکر کرکے اس دوسرے دھارے کے نمونوں کو بھی لیا ہے جو دیوناگری رسم الخط میں ہیں ۔ ہندی کے شاعروں کو شامل کر کے شمالی ہند میں کھڑی بولی کی ایک مسلسل روایت تشکیل پا جاتی ہے ۔

تاریخ کی مختلف جلدوں میں میری تحریر میں اغلاطِ کتابت کافی پائے جاتے ہیں مثلاً اس باب میں کیسر بہ جائے کبیر (ص ۲۶۲) ، مدھیہ پردیش بہ جائے مدھیہ دیش (ص : ۲۶۳) "۱۲۱۰ ھ جو مطابق ۵۶ ۔ ۱۷۹۵ ء کے" اس فقرے میں ۵۶ کی جگہ ۹۶ چاہیے (ص : ۳۰۵) ، خسرو کا انتقال ۷۲۵ ھ میں ہوا ، بجائے ۷۲۵ ھ کے (ص : ۳۱۲) ایک غلطی میری بھی ہے جس کا میں علی الاعلان اعتراف کرتا ہوں ، جس پر میں جتنا بھی شرم سار ہوں کم ہے ۔ ص ۲۹۹ کی پہلی سطر نیز ص ۳۰۰ کی پانچویں سطر میں "وغیرہ" لکھا ہے جس کے صحیح بجے "وتیرہ" ہیں ۔ مجھے غلطی سے وغیرہ معلوم تھا ۔ انجمن ترقیِ اردو پاکستان میں ایک قابل نوجوان کالج لیکچرر نے (جن کا نام مجھے یاد نہیں) میری ادبی تاریخوں کی کتاب کی پروف ریڈنگ کرتے وقت نشان دہی کی کہ صحیح املا "وتیرہ" ہے ۔ زمانۂ طالبِ علمی سے تا حال میں نے کسی دوسرے لفظ کے ہجے غلط نہیں لکھے ۔ اردو ادب کی زیرِ تبصرہ تاریخ میں میں نے ہی "وغیرہ" لکھا ہوگا جسے دہلی میں کسی نے درست نہیں کیا ۔

دوسری جلد کا چوتھا باب "دکن میں اردو شاعری ۱۷۰۰ ء تک" سیدہ جعفر کا لکھا ہوا ہے ۔ انھوں نے مبینہ رسالہ "شاہ [illegible]" کو لے کر اسے بجاطور پر رد کیا ہے (ص ۳۲ ۔ ۳۱) ، لیکن یہ نثری تحریر ہے جو اس باب کے ذیل میں نہیں آتی ۔ اس کی بحث میرے لیے چھوڑ دینا چاہیے تھا ، چناں چہ میں نے چھٹے باب میں اس کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے (ص ۵۵ ۔ ۲۶۹) ۔ اسی طرح انھوں نے شاعری کے اس باب میں خواجہ بندہ نواز کے نثری رسالوں کا ذکر چھیڑا ہے (ص : ۳۹۰) ۔ میں نے اسی جلد میں چھٹے باب میں خواجہ بندہ نواز سے منسوب جملہ رسائل کا تجزیہ کیا ہے ۔ ہاں انھوں نے خواجہ کی شاعری پر خوب لکھا ہے مثلاً خواجہ کے منظوم کلام کو برٹش میوزیم کے مخطوطے سے درست کر کے دیا ہے (ص ۵۸ ۔ ۵۵) ۔ انھوں نے اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری حیدرآباد سے لے کر (جہاں اب آصفیہ کے مخطوطات منتقل کردیے گئے ہیں) خواجہ بندہ نواز کی ایک رباعی درج کی ہے (ص

اس کا پہلا مصرع ، مشہود بہ حیرت ہو گر پیچ ہے واللہ " رباعی کے وزن سے نکل کر ایک اور وزن میں چلا گیا ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ اس مصرع میں " گر پیچ " کی جگہ " کر پیچ " رہا ہو جس سے وزن اور معنی دونوں درست ہوجاتے ہیں ۔

وہ ایک بار پھر نثر کی طرف ڈھلک کر رسالہ ۔ اکبر حسینی پر لکھتی ہیں (ص : ۶۶ ۔ ۶۵) ۔ میں نے اسی جلد میں ص : ۲۳ ۔ ۲۴ پر تفصیل سے بحث کی ہے ۔ وہ فیروز شاہ بہمنی کی ستائش کرتے ہوئے لکھتی ہیں :

" فیروز شاہ صوم و صلوٰۃ اور مذہبی اصولوں پر سختی سے عمل پیرا تھا " (ص : ۷۲)

لیکن اگلے ہی صفحے پر ایک انگریزی تاریخ کے حوالے سے لکھتی ہیں " فیروز شاہ کے حرم میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والی آٹھ سو بیگمات موجود تھیں " (ص : ۷۳) ۔ ۸۰۰ بیگمات رکھنے والے کو کم از کم میں مذہبی آدمی قرار نہیں دے سکتا ۔ وہ ہر بیگم کے ساتھ دو سال سے بھی زیادہ میں شب گزاری کرتا ہوگا ۔ یہ ان پر ظلم ہے ۔ سیدہ جعفر فیروز شاہ کے تخلص کے سلسلے میں لکھتی ہیں :

" اکثر دکنی شعرا کا تخلص یائے مجہول پر ختم ہوتا ہے جیسے وجہی ، نصرتی ، غواصی ، ابن نشاطی اور ہاشمی وغیرہ " (ص : ۹۰)

بڑے عالم بھی غائب ذہنی میں کیا کیا سہو کر جاتے ہیں ۔ سیدہ یائے معروف کو مجہول لکھ گئیں ۔ انھوں نے کدم راؤ پدم راؤ کے مصنف نظامی کی شخصیت اور زمانے پر بہت اچھی بحث کی ہے (ص : ۸۸ ۔ ۸۵) ۔ اس سے ڈاکٹر جمیل جالبی کے فیصلوں کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے ۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ہندی کی بعض نادر کتابوں سے استفادہ کیا ہے ۔ کم از کم وہ اردو والوں کے لیے ندرت رکھتی ہیں مثلاً مہاپنڈت راہول سانکرتیاین کی " دکنی ہندی کی کاویہ دھارا " (۱۹۵۹ء) اور وی پی محمد کنج میتر کی " ہندی ، سردت نیا چنتن (۱۹۸۶ء) ۔ میں ان کتابوں کے وجود سے بھی واقف نہ تھا ۔ وہ کنج میتر کی کتاب سے یہ بیش بہا اطلاع فراہم کرتی ہیں ۔

" کدم راؤ میں استعمال ہونے والے بارہ ہزار الفاظ میں سے دس ہزار الفاظ سنسکرت اصل کے ہیں اور عربی فارسی لغات کی تعداد لگ بھگ دو سو ہے " (ص : ۹۳)

انھوں نے ص ۹۵ ۔ ۹۸ پر عبداللہ حسینی کا ذکر کیا ہے چوں کہ شاعر یہ نہیں تھے انھیں محض نثر نگار کہا جاتا ہے ۔ اس لیے سیدہ جعفر کو اس باب میں ان پر لکھنے کی ضرورت نہ تھی ۔ میں نے ص ۳۲۴ پر ان کے بارے میں لکھا ہے ۔ سیدہ جعفر اور میں دونوں نے لکھا ہے کہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے کے فہرست نگار اسٹیوارٹ کے مطابق عبداللہ حسینی نے نشاط العشق کا ترجمہ کیا تھا ۔ یہ صحیح نہیں ۔ اس کا ذکر میں اپنے باب کے سلسلے میں کروں گا ۔

میراں جی شمس العشاق کی ایک مثنوی کے نام کے سلسلے میں یہ شعر درج کرتی ہیں :

اس نام ہے تحقیق   سن شہادۃ التحقیق   (ص : ۱۰۴)

سچ یہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے " قدیم اردو " کے اپنے مضمون میں اور سروری صاحب نے علی گڑھ تاریخ ادب میں مصرعِ ثانی میں نام شہادۃ التحقیق ہی لکھا ہے اس لیے اس کو تسلیم کرنا چاہیے خواہ حقیق کتنا صحیح نہ ہو ۔ سیدہ ایک بار پھر بہمنی سلطنت میں مرہٹی کے دفتری زبان بننے کا ذکر کرتی ہیں (ص : ۱۲۰) ۔ اس کی تردید میں پیچھے مصطفیٰ کمال کے حوالے سے کرچکا ہوں ۔ سیدہ جعفر نے ہندی کے ڈاکٹر سری رام شرما کے حوالے سے فیروز مصنف پرت نامہ کی ایک نایاب شعری تخلیق یوسف نامہ کی خبر دی ہے (ص : ۱۲۰) ۔ ظاہرا یہ اب معدوم ہے ۔ اردو میں اس کا ذکر اور کہیں نہیں ملتا ۔ وہ شاہ برہان الدین جانم کے سنہ ولادت و وفات

سلسلے میں متعدد لوگوں کے بیانات نقل کرتی ہیں (ص : ۱۰۰) لیکن معلوم نہیں کیوں ڈاکٹر حسینی شاہد کا نام نہیں لیتیں جنھوں
شاہ امین پر اپنی کتاب میں اس موضوع پر لکھا ہے اور کم از کم سنہ وفات شافی طریقے پر متعین کیا ہے ۔ دیکھیے اسی جلد میں
اتحریر ص ۵۰ ۔ ۲۵۶ ۔

وہ شاہ جانم کی متعدد مختصر مثنویوں کی نشان دہی کرتی ہیں ۔ مثلاً " کفر نامہ ، مسافرت خاں میاں و بیان خلاصہ " (کذا)
ب خانم یا توحید حقیقت ، عبرتِ آدم ، پنج گنج (ص ۸۳ ۔ ۱۸۱) ۔ پنج گنج کی صحتِ انتساب کے بارے میں انھیں شک ہے ۔
ملی دکنی نثر و نظم میں اصل والحاق کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے ۔ میں نے مولوی عبدالحق کی مشہور ۹۶۸ ھ کی ضخیم بیاض کا عکس دیکھا
۔ اس میں معلوم نہیں کتنی مختصر نظمیں شمس العشاق کے نام سے دی ہیں ۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے علی گڑھ میگزین میں انجمن ترقی
ہند میں جانم کی نظموں کی تفصیل دی ہے ۔ دکنی مخطوطوں میں بالخصوص صوفیوں کی نظم و نثر میں مصنف کے طور پر جو نام دیا ہو
پر آنکھ موند کر بھروسا نہیں کرلینا چاہیے ۔ اس کی زبان کو آنک کر ہی کچھ فیصلہ کرنا چاہیے ۔ اگر کامل وثوق نہ ہو تو قطعی دعوے
بچنا چاہیے ۔

انھوں نے جانم کے نثری رسالوں کا بیان چار صفحوں میں کیا ہے (ص ۹۵ ۔ ۱۹۲) ۔ وہ بھول جاتی ہیں کہ خاکے کے اعتبار
یہ میری جائداد ہے ۔ میں نے اسی جلد میں ص ۲۵۶ تا ۳۰۳ پر بالاستیعاب لکھا ہے ۔ حیرت ہے کہ انھوں نے شاہ امین الدین
علی کی شاعری پر کسی جلد میں نہیں لکھا ۔

پانچواں باب " گجرات میں اردو شاعری ۱۹۰۰ء تک " میں نے لکھا ہے ۔ اس میں وہاں کے مشہور چار صوفی شعرا سے پہلے
محمد کھٹو پر لکھا ہے جس کے لیے ہندی سے بھی کچھ مواد ملا ۔ چھٹا باب اردو نثر ۱۹۰۰ء تک بھی میرا لکھا ہے ۔ اس کے شروع میں
یوں کے ملفوظات تفصیل سے دیے ہیں ۔ اس میں ص ۲۵ ۔ ۲۲۳ پر مادرِ مومناں اور بابا شکر گنج کے ایک مکالمے کا ذکر کیا ہے ۔
الذکر نے کہا " خوجو برہان الدین بالا ہے " ۔ یہاں بالا کے معنی بالک ہیں ۔ شیخ نے جواب دیا " پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے " ۔
ب سیرالاولیا نے اس جملے میں بالکی یہ تاویل کی ہے کہ چودھویں رات کو اول شب میں چاند چھوٹا ہوتا ہے ۔ میں نے اس سے
ن نہ کرتے ہوئے ایک بے تکی بات کہہ دی کہ شاید خواجہ سہواً پونوں کا چاند بول گئے ہیں ، ان کا منشا دوج کا چاند کہنے کا
(ص : ۲۲۵) ۔ اب میں اپنی تاویل میں ترمیم کرکے کہتا ہوں کہ خواجہ نے بالا کا لفظ " بلند " کے معنی میں استعمال کیا ہے ،
طرح لفظ بالا میں ایہام سے کام لیا ہے ۔

ص ۲۷۶ پر سہو قرات سے نظام شدہ کو بہت جلی عنوان کے طور پر لکھا ہے حالاں کہ دکھانا تھا کہ یہ رسالہ جنوبیہ میں شدہ
ں طرح لکھا ہے کہ اسے ۹۰۰ پڑھا جاسکتا ہے ۔ میں نے خواجہ بندہ نواز سے منسوب ایک ایک نثری رسالے کو لے کر ان کے
اب کو شافی طریقے پر رد کیا ہے (ص : ۲۸۱ تا ۳۲۱) سید عبداللہ حسینی کے ترجمہ ۔ نشاط العشق کے سلسلے میں میں نے شمس اللہ
ی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسٹیوارٹ کے مطابق عبداللہ حسینی نے نشاط العشق کا دکنی میں ترجمہ کیا اور شرح بھی لکھی اور یہ
سلطان کے کتب خانے میں موجود ہیں (ص ۳۲۳) ۔ اس وقت اسٹیوارٹ کی فہرست میرے سامنے نہیں تھی ۔ بعد میں حقانیہ
بہ سی لائبریری میں فہرست دیکھی تو پایا کہ اسٹیوارٹ نے ایک کتاب " نشاط العشق ، شرح خوشیہ " کی موجودگی کی خبر دی ہے
ں اس کے مصنف یا مترجم کا نام نہیں دیا ۔ معلوم نہیں ہم والوں نے اس کے ساتھ عبداللہ حسینی کا نام کیوں جوڑ دیا ۔

شاہ میراں جی شمس العشاق کی سوانح پر بھی نے تفصیل سے بحث کی ہے اور جانم کے مرثیے کی بنا پر یہ خیال ظاہر کیا ۔ کہ حضرت میراں جی کا وصال ۲۵ / شوال ۹۹۳ھ کو ہوا (ص ۳۹ ۔ ۳۲۶) ان سے کسی نثری تصنیف کے انتساب کی تردید کی ہے

ساتواں باب " بیجاپور اور بیدر میں اردو شاعری سترھویں صدی میں " ڈاکٹر سیدہ جعفر نے لکھا ہے ۔ اس کا کچھ حصہ جلد دو میں ہے ، کچھ جلد سوم میں ۔ قریشی بیدری کے زمانے کی بحث عالمانہ ہے (ص : ۲۵ ۔ ۳۲۲) ۔ اسی طرح مقیم اور مقیمی کی بحث بہت خوب ہے (ص : ۳۶ ۔ ۳۳۳) ۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے عاجز کی لیلیٰ مجنوں کی تدوین (۱) کی تھی ۔ سیدہ جعفر نے اس پر سخت تنقید کی ہے کہ وہ عاجز کے حالات زندگی کے متعدد حقائق سے ناواقف ہیں ۔ آگے لکھتی ہیں ۔

" مقدمہ ۔ لیلیٰ مجنوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق میں عدم توجہی ، محدود مطالعے اور داخلی شہادتوں سے استفادہ نہ کرنے کی وجہ سے کس طرح حقائق مسخ ہو کر رہ جاتے ہیں " (ص : ۴۰۰) ۔

اس باب کا بقیہ حصہ جلد سوم میں ہے ۔ سہو کتابت کی مثال دیکھیے ۔ ص ۱۱ پر دوسرے پیراگراف میں ناری نامہ " فارسی نامہ " لکھا ہے ۔ اس جلد میں پہلی جلدوں کے برخلاف ہر شاعر اور نثر نگار کو نئے صفحے سے شروع کیا ہے جو باب کے درمیان میں مناسب نہیں ۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ص ۸۹ ۔ ۸۸ پر نصرتی کی مثنوی گلشنِ عشق سے قدرتی اور سماجی اشیا کی تفصیلات فہرستیں اچھی تیار کی ہیں ۔ شمس اللہ قادری نے نصرتی کی ایک مثنوی گلدستۂ عشق کا بھی ذکر کیا ہے جو ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں موجود تھی ۔ سیدہ لکھتی ہیں کہ چارلس اسٹیوارٹ نے ٹیپو سلطان کے کتب خانے کی فہرست میں نصرتی کے دو شعری کارناموں کا ذکر کیا ہے جو گلشنِ عشق اور گلدستۂ عشق ہیں (ص ۱۲۶) ۔ یہ نادر فہرست عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے جہاں میں نے اسے دیکھا ۔ اگر سیدہ جعفر دیکھ لیتیں تو کئی غلط فہمیوں سے محفوظ رہتیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ فہرست کے مطابق وہاں نصرتی کی صرف مثنویاں علی نامہ اور گلشنِ عشق تھیں ۔ گلشنِ عشق کے ساتھ عشقیہ نظموں کی ایک کتاب گلدستۂ عشق مجلد تھی ۔ اسٹیوارٹ نے نہیں لکھا کہ یہ بھی نصرتی کی تصنیف تھی ۔ دوسروں نے اسے نصرتی کی غزلیات کا مجموعہ کہہ دیا ۔ اب اس کتاب کا کہیں پتا نہیں

سیدہ جعفر ، معظم بیجاپوری کے سلسلے میں دکنی نظم کی کئی نئی ہیئتوں کی خبر دیتی ہیں ۔ ان میں ایک صنف " کھاڑا " میرے لیے نئی ہے (ص : ۱۴۶) ۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انھوں نے کہیں اس کے معنی معہ لکھے ہیں ۔ ہاشمی بیجاپوری کے لیے ان کا یہ مشاہدہ صحیح ہے کہ اس کے کلام میں ملبوسات اور رنگوں کی مناسبت سے یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ مادر زاد اندھا نہیں تھا بلکہ بعد میں چیچک سے اس کی بصارت زائل ہوئی (ص : ۱۶۸) ایک شعر کا مصرع دو نسخوں سے یوں لکھا ہے ۔

کہا احسن القصص جس کوں خدا (ص : ۱۸۹)

کہا احسن القصہ جس کو خدا (ص : ۱۹۰)

پہلا مصرع غیر موزوں ہے ، دوسرا موزوں ۔ اس وزن میں احسن القصص نہیں آسکتا حالاں کہ ترکیب یہی صحیح ہے ۔ وہ ہاشمی کے اس مرثیے کو

سن ہاشمی یو مرثیہ پر سوز گاتے تے عجب انگشتِ حیرت کو منے لیوے الپس کے انوری

انوری کے مشہور مرثیے ع اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری ، کی زمین میں قرار دیتی ہیں (ص : ۴۲ ۔ ۱۴۳) ۔ فرہنگ آصفیہ کے مطابق شعر کی زمین کا تعین ردیف ، قافیہ اور وزن تینوں کی بنا پر ہوتا ہے ۔ ہاشمی کے مرثیے اور انوری کے قصیدے کا وز

مختلف ہے اس لیے دونوں کی زمین کو یکساں نہیں کہا جاسکتا ۔

آٹھویں باب "گولکنڈے میں اردو شاعری سترھویں صدی میں" بھی ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تصنیف ہے ۔ یہ باب تیسری اور چوتھی دونوں جلدوں میں ہے ۔ اس میں احمد شریف مصنف یوسف زلیخا کے سلسلے میں محمود شیرانی کا قول نقل کرتی ہیں :

"وہ اپنے مذہب سے بھی جو شیعہ تھا بہ خوبی واقف معلوم ہوتا ہے ۔"

سیدہ جعفر خود شیعہ ہیں لیکن مذہبی جنبہ داری پر ادبی صداقت کو ترجیح دیتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ احمد شریف شیعہ نہیں تھا ۔ (ص : ۲۵۱) ۔

سخاوت مرزا نے غواصی کا نام شیخ حسین بہاء الدین تحریر کیا تھا ۔ ایک مضمون نگار جمال شریف نے اس کی تردید کی ۔ سیدہ جعفر نے عثمانیہ یونیورسٹی میں غواصی کا کتابت کیا ہوا ایک عربی مخطوطہ دریافت کیا جس کے ترقیمے میں اس نے اپنا نام "شیخ حسین بہاء الدین الملقب بہ غواصی" لکھا ہے ۔ اس سے شاعر کا نام بھی طے ہوجاتا ہے اور یہ کہ اس نے اپنے لقب کو تخلص بنالیا ۔ (ص : ۸۰ ۔ ۳۸۹) ۔

غواصی نے مثنوی طوطی نامہ کی کہانیوں میں عورتوں کے مکروفریب کو شدت سے بیان کیا ہے ۔ سیدہ جعفر نے انھیں تلاش کر کے کہا کہ یہ اس عہد کے مردوں کی فکر و نظر کے ترجمان ہیں (ص : ۴۱۰) ۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا کہنا تھا کہ محمد قلی سے منسوب مشہور غزل ع پیا باج پیالہ پیا جائے نا ، دراصل غواصی کی ہے کیوں کہ یہ دیوانِ غواصی میں شامل ہے ، کلیاتِ قلی قطب شاہ میں نہیں ۔ سیدہ جعفر نے خبردی کہ آصفیہ لائبریری میں کلیات قلی کا ایک قدیم ، نادر اور مکمل نسخہ تھا جسے نظام میر عثمان علی خاں نے اپنے ذاتی کتب خانے کے لیے منگوالیا ۔ اب اس نسخے کا پتا نہیں ۔ مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون میں اس نسخے سے لے کر یہ پوری غزل درج کی تھی ، اس لیے یہ محمد قلی ہی کی ہے (ص : ۱۳ ۔ ۴۱۲) ۔

وہ تحفۃ النصائح کے شاعر قطب کا تخلص زاری لکھتی ہیں بجائے رازی کے (ص : ۴۵۲) ۔ یہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تقلید ہے جنھوں نے اسے زاری کہنے پر اصرار کیا ہے (تاریخ جلد اول ص : ۴۸۶) ۔ میری رائے میں یہ صحیح نہیں ۔ آصفیہ لائبریری میں تحفۃ النصائح کے سات نسخے ہیں ۔ بیش تر میں اس کا تخلص رازی ہی لکھا ہے ۔ دو ایک میں تحریف سے "راضی" درج ہے جس سے طے ہوجاتا ہے کہ رازی ہی صحیح ہے ۔ یائے معروف والے تخلصوں کو اکثر کسی مکمل لفظ میں تحتانی کے اضافے سے تشکیل دیا جاتا ہے ۔ زاری پر یائے معروف کا اضافہ قرینِ قیاس نہیں ۔ زاری خود ایک مکمل لفظ ہے ۔

اب آئیے جلد چہارم پر ۔ سیدہ جعفر نے احمد جنیدی کی مثنوی ماہ پیکر مرتب کی ہے ۔ ایک قدیم مضمون نگار نے مثنوی میں خلفائے راشدین کی مدح دیکھ کر طے کیا کہ احمد سنی تھا ۔ ہر شخص آنکھ موند کر یہی فیصلہ کرے گا ۔ سیدہ جعفر نے اس شعر کی طرف توجہ دلائی :

الٰہی بحرمت شمس العارفین   کہ ہادی موحید ہے دنیا و دین

ان کے بہ قول شمس العارفین ، حضرت سید محمد جونپوری مہدی موعود کا لقب تھا ۔ جنیدی کے شجرہ نسب میں کئی ائمہ کے نام آتے ہیں جن سے سیدہ جعفر نے نتیجہ نکالا کہ احمد جنیدی مہدوی تھا (ص : ۱۶ ۔ ۱۹) ۔ اس شجرے میں مہدوی بزرگ سید خوند میر کا بھی نام آتا ہے ۔ سیدہ جعفر مثنوی ماہ پیکر سے ساز و سامان کی جو فہرست دیتی ہیں اس میں پلنگ کے ساتھ صوفے بھی لکھتی ہیں (ص ۴۹) ۔ [illegible]

مختلف جلدوں میں سیدہ جعفر خود کو بار بار راقمہ الحروف کہتی ہیں مثلاً ص ۱۲۱ پر ۔ میں نے اپنی کتاب " تحقیق کا فن " میں زور دیا ہے کہ تحقیق کا لہجہ غیر شخصی نہیں، شخصی ہونا چاہیے ۔ راقم الحروف کتنا مصنوعی معلوم ہوتا ہے (ہندستانی ایڈیشن ، ۲۶۵) ۔ اس کے آگے اردو کے بڑے بڑے محققین کے بیان سے ضمیر متکلم کے استعمال کی مثالیں دی ہیں ۔ سیدہ نے ابوالحسن شاہ کو ۲۰ صفحے دیے ہیں ۔ ان کا کُل ایک آدھ شعر اور ایک آدھ مشکوک غزل ملتی ہے اس پر ۱۳ صفحے اسراف ہیں ۔

نواں باب " گجرات میں اردو شاعری سترھویں صدی میں " بھی سیدہ جعفر کی تحریر ہے ۔ ص ۲۰۴ پر ایک عنوان ہے " ہاشم اور سید شاہ ہاشم حسینی " ۔ اس عنوان کے تحت ہاشمی بیجاپوری کے پیر سید ہاشم کا ذکر ہے جو شاعر نہیں تھے ۔ حیرت ہے کہ پانچ صفحے لکھے گئے ۔ آگے ص ۲۱۱ پر پھر عنوان سید شاہ ہاشم حسینی ہے جس کے تحت ان کا مفصل ذکر ہے ۔ ص ۲۰۹ کے عنوان میں ان کا نام غیر ضروری تھا ۔ انھیں عام طور سے سید ہاشم علوی کہا جاتا ہے ۔ سیدہ جعفر نے ان کے بیان کے آخری صفحات میں حسینی اور علوی کی بحث کی ہے جو ابتداے مضمون میں آنی چاہیے تھی ۔ ص ۲۲۳ پر عنوان ہے " سید محمود اور سید علی عاجز " ۔ شاعر کے نام اور ان کی مثنوی قصہ ۔ فیروز شاہ یا قصہ ۔ ملک ۔ مصر کے ناموں میں اتنا الجھاؤ ہے کہ سیدہ جعفر کی مفصل تحریر پڑھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا ۔ وہ خود اس مسئلے کو کافی الجھا ہوا مانتی ہیں (ص ۲۲۹) ۔

دسواں باب " اردو نثر سترھویں صدی میں " سیدہ جعفر کا لکھا ہوا ہے لیکن اس میں ملا وجہی ، سب رس اور داستان امیر حمزہ کے دو دکنی نسخوں پر میں نے لکھا ہے ۔ سیدہ جعفر نے شاہ امین الدین علی اعلیٰ پر ۱۹ صفحے لکھے ہیں ۔ یہیں مختصراً ان کی شاعری کا بھی ذکر کر دیا ہے حالاں کہ بہ طور شاعر ان پر پیشتر لکھنا چاہیے تھا ۔ اس باب کے آخری تین نثر نگاروں : شاہ برہان الدین راز الٰہی ، شاہ نور محمد قادری اور محمد شریف پر محض آدھا یا چوتھائی صفحہ ہی لکھا ہے نور دریا اور نو بلون کے مصنف شاہ محمد قادری اہم مصنف ہیں ۔ ان کی تصانیف کئی صفحوں کا مطالبہ کرتی ہیں ۔ حیرت ہے کہ سیدہ جعفر کی دریا دلی ان کے باب میں کیوں شبنم بن کر رہ گئی ۔

گیارھواں باب " شمالی ہند میں اردو شاعری سترھویں صدی میں " میرا لکھا ہوا ہے ۔ میں نے اس میں بکٹ کہانی افضل کی شخصیت کے بارے میں مختلف بیانوں کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بکٹ کہانی کا مصنف افضل ، تذکرہ ، ریاض الافضل کے افضل سے مختلف شخص ہے نیز صاحب بکٹ کہانی کوئی ہندو مسمی گوپال ہے جس کا تخلص افضل تھا ۔ اس باب میں ص ۳۲ سے ۳۸ تک چار شاعروں کے تخلص کو جلی عنوان کے طور پر سطر کے شروع میں عام کتابت کی خفی تحریر میں درج کیا ہے جس سے وہ عنوان معلوم ہی نہیں ہوتا ۔ فقط ، ہندی کے شاعر عبداللہ انصاری جیسے اہم شاعر کو بھی یہی خفی قلم نصیب ہوا ہے کہ اس کا بیان سوا چھ صفحوں پر ہے اس کے مقابلے میں اگلے شاعر شیخ محبوب عالم کو سطر کے بیچ میں جلی عنوان سے درج کیا ہے (ص ۳۵) ۔ ص ۵۲ پر شیخ فیض اللہ مصنف تجرہ کے بارے میں میں نے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ صمد صاحب کے ذخیرے کا اس نظم کا واحد مخطوطہ میرے گھر سے کسی محقق شاگرد نے اڑا لیا ۔ اب مجھے پس نوشت کے طور پر یہ کہنا ہے کہ میرے بچانے پر سعادت مند شاگرد نے یہ نسخہ اس کے مالک صمد خاں کی الماری میں خاموشی سے رکھ دیا ۔

بارھواں باب " قدیم اردو کی اہم ادبی اصناف و موضوعات " زیادہ تر میرا لکھا ہوا ہے ۔ میں نے اس میں دکنی اصناف کی خصوصیات اور ادبی ارتقا کو بیان کیا ہے ۔ پانچ اہم اصناف ، مثنوی ، غزل ، مرثیہ اور رباعی پر ڈاکٹر سیدہ جعفر نے لکھا ۔

خوب لکھا ہے ۔ میں نے بہت زیادہ اصناف پر لکھا ہے لیکن صفحات سیدہ جعفر نے زیادہ لیے ہیں یعنی ۲۲۲ ۔ ص ۳۰۱ پر میں نے ایک نثری صنف کا نام ملفوظ لکھا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ صوفیوں کے قول کو ملفوظ کہتے ہیں یا ملفوظہ ؟ انجمن ترقی اردو پاکستان میں ایک نوجوان ذہین لیکچرر نے پروف ریڈنگ کرتے وقت مجھ سے اصرار کیا کہ اسے ملفوظ کہتے ہیں ۔ عربی دار صوفیاء کے عالم ڈاکٹر نثار احمد فاروقی مجھے لاہور میں ملے ۔ میں نے ان سے پوچھا تو انھوں نے یہی کہا کہ "ملفوظات" کا واحد ملفوظ ہے ۔ میں نے اس اصطلاح کا نام ملفوظ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند میں ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم کی تحریر کے عنوان سے لیا تھا ۔ (چھٹی جلد ص ۱۱۷) ۔ میری رائے ہے کہ نثر کی ایک صنف یا موضوع کے طور پر اسے ملفوظ کے بجائے ملفوظہ ہی کہا جائے ۔ اس طرح اس کی مشابہت قصیدہ، مرثیہ، مثنویہ (ایک) ، نامہ والی شعری اصناف (معراج نامہ، نور نامہ وغیرہ) اور رسالہ، مقالہ، افسانہ، انشائیہ، خاکہ جیسی شعری اصناف یا انواع سے ہو جائے گی ۔

امید کرتا ہوں کہ میرا گم شدہ تیرھواں باب، جو ایک طرح سے مجموعی خاتمہ بھی ہے، ضمیمے کے طور پر چھاپ دیا جائے گا ۔ جلد کے آخر میں کتابیات بہت تفصیل سے ہے یعنی ۳۵ صفحوں پر ۔ اس کی کئی فصلوں پر قوسین میں سیدہ جعفر کا نام لکھا ہے ۔ میں نے اپنی کتابیات علیحدہ سے بنا کر بھیجی تھی، سیدہ جعفر کی کتابیات الگ تھی ۔ معلوم نہیں موجودہ کتابیات دونوں کی مدغم کر کے بنائی گئی ہے یا اس میں صرف سیدہ جعفر کی کتابیں ہیں ؟

اتنی تحقیقی کتاب میں اشاریہ نہیں ۔ اشاریہ بنانا ناشر کی ذمے داری ہوتا ہے، بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ ایک سے زیادہ مصنفوں کی تحریر ہو ۔ میں نے ترقیِ اردو بیورو کو کئی بار لکھا، انھیں یہ بھی پیش کش کی کہ اگر میری تحریر کی کاپیاں یا مطبوعہ پروف مجھے بھیج دیے جائیں تو میں اپنے حصے کا اشاریہ بنادوں گا لیکن بیورو کے سابق انتظامیہ کے تحت تو خطوں کا جواب بھی نہ دیا جاتا تھا، اشاریہ تو کیا بنتا ۔ کوئی تجارتی نجی ناشر اس کھکیڑ میں پڑنے کو تیار نہ ہو تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن ایک بڑا علمی ادارہ اس سے پہلو تہی کرے تو یہ ایک بڑی کمی ہے ۔ میری کتاب اردو کی نثری داستانیں طبعِ دوم پر انجمن ترقیِ اردو پاکستان نے جیسا مفصل اشاریہ تیار کر کے لگایا ہے وہ قابلِ تعریف و تقلید ہے ۔

اس تاریخ کی جلدوں میں سیدہ جعفر نے جو کچھ لکھا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے ۔ انھیں پس منظر بہت مختصر لکھنا چاہیے تھا ۔ مصنفوں اور ان کی کتابوں پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کہیں غیر متعلق نہیں ۔ اسے پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے لیکن انھوں نے بعض شعرا پر جو بہت پھیلا کر لکھا ہے مثلاً نصرتی ۱۷ صفحے، ملا قطب شاہ ۲۵ صفحے، غواصی ۲۸ صفحے، ہاشمی ۳۲ صفحے یہ ایک تاریخ کے لیے بڑا بار ہے ۔ لکھنے کو تو ایک شاعر یا ادیب پر کئی سو صفحوں کی کتاب لکھی جاتی ہے لیکن پورے ادب کی تاریخ لکھتے وقت ہاتھ روک کر، حدود کے ساتھ لکھنا ہوتا ہے ۔ اس سے قطع نظر میں یہ اعتراف کروں گا کہ انھوں نے غیر معمولی محنت کی ہے اور تحقیق کا حق ادا کردیا ہے ۔ میں اپنی تاریخ نگارش کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا ۔ اس کا فیصلہ دوسرے کریں گے ۔ انھی کے باعث یہ کہنے کی جرات کروں گا کہ نقش آخر ہونے کی وجہ سے اب تک کی دکنی ادب کی تاریخوں میں یہ بہترین ہے ۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیش رووں کی تحقیق یا تحقیقات سے پورا استفادہ کیا ہے ۔

○●○

سلطانہ مہر

نگار سجاد ظہیر



یہ شعر نگار سجاد ظہیر کا ہے :

تو نے جو خود کو جہانگیر بنا رکھا تھا
پا بہ جولاں ہے مری سلطنت دل کے قریب

نگار جتنی خوب صورت نثر لکھتی ہیں ، اتنے ہی کاٹ دار شعر بھی کہتی ہیں ۔ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی نثر بہتر ہے یا نظم کیوں کہ نگار کے ہر کام میں نظم و ضبط ہے ، سلیقہ ہے انھیں محبت کرنے کا بھی ڈھنگ آتا ہے ۔ اسی محبت کے ہتھیار سے وہ اپنے پرائے سبھی کے دل فتح کرتی ہیں ۔ تحریر میں بھی محبت کے کنول کھلانے کا ہنر انھیں آگیا ہے ۔ تحقیق کے موضوع پر نگار نے " غلامی ایک تحقیقی جائزہ " کے عنوان سے قابل مطالعہ مواد جمع کیا جو ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا ۔ ۱۹۹۳ء میں تاریخ کے حوالے سے " مطالعہ تہذیب " کے عنوان سے ۲۰۲ صفحات کی کتاب لکھی۔

سفر نامہ نجد و حجاز ۱۹۹۶ء میں " دشتِ امکاں " کے عنوان سے ایک تاریخی دستاویزی حیثیت سے سامنے آئی ۔ نگار لے ک کا پہلا مجموعہ " حرفِ غلط " زیرِ طبع ہے ۔ نگار کو افسانہ نگاری سے بھی دل چسپی ہے اور شاعری کے مقابلے میں افسانہ نویسی کو ا کتھارسس کا بہترین ذریعہ سمجھتی ہیں ۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ " دستِ قاتل " کے عنوان سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوچکا ہے ۔ ان کلام اور نثری تخلیقات معاصر ، بتول (لاہور) روپ ، تشکیل ، اخبارِ جہاں ، جنگ ، جسارت کراچی کے علاوہ اردو نیوز جدہ میں بھی ش ہوتی رہتی ہیں ۔

نگار ۲۰ دسمبر ۱۹۵۴ء کو الہ آباد (یو ۔ پی ، ہندستان) میں پیدا ہوئیں ، بی ۔ اے آنرز اور تاریخ اسلام میں ایم ۔ اے کر کے بعد پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری کے حصول کی تکمیل میں لگی ہوئی ہیں ۔ جامعہ کراچی کے شعبہ ، اسلامی تاریخ سے ۱۹۸۰ء سے بہ حیثیت لکچرار وابستہ ہیں ۔

نگار کہتی ہیں کہ " میرے لیے میری زندگی کا اہم واقعہ میرا ایک خواب ہے جس کے شرمندہ تعبیر ہونے کی شدت سے ' ہوں اور وہ یہ کہ " احترام آدمیت کا درس عام ہوجائے اور انصاف بن مانگے گھر کی دہلیز پر ملنے لگے ۔"

نگار کہتی ہیں ۔ ۔ ۔ " اردو میں شمع کی مانند ہے ، جس پر پروانہ وار فدا ہونے والے عاشقوں کی کمی نہیں اور یہ اس شمع خوش نصیبی ہے کہ اس کے عاشقوں میں صرف وہی شامل نہیں ہیں ، جن کی مادری زبان اردو ہے بلکہ وہ بھی شامل ہیں جن کی ما زبان کچھ اور ہے مگر وہ اردو سے محبت کا حق ادا کررہے ہیں ۔ یہ آخر الذکر عشاق ، اول الذکر عشاق سے زیادہ قابلِ تحسین ہیں عشاق کے اس طویل سلسلے اور ان کی قابلِ ذکر جانثاری کو دیکھتے ہوئے میں اردو کے مستقبل کے بارے میں خاصی پُر امید ہوں ۔

شاعری میں اظہار کے لیے فنکار غزل کو بہتر ذریعہ سمجھتی ہیں۔ نثری نظم کے لیے ان کا خیال ہے کہ اگر شاعرانہ رچاؤ اور خیال آفرینی سے مزین ہے تو چل جاتی ہے ورنہ نہیں۔ آج کل کے مشاعرے ،ادب کی تخلیق اور ترویج میں کوئی کردار اس لیے ادا نہیں کرسکے کیوں کہ یہ "پی آر او" کے زور پر چلتے ہیں ۔البتہ تخلیقی نشستیں عموماً بہتر کردار کرتی ہیں اور ادیبوں اور شعرا کے لیے مہمیز کا کام انجام دیتی ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ ادب کسی دور میں بھی بے اثر نہیں رہا ۔جو چیز تخلیق ہی اثر کے زور پر ہو ۔وہ بے اثر ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ضروری ہے کہ اس مشینی دور میں لوگوں کے پاس ادب کے لیے وقت اور ادبی کتب کی خریداری کے لیے پیسہ کم ہے مگر ادیب اور قاری کا رشتہ بہ ہرحال قائم ہے۔ جب تحریروں میں ابلاغ ہے ،ادب کا قاری سے رشتہ برقرار رہے گا۔ جب یہ ابلاغ ختم ہوجاتا ہے تو نہ صرف ادب و قاری کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے بلکہ تحریر کی دل کشی اور اثر آفرینی بھی فنا ہوجاتی ہے۔ تحریر اسی وقت اثر دکھاتی ہے جب بات سلیقے اور خلوص سے کی جائے۔ ادب وقت گزاری کی چیز نہیں ،ایک سماجی ضرورت ہے۔ یہ جتنا اہم ایک ہزار سال پہلے تھا اتنا ہی اہم آج ہے اور اتنا ہی اہم ایک ہزار سال بعد بھی ہوگا۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فنکار نے کہا ۔۔۔ "ادب کو سرحدوں میں جکڑا نہیں جاسکتا۔ ادب نہ مغرب کا ہوتا ہے نہ مشرق کا یہ آفاقی ہے۔ جہاں تک تکنیک کا معاملہ ہے ،اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے وہ خود بہ خود متعین ہوجاتی ہے۔ جس طرح ایک اچھا عروض داں ،اچھا شاعر نہیں ہوتا ،اسی طرح ایک ادیب جو تکنیک کی فکر کرتا ہے ،اس کی تحریر سے ادبیت غائب ہوجاتی ہے۔ کراچی کے رہنے والے ایک بھوکے مزدور کے احساسات و جذبات فرانس کے رہنے والے ایک بھوکے مزدور کے احساسات و جذبات سے زیادہ مختلف نہیں ہوں گے۔ یہ ضرور ہے کہ زندگی کے بارے میں مخصوص عقائد نظریات کی وجہ سے ان کا ردِ عمل مختلف ہو مگر دکھ ایک ہی ہوتا ہے۔ بہترین ادب وہ ہے جو ان کے دکھوں کو ان ہی کے سماجی پس منظر میں محسوس کرے اور ایک دوسرے سماج میں رہنے والوں تک اس کا ابلاغ کرے۔"

○●○

نگار سجاد ظہیر

مدائنِ صالح

خیبر میں قلعہ قموص کی مکمل سیاحت کے بعد ہم نے خیبر کی چھوٹی سی بستی کو خیرباد کیا اور اپنی اگلی منزل کی جانب روانہ ہوگئے "العلا" کا شہر تھا جو مدائن صالح کے نزدیک تھا ہمارا ارادہ تھا کہ "العلا" میں رات گزار کر مدائن صالح کی سیاحت کو جائیں گے۔

۱۷ جولائی / ۲۰۰۹ کا گرم دن تھا، جب ہم خیبر سے نکلے تو شام ہونے لگی تھی۔ خیبر سے العلا جانے والی سڑک دو رویہ ہے، کہ مدینہ سے خیبر تک کی سڑک یک رویہ تھی۔ سعودی عرب کی ایک اچھی بات یہ ہے کہ صحراؤں میں سڑکوں کا جال بچھا ہوا اور سڑکیں بھی انتہائی چکنی، ہموار اور مضبوط جس نے صحراؤں کے سفر کو بھی سہل اور آسان بنادیا ہے۔

ہماری گاڑی رواں دواں تھی البتہ اس سارے سفر میں شدید ویرانی کا احساس ہورہا تھا۔ خیبر سے العلا جاتے ہوئے ر میں کوئی پٹرول پمپ نہیں ملا، حالاں کہ جیسا کہ میں "دشتِ امکاں" میں لکھ چکی ہوں کہ سعودی عرب میں ہائی وے پر تھو تھوڑے فاصلوں پر پٹرول پمپ ملتے ہیں جس سے آبادی کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں ویرانی ہی ویرانی تھی دونوں اطراف اونچے ٹیلے، سرمئی مائل کتھئی پہاڑ یا دور تک پھیلی ہوئی ریت اور اس کے درمیان سے نکلتی ہوئی اسفالٹ کی شفاف سڑک۔ سڑک ٹریفک بھی خال خال تھی۔ میلوں چلنے کے بعد کبھی کوئی گاڑی ہمارے قریب سے گزر جاتی، پھر وہی دشت کی خاموشی! راستہ میں "ہرگز طریق امن" بھی نہ ملا، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو خیبر سے العلا تک کا راستہ نہایت خطرناک ہے اگر گاڑی خراب ہو یا کوئی اور مسئلہ پیدا ہوجائے تو مسافر کیا کرے؟ یہ سوچ سوچ کر مجھے تو بوکھلاہٹ ہونے لگی۔

"ہم نے سخت غلطی کی" بالآخر میں نے سجاد کو اپنی پریشانی میں شریک کرنا چاہا۔

"کیوں؟"

مجھے سجاد کے اطمینان پر حیرت ہوئی "کس قدر ویران راستہ ہے، نہ آدم نہ آدم زاد، کوئی انسانی آبادی نہیں، ایک گاڑی ہوتی تو کم از کم ہمیں سہارا ہوتا۔ خدا نہ خواستہ ہماری گاڑی خراب ہوگئی یا کوئی اور ایمرجنسی ہوگئی تو اس ویرانے میں کریں گے؟"

"حیرت ہے ابھی تک کوئی پٹرول پمپ بھی نہیں آیا" اب سجاد بھی فکر مند ہوگئے۔ ہم اپنی پریشانی بچوں پر ظاہر نہیں چاہتے تھے لہٰذا اس گفتگو کو یہیں ختم کردیا، البتہ اپنے اعصابی تناؤ کو کم کرنے کے لیے میں قرآنی آیات کا ورد کررہی تھی میری خواہش تھی کہ رات اترنے سے قبل یہ ہول ناک سفر ختم ہوجائے اور ہم انسانی آبادی میں پہنچ جائیں۔

اترتی ہوئی شام اس اعتبار سے اچھی تھی کہ موسم کی شدت میں کمی آگئی تھی خیبر سے العلا تقریباً ۲۰۰ کلومیٹر کا راستہ مغرب تک ہم طے کرچکے تھے۔ دوراہ نما نیلے بورڈ جو شاہراہوں پر لگے ہوتے ہیں بتارہے تھے کہ العلا بہت نزدیک ہے جب دائیں جانب ہمیں ایک پٹرول پمپ نظر آیا۔ سجاد نے گاڑی پٹرول پمپ پر لے جاکر روک دی۔ پٹرول پمپ کے ساتھ ہی

(جنرل اسٹور) تھا۔ پیچھے باتھ روم۔ تھوڑے فاصلے پر چھوٹی سی جگہ کو گھیر کر مسجد بنائی گئی تھی۔ مسجد کے پیچھے ایک چادر پانی کی بچھی ہوئی تھی گاڑی سے اتر کر ہم سب اپنے اپنے کاموں سے لگ گئے۔ سجاد جلد چلے گئے۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں لینے۔ بچے ایک ایک کر کے باتھ روم جانے لگے۔ میں مغرب کی نماز کے لیے وضو کرنے لگی اور شاہدہ ہمارے لیے چائے بنانے لگی۔ چائے بنانے کا سارا سامان ہمیشہ دوران سفر میرے ساتھ ہوتا ہے۔ جگ میں گرم پانی۔ ٹی بیگ۔ خشک دودھ اور شکر۔

یہاں ہم تقریباً نصف گھنٹہ ٹھہرے۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے ڈوب چکا تھا۔ ہلکا اندھیرا صحرا کو گھیرنے لگا تھا جب ہم پھر العلا کی جانب روانہ ہوئے۔ جلد ہی شہر کے آثار شروع ہو گئے۔ چیک پوسٹ بھی ملا۔ جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو سڑکوں پر سناٹا تھا۔ اکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔ یہ چھوٹا مگر انتہائی صاف ستھرا اور جدید طرز کا شہر تھا۔ سڑکوں پر جو پہلا شخص چلتا ہوا نظر آیا وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔

«چلو بھئی یہاں بھی اپنے پاکستانی بھائی نظر آ گئے» راستے کا اعصابی تناؤ ختم ہو چکا تھا۔ اب ہم دشت کی ویرانی سے نکل کر انسانی آبادی میں آ گئے تھے۔ مرکزی سڑک ہی پر ایک پٹرول پمپ سے ہم نے گاڑی میں پٹرول ڈلوایا بلکہ ٹنکی بھروالی۔ یہاں کام کرنے والے دو لڑکوں میں سے ایک لاہور کا تھا اور دوسرا گھوٹکی کا۔ سجاد ان سے مدائن صالح جانے کے بارے میں اطلاعات حاصل کرتے رہے۔

«آپ کو مدائن صالح جانے کے لیے ورقہ (Letter) لینا ہوگا۔» وہ لڑکا سجاد کو بتا رہا تھا۔ «یہ ورقہ آپ کو وزارت الداخلیہ سے ملے گا اور وزارت الداخلیہ کا دفتر اسی سڑک پر آگے جا کر داہنے ہاتھ پر ہے۔»

رات ہو چکی تھی۔ تمام دکانیں بند ہو چکے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ ہم بھی رات گزارنے کا کوئی بندوبست کرتے لہٰذا ہوٹل کی تلاش میں نکلے۔ چند منٹ سڑکوں پر گھومنے کے بعد ہمیں «مطعم مدائن» نظر آیا۔ سجاد معلومات کرنے ہوٹل میں چلے گئے اور ہم گاڑی میں بیٹھے ان کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

«ہوٹل میں جگہ نہیں ہے» سجاد نے واپس آکر اطلاع دی۔ «تاہم تین بستروں کا ایک کمرہ ابھی خالی ہوا ہے۔ صفائی کرا کے وہ ہمیں دے دیں گے۔»

«ہوٹل میں اتنا رش کیوں ہے؟»

«لیلۃ الخمیس (جمعرات کی رات) ہے۔» سجاد نے بتایا۔ «کل چھٹی ہے لوگ تفریح کے لیے آئے ہوئے ہیں۔»

کچھ دیر انتظار کے بعد ہمیں اطلاع ملی کہ کمرہ خالی ہو گیا ہے۔ ہم نے زیادہ تر سامان گاڑی ہی میں رہنے دیا۔ ضرورت کا کچھ سامان لے کر مطعم مدائن میں داخل ہو گئے۔ پہلی منزل پر کمرہ نمبر ۲۲ ہمارے لیے صاف کیا گیا تھا۔ کمرے میں تین بستر لگے ہوئے تھے۔ ٹی۔وی۔ فریج۔ الماری ہر چیز موجود تھی۔ اے۔ سی تیز چل رہا تھا جس کی وجہ سے کمرہ خاصا ٹھنڈا تھا۔ صاف ستھرا بستر دیکھتے ہی بچے بستروں پر دراز ہو گئے۔ یوں تو میرا بھی ایسی ہی کسی حرکت کا جی چاہ رہا تھا مگر ابھی دو مراحل طے کرنے تھے ایک تو رات کا کھانا کھانا تھا کہ سخت بھوک لگ رہی تھی۔ دوسرے عصر ہی سے عشاء کی نماز پڑھنی تھی۔

سجاد کھانا لینے چلے گئے اور میں چیزوں کو حسب منشا جگہوں پر رکھنے لگی۔ کھانا آیا۔ یہ سنتے ہی تمام بچے اٹھے۔ کھانا کھایا گیا۔ میں نے نماز پڑھی اور پھر بستروں پر لیٹ گئے۔ تھکے تو تھے کہ جلد ہی نیند آ گئی۔

پھر صبح ہی صبح سجاد نے جگادیا "اب اٹھ جاؤ۔ بچوں کو تیار کرالو۔ میں ورقہ لے کر اور ناشتہ لے کر آتا ہوں۔"

"بھلا اتنی صبح نکلنے کی کیا ضرورت ؟"

"بیگم صاحبہ اتنی صبح بھی نہیں ہے۔ سات بج چکے ہیں۔ مدائن صالح صبح ہی صبح ہو آئیں۔ ریاض آج ہی واپس جانا ہے۔"

مجھے میاں صاحب کا یہ پروگرام بالکل پسند نہیں آیا۔ آج جمعرات تھی۔ ہم کل یعنی جمعہ تک بھی ریاض پہنچ جاتے تو ٹھیک تھا۔ مگر سجاد اپنا پروگرام سنا کر جاچکے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے جانے کے بعد ہم نے پھر لمبی تان لی۔ ناشتہ آیا تو اٹھنا ہی پڑا۔

"ورقہ نہیں ملا۔"

"کیوں ؟"

"ابھی تک دفتر نہیں کھلا۔"

"پھر کیا کریں ؟"

"ناشتہ کرلو۔ تیار ہوجاؤ۔ چلتے ہیں۔ دیکھا جائے گا۔"

ہم نے ایسا ہی کیا اور صبح ہی مدائن صالح کے لیے نکل گئے۔ العلاء سے مدائن صالح تقریباً ۲۵ کلومیٹر ہے۔ حسبِ سابق سڑک صاف ستھری، کشادہ اور شان دار تھی۔ البتہ اب دونوں جانب جن پہاڑوں کا سلسلہ تھا وہ سعودی عرب کے دیگر پہاڑوں سے یکسر مختلف تھے۔ ترشے ہوئے اور ہوا کے کٹاؤ (Air Erosion) کے زیرِ اثر آئے ہوئے۔ سرخی مائل کتھئی نرم پہاڑ۔ ان پہاڑوں میں وہ سنگلاخی اور کرختگی نہیں تھی جو کہ مکہ یا خیبر کے پہاڑوں میں تھی۔

وہ منظر اب تک میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔ دونوں جانب پہاڑی سلسلے۔ یا پیلی ریت۔ تاحدِ نظر اسفالٹ کی سیاہ شان دار سڑک۔ صبح کا سہانا منظر۔ صحرا کی صبح بھی اپنا مخصوص حسن رکھتی ہے۔ فطرت کے یہ نظارے شہروں میں کہاں ملتے ہیں ؟

شہر سے نکلتے ہوئے نیلے بورڈ پر لکھا ہوا دیکھا تھا۔

مدائن صالح ۲۵ کلومیٹر۔

ہمارے حساب سے ۲۵ کلومیٹر ہوچکے تھے۔ مگر مدائن صالح کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ "یہ پہاڑ سو فیصد مدائن صالح کے ہیں" میں نے کہا۔ "بستی یہیں کہیں ہونی چاہیے" جو پہاڑ میں تصویروں میں دیکھ چکی تھی۔ یہ انہی پہاڑوں جیسے تھے مگر وہ آثار کہاں تھے ؟ شاید آگے نکل آئے ہیں۔" سجاد نے گاڑی واپس گھمائی۔ چند کلومیٹر کے بعد ایک قدرے تنگ سڑک بائیں جانب مڑتی نظر آئی۔

چند لمحے ہم نے سوچا اور پھر گاڑی اسی سڑک پر ڈال دی۔ یہ تنگ سڑک تھی اور اس پر کوئی ٹریفک نہیں تھا۔ اس قدر سناٹا اور ویرانی تھی کہ خوف محسوس ہورہا تھا مگر میں نے اس خوف کا اظہار نہیں کیا کہ مدائن صالح جانا زیادہ ضروری تھا۔ خواہ خوف کے کتنے ہی دریا پار کرنے پڑتے۔ چند کلومیٹر چلنے کے بعد وہ سڑک داہنی جانب مڑ گئی۔ ہم بھی مڑ گئے۔ ذرا آگے جاکر پولیس چوکی آگئی۔ اس سے آگے "منطقہ آثار" (Antique) شروع ہو رہا تھا۔ گویا ہم صحیح جگہ پہنچ چکے تھے۔ پولیس چوکی پر ہمیں رکنا پڑا۔ ہمارے پاس ورقہ نہیں تھا۔ سجاد نے پولیس والے کو قائل کرنے کی بڑی کوشش کی کہ وزارۃ الداخلیہ کا دفتر ابھی کھلا نہیں ہے۔ ہمیں واپس ریاض پہنچنا ہے مگر سعودی شرطے نے معذرت کرلی۔

"ورقہ لانا ہی پڑے گا" سجاد نے آکر اطلاع دی۔ بعض سرکاری دفاتر میں جمعرات اور جمعہ کو چھٹی ہوتی ہے۔ ہمیں یہ خدشہ

تھا کہ کہیں آج دفتر نہ کھلا تو کیا ہوگا؟ لیکن شرطہ کا کہنا تھا کہ دفتر کھلے یا نہ کھلے ایک افسر ورقہ دینے ضرور آئے گا۔

"ہم واپس آگئے۔ سجاد کی سم جو طبیعت نے واپسی میں دوسرا راستہ اختیار کیا اب پتہ چلا کہ اصل راستہ یہی تھا۔ جو خاصا آباد تھا۔ اس راستہ پر ٹریفک بھی تھی اور یہ العلاء کی پرانی بستی سے بھی گزرتا تھا۔ ہم راستے کی جزئیات سمیٹتے اور جگہ جگہ رک کر تصاویر بناتے ہوٹل واپس آگئے۔

چائے پی کر سجاد پھر ورقہ کے حصول کے لیے چلے گئے اور میں موقع غنیمت جان کر پھر سوگئی لیکن جلد ہی اٹھنا پڑا۔ سجاد لیٹر لے آئے تھے۔ ایک بار پھر ہم مدائنِ صالح جانے کے لیے نکلے۔ گیارہ بج چکے تھے۔ گرمی بڑھنے لگی تھی۔ ایک بزنگی بقالہ پر رک کر ہم نے پانی کی ٹھنڈی بوتلیں لیں کہ ہم مدائنِ صالح کی خاک اس عالم میں چھاننے جارہے تھے کہ سورج نصف النہار پر ہوتا۔

"وزارت الداخلیہ میں جو پولیس چیف ملا اس کا نام احمد عبداللہ الدوسری تھا" سجاد ورقہ ملنے کی تفصیل بتانے لگے۔ "بڑا ہنس مکھ اور ملنسار بندہ تھا۔ میں نے تمہارا وزٹنگ کارڈ اس کو دیا تو اس نے پوچھا کہ تمہاری بیوی کے نام کے ساتھ تمہارا نام کیوں لکھا ہوا ہے؟

"هذا فی طریق امریکی" (یہ امریکی طریقہ ہے) میں نے اسے جواب دیا۔

"مافی شرعی" (مگر یہ شرعی اور اسلامی طریقہ نہیں ہے) احمد عبداللہ الدوسری نے کہا۔

سعودی عرب میں طریقہ یہ ہے کہ لڑکیاں ہمیشہ اپنے باپ کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ شادی کے بعد بھی ان کے ناموں میں شوہر کے نام کا لاحقہ نہیں لگتا۔ دوسری تہذیبوں میں جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا خاندان تبدیل ہوگیا ہے اور اب وہ اپنے شوہر کے خاندان کا ایک فرد سمجھی جاتی ہے لہذا وہ اسی خاندان کا خاندانی نام اپنے نام کے ساتھ لگا لیتی ہے اور خود لڑکی کا اپنا خاندان اس کے لیے کم یا غیر اہم ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ اسلامی تصور نہیں ہے۔ اسلام میں میاں اور بیوی دو پارٹنر ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک اپنا ایک قانونی تشخص رکھتا ہے۔ دوسو سال قبل تک مغربی عورت کا کوئی قابلِ ذکر قانونی تشخص نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی ملکیت کے بارے میں بھی شوہر کی مرضی کی پابند ہوتی تھی خواہ اس کی ملکیت اپنے شوہر کی زوجیت میں آنے سے قبل ہی کی کیوں نہ ہو۔ بعض تہذیبوں میں بیوی کی ذاتی چیزیں بھی اس کے شوہر کی ملکیت تصور ہوتی ہیں اور وہ بیوی کی اجازت کے بغیر ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کرسکتا ہے۔

اسلام میں یہ صورت حال برعکس ہے۔ اسلام میں ایک عورت اپنا مکمل قانونی تشخص رکھتی ہے۔ جیسے کوئی مرد رکھ سکتا ہے۔ وہ اپنی جائداد اور دیگر ملکیت کے بارے میں اپنے شوہر کی اجازت کی پابند نہیں ہوتی۔ اس کے بارے میں وہ اپنا ذاتی فیصلہ کرسکتی ہے۔ شادی مرد اور عورت کے مابین ایک معاہدہ ہوتی ہے۔ اس معاہدہ کو فسخ کرنے کا حق دونوں فریقین کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ فریقین میں سے ہر ایک کا نام اس کا "ذاتی نام" ہوتا ہے۔ عورت کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنا نام ہی اختیار کرے اور شوہر کے نام کا یا شوہر کے خاندان کے نام کا لاحقہ لگانے کی پابند نہیں ہے۔ بلکہ خاندانی طور پر وہ اپنے باپ ہی کے نام سے شناخت ہوگی۔ مثلاً عائشہ بنت ابی بکر، رسول اللہ سے شادی سے قبل بھی عائشہ بنت ابی بکر تھیں اور شادی کے بعد بھی عائشہ بنت ابی بکر ہی رہیں۔ فاطمہ بنت محمدؐ، شادی کے بعد بھی فاطمہ بنت محمدؐ رہیں۔ ان کے نام کے ساتھ ان کے شوہر علیؓ کا لاحقہ نہیں لگایا گیا۔ سعودی عرب میں آج بھی یہی رواج ہے مجھے اس بات کا علم ڈیڑھ دو سال قبل یہیں ہوا تھا۔ جب کئی خواتین سے بحث و مباحثہ ہوتے تھے۔ یہ وہ خواتین تھیں جو گزشتہ سترہ اٹھارہ برسوں سے سعودی عرب میں رہ رہی ہیں اور اپنے ناموں کے آگے اپنے باپ کا نام لگاتی ہیں۔

بلکہ ان میں سے ایک خاتون کا "فتویٰ" تو یہ تھا کہ جو خواتین اپنے باپ کی جگہ شوہر کے نام کا لاحقہ لگاتی ہیں وہ گنہ گار ہیں، لہٰذا انھیں توبہ کرنی چاہیے۔

خود میرا خیال بھی یہی ہے کہ لڑکی کی شناخت اس کے شوہر سے نہیں باپ اور ماں سے ہوتی ہے۔ شوہر بدل سکتا ہے باپ نہیں بدل سکتا۔ قیامت کے دن لوگ اپنی ماؤں کے نام سے پکارے جائیں گے وغیرہ۔ وغیرہ۔ لیکن مجھے اس بات کا علم دیر سے ہوا۔ میرے شناختی کارڈ، پاسپورٹ، دیگر اہم کاغذات اور تحریروں اور کتابوں پر میرے نام کے ساتھ میرے شوہر کے نام اور ان کے خاندانی نام کا لاحقہ لگا ہوا ہے۔ اگر مجھے اس مسئلہ کا علم شادی سے قبل ہوجاتا تو شاید نہیں بلکہ یقیناً میں اپنا نام تبدیل نہ کرتی اور میرا خیال ہے کہ پاکستان میں بہت ہی کم لوگ اس مسئلہ سے واقف ہوں گے۔

اس بارے میں مدائن صالح جانے کے لیے سابقہ خیبرآباد راستے کی جگہ العلاء کی پرانی بستی کے درمیان سے گزرنے والے نسبتاً آباد راستے کا انتخاب کیا، یعنی ملک فہد روڈ پر چلتے ہوئے العذیب سے داہنے جانب مڑیں۔ تقریباً بارہ کلومیٹر چلنے کے بعد منطقہ آثار (Antiques) کے بورڈ کے ساتھ بائیں جانب مڑیں، بشرطیکہ وہ بورڈ آج بھی اپنی جگہ لگا ہو۔ آگے چند کلومیٹر پر پولیس چوکی کے ساتھ ہی مدائن صالح کے آثار کے حدود شروع ہوجاتے ہیں۔ ان آثار کو آہنی باڑ لگا کر محفوظ کیا گیا ہے۔

پولیس چوکی پر شرطہ نے ورقہ چیک کیا اور ہماری گاڑی کے لیے آہنی گیٹ کھول دیا گیا۔ گاڑی جوں ہی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو ہمارے دائیں بائیں اور سامنے حجر کی وہ بستی تھی جسے مدائن صالح بھی کہتے ہیں۔ جو ہزاروں سال قبل حضرت صالحؑ اور ان کی قوم ثمود کی جائے رہائش تھی۔

قومِ ثمود کا ذکر قرآنِ مجید میں نو سورتوں میں آیا ہے۔ ان کا زمانہ قومِ عاد کے بعد کا ہے۔ عاد کا زمانہ تقریباً ۲ ہزار سال قبلِ مسیح کا مانا جاتا ہے، یعنی حضرت ابراہیم سے بھی بہت پہلے کا۔ ان دونوں (یعنی عاد اور ثمود) کا شمار سامی اقوام کی شاخوں "عرب بائدہ" میں ہوتا ہے۔ حضرت نوحؑ کی اولاد میں ایک کا نام ثمود تھا یہ قوم ان سے منسوب تھی، انھیں عادِ ثانی بھی کہا گیا ہے۔ اس قوم نے (۱۷۰۰) سترہ سو بستیاں آباد کیں جو خوش نما اور سرسبز و شاداب تھیں۔

ان کی یہ بستیاں حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ میں ۲۵ مربع میل میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس وادی میں جا بہ جا چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں جس کی وجہ سے "وادی القریٰ" (قریہ کی جمع) نام پڑ گیا۔ ان کا مرکزی شہر یا بستی الحجر تھی، جو بعد میں "فج الناقۃ" اور آج کل مدائنِ صالح کے نام سے مشہور ہے جو مدینہ منورہ سے تقریباً ۴۰۰ کلومیٹر شمال میں تبوک کے راستے پر واقع ہے۔

رسول اللہ نے تبوک جاتے ہوئے یہاں مختصر قیام کیا تھا۔ یہ معذب بستی تھی لہٰذا ہم جلد ہی اس کی سیاحت سے فارغ ہونا چاہتے تھے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر جب آپؐ یہاں سے گزرے تھے تو مدائنِ صالح کے کھنڈرات میں جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے ان کو جمع کرکے آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں ثمود کے انجام پر عبرت دلائی اور کہا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا لہٰذا یہاں سے جلدی سے گزر جاؤ۔

یہی بات بار بار میں بچوں کے سامنے دہرا رہی تھی کہ ہمیں جلدی کرنا چاہیے، اس پورے علاقے میں میری کوشش رہی کہ [illegible] کی کیفیت طاری رہے، سیر [illegible] کا حصہ شامل [illegible] ہم نے وہاں سوائے پانی کے کچھ بھی کھانے پینے سے احتراز کیا۔

"اگر یہاں اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا اور ہمیں یہاں سے جلدی گزرنے کا حکم ہے تو آخر یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی؟"
شاہ کا سوال تھا۔

"اس لیے کہ "سیروا فی الارض" بھی تو اللہ ہی کا فرمان ہے۔ یہ بھی تو اللہ کا حکم ہے کہ دنیا میں گھومو پھرو اور اس کی نشانیاں دیکھو۔ اگر یہ معذب مقامات نہ دیکھے جائیں تو عبرت کیوں کر حاصل ہوگی؟ ان معذب مقامات پر تفریح کی غرض سے نہیں آنا چاہیے لیکن حصولِ علم اور حصولِ عبرت کے لیے ان آثار کو دیکھا جاسکتا ہے۔" میں نے بتایا کہا۔

"کیا ان آثار سے آپ لوگ کوئی سبق حاصل نہیں کر رہے ہیں؟" میں نے بچوں سے سوال کیا۔ "کر رہے ہیں کہ جو قومیں اللہ کی نافرمانی کرتی ہیں وہ تباہ کردی جاتی ہیں۔"

مسعود پھرتی سے بولا۔

"ہاں۔ خواہ وہ کتنے ہی مضبوط قلعوں میں رہتی ہوں۔"

حجر کی وسیع و عریض بستی ہماری نظروں کے سامنے تھی، ترشے ترشائے، مدور پہاڑوں کی بستی۔ ان پہاڑوں میں ایک یا زائد دروازے بنے ہوئے تھے ہم پہاڑوں کی نصف بلندی طے کرکے ان دروازوں تک پہنچتے تو عموماً ایک جیسا منظر آتا گول چھت، مسلسل ۱۲ × ۱۲ یا اس کے لگ بھگ کا ایک کمرہ سنگی فرش اور اس کمرے میں ایک یا دو قبریں۔ یہ آلِ ثمود کے مقابر تھے۔

یہ قوم سنگ تراشی میں ماہر تھی۔ یہ پہاڑوں کو کھود کر عالی شان مکانات و مقابر بناتے اور نقش و نگار سے آراستہ کرتے۔ ہم اس کے چشم دید گواہ بن چکے تھے۔ انیسویں صدی ہجری میں ابنِ بطوطہ حج کو جاتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "یہاں سرخ رنگ کے پہاڑوں میں قومِ ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انھوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر اس کے اندر بنائی تھیں۔ ان کے نقش و نگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہوں۔ ان مکانات میں اب بھی سڑی گلی انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملتی ہیں۔" (تفہیم جلد ۲ ص: ۵۱۲)۔ غالباً تاریخ میں ثمود ہی وہ پہلی قوم ہے جس نے چٹانوں کے اندر اس طرح کی عمارتیں بنانے کا سلسلہ شروع کیا یہ تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل کی بات ہے کہ اس کے ہزاروں سال بعد قبطیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبلِ مسیح میں اس فن کو مزید ترقی دی۔ ان کی یادگاریں اب بھی خلیج عقبہ کے کنارے، مدائن کے مقام پر اور اردن کی ریاست میں پیٹرا (Petra) کے مقام پر اب بھی موجود ہیں۔ اور پھر العلا میں، جس کے غار پیٹرا سے تقریباً سات سو سال بعد کے ہیں، یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا۔

مدائنِ صالح کا یہ پورا علاقہ اب محکمہ آثار قدیمہ کی زیرِ نگرانی ہے لہٰذا انھوں نے سیاحوں کی آسانی کے لیے جگہ جگہ بورڈ لگا رکھے ہیں جس سے اس پہاڑی عمارت کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔ ہم ایک ایک آثار کو دیکھتے جارہے تھے اور تصویریں کھینچنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ میں ضروری نوٹ بھی لیتی جارہی تھی۔ ایک جگہ "المقابر النبطیۃ (Nabataeen [illegible] Tombs)" تھا، یہ بھی پہاڑوں کو کھود کر تیار کیے گئے مقابر ہیں۔ ان مقابر کی صورت یہ ہے کہ کسی مدور پہاڑی پر نصف بلندی پر ایک دروازہ ہوگا۔ آپ دروازے سے اندر داخل ہوں تو آپ خود کو ایک چوکور کمرے میں پائیں گے۔ چھت کی بلندی ۱۰ تا ۱۲ فٹ ہوگی اور چھت کو بلا لگا کر چوڑا نہیں سکیں گے اس کمرے میں فرش سے ایک ڈیڑھ فٹ کی گہرائی میں قبریں بنی ہوں گی۔ ایک یا دو یا اس سے زیادہ چار۔ بعض مقابر کے دروازوں پر کچھ نقش تھا۔ وہ سادہ اور معمولی ہیں، بعض مقابر کے

دروازوں پر " عقاب " کا نشان کھدا ہوا ہے ۔ ایک پر ٹوٹا عقاب ۔۔۔ ہوسکتا ہے یہ شاہی ۔۔ بر ہوں ۔

بالکل اسی طرز کے ان کے قصر تھے ۔ قصرالفرید ، قصرالصالح ، اور قصرالبنت وغیرہ ۔ یہ قصر بھی بالکل ایک طرح کے تھے اور ایسے ہی تھے جیسے ان کے مقابر تھے ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے متمول افراد اپنی زندگی میں ایسے قصر قاروں میں بنواتے ہوں اور انھیں ان کے مرنے کے بعد وہیں دفن کردیا جاتا ہو کیوں کہ ان کے مقابر اور ان کے قصر میں مجھے کوئی فرق نہیں نظر آیا ۔ ہم نے تقریباً ہر قصر اندر سے دیکھا ، قصر البنت جس کا زیادہ شہرہ ہے اور جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ان کے سردار جندح کی شاہی حویلی تھی ، آیئے میں آپ کو اس کی سیر کراتی ہوں ۔

یہ قصر ایک بڑی پہاڑی کے اندر بنایا گیا ہے لہذا پہلے تو آپ کو پہاڑی پر چڑھنا پڑے گا ، کم از کم نصف بلندی تک ۔۔۔ اب مگر ، آثار قدیم والوں نے لوہے کی سیڑھیاں لگادی ہیں جس کی وجہ سے یہ چڑھائی آسان ہوگئی ہے ۔ جب آپ تقریباً نصف بلندی پر پہنچیں گے تو آپ کو چند گز کا ایک مسطح چبوترا (Platform) سا ملے گا ۔ سامنے قصر کا کم از کم آٹھ فٹ بلند ایک دروازہ نظر آئے گا ، جس کے اوپر ایک پر ٹوٹا عقاب تراشا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ دروازے کے چاروں طرف اور اوپر کئی گز کی بلندی تک نقش و نگار تراشے گئے تھے جس کی وجہ سے محل کے داخلی دروازے کی شان بڑھ گئی تھی ۔

آپ دروازے سے اندر داخل ہوں تو خود کو ۲۵ x ۲۵ کے ایک کمرے میں پائیں گے ۔ سامنے اور دائیں بائیں تین فیٹ بلندی کا ایک چبوترہ سا ہے سامنے والے چبوترے پر دو مزید دیواریں اٹھی ہوئی ہیں جن کی وجہ سے مستطیل شکل کے تین خانے سے بن گئے ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ ایک خانہ ، ایک کمرہ ، استراحت کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا ۔ یہی حال دائیں اور بائیں جانب کے چبوترے کا ہے ۔۔۔ بس یہ شاہی حویلی یا قصرالبنت ہے ۔

اس سیاحت سے جہاں تک میں سمجھ سکی وہ یہ کہ جیسا کہ قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ میدانوں میں بڑے بڑے عالی شان قصر بناکر رہتے تھے اور پہاڑوں کو کاٹ کر بھی مکانات بناتے تھے ۔ ان کے امرا و روسا کا طریقہ یہ رہا ہوگا کہ وہ ان پہاڑی مکانات کو موسم گرما یا سرما کی شدائد کے دوران اپنی استراحت گاہ بناتے ہوں گے ۔ جیسا کہ آج کل بھی ہوتا ہے کہ ، ہمارا طبقہ ، امرا شدید گرمی کے دن سوات ، مری اور کاغان میں گزارنا پسند کرتا ہے ۔ چوں کہ یہ پہاڑ میں بنے ہوئے مکانات تھے ۔ لہذا ٹھنڈے تھے ۔

" یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمھیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو ۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو ۔" (الاعراف : ۷۴)

مدائن صالح کے شہر کو آثارِ قدیمہ والوں نے مختلف محلوں یا Localities میں تقسیم کیا ہوا ہے ، ہر علاقہ کا اپنا نام ہے مثلاً منطقه الخريمات یا جبل العليمیه وغیرہ ۔

گھومتے گھامتے ہم " الدیوان " تک آ پہنچے ۔ یہ دیوان ایک کشادہ نشست گاہ ہے جہاں تین اطراف میں سنگی بنچیں بنی ہوئی ہیں (جسے تصاویر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے) ۔ یہ دیوان بہت دیوہیکل پہاڑ کی کھوہ میں بنایا گیا ہے یعنی پہاڑ کا دامن اندر کی طرف کاٹ کر یہ دیوان نکالا گیا ہے ۔ اس کے سامنے چند گز کے فاصلے پر اتنا ہی دیوہیکل ایک پہاڑ اور بھی ہے ۔ ان دونوں بڑے پہاڑوں کی وجہ سے دیوان کے سامنے والی راہ گزر ، ایک سایہ دار راہ داری کی شکل اختیار کر گئی ہے ۔ یہ سایہ دار راہ داری جس کا فرش پیلی ریت کا

تھا انتہائی ٹھنڈی تھی خالاں کہ اس وقت باہر کا درجہ حرارت کسی طرح بھی ۴۰ ڈگری سنٹی گریڈ سے کم نہیں تھا اور اس وقت بارہ سے ایک کا درمیانی عمل تھا، یعنی دن کا گرم ترین وقت۔

راہ داری کے دونوں طرف کے پہاڑوں کو طاقوں کی صورت میں کاٹ کر وہاں انھوں نے اپنے بتوں کی تصویریں تراشی ہوئی تھیں۔ قومِ عاد کی طرح ثمود بھی بت پرست تھے۔ ان کے بتوں کے نام صنر، ضمریر اور ابھا تھے۔ اس دیوان کو آلِ ثمود عموماً اپنی مذہبی رسومات کے لیے استعمال کرتے تھے۔

دیوان جس پہاڑ میں بنایا گیا تھا اور اس کے مدِ مقابل جو پہاڑ تھا، دونوں آگے جا کر ایک دوسرے سے نزدیک آگئے تھے لہذا راہ داری خاصی تنگ ہوگئی تھی۔ ہم اس تنگ گزرگاہ سے نکل کر دوسری جانب پہنچے تو وہ ایک اور کھلا علاقہ تھا۔ ہمارے چاروں جانب پہاڑ تھے، جن میں مکانات بنائے گئے تھے۔ کبھی یہاں آبادی ہوتی ہوگی، اس شہرِ خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ یہاں ہمیں ایک کنواں بھی نظر آیا جہاں بارش کا پانی جمع ہوتا ہوگا۔

ہم دیوان کی جزئیات سمیٹ رہے تھے کہ جیپ پر ایک بدو آیا۔ اسے ہم باہر پولیس چوکی پر بھی دیکھ چکے تھے، ہوسکتا ہے ان کا گائیڈ رہا ہو یا ان کی انتظامیہ کا کوئی فرد کیوں کہ اس کو ہم نے جیپ میں ادھر سے ادھر آتے جاتے دیکھا تھا۔

اس نے قریب آکر ہمیں بتایا کہ اس وقت ہم دیوان میں کھڑے ہیں۔ پھر اس نے عربی زبان میں دیوان کے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے زیادہ معلومات ہم دیوان کے قریب لگے ہوئے نیلے بورڈ سے حاصل کرچکے تھے۔ پھر وہ ہمیں گرد و نواح کے بارے میں کچھ بتانے لگا، پھر قصرالبنت کے بارے میں، ان میں سے آدھی باتیں ہماری سمجھ میں آرہی تھیں آدھی نہیں۔ میں نے اس کی بات کاٹ کر اس سے ناقۃ الصالح اور اس کنویں کے بارے میں سوال کیا جہاں سے حضرت صالح کی اونٹنی پانی پیتی تھی۔ اس نے دور مخالف سمت میں ہاتھ سے اشارا کرکے بتایا کہ یہ آثار پہاڑوں کے اس طرف ہیں جنھیں بند کردیا گیا ہے اور عموماً ٹورسٹ حضرات کو وہاں نہیں جانے دیتے۔ ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کنویں کے بارے میں مجھے یہ اطلاع تھی کہ اب وہ کنواں ترکی عہد کی ایک ویران چھوٹی سی فوجی چوکی کے اندر پایا جاتا ہے اور بالکل خشک پڑا ہے۔

نزولِ قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر بھی رسول اللہ ادھر سے گزرے تھے ایک جگہ آپ نے ایک کنویں کی نشان دہی کرکے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالح کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اس کنویں سے پانی لینا، باقی کنووں کا پانی نہ پینا۔۔۔ ایک پہاڑی درے کو دکھاکر آپ نے بتایا کہ اسی درے سے اونٹنی کا معجزہ نکالا گیا تھا۔ چناں چہ وہ مقام آج بھی "فتح الناقۃ" کے نام سے مشہور ہے وہ بدو صحیح کہہ رہا تھا کیوں کہ ہم نے گاڑی پر تقریباً سارا علاقہ چھان مارا، اس نام کا کوئی بورڈ ہمیں نظر نہیں آیا۔ نہ ہمیں ترکی عہد کی کوئی چھوٹی سی فوجی چوکی ہی مل سکی۔

ہم ثمود کی اس بستی میں پھر رہے تھے جو تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل وہاں آباد تھی، ہمارے علاوہ کئی گاڑیوں میں اور بھی ٹورسٹ تھے جو ان آثار عبرت کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔

عاد کے بعد جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہی ثمود تھے، مگر ان کی تمدنی ترقی نے بھی بالآخر وہی شکل اختیار کرلی جو عاد کی ترقی نے کی تھی یعنی معیارِ زندگی بلند سے بلند تر اور معیارِ آدمیت پست سے پست تر ہوتا چلا گیا، معاشرے میں شرک اور بت پرستی

کا تصور پھیلتا چلا گیا اور بیرونی معاشرے میں وہ تمام تر شرک کا نتیجہ ہوتی ہے قوم کے بدترین اور مفسد لوگ قوم کے سردار بنے ہوئے تھے۔ بلاشبہ انھوں نے انجینئرنگ اور فنِ تعمیر میں حیرت انگیز ترقی کرلی تھی مگر ان کی تعمیرات کی غرض و غایت یہ تھی کہ اپنی دولت و قوت، شان و شوکت اور اپنے کمالات فن کی زیادہ سے زیادہ نمود و نمائش کریں۔ یہ تعمیرات ضرورت کی غرض سے نہیں بلکہ نمود و نمائش کی غرض سے تھیں۔ ایک بگڑے ہوئے معاشرہ کی شان یہی ہوتی ہے کہ ایک طرف معاشرے کے غریب لوگ سر چھپانے کے لیے جھونپڑی تک کو ترسیں تو دوسری طرف امرا اور اہلِ ثروت جب رہنے کے لیے ضرورت سے زیادہ محل بنالیں تو بلاضرورت نمائشی یادگاریں تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

نزولِ قرآن سے پہلے قوم ثمود کے قصے اہلِ عرب میں زبان زد عام تھے۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بہ کثرت اس کا ذکر ملتا ہے۔ سیریا کے کتبات اور یونان، اسکندریہ اور روم کے قدیم مورخین اور جغرافیہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے۔ چناں چہ رومی مورخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن فوج میں بھرتی ہوئے اور قبطیوں کے خلاف لڑے جن سے ان کی دشمنی تھی۔

ثمود کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان ہی میں سے حضرت صالح کو رسول بنایا (۱)۔ ان کے والد کا نام عبیل تھا جو حجر کی بستی میں رہتے تھے۔ حضرت صالح کی تبلیغ و تلقین کے نتیجے میں اس زبردست قوم کے چند کمزور لوگ ایمان لے آئے۔ جو زبردست تھا وہ مخالفت میں بھی انتہائی جری تھا اور اقوامِ عالم کی تاریخ میں عموماً ایسا ہی ہوا ہے۔ نبوت کے اعلان سے قبل حضرت صالح ان کے ہر دل عزیز فرد تھے، جب انھوں نے شرک اور بت پرستی کے خلاف آواز لگائی تو وہ ان کے مبغوض ترین فرد بن گئے

"اے صالح! اس سے قبل تو تو ہمارے درمیان ایسا تھا جس سے ہمیں بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جس کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے، تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلارہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے" (۲) وہ کہتے۔

کبھی وہ صالح کا مذاق اڑاتے کہ اللہ میاں کو بس آپ ہی نظر آئے تھے۔ بھئی اگر پیغمبر ہی بنانا تھا تو کسی فرشتے کو بنا۔ (۳)۔ کبھی وہ صالح کے پیروکاروں سے الجھتے اور کہتے۔

"کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے؟"

"بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے، اسے ہم مانتے ہیں" (۴)۔ "جواب دیتے جس پر عرب سردار ہٹ دھرمی سے کہتے" (۵)۔

جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم ہرگز اسے نہیں مانیں گے۔

ان کے حسنت مل سردار، جن کی تعداد قرآن نے نو بتائی ہے۔ جن کی ساتھ ان کے لاولشکر بھی تھے اور تمام آسائشوں سے بھرے ہوئے محلات اور کھیتیاں بھی وہ حضرت صالح اور ان کے پیروکاروں کو دلیل دیا کرتے کہ دیکھو اگر ہم باطل پرست ہیں تو یہ دھن دولت، محلات، سرسبز کھیتیاں، باغات اور نعمتیں ہمیں کیوں عطا ہوئیں؟ اگر آپ اور آپ کے ساتھی ہی اللہ کے حبیب ہیں تو یہ آسائشیں اور نعمتیں آپ کو کیوں نہ عطا ہوئیں؟؟

حضرت صالح انھیں سمجھاتے کہ یہ سب آزمائش ہے، چند روزہ عیش ہے، اگر تم اللہ کے شکر گزار نہ بنے تو یہ سب کچھ

بھی کیا جاسکتا ہے۔ مگر وہ ایک بگڑی ہوئی قوم تھی اس سرکش قوم نے اپنے صالح نبی کی صالح باتیں ماننے سے انکار کر دیا اور معجزے کے طلب ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ جو کچھ صالح کہہ رہا ہے وہ بس اس کا خللِ دماغ ہی ہے اگر واقعی نبی ہے تو معجزہ لائے۔

"ایسا نہ ہو کہ معجزہ آجانے کے بعد بھی تم اپنے انکار پر قائم رہو۔ تب تو تم تباہ کر دیے جاؤ گے۔" حضرت صالح نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں اگر ہماری مرضی کے مطابق معجزہ آگیا تو ہم ایمان لے آئیں گے۔" سب سرداروں نے کہا۔ "کس قسم کا معجزہ چاہتے ہو؟" صالح نے پوچھا۔

"سامنے والے پہاڑ سے ایک ایسی گابھن اونٹنی نکالو۔ جو نکلتے ہی بچہ دے۔ اس بچے کے بال سرخ ہوں۔ ہم اس اونٹنی کا دودھ پیا کریں گے۔" (یعنی دودھ اتنا ہو جو بستی والوں کو کافی ہو)۔

یہ ایک بالکل ناممکن العمل بات تھی۔ اگر صالح ایک عام انسان ہوتے تو وہ کبھی بھی ایک ایسی اونٹنی کو ایک پہاڑ کے پیچھے سے نکالنے پر قادر نہ ہوتے جو گابھن بھی ہو۔ فوراً بچہ بھی دے دے اور بچے کے بال سرخ بھی ہوں اور تو اور وہ اونٹنی اتنا دودھ بھی دے جو بستی والوں کے لیے کافی ہو۔

حضرت صالح نے اس ناممکن العمل کو ممکن بنانے کے لیے رب العزت کی بارگاہ میں دعا کی۔ پہاڑ میں سے ایک گونج دار آواز آئی۔ ایک بڑا پتھر پھٹا اور اس کے عقب سے ایک حاملہ اونٹنی برآمد ہوئی۔ جس نے بچہ دیا۔

دیکھنے والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

بچے کے بال سرخ تھے۔

وہ ٹکٹکی باندھے دم سادھے اونٹنی اور اس کے بچے کو دیکھ رہے تھے۔

"یہ ہے اللہ کی ناقہ۔ جو تمھارے لیے ایک نشانی ہے۔ اسے اللہ کی سرزمین میں چرنے دینا اور کوئی گزند نہ پہنچانا کہ پھر تمہیں دردناک عذاب آلے۔" صالح پکارے۔ قوم سہم گئی تھی۔ لہٰذا چپ چاپ سنا کیے۔

پہاڑ سے نمودار ہونے والی اونٹنی اور اس کے سرخ بالوں والا بچہ چرتے چرتے وادی القریٰ کے مرکزی چشمے پر پہنچ گئے۔ اس کے علاوہ بھی بستی میں کنویں رہے ہوں گے جو موسم کی بارشوں سے سیراب ہوتے ہوں گے۔ مگر چشمہ یہ واحد ہی تھا۔ اونٹنی اور بچے نے چشمے کا سارا پانی پی لیا اور چشمہ خشک ہو گیا۔

ظاہر ہے اگر اونٹنی کو اتنا ہی دودھ دینا تھا کہ ساری بستی کو کافی ہوتا تو اسے اتنا ہی پانی پینا تھا کہ چشمہ خشک ہو جائے۔

قوم کے کاہنوں نے اعلان کیا۔ "یہ تو جادو ہے۔"

اب پانی کا ذخیرہ کم ہوا انھوں نے صالح سے کہا۔

"یہ اونٹنی تو ہمارا سارا پانی پی گئی ہم اس کو اور بچے کو باندھ دیں گے۔"

"اسے کچھ نہ کہو یہ اللہ کے حکم پر تمھارے لیے بھیجی گئی ہے۔" صالح نے سمجھایا کہا۔

"تو ہم سب پیاسے مر جائیں؟"

"اللہ نے اس کے اور تمھارے درمیان پانی پینے کی باری مقرر کر دی ہے۔ ایک دن اس ناقہ کا ہوگا اور دوسرا دن تم لوگوں کا

اس کے چوپایوں کا۔ پیغمبر اس میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

قوم کے بعض لوگ اس معجزے کو دیکھ کر ایمان لے آئے جن میں ایک سردار جندع بن عمرو بھی تھا مگر کاہنوں اور سرداروں نے دیگر لوگوں کو یہ کہ کر روکے رکھا کہ یہ معجزہ نہیں جادو ہے۔ یہ شخص نبی نہیں ساحر اور جادوگر ہے۔ اس کے پیچھے لگ کر اپنے آبائی دین سے کیوں پھرتے ہو؟

یہ ہر حال کچھ عرصہ بستی میں پانی کے لیے باری کا نظام چلتا رہا اپنی باری والے دن وہ اونٹنی پہاڑ کی کھوہ سے نکلتی۔ چرتی چگتی اور کنویں کا سارا پانی پی کر اتنا دودھ دیتی کہ اس دودھ کو محفوظ کرنے کے لیے انھوں نے ایک روایت کے مطابق فرش کھود کر اس میں پیالہ بنالیا تھا۔ اس پیالے کی تصویریں بعض کتابوں میں ملتی ہیں (۶)۔ یہ پیالہ بڑی فنکاری سے پتھر میں تراشا گیا تھا۔ پیالے کی اندرونی دیوار تقریباً سات فٹ بلند تھی۔ اسی حساب سے گولائی یا چوڑائی تھی۔ گویا دودھ کا ایک چھوٹا کنواں بھر لیا جاتا تھا جو پوری بستی والوں کو کافی ہوتا تھا۔ دودھ دے کر اونٹنی اور اس کا بچہ واپس کھوہ میں چلے جاتے۔ اگلے دن بستی والے اپنی ضروریات کے لیے کنویں سے پانی لے جاتے۔

کچھ عرصے تک معاملات یوں ہی چلتے رہے پھر ان کے بدنہادوں کو یہ بھی کھٹکنے لگا۔ ایک روایت ہے کہ ان کی ایک حسین مال دار خاتون صدوق نے سب سے طاقت ور جتھے دار عرب سردار مصدع سے درخواست کی کہ اگر وہ اونٹنی کو ٹھکانے لگا دے تو وہ خود کو اسے پیش کردے گی۔ صدوق کے جانور زیادہ تھے۔ جسے پانی پلانے کا باری کا نظام پریشان کرتا تھا۔ مصدع آمادہ ہوگیا۔

ادھر ایک اور مال دار خاتون عنیزہ نے ایک دوسرے طاقت ور۔ جتھے دار عرب سردار قیدار بن سالف کو پیش کش کی کہ اگر وہ اونٹنی کو ٹھکانے لگانے لگادے تو وہ اپنی نوجوان خوب صورت لڑکی اسے بخش دی گی۔

یہ بڑی پُرکشش پیش کش تھی۔ قیدار آمادہ ہوگیا لہذا جب مصدع نے اس سے رابطہ کیا تو وہ تیار تھا۔ ان دونوں نے سازش کرکے باقی سات سرداروں کو اپنے ساتھ ملالیا اور ایک دن موقع پاکر مصدع نے ناقہ کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اسے مارڈالا۔ بچہ دیکھ کر بھاگا اور چیختا چلاتا پہاڑ میں غائب ہوگیا۔

خبر دینے والوں نے حضرت صالحؑ کو خبر دی تو وہ لرز گئے۔

"آخر تم لوگوں نے وہی کیا جس کا مجھے ڈر تھا۔" انھوں نے قوم کے بدنہاد سرداروں سے کہا۔

"ہاں ہمیں جو کرنا تھا ہم نے کرلیا۔ اب تم لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو" (۷)۔

"تین دن اپنے گھروں میں اور مزے کرلو۔" صالحؑ نے جواباً کہا۔ "اس کے بعد تمھیں عذاب آئے گا اور یہ الٹی تنبیہ ہے جو جھوٹی ثابت نہ ہوگی" (۸)۔

اس بات سے سردار اور بھڑک گئے اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس سے قبل کہ صالح کا خدا ہمیں پکڑے، ہم اسے اور اس کے گھروالوں کو قتل کردیں۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ سارے اہم عرب سرداروں نے جو تعداد میں نو تھے۔ اور ہر ایک کے پاس اپنے اپنے جتھے تھے صالح اور ان کے اہلِ خانہ پر شب خون مارنے کی تیاری مکمل کرلی۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنی چال چلتے ان کی چالوں پر اللہ کی چال غالب آگئی۔

"اس شہر میں نو جتھے دار تھے۔ جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے۔ انھوں نے آپس میں کہا۔

"خدا کی قسم کھاکر عہد کرو کہ ہم صالح اور اس کے اہلِ خانہ پر شب خون ماریں گے پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت پر موجود نہ تھے۔ ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔

یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انھیں خبر نہ تھی۔

اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا؟

ہم نے تباہ کرکے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو اب ان کے گھر خالی پڑے ہیں اس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے اس میں ایک نشانِ عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں اور بچالیا ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے۔ (النمل: ۴۸ تا ۵۳)

سو وہ عذاب آگیا جس کو انھوں نے اپنی سرکشی، نافرمانی اور ہٹ دھرمی سے خود دعوت دی تھی۔ ایک دل ہلادینے والی کڑک کے ساتھ ایک زبردست زلزلے نے ان کو آلیا وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے، ایسے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ ان کے وہ محلات، عالی شان مکانات، ان کے وہ لاؤلشکر جن کی خبر ہم تک پہنچی ہے، ایسے ملیامیٹ ہوگئے جیسے راندہ ہوا بھوسا۔

"ہونی شدنی!

کیا ہے وہ ہونی شدنی!

اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ ہونی شدنی!!

ثمود اور عاد نے اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کو جھٹلایا تو ثمود ایک سخت حادثہ سے ہلاک کیے گئے۔" (الحاقۃ: ۱ تا ۵)

قرآن نے اس عذاب کو سورہ اعراف (آیت: ۷۸) میں الرجفۃ یعنی زبردست زلزلہ کہا ہے، سورہ ہود (آیت: ۶۷) میں اس کے لیے الصیحۃ یعنی زور کے دھماکے کا لفظ استعمال کیا ہے، سورہ حم السجدہ (آیت: ۱۷) میں کہا گیا ہے کہ ثمود کو صاعقۃ العذاب (عذاب کے کڑکے) نے آلیا۔ دراصل یہ سب ایک ہی واقعہ کی مختلف کیفیات کا نام ہے۔

ثمود پر ایک ہولناک کڑک کے ساتھ ایک زبردست زلزلہ مسلط کیا گیا یہ زلزلہ صرف حجر کی وادی یا مدائنِ صالح ہی میں نہیں آیا بلکہ وادی القریٰ کی ساری بستیوں (جن کی تعداد ۱۷۰۰ بتائی جاتی ہے) میں آیا جہاں ثمود کے مختلف قبائل رہائش پذیر تھے اور ان سب کے پاس حضرت صالح دعوتِ الٰہی لے کر گئے تھے، اور ان سب نے انھیں جھٹلایا تھا۔ مولانا مودودی نے اس بارے میں اندازہ لگایا ہے کہ مشرق کی طرف العلاء سے خیبر جاتے ہوئے تقریباً ۵۰ میل تک اور شمال کی طرف ریاست اردن کے حدود میں ۳۰ تا ۴۰ میل تک وہی مخصوص پہاڑ ملتے ہیں جو مدائنِ صالح کے ہیں اور جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کسی سخت ہولناک زلزلے نے انھیں زمین سے چوٹی تک جھنجھوڑ کر قاش قاش کررکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تین چار سو میل لمبا اور سو میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے اس زلزلہ عظیم نے ہلاکر رکھ دیا تھا (۹)۔

ثمود پر یہ عذاب رات کے پچھلے پہر نازل کیا گیا تھا، سپیدہ سحر نمودار ہونے پر ثمود کی بستی ایک ہلاکت آفرین منظر پیش کررہی تھی۔ فنِ تعمیر کے شاہکار ان کے وہ محلات جو میدانی علاقوں میں بنائے گئے تھے، ریزہ ریزہ ہوئے پڑے تھے۔ ان کے پہاڑوں میں بنائے گئے سنگین مکانات جو اب تک انھیں ہر قسم کی آفاتِ ارضی و سماوی، گرمی، سردی، پالا، بارش اور آندھی طوفان سے بچاتے رہے تھے ان کی کچھ بھی حفاظت نہ کرسکے۔

بلا نمبر ۔ سب دس ۔ حیدرآباد۔

وہ مقتدر شاداب کا کیا تھا اور اطمینان سے خاموش تھے کہ ہر گھر، ہر راہ گزر اور ہر پہاڑ کے دامن میں خاموش چٹانوں کی بیاضیں کھڑی چپ تھیں۔ اور وادی بھی وادی ہی کیسی ہوئی جیسے جنت کی بادہ میں گلی ہوئی سوکھی جھاڑیاں جو چٹانوں کی دلدل سے پامال ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ ان کے شکستہ مسمار تھیں اس حالت سے بھٹکے ہوئے پہاڑوں میں کھودی ہوئی پناہ گاہیں۔ وہ اور وہ کھنڈر جن پر ان کی حیثیت کا دار و مدار تھا جس کی ماتحت ہیں کر رکھ دی گئی تھیں۔ کنویں بے کار ہو گئے تھے ... کھنڈر بن گئے تھے ... بستیاں اجڑ گئی تھیں۔

حضرت صالح اور ان کے پیروکار مسلمانوں کو اللہ نے اپنی رحمت سے محفوظ رکھا ان کی تعداد ایک سو بیس (۱۲۰) بتائی ہے۔ صالح نے مومنوں کو جمع کیا اور ہجرت کا حکم دیا وہ سب یہ مغضوب بستی چھوڑ کر چل دیے۔ صالح نے ایک آخری نظر بستی پر ڈالی اور حسرت سے کہا۔

"اے میری قوم! میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا تھا اور میں نے تمہاری بہت خیر خواہی کی۔ مگر میں کیا کروں تمہیں اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں" (۱۰)۔

ایک سو بیس کے اس قافلے نے شمال کی سمت رخت سفر باندھا کئی دنوں تک وہ اپنی مغضوب وادیوں کے درمیان سفر کرتے رہے جہاں کبھی زندگی کی گہما گہمی عروج پر تھی اب وحشت سی وحشت اور ویرانی سی ویرانی تھی۔ گھنٹے کٹے پہاڑوں اور جانے والی زمین کے درمیان وہ اپنا راستہ بناتے فلسطین کے قریب رملہ پہنچ گئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ صالح ہجرت کر کے وادیٔ سینا چلے گئے تھے جہاں پر کوہ طور کے قریب ہی ایک پہاڑی کا نام "نبی صالح" ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہی صالح کی جائے قیام تھی۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ مکہ چلے گئے اور یہیں ۵۸ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

حجر کی بستی کے گرد ہم نے ایک الوداعی چکر لگایا۔ ویران، بے آباد اور سنسان وادی۔ ادھر ادھر چند سیاحوں کی موٹر گاڑیاں اور بس، ساڑھے تین ہزار سال قبل جھنجوڑ کر تباہ کردی جانے والی اس مغضوب بستی کو چھوڑ کر ہم حلقہ دیکھا سے نکلے۔ میرے کانوں میں قرآن کی آیات گونج رہی تھیں۔

دیکھو! ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا!

سنو! دور پھینک دیے گئے ثمود!!

ooo

(زیر ترتیب سفرنامہ "وحشتِ قرآن" کا ایک باب)

حوالے:

(۱) ہود: ۶۱۔ (۲) ہود: ۶۲۔ (۳) شعراء: ۱۴۷۔ (۴) الاعراف: ۷۵۔ (۵) الشعراء: ۱۵۴-۱۵۵۔
(۶) سیرت النبی اعظم ص: ۴۲۰، مرتبہ شاہ مصباح الدین شکیل، پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ، کراچی۔ (۷) الاعراف: ۷۷۔
(۸) ہود: ۶۷۔ (۹) مودودی، سید ابوالاعلیٰ "تفہیم القرآن" جلد ۲، ص: ۵۴۳۔ (۱۰) الاعراف: ۷۹۔

ڈاکٹر سجاد شمیم

پروفیسر ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

ڈاکٹر پروفیسر کبیر احمد جائسی، جو علمی دنیا میں ادبیاتِ فارسی کے اسکالر کے طور پر سب سے زیادہ معروف ہیں۔ ۲۱ / نومبر ۱۹۳۹ء کو جائس (رائے بریلی، یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم شبلی ہائی اسکول (اعظم گڑھ) سے حاصل کی۔ انٹر، شبلی کالج (اعظم گڑھ) سے کیا۔ اس دوران ان کی سب سے پہلی طبع زاد کتاب "نقوشِ قالی" ۱۹۵۸ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی اس وقت وہ بائیس سالہ نوجوان تھے۔ اس کتاب کی بہت پذیرائی ہوئی۔ ان کی اس کتاب پر اس زمانے میں جتنے مضامین و مقالے شائع ہوئے اتنے مقالے ان کی کسی اور کتاب پر شائع نہیں ہوئے۔

۹ نومبر ۱۹۵۹ء میں ان کی شادی ہو گئی۔ جائسی صاحب نے خانگی معاملات طے کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم و تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا اس سال انھوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں ماہنامہ "ادیب" (جو کہ شبلی کالج کا میگزین تھا) کا خاص نمبر نکالا۔ یہ ندوی صاحب پر لکھے جانے والے پانچ مقالوں کا مجموعہ ہے۔ مضامین نگاروں میں شاہ معین الدین احمد ندوی (صاحب معارف) سید صباح الدین عبدالرحمن، مولانا سعید انصاری، علی حماد اور خود کبیر احمد جائسی شامل ہیں۔ ڈاکٹر جائسی ماہنامہ "ادیب" کے ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۲ء مدیر رہے تھے۔

گریجویشن کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۶۱ء میں داخلہ لیا۔ بی۔ اے میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور یونیورسٹی کی طرف سے انھیں سونے کا تمغہ (گولڈ میڈل) دیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں فارسی میں ایم۔ اے مکمل کیا اور اپنی پی ایچ۔ ڈی کی تیاریوں میں لگ گئے۔ ادھر ۸ / مئی ۱۹۶۶ء کو ان کی بیوی حسنہ، کافی بیمار رہنے کے بعد انتقال کر گئیں اور تین بچوں کی ذمہ داریاں جائسی صاحب کے کاندھوں پر آ گئیں۔ یہ شدید آزمائشیں بھی جائسی صاحب کے علمی سفر میں رکاوٹ نہ بن سکیں اور ۱۹۶۷ء میں انھوں نے اپنی پی ایچ۔ ڈی، پروفیسر نذیر احمد صاحب جیسے صاحبِ فکر محقق کی رہنمائی میں مکمل کی۔

پروفیسر نذیر احمد سابق صدر شعبہ فارسی اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ہندوستان کے ان طلبا میں سے ہیں جن کی علمیت اور قابلیت کا اعتراف ایرانی دانش وروں نے بھی کیا۔

• جائسی صاحب کے اس دور کے بارے میں لکھتے ہوئے اکمل اجملی (سابق نائب مدیر، ہمدرد ویلفیئر، دہلی) لکھتے ہیں:

"بیوی کی رحلت کے ساتھ شوقِ تحقیق کا جاری رکھنا یہی بہرحال کرنے والا کرنے کا کام ہے لیکن حقیقی مادری کی خدمت کرتے ہوئے، ہر ان کے بچے معصوم بچوں کی پرورش کرتے ہوئے، صبح سے شام تک گھر کے ہر طرح کے فرائض اور تعلیمی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے بھی خود کو تحقیق و تصنیف کے میدان میں زندہ ہی نہیں بلکہ شان کے ساتھ زندہ رکھنا وہ کارنامہ ہے جسے ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کے لیے دل سے داد نکلتی ہے کہ وقت اور حالات نے بھی ان کی ہمت نہ توڑ سکے۔ وہ اسی طرح کام اور علمی ثقافت کا سلسلہ ایک حوصلے کے ساتھ

جاری رکھ سکیں ۔"(۱)

ابتدا جانسی صاحب کچھ عارضی نوعیت کی ملازمتیں کرتے رہے مثلاً شعبہ فارسی (علی گڑھ یونیورسٹی) میں چند ماہ عارضی لکچرر رہے ۔ یہ عارضی ملازمت ختم ہوئی تو مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ اور انجمن ترقی اردو میں تصحیح کتابت کا کام بہت ہی قلیل معاوضہ پر کیا ۔ معاش کے میدان میں ان کی یہ آزمائشیں ۲۰ ستمبر ۱۹۶۳ء کو ختم ہوئیں جب انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں فارسی کا استاد مقرر کیا گیا اور وہ علی گڑھ چھوڑ کر دلی چلے گئے جہاں وہ کچھ سال تک یعنی ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء تک اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہے ۔ جامعہ ملیہ کے قیام کے دور میں ان کے والد اور والدہ کا بھی انتقال ہوگیا اور وہ اپنے بچوں کے ساتھ اکیلے رہ گئے ۔

پروفیسر آل احمد سرور جب اقبال انسٹی ٹیوٹ (سری نگر) کے ڈائرکٹر ہوئے تو انھوں نے جانسی صاحب کو بہ حیثیت ریڈر کے اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی میں کام کرنے کا موقع دیا جہاں انھوں نے پروفیسر آل احمد سرور کی راہ نمائی میں گراں قدر علمی و تحقیقی کام کیا ۔ یہاں وہ بڑی تن دہی سے تصنیف و ترجمہ کے کام میں مصروف رہے ۔ جس کا اعتراف پاکستان میں "نقوش ایوارڈ" اور ہندستان میں "سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ" دے کر کیا گیا ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ملازمت سے قبل ۱۹۶۹ء میں ان کی غزلوں کا مجموعہ "صحرا صحرا" صبا جانسی کے نام سے شائع ہوا جو سائٹھ اردو غزلوں، چار فارسی غزلوں اور کچھ متفرق اشعار پر مشتمل تھا ۔ اس کے بارے میں مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں ۔

"صبا جانسی کے کلام میں ایک روحانی حزن ملتا ہے جو فانی سے مختلف ہے ۔ اگر چہ وہ فانی کے حد درجہ قائل رہے ہیں اور شائد اب بھی ہیں ۔ مجھے ان کے روحانی حزن میں ان چھوٹے چھوٹے لیکن انتہائی سچے غزل گویوں کا تاثر ملتا ہے ۔ جن کا ذاتی لہجہ اردو غزل پر ہمیشہ کے لیے اپنا اثر چھوڑ گیا ہے ۔ میری مراد قائم ۔ سوز ۔ احسن اللہ بیان اور مصحفی وغیرہ سے ہے ۔" (۲)

اس مجموعہ غزل پر جانسی صاحب کو اتر پردیش اردو اکیڈمی نے ۱۹۷۲ء میں انعام سے نوازا ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ملازمت کے دوران ان کی چار کتابیں منظرِ عام پر آئیں ۔ جن میں سے ایک ان کے مقالوں کا مجموعہ "بازگشت" اور تین تراجم تھے ۔ "بازگشت" ۱۹۷۵ء میں "نقوشِ فانی" کے سترہ اٹھارہ سالوں کے بعد منظرِ عام پر آئی ۔ یہ کتاب فارسی ادب سے متعلق جانسی صاحب کے مقالات کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے تین ایسے ایرانی اساطینِ ادب پر تفصیلی نظر ڈالی ہے ۔ جس کے بارے میں اردو داں طبقے کو کوئی علم نہیں تھا یعنی مجید ۔ ییلاقانی ، احمد کسروی اور استاد عبدالعظیم قریب ۔ اسی کتاب میں جانسی صاحب کا وہ مقالہ بھی شامل ہے جس کا عنوان "اقبال اور حافظ" ہے ۔ اس مقالے کا اس زمانے کی علمی دنیا میں خاصے دنوں تک چرچا رہا ۔ اس تصنیف پر بھی انھیں ۱۹۷۵ء میں اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا ۔

اس طبع زاد تصنیف کے علاوہ ان کے تین تراجم بھی منظرِ عام پر آئے ۱۹۷۶ء میں "تاریخی اور علمی مقالے" شائع ہوئی ۔ اس کتاب میں جانسی صاحب نے اپنے استاد پروفیسر نذیر احمد کے تین رسائل (مونو گرافس) کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ۔ جانسی صاحب کا دوسرا ترجمہ "تاریخ ادبیاتِ تاجیکستان" کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ۔ اردو کی یہ وہ پہلی کتاب ہے جس نے اردو داں طبقے کو اس بات کا احساس دلایا کہ فارسی ادب صرف ایران ہی کی میراث نہیں ہے بلکہ اس کی پیش رفت میں اس علاقے کے ادبا اور شعرا کا بھی قابلِ ذکر حصہ ہے جس کو قدیم زمانے میں ماوراء نہر کہا جاتا تھا ۔ اس ضخیم کتاب کو جانسی صاحب نے انگریزی سے

اردو میں ترجمہ کیا۔ تاجکی ادبیات کے مطالعے کی یہی وہ پہلی اینٹ تھی جس پر آگے چل کر انھوں نے ایک مضبوط عمارت تعمیر کی۔ اس ترجمے پر انھوں نے تیسری بار اترپردیش اکیڈمی ایوارڈ (۱۹۸۰ء) بھی حاصل کیا۔ ان کا تیسرا ترجمہ "آذری" ۱۹۸۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اگرچہ اس فارسی کتاب کا ترجمہ جانسی صاحب نے ۱۹۷۸ء میں اس وقت مکمل کرلیا تھا جب وہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں شعبہ فارسی کے ریسرچ اسکالر تھے لیکن اس کی اشاعت دس سال بعد عمل میں آسکی۔ "آذری" آذر بائیجان کی زندہ زبان ہے جس کے بارے میں اردو دنیا قطعی لاعلم تھی۔ ترجمے کے ساتھ جانسی صاحب نے اس پر ایک مفید مقدمہ لکھ کر اہم علمی خدمت انجام دی۔

کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ سے وابستگی کے تین سالہ دور میں مزید اہم تراجم سامنے آئے۔ ایک "علامہ اقبال" مصلحِ قرنِ آخر" اور دوسرا "محمد اقبال" کے نام سے منظر عام پر آئے۔ اس کے علاوہ ذبیح اللہ صفا "حیات و کارنامے" ان کی طبع زاد تصنیف بھی اسی دور میں شائع ہوئی۔

اول الذکر مقالہ مشہور ایرانی مفکر علی شریعتی کی ان دو تقریروں میں سے ایک کا ترجمہ ہے جو انھوں نے تہران کے مشہور دینی مدرسے حسینیہ ارشاد میں کیں۔ جانسی صاحب نے صرف اس تقریر کا ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ اس پر ایک طویل اور پُر مغز مقدمہ لکھ کر اردو داں طبقے کو علی شریعتی کی حیات و افکار سے روشناس کرایا جانسی صاحب کی اس دو طرفہ خدمت کا علمی حلقوں میں کھلے دل سے اعتراف کیا گیا جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر علی شریعتی کی اس تقریر کا اردو میں ترجمہ کر کے ڈاکٹر جانسی نے اقبالیات کے سلسلے میں ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ اقبال پر انگریزی یا یورپ کی دوسری زبانوں میں جو کام ہورہا ہے وہ اپنی اصل صورت میں یا اردو ترجموں کی صورت میں ہم تک بہت جلد پہنچ جاتا ہے۔ لیکن ایران یا دوسرے مشرقی ممالک میں جو کام ہورہا ہے اس سے ہم اکثر ناآشنا رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب فارسی زبان سے بیگانگی یا بے التفاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ تاجکستان، افغانستان اور ایران میں اقبال پر جو کام ہورہا ہے وہ اپنی بے پایاں اہمیت کے باوجود ہم اردو والوں تک نہیں پہنچ رہا ہے۔" (۲)

ثانی الذکر کتاب "محمد اقبال" دراصل تاجکستان کے مشہور شاعر اور ادیب میر سید میر شکر کا ایک دیباچہ ہے جو انھوں نے اقبال کے فارسی مجموعہ کلام "پیامِ مشرق" کے لیے لکھا۔ یہ فارسی مجموعہ کلام ۱۹۷۹ء میں دوشنبہ (تاجکستان) سے شائع ہوا۔ جسے ڈاکٹر جانسی نے اردو کا قالب دیا۔ اہم بات یہ ہے کہ کتاب میں ڈاکٹر جانسی نے ایک طویل مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں میر سید میر شکر کی سوانح حیات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ان افکار و خیالات پر بھی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے جن کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب "محمد اقبال" میں کیا ہے۔ بعض اہم تذکرہ نگاروں نے اس ترجمے کے بارے میں یہ تسلیم کیا ہے کہ اگر ڈاکٹر جانسی اس دیباچے کو اردو زبان میں پیش نہ کرتے تو لوگ نہ تو میر سید میر شکر کے نام سے واقف ہوتے اور نہ ہی اس بات کا سراغ لگایا جاسکتا تھا کہ تاجکستان کے لوگ اقبال کی شاعری کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ جگن ناتھ آزاد، اس کتاب پر ایک طویل تبصرہ کرنے اور کتاب کے حسن و معائب بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"آخر میں ایک بار پھر اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ کبیر احمد صاحب جانسی نے اصل کتاب کا ترجمہ کرنے میں جو محنت کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ بالخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ اصل کتاب روسی رسم الخط میں تھی

"ہے۔ جانسی صاحب نے اس بحث طلب کو کن کن مشکلوں سے طے کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ آسان نہیں۔ کیوں کہ پہلے یہ ساری کتاب فارسی رسم الخط میں منتقل ہوئی اور پھر اردو میں۔" (۴)

جنوری ۱۹۸۸ء کو انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ میں علوم فارسی کے ریڈر کے عہدہ پر اپنی خدمات کا آغاز کیا اور اپنی سبک دوشی (۳۰/ نومبر ۱۹۹۹ء) تک اسی شعبہ سے منسلک رہے۔ پانچ سال بہ حیثیت ریڈر، اس کے بعد پروفیسر ہوئے، فارسی اور انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہوگئے۔ یوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بہ حیثیت استاد لے ان کا تعلق تیرہ سال کا بنتا ہے۔ علمی تحقیقی اور تصنیفی اعتبار سے یہ دور بھی بڑا کارآمد تھا جس میں ان کی پانچ مزید کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر جانسی کی کتاب "انعکاس" شائع ہوئی، یہ کتاب بھی "بازگشت" ہی کی طرح ان کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو وہ مختلف اوقات میں لکھتے رہے ہیں اور جن میں سے بیشتر کا موضوع فارسی ادبیات ہے۔ اس کتاب میں آٹھ مقالات شامل ہیں۔ پہلا مجید طالقانی پر ہے جو خاقانی جیسے استاد سخن کا شاگرد ہے۔

دوسرا مضمون "علی شریعتی اور اقبال" ہے، تیسرا مضمون "حافظ کی شاعری پر ایک نئی نظر" ہے۔ بعض ناقدوں نے اس مضمون کو کتاب کا اہم اور قیمتی مضمون قرار دیا ہے۔ چوتھا مقالہ سعید نفیسی کے اجتہادات پر ہے۔ بہ قول مجیب اللہ ندوی: یہ اس مجموعہ کا سب سے زیادہ فکر انگیز مضمون ہے (۵)۔ پانچواں مضمون پروفیسر ہادی حسن مرحوم کی علمی خدمات پر ہے۔ چھٹا مضمون اقبال کی رومیت پر اور ساتواں مضمون محمد شاہی عہد کی ایک غیر مطبوعہ نادر فارسی مثنوی پر ہے۔ شہاب الدین صاحب اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"اس مجموعہ مقالات میں شامل دو مقالات کا ذکر میں خاص طور سے کروں گا جس میں ایک مقالہ پروفیسر ہادی حسن مرحوم کی علمی خدمات پر ہے اور دوسرا محمد شاہ کے بھائی شاہ زادہ اختر کی ایک مثنوی پر جو اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ ہادی حسن مرحوم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نامور گرامی اساتذہ میں تھے۔ ان کی ساری تصانیف انگریزی میں ہیں جس کی وجہ سے اردو دنیا پروفیسر ہادی حسن کے علمی مرتبے سے بے خبر تھی۔ پروفیسر جانسی اردو کے وہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے ہادی حسن صاحب کی تصانیف کا دیدہ ریزی سے مطالعہ کیا اور اردو دنیا کے سامنے اپنا حاصلِ مطالعہ پیش کیا۔۔۔ شاہ زادہ اختر کو شاعری کی حیثیت سے روشناس کرانے کا سہرا بھی پروفیسر جانسی کے سر بندھتا ہے۔ شاہ زادہ اختر کے حالاتِ زندگی عام طور سے تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ جانسی صاحب نے اس کے بارے میں جو مواد حاصل کیا ہے اس کو بڑے سلیقے سے اس مقالے میں پیش کردیا ہے۔" (۶)

یہاں بھی ڈاکٹر جانسی کی یہ شعوری کوشش کارفرما نظر آتی ہے کہ وہ ایسے ہندستانی اور فارسی شعرا، ادبا اور شخصیات کی کاوشوں کا اردو میں تعارف کرائیں جن سے عام طور پر اردو داں طبقہ ناواقف ہے۔ یہ صرف علم و فن اور شعر و ادب کی ہی نہیں زبانِ اردو کی بھی گراں قدر خدمت ہے کہ دامنِ اردو اس سے کشادہ سے کشادہ تر ہوتا ہے۔

۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر جانسی کی ایک اور اہم کتاب "سوویت کے بانی، تاجیکی ادبیات" شائع ہوئی۔ اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو فارسی ادب کے ایک ایسے گوشے سے بحث کرتی ہے جس کے بارے میں اردو زبان میں نہ کوئی قابلِ ذکر مواد ملتا ہے اور نہ ہی زیادہ اس گوشے کو فارسی زبان و ادب کے دائرہ میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ یہ کتاب (۷) تیج

ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں تاجکستان کے جغرافیہ اور تاجیک قوم کی اصل سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا دوسرا باب تاجیکی ادبیات کے معمارِ اول صدرالدین عینی کی حیات، ان کے عہد اور ان کی شاعرانہ کاوشوں سے متعلق ہے۔ تیسرے باب میں صدرالدین عینی کے شریکِ کار ابوالقاسم لاہوتی کی حیات و شاعری اور ان کے عہد سے بحث کی گئی ہے جنھوں نے عینی کے ساتھ سوویت۔ تاجیکی ادب کے سمت سفر کو متعین کرنے میں اپنی زندگی صرف کردی۔

اسی کتاب پر ڈاکٹر جافری کو سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ کا حق دار قرار دیا گیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر جافری کو ان کے رسالے (مونوگراف) ابوالقاسم لاہوتی ۱۹۸۸ء کا نقوش ایوارڈ (آفاقی) برائے تحقیق کا مستحق قرار دیا جاچکا تھا اس طرح سے ڈاکٹر جافری نے خود کو اردو داں طبقے میں ایک معتبر محقق کے طور پر منوایا اور پاکستان میں بھی ان کے معترفین کا ایک حلقہ پیدا ہوگیا ہے۔

۱۹۹۰ء میں "جدید تاجیکی شعرا" کے نام سے ان کی ایک اور کتاب منظرِ عام پر آئی یہ کتاب ان چھے سوویت۔ تاجیکی شعرا کے مطالعے پر مشتمل ہے جو انقلابِ بخارا (۱۹۲۰ء) سے قبل پیدا ہوئے تھے مگر ان کی اٹھان انقلابِ بخارا کے بعد کے تاجیکستان میں ہوئی۔

فارسی زبان و ادب کا تذکرہ ہو تو ذہن فوراً ایران کی طرف جاتا ہے اصل حقیقت کی طرف ڈاکٹر جافری اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ماوراء النہر کا علاقہ فارسی زبان و ادب کا مہدِ اولین ہے یہاں معرضِ وجود میں آنے والے ادب سے صرفِ نظر کر کے ایرانی فارسی ادب کا تو مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مجموعی فارسی ادب کا نہیں۔" (۸)

دو سال بعد ڈاکٹر جافری کی اگلی کتاب "چند ایران شناس" ۱۹۹۲ء میں منظرِ عام پر آئی۔ کتاب ایسے چار مقالوں پر مشتمل ہے جن میں چند غیر ایرانیوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے ایران اور ایرانی قوم کو اس کے ادب کے ذریعے جاننے، پہچاننے اور اپنے ہم وطنوں کو اس سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ ان دانش وروں میں ایک احمد آتش ہیں جن کا تعلق ترکی سے ہے، دوسرے الیساندرو بوزانی ہیں، جن کا تعلق اٹلی سے ہے، تیسرے میکائل زند، جن کا تعلق اسرائیل سے ہے اور چوتھے پروفیسر یرشی بیچکا ہیں جن کا تعلق چیکوسلواکیہ سے ہے۔

ایک طرف تو کبیر صاحب کی تدریسی اور انتظامی ذمہ داریاں ہیں، دوسری طرف تحقیقی و تصنیفی ذمہ داریاں، اس کے علاوہ وہ صحافتی میدان میں بھی سرگرم رہے اور انھوں نے ایک اداریہ نگار کے طور پر بھی خود کو منوایا۔ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۹ء ماہنامہ ادیب (اعظم گڑھ) کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے، اسی دوران انھوں نے عبدالسلام ندوی نمبر بھی نکالا تھا جس کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۱ء "تہذیب الاخلاق" (علی گڑھ) کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے اور پھر ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۷ء اس رسالے کے ایڈیٹر رہے۔

جہاں تک اداریہ نگاری کا تعلق ہے پہلے ان کا تعلق "کانفرنس گزٹ" کی ادارت سے رہا۔ انھوں نے "تہذیب الاخلاق" کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ یہ دونوں جرائد اپنے مقاصد کے اعتبار سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ ان دونوں جرائد کی اشاعت کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو ایک طرف جدید علوم سے روشناس کرانا ہے اور دوسری طرف اپنے اعلیٰ فکری، علمی، اخلاقی اور تہذیبی ورثے سے واقف کرانا ہے۔ ان دونوں جرائد کا تعلق علی گڑھ سے ہے۔ ڈاکٹر جافری نے ان جرائد کے لیے تقریباً [illegible] سے زائد اداریے سپردِ قلم کیے۔

اس کے [illegible] علی گڑھ کے کالج میگزین (Editorial Board) کے رکن رہے [illegible]

جمال" (دہلی)۔ جنرل تعلیمی جرائد کے ایڈیٹر رہے تھے۔ مجلہ "علوم اسلامیہ" اور بولیٹن آف دی انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔"
ڈاکٹر جانسی کے دو سو سے زائد علمی مقالے ہندستان اور غیر ممالک کے اہم جرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔ انھوں نے پچیس سے زائد قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی جو کہ دہلی، سری نگر، اعظم گڑھ اور علی گڑھ وغیرہ میں منعقد ہوئے۔ مئی ۱۹۷۷ء میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے تہران بھی گئے اور ایک سے زائد بار پاکستان بھی آئے۔

ڈاکٹر جانسی کی ان ادبی و علمی خدمات کا ہر سطح پر خیر مقدم کیا گیا۔ ان کو ملنے والے بعض ایوارڈ اور انعامات کی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان کی جاچکی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۹۲ء میں آل انڈیا میر اکیڈیمی، لکھنو نے انھیں "میر ایوارڈ" سے نوازا اور اس کے اگلے سال ۱۹۹۳ء میں ہندستان کے صدر کی طرف سے انھیں توصیفی سند (Certificate of Merit) دی گئی۔

۳۰ نومبر ۱۹۹۶ء کو اپنی ملازمتی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونے کے باوجود ان کا یہ تصنیفی و تحقیقی سفر جاری ہے، گو کہ واجبی عمر کے طبی مسائل بھی ساتھ ہی ساتھ جاری ہیں۔ نومبر ۱۹۹۳ء میں وہ ایک قلبی دورہ برداشت کرچکے ہیں۔ شکر (ذیابطیس) کے مرض کو بھی بھگت رہے ہیں اور موتیابند کو بھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحقیقی کام ان کی مجبوری ہے جو وہ کیے جارہے ہیں۔ آج کل وہ ایرانی تفسیروں پر کام کررہے ہیں۔ یہ خاصا اہم مگر بہت بڑا پروجیکٹ ہے۔ غالباً یہ کام تین جلدوں پر محیط ہوگا۔ جس کی پہلی جلد منظرِ عام پر آچکی ہے۔ یہ انتہائی محنت طلب اور صبر آزما کام ہے اور علمی حلقوں میں اس کام کی تکمیل کا بے چینی سے انتظار کیا جارہا ہے۔

المختصر ڈاکٹر جانسی کا وہ علمی سفر جو دارالمصنفین سے شروع ہوا، علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)، اقبال انسٹی ٹیوٹ (سری نگر) اور پھر علی گڑھ واپسی تک جاری رہا اور جس کے دوران وہ ان تھک کام کرتے رہے، فارسی ادبیات کے مختلف گوشوں سے وہ پردہ اٹھاتے رہے، اردو کے علمی سرمائے میں اضافہ کرتے رہے، جس کے نتیجے میں اردو کے سرمایہ علمی میں اٹھارہ کتابوں کا اضافہ یقیناً قابلِ قدر اور قابلِ ذکر کام ہے۔ اپنی شخصی اور ذاتی زندگی کے بحرانی اور صبر آزما حالات کے باوجود انھوں نے بلاشبہ وہ ادبی و علمی خدمت انجام دی ہے جس نے انھیں علم و ادب اور تحقیق و تصنیف کے میدان میں صفِ اول کے ممتاز افراد کی صف میں لاکھڑا کیا ہے۔ ابھی ان سے اہلِ نظر کو بہت سی توقعات وابستہ ہیں کہ ابھی وہ مزید تازہ بستیاں آباد کریں گے کہ ان کی تلاش و تحقیق کا سفر ہنوز جاری و ساری ہے۔

ooo

حوالے:

(۱) "کبیر احمد جائسی کی علمی و ادبی خدمات" مرتبہ شہاب الدین۔ ص: ۱۵۹۔ علی گڑھ، ۱۹۹۲ء۔

(۲) "شب خون" (الہ آباد)، جنوری ۱۹۷۰ء۔ ص: ۶۹، ۷۰۔

(۳) "اقبال ریویو" لاہور۔ جنوری ۱۹۸۳ء۔ ص: ۲۲۵۔

(۴) "معاصر" پٹنہ۔ جنوری تا جون ۱۹۸۶ء۔ ص: ۹ / جولائی تا اکتوبر ۱۹۸۶ء۔ ص: ۱۰

(۵) کبیر احمد جائسی کی علمی و ادبی خدمات، ص: ۳۷   (۶) کبیر احمد جائسی کی علمی و ادبی خدمات، ص: ۲۳، ۲۵۔

(۷) جائسی، کبیر احمد۔ صدریق۔ تاجیکی ادبیات کے بانی، علی گڑھ ۱۹۸۹ء۔

(۸) جائسی، کبیر احمد، جدید تاجیکی شعرا، (مقدمہ) ص: ۱۵، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۸۰ء۔

ooo

نگار سجاد ظہیر

حادثہ اور کس کو کہتے ہیں

ناظم آباد پہلی چورنگی سے جو سڑک لیاقت آباد کی طرف جاتی تھی اس سڑک کے بائیں جانب بنی ہوئی پلیا کے تھڑے پر بہت سے مزدوروں کے درمیان وہ بھی بیٹھا کرتا تھا۔ اس کا نام لیاقت تھا۔ پتلا دبلا لمبا سا۔ پینتیس، چالیس کے پیٹے میں تھا۔ سانولا رنگ، نحیف جسم، بہت کم گو اور بہت خاموش طبع۔ اتنی کم گوئی کی وجہ سے اس کے ساتھی مزدور اس کے بارے میں سب سے کم معلومات رکھتے تھے۔ وہ چورنگی کے اس تھڑے پر صبح سویرے، شاید سب سے پہلے آجایا کرتا تھا اور عموماً احسان کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ احسان رنگ کا کام کرتا تھا، کسی کو اپنے گھر میں رنگ روغن کرانا ہوتا تو احسان کو دہاڑی مل جاتی۔ کام کم ہوتا تو وہ اکیلے ہی دہاڑی لگا آتا، کام زیادہ ہوتا تو لیاقت کو ساتھ لے جاتا تھا۔ ایسے میں اسے دہاڑی کے جو سو روپے ملتے اس میں سے پینتیس روپے وہ لیاقت کو اس کی مزدوری کے دے دیا کرتا تھا، رنگ روغن کا سارا سامان احسان کے پاس ہوتا تھا۔ لمبی سی سیڑھی، رنگوں کے ڈبے، ریگ مال، تیل اور برش وغیرہ۔ جب کہ لیاقت کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ صرف ایک مزدور تھا، چوں کہ اس کے ہاتھ میں کوئی ہنر نہ تھا اور نہ ہی کاری گری لہذا اس کی قیمت بھی کم تھی اگر کوئی سارا دن بھی اس سے مزدوری لیتا تب بھی پچاس روپے سے زیادہ اسے نہ ملتے۔

یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ صبح سویرے چورنگی پر آجاتا اور تھڑے پر بیٹھ جاتا پھر ایک ایک کر کے مزدور آتے رہتے اور اس کے اردگرد کی جگہ بھرتی جاتی، احسان آتا تو اس کے برابر میں جگہ بنا کر بیٹھ جاتا۔ دوسروں کے مقابلے میں اسے لیاقت اس لیے زیادہ پسند تھا کہ لیاقت میں چالاکی اور عیاری نام کو نہ تھی۔

دن بھر لوگ مزدوروں کی تلاش میں آتے رہتے اور اپنی مرضی کا مزدور اپنے ساتھ لے جاتے۔ کبھی ایک گاڑی آکر رکتی اور کسی مستری سے دہاڑی طے کر کے اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے جاتی۔ کسی کو گھر کی صفائی یا باربرداری کے لیے مزدور کی ضرورت ہوتی تو مزدوروں میں سے کسی ایک سے دہاڑی طے کرنی پڑتی۔ عید بقرعید اور جن مہینوں میں شادیاں زیادہ ہوتیں مزدوروں اور رنگ روغن والوں کی مانگ بڑھ جاتی۔

لیاقت قریب ہی کی کسی کچی بستی سے پیدل آیا کرتا تھا۔ اس کے گھر سے ناظم آباد چورنگی کا راستہ نصف گھنٹے پیدل کا تھا۔ اس کا گھر بھی کیا تھا، نالے کے کنارے پر بنی ہوئی جھگی تھی جہاں وہ اپنے بیوی، بچوں کے اور بیمار بوڑھے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹا سب سے بڑا تھا اور لیاقت اسے قریب کے ایک اسکول میں پڑھا رہا تھا۔ یہ ایک خیراتی اسکول تھا جہاں پانچویں جماعت تک بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی اس کا بیٹا احمد پانچویں جماعت میں پڑھ رہا تھا اور لیاقت اب خاصا فکر مند رہا کرتا تھا کہ اس کے بعد جب احمد کو کسی دوسرے اسکول میں ڈالنے کا تو فیس اور کاپیوں کتابوں کے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ وہ ہر قیمت پر احمد کو پڑھانا چاہتا تھا تاکہ اس کا بیٹا اس کی طرح ایک معمولی مزدور بننے کے بجائے کسی دفتر

نوکری حاصل کر سکے جہاں سے ہر ماہ باقاعدگی سے تنخواہ مل سکے۔ مزدور لیاقت کا کیا تھا؟ کسی دن مزدوری مل گئی تو ٹھیک ورنہ بعض اوقات تو نوبت فاقوں تک آجاتی۔ ملازمت میں کم از کم ہر مہینے کچھ تو بندھی آمدنی تو ملتی ہے۔

لیاقت اپنے ماں باپ کا سب سے چھوٹا اور اکیلا بیٹا تھا۔ اس سے بڑی تین بہنیں تھیں۔ تینوں کی جیسے تیسے شادیاں ہو چکی تھیں اور سب اپنے گھروں کی تھیں۔

لیاقت کے ماں باپ غربت و افلاس کی چکی میں پس پس کر وقت سے پہلے بوڑھے ہو چکے تھے۔ اچھی غذا اور اچھے ماحول کی عدم دستیابی نے انہیں طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کا علاج بھی صحیح طرح نہیں ہوتا تھا۔ ہر کام کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی اور یہی ایک ایسی چیز تھی جو لیاقت کے پاس نہیں تھی۔ وہ تھا بھی بڑا غیرت مند لہذا کبھی کسی سے مانگ کر نہیں کھاتا۔ ماں باپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو انہیں ایدھی کے خیراتی ہسپتال لے جایا کرتا تھا جہاں مفت علاج ہوتا تھا اور دوا بھی مفت مل جاتی تھی لیکن یہ ہسپتال سبزی منڈی میں تھا جہاں تک بسوں میں آنا جانا دونوں بوڑھوں کے لیے عذاب سے کم نہیں تھا۔ زندگی اسی طرح گزر رہی تھی۔ غربت و افلاس کی زندگی بجائے خود بہت بڑا عذاب ہوتی ہے۔ لیاقت یہ جانتا تھا لیکن کسی سے اس کی شکایت نہیں کرتا تھا۔ احسان سے بھی نہیں جو اس کے ساتھ ہی بیٹھا کرتا تھا۔

ان دنوں شہر کے حالات بہت خراب تھے۔ کل رات ناظم آباد اور لیاقت آباد میں میں خوب فائرنگ ہوئی تھی، لہذا آج ناظم آباد چورنگی پر بیٹھنے والے مزدوروں کی تعداد نصف تھی۔ لیکن لیاقت حسب معمول صبح ہی صبح آ گیا تھا کل اسے دہاڑی نہیں ملی تھی لہذا خراب حالات کے باوجود وہ آ گیا تھا تھوڑی دیر بعد احسان بھی آ گیا مگر وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔

"حالات صحیح نہیں ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم واپس چلے جائیں گے" احسان اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا "تمہاری طرف حالات کیسے ہیں؟"

"فائرنگ ہوتی رہی ہے ساری رات" لیاقت بولا۔ "ماں آج آنے سے منع کر رہی تھی" "ہاں مجھے بھی سب روک رہے تھے" احسان گردن گھما کر اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "مگر کیا کریں یار دہاڑی نہ لگائیں تو شام کو چولہا کیسے جلے؟"

لیاقت ایک جھرجھری لے کر خاموش ہو گیا۔ خدا جانے اسے کیا یاد آ گیا تھا۔ چند مزدور اور آ گئے تھے سب ہی اپنے اپنے علاقے کے حالات کی خبر دے رہے تھے کسی کے علاقے سے دو لاشیں۔ کسی کے نزدیکی علاقے کی تنظیم نے ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ کسی کے علاقے میں پولیس موبائل پر حملہ ہوا تھا اور دو پولیس والے مارے گئے تھے تو کہیں چھاپہ پڑا تھا اور کچھ لڑکے اسلحہ سمیت گرفتار ہو گئے تھے۔

ہر مزدور کے پاس ایک کہانی تھی۔

اور ان کہانیوں کا تبادلہ ہو رہا۔

لیاقت سب کچھ سنتا رہا اور حسب عادت خاموش رہا۔

"بھائی لیاقت تیرے علاقے میں کیسا ہے امن تھا۔" کسی نے اس سے پوچھا۔

"نہیں امن تو نہیں تھا۔" لیاقت آہستہ سے بولا "ساری رات فائرنگ ہوتی رہی ہے۔" "ہم تو بارہ بجے تک بیٹھ کر چلے جائیں گے۔" احسان نے ماحول کی ویرانی کو دیکھتے ہوئے حتمی طور پر پھر اعلان کیا۔

شاید یہ گاڑی رکے گی۔ کوئی صاحب نیچے اتریں گے۔ اسے ایک دو ٹکٹ بک ہو جائیں، جوجود چاہیے ہوگا۔ احسان نے ان کی دلالی لے رکھی ہوگی۔ چوں کہ کام زیادہ ہوگا لہٰذا وہ حسب معمول اس سے کہے گا۔ "چل بھئی لیاقت، آؤ۔۔۔"

لیکن دوپہر ہو گئی۔ ایسا نہیں ہوا۔

جوجود ایک ایک کر کے بے نیل و مرام واپس چلے گئے۔ احسان نے بھی اپنا سامان سمیٹا۔

"لیاقت میں تو جا رہا ہوں۔ تو بھی چل۔"

"میں تھوڑی دیر اور بیٹھوں گا۔ شاید۔۔۔" اور شاید کے بعد اس نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کوئی فائدہ نہیں لیاقت۔۔۔" احسان سامان سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ "اچھا بھئی زندگی رہی تو کل ملیں گے۔۔۔ کسی گولی کا نشانہ بن گئے تو کہا سنا معاف۔"

احسان کے جانے سے لیاقت کی آدھی امید دم توڑ گئی مگر وہ اس لیے بیٹھا رہا کہ دو دن سے اسے دہاڑی نہیں ملی تھی اور آج صبح ناشتے میں اسے ایک کپ چائے بھی نہیں مل سکی تھی۔ ماں باپ، بیوی بچے سب بھوکے تھے۔ وہ خالی ہاتھ گھر میں داخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔

اسے یاد ہے وہ جب بھی گھر میں داخل ہوتا تو اس کی طرف چار آنکھیں ایک ساتھ ایک آس سے اٹھا کرتی تھیں اور وہ خفیف سی مسکراہٹ سے چند نوٹ اپنے بیٹے کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہتا۔

"جاؤ احمد۔۔۔ اپنی ماں سے پوچھ کر تھوڑا سودا لے آؤ۔۔۔"

چار آنکھیں، آئندہ چار گھنٹوں کے لیے مطمئن ہو جاتیں اور اس کی بیوی اٹھ کر تیل کا چولہا جلانے لگتی۔

مگر دو دن سے ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ مگر تیز مہنگائی کی وجہ سے پیسے کھانے پینے پر اڑ جاتے تھے۔ ہر روز دہاڑی ملنا، زندہ رہنے کے لیے بہت ضروری ہو گیا تھا۔

دوپہر ڈھل گئی۔

وہ تھک سا گیا تھا۔

سارے جوجود واپس چلے گئے تھے۔ چورنگی کی اکا دکا کھلی دکانیں بھی بند ہو چکی تھیں۔ سڑکوں پر ٹریفک بھی کم ہو گیا تھا۔ یہ وہ سڑک تھی جہاں کبھی سے لی کھٹی چلا کرتی تھی۔ گاڑیوں کا دھواں، دکانوں کی بھیڑ، بھیڑ بھاڑ۔۔۔ شور شرابا۔۔۔ اور ایک رونق ہوا کرتی تھی۔ اس وقت ہو کا عالم طاری تھا چورنگی کے اس ٹکڑے پر جہاں کم سے کم بیس پچیس جوجود بیٹھا کرتے تھے تنہا لیاقت تھڑے پر بیٹھا ہوا تھا۔

وہ صبح کا بھوکا پیاسا اسی طرح تھڑے پر بیٹھا رہا اور پھر قریبی مسجد سے مغرب کی اذان بھی ہو گئی۔ وہ اب بالکل مایوس ہو گیا۔ اس کی جیبیں اپنے جسم پر بوجھ محسوس کیا تھا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

کر ہی کیا سکتا تھا۔

منگھو پیر میں کی دو تین رات تو پہلے کے بعد شروع ہوا کرتی تھیں مغرب کی اذان کے ساتھ ہی گولیوں اور دھماکوں کی آغوش میں چلا جاتا تھا۔

اپنے بوجھل جسم کو بہ مشکل سنبھالتا لیاقت اٹھ کھڑا ہوا اور مردہ قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔

گلو ہوٹل سے، جو اس کے گھر سے ذرا فاصلے پر ہی تھا۔ انواع و اقسام کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ محلے کا یہ واحد ہوٹل تھا جو پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ہوٹل تو چھوٹا تھا مگر باہر چارپائیاں ڈال دی گئی تھیں۔ کچھ مہینے قبل گلو نے ہوٹل پر رنگین ٹی۔ وی بھی رکھوا لیا تھا اور ڈرامے کے وقت یہاں خوب رونق ہو جایا کرتی تھی۔ مگر یہ بھی اچھے وقتوں کی بات تھی جب سے شہر میں ہنگامے بڑھے تھے گلو ہوٹل کی رونقیں بھی ہوا ہو گئی تھیں اور رات کے ایک بجے تک کھلا رہنے والا ہوٹل اب دس بجے ہی بند ہو جاتا تھا۔ لیاقت جب گلو ہوٹل کے سامنے سے گزرا تو کوئی ڈرامہ چل رہا تھا اور دو تین لوگ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کیا پک رہا تھا۔ اشتہا انگیز خوشبو ارد گرد پھیلی ہوئی تھی اور وہ بہت ہی تھکے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

رات خیریت سے گزر گئی۔ فائرنگ نہیں ہوئی۔ "اللہ کرے حالات ٹھیک رہیں تاکہ کل مزدوری مل جائے" وہ دل ہی دل میں یہ دعا کرتے صبح سویرے پھر گھر سے اپنا وجود گھسیٹتے ہوئے باہر نکل گیا۔ آدھے گھنٹے کا سفر گھنٹے میں طے کر کے وہ پھر ناظم آباد چورنگی پہنچ گیا۔ کل کے مقابلے میں آج حالات کچھ بہتر لگ رہے تھے۔ کیوں کہ چند دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور سڑک پر تھوڑا بہت ٹریفک بھی تھا۔ مزدوروں کی تعداد بھی کل سے زائد تھی گو کہ ابھی احسان نہیں آیا تھا مگر اسے امید تھی کہ احسان آجائے گا اور یہ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر آج بھی مزدوری نہ ملی تو احسان سے دس روپے قرض مانگ لے گا کیوں کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ فاقے کا آج اسے تیسرا دن تھا کمزوری کی وجہ سے اس کے بدن اور ہاتھوں میں رعشہ سا آ گیا تھا۔ اس نقاہت میں تو اس سے کوئی کام بھی نہیں ہو سکے گا!

بڑے انتظار کے بعد ایک گاڑی آئی اور احمد مستری اس کے ساتھ چلا گیا۔ تین دن میں یہ پہلی مزدوری تھی جو ان مزدوروں میں سے کسی ایک کو ملی تھی لیاقت کو کچھ امید ہو چلی وہ اور بے تابی سے احسان کا انتظار کرنے لگا۔ احسان آیا تو اسے تھوڑی سی ڈھارس ہوئی لیکن اس کی حالت بدستور بگڑتی جا رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد نیلے نیلے حلقے سے نمایاں ہو رہے تھے اور پیٹ کو اندر سے کوئی پنجے سے کھرچ رہا تھا اور پھر اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

چورنگی کے جس ٹکڑے پر یہ مزدور بیٹھا کرتے تھے وہاں سامنے ہی کیمسٹ کی ایک بہت بڑی دکان تھی، جو آج چار دن کے بعد کھلی تھی۔ احسان بھاگ کر کیمسٹ کو بلا لایا۔ لیکن کیمسٹ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے فون کر کے ایدھی کی ایمبولینس منگالی۔ ایمبولینس میں لیاقت کو ڈالتے ہوئے احسان نے ڈرائیور کو بہ مشکل تمام گلو ہوٹل کا پتہ سمجھایا۔ احسان کو اس سے زیادہ نہیں معلوم تھا کہ لیاقت کے گھر کے پاس ایک گلو ہوٹل ہے۔

"ہوٹل میں کوئی نہ کوئی لیاقت کو جانتا ہوگا" احسان نے ڈرائیور کو سمجھاتے ہوئے کہا اور ایمبولینس لیاقت کو ہاسپٹل کے لیے لے کر روانہ ہو گئی۔

لیکن ہسپتال پہنچتے پہنچتے لیاقت ختم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ لاش کو ہسپتال کے سرد خانے میں رکھوا دیا گیا۔

"ان کے رشتے دار ہی وصول کر سکیں گے" ڈاکٹر نے ڈرائیور کو سمجھاتے ہوئے کہا "آپ ان کے گھر والوں کو اطلاع کر دیں۔"

(باقی ص [illegible] پر)

نگار سجاد ظہیر

ادھورا منظر

گھر کے باہر
لان کے اندر
شام کا روپہلا منظر
کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت
بالوں میں بیلے کے خوش بودار ، سفید ، مہکتے گجرے
زانو پر ایک کھلی کتاب
سامنے میز پہ چائے کے دو خالی کپ
عقبی ، بیرونی دیوار پہ عشقِ پیچاں کی بیلیں
خوش ترتیب اور بے ہنگم

داہنے ہاتھ پہ ذرا پرے
املتاس کا گھنا درخت
اور گھنے درخت پر اگی ہوئی وہ پیلی آگ
اس کی جڑوں کو پانی دیتا
ادھیڑ عمر کا سانولا مرد
چہرے پر انمول سا سکھ
جس نے تھوڑی دیر ہی قبل
بیلے کی کلیوں کا گجرا ، اپنے ہاتھوں سے بن کر
اس عورت کو پہنایا تھا
بیلے کے پھولوں کی قطاریں
بائیں جانب مہک رہی تھیں
کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت
لان میں پانی دیتے مرد کو دیکھ رہی تھی
کتنا مکمل منظر تھا !

○

گھر کے باہر
لان کے اندر
شام کا بدرنگ منظر
عقبی ، بیرونی دیوار پہ عشقِ پیچاں کی بیلیں
خوش ترتیب اور بے ہنگم

داہنے ہاتھ پہ ذرا پرے
املتاس کا گھنا درخت
اور گھنے درخت پر اگی ہوئی وہ پیلی آگ
اس کی جڑوں کو پانی دیتا
ادھیڑ عمر کا سانولا مرد
چہرے پر دکھ کا ساگر
بائیں جانب مہک رہی تھیں
بیلے کے پھولوں کی قطاریں
سامنے میز پہ چائے کا ایک خالی کپ
لان کی کرسی خالی تھی !

○●○

نگار سجاد ظہیر

قرض

کچھ خط تھے اور کچھ تصویریں
جو برسوں پہلے بھیجی تھیں
جذبات سے پُر وہ زنجیریں
جو برسوں پہلے پہنی تھیں
مجھے حق تو نہیں وہ واپس لوں
پر دل میں خوف سا رہتا ہے
وہ زخم اگر تم بند کرو
جس زخم سے لہو رستا ہے
وہ خط سارے وہ تصویریں
راوی میں بہادو یا ان کو
شعلوں کے نذر کرو تاکہ
میں موت کے منہ میں جاتے ہوئے
بے کل نہ رہوں بے چین نہ رہوں
سنتے ہیں کہ جن کا قرض کوئی
اس دنیا میں رہ جاتا ہے
وہ روحیں واپس آتی ہیں

○●○

جگن ناتھ آزاد

○

آرزوئیں نذرِ جاناں نذرِ دوراں ہو گئیں
کیا بہاریں تھیں کہ وہ پھولوں پہ قرباں ہو گئیں

کس لیے ہم بے سروسامانیوں کا غم کریں
بے سروسامانیاں ہی ساز و ساماں ہو گئیں

صورتیں جو ایک جنت تھیں نگاہوں کے لیے
دل میں جب اتریں تو گویا دشمنِ جاں ہو گئیں

کیا بتاؤں مجھ سے کیا کچھ لے گئے جوشِ فراق
جس قدر کیفیتیں تھیں نذرِ حرماں ہو گئیں

احتشام و جاں نثار و فیض و احسان و حسنیٰ
ہائے کیا کیا صورتیں نظروں سے پنہاں ہو گئیں

اب نہ یادیں ہیں نہ یادوں کی پریشانی کوئی
جس قدر یادیں تھیں زیبِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

کس قدر آباد تھیں ہندوستاں کی بستیاں
رہنماؤں کی عنایت سے یہ ویراں ہو گئیں

وجد کے عالم میں ہے غالب کے اس مصرعے پہ جاں
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اقبال متین

o

اس کی چاہت کا دم بھرتے نکلے کیسے کیسے لوگ   ہم بہ اندازِ دگر جاتے ہیں
ہم نے لگا کر جان کی بازی دیکھے جھوٹے سچے لوگ   جب ترے پاس سے گھر جاتے ہیں
دل میں کچھ ہے ، کچھ ہے زباں پر ، اوپر والے اندر والے لوگ   خواب ملتے ہی نہیں بستر پر
سجدے میں چہرے کو چھپاکر میری ہوک سے اٹھے لوگ   جاگتی آنکھوں میں بھر جاتے ہیں
بانس کے ہدے باندھ کے نکلے مخنوں اور گھٹنوں کے بیچ   بے حسابی تو مرے اندر ہے
ریت کے ٹیلوں پر ناچے ہیں [illegible] ، [illegible] لوگ   پھر یہ سب لوگ کدھر جاتے ہیں
عمر گنوا کر جن کے ہاتھوں خوار ہوئے خاشاک ہوئے   تجھ کو کھو لیتے ہیں زندہ رہنے
اب وہ زمیں پر ڈھونڈھ رہے اپنی [illegible] لوگ   تجھ کو پاتے ہیں تو مرجاتے ہیں
اب اپنی زنبیل اٹھالو [illegible] سڑکیں   [illegible] چاہے تو یہ پندار بھی ہے
سب یکساں ہیں ، چلے چلو بھی ، دیکھو چلتے پھرتے لوگ   ورنہ سب اشک بکھر جاتے ہیں
ہم نے نظریں نیچی رکھیں [illegible] بہت تھا   وہ کہیں بھی ہو ، کسی کا ہو مگر
نظر اٹھی تو ہم نے دیکھا [illegible] لوگ   [illegible] اس کے ہی سر جاتے ہیں
جیب و دامن تھے ہی دریدہ ، داد و دہش کی خواہش بھی   ان پرندوں کی اداسی دیکھو
نم آنکھوں سے چاہت پاکر [illegible] لوگ   [illegible] ناپتے گھر جاتے ہیں
شورِ سگاں ہے چار طرف بھی ، ہاتھ میں [illegible] اٹھا لینا تھا   ہم بھی اک طرفہ تماشا ہیں متین
یوں نہ کبیدہ خاطر ہونا ، لوگ ہیں ، رنگ بدلتے لوگ   دکھ کسی کا بھی ہو ڈر جاتے ہیں
اب تو وہ بھی نہیں ملیں گے تم جن کو [illegible] اقبال متین   ooo
خلقت خلقت ڈھونڈ رہے [illegible] دنیا [illegible] لوگ

ooo

من موہن تلخ

○

کج یہ دل سا دن چڑھا ہے کوئی
تک رہا ہے بچھڑ چلا ہے کوئی

[illegible] سچ خوب یہ چپکتا ہے
جا بہ جا خود کو ڈھونڈتا ہے کوئی

[illegible] کوئی [illegible] جاتا ہے
اور حیرت سے تک رہا ہے کوئی

[illegible] ہو تم
یہ تو سوچو یہ ابتدا ہے کوئی ؟

گھر [illegible] کر بھی گھر نہیں پہنچا
کس جگہ جانے رہ گیا ہے کوئی

[illegible] بھی ہوا
کیسی خود سے الجھ پڑا ہے کوئی

[illegible] دنیا پر
میرے [illegible] پہ یہ دعا ہے کوئی

○

سب کے ہوتے ہوئے یہ لگتا ہے
[illegible] گیا ہے کوئی
[illegible]
[illegible] گھر [illegible]
[illegible] ہے کوئی
[illegible]
[illegible] سب
[illegible] ہے کوئی
[illegible]
[illegible] ہیں
[illegible] ہے کوئی
[illegible]
[illegible] ایب
[illegible] کوئی
[illegible]
[illegible]
[illegible] کوئی
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے کوئی

○●○

چندر پرکاش شاد

○

کیا من کو لبھاتا اندر کا اظہار لگے
دشمن جو کبھی ہنس کر بولے وہ یار لگے

ہر آفت نیند میں سات سمندر پار لگے
جب آنکھ کھلے اپنے ہی گلے کا ہار لگے

گھر سے نکلے تو موسمِ گل بن کر نکلے
اور گھر میں رہے تو صدیوں کا بیمار لگے

اک مہمل لفظ کہ فرش پہ چکنا چور ہوا
ہر گوشے میں آوازوں کے انبار لگے

جب اپنی ہی پہچان کی کھوج میں نکلے ہم
دنیا کے کونے کونے میں بازار لگے

کیا الٹے سیدھے سائے ذہن میں پھرتے ہیں
یہ دھول چھٹے تو سپنوں کا دربار لگے

حیران سا خالی ہاتھ مسافر جائے کہاں
ہر گام کہ اس کو سر بہ فلک دیوار لگے

جب الجھن ہو من میں تو کھائی پہاڑ بہت
اور چل نکلیں تو سب رستے ہموار لگے

کس شخص نے ایسی کاٹ ہوا میں رکھ دی ہے
اک نرم سا جھونکا بھی خنجر کی دھار لگے

○●○

○

بے سبب ٹوٹتے بکھرتے چلو
اپنے سب رنگ فاش کرتے چلو

بن کے جوالا اچھل پڑو گے کبھی
ابھی اس کھائی میں اترتے چلو

یہ علاقہ کہ دانوؤں کا ہے
جلد اس راہ سے گزرتے چلو

موج کا ہی مزاج اپنا کر
تیرتے ڈوبتے ابھرتے چلو

جو ہمارے اثر میں آئے نہیں
ان خلاؤں میں خاک بھرتے چلو

اپنے سائے کی اک تراش لیے
سب نوادر کو زیر کرتے چلو

○●○

مصحف اقبال توصیفی

○

ں نے سنایا ہم کو اپنے دل کا قصہ آج عجیب
ا جس کو پتھر کہتے تھے وہ بھی دھڑکا آج عجیب

ان میں جانے کب گھس آیا صحرا. میرے کمرے میں
فتر سے لوٹے تو دیکھا گھر کا نقشہ آج عجیب

یٹا ہی تھا بستر پر میں • درد اٹھا جب پہلو میں
ات ابھی باقی تھی آدھی • سورج چمکا آج عجیب

رسوں بعد اسے دیکھا تو حیرانی میں ڈوب گیا
ائینہ دیکھا تو لگتا ہے اپنا چہرہ آج عجیب

وہ کہتی ہے • آج ہمارے بچوں کے فون آئیں گے
پنے گھر میں لگتے ہیں نا تنہا تنہا آج عجیب

○●○

محسن بھوپالی

○

ہم سخن اور ہی سفر میں ہیں
شاعری میں شہیں خبر میں ہیں
ہیں نمونہ انا پرستی کا
یہ جو خود اپنے ہی اثر میں ہیں
حاصلِ عمر ہوں گے وہ نغمے
جو ابھی ذہنِ کوزہ گر میں ہیں
ہم اندھیروں کی دسترس سے دور
روشنی کی طرح سفر میں ہیں
جانے کب آئیں گے نگاہوں میں
ہم بھی اس صدِ کم نگر میں ہیں
دیکھیے وقت کیا بناتا ہے
ہم ابھی دستِ کوزہ گر میں ہیں
چھین سے ہیں مسافرانِ کرام
دیکھو مسافت کے سبب شجر میں ہیں
محسن ان سے عمل کی ہے امید
محو جو ذکرِ خیر و شر میں ہیں

○●○

حبیب صدیقی

○

یاد آجاتے ہیں اک پل میں فسانے کتنے
خواب بھی ہوتے ہیں روپوش زمانے کتنے

ریگ صحرا کو بتانا ہی پڑے گا شاید
دفن کرتے ہیں تجھے اس میں خزانے کتنے

زندگی تجھ سے محبت ہے کہ تیری خاطر
ڈھونڈ لیتا ہوں میں جینے کے بہانے کتنے

قصہ گوئی کا ہنر کس نے سکھایا ہوگا
رات نے یاد کیے ہوں گے فسانے کتنے

جب سے مرجھانے برے لگنے لگے دل کی طرح
کبھی لگتے تھے یہی پھول سہانے کتنے

○●○

○

میری آنکھوں کے سوا اور کہاں نکلے
آتشِ ہجر سے پہلے جو دھواں نکلے

بانجھ ہوجائے گی یہ پھول اگتی
ریگ زاروں میں اگر آبِ رواں نکلے

دشت سے لوٹ کے مت جانا کبھی گھر کی
شہر والوں میں بہت خوفِ زیاں نکلے

میرے قاتل تجھے معلوم نہیں تھا
میرے ہی دم سے ترا نام و نشاں نکلا

رونقِ شہرِ ہوس جلد بھلا دو دل
شام کے بعد اداسی کا دھواں نکلے

○●○

شاداب رضی

[illegible] زور ہواؤں کا [illegible] تھا
[illegible] چراغ [illegible] تو ایک بہانہ [illegible] تھا

خلوص تھا کوئی [illegible] شاعرانہ تھا
[illegible] کبھی [illegible] مرا ربط دوستانہ تھا

تمام خلق خدا تھی تری حمایت میں
مرے خلاف مرا [illegible] زمانہ تھا

لرز لرز کے [illegible] کسی ابر [illegible]
[illegible] تیز ہواؤں کا [illegible] تھا

[illegible] کر زباں [illegible] گرفت [illegible]
[illegible] یہ تھا [illegible] نشانہ تھا

[illegible] وہ [illegible] کہ [illegible]
ہوا جہاں کبھی [illegible] آب و دانہ تھا

ابھی گئی تھی ہوا [illegible] پھینکنے کو
پلٹ کے آئی تو [illegible] آشیانہ تھا

○●○

جمشید مسرور

[illegible] کرن کی طرح [illegible]
وہ جسم شمال میں بنا ہے

[illegible] سمندروں [illegible]
[illegible] چاند [illegible]
ہیں خشک ہوائے گل کے موسم

[illegible] کبھی [illegible]
[illegible]
شاید اسے برف سے ملا ہے

[illegible]
[illegible]
ہونٹوں سے وہ دیکھتا ہے جو کو

آنکھوں [illegible]
[illegible] کہ ابر [illegible]
اس عہد میں سچ کی بددعا ہے

[illegible]

○●○

رضوان سعید

○

پلکوں تک لہرائے بارہ ماس آنکھوں کا ساگر
جو ہریالی اگا نہ پائے دل ہے ایسا بنجر ۔

لے کر چوڑی موتی بندیا گھونگھر جھومر جھالر
گاؤں گاؤں میں گھوم رہے ہیں یادوں کے سوداگر

اجڑی اجڑی ساری بستی رویا رویا پنگھٹ
چھوڑ گئی وہ چنچل گوری سونا سونا بابر

من کا چین چراتی کوئل آنگن آنگن جھانکے
اپنے کالے کرتوتوں کو بانٹ رہی ہے گھر گھر

ناگن سی برہا کی راتیں سونا سونا کمرہ
چبھنے لگتا ہے ہر پہلو نرم نرم یہ بستر

مال روانی صبحیں ریل بجائے سیٹی
جنگل جنگل بھاگی جائے دل کی دنیا لے کر

کتنی پیاری صورت رضواں جیسے لعل نگینہ
دل بھی اپنی قیمت پاتا کاش کہ ہوتا پتھر

○●○

ایس ۔ اے ۔ فہیم

○

دنوں نہ لمحوں کی کوئی حد ہے ۔ نہ سال ہا سال کے قرینے
نگاہ و دل میں ٹھہر گئے ہیں ۔ حسین یادوں کے کچھ مہینے
نظر کی گرمی سے چھوٹتے تھے بدن سے جن کے کبھی پسینے
وہی مقابل میں آج اپنے کھڑے ہوئے ہیں تنائے سینے
تری توجہ سے رفتہ رفتہ ۔ مری سمجھ میں بھی آرہا ہے
نظر بھی طے کررہی ہے میری ۔ خیال کے کچھ حسیں زینے
قریب پھولوں سے پھل کو پاکر ۔ گمان یہ بھی ہوا ہے اکثر
جھلس نہ دے ان کو آتش گل یہ رنگ و رس کے ہیں آبگینے
ہوا کے یہ ہلکے نرم جھونکے کہیں سے آکر ٹھہر گئے ہیں
تھرکتے جسموں کی آنچ ہی سے سلگتے نغموں کے ہیں شیشے
غزل کو جذبات کی زباں سے خیال سے وسعتیں ملی ہیں
ہم اہلِ فن ہی تراشتے ہیں کمالِ فن کے حسیں نگینے
کہیں نہ ساحل پہ غرق کردے یہ موج و طوفاں کی سیاست
ہوا کے رخ پر نکل پڑے ہیں ادھورے جذبات کے سفینے
جس احتیاطِ نظر نے مجھ کو ہمیشہ رسوائیوں سے روکا
قریب آنے کو ڈھونڈتے ہیں وہ رسمِ دنیا کے کچھ قرینے

○●○

سید بشارت علی

○

مختصر روداد اپنی ، داستاں کچھ بھی نہیں
صاف سیدھا سا بیاں ، حسنِ بیاں کچھ بھی نہیں
ایک ادنیٰ سے تخیل کا یہ سارا کھیل ہے
یہ زمیں کچھ بھی نہیں اور آسماں کچھ بھی نہیں
یاں مسلط ہے ہر اک جانب سے گہری تیرگی
ہے عیاں سب اپنی نظروں سے نہاں کچھ بھی نہیں
اک نہ اک ہنگامہ ہر پل زندگی میں چاہیے
قہقہے کچھ بھی نہیں ، شورِ فغاں کچھ بھی نہیں
وہ تو بس اندازِ محبوبی نبھاتا جائے ہے
مہرباں ، نامہرباں ، وہ جانِ جاں کچھ بھی نہیں

○

جز نگاہوں کی کرشمہ سازیاں کچھ بھی نہیں
ہر طرف رنگوں کی یہ گل کاریاں کچھ بھی نہیں
رات اور دن تو بہ ہر صورت گزر ہی جائیں گے
ایک جینے کے سوا دشواریاں کچھ بھی نہیں
خود فریبی کے طلسماتی کرشمے ہیں فقط
یہ لگاوٹ اور یہ دل داریاں کچھ بھی نہیں
خود کو الجھائے ہوئے رکھنے کو ہیں پرچھائیں
سب بمانندِ حباب ہیں یہاں ، سود و زیاں کچھ بھی نہیں

○○○

انیس پروین

○

وفا کہاں کی اسے ساتھ کب نبھانا تھا !
فریب دے کے مجھے اس کو لوٹ جانا تھا !
فلک تو یوں بھی ازل سے تھا مرا دشمن
نظر میں برق کی کب سے مرا ٹھکانہ تھا !
وفا کے موڑ پہ بچھڑے ، تو پھر کبھی نہ ملے
تھے ہم اکیلے ، تیرے ساتھ اک زمانہ تھا !
اسی لیے تو کبھی " چاند " تھا کہا تم نے
سیاہیوں میں اماوس کی مجھ کو جانا تھا !
جو تو نہیں نہ سہی ، یہ خیال ساتھ تو ہے
چلے تھے مل کے کبھی ، آشیاں بنانا تھا !
تم اپنے شہر کی گلیوں میں چھوڑ آئے ہمیں
وہ بھیڑیوں کا تھا مسکن ، ہمیں بتانا تھا !
غموں نے پھر سے پتہ ڈھونڈ ہی لیا میرا
انھیں تھا پاسِ وفا ، ساتھ بھی نبھانا تھا !
تھے ساتھ وہ تو ستارے بھی ساتھ تھے پروین
ہے گھپ اندھیرا ، اُفق پار مجھ کو جانا تھا !

○○○

عذرا نقوی

کاوشیں

ہر صبح دریچے سے چلی آئے رسیلی ہوائیں
موسم کی مہک چڑیوں کی چہکار جگائے
آنکھوں میں سجی رات کے خوابوں کا فسوں ہو
دروازہ جو کھولیں تو
نئے دن کا سکوں
گھر میں چلا آئے
اسکول سدھاریں جو کھلے پھول سے بچے
ماؤں کو تسلی ہو کہ وہ لوٹیں گے سلامت
ہم صبح کے سورج کی طرح کام پہ نکلیں
روزی کی ریاضت میں ہراساں نہ ہو غیرت
تھک ہار کے جب شام ڈھلے لوٹ کے گھر آئیں
دہلیز پہ چھائی ہو مگن شام کی راحت
ایسی کاوشیں مقدر میں کوئی ایسا بھی دن ہو!

○●○

CHANDELIER SOCIETY

روشنی روشن جھرمٹوں میں
جمالی تہذیبوں کی ٹوٹ پھوٹ
کھل کھل کھلاتی سیمابی سی
شانی چہروں کی گہما گہمی
جھلک جھلک محفل میں
ریشمی زیب تن پیرہن
جھلملاتے کسمسے شانوں پہ میں
مخمل بچھونوں کی لہریں
والہانہ کی گھڑیاں
اسی محفل میں من کے پریتم
کہاں ہو تم؟
اک سوچ سی ہے یہ کہاں ہو تم
پھر بھی بیراگی ہے من یہ کہیں
آنکھوں میں اک آہٹ کی موہوم جھلک
میری روح میں کھلتی اک بے نام اداسی نے
تم کو جھل مل محفل میں پہچان لیا ہے

وقار الحق

[illegible]

نذرِ وقار خلیل (مرحوم)

[illegible]

اقبال مجید

سرد کار

کچھ برسوں سے وہاں جلدی جلدی فسادات ہورہے تھے ۔ کبھی لوٹ مار اور فضا میں دھوئیں کے بادل اٹھتے دکھائی دیتے تو اس علاقے میں کرفیو لگ جاتا ، لیکن شہر کے دیگر علاقوں میں روزمرہ کی زندگی کچھ چوکنا رہ کر چلتی بھی رہتی ۔ امیر محمد کوئی سترہ سالوں سے اپنا وطن چھوڑ کر وہاں آباد تھا وہ ایک انگریزی اخبار میں ویسے تو کمپوزر تھا مگر اودھ کے شریف اور مہذب خاندان سے تعلق رکھتا تھا ۔ امیر محمد جب چائے کی چسکی لینے دفتر سے باہر نکلتا تو پھاٹک کے قریب ہی بنواری پان والے کی دکان پر ضرورتاً حاضری بھی دیتا۔ یہاں اپنی اپنی طلب پوری کرنے والوں کے جماوڑے میں اسے شہر کی تازہ تازہ خبریں بھی مل جاتیں ۔ فساد کے اس ماحول میں بنواری کی دکان پر امیر کو ایک خبر یہ بھی ملی کہ کنور برجیش جی جو اپنے دادا پردادا کے کسی بھولی بسری جاگیر کے نام کا مونوگرام اپنی جیپ پر لگاکر گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں اور اپنی درپردہ غیر قانونی حرکتوں سے کچھ بدنام بھی ہوچکے ہیں فساد میں کوئی نیا شگوفہ کھلانے والے ہیں تو امیر محمد کو یقین نہیں آیا۔ اسے یاد آیا کہ کنور جی کو تو اس نے ایک بار بنواری کی ہی دکان پر دیکھا تھا ، وہ جیپ پر سوار اپنے چار پانچ موالی موالیوں کے ساتھ ایک بار پان کھانے آئے تھے اونچے قد کے بھاری بھرکم سے ، گلے میں بنواری کی زنجیر سے کچھ زیادہ موٹی سونے کی زنجیر تھی ، لہجے میں اکڑفوں تھی اور کچھ بگڑے رئیسوں جیسے انداز تھے ۔ ان کے کسی شگوفے کے کھلانے والی خبر کو بنواری نے تو محض افواہ کہہ کر مسترد کردیا لیکن کنور جی کے جو لوگ زیادہ قریب تھے اور کنور جی کو اس طرح کے فسادوں پر چراغ پا ہوتے اور اس جگہ کوئی بڑا کام کرجانے کی آرزو میں تلملاتے دیکھ چکے تھے اس خبر کو آسانی سے رد بھی نہ کرسکے ۔

امیر محمد اور بنواری پان والے میں خوب پٹتی تھی ۔ دونوں ہی ہنسوڑ تھے ۔ بنواری دیسے تو خاصہ کسرتی پہلوان جیسا تھا لیکن اپنی دکان کو دلہن کی طرح سجا کر رکھتا تھا ۔ دکان کا سازوسامان بھی بڑا پُر شکوہ تھا ، قیمتی سگرٹوں کے پیکٹ ، کئی طرح کے سگار ، تمباکوؤں کے پاؤچ ، پانوں میں کئی قسم کے پان یہاں تک کہ صوبے کا پان بھی اکثر وہ مہیا کرلیا کرتا ۔ بنواری کو دکان کے لیے طرح طرح کے عمدہ پان مسالوں ، قوام اور چٹنیوں کو جمع کرنے کا بے حد شوق تھا جس کے سبب موٹروں پر دور دور سے پان کھانے والے اس کے پاس آتے ۔ ایک بنڈل بیڑی اور پناما کی ڈبیا سگریٹ امیر محمد کا بھی روز کا راشن بنواری مہیا کرتا تھا اور کبھی کبھی جب دکان پر سناٹا ہوتا تو اپنے ہاتھ کا پان بھی امیر محمد کو کھلا دیتا ۔ اس پان کے عوض امیر بنواری کو کوئی چٹکلا سناکر دیر تک ہنستا ہوا چھوڑ کر دفتر چل دیتا ۔

ایک بار امیر وطن سے واپس آیا تو سوغات کے طور پر بنواری کے لیے ایک مہربند شیشی میں پان کے ساتھ کھائی جانے والی قوام کی گولیاں بھی لایا جس پر چاندی کے ورق لپٹے ہوئے تھے ۔ امیر محمد نے اسے بتایا کہ اس کے وطن میں (مہو) اسی نسل کے ایک نسخے میاں اپنے باپ دادا کے کسی شاہی نسخے سے یہ سلطانی گولیاں گھر میں ہی تیار کرتے ہیں ۔ جس کے کھانے سے دیر تک منہ میں خوش گوار اور مدھم سی خوشبو رہتی ہے اور پان کا مزہ اور سرور بھی دوبالا ہوجاتا ہے ۔ بنواری نے فوراً شیشی کھولی ، پان بناکر منہ میں

رکھا اور ایک گولی پھانک لی۔ ہنواری دھیرے دھیرے منہ چلاتے جیسے ساری تمیز منہ میں اٹھنے والے ذائقے کی جانب لگاتے ہوئے کچھ دیر امیر محمد کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھوں کی چمک ابھرنے لگی۔ تمباکو کے اثر سے جو سرور اٹھا تو ہنواری کی تعریف کے لئے بھی منہ کھولنے کو جی نہ چاہا۔ بس گردن کو جھٹکے دیتا رہا۔ پھر تو امیر محمد نے اس غیر معروف گولی کے بارے میں یہ بھی بتا دیا کہ ان بزرگ کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ نسخہ آصف الدولہ نواب کی تمباکو کا ہے جنھوں نے لکھنؤ کا امام باڑہ بنوایا تھا۔ ہنواری بہت متاثر ہوا۔ شیشی کی قیمت جب امیر کو دینی چاہی تو اس نے لینے سے انکار کر دیا اور یہ بھی بتایا کہ چالیس گولیوں کی قیمت صرف ۱۰ روپئے ہے جسے وہ سوغات کے طور پر ہنواری کے لئے لایا ہے۔ ہنواری نے گاڑیوں پر آنے والے پان کے شوقین گاہکوں میں سے کئی کو پان کے ساتھ ان گولیوں کا ذائقہ چکھایا۔ تعریف ہوئی تو ہنواری کی چھاتی چوڑی ہو گئی۔ پھر تو ہنواری نے نخروں کے ساتھ اس سلطانی گولی کے پان کو پانچ روپے میں بیچنے لگا۔

فسادیوں تو تھم سا چکا تھا۔ مگر اس بار اس کے تیور کچھ عجیب سے تھے۔ تھمتا اور پھر جھگڑا مچا دیتا۔ ایسے ہی ایک دن روزہ کی طرح امیر نے اپنی جیب میں کرفیو پاس رکھا اور پریس کے لیے نکل پڑا۔ وہ سڑکیں گلیاں اور چوراہے محفوظ علاقوں کا انتخاب کے پار کر ہی رہا تھا کہ ایک زیر تعمیر مکان کے پاس جدھر کچھ سناٹا تھا کچھ فسادی لونڈوں نے امیر کو گھیر لیا۔ وہ لوگ آپس میں اس اشکل میں لگے تھے کہ ان کا شکار مسلمان ہے یا ہندو اور اس معاملے میں جلد ہی فیصلہ کرنا چاہتے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ زیر تعمیر مکان سے برآمد ہوتا ہوا ایک آدمی انھیں للکار رہا ہے۔ ابھی لونڈے اس کی نوعیت کو سمجھ نہیں پائے تھے کہ وہ تلک دھاری ان کے سروں پر آن پہنچا۔ امیر کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ ہنواری تھا۔ ہنواری نے پہلے تو ایک لونڈے کے چپت مار کر آستین میں چاقو چھینا اور پھر انھیں بتایا کہ ان کا شکار مسلمان ہے اور اگر امیر کو اس علاقے میں کچھ ہو گیا تو وہ اس آدمی کے بھی پیچھے سے دھوا نکال دے گا جو ان کا کرایہ ادا کر رہا ہے اور جس نے ان کی ضمانت کرانے کا ٹھیکہ بھی لیا ہوا ہے۔ ان میں سے ایک لڑکے کا زیادہ تلملاہٹ دکھا رہا تھا ہنواری سے یہ پتا کرنے پر بہ ضد تھا کہ ہنواری کا امیر محمد سے کیا لینا دینا تھا۔ ہنواری کو جلال آگیا لونڈے کے ایک لات رسید کی اور بولا۔

" یہ ہے لینا دینا۔ تم سے مطلب ؟ "

پھر ہنواری نے کچھ ایسا چہرہ بنا کر انھیں ہنکایا کہ لونڈے کھسک لیے۔ ہنواری دراصل اپنے ادھورے مکان کی دیواروں پر پلاسٹر کی ترائی کرنے وہاں پہنچا تھا۔ اس نے امیر کو اپنا مکان دکھایا، نقشے کی تعریف کروائی۔ اسی درمیان ان نے امیر کو یہ بھی بتایا کہ وہ ان لونڈوں کی سات پشتوں کو جانتا ہے۔ ان کا سرغنہ ہنواری کے چچا کی زمین پر ایک اکھاڑا چلایا کرتا تھا اسی نے ان بے روزگار لونڈوں کو ادھر ادھر کے علاقوں میں بٹھا کر دعاؤں کے لیے زمین گھیرنے کے پیشے میں بھی لگا رکھا ہے۔ ہنواری چہک کر بولا۔

" یار، میں ان لونڈوں کو کیا بتاتا کہ میرا تم سے سب سے بڑا لینا دینا تو اس سلطانی گولی کا ہے جو پان کا مست بنا دیتی ہے۔ یہ بتاؤ کہ اب تم وطن کب جا رہے ہو ؟ "

امیر نے بتایا کہ وہ عید کے موقعے پر جائے گا۔ ہنواری نے امیر کو اپنی جاپانی موٹر سائیکل پر بٹھایا اور کچھ دور تک جیل آباد کے حلقے پر چھوڑ کر جلدی سے اپنے کام پر واپس آگیا کیوں کہ بچا ہوا کچھ لیا [illegible] رہ گیا تھا جو اس افراتفری میں ادھر ادھر ہو سکتا تھا۔

[illegible]

قابل کام کرتا ہے۔

[illegible]

عمارت کو جو کبھی آلو کا گودام ہوا کرتی تھی گھیر لیا ہے۔ خبر غلط نہ تھی پولیس کی اس کارگزاری کے نتیجے میں [illegible] پیشہ افراد جو اکثر کنور جی کے ساتھ ہی دیکھے جاتے رہے تھے گرفتار کیے گئے اور ان کے ساتھ ہی [illegible] اٹھائے گئے [illegible] کے بیانات [illegible]

[illegible] دو ہی دوسرے لوگ کہ آخر یہ جو کم اٹھانے سے کنور جی کا منشا کیا تھا؟

[illegible] حاصل ہونا چاہیے وہ حاصل نہیں ہوتا یعنی وہ خوف ہی پیدا نہیں ہوتا جس کی اصل ضرورت ہے۔ اس [illegible]

پولیس کو بھی پھنسا دیا تھا اور یہ انکشاف کیا تھا کہ ان [illegible] یا تو
عورتوں کی چھاتیاں [illegible]
کی [illegible] تعلیم دیتے [illegible] کر جیسے
[illegible]

پولیس [illegible]
[illegible] جرائم کی
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] لوگوں کو [illegible]
۔ میں ان لوگوں کو بلیک بورڈ کی طرح استعمال کرنا چاہتا تھا۔" جواب [illegible]
۔ کیسے ؟" [illegible]
[illegible]
۔ سوال [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

"پہلے یہ سمجھ لو کہ علاء الدین خلجی کوئی ہزار سال پہلے دلی کا سلطان تھا۔"

"ہوگا۔" کسی نے ناگواری سے کہا، "تم تو یہ بتاؤ کہ اس کے سردار نصرت خاں نے لکھا کیا تھا۔۔۔؟"

"اس نے لکھا تھا" کنور جی ذرا کھنے لہجے میں بولے۔ "دنیا میں دو ہی لوگ ہیں، ایک طاقت رکھنے والے دوسرے طاقت گھٹانے والے۔" وہ لوگ پھر پہلے تو ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے پھر انھوں نے ایک پل کو آپس میں مختصر سی باتیں کیں پھر ان میں سے ایک نے سوال کیا "اچھا اب یہ بھی بتا دو کہ کیسے لکھا تھا تاکہ ہم جیسے کم پڑھے لکھے لوگوں کی بھی سمجھ میں آجائے۔"

کنور جی کو اپنے دل میں غالباً ایسا کوئی پچھتاوا نہ تھا کہ انھوں نے تعلیم کی ناقدری کی تھی یا اپنے ہی کرتوتوں سے وہ ڈگری نہ لے پائے تھے مگر اس کے ساتھ یہ بھی غلط نہ تھا کہ کنور جی نرے گاودی نہ تھے وہ عمدہ صحبتیں اٹھائے ہوئے تھے انھوں نے بڑی نرمی سے تفتیش کرنے والوں کو سمجھایا کہ علاء الدین نے جانور کے باغیوں کے شیر خوار بچوں کو خاکروبوں کے ہاتھوں ان کی ماں بہنوں کے سروں پر پتھروں کی طرح مار مار کر انھیں دھنکی ہوئی روئی کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ بس اسی طرح کنور جی بھی اپنے قیدیوں کے سروں پر ان کے شیر خوار بچوں کو روئی کی طرح دھنک کر عام لوگوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے انتظار میں تھے اس بیان پر ایک متین قسم کے افسر کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی تناؤ نظر آیا۔ اس نے جب کنور جی کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ سیکڑوں سال پرانے جنگ جو بادشاہوں میں سے کسی نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے کچھ باغیوں کو اگر ایسی سزائیں دیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کنور جی بھی ان کی نقل کر کے بے گناہوں پر ظلم ڈھائیں اور فرقہ پرستی کو ہوا دیں۔ کنور جی نے جو یہ سنا تو ان کا منہ سرخ ہوگیا ایک طرف کا گال کچھ پھڑپھڑانے لگا کچھ دیر وہ بالکل نہ بولے اور دانتوں سے انگلیوں کے ناخن چباتے رہے اور فرقہ پرستی کے لفظ کو بھی کبھی دہراتے بھی رہے پھر یکایک چلائے۔

"فرقہ پرستی کا لفظ دوسروں کا چبایا ہوا نوالہ ہے جو آپ لوگوں کے منہ میں رکھ دیا گیا ہے۔"

افسران ان کے لہجے پر ذرا چونک پڑے، کنور جی کو انھوں نے ذرا نیچی آواز میں بولنے کا مشورہ دیا تو جواب میں وہ پھر چلائے۔

"دیکھیے میرے اندر ان جاگیرداروں کا خون ہے جو لگے وار کر کے لڑائی کی عمر بڑھانے سے نفرت کرتے تھے۔"

وہ لوگ کمرے میں لمبے وقت سے بند تھے۔ اس سوال جواب کے درمیان چائے آگئی، ایک پیالی کنور جی کو بھی بڑھا دی گئی چائے بہت اچھی نہ تھی مگر کنور جی نے ان لوگوں کا دل رکھنے کے لیے دو ایک چسکیاں لیں اور انھیں سمجھایا کہ انھوں نے جان بوجھ کر خود کو اس لیے گرفتار کروایا ہے کہ اس بہانے وہ متعلقہ لوگوں کو ان کے زندہ سرد کاروں سے روشناس کرا سکیں۔ متین چہرے والا افسر جو بہت توجہ سے کنور جی کی باتیں سن رہا تھا اور جس کے سامنے شہر میں کنور جی کے نام سے لکھے گئے اور خاموشی سے تقسیم کیے گئے پرچوں کی خفیہ رپورٹ بھی دھری تھی اپنے غصے کو نہ روک سکا۔ علاء الدین کی جانب کیے گئے کنور جی کے اشاروں سے جو معمہ حل ہو گیا تھا اس نے افسر کو اور بھی بے چین کر دیا۔ اس سلسلے وہ کنور جی سے علاء الدین خلجی کے بہیمانہ مظالم کی وہ ناگوار داستان اگلوانا چاہتا تھا جس نے کنور جی کو اس حد تک مسلمانوں سے متنفر اور برافروختہ کر دیا تھا۔ افسر بڑا درشت لہجے میں چل کر بولا۔

"بہت واہیات مت بکو اور اتنا کہو کہ تم مسلم بادشاہوں کے مظالم کا بدلہ کھلے عام ان بے گناہوں سے لینا چاہتے تھے۔"

افسر کے لہجے اور اس کی بات نے کنور جی پر خاصا اثر کیا۔ انھوں نے کرتے کی جیب سے اپنا رومال نکالا ماتھے کو پسینے نے گیلا کر رکھا تھا انھوں نے پیشانی کو پونچھا غالباً انھیں کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اس کو شاید ٹال رہا تھا۔ اس

خوشامد انداز میں اس طرح درخواست کی کہ جیسے وہ سب سے ہی مخاطب ہو رہا ہو۔ پھر اس نے بڑی رازداری کے ساتھ بتایا کہ
کو اصل حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے جو موقع اس نے نکالا ہے اس سے ان سب کو آگے چل کر فائدہ اٹھانا چاہیے۔ پھر وہ بھی
ں کڑوے لہجے میں بولا جیسے افسر بولا تھا۔

"مجسٹریٹ کے سامنے میں یہ ساری باتیں نہیں کروں گا بلکہ وہ بیان دوں گا جو مجھے قانونی گرفت سے بچا سکے۔"

اس درمیان باہر سے کنور جی کے کسی دوست نے پانوں کی پڑیاں بھیجیں تو کنور جی کی آنکھیں چمک اٹھیں سب کے ساتھ
نے بھی پان کے بیڑے اپنے گال میں دبائے۔ اب ان کے چہرے سے کسی چیز کی تلاش کی وہ کیفیت ختم ہو چکی تھی بولنے تو
بھی تازگی تھی۔

"دیکھیے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ہوسکتا ہے کہ ویسا ہی تاریخی واقعہ ہندوؤں کے یہاں بھی مل جائے۔"

"بکو مت۔۔۔" افسر گرجا۔ "یہ بتاؤ علاء الدین نے یہ سزائیں کس کو دی تھیں؟"

جواب ملا۔

"جانور میں پیر جاکر بار بار سر اٹھانے اور غلبہ چاہنے والوں کو۔"

"سیدھی بات بتاؤ، وہ ہندو تھے یا مسلمان؟"

"نہ ہندو ہوتے ہیں اور نہ مسلمان ہوتے ہیں۔" کنور جی دھیرے سے بولے "بس اپنے اپنے سردکار ہوتے ہیں" پھر کنور جی
صاف کیا کہ بچوں کو روئی کی طرح دھنکنے والے ہاتھ تو مسلمان تھے ہی، ماؤں کے سر اور معصوم بچے بھی مثل مسلمان تھے۔ پھر
بھاری آواز کمرے میں گونجی۔

"سردکاروں کو سمجھو تو علاء الدین کی دی ہوئی یہ تعلیم بھی سمجھ میں آجائے گی۔"

اس کمرے میں دیر تک پھر کوئی آواز نہ اٹھی۔

امیر محمد اس آفتِ ناگہانی سے نپٹنے کے بعد کئی روز گھر پر پڑے رہ کر ایک روز جب اپنی حیرانیوں اور اداسیوں کی گرد جھاڑ کر
ان والے کی دکان پر اپنا راشن لینے پہنچا تو اس حادثے کی کچھ اڑتی اڑتی سی خبر دفتر سے ہوتے ہوئے ہنواری تک بھی آدمی
پہنچ چکی تھی۔ بات خوش گوار نہ تھی اس لیے ہنواری نے اس کا ذکر نہ کیا مگر فکر مندی کے ساتھ یہ تو پوچھ ہی لیا۔

"کہاں رہے امیر بھائی اتنے دنوں؟ سب ٹھیک ٹھاک تو ہے۔" امیر لمبی سی سانس چھوڑ کر بولا۔

"اب کیا بتاؤں، تم تو ایک پان کھلاؤ کہ طبیعت مست ہو جائے۔" ہنواری نے ایک بڑا سا سفید پان اٹھایا، لگاتے ہوئے بولا

"پان ایک نہیں دو کھلاؤ مگر کہاں اٹک گئے تھے یہ تو بتاؤ۔۔۔"

"ٹھیک ہے تو پھر سنو" امیر ہنواری سے بولا "کچھ سردکاروں کا چکر تھا شاید۔"

ہنواری کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ساتھ ہی کسی کی طرف اشارہ کیا اور پان بناتے ہوئے بولا۔

"میں تو خوش ہوا تھا کہ شاید اپنے وطن نکل گئے ہوں گے۔۔۔"

"دھوکر دھرما پوری کر"

ترجمہ: قاسم ندیم

"منت"

رحمت بی رکی۔ رکمانہ کی پیٹھ پر بچہ لدا ہوا تھا۔ سر پر ٹوکرا، جس میں کنڈے، سوکھی لکڑیاں تھیں۔ جس نے اسے چلنے میں دقت ہو رہی تھی۔ پیٹھ پر جو بچہ تھا، وہ تھا محمود۔ وہ پاس آئی۔ دونوں پھر چلنے لگیں۔

"پرسوں کو بولتی، اپن جائیں گے وہاں!"

"کہاں؟"

"ساکور گاؤں!" رحمت بی نے اس کی پیٹھ پر لدے بچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

دو پہر سے ان کی اس بات پر بات چیت چل رہی تھی۔ بہت دوا دارو کیا، کئی درگاہوں پر گئی، گنڈے، تعویذ باندھے، پھر بھی محمود ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ پیٹ پھول کر ڈھول ہو گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ وہ گردن لٹکائے بیٹھا رہتا۔ اب تو سات آٹھ دنوں سے سوتا ہی رہتا ہے۔ رکمانہ کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ اس کا دل کام میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کپاس چنتے چنتے وہ بچے کے بارے میں بولتی رہتی۔

"وہاں کیا ہے؟"

"کل منگل ہے، وہاں دیوی کے پاس جائیں گے۔"

چلتی ہوئی رکمانہ رکی۔ رحمت بی کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتی رہی۔

"دیوی کے پاس؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں، کل منگل ہے، دیوی کا دن ہوتا ہے۔ وہاں جاکے محمود کو دیوی کے سامنے رکھ کر دعا مانگیں گے۔" رحمت بی کہنے لگی۔ مگر رکمانہ نے منہ بنایا۔ لکڑیاں چننے سے آئی ہوئی کھرونچ کو وہ سہلانے لگی۔

"لیکن وہاں آنے دیتے کیا اپنے کو؟"

"نہیں آنے دینے کو کیا ہوا؟ بہت جاتے اپنے والے وہاں!" رحمت بی نے کہا۔

محمود کی بیماری اور اس سے پریشان رکمانہ کو دیکھتے ہی رحمت بی کا دل پگھل جاتا۔ یہ رکمانہ جانتی تھی۔ سات آٹھ زچگی [illegible] ہوئی تھی۔ مگر رکمانہ کے بچے زندہ ہی نہیں رہتے تھے۔

"اپن [illegible] کے لوگ آتے ہیں! خندار کے حاجی سیاں کو تو ہمن بھی آتے ہیں۔"

"ہاں [illegible]۔۔۔ مگر یہ کیا اپنے۔۔۔" رکمانہ کی آواز میں فکر تھی۔

"[illegible] تیرا [illegible]؟"

"ہاں ۔۔۔"

"ارے اس کو کیا بولنے کا ؟ وہ تو کم بخت گھومتے ہی رہتا ہے ! اپنے کو ہی کرنا پڑتا سب ۔"

"لیکن ؟"

"تو چپ بیٹھ ۔ تیرا مرد تو ابھی چار دن نہیں آتا ۔ ہوٹل کی ڈیوٹی بولے تو اس کو فرصت کہاں ملتی ؟ اور آیا تو گھر میں بول لے رکھیں گے ۔ علاج کو گئے ہیں ۔"

رحمت بی کی باتوں کا ریکانہ پر اثر ہونے لگا ۔ اس کے لفظوں سے ریکانہ کو سب کچھ آسان لگنے لگا ۔ بچے کی فکر میں ڈوبی ریکانہ کو رحمت بی کا سہارا محسوس ہوا ۔ اس کا مرد چار چار دنوں کے بعد آتا ۔ آتے وقت ممدو کے لیے شکر کی جلیبی اور سیو کی پڑیا لاتا گہرے لال رنگ کی میلی سی لنگی لپیٹ کر بچے کو سنبھالتا ۔ پھر ریکانہ کام پر اکیلے ہی جاتی ۔ کبھی کبھی شوہر کے ساتھ وہ شہر کے ڈاکٹر کے پاس ممدو کو علاج کے لیے لے جاتی ۔ واپسی پر اس کا شوہر اسے بس میں بٹھا دیتا ۔ ممدو کے لیے ہوٹل سے چوڑا ، پیڑے باندھ دیتا ۔ گیلی ، سخت لال انگلیوں سے ممدو کو بہلاتا ، ہوٹل کے کام کی وجہ سے اس کی انگلیوں کی چمڑی چھل گئی تھی ۔ ریکانہ کو لگتا ابھی ان سے خون پڑے گا ۔ نظر بچا کر وہ شوہر کو ، پھر ممدو کو دیکھتی ۔ شہر سے آنے پر ریکانہ کو سونا سونا سا لگتا ۔ ڈری سہمی ریکانہ کو ایسے میں رحمت بی کا ساتھ بڑا ضروری لگتا ۔

جیسے جیسے گاؤں نزدیک آنے لگا ، ویسے ویسے رحمت بی کا کہنا اسے صحیح لگنے لگا ۔ سانور گاؤں جانے ، دیوی کے سامنے بچے کو "کر منت مانگے " ۔۔۔ میرے بچے کو ٹھیک کر ماں ۔۔۔ میں ۔۔۔ " آگے اس کی سمجھ میں نہیں آیا ۔

"کل کام بھی نہیں ہے ۔۔۔"

"ہاں ۔ اب دو چار دن کپاس کہاں آتی چننے کو ؟ اس لیے بول رہی ہوں ، اپن صبح جائیں گے ۔ وہ پہلی بس ادھر سے نکلتی ہے نا ؟"

"ہاں ۔"

"پھاٹے پر جائیں گے ۔ وہاں سے سات بجے سانور گاؤں کی بس ملتی ہے ۔ آدھے گھنٹے میں پہنچ جاتے وہاں ۔۔۔ میں گئی تھی نا ، دو بار وہاں ۔"

"وہاں جاکے پاؤں پڑنا اور ۔۔۔"

"ہاں ۔ بہت بڑا مندر ہے ۔ پہلے ناریل لینا ، وہ سب پڑیا باندھ کے دیتے ۔ ہلدی ، کھوپری ، شکر ، وہ لے کر دیوی کے سامنے انا ۔ وہ بھی کو سب چڑیاں دینا اور دعا مانگنا ، بس ۔۔۔"

"ہاں ۔" کھوئی ہوئی سی ریکانہ کی آنکھوں کے سامنے سارا منظر دکھائی دینے لگا ۔

"اور پھر باہر آکر ناریل پھوڑنا ، مندر کے پاؤں سے گھوم کر پھر وہ کھوپرے کے ٹکڑے چار لوگوں میں بانٹ دینا ، بس ۔"

اس کے ساتھ رحمت بی نے سانور گاؤں کی دیوی کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں ۔ منت پوری کرنے والی وہ دیوی ہے ۔ اس کے لیے بکری ایک سے جی اور ہاں ۔۔۔"

کہاں ۔ وہ منہ میں بار ریکھا کی آنکھیں پھٹی سی رہ گئیں ۔

" ہاں ۔ دیوی کے سامنے چڑھاوا چڑھانے کو کچھ نہیں ہوتا ۔ تو چل ۔ اب اتنے ڈاکٹر تو ہو گئے درگاہیں ہو گئیں ۔ منتیں ہوئی ۔ لیکن کچھ فائدہ ہوا تیرے بچے کو ؟ "

" نہیں نا ۔ ۔ ۔ "

" اب وہاں دیکھیں گے ۔ تیرا ممدو ٹھیک ہو جائے گا ۔ تو فکر مت کر ۔ "

ریکھا اور رحمت بی گھر پہنچی ۔ ایک ہی باڑے میں وہ دونوں رہتی تھیں ۔ کمر کے بٹوے میں سے ریکھا نے چابی نکالی ، کھولا ، پیٹھ پر بندھے ممدو کو زمین پر سلایا ۔ پانی لیا اور بیٹھی ۔ بچے کی طرف دیکھتے ہی پانی بھی گلے سے نیچے نہیں اترا ۔ اس کے ماتھے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ بول پڑی ، ممدو ۔ ۔ ۔ ممدو رے ۔ ۔ ۔ " اس نے آنکھیں کھولیں ۔ سونی آنکھوں سے دیکھنے لگا ۔ اس کے گلے میں دو تین گنڈے ، تعویذ تھے ۔ پاؤں میں کالے اون کا ڈورا بندھا تھا ۔ پھولا ہوا پیٹ ، پچکے گال اور سونی نظر ۔ ریکھا نے اسے اٹھا کر اٹھایا ۔ ممدو بھی دیوار سے ٹک کر بیٹھ گیا ۔

شام کے وقت سبھی کام کر کے لوٹ آ رہے تھے ۔ گاؤں میں شام کی چہل پہل ہونے لگی ۔ چولہے جل اٹھے ، دھواں اٹھنے لگا ، بچوں کا رونا ، چیخنا ، چلانا سنائی دینے لگا ۔ پنچایت کے بھونپو سے ریڈیو کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی ۔ جانوروں کو ہانکنے کی آواز ، ان کی گردن میں بندھے گھنگھروں کی آواز اور کھروں کی آواز سنائی دینے لگی ۔ ریکھا کے پڑوس میں بھی چار بھینسے تھے ۔ ڈوری کھینچ کر چلا رہے تھے ۔ دن بھر ادھر ادھر گئی مرغیاں لوٹ کر آنے لگیں ۔ ٹوکرے کے ارد گرد منڈلانے لگی ۔ رحمت بی نے چولہا جلایا ۔ اس کے بچے چلا رہے تھے ۔ بڑی لڑکی بکری کا دودھ ایلومینیم کے برتن میں نکال رہی تھی ۔ اس سارے شور و غل میں ریکھا ممدو کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اکیلی بیٹھی تھی ۔ ۔ ۔ !

" روٹی نہیں بنانا ہے کیا ریکھا ؟ " رحمت بی نے ادھر سے آواز لگائی ۔

" وہ اٹھی ، چولہا جلایا ، پھٹی ہوئی آواز سے رونے والے ممدو سے بولنے لگی ۔ " وہ دیکھ ۔ چاچا آئے ، چپ بیٹھ ! "

باڑے کے دروازے کو دھکیل کر رحمت بی کا شوہر آیا ۔ چر مراتے جوتوں کی آواز نے اس کے آنے کی اطلاع دی ۔ سر سے گھاس کا گٹھا پٹکا ، جوتے نکالے ، صافہ نکال کر سر کھجلایا ۔

" افضل کہاں گیا ؟ دکھائی نہیں ۔ ۔ ۔ " اس نے پوچھا ۔

" کہاں مرا ؟ صبح اس کو بولی تھی کہ چل میرے ساتھ ۔ " روٹی تھپتھپاتے ہوئے رحمت بی نے کہا ۔

ہاتھ پاؤں دھو کر صافے سے پونچھتے ہوئے رحمت بی کا شوہر آیا اور " یا اللہ " کہتے ہوئے کھاٹ پر سستانے لگا ۔ روٹی بناتے ہوئے ریکھا کو باہر آنگن دکھائی دے رہا تھا ۔ اس نے دودھ میں روٹی کے ٹکڑے ملائے اور کٹوری ممدو کے سامنے رکھی ۔ وہ انگلیوں سے دھیرے دھیرے کھانے لگا ۔ ریکھا نے بھی روٹی کھائی ۔

" کل سانوند گاؤں جاتے ہم دونوں ۔ " چارپائی پر آرام کرتے ہوئے شوہر سے رحمت بی نے کہا ، تبھی ریکھا منجے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی ۔

" کیوں جا رہے ہو ؟ " اس نے پوچھا ۔

ریحانہ کے محمد کی طبیعت درست نہیں ہورہی ہے نا۔ وہ ڈیوی کو دکھا کر لاتے۔"

"ہاں" وہ اٹھ بیٹھا۔

پھیلی ہوئی چاندنی باڑے میں سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ گاؤں کے لوگ سوگئے تھے۔ دوسرے کے محلوں سے گاؤں زیں آرہی تھیں۔ رحمت بی، اس کا شوہر اور ریحانہ باتیں کررہے تھے۔ سفید سر کے بال، سفید داڑھی اور کالے رنگ کی ں کا شوہر بوڑھے بندر سا ریحانہ کو لگ رہا تھا۔ وہ اپنی منمنی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔ بے سر پیر کی باتیں کررہا تھا۔ گاؤں کے ہ کے پاس پہلیاں کی دوگی ملتی ہے۔ بالکل اکسیر علاج، پٹیل کے باڑے کا کبنی پاؤں کی لپک ٹھیک کردیتا ہے۔ گاؤں باہر ا بوڑھا امام، پیش امام بولتے اس کو۔ بھوت پریت کو بھگانے میں ماہر ہے۔ سارا گاؤں اسے مانتا ہے۔ پیٹ کی گڑبڑ پر گاؤں میا پانی پر منتر پھونک کر دیتی ہے۔۔۔"

لیکن محمد کی بیماری سب کی سمجھ سے پرے تھی۔ دو تین تعویذ، تانترک کے تعویذ، شہر کے ڈاکٹروں کا علاج، درگاہ پر منتیں ں سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ جنم سے تیسرے چوتھے دن ہی مرے ہوئے دو بچے اسے یاد آتے ہیں تو وہ محمد کے پاس جا بیٹھی لیاں لیتے وقت محمد روتا نہیں، صرف منھ بناتا، ہونٹ بھینچے رکھتا، دانتوں پر دانت بھینچ کر ای۔۔۔ ای کرتا رہتا۔ بالوں اس کا سر اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں۔۔۔ یہ سب دیکھ کر ریحانہ کا دوا دارو سے بھروسہ اٹھ گیا تھا۔ پچھلے تین چار دنوں ٹھیک طرح سو بھی نہیں سکی۔ محمد کی فکر اسے کھائے جارہی تھی۔

محمد کا باپ اسے گود میں لے کر بیٹھتا اور دیر رات تک رحمت بی کے شوہر سے باتیں کرتا رہتا۔ ریحانہ جب پیچھے پڑجاتی، لو شہر لے جاتا، ڈاکٹر کو دکھاتا۔ یہی سب اس کے دل میں آجا رہا تھا۔

فجر کے وقت رحمت بی نے ریحانہ کو آواز دی۔ بکری کے دودھ کی چائے چولھے پر چڑھائی دونوں نے چائے پی۔ ریحانہ نے ، جالی والی تھیلی میں ٹھونس کر رکھا ہوا پرانا برقعہ نکالا۔ گردن میں برقعے کی ڈوری باندھی۔ محمد کو گود میں لیا۔ میلا کپڑا اسے تالا لگا کر چلنے کے لیے تیار ہوئی۔

ساتھ میں کچھ لینا ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

نہیں، کیا ضرورت ہے؟ پن وہاں ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچتے۔ دوپہر کے پہلے ہی واپس آجائیں گے اور ہاں، کھا کے نہیں جانے " کہتے کہتے رحمت بی نے چپل پہنی، اس کے بچے سوئے ہوئے تھے۔ شوہر نماز ادا کرنے گیا تھا۔ ٹوکری اٹھاکر اس نے ، چھوڑ دیا، دروازہ لگایا اور دونوں چل پڑیں۔

موڑ پر آتے ہی انھیں سانور گاؤں جانے والی بس آتی ہوئی دکھائی دی۔

" دیکھ تیرے کو بولی تھا نا، وہ دیکھ بس آگئی۔" رحمت بی بس کو دیکھتے ہی چہک اٹھی۔ محمد جاگ گیا تھا اور ممیاتی آواز لگا۔

دونوں سانور گاؤں اتریں۔ ہوٹل پر گئیں۔ منھ ہاتھ دھویا۔ چائے پی۔ محمد نے آدھی ساسر چائے پی اور منھ بنایا، دانتوں پر ، بنا آواز ای۔۔۔ ای۔۔۔ کرنے لگا۔ بچی ہوئی چائے ریحانہ نے پی ڈالی۔ منگل کا دن ہونے سے لوگوں کی بھیڑ بڑھ رہی سے الگ ندی نالے مل کر ایک دریا بن جائے، اسی طرح گی، کوچے سے لوگ آکر حضرت کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اسی بھیڑ میں

رحمت اور ریحانہ برقعے کا پردہ اٹھاکر آگے بڑھنے لگیں۔ رحمت بی کی امنگ بھری باتیں ریحانہ کو اب دبی دبی لگ رہی تھیں۔ وہ کی باتوں کا ہاں، ہوں میں جواب دے رہی تھی۔ اس کا سارا دھیان آس پاس چلنے والی بچے والیوں کی اور تھا۔

دور سے مندر کا کلس دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہوئے ریحانہ ممدو کو تھپتھپانے لگی۔ مندر کے سامنے دونوں طرف ناریل پھول، ہلدی، کم کم، پرساد وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ایک دکان کے سامنے دونوں رکیں۔ رحمت بی نے ناریل کا دام پوچھا، پانی دیکھا۔ بڑا سا ناریل اور ہلدی کم کم لیے۔ ریحانہ نے جھٹ سے ممدو کو زمین پر بٹھایا۔ کمرے سے بٹوا نکالا۔ بٹوے میں دوا، ڈور چاپی میں اٹکا ہوا مڑا تڑا دس کا نوٹ تھا۔ اس نے نکال کر دکان دار کو دیا۔ بس کے ٹکٹ پھینک دیے۔ دونوں ایک کونے میں گ برقعے اتارے۔ سمیٹ کر تھیلی میں رکھ دیے۔ چپلیں، برقعے دکان دار سے کہہ کر اسی دکان پر رکھ دیے۔ وہیں پر ناریل ک رحمت بی نکالنے لگی۔ ریحانہ ادھر ادھر دیکھتی کرتی تھی۔ اچانک بول پڑی "۔۔۔ لاؤ۔ میں نکالتی" اور ناریل لے کر وہ جلدی جٹائیں نکالنے لگی۔ تبھی رحمت بی نے کہا۔۔۔ "ارے۔ سب مت نکال، تھوڑا رہنے دے۔"

ریحانہ کے دل میں رحمت بی کے لیے احترام کا جذبہ جاگا۔

بڑے دروازے کی بڑی محراب سے وہ اندر آئیں۔ ہال میں بڑا سا نقارہ بج رہا تھا۔ آرتی شروع تھی۔ مداری کے کھیل بچہ اوپر سے تو لطف اندوز ہوتا ہے مگر دل ہی دل میں گھبراتا بھی ہے۔ ٹھیک ایسے ہی احساس ریحانہ کو ہورہا تھا۔ آرتی کی آوازوں وہ کھو سی گئی۔ ممدو کی جانب دیکھ کر اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ رحمت بی کے ساتھ قدم بڑھانے لگی۔ چاروں طرف دیکھا، کا دھیان ان کی اور تو نہیں ہے۔ دیکھ کر اسے تسلی ہوئی۔ اس کی ہمت بڑھ گئی۔

مندر میں کوئی گھنٹہ بجارہا تھا، کوئی پوجا کررہا تھا، کوئی ماتھا ٹیک رہا تھا تو کوئی پرساد بانٹ رہا تھا۔ دیوی کی بڑی مورتی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر ریحانہ کا گلا بھر آیا۔ اسے ہاتھ بھی تھرتھراتے ہوئے محسوس ہوئے۔

لا۔ ادھر لا۔ دھیمی آواز میں رحمت بی بولی۔

اس نے ممدو کو لے کر دیوی کے سامنے سلایا۔ دونوں نے گھٹنے ٹیک، ہاتھ پھیلاکر، آنکھیں موند کر دعائیں مانگیں۔ پھر ا دونوں ہاتھ چہرے پر گھماتے اور جھٹ سے باہر آئیں۔

"وہاں ناریل پھوڑنے کا!" رحمت بی نے جگہ بتائی اور ممدو کو گود میں لیا۔ پھر وہ ادھر ادھر دیکھتی رہی اور ریحانہ ناریل کو پتھر پر پٹک دیا۔

"ارے ٹھہرو۔" رحمت بی کی اچانک آواز سے ریحانہ گھبرائی۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ کہہ رہی تھی "عورتیں ناریل ن پھوڑتیں!" اس نے ایک آدمی سے کہا۔ "ماما۔ ناریل پھوڑ دیتے کیا؟"

اس آدمی نے ناریل پھوڑ دیا۔ رحمت بی نے جھٹ سے ناریل کا پانی، انگلیوں کے پوروں سے ممدو کے ہونٹوں کو ل اس کے ہلتے ہونٹ دیکھ کر ریحانہ تھرتھرائی، خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ دونوں نے پھر دعا کی۔ دھیمی آواز میں ریحانہ بول پڑی۔ "میر بچے کو اچھا رکھنا۔۔۔ طبیعت سدھری تو میں۔۔۔" الفاظ رک گئے۔ اس کی آنکھوں میں مندر سما گیا۔

وہ دونوں باہر آئیں۔ رحمت بی نے ناریل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑے کو ناخن سے کرید کر ممدو کو کھلا "تو جاکر ناریل کے ٹکڑے چار لوگوں میں بانٹ کر آجا۔" رحمت بی نے کہا

اکیلے جانے میں ریحانہ گھبرائی۔ مگر جیسے جیسے ناریل بانٹنے لگی، اسے خوشی کا احساس ہوا۔ وہ امنگ سے بھر اٹھی۔ دوڑ کونے میں مندر کا سیوک بیٹھا تھا۔ وہ چڑھاوے کی رسید بنا رہا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک الماری تھی۔ وہاں جاکر ریحانہ نے اس سے کہا "ماما۔ پرساد" اور ایک ٹکڑا اس کی جانب بڑھایا۔ ہاں، کہتے ہوئے سیوک نے بنا اوپر دیکھے اسے منہ میں ڈال دیا۔ ریحانہ خوش ہوئی۔

"چلو۔" اس نے رحمت بی سے کہا۔ دونوں ناریل کھاتے کھاتے باہر آئیں۔

"عورتوں نے ناریل نہیں پھوڑنا۔ ہے نا؟" ریحانہ نے پوچھا۔

"نہیں پھوڑنا؛ اور تو تو پگلی کی طرح ناریل پھوڑ رہی تھی۔"

"عورتوں نے ناریل پھوڑا تو دعا قبول نہیں ہوتی کیا؟"

"کوئی بھی نہیں پھوڑتا۔ وہ مرد یا بچوں کو پھوڑنا پڑتا ہے۔" دکان پر برقعہ چڑھاتے رحمت بی سمجھا رہی تھی۔

ریحانہ کو اسی وقت اسی لمحے کی یاد آئی۔۔۔ اس نے جلدی سے ناریل پٹکا تھا۔ پھر رحمت بی کے کہنے پر ایک آدمی کو دیا تھا۔۔۔ ایک جھٹکے سے اس ناریل میں آئی ہوئی ہلکی سی دراڑ ریحانہ کو یاد آئی۔۔۔ گود میں مدد کو وہ تھپتھپانے لگی۔

اب اس کا دھیان رحمت بی کی باتوں سے اور مندر سے ہٹ گیا۔۔۔ اور اسے صرف دکھائی دینے لگی ناریل کی وہ ہلکی سی دراڑ۔۔۔!!

○●○

(سلسلہ صفحہ ۱۷ سے)

——— لیکن فائدہ کچھ نہ حاصل ہوا۔ احمد بخش خاں نے مٹکاف سے اس مسئلے پر گفتگو ہی نہیں کی۔ غالب نے طے کیا کہ اب وہ اس معاملے میں اپنے ہی بوتے پر کارروائی کریں گے۔ انھوں نے سنا تھا کہ گورنر جنرل مغرب کی طرف آرہے ہیں اور یہ کہ مٹکاف ان کی ملاقات کے لیے کان پور جائیں گے۔ غالب کا ارادہ تھا کہ "کان پور جاؤں اور وہاں سے ان کے ہم رکاب واپس لوٹوں، اس طرح سے خود کو سر چارلس مٹکاف سے متعارف کرواؤں، انھیں اپنی مصیبت، بے کسی اور قرض داری کی شرم ناک صورتِ حال سمجھاؤں اور انصاف پاؤں۔" غالب فیروز پور سے سیدھے کان پور روانہ ہوئے لیکن بد قسمتی سے منزلِ مقصود پر پہنچ کر بیمار پڑگئے اور اس طرح سے انھوں نے مٹکاف سے ملاقات یا پھر گورنر جنرل کے حضور میں عرضی پیش کرنے کا یہ عمدہ موقع کھودیا۔ لیکن اب لڑائی کا آغاز ہوچکا تھا اور انھوں نے عزم کرلیا کہ اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیے کلکتے ہی جائیں گے۔

معاملہ کافی اہم تھا، اگر ان کا دعویٰ تسلیم کرلیا جاتا ہے تو وہ اپنے جمع شدہ سارے قرضے ادا کر پائیں گے اور خرچ کرنے کے لیے ان کے پاس زیادہ روپے پیسے بھی رہا کریں گے۔ انھیں اپنے دعوے کی معقولیت پر ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا۔ دلی کے باثر انگریز احباب مدد تو کرسکتے ہیں لیکن آخری فیصلہ تو کلکتے ہی میں ہوتا ہے۔ ان کا عزمِ کلکتہ ان کی عمر بھر کی سفر کی آرزو سے بھی بہ خوبی توافق رکھتا تھا۔ تبدیلیِ آب و ہوا اور دلی اور اس کے تمام مسائل سے چھٹکارا بھی بے شک وجہ ترغیب رہے ہوں گے۔ سفر اخراجات کا باعث تو ہوگا لیکن اس پر پیسہ لگانے کے لیے لوگ اس امید میں مل ہی جائیں گے کہ جیسے ہی غالب مقدمہ جیتتے ہیں یہ قرضہ اور پہلے لیے ہوئے قرضے بھی یک مشت ادا ہوجائیں گے۔ غالب کلکتے کے لیے ۱۸۲۶ء کے آخر یا ۱۸۲۷ء کے شروع کی کسی تاریخ کو روانہ ہوئے۔

○●○

سید خالد قادری

مطالعہ

جامعہ رسالہ

(جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ ، خصوصی اشاعت سرسید کی معنویت)

سرسید کی یاد میں شائع کیا گیا جامعہ کا یہ خصوصی شمارہ اس کے مرتبین پروفیسر شمیم حنفی اور سہیل احمد فاروقی کی فہم و ا اور ہنرمندی کا وافر ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ۱۹۹۲ء کے فکرونظر کے سرسید نمبر کے بعد جس کے مدیر شہریار تھے غالباً اب ۱۹۹۸ء : سرسید کی خدمات اور افکار پر ایسی جامع دستاویز مرتب کی گئی ہے مدیرانِ جامعہ اس کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

"جامعہ" کا یہ خصوصی شمارہ بہ عنوان "سرسید کی نئی معنویت" ۱۹ ویں صدی کی اس تاریخ ساز شخصیت کو حال اور مستقبل سے جوڑ کر دیکھنے کی ایک اہم اور قابلِ قدر کوشش کہی جاسکتی ہے۔ اداریہ میں اس خصوصی نمبر کی اشاعت کے موقع و محل کا ؟ اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

"ہماری اجتماعی زندگی پر سرسید کے اثرات کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کے افکار کا اور خدمات کا جائزہ بدلتی ہوئی صورتِ حا کی روشنی میں بھی کیا جائے۔ اس وقت ہندستانی معاشرہ جن حالات سے دوچار ہے اس پر نظر ڈالی جائے گی تو یہ احساس ہوتا ہے سرسید کے مطالعے کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔"

ابتداء میں سرسید میموریل سوسائٹی کے سلسلے میں پروفیسر آلِ احمد سرور کی تجویز شائع کی گئی ہے جو اتنی عملی اور دیانہ دارانہ ہے کہ اس کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کی صورت میں سرسید کے اس تہذیبی اور تعلیمی مشن کی بازیافت ممکن معلوم ہو۔ لگتی ہے جو آج بھی بامعنی ہونے کے باوجود نظروں سے تقریباً اوجھل ہوچکا ہے۔ اس کے بعد وہ مضامین آتے ہیں جن میں سر کے حالات زندگی کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ یہاں ان کی والدہ عزیز النساء بیگم کے تذکرہ میں مولوی عبدالحق کی روشن خیالی ا دور اندیشی کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہاں درج کیے گئے تعلیمِ نسواں سے متعلق ان کے خیالات قابلِ ستائش ہیں "جو لوگ تعلیمِ نسواں کے مخالف ہیں وہ اگر ذرا غور سے دیکھیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ ان کے بہت سے خیالات، عادات، توہمات و تعصبات جھوٹ موٹ کے ڈر اور امیدیں جو ان کے دلوں میں پتھر کی لکیر ہوگئی ہیں انھوں نے اپنی ماؤں سے اخذ کی ہیں۔ اب اگرچہ وہ ا میں سے بہت سے خیالات کو غلط و فضول تصور کرتے ہیں لیکن افسوس دل سے نہیں مٹاسکتے۔۔۔ جو لوگ ملک کی ترقی کے خوا ہیں انھیں بلکہ جو لوگ صرف اپنی اولاد اور خاندان کی بہبودی چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ سب سے پہلے تعلیمِ نسواں کی طرف ت دیں کیوں کہ جب تک ہمارے یہاں کی عورتیں پڑھی لکھی اور قابل نہ ہوں گی ہماری اولاد کے دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑسکتا۔"

مولوی عبدالحق کے اس نقطۂ نظر کی تائید ان کی ایک قدیم تر تحریر (مطبوعہ رسالہ، معلمِ نسواں، جلد ۱۰ سال ۱۸۹۹ء) سے ہوتی ہے۔ جب سرسید حیات تھے اور عبدالحق ان کے مدرسہ، علی گڑھ کے طالبِ علم ہوا کرتے تھے)۔ یہاں یہ امر قابلِ غور ہے

د سرپرست اپنی تمام تر دور اندیشی اور روشن خیالی کے باوجود اپنے دوسرے ہم عصروں حالی اور شبلی کی طرح تعلیمِ نسواں کو ایسا
ضوع نہ خیال کرتے تھے جس پر فوری توجہ دی جائے۔ کاش ہمارے رہنماؤں کا ذہن پدرسرانہ سماج کے پرے جاسکتا اور مرد و زن
نوں کی تعلیم کو یکساں اہمیت حاصل ہوسکتی۔

ہر چند کے سرسید کی قومی خدمات یا ان کا نظریہ علم ایسے موضوعات ہیں جن پر نہ صرف یہ کہ اب تک کافی لکھا جاچکا ہے
رکسی نئی بات کی گنجائش مشکل سے نکلتی ہے اور یہ کہ آج ۲۱ ویں صدی تک آتے آتے سیاسی، سماجی اور علمی میدان میں انقلابی
ریلیاں آچکی ہیں پھر بھی سرسید کے اس نقطہ نظر سے کہ برصغیر کے مسلمانوں کا ایک زندہ اور متحرک معاشرہ کا حصہ بننے کے لیے
نی سے رشتہ توڑے بغیر حال اور مستقبل سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے زیادہ تر لوگ متفق ہوں گے۔ گوکہ اس نمبر میں شائع کیے
ے بیش تر مضامین سرسید کی حیات اور نظریات پر مزید روشنی ڈالنے کا کام عمدگی سے انجام دیتے ہیں مگر اشفاق محمد خاں کا تحریر کردہ
نمون "سرسید کی پیش بینی" اس سلسلے کا کلیدی مضمون قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان مسائل پر ایک پر مغز اور مدلل بحث کے بعد
منف نے یہ سوال کھلا چھوڑ دیا ہے کہ برصغیر کے مصلحین نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے مذہبی اصلاح کی ضرورت پر ہی
ں زور دیا اور اپنے مذہب کی فضیلت و فوقیت ثابت کرنے کی دھن میں ہی ساری زندگی کیوں صرف کردی۔ ان میں سے کچھ اور
ملحین نے سرسید کا منتخب کیا راستہ کیوں نہ اپنایا۔ ان کی یہ رائے ہم سبھی کے لیے قابلِ غور ہے کہ اگر ہمارے دانش ور اور
لمائے کرام آج بھی سر جوڑ کر بیٹھیں اور پہلے اپنی ایک ہزار سالہ اصلاحی تحریکات کی ناکامیوں کا احتساب کریں اور پھر سرسید کے
ریات پر از سرِ نو غور کریں تو ممکن ہے کہ ہندستان میں رہنے والی پس ماندہ اور نیم خواندہ اقلیت کے لیے صحت مندی کے اصول
ر ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی کوئی صورت شکل سکے۔ اس نمبر میں ایک دو ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو اپنے عنوان کی مناسبت
ے نامکمل اور تشنہ سے لگتے ہیں جیسے "سید احمد اکیسویں صدی میں" یا "ستردیں صدی کے سرسید اور اکیسویں صدی کی اردو" وغیرہ۔
.. مگر اسی کے ساتھ اس میں "سرسید کے تعلیمی تحفظات" (صفدر امام قادری) جیسے اور معلوماتی مضامین بھی ہیں جو اس موضوع پر
ارئین کو غور و خوض اور مذاکرہ کی کھلی دعوت دیتے ہیں۔

کتاب میں شائع مضامین سے قطع نظر ایک سوال اور بھی ہے جو اس خصوصی نمبر کے مطالعے کے دوران بار بار ذہن میں
ابھرتا رہا ہے وہ یہ کہ کیا انگریزی اقتدار کے اختتام کے پچاس سال بعد آج بھی Colonial discourse گرفت ہمارے ذہنوں پر
تی مضبوط ہے کہ ہم سید احمد کو مولوی سید احمد نہیں کہہ سکتے؟ کیا ان کے نام میں "سر" کا اضافہ ان کی شخصیت کی اہمیت اور وقار
کے لیے آج بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو انہی حالات میں اقبال کے ساتھ ہمارا رویہ مختلف کیوں ہے؟ کیا اس
لیے کہ اقبال نے مشرق کے بہ مقابل مغرب کو رد کردیا تھا؟ سید احمد کے ساتھ "سر" کیا اس لیے ہمیشہ کے لیے غیر شعوری طور پر یا
پر دانستہ اور احتیاطاً جوڑ دیا گیا ہے کہ وہ کئی معنوں میں مغرب کے حامی اور اس کی برتری کے معترف تھے؟ ... اور کیا مستقبل
قریب میں کبھی اس رویہ میں تبدیلی کے امکانات ہیں؟

بہ حیثیت مجموعی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ۱۹ ویں صدی کی اس اہم اور فعال شخصیت کے بارے میں جامعہ کا یہ خصوصی نمبر
مطالعہ سید احمد کے ضمن میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ کتاب کا گٹ اپ اور طباعت عمدہ ہے۔

غلام جیلانی

فریب زار

(قسط : ۸)

(۳۱)

اگلے دو دن رما نے شاپنگ میں صرف کیے۔ نیل کمل کی شادی کے لیے کپڑے خریدے۔ زیورات کے آرڈر دیے اور کچھ چھوٹے موٹے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ چوتھی صبح اسوانی سے ملنے اس کے آفس چلی گئی۔ نیل کمل کی شادی کے تعلق سے ہونے والے اخراجات اور دوسرے انتظامات کے بارے میں باتیں کرنی تھیں۔۔۔۔

"رما دیوی؛ آپ نے خود آنے کی تکلیف کیوں کی؟۔۔۔ مجھے اطلاع کردیتیں، میں خود آجاتا آپ سے ملنے۔۔۔!" اسوانی بولا

"نہیں اسوانی صاحب۔۔۔ میں آج کل زیادہ تر گھر سے باہر ہی پھر رہی ہوں، مصروف رکھتی ہوں اپنے آپ کو۔۔۔ اس لیے خود چلی آئی۔۔۔ اس کے علاوہ آپ سے ایک درخواست بھی کرنی تھی۔۔۔"

اور پھر اسوانی کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بولی۔۔۔ "چھتری والی کوٹھی کی جگہ کامپلکس کے بننے تک سال دو سال تو لگ ہی جائیں گے۔۔۔ بس اتنا کیجیے کہ کوٹھی کے پرانے ملازم بندو کو اس عرصے میں وہیں رہنے دیا جائے۔۔۔ کسی کونے، کھدرے میں۔

"اچھی بات ہے۔ مگر آپ اسے یہاں حیدرآباد کیوں نہیں بلا لیتیں؟۔۔ آپ کا نوکروں کا پرابلم بھی سالو ہوجائے گا!"

"بلالوں گی،۔۔۔ مگر ابھی نہیں۔"۔۔۔ اسوانی تعجب سے دیکھنے لگا تو بولی۔۔۔ "ہوسکتا ہے، وہاں کے پتے پر ایک خط آئے۔ اور جب آئے تو بندو وہاں ہو۔"

اسوانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اور نہ اس نے کچھ اور پوچھنا مناسب سمجھا۔

اسوانی کے آفس سے روانہ ہونے لگی تو یکایک رما کو خیال آیا کہ پروفیسر راجن کے کالج جاکر اس سے مل لے، ورنہ وہ پھر فون کرے گا، یا گھر آجائے گا۔ رما نے اپنی کار یونیورسٹی روڈ کی طرف موڑ دی۔ شہر سے دور اس نئی یونیورسٹی کا کیمپس وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا، جس میں لڑکوں کے ہاسٹل کے علاوہ ٹیچرز کے کوارٹرز بھی تھے۔

یونیورسٹی پہنچ کر رما نے راجن کا کمرا تلاش کیا۔ مگر راجن کمرے میں نہیں ملا۔ چپراسی نے بتایا کہ وہ آج کالج نہیں آئے۔ شاید ان کی بیوی کی طبیعت پھر بگڑ گئی ہے۔

رما دل برداشتہ ہوکر کمرے سے نکل آئی۔ راستے بھر وہ اس ملاقات کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرتی آئی تھی۔ اتنے میں چپراسی نے کہا۔۔۔ "آپ چاہیں تو ان سے گھر پر مل لیں۔ وہ پاس ہی رہتے ہیں۔"

رما شش و پنج میں پڑ گئی۔ دلی میں کالج کے زمانے میں وہ اپنے کام سے پروفیسر کے گھر پر بھی ملتی تھی۔ مگر اب بات اور تھی۔ وہ سوچنے لگی اور پھر وہاں انیتا بھی ہوگی ! مگر اس لمحے یک بارگی اس کی انا اس کے پس و پیش پر حاوی ہوگئی۔۔ وہی انا جو موقع پڑنے پر اس کو بغاوت پر بھی آمادہ کردیتی تھی۔۔۔ اس نے انیتا یا کسی اور کی کبھی پرواہ کی تھی ؟۔۔۔

چپراسی اسے پروفیسر کے کوارٹر لے گیا۔

راجن نے رما کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ رما اس سے ملنے اس کے گھر آجائے گی ! ۔۔۔ ویسے اس وقت وہ کسی سے ملنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ آنکھیں خمار آلود ہورہی تھیں۔۔۔ سر کے لمبے لمبے بال بکھر کر کانوں اور آنکھوں پر آگرے تھے اور کمرے میں آتے وقت اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔۔۔ رما اسے تعجب سے دیکھنے لگی۔

"بہت اچھا کیا رما جو چلی آئیں۔" پروفیسر نے سنبھل کر کہا "۔۔۔ ورنہ شائد میں آجاتا، تمہارے گھر۔۔۔"

شراب کی بو اتنی دور سے بھی رما نے محسوس کرلی۔ حیرت سے بولی۔۔۔ "مگر آپ کی بیوی کی طبیعت اتنی خراب ہورہی ہے۔۔۔ !"

"انیتا کی بات کیوں کرتی ہو ؟۔۔۔ اسے کچھ نہیں ہوا۔ زندہ ہے ابھی تک ۔۔۔ نفرت میں ڈوبی پروفیسر کی آواز نے رما کو چونکا دیا۔

"۔۔۔ شائد میں غلط وقت پر آئی ہوں۔" رما کے منہ سے نکلا۔

"نہیں۔۔۔ تم ٹھیک وقت پر آئی ہو۔ تمہیں میری حالت دیکھ کر تعجب ہورہا ہے۔۔۔ مگر میں کب سے اسی عذاب میں جی رہا ہوں۔ انیتا نے میری زندگی جہنم بنا رکھی ہے۔۔۔ سات سال ! تم نہیں جانتیں امریکہ میں یہ سات سال میں نے انیتا کے ساتھ کس طرح گزارے ہیں ; تمہیں یہی بتانا چاہتا تھا۔۔۔ رما، وہ مجھ سے انتقام لینا چاہتی تھی۔۔۔" ۔۔۔ پروفیسر کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی خمار آلود آنکھوں میں عجیب چمک آگئی تھی۔

"انتقام ؟ "۔۔۔ رما نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اس لیے کہ وہ جانتی تھی، شروع سے تم میری آئیڈیل رہیں۔ اور۔۔۔ وہ کبھی تمہاری جگہ نہیں لے سکی ۔۔۔ کبھی بھی۔"

یکایک اندر کے دروازے سے ملازمہ داخل ہوئی۔ وہ پروفیسر سے کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر اس کو دیکھتے ہی پروفیسر نے غصے سے کہا۔۔۔ "چلی جاؤ یہاں سے۔۔۔ ڈونٹ ڈسٹرب می۔"

خادمہ خوف زدہ سی ہوکر فوراً واپس چلی گئی۔

چند سکنڈ کے لیے کمرے کی فضا میں ٹینشن بھری خاموشی کسی چیخ کی گونج کی طرح اعصاب پر سوار ہونے لگی۔ یک لخت پروفیسر نے پہلو بدلا اور اٹھ کر رما کے سامنے آ کھڑا ہوا۔۔۔

"رما۔ دل تو بیٹھا ہی ؟ ۔۔۔"

الجھے ہوئے سانسوں میں پروفیسر نے یہ الفاظ تیزی سے ایسے کہہ دیا جیسے وہ کہنا تو نہ چاہتے ہوں مگر کب سے اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کے یہ الفاظ لاوے کی طرح ہوکر باہر آجاتے !

"وہاٹ۔۔۔؟" رما کے منہ سے نکلا۔ اس کے حق دق چہرے سے لگ رہا تھا، جو اس نے سنا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"ہاں رما۔۔۔ کب سے یہ الفاظ میری زبان پر آنے کے لیے تڑپتے رہے۔ مگر میں کہہ نہ سکا۔ روزِ اول سے تم میرے دل و دماغ پر چھائی رہیں۔۔۔ اور یہ بات ان دنوں کالج میں سب ہی جان چکے تھے۔ کیا تم نہیں جانتی تھیں؟"

پروفیسر رک کر رما کو دیکھنے لگا جو اب بھی خالی خالی نظروں سے اسے تکے جارہی تھی اور جس کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہوگئی تھی۔

"۔۔۔ مگر میں تمھیں کوئی دوش نہیں دیتا۔ کیوں کہ ان ہی دنوں آنند تمھاری زندگی میں داخل ہوا اور سیلاب کی طرح تمھارے دل و دماغ، ہوش و حواس، سبھی کچھ بہا لے گیا اور تم بہتی چلی گئیں۔۔۔ میری نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

رما کے اوسان جمع ہوئے تو اسے یک لخت شدید بیزارگی اور وحشت کا احساس ہوا۔ اس کے ذہن میں آیا کہ اس دم گھونٹنے والی فضا سے اسے فوراً چلا جانا چاہیے۔

"نہیں۔ رما۔۔۔ تم ابھی نہیں جاسکتیں۔ میری بات ختم نہیں ہوئی ہے، سن لو گی تو جواب دینے میں آسانی ہوگی۔۔"

پروفیسر کے لہجے میں وحشیانہ کرختگی کی جھلک محسوس کر کے رما چونک گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے پروفیسر نے اپنا لہجہ نرم کرلیا۔۔ "مجھ سے اتنی اجنبیت مت برتو رما۔۔۔ مجھے ہمدردی کی ضرورت ہے۔ تم نہیں جانتیں انیتا ایک وائرس کی طرح میری زندگی سے چمٹ رہی۔۔۔ میرے تعاقب میں امریکہ بھی چلی آئی اور جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ میرے دل میں کبھی تمھاری جگہ نہیں پاسکے گی، تو انتقام کی خاطر خود کو شراب میں غرق کرلیا۔ الکوہلک بن گئی۔ اور میری زندگی اجیرن کردی۔ امریکہ میں رہنا مشکل کردیا۔۔۔ مگر اب وہ چند دن کی مہمان ہے۔ اس کا جگر اور پھیپھڑے بالکل ناکارہ ہوچکے ہیں۔۔۔" یہ کہتے کہتے پروفیسر پھر رما کے سامنے آکھڑا ہوا۔۔۔

"۔۔۔ بتاؤ رما۔ کیا تمھارے دل میں میرے لیے کوئی ہمدردی نہیں؟۔۔۔ تم چاہو تو میری زندگی کا کھنڈر پھر سے آباد ہوجائے۔ اب جب کہ آنند بھی نہیں رہا۔۔۔"

رما یک لخت اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "اسٹاپ دس نان سنس۔ ہاؤ ڈیر یو۔۔۔؟" سخت غصے کی حالت میں اس کا سانس پھول گیا تھا، جس میں الجھ کر اس کی کانپتی ہوئی آواز ٹوٹ کر رہ گئی۔ جھک کر صوفے پر سے اپنا پرس اٹھانے لگی تو پروفیسر ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

"ڈونٹ گٹ اپ سٹ، رما۔۔۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" پروفیسر کی آنکھوں میں عجیب چمک آگئی تھی۔

رما ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر جہاں کی تہاں رک گئی۔ پھر خود کو سنبھال کر بولی۔۔۔ "یو آر مسٹیکن، پروفیسر۔ آنند نہیں رہا۔۔۔ مگر میں تنہا نہیں ہوئی۔"

"وہاٹ ڈو یو مین؟۔۔۔ تنہا نہیں ہوئی؟" جذبات کی کشاکش میں ڈوب کر پروفیسر کی آواز لڑکھڑا کر ڈراونی لگ رہی تھی۔

کوئی جواب دینے کی بجائے رما نے وہاں سے چلے جانے کے لیے قدم بڑھایا، تو پروفیسر تیزی سے اس کے سامنے آگیا۔۔۔

"نہیں، تم ابھی نہیں جاسکتیں۔۔۔ ورنہ پھر وقت نہیں ملے گا۔"

"کاہے کا وقت؟۔۔۔" رما نے چونک کر دیکھا، پروفیسر کی آواز کی طرح اس کا چہرہ بھی ڈراونا لگ رہا تھا۔

"آپ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔۔۔ مجھے جانے دیجیے۔" رما نے جانے کے لیے پھر قدم بڑھایا تو پروفیسر نے دونوں ہاتھ اس

کے کاندھوں پر رکھ دیے اور پوری قوت سے صوفے پر دھکیلتے ہوئے بولا۔۔۔ "ہاں۔ میں پاگل ہوگیا ہوں۔۔۔ اور تم ہو اس کی ذمہ دار۔"

رما خوف زدہ ہوکر پروفیسر کو دیکھنے لگی۔ جس کے سر پر شکست خوردہ جذبات کے انتقام کا وحشی جنون سوار ہوگیا تھا۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔۔۔ اور اکھڑی سانسوں میں جانے کیا کیا بے ربط الفاظ اس کے منھ سے نکل رہے تھے! اس نے جھک کر رما کو اپنی دونوں بانہوں میں جکڑ کر اوپر اٹھالیا۔ اس کے ہاتھوں میں بلا کی طاقت آگئی تھی اور اس کی فولادی گرفت میں رما کا سانس رکنے لگا۔ رما اس نے چیخ کر پروفیسر کو پیچھے دھکیل دیا۔

پروفیسر کے لڑکھڑاتے قدم ایک لمحے کے لیے اپنا توازن کھو بیٹھے۔ کسی بپھرے ہوئے زخمی جانور کی غر غراہٹ جیسی آواز اس کے حلق سے نکلی۔۔۔ مگر فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال کر پلٹا تو اس کے مکروہ چہرے پر شیطانی قوتیں ناچ رہی تھیں۔۔۔

اسی لمحے رما کی نظر انیتا پر پڑی جو جانے کب اپنے بستر سے اٹھ آئی تھی اور دروازے میں کھڑی چپ چاپ اسے اور پروفیسر کو دیکھ رہی تھی۔ رما کے قدم جہاں کے تہاں رک گئے۔ انیتا کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا سارا جسم بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ بیماری سے چہرہ زرد پڑ کر بری طرح پھول گیا تھا۔ جس میں دھنس کر آنکھیں دو شگافوں کی مانند لگ رہی تھیں۔ مہین نائٹ گون میں سوکھے سوکھے ہاتھ پیر کسی مرجھائی ہوئی جھاڑی کی ٹہنیاں لگ رہے تھے جس کے پتے جھڑ چکے ہوں اور۔۔۔ وہ خود بھی ہوا کے ایک تیز جھکڑ کی مہمان ہو۔

انیتا کے حلق سے ایک عجیب دل خراش آواز بلند ہوئی۔ جو نہ چیخ تھی اور نہ قہقہہ! کمرے کی ہر شئے نے سہم کر دم سادھ لیا۔۔۔ انیتا پستول تھامے کمرے کے وسط میں آگئی۔ اور اب جیسے پہلی بار صورتِ حال کی نزاکت پروفیسر راجن کی سمجھ میں آئی۔ وہ سراسیمگی کی حالت میں انیتا کی طرف بڑھنا چاہتا تھا مگر انیتا کی خوف ناک آواز نے اسے وہیں روک دیا۔۔۔۔

"نہیں۔۔۔ تجھے میں بعد میں ماروں گی۔۔۔ پہلے مجھے اس چڑیل کا حساب چکانا ہے۔ جس کے ناپاک سائے نے میری ساری زندگی تباہ کرڈالی۔۔۔" انیتا کے ہاتھوں میں پستول بری طرح لرز رہا تھا۔۔۔ "اور اب یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔۔۔ میں تم دونوں کو بھون کر رکھ دوں گی۔۔۔"

اتنی دیر میں انیتا تھک کر ہانپنے لگی تھی۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ منع کرنے کے باوجود پروفیسر بڑھ کر اس کے پاس آگیا تھا۔ یکایک چونک کر اس نے پستول اونچا کیا اور کانپتی انگلیوں سے لبلبی دبادی۔۔۔ کِلک۔۔۔ کِلک۔ بھی ہوئی۔ مگر گولی نہیں چلی۔۔۔ کِلک۔۔۔ کِلک ہوتی رہی۔

پروفیسر نے بڑھ کر اس کے لرزتے ہاتھوں سے پستول چھین لیا۔

"یو ڈرٹی۔۔۔ تھرڈ ریٹ چیٹ!" ۔۔۔ اور اپنے ہاتھ چھڑا کر انیتا نے ایک زور کا طمانچہ پروفیسر کے منھ پر جڑ دیا۔۔۔ مگر اس طمانچے نے اس کے جسم کی ساری رہی سہی طاقت جیسے نچوڑ کر رکھ دی۔ اس کی کمزور ٹانگیں جواب دینے لگیں اور وہ وہیں فرش پر ڈھیر ہوکر زور زور سے رونے لگی۔۔۔ سوکھی جھاڑی کی خشک ٹہنیاں دیر تک کپکپاتی رہیں۔

کمرے کے باہر لان میں بارش کے اترتے زور سے کھلی ہوا کی سرگوشی اور ٹھنڈی ہوا کی لہریں [illegible]

بہت گہرے کنویں میں سے آرہی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ آوازیں قریب ہوتی محسوس ہوئیں تو ذہن بھی جاگتا چلا گیا۔۔۔ کروٹ لے کر دیکھا تو کھڑکی کے باہر لان پر، جہاں بلبلیں لڑ رہی تھیں، ناریل اور سرو کے سائے لمبے ہو چلے تھے اور پھر ذہن پر چھائی ہوئی دھند یک بیک ہٹ گئی۔ اب صبح نہیں، شام ہو رہی تھی۔

اور پھر وہیں بستر پر لیٹے لیٹے اس دن کی ایک ایک بات یاد آتی گئی۔ پروفیسر کا گھر۔۔۔ انیتا۔۔۔ وہاں سے نکل کر وہ اپنے گھر کیسے پہنچی، کار کس طرح چلائی!۔۔۔ اس کا اب بھی کچھ ہوش نہیں تھا۔۔۔ بس اتنا یاد آیا کہ جب گھر پہنچی تو اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کی خادمہ دنگ رہ گئی تھی۔۔۔ اور پھر کافی کی ایک پیالی کے ساتھ نیند کی دو گولیاں لے کر وہ سیدھی بستر پر آن پڑی تھی۔

رما ان لڑکیوں میں نہیں تھی جو ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جائیں۔ اپنی فہم و فراست اور خود اعتمادی کے بل بوتے پر اس نے زندگی کی منزلیں طے کی تھیں۔ لوگوں کے غیر متوقع رویے کو ان کی جبلی کمزوری پر محمول کر کے، انھیں معاف کر دینے کی عادت اس نے سیکھ لی تھی۔ مگر ادھر پچھلے چند دنوں اسے یکے بعد دیگرے جن ذہنی تناؤں سے گزرنا پڑا، اس نے اس کے اعصاب کو شل کر کے رکھ دیا تھا۔ جو بھروسہ اسے اپنی ذات پر تھا، وہ طلسم باطل کی طرح تحلیل ہوا جا رہا تھا اور پہلی بار اسے لگ رہا تھا وہ کتنی بے بس اور نا سمجھ ہے!

یہ زندگی کے آدرشوں کی باتیں، اعلیٰ قدروں پر یقین کے دعوے، یہ تہذیب و اخلاق کے پند و نصائح۔۔۔ سب بے معنی ہیں کھوکھلے ہیں۔۔۔ انسانی جبلت، اس کی پنہاں خواہشات، اس کی آرزوئیں، اسے کتنا مجبور اور کمزور بنا دیتی ہیں!۔۔۔ سب شکست و ریخت ہو کر رہ جاتا ہے۔ دکھ۔۔۔ صرف دکھ رہ جاتا ہے، جس سے نجات کی تلاش انسان کو اور دکھی بنا دیتی ہے۔ کون ہے سکھی؟۔۔۔ کہاں ہے مسرت؟ کسے ملی ہے وہ منزل جہاں روحانی تسکین نصیب ہو؟۔۔۔

جھوٹ۔۔۔ سب جھوٹ ہے۔۔۔ فریب ہے!۔۔۔ صرف دکھ ہے سچائی۔ اور ہم سب انسان ہیں، دیوتا نہیں۔

اسی رات اپنے ذہنی انتشار کے اس عالم میں رما نے پھر ایک بار قلم ہاتھ میں لیا اور وہ کاغذات نکالے جو دلی سے ساتھ لائی تھی۔ ناصر کی داستان نے جو ہیجان رما کے ذہن میں کھڑا کر دیا تھا، اور جس کے زیرِ اثر غیر شعوری طور پر اس سے ایک ناول کی شروعات ہو گئی تھی۔۔۔ اس رات اسی کو آگے لکھتی چلی گئی۔۔۔۔

اور پھر ایک بار ناصر سے ملنے کی خواہش نے اسے بے چین کر دیا۔ اس کے بغیر وہ اپنے ناول کو اختتام تک کیسے پہنچائے گی!

(۴۴)

تیسرے دن انیتا نے اسپتال میں دم توڑ دیا۔ اور اس کی خبر سب سے پہلے آرتی نے رما کو دی۔ وہ اسپتال میں انیتا سے ساری تفصیل سن چکی تھی۔ اس دن پروفیسر راجن اور رما کے درمیان جو کچھ ہوا تھا اسے انیتا کے بیان اور اپنی حاشیہ آرائی کے ساتھ آرتی نے لوگوں کے کانوں تک پہنچانے میں دیر نہیں کی تھی۔ رما کے اجلے امیج کو داغ دار کر دینے کا ایسا اچھا موقع مل جائے گا، اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کہانی کو ہر مرتبہ ایک نیا موڑ دیتی گئی۔۔۔۔

منوج رما سے ساری تفصیل سن چکا تھا، انیتا کی موت کی خبر بھی اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھی، پھر بھی، ٹیلی فون پر آرتی کی آواز میں چھپے ہوئے طنز کے نشتر نے اس کے سکون کو مجروح ضرور کر دیا۔ اس کا جی چاہا کہ آرتی کو بچھو کی طرح کوئی گندہ گالی دے، مگر پھر شاید رما کے خیال سے، اس نے فون خاموشی سے رکھ دیا۔

لی نا کی آنکھیں منوج پر گڑی تھیں۔۔۔ "کتنی برائی بھری ہے اس دنیا میں!" کہتے ہوئے منوج اٹھ کھڑا ہوا اور میز پر سے آدھا لکھا ہوا کاغذ اٹھا کر توڑ مروڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔۔۔ "لی نا۔ میں جارہا ہوں۔ یہ آرٹیکل کل کم پلیٹ کر کے تمھیں دوں گا۔ آج نہیں لکھ سکتا۔"

لی نا حیران ہوکر دیکھنے لگی۔۔۔ "کیا بات ہوگئی سر۔۔۔؟"

منوج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے میز پر اپنا لائٹر تلاش کرتا رہا جو مل نہیں رہا تھا۔ لی نا نے پھر پوچھا "آپ کو کہیں جانا ہے؟"

منوج نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ لائٹر مل گیا تھا، اسے جیب میں ڈالتے ڈالتے رک کر لی نا سے بولا۔۔۔ "سنو لی نا۔ تم بھی اپنا کام بند کرو۔۔۔ مجھے کہیں جانا نہیں ہے۔ مگر اب کچھ نہیں لکھ سکتا۔ چلو۔۔۔ تمھارے گھر چلتے ہیں۔۔۔ تم پرسوں سے کہہ رہی تھیں نا؟۔۔۔ تمھاری ممی سے بھی مل لوں گا۔"

لی نا حیرت میں ڈوبی سنتی رہی۔۔۔ پھر جب منوج کی بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آئی تو خوشی سے پاگل ہو اٹھی۔ وفور جذبات میں کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر الفاظ منہ سے نہ نکل سکے۔

چھوٹے سے کاٹیج نما گھر کو لی نا اور اس کی ممی نے سلیقے سے رکھ چھوڑا تھا۔ بھاری جسم کی ادھیڑ عمر ممی نے منوج کو دیکھا تو خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جلدی جلدی چائے بنا کر لائی۔ ایک چھوٹا سا پلم کیک گھر میں تیار رکھا تھا۔۔۔ منوج کی خاطر داری میں بچھی جارہی تھی۔

"لی نا ہر وقت آپ کی باتیں سناتی رہتی ہے۔۔۔ آپ کی تعریف کرتے اس کی زبان نہیں تھکتی کبھی!" ممی نے بتایا۔

"لی نا بہت اچھی لڑکی ہے۔ ایفی شنٹ اور محنتی۔ میری بہت مدد کرتی ہے، کام میں۔۔۔" منوج بولا۔

"یہ آپ کی مہربانی ہے، جو آپ ہمارے اس چھوٹے سے گھر آئے۔"

لی نا اک دم کچن سے نکل کر آئی اور بچوں کی طرح جوشیلے انداز میں بولی۔۔۔ "آپ کھانا کھائے بغیر نہیں جائیں گے سر۔۔۔ آپ نے کہا تھا، آپ فری ہیں۔"

"نہیں۔ لی نا۔ آج رہنے دو۔۔۔ ویسے بھی تم جانتی ہو، میں دوپہر کو نہیں کھاتا۔"۔۔۔ منوج بولا۔

"آج کھالیجیے سر۔۔۔ ہماری خاطر۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہوا جاتا ہے۔۔۔"۔۔۔ اور منوج کے کچھ اور کہنے سے پہلے پھر کچن کی طرف بھاگ گئی۔

منوج نے مسکرا کر ممی سے کہا۔۔۔ "اب آپ جلدی سے لی نا کی شادی کر ڈالیے۔"

یکایک ممی کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی پھر آہستہ سے بولی۔۔۔ "میں بھی دن رات اسی فکر میں گھلی جارہی ہوں سر۔"

"آپ مجھے سر مت کہیے میڈم۔" منوج جلدی سے بولا۔۔۔ پھر ذرا سے توقف کے بعد پوچھنے لگا۔۔۔ "مگر لی نا کی شادی کے لیے ابھی تک رکاوٹ کہاں ہے آپ۔۔۔؟"

"۔۔۔ وہ کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ آپ کو نہیں بتایا کبھی؟" می نے پوچھا۔

"لِلی سے بھی نہیں؟"۔۔۔ منوج نے تعجب سے پوچھا۔

"۔۔۔ لِلی؟" می کے چہرے پر حیرانی پھیل گئی۔

منوج نے اور زیادہ تعجب سے می کو دیکھا۔۔۔ "لِلی۔۔۔ جو پونا کی ڈیفنس اکیڈمی میں انڈر ٹریننگ ہے؟۔۔۔ اور جو ویک اینڈ پر لِینا سے ملنے آتا رہتا ہے۔۔۔ کیا آپ کو نہیں بتایا لی نا نے۔۔۔؟"

می کے چہرے پر یکایک عجیب سا تناؤ پھیل گیا۔۔۔ جیسے کسی خیال سے سہم گئی ہو۔ منوج اسے غور سے دیکھنے لگا۔۔۔۔

"کیا آپ کو نہیں معلوم۔۔۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے ہیں؟"

می نے نظریں اٹھا کر منوج کو دیکھا تو منوج ششدر رہ گیا۔ می کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ ہونٹ لرز رہے تھے، جیسے کسی اندرونی کرب کے اظہار کو روکنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کمرے کی فضا عجیب پُر اسرار خاموشی میں ڈوب گئی تھی۔ صرف کچن سے برتنوں کے الٹ پلٹ کرنے کی آوازیں تھوڑی تھوڑی دیر سے آرہی تھیں۔۔۔

بالآخر می کی آواز نے اس خاموشی کو توڑا جو بوجھل ہوتی جارہی تھی۔۔۔ "نہیں منوج صاحب۔ میں سب جانتی ہوں۔ مگر جو آپ نہیں جانتے، وہ یہ ہے کہ لی نا نے آپ سے سب جھوٹ کہا ہے۔ کہیں کوئی لِلی نہیں ہے۔ نہ کوئی اس سے ملنے آتا ہے!۔۔۔ یہ سب اس کے دماغ کی پیداوار ہے۔ وہ بچپن سے خیالی دنیاؤں میں رہتی ہے۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، اس کھیل میں اس کی اندرونی خواہشیں چھپی رہتی ہیں۔"

می کی بھاری آواز میں وہ پیار جھلک رہا تھا جو اسے لی نا سے تھا۔ اور پھر یک بارگی منوج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بولی۔ "اسے صرف آپ سے محبت ہے!۔ مجھے معلوم ہے، دن رات اس کے خیالوں میں آپ بسے رہتے ہیں۔۔۔ آپ کی ذرا ذرا سی بات اس کے لیے بے حد اہم ہوجاتی ہے۔ آپ خوش ہوں، تو وہ نہال رہتی ہے۔ اور آپ کو کسی سے ذرا سی بھی تکلیف پہنچے، تو وہ دن بھر اداس رہتی ہے۔۔۔ بے وقوف لڑکی۔۔۔ خیالوں کے دیس میں رہتی ہے۔"۔۔۔ می کہتی جارہی تھی اور منوج سکتے کے عالم میں سن رہا تھا۔ اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ چائے کی خالی پیالی کب سے اس کے ہاتھ میں دھری ہے۔

(۳۴)

بیٹی کے آنے کی خبر سے جو خوشی اور اکسائیٹ منٹ ماں کو ہوا تھا، اس پر پچھلے چند دنوں کے واقعات سے اوس سی پڑ گئی تھی۔ دن قریب آرہے تھے، اور رما کو نیل کمل کی شادی کے تعلق سے ابھی کئی کام کرنے تھے۔

جوہری کی دکان سے فون آیا تھا کہ زیورات تقریباً تیار ہیں۔ وہ ایک بار آکر اطمینان کرنے تو دوسرے ہی دن بھجوا دیے جائیں گے۔ رما اس دن سب سے پہلے وہیں چلی گئی۔۔۔ زیورات ہدایت کے مطابق بنے تھے۔ وہ مطمئن ہوکر درزی کی دکان پر چلی گئی جہاں نیل کمل کے لیے کچھ کپڑے سلنے کو دے رکھے تھے۔ مگر یہاں کام ابھی باقی تھا۔

رما نے سوچ رکھا تھا کہ نیل کمل کے لیے جو سنگھار میز خریدے گی، وہ روایتی سنگھار میزوں سے مختلف مگر خوب صورت ہو۔ ایک دفعہ تلاش میں نکلی تھی، مگر اس کی مرضی کے مطابق کہیں نظر نہیں آئی۔

درزی کی دکان سے نکل کر ایک مرتبہ پھر سنگھار میز کی تلاش میں گھومنے لگی۔ لکڑی کے فرنیچر کے شو روم دیکھتے

پھری، مگر خواہش کے مطابق کوئی سنگھار میز نہیں ملی ۔۔۔ بالآخر اس نے سوچ لیا کہ اب اس کا انتخاب وہ نیل کمل پر ہی چھوڑ دے گی۔

کار اسٹارٹ کرتے کرتے رما کی نظر سامنے ہی آئس کریم پارلر پر پڑی۔ کافی دیر سے اسے پیاس لگ رہی تھی۔ تھک بھی گئی تھی۔ پتہ نہیں کتنے عرصے کے بعد یکایک اس کے جی میں آیا اور وہ تنہا پارلر میں جا بیٹھی۔ ویٹر سے تاکید سے کہا کہ آئس کریم لانے میں دیر نہ کرے۔

پارلر میں اس وقت بہت کم لوگ تھے ۔۔۔ مشکل سے چار پانچ۔ کیبن بھی خالی خالی لگ رہے تھے۔

مگر اسی لمحے جیسے کسی نے اچانک اس کے ذہن میں کوئی سوئچ دبا دیا اور یادوں کی گرہیں آپ ہی آپ کھلنے لگیں ۔۔۔

سنگاپور میں آنند اکثر اسے اپنی پسند کے ایک پارلر میں آئس کریم کھلانے لے جایا کرتا تھا ۔۔۔ بڑی خوب صورت جگہ تھی۔ وہ لوگ کھڑکی کے پاس بیٹھا کرتے تھے، جہاں سے دور تک سمندر نظر آتا تھا۔ سبزی مائل نیلگوں پانی میں ہچکولے کھاتی چھوٹی بڑی کشتیوں کے اوپر سمندری چڑیوں کی پروازیں بڑی بھلی لگتی تھیں۔ کبھی کوئی بڑا جہاز گزرنے لگتا تو رما دیر تک اسے دیکھا کرتی، جب تک کہ وہ افق پر نظروں سے اوجھل نہ ہونے لگے ۔۔۔ آئس کریم کے دو دو تین تین دور ہوجاتے۔ اور آنند مسلسل باتیں کیے جاتا ۔۔۔ اپنے آفس کی ۔۔۔ وہاں ملازم چینی لڑکیوں کی ۔۔۔ اور رما کو ستانے کے لیے ان کے فلرٹیشن کی! کتنے سرور کے دن تھے وہ!

ایک مرتبہ پارلر میں کھڑکی والی نشستیں حاصل کرنے کے لیے آنند کو دو انڈونیشین سے تکرار کرنی پڑ گئی تھی۔ وہ لوگ مان نہیں رہے تھے۔ آخر میں آنند ہاتھا پائی پر اتر آیا تو بے چارے خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے ۔۔۔ آنند ہار جانے والوں میں نہیں تھا۔

آنند کی یادیں اب رما کو رنجیدہ نہیں کرجاتی تھیں۔ بلکہ اتنی دیر جیسے سچ مچ آنند اس کے ساتھ ہوتا اور وہ ان سہانی گھڑیوں کے کیف سے دوبارہ گزرتی ۔۔۔ اس وقت بھی پارلر میں تنہا نہیں تھی ۔۔۔ آنند مقابل کی کرسی پر بیٹھا اس کے ساتھ مسکرا کر آئس کریم کھا رہا تھا۔

رما اس وقت چونکی جب ویٹر نے بل لاکر اس کے سامنے رکھا۔ رما پرس کھولنے لگی تو دھیرج گھوش کی آواز نے اسے چونکا دیا ۔۔۔ "ہلو رما دیوی ۔۔۔!" وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ ایک کیبن سے نکل کر آرہا تھا۔ دوست کو اشارے سے چلے جانے کے لیے کہہ کر گھوش رما کے مقابل آ بیٹھا ۔۔۔ "یہ کیا؟ ۔۔۔ آپ تو جارہی ہیں! ۔۔۔ مائی بیڈلک ۔۔۔!"

"آپ کو کوئی کام تھا ۔۔۔ مجھ سے؟" رما نے پوچھا۔

"نہیں ۔۔۔ کام تو نہیں، مگر معلوم ہوتا تو میں یہ وقت آپ کے ساتھ گزارتا ۔۔۔ کچھ باتیں کرتا۔"

"اب بھی کرلیجیے وہ باتیں ۔۔۔ کیا منگواؤں آپ کے لیے؟"

"نو، تھینکس ۔۔۔" گھوش جلدی سے بولا ۔۔۔ "ابھی کھا پی کر آرہا ہوں۔"

اس کے بعد چند سکنڈ تک وہ کچھ نہیں بولا۔ پہلو بدل کر خاموش بیٹھا رہا ۔۔۔ جیسے فیصلہ کررہا ہے، بولے کہ نہ بولے!

"رما دیوی۔ پروفیسر کے بی ہیویر پر مجھے بہت افسوس ہوا۔" بالآخر وہ بولا۔

رما چپ رہی۔

"انیتا اسی شاک میں ختم ہوگئی ۔۔۔ یہ دنیا بڑی سفاک ہے رما دیوی۔ آپ جانتی ہیں، کرتی کیا کچھ پھر رہی ہے؟ انیتا کی موت کی ذمہ دار آپ ہیں ۔۔۔!"

صاحب بھی چپ تھی اسپین کے چہرے پر کوئی رد عمل تک نہیں تھا ۔ گوش کو عجیب لگا ۔ ۔ ۔ "اور عجیب بات یہ کہ اس نے میری بیوی کو بھی اپنا ہم نوا بنالیا ! ۔ ۔ ۔ یہ عورتیں کتنی جلدی دوسری عورتوں سے حسد کرنے لگتی ہیں ! ۔ ۔ ۔ خاص طور پر اگر دوسری عورت خوب صورت ہو ، نیک نام ہو ، اور ۔ ۔ ۔ تنہا ہو ۔"

"مگر آرتی اور اندرانی عام عورتوں میں نہیں ۔ ۔ ۔ ان کا شمار انسائیکلوپیڈیا میں ہوتا ہے ۔"

نہیں ۔ ۔ ۔ سب فارس ہے ، فراڈ ہے ۔ اندرانی سے شادی کرکے میں نے بھی دھوکا کھایا ۔ وہ میرے لیے ٹوٹل مس فٹ ہے رما دیوی ۔ ۔ ۔ آپ نہیں جانتیں ، اس نے میری زندگی کیسی دوزخ بنادی ہے ۔ ۔ ۔ ! "

رما کے ذہن میں کسی نے کھٹ سے وارننگ کا بٹن دبادیا ۔ ۔ ۔ وہی پرانا پینترا ۔ ۔ ۔ اپنے کو قابلِ رحم بتاکر عورت کے دل میں ماں کا جذبہ جگا دینا ، اور جیسے ہی وہ لپکی ، بانہوں میں جکڑ لینا ۔ ۔ ۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ، گوش صاحب ؟"

گوش پھر چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگیا ۔ پھر بے چین ہوکر پہلو بدلا ۔ ۔ ۔ "ابھی آپ کی زندگی کا کافی سفر باقی ہے ، رما دیوی ، ۔ ۔ ۔ جو تنہا طے کرنا ہے ۔ آپ چاہیں تو ۔ ۔ ۔ میں آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں ۔ کئی بار آپ سے کہتے کہتے رک گیا ، ہمت نہیں ہوئی ۔ ۔ ۔"

رما سن سے رہ گئی ۔ سر سے پیر تک غصے کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ اسے لگا جیسے رگوں کا سارا خون کھنچ کر کنپٹیوں میں آ جمع ہوا ہے ۔ ایسے میں اس کے جی میں آئی کہ اٹھ کر گوش کے منہ پر ایک زور کا طمانچہ جڑ دے ، اور پوچھے اسے یہ بات کہنے کی جراءت کیسے ہوئی ؟ مگر رما نے حسبِ عادت خود کو سنبھال لیا ۔ بڑی مشکل سے اپنی آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے بولی ۔ ۔ ۔ "مسٹر گوش ۔ ۔ ۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ۔ زندگی کے سفر میں نہ میں تنہا ہوں ، ۔ ۔ ۔ اور نہ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت ہے ۔" ۔ ۔ ۔ اور پھر ذرا سے توقف کے بعد بولی ۔ "مجھے آپ سے ہم دردی ہے ، مسٹر گوش ۔ ۔ ۔ کیوں کہ ۔ ۔ ۔ آپ بے وقوف ہیں ۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں آپ کی چوتھی بیوی بن کر آپ کے ناولوں کو ایک اور کیرکٹر فراہم کردوں گی ؟ ۔ ۔ ۔ You go, and try somewhcie else غصے میں لرزتی ہوئی وہ تیزی سے اٹھ کر چلی گئی ۔ ۔ ۔ پارلر میں بیٹھے ہوئے تھوڑے سے لوگ مڑ کر اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے ۔ پھر وہ گوش کو دیکھنے لگے جو دیر تک اسی جگہ اسی طرح بیٹھا رہا ۔

۔ ۔ ۔ فراڈ ۔ ۔ ۔ فراڈ ۔ ۔ ۔ سب بکواس ۔ ۔ ۔

رما ایک بار پھر دماغ میں مچے ہوئے طوفان کے تھپیڑوں میں ، پر ہجوم سڑکوں پر کار چلاتی ہوئی گھر پہنچی تو نوکرانی اس کا چہرہ دیکھ کر دم بہ خود رہ گئی ۔

○●○

رپورٹ

قومی سمینار «اردو میں راماین کی روایت»

«اردو مشترکہ ہندستانی تہذیب کی پیداوار ہے اور راماین کی روایت اردو کا ایک ناقابلِ فراموش ورثہ ہے۔» ان خیالات کا اظہار ممبئی یونیورسٹی کی وائس چانسلر ڈاکٹر شریمتی سنیہ لتا دیش مکھ نے قومی سمینار «اردو میں راماین کی روایت» کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ قومی سمینار کا اہتمام شعبۂ اردو اور گرودیو ٹیگور چیئر، ممبئی یونیورسٹی نے بھارتیہ ودیا بھون، ممبئی کے تعاون سے کیا تھا۔

ڈاکٹر رفیق زکریا نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اردو کے بارے میں چند مفاد پرست اس قسم کی غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کررہے ہیں کہ اس زبان میں صرف مسلمانوں ہی کا تہذیبی وثقافتی خزانہ ملتا ہے حالاں کہ اردو زبان وادب میں راماین کے علاوہ مہا بھارت سے متعلق بھی بہت زیادہ مواد ملتا ہے اور ان مقدس کتابوں کے ترجمے اور تفسیریں بھی پائی جاتی ہیں۔ برسوں پہلے پروفیسر نورالحسن نقوی نے تلسی داس کی مشہور «رام چرت مانس» کا اردو ترجمہ بڑی محنت اور خوب صورتی سے کیا اور اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے شائع کیا تھا۔

اردو کے ممتاز اسکالر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے کلیدی خطبے میں اردو سے رام کتھا کے دیرینہ تعلق کو واضح کرتے ہوئے بتایا کہ اردو شاعروں اور افسانہ نگاروں نے رام کتھا کے علاوہ مہابھارت اور گیتا وغیرہ کے کرداروں کو اچھوتے اور عقیدت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال نے رام پر نظم کہی ہے اور انھیں «امامِ ہند» کہا۔ اردو میں راماین کی روایت جیسے انوکھے موضوع پر سیمینار منعقد کرنے پر شعبۂ اردو کو مبارک باد دیتے ہوئے پروفیسر نارنگ نے اردو میں راماین سے متعلق تلمیحات، ضرب الامثال اور محاورات کی بھی نشان دہی کی۔ لسانی تاریخ کی روشنی میں انھوں نے اردو کو متعدد زبانوں کے ورثہ کی امانت دار بتایا۔

ابتدا میں شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی کے سربراہ ڈاکٹر یونس اگاسکر نے «اردو میں راماین کی روایت» کے موضوع پر قومی سیمینار منعقد کرنے کے مقصد کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ یہ سیمینار یک جہتی اور رواداری کو بڑھاوا دینے اور ذہنی جالوں کو صاف کرنے کی ایک کوشش ہے۔ برسوں پہلے ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی کی طرف سے Ramayana Tradition in Asia کے موضوع پر بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا لیکن اس میں اردو میں راماین کی روایت پر کوئی مقالہ نہیں پڑھا گیا۔ یہ جان کر ہمیں مزید اطمینان ہوا کہ ہم اس کمی کو پورا کررہے ہیں۔ انھوں نے اگلے سال اردو میں مہابھارت اور گیتا کی روایت پر سیمینار کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ ڈاکٹر اگاسکر نے شعبۂ اردو کی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا کہ آئندہ جرنلزم اور ٹرانسلیشن، اسکرپٹ رائٹنگ وغیرہ کے کورسیز اور کمپیوٹر ڈیکونسٹرکشن سیریز شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بھارتیہ ودیا بھون ممبئی کے ڈائرکٹر جنرل رام کرشن جی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس سیمینار کے انعقاد کو قومی ایکتا کے حق میں نیک فال بتاتے ہوئے اس کے لیے شعبۂ اردو کو مبارک باد دی اور آئندہ بھی تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔

مقالہ خوانی کے پہلے اجلاس میں پروفیسر حنیف کیفی نے منشی جگن ناتھ خوشتر کا ترجمہ "رامائن" پر اپنا مقالہ سنایا اور اس کی ادبیت و اہمیت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر خورشید نعمانی نے "اردو شاعری میں سری رام" کا ذکر کرتے ہوئے اردو شاعری میں رام کی مقبول تصویر کشی پیش کی۔

پروفیسر معین الدین جینا بڑھے نے "تلسی کی رامائن اور ڈاکٹر صفدر آہ" پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ اصولِ تحقیق کی روشنی میں اس کام کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے صفدر آہ کی اس کتاب کو تحقیق کا عمدہ نمونہ بتایا۔ ان کے نزدیک تلسی اور ان کی رام چرت مانس سے متعلق نئے ماخذ و حقائق کی دریافت کے امکانات موہوم تھے۔

دوسرے اجلاس میں پروفیسر نورالعین علی نے "نصابی کتابوں میں رامائن" کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ نصابی کتابوں میں بچپن ہی سے ہم رام اور ان سے متعلق کہانیاں پڑھتے آرہے ہیں۔ انھوں نے ہندستان کے کئی صوبوں کی اردو کی نصابی کتابوں میں رامائن کے کردار اور اس سے حاصل شدہ مواد کی نشان دہی کی۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے "رامائنی ادب ایک تقابلی مطالعہ" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں مثلاً فارسی، انگریزی، تلگو، ملیالم وغیرہ میں رامائن کا جائزہ لیا۔

سلام بن رزاق نے "اردو افسانوں پر رامائن کا اثر" میں بیدی کی کہانی "لاجونتی" اور سید محمد اشرف کی "دوسرا بن باس" کا تجزیہ کر کے ثابت کیا کہ ان کے کردار رامائن کے کرداروں سے متاثر ہیں اس سلسلے میں انھوں نے اپنی کہانیوں کا بھی حوالہ دیا۔ ڈاکٹر رام پنڈت کسی وجہ سے شرکت نہ کرسکے ان کا مقالہ "اردو شعروادب پر رامائن کا اثر" ڈاکٹر یونس اگاسکر نے پڑھ کر سنایا۔ "اردو میں رامائن کے نسوانی کردار" کے زیر عنوان ڈاکٹر غزالہ نادری نے رامائن کے اہم نسوانی کرداروں سیتا، کوشلیا، کیکئی اور سمترا وغیرہ کی شخصیت، ان کی ذہنی و جذباتی کشمکش اور دیگر کرداروں کی ذاتی صفات کی افسانوی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

اس قومی سیمینار کے ایک سیشن کی صدارت پروفیسر عبدالستار دلوی نے کی اور نظامت کے فرائض پروفیسر معین الدین جینابڑھے نے انجام دیے اور دوسرے سیشن کی صدارت جناب محافظ حیدر نے اور نظامت پروفیسر انور ظہیر خاں نے کی۔ شرکاء اور حاضرین کے شکریے کی رسم ڈاکٹر صاحب علی نے ادا کی۔

اس قومی سیمینار میں سامعین کی بڑی تعداد نے شرکت کی اور بعض نے مقالات کے بارے میں استفسار بھی کیا۔ خصوصی شرکا میں ڈین، فیکلٹی آف آرٹس، پروفیسر وی پی بالاپوریا، یوسف ناظم، ڈاکٹر آدم شیخ، انور قمر، پرویز یداللہ مہدی، ڈاکٹر شفیع شیخ، پروفیسر سید اقبال، اطہر عزیز اور اقبال نیازی شامل تھے۔

ooo

(سلسلہ ص: ۶۳ سے)

"وجہ کیا ہوئی ڈاکٹر صاحب" ایمبولینس کے ڈرائیور نے چلتے چلتے پوچھا۔

"ان کی موت بھوک پیاس کی شدت اور شدید ڈیپریشن کی وجہ سے ہوئی ہے۔" ڈاکٹر جلدی میں تھا۔ ایمبولینس کے ڈرائیور نے باہر آکر گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے کچی آبادی کی طرف ڈال دیا۔ بہ مشکل تمام ڈھونڈتے ڈھانڈتے مجو ہوٹل پہنچ گیا۔

ہوٹل کی چند چارپائیوں پر لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے، رنگین ٹی۔ وی سے کراچی کی مقامی خبریں ٹیلی کاسٹ ہو رہی تھیں۔

... آج کراچی کے حالات معمول پر رہے۔ کاروبارِ زندگی جاری رہا، کسی بھی علاقے سے فائرنگ یا کسی بھی ناخوش گوار واقعے کی اطلاع نہیں ملی...."

ooo

بیادگار سید محی الدین قادری زورؔ

سن اجراء : ۱۹۳۸ء — فون : 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۶۱ — مئی ۱۹۹۹ء — شمارہ : ۵

فی پرچہ	:	۱۵ روپے
زرِ سالانہ	:	۱۵۰ روپے
کتب خانوں سے	:	۱۷۵ روپے

مشرقِ وسطی اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۶ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر : ادارۂ ادبیاتِ اردو ۔ پنجہ گٹہ روڈ ۔ حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے۔ پی) انڈیا۔

کمپیوٹر کتابت : [illegible]

[illegible]

اس شمارے میں

پہلی بات

سب رس کے پیشِ نظر شمارے میں پروفیسر آئزک سکویرا کا خطبہ ۔ صدارت شامل ہے جو انھوں نے انگریزی زبان و ادب کے اساتذہ کی کل ہند کانفرنس میں پڑھا تھا ۔ اس خطبے میں اگرچہ انگریزی زبان و ادب کے اساتذہ کو مخاطب کیا گیا ہے اور ہندستانی یونیورسٹیوں میں انگریزی ادب کی تدریس کے مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے ۔ لیکن پروفیسر سکویرا نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اردو زبان و ادب کے اساتذہ اور طالب علموں کے لیے بھی قابلِ توجہ ہیں ۔

○

ترقی پسند تنقید نے ادب کے مطالعے میں سیاسی اور معاشی مسائل پر زور دیا تھا لیکن اس نے ایک طرف متن کے مطالعے کو نظرانداز کیا اور دوسری طرف ادب کے ثقافتی مطالعے اور جمالیات پر ثقافت کے اثرات کا جس وسعت اور گہرائی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے تھا نہیں لیا ۔

جدیدیت کی تحریک کے ساتھ ہی نئی تنقید (New Criticism) اور ہیئتی تنقید کا رواج ہوا جس نے مطالعہ ، متن پر توجہ دی ۔ اسلوبیات اور اسلوبیاتی تنقید نے بھی سائنسی ڈھنگ سے متن کے تجزیے کا کام انجام دیا ۔ قاری اساس تنقید پھر ساختیات اور ردِ تشکیل کے نظریات سامنے آئے ۔ یہ بات اپنی جگہ اہم اور درست ہے کہ ادب کے مطالعے میں متن کو بنیاد بنانا چاہیے ۔ ادبی اعتبار سے اس کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنا چاہیے اور اگر کوئی تحریر ادبی معیار پر پوری نہ اترے تو اس کا مطالعہ ، تجزیہ اور اس پر رائے زنی ایک کارِ فضول ہے ۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی تخلیق کے مطالعے میں تخلیق کار کے سوانح ، اس کے ماحول اور زمانے کو پیشِ نظر رکھنا ضروری نہیں ۔ لیکن ادبی تخلیق کی زبان کسی دور کی ثقافت سے گہرا رشتہ رکھتی ہے اس لیے ادب فہمی کے لیے ثقافتی مطالعہ ناگزیر ہوجاتا ہے ۔ پروفیسر آئزک سکویرا نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔

○

انگریزی کی طرح ہی جامعات میں اردو زبان و ادب کے شعبے میں ہندستان سے باہر دیگر ملکوں میں تخلیق پانے والے ادب کے مطالعے کو شریکِ نصاب نہیں کیا گیا ۔ خلیجی ممالک اور مغربی ملکوں میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اس نے ثقافتی اعتبار سے ابھی تک اپنی علاحدہ شناخت نہیں بنائی ہے ۔ لیکن پاکستان کا موجودہ ادب ہندستان میں تخلیق پانے والے اردو ادب سے اپنی جداگانہ شناخت پیدا کر رہا ہے ۔ اس لیے پاکستانی ادب کو ایک اکائی کے طور پر نصاب میں شامل کرنے کے امکانات پر غور کرنا ہوگا ۔

○○○

مغنی تبسم

پروفیسر آئزک سکویرا

ترجمہ: اسامہ فاروقی

ثقافتی مطالعہ اور ادبی مطالعہ

[پروفیسر آئزک سکویرا (پیدائش ۵ جنوری ۱۹۳۰ء) عثمانیہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے بعد شعبۂ انگریزی میں لکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں ممالکِ متحدہ امریکہ کی یونیورسٹی آف اوتاہ سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ تحقیقی مقالے کا عنوان تھا:

جدید امریکی فکشن کی ابتدا کا موضوع (The Theme of initiation of Modern American Fiction)

۱۹۵۸ء سے ۱۹۹۰ء تک جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبۂ انگریزی سے بہ حیثیت استاد منسلک رہے اور ۱۹۹۰ء میں صدر شعبۂ انگریزی اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی حیثیت سے وظیفے پر سبک دوش ہوئے۔

۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء تک یونیورسٹی آف اوتاہ، امریکہ کے شعبۂ انگریزی میں Teaching Associate کے فرائض انجام دیے۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۴ء تک امریکن اسٹڈیز ریسرچ سنٹر کے کارگزار ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۹ء میں بولنگ گرین یونیورسٹی اوہایو، امریکہ میں وزیٹنگ پروفیسر رہے۔

۱۹۹۱ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن پروفیسر ایمریٹس کے عہدے پر فائز ہوئے۔

تصانیف:

1. The theme of Initiation in Modern American Fiction (Mysore: Geetha Book House, 1975).
2. A Manifesto for Humour, Ed., Hyderabad: World Humour Conference. 1985.

3. Popular Culture: East & West (New Delhi: B.R.Publishers, 1991)
4. Essays in American Studies, Ed., New Delhi: USEFI, 1991.
5. The Closing of the Frontier 1890-1990, Ed., Hyderabad: ASRC, 1994.
6. American studies Today, Ed., New Delhi: Creative Publishers, 1995.

اس کے علاوہ آپ کے ستر سے زیادہ مضامین امریکہ ، کوریا اور ہندستان کے مجلوں میں شائع ہو چکے ہیں ۔

ہندستان کی ساٹھ جامعات اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دس جامعات میں لکچر دے چکے ہیں ۔

جاپان کے شہر ٹوکیو ، کوریا کے شہر سیول ، فلپائن کے شہر منیلا ، ہوائی کے شہر ہونولولو ، آسٹریلیا کے شہر برسبین اور ملبورن ، پاکستان کے شہر لاہور ، سنگاپور اور انگلستان کے شہر مانچسٹر ، نیویارک اور آکسفورڈ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کئی جامعات میں مقالے پڑھے ۔

علمِ موسیقی میں بھی درک حاصل ہے ۔ اس موضوع پر ہندستان اور بیرونی ممالک میں مذاکروں میں حصہ لیا ہے اور متعدد لکچر دیے ہیں ۔

ڈرامے کے فن سے بھی دل چسپی رکھتے ہیں ۔ امریکی ، انگریزی اور ہندستانی ڈراموں کی ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیے ہیں اور ان میں ایکٹنگ بھی کی ہے ۔ ۱۹۸۰ ء سے ڈرامیٹک سرکل حیدرآباد کے صدر ہیں ۔

آج کل Indian Journal of American Studies کے شریکِ مدیر ہیں ۔]

o●o

گزشتہ تیس برس کے دوران ہمارے ملک کی جامعات کے انگریزی زبان و ادب کے شعبوں نے اپنے نصاب میں مختلف [illegible] میں لکھے جانے والے انگریزی کے نئے ادب کے مطالعے کو بھی شامل کرلیا ہے مثلاً امریکی ادب ، آسٹریلیائی ادب ، کناڈا کا [illegible] ، انگریزی میں ہندستانی تصانیف ، انگریزی میں افریقی تصانیف ، دولتِ مشترکہ کا ادب ، عالمی ادبیات عالیہ کے تراجم ، یورپ [illegible] کا جدید ادب وغیرہ ۔ ۱۹۸۹ ء میں شائع شدہ اپنی رپورٹ " نصاب کا ارتقاء " میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ان اضافوں کو نہ [illegible] باضابطہ اپنی منظوری دی ہے بلکہ ان کورسوں کے نہایت عمدہ نصاب بھی فراہم کردیے ہیں ۔ مضامینِ اختیاری کی تعداد میں [illegible] ہو گیا ہے اور انگریزی زبان و ادب کے اساتذہ ان نئے مضامین کو پڑھانے اور ان کے اس اضافے سے عہدہ برا ہونے کی جدوجہد لگے ہوئے ہیں ۔

یہ ظاہری طور پر تشویش ناک صورت حال نہیں ہے کو کہ بعض سن رسیدہ اساتذہ نصاب میں ان اضافوں کے نتیجے میں [illegible] یعنی برطانوی نصاب میں ہونے والی تخفیف سے دہشت زدہ ہیں ۔ رجائیت پسند ہونے کے ناتے میں ادبی مطالعے کی حدود اور [illegible] میں توسیع کے منصوبے کا خیر مقدم کرتا ہوں ۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں ، ادب کا مطالعہ اسے قرنطینے میں رکھ کر نہیں کیا جاسکتا [illegible] ، تاریخ ، سماجی حوال ، عمرانیات اور فلسفے سے آزاد اور بے تعلق نہیں ہے ۔ مثال کے طور پر افریقی ادب کے مطالعے کے لیے

افریقی تاریخ، تہذیب و تمدن سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ یہی بات آسٹریلیائی ادب، کناڈا کے ادب، جزائرِ غرب ا
کے ادب اور انگریزی میں تخلیق کیے جانے والے ہندستانی ادب کے مطالعے پر صادق آتی ہے۔ یہ ان اہم وجوہ میں سے ایک
جن کی بنا پر اس خطبے میں میں یہ تجویز کر رہا ہوں کہ جامعات کے انگریزی زبان و ادب کے شعبوں میں ثقافت کے مطالعے کو بھی ر
دینا چاہیے۔ ثقافت کے مطالعے سے مختلف ممالک میں انگریزی میں تخلیق کیے جانے والے ادب کے مطالعے کی معنی خیزی، افاد
اور قوتِ حیات میں مزید اضافہ ہوگا۔ ساری دنیا کی جامعات کے انگریزی زبان و ادب کے شعبوں نے ہمت کر کے اس نئے ک
بیڑا اٹھالیا ہے اور ان کا بیان ہے کہ طریقِ کار اور تدریس سے متعلق بعض دقتوں کے باوجود وہ کامیاب رہے ہیں۔

ثقافتی مطالعے پر مباحث گزشتہ چالیس سالوں سے جاری ہیں یعنی اس وقت سے جب رچرڈ ہوگرٹ کی lses of
Literacy (۱۹۵۶ء) اور ریمنڈ ولیم کی Culture and Society (۱۹۵۸ء) جیسی کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور جب ۱۹۶۴
برمنگھم میں مرکزِ ثقافتی مطالعہ کا قیام عمل میں آیا۔

انگریزی ادب کے شعبوں کے اساتذہ نے super specialization یعنی اعلیٰ مہارتِ خصوصی کی طرف رجحا
بالخصوص ادبی تنقید کی محدود مہارتِ خصوصی کے خلاف ردِ عمل کا اظہار کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۸۰ء کے دہے مر
رجحان تنقیدی نظریے کے تحکمانہ غلبے (Mandarin Machismo of Critical Theory) کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ہندستان
انگریزی زبان و ادب کے بیشتر شعبوں میں اب بھی اس کا بول بالا ہے۔ اس رویّے کے خلاف ردِ عمل کا وقوع پذیر ہونا لازم
اور یہ وقوع پذیر ہوا کیوں کہ تھیوری (Theory) نے انگریزی زبان و ادب کے مطالعے کو ایک مسئلے کی شکل دے دی ہے۔

دورِ مابعد جدیدیت میں ادب کو اس کے تقدس اور استناد سے محروم کرنے کا رجحان مشاہدے میں آیا ہے اور اس کے
میں مکالمے کے صحت مند لین دین کو بڑھاوا ملا ہے۔ ثقافت کو اب فنون کا محض ایک اظہار نہیں بلکہ ایک ماخذ سمجھا جاتا ہے۔ م
کا لین دین ایک مخالف رو کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ اسٹیفن گرین بلیٹ اسے "ثقافتی شعریات" کا نام دیں گے اور میخائل با
غالباً "ناول کا رنگ دینے" (Novelization) اور "جشن کا رنگ دینے" (Carnivalization) کی مناسبت سے اسے "
نثریات" کہیں گے۔

اس مرحلے پر ثقافتی مطالعے کی تعریف کی بعض کوششوں پر غور کرنا سود مند ہوگا۔ طامس ولسن اور ایڈورڈ وھیٹلی
اسے "ثقافتی معمولات کے تنوع، بالخصوص گفتگو اور اظہارِ خیال کے طریقوں اور اقتدار سے ان معمولات کے رشتوں کی چھان
سے تعبیر کیا ہے۔" یہ نہ صرف ان طریقوں کو جن کے ذریعے سے بعض انفرادیتیں (قومی، معاشرتی، سیاسی، متعلق بہ جنس،
اور لسانی وغیرہ) تشکیل پاتی ہیں بلکہ ثقافتی حلقوں میں معنی اور حقیقت کے برخلاف ان انفرادیتوں کے استعمال کو بھی باقاعدہ
نظریے کے تحت لانے پر مبنی ہے۔"

جینٹ سورنسن (Janet Sorensen) کا یہ خیال ہے کہ "ثقافتی مطالعہ" اس ادبی مطالعے سے انحراف سے زیادہ جو
زبان کے مخصوص استعمال اور مطالعے کے مخصوص نمونے رکھنے والی ایک ڈسکورس (discourse) کی حیثیت سے تعریف کی
ہے۔ مطالعے کی حدود کو امتیازی ثقافتی تجربے کے جامد و غیر تبدیل علاقے کے پرے اس طرح وسعت دینے کا نام ہے کہ اس میں
کا ایک کمیں مثلاً جگمٹ بھی شامل ہوجائے اور وہ تاریخی صورتِ حال بھی جس نے لکھنے اور پڑھنے کے مخصوص عمل وہ آمد

۔ "سب رس" حیدرآباد۔

میں حصہ لیا۔ گو کہ بہتر یہ ہو سکتا ہے کہ ادبی مطالعے کو ثقافتی تجربے کی ایک تعبیری شکل سمجھتے ہوں، ان لوگوں کے لیے بھی جو تغیر کی تاریخ کو اپنا موضوعِ مطالعہ بناتے ہیں یہ ضروری ہے کہ ثقافتی پیداوار اور ادبی تخلیقات کو جنم دینے والی صورتِ حال کے تجزیے میں اس تاریخ اور ادبی مطالعے کے تغیر پذیر رسمی عمل درآمد کے درمیان عملِ باہمی کو ایک کلیے کی شکل دیں۔"

اس طرح سے ثقافتی مطالعہ، مطالعے کی حدود کو وسعت دے کر اس میں نسلیت و قومیت - (Ethnicity)، سیاسی طبقے، ، مابعد استعماری تحریروں، فلم، مسلمہ اور نیز غیر مسلمہ مصنفین کو شامل کرلے گا۔ اس میں فن کی وہ اشکال بھی شامل ہوں گی جو یا زبان کے پرے عام ذرائع ابلاغ تک پہنچتی ہیں، مابعد مطمح اس کہکشاں تک جو زبان کے تخیلی اور محض متنی استعمال سے ز حدود کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ یہ ثقافت سے معاشرے کی ایک اعلیٰ و ارفع پیداوار کی حیثیت سے نہیں بلکہ روز مرہ کے معاشرتی ، درآمد اور روز مرہ کی زندگی کی سرگزشت کی حیثیت سے پیش آئے گا۔ ثقافتی مطالعہ روز مرہ کی زندگی کو سماجی ڈھانچے سے مربوط نے والی ڈسکورس کی وضاحت کرے گا اور اس کے لیے حکم کا کام کرے گا۔ کسی ثقافت کا مزاج یا سرشت " اقدار اور کردار اور فر فن پاروں کی فراموش کردہ غیر شعوری کنجی ہے۔ یہ وہ بنیادی ڈھانچہ ہے جسے الفاظ کا جامہ تو نہیں پہنایا جاتا لیکن جس پر لوگ زندگی کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔" کسی بھی تہذیب میں اسطور، مذہبی اشکال اور مورتیاں (icon) اور مذہبی رسوم علامتی شکل اس مخصوص گروہ کی سرشت کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان تین اشکال کو وضاحت سے سمجھ لینے کے بعد ہی اس تہذیب کے فنون اور فن دں کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ قدیم یونانیوں کے لیے (Mythos) (اسطور) کا مفہوم کہانی یا قصے کا خاکہ تھا اور اس کی مذہبی اہمیت ،۔ عہد حاضر میں اسطور علم الاساطیر یا اس دیومالا کی ایک کہانی ہے جو "پشت در پشت سنائی جانے والی ان کہانیوں کا ایک نظام ، جنھیں کسی زمانے میں ایک مخصوص ثقافتی گروہ مبنی بر حقیقت مانتا تھا اور جو (فوق الفطرت ہستیوں کے ارادے اور اعمال و ال کے حوالے سے) اس امر کی توضیح کے کام آتی تھیں کہ دنیا اپنی موجودہ شکل میں کیسے معرضِ وجود میں آئی اور امور ایک خاص ح سے ظہور پذیر ہوتے ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے اور جو سماج کے رسوم و رواج کی توجیہہ فراہم کرتی تھیں اور لوگ اپنی زندگی جن ردں کے تحت بسر کرتے ہیں ان کی توثیق کرتی تھیں۔" Icons وہ تصویریں ہیں جنھیں سانچے میں ڈھلی ہوئی شکل دے دی گئی۔ کسی اور ہی چیز کی نمائندگی کرتی یا اس کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔" Icons کا مفہوم بھی ہوتا ہے اور ان کے ابعاد بھی ہوتے ہیں۔ وہ لمی عقائد کے بیرونی مظاہر ہیں، وہ روز مرہ کی ایسی چیزیں ہیں جو بیرونی کو معنویت عطا کرتی ہیں۔ عہدِ گزشتہ میں "مذہبی رسوم" کا طور سے قریبی تعلق تھا۔ البتہ یہاں ہم ان مذہبی رسوم کا ذکر کر رہے ہیں جو اجتماعی تجربہ ہیں اور جو سماجی اور وہ بھی بیشتر غیر مذہبی عمل میں ادا کی جاتی ہیں۔ ان تینوں میں اسطور سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ یہ کسی قوم کی خصوصیات (ethos) کے لمار اور تجسیم کا موثر ترین وسیلہ ہے۔

ہر تہذیب میں اس کی آرزوؤں اور خدشات، اس کے خوش گوار اور بھیانک خوابوں کے درمیان عملِ باہمی جاری رہتا ہے۔ ب اس عملِ باہمی اور اس کے عواقب کا اظہار بصری پیرائے میں ہوتا ہے تو وہ Icons (دیوی دیوتاؤں کی تصویروں اور مورتیوں) ، شکل اختیار کرتے ہیں۔ جب انھیں ڈرامے کی شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے یا ان کا ناٹک کھیلا جاتا ہے تو مذہبی رسوم بن جاتے ہیں ور جب وہ بیانیہ شکل اختیار کرتے ہیں تو اساطیر میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ عہدِ حاضر کی دنیا میں اساطیر، Icons اور مذہبی رسوم بالعموم روز بہ روز سیکولر رنگ اختیار کرتی جارہی ہیں۔

ریمنڈ ولیمس (Raymond Williams) کا یہ خیال بجا ہے کہ فن پارے کو اب برتے جانے کے لیے تیار ایک شے یا پیداوار نہیں تصور کرنا چاہیے بلکہ اسے ایک ایسی فعال تحریر ماننا چاہیے جسے دوسرے متعلقہ سماجی رواجوں اور معمولات کے تناظر میں اور جن حالات میں اس کی تخلیق ہوئی ہے ان کے تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ثقافتی مطالعہ زور دیتا ہے فہم و ادراک کے اس معنی خیز انقطاع پر جو فہم و ادراک کے سماجی ذہنی قالبوں میں منعکس خیال اور تاریخی حقیقت کے مابین پیچیدہ ربط اور علم و اقتدار کے مابین مسلسل جدلیات کی وجہ سے لائق توجہ ہے۔

ادبی تنقید کا مقام قطعی طور پر ثقافتی مطالعے کی حدود کے اندر ہے اور چناں چہ اس سے صدہ برا ہونے کے لیے خاصی وسعت نظر درکار ہے۔ ادب کا مطالعہ اب محض زبان کے مطالعے تک محدود نہیں رہ گیا ہے گو کہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دوسری ثقافتی اشکال (formations) کے مقابلے میں زیادہ باقاعدہ ہے، تہذیبی اقدار پر مباحثے سے سروکار رکھنے سے اکثر احتراز کرتا ہے اور لسانی کیفیات کی نام نہاد معروضی نوعیت کی طرف ہمیشہ معاودت کرتا ہے یہ اب نفسیاتی مطالعے تک بھی محدود نہیں ہے، کیوں کہ نفسیاتی مطالعہ ناگزیر طور پر متن کی علامات پر بحث کی طرف لے جاتا ہے، مخصوص مصنفین اور یہاں تک کہ مخصوص ادوار کی صحت یا مرض کے حوالے سے تشخیص پر منتج ہوتا ہے، ادراک کے اس طور طریقے کو اختیار کرتے ہوئے جو کم و بیش خود مختار موضوعات پر مبنی ہوتا ہے۔

رابرٹ کون ڈیوس اور رونالڈ شلائفر (Ronald Schleifer) کا خیال ہے کہ مذہبی اور رد تشکیلی (deconstructive) مسائل پر مبنی ادبی تنقید، اسٹیفن گرین بلیٹ (Stephen Greenblatt) کے الفاظ میں، اکثر بالکل براہ راست اور متوقع طور پر خلا پر منتج ہوتی ہے یا کم از کم ارفع وہ اعلیٰ کے مختلف مظاہر میں خلا کی تجسیم پر۔ تاریخ اور سماج کے مطالعے کی ہم پیمانہ ہوکر تنقید سماجی جدوجہد کا ایک لائحہ عمل بن جاتی ہے، جسے لین ٹرک شیا (Lentricchia) "حصولِ اقتدار کی غرض سے علم و فن کی پیداوار" کا نام دیتا ہے، جب کہ ادب کا مطالعہ ان تہذیبی اقدار کو تسلیم کرتا ہے جن کی اجتماعی اور معاشرتی اعتبار سے بہ حیثیت اقتدار تعریف کی جائے۔ زمین تیار کرنے یا بنیاد قرار دینے کا یہ عمل "اس سبھی کچھ کو جسے وہ مذکورالصدر عالمی تاریخی توضیح میں مذکورہ تاریخی ساخت کی بنیاد کا ایک حصہ نہیں قرار دے سکتا، نظر انداز کرنے کے لائق گردانتا ہے۔"

ثقافت کے مطالعے سے مربوط مسائل میں سے ایک مسئلہ عامیانہ پن (banality) کا ہے، اس مفہوم میں جس میں اس اصطلاح کو ژاں بودرلارد نے استعمال کیا ہے۔ پیش پا افتادگی یا سطحیت banality (یا عام تہذیبی مزاج) کی ضد fatality یعنی "جبریت" کی اصطلاح ہے جس کا وسیع تر مفہوم "جمالیاتی حسنِ ترتیب" (aesthetic order) ہے۔ بودرلارد (Baudrillard) کہتا ہے کہ: "ایک عامیانہ نظریے (banal theory) کو یہ علم ہوتا ہے کہ موضوع (subject) معروض (object) سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے اور ایک جبریاتی نظریے (fatal theory) کو یہ علم ہوتا ہے کہ معروض ہمیشہ موضوع سے بہتر ہوتا ہے۔" بودرلارد کا استعاراتی اور لفظی کو ایک دوسرے کے مقابل رکھنا دراصل استعاروں کا آپس کا کھیل اور مابعد لسان (metalanguage) اور تفسیر کی طرف مراجعت ہے۔

ہمیں بودرلارد کے بہ حیثیت تقابل پیش کردہ جبریاتی سطحی سلسلہ، مراتب (fatal-banal hierarchy) کی بہ جائے عالیہ ثقافتی مطالعے کے زیادہ جمہوری طرزِ خیال کو قبول کرنا چاہیے۔ آسٹریلیا کے میگن مارس (Meghan Morris) کا ادعا ہے کہ علم الاقوام کے سلسلے میں کام کے لیے ضروری ہے کہ ایک تہذیب کا تجزیہ اس طرح کیا جائے کہ کم از کم اس تہذیب کی تحقیقات

کے دوران نسلی اعتبار سے تجزیہ کرنے والے اور اس تہذیب کے بیچ میں ایک فصل ہو۔ نتیجۃً ثقافت کے طالبِ علم اور زیرِ مطالعہ ثقافت کے درمیان ایک فصل موجود ہوتا ہے۔" جب تجزیہ کنندہ کو اپنے اصولی مقام کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔

ثقافتی مطالعہ اپنے طریقِ عمل میں نصاب کے مختلف مضامین کا احاطہ کرتا ہے اور کثیت پسندانہ ہے۔ جس میں نظریہ کا جزو اچھا خاصہ ہوتا ہے۔ اس میں مابعد نوآبادیاتی تحقیقات، جنس کی بنیاد پر درپیش مسائل کا مطالعہ، تحلیلِ نفسی اور مارکسی سماجی نظریہ بھی شامل ہیں۔ ایک طرح سے یہ ادبی مطالعے اور جمالیات کے روایتی عمل درآمد کی تنقید ہے جس میں ثقافت کو ایک مرکزی خیال کی حیثیت حاصل ہے۔

میں جانتا ہوں کہ یہ لائحہ عمل بادی النظر میں بہت وسیع دکھائی دیتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ہندستان میں انگریزی زبان و ادب کے اساتذہ کو اسے آزما کر دیکھنا چاہیے تاکہ ہندستان میں انگریزی زبان و ادب کا مطالعہ موجودہ عہد کے تقاضوں سے مزید ہم آہنگ ہوسکے۔

ooo

{ ہندستانی مجلس برائے مطالعہ زبان انگریزی کے زیرِ اہتمام منعقدہ
انگریزی زبان و ادب کے اساتذہ کی تینتالیسویں کانفرنس (۹ تا ۱۱ جنوری ۱۹۰۹ء) کا صدارتی خطبہ }

o●o

ڈاکٹر خواجہ ربانی
" ترجمہ : محمد یحیٰی جمیل

نو دریافت شدہ بہمنی سکّے : ایک مطالعہ

تانبے کے ۱۰۳ سکوں کے ایک دفینے کا انکشاف لاڈ کھیڑ میں عبدالسعید ولد عبدالحمید کے آبائی مکان کی کھدائی کے دوران جون ۱۹۹۰ء میں ہوا۔ لاڈ کھیڑ (شمال ۵۵ ،۰۰، مشرق ۲۰۰۲۰) مہاراشٹرا کے ضلع ایوت (۱) محل کی تحصیل، دارِوہ میں واقع ایک قصبہ ہے۔ یہ سکّے بہمنی سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سے کچھ اجراء کی تاریخ کی نسبت سے نئے ہیں لہذا سکہ شناسوں کے لیے ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء سے ۱۵۲۶ء تک دکن پر حکم راں رہی۔ ظفر خاں نے جو دلی کے سلطان محمد بن تغلق کا ایک فوجی افسر تھا دکن میں اپنی خود مختاری کے اعلان کے بعد علاء الدین بہمن شاہ کا لقب اختیار کیا اور اس طرح ۱۳۴۷ء (۲) میں ایک نئی علاقائی سلطنت وجود میں آئی اس سلطنت کے اٹھارہ بادشاہوں نے ۱۵۲۶ء تک جنوبی ہند پر حکومت کی اور اسی سال یہ سلطنت پانچ حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

بہمنی سلاطین نے مخصوص القاب مخصوص خطِ نسخ کے ساتھ سکوں کا اپنا ایک انداز برقرار رکھا۔ ان سکوں میں فیروز شاہ احمد شاہ اول احمد شاہ ثانی اور ہمایوں شاہ نمائندہ سلاطین ہیں۔ تانبے کے یہ سکّے جو ۱۶ سے ۲۲ ملی میٹر تک ہیں شکل کے اعتبار سے مدور اور جسامت میں مختلف ہیں۔ ان کی عبارت عربی زبان میں بہمنی طرز کا مخصوص خطِ نسخ ہے۔ رخ پر بادشاہ کے القاب اور تاریخ اجرا اعداد میں منقش ہے ساتھ ہی دارالضرب کا نام حسب روایت بادشاہوں کے ناموں کے ٹھیک نیچے لکھا گیا ہے ان سکوں کا مفصل گوشوارہ اس طرح ہے :

نمبر شمار	بادشاہ کا نام			سکوں کی تعداد
۱	تاج الدین فیروز شاہ (۸۰۰ تا ۸۲۵ ہجری / ۱۳۹۰ تا ۱۴۲۲ عیسوی)			۲۸
۲	شہاب الدین احمد شاہ اول (۸۲۵ تا ۸۳۸ ہجری / ۱۴۲۲ تا ۱۴۳۵ عیسوی)	قسم اول	۶	
		قسم دوم	۱۰	
		قسم سوم	۳	۱۹
۳	علاء الدین احمد شاہ ثانی (۸۳۸ تا ۸۶۲ ہجری / ۱۴۳۵ تا ۱۴۵۰ عیسوی)	قسم اول	۸	
		قسم دوم	۲۱	
		قسم سوم	۱۰	
		قسم چہارم	۱۴	۵۳
۴	علاء الدین ہمایوں شاہ (۸۶۲ تا ۸۶۶ ہجری / ۱۴۵۰ تا ۱۴۶۱ عیسوی)			۳
	جملہ تعداد			۱۰۳

۱۔ تاج الدین فیروز شاہ کے ۲۸ سکّے (نمبر شمار ۱ تا ۲۸) ایک معروف قسم سے ہیں جس کے رخ پر بادشاہ کا لقب اور پشت پر بادشاہ کا اصل نام شاہی لقب کے ساتھ دائرہ میں لکھا ہے۔ دارالضرب کا نام حاشیے کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن اجرائی کی تاریخ کا ذکر نہیں ہے۔ رخ پر لقب ایک سجع کی صورت میں لکھا گیا ہے جس کا "میمنی" بادشاہ کے خاندانی نام "بہمنی" کا ہم قافیہ ہے یہ موزونیت ایک خوش کن صوتی تاثر پیدا کرتی ہے۔ سکّوں کی یہ عبارتیں دراصل اس عہد کے ادبی مذاق کا ایک اچھا نمونہ ہے جب سجع نثر بھی کتبوں اور سکّوں کے جزو لازم کے طور پر مروج تھی یہ عبارتیں اس طرح ہیں:

پشت	رخ
(دائرہ میں) فیروز	راجی
شاہ بہمنی	رضوان
(حاشیے کے ساتھ) ضربہ بہ حضرت احسان آباد	میمنی

(قطر: ۱۰ ملی میٹر ۔ وزن: ۳۷ء۵ گرام)

۲ اس گنجینے میں شہاب الدین احمد شاہ اول کے ۱۹ عدد تانبے کے وہ سکّے ہیں جو تین مختلف اقسام کی نمائندگی کرتے ہیں۔

پہلی قسم کے چھ سکّے (۲۹ تا ۳۴) رخ پر بادشاہ کے لقب کے حامل ہیں اور بادشاہ کا نام (شاہی خطاب کے بغیر) پشت کی طرف منقش ہے۔ یہاں بادشاہ کے لیے شاہ کی بجائے لفظ سلطان کا استعمال ہوا ہے جو لفظ منان کا قافیہ ہے اجرا کی تاریخ بادشاہ کے نام کے نیچے دی گئی ہے۔

خصوصاً نمبر ۲۹ کی تاریخ ۸۲۶ ہجری (۱۴۲۳ تا ۱۴۲۴ عیسوی) اور نمبر ۳۰ کی تاریخ ۸۲۰ ہجری (۱۴۲۴ تا ۱۴۲۵ء) ہے نمبر ۳۱ اور ۳۲ پر بھی تاریخ درج ہے لیکن صرف ابتدائی دو اعداد پڑھے جاتے ہیں یہ ہیں ۸۳۔ نمبر ۳۳ اور ۳۴ کا تاریخ والا حصہ مسخ ہوگیا ہے ان پر عبارتیں اس طرح ہیں:

پشت	رخ
ابوالمغازی	المنصور
احمد شاہ السلطان	بی نصر اللہ
۸۲۶	المنان

(قطر: ۱۶ ملی میٹر ۔ وزن: ۲۸ء۵ گرام)

دوسرے قسم کے دس تانبے کے سکّے (نمبر ۳۵ تا ۴۰) جو اسی بادشاہ کے ہیں۔ جسامت اور وزن میں کسی حد تک پچھلے سکّوں جیسے ہی ہیں۔ صرف رخ پر خطاب اور ٹکسال کا نام حضرت محمد آباد (بیدر) اور پشت پر تاریخ مختلف ہے۔

یہاں سکّوں کی عبارت کا دل چسپ پہلو دارالضرب کا لقب "حضرت" ہے جو دارالضرب کے شہر محمد آباد (بیدر) کی اہمیت بہ طور دارالسلطنت ظاہر کرتا ہے۔ پہلے بہمنی سلطنت کی دارالخلافہ احسان آباد (گلبرگہ) تھی۔ (بہ مطابق سکہ نمبر ۱ تا

فیروز شاہ بہمنی کا ہے)۔ لیکن جب احمد شاہ بہمنی اول تخت نشین ہوا تو اس نے اپنا دارالسلطنت بیدر منتقل کرلیا اور ۱۴۲۲ء میں اس کا نام بدل کر محمد آباد رکھا۔ یہ سکہ اسی سال رائج کیا گیا جو اس تاریخی واقعہ کی تصدیق کرتا ہے۔ بہمنیوں نے اپنے سکوں میں رائج دعائی کے نام کے ساتھ حضرت کا لقب لکھنے کی روایت برقرار رکھی جو سلاطینِ دہلی، سلاطین بنگال اور اودھ کی بادشاہوں کے زمانے میں زیادہ مروج رہی۔

سکوں کی عبارت میں سب سے اوپر پشت کی جانب کچھ حروف ہیں جو اس طرح پڑھے گئے ہیں:۔ "ضربہ بہ حضرت"

نمبر ۲۵ اور ۲۶ کی تاریخ ۸۲۶ ہجری (۱۴۲۲ تا ۱۴۲۳ء) اور نمبر ۲۷ اور ۲۸ کی ۸۲۷ ہجری (۱۴۲۳ تا ۱۴۲۴ء) ہے نمبر ۲۹ کی تاریخ ۸۳۳ [۸] ہجری ہے۔ محولہ وضاحتی فہرست اس تاریخ میں جاری کسی سکے کا ذکر نہیں ملتا اس لیے یہ سکہ اہم ہے (۳)۔ نمبر ۳۰ کی تاریخ ۸۲۸ ہجری (۱۴۲۴ تا ۱۴۲۵ء) ہے جب کہ بقیہ چار (۳۱ تا ۳۴) کی تاریخ کا حصہ مسخ ہوگیا ہے ان کی عبارات اس طرح ہیں (۴)۔

رخ	پشت
المؤید	ضربہ بہ حضرت (سب سے اوپر)
بی نصر اللہ	ابو المغازی
الملک المنان	احمد شاہ السلطان

(قطر: ۱۸ ملی میٹر ۔ وزن: ۸۔۰۰۶ گرام)

تیسری قسم کے تین سکے (۴۵ تا ۴۷) اسی بادشاہ کے ہیں لیکن ذرا بڑی جسامت کے ہیں۔ رخ پر خطاب منقش ہے اور بادشاہ کا پورا نام شاہی لقب کے ساتھ پشت پر لکھا ہوا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ نام کے ساتھ تین سلسلوں تک یعنی حسن بہمن شاہ تک بادشاہ کا شجرہ نسب بھی تحریر ہے۔ آخری الفاظ خط کشیدہ ہیں جن کے ٹھیک نیچے تاریخ درج ہے۔

نمبر ۴۵، ۴۶ کی تاریخ ۸۳۳ ہجری (۱۴۲۹ تا ۱۴۳۰ء) ہے لیکن نمبر ۴۷ کی تاریخ مسخ ہو گئی ہے اس کی عبارات اس طرح ہیں (۵)۔

رخ	پشت
المستوثق	سلطان
باللہ الحنان	احمد شاہ بن احمد
المنان الغنی	بن الحسن البہمنی
	۸۳۳

(قطر: ۲۲ ملی میٹر ۔ وزن: ۱۹ گرام)

---

۴ تانبے کے ۵۴ سکے اس گنجینے کا سب سے بڑا حصہ ہیں جو علاء الدین احمد ثانی کے ہیں اور چار معروف اقسام پر مشتمل ہیں یہ مختلف اوزان جسامت اور تاریخ کے ہیں۔

پہلی قسم کے تانبے کے آٹھ سکے (نمبر ۴۸ تا ۵۵) ہیں ان کے رخ پر خطاب اور پشت پر نام مع شاہی لقب اور تاریخ درج ہے نمبر ۴۸ کی تاریخ ۸۳۴ ہجری (۱۴۳۰ تا ۱۴۳۱ء) نمبر ۴۹، ۵۰ کی ۸۳۵ ہجری (۱۴۳۱ تا ۱۴۳۲ء) اور نمبر ۵۲ کی ۸۴۸ ہجری (۱۴۴۴ تا ۱۴۴۵ء) ہے دیگر تین ۵۳ تا ۵۵ کا تاریخ والا حصہ مسخ ہوگیا ہے۔ ان کی عبارات یہ ہیں (۶)۔

رخ	پشت
المستعصم	احمد شاہ
باللہ الغنی	بن احمد شاہ
ابو المظفر	۸۴۳

(قطر : ۱۹ ملی میٹر ، وزن : ۵٫۳۲ گرام)

دوسری قسم کے تانبے کے سکوں کی تعداد ۲۱ ہے (۵۶ تا ۷۶) ۔ احمد شاہ ثانی کے ان سکوں کے رخ پر بادشاہ کے دوسرے …ب درج ہیں بادشاہ کا اصل نام مع شاہی لقب اور تاریخِ اجرا کے ساتھ پشت پر لکھا گیا ہے۔

نمبر ۵۶ کی تاریخ ۸۴۱ ہجری (۱۴۳۷ تا ۱۴۳۸ء) اور ۵۷ ، ۵۸ کی ۸۴۴ ہجری (۱۴۴۰ تا ۱۴۴۱ء) ہے نمبر ۵۹ پر صرف ۴۵ لکھا ہوا ہے اور سیکڑہ والا عدد مٹ گیا ہے جسے ۸۴۵ ہجری (۱۴۴۱ تا ۱۴۴۲ء) تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ نمبر ۶۰ اور ۶۱ کی تاریخ ۸۴۶ ہجری (۱۴۴۲ تا ۱۴۴۳ء) ہے۔ نمبر ۶۲ تا ۶۴ میں بھی صرف پہلے دو اعداد (۸۴) ہیں اور تیسرا عدد حذف ہو گیا ہے (۸۴) ۔

نمبر ۶۵ کی تاریخ ۸۵۲ ہجری (۱۴۴۸ تا ۱۴۴۹ء) ہے۔ نمبر ۶۶ کی تاریخ ۸۵۶ ہجری (۱۴۵۲ تا ۱۴۵۳ء) ہے اس سکے کا دلچسپ پہلو …ں کی تاریخ ہے۔ بہمنی سکوں کی فہرست میں جو یہاں زیرِ حوالہ ہے اس تاریخ کا کوئی سکہ مذکور نہیں ہے (۷) ۔ لہٰذا یہ سکہ اس قسم … سکوں میں اپنی تاریخ کے سبب ایک اضافہ سمجھا جانا چاہیے۔

نمبر ۶۷ بھی صرف ابتدائی دو اعداد (۸۵) کے ساتھ ہے اسی طرح نمبر ۶۸ تا ۷۰ پر صرف پہلا عدد (سیکڑہ) "۸" سلامت …سکا ہے بقیہ کچھ (۷۱ تا ۷۶) کی تاریخ کا حصہ مسخ ہوگیا ہے۔ ان کی عبارات یوں ہیں (۸) ۔

رخ	پشت
الواثق	احمد
تائید الملک	شاہ بن احمد
اللہ ابو المظفر	شاہ بہمن شاہ

(قطر : ۱۸ ملی میٹر ، وزن : ۸٫۲۳ گرام)

تیسری قسم کے احمد شاہ ثانی کے تانبے کے ۱۰ سکے تعداد میں (۷۷ تا ۸۶) ہیں جو جسامت اور وزن میں نسبتاً چھوٹے ہیں۔ …خ پر بادشاہ کا دوسرا خطاب کچھ طویل ہے آخر میں لفظ سلطان ہے جو پشت پر رحمٰن کا ہم قافیہ ہے۔ تاریخ لفظ سلطان کے …یک نیچے پشت پر لکھی ہوئی ہے۔ خصوصاً نمبر ۷۷ کی تاریخ ۸۴۰ ہجری (۱۴۳۶ تا ۱۴۳۷ء) اور نمبر ۷۸ کی ۸۴۶ ہجری (۱۴۴۲ تا ۱۴۴۳ء) …ہے نمبر ۷۹ اور ۸۰ پر صرف سیکڑہ اور دہائی کا عدد ہے۔ (۸۴) ۔ جس کا آخری عدد حذف ہو گیا ہے نمبر ۸۱ کی تاریخ ۸۵۱ … (۱۴۴۷ تا ۱۴۴۸ء) اور نمبر ۸۲ کی ۸۵۳ ہجری (۱۴۴۹ تا ۱۴۵۰ء) ہے بقیہ چار سکوں (۸۳ سے ۸۶) کی تاریخ مٹ چکی ہے ان کی …ارات اس طرح ہیں (۹) ۔

رخ	پشت
المعتصم بی صبیل	علاوالدنیا
اللہ المنان	والدین احمد شاہ
سمیہ خلیل الرحمن	بن احمد
رحمن ابوالمظفر	شاہ السلطان ۸۴۰ھ

(قطر: ۱۸ ملی میٹر ۔ وزن: ۸۰۲۳ گرام)

چوتھی قسم کے تانبے کے سکے جو کل ۱۴ (نمبر ۸۷ تا ۱۰۰) ہیں احمد شاہ ثانی کے سکوں میں ذرا مختلف ہیں ان کے رخ پر دوسرے سکوں سے مختلف دائرے میں بادشاہ کا نام اور حاشیے پر دارالضرب محمد آباد (بیدر) درج ہے۔ بادشاہ کا ابتدائی نام شاہی خطاب کے ساتھ پشت پر لکھا ہوا ہے جس کے نیچے تاریخ درج ہے خاص طور پر ۸۷ کی تاریخ ۸۴۹ ہجری (۱۴۴۵ تا ۱۴۴۶ء) اور نمبر ۸۸ تا ۹۰ کی ۸۵۰ ہجری (۱۴۴۶ تا ۱۴۴۷ء) ہے۔ نمبر ۹۱، ۹۲ ۸۵۱ ہجری (۱۴۴۷ تا ۱۴۴۸ء) کے حامل ہیں نمبر ۹۳ تا ۹۶ کی تاریخ ۸۵۲ ہجری (۱۴۴۸ تا ۱۴۴۹ء) ہے۔ نمبر ۸۵۸ ہجری (۱۴۵۴ء) اپنے اجرا کی نئی تاریخ کے ساتھ ایک اضافہ ہوسکتا ہے جس کا ذکر اس فہرست میں نہیں ہے۔ بقیہ تین سکوں ۹۸ تا ۱۰۰ کی تاریخ حذف ہوچکی ہے ان کی عبارات یوں ہے:

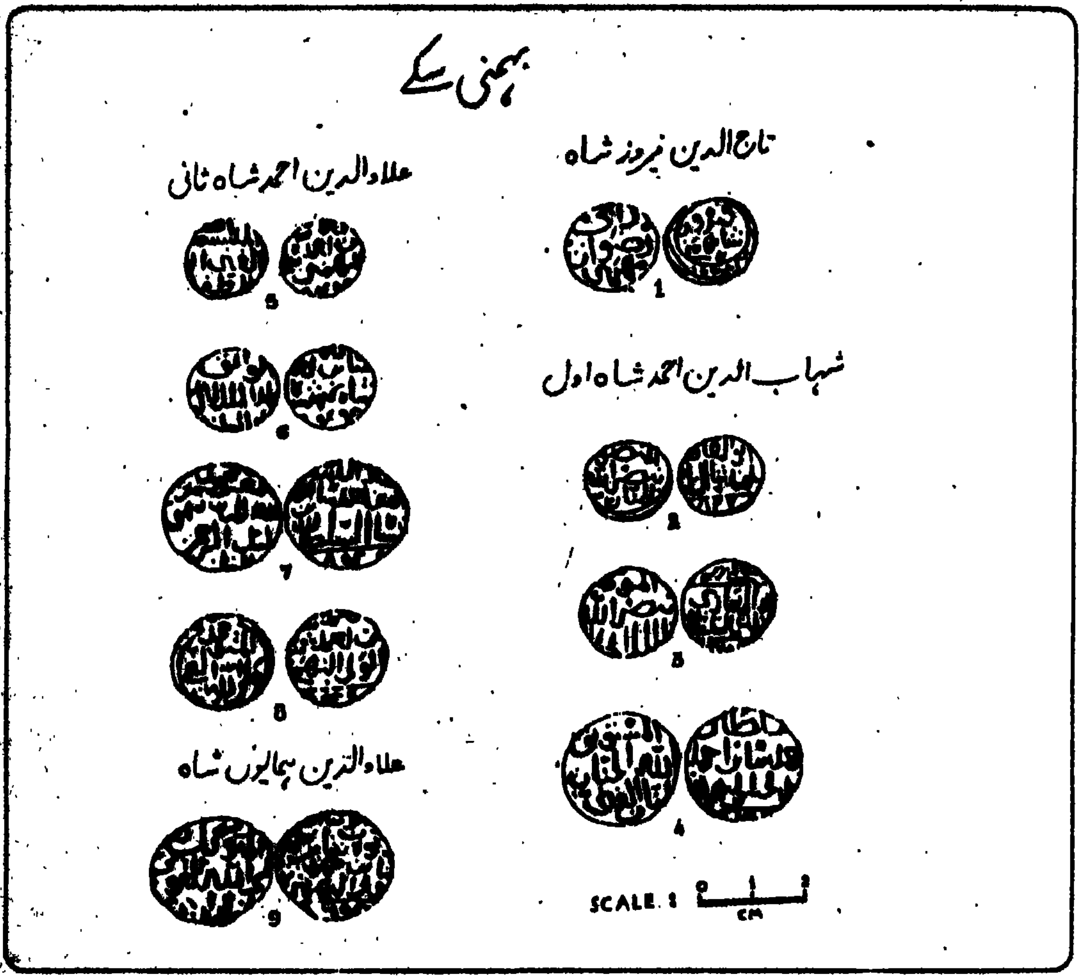
رخ	پشت
(دائرہ میں) المتوکل	احمد شاہ
علی اللہ الغنی	بن احمد شاہ
(حاشیے کے ساتھ) ضرب بہ حضرت	الولی البہمنی
محمد آباد	۸۴۹

(قطر: ۲۰ ملی میٹر ۔ وزن: ۱۰۰۶۰ گرام)

۴ علاء الدین ہمایوں شاہ کے نمائندہ سکے صرف تین تانبے کے سکے (۱۰۲ سے ۱۰۳) ہیں جو جسامت میں بڑے ہیں سکے کے رخ پر خطاب درج ہے بادشاہ کا پورا نام علاء الدین والدین ہمایوں شاہ ابن احمد شاہ الولی، خاندانی نام کے ساتھ پشت پر لکھا ہوا ہے جس کے نیچے تاریخ کندہ ہے نمبر ۱۰۱ جسامت میں ذرا سا چھوٹا ہے جس کا تاریخ والا حصہ ہے مٹ چکا ہے نمبر ۱۰۲ کی تاریخ ۸۶۳ ہجری (۱۴۵۹ تا ۱۴۶۰ء) ہے جب کہ نمبر ۱۰۳ کا تاریخ والا حصہ حذف ہوگیا ہے ان پر کی عبارات یوں ہیں (۱۱)۔

رخ	پشت
المتوکل	علاء الدنیا والدین
علی اللہ القوی	ہمایوں شاہ بن احمد
الغنی ابوالمغازی	شاہ بن احمد شاہ
	الولی البہمنی ۸۶۳

(قطر: ۲۲ ملی میٹر ۔ وزن: ۱۲۰۵۹ گرام)



حوالے :

(۱) مہاراشٹرا اسٹیٹ گزیٹیر۔ ایوت محل ڈسٹرکٹ ، بمبئی ۱۹۷۴ ، صفحہ ۵۷۲ ۔

(۲) ہارون خاں شیروانی ، ہسٹری آف میڈیول دکن جلد اول ، حیدرآباد ۱۹۷۳ صفحہ ۱۳۹ ۔

(۳) محمد عبدالولی خاں ، بہمنی کوائنز ان دی آندھرا پردیش گورنمنٹ میوزیم ، حیدرآباد ، حیدرآباد ۱۹۷۴ ، نمبر ۱۱ صفحہ ۸۱۔

(۴) پلیٹ "الف" سکہ نمبر ۲۔ (۵) پلیٹ "الف" سکہ نمبر ۳۔

(۶) ایضاً سکہ نمبر ۵ (۷) محمد عبدالولی خاں۔

(۸) ایضاً سکہ نمبر ۶ (۹) پلیٹ "الف" سکہ نمبر ۸۔

(۱۰) ایضاً سکہ نمبر ۷ (۱۱) ایضاً سکہ نمبر ۹۔

○●○

پون ورما

ترجمہ : اسامہ فاروقی

کتاب : غالب ، شخصیت اور عہد

باب : تین ـــ ایک مضطرب صاحبِ بصیرت

(قسط : ۵)

سفر سست رفتار اور دشوار تھا۔ وہ کشتی سے سفر کرنے کا مقدور نہ رکھتے تھے اور انھیں زیادہ تر گھوڑے پر سوار ہو کر یا ڈولیا یعنی بیل گاڑی پر ، تھا ، دو تین خدمت گاروں کے ساتھ نہایت ناتوانی اور کم زوری کی حالت میں ، کسی راحتِ سفر یا سہولت کے بغیر یہ سفر کرنا پڑا۔ کان پور پہنچ کر ، جہاں انھیں کوئی ڈھنگ کا معالج نہیں ملا ، انھوں نے ایک کرائے کی پالکی پر گنگا پار کی اور لکھنؤ پہنچے۔ یہاں بحالیِ صحت تک انھوں نے کئی مہینے گزارے۔ اودھ کا پایۂ تخت لکھنؤ خاصی اہمیت کا حامل تہذیبی مرکز تھا۔ یہاں کے اربابِ علم کے لیے غالب بہ حیثیت شاعر غیر معروف ہرگز نہیں تھے۔ اس وقت ان کا مقصد چوٹی کے مراکزِ سرپرستی یعنی حکم راں نواب نصیرالدین حیدر اور ان کے باثر ترین اراکینِ حکومت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا تھا۔ ان کی یہ کوشش کچھ ایسی کام یاب نہیں رہی۔ وہ نواب کے حضور میں باریاب نہ ہوسکے۔ گو کہ وہ نائب السلطنت آغا میر یا ان کے دستِ راست سبحان علی خاں کنبوہ کو اپنا طرف دار بناسکتے تھے لیکن کام یاب نہ ہوئے کیوں کہ انھوں نے ان سے اپنی ملاقات کی دو شرطیں رکھیں ، ایک یہ کہ انھیں اسی احترام کے ساتھ جس کے وہ مستحق ہیں باقاعدہ تعظیم دی جائے ، دوسرے یہ کہ انھیں رسمی نذر کی پیش کش سے معاف رکھا جائے۔ مربیوں کو ملتجی کی طرف سے شرطوں کا عائد کیا جانا اچھا نہیں لگتا۔ ایسا لگتا ہے کہ نواب سے ملاقات کی کوئی شکل نہ نکلنے کے بعد غالب کو اس مہم سے کوئی خاص دل چسپی نہیں رہی تھی ، انھوں نے نائب السلطنت کے ہاں پیش کرنے کے لیے دستور کے مطابق قصیدہ نہیں بلکہ نثر میں ایک مدحیہ عبارت لکھی تھی۔ یہ واقعہ غالب کی زندگی میں سرپرستانہ امداد کے سرچشموں کی تعظیم و تکریم پر آمادہ کرنے والی ان کی مالی حالت اور ایک شاعر اور طبقۂ امرا کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنی قدر و قیمت پر ان کے اس یقین کے درمیان مستقل کش مکش کی بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے جس کی رو سے غلامانہ ذہنیت کا کوئی بھی اظہار ان کے لیے باعثِ ذلت تھا۔ یہ کش مکش اکثر انھیں اظہارِ احترام میں جھکنے کے تمام مراحل سے گزارتی لیکن ، آخر میں وہ پھر سینہ تانے کھڑے ہوجاتے۔ اس زمانے میں جب کہ ان کی زندگی بسر ہوتی وہ تونگروں اور صاحبانِ اختیار کی شان میں قصیدے لکھنے سے احتراز نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن اس طرح کے قصائد ان کی تخلیقی زندگی اور فن کا کم زور ترین پہلو تھے۔ اپنے کلیاتِ فارسی کے حصے میں وہ افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی نصف زندگی نادانوں کی مدح سرائی میں ضائع ہوئی۔ اسی وجہ سے ان قصائد کے سراسر مدحیہ [illegible] پھس پھسے ہوتے ہیں جب کہ تشبیب ہمیشہ زوردار ہوتی ہے۔ غالب کو اپنے قصیدے کے ممدوح کے مقابلے میں خود اپنے تفوق کا شدت سے احساس رہتا

اور وہ اکثر کنایتہً خود اپنی تعریف کے چند الفاظ قصیدے میں شامل کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ بڑی استادی سے ڈھونڈھ ہی نکالتے تھے ۔

لکھنؤ سے وہ مئی ۱۸۲۷ء میں روانہ ہوئے اور بہ راہِ باندا (جہاں کے نواب ذوالفقار علی بہادر ان سے واقف تھے اور جنھوں نے ی کچھ مالی اعانت بھی کی تھی) و الہ آباد (جس شہر نے ان پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا) بنارس پہنچے ۔ بنارس نے انھیں بے حد متاثر کیا ۔ یاں انھوں نے علاقہ نورنگ آباد میں واقع ایک کرائے کی حویلی میں تقریباً چار ہفتے قیام کیا ۔ ان نئے مقامات کے تعلق سے جو انھوں دیکھے غالب کا پُر جوش ردِ عمل ان کے سچے شوقِ سفر کا آئینہ دار ہے ۔ یہی کی وجہ سے وہ کسی شہر میں اپنے شخصی تجربے اور معروضی دم میں اس شہر کی قدر و قیمت میں فرق کر پاتے تھے ۔ لکھنؤ میں شاہی سرپرستی کے حصول کی اپنی کوششوں کی ناکامی کے باوجود خود شہر کی ں میں وہ بخل سے کام نہیں لیتے ۔ وہ لکھتے ہیں : " لکھنؤ کا کیا کہنا ! وہ ہندستان کا بغداد تھا ۔" (خط بہ نام سیاح ۳۰۰ / جون ۱۸۶۰ء) ۔

دلی سے رخصت ہونے کے تقریباً ایک سال بعد غالب فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے ۔ وہ شہر میں نووارد ضرور تھے لیکن اجنبی ں تھے ۔ سارے سفر کے دوران تقریباً ہر اہم شہر میں ان کے دوست تھے ۔ یہ بہ حیثیت شاعر ان کی بڑھتی ہوئی شہرت کی اور غیر ترقی ذرائع ترسیل اور طویل فاصلوں کے باوجود شمالی ہندستان میں جاگیردار روداروں کے درمیان روابط کے ایک غیر رسمی نظام کی موجودگی کی بت ہے ۔ وہ شملہ بازار میں مرزا علی سوداگر کی آرام دہ حویلی میں اقامت پذیر ہوئے جس کا دس روپے ماہانہ کرایہ ان کے ایک دوست موہن لال کے ذریعے طے ہوا ۔ چند ماہ قبل نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہوچکا تھا ، چناں چہ کام کو بہ تعجیل بسر انجام دینا اور بھی ری ہوگیا تھا ۔ غالب چیف سکریٹری اینڈریو اسٹرلنگ اور اسسٹنٹ سکریٹری سائمن فریزر کی ملاقات کو گئے ۔ ملاقات پُر تپاک تھی ۔ لہ گورنر جنرل کی کونسل کے سامنے پیش ہوا اور طے ہوا کہ اسے فیصلے کے لیے دلی میں متعین انگریز ایجنٹ کے ذریعے پیش کیا جانا ہے کیوں کہ مس در آمد کے لحاظ سے متعلقہ عہدہ دار وہی ہے ۔ غالب اس کے خلاف نہیں تھے ۔ دلی میں انگریزوں کے ایجنٹ سر ایڈورڈ بروک سے ان کی واقفیت تھی ۔ غالب بہ ذاتِ خود ڈاک خانے گئے اور وہاں انھوں نے دس روپے خرچ کر کے دلی میں اپنے وکیل ت ہیرا لال کے نام مختار نامہ اور سبھی دوسرے متعلقہ کاغذات اس ہدایت کے ساتھ بہ ذریعہ ڈاک روانہ کیے کہ وہ کول بروک سے ق مطلب رائے حاصل کریں ۔ کلکتے میں اخراجات کی پابجائی کے لیے باندا کے نواب نے مزید کچھ رقم مستعار بھیجی تھی ۔ غالب کے ن خدم و حشم میں تین خدمت گار تھے اور ایک کہار ۔ وسائل میں اضافے کے لیے انھوں نے اپنا گھوڑا ڈیڑھ سو روپے میں بیچ دیا اور اپنا ٹ ماہانہ پچاس روپے مقرر کیا ۔ پھر خاصی خوش امیدی کے ساتھ وہ یک سو ہو کر لمبے دور کا انتظار کرنے لگے ۔

انتظار کا یہ عرصہ جیسا بھی ہو اہم واقعات سے خالی بالکل نہیں تھا ۔ غالب کا قیامِ کلکتہ اس طولانی اور بغض و حسد پر مبنی ادبی قضے کے حوالے سے بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہے جس میں مرکزی حیثیت غالب کو حاصل تھی ۔ کلکتے میں ہر ماہِ شمسی کے پہلے اتوار کو مدی سے ایک مشاعرہ منعقد ہوتا تھا ۔ غالب کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی اور یہاں انھوں نے دو فارسی غزلیں پڑھیں ۔ معین کی تعداد اچھی خاصی تھی ، بہ قولِ غالب پانچ سو افراد موجود تھے ۔ ان میں سے بعض نے غالب کے اشعار میں مستعمل کچھ لیب الفاظ پر اعتراض کیا اور اپنے دعوے کے ثبوت میں بہ طورِ سند اٹھارویں صدی عیسوی کے مشہور ہندستانی شاعر اور فارسی کے قتیل کا حوالہ دیا ۔ غالب بگڑ گئے ۔ دلی میں اپنے ابتدائی دنوں میں انھوں نے اپنے اشعار پر اس تنقید کا کہ یہ ناقابلِ فہم ہیں برا مانا ۔ لیکن اب زبان کی غلطی کا الزام ، وہ بھی فارسی میں ، جس پر عبور کو وہ اپنی امتیازی خصوصیت سمجھتے تھے ، ناقابلِ برداشت تھا ۔ ں نے فارسی زبان فارسی اساتذہ کے کلام کے مطالعے سے سیکھی تھی ۔ اس زبان پر ان کو پورا عبور حاصل تھا اور یہ تیقن تھا بسا با

مل کے جامعقداد مطالعہ کا ۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں : " فارسی میں مبدء فیاض سے مجھے وہ دست گاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں ، جیسے فولاد میں جوہر ۔ " چناں چہ ایک ہندستانی شاعر قتیل کی سند کو انھوں نے فوراً مسترد کردیا حالاں کہ زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی جب یہ موضوع زیرِ بحث آتا ہے تو غالب کے قلم سے آگ برستی ہے ، وہ قتیل کو الو کا سے پیچھے نہیں ہٹتے ، فارسی میں استناد کا دعویٰ کرنے والے ہندستانیوں کو جھاڑ سناتے ہیں اور انکسار کی کسی ہچکچاہٹ کے بغیر باور کرادیتے ہیں کہ گو کہ وہ خود ہندستانی ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ دوسروں کے برخلاف فارسی کی میزان حق و باطل ان کے ہاتھ میں ہے

قتیل ایک نومسلم تھے ۔ ان کا اصلی نام دلوالی سنگھ تھا ۔ بہ حیثیت ایک عالم کے ان کی بڑی عزت تھی اور شاگردوں اور مداحوں کی بہت بڑی تعداد تھی ۔ غالب نے اپنے نکتہ چینوں کو برہمی کے ساتھ اور خلافِ قاعدہ وار کرتے ہوئے یہ دیا کہ میں فرید آباد کے کھتری دلوالی سنگھ کی سند تسلیم نہیں کرتا ۔ اس پر برپا ہونے والا ہنگامہ نہ ہی غیر متوقع تھا اور نہ ہی گا محدود ۔ اپنے ایک خط میں غالب ذکر کرتے ہیں کہ نتیجتاً وقوع پذیر ہونے والے ادبی مناقشے میں ان کی مخالفت میں پیش پیش کرم حسین بلگرامی ، مولوی عبدالقادر رام پوری ، پٹنہ کے مولوی نعمت علی اور غالباً لکھنؤ کے مولوی علی احمد اور وجاہت حسین اخلاص تھے ۔ ان کے حامیوں میں نواب اکبر علی خاں اور سراج الدین احمد خاں جیسے کلکتہ کے پرانے دوست شامل تھے اور خا بات یہ کہ کفایت خاں بھی جو ہرات سے بہ عہدہ ، سفارت کلکتے میں وارد ہوئے تھے اور جن کی مادری زبان فارسی تھی ۔

مناقشہ جب تک جاری رہا اس سے غالب کو شہرت تو ضرور ملی لیکن ایک مرحلے پر پہنچ کر انھوں نے یقیناً اندازہ لگ کہ اس طرح کی نام وری دو دھاری تلوار کا بھی کام دے سکتی ہے ۔ حلقہ ، احباب کو وسعت دینے اور لوگوں کو متاثر کرنے کا اس سے قطعاً پورا نہیں ہوسکتا تھا ۔ غالباً شروع میں بہ حیثیت ایک اہلِ علم قتیل کی قابلیت کے بارے میں غالب کے خیالا ملامت آمیز یا حقی نہیں تھے ۔ یہ خود ان کی فارسی دانی پر ذراسی بھی تعریض برداشت نہ کر پانے کی ان کی عادت تھی جس نے نامناسب وشنام آمیز الفاظ میں اپنے بے ساختہ ردِ عمل کے اظہار پر برانگیختہ کیا تھا ۔ بدقسمتی سے اس مناقشے کے بعد راہِ عمل ہم لیے طے ہوگئی اور اپنے ناقدرشناسوں اور بدگویوں کے تعلق سے ان کے دل میں جذبہ ، تنفر تازیست برقرار رہا ۔ لیکن فی الحال نے اپنا نقطہ ، نظر خاصا واضح کردیا تھا ۔ دانش مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ اب مصالحت کرلی جائے تاکہ اس تلخی اور درشتی کا سدِ جائے جس سے ان کے ، بہ شمول مقدمہ ، پنشن ، دوسرے مفادات کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے ۔ ان کے احباب کا بھی یہی م اور چناں چہ غالب نے ایک معذرت نامہ بہ عنوان " بادِ مخالف " تصنیف کیا ۔ لیکن ان کے بہت سے قصائد کی طرح بہ معذر کے طور پر لکھی گئی اس مثنوی کے اصل مفہوم کے بارے میں بھی شاید ہی کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے ۔ وہ خیر محتاط طرز سے معافی کے خواست گار ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے موقف کی معقولیت کے بھی مدعی ہیں ۔ وہ اپنے حریفوں کی ایسے مبالغہ آ میں تعریف کرتے ہیں کہ ان کا طنز کسی سے چھپا نہیں رہتا اور پھر بہ طور اظہارِ امر واقعہ کہتے ہیں کہ لوگ انھیں سعدیِ ثانی کہتے وہ مبالغہ آمیز فروتنی کے رونے کی مضحک نقل کرتے ہوئے اپنے مخالفین سے ہم دردی کی التجا کرتے ہیں مگر دوسرے ہی لمحے کہ وہ معرکہ ، کارزار میں کبھی ہمت نہیں ہارتے ۔ آخر میں وہ سب سے صلح صفائی کی پُر جوش استدعا کرتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ سے انھوں نے معاف کرنے اور بھول جانے کی استدعا کی تھی سوچتے رہے ہوں گے کہ آیا خود انھوں نے بھی ہمارے ساتھ معاف کرنے اور بھول جانے کا سلوک کیا ہے یا نہیں ۔

ان کی یہی ادبی سرگرمیاں اتنی ہنگامہ خیز یا بلند آہنگ نہیں تھیں ۔ اپنے دوست نواب سراج الدین کی صلاح سے انھوں نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا ایک مجموعہ " گلِ رعنا " مرتب کیا ۔ چھاپہ خانے کی یہ دولت ، جو کلکتے میں آچکا تھا لیکن جسے دلی میں ابھی کئی سال درکار تھے ، وہ جدید فارسی اور اردو نثر سے اور ممکن ہے کہ حال میں قائم شدہ فورٹ ولیم کالج کی طرف سے کئے گئے انگریزی ادبیاتِ عالیہ کے تراجم سے بھی واقف ہوچکے تھے ۔ کلکتے سے متعدد اخبار شائع ہوتے تھے (اس ادارے کو دلی آنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا) اور یہیں غالب کو عمر بھر کی اخبار بینی کی عادت پڑی ۔ انگریزوں کا دارالحکومت اور برِّ صغیر کی سب سے بڑی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے ، برطانوی موجودگی کی بہ دولت بہ روئے کار آنے والی تبدیلیوں کے مشاہدے کے لیے دلی کے مقابلے میں کلکتہ بہ حیثیت مجموعی کہیں زیادہ وسیع اسٹیج فراہم کرتا تھا ۔ ان میں سے بعض بالخصوص چھاپہ خانہ ، نظام لاسلکی ، دخانی انجن جیسی جدید ولایتی کی اختراعات غالب کے ذہن پر ایک دیرپا اثر چھوڑیں گی ۔ بہ ظاہر یہ شہر دوسرے روایتی دل بہلاووں میں بھی کسی سے کم نہیں تھا ۔ اسی زمانے میں لکھی ہوئی ایک نظم میں غالب کلکتے کے نفیس بادہ ، ناب ، اس کے رسیلے میووں ، اس کے سبزہ ، فراواں اور سب سے بڑھ کر وہاں کی عورتوں کی دل فریبی کی پُر جوش مدح سرائی کرتے ہیں ۔ وہاں کے آموں نے ان کو خاص طور سے متاثر کیا ، ان کا ادعا ہے کہ ثمراتِ بہشت بھی ان کی خوش بو اور ذائقے کی یاد کو ان کے ذہن سے محو نہیں کرسکتے ۔

پنشن کے مقدمے میں ، جو ان کے کلکتہ جانے کی اصل وجہ تھا ، موافق مطلب فیصلے کے حصول کی ان کی مساعی ، جیسا کہ دیکھ چکے ہیں ، بار آور نہیں ہوئیں ۔ آخری فیصلہ صادر ہونے تک وہ واقعات کے موڑ سے برہم اور دل شکستہ ، دلی واپس جاچکے تھے ۔ صریحی طور پر انگریزوں کے تعلق سے ان کے احساسات میں بڑی تلخی تھی :

گفت ایں ماہ پیکراں چہ کس اند ؟ گفت خوبانِ کشورِ لندن

گفتم ایناں مگر دلے دارند ؟ گفت دارند لیکن از آہن

ooo

(پوچھا ہیں کون سب یہ مہ پیکر ۔ کہا لندن کے ہیں یہ سب دل بر

پوچھا سینے میں ان کے دل ہے کیا ؟ کہا ، ہے ، لیک ہے وہ لوہے کا !)

(ترجمہ ، مظفر مجاز)

گو کہ وہ حیرت انگیز مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے اس معاملے کی پیروی کرتے رہے وہ انگریزوں سے کبھی بھی ابتدائی پانسو روپے آٹھ آنے سے ایک پیسہ بڑھ کر حاصل نہ کرپائے ۔ تاہم ان کی اس امید کو کہ یہ ممکن ہے اور اس سلسلے میں بیس سال سے زیادہ رہے پر امید ان کی لگاتار کوششوں کو ان کی زندگی کے ایک اہم رشتہ ، امید و سعی و ناکامی کی حیثیت حاصل ہے ۔ اس نے ان کے تصورِ زندگی اور دوسروں کے ساتھ تعلقات پر ان مٹ نقش چھوڑا ہے اور ان کی حیات کے کسی بھی مطالعے میں اسے ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے ۔

جب غالب کلکتے سے واپس ہوئے تو ان پر چالیس ہزار روپیہ واجب الادا تھے ، اور یہ رقم اس زمانے کے لیے بہت بڑی تھی ۔ مقدمے کے انجام سے قرض خواہ واقف تھے ۔ اس خوش مزاجی اور بے باکی کے ساتھ ان کو ٹال دینا اب ممکن نہ تھا ، جس سے کام لیتے ہوئے کلکتہ جانے سے قبل وہ ان سے نپٹے تھے ۔ ان کا پیمانہ ، صبر لب ریز ہوچکا تھا ؛ ۱۸۳۵ء میں ان کے خلاف کچھ نہیں تو چار ڈگریاں صادر ہوچکی تھیں ۔ غالب کے لیے دو ہی راستے کھلے تھے ، یا تو قرض ادا کریں اور یا پھر جیل جائیں ۔ ادائگی قرض کا کوئی وسیلہ

نہ تھا لیکن خوش قسمتی سے وہ جیل جانے سے خود کو بچا سکتے تھے کیوں کہ اس زمانے میں عام وہ اشخاص • جب تک کہ وہ گھر کی چار دیواری میں ہوں • حراست سے مستثنیٰ تھے ۔ جب تک وہ گھر کے باہر نہ نکلیں محفوظ تھے • لیکن یہ شاید ہی مسئلہ کا قبول یا مناسب حل تھا ۔ چار ماہ تک وہ اپنے ہی گھر میں اس طرح قید رہے کہ باہر قدم رکھنے کی ہمت نہ تھی ۔ جیسا کہ ہیں کہ ان کے جیسے مزاج کے آدمی کے لیے یہ اذیت کسی کافر کے دوزخ میں سو سال کے عذاب سے دو چند تھی ۔

ایسا لگتا ہے کہ ایک موقع پر عدالت میں ان کی بہ ذاتِ خود حاضری ناگزیر تھی ۔ مفتی صدرالدین آزردہؔ صدر تھے ۔ انھوں نے غالب سے دریافت کیا کہ آیا انھیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے ۔ اس پر غالب نے اپنا مشہور شعر پڑھ کر سنایا

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

آزردہ مسکرائے • مقدمے کا فیصلہ غالب کے خلاف صادر کیا اور واجب الادا رقم اپنی جیب سے سرکاری خزانے میں داخل کی ۔

لیکن دراصل دیکھا جائے تو اس صورتِ حال سے شاعر کو پہنچنے والے صدمے کو نہ تو اس کی طنز آمیز ظرافت کم کر سکی نہ ہی آزردہؔ کی کریم النفسی ۔ پنشن کے مقدمے میں ناکامی کا مطلب تھا مالی نقصان ۔ یہ بدقسمتی کی بات تھی لیکن برداشت کے قابل تھی ۔ یہ نازک وقت بھی گزر ہی جائے گا • اور کوئی چیز رہن رکھ دی جائے گی • نئے ساہوکار مل جائیں گے ۔ اس کے علاوہ وہ نادار مرزا صاحب تو تھے نہیں • یہ تو طبقۂ امرا کی ابتری کا زمانہ ہی تھا ۔ دراصل جو بات ناقابلِ برداشت تھی وہ تھا وہ دھکا جو وقار کو پہنچا تھا • ممتاز امیر زادہ غالب کی درخواست کسی بھی عامی کی مرضی کی طرح سے انھی لوگوں نے نامنظور کی تھی جن سے بے تکلفی کا اسے بڑا دعویٰ تھا ۔ ان کی نظر میں اس امیرزادے کی قدر و قیمت اب سب پر ظاہر ہو چکی تھی ۔ یہ حقیقت اب تھی کہ اس کے پاس وہ اثر و رسوخ تھا نہ مطلوبہ روابط اور نہ ہی اس کی انگریزوں کے ساتھ ایسی بے تکلفی تھی جو لوگوں کو سماج کی وقعت کا احساس دلا سکتی ۔ یہ ادعا کہ نئے حاکم انگریز • سماج میں اس کے رتبے کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی ضروریات کے تعلق نقطۂ نظر رکھتے تھے • ایک خیالی افسانہ تھا جو اس نے بڑے جتن سے گھڑا تھا ۔ اس خیالی افسانے کا پول اب کھل چکا تھا ۔ اس پر یہ کہ اس کے حریف نواب شمس الدین نے ثابت کردیا تھا کہ ان کا دعویٔ استحقاق انگریزوں کی نظر میں زیادہ معتبر تھا ۔ اس طرح کے مقدمے میں ناکامی معاشرے میں وقعت کھو دینے کے بھی مرادف تھی ۔ غالب کی ساری دوڑ دھوپ کے تعلق سے انگریز کی نے انھیں خود اپنے ہم سروں کی نظر میں ذلیل کردیا تھا ۔ اس نے ان کی انا کو بری طرح چوٹ پہنچائی تھی ۔ برہمی اور دل شکستگی کے عالم میں انھوں نے طے کیا کہ اپنے ہم سروں کی صحبت سے احتراز کرتے ہوئے خود کو اپنی ذات میں محدود کرلیں گے • کیوں کہ بہتیرے انھیں اپنے برتاؤ اور بے ڈھنگی گفتگو سے ان کی ہزیمت کو یاد دلانے سے چوکتے نہیں تھے ۔

۱۸۳۵ ء میں غالب کے مخالف نواب شمس الدین کو دہلی میں برطانوی ریزیڈنٹ ولیم فریزر کے قتل کی سازش کے الزام میں برسرِ عام پھانسی دی گئی ۔ یہ دہلی میں ۱۸۵۷ ء سے قبل کا انتہائی سنسنی خیز واقعہ تھا ۔ فریزر کو ۲۲ / مارچ ۱۸۳۵ ء کو اس وقت قتل کر ہلاک کردیا گیا تھا جب وہ راجہ کشن گڑھ کی کوٹھی میں منعقدہ ایک دعوت سے واپس آرہا تھا ۔ قاتل کریم خان کا سراغ لگا اس نے اقرار کیا کہ شمس الدین نے اسے معاوضہ دے کر اس کام کو سرانجام دینے پر مقرر کیا تھا ۔ اس خاندانی نزاع میں ... الدین خاں کے سوتیلے بھائیوں کا طرف دار تھا ۔ شمس الدین خاں کے لیے فریزر کو بے دردی سے ختم کرنے کی وجہ تحریک ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان ڈرامائی واقعات سے غالب کو بھی گہرا تعلقِ خاطر تھا ۔ ولیم فریزر ایک اچھا دوست تھا جب کہ شمس الدین

نے دشمن تھے ۔ پنشن کے مقدمے کے بعد انگریزوں سے ان کی ناراضگی نے انھیں انگریزوں کی دوستی کا کوشاں ہونے کی اہمیت سے
ں نہیں بنایا تھا بہ شرطے کہ وہ قابلِ رسائی ہوں ۔ بادی النظر میں فریزر کے قتل پر ان کا رنج و ملال سچا دکھائی دیتا ہے ۔ اسی
نے میں تحریر شدہ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ اس قتل سے میرے لیے باپ کی موت کا غم تازہ ہوگیا ، دل بےقابو ہوگیا اور
ے خیال و حال پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے ۔ اگر مبالغے کو نظر انداز بھی کریں تو صاحب بہادر جیسے اہم سرپرست سے محروم
جانے پر ان کی غم گینی کا اندازہ لگایا ہی جاسکتا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تحقیقات میں جو شمس الدین خاں کی گرفتاری کا
ث ہوئیں غالب بھی شریک تھے ۔ انھوں نے ایک خط میں اس کا صریحاً اعتراف بھی کیا ہے جس میں وہ ذکر کرتے ہیں کہ شہر کا
شربٹ ان سے واقف تھا اور واقعہ کی حقیقتِ حال تک پہنچنے اور قاتل کو رنگے ہاتھ پکڑنے میں اس نے ان سے بھی مدد لی تھی ۔
ورتِ حال کا یہ پہلو باشندگانِ دلی سے ، جن کی وفاداریاں شمس الدین خاں کے ساتھ تھیں ، چھپا نہیں رہ سکتا تھا ۔ عام خیال یہ تھا
شمس الدین خاں معصوم ہیں ، انھیں سازش کا شکار بنایا گیا ہے اور دامِ فریب میں پھانسا گیا ہے ۔ بہتیروں کی نظر میں ان کی حیثیت
ے شہید کی تھی ۔ چناں چہ تعجب کی بات نہیں کہ شمس الدین خاں کی گرفتاری میں حکام سے ملی بھگت کے شبہ میں غالب کو بڑی
ت ملامت کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی مقبولیت اور شہرتِ عامہ بےحد متاثر ہوئی ۔

شمس الدین خاں کی گرفتاری اور انھیں پھانسی دینے پر عام برہمی اس فی الوقت ابتدائی مل جل کی نشان دہی کرتی ہے جو
۱۸ء کی بغاوت میں منتج ہوگی ۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو زیادہ گہرے مطالعے کا سزاوار ہے ۔ بلاشبہ غالب کو کاسہ لیسی کا الزام دینا
ے انصافی ہوگی ۔ ان کا ردِ عمل شمس الدین خاں سے دشمنی اور فریزر سے دوستی کے محدود چوکھٹے پر مبنی تھا ۔ مخالف انگریز سیاق و
ق میں قوم پرستی کو ابھی ایک متاثر کن عامل کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی ۔ بہ ہر حال اس سارے واقعے سے انھیں نقصان کے
وہ کچھ ہاتھ نہیں آیا ۔ فریزر کی موت کے ساتھ انھوں نے ایک کارآمد دوست کھو دیا اور اپنے ہندستانی بھائیوں کی لعنت ملامت کے
ر الگ بنے ۔ اور فائدہ خاک نہ ہوا ۔ گو کہ شمس الدین خاں کی جاگیر ضبط ہوجانے کے نتیجے میں اب انھیں پنشن راست انگریزوں
ے خزانے سے ملنے لگی تھی ، اس کی رقم کے اضافے کے لیے ان کی تمام مساعی ناکام ہی رہیں ۔

پنشن کے مقدمے اور شمس الدین خاں کے واقعے کا ناخوش گوار نتیجہ یہ نکلا کہ غالب زیادہ تر خانہ نشین رہنے لگے ۔ ان کی
بی ایک نہایت راسخ العقیدہ خاتون تھیں ، غالباً ناخواندہ تھیں اور یقیناً اس قبیل کی نہیں تھیں کہ ان کے آزاد خیال طرزِ زندگی اور
ے دن کی بے راہ رویوں کو نظرِ کرم سے دیکھیں ۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنی معمول کی عبادات اور روزوں میں اتنی مشغول رہتی تھیں کہ
ب نے اپنے گھر کو مذاق میں مسجد فتح پوری کا نام دے دیا تھا ۔ اس میں شک نہیں کہ اس لحاظ سے ان دونوں کے درمیان بہت
ایاں فرق تھا کیوں کہ مذہبی رسوم کے تعلق سے بےاعتنائی میں غالب بھی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے ۔ اسی وجہ سے بہ قول حالی بے
اری اپنے کھانے پینے کے برتن شوہر کے استعمال کے برتنوں سے الگ رکھتی تھیں ۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی ، سات بچے پیدا
ئے لیکن کوئی بھی سوا سال سے زیادہ نہ جیا ۔ اپنے ایک خط میں غالب اس کا سرسری ذکر کرتے ہیں ، لیکن اس سے پیدا ہونے
لے گہرے خلا اور احساسِ محرومی کو گھٹا کر دکھانا ممکن نہیں ۔ اپنی بیوی سے ہم خیالی کا فقدان اس زمانے کے لیے کوئی غیر معمولی
ات نہیں تھی ۔ مرد تعلیم یافتہ اور دنیا کے مسائل کے ہم قدم ہوتے تھے ، جب کہ عورتوں کو جو زیادہ تر ناخواندہ ، پردہ نشین اور گھر
چار دیواری کے باہر قدم نہ نکالنے والی ہوتیں ، مندھی کی تعریف کے بالکل مطابق تنگ نظر اور صرف فضول گپ بازی اور خانہ داری

کے دنیوی مسائل سے علاقہ رکھنے والا سمجھا جاتا ۔ اس فاصلے آپ کے درمیان بیچ پُل کا کام دیتے ۔ ان کی غیر موجودگی سے اس ا
اور تسکین کی بیخ کنی ہوتی تھی جو روایات کی رو سے گھر بار اور رشتہ ، ازدواج سے حاصل ہوتی تھی ۔

غالب کے خطوط میں رشتہ ، ازدواج کے ذکر سے ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ اسے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ سمجھتے تھے بھتیجے دوستوں کو ان کا مشورہ یہ تھا کہ " پیو ، کھاؤ ، مزے اڑاؤ ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو ، شہد کی مکھی نہ بنو ۔" دوسروں کے ملاحظے میں سرلیتے ہوئے یہ پرانا قول پیش کرتے تھے کہ آدمی کو دو باتوں سے احتراز کرنا چاہیے ، ایک تو شادی ۔ چاہے دلہن شاہ زادی ہی کیوں نہ ہو اور دوسرے قرض لینے سے ، چاہے اسے چکانے کی مدت قیامت تک ہی کیوں نہ ہو ۔

ایک مشہور خط میں جس میں وہ اپنی زندگی کے اہم واقعات کا خلاصہ علامتی طرز میں بیان کرتے ہیں وہ اپنی شادی کا ذکر ان الفا میں کرتے ہیں : " ساتویں رجب ۱۲۲۵ ہجری کو میرے واسطے حکم دوامِ حبس صادر ہوا ۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی ۔ ۔ ۔" ایک ا دوست کی غالبا دوسری بیوی کی موت پر غالب اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہیں : " امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپ واسطے رشک آتا ہے ۔ اللہ اللہ ! ایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ اوپر پچاس برس سے جو پھانس کا پھندا گلے میں پڑا ہے ، تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے ، نہ دم ہی نکلتا ہے ! "

ہمیں غالب کی ان باتوں کے ضرورت سے زیادہ لفظی معنی مراد نہیں لینے چاہییں ، ان کی اس طرح کی رائے زنی بیش استہزائیہ ہوتی تھی ، رشتہ ، ازدواج کے تعلق سے مردوں کی روایتی ناپسندیدگی کا ایک جزو تھی اور سنجیدہ شکایت سے زیادہ اسلوب بیان ا طرزِ ادا کی غرض سے کی جاتی تھی ۔ " اگر وہ اپنی اس شکایت کے تعلق سے سنجیدہ ہوتے کہ ان کی شادی سزائے حبسِ دوام تھی تو اسے اہانت آمیز اور غلط قرار دیتے ۔ لیکن ان کے خطوط دل آویز غلط بیانیوں سے بھرے ہوئے محض خوش بیانی کے نمونے ہیں ۔" اس میں شک نہیں کہ بیڑیاں تکلیف ضرور دیتی تھیں لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ وہ ان کے عادی ہوگئے ۔ بیوی کے ساتھ ہم خیالی کے فقدان وجہ سے ازدواجی رابطے میں کم زوری ضرور آئی لیکن وہ نیست و نابود نہیں ہوا ۔ ساری عمر اکٹھا بسر کرتے ہوئے امراؤ بیگم اور غالب ۔ اپنے اختلافات سے سمجھوتا کرلیا اور وقت کی رو میں ایک ساتھ بہنے پر راضی ہوگئے ۔ تاہل کی زندگی کے لیے ایسا موڑ زمانے سے بالکل غیر آہنگ بھی نہیں تھا اور ان حدود کے اندر اس امر کی شہادت ہے کہ میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کی عزت اور لحاظ کرنے کا مقدا رکھتے تھے ۔ دن میں کسی نہ کسی وقت غالب ہمیشہ کچھ وقت زنانے میں امراؤ بیگم کے ساتھ گزارتے اور اپنی طرف سے ، اپنے مذہبی معمولا کے باوجود بیوی اپنے شوہر کی ضروریات کا خیال رکھنے سے کبھی نہ چوکتیں ۔ غالب ویسے گھر بار کی ذمہ داریوں سے غافل رندِ خوش باش ب نہیں تھے جیسا کہ وہ خود کو ظاہر کرنا پسند کرتے ہیں ۔ ڈومنی والا معاشقہ شاید اس طرح کا آخری واقعہ تھا ۔ علائقِ دنیوی کا بوجھ ، بالخصوص مالی دشواریوں کے وقت ، ان کو ناگوار ضرور گزرتا تھا ۔ لیکن یہ غیر قرینِ قیاس ہے کہ انھوں نے ایک صاحبِ اہل و عیال کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے پیچھا چھڑانے کے بارے میں کبھی سوچا بھی ہو ۔ اس کے برعکس وہ اپنی حلقہ بگوشی میں اضافے پر خوش تھے ۔ اپنی اولا نہ ہونے کے پیشِ نظر انھوں نے اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں کو اپنا منھ بولا بیٹا بنالیا تھا ۔ تبنیت کی تاریخ کا علم نہیں لیکن علم ہے کہ غالب ان کو بہت چاہتے تھے ۔ زین العابدین خاں اچھے شاعر تھے اور انھوں نے " عارف " تخلص اختیار کیا تھا ۔ وہ غالب کے لیے مستقل فکر و مسرت کا سرچشمہ تھے ۔ عارف ، ان کی بیوی اور ان کے دو بچے غالب ہی کے ساتھ رہتے تھے ۔ غالب کے خطوط سے ا بال بچوں کے ساتھ ان کے تعلقِ خاطر کی کافی شہادت دست یاب ہے ۔ عارف کے دو بیٹے ، باقر علی اور حسین علی بالخصوص ان پر جا

والے دادا تا ۔ ۔ ۔ تھے۔ فی الحقیقت بچوں سے غالب کی محبت ان کی سیرت کا نہایت دل پذیر پہلو ہے جس سے لوگ کم ہی ہیں۔ ان کے ~~بھتیجے~~ دوستوں کی آل اولاد کے لیے وہ "چچا" تھے اور یہ چچا حضرت ان بچوں کی خیریت دریافت کرنا کبھی نہیں تھے۔ مثال کے طور پر یہاں ہم ایسے ہی ایک دوست کے نام خط کا ایک دل چسپ اقتباس پیش کرتے ہیں: "میرا بھتیجا اور بیاری کس طرح ہے۔ پہلے خط سے معلوم ہوا تھا کہ وہ دوات قلم لے کر الگ بیٹھتی ہے اور مجھ کو خط لکھا کرتی ہے اور جب لڑتی ہے تو ہے کہ میں مرزا صاحب کے ہاں چلی جاؤں گی۔ اب آپ اس سے مرزا صاحب کہنا موقوف کروا دیجیے۔ اس سے مجھ کو چچا کہلوایا کیجیے۔"

۸۵۲ میں عارف کی پینتیس سال کی کم عمر میں بے وقت موت غالب کے لیے ایک صدمۂ عظیم تھی۔ اس موقع پر غالب نے لکھا اسے اپنے بیٹے کی موت پر ایک باپ کے کربِ روحانی کی ایک انتہائی دردناک شہادت کی حیثیت حاصل رہے گی۔

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

عارف کی بیوی کا شوہر سے چند ماہ قبل ہی انتقال ہو چکا تھا۔ وہ بھی غالباً اسی جان لیوا مرض حبِ دق کا نشانہ بنیں جس نے لے شوہر کی جان لی تھی۔ ایک سال بعد غالب کی ایک پھوپھی کا انتقال ہوا جن سے انھیں بہ ظاہر بہت گہرا دلی تعلق تھا۔ انھوں میشہ غالب کا ایک بیٹے کی طرح خیال رکھا تھا اور غالب بچپن ہی سے انھیں ماں کے برابر سمجھتے تھے۔ اس کی بھی شہادت ہے کہ ن کے علاوہ ان سے غالب کو مالی امداد بھی ملتی تھی۔ غالب لکھتے ہیں: "ان کی موت کے ساتھ یوں سمجھو کہ میں بہ یک وقت اپنے ، دادا، تین چچاؤں اور تین پھوپھیوں سے محروم ہو گیا۔"

شخصی زندگی میں غالب کے تعلقات خاطر، جیسا کہ اس زمانے میں عام قاعدہ تھا، ان کے اپنے مرکزی کنبے تک محدود نہیں تھے۔ ے خاندان کے لیے مخصوص دلی تعلقات اور ذمہ داریوں کے پیچیدہ رشتوں کو مسلمہ طرزِ زندگی کی حیثیت حاصل تھی۔ غالب کو اپنی ی زندگی سے ناخوش، لاولد، کسی سے کوئی تعلقِ خاطر نہ رکھنے والا اور غم و اندوہ سے مجبور ہو کر تنہائی اختیار کرنے والا گوشہ نشین کرنا ایک مغالطہ ہوگا۔ بہ حیثیت شاعر ان کی تنہائی اپنی جگہ پر لیکن ان کی روز مرہ کی زندگی میں ایک وسیع تر خاندان کے متعلقا ت کا اژدہام رہتا تھا۔ شادمانی اور الم دونوں کا ورود ہوتا تھا لیکن چوں کہ نظمِ زندگی جمع داری کا تھا تو اس سے مسرت کی تاثیر اگر اضافہ نہیں تو رنج و الم کا صدمہ کم ضرور ہوتا تھا اور اس صدمے سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت ملتی تھی۔ غالب نے عارف چوں کو اپنا کر خود کو سنبھالا اور بہ حیثیت ایک صاحبِ اہل و عیال اپنی زندگی کا از سرِ نو آغاز کیا۔ بڑا لڑکا باقر علی جو اپنے باپ انتقال کے وقت صرف پانچ سال کا تھا غالباً بعد میں جاکر والدہ، عارف کے ساتھ رہنے لگا لیکن باقر سے تین سال چھوٹا حسین علی ما آخر غالب ہی کے ساتھ رہا۔ یہ لڑکے غالب کی آنکھ کا نور تھے اور ان کی شوخیوں اور ان کے کھیلوں سے ان کے گھر کی رونق بڑھتی اپنے ایک خط میں یہ شکایت کرتے ہیں کہ: "مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے

پلنگ پر رکھتے ہیں، کبھی پانی لڑھاتے ہیں، کبھی خاک اڑاتے ہیں۔" لیکن یہ سب وہ بہ خوشی برداشت کرتے تھے ۔

زیادہ تر سوانح نگاروں کا رجحان غالب کی گھریلو زندگی کی سراسر ویرانی کی تصویر کشی کی طرف ہے۔ حقائق سے عدم توافق کے علاوہ ایسی تصویر فلسفی اور شاعر غالب کی مبارز طلبانہ اور زندہ دلانہ رواقیت سے بھی انصاف نہیں کرتی ۔ انھوں نے ایک موقع پر لکھا تھا،

درجنوں ہے کار نتواں زیستن　　　آتشِ تیز ست و داماں می زنم

می ستیزم با قضا از دیر باز　　　خویش را بر تیغ عریاں می زنم

لعب با شمشیر و خنجر می کنم　　　بوسہ بر ساطور و پیکاں می زنم

(اگر آگ تیز ہو تو میں اسے اور بھڑکاتا ہوں ۔ میں موت سے لڑتا ہوں ۔ میں بے نیام تلواروں پر ٹوٹ پڑتا ہوں ۔ میں خنجروں سے کھیلتا ہوں اور تیروں کے بوسے لیتا ہوں) ۔

مصیبت کو قادرِ مطلق کے محیطِ کل ہونے کا محض ایک پہلو سمجھ کر اسے بہ خوشی قبول کرنے سے ان کو ذاتی نقصان اور محرومیوں کو ۔ روحانی تکلیف کی پُرمسرت آب و تاب کے ادراک ۔ میں قلبِ ماہیت کی طاقت ملتی تھی ۔ نتیجہ تھا ایک مکمل فلسفیانہ تصورِ زندگی جو واضح تناسب میں مشیتِ الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے اور اسے قبول کرنے کے عناصر پر مشتمل تھا ۔ یہ تصورِ زندگی خود کو ایک صحت مند حسِ مزاح میں آشکار کرتا تھا ۔ جہاں دوسرے ہتھیار ڈال دیتے تھے ہمارا شاعر سبقت لے جاتا تھا ۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　　مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

انسانی صورتِ حال کا اپنا کرب و انبساط تھا ۔ نشیب و فراز تھے ۔ ہجر و وصال اور اس کے مسرت و افسردگی کے لمحات تھے لیکن اس کے تمام پہلوؤں میں ایک ایسا خلقی اہتزاز تھا جس کے صرف بے حس ہی منکر ہوسکتے تھے ۔ غالب نے تجربے کے عمل ہی کو بہ ذاتِ خود ایک وجدیاتی مقصد کی بلندی عطا کی جس سے درد و غم کے وجود کے علی الرغم لطف اندوز ہونا چاہیے ۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے　　　بے صدا ہوجائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

غالب کا خیال تھا کہ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی فتح مند ذوقِ حیات ہی کو ہونا چاہیے اور اگر انسان کے ظرف میں زندگی کی گوناگونی کو قبول کرنے کے لیے وسعت کافی نہیں ہے تو گنجائش کی تلافی کے لیے اسے اپنی قوتِ احساس کو بڑھانا چاہیے اور یہی وہ ذہنی کیفیت تھی جس نے انھیں پیرانہ سالی میں بھی مختلف بیماریوں کے باوجود اپنے ادبی مشاغل کو جاری رکھنے کا حوصلہ دیا ۔

گر ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا　　　گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اس مفہوم میں غالب " شوق " یا آرزو مندی کی اصطلاح کے معنی کو ایک نئی آب و تاب اور زندگی کے تقاضوں سے نئی مناسبت عطا کرتے ہیں ۔ ذوق و شوق اور آرزو مندی کا مطلب ہے تجربے کے جواز کا اقرار ۔ تجربے سے اپنے کو الگ تھلگ رکھنا اس کی نفی کے مرادف ہے ۔

نشہ ، رنگ سے ہے واشدِ گل　　　مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

یہ ضروری نہیں کہ ذوق و شوق ۔ آرزو اور تمنا کارگر بھی ہو ۔ یہ تو بہ ذاتِ خود ایک مقصد ہے ،

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا　　　مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

اور جب کسی منشا و مقصد کے بغیر شمولیت کا عزم کر ہی لیا تو محبت کے جواب میں محبت ۔ تکمیلِ تمنا ۔ دنیوی مظاہر کی ناپائداری جیسے

قابلِ لحاظ امور ہر تجربے میں مضمر انبساط اور غصے دونوں کے امکان پر اثر انداز تو ہو سکتے ہیں لیکن اسے محدود نہیں کر سکتے ۔

نہیں نگار کو الفت ، نہ ہو ، نگار تو ہے　　روانیِ روشن و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت ، نہ ہو ، بہار تو ہے　　طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

غالب کے زبان زدِ عام حسبِ ذیل شعر کو اس سیاق و سباق میں بہتر سمجھا جاسکتا ہے :

گو ہاتھ کو جنبش نہیں ، آنکھوں میں تو دم ہے　　رہنے دو ابھی ساغر و مینا ، مرے آگے

یہ سیدھا سادا نظریہ ، لذتیت نہیں ہے اور نہ ہی تنگ نظری سے کی جانے والی بعض تشریحوں کے باوجود ، یہ اوباشی کو بڑھاوا دینا ہے ۔ شعر کا موضوع لذت پسندانہ فنائیت نہیں بلکہ تجربے کی زندگی کے تقاضوں سے خدا داد مناسبت ہے ۔ یہ ہر حالت میں تجربہ ، زندگی کے جواز کا ادعا ہے اور چناں چہ اس رنج و الم اور صدمے کے باوجود جو اس کا ایک جزو لاینفک ہے ، اس سے لطف اندوز ہونے کے حوصلے کا اعلان ہے ۔ جیسا کہ انھوں نے ایک موقع پر لکھا اس دنیا کی مصیبتوں کا شکار ہونا خود شرافتِ نفس کی شہادت ہے ۔ غالب خانقاہ نشین کے کنجِ عزلت کے قائل نہ تھے ۔ زندگی کے گوناگوں مظاہر کے رنگ اور نظارے سے خود کو الگ تھلگ رکھنے کے لیے دیواریں تعمیر کرنے کی بہ جائے وہ دکھ درد کو دعوت دینا کہیں بہتر سمجھتے تھے ۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم　　دل میں چھری چبھو ، مژہ گر خوں چکاں نہیں

یا پھر

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو　　ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

بے شک دکھ درد کو سوچ سمجھ کر قبول کرنے سے رنج و الم اور جدائی یا ہر روز کی جنگ و جدال کی تکان اور مایوسی کی شدت میں کمی تو آ سکتی تھی لیکن ان سے کلیتہً چھٹکارا نہیں مل سکتا تھا ۔ بہ حیثیت شاعر غالب نے ان کی شدت میں سوگنا اضافہ کر کے ، انھیں موضوعی رنگ دے دیا تھا اور وہ اپنے کرب کو بے ساختہ سادگی کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنا سکتے تھے ۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

○

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

اس زہر کا توڑ تھا فلسفے کا سہارا ، جس کی طرف ان کا میلانِ طبع عمر کے کافی ابتدائی دور ہی سے تھا ۔ کم سنی ہی میں ان کے پسندیدہ شعرا بیدل اور ناصر علی تھے جن کا کلام پیچیدہ اور مبہم مابعد الطبیعیاتی غور و فکر سے مملو تھا ۔ آگے چل کر وہ وجودِ حقیقی کی ماہیت ، وحدتِ الوہیت یا دنیوی مظاہر کی حقیقت جیسے مابعد الطبیعیاتی مسائل پر گرما گرم مباحث سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ۔ ان کی تحریروں سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اکثر ان کو بھی ان مناقشوں میں خواہی نہ خواہی گھسیٹ لیا جاتا تھا ۔ لیکن بہ ظاہر ، فلسفیانہ غور و فکر کے مختلف دبستانوں کے ابتدائی اصولوں سے بہت اچھی واقفیت کے باوجود ، انھیں لاحاصل علمی مباحث پسند نہیں تھے اور دینیات کے ان عالموں کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں تھی جو ساری عمر ان مسائل کے تعلق سے بال کی کھال نکالنے میں صرف کر دیتے تھے ۔ ایک فارسی شعر میں معاندانہ طنز و تعریض لکھتے ہیں :

برتر از عدم بحث است جذبہ ، توحید غالب را　　کہ ترکیبِ سادہ ، با تخییلان در نمی آید

(اسے بتایا ۔ توحید غالب کو بحث مباحثے کی بزم سے باہر نکال ، کیوں کہ ہمارا ترکیبِ سادہ قضیوں سے عہدہ برا نہیں ہوسکتا) ساری عمر انھوں نے وسیع المشربانہ صاف دلی کو ترک نہیں کیا اور فخر کے ساتھ اس کا اقرار کرتے تھے ۔ بحث سے باخبر ہوتے ہوئے وہ اپنی تلاش کو کسی ایک فرقے یا گروہ کے عقائد تک محدود رکھنا یا کسی ایک شخص کو اپنا مرشدِ روحانی مان کر اس تلاش سے متعلق ان سوالات کو منجمد ہونے دینا نہیں چاہتے تھے :

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

ایسا لگتا ہے کہ مسلۂ منزلِ مقصود کا محدود تصور نہیں بلکہ نئے آفاق کی فرحت اور پہلے سے طے شدہ جواب نہیں بلکہ جو ہیں ان کی فلسفیانہ جستجو کے رہنمایانہ اصول تھے ۔ چناں چہ جیسا کہ توقع کی جاسکتی ہے ان پر اکثر تشکیک کا زور ہوتا تھا اور یہ اکثر ان زمانے سے کہیں آگے کے تصورات پر مشتمل ان کے بعض بہترین اشعار کی وجہ تحریک ہے ۔ اگر ظاہر حقیقت نہیں ہے اور اس کے باوجود حقیقت ظاہر میں عیاں ہے تو پھر عقیدے کی متضاد حدود میں توافق کے ساتھ ساتھ یقینِ کلی کی ایک راہِ مستقیم کا تعین کیسے کیا جائے ؟ اگر دنیا خدائے برتر کے فضل و کمال کے اظہار کی ایک بازی گاہ ہے تو پھر ایک فرد بشر اپنے دکھ درد اور رنج و غم اور ناموافقت سے کیسے عہدہ برا ہو ؟ اگر اس کی وحدت واحد حقیقت ہے تو اس انداز میں ڈالنے والی کثرت کی کیا ضرورت ہے ؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یا پھر کسی قدر مختلف رنگ میں :

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اس کے باوجود شک اور سوال زور پکڑ کر مایوسی میں کبھی متبدل نہیں ہوئے ۔ ان سے فہم و ادراک سے خدائے برتر کی ازلی دل ماورائیت کے سامنے اور پریشان کن انسانی صورت حال کے ابعاد کی سنگینی پر شاعر کے تقریباً بچوں کے سے استعجاب و تحیر میں بس اضافہ ہوتا تھا ۔ نیز ہر بے جواب سوال پر ماتما کے قدموں میں ، اس کی لیلا کے ایک اور اظہار اور اس کی خوش تدبیری کے سامنے انسانی کی نارسائی کی ایک اور نشانی کی حیثیت سے بھی ڈالا جاسکتا تھا :

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

○

ہر کمالِ تو در اندازہ کمالِ تو محیط ہر وجود تو در اندیشہ وجودِ تو دلیل

(فہم و ادراک میں تیرے کمال پر تیرا کمال ہی محیط ہے اور عقل و فہم میں تیرا وجود ہی تیرے وجود کی دلیل ہے) ۔ روحانی اخذ و قبول اس صلاحیت کی بہ دولت غالب ایک شخصی فلسفیانہ بصیرت کی تشکیل کے لیے عناصر کا صحیح ذوق اور احتیاط سے انتخاب کرسکتے تھے ۔ ایک سطح پر وہ حقیقت حقہ کے ماسوا ہر شے کے عدم وجود کے ویدانتی ادعا کے ذریعے خود کو دنیوی تجربے سے علاحدہ بھی کرسکتے تھے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقہ ، دامِ خیال ہے

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا

○

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

○

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

دوسری سطح پر وہ کائنات کے ہر پہلو کو الوہیت کا رنگ دے سکتے تھے۔ ہر ذرے میں خدائے برتر کے فضل و کرم کا جلوہ بھی دیکھ سکتے تھے اور دلیل بھی۔

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

یا پھر جیسا کہ وہ ایک فارسی شعر میں کہتے ہیں:

سراغِ وحدتِ ذاتش تواں زکثرت جست کہ سازِ ہست در اعدادِ بے شمار یکے

(اس کی وحدت کا سراغ کثرت سے مل سکتا ہے۔ بے شمار اعداد کے لیے مشترک ایک کا عدد ہے)۔ یہی سرچشمہ تھا ہستیِ واجب الوجود کے بارے میں ان کے اس خیال کا کہ وہ رحمتِ مجسم ہے۔ سورج کی حیات بخش شعاعوں کی طرح، جن کی تابانی انفرادی ا؟ کی نااستواری اور کش مکش کو بے حقیقت بنادیتی ہے۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

○

ہے تجلی تیرا سامانِ وجود ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

ایسی صورت میں خدا مندر میں ایستادہ بُت میں مل سکتا ہے او ر نہ مسجد میں اظہارِ عقیدت و عبادت کے ذریعے۔ تقلید پسند اس بات کے درپے تھے کہ الوہیت کو مذہبی رسوم و معمولات، حق و باطل، گناہ اور جزا کے تنگ دائرے میں محفوظ کرلیں۔ غالب کا تصورِ اخلاقیات خدائے برتر کی رحمت کے بارے میں ان کے متوازن اور اعلیٰ و برتر نظریے کی بہ دولت ان بندشوں سے آزاد تھا۔

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مذہبی اور ناصحانہ مفہوم میں حق و باطل فہمِ انسانی کی تفریق پسندی کی پیداوار تھے۔ لیکن خدائے برتر نے دنیا کی تخلیق اس لیے کی تھی کہ انسان اس سے لطف اندوز ہو۔ یہی روحانیت کے حامی تنگ نظری پر مبنی ایسی زمرہ بندیوں کو خاطر میں نہیں لاسکتے تھے اور چناں چہ غالب روحِ اخلاقیات، بالخصوص اس سے جو تقلید پسندوں کے مفاد میں ہے، اپنی بے زاری کا برملا اظہار کرتے ہیں:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

○

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یہاں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ اس طرح کے بیانات حظِ نفس اور عیاشی میں بغیر سوچے سمجھے مست رہنے کی دعوت نہیں تھے۔ لوگوں کو جو اس طرح کی باتوں کے ضرورت سے زیادہ لفظی معنی مراد لینے کی طرف مائل رہتے تھے غالب ان الفاظ میں متنبہ کرتے ہیں:

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

[ان]کی اخلاق غالب کے لیے ایک ایسا موقف تھا جو وسیع تر مفہوم میں مسرت کے اس شاعرانہ اور فلسفیانہ ادراک سے جڑا ہوا تھا جس [کی بن]یاد ہے تخلیق کا اصل اصول یہی ہے اور یہ خیال اپنشد کے اس اشلوک سے بھی بڑی حد تک ہم آہنگ ہے : " جہاں مسرت ہے [وہاں] تخلیق ہے ۔ جہاں مسرت کا فقدان ہے وہاں تخلیق کا بھی فقدان ہے ۔ مسرت کی ماہیت کو سمجھو ۔ " ایسی مسرت لازوال قدر و قیمت [کی] حامل صرف عارضی مظاہر کے پس پردہ ذاتِ حقیقی کے ادراک ہی میں ہو سکتی ہے ۔ اپنے مختلف اشعار میں غالب دل کش اور حیرت [انگیز] صراحت کے ساتھ اس ادراک کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں :

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروغ کو خاموشی ہی سے نکلے ہے ، جو بات چاہیے

اس موضوع کی طرف وہ اپنے کلیاتِ فارسی میں بھی رجوع کرتے ہیں :

قطرہ و موج و کف و گرداب جیحون ست و بس این من و مائی کہ می بالد حجابے بیش نیست

(قطرہ ، موج ، جھاگ اور بھنور ، سبھی دریا کے مختلف پہلو ہیں ۔ " میں " اور " میرا " کی یہ لاف زنی ایک حجاب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی) ۔ اس ادراک کی روشنی میں غالب ذاتِ مطلق کے وجود کا اعلان بالکل واضح الفاظ میں کرتے ہیں :

نہ تھا کچھ تو خدا تھا ، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے ! نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا ؟

انفرادی انا کی نفی اور خدائے برتر کے محیطِ کل ہونے کے پیش نظر اس کی کلیتہً بے حاصلی کا ادعا ، حد سے زیادہ سادگی کی سطح پر ، غالب جیسے بے حد حساس انا رکھنے والے شخص کے لیے ، بادی النظر میں ایک ایسی بات دکھائی دیتی ہے جس میں تضاد بھی ہے اور جس میں ریاکاری کا عنصر بھی شامل ہے ۔ لیکن اس سے محض غالب کی اس پیچیدہ شخصیت کا امتیازی خاصہ ہمارے سامنے آتا ہے جو اگر ایک سطح پر اعلیٰ و ارفع روحانیت کی علم بردار تھی تو دوسری سطح پر ارضی و بشری تھی ۔ شاید ان کی روحانی ماورائیت کے لمحات نتیجہ تھے اس احساس کا کہ وہ روز مرہ کی جدوجہد اور حبِّ جاہ کے لاحاصل جھمیلوں میں کس بری طرح پھنسے ہوئے اور اس روحانی آزادی سے کتنی دور ہیں جس کے لیے ان کا دل تڑپتا ہے :

تا چند پست فطرتیِ طبعِ آرزو یا رب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے

تاہم یہ امر ناقابلِ انکار ہے کہ تسکینِ روحانی کے سرمایہ ، محفوظ سے وہ محروم نہیں تھے ۔ ان کی فلسفیانہ بصیرت کے بہیترے اجزا میں سے دو کی ایسے عناصر کی حیثیت سے بہ آسانی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو رنج و الم اور مایوسی میں ان کے لیے سب سے زیادہ باعثِ تقویت تھے ۔ پہلا عنصر تھا ، جب بھی بحران اپنی منتہائے کمال کو پہنچے ، قادرِ مطلق کی مشیت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر خوشی سے آمادگی ، ایک حد کے آگے جدوجہد کو راحت و الم کے جذبات سے مستغنی رواقی فلسفے کی رو سے فضول سمجھنا اور رواقیت کے لیے مخصوص لیتے ہی ضبط و استقلال کے ساتھ یہ یقین کرنا کہ ایسا سمجھنے سے انھیں بحران سے عہدہ برا ہونے کی لچک ملے گی :

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

دوسرا عنصر تھا راست صورتِ حال سے خود کو علاحدہ کر لینے کی ان کی صلاحیت ۔ بہ ظاہر ہر لحاظ سے شریک و شاہد کی حیثیت سے برقرار رہتے ہوئے بھی خود اپنی حالت کا علائق دنیوی سے ماورا رہ کر مشاہدہ کرنے والا بن جانا ۔ ایسا کرتے ہوئے وہ تناسبِ باطنی کے احساس اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ حسنِ مزاح کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور کبھی کبھی بہ مسرت لاابالی پن اور بے جاہلگی کے اعلیٰ و ارفع اور بلند پرواز جذبات محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔

چوں عکسِ پُل بہ سیل ، بہ ذوقِ بلا برقص — جارا نگاہ دار وہم از خود جدا برقص
تجدیدِ والئے عہد دمے خوش غنیمت ست — از شاہدان بنازشِ عہدِ وفا برقص
ذوقے ست جستجو چہ زنی دم زقطعِ راہ — رفتار گم کن و بہ صدائے درا برقص
سر سبز بودہ و بہ چمنہا چمیدہ ایم — لئے شعلہ در گدازِ خس و خارِ ما برقص
ہم بر نوائے چند طریقِ سماع گیر — ہم در ہوائے جنبشِ بالِ ہما برقص
در عشق انبساط بپایاں نہ می رسد — چوں گرد باد خاک شو و در ہوا برقص
فرسودہ رسم ہائے عزیزاں فرو گزار — در سور نوحہ خواں و بہ بزمِ عزا برقص
چوں خشمِ صالحان و ولائے منافقاں — در نفسِ خود مباش و لے برملا برقص
از سوختن الم ز شگفتن طرب مجوے — بے ہودہ درکنارِ سموم و صبا برقص
غالب بدیں نشاط کہ وابستہ ، کیو — بر خویشتن بہ بال و بہ بندِ بلا برقص

ooo

(جوں سایہ ، پل سیل پہ ، باذوقِ بلا ناچ — جا اپنی نہ چھوڑ اور یوں ہی خود سے جدا ناچ !
کرتا ہے وفا عہدِ وفا کون یہاں پر — ہوکر یوں ہی سرمستِ مئے عہدِ وفا ناچ
کیا طئی مسافت کا جنوں ، ذوقِ عمل مانگ — رفتار کو بھول اور بہ خوشنائے درا ناچ !
ہم سبزہ تھے گلشن میں بہت جھوم چکے ہیں — اے شعلے ہمارے خس و خاشاک میں آ ! ناچ !
کر ذوقِ سماع اخذ نواہائے چند سے — جنبش میں پر و بالِ ہما کی بھی ذرا ناچ !
ناداں ! طربِ عشق کا پایاں ہی نہیں ہے — بن خاک ، بگولے کی طرح ، اور دکھا ناچ
کر ترک عزیزوں کی یہ فرسودہ سی رسمیں — کر گریہ طرب گاہ میں ، ہنگامِ عزا ناچ
صالح کا تبرّا نہ منافق کا تولّا ۔ ! — آلودہ نہ کر نفس کو باذوقِ ابا ناچ !
جلنے میں تڑپ دیکھ نہ کھلنے میں طرب ڈھونڈ — مسموم فضا ہو کہ ہو آغوشِ صبا ناچ
تا چند نشاط و طرب و عیش یہ غالب — کر خود کو بلند اور بہ صد بندِ بلا ناچ !)

(ترجمہ ، مظفر مجاز)

مرور زمانہ کے ساتھ بہ حیثیت شاعر غالب کی شہرت مسلسل بڑھتی گئی ۔ انھوں نے اپنا پہلا اردو مجموعہ ، کلام ۱۸۲۱ء میں مرتب کیا تھا
۱۸۲۷ء میں دوستوں کی فرمائش پر فارسی مکتوب نگاری کے عام اصول کے بارے میں " پنج آہنگ " نام کا ایک عام فہم کتابچہ تالیف کیا ۔ ۱۸۲۸
ں انھوں نے " گلِ رعنا " کے نام سے اپنے اردو اور فارسی کلام کا ایک ملاجلا انتخاب مرتب کیا ۔ ان کا اردو دیوان پہلی بار ۱۸۴۱ء میں شائع ہو
ر فوراً ہی اس کے تمام نسخے فروخت ہوگئے ۔ ۱۸۴۷ء میں اسے دوبارہ چھاپا گیا لیکن بہ ظاہر یہ ایڈیشن بھی عام قارئین کی مانگ کو پورا کرنے سے
ی حد تک قاصر رہا ۔ آگے چل کر یعنی ۱۸۵۵ء میں غالب شکایت کرتے ہیں کہ انھیں خود اپنے لیے ایک نسخہ بھی نہ ملا کیوں کہ ناشر نے پہلے ہی
ے تمام نسخے کتب فروشوں کو تھوک کے حساب سے فراہم کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا ۔ ان کا فارسی کلام کلیات کی شکل میں ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا ۔

ooo

یوسف میا طوع اراسکی
ترجمہ: اسامہ فاروقی

حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان (وسط ایشیا) ماسکو ۱۹۷۷ء

حصاری پریا لوگوں کی زبان، ہند آریائی زبانوں کے وسطی زمرے کی ایک بولی

(قسط: ۷)

تخصیصی کیفیت کی ہیئتوں کی تشکیل معاون فعل -lag کی مدد سے

(الف) تخصیصی کیفیت والے زمانہ حال کی تشکیل: to- (تو) پر ختم ہونے والا معنی خیز فعل کا حالیہ + معاون فعل -lag (لگ) کی زمانہ حال مستقبل کی شخصی ہیئتیں۔ بعض اوقات اس فعلی ہیئت میں ماقبل مختصر لاحقہ de- (دے) کا بھی اضافہ کردیا جاتا ہے۔ me-ti muallim ustol-kula kam karto lagai مےتی معلم استول کلا کام کرتو لگائیں (میں اور معلم میز کے پاس کام کررہے ہیں)۔ sun, ya bitya pianino -ta marto lagai -de سن، یا بٹیا پیانینوتا مار تو لگائی دے (سن، یہ لڑکی پیانو بجاتی ہے / بجانے لگی ہے)

(ب) تخصیصی کیفیت والے زمانہ ماضی کی تشکیل: to- (تو) پر ختم ہونے والا معنی خیز فعل کا حالیہ + معاون فعل -lag (لگ) کی زمانہ ماضی تمام کی ہیئتیں۔ me-ti muallim kam karto lagi c^ho, ya bitya huva pianino-ta mara c^ho مےتی معلم کام کرتو لگی چھو، یا بٹیا ہوا پیانینوتا مارا چھو (معلم میرے ساتھ کام کررہا تھا اور یہ لڑکی / اس وقت / پیانو بجارہی تھی)۔ miya rat-a kitab partó lage c^ho, is (i) vaxt-a kere kat-na darvaze-ta taqas karyo میا راتا کتاب پرتو لگے چھو، اسی وختا کیڑے کت نا دروازے تا تقاس کریو (میں رات کتاب پڑھ رہا تھا، اسی وقت کسی نے دروازہ کھٹ کھٹایا)۔ Bibi- Rabia-na ser- par-ta k^haki karti lagi c^he بی بی رابعہ نا سر پرتا کھکی کرتی لگی چھے (بی بی رابعہ / اس وقت / اپنے بالوں کو کنگھی کررہی تھی)۔

(ت) معنی خیز فعل کے to- (تو) پر مختتم حالیے اور معاون فعل lag (لگ) کے i- (ای) پر مختتم حالیے کے یک جا استعمال سے تخصیصی کیفیت کی حالیہ معالیہ تمیزی ہیئت کی تشکیل ہوتی ہے: Karmai-git gató, ato lagi, dek^{h}ai ke ... کرمائی گیت گاتو، اتو لگی، دیکھائی کہ... (کرمائی، گیت گاتا، آتا تھا / آنے لگا / دیکھتا ہے کہ...)۔

حالیہ فعل تمیزی ہیئتیں اور حاصل مصدر حاصل مصدر اور افعال کی ساختوں کا افعال -lag (لگ) اور -sag (سگ) کے ساتھ استعمال۔ سببی افعال:

زبانِ پریا کے ‎-o‎، ‎-yo‎ (او ، یو) پر ختم حالیوں کا ہندستانی کے ‎-ā‎ پر، پنجابی کے ‎-iā‎ پر، سندھی کے ‎-ea‎ اور راجستھانی کے ‎-yō‎ پر ختم حالیہ تمام سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔

عملی طور سے زبانِ پریا کے ‎-yo‎، ‎-o‎ پر ختم حالیہ ماضی مطلق کی غیر منصرف (مختلف صیغوں میں غیر متبدل) ہیئت کہے جاسکتے تاہم افعالِ لازم کے حالیہ مختلف اعداد کے لیے اپنی ہیئت تبدیل کرتے ہیں، واحد میں یہ ‎-o‎ پر ختم ہوتے ہیں اور جمع میں ‎-e‎ پر۔

: me ayo مے آیو (میں آیا)۔ me uto مے اٹو (میں اٹھا) me darya- mata lang'yo مے دریا متا لنگیو (میں نے دریا پار کیا)۔ texnikum me varó تخ نکم مے ورو (میں ٹیکنیکل اسکول میں داخل ہوا)۔ tu ayo تو آیو (تو آیا)۔ budo a بڈو ایو (بڈھا آیا)۔ pâšâ uto پاشا اٹو (پادشاہ اٹھا)۔ Bahram daraxt- mata uturó بہرام درخت متا اترو (بہرام درخت پر سے اترا)۔ Pataxan ugi langio پتے خاں اگی لانگیو (پتے خاں / فتح خان / اس طرف چلا گیا / لانگھ گیا)۔

: ham aye ہم ایے (ہم آئے)۔ kadun ki ham satum(m)a lange.... کدن کی ہم ستم ملنگے (جب ہم ... جماعت/ میں پہنچے...)۔ čaixana-ma vare چاے خانہ ماورے (ہم / چائے خانے میں داخل ہوئے)۔ ami(aizo) امی (ایزو) ایے (آدمی / مرد آئے / عورتیں آئیں)۔ likariye لکریے (وہ / نکلے)۔ yek čol-ma nikile یک چول ما ... / وہ / ایک بنجر میدان / دشت / میں نکلے)۔ jatak utere جتک اترے (لڑکے / گھوڑوں سے / اترے) وغیرہ۔

جب یہ حالیہ افعالِ متعدی کی غیر منصرف شکلوں میں استعمال ہوتے ہیں تو مختلف صیغوں میں اپنی ہیئت تبدیل نہیں کرتے:

minja mar... منجا ماریو (میں نے مارا)۔ tinja maryo تن جا ماریو (تو نے مارا)۔ munde-na maryo منڈے نا ... (لڑکے نے مارا)۔ ham- na maryo ہم نا ماریو (ہم نے مارا)۔ jatak maryo جتک ماریو (لڑکوں نے مارا / چڑیوں کو)۔ [تاہم بعض اوقات افعالِ لازم کی طرح افعالِ متعدی کے حالیہ بھی اعداد کے لیے اپنی ہیئت تبدیل کرتے ہیں مثلاً ham- na ... anqât kay... ہم نا اوقات کایو (ہم نے کھانا کھایا) کے ساتھ ساتھ ham- na anqât kaye ہم نا اوقات کایے (ہم نے کھانا ...)]

دوسرے اجزائے کلام کی طرح زبانِ پریا کے حالیوں میں بھی قواعدی جنس کا امتیاز کافی مٹا ہوا دکھائی دیتا ہے موازنہ کریں:

pâča ... پاچا اُٹو (پادشاہ اٹھا) Larjar-pâšâ uto لرجر پاشا اٹو (لرجر پادشاہ اٹھا) ran uti رن اُٹی (بیوی اٹھی) ganji ... گنجی اُٹی (گنجی اٹھی) لیکن اس کے ساتھ ہی: ... r:m darav Badal-para čaryo ... رن درو بادل پرا چریو (یہ عورت بادل پر چڑھ گئی / سوار ہو گئی / بادل۔ گھوڑے کا نام /) اور fer ya korre -pera čaryo فِر یا کوڑے پیرا چریو (پھر وہ / ... / گھوڑے پر چڑھا / سوار ہوا) Gul... sayisxane -mata nikil(l)ó- گل ... سائیس خانے متا نکلو (گل اصطبل ... سائیس خانے / سے نکلی) اور ya be ran-pare -pača nikil(l)o یا بے رن پرے پچا نکلو (وہ بھی اپنی بیوی کے پیچھے ...)۔ pâšâ mar go پاشا مرگو (پادشاہ مرگیا) اور almasti... mar go الماستی... مرگو (چڑیل مر گئی) وغیرہ۔ یہ ظاہر ... ‎-o‎ (او ، یو) پر ختم ہونے والی ہیئتیں، جو ابتدا میں جنسِ مذکر کے لیے مستعمل ہیں رفتہ رفتہ اب دونوں جنسوں کے لیے ... اور ‎-i‎ (ای) پر ختم ہونے والی ہیئتوں کا رواج اٹھتا جارہا ہے۔

بعض مصوتے پر ختم ساق رکھنے والے کثیر الاستعمال افعال (مثلاً ‎-ja‎ جا / جانا / ، ‎-de‎ دے / دینا / ، ‎-le‎ لے (لینا) ...

سو / سونا) اپنی ہیئت کی تشکیل میں امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں۔ فعل ja- جا (جانا) کا حالیہ مختصی ساق سے تشکیل پاتا ہے اور عدد واحد جنسِ مذکر میں اس کی ہیئت gio/go گیو، گو (گیا) ہوتی ہے (اس کا موازنہ ہندستانی کے gaya گیا سے اور پنجابی کے gia گیا سے کریں)۔ افعال de- دے (دینا) اور le لے (لینا) کے اس قسم کے حالیے حشو n (ن) کے اضافے اور ساق کے مصوتے میں تبدیلی کے ساتھ تشکیل پاتے ہیں: dino / dineo دنو / دنیو (اس کا ہندستانی کے diyā دیا اور پنجابی کے dita دِتا سے موازنہ کریں)، lino / lineo لنو، لنیو (اس کا ہندستانی کے liya لیا اور پنجابی کے lia لیا سے موازنہ کریں)۔ فعل so- سو (سونا) کا اس قسم کا حالیہ حشو t (ت) کے اضافے اور ساق کے مصوتے میں تبدیلی کے ساتھ تشکیل پاتا ہے: suto / sutyo سُتو / سُتیو۔

-to تو پر ختم ہونے والا زبانِ پریا کا حالیہ (مثلاً karto کرتو) ہندستانی کے -ta (تا) پر مختتم اور راجستھانی کے -tō (تو) پر مختتم زمانہ حال کے حالیوں سے توافق رکھتا ہے۔

یہ آزاد جزوِ کلام کے طور سے حسبِ ذیل مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے:

(الف) طریقہ عمل کے تمیزی ترمیم کار کی حیثیت سے: is Karamai -na do xatbarun -ta inta pugurke, gal karto, gal karto, paša rah lineo اس کرمائی نا دو خط برن تا انتا پگڑکے، گل کرتو، گل کرتو، پشا راہ لنیو (یہ کرمائی، دونوں نامہ بروں کو اس طرح پکڑ کے، بُرا بھلا کہتا، پیچھے چلا)۔ git gato گیت گتو (گیت گاتا) وغیرہ۔

(ب) شرطیہ تابع فقرے میں مشروطیت عمل کے مختلف شائبوں کو ظاہر کرنے والی خبر کی حیثیت سے: lef -ma agar varto, ya dad-vai, kuva čo لیف ما اگر ورتو، یا داد وائی کووا چو (اگر لحاف میں / وہ / گھستی / بھی / اگر میرے بستر پر وہ پہنچتی بھی / تو میرے پیار سے / کراہتی / آہیں بھرتی)۔ agar kui-na pišna karto, ya isi gal-ta kara čo اگر کوئی نا پشنا کرتو، یا اسی گل تا کرا چو (اگر کوئی پوچھے، یہی قول پورا ہوگا)۔ agar ham bāra jate, bōd gal lada čʰe اگر ہم بارا جاتے، بود گل لدا چھے (اگر ہم باہر جاتے، باتوں کے لیے بہت / سے موضوع / پاتے (ہندستانی شرطیہ فقروں میں -tā (تا) پر ختم ہونے والے حالیہ کے استعمال سے موازنہ کریں)۔

معاون فعل lag- (لگ) کے ساتھ یہی حالیہ تخصیصی کیفیت کی ہیئتوں کی تشکیل کرتا ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

(۱) a پر ختم ہونے والا حالیہ حسبِ ذیل مواقع پر استعمال ہوتا ہے:

(۱) ماضی ناتمام کی ہیئتوں کی ساخت میں شامل رہتا ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

(۲) طور شرطیہ احتمالیہ زمانہ حال مستقبل کی غیر منصرف ہیئت کے طور سے استعمال ہوتا ہے اور طور بیانیہ کے علاوہ طور بیت کے مختلف مفاہیم کو ادا کرتا ہے، مثلاً امر بالواسطہ، خواہش، مشروطیت، ارادہ، عمل کا کسی خاص مقصد کا حامل ہونا وغیرہ۔

(الف) امر بالواسطہ: pâčâ- na kiyo: ran- ta juval-ma kalke lamkova ! پاچا نا کیو، رن تا جوال ماکال کے لمکوا! (پادشاہ نے کہا: اس عورت کو تھیلے میں ڈال کے لٹکادیں!) yek jâg-a bulbul-i guyâ čʰe, us-ta pai-turo leke ova یک جاگہ بلبلِ گویا چھے، اُسس تا پائی تُرو لے کے اووا! (ایک جگہ بلبلِ گویا ہے، اسے تیرا بھائی لے کے آئے!)۔

(ب) خواہش : تو مُرو ما پتر لگا ! tu muro ma-pen laga ! (تو میری ماں بہن لگے !) - xudo

نگہ وان تُرو ہوا ! nigahvân- turo huva ! (خدا تیرا نگہبان ہو !) - بر پدر تارو bar padar- târo nalat howá ! (تمہارے باپ / دادا / پر لعنت ہو !) -

(پ) زمانہ مستقبل سے متعلق حقیقی شرط (شرطیہ تابع فقروں میں) : agar us-ta lâvá, o mare-nala gal karai اگر اس تا لاوا ، او مرے نالا گل کرائی (اگر اسے / یعنی بلبل گویا کو / لاسئے گا تو وہ میرے ساتھ بات کرے گا) - agar اگر مرے گنا تا تو لنگا ، مے کے کے دُوا / دُوام mre guna -ta tu langá, me keke duvá(m) (اگر تو میرا گناہ / میرا قصور / معاف کرے ، میں / تجھے سب / کچھ دوں گا) - agar yek čiz gum huvá, me us-ko pesa-ta dene-mro darkar-i اگر یک چیز گم ہوا ، مے اس کا پیسا تا دینے مرو درکاری (اگر کوئی چیز گم ہوجائے ، مجھے اس کا پیسہ / اس کی قیمت / دینا ضروری ہوگا) -

(ت) ارادہ ، عمل کا کسی خاص مقصد کا حامل ہونا (مفعولی فقروں میں) : Larajar- pâčâ -na dâru dineo. لڑاجر پاشا نا دارو دنے او ، چاقن ہات تا پرے ترا ، چاقن جور ہوا čaqan hat -(t)a - pare tará, čaqan jor howá (لڑاجر پادشاہ نے دوا دی / تاکہ جلدی سے اس کا ہاتھ پھر سے کام کا ہوجائے اور وہ جلدی سے صحت مند ہوجائے) - [illegible] ixtiyar karó, ke pâčâ kale-ta lekavá گل ۔۔۔ اختیار کرو ، کہ پاچا کلے تا لیکاوا (گل نے طے کیا کہ پادشاہ کا سر لے کر آسکے گا) - bom -ki ufar -ta andowo kar(i)yo, ke mi langá ni- بوم کی اُفر تا انڈوو کریو ، کہ می لنگانی (چھت کو اوپر سے ، میں نے / چھوپا تاکہ بارش / کا پانی اس میں سے / نہ گزرے) miya paraxčo layo, indar lagá سیا پرخچو لایو ، اندر لگا (میں چپٹیاں لایا / تاکہ / لکڑیاں بھڑک اٹھیں) -

-e (ے) پر ختم ہونے والا حالیہ مثلاً lange, bete (لنگے ، بیٹے) حسب ذیل مواقع پر استعمال ہوتا ہے :

(۱) زمانہ تمام اور ماضی تمام کی تحلیلی فعلی ہیئتوں میں شامل رہتا ہے۔ اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

(۲) وصف جارِ مقدم کی حیثیت سے استعمال ہوسکتا ہے : maslihat -nala kare čapan (مصلحت نالا کرے چپان حقل مندی سے سیا ہوا لباس۔ دیکھیے تاجک : جامہ ، با مصلحت کردگی) -

-i (ای) پر ختم ہونے والا حالیہ زمانہ ماضی (ماضی مطلق) کی غیر منصرف فعلی ہیئت کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے : minja mari منجا ماری (میں نے مار ڈالا) - tinja mari تنجا ماری (تو نے مار ڈالا) - gal kari ni گل کری نی (اس نے / بات نہیں کی) - paki پکی (پک گیا ، تیار ہوگیا) - aba-muro marii (mari-i?) ابا مرو مری ای (میرا دادا / [illegible]) - tund, kis-na kari تُنڈ ، کس نا کری (ڈھونڈو / پتہ چلا / کس نے / یہ کام / کیا) [illegible] mal- tare mija raki, mare xak -ta be -de ! [illegible] دو سو مال تیرے میجا رکی ، مرے خک تا بے دے ! (میں نے تیرے دو سو مویشی چرائے ، میری اجرت / میرا حق دے !) - tam-na ma-ta izat kari تم نا ما تا عزت کری (تم نے میری عزت کی) -

-ke (-ki) (کے ، کی) فعل کی ساق سے جُڑ کر مطلق یا نحوی تعلق سے آزاد فعلی تمیزی ہیئت ([illegible] marke مارکے) کو تشکیل دیتا ہے [illegible] اور تمیزی [illegible] (کے) سے ترادف رکھتا ہے : [illegible] čupi-ta marke, [illegible]

pugur'yo اشترا چڑی تا مار کے پگریو (ماشٹر نے چڑیا کو مار کے ، / اسے / پکڑلیا) ـ dalu-ta čunki, almasti-ta.
dino انندالو تا چُنی کی ال مستی تا دنو (اس نے / زردالو توڑ کے / چُن چُن کے / چڑیوں کو دیے) وغیرہ۔

تواتر سے وقوع پذیر ہونے والے افعال ، جن کا فاعل ایک ہی شخص ہو ، عموماً جملے میں تواتر سے استعمال ہونے والی مطلق نحوی تعلق سے آزاد فعلی تمیزی ہیئتوں کے ذریعے ظاہر کیے جاتے ہیں اور ان میں کا صرف آخری فعل فعلی ہیئت کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے ، roba aki, kukeri -ta pugurki-le lino روبا آکی ، ککری تا پگرکی لے لنو (لومڑی آئی ، مرغیوں کو پکڑا ، لے گئی لفظی ترجمہ ، لومڑی آکر ، مرغیوں کو پکڑ کر ، لے گئی) ۔ Karamai ayo, is-ta čuke leké čalo gyo کرمائی ایو ، اس لے کے چلو گیو (کرمائی آیا ، اسے اٹھایا ، لیا چلا گیا ۔ لفظ بہ لفظ ترجمہ ، کرمائی آیا ، اسے اٹھاکے ، لے کے چلا گیا) ۔ i u darki- zamin-ma luko جا کی زمین ما لکو (جا / گٹھلی / زمین میں بودے ۔ لفظ بہ لفظ ترجمہ ، جا کے زمین میں بو دے) ۔ utki paki čali ge قازو ڈرکی اُٹ کی پاکی چلی گے (قازیں ڈر گئیں ، اٹھیں اور اڑ گئیں ۔ لفظ بہ لفظ ترجمہ ، قازیں ڈر کے ، بھاگ چلی گئیں ۔ تاجک ، ترسیدہ ، پریدہ ، گریختہ ، رفتند) ۔

لاحقہ keta کیتے جو فعل کی ساق سے جڑ کر مطلق یا نحوی تعلق سے آزاد فعلی تمیزی ہیئت (le keta لے کیتے) کو تشکیل دیتا ہے بہ ظاہر پنجابی اور لہندا کے زمانہ ماضی کے حالیہ kit(t)a کِتا ، کِتّا سے توافق رکھتا ہے ۔ اس کا مفہوم اور استعمال وہی ہے جو لاحقہ (ki-)ko- سے تشکیل پانے والی نحوی تعلق سے آزاد فعلی تمیزی ہیئتوں کا ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ، nâvar -pâčâ -na is gal -ta sun keta, vaxt-a sare muro' ضناور پاچانا اس گل تا سُن کیتے وختا سرے مُڑو (ضناور پاشا ، اس بات کو سن کے ، قبل از وقت / گھر کی طرف / لوٹ گیا) ۔ Gul a keta, dek(h)o, ke pâčâ sutei گل آ کیتے ، دیکھو ، کہ پاچا سُتے (گل نے آکر / گھر آکر دیکھا کہ بادشاہ سو رہا ہے) وغیرہ۔

مصدر کی غیر فاعلی ہیئت اور جارِ موخر ko- (کو) کے میل سے (جس کے درمیان نقطہ اتصال پر انفی پیشِ صوت وقوع ہوتی ہے) فایتی حالیہ کی تشکیل ہوتی ہے ، janẽko جانیں کو (جانے کے لیے تیار / تیاری کرنے والا) ، lenẽko لینیں کو (جانے / قبضہ کرنے کا ارادہ رکھنے والا) وغیرہ۔ فایتی حالیے کی متابعت وہی ہوتی ہے جو اس فعل کی ہوتی ہے جس سے وہ تشکیل پاتا ہے ۔ me šar-ma janẽko hoyo مے شرما جانیں کو ہویو (میں شہر جانے کو تیار ہوا) (تاجک ، رفتنی شدم) ۔ ami mre kore-ta lenẽko hoyo امی مرے کورے تا لینیں کو ہویو (اس آدمی نے میرے گھوڑے پر قبضہ کرنے / میرے گھوڑے کو جانے / کا قصد کیا) (= تاجک ، گرفتنی شد) ۔

لاحقہ -nalō (-ralo?) -nyalo, -n'alo (نالو) جو فعل کی ساق سے جڑتا اور کام انجام دینے والے شخص کے نام rõnalo رونالو بہ معنی سسکنے والا ، روتا بچہ ، anpakaralo ان پکرالو بہ معنی باورچی ، کھانا پکانے والا ، burnyalo بُرنیالو بہ معنی کپڑا بننے والا ، جُلاہا) کو تشکیل دیتا ہے ، بہ ظاہر ہندوستانی لاحقے -ne -vala (نے والا) سے توافق رکھتا ہے ۔ موجودہ ہند آریائی زبانوں میں غالباً اس کا سب سے قریبی مماثل لہندا کا لاحقہ -neālá (نے آلا) ہے ۔ فعل کی ساق سے جڑ کر یہی لاحقہ حاصل مصدر اور حالیہ صفت کی تشکیل کرتا ہے ، atugunyalo kasō آٹو گنیالو کاسو بہ معنی آٹا گوندھنے کا کاسہ / برتن (فعل کی ساق ato- [illegible] سے وضع کیا گیا) ، guvaropečanalo گوارو پچانالو بہ معنی گہوارہ پوش (فعل کی ساق -peča- guvaro- [illegible] سے

کیا گیا) ۔

مصدر کی ہیئت فعل کی ساق سے لاحقے -nó, -nō- نو کے جُڑنے سے تشکیل پاتی ہے ؛ marnó مرنو (مارنا ، پیٹنا ، ٹھوکنا) ، langnó لنگنو (گزرنا ، لانگنا) ، lenó لیترو (لینا) وغیرہ ۔ اس کا موازنہ ہندستانی کے لاحقے -nā ، پنجابی -nā, -nā ، لہندا -nā, -nā, -un ، سندھی -anu ، راجستھانی -nō, -nū, -nū ، اور نیپالی -nu سے کیا جاسکتا ہے ۔

جب مصدر ، جملے میں حاصلِ مصدر کی حیثیت سے کام میں آتا ہے تو فاعلی حالت میں -o, ō پر ختم ہونے والے دیگر اسما کی طرح اس کی غیر فاعلی ہیئت کی ساق اختتام -o کی -e میں تبدیلی کے ذریعے تشکیل پاتی ہے اور اس کے ساتھ جارِ موخر بھی استعمال ہوسکتا ہے ۔ موازنہ کیجیے ؛ yek kar bân karno darkor-i یک کر بنڑ کرنو درکو ری (ایک گھر بنانا ضروری ہے) لیکن fundamen karne -xatara فنڈامن کرنے خاطرا (بنیاد ڈالنے کی خاطر / بنیاد رکھنے کے لیے) ۔ bakar dekʰnō بکر دیکھنو (چاہنا ، پسند کرنا) لیکن bakar dekʰne -pare -xatara بکر دیکھنے پرے خاطرا (اپنی نسبت کی وجہ سے / اپنی پسند کی وجہ سے) ۔

بہ یک وقت اسم اور فعل کی خصوصیات کی حامل مصدر کی ہیئت اپنی فعلی مناسبت برقرار رکھتی ہے اور افعالِ متعدّی کے مصدر کا اپنا مفعول اوّل بھی ہوسکتا ہے ؛ vaxt ni dari -pe-ta múnno وخت نی داڑی پے تا مُونّو (داڑھی مونڈنے کے لیے وقت تنگ ہے) ۔

نقل و حرکت کا اظہار کرنے والے افعال کے ساتھ مصدر کی غیر فاعلی ہیئتوں کی ساق عمل کے مقصد اور غایت کی نشان دہی کرتی ہے ؛ aiza... pani parne aye ایزا ۔ ۔ ۔ پانڑی پرنے آئے (عورتیں ۔ ۔ ۔ پانی بھرنے آئیں) ۔ âp čalo go qimâr marne آپ چلو گو قمار مارنے (خود جوا کھیلنے چلا گیا) ۔

معنی خیز فعل کے مصدر اور معاون فعل lag- (لگ) کی شخصی ہیئتوں کا یک جا استعمال عمل کو آغاز کا مفہوم عطا کرتا ہے ؛ har yek jatak yek bitya-nala farnó lagé ہریک جتک یک بٹیا نالا فرنو لگے (سب لڑکے لڑکیوں کے ساتھ گھومنے پھرنے لگے) (= تاجک ، گشتن گرفتن) ۔ (ہندستانی میں ان مواقع پر مصدر کی غیر فاعلی ہیئتوں کی ساق استعمال ہوتی ہے) ۔

عمل کی انجام دہی کے امکان یا عدمِ امکان کو ظاہر کرنے کے لیے معنی خیز فعل کی ساق اور فعل sag- سگ (بہ معنی سکنا) کی شخصی ہیئتوں سے تشکیل پائی ہوئی ترکیب استعمال ہوتی ہے ؛ me čuk sagũi مے چک سگوں ئی (میں اٹھا سکتا ہوں) ۔ me lang ni saktui مے لنگ نی سکتوئی (میں پھلانگ نہیں سکتا / میں کود کر پار نہیں کرسکتا) ۔ ? jor kárke de sagăi جور کر کے دے سگائی ؟ (اچھا کرسکتے ہو ؟ / علاج کرسکتے ہو ؟) ۔ čap ni-sakta چاپ نی سکتا (/ وہ / چبا نہیں سکتا) ۔ منفی ہیئتوں میں نفی کا استعمال معنی خیز فعل کی ساق کے عین قبل ہوسکتا ہے اور مرکب افعال میں ان کے اسمی اور فعلی اجزا کے درمیان ؛ ni-taga saktai نی تگا سکتائی (تو / دھوکا نہیں دے سکتا / ٹھگ نہیں سکتا) ۔ kam ni-kar suktũ کام نی کر سکتوں (کام نہیں کرسکتا ہوں) ۔ (اس کا موازنہ ہندستانی اور لہندا کی مماثل تراکیب سے کریں) ۔

سببی فعل کی ساق اساسی فعل کی ساق سے اور لاحقے -a- (ہندستانی -ā- / آ) کے شمول سے تشکیل پاتی ہے ؛ dur-(dur-) ڈر / ڈر (دوڑنا) dura دڑا (دوڑانا) ۔ pak- پک (پکنا) ۔ ۔ ۔ palca پکا (پکانا) ، ut اُٹ (اُٹھنا) ۔ ۔ ۔ uta اُٹا (اُٹھانا ، جگانا) ، ud اُڑ (اُڑنا) ۔ ۔ ۔ uda- اُڑا (/ تیر ، گولی وغیرہ / چلانا) وغیرہ ۔ موازنہ کریں ؛ pâčâ utó پاچا اٹو (پادشاہ اٹھا)

اقبال متین

سنو بھی

○

تم اپنی نفرتیں دل میں بسا کر ہی تو سکتی ہو
میں اکثر سوچتا ہوں چاند کو اپنا سمجھ لینا
اگر یہ راس آ گیا تم کو
تو کیا تم اس حقیقت کو بھلا دو گی
کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے
اک دکھاوا ہے

○

اندھیرے ہی اندھیرے روشنی میں اس کی
ایسے بس گئے ہیں تم سے پہچانے نہیں جاتے
توے کے پیچھے کالک ہے، اسے چہرے پہ مل لینا
کسی درگاہ کی بجھتی سلگتی عود دانی سے
اٹھا کر راکھ پلکوں اور پیشانی پہ رکھ لینا
یہ سب یکساں ہے

○

اللہ اور ہے
وہ داتا بھی ہے بینا بھی، اسے ڈھونڈو
نہیں ملتا ہے وہ جانے کہاں پر جا چھپا ہے
مگر اب بھی
سنا ہے غم زدوں کے دل میں رہتا ہے

○

تو پھر۔۔۔ اس کو پکڑ لاؤ
بس اک پل کے لیے دل میں رکھو اس کو
پھر اس کے بعد ساری نفرتوں میں جھانک کر دیکھا
وہ تم کو بھی ملے گا
دکھی ہے وہ، تو رہنے دو

○

مگر اتنا بتا دو، تم تو خوش ہو
اس کا کیا ہے، اس سے کیا لینا
کہ وہ ہے بھی نہیں بھی

○●○

شاداب رضی

مراجعت

دوڑتے بھاگتے لمحوں کے تعاقب میں کبھی
میں نے آوارگیِ برگِ خزاں دیکھی ہے
پیش و پس اور چپ و راست بگولوں کا سفر
پہلوئے گل میں رواں برقِ تپاں دیکھی ہے

دوڑتے بھاگتے لمحوں کے تعاقب میں کبھی
میں نے خود اپنے تعلق سے یہ محسوس کیا
ڈال سے چپکے ہوئے دق زدہ پتے کی طرح
لطمۂ موجِ ہوا سے رہا سہما سہما
کرب کے پیچکی احساس سے طاری جیسے
فرق سے تا بہ قدم روح و بدن پر رعشہ
حلق میں خار چبھے اور لبوں میں نشتر
چھا گیا میری رگ و پے میں تھکن کا نشہ

ایسے ہنگام بھی دورانِ تعاقب آئے
دل نے جذبے کو مرے سرد بھی کرنا چاہا
میری آنکھوں میں شبِ تار نے انگڑائی لی
حوصلے نے مرے تھک ہار کے مرنا چاہا
عزم کے پاؤں بھی رکنے سے لگے تھے۔ لیکن
یاس کا ابر چھٹا ۔ پھوٹی شعاعِ امید
جیسے گھنگھور گھٹا چیر کے نورانی لکیر
ایک دو پل کو کرے ظلمتِ شب کی تردید

میں نے فہمائشِ دل کی ابھی مایوس نہ ہو
پالنا مہرِ جہاں تاب کا ہے پہلوئے شب
مرحلہ ہائے غم و یاس کے بعد اے دلِ من
تیرا مقصود تری نذر گزارے کا طرب
اٹھ ا کہ پھر عزم کا سامانِ سفر تازہ کروں
نفسِ سوختہ کو بارِ دگر تازہ کروں

بارے دل پھر سے تعاون پہ رضامند ہوا
مثلِ خاشاک تھا میں کوہِ دماوند ہوا
بڑھ کے تخئیل کی پلکوں نے مرے تلووں سے
ایک اک کر کے سبھی خارِ الم چن ڈالے
جوششِ حوصلۂ نو کی عنایت کے طفیل
ان گنت خواب تصور نے مرے بن ڈالے

یوں لویں دے اٹھی تاریک فضا کی چلمن
جیسے قاصر ہو چھپانے سے قبا رنگِ بدن
جیسے چلمن کے کوئی نور کہیں سے آئے
بے محابانہ قد و قامتِ ترکانہ لیے
شاہدِ وقت ملا نازشِ جانانہ لیے
توڑ کر بازوؤں کی محراب اشارے کر کے
کہی وہ بات کہ جس کا نہ [illegible] ہو پائے
ہر نفس ایک نیا رنگ بدلتی دنیا

یوں لگا ۔ میری قدم گیر ہوئی جاتی ہے
نغمہ ۔ بادہ ۔ شبنم ہو کہ پھولوں کے سبو
ایک اک شئے مری راہوں میں بچھی جاتی ہے
دوڑتے بھاگتے لمحوں کا تعاقب کر کے
میں نے سمجھا کہ چلو ایک بڑا کام کیا
اب کسی شوخ شگوفے کو کسی غنچے کو
اب کسی شاخ کسی پھول کسی بھونرے کو
زرد موسم کے حوالے نہیں ہونے دوں گا
ہجر کو قرب کے رنگین اجالے دوں گا
سو پریشاں تو کبھی چاک گریباں کر کے
صحرا صحرا نہ پھرے گا کوئی مارا مارا
تیز ہوں گے نہ سرِ خار جنوں زاروں میں
دشت ہو جائیں گے تبدیل فسوں زاروں میں
ہر طرف مشکِ ختن کا جہاں ڈیرا ہوگا
بس دھنک رنگ بہاروں کا بسیرا ہوگا
ہوں گے مرقد نہ جہاں تشنہ تمناؤں کے
در کھلے ہوں گے جہاں ہر طرف آشاؤں کے

دفعتاً صرصرِ سفاک اٹھی لہرا کر
ہوگئی ساری فضا گرد و غبار آلودہ
چند ذروں کی خلش کر گئی آنکھوں کو مری
آن کی آن میں یک لخت غبار آلودہ
یک بہ یک میرے کفِ دست اٹھے آنکھوں تک
کھل گئے میرے تصور کے بھرم ہی سارے
خیمہ ۔ خواب سے خوابوں کے سبھی بنجارے
ایسے نکلے کوئی بھونچال میں جیسے گھر سے
پھر وہی عارض و لب پھر وہی بادِ مسموم
موجہ ۔ خون کی مانند رگ و پے میں تھکن
تشنگی گردِ سفر پھر وہی دیرینہ جلن
خواب پھر خواب ہیں خوابوں کی حقیقت معلوم
خواب کا رشتہ صداقت سے خیالی ۔ موہوم
پھر نیا وہم دکھاتا ہے مگر اپنی جھلک
ہیں مرے دستِ نظر اور گریبانِ فلک

○●○

جوشش مندوزئی

تقدیسِ محبت

○

اک کار رواں ہے ہائی وے پر
اور سیٹ پہ پچھلی
کرسی میں معصوم سا بچہ بیٹھا ہے
پاداش میں پیدا ہونے کی
یوں باندھ کے تنہا رکھا ہے
جس طرح کوئی وہ قیدی ہو
اک چوسنی منہ میں دے دی ہے
تا رو نہ سکے چلائے نا

○

اک کار رواں ہے ہائی وے پر
ماں باپ ہیں اگلی سیٹوں پر
ہیں مست جوانی کے پیکر
بیوی نے ٹکا رکھا ہے سرَ
اک خاص ادا سے شانے پر
ہے گود میں چھوٹا سا کتا
سینے سے لگا کر رکھا ہے
اور ساز کی دل کش دھن پر وہ
کتے کو تھپکتی جاتی ہے

○

منہ چومتی جاتی ہے اس کا
نظروں میں سمٹ کر آتی ہے کتے کے لیے جس کی ممتا

○

اک کار رواں ہے ہائی وے پر
جو ایک فریبِ ممتا تھی وہ چوسنی شاید چھوٹ گئی
اک آس کی ڈوری ٹوٹ گئی
رویا وہ بلک کر چیخا بھی اور ہاتھ بھی مارے پاؤں بھی
لوٹائے کوئی شاید اس کو
وہ چیز کہ جس سے پیار سا تھا
سینے کی طرح تھی ماں کے جو
ابرو میں پڑے کچھ بل ماں کی
غصے سے پلٹ کر یوں دیکھا
جیسے وہ کوئی سوتیلا ہو اپنی گود میں بیٹھے کتے کا
اور چیخ کے بولی - یو شٹ اپ
ڈو ناٹ کرائی یو فول اگین -
بچے کے حلق سے اک سسکی
آتی تھی لبوں تک ٹوٹ گئی
معصوم سا بچہ کیا جانے تقدیسِ محبت چھوٹ گئی

○●○

اعجاز عبید

○

م و زر رکھیے ، بہت لعل و جواہر رکھیے
رکھیے ، مرے دیواں کے برابر رکھیے

ال نہ ہو وقت جو پڑ جائے تو خالی نکلے
اپنی آنکھوں کے خزانے کو بچا کر رکھیے

ں مرجھانے پہ خوشبو نہیں دیتے صاحب
اپنے بالوں میں مرے ہونٹ سجا کر رکھیے

ینے کو سلگنا ہی نہیں ہے کافی
نکھ میں جھیل تو سینے میں سمندر رکھیے

ل وہ ادسر ہے یہاں زخموں کی کھیتی کے لیے
نسوؤں سے اسے ہر لمحہ بھگو کر رکھیے

لیسہ دیوانہ پھرے ہے کہ جسے عشق کہیں
رات بے رات قدم گھر سے نہ باہر رکھیے

○●○

○

رنگ و بو کی فضائیں کیا کیا ہیں
زخم دل کی قبائیں کیا کیا ہیں

کچھ برستا نہیں مگر دل پر
ابر کیا کیا گھٹائیں کیا کیا ہیں

کھل گئیں کیسی کیسی دستاریں
سر سے اتری ردائیں کیا کیا ہیں

کس کا آنگن حسین بنا ہوگا
اس کی رنگیں قبائیں کیا کیا ہیں

ہم ہی شہرِ وفا میں ہیں کہ یہاں
خوف کیا کیا ، بلائیں کیا کیا ہیں

دل کو خوں کر کے شعر کہیے عبید
عاشقی کی سزائیں کیا کیا ہیں

○●○

عزم بہزاد

○

کتنے موسم سرگرداں تھے مجھ سے ہاتھ ملانے میں
میں نے شاید دیر لگادی خود سے باہر آنے میں

ایک نگاہ کا سناٹا ہے اک آواز کا بنجر پن
میں کتنا تنہا بیٹھا ہوں قربت کے ویرانے میں

بستر سے کروٹ کا رشتہ ٹوٹ گیا اک یاد کے ساتھ
خواب سرہانے سے اٹھ بیٹھا تکیے کو سرکانے میں

آج اس پھول کی خوش بو مجھ میں پیہم شور مچاتی ہے
جس نے بے حد عجلت برتی کھلنے اور مرجھانے میں

بات بنانے والی راتیں ۔ رنگ نکھارنے والے دن
کن رستوں پر چھوڑ آیا میں عمر کا ساتھ نبھانے میں

ایک ملال کی گرد سمیٹے میں نے خود کو پار کیا
کیسے کیسے وصل گزارے ہجر کا زخم چھپانے میں

جتنے دکھ تھے جتنی امیدیں سب سے کچھ کچھ کام لیا
میں نے اپنے آئندہ کی اک تصویر بنانے میں

ایک وضاحت کے لمحے میں مجھ پر یہ احوال کھلا
کتنی مشکل پیش آتی ہے اپنا حال بتانے میں

پہلے دل کو آس دلاکر بے پروا ہوجاتا تھا
اب تو عزم بکھر جاتا ہوں میں خود کو بہلانے میں

○●○

○

تشنگی وہ تھی کہ سیرابی کا چہرہ جل گیا
میں لبِ دریا جو پہنچا سارا دریا جل گیا

اب نئے منظر میں بیٹھا ہوں ارادوں کے بغیر
جستجو کی سانس کیا پھولی کہ سینہ جل گیا

میں خزاں کا آئینہ تھا اپنی ویرانی سے خوش
تم نے مجھ میں باغ ڈھونڈا ۔ میرا صحرا جل گیا

کیا بیاں ہو اک تعلق ختم ہوجانے کا حال
دھوپ تھی انکار کی ۔ خواہش کا سایہ جل گیا

رات محفل کی سماعت نے وہ تاریکی دکھائی
قصہ گو بجھنے ہی والا تھا کہ قصہ جل گیا

کیا دوا ۔ کیسی بحالی ۔ آخری کوشش کے ساتھ
بسترِ بیمار پر دستِ مسیحا جل گیا

خواب میں دیکھا تھا خود کو راکھ ہونے کے قریب
نیند سے چونکا تو باہر کا تماشا جل گیا

حکم تھا آنکھیں کھلی رکھوں کہ شمعیں بجھ نہ جائیں
میں بھی اس خوبی سے جاگا جس نے دیکھا جل گیا

یہ غزل ہے نذرِ غالب عزم جس غالب کا دل
"دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا"

○●○

جوش مندوزئی

○

جب پرندوں نے ٹھکانے بدلے
بجلیوں نے بھی نشانے بدلے
جتنے صیاد چمن میں آئے
جال سب نے ہی پرانے بدلے
تھی تماشائے نظر تبدیلی
جو تہِ دام تھے دانے بدلے
زلفِ تقدیر الجھتی ہی گئی
لاکھ تدبیر نے شانے بدلے
اب اناالحق نہ سہی وجہِ سزا
وار باقی ہے بہانے بدلے
حرمتِ فرد کہاں اب باقی
جبر نے سارے فسانے بدلے
بے حسی اپنی نہ بدلی اب تک
ظلم کے کتنے زمانے بدلے
جوش کشتی نہ بھنور سے نکلی
ناخدا کتنے خدا نے بدلے

○●○

○

تمام رات جلے دھوپ ان نگاہوں کے
اندھیرا پھر بھی رہا گھر میں بے سہاروں کے

پجاری اپنے سیاسی خدا سے بدظن ہیں
سہارے ڈھونڈ رہے ہیں نئے خداؤں کے

بھروسا اس پہ رکھو جو ہوا کا خالق ہے
مرید ہو کے نہ رہ جاؤ باد بانوں کے

یہ مشعلیں ہیں جو انساں کی رہ گزر میں ہیں
مقدرات سے رشتے نہیں ستاروں کے

ہے جوش آج تلک قید ان کی آنکھوں میں
کواڑ بند ہوئے تھے کبھی نگاہوں کے

○●○

جمال اویسی

○

جو بھی ملتا ہے نصیبوں سے خدا دیتا ہے
لیکن اس بات کو تو دل سے مٹا دیتا ہے

کاشتا ہے مری امید کا نخلِ جاں تب
شجرِ تمر مرے دل میں اگا دیتا ہے

دل میں بھرتا ہے مرے خواہشِ دنیا تو ہی
اور پھر تو ہی مجھے اس کی سزا دیتا ہے

پہلے ایقان کی اک شمع جلاتا ہے ۔ مگر
روشنی پھیلتے ہی اس کو بجھا دیتا ہے

کون ہو پاتا حریفِ گلِ رعنا ۔ لیکن
تو ہی جب اس کے مخالف کو بڑھا دیتا ہے

میں نے دیکھی ہے مسیحائی تری جب دل میں
درد اٹھتا ہے اسے اور بڑھا دیتا ہے

○●○

○

اچھا ہے چراغ جل نہ پائے
دل کا یہ اندھیرا ٹل نہ پائے
من موہنی صورتو ! کہو تم
کیوں ترچھی نظر بدل نہ پائے
وہ شام تھی بے مثال ۔ پر ہم
کیا بات ہوئی بہل نہ پائے
ہر محفلِ دوستاں میں اے دل
کیوں تیرا مزاج ڈھل نہ پائے
میرے لیے تیرگی بہت ہے
کیا ہے جو چراغ جل نہ پائے
اچھے تھے محبتوں کے رشتے
بس ہم ہی ذرا بہل نہ پائے
دنیا کی اساس ہے تجارت
اس رسم کو ہم بدل نہ پائے
اک مسئلہ زندگی ہے گویا
اور آدمی اس کا حل نہ پائے

○●○

حسن داد خاں

○

ہم سمجھتے ہیں کام اپنا ہے
کام ان کا ہے نام اپنا ہے

کیسے کہہ دوں کہ شعر میرے ہیں
لفظ ان کے کلام اپنا ہے

مے کدہ ان کا مے بھی ان کی ہے
ہاتھ اپنے ہیں جام اپنا ہے

یہ زمیں ان کی بام و در ان کے
گو بہ ظاہر مقام اپنا ہے

کیا کریں جبر و اختیار کی بات
کب کوئی انتظام اپنا ہے

خود نبرد آزما ہیں خود کے لیے
زیست سے انتقام اپنا ہے

جانتے ہیں اہلِ ہوش و حواس
آج سب کو سلام اپنا ہے

یہ جو توفیقِ بندگی ہے حسن
اصل میں احترام اپنا ہے

○○○

مقبول احمد مقبول

○

زمانے سے عبث میں بدگماں تھا
مرا دشمن مرے اندر نہاں تھا

مرے اطراف، بارش قمقموں کی
مری آنکھوں سے اک دریا رواں تھا

مرا ذوقِ سفر تھا میرا رہبر
نہ نقشِ پا نہ کوئی کارواں تھا

ہوا ثابت زمیں سے بھی فروتر
جو کل میری نظر میں آسماں تھا

حقیقت میں ریا کارِ ازل ہے
بہ ظاہر وہ رفیق و رازداں تھا

خبر کیا تھی کہ تجھ سے جی لگانا
حقیقت میں مرے جی کا زیاں تھا

میں اکثر سوچتا رہتا ہوں مقبول!
نہ جانے کیوں وہ مجھ پر مہرباں تھا

○○○

جمال اویسی

○

کون دریا سے لڑے اور مرے
جو مرے خواب کو غرقاب کرے

ہاتھ اٹھانے نہیں دیتی زنجیر
خواہشِ وصل گرفتار کرے

شمع گل ہوگئی کیوں میرے بعد
شبِ تاریک پہ الزام دھرے

وقت کی حد سے گزرتے ہوئے ہم
آگے دیکھا تو گئے اور پرے

عقل میری بھی نگہباں نہ ہوئی
دل فسوں کارئ دانش سے ڈرے

○●○

حبیب اجملی

○

جھوم اٹھی بزم بھی تحسین کے تحفے برسے
لبِ شاعر سے جو کچھ پھول سخن کے برسے

یادِ ماضی کا وہ ہرسو تھا چراغاں شب بھر
جلتے بجھتے ہوئے جگنو کے اجالے برسے

اس بارش کی لیے بھیگ رہی تھیں آنکھیں
اب کے پانی نہیں موسم کے اشارے برسے

کوئی آواز سنائی نہیں دیتی مجھ کو
اتنے سناٹوں کے پرشور دھماکے برسے

غم کے تپتے ہوئے صحرا کے قریب آکے حبیب
لوٹ جاتی ہے مسرت کی گھٹا بے برسے

○●○

غلام جیلانی

فریب زار

(آخری قسط : ۹)

(۳۵)

منوج دو دن تک پھر لاپتہ رہا۔ لی نا سے بھی اس کے گھر پر ہی کہہ دیا تھا کہ اگلے دو دن آفس آنے کی ضرورت نہیں۔ حسبِ معمول کسی کو خبر نہیں تھی، وہ کہاں رہا۔

چوتھے دن آفس آیا تو ایک سبز رنگ کا چھوٹا سا لفافہ اس کی میز پر دھرا تھا اوپر لکھا تھا "پرسنل" کھولا، تو ایک چھوٹے کاغذ پر مختصر سی عبارت تھی پڑھنے کے بعد منوج یکایک خاموش ہو گیا۔ دیر تک کسی سوچ میں غرق رہا۔ ایش ٹرے میں رکھے جلتا ہوا سگریٹ راکھ کی پنسل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ لی نا اسے تجسس بھری نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔

... "یہ خط میری بیوی نے بھیجا ہے، انگلینڈ سے ... واپس آنا چاہتی ہے ... پوچھا ہے، کیا میں اسے معاف کردوں گا ؟"

یہ اطلاع لی نا کے لیے بھی اتنی ہی اچانک اور غیر متوقع تھی، جتنی منوج کے لیے۔ گم سم سی رہ گئی۔ ساری چہل اور بھول کر سہمی سہمی سی منوج کو دیکھنے لگی ... کئی سکنڈ اسی خاموشی میں گزر گئے۔

"... کیا آپ معاف کردیں گے، سر ؟"

منوج نے نیا سگریٹ جلا لیا تھا ... "سنو لی نا۔ تمہارے جاننے کے لیے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایک آدھ مہینے میں چندی گڑھ جا کر نیو ہورائزن پبلی کیشن جوائن کرلوں گا ... سادھنا کنسرن والا۔ وہ لوگ بہت دنوں سے بلا رہے ہیں ... اب میں فیصلہ کرلیا ہے ..."

منوج رک کر لی نا کو دیکھنے لگا، جو پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی ... چپ چاپ۔ جیسے منوج کی بات کا مطلب پوری طرح اس کے پلے نہیں پڑا ہے۔

... "ظاہر ہے کہ میں چندی گڑھ چلا جاؤں گا۔ یہ آفس بند ہو جائے گا ..."

اچانک ایک سرد، برفیلی لہر لی نا کے سر سے پاؤں تک تیر گئی ... وہ سہم کر رہ گئی ... بھیانک حقیقت اب ا کھلتی جا رہی تھی۔

... "ہاں۔ لی نا ... یہ تو ہونا ہی تھا، ایک دن۔ چندی گڑھ نہیں تو پھر کلکتے چلا جاتا ... اسی میں بہتری ہے، میر اور تمہاری بھی ... کیا تم ساری عمر اس چھوٹے سے آفس میں اپنا کیریر خراب کرو گی ؟ ... تم ٹیلنٹڈ ہو، ترقی کی بلندیوں تک

۔ اور سنو۔۔۔ زندگی ڈے ڈریمنگ نہیں ہے۔ حقیقت کا سامنا کرنا سیکھو۔ چاہے وہ شروع میں کڑوی لگے۔۔۔ تمھیں اس سے کہیں اچھا جاب مل جائے گا۔ میں ریکمنڈ کروں گا۔۔۔ اور اچھا سا اس بینڈ تم تلاش کر کے جلد سے جلد شادی کر لو۔۔۔ ممی بوڑھی ہوتی جارہی ہیں۔"

۔۔۔ اس دوران منوج نے ایک دفعہ بھی لی نا کی طرف نہیں دیکھا۔ بس میز پر فائلوں کو بے مطلب ادھر ادھر کرتا رہا۔

(۳۹)

روپیش کچھ دنوں کے لیے لوکیشن شوٹنگ پر اوٹی گیا ہوا تھا۔ لوٹا تو اس کے کانوں تک بھی وہ باتیں پہنچیں جو رما کے تعلق سے سوسائٹی کے انٹلکچوئل طبقے میں ہو رہی تھیں۔۔۔ پروفیسر کے واقعے کو آرتی نے فون پر ہی اس انداز میں تفصیل سے سنا دیا جیسے وہ خود وہاں موجود تھی، اور رما کی "مذموم" حرکتوں کی چشم دید گواہ ہے۔ روپیش کو یقین نہیں آسکا۔ اس نے بھی رما کو قریب سے دیکھا تھا اور اس کا مداح رہا تھا۔ ایک شام اپنے پس و پیش پر غالب آکر اس نے رما کو فون کیا کہ وہ ملنے آنا چاہتا ہے۔

یہ وہی دن تھا جب آئس کریم پارلر میں دھیرج گھوش کی باتوں سے رما کو سخت ذہنی اذیت پہنچی تھی۔۔۔ روپیش کی آواز نے اسے قدرے دلاسا دیا۔۔۔ "تم کہاں تھے اتنے دن؟۔۔۔ ابھی آجاؤ۔ بہت سے کام ہیں، جو تمھیں میرے لیے کرنے ہیں۔۔۔ نیل کمل آرہی ہے، شادی کے لیے۔۔۔" رما کہتی چلی گئی۔

اور جب روپیش آیا تو رما نے اسے دیر تک روک لیا۔ پہلے تو نیل کمل کی باتیں ہوتی رہیں پھر یکایک بولی۔۔۔ "مگر تم جن باتوں کے سننے کے لیے آئے ہو، میں جانتی ہوں۔ اور اب میں تمھیں وہی باتیں سنانے والی ہوں۔۔۔"

اس دن رما بے تکان بولے جارہی تھی۔ اس نے وہ ساری باتیں روپیش کو سنادیں، جنھیں جاننے کے لیے وہ آیا تھا۔۔۔ اور وہ باتیں بھی، جو اس نے کسی سے نہیں سنی تھیں اور نہ اسے معلوم تھیں،۔۔۔ پروفیسر راجن اور انیتا کی، مشہور ناولسٹ دھیرج گھوش کی، اور معصوم ناصر کی بے زبان محبت کی!۔ خاموش رہنے والی رما اس دن عجیب ہذیانی کیفیت میں باتیں کیے جارہی تھی، جو کئی جگہ بے ربط بھی ہوئی جارہی تھیں۔ روپیش بت بنا خاموش سنتا رہا۔۔۔

"روپیش۔ کتنا دکھ پھیلا ہوا ہے اس دنیا میں!۔۔۔ اور سب کو تلاش ہے، سکھ کی!۔۔۔ دوڑ رہے ہیں اس کے پیچھے، جو بادل کا گزرتا ہوا سایہ ہے،۔۔۔ اور جب وہ گزر جاتا ہے، تو محرومی کا احساس اور دکھی کر دیتا ہے!۔۔۔ جسم کی بھوک مٹ بھی جائے تو روح پیاسی رہ جاتی ہے! کوئی شکایت، کوئی گلہ نہیں ان سے جن سے مجھے آزار پہنچا۔ تعجب بھی نہیں۔ انھوں نے وہی کیا جو انھیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔ ایسا نہ کرتے تو ہوتا تعجب!۔۔۔ اپنے اپنے شکنجوں میں سب بے بس ہیں۔۔۔ ان انٹلکچوئلس کیا اور غیر انٹلکچوئلس کیا!

۔۔۔ فضول۔۔۔ سب فضول۔۔۔ کچھ نہیں ہے دکھ کے سوا۔ سب جھوٹ۔۔!۔

(۴۰)

نیل کمل اپنے منگیتر کے ساتھ آرہی ہے، یہ بات ابھی اسوانی، منوج اور روپیش کے سوائے کسی اور کو معلوم نہیں ہوئی تھی۔ اور اسی وجہ سے آرتی دن رات کھوج میں تھی کہ رما کے گھر یکایک ان لوگوں کا آنا جانا کیسے بڑھ گیا ہے!

رما کو یقین تھا کہ نیل کم حسب معمول بغیر اطلاع کے پہنچ جائے گی۔ سر پرائز کا سسپنس منٹ وہ کبھی ہاتھ سے جانے

نہیں دیتی ۔ ۔ ۔

رما اس بات سے بے نیاز اپنے اور آنند کے رشتہ داروں کے پتے ڈھونڈھ کر نکالنے میں مصروف رہی ۔ دونوں کے خاندان شروع ہی سے وسیع نہیں تھے۔ کئی لوگ دوسرے ملکوں میں جا بسے تھے۔ چند رہ گئے تھے، وہ بھی ہندستان میں جانے کہاں کہاں بکھر گئے تھے ۔ ۔ ۔ اپنی دنیاؤں میں قید۔ کسی کے پاس فرصت ہو، یا کوئی قدر مشترک ہو تو کوئی خط بھی لکھے ! رما نے سوچا کہ نیل کی شادی کے موقع پر شادی کے رقعوں کے ساتھ سب کو علاحدہ خط بھی لکھے ! ایک مشترکہ مضمون کا مسودہ بھی لکھ کر تیار کرلیا ۔ ۔ ۔ ۔

مگر اس کے ساتھ ہی اسے لکھے ہوئے ان ڈھیر سارے صفحوں کا خیال آگیا جن میں ایک ناول کا وجود سانس لینے لگا تھا۔ مگر جو اس کے شعور میں ایک اب سیٹین بن کر سما گیا تھا ۔ ۔ ۔ اب نہ وہ اسے پھاڑ کر پھینک دینا چاہتی تھی، اور نہ اس کا قلم آگے سرکتا تھا ۔ ۔ ۔ ایک دفعہ، بس ایک دفعہ کیا میں ناصر سے نہیں مل سکوں گی ؟

عجیب بات تھی، ادھر چند دنوں سے جب جب رما کے ذہن کے پردے پر آنند آموجود ہوتا تو ایک لمحے کے لیے پس منظر میں ناصر کا دھندلا دھندلا چہرہ بھی نمودار ہوتا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس پر آنند کا چہرہ سوپر امپوز کرلیتا ۔ ۔ ۔

پروفیسر راجن اور دھیرج گھوش کو اس نے معاف کردیا تھا۔ مگر ناصر کے لیے وہ اپنے آپ کو کیسے معاف کرے گی ؟

بستر پر لیٹے لیٹے رما کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ باہر خزاں کی اداس رات میں لپٹی ہر شئے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر پچھلے سات راتوں کے چاند نے ہلکے سفید بادلوں کی اوٹ میں اپنا چہرہ چھپالیا تھا۔ پھر بھی اس کی روشنی میں رما کو بادام کا تناور درخت اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ جس کی شاخوں سے ہوا کا کوئی تیز جھونکا گزرتا تو اپنے ساتھ کئی زرد اور سوکھے پتوں کو اڑا لے جاتا ۔ ۔ ۔ اور پھر جب یہ جھونکے ہلکے ہوجاتے، اور شاخوں میں ہولے ہولے سرسرانے لگتے، تو لگتا جیسے پیڑ اپنے پتوں کی جدائی پر سسکیاں بھر رہا ہے۔

۔ ۔ ۔ یہ گھٹتا بڑھتا چاند، یہ آتے جاتے موسم، یہ ہوا میں پوشیدہ نغمے اور سسکیاں ۔ ۔ ۔ یہ سب کتنے سفاک اور بے حس ہیں ! وہ سوچنے لگی ۔ ۔ ۔ کب سے کھیل رہے انسانوں کے جذبات کے ساتھ، یہ سب ! خود ہی آتش شوق بھڑکاتے ہیں ۔ ۔ ۔ اور پھر خود ہی جدائی کا کرب دے جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ بے حس ۔ ۔ ۔ سب بے حس ۔ ۔ ۔ اور سفاک ۔ ۔ ۔

یکایک ٹیلی فون کی گھنٹی نے رما کو چونکا دیا ۔ ۔ ۔ کون ہے ! ۔ ۔ ۔ اس وقت ۔ ۔ ۔ رات کو ! اور پھر ایک لمحے کے لیے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی، نیل کمل ہوگی۔

مگر کال دلی سے آئی تھی، رضیہ کی۔ رما کے دل کی دھڑکن اور تیز ہوگئی ۔ ۔ ۔ ۔

" آج ہی پتہ چلا ہے کہ ناصر حیدرآباد کے پاس ناگر جونا کونڈا کے مقام پر کسی بودھی وہارا میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ تم نے اصرار سے کہا تھا، اس لیے فوراً اطلاع کردی۔ میں صبح کی فلائیٹ سے وہاں پہنچ رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

رما دم بہ خود رہ گئی ۔ ۔ ۔ جس اطلاع کے لیے وہ بے چین تھی، اسی نے یکایک اسے بدحواس کردیا ۔ ۔ ۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ناصر کا پتہ اسے اتنی جلدی مل جائے گا ! ۔ ۔ ۔ اور وہ بھی ایسے وقت جب کہ نیل کمل کسی بھی دن، کسی بھی لمحے آسکتی ہے ! ۔ ۔ ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، وہ کیا کرے !

۔۔۔ اور پھر اس نے طے کرلیا اسے کیا کرنا ہے۔

اسی وقت منوج کو فون کیا۔ وہ جانتی تھی منوج ان دنوں آفس کی بجائے گھر پر رات کو دیر تک کام کرتا ہے۔۔۔ منوج نے تعجب سے فون اٹھایا تو ساری بات اسے سنادی۔۔۔ "منوج صاحب۔۔۔ کہیں دیر نہ ہوجائے۔ صبح سویرے ہی میں روانہ ہوجاؤں گی۔ آپ کو میرے ساتھ ناگر جونا ساگر چلنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سویرے ہی آجاؤں گا۔۔۔ اپنی گاڑی لے کر۔"

(۴۸)

شہر پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ کار اب دھان کے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔ فصلیں کٹنی شروع ہوگئی تھیں۔ دور دور تک پھیلے ہوئے گہرے سبز کھیتوں کو ان میں کام کرتی ہوئی تلنگنوں کی سرخ اور زرد ساڑیوں نے اور بھی دل فریب بنادیا تھا۔ کہیں کہیں کام کے ساتھ وہ آپس میں مل کر گانے بھی لگ جاتیں تو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ان کی تانیں فضاء میں دور دور تک پھیل جاتیں۔۔۔ رما کو اس دن ان تانوں میں چھپی ایک عجیب سی کسک محسوس ہورہی تھی۔۔۔

جس ذہنی تناؤ کو لے کر وہ گھر سے چلی تھی، وہ اب قدرے کم محسوس ہورہا تھا۔

یہاں تک سفر میں اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ منوج بھی خاموشی میں کار ڈرائیو کرتا رہا۔۔۔ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ رما نے چلتے وقت خادمہ سے کہہ دیا تھا کہ اگر نیل کل آجائے تو اس سے کہہ دو کہ پریشان نہ ہو۔ وہ ایک دو دن میں واپس آجائے گی۔۔۔ وہ کہاں اور کیوں جارہی ہے [illegible]۔۔۔ بتانے پر کیا وہ، یا کوئی اور سمجھ پاتا؟ خادمہ کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھما کر کہہ دیا تھا کہ رضیہ کے آنے پر اسے دے دے۔

اب کار تلنگانے کی مجوبہ، روزگار پہاڑیوں میں سے گزر رہی تھی جن کی مثال ساری دنیا میں نہیں ملتی۔۔۔ گرینائیٹ کی چٹانیں ایک دوسرے پر یوں دھری ہوئی جیسے ذرا سے دھکے سے لڑھک جائیں گی۔۔۔ عظیم الجثہ پتھر اپنے سے کہیں چھوٹے پتھروں کے ایک ذرا سے حصے پر ٹکے ہوئے!

"ہزاروں لاکھوں موسم ان پر سے گزر گئے، مگر یہ چٹانیں اسی طرح ایک دوسرے پر قائم ہیں۔"۔۔۔ یکایک منوج نے خاموشی کو توڑا جو اب بہت زیادہ بوجھل ہوتی جارہی تھی۔ "۔۔۔ آپ کو معلوم ہے رما دیوی، یہ بڑی بڑی چٹانیں، چھوٹی چٹانوں پر کس نے رکھی تھیں؟"

رما مڑ کر منوج کو خاموشی سے دیکھنے لگی۔

۔۔۔ "دیوتاؤں کے بچوں نے۔ پراچین کال میں ایک روز آکاش کے دیوتا اپنے پریواروں کے ساتھ دھرتی پر اترے تھے۔۔۔ وہ بھگوان رام اور سیتا کے بن باس کا زمانہ تھا۔ اور وہ دونوں لکشمن کے ساتھ وادی میں ٹھیرے ہوئے تھے، جو تلنگانے کی سیما پر گوداوری کے کنارے ہے۔ دیوتاؤں کے آنے کا کارن بس یہی تھا کہ دیکھیں بھگوان رام کس حال میں ہیں؟ اسی لیے وہ سب یہیں تلنگانے میں اترے۔

دن بھر ان کے بچے پہاڑیوں پر کھیلتے رہے۔ بڑے بڑے پتھروں اور چٹانوں کو ایک دوسرے پر جما کر خوشی مناتے رہے۔ ۔۔۔ اور شام کو جب ان کے ماتا پتا وادی سے واپس آئے تو کھیلتے کھیلتے ان چٹانوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے ماتا پتا کے ساتھ

واپس آ کاش چلے گئے ۔۔۔ اور اب تک یہ چٹانیں ویسی ہی دھری ہیں ۔۔۔"

منوج نے پلٹ کر دیکھا تو اپنے تمام ذہنی ٹینشن کے باوجود رما مسکرا رہی تھی ۔ منوج بھی مسکرانے لگا ۔

"آپ نے یہ کہانی کہاں پڑھی ؟ ۔۔۔ یا پھر ابھی گھڑی ہے ؟" رما نے پوچھا ۔

"کیا فرق پڑتا ہے ؟ ۔۔۔ آپ کو کیسی لگی ؟"

"دل چسپ ضرور ہے ۔۔۔۔"

کار ایک گاؤں میں سے گزر رہی تھی ۔ اچھی خاصی آبادی تھی ۔ ایک اڑپی ہوٹل دیکھ کر منوج نے کار روک لی ۔

"صبح کو جلدی میں ناشتہ نہ آپ نے ٹھیک سے کیا تھا اور نہ میں نے ۔ چلیے اب اڈلی اور کافی کا ایک اور ناشتہ ضروری ہے ۔۔۔۔"

(۳۹)

نیل کمل کے پلین نے حیدرآباد کے ایرپورٹ پر صبح نو بجے لینڈ کیا ۔ رسک ساتھ تھا ۔ ایرپورٹ پر اس نے نیل کمل سے ایک مرتبہ پھر کہا گھر پر فون کر کے اپنے آنے کی اطلاع کر دے ۔ مگر نیل کمل نہیں مانی ۔ سسپنس ، سرپرائز ۔۔۔ اور اکسائیٹ منٹ سارا سیناریو اس کے ذہن میں مچل رہا تھا ۔۔۔ پورٹیکو میں ٹیکسی رکے گی ۔ وہ دوڑ کر کال بیل دبائے گی دروازہ کھلے گا اور ۔۔۔ ممی دھک سے رہ جائیں گے ۔ جذبات کے سیلاب میں کوئی بات نہ کر سکیں گی ! اور پھر دونوں بڑھ کر لپٹ جائیں گے ۔۔۔ دیر تک ، ایک دوسرے میں سمائے ہوئے ! ۔۔۔ ممی کی آنکھیں بھیگ جائیں گی ۔ اور جب گردن اٹھائیں گی تو پیچھے رسک کھڑا ہوگا ! ممی دیکھتی رہ جائیں گی ۔

مگر جب نیل کمل گھر پہنچی تو سرپرائز کا سارا اکسائیٹ منٹ دھرا کا دھرا رہ گیا ۔۔۔ ممی بہت سویرے ہی منوج انکل کے ساتھ کہیں دو دن کے لیے چلی گئی تھیں ۔۔۔ نیل کمل حیران رہ گئی ! کہاں گئی ہیں ، کیوں گئی ہیں ۔۔۔ کچھ بتایا بھی نہیں !

اسوانی انکل کو فون کیا ۔ مگر سن کر وہ بھی حیران رہ گئے ۔ انھیں بھی کچھ پتہ نہیں تھا ۔ نیل کمل سے بولے ۔۔۔ میں ابھی آکر تم سے ملتا ہوں ۔ کوئی فکر نہ کرو ۔

مگر اسوانی کے آنے سے پہلے آرتی ، اندرانی کے ساتھ وہاں پہنچ گئی ۔ رما اور منوج کے جانے کی اطلاع کو اس تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی ۔ سنتے ہی دل میں کھل بلی مچ گئی ۔ بے چینی بڑھنے لگی تو سوچا کہ شاید گھر پر نوکرانی سے کرید کرنے پر اور بھی کوئی بات معلوم ہو جائے ۔ اندرانی کو ساتھ لے کر پہنچ گئی ۔۔۔ مگر گھر پر رما کی بیٹی اور ہونے والے داماد کو دیکھ کر تو اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا ! نئی نئی خبروں اور اسکینڈلس کے لیے تو جیسے دروازہ کھل گیا !

"فکر مند نہ ہو بیٹی ۔۔۔ تمھاری ممی ایک دو دن میں ہی آجائیں گی ۔۔۔" شفقت سے لبریز لہجے میں آرتی نیل کمل کو دلاسہ دینے لگی ۔۔۔ "تمھیں شاید پتہ نہیں کہ وہ اور منوج اس سے پہلے بھی اسی طرح کہیں چلے گئے تھے ۔۔۔ مگر ہمیں وقت وہ جلدی آجائیں گے ۔ انھیں معلوم ہے ، تم آنے والی ہو ۔۔۔"

نیل کمل کے چہرے کے اڑتے ہوئے رنگ دیکھ دیکھ کر آرتی کو بڑا سکون مل رہا تھا ۔

(۳۰)

پہاڑیاں پیچھے رہ گئی تھیں ۔ ۔ ۔ کار اب تل گنڈے کے خشک علاقے سے گزر رہی تھی ۔ یکایک منوج بولا ۔ ۔ ۔ " اور اگر نیل کمل آ گئی ہو تو ؟ "

" آجانے دو ۔ ۔ ۔ "

" اس کے ساتھ رسک بھی ہو گا ۔ "

" وہ لوگ انتظار کر سکتے ہیں ۔ میں نہیں ۔ " رما بولی ۔

" انتظار تو آرتی بھی نہیں کرے گی ۔ ۔ ۔ " منوج بولا ۔

رما نے مڑ کر ایک نظر منوج پر ڈالی اور پھر پلٹ کر سامنے دیکھنے لگی ۔ ۔ ۔ " نیل کمل آئے ، نہ آئے ۔ ۔ ۔ آرتی نے اپنا کام شروع کر دیا ہو گا ۔ ۔ ۔ مگر ان باتوں پر سوچنے کا نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ مجھے ان کی پرواہ ہے ۔ ۔ ۔ جانے پھر موقع ملے نہ ملے ۔ ۔ ۔ ناصر سے ایک دفعہ ملے بغیر مجھے سکون نصیب نہیں ہو گا ، منوج صاحب ۔ شاید ۔ ۔ ۔ اسے اب بھی ہوش کے راستے پر لا سکوں ! کچھ رسکوں اس کے لیے ۔ ۔ ۔ نہ بھی کر سکوں تو بس ایک بار مل لوں ! ۔ ۔ ۔ یہ خواہش ایک مستقل اب سیشن بن چکی ہے میرے لیے ۔ کیا وہ لوگ اس بات کو سمجھ سکیں گے ؟ "

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے ۔ ایک ذرا سی دیر کے لیے منوج کے ذہن میں آیا تھا کہ رما سے کہے " ۔ ۔ ۔ آپ کے اب سیشن میں صرف آپ ہی نہیں ، وہ ناول بھی بستا ہے ، جو آپ کے گھر پر ادھورا پڑا ہے ۔ ۔ ۔ " مگر اس نے کہا نہیں ۔ نیل کمل کا ذکر چھیڑ کر ، اسے پہلے ہی محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے غلطی کی ہے ۔ ۔ ۔ وہ چپ چاپ کار چلاتا رہا ۔ رما بھی چپ رہی ۔ فاصلہ اب آدھے سے بھی کم رہ گیا تھا ۔

یہاں سڑک عجیب ویران سے علاقے سے گزر رہی تھی ۔ گاؤں آتے بھی تو دور دور اور چھوٹے چھوٹے سے ۔ کار کے اندر خاموشی اب بوجھل ہوتی جا رہی تھی ۔ ۔ ۔ بالآخر رما بولی ۔ ۔ ۔ " منوج صاحب ۔ اب آپ ذرا ریسٹ لیجیے اور اسٹیرنگ مجھے دے دیجیے ۔ "

منوج نے کار روک لی ۔ اس نے دیر سے سگریٹ بھی نہیں سلگایا تھا ۔ ۔ ۔ رما نے جیسے ہی کار آگے بڑھائی ، منوج نے سگریٹ سلگائی ۔ اور سیٹ پر گردن ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں ۔ ۔ ۔

کار کے اندر وہ بوجھل پن اب تحلیل ہو چکا تھا ۔

" ناگر جونا ساگر پہنچ کر ناصر کو کیسے اور کہاں تلاش کرنا ہو گا ؟ اس سلسلے میں کچھ سوچا ہے آپ نے ؟ " ۔ ۔ ۔ منوج نے پوچھا ۔

" نہیں ۔ "

" رضیہ نے کچھ نہیں بتایا ؟ "

" اسے شاید خود بھی نہیں معلوم ۔ "

" ناگر جونا کونڈا تو جنگل میں ڈوب چکا ۔ ۔ ۔ معلوم نہیں وہ کہاں رہتا ہے ۔ "

" معلوم ۔ ۔ ۔ ؟ " رما نے پوچھا ۔

"۔۔۔ قدیم کے تالاب گھنے جنگل اور اونچے پہاڑوں میں، کرشنا کے کنارے کچھ پرانی گپھائیں ہیں، جو کسی زمانے میں بودھی وہاروں میں ہوا کرتی تھیں۔ ناگارجنا کونڈا اسی گاؤں کا نام ہے۔ کہیں ناصر بودھی راہبوں کے ساتھ وہیں نہ ہو۔۔۔"

"وہاں تک کار جاسکتی ہے؟" رما نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔"

سڑک کے دائیں جانب دور افق پر پہاڑوں کا ایک سلسلہ نظر آنے لگا تھا۔ منوج ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔

"ان پہاڑوں کے پیچھے سے کرشنا دریا آرہا ہے۔ اب ناگر جونا شہر زیادہ دور نہیں۔"

"کون سا شہر؟" رما نے پوچھا۔۔۔ "بودھی عہد کا ناگر جونا کونڈا، جس کے کھنڈر اب ساگر کی تہہ میں ہیں؟۔۔۔ یا وہ شہر اب دوبارہ بسایا گیا ہے؟"

"دونوں۔ جو ڈوب گیا، ناگر جونا کونڈا، اس کی ایک ایک اینٹ کو اٹھا کر تالاب کے ایک جزیرے پر جوں کا توں رکھ دیا گیا ہے۔۔۔ آپ نے دیکھا ہے؟" منوج نے پوچھا۔

"دیکھا ہے۔ آنند کے ساتھ"۔۔۔ رما نے جواب دیا۔ "میں نے وہ شہر اس وقت دیکھا تھا، جب کھدائی میں برآمد ہوا تھا۔۔۔ اس وقت اسے تالاب کے پانی نے نہیں، وقت کے سمندر نے غرق کررکھا تھا۔ تالاب میں گم ہوجانے والا شہر، جہاں ناگر جونا لوگوں کو سمجھاتا تھا کہ غم اور خوشی ایک ہی احساس کے دو رخ ہیں۔ ان کے فرق کو مٹادو گے تو نجات کا راستہ مل جائے گا۔۔۔ ہزاروں سال سے یہ شہر خود کو زندہ رکھنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ زمانے کی رفتار نے اسے نابود کردیا، مگر اسے پھر سے بنایا گیا۔۔۔ یہ اس کا پنر جنم ہے اور کون جانے اس میں دبی روح بھی سانس لیتی ہے!"

رما اک دم چپ ہوگئی۔ کہیں سے ایک مانوس آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی۔۔۔ "یہاں بھی شاعری شروع کردی؟۔۔۔ ادب، فلسفہ، شاعری! زمانے کی تلخ حقیقتوں کے سامنے سب فراڈ لگتا ہے، رما دیوی جی۔۔۔" آنند اسے اسی طرح چھیڑ کر خوش ہوا کرتا تھا۔۔۔

اور اب مشرق کی طرف جمع ہونے والے بادل بڑھ کر آسمان کے ایک بڑے حصے پر پھیلتے جارہے تھے۔ سورج بار بار ان کی گرفت سے باہر آنے کی ناکام کوشش میں لگا ہوا تھا۔ موسم اب بھی ویسا ہی خشک لگ رہا تھا۔

منوج نے سوچ لیا تھا کہ ناگر جونا ساگر شہر پہنچ کر وہ سب سے پہلے پولیس اسٹیشن میں دریافت کرے گا۔ جرنلسٹوں کو پولیس والوں کا تعاون فوراً مل جاتا ہے اور پولیس کو یقیناً معلوم ہوگا کہ ناصر والا بودھی راہبوں کا گروپ کہاں آکر ٹھہرا ہوا ہے۔

شہر ابھی آٹھ دس کیلو میٹر دور ہی تھا کہ سڑک پر اچانک بھیڑ بکریوں کا ایک بڑا ریوڑ آگیا۔ وہیں سے ایک کچا راستہ سڑک کے دائیں جانب سے نکل کر بہت دور پہاڑوں کی طرف جارہا تھا۔ ان ہی پہاڑوں کے دامن میں پہلی جانب ساگر کا پانی لہریں مار رہا ہوگا۔۔۔ منوج سوچا!۔۔۔ یک لخت اسے خیال آیا کہ ان ہی پہاڑوں کی ڈھلانوں میں وہ گاؤں بھی ہوگا، جہاں قدیم بودھی گپھائیں ہیں۔۔۔ وہارا اور چیتیا ہیں!

"یہ راستہ کہاں جاتا ہے؟" کار سے اتر کر منوج نے بکریوں کے ریوڑ والے بچے سے پوچھا۔

"گاؤں کو۔" بچے نے جواب دیا۔

"کون سا گاؤں؟"

"بلیشورم۔۔۔"

کار میں بیٹھتے ہوئے منوج نے رما کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش بیٹھی تھی منوج نے کار کچے راستے پر موڑ دی۔

ٹیڑھا میڑھا راستہ پہاڑ کی طرف جارہا تھا۔ آگے اونچائی پر بے ڈھب نکلے ہوئے پتھروں پر سے کار کو بچا کر لے جانا اور بھی شکل ہوگیا۔ گاؤں خاصی اونچائی پر پہاڑ کی ڈھلان پر تھا۔۔۔ چھوٹا سا گاؤں۔ کوئی پندرہ بیس گھر تھے۔ گھاس پھوس اور مٹی کی دیواروں لے، اور کویلو کی چھتوں والے۔ ان کے پرے ایک اونچی چٹان پر کوئی پرانا دیول تھا، جس کے چبوترے کی سیڑھیوں کے نیچے تک اگر کا پانی آگیا تھا۔ اوپر پہاڑ کی ڈھلان پر خود رو جنگلی جھاڑیوں میں بچی دو قدیم گپھاؤں کے دہانے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے گے سے پتھروں میں تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی اور ٹوٹی پھوٹی سی سیڑھیاں اونچی گھاس میں لپٹی نیچے گاؤں تک آرہی تھیں۔

سیڑھیوں پر سے تین بھکشو سر جھکائے آہستہ آہستہ نیچے اتر کر آرہے تھے۔ ان کے سر گھٹے ہوئے اور جسم پر زرد چادریں تھیں۔

دیول والی چٹان کے پاس تھوڑی سی ہموار جگہ دیکھ کر منوج نے کار کھڑی کردی کار سے اتر کر وہ اور رما بھکشوؤں کو تکنے لگے ان کی طرف آرہے تھے۔ گاؤں کے کچھ مرد اور عورتیں اور کچھ بچے کار کے پاس آ کھڑے ہوئے اور حیران نظروں سے منوج اور رما کو یکھنے لگے۔

اور اس وقت منوج اور رما کے کانوں میں پہلی بار وہ ہلکی ہلکی، غیر مانوس اور پر اسرار سی آواز آئی، جو پاس کے کسی گھر ے آرہی تھی۔۔۔ اور پھر دھیرے دھیرے ان کی سمجھ میں آنے لگا کہ وہ آواز کسی مرد کی ہے۔ جو عربی زبان میں قرآن شریف کی ِلاوت کر رہا ہے۔

رما کا دل دھک سے ہوگیا۔۔۔ منوج پلٹ کر کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر اس دوران میں بھکشو ان کے پاس پہنچ چکے تھے اور اب یرت میں ڈوبی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔۔۔

"آپ لوگ ناصر کو جانتے ہیں؟"۔۔۔ منوج نے رکتے رکتے پوچھا۔

جواب دینے کی بجائے وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔۔۔ بالآخر ایک بولا۔

"وہ مہان تھا۔۔۔ اس نے سمبودھی کی سیما کو پار کرلیا تھا۔۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے ناصر نے پری نروان پالیا۔۔۔!"

منوج نے رما کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل گم سم کھڑی تھی۔

"آپ لوگ ناصر کے کون ہیں؟" دوسرے بھکشو نے پوچھا۔

بھکشو کو کوئی جواب نہیں ملا۔ رما اور منوج اسی طرح چپ چاپ کھڑے رہے تھے اور اس خاموشی میں اس گھر سے آتی ئی پراسرار آواز ذرا سی دیر کے لیے ایک بار گی ابھر کر مدھم ہوگئی۔۔۔ جیسے رات کے سناٹے میں کسی گاؤں کے باہر کہیں دور ی سفری سینما گھر سے سکنڈ شو کے کسی نغمے کی آواز ہوا کے جھونکوں پر سوار سنائی دے جاتی ہے۔

"جانیے۔۔۔ دیکھ لیجیے۔۔۔" پہلے بھکشو نے اس گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں سے وہ آواز آرہی تھی۔۔۔ "اچھا ا آپ آگئے۔ ہم بھی سوچ رہے تھے۔۔۔ کہ۔۔۔"

مگر رما وہاں نہیں تھی ۔۔۔ وہ ہولے ہولے قدموں سے پرانے مندر کی سیڑھیوں کی طرف جارہی تھی ۔ منوج کچھ دیر وہیں اسے دیکھتا رہا ، کھویا کھویا سا ۔ پھر خود بھی بہت دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنے لگا ۔

مندر کا چبوترا کئی جگہ سے ٹوٹ گیا تھا ۔ اس پر پہنچا تو دیکھا ، رما دوسری طرف پہاڑی کے نیچے اترتی ہوئی سیڑھیوں پر دور تک پھیلے ہوئے ساگر کے پانیوں کو دیکھ رہی تھی ۔ جن پر دھندلائی ہوئی دھوپ میں جگہ جگہ بادلوں کی کجلائی ہوئی پرچھائیں جزیرے ایک دوسرے کے تعاقب میں پھیلتے جارہے تھے ۔۔۔

لگتا تھا جیسے مندر سے مورتی اٹھ آئی ہے ۔۔۔ پتھر میں ترشی ہوئی ۔۔۔ بے حس و حرکت ! پتھرائی ہوئی آنکھیں ساگر آکاش کے بیچ خلاء کی دھند میں جانے کیا تکے جارہی تھیں ! ۔۔۔ چہرے پر نہ غم ، نہ خوشی ! ۔۔۔ فکر و احساس کی کشاکش سے ۔۔۔ غم و اندوہ کے سلاسل سے بے نیاز ! ۔۔۔ نہ کچھ سن سکتی تھی ، نہ دیکھ سکتی تھی ! ہوا کے دوش پر آنے والی وہ سحر انگیز اوپر پہاڑوں کی اونچائیوں میں اپنے سربستہ راز سینے میں چھپائے وہ ہزاروں سال پرانی گپھائیں اور یہاں اس بے نام سے قدیم گپھا گریہہ کے رنگ منڈپ کی چھت سے آویزاں یہ گھنٹے ۔۔۔ سب اپنے اپنے فریم میں فریز ہوکر معلق ہوگئے تھے ۔ اور پھر یہ دوسرے میں ضم ہوکر آوٹ فوکس ہونے لگے ۔۔۔ اور پھر یہ بے ترتیب بے مطلب پرچھائیاں بھی فیڈ آوٹ ہونے لگیں ۔۔۔

بس ایک نیلگوں دھند کا غبار حدِ نگاہ تک پھیلتا چلا گیا ۔۔۔

اب نہ وہاں ساگر کا بے پایاں پانی تھا اور نہ اس کی سطح پر مچلتی ہوئی بے چین موجیں ۔۔۔ ہر چیز غبار کی نیلگوں دھندلا میں تحلیل ہوچکی تھی ۔۔۔ اور یہ دھواں دھواں کہرے کی نیلاہٹ زمین اور آسمان کے درمیان پھیلی ہوئی وسعتوں میں بلند ہوتی تھی ۔۔۔ جیسے آسمان کو چھولے گی !

۔۔۔ لاحاصل ۔۔۔ سب لاحاصل ۔۔۔ لایعنی ۔۔۔

اور پھر پتھر کی مورتی یک لخت چبوترے کے سرے پر یوں بیٹھ گئی جیسے کانپتے ہوئے پیر اس کا بوجھ سنبھال نہ سکے ۔۔۔ ۔

○●○

سلسلہ ص : ۳۵ سے)

) اور Pataxan -ta utayo پتے خان تا اُٹایو (اس نے / پتے خاں / فتح خاں / کو اٹھایا ۔ ۔ ...angur ki pakiyo انگور کی پکیو (انگور کب پکا ۔۔۔) اور ranun-se -na auqȧt pakáyo رنُن سے نا اوقات پکایو (اس کی بیویوں نے کھانا پکایا) ۔ ȃ ...i-na čupanu -nala duṛayo پاچا اُٹو ، دڑیو کنیز کُلا (بادشاہ اٹھا ، کنیز کی طرف دوڑا) اور uto, duryó kaniz -kula ہم نا چوپانو نلا دڑایو (ہم نے چرواہے / چوپان / کے ساتھ / بھیڑیے کو / کھدیڑا) ۔

بعض اوقات اساسی اور سببی ساق کے تضاد کو داخلی تصریف کے ذریعے یعنی ہندستانی میں a/ā (اَ اور آ) کی طرح متکلم مصوتے (u/ə/a) اور متکلم مصوتے (a) کے تبادلہ باہمی کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے : -utur- / utər- / utar (اُتُر بہ معنی اُترنا) ۔۔۔ -utar (اُتر بہ معنی اُتارنا) ۔ موازنہ کریں : pâšâ uturo taxt- parta پاشا اُتُرو تخت پرتا (تخت سے اترا) اور fer in-ta utaryo فیر ان تا اُتریو (پھر ان کو / زمین پر / اُتارا) ۔

○●○

سجاد ظہیر

سائبان

ایرپورٹ کے ہجوم میں اس کی ایک جھلک نظر آئی اور پھر وہ غائب ہو گئی! کوئی اور وقت ہوتا تو میں لپک کر اس کی طرف ؛اور اسے ہجوم میں بھی جا لیتا مگر اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ ڈیپارچر لاؤنج میں میرا بڑا بیٹا سلیم مجھ سے الوداعی کلمات کہہ رہا ۔ میری بہو نسرین مجھے تاکید کر رہی تھی کہ میں اپنا خیال رکھوں، صبح کی سیر میں ناغہ نہ کروں، ناشتہ میں ملائی ہرگز نہ لوں اور ؛یٹ تو اب بالکل ہی چھوڑ دوں، کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں اس کے بھائی کو فوراً فون کروں ۔ ۔ ۔ اور میرا چار سالہ پوتا میری ؛ں سے چمٹا مجھ سے وعدہ لینا چاہ رہا تھا کہ میں جلد ہی کنیڈا واپس آؤں اور جب آؤں تو اس بار اس کے ساتھ اس کے ؛ـ میں رہوں ۔

اس صورتِ حال میں میرے لیے کیا گنجائش رہ جاتی تھی کہ میں اس کے پیچھے جاتا جس کے پیچھے لپکتے اور جس کے قرب اور ؛ہ کی تمنا کرتے بارہ برس بیت چکے تھے ۔

جب میرا بیٹا، بہو اور پوتا الوداعی ہاتھ ہلاکر ایرپورٹ کی عمارت میں چلے گئے تو میں نے پھر اس کی تلاش میں نظر دوڑائی ۔ وہ نیلی ساڑی میں تھی لہذا میری نظریں لوگوں کے ہجوم میں نیلا رنگ تلاش کرتی رہیں ۔ مجھے اپنے اوپر غصہ آرہا تھا ۔ آخر میری آنکھوں ؛اسے کیوں کھودیا؟ آج تین سال بعد وہ مجھے نظر آئی تھی ۔ تنہائی، اداسی اور جدائی کے اس لمحے میں اچانک مجھے اس کی ضرورت ؛ سے زیادہ محسوس ہونے لگی ۔ میں ہجوم سے نکل کر سڑک کی طرف آگیا، مگر وہ مجھے دور دور تک نظر نہ آئی ۔

وہ یہاں کیوں آئی تھی؟" میں نے سوچا " شائد سمارا کو رخصت کرنے آئی ہو " ۔ سارا اس کی بیٹی تھی جو شادی کے بعد سے ؛ شوہر کے پاس امریکہ میں رہتی تھی ۔ اب تو اس کے دو تین بچے ہوں گے ۔ بیٹی کو رخصت کر کے وہ اداس ہو گئی ہوگی ۔ شائد ؛ہم درد ضرورت وہ بھی محسوس کررہی ہو ۔ مجھے اس کے پاس جانا چاہیے ۔ ۔ ۔ مگر وہ تھی کہاں؟

اچانک مجھے خیال آیا کہیں وہ اوپر اسکائی ویو میں نہ ہو ۔

اور پھر میں لپکتا ہوا سیڑھیوں کی طرف گیا ۔ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرا رواں رواں دعا کر رہا تھا کہ وہ اوپر اسکائی ریسٹورنٹ مجھے مل جائے ۔ میں ہر قیمت پر اس سے ملنا چاہ رہا تھا، اس سے کرنے کے لیے میرے پاس باتوں کا نہ ختم ہونے والا ؛رہ تھا ۔ اپنی بے چینی دیکھ کر میں خود حیران تھا کہ آخر اس کے بغیر میں نے تین سال گزار کیسے لیے؟

میں جب اوپر پہنچا تو میری سانس پھول رہی تھی جوں ہی میں ریسٹورنٹ میں داخل ہوا وہ مجھے نظر آگئی ۔

دعائیں اس طرح بھی قبول ہوجاتی ہیں ۔

ایک لمحہ کو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، مگر شبہ کی گنجائش نہیں تھی ۔ یہ وہی تھی ۔ آسمانی ساڑی میں ملبوس اس کا

اداس اور مضطرب چہرہ اس کی ہتھیلی پر ٹکا ہوا تھا اس کی نگاہیں بائیں جانب مڑی ہوئی تھیں جہاں شیشے کی بڑی سی دیوار کے ادھر رن وے کا منظر نظروں کے سامنے تھا۔ جہاں کبھی کوئی جہاز اتر رہا تھا، کبھی کوئی اپنے سفر پر روانہ ہو رہا تھا، وہ اس نظارے میں اس قدر گم تھی کہ اردگرد سے تقریباً لاتعلق لگ رہی تھی۔

کچھ سوچ کر میں اس سے خاصے فاصلے پر ایک الگ میز پر جا بیٹھا جہاں سے میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ اسکائی ویو میں اس وقت عملے کے دو افراد کے علاوہ یا وہ تھی یا میں۔ مدھم سروں میں کوئی ملائی دھن بج رہی تھی۔ میں نے رن وے پر ایک نظر ڈالی۔ ایرانڈیا کا جہاز ٹیکسی کر رہا تھا۔ ڈربن، ساؤتھ افریقہ جانے والا جہاز ٹنل سے لگا کھڑا تھا۔ کنیڈا جانے والے جہاز کی روانگی میں ابھی کچھ وقت تھا میں نے گھڑی دیکھی۔ فروری کی چار تاریخ تھی اور صبح کے سات بجے تھے۔ میں نے پھر اس کو دیکھا وہ جتنی ٹوٹی ہوئی، شکستہ اور تنہا اس وقت تھی، اتنی ہی ٹوٹی ہوئی شکستہ اور تنہا بارہ سال قبل تھی۔ جب دفتر میں اس کا پہلا دن تھا اور وہ دن کل کی طرح میرے حافظے میں محفوظ تھا۔

میں شہر کی ایک بڑے طباعتی ادارہ میں اس وقت خاصے اچھے عہدے پر تھا جب ہمارے ادارے کے ایک سینئر فینانشیل ایڈوائزر رفیق احسان کا ہارٹ اٹیک سے اچانک انتقال ہوگیا۔ رفیق سے میری ملاقاتیں عموماً میٹنگ کے دوران ہوا کرتی تھیں یا کبھی ضرورتاً فون پر بات ہوجاتی تھی۔ ہمارا ادارہ ایک تین منزلہ عمارت میں قائم تھا۔ رفیق کا کمرہ پہلی منزل پر اور میرا تیسری منزل پر تھا لہذا کئی کئی دن گزر جاتے تھے ہمارے درمیان ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ رفیق دل کے دورے سے جاں بر نہیں ہوسکا۔ چیرمین سے لے کر چپراسی تک سب ہی اس کے جنازے میں شریک تھے۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا بلال اس وقت اٹھارہ سالہ نوجوان تھا۔ دوسرا بیٹا کمال سولہ سال کا تھا دونوں ہی بہت دل گرفتہ اپنے والدین کے جنازے میں شریک تھے۔ میں ان دونوں بچوں سے بہ طور خاص ملا اور اپنے ہر ممکنہ تعاون کا انھیں یقین دلایا، میں ان دونوں کے لیے اپنے دل میں خاص ہم دردی محسوس کر رہا تھا۔ لہذا چند ہفتوں کے بعد رفیق کے واجبات وغیرہ کی وصولی کے لیے بلال جب دفتر آیا تو سیدھا میرے پاس ہی آیا۔ میں نے اس کی ہر طرح رہ نمائی کی، واجبات کی ادائیگی میں ہفتہ دس دن لگ گئے، اس دوران تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن وہ دفتر آتا تھا، اس سے گفت و شنید کے دوران پتہ چلا کہ وہ میڈیکل کالج میں سالِ اول کا طالبِ علم تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی کالج کے پہلے سال میں اور چھوٹی بہن میٹرک میں تھی اور یہ کہ چوں کہ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے لہذا اس کی ماں عدت کے بعد ملازمت کرے گی۔ میں نے اسے ان دیکھی، دکھی عورت کے لیے اپنے دل میں خاص جذبہ ہم دردی محسوس کیا۔ یہ میرا اس سے پہلا رابطہ تھا، یک طرفہ رابطہ۔

"اپنی والدہ کو میرا سلام کہیے گا۔ انھیں کہیں کہ وہ ملازمت کے لیے کہیں اور جانے کے بہ جائے ہمارے پاس آئیں۔ رفیق صاحب کے بعد ان کے خاندان کو ہم بے آسرا نہیں چھوڑیں گے، میں چیرمین صاحب سے بات کرلوں گا، مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کریں گے۔"

میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بلال کو دیا۔

"اور ہاں اپنی والدہ کا ایک سی۔ وی، مجھے [illegible] دیجیے گا۔"

ایک ہفتہ کے بعد بلال نے مجھے اس کا سی۔ وی لاکر دیا۔ "امی آپ کو سلام کہلا رہی ہیں، یہ سن کر کہ آپ لوگ انھیں

جواب دے دیں گے۔ ان کی آدھی پریشانی ختم ہو گئی ہے۔ وہ آپ کی بہت شکر گزار ہیں۔" بلال کہہ رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے غور سے سی۔ وی دیکھا۔ وہ انٹرنیشنل ریلیشنز میں ایم۔ اے تھی۔ عمر چالیس سال تھی۔ ٹائپنگ، کمپیوٹر یا کسی اور قسم کی ٹکنیکل ٹریننگ اس کے پاس نہیں تھی، نہ ہی اس سے قبل ملازمت کا کوئی تجربہ تھا۔ جب یہ سی۔ وی میں نے چیرمین صاحب کو دیا تو وہ کچھ متفکر ہوئے۔

"انھیں ہم کہاں ایڈجسٹ کر سکیں گے؟"

"آپ انھیں میرے ڈپارٹمنٹ میں بھجوا دیں۔ میں انھیں کام سکھادوں گا، اگر نہیں چل سکیں تو فیکٹری بھی بھجوایا جاسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ انھیں انٹرویو کے لیے بلوالیں۔"

چیرمین صاحب کا شیڈول ایسا تھا کہ وہ تین فروری تک خاصے مصروف تھے لہذا میں نے فون کر کے اسے چار فروری کو دفتر بلوالیا۔ انٹرویو کا نام سن کر وہ کچھ گھبرا سی گئی تھی۔

"انٹرویو۔۔۔ اصل میں رضا صاحب مجھے انٹرویو دینے کا کوئی سابقہ تجربہ نہیں ہے۔"

"آپ گھبرائیے نہیں۔۔۔ یہ بس ایک رسمی کارروائی ہے، چلیے یوں سمجھیے کہ انٹرویو نہیں بلکہ چیرمین صاحب آپ سے کچھ گفتگو کریں گے لہذا آپ کل گیارہ بجے تشریف لے آئیں۔"

"جی بہت اچھا۔"

یہ میری اس سے پہلی گفتگو تھی۔

اگلے دن وہ پونے گیارہ بجے میرے دفتر میں تھی۔ میں اسے دیکھ کر کافی حیران ہوا۔ چھریرے بدن کی، ایک خوب صورت، سنجیدہ خاتون تھی۔ یہ باور کرنا دشوار تھا کہ بلال اور کمال جیسے نوجوانوں کی ماں ہوگی۔ اس کے چہرے پر کھنڈی ہوئی اداسی اور اس کے وجود پر طاری تنہائی نے اسے بڑا شکستہ حال بنا دیا تھا۔

میں چند منٹ اس سے گفتگو کرتا رہا اور ٹھیک گیارہ بجے اسے چیرمین صاحب کے کمرے میں لے گیا۔ چیرمین صاحب چند منٹ اس سے بات چیت کرتے رہے پھر کہا۔

"آپ فی الحال رضا صاحب کا ڈپارٹمنٹ جوائن کر لیں، ابتدائی چھے ماہ آپ کا پروبیشن پریڈ ہے، اگر آپ کی رپورٹ تسلی بخش آئی تو آپ کی ملازمت کنفرم ہو جائے گی۔ باقی ٹرمز اینڈ کنڈیشنز رضا صاحب آپ کو بتا دیں گے۔"

یوں وہ میرے ڈپارٹمنٹ میں آگئی۔ میں نے کام سکھانے کے لیے اسے مسز راتھر کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ بہت زیادہ محنتی ثابت ہوئی۔ اردگرد سے بے نیاز اپنے کام میں جتی رہتی۔ کبھی کبھار اس کا امتحان لے لیا کرتا تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ خاصی ذہین تھی۔

چھے ماہ بعد اس کی کارکردگی کی بہترین رپورٹ میں نے چیرمین صاحب کو بھجوادی۔ اس کی نہ صرف ملازمت کنفرم ہو گئی بلکہ اس کی تنخواہ میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ آہستہ آہستہ اس کا اعتماد بحال ہونے لگا۔ اب کبھی کبھی وہ ہنس بول بھی لیا کرتی تھی۔ اس سے گفت و شنید کے دوران، میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ رفیق کا کوئی تذکرہ نہ آئے کیوں کہ رفیق کا ذکر اسے بری طرح زخمی کر دیتا تھا اور وہ کافی دیر کے لیے گم سم ہو جاتی تھی۔ رفیق کی موت تھی بھی بہت اچانک۔ رات کے پچھلے پہر درد اٹھا تھا اور بات دم گیا تھا، واپس آیا تو کمرے کے دروازے پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے گرنے کی آواز سن کر وہ اٹھی تھی مگر رفیق جاں بر نہ ہو سکا۔

...ب کچھ اتنا اچانک تھا کہ وہ اس کی موت کا یقین ہی نہیں کرپا رہی تھی۔

ابتدائی وہ تین سالوں میں بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے اس کی زندگی میں داخل ہوگیا تھا۔ اس کا اندازہ میں نے اس وقت سے لگایا کہ ہر دشواری اور پریشانی کے وقت وہ سیدھی میرے پاس آتی تھی۔ پریشانی خواہ دفتری ہو خواہ گھریلو۔ اس کی دفتری پریشانیاں دور کرنا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا کہ میں اس ادارہ میں گزشتہ پچیس سال سے کام کررہا تھا اور اس وقت میں دفتر کے تین بڑوں میں شمار ہوتا تھا۔ میں بہ راہ راست چیرمین کو جواب دہ تھا اور بس۔ میں اس کے گھریلو مسائل میں بھی نہایت دیانت داری سے اس کو مشورے دیتا تھا۔ بلال اور کمال اپنی پڑھائی میں مصروف تھے اس کے تمام گھریلو مسائل میں حل کرادیا کرتا تھا، چھوٹے بڑے ہر معاملے میں وہ مجھ سے گفتگو کرنے لگی تھی۔ کمال نے ایف۔ ایس۔ سی کرلیا ہے، اب اسے کون سی ٹکنیکل فیلڈ لینی چاہیے۔ سمارا نے میٹرک کرلیا ہے، کون سا کالج اچھا رہے گا؟ سے لے کر، توبہ یہ سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ آج گھر جاکر کیا پکاؤں؟ تک سب باتیں مجھ سے کیا کرتی تھی۔

خود وہ بھی بری طرح میرے وجود میں تحلیل ہوچکی تھی۔ اس کو دفتر آئے تین سال ہی ہوئے تھے مگر مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں اسے برس ہا برس سے جانتا ہوں۔ دفتر میں کچھ دیر وہ مجھے نظر نہ آتی تو میری نظریں اسے تلاش کرتی رہتیں۔ دفتر میں ہی نہیں گھر میں بھی وہ میرے قریب رہتی۔ میں صبح کی چائے بناتا تو کچن میں ہی کہیں موجود ہوتی، میں اخبار پڑھتا تو قریب ہی کہیں ناک کی نوک پر باریک سیاہ فریم کا پڑھنے کا چشمہ ٹکائے اخبار پڑھ رہی ہوتی، گاڑی ڈرائیو کرتا تو میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھی ہوتی۔ وہ میرے گھر میں کہیں نہیں تھی مگر اس کے باوجود میری زندگی کے ایک ایک لمحہ میں زندہ تھی۔

اگر میری بیوی سائرہ زندہ ہوتی تو شائد وہ میری زندگی میں اتنی آسانی سے داخل نہ ہوسکتی۔ سائرہ میری بیوی بھی تھی اور میری چچازاد بھی۔ ہماری شادی ہمارے بڑوں کا فیصلہ تھا۔ مجھے اس فیصلے پر کوئی غیر معمولی خوشی تھی نہ کوئی اعتراض۔۔۔ اعتراض کی گنجائش یوں نہیں تھی کہ وہ بی۔ اے پاس تھی، قبول صورت تھی، بہ قول میری امی کے گھر گرہستی جانتی تھی۔ وہ پچیس سال میرا ساتھ دے کر گزر گئی۔ ہمارے دو بیٹے تھے سلیم اور ندیم۔ میرا دن تو دفتری مصروفیات میں گزر جاتا لیکن جب میں تھکا ہارا شام کو گھر پہنچتا تھا تو سائرہ کی کمی سب سے زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ میری اس سے کوئی غیر معمولی ذہنی ہم آہنگی تو نہیں تھی مگر یہ تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ اس کے بعد میں بہت زیادہ اکیلا ہوگیا تھا، سلیم اپنے دفتر میں ہوتا، ندیم یونیورسٹی میں، سائرہ کی عدم موجودگی میں گھر بھائیں بھائیں کرتا، اچھا بھلا گھر سرائے بن کر رہ گیا تھا، اسے دوبارا گھر بنانے کے لیے میں نے سلیم کی جلد ہی اپنی بھانجی سے شادی کردی یوں نسرین نے آکر گھر سنبھال لیا۔ وہ حتی المقدور میری ضروریات کا خیال رکھتی مگر ذات کی تنہائی بہو بیٹیاں کب ختم کرسکتی ہیں۔

سائرہ کے انتقال کو تین سال گزرے تھے جب اس نے دفتر جوائن کیا تھا اور چند برسوں میں میری زندگی میں بری طرح رچ بس گئی تھی۔ ہمارے درمیان غضب کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ گھریلو معاملات سے لے کر عالمی سیاست تک ہمارے نظریات اور خیالات ایک جیسے تھے۔ زندگی کی قدروں کے بارے میں ہمارے رویے ایک سے تھے پر ہم دونوں کا وہ غم بھی مشترک تھا جس نے ہم دونوں کو تنہائی کے کرب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ان ساری باتوں نے ہمیں ایک دوسرے کا بہت اچھا دوست بنادیا تھا۔ یوں تو اپنے ڈپارٹمنٹ کے تمام لوگوں سے میرا رویہ دوستانہ تھا، میرا انداز روایتی افسروں والا نہیں تھا تاہم اس کے ساتھ میرے خصوصی برتاؤ کو دیکھتے

ہوئے میرے دوستوں نے مجھے مشورہ دینا شروع کر دیا تھا کہ میں اس سے شادی کر لوں۔

میرا اس کے گھر آنا جانا بھی تھا۔ اس کے بیٹوں سے میری پہلے ہی دوستی تھی۔ اس کی بیٹی سمارا سے بھی ملاقات رہتی۔ وہ کالج کی طالبہ تھی۔ خوب صورتی میں ماں کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ البتہ وقت سے پہلے سنجیدہ ہو گئی تھی۔ میرے ساتھ بھی اس کا رویہ لیے دیے ہی رہا۔ وہ مجھے بہت پسند تھی۔ میری خواہش تھی کہ ندیم اسے اپنی شریک حیات کے طور پر قبول کر لے۔ ندیم انجینئرنگ یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے ان دنوں جرمنی میں تھا۔ لہٰذا کسی سے بات کرنے سے قبل میں نے ندیم سے خط لکھ کر پوچھا تھا کہ اب شادی کے بارے میں اس کا کیا ارادہ ہے؟ اور یہ کہ کیا میں اس کے لیے کوئی لڑکی تلاش کروں؟

اس کے جوابی لفافے میں خط کے ساتھ ایک جرمن لڑکی کی تصویر بھی تھی جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ میری خواہش گویا سر اٹھاتے ہی دم توڑ گئی۔

سمارا کے لیے وہ تین رشتے موجود تھے۔ اس کے بی۔ اے کرتے ہی اس نے اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھائی کے بیٹے سے کر دی اور وہ چند ہفتوں کے بعد امریکہ چلی گئی جہاں مزوری میں اس کے ماموں کی فیملی پہلے سے ہی سیٹل تھی۔

اسکائی ویو کا ویٹر اس کی میز پر چائے اور سلائس وغیرہ سرو کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کی توجہ رن وے سے ہٹ گئی تھی۔ میں نے جلدی سے اخبار اٹھا کر اپنے سامنے اس طرح تان لیا کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔ اس کی میز سے وہی ویٹر میرے پاس آیا "کافی... چکن سینڈوچز" میں نے اخبار ہٹائے بغیر ویٹر سے کہا اور اس کے جانے کے بعد کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا وہ اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔

بہت تھکی ہوئی، شکستہ اور دل برداشتہ لگ رہی تھی۔

"یہ اکیلی کیوں ہے" اچانک مجھے خیال آیا "بلال کہاں ہے؟ اگر سمارا کو سی۔ آف کرنے کا معاملہ تھا تو بلال کو ساتھ آنا چاہیے تھا" کمال کے بارے میں تو مجھے پتہ تھا کہ وہ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے ماموں کے پاس امریکہ میں تھا۔ مگر بلال تو ماں کے پاس رہتا تھا۔ اس وقت تو اس کے کلینک کا وقت بھی نہیں تھا۔ اسے اپنی ماں کے ساتھ ضرور آنا چاہیے تھا۔

مجھے بلال پر غصہ آنے لگا۔

مجھے یوں ہی اس پر غصہ تھا۔ یہ وہی تھا جو ہم دونوں کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔ یہ بلال ہی تھا جس کی وجہ سے مجھے اسے کھونا پڑا تھا۔ وہ میری رگِ جاں سے قریب آ کر بے دردی سے دور کر دی گئی تھی۔ میرا دل دکھ سے بھرنے لگا۔ میں نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہی تھی۔

گزشتہ بارہ سالوں میں اس نے سینکڑوں بار میرے ساتھ چائے پی تھی۔ ہم دونوں ہی چائے اور کافی کے شوقین تھے۔ کبھی وہ میرے لیے چائے بناتی، کبھی میں اس کے لیے۔ چائے ہی کیا متعدد بار میں نے اس کے گھر اور اس نے میرے گھر کھانا کھایا تھا۔ وہ تو خیر بہت اچھا کھانا پکاتی تھی میں نے بھی کھانے میں جو تین چار چیزیں سیکھی ہوئی تھیں ان کو کھلا کر رعب جمایا کرتا تھا۔

یہ وہ دن تھے جب سلیم، نسرین اور میرے دونوں پوتے کینیڈا جا چکے تھے۔ ندیم جرمنی جا چکا تھا اور میں گھر میں پھر سے بالکل تنہا ہو گیا تھا۔ میری تنہائی کے پیشِ نظر میری بہن (نسرین کی امی) ہر روز ہی میرے گھر آ جایا کرتی تھیں۔ کچھ نہ کچھ پکا کر رکھ جاتی تھیں لیکن ان کے بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے کبھی کبھی یہ سلسلہ معطل بھی ہو جایا کرتا تھا۔ وہ میرے اکیلے پن سے خاصی فکر

منع کیا کرتی تھی۔ لہٰذا جب انھوں نے میرے اور اس کے تعلقات کی شدت کو جانا تو مجھے زور دینا شروع کر دیا کہ میں اس سے شادی کرلوں۔ میرے بچے اسے بہت پسند کرتے تھے۔ اس کی شخصیت تھی ہی ایسی کہ لوگوں کو اپنا گرویدہ کر لیتی۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے بچوں سے فون پر بات کی اور اس ضمن میں ان کا عندیہ لیا۔ دونوں بیٹوں نے نہ صرف اس پر خوشی کا اظہار کیا بلکہ نسرین نے خاصا اصرار کیا کہ میں جلدی کرلوں اور اپنی ریٹائرمنٹ سے قبل اس سے شادی کرلوں۔

میری ریٹائرمنٹ میں ایک سال باقی تھا۔ اس کو یہ دفتر جوائن کیے ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے۔ بلال میڈیکل پاس کر چکا تھا اور اب کسی ہاسپٹل میں جاب کر رہا تھا۔ کمال امریکہ سے آتا جاتا رہتا تھا۔ اس کی بات چیت سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ وہیں سیٹل ہونا چاہتا ہے۔ سارا بھی امریکہ میں تھی۔ خود اس کی ریٹائرمنٹ میں گیارہ، بارہ سال پڑے تھے۔ وہ مجھ سے کم و بیش دس سال چھوٹی تھی۔ اس نے دفتری معاملات جس طرح سنبھالے ہوئے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ میرے بعد نہ سہی، اس کے بعد ڈیپارٹمنٹ کی سربراہ وہی ہوگی۔ اس کے اعتماد، تدبر اور تمکنت میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے پتہ تھا وہ میرے شادی کے پیغام کو ٹھکرائے گی نہیں۔

میں اس میں جی رہا تھا اور وہ مجھ میں پناہ گزیں تھی۔

وہ میرے لیے نئی زندگی کی نوید اور میں اس کا حصارِ عافیت تھا۔ ان آٹھ سالوں میں میں نے اسے ہر قسم کے مسائل اور دشواریوں سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ اسے دفتری سیاست سے محفوظ رکھا تھا۔ اس کے گھریلو مسائل کو برابر سے شیئر کیا تھا۔ اپنی بساط سے بڑھ کر اسے زمانے کے سرد و گرم سے بچاتا رہا تھا اور وہ ان سب باتوں کو مانتی تھی، اعتراف کرتی تھی۔ اس کا ہر اعتراف ہمارے درمیانی فاصلے کو اور کم کر دیتا تھا۔

اور ان دنوں تو ہم میں کوئی فاصلہ نہیں رہ گیا تھا۔

وہ اوائل دسمبر کی بہت ہی خوب صورت شام تھی۔ جب میں اس کے گھر پہنچا۔

"کیا بات ہے؟ بڑے ٹپ ٹاپ لگ رہے ہیں" وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

"معاملہ ہی ایسا ہے۔"

"کیسا معاملہ؟"

چائے پلاؤ تو معاملہ بتاؤں۔"

اس نے اپنی ملازمہ کو آواز دے کر چائے کے لیے ہدایات دیں۔ ہم دونوں وہیں ٹی۔ وی لاؤنج میں بیٹھ گئے تھے۔

"بچے کہاں ہیں؟"

"بلال، فرحین کو شاپنگ کرانے لے گیا ہے۔"

فرحین، بلال کی دوست تھی۔ جس سے شادی کی خواہش کا اظہار وہ اپنی ماں سے کر چکا تھا اور وہ راضی بھی ہو گئی تھی۔ انتظار صرف فرحین کی تعلیم کی تکمیل کا تھا۔

"ہاں تو کیا معاملہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اصل میں ایک بہت ہی اچھی، بہت ہی اپنی خاتون کو پروپوز کرنے کا معاملہ ہے۔"

"واقعی" وہ مسکرائی "کون ہے وہ بہت ہی اچھی خاتون۔۔۔؟" "وہ" بہت ہی اچھی" کو چبا چبا کر بولی۔

"تم اسے نہیں جانتیں؟" میں نے مسکرا کر گہری نظر سے اسے دیکھا تھا۔ وہ نظریں چرا گئی۔ ملازمہ گرما گرم سموسوں کے ساتھ چائے لے آئی تھی۔ وہ خاموشی سے چائے بنانے لگی۔

پھر میں اسے بتانے لگا کہ کس طرح باجی مجھے اس سے شادی کرلینے کے لیے دباؤ ڈال رہی ہیں اور یہ کہ میں نے سلیم، ندیم اور نسرین سے اس سلسلے میں بات کرلی ہے۔

وہ بہت بااعتماد تھی مگر اس وقت کچھ گھبرا گئی تھی۔ اس نے مجھے چائے بنا کر دی تب بھی اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے بہ غور اس کو دیکھا۔

"بات کوئی نہیں ہے" اس نے اب بھی میری طرف دیکھنے سے گریز کیا "شاید میرے بچے اس بات کے لیے راضی نہ ہوں"

"تم نے ان سے بات کی ہے؟"

"نہیں تو۔۔۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کریں گے۔"

"بات کیے بغیر تم کیسے کچھ کہہ سکتی ہو؟"

"میں اپنے بچوں کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔۔۔"

"اگر تم مجھے اجازت دو تو میں بچوں سے بات کرلوں۔ کمال اور سارا کا فون نمبر ہے میرے پاس۔"

"کمال اور سارا کا مسئلہ نہیں ہے، بلال تیار نہیں ہوگا۔"

"بلال کو راضی کیا جاسکتا ہے، تم بات کروگی یا میں اس سے بات کرلوں۔"

"میں تو اس مسئلہ پر اس سے بات نہیں کرسکتی۔" وہ پست آواز میں بولی۔

"اچھا تم پریشان مت ہو" یہ میری کمزوری تھی کہ میں اسے تھوڑی دیر کے لیے بھی پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔ "کسی مناسب موقع پر میں خود اس سے بات کروں گا۔"

اور چند دنوں بعد جب میں نے بلال سے بات کی تو وہ کھلی کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا اس کے دیکھنے میں حیرت، غصہ، صدمہ سب کچھ شامل تھا۔ اس نے بغیر کسی توقف کے بڑے سخت لہجے میں مجھے کہا۔

"بالکل نہیں انکل، ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"اس میں کیا حرج ہے بلال" میں نے ملائمت سے کہا "جلد ہی تمہاری شادی ہوجائے گی پھر تمہاری ماں تنہا رہ جائے گی۔"

"وہ کیوں تنہا ہوجائیں گی؟" اس کے لہجے میں تلخی تھی "ہم ان کے ساتھ رہیں گے۔ ان کی ضروریات کا خیال کریں گے۔ انہیں جو تحفظ چاہیے ہم مہیا کریں گے۔ مجھے امید ہے آپ یہ موضوع دوبارا نہیں چھیڑیں گے۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ اس معاملے میں تمہاری امی کی رضا شامل ہے تب بھی نہیں۔۔۔؟"

وہ ایک لمحہ کو ٹھٹکا مگر پھر مضبوط لہجے میں بولا۔

"جی ہاں تب بھی نہیں۔ اب اس عمر میں اور اس اسٹیج پر امی کی دوسری شادی ہم سب کے لیے پریشانیاں کھڑی کرے گی۔ فرحین کے گھر والے اس بات کو بالکل پسند نہیں کریں گے۔ میں اس سلسلے میں مزید کچھ کہنا نہ سنوں گا۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر چلا گیا تھا اور میں سناٹے میں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھے شکست کیا تھا۔

میں اپنی شخصیت کے سحر سے واقف تھا۔ میں نے بڑی کامیاب زندگی گزاری تھی۔ کسی انٹرویو میں ناکام نہیں رہا تھا۔ جس مقصد کو چاہتا حاصل کر لیتا جس محفل میں ہوتا لوگ میری طرف متوجہ رہتے۔ خواتین میری معیت اور ساتھ کو ترجیح دیتی تھیں۔ میری پرسنالیٹی ایسی تھی کہ اس عمر میں بھی خواتین کی بھرپور توجہ حاصل کر سکتا تھا۔

پھر اب یہ کیسا دھکا تھا جو مجھے لگا تھا۔

شکستِ پندار کے اس سانحہ میں بڑی شدت تھی۔

اگلے دن دفتر میں چائے کے دوران اس نے بہت غور سے مجھے دیکھا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔۔۔" میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

"کچھ تو ہے۔" اس نے اصرار کیا۔ اتنے تھکے ہوئے کیوں لگ رہے ہیں؟"

"میں نے کل بلال سے بات کی تھی۔"

وہ چونک گئی۔

"وہ اس بات پر بالکل ہی راضی نہیں ہے۔ کچھ سننے ہی کو تیار نہیں ہے۔"

اس کے چہرے پر سائے سے آکر گزر گئے۔

اس کے بعد ہم دونوں نے گمبھیر خاموشی میں چائے ختم کی۔ دفتر میں وہ سارا دن سخت ڈسٹرب رہی نہ اس کے کام کی رفتار وہ رہی تھی نہ معیار۔ جب ایک ہی دن میں اس کی کئی غلطیاں سامنے آئیں تو میں بالآخر اس کے کمرے میں گیا۔

"ان فائلوں کو دوبارا دیکھ لو۔ میں نے پنسل سے مارک کر دیا ہے۔ کریکشن کیے بغیر ان فائلوں کو فارورڈ نہ کرنا۔ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم چند دن چھٹی لے کر آرام کر لو۔۔۔۔"

میں نے یہ مشورہ دل پر پتھر رکھ کر دیا تھا کہ اس کے بغیر اب دفتر میں میرے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔

اگلے دن اس کی تین دن کی چھٹی کی درخواست آگئی۔ میں نے فون پر اس کی خیریت پوچھی تھی۔ کچھ یوں ہی سی رسمی باتیں۔ کچھ یوں ہی سے بےربط جملوں کا تبادلہ۔۔۔ کچھ یوں ہی سی خاموشی۔

نہ اس کے پاس کہنے کو کچھ تھا اور نہ میرے پاس۔

تین دن کے بعد جب وہ دفتر آئی تو اتنی ہی کھلی ہوئی۔ دل گرفتہ اور شکستہ تھی جتنی اس دن تھی جب پہلی دفعہ دفتر آئی تھی۔ میں نے اس پر بہت محنت کی تھی۔ اسے بہت احتیاط سے سنبھالا تھا۔ اسے دوبارا زندگی سے قریب تر کیا تھا۔ اسے ہنسنے بولنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کا اعتماد بحال کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میری ساری محنت اکارت گئی۔ وہ پھر اتنی ہی دکھی تھی اور میں چاہنے کے باوجود اس کی آنکھوں کے موتی چن سکتا تھا نہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا سکتا تھا۔ میرا دل بلال کے خلاف غصے سے بھرنے لگا لیکن میں اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس کا جگر گوشہ تھا جو مجھے ازحد عزیز تھی۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی تھی۔ دفتر میں کوشش کرتی کہ میرا کم سے کم سامنا ہو۔ چائے اب وہ اپنے کمرے میں منگوالیتی تھی۔ میرے گھر آنا جانا تقریباً بند کردیا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود میں اس کا ایسے میں خیال رکھتا تھا۔ میرے لیے وہ ایک نازک پودے کی مانند تھی جسے زمانے کے سرد و گرم سے بچانے کی ذمہ داری میں نے از خود اپنے اوپر لے لی تھی۔ اور میں ہمیشہ سے ہی بہت ذمہ دار رہا تھا۔

میری ریٹائرمنٹ کے دن نزدیک آرہے تھے۔ ان ہی دنوں بلال کی شادی ہوگئی۔ وہ ایک ماہ اس کی انتہائی مصروفیت کا مہینہ تھا۔ سمارا اپنے دونوں بچوں اور شوہر کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ کمال اپنی امریکن بیوی کے ہم راہ آیا ہوا تھا۔ اس کا گھر مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ دس دنوں کی چھٹیوں پر تھی ان دنوں میں نے خود کو جتنا اکیلا محسوس کیا۔ اس سے قبل نہیں کیا تھا۔

تنہائی کے انہی دنوں میں میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی کی منصوبہ بندی کرلی تھی۔ سلیم اور نسرین کا میرے اوپر بہت دباؤ تھا کہ میں ان کے پاس کینیڈا چلا جاؤں۔ وہ دونوں میرے اکیلے پن سے پریشان تھے۔ پھر سلیم وہیں اپنا کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ قائم کرنے کا ارادہ کرچکا تھا اور اس سلسلے میں میں اس کا کافی معاون ثابت ہوسکتا تھا۔

بلال کی شادی کے تیسرے دن کمال اپنی امریکن بیوی کے ساتھ واپس چلا گیا۔ سمارا مزید دو ہفتے رک کر چلی گئی۔ بلال اور فرحین ہنی مون کے لیے چلے گئے اور وہ اکیلی رہ گئی۔

"ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کیا کریں گے؟" ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"سلیم بلا رہا ہے۔ وہ وہاں اپنا کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ قائم کرنا چاہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں اسے میرے تعاون کی ضرورت ہے۔"

"تو کیا آپ کینیڈا چلے جائیں گے؟" وہ دھک سے رہ گئی تھی۔

"تو پھر کیا کروں؟ ... یہاں تو میری ایسی کوئی مصروفیت نہیں ہوگی۔"

"کب واپس آئیں گے؟" اس کی آواز کنویں سے آتی محسوس ہورہی تھی۔

"اس بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

وہ پریشان ہوگئی تھی۔ اتنی زیادہ پریشان کہ مجھے کہنا پڑا۔

"اگر تم روکوگی تو میں رک جاؤں گا... مگر سوچو تو سہی یہاں رہ کر میں کیا کروں گا؟ میری زندگی کی بیش تر ذمہ داریاں ختم ہوچکی ہیں۔ میرے کاندھوں پر اب میری ذات ہی کی صلیب ہے نا، وہ میں جس طرح بھی اٹھاؤں... اٹھاؤں بھی یا نہ اٹھاؤں۔ اب ان باتوں سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

وہ میرے جواب سے بری طرح کچلی گئی تھی۔ لیکن صورت حال یہ تھی کہ اب میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے مجھے نہیں روکا لہذا میں اپنی ریٹائرمنٹ کے چند ہفتوں کے بعد کینیڈا چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں چھ ماہ تک واپس آجاؤں گا مگر وہاں سلیم کے انسٹیٹیوٹ کے چکر نے مجھے اس بری طرح سے جکڑا کہ نہ دن کا ہوش رہا نہ رات کا۔ گھر آتا تو دونوں پوتے مجھے گھیر لیتے۔ نسرین میرا بے حد خیال رکھتی۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں اسی طرح مصروف رہا تو شاید اسے بھلانے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے کوئی خط لکھا تھا، کارڈ ڈالا تھا نہ فون کیا تھا۔ ان سارے احتیاطی تدابیر کے باوجود وہ میرے وجود کا حصہ بنی تھی۔ مجھے اب بھی اپنی رگ جاں سے قریب محسوس ہوتی تھی۔ دن بھر کے ہنگاموں سے نمٹ کر جب رات میں اپنے اکلوتی کمرے میں

بستر میں لیٹتا تو وہ خاموشی سے میرے قریب آکر بیٹھ جاتی۔ صبح جب میں کچن میں اپنی چائے بنا رہا ہوتا تو وہ کچن میں ہی کہیں موجود ہوتی۔ میں گاڑی ڈرائیو کر رہا ہوتا تو وہ برابر والی سیٹ پر آکر بیٹھ جاتی۔ میں اخبار پڑھ رہا ہوتا تو وہ قریب ہی کہیں ناک کی نوک پر ایک سیاہ فریم کا پڑھنے کا چشمہ ٹکائے اخبار پڑھ رہی ہوتی وہ میرے گھر میں کہیں نہیں تھی اس کے باوجود میری زندگی کے ایک ایک لمحہ میں زندہ تھی۔

سلیم کے انسٹیٹیوٹ کے لیے میں نے اس کے ساتھ مل کر دن رات کوشش کی تھی۔ اس کے ادارے کا چیرمین میں ہی تھا مگر اس ان تھک کوشش نے مجھے تھکا دیا تھا اور میں خاصا بیمار ہوگیا۔ بیماری کے ان دنوں میں وہ پہلے سے زیادہ شدت سے مجھے یاد آئی۔ بالآخر ایک دن میں نے ہتھیار ڈال دیے اور اس کے دفتر فون کیا۔ وہ مجھے نہیں ملی بلکہ یہ اطلاع ملی کہ وہ پچھلے سال استعفیٰ دے کر جا چکی ہیں۔

میں حیران رہ گیا اس نے استعفیٰ کیوں دے دیا؟ ابھی تو اس کی ملازمت کے آٹھ نو سال باقی تھے مجھے یاد آیا وہ کئی بار کہہ چکی تھی کہ آپ کی ریٹائرمنٹ کے بعد میرے لیے بہت مشکل ہوجائے گی کبھی کہتی۔

میں دفتری امور میں آپ کی عادی ہوگئی ہوں۔ آپ کے بعد کیا کروں گی؟

تو کیا اس نے اسی لیے استعفیٰ دے دیا۔

میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا میں نے کئی بار مختلف اوقات میں اسے گھر فون کیا مگر ایک بار بھی اس نے فون نہ اٹھایا۔ کبھی بلال ہوتا کبھی فرحین۔ اور ان دونوں سے ہی میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا لہذا فون بند کر دیتا۔

جب اس کے لیے میری بے چینی حد سے بڑھ گئی تو میں نے کراچی واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ بچے بھی تیار ہوگئے اور تین سال بعد میں واپس آگیا۔ سلیم اپنا انسٹیٹیوٹ زیادہ دیر نہیں چھوڑ سکتا تھا لہذا ایک ہفتے قیام کے بعد بچے آج ہی واپس گئے تھے اور میں انہیں چھوڑنے ایرپورٹ آیا تھا۔ جہاں وہ اچانک مجھے نظر آگئی تھی۔

میں نے دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب پوری طرح سے رن وے کی طرف متوجہ تھی۔

ڈربن جانے والا جہاز ٹیکسی کر رہا تھا۔

اس نے اسی محویت کے عالم میں ہاتھ اٹھایا اور الوداعی طور پر ہاتھ ہلانے لگی میں اٹھ کر اس کے قریب چلا گیا۔ لیکن وہ اردگرد سے بالکل ہی لاتعلق تھی۔ اس کے گالوں پر آنسو قطار سے بہہ رہے تھے۔

میں نے اپنا رومال اس کی طرف بڑھایا۔

وہ چونک کر مڑی اور پھر جیسے حیرت سے اپنی جگہ جم کر رہ گئی ہو۔

"رضا۔۔۔ آپ۔۔۔"

"ہاں میں۔۔۔ کیسی ہو۔۔۔۔"

"آپ کہاں رہے اتنے عرصے؟۔۔۔ نہ کوئی خط نہ فون۔۔۔ کوئی رابطہ نہیں۔" اس کا انداز شکایتی تھا۔

"رابطہ اسی وقت معتبر ہوتا ہے جب درمیان میں کوئی رشتہ ہو۔۔۔۔"

وہ چند لمحے کے لیے چپ ہوئی پھر مجھ پر سوالات کی بوچھار کردی۔ اتنا عرصہ کہاں رہے۔ کیا کرتے رہے۔ کب واپس

آج یہاں کیسے ؟

میں اس کے سارے سوالات کے جوابات دیتا رہا۔

" تم یہاں کیسے ؟ کیا سمارا کو چھوڑنے آئی ہو۔۔۔ بلال کہاں ہے ؟ "

" سمارا تو امریکہ میں ہے۔۔۔ دو سال سے نہیں آ سکی۔۔۔ میں تو بلال کو چھوڑنے آئی تھی۔ "

" کیوں بلال کہاں ہوتا ہے ؟ "

" دو سال قبل اسے لندن سے بہت اچھی آفر آئی تھی۔۔۔ فرحین کو بھی موقع مل رہا تھا۔ لہذا وہ دونوں وہاں چلے گئے تھے۔ ایک ماہ کی چھٹیوں پر آئے تھے۔ ابھی واپس گئے ہیں۔ اب تو ان کا ایک سال کا بیٹا بھی ہے۔ "

" بلال تو کہتا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ رہے گا۔ تمہاری ساری ضروریات کا خیال رکھے گا۔۔۔ "

میں کوشش کر رہا تھا کہ میری آواز غصیلی نہ ہونے پائے۔

" وہ تو کہتا تھا کہ اس کے ساتھ چلوں " اس کی آواز شکست خوردہ تھی۔

" تو تم کیوں نہیں گئیں ؟ " میں نے اسے کریدا۔

" میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم واپس آتے تو میرا بند گھر دیکھ کر تمہیں تکلیف ہوتی۔ "

" تمہیں میری واپسی کی امید تھی ؟ "

" امید نہیں۔۔۔ مجھے یقین تھا۔۔۔۔ "

" تو پھر اب کیا ارادہ ہے ؟ میں اب بھی تمہارا خواست گار ہوں۔۔۔ وقت کافی گزر گیا ہے اور ہم مزید وقت ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ " میرے لہجے کی مضبوطی محسوس کر کے اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

" چلو چلیں۔۔۔ ہم بچوں کو بعد میں اطلاع کر دیں گے۔ "

قوس و قزح کے کچھ رنگ اس کے ستے ہوئے چہرے پر بکھر گئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ چلچلاتی دھوپ سے کسی سائبان کے سائے میں آ گئی ہو۔

○●○

سلطانہ شرف الدین احمد

چھوٹی آپا

کچھ دنوں سے حرارت بھی رہنے لگی تھی ۔ جوڑوں میں بھی اکثر درد ہوا کرتا وہ بالکل آرام نہ لیتی ۔ کولھو کے بیل کی طرح جتی رہتی ۔ کام دھندا نہ چھوٹتا ۔ ہر وقت کسی نہ کسی مصروفیت میں منہمک رہتی ۔ آرام کا لطف اور راحت کا احساس تو وہ کبھی کا بھول چکی تھی خیر پلی تو ناز و نعم میں تھی جب وہ مصروف نہ ہوتی ۔ زندگی میں جان لیوا خلا سا دکھائی دیتا ۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ گھپ اندھیرے غار میں اتری چلی جارہی ہے اور پھر اس کی محبوب ہستیاں ، اس کے عزیز بچے ٹٹولتے اور بھٹکتے رہ جائیں گے اکیلے ہو جائیں گے ۔ دوسری ماں ، بے مہری ، مشکلیں جھیلتے رہیں گے ۔ کون جانے کب تک یہ تصور لرزا دیتا ۔ سلمیٰ کانپ اٹھتی ۔ محض بچوں کے لیے ، صرف ان کی خاطر وہ جینا چاہتی ، لمبی زندگی چاہتی ۔ اس نے اپنا ہر لمحہ اور وقت کا سب ہی حصہ وقف کردیا تھا۔

شوہر نجیب الطرفین تھا ۔ قریبی رشتہ دار تھا ۔ کماؤ مرد تھا ، مگر بلا کا بے حس اور لاپرواہ ۔ دوست پرست ۔ گھر میں ٹکنے کی قسم کھا رکھی تھی ۔ ملازمت بھی کم بخت ایسی کہ دوروں سے فرصت نہیں مہینے میں ایک دو بار آتے اور مشکل سے دو تین دن ٹھیرتے ۔ ان دنوں کا زیادہ وقت گھر کے باہر گزرتا ۔ یا تو دوست آدھمکتے یا خود ان کے ہاں چلے جاتے ۔ رات گئے لوٹتے ۔ اس درجہ تھکے ہوتے کہ بات بھی نہ کر پاتے ۔ بستر پر لیٹتے ہی مرجاتے اور صبح ہی اٹھتے ۔ اس وقت سلمیٰ کو بیسیوں مصروفیتیں ہوتیں ۔ مدرسہ جانے والے بچوں کے لیے سب کچھ ہی تو کرنا ہوتا ۔ صبح سے شام تک سلمیٰ کو مصروفیت دبوچے رہتی اور صاحب شام سے رات ڈھلنے تک لاپتہ رہتے ۔ وہ رات کے راجہ اور یہ دن کی رانی ۔ دل کی دل ہی میں رہتی ۔ سلمیٰ کے پاس تو بہت کچھ تھا کہنے کو ۔ مگر ان کے احساسات کی زبان بند ہی رہتی ۔ چند قریبی دوستوں کے ذکر اور عہدے داروں کے تذکرے کے سوائے کچھ نہ ہوتا ۔ سلمیٰ کو تو بہت کچھ کہنا تھا ۔ خیروں اور برائیوں سے زیادہ صرف اپنوں سے متعلق ۔ جو صرف اس کی اپنی ذات سے وابستہ تھے ۔ خود اظہاری کے لیے خلوت نصیب ہی نہ ہوتی اسی لیے وہ گھٹتی کڑھتی رہتی ۔ آپ ہی آپ بل کھائے جاتی ۔ زبان سے اف تک نہ کرتی ۔ سلمیٰ مہمان نواز واقع ہوئی تھی لیکن یہ مہمان نوازی صرف قریبی عزیزوں تک محدود رہتی ۔ دور کے رشتہ دار کبھی مدعو نہ کیے جاتے ۔ ان قریبی رشتہ داروں میں سلمیٰ کا چچازاد بھائی مشرف نظر فریب وجاہت لیے اپنی مثل سی بیوی کے ساتھ آموجود ہوتا اور بھی کئی ہشاش بشاش جوڑے کھاتے پیتے ، گپ شپ لگاتے مسکراہٹیں بکھیرتے روانہ ہو جاتے ۔ سلمیٰ کا وقت تو اچھا گزر جاتا مگر کسک اور محرومی کی چبھن چھوڑ جاتا ۔ اس کا بے اختیار دل چاہتا نعیم صاحب بھی مشرف جیسے ہوتے ۔ ہنس مکھ اور صاحبِ احساس ۔ کتنی پُر کیف ہوتی زندگی ۔ کتنے خوش بخت ہوتے لمحات اور وہ روح فرسا ذہنی اذیتوں ، دل خراش الجھنوں سے بچی رہتی اس کے کمزور ہاتھوں سے رہی سہی بہاریں بھی چھوٹی جارہی تھیں ۔ وہ لرزاں تھی ۔ خوف زدہ رہنے لگی تھی ۔ وہ کچھ زیادہ بیمار رہنے لگی ۔ نعیم صاحب کی فطرت کا یہ جدید انقلاب سلمیٰ کے لیے بڑا روح فرسا تھا ۔ کچھ عرصہ پہلے وہ بالکل ایسے نہ تھے ۔ عجیب عجیب وسوسے پیدا ہوتے رہتے ۔ خیال آتا آخر نعیم صاحب کے رویے میں

ے کیوں بڑھتی جارہی تھی۔ وہ فکر مند ہو چلی تھی۔ کہیں نعیم صاحب کسی اور کے نہ ہو رہے ہوں۔ کسی اور نے انھیں اپنا نہ لیا وہ اپنی ملکیت کو کسی اور کے قبضے میں دیکھنا تو کجا تصور کرنا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ سلمیٰ کا دماغ ہر وقت شک و شبہ کی آماج گاہ تا۔ وہ اپنے میاں کی سرشت سے خوب واقف تھی۔ جس میں ہرجائیت کا عنصر شامل تھا۔ شوہر اور بچے، گھر یہی تو اس کی کائنات تھی۔ ان کی خاطر وہ قربانیاں کیے جارہی تھی۔ بڑی دل کش رات تھی وہ۔ ماہتاب آب و تاب سے روشن تھا گرمیوں کی ں خوش گوار ہوتی ہیں۔ سلمیٰ صحن کے بیچ میں پلنگ پر پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ چاندنی اتر آئی تھی۔ ہر ذرہ کو روشنی سے نواز تھی لیکن اس کے لیے ہر رات کی طرح یہ منور رات بھی اندھیری تھی۔ وہ تاریکی بھی نہ ہٹی جس سے اس کا دم گھٹا جارہا تھا۔ ں تنہائی اسے کاٹنے کھا رہی تھی۔ عجیب عجیب خواہشیں جاگ اٹھی تھیں۔ وہ امنگوں کی رو میں بہی چلی جارہی تھی۔ آرزؤں کے ب نے لذتوں کا احساس بیدار کردیا تھا۔ اس کا رواں رواں کسی کو بے اختیار آواز دینے لگتا تمناؤں کے جوار بھاٹے جنبذ کی ں میں ڈوبنے لگے اور وہ عالم محویت میں گم ہوگئی۔

صبح ہی صبح کسی نے سلمیٰ کو آواز دی۔ آنکھیں کھلیں۔ دیکھا نعیم صاحب کھڑے ہیں۔ وہی سفری لباس۔ وہی سنجیدہ انداز۔ کچھ بھی تو تبدیلی نہ ہوئی تھی ان میں۔ سارے شک و شبہات جیسے دھل گئے ہوں سب وہم و گماں کافور ہوگئے۔ مارے خوشی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ کوئی ڈیڑھ مہینے بعد آئے تھے۔ خاطر تواضع، لحاظ پاس اور خیال میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ دار مرغن غذائیں اور طرح طرح کے میٹھوں سے خوب آؤ بھگت کی۔ جب تک نعیم صاحب رہے دعوت کا سماں دکھائی دیتا۔ ب تین روز ٹھیرے۔ جو محسوس ہوا تین گھنٹوں میں گزر گئے۔ صبح سویرے جانے والے تھے وہ۔ یہ تین دن وہ دیوانہ وار مصروف تھی۔ اتنا دوڑ دوڑ کے کام کیا تھا کہ رات کو حرارت نے بخار کی شکل اختیار کرلی۔ تپش سے بدن بھنا جارہا تھا اعضا ٹوٹنے ہے تھے۔ سر کے درد سے آنکھیں نہ کھلتی تھیں۔ نعیم صاحب کی آواز پر سلمیٰ جاگ اٹھی۔ دیکھا نعیم صاحب کھڑے ہیں وہی س سفری لباس اور وہی سنجیدہ انداز تبسم۔ خدا حافظ کہتے ہوئے سلمیٰ کی پیٹھ پر ہلکے سے تھپتھپایا۔ جانے کے لیے مڑے۔ بڑا لڑکا سرا ہوا۔ پوچھا جارہے ہیں بابا آپ۔ امی کی طبیعت تو سخت خراب ہے۔ نعیم صاحب نے اپنی فطری لاپرواہی میں لپٹا جواب دیا۔ لیا جائے۔ میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ تمھاری امی کی خاطر ملازمت نہیں چھوڑی جاسکتی۔ اور بس چلتے بنے سلمیٰ بخار میں تو بھن ہی تھی۔ کوفت اور محرومی میں بھی جلنے لگی۔ اپنے شوہر سے کم از کم اسے ایسے ترش جواب کی امید نہ تھی۔ نعیم صاحب کے جملے تیر کی لگے تھے۔ بدن میں جیسے آگ سلگ اٹھی ہو۔ وہ تھرانے لگی۔ غصہ کا پارہ اونچا ہوگیا تھا خون کھولنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے زخموں کو کسی نے نوچ ڈالا ہو۔ بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ جھڑی لگی ہوئی تھی۔ رضائی تان لی اور تکیہ رو رو کر بھگو دیا۔ ندتے ے حد ہوتی ہے۔ آنسو تھم گئے۔ وہ اتنی چپ ہوئی جیسے پتھر کی مورت۔

سلمیٰ کا بڑا لڑکا اتنا چھوٹا نہ رہا تھا کہ اپنی امی کے دکھ درد کو نہ سمجھے۔ وہ اپنے والد بزرگ وار کی بے حسی سے خوب واقف مغموم ہوگیا۔ ماں کے غم میں رنگ گیا۔ اسے دلی تکلیف ہو رہی تھی مگر وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ دباتا، سہلاتا رہا۔ اس کا تو کچھ عرصے یہ حال ہو گیا تھا کہ کھیل اور پڑھائی میں بھی دل نہ لگتا تھا۔

سلمیٰ کی طبیعت اور موڈ دونوں خراب تھے۔ بڑا کنبہ تھا سلمیٰ کا۔ صحت کی خرابی کا پتہ چلتا گیا مزاج پرسی کو لوگ آنے ۔ مشرف بھی پہنچے۔ سلمیٰ سے اسے پیار تھا۔ ساتھ کی کھیلی چچازاد اور چہیتی بہن جو تھی وہ عمر میں سال دو سال چھوٹا تھا مگر دیل

بھی سے بڑا معلوم ہوتا۔ چٹپٹے مزے کی باتوں سے بہلاتا ہنساتا تھا اور دل کھول کر گپ شپ کرتا۔ مشرف کا وجود، اس کا انداز محبت اور دل چسپ باتیں سلمیٰ کو اپنا بھی دکھ بھول جانے پر مجبور کرتیں۔ وہ چھوٹی آپا چھوٹی آپا کہہ کر زبان خشک کرتا اور جب کبھی وقت ملتا وہ ضرور آدھمکتا۔ تازہ قصے، نئی نئی وارداتیں، ادھر ادھر کی باتیں سلمیٰ کے لیے سامانِ تفریح مہیا کرتی۔ مشرف کے قہقہوں میں سلمیٰ بھی برابر کی شریک رہتی اسے اپنی ہنسی دل کی گہرائیوں سے ابھرتی محسوس ہوتی۔

سلمیٰ پلنگ پر دراز تھی۔ آنکھیں بند کیے چپ سادھے پڑی تھی۔ چھوٹی آپا کی آواز کے ساتھ اپنی وجاہت لیے مشرف داخل ہوا۔ سلمیٰ کے چہرے پر پھیلی زردی نے اسے پریشان کردیا۔ غور سے دیکھا۔ گیندے سے ملتی جلتی رنگت۔ وہ پلنگ کی پٹی پر ٹک گیا۔ آہستہ سے اپنی لمبی اور مخروطی انگلیاں سلمیٰ کی پیشانی پر رکھ دیں چھوٹی آپا کا درد کرنے لگا۔ سلمیٰ نے آنکھیں کھولیں۔ بدن میں روانی کا احساس ہوا۔ اس نے اضطراری طور سے اپنا پہلا کم زور ٹھنڈا ہاتھ مشرف کے گرم ہاتھ پر رکھ دیا۔ سلمیٰ کے اندر زندگی داخل ہورہی تھی۔ آنسو تسلسل سے بہنے لگے۔ پانی کی جھڑی نے مشرف کو بے چین کردیا۔ وہ واقعی متفکر تھا وہ بہ مشکل چھوٹی آپا کہہ سکا۔ اتنا درد تھا اس کے لہجے میں، ہم دردی گھلی تھی اس کی آواز میں۔ سلمیٰ اس حیات بخش تخاطب پر مسکرانے لگی۔ مشرف رونے کی وجہ پوچھنے لگا تفتیشی سوالات کی بھرمار کردی۔ سلمیٰ خاموش جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ زبان سے کچھ نہ نکلا۔ شاید وہ کچھ کہنا نہ چاہتی تھی۔ مشرف نے چھوٹی آپا کی پیشانی پر اپنا سر رکھ دیا اور دھیرے دھیرے اس کی انگلیاں سر سہلانے لگیں۔ وہ چپکے چپکے کچھ کہے جارہا تھا۔ محبت بھرے الفاظ میں شاید دکھ دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا تسلیاں دے رہا تھا۔ تشفی دینے کے انداز سے بھی خوب واقف تھا۔ سلمیٰ کو کتنی تشفی ہوئی تھی۔ آتشیں جذبات میں جیسے ٹھنڈک پڑ گئی ہو۔ اسے پھر سے تندرستی مل گئی تھی ایسا معنی خیز اور بھرپور لمحہ اس کی زندگی میں شاید پہلی بار آیا تھا۔ مشرف کے سکون نواز حسین وجود نے اسے ہر ذہنی خلش سے دور کردیا تھا۔ روحانی اذیتوں سے نجات دلائی تھی۔

○●○

(سلسلہ ص : ۶۱ سے)

۹ ناگپور سمینار اور کتاب میلہ : ۲۶ تا ۲۸ فروری ۱۹۹۹ء تک مبلغ 00=367.۹ روپے مالیت کی کتب فروخت ہوئیں۔

مذکورہ بالا کتاب میلوں میں مبلغ 00=3,65,078 روپے مالیت کی کتابیں فروخت کی گئیں۔

درجِ بالا کتاب میلوں اور کونسل کے شعبہ، فروخت و نمائش میں کل ملاکر تقریباً ۲۶ لاکھ روپے کی کتابیں فروخت کی گئیں۔ پچھلے سال ۱۹۹۷ء تا ۱۹۹۸ء میں تخمیناً ۲۰ لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئی تھیں۔

بلک پرچیز اسکیم کے تحت کتب کی خریداری

بلک پرچیز اسکیم کے تحت سال ۱۹۹۸ تا ۱۹۹۹ء میں اردو اور فارسی کے مصنفین / مترجمین / مؤلفین کی کل ۱۲۸ مطبوعات خریداری کے لیے منظور کی گئیں جن کی کل مالیت مبلغ 00=5,32,055 روپے ہے۔ یہ کتابیں ملک کے مختلف کتب خانوں کو اعزازی طور پر ارسال کی گئیں۔ بلک پرچیز کے لیے ۲۶ / اگست ۱۹۹۸ء کو منعقد کی گئی میٹنگ میں ان کتب کی خریداری کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ بلک پرچیز کی دوسری میٹنگ ۱۸ / دسمبر ۱۹۹۸ء کو منعقد ہوئی۔ اس میں اردو اور فارسی کے کل ۱۸ مصنفین کی مطبوعات کو خریداری کے لیے منظور کیا گیا جن کی کل مالیت 00=69,600 روپے ہے۔ یہ کتابیں بھی مختلف کتب خانوں کو اعزازی طور پر ارسال کی جارہی ہیں۔

رپورٹ

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

(جنوری ۱۹۹۹ء تا مارچ ۱۹۹۹ء)

کونسل ویب سائٹ پر

انٹرنیٹ سروس (Internet Service) کی افادیت اور اہمیت کے مد نظر قومی اردو کونسل نے انٹرنیٹ کمیٹی کی تشکیل کی ہے جس کی پہلی میٹنگ ۱۵ / فروری ۱۹۹۹ء بہ وقت ساڑھے گیارہ بجے پروفیسر حامد حسن کی صدارت میں کونسل کے کمیٹی روم میں منعقد ہوئی۔

میٹنگ میں یہ طے کیا گیا کہ کونسل جلد ہی انٹرنیٹ اور ویب سائٹ کنکشن لے گی۔ اس سے اردو زبان کے فروغ کے لیے کونسل کی کوشش بین الاقوامی سطح پر نمایاں ہوں گی اور غیر ممالک میں آباد اردو داں لوگوں تک کونسل کی سرگرمیاں اور اشاعتیں پہنچ سکیں گی۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کام کرنے والی انجمنوں اور اداروں سے رابطہ سہل ہوجائے گا۔ میٹنگ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ویب سائٹ پر کونسل کا جامع تعارف اور مقاصد چار یا پانچ صفحوں پر فراہم ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ کونسل کی کتابوں کی فہرست اور ہر ایک کتاب کا مختصر تعارف بھی موجود ہو جس سے لوگوں کو یہ معلوم ہوسکے کہ کونسل اردو زبان کے فروغ کے لیے کن جہات میں کوششیں کر رہی ہے۔ انٹرنیٹ کمیٹی نے یہ بھی طے کیا کہ VSNL کے ذریعے کونسل جلد از جلد انٹرنیٹ کنکشن لے کر کام شروع کردے۔ اس میں مندرجہ ذیل سہولتیں فراہم کرنے کو کہا گیا:

۱ کمیٹی کے مطابق Website کم سے کم 20MB کا ہو جس سے اس کی رفتار (Speed) میں کمی نہ ہو۔

۲ کونسل کے پاس FTP رائٹس ہوں۔

۳ پانچ (Pop-3) اکاؤنٹس کے ساتھ ساتھ سال میں چھ مرتبہ مفت (Up-Date) کرنے کی سہولت ہو۔

لسانی اقلیتوں کے کمیشن سے قومی اردو کونسل کے رابطے:

۱۸ فروری ۱۹۹۹ء کو لسانی اقلیتوں کے کمشنر پروفیسر ای۔ ایس۔ ڈیل کے ساتھ کونسل کے کمیٹی روم میں ایک میٹنگ منعقد کی گئی جس میں قومی کونسل کے وائس چیئرمین ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے شرکت کی۔ میٹنگ میں پرائمری سطح پر مادری زبان کے ذریعے تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس بات پر اظہار خیال کیا گیا کہ پرائمری تعلیم پر مرکزی حکومت کے ذریعے مختص کیے جانے والے بجٹ کا بیشتر حصہ مادری زبانوں میں تعلیم پر ہی خرچ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے مختلف صوبوں میں لسانی اقلیتوں سے متعلق اعداد و شمار جمع کیے جائیں اور اسی اعتبار سے قومی تعلیمی پالیسی کا نفاذ ہو۔ تبادلہ خیال کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ لسانی اقلیتوں کے مفاد میں گجرال کمیٹی کی سفارش میں پیش کیا گیا سہ لسانی فارمولا نافذ کیا جانا چاہیے، تاکہ اردو لسانی اقلیت بھی اردو میں تعلیم حاصل کرنے کے اپنے آئینی حق کا استعمال کرسکے۔ اردو ہندوستان کے ایک بڑے حصے میں

بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ مختلف علاقوں میں لنک لینگویج یا رابطے کی زبان کا کام بھی انجام دے رہی ہے۔ اسی لیے یہ کل ہند اقلیتی زبان بھی ہے۔ ان باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے پروفیسر ڈیل نے کہا کہ اردو زبان کے مسائل کو قومی مفاد کے لیے ملک گیر سطح پر اٹھایا جانا ضروری ہے اور اس سلسلے میں مین اسٹریم میڈیا کے ساتھ اردو والوں کا رابطہ اولین شرط ہے۔

اس میٹنگ کے نتیجے میں قومی اردو کونسل اور لسانی اقلیتوں کے کمیشن کے درمیان مندرجہ ذیل امور پر رابطہ قائم رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۱ قومی کونسل ہندستان کا لسانی نقشہ تیار کرے گی جو اعداد و شمار پر مشتمل ایک وسیع سروے پر مبنی ہوگا۔

۲ "اردو ایک قومی اقلیتی زبان" کے موضوع پر ایک ملک گیر سروے کرایا جائے تاکہ دوسری زبانوں کے مقابلے معاشرے میں اردو زبان کی مقبولیت کی روشنی میں اردو کے لیے کوئی رہنما پالیسی اختیار کی جاسکے۔

۳ لسانی طور پر حساس علاقوں کی نشان دہی بھی کی جائے۔ اس سے اردو پالیسی کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے میں مدد ملے گی۔

اردو کے مقامی زبانوں کے ساتھ رابطے پر میگا پروجیکٹ:

قومی اردو کونسل چوں کہ حکومتِ ہند کی منظور شدہ نوڈل ایجنسی ہے جس کا کام اردو کے لیے پالیسی وضع کرنا اور اس پر عمل درآمد کرانا بھی ہے۔ لہٰذا ہندستان بھر میں اردو کی ترویج کے لیے ایک بنیادی پالیسی مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ سماجی اور لسانی بنیادوں پر ایک ملک گیر سروے کرایا جائے جس میں اردو زبان کے دوسری قومی زبانوں پر اثرات کے علاوہ ساتھ ملک کے حساس لسانی علاقوں (Linguistically Sensitive Areas) کی بھی نشان دہی ہو۔ اس پروجیکٹ کو کوآرڈی نیٹ کرنے کا کام جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کی پروفیسر انویتا ابی کریں گی۔

مورخہ ۱۷ فروری کو کمیٹی روم میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے زیرِ صدارت میٹنگ ہوئی جس میں پروفیسر انویتا ابی، پروفیسر جگناتھن، IGNOU، نئی دہلی، پروفیسر آر۔ سی۔ گپتا، جے۔ این۔ یو، ڈاکٹر امتیاز حسنین، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ڈاکٹر اے۔ آر۔ فتیحی (اے ایم یو) اور ڈاکٹر عائشہ قدوائی، جے۔ این یو، نئی دہلی نے شرکت کی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے مجوزہ پروجیکٹ "اردو کا مقامی زبانوں کے ساتھ ارتباط" کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ پروجیکٹ قومی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس کے نتائج سے ہمیں معلوم ہوسکے گا کہ اردو کس طرح ہندستان کے مختلف لسانی دھاروں کے ساتھ پروان چڑھ رہی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ پروجیکٹ (Socio-Linguistic Survey) کی بنیاد پر ہوگا اور اس سروے کے بعد جو Data حاصل ہوگا اس کی بنیاد پر اردو کے فروغ کی پالیسی وضع کرنے کے لیے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کیا جاسکے گا۔ پروجیکٹ کی مالی منظوری اور اس کی نگرانی کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں ایک Monitoring کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے جس کے اراکین پروفیسر جگناتھن، پروفیسر عبدالستار دلوی، ممبئی اور ڈاکٹر اے۔ آر۔ فتیحی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ہیں۔ اس میٹنگ میں پہلے مرحلے میں دو سال کے اخراجات کے تخمینے کو آخری شکل دی گئی۔

ڈپلوما ان کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ڈی۔ ٹی۔ پی (اردو) کی شروعات:

قومی اردو کونسل نے ہندستان بھر کی مختلف ریاستوں میں اب تک ۳۲ کمپیوٹر سینٹروں کو مالی تعاون اور دیگر سہولیات فراہم کی ہیں اور اس سال مزید ۱۸ مراکز کو منظوری دینے کا منصوبہ ہے تاکہ اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ جدید ٹکنالوجی اور سائنس کی روشنی سے

ہر مستفید ہو سکیں۔ سبھی مراکز کو ہارڈویر، سافٹ ویئر فراہم کیا جا چکا ہے۔ ان کمپیوٹر مراکز نے یکم اپریل ۱۹۹۹ء سے اردو میں ایک سالہ "Diploma in Computer Applications and D.T.P (Urdu)" شروع کرتا ہے۔

فروری اور مارچ میں ناگ پور، اورنگ آباد، حیدرآباد، بمبئی، غالب اکیڈمی، دلی، اردو اکیڈمی، دلی، میں کمپیوٹر مراکز کا تتاح ہوا۔ ناگ پور گوئل کمپیوٹر اکیڈمی میں ۲۰ فروری کو قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر مرکز کا افتتاح ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے کیا۔ لے کی صدارت شہر کے میئر جناب مجید شعلہ نے کی۔ معزز شہری اور عمائدین بھی اس تقریب میں شریک ہوئے اور کمپیوٹر تعلیم کی یت و افادیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اردو زبان میں کمپیوٹر تعلیم کے اقدام کی ستائش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے لیے بھی صوصاً مبارک باد دی گئی کہ اس نے کمپیوٹر کو غریب اردوداں عوام کے دروازے تک پہنچانے کی عملی کوششیں شروع کر دی ہیں۔

اورنگ آباد میں مالدن شکشن پرسارک منڈل کے زیرِ نگرانی اردو انگریزی کمپیوٹر سنٹر کا افتتاح ۲۰ فروری کو مہاراشٹرا سٹیٹ کے وزیرِ تعلیم اٹل ونش کمو صاحب نے کیا۔ ایکسپرٹ کمیٹی کے ممبر ڈاکٹر حامد حسن نے کورس کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ۓ کمپیوٹر اور جدید ٹکنالوجی کی تعلیم کو عام کرنے کی کونسل کی کوششوں کی ستائش کی۔

حیدرآباد میں کمپیوٹر سنٹر قائم کرنے کی ذمے داری ادارہ، ادبیاتِ اردو کے سپرد کی گئی ہے۔ اس مرکز کا افتتاح ۲۲ / فروری آندھرا پردیش کے اقلیتی بہبود کے وزیر جناب خلیل باشاہ کے ذریعے عمل میں آیا۔ پروفیسر جعفر نظام، صدر ادارہ، ادبیات اردو، یفیسر مغنی تبسم، جنرل سکریٹری ادارہ، ادبیات اردو، پروفیسر پرمود تل گیری وائس چانسلر، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ رن لینگویجس، حیدرآباد نے اس جلسے میں شرکت کی۔

بمبئی میں مدنی کمپیوٹر سنٹر، بلاس روڈ کا افتتاح جناب اٹل ونش کمو وزیرِ تعلیم، مہاراشٹرا نے کیا اور جلسے کی صدارت کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے کی۔ جلسے میں بمبئی کی تاجر برادری نے بہت جوش و خروش کے ساتھ بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ تلف علمی اور ادبی انجمنوں کے نمائندوں نے اس مرکز کے افتتاح کے لیے ڈاکٹر بھٹ کو تہہِ دل سے مبارک باد دی اور ہر ممکن اون کا یقین دلایا۔

غالب اکیڈمی، نئی دلی میں کمپیوٹر سنٹر اور اشاعت و فروخت سنٹر کا افتتاح ۲۳ / مارچ کو مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی سائل جناب مرلی منوہر جوشی کے ذریعے عمل میں آیا۔ اس تقریب میں جناب سمت بوس، جوائنٹ سکریٹری لینگویجس، ڈاکٹر محمد میداللہ بھٹ، خواجہ حسن ثانی نظامی اور شاہد صدیقی، ایڈیٹر عوام نے مقررین کی حیثیت سے شرکت کی۔

دلی اردو اکیڈمی میں کمپیوٹر مع زیرِ تکمیل گرانی مرکز کا افتتاح ۲۰ / مارچ ۱۹۹۹ء کو خواجہ حسن ثانی نظامی کے ذریعے عمل میں آیا۔ ایسر گوپی چند نارنگ نے صدرِ جلسہ اور مسٹر نریندر پرساد نے مہمانانِ خصوصی کے طور پر شرکت کی۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ کونسل کی اسکیم کے مطابق ہر مرکز میں پچاس فی صد تک ضرورت مند طلبہ کو مفت تعلیم مہیا کی جائے گی۔

ردو کمپیوٹر مینول:

کمپیوٹر مراکز میں زیرِ تعلیم طلبہ کو اردو کے ذریعے تعلیم کی سہولت فراہم کرنے کے لیے کونسل کمپیوٹر کورس کے نصاب سے متعلق کتابیں تیار کرا رہی ہے۔ اس مینول کو تیار کرانے میں یہ مقصد شامل ہے کہ طلبہ رائج انگریزی اصطلاحات کے ساتھ عام بول چال

کی زبان میں کمپیوٹر کا علم آسانی کے ساتھ حاصل کرلیں ۔ یہ مثالی کمپیوٹر کے ایک سالہ ploma in Computer
Applicaion and DTP (Urdu) کے طلبہ کو فراہم کرایا جائے گا ۔

کمپیوٹر مراکز کے سپروائزرس کی میٹنگ:

کونسل کے ذریعہ ہندستان کے مختلف صوبوں میں قائم کیے گئے کمپیوٹر مراکز کے سپروائزرس ، جن کا تقرر کونسل کے ذ کیا گیا ہے ، کی میٹنگ ۲۲ تا ۲۳ / مارچ ۱۹۹۹ء کو کونسل کے کمیٹی روم میں منعقد کی گئی ۔ اس میں ۲۰ مراکز کے سپروائزر ش ہوئے ۔ میٹنگ میں کونسل کے ڈائرکٹر نے ان مراکز کے مقاصد کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے سپروائزرس کے فرائض اور اختیارات روشنی ڈالی میٹنگ میں کمپیوٹر مراکز کی معیاری کارکردگی کے لیے لائحہ عمل بھی طے کیا گیا اور ان کو دی جانے والی قانونی اور سہولیات کے متعلق فیصلے لیے گئے ۔ اس کے علاوہ مراکز کو کام یابی سے چلانے کے لیے سپروائزرس کو ہدایات بھی دی گئیں ۔

جن کمپیوٹر ایجنسیوں کی خدمات کونسل نے حاصل کی ہیں ، ان کے ذریعے نئی کمپیوٹر فیکلٹی کی ٹریننگ اور آریئنٹیشن (Orientation) کے لیے ہفتے بھر کے کورس کا انعقاد کیا گیا تھا ۔ یہ کورس بھی کام یابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچ چکا ہے ۔

کتابت اور کیلی گرافی سنٹرز:

کونسل نے اس سال ملک بھر میں ۲۵ کتابت اور خطاطی کے مراکز کو تقریباً ۳۲ لاکھ روپے کی گرانٹ دی ہے ۔ اس ساتھ کونسل نے واضح یہ پالیسی بھی اختیار کی ہے کہ جو مراکز بنیادی ضرورتیں (Infrastructure) مہیا کرلیں گے ان کو کونسل سالہ "Diploma in Calligraphy and Graphic Design" کے لیے تعاون اور منظوری دے گی ۔

لکچر سیریز:

قومی اردو کونسل نے گزشتہ سال پانچ یادگاری خطبات کے انعقاد کا فیصلہ کیا تھا ۔ اس سلسلے میں دو خطبے بہ یادگار اور محمد قلی قطب شاہ کا انعقاد بالترتیب جواہر لال نہرو یونیورسٹی ، نئی دلی اور سنٹرل یونی ورسٹی ، حیدرآباد میں ہوا تھا ۔ تیسرا خطبہ میموریل لکچر دہلی یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی میں "ہندستان کے سیاسی اور سماجی تعلقات" کے عنوان سے ۳ / مارچ ۱۹۹۸ء کو منعقد کیا گیا۔ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر وی آر مہتہ کی صدارت میں منعقد ہونے والا یہ توسیعی خطبہ معروف ماہر اقتصادیات پروفیسر علی محمد خسرو (چیرمین فینانس کمیشن ، حکومت ہند) نے پیش کیا ۔

سیریز کا چوتھا لکچر بہ یادگار فراق گورکھپوری ۶ / مارچ ۱۹۹۹ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دلی میں بہ عنوان "آزادی کی تحر میں مسلمانوں کا حصہ ، ولایت علی بمبوق کے حوالے سے" منعقد کیا گیا ۔ یہ لکچر معروف مورخ اور دانش ور پروفیسر مشیر الحق نے کیا ۔ جلسے کی صدارت جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کی ۔ اس سیریز کا پانچواں خطبہ "ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل لکچر" عن قریب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں منعقد ہوگا ۔

اورینٹل تعلیم کے اداروں کے لیے پلاننگ:

پلاننگ کمیشن کی منظور شدہ اسکیم کے تحت سنسکرت کی طرح عربی ، فارسی ، زبانوں کو تحفظ دینا حکومت کی پالیسی کا حصہ ہے ۔ قومی اردو کونسل گورنمنٹ کی اس اسکیم کے نفاذ کے لیے ذمے دار ہے ۔ عربی اور فارسی کے فروغ سے مغربی ایشیائی ممالک

ساتھ نہ صرف ارتباط کو استحکام ملے گا بلکہ یہ اسکیم مغربی ایشیا کے ڈیولپمنٹ میں بالواسطہ معاون ہوگی۔ کونسل اس سلسلے میں ہندستانی میں عربی تعلیم کا ایک ایسا ماڈل تیار کرنے کے لیے لائحہ عمل مرتب کررہی ہے جو ہندستان میں عربی، فارسی زبانوں کے طلبا کو نئی جہات سے روشناس کرائے گا۔

ہمارے مدارس اور اورینٹل اداروں میں تعلیمی نصاب عموماً درسِ نظامی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس قدیم نصاب پر نظرِ ثانی کرکے تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اس کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے نئی نصابی کتب معاون مواد کو ان اداروں میں متعارف کرانا بھی ضرور ہے۔

اس سلسلے میں حیدرآباد میں قائم شدہ Central Institute of English and Foreign Languages (CIEFL) سے اشتراک کیا گیا ہے جو ان مقاصد کے حصول میں کونسل کو تعاون دے گا۔

عربی / فارسی میں تحقیق کے لیے وظائف :

اس اسکیم کے تحت عربی اور فارسی زبانوں میں تحقیق کے لیے کونسل ان طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کو وظائف دیتی ہے جو اورینٹل اداروں اور مدارس میں ریسرچ کا کام کرنے کے خواہش مند ہوں۔ اس اسکیم کے تحت کونسل نے ایک اشتہار شائع کرنے کے بعد عربی و فارسی اداروں میں مذکورہ اسکیم کے فارم بھی روانہ کیے تھے۔ ۹ فروری ۱۹۹۹ء کو عربی و فارسی زبانوں میں تحقیق کے لیے وظائف تفویض کرنے کے لیے ماہرین کی سلیکشن کمیٹی نے جو خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور ڈاکٹر چندر شیکھر پر مشتمل تھی، کل ۷۱ امیدواروں کے انٹرویو لیے اور ان میں سے ۱۲ امیدواروں کو وظائف کے لیے بالآخر منتخب کیا گیا۔

یو۔ این۔ آئی اردو سروس پر اردو اخبارات کو سبسڈی :

قومی اردو کونسل اردو صحافت کے معیار کو بلند کرنے کی خاطر اردو اخبارات کو یو۔ این۔ آئی (اردو نیوز سروس) پر سبسڈی فراہم کرتی ہے۔ یو۔ این۔ آئی۔ اردو سروس کا وجود کونسل کی کاوشوں ہی کا نتیجہ ہے۔ اس سے قبل اردو اخبارات یو۔ این۔ آئی کے ذریعے فراہم شدہ ہندی اور انگریزی خبروں کے ترجمے کے مشکل مرحلے سے گزرتے تھے جس سے بالعموم اصل مفہوم ہی مسخ ہوجاتا تھا۔ یو۔ این۔ آئی کے قیام کے بعد سے اب اردو اخبارات کو اردو ہی میں تیار شدہ خبریں مل جاتی ہیں۔

قومی اردو کونسل نے یو۔ این۔ آئی کو گذشتہ برس 9,79,427=00 روپے کی سبسڈی کی فراہم تھی۔ رواں مالی سال ۱۹۹۸ء تا ۱۹۹۹ء میں یہ رقم بڑھا کر 10,83,524=00 روپے کردی گئی ہے۔

اس اسکیم سے تقریباً ۳۳ اردو اخبارات مستفید ہورہے ہیں۔ ۳۱ / دسمبر ۱۹۹۶ء سے قبل قومی اردو کونسل ان اخبارات کو 2,500=00 روپے ماہانہ کی در سے سبسڈی فراہم کرتی تھی جن کی یومیہ تعدادِ اشاعت 25,000 سے زائد نہ تھی۔ جبکہ یکم جنوری ۱۹۹۷ء سے اس سبسڈی کی رقم کو بڑھا کر 32,000/= روپے کردیا گیا ہے اور تعدادِ اشاعت کی شرط 25,000 یومیہ سے بڑھا کر 75,000 یومیہ کردی گئی ہے۔

لٹریچر پینل کی میٹنگ :

مورخہ ۱۰ / فروری کی سہ پہر تین بجے کونسل کے دفتر میں جناب شمس الرحمان فاروقی کی صدارت میں لٹریچر پینل کی ایک

میٹنگ منعقد ہوئی جس میں پروفیسر شمیم حنفی ، دلی جناب محمد یوسف ٹینگ ، کشمیر اور جناب بلراج پوری ، جموں لٹریچر پینل ۔ اراکین کی حیثیت سے اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کونسل کے وائس چیرمین کی حیثیت سے شریک ہوئے ۔ اس میٹنگ میں درج ذیل موضوعات زیرِ بحث رہے اور ان پر فیصلے کیے گئے :

(۱) جامع اردو انسائیکلوپیڈیا : مجوزہ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت نوجلدوں میں کی جائے گی جن میں ۳۲ علوم پر مشتمل مختصر نوشتے شامل ہوں گے ۔ یہ نوشتے پروفیسر فضل الرحمان کی ادارت میں اب سے تقریباً دس برس قبل تیار کیے گئے تھے اب کونسل مختلف علوم کے ماہرین کے ذریعے ان کی اپ ڈیٹنگ کا کام کرا رہی ہے ۔

(۲) انسائیکلوپیڈیا برائے اردو زبان و ادب : پینل اصولی طور پر اردو زبان و ادب پر مبنی علاحدہ ... انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کے حق میں ہے ۔ اس سلسلے میں پینل کی رائے یہ ہے کہ کونسل پروفیسر شمیم حنفی کی نگرانی اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سرپرستی میں ایک پروجیکٹ تیار کرکے پینل کی اگلی میٹنگ میں ماہرین کے مشوروں کی روشنی میں اردو زبان و ادب انسائیکلوپیڈیا تیار کرانے کے لیے لائحہ عمل مرتب کیا جاسکے ۔

(۳) اردو زبان و ادب کی تاریخ : کونسل نے پانچ جلدوں پر مشتمل ... زبان کی تاریخ شائع کی ہے جو ۱۷۰۰ء تک کے زمانے کو محیط ہے اور جسے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے ۔ یہ کام پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر سیدہ جعفر نے انجام دیا ہے ۔ کونسل کی خواہش ہے کہ مزید پانچ جلدوں میں ۱۹۴۷ء تک اردو ادب کی تاریخ کا احاطہ کیا جائے ۔ لٹریچر پینل کونسل کے اس قدم کی حمایت کرتے ہوئے اٹھارہویں انیسویں اور بیسوی صدی کے نصفِ اول پر مبنی تاریخ ادب اردو پروجیکٹ کو منظوری دے دی گئی اور عن قریب ہی اس سلسلے میں منتخب ماہرین سے رابطہ قائم کر کے اسے حتمی شکل دی جائے گی۔

پینل نے کلیاتِ میر جلد اول کی اشاعتِ مکرر اور کلیاتِ میر ، جلد دوم کی تیاری کے سلسلے میں لائحہ عمل تجویز کیا منشی پریم چند اور سعادت حسن منٹو کے کلیات کی اشاعت کے سلسلے میں پینل نے بالترتیب جناب مدن گوپال اور جناب بلراج مین را کے نام تجویز کیے ۔

فائن سائنس پینل کا اجلاس :

فائن سائنس پینل میٹنگ ۱۶ / فروری ۱۹۹۹ء کونسل کے کمیٹی روم میں پروفیسر محمد نسیمین قادری ، وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوئی ۔ اس میں پروفیسر محمد اقبال ، نئی دلی ؛ ڈاکٹر بی ۔ ایس ۔ ایم ۔ پی قادری ، چنائی ؛ پروفیسر نجمہ باقر ، جے ۔ این ۔ یو نئی دلی ؛ ڈاکٹر شبیر علی ، نئی دلی اور جناب انوار رضوی پرنسپل پبلیکیشنز آفیسر ، قومی اردو کونسل نے شرکت کی اس اجلاس میں اردو میڈیم طلبہ کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کی غرض سے ٹیچرز کے لیے ریفریشر کورسس کی ضرورت پر زور دیا ۔ اور یہ بھی طے کیا گیا کہ طلبہ کو نصابی کتابوں کے علاوہ معاون مواد کی فراہمی ممکن بنانے کی سمت میں پیش رفت کی جائے تاکہ اردو میڈیم طلبہ کی جس سے ان کی ذہنی لیاقت کو جلا مل سکے ۔ این ۔ سی ۔ ای ۔ آر ۔ ٹی کی کتابوں کے ساتھ مزید مواد شامل کر کے کتابیں تیار کرائی جائیں ۔

جامع اردو انسائیکلوپیڈیا:

قومی اردو کونسل مختصر نوشتوں پر مشتمل جامع اردو انسائیکلوپیڈیا تیار کر رہی ہے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا پروفیسر فضل الرحمان کی ادارت میں کافی پہلے تیار کیا گیا تھا۔ کونسل اب یہ محسوس کرتی ہے کہ تبدیل شدہ حالات میں اس میں مزید ترمیم و اضافے کی ضرورت ہے۔ ان ہی مقاصد کے پیشِ نظر شمس الرحمان فاروقی کی صدارت میں انسائیکلوپیڈیا کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ اردو ادب سے متعلق باقی ماندہ مختصر نوشتوں پر از سرِ نو نظر ثانی کے لیے مورخہ ۸ تا ۱۰ / فروری ۱۹۹۹ء کو ایک سہ روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں جناب شمس الرحمان فاروقی اور پروفیسر شمیم حنفی بھی شریک ہوئے۔

اردو تلگو لغت پروجیکٹ:

اردو زبان کی ترویج کی راہ میں حائل ایک بڑی رکاوٹ معیاری مواد کی عدم فراہمی کے علاوہ ہندستان کی علاقائی زبانوں میں اردو لغات کی کمی بھی ہے۔ قومی زبانوں کے ساتھ رابطے کی دشواریوں کے مدِّ نظر قومی کونسل نے اس قسم کے لغات کی تیاری کو اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کیا ہے۔ اسی پروگرام کا ایک حصہ اردو تلگو لغت کی تدوین ہے۔

قومی اردو کونسل کی پروگرام کمیٹی نے اردو تلگو لغت کی تیاری کے پروجیکٹ کو منظوری دے دی ہے۔ اس پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے کونسل آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کو ڈیڑھ لاکھ روپے کا مالی تعاون دے رہی ہے۔ آندھرا پردیش اکادمی کے چیرمین کے ساتھ ایک میٹنگ میں اس پروجیکٹ کا جائزہ لیا گیا اور ۵۰ ہزار روپے کی عبوری گرانٹ ریلیز کی گئی۔

پریم چند کی تحریروں کی اشاعت کا منصوبہ:

لٹریچر پینل کے فیصلے کے مطابق کونسل نے پریم چند کی تمام تحریروں کی اشاعت کا فیصلہ کیا ہے جن میں ناول، افسانے، خطوط اور مضامین شامل ہیں۔ کونسل کے لیے یہ علمی منصوبہ جناب مدن گوپال کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ مدن گوپال نے ساٹھ برس سے زیادہ کی طویل مدت پریم چند کی تحریروں سے متعلق مختلف تفصیلات کی تحقیق میں صرف کی ہے۔ یقیناً ان کا یہ علمی منصوبہ تحقیق کے زاویے سے نہ صرف مستند حقائق پر مبنی ہوگا بلکہ اس کے ذریعے پریم چند سے متعلق راہ پاگئی متعدد غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوسکے گا۔ اس منصوبے کے تحت پریم چند کی تحریروں کی تخلیقیت مجروح نہ ہو اس مقصد کے پیشِ نظر ان کی ہندی تحریروں کی اشاعت اردو رسم الخط میں ترجمے کے بغیر ہوگی مگر ہندی کے مشکل الفاظ کے معنی حواشی میں درج کیے جائیں گے۔ مضامین اور خطوط وغیرہ کے جلدوں کے آخری میں اشاریہ موجود ہوگا اور تحریروں کی تدوین تاریخی ترتیب (Chronological) میں کی جائے گی۔

نونہالوں کے ادب کی فراہمی کے لیے کونسل کی کوششیں:

اردو میڈیم میں تعلیم کا فروغ قومی اردو کونسل کی بنیادی پالیسیوں میں شامل ہے۔ اردو میڈیم کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ اردو میں معیاری نصابی کتابیں اور معاون مواد طلبہ کو حاصل ہو۔ بچوں کی شخصیت کی ہمہ گیر اور متوازن نشو ونما کے لیے لازم ہے کہ نصابی کتب کے علاوہ تخلیقی، تفریحی معلوماتی اور سبق آموز کتابیں بھی ان تک پہنچیں۔ کونسل نے بچوں کے معیاری ادب کی اشاعت کو اپنے پروگرام میں شامل کیا ہے جس کے تحت کم قیمت پر بچوں کی معیاری کتابوں کی فراہمی کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ اس پروگرام میں قومی اردو کونسل نے "بچوں کا ادبی ٹرسٹ" کی خدمات بھی حاصل کی ہیں۔ اردو میں چوں کہ بچوں کے ادب کی

ملک ہے اس لیے کونسل نے اس کمی کو دور کرنے کے لیے C.B.T کے ساتھ اشتراک کیا ہے ۔ کتابوں کی ترتیب ، گیٹ اپ اور طباعت کے معیار میں کسی قسم کی مفاہمت کیے بغیر C.B.T کی زیادہ سے زیادہ کتابیں نہ صرف کم قیمت پر نونہالوں تک پہنچ سکیں گی بلکہ مارچ کے آخر تک ان میں سے ۲۰ کتب اشاعت پذیر ہو بھی چکی ہے ۔ اردو میں بچوں کے لیے معیاری اشاعت کو یقینی بنانے کی غرض سے کونسل نے رہنما اصول وضع کرنے کے لیے دو روزہ ورک شاپ بہ عنوان " بچوں کا ادب ، موجودہ صورت حال اور مستقبل کا لائحہ عمل " کے عنوان سے مہاراشٹرا اردو اکیڈمی ، ممبئی کے اشتراک سے انجمن اسلام ممبئی ، میں ۳۱ / جنوری تا ۱ / فروری ۱۹۹۹ ، محترمہ سلمہ صدیقی کی صدارت میں منعقد کیا ۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر ، ایس ۔ جی ۔ حیدر ، ایس ۔ ایچ ۔ نقوی ، تسلیم زیدی صفدر نقوی ، یوسف ناظم اور رفعیہ شبنم عابدی نے ورک شاپ میں شرکت کی ۔ اس ورک شاپ میں بچوں کے ادب میں در آئی خامیوں کی نشان دہی کر کے اس کے معیار کو بہتر اور دل چسپ بنانے کی تجاویز پیش کی گئیں جو بحث و تمحیص کے بعد منظور ہو گئیں ۔ ان پر عمل کر کے کونسل جلد ہی کچھ کتابیں منظرِ عام پر لا رہی ہے ۔

اردو مراسلاتی کورسس اور بی ایڈ :

قومی اردو کونسل Central Institute of Indian Language میسور کے اشتراک سے مراسلاتی کورس کے لیے نصاب تیار کر رہی ہے ۔ اس کورس کے لیے ایک ورک شاپ ۲۰ تا ۲۴ جولائی ۱۹۹۸ء کے دوران منعقد ہوا جس میں اس کورس کا نصاب تیار کیا گیا تھا ۔ اس سال جون میں ایک اور ورک شاپ منعقد کیا جائے گا جس میں گزشتہ ورک شاپ میں تیار کیے گئے مواد کو قطعی شکل دی جائے گی ۔ امید کہ یہ کورسس جلد ہی شروع ہو جائے گا ۔ اس کے علاوہ CIIL ہی کے اشتراک سے انگلش میڈیم مراسلاتی کورس اور اردو ٹیچرس ٹریننگ سنٹر بھی جلد ہی شروع کیے جائیں گے ۔

فاصلاتی تعلیم کے لیے اردو ٹیچرس ٹریننگ کورس بھی اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے اشتراک سے جلد ہی شروع کیے جائیں گے ۔

کتاب میلوں میں قومی اردو کونسل کے اسٹال :

سال ۱۹۹۸ء تا ۱۹۹۹ء میں قومی کونسل کے شعبہ ، فروخت و نمائش نے ملک کے درج ذیل شہروں میں منعقد ہونے والی کتاب نمائشوں میں شرکت کی ۔

۱ ۔ چھتا طی کتاب میلہ : ۸ / اگست ۹۸ء سے ۱۶ / اگست ۹۸ء تک ان نو دنوں میں مبلغ 64,000=00 روپے مالیت کی کتابیں فروخت ہوئیں ۔

۲ ۔ پٹنہ کتاب میلہ : ۲۹ / نومبر ۹۸ء سے ۷ / دسمبر ۹۸ء تک بارہ دنوں میں مبلغ 88,204=00 روپے مالیت کی کتب فروخت ہوئیں ۔

۳ ۔ جے پور کتاب میلہ : ۲ تا ۱۰ / جنوری ۱۹۹۹ء تک نو دنوں میں مبلغ 32,285=00 روپے مالیت کی کتب فروخت ہوئیں ۔

۴ ۔ کلکتہ کتاب میلہ : ۲۰ / جنوری تا ۱ / فروری ۱۹۹۹ء تک بارہ دنوں میں 1,42,914=00 روپے مالیت کی کتب فروخت ہوئیں ۔

۵ ۔ چنڈی گڑھ کتاب میلہ : ۲۰ / فروری ۱۹۹۰ء سے ۲۸ / فروری ۱۹۹۹ء تک نو دنوں میں 23,308=00 روپے مالیت کی کتب فروخت ہوئیں ۔

(باقی ص ؛ ۸۴ پر)

[illegible]
قائم شدہ : ۱۹۳۸ — فون : [illegible]

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۶۱ — جون ۱۹۹۹ء — شمارہ : [illegible]

فی پرچہ	:	۱۵	روپے
زرِ سالانہ	:	۱۵۰	روپے
کتب خانوں سے	:	۱۷۵	روپے

[illegible]ق وسطیٰ اور امریکہ	:	۲۵	ڈالر
[illegible]تان ، برما ، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۲	ڈالر
[illegible]ستان	:	۱۰	پونڈ

ناشر : ادارۂ ادبیاتِ اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا ۔

[illegible]

[illegible]

اس شمارے میں

○○○

پون ورما

ترجمہ: اسامہ فاروقی

کتاب: غالب، شخصیت اور عہد

باب: تین — ایک مضطرب صاحبِ بصیرت

(قسط: ۷)

اپنی تشویق نے غالب پر مخصوص ذمہ داریاں بھی عاید کر رکھی تھیں۔ پنشن کے مقدمے میں شرمناک ناکامی اور شمس الدین خاں کے واقعے سے پیدا ہونے والی تلخی کے بعد اپنے ہم چشموں سے قطع تعلق کی خواہش چند روزہ بھی رہی ہوگی اور بالعموم پوری بھی نہ ہوئی ہوگی۔ ان کا کافی وقت دوسروں کے اصلاحِ کلام میں صرف ہوتا تھا۔ یہ وہ بے معاوضہ کام تھا جس کی ایک سربرآوردہ شاعر سے توقع رکھی جاتی تھی۔ غالب کسی سے انکار نہ کرتے تھے اور ان کی شہرت میں اضافے کے ساتھ ان لوگوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی جو اپنے کلام کے بارے میں ان کی رائے جاننے کے آرزو مند تھے۔ اس کلام کے تعلق سے ان کا رویہ سنجیدگی کا تھا اور وہ توقع رکھتے تھے کہ دوسرے اس کی قدر پہچانیں گے۔ ایک خط میں وہ اپنے نہایت زودگو شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کی نرمی سے سرزنش کرتے ہوئے انھیں صلاحوں کے بہ غور مطالعے کا مشورہ دیتے ہیں۔ شعر کے وزن اور اس کی عبارت کو درست کرنے کے علاوہ وہ تفصیلی وضاحتیں اور ترمیمیں بھی شامل کرتے۔ ان کی تنقید ہمیشہ بےباک اور اکثر دو ٹوک ہوتی لیکن روادری کی کبھی نہ ہوتی۔ تفتہ کے نام ایک طویل مکتوب میں وہ ان کے لکھے ہوئے ایک مصرعے پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں لیکن یہ کہتے ہوئے گفتگو ختم کرتے ہیں کہ کچھ بھی کرو یہ بے معنی ہی رہے گا۔ کبھی کبھی ان کا تبصرہ تباہ کن بھی ہوسکتا تھا۔ تفتہ کے بعض اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے، جن کے متعلق ایسا لگتا ہے کہ وہ ان امور کے بارے میں سب سے زیادہ مراسلت کیا کرتے تھے، وہ لکھتے ہیں: "ان تمام اشعار میں کوئی سقم نہیں ہے اور کوئی دل چسپ بات بھی نہیں ہے۔" خاص طور پر دل چسپ اعلیٰ درجے کی وہ ذہنی وسیع المشربی تھی جو صحیح محاورے کے استعمال میں ان کی رہ نمائی کرتی تھی۔ ایک دفعہ جب ایک شاگرد نے نام ور شاعر حزیں کے ایک شعر کا بہ طور سند حوالہ دیتے ہوئے ایک مخصوص محاورے کے استعمال کو حق بہ جانب ثابت کرنے کی کوشش کی تو غالب کا جواب یہ تھا کہ "حزیں تو آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبریل کا ہو تو اس کو سند نہ مانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔"

غالب ان تھک مکتوب نگار تھے اور انھیں لکھنے میں کافی وقت اور توجہ صرف کرتے۔ [illegible] ان کے بے شمار خطوط کی نمایاں [illegible] تصنیفات اور دل آویز حسن اقبال و ذکاوت سے [illegible] تشنیع اور رسمی انداز [illegible] گفتگو۔ وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں: "میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔" خطوط کے [illegible]

کہا تھا لیکن اخبارات کا رواج شروع ہونے تک اور بڑی حد تک اس کے بعد بھی خبروں کی نشر و اشاعت کے ایک ذریعے کی حیثیت سے خطوط کی اہمیت برقرار رہی۔ غالب کے لیے سارے شمالی ہند میں پھیلے ہوئے اپنے بہتیرے دوستوں سے ساتھ خط و کتابت جاری رکھنا ایک اہم مشغلہ تھا۔ خطوط کے پہنچنے کا انتظار یا اپنے خدمت گار کلو کو خطوط ارسال کرنے کے لیے ڈاک خانے بھیجنا روز کا معمول تھا۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ ان کے حینِ حیات طبع ہوا۔ ان کا رجحانِ طبع صرف شعر گوئی کی طرف نہیں تھا بلکہ وسیع تر مفہوم میں اسے ادبی تخلیقات کے سبھی لوازم پر دسترس کہ سمجھنا چاہیے۔ اکثر دوسرے مصنفین اپنی علمی کاوشوں پر تقریظ یا پیش لفظ لکھنے کی ان سے فرمائش کرتے۔ وہ ان پر کافی محنت کرتے۔ ایک خط میں وہ تفتہ کو مطلع کرتے ہیں، "دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔"

شعر گوئی کے لیے ان کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا، لیکن ایسا لگتا ہے کہ اشعار وہ زیادہ تر رات دیر گئے اس وقت کہتے جب کچھ فاصلہ خاطری نصیب ہوتی۔ مشاعروں کا رواج عام تھا اور انھیں اس عہد کے ادبی جوش و خروش کے اظہار کے ایک مسلمہ وسیلے کی حیثیت حاصل تھی۔ محلِ شاہی کی طرف سے ماہانہ کم از کم دو رسمی مشاعرے دیوانِ عام میں منعقد کیے جاتے لیکن امرا کے ایوانوں میں اور بہت سی غیر رسمی شعری محفلیں ضرور منعقد ہوتی رہی ہوں گی۔ ان مشاعروں اور ادبی محفلوں میں خاص قوتِ کشش کی حامل غالب کی شخصیت تھی۔ ان کی آواز بلند تھی اور وہ اسے کارگر طور پر استعمال کرتے تھے۔ بہ حیثیت شاعر ان کی امتیازی حیثیت کے اعتراف کے طور پر ان کے کلام سنانے کی باری بالعموم بالکل آخر میں آتی تھی۔ بعض اوقات جب انتظار کی گھڑیاں ان پر بھاری گزرتیں، بالخصوص جب شاعری کا معیار اونچا نہ ہوتا اور اشعار آب دار نہ ہوتے، تو وہ عذر معذرت کر کے کچھ دیر کی رخصت حاصل کر لیتے، شہر کی سیر کرتے، تھوڑی سی پی لیتے اور پھر محفل کو واپس لوٹتے جو افق پر سپیدیِ صبح کے نمودار ہونے تک جاری رہتی۔ ان کے قریبی دوستوں میں منشی نبی بخش حقیر، مولوی فضلِ حق اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ شامل تھے، موخر الذکر سے قریبی دوستی غالب کی کلکتے سے واپسی کے بعد شروع ہوئی۔ یہ سبھی باکمال شعرا تھے اور اہلِ علم کہلانے کا پورا پورا حق رکھتے تھے۔ غالب کے شاگردوں میں تفتہ اور علائی یعنی لوہارو خاندان کے علاء الدین احمد خاں، شامل تھے۔ ان کو اور بعض دوسروں کو ملا کر ایک ادبی حلقے کی حیثیت حاصل تھی اور یہ تقریباً روزانہ ملاقات یا مراسلت کے ذریعے ایک دوسرے سے ربط قائم رکھتے تھے۔ اس طرح سے غالب کی روز مرہ کی زندگی آج کل کی کسی نام ور ادبی شخصیت کے نظامِ عمل سے مختلف نہیں تھی جس میں تصحیح کا کام، شعر گوئی، مضمون نگاری، تنقیدی تبصروں اور دیباچوں کا لکھنا، مباحث، مذاکرات، سیمیناروں اور شعر خوانی کی محفلوں میں شرکت، ادبی مناقشوں کے متنازع فیہ مسائل پر اپنی بیش قیمت رائے کا اظہار، ترتیب و تہذیب متن اور علاوہ، درس کی صورت جیسے فرائض شامل رہتے ہیں۔ فرق بس اتنا تھا کہ دنیائے ادب پر چھائی ہوئی اس بے مثل بہار کے زمانے میں ماحول کچھ اور بھی زیادہ زور و شور کا اور ہمہ گیر تھا۔ یہ مکمل ادبی تجربہ، جس سے وہ شبانہ روز گزرتے تھے، غالب کی زندگی کی بناوٹ کا ایک اتفاقی اہم عنصر تھا، جس کو ملحوظِ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے۔

دلی کالج کے قیام کے بعد ۱۸۴۲ء میں غالب کا نام فارسی کی مدرسی کے لیے تجویز کیا گیا۔ حکومتِ ہند کے سکریٹری ٹامسن نے انھیں اس سلسلے میں باضابطہ ملاقات کے لیے بلایا۔ جب غالب پالکی سے اترے تو اس انتظار میں کھڑے رہے کہ صاحب سکریٹری ان کے استقبال کے لیے نکلیں گے۔ یہ شرفا کی تشریف آوری کے موقع پر تعظیم و تکریم کا مروجہ عمل ہوا کرتا تھا۔ ٹامسن نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ ان کے خیال میں اس موقع پر دستور کی پیروی کا کوئی جواز نہیں تھا، کیونکہ غالب ان کے پاس نوکری کے ایک امیدوار کی حیثیت سے

رہے تھے ۔ غالب کو یہ بہت ناگوار گزرا ، جیسے ان کی دکھتی رگ پکڑلی گئی ہو ۔ غالب نے ٹامسن کو جواب دیا کہ " سرکاری ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو ، نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے ۔ " ٹامسن نے کہا کہ میں ان امور کا تعین کرنے والے ضابطوں سے مجبور ہوں ۔ تب غالب نے اجازت چاہی اور رخصت ہوئے ۔ بے شک غالب کو روپے پیسے کی ضرورت تھی ، لیکن بعض مخصوص اقدار تھیں جن سے وہ خود اپنی نظر میں اپنی شناخت برقرار رکھنا چاہتے تھے اور جن کی قربانی دینے کے لیے وہ ہرگز تیار نہیں تھے ۔ اس کے علاوہ کسی کالج میں تنخواہ پر ملازمت اس وقت تک ایک نیا تصور تھا ، جب کہ توقع کی جاتی تھی کہ ایک نام ور شاعر کی کفالت کا فریضہ شاہی سرپرستی اور قدردان امرا کو ہونا چاہیے ۔ بہرحال کالج کے باہر ادبی سرگرمی غالب کے لیے خاطر جمعی کا ایک ذریعہ بھی تھی اور کافی وقت کا بھی مطالبہ کرتی تھی ۔ کالج کی ملازمت میں قابلِ لحاظ امر محض روپیہ پیسہ تھا ، لیکن ہماری سبھی خواہشیں تو پوری ہونے سے رہیں ۔

اس طرح زندگی بڑی حد تک پہلے ہی کی طرح بسر ہوتی رہی ۔ گرمیوں میں وہ اپنے گھر کے صدر دروازے کی چھت پر واقع ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں دن گزارتے ۔ جاڑوں میں وہ اس سے ملحق ایک برآمدے میں بیٹھ کر دھوپ کھاتے ۔ شام میں تھوڑی سی شراب ، شطرنج اور چوسر ان کی معمول کی تفریح تھی اور آم ان کی ہمیشہ کی لت تھی ۔ ادبی مشاغل ان کو مصروف رکھتے ۔ قلعے کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے اپنے اور لتے ہی اہم تقاضے تھے ، یہ ان کے لیے مسرت کا سرچشمہ بھی تھی لیکن شاید زیادہ تر رنج و ملال کا باعث ۔ روپے پیسے کی کمی دماغی سکون میں ہمیشہ خلل انداز رہی اور صحت کے محاذ پر بھی بعض مسائل ابھر رہے تھے جو بیش تر جسمانی ورزش کے فقدان ، نیز تقریباً کلیتہً گوشت اور روٹی پر مشتمل خوراک " کا نتیجہ تھے ۔ اس رفتار سے آہستہ آہستہ سال گزرتے گئے یہاں تک کہ قماربازی کے الزام میں گرفتاری کا وہ واقعہ پیش آیا جس نے انھیں ہلاکر رکھ دیا ۔ اس کا مختصراً ذکر اوپر آچکا ہے لیکن اس واقعے کی اہمیت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس پر ایک غائر نظر ڈالنا مناسب ہوگا ۔

غالب کو شرط لگا کر چوسر کھیلنا پسند تھا ۔ ممکن ہے کہ مالی دشواریوں نے انھیں ایک حد تک ناعاقبت اندیش بنادیا ہو لیکن بعض مصنفوں کی طرف سے ایسے ادعا کے باوجود ، ان کا گھر جواریوں کا اڈہ نہیں تھا ۔ وہ چوسر دوستوں کے ساتھ کھیلتے تھے اور اسے وہ اخلاقی طور پر غلط نہیں سمجھتے تھے ۔ اس زمانے میں انگریز عہدہ دار اخلاقیات کے نقیب کی حیثیت اختیار کر رہے تھے ۔ جس میں تبلیغ انجیل کا جوش تھا اور جو دیسیوں کو ان کی بری عادتوں سے چھٹکارا دلانے کے لیے جلد کی علم بردار تھی اور کسی قسم کی رو رعایت کی قائل نہ تھی ۔ یہ عہدہ دار قمار بازی کو [illegible] جس کی بیخ کنی ضروری تھی ۔ ۱۸۴۱ ء میں غالب کو متنبہ کیا جاچکا تھا جب کہ ان کے گھر پر چھاپا مارا گیا تھا اور ان پر قمار بازی کے الزام میں سو روپے جرمانہ عاید کیا گیا تھا ۔ ۱۸۴۷ ء میں کیا واقعہ پیش آیا ٹھیک سے معلوم نہیں ۔ [illegible] غالب ذکر کرتے ہیں کہ دلی کا کوتوال فیض حسن خاں ان کے خلاف تھا ۔ (حقیقت کی [illegible] مرزا غالب – میں اشفاق مرزا کی کے دانا اضافوں کے ساتھ کام میں لایا گیا ہے) ۔ لیکن [illegible] کے گھر پر چھاپا مارنے گئے تھے [illegible] کے ہمیں پتہ [illegible] ۔ غالب [illegible] امرا کے ایک [illegible] رکن تھے ، [illegible] لیکن [illegible] گیا تھا ۔ [illegible]

معلوم کیا ضروری سمجھا۔ یہ قول غالب وہ بہت زیادہ کوتوال کے دباؤ میں آگیا۔ غالب کو چھ مہینے کی قید با مشقت اور دو سو جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر وہ سو روپے جرمانہ ادا نہ کریں تو قید میں اور اضافے کا حکم تھا۔ مقررہ جرمانے کے علاوہ اگر پچاس زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت سے معافی مل سکتی تھی۔ سیشن جج نے، جو غالب سے بہ خوبی واقف تھا، فیصلے کی توثیق کردی۔

جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی اس فیصلے سے ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ حکم سزا کی درشتی سے عوام میں خفگی کی لہر دوڑ گئی۔ معاصر اخبار نے احتجاج کیا کہ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جن کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، معمولی جرم میں اتنی سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے بھی اور انگریز حکام سے غالب کی رہائی کا مطالبہ کیا لیکن انگریزی سرکار پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اعلیٰ حضرت کو مطلع کیا گیا کہ معاملہ تحقیقاتِ عدالت ہے۔ عدالتی کارروائی میں دخل اندازی مناسب نہ ہوگی۔

غالب کو قید کی پوری میعاد نہیں کاٹنی پڑی۔ وہ تین مہینے کے بعد رہا کردیے گئے۔ قید میں وہ مشقتِ تحریری سے بچے۔ انھیں اجازت تھی کہ گھر سے بھیجا ہوا کھانا کھائیں، اپنے ذاتی کپڑے پہنیں اور ملنے آنے والوں سے ملاقات کریں۔ لیکن گرمی کا موسم تھا اور انھوں نے تکلیف ضرور اٹھائی ہوگی۔ درحقیقت انھیں میعاد پوری ہونے سے قبل غالباً سول سرجن ڈاکٹر راس کی سفارش کی بنا پر رہا کیا گیا۔ سارے معاملے کا اصل صدمہ پہنچانے والا پہلو وہ ذلت تھی جو اس کی وجہ سے انھیں برداشت کرنی پڑی۔ غالب ایک امیر زادے، دانش ور، رنج و الم اور مسرت و شادمانی کے نغموں کے خالق حساس شاعر تھے، ایک معمولی مجرم کی طرح جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ نئے حاکموں کی نظر میں ان کی حیثیت کے بارے میں اگر کسی کو کوئی خوش فہمی تھی تو اب کلیۃً دور ہوگئی ہوگی۔ علاوہ ازیں مغل بادشاہ کی بے بسی اور مناصبِ معکوس میں فرنگیوں کے اختیارات وضاحت کے ساتھ آشکار ہوگئے۔ موخر الذکر کی رہائی حاصل کرنے کی مساعی لاحاصل ثابت ہوئیں۔ یہ ایک نیا نظامِ اقدار تھا، نئے سیاسی نظام کے سہارے قائم شدہ بے رحم میزان پامال تھی، جسے آپ یا تو تسلیم کریں یا پھر مصیبت اٹھائیں اور اس مصیبت میں کوئی آپ کا ساتھ بھی نہیں دے گا۔ ذاتی طور پر غالب کے لیے انتہائی حیرت انگیز انکشاف تھا۔ ان کے دلی کے اکثر احباب، یہاں تک کہ قریبی اور عزیز ازجان رشتہ داروں نے ان سے منہ موڑ لیا اور حکام کے منظورِ نظر بنے رہنے کی اپنی مساعی میں بڑی زود حسی سے کام لیا۔ غالب کے نہایت قریبی دوست اور رشتہ دار لوہارو کے امین الدین خاں نے اخبار میں یہ توضیح شائع کروا کے کہ غالب سے ان کی کوئی یک جہتی رشتہ داری نہیں ہے، باہمی کے داغ کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ان کے بھائی ضیاء الدین احمد خاں کا رویہ بھی کچھ کم معاندانہ نہیں تھا۔

واحد اور قابلِ ذکر استثنائی حیثیت مصطفیٰ خاں شیفتہ کی تھی۔ شیفتہ نے ہر ممکنہ کوشش کی کہ غالب کی سزا منسوخ کردی جائے۔ انھوں نے مقدمے اور مرافعے کے اخراجات برداشت کیے اور جب کام یابی نہ ملی تو غالباً انھی نے جرمانہ ادا کیا۔ غالب کے زمانۂ اسیری میں وہ ان سے تقریباً روزانہ ملاقات کرتے رہے۔ دوسروں کے رویے کے بالکل برعکس ان کے اس حسنِ سلوک کی وجہ سے غالب تا عمر شیفتہ کے مرہونِ منت رہے۔ جیل میں لکھی گئی اپنی مشہور حبسیہ نظم میں غالب شکر و امتنان میں انھیں اللہ تعالیٰ کی رحمت مجسم قرار دیتے ہوئے انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ غالب پکار اٹھتے ہیں کہ جس کا شیفتہ جیسا دوست ہو اس کو تو مرنے کا بھی غم نہ ہونا چاہیے۔ اسی نظم میں دوسرے احباب کی "وفاداری" کے بارے میں تلخی اور شدید طنز سے بھری ہیں۔ غالب کہتے ہیں کہ ان کے رفقا نے قید خانے کو آزاد دنیا سے کہیں بہتر جگہ کی حیثیت دے دی تھی۔

رہائی کے بعد غالب کی ذہنی کیفیت شدید دل شکستگی کی تھی ۔ اسی معاشرے کو واپس لوٹنے کا خیال ، جس نے آڑے وقت ، جب انھیں سہارے اور دلاسے کی ضرورت تھی ، ان سے طوطا چشمی کی تھی ، ان کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا ۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے یہ مشہور اشعار جن میں سماج کی بے رحمی کی تصویر الفاظ میں کھینچی گئی ہے ، اسی زمانے میں لکھے ہوں ۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

لب کے ایک فارسی خط میں ، جسے حالی نے نقل کیا ہے ، ہمیں ایسے ہی خیالات کی آوازِ بازگشت سنائی دیتی ہے ۔ " میری آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں ، تو ہندستان میں نہ رہوں ۔ مصر ہے ، ایران ہے ، بغداد ہے ۔ یہ بھی جانے دو ، خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ ، رحمۃ اللعالمین دل دادوں کی تکیہ گاہ ہے ۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے ، جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے ، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں ، سر بہ صحرا نکل جاؤں ۔ "

سزائے قید کی وجہ سے ان کے گھریلو انتظامات یقیناً درہم برہم ہوگئے ہوں گے ۔ اس پر یہ امرِ واقعہ دلالت کرتا ہے کہ رہائی کے بعد وہ اپنے پرانے گھر کو واپس نہیں لوٹے بلکہ بہادر شاہ ظفر کے پیر و مرشد نصیرالدین کالے میاں صاحب عرف کالے شاہ کے مکان پر منتقل ہوئے جہاں شاہ صاحب نے غالب اور ان کے کنبے کو رہنے کا ٹھکانہ دیا تھا ۔ یہ میاں کالے صاحب کے بہادر شاہ کے ساتھ تعلقات ہی تھے جن کی بہ دولت غالب پہلی بار مغل دربار میں باضابطہ باریاب ہوئے ۔ بادشاہ کے معالج حکیم احسن اللہ خاں نے بھی ، جو غالب کے قریبی دوست تھے ، ضرور ان کی سفارش کی ہوگی ۔ واقعہ ، اسیری سے غالب کی شہرت بہ حیثیت شاعر متاثر نہیں ہوئی تھی ۔ یہ بہر حال بیش تر عوام کی نظر میں ، ان کے سنگ دلانہ برتاؤ کے باوجود ، غالب مجرم کبھی نہیں تھے ۔ فرنگی سرکار حاکم تھی اور اس کے حکم کی مہر لگ گئی تو سب بے بس تھے ۔ جب غالب رہا ہوگئے تو بہتیرے ایسے تھے جنھوں نے ہمت جُٹا کر اپنی درپردہ ہم دردی کا اظہار کیا ۔ بادشاہ نے سزائے قید کی منسوخی کے لیے باضابطہ انگریزوں سے ربط قائم کیا تھا ۔" یہ نام ور شاعر اور امیرزادہ غالب کے حق میں ان کا فرض تھا ۔ لیکن ذاتی سطح پر غالب کے ساتھ ان کے تعلقات زیادہ خوش گوار نہیں تھے ۔ بہادر شاہ ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے ، لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں ، وہ اپنے باپ اکبر شاہ ثانی کے منظورِ نظر نہیں تھے ۔ اکبر شاہ ثانی تو آخر تک انگریزوں سے چھوٹے بیٹے شہ زادہ سلیم کو بہ حیثیت ولی عہد تسلیم کرنے کی استدعا کرتے رہے تھے ۔ غالب نے اکبر شاہ ثانی کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا ، جس میں انھوں نے کچھ زیادہ ہی خوش بیانی سے شہ زادہ سلیم کی خوبیوں کی بھی مدح سرائی کی تھی ۔ جب بہادر شاہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے اپنے حریف کے تعلق سے غالب کی طرف داری کو فراموش نہیں کیا ۔ " اس داغ کو دور کرنے کے لیے غالب کو تیرہ سال اور چندہ مدحیہ قصیدے درکار ہوئے ۔ " آخر کار ۱۸۵۰ء میں بادشاہ نے ان کو نجم الدولہ ، دبیر الملک ، نظام جنگ کے خطابات مرحمت کیے اور سالانہ چھ سو روپیے تنخواہ پر خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا ۔

ان واقعات سے جزوی طور پر غالب کو بحال ہونے میں مدد ملی ۔ سماج میں ان کی حیثیت کو سہارا ملا ، وہ بھی عین اس وقت جب کہ اس کی سخت ضرورت تھی ۔ لیکن اخلاقی احساس کام رانی کا جوش جلد ہی ٹھنڈا پڑگیا ۔ تاریخ نویسی تحقیقی ریاضت کا تقاضہ کرتی تھی اور ایسا لگتا ہے کہ وہ جلد ہی اس سے تھک گئے اور اگر وہ اس پر قائم رہے تو صرف تنخواہ کی خاطر ۔ پہلے چھ مہینوں میں

[illegible] تک وہ بھی ... نہیں ہوئے۔

لے یہ خیال تھا کہ انھیں تنخواہ [illegible] کرے گی۔ غالب، جن کے پاس زر نقد کی ہمیشہ کمی رہتی تھی، ماہانہ تنخواہ ترجیح دیتے تھے اور شروع میں انھوں نے طے کیا کہ اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ سارے منصوبے ہی سے پیچھا چھڑا لیں گے۔ اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں انھوں نے بہادر شاہ کو راست مخاطب کرتے ہوئے ایک نظم لکھی جس میں ماہانہ تنخواہ کی ادائگی کا سوال اٹھایا۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہوگیا ہے شریک ساہوکار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

وہ ماہانہ تنخواہ لینے میں تو کام یاب ہوئے لیکن اپنے تاریخی بیانیہ کو ہمایوں سے آگے لے جانے میں انھیں کام یابی نصیب ہوئی۔ [illegible] تک ان کا روزِ عمل کہیں زیادہ دو ٹوک ہوچکا تھا اور وہ اس فرضِ منصبی کو ایک دردِ سر سمجھنے لگے تھے۔ منصوبہ اپنی موت آپ ہی مرگیا۔ دربار کو اس میں دل چسپی باقی نہ رہی اور غالب نے اس کی تجدید کی کوشش بھی نہیں کی۔ جو کچھ وہ لکھ چکے تھے بالآخر [illegible] میں "مہر نیم روز" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس سارے کاروبار کا واحد اہم نتیجہ یہ نکلا کہ غالب خاصے طویل عرصے تک پرتکلف فارسی عبارت لکھتے لکھتے تھک کر، بیس سال سے بھی زیادہ لمبے وقفے کے بعد، اردو کی طرف لوٹے اور اسے اپنے مکاتیب میں اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔

کارِ مفوضہ کی نوعیت دربار سے غالب کے سرد مہرانہ تعلقات کی واحد وجہ نہیں تھی۔ غالب کی نظر میں استادِ شہ کی حیثیت سے شیخ محمد ابراہیم ذوق کا انتخاب ظفر کی ادبی سوجھ بوجھ کا ثبوت ہرگز نہیں تھا۔ غالب شہر کے مسلمہ سرکردہ شاعر تھے جب کہ ذوق سرکاری سرپرستی پر پل رہے تھے۔ ان کی کبیدگی اور مخالفت سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن غالب ایک سرائے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے ذوق کو سامنے گلی میں محلِ شاہی کو جاتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ قریب سے گزرے تو غالب نے بہ آوازِ بلند پھبتی کسی، "بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا۔" طعنہ بہت شدید تھا اور جیسا کہ توقع رکھی جاسکتی ہے ذوق نے بادشاہ سے شکایت کی۔ غالب ابھی سرائے ہی میں تھے کہ شاہی چوب دار اس پیغام کے ساتھ آیا کہ اعلیٰ حضرت کا حکم ہے کہ مرزا نوشہ فوراً ملاحظے میں پیش ہوں۔ معقول توضیح ضروری تھی کیونکہ حملہ استادِ شہ پر تھا اور صاف انکار لاحاصل تھا۔ لال قلعے کو جاتے ہوئے غالب نے حسبِ ذیل اشعار موزوں کیے، جن میں بڑی باریکی سے بادشاہ کو بے جا طرف داری پر ملامت بھی کی گئی ہے اور جو ساتھ ہی ساتھ ذوق سے مخاطب ہوکر کہے گئے اہانت آمیز فقرے کے سیاق و سباق کو کلیۃً بدل بھی دیتے ہیں۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے؟" — تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا — کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے — وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے؟

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی   تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے ؟
ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا   وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے ؟

بدلے ہوئے سیاق و سباق میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس پر اہلِ حضرت اعتراض کرتے۔ لیکن حقیقتِ واقعہ سے بادشاہ بھی واقف تھے اور سارا شہر بھی۔ ایک اور بھی سنگین واقعہ دسمبر ۱۸۵۱ء میں پیش آیا۔ اس کا سبب تھا بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا جواں بخت کی شادی۔ جواں بخت کی ماں زینت محل بہادر شاہ ظفر کی چہیتی بیوی تھیں اور بادشاہ پر ان کا بڑا اثر تھا۔ ان کی تحریک پر بہادر شاہ کوشش کر رہے تھے کہ انگریز جواں بخت کو ولی عہد تسلیم کر لیں، حالاں کہ وہ اور شہزادوں سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ چناں چہ تعجب کی بات نہیں کہ جواں بخت کی شادی کے انتظامات بڑی دیدہ ریزی سے کیے جا رہے تھے اور شہر میں اس کی وجہ سے بڑا جوش و خروش تھا۔ زینت محل نے غالب سے اس موقع پر سہرا لکھنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے فرمائش کی فوراً تعمیل کی اور سہرا روایتی انداز میں لکھا، بجز آخری شعر کے، جو ذوق سے ان کی اس رقابت کے سیاق و سباق میں، جس سے سب واقف تھے، صریحاً اشتعال انگیز تھا،

ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرف دار نہیں   دیکھیں، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

بادشاہ کو اپنے استاد کی یہ اہانت ناگوار گزری۔ انھوں نے ذوق سے مبارزت قبول کرنے اور ترکی بہ ترکی جواب لکھنے کو کہا۔ چناں چہ ذوق نے بھی ایک سہرا لکھا جس کے آخری شعر میں، غالب ہی کے انداز میں، شعر گوئی کا دعویٰ کرنے والوں کو للکارا کہ اگر ہمت ہو تو اس سہرے کے برابر لکھ کر دکھائیں۔

ذوق کے سہرے کو محلِ شاہی کے پیشہ ور مغنیوں نے بڑی شہرت دی اور دوسرے دن اسے مقامی اخباروں میں شائع بھی کیا گیا۔ شروع میں غالب نے سوچا کہ ان کے متنازع فیہ شعر کا صرف ذوق نے برا مانا ہے۔ گو کہ نجی طور پر وہ یہ ماننے کو تیار تھے کہ شاید تصرفِ شاعرانہ کی حدود سے انھوں نے تھوڑا بہت تجاوز کیا ہو، ان کا ابتدائی ردِ عمل ذوق کے جوابی حملے کو نظر انداز کرنے کا تھا۔ لیکن اس خاصی شہرت سے جو اس سہرے کو دی جا رہی تھی غالب نے اندازہ لگا لیا کہ بات خود بادشاہ کو ناگوار گزری تھی۔ تب انھوں نے بادشاہ کے حضور میں اپنی مشہور معذرت پیش کی،

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی   اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری   کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل   ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں ؟   مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال   یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ، ہاں اس سے مدعا   جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات   مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ   سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں   ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالب، خدا گواہ   کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اس منصفانہ کا لگے کی دلی تک ہر طرف چرچا رہا ۔ معذرت نامے میں مسکینی اور فروتنی کے مبالغہ آمیز اقرار کے ذریعے یہ ظاہر بیش کے جسارت کر رہے تھے ۔ لیکن اس کے ذو معنی اور چبھتے ہوئے استفہامیہ فقروں کے وسیلے سے وہ مبارز طلبانہ اعلان کر رہے تھے کہ جب میری گوشہ نشینی کے عالم میں قبول رواں کی زبان فارسی میرا تمدہ ۔ امتیاز ہے تو بیٹھے ہیں تو کوئی میرا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا اور یہ کہ میری ذاتی وجاہت کا انحصار تو میری عالی نسبی پر ہے نہ کہ شعر گوئی پر (سب جانتے تھے کہ ذوق کم اصل تھے) ۔ آخری شعر میں تو چڑا دینے والی کاٹ تھی ۔ یہ ادعا کہ میں سچ کہتا ہوں ایک عمومی بیان تھا لیکن یہ سب پر ظاہر تھا کہ اس کے ذریعے وہ دوسرے میں اپنی اخلاقی لن ترانی کے حق بہ جانب ہونے پر زور دے رہے ہیں ! لفظوں کے اس دل چسپ کھیل سے بادشاہ کی خفگی دور ہوئی ہو یا نہ ہو ، اس سے وہ محظوظ تو ضرور ہوئے ہوں گے ۔ دلی والوں کے لیے جو ادبی نوک جھونک کا تماشا بڑے شوق سے دیکھنے کے عادی تھے یہ بلاشبہ نہایت عمدہ سامانِ تفریح تھا ۔

ذوق کا ۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا ۔ ان کی جگہ غالب استادِ شہ مقرر ہوئے ۔ بادشاہ خود ایک ممتاز شاعر تھے ۔ ذوق کی طرف اپنے میلانِ خاطر کے باوجود وہ بہ حیثیت شاعر غالب کی اصلی قدر و قیمت سے ناواقف نہیں تھے ۔ انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کی شاعری کی بہار کے تین سرکردہ شاعر غالب ، ذوق اور مومن تھے ۔ مومن کا ۱۸۵۱ء میں انتقال ہو چکا تھا ۔ تین سال بعد ذوق کے انتقال پر غالب کا انتخاب ناگزیر تھا ۔ قرینِ قیاس ہے کہ یہ تقرر شاید ہی ان کے جذبات میں ضرورت سے زیادہ جوش و خروش کا باعث بنا ہوگا ۔ ان کی قدر شناسی حد سے زیادہ دیر میں کی گئی تھی ۔ اس وقت غالب ستاون سال کے تھے اور اب بھی انھیں ملک الشعرا کے اس بڑے منصب سے نہیں نوازا گیا تھا جو ذوق کو حاصل تھا ۔ بادشاہ کی مالی حالت ایسی تھی کہ مادی فائدے کی امید موہوم ہی تھی ۔ تقرر تنخواہ میں کسی اضافے سے مربوط نہیں تھا ۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ غالب اس بات کو دراصل نہ بھول سکتے تھے اور نہ ہی معاف کر سکتے تھے کہ ظفر نے ابتداءً استادِ شہ کی خدمت پر ذوق کا انتخاب کیا تھا ۔ اس سے نہ صرف اس خدمت کی قدر و قیمت میں کمی آئی بلکہ ، غالب کی نظر میں ، بادشاہ کی ادبی صلاحیتوں پر بھی حرف آیا ۔ ان کی یہ بدگمانی کبھی دور نہ ہو سکی کہ بہادر شاہ بہ حیثیت شاعر غالب کی قدر شناسی کی اہلیت نہیں رکھتے ۔

۹ ایسا لگتا ہے کہ بادشاہ کے کلام پر اصلاح کے کام سے وہ فکر پر زیادہ زور ڈالے بغیر جس سرسری طور پر نبٹ لیتے تھے اس سے اس احساس کی آئینہ داری ہوتی تھی کہ اس کلام پر بس لیتے ہی غور و فکر کی ضرورت ہے ۔ ایک چشم دید گواہ نے ایک دفعہ دیکھا کہ انھوں نے دیوانِ عام میں بیٹھے بیٹھے اور بات چیت کرتے ہوئے ظفر کے اشعار کے ایک پلندے پر کچھ ہی منٹوں میں اصلاح کر دی ۔ اصلاح ہو چکی تو انھوں نے پرچے چوب دار کے حوالے کیے کہ بادشاہ تک پہنچا دے اور کام سے سبک دوشی پر بڑے اطمینان کا اظہار کیا ۔

اشارہ واضح ہے ۔ اصلاحِ کلام کا کام وہ نہ صرف سرسری طور پر بلکہ بادلِ ناخواستہ کیا کرتے تھے ۔ تاہم بہ حیثیت استادِ شہ بعض فرائضِ منصبی سے وہ پہلو تہی نہیں کر سکتے تھے ۔ ان میں مختلف تقاریب ، مثلاً عیدین ، کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر جب بادشاہ کی ملی خلعا ہو مدحیہ قصائد کا پیش کرنا بھی شامل تھا ۔ غالب کے لیے یہ فرائض ناگوار سے ناگوار تر ہوتے جا رہے تھے ۔ ۱۸۵۵ء میں عید کے موقع پر نہ قصیدہ لکھا ، نہ قطعہ اور نہ ہی رباعی بلکہ دو تین اشعار فی البدیہہ موزوں کر کے سنا دیے ، جن کی انھوں نے اپنے پاس نقل بھی نہیں رکھی ۔ اگلی عید پر قلعہ معلیٰ کی ملی ہی کوشش پر حکیم احسن اللہ خاں نے سخت اعتراض کیا اور باقاعدہ قصیدے پر اصرار کیا ۔ غالب کو محض یہ جبر اور دستور کی لاحاصل پابندی ہی ناگوار نہیں گزرتی تھی ۔ گو کہ جب انھیں اپنی روش خاص

کی ضرورت نہ ہوتی وہ فکر پر زیادہ زور ڈالے بغیر بھی شعر کہہ سکتے تھے ۔ اس وقت تک ان کے لیے سنجیدہ شعر گوئی کا کام حد سے
کاوش کا متقاضی ہوگیا تھا کیوں کہ ان کی افتادِ طبع اور تربیت ایسی تھی کہ اپنی طرزِ خاص میں لکھنے کا کام وہ بڑی جاں کاہی سے
م دیتے تھے ۔ وہ اس کا ذکر شاید ۱۸۵۵ء یا ۱۸۵۶ء کے ایک خط میں کرتے ہیں : "میں شاعر تھا ، سچ اب نہیں رہا ، صرف سخن
گیا ہوں ۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گون ہوں ۔ بناوٹ نہ سمجھنا ، شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا ۔ اپنا کلام دیکھ کر
، رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیوں کر کہا تھا ۔"

بادشاہ کو ان کی دربار میں تقریباً روزانہ حاضری درکار تھی ۔ اپنے متعدد خطوط میں غالب ذکر کرتے ہیں کہ صبح نو بجے تک وہ
کے لیے روانہ ہوجاتے ہیں ۔ جہاں پناہ کے من کی موج اس کی متقاضی ہوتی تو یہ نظام الاوقات خاصہ کڑا بھی ہوسکتا تھا ۔ ایسے
دور آتے جب بہادر شاہ دربار روزانہ منعقد کرتے ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ غالب قلعے کے لیے صبح آٹھ اور نو بجے کے درمیان
ہوتے ، دوپہر کو بہ عجلت کھانا کھانے کے لیے گھر واپس لوٹتے ، چار پانچ گھڑی دم لیتے ، اور اکثر شام کو پھر دربار میں حاضر ہوجاتے ۔
کی خواہش ہر حال میں واجب التعمیل ہوتی ۔ مثال کے طور پر سارے دن کے دربار کے بعد وہ غالب کو شام میں پتنگ بازی میں اپنے
شامل ہونے کی دعوت دیتے (یہ اس زمانے میں اُمرا کا پسندیدہ فرصت کا مشغلہ تھا) انکار ممکن نہ ہوتا ۔ غالب جنھوں نے کبھی باضابطہ
ت نہیں کی تھی اس رفتار کے دستور العمل کے عادی نہیں تھے اور اپنے دوستوں سے شکایتاً کہتے کہ رات کو مزدوروں کی طرح تھک کر پڑ
ہوں ۔ یہ شعر شاید انھوں نے اسی زمانے میں لکھا ہے :

غالب ! وظیفہ خوار ہو ، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے ، نوکر نہیں ہوں میں "

اس ملازمت میں کچھ ایسی خوبیاں بھی تھیں جن سے اس کے عیوب کی تلافی ہوجاتی تھی ۔ دراصل تعلقاتِ باہمی کے اطمینان بخش
نے کے باوجود ذاتی سطح پر بادشاہ اور غالب دونوں اکثر بے تکلفانہ دل لگی سے لطف اندوز ہوا کرتے ۔ اپنے استاد کی شہرت ، ان
ر اور بہ حیثیت امیر زادہ ان کے رتبے کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بادشاہ ان کے شخصی برتاؤ اور فرائضِ منصبی کی بجا آوری میں کافی
ے سے کام لیتے تھے ۔ غالب اس سے واقف تھے ، لیکن حد سے زیادہ بے تکلف بننے کے لیے صورتِ حال کا غلط استعمال نہیں کرتے
۔ ان کے باہمی عمل میں اعتدال ، لطافت ، احترام ، خوش طبعی اور شائستگی کا وہ صحیح امتزاج تھا جسے اس عہد کی تہذیبی خوش سلیقگی
ترین علامت کی حیثیت حاصل تھی ۔ ایک موقع پر جب بادشاہ دربار میں موجود تھے گفتگو ازمنۂ وسطیٰ کے درویش حضرت نظام الدین
اور فارسی گو شاعر امیر خسرو کے قریبی تعلقات کے بارے میں چھڑ گئی ۔ غالب نے ، جو اپنے ذہن کی چستی اور فی البدیہہ شعر گوئی کے
مشہور تھے فوراً حسبِ ذیل شعر موزوں کر کے سنایا :

تھے وہ مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں وہ طالب
نظام الدین کو خسرو ، سراج الدین کو غالب

الدین بادشاہ کا اصلی نام تھا ، انھوں نے تختِ نشینی کے بعد ہی اسے بہادر شاہ میں تبدیل کیا ۔ وہ اپنے استاد کی جولانیِ طبع کے
بے ساختہ مظاہرے سے یقیناً بہت محظوظ ہوئے ہوں گے ۔ دراصل یہی وہ شعر کہنے کی طرح تھی جس کی بہ دولت وہ ان [illegible]
ور کے تعلق سے بھی ان کے بارے میں ان کے خیالات بنیادی طور پر مختلف تھے ، موجود زندہ کے ساتھ معاملات اور ہم آہنگی کا

[illegible] کر پاتے ۔ بادشاہ ایک دین دار مسلمان تھے ۔ پنج وقتہ نماز کے پابند تھے اور روزوں کا بڑا اہتمام کرتے تھے ۔ غالب مذہبی [illegible] پر تی سے بیزار تھے اور ماہِ رمضان کے روزے کبھی نہیں رکھتے تھے ۔ ماہِ رمضان کے اختتام پر ایک دفعہ بادشاہ نے غالب سے [illegible] کیا کہ تم نے کتنے روزے رکھے ۔ بغیر کسی جھجک کے اور متین چہرہ بنا کے غالب نے جواب دیا ، "پیرومرشد ایک نہیں رکھا" ۔ اس [illegible] پر بھی ہوسکتا تھا کہ ان کا بس ایک روزہ چھوٹا اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ایک روزہ بھی نہیں رکھا ۔ بادشاہ جانتے تھے آخر الذکر بات [illegible] تھی ۔ لیکن وہ مسکرائے اور مغالطے کو نظر انداز کیا ۔ اسی رنگ میں غالب نے ایک دفعہ ظفر کو حسبِ ذیل اشعار پڑھ کر سنائے ؛

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو … اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو … روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

یہ امرِ واقعہ کہ غالب بادشاہ سے ان الفاظ میں مخاطب ہوسکتے تھے وہ بھی اس موضوع پر جس کے بارے میں بادشاہ کے [illegible] عقیدے پختہ تھے ظفر کی رواداری کا بھی بہت بڑا ثبوت ہے اور اس خوش گوار خصوصی تعلق کا بھی جو بادشاہ اور استادِ شہ کے درمیان غیب قائم تھا ۔

دنیوی حیثیت سے ۱۸۵۴ء ، یعنی وہ سال جب وہ استادِ شہ بنے غالب کا بہترین دور تھا ۔ اس سے پیشتر اسی سال بادشاہ کے فرزند اور ولی عہد مرزا فخرالدین المتخلص بہ رمز بھی ان کی شاگردی میں آچکے تھے جہاں غالب کی سالانہ تنخواہ چار سو روپے مقرر ہوئی تھی ۔ مرزا فخرالدین کی شادی نواب شمس الدین کی بیوہ سے ہوئی تھی ۔ اس امر واقعہ کے پیشِ نظر کہ غالب کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ انھوں نے شمس الدین کو مجرم قرار دینے میں انگریزوں کی مدد کی تھی ، یہ امرِ واقعہ کہ مرزا فخرالدین نے غالب کو اپنا استاد مقرر کیا نوجوان شہزادے کی عالی ظرفی پر بھی دال ہے اور شہر کے مانے ہوئے سرکردہ شاعر کی حیثیت سے غالب کی شہرت پر بھی ۔ کم و بیش اسی زمانے میں اودھ کے فرماں روا نواب واجد علی شاہ پر اثر انداز ہونے کی غالب کی متواتر مساعی بھی بار آور ہوئیں ۔ واجد علی شاہ نے ان کے لیے ازراہِ عنایت سالانہ تنخواہ پانچ سو روپے مقرر کی ۔ غالب کے لیے جن کی مالی حالت ہمیشہ سقیم رہی آمدنی میں یہ اضافہ نہایت خوش آئند تھا ۔ لیکن یہ خوش گوار صورتِ حال بالکل ہی عارضی ثابت ہوئی ، جیسے طویل اور ناقابلِ تغیر زوال سے قبل پہاڑ کی چوٹی پر روشنی کی کرنیں دم بھر کے لیے روشنی بکھیر دیں ۔ اس وقت تک غالب بوڑھے ہوچکے تھے اور ان کی صحت تیزی سے بگڑ رہی تھی ۔ دلی کی روایتی بیماریاں ملیریا بخار اور دل کے پھوڑے سے غالب بچ نہیں پائے ۔ ان پر اکثر قولنج کے شدید حملے بھی ہوجاتے تھے ۔ ان کی بصارت کم زور ہوگئی تھی اور انھیں اونچا سنائی دیتا تھا ۔ "مہرِ نیم روز" کے پیشِ لفظ میں وہ لکھتے ہیں کہ ان کی انگلیوں کے جوڑ اکڑ گئے ہیں اور ان کے لیے قلم پکڑنا مشکل ہوگیا ہے ۔ ان کے اس زمانے کے خطوط میں وہ اکثر اپنی گرتی ہوئی صحت ، دانتوں کے گرنے ، بڑھتی ہوئی گراں گوشی ، چہرے کی جھریوں ، ہاتھوں کے رعشے اور بالوں کے [illegible] ۔

مومن اور ذوق کی موت ان کے لیے ایک صدمہ تھی ۔ حالاں کہ ذوق [illegible] اور یہ [illegible] اکثر ذاتی طنز و تعریض پر بھی منتج ہوتا تھا ۔ لیکن بہرحال وہ ان کے ساتھی شاعر اور معاصر بھی تھے ، ایک ایسے ادبی دور کے [illegible] تھے جس سے وہ اکٹھا گزرے تھے ۔ ایک [illegible] ۔ ان کی [illegible] غالب کو [illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ۔

مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس تینتالیس برس ہوئے، یعنی چودہ چودہ، پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اور اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔ حضرت، چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا، دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔" تاہم اپنی اس دل گیری کے باوجود وہ اب بھی اپنی پرجوش خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں، خوش وقتی کے مختصر لمحوں کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور جو ملے اسے لے کر خاص طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں۔ مومن اور عارف کے انتقال کے کچھ ہی عرصے بعد ۱۸۵۲ء میں تفتہ کے نام خط میں وہ بچوں کی سی شادمانی کے ساتھ انھیں مطلع کرتے ہیں/ "قرض متفرق سب ادا ہوا، بہت سبک دوش ہوگیا۔ آج میرے پاس سینتالیس نقد بکس میں اور چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔۔۔ الحمد للہ علیٰ احسانہٖ۔"

لیکن ایسی جولانی کے مظاہروں میں اب بہ تدریج کمی آتی ہے اور غالب رفتہ رفتہ سمجھ جاتے ہیں کہ ان کی زندگی کا بہترین دور ختم ہوا اور زوال کا ناگزیر دور شروع ہوچکا ہے۔ ان کا ذہن اب موت کے سوال کی طرف بار بار متوجہ ہوتا ہے کہ انھیں اور کتنے دن جینا ہے اور وہ اور کتنے دن تصنیف کا کام جاری رکھ سکیں گے۔

۱۸۵۴ء میں اس امر کا بھی علم ہوگیا کہ انگریزوں کا ارادہ برائے نام مغل بادشاہ کے اختیارات میں مزید قطع برید کا ہے۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ کا الحاق کرلیا۔ اسی سال مغل ولی عہد مرزا فخرالدین کا انتقال ہوا۔ غالب ان دو ذرائع سے اپنی آمدنی سے محروم ہوگئے۔ مغل بادشاہ کے مستقبل کے غیر یقینی ہونے کی صورت حال اور بھی زیادہ تشویش کا باعث تھی۔ حالات روز بہ روز بدتر اور ڈراؤنے ہوتے جارہے تھے۔ غالب فکر مند تھے کہ ان کے شاگرد ولی عہد مرزا فخرالدین کی موت کے بعد مغل دربار سے ان کا تعلق بادشاہ کی زندگی تک ہی یقینی تھا۔ بہ ظاہر مرزا فخرالدین سے غالب کے تعلقات نہایت مخلصانہ تھے۔ مقررہ تنخواہ کے علاوہ شاہ زادے کی طرف سے غالب کے پوتوں (یعنی عارف کے دو بیٹوں) کی میوہ خوری کے لیے ماہانہ دس روپیہ بھی ملتے تھے۔ اب یہ آمدنی بھی بند ہوگئی۔

لیکن اگر غالب کو معلوم ہوتا کہ ۱۸۵۷ء کی اتھل پتھل میں جلد ہی روزمرہ کی زندگی کے یہ چلنے پھرتے نشیب و فراز کتنے بے حس ہونے والے ہیں تو وہ ان چھوٹے نقصانوں پر فکر مند بالکل نہ ہوتے۔ اس روح فرسا واقعے کے بعد وہ اور بھی کئی سال جییں گے اور دیکھیں گے کہ کیسے ان کی اپنی آنکھوں کے سامنے وہ سارا تاریخی نظام، جس سے اور صرف جس سے ان کی شاعرانہ معنویت اور زندگی کے تقاضوں سے مناسبت کی حامل تھیں، بہ تدریج شکست و ریخت کے عمل سے گزرتا ہے۔ نہ ہی غالب، نہ ہی ان کا ادب اور نہ ہی وہ تہذیب جو ان دونوں کو ایسے اٹوٹ رشتے میں باندھے ہوئے تھی، کبھی اپنی اصلی حالت کو لوٹ پائیں گے۔

ooo

یوسف میخائلووچ ارانسکی

ترجمہ: اسامہ فاروقی

حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان (وسط ایشیا) ماسکو، ۱۹۷۷ء

حصاری پریا لوگوں کی زبان، ہند آریائی زبانوں کے وسطی زمرے کی ایک بولی

(قسط: ۸)

افعالِ لازم و متعدی، لازم و متعدی افعال والی تراکیب

افعالِ لازم اور افعالِ متعدی والی تراکیب کے مابین حسبِ ذیل بنیادی فرق ہے، فعلِ لازم سے ظاہر ہونے والے عمل کا فاعل جملے میں ہمیشہ فاعلی حالت میں رہتا ہے۔ مثلاً tu kadun ovai? تو کدُن او وئی؟ (تو کب آئے گا؟) اور tu kadun ayo? تو کدن آیو؟ (تو کب آیا؟)۔ فعلِ متعدی سے ظاہر ہونے والے عمل کا فاعل، اگر عمل کا تعلق حال یا مستقبل سے ہو، تو فاعلی حالت میں ہوتا ہے لیکن اگر عمل کا تعلق زمانہ ماضی سے ہو تو یہ فاعل جملے میں آلی فاعلی حالت میں ہوتا ہے اور فعل زمانہ ماضی تمام، تخصیصی کیفیت والے زمانہ ماضی، o-, yo- پر مختتم حالیوں (غیر منصرف ماضی مطلق)، to- اور i- پر مختتم حالیوں کی ہیئتوں اور نحوی تعلق سے کلا و فعلی تمیزی ہیئتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فاعل کی اس آلی فاعلی حالت کا اظہار حسبِ ذیل طریقوں سے ہو سکتا ہے:

(الف) اسم کی غیر فاعلی ہیئت کے ذریعے، جارِ موخر na- (نا) کے اضافے کے ساتھ۔ (ب) ضمائر اشارہ شخصی و استفہامی (kō کوں) اور موصولہ (ju جو) کی غیر فاعلی ہیئتوں کے ذریعے، جارِ موخر na- (نا) کے اضافے کے ساتھ اور (ج) ضمائرِ شخصی کی آلی فاعلی ہیئتوں کے ذریعے۔ موازنہ کریں: fadira me ayi -pare -xatra xat likūi فیدا مے ائی پرے خاطرا خط لکوں ئی (کل میں / فاعلی ہیئت / اپنی ماں کو خط لکھوں گا) لیکن minja kalla aba -pare -xatra xat likʰo منجا کلا ابا پرے خاطرا خط لکھو (کل میں نے / آلی فاعلی ہیئت / اپنے باپ کو خط لکھا)۔ tinja pâcâ -para rayam na -kayo, a m(e)re -pare tu rayam kovai? تن جا پاچا پرا رحم نہ کایو، امرے پرا تو رحم کووَے؟ (تو نے / آلی فاعلی ہیئت / پادشاہ پر رحم نہ کھایا / بھلا / مجھ پر تو / فاعلی ہیئت / رحم کھائے گی؟)... اسی طرح me ayo مے آیو (میں آیا) لیکن minja maryo منجا ماریو (میں نے مارا)۔ tu ayo تو آیو (تو آیا) لیکن tinja maryo تن جا ماریو (تو نے مارا)۔ ō ayo او آیو لیکن us -na maryo اس نا ماریو (اس نے مارا) (یہاں فاعل کے زمانہ ماضی میں آلی فاعلی ہیئت میں استعمال کے لیے جملے میں مفعول اول کی موجودگی ضروری نہیں ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے فعل کا متعدی ہونا کافی ہے)۔ چناں چہ اس لحاظ سے بعض ایسے افعال کو جو مفعولِ اول کے ساتھ استعمال نہیں ہوتے متعدی ماننا پڑتا ہے اور ان کا فاعل مذکورہ، صدر مواقع پر آلی فاعلی ہیئت میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً:

(الف) بعض افعال متعلق بہ حواسِ خمسہ: Karamai -na ... sunyo کرمائی نا... سنیو (کرمائی نے سنا)۔

(ب) "بولنے" ، "گفتگو کرنے" ، اور "سوچنے" ، "غور کرنے" کا مفہوم رکھنے والے افعال : minja kalla kabxoz, un -nala (میں نے کل اجتماعی کمیٹی کے صدر سے بات کی) ، rayis -nala gal karo مِن جاکلا کمُوز رئیس نلا گل کرو (میں نے ۔۔۔ گل کرد (انھوں نے کل ۔۔۔ بات کی) ، is Karamai -na kiyo ke... اِس کرمائی نا کیو کہ ۔۔۔ (اِس کرمائی نے کہا کہ ۔۔۔) ۔ ganji -na pašta balayó گنجی نا پشتا بلایو (گنجی نے پیچھے سے آواز دی) ۔ minja hiyal karo مِن جاہیال کرو (میں نے خیال کیا) وغیرہ ۔ (مکالموں ، حکایتوں وغیرہ میں بار بار دہرائے جانے کی صورت میں فعل kiyo کیو (کہا) حذف بھی کیا جاسکتا ہے ۔ تاہم فاعل کی آلی ہیئت برقرار رہتی ہے : Bibi -Rabia -na : "me hor ruti ni" بی بی رابعہ نا : "مے ہور روتی نی" (بی بی رابعہ نے / کہا / : "میں اور نہیں روؤں") ۔ Karamai -na : Pataxan, pâšâ-ko bet-mar giyo" کرمائی نا : "پتے خان ، پاشا کو بیٹا مرگیو" (کرمائی نے / کہا / : "پتے خان / فتح خان / ، پادشاہ کا بیٹا مرگیا") ۔

(ت) متعدی فعل پر مشتمل مرکب افعال : minja deval -mata xez máryo مِن جادیوال متا خیز ماریو (میں نے دیوار پر سے چھلانگ لگائی / میں نے دیوار پھلانگی) ۔ mere kōre -na isi dajra -parta xez mar kéta longo مرے کوڑے نا اسی دَریا پرتا خیز مار کیتا لانگو (میرے گھوڑے نے اس دریا کو پھلانگا / کود کر پار کیا) ۔ kota -na tōr kayó کوتانا تور کایو (گدھا بھڑکا ۔ لفظی ترجمہ : گدھے نے بھڑک کھائی) ۔ dumbun -na bi...tōr kayo دُنبن نابی ۔۔۔ تور کایو (بھیڑیں بھی ۔۔۔ بھڑکیں) ۔ minja... palo kayo مِن جا ۔۔۔ پالو کایو (میں نے ۔۔۔ سردی کھائی / پالا کھایا) وغیرہ ۔ ان جملوں میں فاعل کے آلی ہیئت میں استعمال کی وجہ مرکب افعال کے جزو کی حیثیت سے متعدی افعال mar- مار (مارنا) اور ka- (k a-) کا (کھا) بہ معنی کھانا کی موجودگی ہے ۔

(ث) افعال na- نا (نہانا) ، mut- مُت (موتنا) ، rō- رو (رونا) ، hag- ہگ (ہگنا) : minja ābe nayo مِن جا آبے نایو (میں نے ابھی غسل کیا / میں ابھی نہایا ہوں) ۔ miya muto مِیامُوتو (میں نے پیشاب کیا) ۔ minja hago مِن جاہگو (میں نے پاخانہ کیا) ۔ Ibrâyim -na runio ابرائیم نا رنیو (ابراہیم نے آنسو بہائے / ابراہیم رویا) ۔

بعض افعال بہ یک وقت فعلِ متعدی اور فعلِ لازم کے مفہوم کے حامل ہوسکتے ہیں ۔ مثال کے طور پر mar- کے مختلف مفاہیم کا موازنہ کریں : minja us-ta maryo مِن جا اُس تا مریو (میں نے اس کو مارا) اور ساتھ ہی ساتھ kiljo marái کِلجو مرائی (دل دھڑکتا ہے) ، almasak marái اَل مَسک مرائی (بجلی چمک رہی ہے) ۔

بعض افعال بہ یک وقت متعدی اور دو چند متعدی (سببی) مفہوم کے حامل ہوسکتے ہیں اور (الف) خود فاعل کے کیے ہوئے کاموں اور (ب) فاعل کی مرضی سے کسی دوسرے شخص کے کیے ہوئے کاموں کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ مثلاً افعال paka- پکا (پکانا) ، pun- پُن (ہونا) : an-ta pakovai اَن تا پکوائی (ہم پلاؤ پکائیں گے) ، ham... gad(t)puna ہم ۔۔۔ گشت پُنا (ہم نے گوشت بھونا) اور ساتھ ہی ساتھ an pakayo, gašt puno اَن پکایو ، گشت پُنو (میں نے / پلاؤ / پکایا / گوشت بھونا) (یہ جملہ ضیافت کرنے والے میزبان کا ہے کہ کھانا خود اس نے نہیں بلکہ اس کے ملازمین نے پکایا تھا جن کی خدمات اس نے اس موقع پر اجرت پر حاصل کی تھیں) ۔ اسی طرح ان دو جملوں کا موازنہ کریں : batan -pari -ta sun(a)at karé, [illegible]

(میں نے [illegible] کو ... اُستاد کا ... ساتھ ... اُستاد کو ... بہت محنت کی) [illegible] -ta lahyo ...

[illegible] کے گیا ... اُستاد کا بہت زیادہ قدر کی)۔

[illegible] فعل لازم کے ساتھ -ta (۳) [illegible] بھی ہو سکتے ہیں۔ ان صورتوں میں ایک مفعول اول کے ساتھ اور [illegible] باچا

[illegible] pâčâ -na ma-pari-ko [illegible] raku čo پاچا مائن پری کو... گل ڈرکے چ

[illegible] ہات [illegible] hat -[illegible] -ta karkani? (اپنے بادشاہ کے ساتھ کیا کیا؟)۔

اگر [illegible] متعلق [illegible] ماضی کے [illegible] کرنے [illegible] فعل [illegible]

[illegible] استعمال ہوتی لیکن ان میں سے ایک متعدی اور دوسرا لازم [illegible] فاعل کی بیست میں بھی استعمال ہو سکتا ہے اور

[illegible] Karmâi -na... ayó, Bibi -Rabia -ta piŝná -[illegible]yo کرماں نے ... آیو، بی بی رابعہ تا

(کرماں ... آیا / اور اس نے / بی بی رابعہ سے سوال کیا)۔ jatkan -[illegible]a ruti -ta k^hako' ute' جٹکن [illegible] تا

[illegible] (لڑکے [illegible] نکلے)۔ us-ki golo-na ayó, Purdulxan -ta máryo اس کی گولے نے آیو، پُردل خان تا

[illegible] (اس کی گولی آئی، پُردل خان کو ڈھیر کر دیا)۔ [illegible] īyw'āki traktris -ko qurs -ta tamām karo' میں یا [illegible]

[illegible] کو قُرس تا تمام کرو (میں نے یہاں آکر ٹریکٹر چلانے والوں کا کورس تمام کیا)۔ (اوپر کی تمام مثالوں میں فاعل کل فاعلی

[illegible] استعمال ہوا ہے)۔ ان کا موازنہ ذیل کی مثالوں سے کریں جہاں فعلی تراکیب میں فاعل فاعلی بیست میں استعمال ہوا ہے:

ganji utí, kore -ta sat... (لایا / چرا / گھلیں / جاکے ... میں) ... me... [illegible]

(گنجی اٹھی، گھوڑے کو سات پیالے دودھ ... دیا) piyalá [illegible] گنجی اٹی، کوڑے تا سات پیالے ... وٹے او

ō bazar -a giyo, bakar ga [illegible] او بزا گیو، بکر گا لِنے او (وہ بازار گیا، عمدہ گائے لی / خریدی) وغیرہ۔

اکثر [illegible] استعمال میں بے قاعدگی بھی مشاہدے میں آتی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل جملوں میں افعال متعدی کے

ساتھ [illegible] استعمال کا جائزہ کریں: is pâčâ -na sare tinbisi kuče tara c^ho اس پاچا نہ سرے تن بیس کچو تا چھو

(اس بادشاہ کے پاس ستر کتے تھے / یہ بادشاہ ستر کتے رکھتا تھا) (فاعل کل فاعلی بیست میں) اور ساتھ ہی ساتھ pâčâ dú ran

[illegible] (بادشاہ کے دو بیویاں تھیں / بادشاہ دو بیویاں رکھتا تھا)۔ pâčâ tin beta tarai čo پاچا تن بیٹا

(بادشاہ کے تین بیٹے تھے / بادشاہ تین بیٹے رکھتا تھا) (فاعل فاعلی بیست میں)۔ ma diya -ta lagiyo مے دیا تا لگیو

(میں نے دیا جلایا / چراغ جلا) (فاعل فاعلی بیست میں) اور miŋa diya -na karasin -ta satyo مِنا دیا نا کراسین تا ستیو (میں

نے دیے / چراغ میں کیروسین ڈالا) (فاعل کل فاعلی بیست میں)۔ مندرجہ ذیل جملوں میں افعال لازم کے ساتھ فاعل کے استعمال

کا مطالعہ کریں: me nir -mita uto' مے نیر متا اُٹو اور minja nir -mita ute من جانہ نیر متا اُٹو (میں نیند سے ... اٹھا)

(جہاں پہلے جملے میں فاعل فاعلی بیست میں اور دوسرے جملے میں کل فاعلی بیست میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح ... کا بھی

مطالعہ کریں: mo(h)mon -a -ana ayo ... (مہمان ... آئے) جہاں فعل ... (۲) ... کے ساتھ ... لازم فعل

... استعمال کے ... فاعل کل فاعلی بیست میں استعمال ہوا ہے۔

کل فاعلی یا ساختی تراکیب بر شمالی ہندوستانی، مشرقی پنجابی، سرائیکی، سندھی، گجراتی وغیرہ ... [illegible]

ال میں / تمام ہند آریائی اور مشرقی ایرانی کے برخلاف زبانِ پریا میں فاعلی ترکیب [illegible] شخص کی ہی میں فعل فعل متعدی متعلق
ل طور سے مطابقت رکھتا ہے۔ زبانِ پریا میں کئی صورتوں میں فعل واحد مذکر کی صورت میں استعمال ta ہے، -ta vazir
dyak وزیر کا دیا کیو (/ بادشاہ نے / وزیر کو بھیجا)۔ minja ta-ta maryo میں تا تا مریو (میں نے مجھے مارا) minja
یک بیٹیا تا پانی کریو (کس نے ایک لڑکی کو پکڑا)۔ yek bitya -ta pani ka ... minja naki rani kʰayo میں نے پانچ کل
(میں نے سوکھی روٹی کھائی)۔ tija kʰayo? تجا کھایو؟ (تو نے / تم / کھایا؟) us -na kiyo اس نے کیو (اس نے
ham -na cai piyo ہم نا چائے پیو (ہم نے چائے پی)۔ abo -mare -na kia vasiyat kare co? ابو مرے نے کیا وصیت کرے چو
کرے چو؟ (ہمارے باپ نے کیا وصیت کی تھی؟)۔ us -ki sali -ta minja kare co اس کی سالی تا میں کرے
نے اس کی سالی سے شادی کی) وغیرہ۔ (استمراری حیثیت ایک کلا کی ہے جس میں فعل کی مخصوص کیفیت والی صورت زیادہ
استعمال ہوتی ہے: Bibi -Rabia -na sar -par, ta' kʰaki karti lagi še بی بی رابعہ نا سر پر تا کنگھی کرتی لگی
بی بی رابعہ / اس وقت / بالوں میں کنگھی کر رہی تھی)۔ ......

[illegible]

ہند آریائی وغیرہ۔ الفاظ کے علاوہ زبانِ پریا میں تاجک الفاظ کی خاصی قابلِ لحاظ تعداد اور اسی طرح ازبک، افغانی (پشتو) اور
سے مستعار الفاظ شامل ہیں۔

زبانِ پریا میں اساسی حیثیت ہند آریائی الفاظ کو حاصل ہے۔ اور گو کہ بہ لحاظ تعداد یہ الفاظ شاید اس زبان کے پنجم [illegible] وغیرہ
نصف سے بھی زائد نہ ہوں لیکن اپنی اہمیت اور تواتر استعمال کے اعتبار سے یہی اساسی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان میں حسب
الفاظ شامل ہیں:

(۱) تمام ضمائر... ضمائرِ شخصی (me مے / میں /، tu تو / تو /، ham ہم / ہم /، tam تم / تم /)، شخصی ضمائر
ya یا / یہ / u او / وہ واحد اور جمع دونوں مفاہیم میں)، yo یہ (وہ، مرکب کے مفہوم میں)، ضمائرِ شخصی متعلقی
muro مرو / میرا /، turo تُرو / تیرا /، maro مرو / ہمارا /، taro تَرو / تمہارا / وغیرہ)، ضمائرِ استفہامی (koi? کوئی؟
ka? کا؟ / کیا؟)، ضمائرِ موصولہ (ju جُو / جو /) اور ضمائرِ تاکید منضمر (so / سو، so- سو- جیسی صورتیں [illegible]
ان کا ...)۔

(۲) تمام اعداد ایک سے سو تک (دیکھیے جدول ۳)۔

(۳) تمام بنیادی افعال [illegible] kar- کر (کرنا)، ho- ہو (ہونا)، tar- [illegible] dek- دیکھ
[illegible] (لینا)، a- آ (آنا)، ja- جا (جانا)، mar- مر (مرنا) ...
جنم (پیدا کرنا) [illegible] kʰa- کھا (کھانا)، pi- پی (پینا)، bol- بول (بولنا)، ... us- اٹھ
[illegible] pugar- ...
[illegible] بیٹھ ... طرح
[illegible] وغیرہ۔

افعال kar- (کر)، ho- (ہو)، de- (دے)، le- (لے)، ja- (جا)، mar (مر)، k'a- (کھا) وغیرہ کی مدد سے متعدد مرکب افعال تشکیل پاتے ہیں۔ جو کہ چوں کے طور سے ظاہر ہو کر اپنی اصل کے اعتبار سے مختلف نوعیت کے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔ زبان کے افعال کا ذخیرہ تعداد کے اعتبار سے، بڑی حد تک انھیں مرکب افعال پر مشتمل ہے۔ gum kar- گم کر (گم کرنا، کھونا)، vasiyat kar- وصیت کر (وصیت کرنا)، sust kar- سست کر (ڈھیلا کرنا)، gal kar- گل کر (بات کرنا)، [illegible] kar- [illegible] کر (چوری کرنا)، k'aki kar- کھکی کر (کنگھی کرنا)، piŭna kar- پچھا کر (پوچھنا، سوال کرنا)، jor ho- جوڑ ہو [illegible] ([illegible])، gum ho- گم ہو (گم ہونا، کھو جانا)، xez mar- خیز مر (پھلانگنا، کود کر پار کرنا)، palo k'a- پالو کھا (سردی کھا جانا، ٹھنڈ لگ جانا)، ratam k'a- رتم کھا (رحم کھانا) وغیرہ۔

(۴) اہم ترین اسمائے صفت اور حروفِ تمیز، bor(r)o بوڑو (بڑا، بلند)، nuko نکو (چھوٹا)، ancu انچو ([illegible])، moto موٹو (موٹا)، patulo پتلو (دبلا، پتلا)، bago بگو (سفید)، kalo کلو (کالا)، pij پیج (گیلا، بھیگا)، suko سکے (سوکھا)، haco ہچو (اچھا)، sac سچ (سچا، درست)، cut / cŭt چٹ، چھٹ ([illegible])، gaban / gabã(n) گبان، گبیں (گابھن، حاملہ)، ac / ac̃ آچ، آنچ (آنچ)، kala کلا (کل)، fer فر (پھر، دوبارہ)، bat / bŏt بہت (بہت)، unya انیا (وہاں)، (n)ya [illegible] (یہاں) وغیرہ۔

(۵) ذخیرہ الفاظ کے قدیم ترین، مگر انتہائی مختصر حصے پر مشتمل اہم ترین اسمائے ذات:

(الف) جسم کے اعضاء و جوارح کے نام: hat ہت (ہاتھ)، per پیر (پیر، پاؤں)، ank انک (آنکھ)، nak ناک (ناک)، mo مو (منہ)، kan / kân کن، کان (کان)، bâl بال (بال)، dân / dan دان، دن (دانت)، mato متو (ماتھا)، ut / ũt اوٹھ، انٹھ (ہونٹ)، jip جیپ (زبان، جیبھ)، todi ٹوڈی (ٹھوڑی)، dari داڑی (داڑھی)، muc مچ (مونچھ)، hadi [illegible] ([illegible])، pepuro / pep'ro پپڑو (پھیپھڑا)، atri اتری (انتڑی)، cici چیچی (چھاتی، چوچی)، baki / bak'i [illegible]، kilojo کلجو (دل، کلیجہ)، pet پیٹ (پیٹ)، mangar منگر (پیٹھ، پشت)، ungli انگلی (انگلی)، ungutu انگٹھ (انگوٹھا)، nuk نک (ناخن)، talva تلوا (تلوا)، kuni کنڑی (کہنی)، jamu جنو (گھٹنا)، pedi [illegible] (گھٹنا) وغیرہ۔

(ب) جانوروں، چڑیوں، مچھلیوں اور کیڑوں مکوڑوں کے نام: bakari بکری (بکری)، bald / bal بلد، بل (بیل)، gai گائی (گائے)، dumbo ڈمبو (بھیڑ، دنبہ)، bor(r)o [illegible]، [illegible] (گھوڑا)، ut انٹ (اونٹ)، kuto کتو (کتا)، kuturungo کترنگو (پلا، کتے کا بچہ)، bil(l)i بلی، بلی (بلی)، muso ([illegible])، gidiri گیدڑی (گیدڑ)، pegar پیگر (بھیڑیا)، mac'i مچھی (مچھلی)، kukara ککڑا (مرغ)، kukuri ککڑی ([illegible])، ciri / ciri چڑی، چڑی (چڑیا، گوریا)، ju جوں (جوں)، kira کیڑا (کیڑا)، mak'i مکھی (مکھی) وغیرہ۔

(ت) قدرتی اشیاء و مظاہر اور دن رات کے مختلف اوقات وغیرہ کے نام: ak / ãk اک، آک (آگ)، pani / pãni پانی، پانڑی (پانی)، patar / patar پتر ([illegible])، [illegible]ar، kas / kãs کس، کاس (گھاس)، indar اندر (اندر، آسمان)، c'ar / c'ãr چھر، چانر (چاند)، [illegible]dal [illegible]

بل (بادل) ، mi مِی (بارش، مینہ) ، grazás گرزاس (گرج) ، tup / tup ٹپ، ٹُپ (دھوپ) ، cãn / cãn چان، چاں
چاند) ، din دن (دن) ، rãt / rat رات، رت (رات) ، daper ڈپر (دوپہر) وغیرہ۔

(ث) گھر اور اس کے مختلف حصوں، گرہستی کی چیزوں، غذائی اشیا، پھل، لباس وغیرہ کے نام۔

kar / kãr کر، کار (گھر) ، biyo بیو (چوبارہ) ، culo چلو (چولہا) ، diya دیا (دیا، چراغ) ، bati بتی (بتی،
فتیلہ) ، handi ہنڈی (ہانڈی، دیگ) ، kundi کنڈی (رکابی، کٹورا، مشقاب) ، kara کڑا (کڑاہ) ، undeli (کڑھائی) ،
caru / cãru چڑو، چاڑو (جھاڑو) ، c'uri چھُری (چھری، چاقو) ، damri دمری (دوسل) ، karank کرنک (کچھن، کنگھا) ،
caval چاول (چاول) ، gona گونڑا (دھان کی بالی) ، rũ ریں (روئی) ، ato / atõ آٹو (آٹا) ، runi رونی (روٹی) ، an
آن (پلاؤ، بھات ؟) ، kanji کنجی (شوربا، کانجی) ، ando انڈو (انڈا) ، non نونڑ (نمک، لون) ، dut دُت (دودھ) ، dai
دہیں (دہی) ، ca / cã چا (چائے) ، jiti جتی (جوتی) ، raso رسو (رسّی) ، tago تگو (تاگا) ، sũi سُوئی (سوئی) ، bali /
bãli بلی، بالی (آستین) ، k'aki کھکی (کنگھی) ، minya منڑیا (پوت، مالا، منکا) وغیرہ۔

(ج) جنس اور عمر کی صراحت کرنے والے الفاظ، رشتے داری اور قرابت کی اصطلاحات:

anmi انمی (آدمی، مرد) ، ran رن (عورت) ، jatak جتک (بچہ، بال بچہ، لڑکا، لڑکے) ، mundo مُنڈو (لڑکا،
نوجوان) ، bitiya بِٹیا (لڑکی) ، budo بُڈو (بوڑھا) ، budi بڈی (بوڑھی) ۔ ذیل میں رشتے داری اور قرابت کی بنیادی اصطلاحات
کی فہرست دی گئی ہے (بعض تابک سے مستعار اصطلاحات بھی فہرست میں شامل ہیں۔ ان کی نشان دہی قوسین میں کر دی گئی ہے)۔

جدول نمبر (۱)

رشتے داری یا قرابت	پریا اصطلاح: اسم عام	پریا اصطلاح: تخاطب	رشتے داری یا قرابت	پریا اصطلاح: اسم عام	پریا اصطلاح: تخاطب
دادا، نانا	aba, budo aba, bovo		بھائی	پئی pai	پئی pai
	ابا، بُڈو آبا، بوو (تابک)		بڑا بھائی	دا da، دادا dada(?)	دا da
دادی، نانی	بُڈئی budayi	بُڈئی budayi	چھوٹا بھائی	پئی pai	پئی pai
باپ	آبا، دا aba, da	آبا، دا aba,da	بڑی بہن	جی ji	
ماں	آئی ayi, aya, ma, ji	ayi, aya, ji,	چھوٹی بہن	پنڑ pen	پنڑ pen
	آیا، ما، جی	آئی، آیا، جی	شوہر	مُرس murs	
بیٹا	بیٹا beta	بیٹا beta	بیوی	رن ran	
بیٹی	بِٹیا bitiya, bita, ti		سسر (بیوی کا باپ)	سسرو susro	
	بِٹا، تی		سسر (شوہر کا باپ)		
پوتا، نواسا	پوتو poto		ساس (بیوی کی ماں)	سسو sasu	
پوتی، نواسی	پوتی poti		ساس (شوہر کی ماں)		
پڑپوتا	[illegible] doto				

[illegible] (۲)

رشتے داری یا قرابت	پہاڑی اصطلاح: اسم عام	پہاڑی اصطلاح: تخاطب
بیبی (بھائی کی بیوی)	بَے bay	
[illegible]	جھنی، جھنی jai(n)	
بڑے بھائی کی بیوی، بھابھی	پبی pabi	pabi پبی
چھوٹے بھائی کی بیوی، بھابھی	بَے bay	
" "	پاواچ pāwāc	
بڑی بہن کا شوہر، بہنوئی	jai(n), yazná جھیں، یزنا (تانیث)	
چھوٹی بہن کا شوہر، بہنوئی	" "	
بڑے بھائی کا بیٹا، بھتیجا	پتیجو patijo	
چھوٹے بھائی کا بیٹا، بھتیجا	" "	
بڑی بہن کا بیٹا، بھانجا	پاں جو، پانجو pã(n)jo	
چھوٹی بہن کا بیٹا، بھانجا	" " "	
بڑے بھائی کی بیٹی، بھتیجی	پتیجی patiji	
چھوٹے بھائی کی بیٹی، بھتیجی	" "	
بڑی بہن کی بیٹی، بھانجی	پاں جی، پانجی pã(n)ji	
چھوٹی بہن کی بیٹی، بھانجی	" " "	
ماں کا بڑا بھائی، ماموں	ماما mâma	
ماں کا چھوٹا بھائی، ماموں	" "	
ماں کی بڑی بہن، خالہ	مَسی، مَسّی mas(s)i	
ماں کی چھوٹی بہن، خالہ	" " "	
باپ کا بڑا بھائی، چچا	چاچا، لالا čāčā, lālā	
باپ کا چھوٹا بھائی، چچا	" " " "	
باپ کی بڑی بہن، پھوپھی	پُھی pui	
باپ کی چھوٹی بہن، پھوپھی	" "	
ماں کے بڑے بھائی کی بیوی، ممانی	مامی māmi	
ماں کے چھوٹے بھائی کی بیوی، ممانی	" "	
باپ کے بڑے بھائی کی بیوی، چچی	پبی، چاچی pabi, čāči	pabi پبی
باپ کے چھوٹے بھائی کی بیوی، چچی	" "	
باپ کی بڑی بہن کا شوہر، پھوپھا	jai(n), masan, yazna	
باپ کی چھوٹی بہن کا شوہر، پھوپھا	جھیں، مَسَن، یزنا (تانیث)	

رشتے داری یا قرابت	پہاڑی اصطلاح: اسم عام	پہاڑی اصطلاح: تخاطب
ماں کی بڑی بہن کا شوہر، خالو	masi -ko mura مسّی کو مُرو	
ماں کی چھوٹی بہن کا شوہر، خالو	"	
بھائیوں کی بیویاں (آپس میں)	دُرانی durani	
بہنوں کے شوہر (آپس میں)	بجو، بوجا (تانیث) bajo / boja	
سمدھی (آپس میں)	کدو کدو (") kudo- kudo	
سالی	سلی sali	
سالا	سلو salú	
شوہر کا بھائی، دیور، جیٹھ	دیوار devár	
سوتیلا باپ	اُگو ابا ugo aba	
سوتیلی ماں	ugi ayi, ugi ma اُگی آئی، اُگی ما	
سوتیلا بیٹا	اُگو بیٹا ugo beta	
سوتیلی بیٹی	اُگی تی ugi ti	
دولہا	لاڑو laro	
دلہن	لاڑی lari	
منگیتر	man(g), man من، منگ، منتر	
رنڈوا	رنڈو ran'do	
بیوہ، رانڈ	رنڈی ran'di	
سوتیلا بھائی	پئی پگرنو pai puguno	
سوتیلی بہن	پینہ پگرنو pen puguno	

پریا۔ تاجیک مکمل دو لسانیت کے حالات میں زبانِ پریا میں مستعمل تاجیک الفاظ کی تعداد عملاً غیر محدود ہے (یہاں تاجیک الفاظ سے مراد بلالحاظ ماخذ، بہ شمول عربی، ترکی اور روسی وغیرہ سے مستعار وہ تمام الفاظ ہیں جو تاجیک زبان میں مستعمل ہیں اور ۱۹۵۴ء میں شائع شدہ تاجیک روسی لغت میں شامل ہیں)۔ اس کتاب میں پیش کردہ متون اور مکالموں کے تاجیک ذخیرہ الفاظ کی مقدار اور نوعیت بیشتر گفتگو کرنے والے کی شخصیت، عمر، تعلیم، تجربے اور ان حالات پر منحصر ہوتی ہے جن میں انھیں درج کیا گیا ہے... تاجیک ذخیرہ الفاظ کا قابلِ لحاظ حصہ ان الفاظ پر مشتمل ہے جن کا تعلق زراعت اور کھیتی باڑی (کاشت کاری، باغ بانی، ترکاری کی کاشت، مویشی پالنے)، دست کاریوں، گھر اور اسباب خانہ داری، مذہب، ثقافت، علم، تعلیم وغیرہ سے ہے: arzan ارزن (باجرہ، کودوں وغیرہ، موٹا اناج)، naxut نخت (مٹر، نخود)، brinj برنج (چاول، برنج)، čigit چگت (بنولہ)، ǰozapoya غوزا پویا (کپاس کا ڈنٹھل اور شاخیں)، jav جو (جَو)، meva میوا (میوہ، پھل)، gelas گیلس (چیری، گلاس)، badrin بدرن (ککڑی، کھیرا)، čanak چنک (کنگھا، پیلی)، ispor اسپور (ہل)، asiya آسیا (چکی، آسیا)، aroba اروبا (بیل گاڑی، چھکڑا)، juya جُیا (ہل جوتنے سے لکیر، کیاری)، ai.ir آئیر (ناگھیرا)، havli حولی (کسان کا گھر، کھیت مع مکانات)، bâm بام (چھت)، xišt / xist خشت، خِشت (اینٹ)، ǰalber غلبیر (چھلنی، غربال)، gilim گلم (بغیر روئیں کا قالیچہ، پلاس)، arra / arrō ارا، ارّو (آرہ)، tavar تور (کلہاڑا، تیشہ، تَبَر)، anbur انبر (چمٹا)، čuyan چوین (کچا لوہا)، dars درس (سبق، درس)، maktab مکتب (اسکول، مکتب)، daftar دفتر (کاپی، دفتر)، dâru دارو (دوا، دارو)، idare ادارے (دفتر، ادارہ)، jamaa جما (دیہی سوویت)، darya دریا (دف، دائرہ)، dutar دتر (دوتارا)، harâm حرام (حرام، شریعت کی رو سے) وغیرہ۔

حصاری پریا کی زبان کے ذخیرہ الفاظ میں بڑی تعداد میں تاجیک الفاظ کی موجودگی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ تمام الفاظ زبانِ پریا میں زمانۂ حال ہی میں وسطی ایشیا کی سرزمین پر مستعار لیے گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی ہی سے تاجیک (یا فارسی) الفاظ شمال مغربی ہندستان کی زبانوں میں بڑے پیمانے پر داخل ہونے شروع ہوئے اور اب بھی ہندستانی اور اس علاقے کی دوسری ہند آریائی زبانوں کے ذخیرہ الفاظ کا قابلِ لحاظ حصہ ان پر مشتمل ہے۔ افغانستان میں، جس کی سرزمین سے حصاری پریا لوگوں کے نقلِ مکان کے راستے گزرتے تھے، فارسی تاجیک بولیوں کا رواج کافی ہے۔ اس طرح سے بسا اوقات اس سوال پر کافی بحث کی گنجائش رہتی ہے کہ تاجیک ذخیرہ الفاظ کے مختلف عناصر کس زمانے اور کس علاقے میں زبانِ پریا میں مستعار لیے گئے۔ (تاہم تاجیک اہلِ زبان کے برخلاف بہت سے تاجیک / فارسی الفاظ کے بے زور مصوتے "o" (او) کی پریا میں "a" (اَ) کی حیثیت سے ادائگی اس بات کا اشارہ ہے کہ تاجیک / فارسی الفاظ اس گروہ نے وسطی ایشیا کو نقلِ وطن سے قبل ہی غالباً سرزمینِ افغانستان پر اپنا لیے تھے)۔ صرف مقامی تاجیک الفاظ اور اسی طرح روسی (یا بین الاقوامی روسی) الفاظ کی حد تک وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ حصاری پریا میں وسطی ایشیا کی سرزمین پر اور حالیہ زمانے میں داخل ہوئے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ پریا گروہ کے بہت سے مرد ازبک زبان بھی کافی روانی سے بولتے ہیں۔ تاہم ازبک ذخیرہ الفاظ کے عناصر کی تعداد ان لوک کہانیوں اور مکالموں میں جو ہم یہاں پیش کر رہے ہیں نسبتاً کم ہے: el ایل (ہم قبیلہ)، ov / ow او (شکار، آہو، ہرن)، balačaqa بالا چقہ (بال بچے، اہلِ خاندان)، yau یو (دشمن) وغیرہ۔

بڑے پریا لوگوں کی بول چال (گفتگو) [illegible] الفاظ یاد ہیں (dodi دادی، sodi [illegible] [illegible]) [illegible] گفتگو میں یہ الفاظ بالعموم استعمال میں نہیں آتے اور [illegible] جاتے ہیں۔

پریا گروہ کے افراد کی گفتگو میں [illegible] تعلیم [illegible] لڑکوں اور لڑکیوں کی گفتگو میں روسی الفاظ بھی اکثر استعمال میں آتے ہیں جو ان زبان میں بول چال کی روسی زبان سے [illegible] تاجیک یا ازبک زبانوں کے توسط سے داخل ہو چکے ہیں۔ [illegible] زندگی [illegible] علم، تعلیم وغیرہ سے متعلق الفاظ [illegible] ہیں۔ اس کتاب میں پیش کیے جانے والے مکالموں میں مختلف روسی الفاظ (اکثر [illegible]) [illegible] رکھ [illegible]

... بیل (بجلی گیس وغیرہ سپلائی کا آلہ)، bugalter بُگلٹیر (محاسب، بک کیپر)، jujur جُجُر (ڈیوٹی والا)، بجلی میٹر (بجلی کا میٹر)، ... سسں، سربل کا نوٹ یا سکہ)، pianino پیانینو (پیانو)، aprabalet آپرابلیت (اوپر اور نیچے کا قمیض) وغیرہ۔

بعض الفاظ کی اصل کا تعین نہیں ہو سکا: valga ولگا (زکام)، zirat زرت (وارث، جانشین)۔ (آں جہانی ڈاکٹر بھولاناتھ تیواری کے خیال میں موخرالذکر لفظ کی اصل "ذریت" ہے۔ — مترجم)

حصاری پریا زبان کے ہند آریائی زبانوں اور بولیوں کے گروہ بندی کے نقشے میں مقام کے تعین کے لیے اس کے ذخیرہ الفاظ کے ہند آریائی حصے کی نوعیت کا مسئلہ فیصلہ کن حیثیت کا حامل ہے۔ تاہم ذخیرہ الفاظ کے اس حصے کا تجزیہ بھی شاید ہی اس سوال کا قطعی جواب دے پائے کہ زیر بحث زبان کا قریب ترین رشتہ کس بولی کے ساتھ ہے۔ بنیادی طور سے دو باتیں اس میں رکاوٹ ڈالتی ہیں: اولاً برصغیر ہندستان کے وسطی اور شمال مغربی علاقے میں بولی جانے والی زبان کے ذخیرہ الفاظ کا کافی حد تک مشترک ہونا اور ثانیاً یہ بات کہ ایسے قلیل التعداد گروہ کی زبان کے ذخیرہ الفاظ نے، جس نے نقل وطن کی پیچیدہ اور طویل راہ طے کی ہے، بے شک مختلف زبانوں اور بولیوں کا اثر قبول کیا ہوگا۔ اس کے باوجود ذخیرہ الفاظ کے شعبے سے بھی زبانِ پریا کی پنجابی، لہندا گروہ کی بولیوں سے قربت کی کچھ دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس صورت میں جب کہ زبانِ پریا میں مطابقے میں آنے والا کوئی لفظ زمانہ موجودہ کی ہند آریائی زبانوں اور بولیوں میں سے متعدد میں نہیں پایا جاتا (بالخصوص ہندستانی میں نہیں پایا جاتا) تو اکثر پنجابی، لہندا گروہ کی بولیوں میں اس سے توافق رکھنے والا لفظ دست یاب ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل الفاظ کا موازنہ کریں: gal گل بہ معنی لفظ، بات، زبان (پنجابی، لہندا gall گلّ)۔ رَن بہ معنی بیوی، عورت (پنجابی، لہندا rann رَنّ)۔ murs مُرس بہ معنی شوہر (پنجابی muns مُنس، ملتانی لہندا muns مُنس، murs مُرس، کھیترانی murs مُرس)۔ mundo- مُنڈو بہ معنی بیٹا، لڑکا (پنجابی munda مُنڈا)۔ mangar منگر بہ معنی پونڈ، پشت (پنجابی magar مگر)، مزید اں مغربی پہاڑی magar مگر، راجستھانی (بے پوری اور میواتی) mangar منگر۔ janú / jānu جنو، جانو بہ معنی گھٹنا (لہندا، کھیترانی jāņu جانڑو، پہاڑی jāņū جانڑو)۔ kʰotā کھوتا بہ معنی گدھا، خر (پنجابی khotā کھوتا، مغربی پہاڑی khotā کھوتا)۔ فعل ku کو بہ معنی مارنا، مار ڈالنا، کاٹنا (پنجابی kuhņā کُہنڑا، لہندا kuhaņ کُہنڑ)۔ فعل lamka- لمکا بہ معنی ٹانگنا، لٹکانا (پنجابی lamkņā لمکنڑا، آوان کاری لہندا lamkuņ لمکنڑ)۔ puri پری بہ معنی چٹائی، بوریا (لہندا phūhrī پھوہری) حرفِ ماقبل مختصر te- تے بہ معنی اور (پنجابی te تے، مغربی پہاڑی te تے)۔

بعض اوقات اس صورت میں جب کہ زبانِ پریا کا کوئی لفظ ہندستانی اور پنجابی، لہندا گروہ کی بولیوں کے بہ شمول عہدِ حاضر کی اکثر ہند آریائی زبانوں اور بولیوں میں پایا جاتا ہے، اس کا سب سے قریبی صوتی اور معنوی توافق پنجابی، لہندا گروہ کے الفاظ ہی سے مطابقے میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل الفاظ کا موازنہ کریں: rũ رُوں بہ معنی روئی (پنجابی rũ رُوں، لیکن ہندستانی rūī روئی)۔ tuni تنی بہ معنی ناف، ڈھنی (پنجابی dhunni, tunni دھنی، تنی، لہندا dhunni دھنی لیکن ہندستانی ṭoḍi, ṭoḍi, ṭũḍi ٹوڑی، ٹونڈی، ٹُنڈی)۔ فعل pagur- پگر بہ معنی پکڑنا (پنجابی pakarna / pagarnā پکڑنا، پگڑنا لیکن ہندستانی pakṛnā پکڑنا)۔ فعل ud- اُڈ بہ معنی اُڑنا (پنجابی uḍḍņā اُڈنا، لہندا uḍḍaņ اُڈنڑ لیکن ہندستانی اُڑنا)۔ فعل sar- / sar- سر، سڑ بہ معنی جلنا (پنجابی sarnā سڑنا، لہندا saraņ سڑنڑ صوتی و معنوی توافق کے ساتھ، لیکن ہندستانی، سڑنا، کے ساتھ معنوی توافق نہیں ہے)۔

صوتیات کے شعبے سے متعلق اس سے قبل پیش کردہ معلومات اور ذخیرہ الفاظ کے شعبے سے متعلق اوپر پیش کردہ حقائق کی بنیاد پر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہند جدید کی ہند آریائی زبانوں اور بولیوں کے زمرے میں حصاری پریا زبان پنجابی، لہندا گروہ کی بولیوں سے خصوصی قربت رکھتی ہے۔

○●○

گیان چند جین

ایک ننھی قندیل

اپندر ناتھ اشک اپنے دور کے بزرگ ترین فکشن نگاروں میں تھے۔ انھوں نے پہلا ناول "ستاروں کے کھیل" ۱۹۳۸ء میں مکمل کیا۔ اس کی تخلیق کے دوران وہ ایک طرف انگارے اور گنبدان سے متاثر ہوئے، دوسری طرف ۱۰/ دسمبر ۱۹۳۶ء کو ان کی پہلی بیوی شیلا تپ دق کا شکار ہوکر وفات پا گئیں۔ اشک کے ادارے سے ۱۹۹۵ء میں ان پر ایک کتاب چہ شائع ہوا۔ اس میں لکھا ہے:

"ان کی پہلی بیوی کی موت ایسا سانحہ ہے جس سے اشک عمر بھر بری نہیں ہوسکے۔ جس نے نہ صرف ان کی زندگی کا رخ بدل دیا بلکہ اسے عمر بھر کے لیے گھائل بھی کردیا۔ بیوی کی موت کا وہ تیر ان کے سینے میں کچھ ایسا گڑا کہ پھر نہیں نکلا۔" (ص ۱۲۰)

ستاروں کے کھیل رومانی ناول تھا۔ ترقی پسند تحریک اور اپنی بیوی کے انتقال کے صدمے کے زیر اثر وہ تخیلیت کو چھوڑ کر حقیقت نگاری کو پسند کرنے لگے۔ ستاروں کے کھیل کو بد دلی سے مکمل کیا اور اس کے بعد اپنے دوست پروفیسر محمد فیاض محمود کے ساتھ بیٹھ کر نو جلدوں کے ناول "گرتی دیواریں" لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ اب یہ سات جلدوں میں ختم ہوتا ہے۔ کئی ہزار صفحوں میں یہ صرف پانچ سال کی داستان ہے۔ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۶ء۔ ان دو حدود کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۳۱ء میں وہ اردو صحافت کے پیشے میں آئے اور ۱۹۳۶ء میں ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔ ناول کا اختتام اسی سانحے پر ہوتا ہے لیکن افسوس تکمیل سے پہلے ہی اشک کا پیمانہ عمر لبریز ہوگیا۔ وہ آخری حصے کے ۱۵ تا ۲۰ باب تحریر لکھے چھوڑ گئے ہیں۔ ہندی میں اس کے چھ حصے شائع ہوگئے ہیں۔

۱۔ گرتی دیواریں ۲۔ شہر میں گھومتا آئینہ ۳۔ ایک ننھی قندیل ۴۔ اور ۵۔ باندھو نہ ناؤ اس ٹھاؤں
۶۔ پلتی دھارا

ساتواں حصہ ابھی نامکمل مسودہ ہے۔ ۱۹۳۹ء کے اواخر سے ۱۹۹۵ء کے اواخر تک یعنی ۵۶ سال میں بھی وہ پانچ سال کی رام کہانی پوری نہ کرسکے۔ اردو میں اس کے پہلے تین حصے شائع ہوئے ہیں۔ گرتی دیواریں ۱۹۴۷ء میں، شہر میں گھومتا آئینہ ۱۹۹۶ء میں اور ایک ننھی قندیل ۱۹۸۹ء میں اس سیریز کے تیسرے حصے، جو ہندی میں ہیں، وہ ابھی [illegible] لیکن چوں کہ سیریز کا ہر ناول ایک دوسرے سے منسلک ہونے کے باوجود آزاد ہے اس لیے ہر حصے کا اپنے طور پر مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ میں الگ سے ایک ننھی قندیل کا جائزہ لیتا ہوں۔

اردو ایڈیشن پر سنہ اشاعت ۱۹۸۹ء درج ہے لیکن اشک نے مجھے اس کا جو نسخہ عطا کیا اس پر تاریخ [illegible] فروری ۱۹۹۰ء درج ہے اس سے مجھے استفادہ ہوا کہ یہ [illegible] میں شائع ہوا۔ اس کا نام [illegible] کے نظم [illegible] سے لیا ہے۔

یوں تو ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
تمتماتی ہوئی شمع سی یہ خودی کی قندیل

بات سچی ہے لیکن اس میں یہ جملہ کھٹکتا ہے کہ دلہن قابلِ دید اور پر شوکت ہوتی ہے جب کہ اس کی شمع سے قندیل کو تمتماتی ہوئی کہنے سے اس کی بے رونقی اور زوال ظاہر ہوتا ہے۔ میں نے تقسیمِ ملک سے پہلے مرادآباد کے ایک مشاعرے میں جگر کے شاگرد رشید مرادآبادی کی غزل کا یہ مطلع سنا تھا۔

جب دل میں شمع جلنے لگتے تو ہوں   سینے میں اس کی یاد چھپائے ہوئے تو ہوں

یہاں بھی سینوں میں شمع روشن کی گئی ہے لیکن یہ مسئلہ جذبہ، عشق کی شمع ہے جب کہ راشد کے ان مصرعوں میں خودی کی قندیل ہے جو عام آدمی کے لیے کم زور اور تمتماتی ہوئی ہی ہونی چاہیے۔ کتاب کے شروع میں فلیپ کی طرح لکھا ہے۔

"قندیل ۔۔ عوام کی خودی کا سمبل، کائنات کے پردے پر اپنی خودی کو منوانے، اسے ایک انفرادی ہستی کے طور پر متعین کرنے کے لیے عام لوگوں کی کوششوں کی احساس بھری تصویر کشی ہے۔"

"اشک نے اپنی ایک کتاب اس زندگی کے نام معنون کر رکھی ہے جو اپنے سکھ دکھ کے باوجود دل چسپ ہے ایک ننھی قندیل اسی زندگی کی تصویر کشی ہے۔ سکھ دکھ بھری، لیکن دل چسپ۔۔۔۔"

ایسی منکسرانہ بات ایک بڑا فن کار ہی کہہ سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان سطور کے خالق خود اشک ہی ہوں گے۔ کتاب کے پیش لفظ میں جو شانِ نزول دی ہے۔ اس میں تخلیق کی فکر انگیزی بھری ہوئی ہے۔ کہتے ہیں۔

"انسان کیوں زندہ رہتا ہے اس کے جینے کی تہہ میں کون سی ترغیبات کام کرتی ہیں، کون سی محرک طاقتیں ہیں جو اس کے توسن عمل کو مہمیز کرتی ہیں۔۔۔ گرتی دیواریں کے پہلے تین حصوں میں انھی محرک طاقتوں سے (جنھیں تین طرح کی بھوک کا نام بھی دیا گیا) بحث کی گئی ہے۔ پہلے دو حصوں میں پیٹ کی بھوک اور سیکس کی بھوک کا ذکر ہے اور سیکس میں محبت کے سبھی شیڈز شامل ہیں اور زیرِ نظر ناول میں انسان کی تیسری اور پہلی دو سے بھی کہیں بڑی خودی کی بھوک کی عکاسی ہے۔۔۔ انسان کی انا اس کی زندگی کی محرک طاقتوں میں سب سے بڑی ہے۔" (ص ۷، ۸)

یہ حقیقت ہے کہ پہلی جلد میں پیٹ کی اور تیسری جلد میں خودی کی بھوک کی روداد ہے زمانی اعتبار سے پہلا اور تیسرا حصہ جزوا ایک دوسرے سے مشترک ہیں۔ دونوں میں ہیرو کی قبلِ کتخدائی کی عطالیات زندگی اور شادی کا ذکر ہے۔ شادی کے بعد پھر وہی معاملت۔

ننھی قندیل اردو میں ۶۸۵ صفحوں کا ناول ہے۔ اس ناول کی باب بندی عجیب ہے۔ اس میں ایک طرف چھ باب ہیں اور دوسری طرف ہر نامہ نہاد باب کے تحت پھر باب جیسے نمبر شمار دیے ہیں۔ اس طرح:

پہلا باب: ۱ تا ۱۰، دوسرا باب: ۱۱ تا ۱۷، تیسرا باب: ۱۸ تا ۲۳، چوتھا باب: ۲۴ تا ۳۲، پانچواں باب: ۳۳ تا ۴۱، چھٹا باب: ۴۲ تا ۴۸۔

اجزا کی یہ دوہری تقسیم عجیب ہے۔ دراصل کتاب میں چھ فصلیں اور ۴۸ باب ہیں۔ ہر فصل میں ایک

بڑا موضوع سمیٹا گیا ہے۔ اس کے ذیلی حصے اسے چھوٹے ابواب میں تقسیم کرتے ہیں۔ ناول کے دو واضح حصے ہیں۔ پہلے میں پنجاب کے اردو اخباروں کے ماحول کا بیان ہے، دوسرے میں ہندی کے ادیبوں کا۔ پہلے حصے میں چیتن مختلف اخباروں کے صحافتی عملے میں کام کرتا ہے اور اردو میں اپنی کہانیوں کا مجموعہ چھپوانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ اس کے بعد قصیدے کی گریز کی طرح وہ اردو سے ہندی کی طرف مڑجاتا ہے۔ ص ۴۳ سے آخر تک ہندی کے شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے قلمی خاکے اور معاملات ہیں۔ ان کے دوش بہ دوش پوری کتاب میں اس کے خانگی مسائل بھی پس منظر بلکہ پیش منظر میں چلتے ہیں۔ اشک کی ابتدائی زندگی کے سب سے بڑے سانحے اور صدمے دو ہیں۔

۱۔ یہ معلوم ہونا کہ ان کی پہلی بیوی کے والد پاگل ہوکر لاہور کے ایک پاگل خانے میں داخل ہیں اور اشک کی ساس اسی کے محلے میں ایک سیٹھ کے گھر میں خادمہ کا کام کر رہی ہے۔ ننھی قندیل میں اس سانحے کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۲۔ دوسرا صدمہ، عظیم دسمبر ۱۹۳۶ء میں ان کی پہلی بیوی کی تپ دق سے موت ہے۔ یہی دونوں صدمے چیتن کو درپیش آتے ہیں۔ افسوس کہ اشک چیتن کی بیوی کی موت کا بیان کرنے سے پہلے خود ہی لقمہ اجل ہوگئے۔ جو ناول ۱۹۳۹ء میں شروع کیا گیا تھا۔ وہ ۵۰ سال گزرنے پر ۱۹۹۰ء کے آخر میں بھی اپنی منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکا۔ اندازاً ۱۵ تا ۲۰ ابواب اور لکھے جانے تھے۔

گرتی دیواریں کے جملہ حصے ہیرو چیتن کے پردے میں خود اشک کی سوانح عمری ہیں، پوری عمر کی نہیں بلکہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک کے صرف پانچ سال کی۔ بہ طور ناول کے یہ سوانح نہایت معلومات افروز بھی ہے، دل چسپ بھی۔ اس میں سماجی مرقعوں کی ریل پیل ہے اور انھیں کے دست بہ دست نفسیاتی خاکے، مطالعے اور تجزیے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ سب بیانات اشک کی زندگی کا کم و بیش حقیقی عکس ہیں۔ سانحات سے بھرپور۔ اشک کی زندگی کتنی ڈرامائی رہی ہوگی کہ اس کا سیدھا سچا بیان ایک دل آویز ناول بن گیا ہے۔ میں فیصلہ نہیں کر پاتا کہ میں ناول کے خارجی بیانات کے نمونے پیش کروں کہ نفسیاتی نشیب و فراز کے۔ اس وسیع نگار خانے کے دو چار حیرتی آئینوں ہی کی نظارہ بازی کرلی جائے تو کافی ہے۔

اشک منہ پھٹ اور لڑاکو ادیب تھے۔ اردو ہندی ادیبوں کے بارے میں اپنے بے لاگ خیالات کو بے دھڑک زبان پر لے آتے تھے۔ اس ناول میں بھی انھوں نے کئی ادیبوں کی دکھتی رگ کو نشترِ قلم سے چھیڑا ہے۔ انھوں نے کئی مشاہیر کے نام ادل بدل کر لکھے ہیں لیکن اس جعلی چلمن کے پیچھے سے اصل شخصیت صاف دکھائی دے رہی ہے۔ میں نے بعض ناموں کی تحقیق انھیں سے کی تھی، ان کے انتقال کے بعد کچھ شخصیتوں کو اشک کی اہلیہ اور بڑے لڑکے کی مدد سے دریافت کیا۔ چند شخصیتیں یہ ہیں۔

ناول میں نام	حقیقی زندگی کے افراد
چیتن	اشک
چیتن کی پہلی بیوی چندا	اشک کی پہلی بیوی شیلا

کوی پرتاپ سادھن کا قلمی نام منشی چندر شیکھر ہے	منشی پریم چند
موہن رام، قلمی نام سادھو دیو درشن، مالک اخبار منند	پنڈت ہندی ناتھ سدرشن، مالک اخبار چندن
رام سبھایا منوا، اردو اخبار بھیشم کے مالک	میلا رام وفا، بھیشم کے مالک
ہندی کہانی کار مہیندر کمار	مشہور ہندی افسانہ نگار جینیندر کمار
کوی چانک جی	ہری کرشن پریمی
پنڈت دھرم دیو ودیا النکار	چندر گپت ودیا النکار

ان ناولوں میں اشک نے منشی پریم چند کو سراہا ہے، بقیہ سب کے بارے میں کچھ نہ کچھ طنز کیا ہے۔ سب سے زیادہ تضحیک منوا (یعنی میلا رام وفا) کی ہے۔ میں نے ان کے بارے میں ایک مزاح آمیز مصرع سنا ہے:

شعر کہنے کا سلیقہ سیکھ میلا رام سے"

غالباً یہ مصرع اکبر الہ آبادی کا ہے کہ ترلوک چند محروم کا۔ میلا رام عرف رام سبھایا کو شعر کہنے کا سلیقہ ہو کہ نہ ہو لیکن وہ ایرانی ذوق سے بقدرِ بالیست بہرہ یاب تھے۔ دفتر کے صحافی عملے میں کئی قبول صورت لڑکوں کو ملازم رکھتے تھے، ان کے گالوں اور کمر کو پیار سے تھپتھپاتے تھے۔ ان میں کسی کا نام گوندا، کسی کا مہاتما رکھ چھوڑا تھا۔ ان کے دفتر کے ماحول کو گرتی دیواریں میں (ص ۹۳ تا ۹۵) اور ننھی قندیل (ص ۷۰ تا ۸۰) پر درشایا گیا ہے۔ ان کے اخبار کا ایک رپورٹر منگت رام بلوچی تھا جو ان سے بھی بڑا شکاری تھا۔ اس نے بارہا چیتن پر ڈورے ڈالے، سیڑھیوں میں منہ چوم لیا، اس کے گھر پر جا دھمکا۔ اسی کے ڈر سے چیتن نے اخبار بھیشم کی ملازمت چھوڑ دی۔ ناول سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں پنجاب میں امرد پرستی کا بہت رواج تھا۔ چیتن کے سرپرست پنڈت رتن موہن (قلمی نام غیر معروف بر جستہ) تھے۔ یار لوگوں نے چیتن کو ان سے منسوب کر کے اسے لونڈہ، خود رنگ کا خطاب دے دیا تھا۔

اردو اخباروں کے حالِ زار کی تصویر پہلے حصے گرتی دیواریں اور میں بھرپور ہے۔

" اس نے بتایا کہ ان چار مہینوں ہی میں اسے معلوم ہو گیا کہ جس ایڈیٹری کے خواب وہ دیکھا کرتا تھا وہ دراصل کتنی ذلیل اور جھوٹی ہے۔ اردو اخباروں کے ایڈیٹر اور مترجم دن کو بارہ بجے سے چھ بجے تک اور رات ساڑھے نو بجے سے دو بجے (اور بارہا جب کوئی مترجم بھی بیمار ہو اور اس کا کام بھی باقیوں ہی کو کرنا پڑے) تو تین تین چار چار بجے تک کولہو کے بیل کی طرح جتے رہتے ہیں۔ جب تھک جاتے ہیں تو آپس میں نہایت غلیظ اور سوقیانہ مذاق کرتے ہیں۔ پلے ٹنڈ (گنجا) چہرے، اینڈی محار آلود آنکھیں، میلے غلیظ دانت، بے حد پتلے یا بے حد موٹے اور ہر طرح سے بھوکے اور بدبیسہ۔ لاہور کے اردو اخباروں میں کام کرنے والوں میں سے اکثر کو اس نے ایسا ہی پایا ہے۔" (ص ۹۳ تا ۹۵)

چیتن نے منوا کے اخبار میں دو مہینے کے قریب کام کیا لیکن وہاں سے پوری تنخواہ نہ ملی۔ بعد میں دھنپت رائے کے اخبار بندے ماترم میں ملازمت کی۔ وہاں بھی تنخواہ حاصل کرنا بڑا مشکل تھا۔ طرح طرح کے جھوٹ بول کر پیسے کی وہ جیبیں تنخواہ تک بات ہوتی تھی۔ (ص ۱۰۳)

ناول کے اہم بیانات یہ ہیں :

۱ ۔ اردو اخباروں کا گندہ ماحول ، صحافیوں کا حالِ زار ، اخبار نکالنے کے مسائل ، اخباروں کے چار مالک ایڈیٹروں کے خاکے ۔

۲ ۔ بچپن میں اسکولوں کے تجربات ، لڑائی جھگڑے ، ایک جلاد ماسٹر کی تادیب کا مفصل بیان ۔

۳ ۔ بھائی کو تپِ دق ، اسپتال میں اس کا علاج اور آخر کار موت ۔ گھریلو چپقلش ۔

۴ ۔ دیدوں کے علاج اور اشتہار بازی ۔

۵ ۔ لاہور میں اردو کتابوں کے ناشرین کے نقشے ، چیتن کا ان کو پرکھنا ، ٹٹولنا اور ایک اچھے ناشر سے اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کرانا جس پر منشی چند شیکھر (پریم چند) نے دیباچہ لکھا تھا ۔

۶ ۔ باب ۲۶ ، ص ۳۲۳ سے تقریباً آخر تک ہندی افسانہ نگاروں ، کویوں اور نقادوں کا نقشہ ، چیتن کا اردو سے ہندی افسانہ نگاری میں آنا ۔

۷ ۔ خسر کا پاگل خانے میں داخلہ ، ساس کا چیتن کے بنگلے میں ایک سیٹھ کے یہاں کھانا پکانے کی ملازمت کرنا ۔ چیتن کا پاگل خانے میں خسر سے ملنا ، ایک بار ساس سے ملنے پر معلوم ہونا کہ اس کے مالک کی لڑکی کی نسبت چیتن کے پرانے ہم سبق ڈپٹی کلکٹر سے ہو گئی ہے ۔

۸ ۔ اردو اخبار کے مالک سے عاجز آکر چیتن کا ملازمت چھوڑ دینا ۔

واقعات کا بیان زمانی ترتیب سے نہیں ، بہت کچھ آگے پیچھے ہے ۔ اس کی ایک بیّن مثال یہ ہے کہ جو کچھ پہلی جلد گرتی دیواریں کے (ص ؛ ۹۳ تا ۹۵) پر ہے وہی تیسری جلد ننھی قندیل کے (ص ؛ ۷۹ تا ۸۰) پر دہرایا گیا ہے ۔ دونوں جلدوں کے مشترک صفحات کے بیچ بہت کچھ رونما ہوتا ہے ۔ اشک فلیش بیک سے بہت کام لیتے ہیں ۔ ان کی مرغوب ترکیب یہ ہے کہ ہیرو ماضی کے واقعات کے بارے میں سوچنے لگتا ہے اور تخیل کے پردے پر ان سب واقعات کی مفصل تصویریں گزرنے لگتی ہیں ۔ ماضی و حال کا یہ معانقہ ایک دو پیراگراف یا صفحوں کا نہیں بلکہ اس میں باب کے باب سمو جاتے ہیں مثلاً

چیتن اپنے مربی پنڈت رتن کے گھر جاتا ہے اور ایک رنگین پیڑھے پر بیٹھتا ہے ۔ وہیں پنڈت جی کی شلوار قمیص اور کلے دار پگڑی کو دیکھ کر اس کی نظروں میں روزانہ بھیشم کے پھکڑ رپورٹر منگت رام ملوی کا چہرہ نظر میں گھوم گیا (ص ؛ ۵۵ تا ۵۶) اس کے بعد مصنف (ص ؛ [illegible]) تک چیتن کے اس اخبار کے تجربات بیان کرتا ہے ۔ پھر کہتا ہے ۔

" وہیں پیڑھے پر بیٹھے بیٹھے منشی ناتھ کی ملازمت کے وہ ابتدائی دن چیتن کی آنکھوں میں گھوم گئے " (ص [illegible])

یہاں سے (ص [illegible]) تک اس اخبار کے افراد کے ساتھ اس کی بیتی بیان کی جاتی ہے ۔ پھر مصنف اگلے باب ۱۰ کو یوں شروع کرتا ہے ۔

" وصل نگر کے بنگلے کے آنگن میں رنگین پیڑھے پر بیٹھا وہ [illegible] گزشتہ سال ڈیڑھ سال کی اندھیری گلیوں میں بھٹکتا رہا ۔ " (ص [illegible])

گویا بستر پر بیٹھے بیٹھے ۱۴ صفحوں میں ۴۰ سال ڈیڑھ سال کا ماضی چیتن اور قاری کی آنکھوں کے سامنے گزار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی آگے جاکر "چیتن اپنے جھوٹ کا پیچھا کرتا ہوا تصور کی ایک ہی جست میں چوتھی کلاس میں پہنچ گیا محلہ جالندھر کے پرائمری اسکول میں" (ص : ۱۰۰) اور اس کے آگے اس کے اسکولوں کے حادثات کا بیان ہے۔ ص ۱۰۰ سے ص ۲۰۰ تک۔

گرتی دیواریں یعنی پہلے حصہ میں کہیں چیتن کو ڈائری لکھتے نہیں دکھایا گیا۔ ننھی قندیل میں یہ سب سے پہلے باب ۱۱، ص ۱۰۹ پر رونما ہوتی ہے یہ فلیش بیک کا وسیلہ بنتی ہے۔ چیتن نے یہ فیصلہ کیا کہ گذشتہ چند دنوں میں وہ جن لوگوں سے ملا ہے ان کے خاکے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لے "(ص : ۱۰۰) لکھنے سے پہلے وہ ماضی کی تاریخوں میں لکھے واقعات کو پڑھنے لگتا ہے۔ یہ بات زیادہ تر اسی بازخوانی پر مشتمل ہے۔ اگلے باب ۱۲ میں چار مالک ایڈیٹروں کے خاکے ہیں۔ ان میں پنڈت نیک رام شاہین ایڈیٹر دلیش اور مولانا ظفر علی خاں کے شعری سرکوں کا دلچسپ بیان ہے۔ ان دنوں پنجاب میں ایک طرف ہندو مسلم اخباروں میں آویزش رہتی تھی، دوسری طرف ہندو خیمے میں آریہ سماج اور سناتن دھرم کے اخباروں میں نوک جھونک ہوتی تھی (ص : ۱۲۴)۔

مصنف نے ڈائری سے دوسرا کام یہ لیا ہے کہ چیتن کو جب بھی کسی جذباتی اتھل پتھل کا سامنا ہوتا ہے اور یہ اکثر ہوتا ہے، تو وہ اپنی کیفیت کو قرطاسِ ڈائری پر تفصیل سے ٹانک دیتا ہے۔ یہ بھی ماضی قریب کا فلیش بیک ہے۔

اس ناول میں اشک ایک منجھے ہوئے فن کار کی طرح شخصی خاکہ نگاری اور واقعات نگاری دونوں کی داد دیتے ہیں۔ میں مختصراً ان کی طرف اشارے کرتا ہوا گزر جاؤں گا۔ پہلے چند چھوٹے مرقعے ملاحظہ ہوں جو موقلم کی ایک دو جنبشوں سے بنائے گئے ہیں۔

حلوائی ، دودھ کے چوڑے کڑا ہوں کے پیچھے دوکان جتنا ہی پرانا، دلاور سنگھ، کسی قدیم مندر کے اتنے ہی قدیم مینت کی طرح چوڑے پٹڑ پر چوکڑی مارے بیٹھا نہایت بے نیازی سے لسی بلو رہا تھا۔ پینتالیس پچاس کو پہنچتی عمر، موٹی توند، اسی کی وجہ سے اندر کو دھنسا سینہ، ناف کو چھوتی ہوئی لمبی نوک دار داڑھی، سر پر بڑا سا میلا پگڑ۔ اس کے چہرے پر چیتن کو اپنے دھیان میں مگن کسی سینا سی کی سی بے نیازی دکھائی دی۔ لمحہ بھر کو اسے لگا کہ جان دار ہاتھ نہیں، بلکہ بے جان ہاتھ متھنی کو بلوئے جا رہے ہیں، چیتن کو یاد نہیں کہ اس نے کبھی دلاور سنگھ کو ہنستے یا مسکراتے دیکھا ہو۔
(ص ۲۹۰)

۲۔ کمل بارغ میں نشستوں کے انتخاب ، کہیں پنشن یافتہ بڈھے موجودہ سیاست پر بحث کر رہے ہوتے اور مہاتما گاندھی کی حماقت کا ذکر کرتے ہوئے نئے زمانے کو کوس رہے ہوتے۔ ان کی کوشش یہ بات ثابت کرنے میں کہ قدیں جلوسوں سے لیس فوجوں والی انگریزی حکومت کو یہ ننگا فقیر محض چرخے کی طاقت سے کیسے شکست دے گا۔۔۔ کچھ جنھیں تنہائی پسند تھی، خاموشی سے بیٹھے، یادوں کے چراغ روشن کیے رہتے، کہیں آوارہ بیکار لوگ بیٹھے بحث کیے رہتے۔ کہیں چوپڑ شطرنج بھی ہوتی۔ ایک چھوٹا سا حصہ بھی تھا جہاں کچھ لوگ گھنگھروؤں والے جوتے سے کھنک کو سنتے رہتے۔۔۔ میونسپلٹی کے باہر کانگریس یا دوسری پارٹیوں کے اجلاس ہوتے۔ کچھ لوگ بیٹھے

ہی گھاس پر نیم دراز ہو کر آرام کر رہے ہوتے۔ کبھی کچھ پھانک اڑا رہے ہوتے۔ (ص : [illegible])
سو غالب کا شعر ہے۔

بن گیا جوشِ حنا سے زلف کا ، اعجاز میں عکس ٭ ہے نزاکت جلوہ ، اے ظالم ! سیہ فامی تری

اشک اور چیتن کا مذاق بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ حسن سیاہ :

وہ دفتر میں کھڑکی کے قریب بیٹھا ہے۔ ظاہر کھڑکی کی روشنی میں پروف پڑھ رہا ہے لیکن اس کی آنکھیں بار بار گلی کے اس پار ۔ ۔ ۔ سامنے دو منزلہ مکان کے کھلے جھروکے میں کھڑی نوجوان عورت کی طرف اٹھ جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ عورت دفتر کے دبلے پتلے خزانچی کی بیوی ہے ۔ ۔ ۔ کالے پتھر کی ترشی ہوئی متناسب سڈول مورتی جیسی ۔ ۔ ۔ ستواں ناک ، نکیلی ٹھوڑی ، بھرے بھرے کلّے ، چوڑی پیشانی اور دیویوں جیسی بڑی بڑی آنکھیں ! سانولے رنگ کی کوئی عورت بھی اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے ، اگر چیتن نے اسے نہ دیکھا ہوتا تو محض سننے پر کبھی یقین نہ کرتا۔ اس کی آواز تیکھے پن کے باوجود اتنی میٹھی ہے کہ جب وہ کھڑکی میں آ کر نیچے کسی پڑوسن یا خوانچے والے سے بتیاتی ہے تو چیتن کا دل بے طرح دھڑکنے لگتا ہے۔ (ص : ۴۱ تا ۴۲)

۴۔ قدیم انداز کا ناشر : وہ دو ایک بار ست سنگھ بک ڈپو کے سامنے سے گزرا تھا ، لیکن اندر نہایت ہی قدیم زمانے کے نحیف و ناتواں لوگوں کو اور بھی قدیم میز کرسیوں پر بیٹھے دیکھ کر ، دوکان کے اندر جانے یا ان کا تعارف حاصل کرنے کی خواہش اسے نہیں ہوئی۔

۵۔ ادیبوں کی کمزوری : "ہم سارے ادیب اور شاعر جو دوسروں کی نفسیات کو جاننے اور اکیرنے کا دم بھرتے ہیں ، دوسروں کی حماقتوں کا مذاق اڑاتے ہیں ان پر قہقہے لگاتے ہیں۔ خود کیسی کیسی بے وقوفیاں کرتے ہیں ، یہ تم نہیں جان سکتیں۔" (ص : ۳۶۹)

۶۔ جدید وضع کی بیوی : اسٹیشن پر دھرم جی کی نئی بیوی کو دیکھا۔ گوری چٹی ، باب بالوں والی ، آزاد خیال اور ماڈرن ! دانت اس کے قدرے باہر کو نکلے ہیں۔ لگتا نہیں کہ اس نے کسی گاندھی وادی خاندان میں جنم لیا ہے۔ اتنا میک اپ تو اعلیٰ طبقے کی خواتین بھی نہیں کرتیں۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں دھرم جی کی پہلی بیوی کی سنجیدہ اور متین تصویر گھوم گئی ۔ ۔ ۔ اگر اس بیوی کی صحبت میں دھرم جی ادیب بن گئے تھے تو ان کی یہ بیوی انھیں یقیناً ادب کی بلندیوں سے نیچے لے آئے گی۔ اس کے نخروں کا پیٹ بھرنے میں اگر وہ انقلابی ادب ، وہب ترک کر کے کلاسنہ تاجر بن جائیں یا کسی بڑی کرسی پر جا بیٹھیں تو مجھے حیرت نہیں ہوگی اور ان جیسے لوگ شاہ طبیعت کے ویسے کی یہی ہوا ہے۔

ان بہت مختصر خاکوں کے علاوہ کئی شخصیتوں یا گروہوں کے اور مفصل مرقع ہیں جنھیں اشک ایسی جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ قاری کے سامنے کھلتے ہیں۔ بارھویں باب میں [illegible]
[illegible]

ایڈیٹر ملت [illegible]ری " ، پنڈت شیو پرشاد زخمی ایڈیٹر روزنامہ " ویر بھارت " (شانتی) ۔

ان میں جیون لال کپور سب سے ممتاز ہیں کہ وہ جگہ جگہ اس ناول میں ظاہر ہوتے ہیں ۔ پنڈت شانتی کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے اخبار میں سیاسی غزلیں لکھ کر مولانا ظفر علی خاں سے چونچیں لڑاتے تھے ۔ یہ معرکہ آرائی فرقہ وارانہ بھی تھی ۔ فن اور زبان کے معاملے میں شاہین ظفر علی خاں کے مقابل نہیں ہو سکتے تھے ۔ اشک نے شاہین کے دو اور ظفر علی خاں کی دو غزلیں نقل کی ہیں جن میں آخر الذکر بہ غایت دل چسپ ہیں ۔ کرنے ، مرے کے قافیہ میں شاہین کا ایک شعر تھا ۔

شاہین کے زورِ قلم نے نعرہ وہ باندھا ہے اب　　واہ واہ کا شور ، دشمن بھی تو کرنے لگ پڑے

اس پر مولانا سالک ایڈیٹر انقلاب نے ان کی زبان دانی اور شاعری پر طنز کرتے ہوئے لکھا شاعری پنڈت جی کے بس کا روگ نہیں " ہاں اگر پنڈت جی ، پڑنے ، کا وعدہ کریں تو ہم لگنے ، کا وعدہ کرتے ہیں " (ص ۱۳۵)

طنزیات کا یہی معیار تھا ۔ پانچوں صحافیوں میں جیون لال کپور کی شخصیت سب سے زیادہ زور دار اور دل چسپ ہے ۔ ان کا مزید تذکرہ آگے چل کر کیا جائے گا ۔ صحافیوں کے علاوہ ایک مکمل خاکہ اشک کے جلاد ماسٹر رام چندر کا ہے جسے لڑکے اڑی چک بھوتنا (ایڑی اٹھا کر چلنے والا بھوت) کہتے تھے ۔ اس کا قصہ ص ۱۶۲ سے ۱۹۶ تک ہے ۔ اشک نے اسے ایک علحدہ کہانی کا روپ بھی دیا ہے ۔ رام لعل کے مرتبہ " اشک کے منتخب افسانے " میں پہلا افسانہ یہی ہے ۔ ماسٹر جی غلطی سرزد کرنے والے لڑکوں کو طنزاً بھارت کا ستارہ کہتے تھے ۔ ان کے کشت و خون کی ایک جھلک دیکھیے ۔ بھوتنا نے خود لڑکوں کی مرمت کرنے کے بدلے کرسی پر بیٹھے بیٹھے مانیٹر کو حکم دیا ۔ دو دو تکے زور نال مار ساریاں دے

بھارت کا پہلا ستارہ اس روز بدقسمتی سے مانیٹر کی ڈیسک پر ہی طوع ہو گیا تھا ۔ کچھ دوستی کا لحاظ ، کچھ روزانہ صحبت کا اثر ، مانیٹر نے مکا ذرا دھیرے سے لگایا ۔ تبھی بھوتنا لپک کر اٹھے اور گرجے :

" بھوتن دیا پترا ایہہ زور نال مکا ماریا ای جاں پیار کیتا ای ۔ آ ، تے میں تینوں دیتاں مکا کنج ماریدا ۔

اور گردن سے دبوچ کر انھوں نے مانیٹر کی پیٹھ پر ایک زور دار گھونسہ جڑ دیا ۔

" ماسٹر جی میں ، ۔ ۔ ۔ مانیٹر نے کہنا چاہا ۔

" اوئے میں دیا پترا ۔ ۔ ۔ ذرا ایدھر تے ہو ، میں تینوں مکا مارنا سکھاواں ،

اور دانت کچکچاتے اور داد حاصل کرنے کے لیے لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے بھوتنا نے زور کا ایک مکا اس کی پیٹھ پر اور جڑ دیا ۔

" اوئے جی میں کی ؟ تو مانیٹری کرتا ایں کہ دوستیاں نبھاوندا ایں ، اوئے بدا ، توں بکرا ایں تے میں قصائی ۔ چل تے کدھر نوں چلنا ایں "

ساتھ ہی انھوں نے ایک تھپڑ اور دو گھونسے اسے اور رسید کر دیے ۔ ۔ ۔

چیتن کو اچھی طرح یاد تھا جب دوسرا چکر لگا کر انھوں نے تیسری بار مانیٹر کو جا پکڑا تو ایک دو تھپڑ اسے جمانے کے بعد اپنے سر پر بھی جما لیا ۔ ان کا چہرہ دیکھ کر خوف آتا تھا ۔ ان کا منہ لال بھبوکا تھا ۔ ہونٹوں سے جھاگ نکل رہی

جیسے ہی ابھر آئے تھے۔ اور گردن آگے کو نکل پڑتی تھی۔" (ص ۱۰۰ تا ۱۰۳)

ایک قابلِ توجہ مرقع ہندی کے مشہور کہانی کار، منشی چندر شیکھر کے معتقد مہیندر جی کا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پردے میں مشہور افسانہ نگار جیتندر کمار جین کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ لاہور آئے تھے۔ مداحوں کے اصرار پر ایک تقریب منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مہیندر جی دعوت نامے کا مضمون خود ہی لکھوانے لگے۔ جس میں انھوں نے اپنے ہی منہ سے مہیندر جی کو ہندی افسانے کے نئے دور کا پیشوا اور منشی چندر شیکھر کا جانشین کہا اور لاہور کے ہندی اہل کی خوش بختی ہے دیدہ النکار اور سبزی کے ایڈیٹر کی گزارش پر جیسے انھوں نے لاہور میں قیام کرنا منظور کر لیا ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ان کے نادر خیالات اور نظریات کو سننے اور جاننے سے لاہور کے ہندی ادیبوں کو جو فائدہ ہونے والا ہے اس کی تفصیل دیتے ہوئے لوگوں کو نشست میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ "یا تو یہ شخص بالکل سیدھا ہے یا انتہائی شاطر، چیتن نے دل ہی دل میں کہا۔ لیکن جیسا بھی ہے، ہے یہ اپنی طرح کا جینئس۔" (ص ۴۹۸ تا ۵۰۰)

انھوں نے تقریب میں اپنے بارے میں جو تقریر کی وہ بے نظیر ہے اپنے بارے میں صیغۂ غائب میں جملہ اور باتوں کے کہا:

"مہیندر اپنی کہانی کی بات کیا بتائے۔ وہ تو کہانی کے میدان میں یوں ہی انجانے اور ان چاہے آ گیا۔ نہ تو اس نے کہانی کے قاعدے قانون کو جانا نہ کہانی کے ہنر اور فن کو۔۔۔ رہی بات تکنیک اور فن کی تو وہ سب مہیندر کے اوپر سے ہو کر گزر جاتا ہے۔ اس کے بارے میں اس نے پڑھا نہیں، یہ وہ نہیں کہتا۔۔۔ اسے تکنیک اور فن کی خبر نہیں کہ وہ کدھر سے کہانیوں میں آتے ہیں۔ وہ تو بیج کو جانتا ہے کہ بیج انکھوتا ہے اور بڑھ کر درخت بن جاتا ہے۔ اس بیج کو پھوٹنے کے لیے کتنے ماشے کھاد اور کتنے تولے پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ دونوں کس توازن میں اور کب اسے ملیں، اسے نہ بیج جانتا ہے اور نہ ہی زمین سمجھتی ہے۔ خیال کا وہ بیج انسانی ذہن کی زمین کے بطن میں کب تک پکتا رہتا ہے اور پک چکتا ہے تو کب اس میں سے انکھوا نکلتا ہے اسے زمین نہیں جانتی۔" (ص ۴۹۸ تا ۴۹۹)

چیتن دلی جا کر ان کے گھر پر ان سے ملتا ہے۔

"باہر کے کمرے میں دروازے کے سامنے کونے میں لگی ایک میز کرسی اور بیچ کمرے میں فرنیچر کے نام پر سیمنٹ کے فرش پر بچھی صرف ایک چٹائی۔ اسی پر مہیندر جی بنڈی اور نیکر جیسا کچھا پہنے بیٹھے تھا۔ مجھے ان میں کچھ عجیب سی سادگی اور اس سادگی کے باوجود بے پناہ بناوٹ دکھائی دی۔ عاجزی اور غرور، بے تکلفی اور تکلف۔ یکسر متضاد کیفیتوں کی آمیزش مجھے ان کے کردار میں نظر آئی۔" (ص ۵۰۰)

ان کے بھانجے نے بتایا کہ یو۔ پی کے کانگریسی لیڈر ہمارے ہاں آ رہے ہیں۔ اس پر "مہیندر جی نے گھٹنوں کو بانہوں کی قید سے آزاد کیا اور نیم پدم آسن میں سیدھے تن کر بیٹھ گئے۔ پاس پڑا تہہ کیا ہوا صافہ انھوں نے کندھے پر رکھ لیا اور ناک ذرا سی نیچی کر لی۔" (ایضاً)

کتاب میں اور زیادہ تفصیل سے ہیرو کے بڑے بھائی اور ہیرو کی بیوی کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ یہ [illegible] پورے ناول پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ اردو کے صحافی جیون لال کپور، ہندی کے کوی [illegible] جی اور افسانہ نگار [illegible]

وغیرہ ادیبوں کا مفصل ذکر ہے۔ آخر الذکر دونوں کتاب کے نصف آخر میں مسلسل سامنے آتے رہتے ہیں۔

اشک کے دو ہاں تیز نظر بڑے بھائی ابھی قیدِ حیات میں ہیں۔ انھیں ہیرو چیتن کے بڑے بھائی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی رومانیت اور امور خانہ داری سے بے نیازی کی تفصیل ہے۔ وہ اپنی دق زدہ بیوی کی شدید علالت سے پریشان ہو کر چیتن سے مسلسل مالی امداد ملنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اردو صحافیوں میں دو قابلِ ذکر ہیں: رام بھایا دتا اور جیون لال کپور۔ دتا دراصل میلا رام وفا ہیں۔ وہی اشک کو جالندھر سے لاہور لے گئے اور اپنے ستائش دھرمی روزنامے بھیشم میں ملازم رکھ لیا۔ ان کی ہیئت اور قد و قامت:

"دتا صاحب شکل سے ذرا بھی شاعر نہیں لگتے تھے۔ بغیر کالر کی قمیص، کھلا پاجامہ، پیروں میں پرانے ڈھیلے جوتے، سر پر پگڑی (جو وہ عموماً اتار کر میز پر رکھ دیتے تھے) ایک آنکھ دبی ہوئی اور نظر قدرے کمزور۔ وہ کاغذ کو بالکل آنکھ کے قریب لے جاکر پڑھتے تھے۔ کرسی کے برابر ہی دائیں طرف ان کا حقہ پڑا رہتا تھا۔ دن بھر وہ میز پر ٹانگیں پھیلائے کرسی پر پیچھے کو ٹیک لگائے حقہ گڑگڑایا کرتے تھے۔" (ص: ۸۰)

"الہی شدہ زود بیوی اور ایک بھولے سے بچے کا باپ دفتر ہی میں لونڈے رکھے ہوئے تھا۔ خواہ وہ خود خوب صورت نہیں تھے لیکن دل انھوں نے حسن پرست پایا تھا۔ حتی الامکان وہ اپنے اردگرد حسینوں کو جمع رکھتے تھے" ص: ۸۰

گرو گھنٹال کے مالک لالہ جیون لال کپور کا حلیہ اس طرح پیش کیا ہے۔

"لمبا قد، بدن گٹھا ہوا، گھٹنوں تک لمبا گرم کوٹ اور اس سے میچ کرتی ہوئی پتلون، سر پر کرسٹی ٹوپی۔

کپور صاحب کے چہرے پر ہمیشہ کامیاب شخص کا اطمینان، خوشی اور خود اعتمادی جھلکتی ہے۔" (ص: ۱۲۹)

انھوں نے اپنے اخبار میں زوال پذیر یورپ کی بچی کہانیوں کے اردو ترجمے اور ساتھ میں بھارت کے مذہبی گروہوں کی ملی جلی پیش کی کہ ان کے اخبار کے پہلے شمارے کی تمام کاپیاں بک گئیں۔ وہ پھکڑ انداز میں عریاں لطیفے سناتے اور دوسروں پر اسی انداز کی پھبتیاں کس کر زور کے قہقہے لگاتے۔ اشک نے ان کی زبانی دو نہایت فحش لطیفے درج کر دیے ہیں جو نہیں چاہیے تھا۔ پہلا لطیفہ، ایک جولاہے اور اس کی ادھاتی بیوی کا ہے جس میں وظیفہ زوجیت ادا کرنے

ایک کافر ماننے کے برابر ٹھہرایا ہے (ص ۱۲۹ اور ص ۹۹ تا ۲۹۸)۔ دوسرا ایک مسلمان امیر زادے کا ایک برہمن پر دیوانہ ہونے اور مصنف بکٹ کہانی کے منبذ طریقے سے ہندو پنڈت کا بہروپ کرکے اپنی مراد حاصل کرنے کے بارے میں ہے۔ (ص: ۵۰۵) ناول میں ایک آدھ جگہ اور عریانی ملتی ہے جس کی وجہ سے ہندی کے بعض نقادوں نے اس کو سوقیانہ اور عریاں قرار دے کر حال پبلک لائبریری سے نکلوا دیا تھا۔ خواجہ احمد عباس نے انگریزی، اردو اور ہندی اخبار میں اس کے خلاف احتجاج کیا جس پر یہ امتناع ہٹایا گیا۔

چیتن نے کچھ دنوں اخبار بندے ماترم میں بھی کام کیا۔ یہ لالہ لاجپت رائے کا اخبار تھا۔ لالہ جی کے انتقال کے بعد اب مدت وشمیت رائے بی۔ اے (تخیل ؟) اس کے ایڈیٹر تھے۔ اشک یہ دل چسپ اطلاع دیتے ہیں کہ اس زمانے میں بھی اخباروں میں دو دو ایڈیٹر ہوتے تھے۔ ایک اصلی اور ایک نقلی۔ اصلی ایڈیٹر عوام اور سرکاری نظر

اور نقلی ایڈیٹر صرف نام دیتا ۔" لوگ کہتے ہیں کہ دھنپت رائے کام کی نہیں ۔ اخبار پر انھیں ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنا نام دینے کی تنخواہ پاتے ہیں ۔ وہ دوپہر کو اور رات کو بھی دفتر میں اونگھتے ، سوتے رہتے تھے ۔ چیتن نے ڈائری میں ان کا حلیہ یوں لکھا تھا ۔

"یوں کہنے کو تو مہاشے دھنپت رائے بھی خوب صورت ہیں ۔ رنگت بھی ان کی گوری ہے ۔ نقوش بھی تیکھے ہیں ۔ کانگریس کے رضاکار دستے میں بھی رہے ہیں ۔ تقریر بھی زور دار کرلیتے ہیں اور مجھے یہ نوکری بھی انھیں نے دلوائی ہے لیکن نہ جانے کیوں میں جب بھی ان کی طرف دیکھتا ہوں کچھ عجیب سی نخوت آمیز بے وقوفی ان کے چہرے پر صاف جھلکتی ہے ۔ جو دل میں نفرت پیدا کرتی ہے ۔ لیکن یوسف تو یوسف ہی ہیں ۔ ان کی پیشانی کے تیور ، ان کی آنکھوں کی لالی ۔ ان کا غصہ ۔ سب اچھا لگتا ہے اور ان کے نتھنوں میں پھوٹ کر ہونٹوں پر جھلک اٹھنے والی وہ مسکراہٹ ۔" (ص ۱۱۰)

بہت طویل مرقعوں میں ہندی کے دو ادیب بھی ہیں جن میں سے ایک کوی چاتک جی (اصلی دنیا میں برج کرشن پریمی) ہیں ۔ ان کا ذکر پہلی بار ص ۳۳۲ پر آتا ہے دودھ دھلے کھدر کے دھوتی کرتے میں ملبوس ، گول مٹول چہرے اور منجھلے قد کے ۔ چیتن نے ہندی ادیبوں کی پہلی میٹنگ میں شرکت کی تو اس نے طے کیا کہ اسے چاتک جی کے ساتھ تعلق بڑھانا چاہیے ۔ ان کے چہرے پر اسے ایسا جذبہ دکھائی دیا تھا جس میں طفلانہ معصومیت اور قدرے بے وقوفی کی جھلک تھی ۔ وید النکار جی نے ان کے بڑے رومانی شاعر ہونے کا اعلان کیا تھا ۔ (ص ۳۳۸)

انھوں نے کئی رومانی کھنڈ کاویہ (طویل نظمیں) لکھ رکھے تھے ۔ انھیں اپنی شاعری سنانے کا خبط تھا ۔ چیتن ان کا چیلا ، بلکہ چمچہ ہوگیا ۔ وہ تقریبوں میں چاتک جی سے کویتا سننے کی تجویز رکھتا ۔ چاتک جی نے بھی ہندی ادبی دنیا میں چیتن کو متعارف کرانے میں مدد دی ۔ ایک جگہ چاتک جی اپنا فلسفہ ۔ زندگی یوں بیان کرتے ہیں ۔

" بھوجن اور ... پر ہی تو دنیا کا کاروبار ٹکا ہے ۔ ۔ ۔ ہم تو بھائی دونوں کا پورا لطف اٹھاتے ہوئے قلم ہاتھ میں لیتے ہیں ۔" (ص ۴۱۵)

یہ صاحب دلی کی ایک بے جھجک لڑکی سے معاشقہ کرتے ہیں گو اسے بہن سودرا (بہن) بتاتے ہیں ۔

ہندی کے دوسرے ادیب افسانہ نگار پنڈت دھرم دیو وید النکار (اصلی دنیا میں چندر گپت ویدالنکار) ہیں ۔ یہ گروکل کانگڑی ہردوار کے گریجویٹ ہیں ۔ ان سے مل کر چیتن پر اچھا تاثر نہ ہوا ۔ اشک لکھتے ہیں :

" چیتن جب کیبن میں پہنچا تو اپنے محبوب افسانہ نگار کو سوٹ بوٹ میں ملبوس ، چھوٹی سی کیبن میں ، بڑی سی میز کے پیچھے دیکھ کر اسے نہایت مایوسی ہوئی ۔ اس کے سامنے سوٹ بوٹ سے لیس چوکور منھ پر موٹی سی ناک لیے جو شخص بیٹھا تھا ، وہ اگر چہ بدصورت نہ تھا ، لیکن کہیں سے بھی ادیب یا شاعر نہ لگتا تھا ۔ وہ کسی سرکاری دفتر کا سکریٹری یا ڈپٹی سکریٹری دکھائی دیتا تھا ۔ نتھنے کے دائیں طرف گال پر ایک چھوٹا سا مسّہ ۔ جو اگر کسی عورت کے چہرے پر ہوتا تو بیوٹی سپاٹ کہلاتا ۔ ان کے منھ پر چیتن کو بہت بھدا لگا تھا ۔ ۔ چیتن جب ان کے سامنے میز پر جاکر کھڑا ہوا تو ایک فاتحانہ فخر کے ساتھ دھرم دیو وید النکار نے اس پر نظر ڈالی ۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے ، نہ انھوں نے ہاتھ بڑھایا ۔ اسے بیٹھنے کے لیے کہا ، بس نمسکار کے جواب میں سر کو ذرا سا جنبش دے کر انھوں نے آنکھیں اٹھا دیں کہ کیا کام ہے ۔ (ص ۳۳۸)

ان سے چیتن کی کئی قسم کی حیثیتیں ہوتی ہیں۔ پہلی بیوی کے مرنے کے بعد انھوں نے نئی شادی کی تیاری کی تو ا
سے عین پہلے ان کی گھر میں ایسا جھٹکا آیا کہ پتا جلتا وہ بیر ہو گیا۔ چیتن نے ننھو پر نمک لگا کر گرم کر کے سکائی کی
انھیں افاقہ ہوا۔ ان کی شادی میں چیتن نے سہرا بھی پڑھا۔ چوں کہ چیتن اپنی مفلوک الحالی کی وجہ سے محض قمیص ا
سفید تہ بند پہن کر ادبی محفلوں میں جاتا تھا اس لیے اردو ہندی ادیبوں کو سوٹ پہنے دیکھ کر وہ چڑھتا تھا۔ پنڈت ہر
چند اختر کے ساتھ بھی ایسا ہی تجربہ ہوتا ہے۔ وہ ان سے اپنے افسانوی مجموعے پر دیباچہ لکھوانا چاہتا ہے۔ وہ ان سے ملنے
کونسل ہاؤس لائبریری گیا۔

"پنڈت اختر بڑی سی میز کے پیچھے گزشتہ کوئی کاغذ ڈھونڈ رہے تھے۔ بغیر اس کی طرف دیکھے سر کے اشارے
سے انھوں نے اسے اندر آنے کے لیے کہا اور بہ دستور کاغذ ڈھونڈتے رہے۔ لمبے اور چھریرے۔ چوکور چہرہ گالوں کی
ہڈیاں قدرے ابھری ہوئی (کذا) ان کے چہرے سے ان کی قابلیت، بذلہ سنجی، حاضر جوابی کا ذرا بھی اندازہ نہ ہوتا تھا
وہاں بڑی سی کرسی اور میز کے درمیان کریم رنگ کے سوٹ میں ملبوس لمبا سا جو شخص کھڑا تھا، وہ شاعر نہیں
دفتر کا کوئی ڈپٹی سکریٹری جیسا لگتا تھا۔" (ص ۶۰ - ۲۵۹)

صحافی آزاد والا کو دیکھ کر بھی چیتن نے مخالفانہ رائے قائم کی تھی۔

"آزاد والا سوٹ بوٹ میں ملبوس کرسی پر چاق و چوبند بیٹھے ہیں۔ ان کی عمر ساٹھ کو تجاوز کر گئی ہے۔ ان کی
آنکھوں کے پپوٹوں پر دوہرے غلاف چڑھ گئے ہیں اور نیچے گوشت کی تھیلیاں لٹک آئی ہیں۔ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ا
گھنے ابرو بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ نیلی ٹوئیل ٹائی، تھری پیس بڑھیا گرے سوٹ اور بڑی سی شملے دار پگڑی میں سے
سنورے اپنے دفتر میں بیٹھے وہ کسی پریس یا اخبار کے مالک نہیں، کسی سکول کے ہیڈ ماسٹر لگتے ہیں۔" (ص ۱۴۱)

اردو ہندی کے ادیبوں کو انگریزی لباس میں ملبوس دیکھ کر چیتن کے دل میں عناد ابھرتا ہے لیکن وہ خود اپنے
پاگل سسر کو پاگل خانے میں دیکھنے گیا تو ڈاکٹر کو مرعوب کرنے کے لیے ٹھنڈا سوٹ سلوایا۔ اسے پہن کر ٹائی ا
ہیٹ میں ملبوس ہو کر گرمی میں کئی میل پیدل چل کر گیا۔ محض ڈاکٹر کو مرعوب کرنے کے لیے بہ طور خاص سلوانا ا
ہیٹ اور ٹائی کے ساتھ جانا مندرجہ بالا ادیبوں کے انگریزی لباس سے زیادہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی اس وقت
جب کہ وہ بڑے معتمد لوگوں کی سفارشی چٹھیاں ساتھ لے کر گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں حمیدیہ کالج بھوپال مدھ
پردیش میں تھا وہاں کسی سلسلے میں ریاستی گورنر پتا بھی سیتا رمیا تشریف لائے۔ سنسکرت کے استاد سوٹ پہنے ہوئے تھے
انھیں دیکھ کر پتا بھی بگڑ گئے۔ کہنے لگے کہ سنسکرت کا استاد سوٹ اور ٹائی پہنے یہ احساسِ کم تری کا غماز ہے۔ میں پوچھتا
ہوں کہ کیا اردو کے استاد کے لیے بھی انگریزی لباس اسی طرح قابلِ اعتراض ہے؟

کردار نگاری کی جان چیتن کی بیوی چندا کی مرقع نگاری ہے۔ وہ حسنِ ظاہر سے حصہ نہیں لیکن اس کی باطنی
خوبیاں چیتن ہی کو نہیں، قاری کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہتیں۔ وہ پانچ جماعت تک پڑھی ہوئی، سوتی، سست ر
اور الھڑ لڑکی ہے لیکن اس کی بردباری، صبر و شکر، کبھی حرفِ احتجاج زبان پر نہ لانا اس کے خیر مستور اوصاف ہیں
اپنے بڑے بھائی کی مدد کے لیے چیتن نے چندا کے زیور لے کر فروخت کر دیے۔ اس نے ایک بار بھی احتجاج نہیں کیا

اسے معلوم ہے کہ اشک کو ایک خاتون کملا کے یہاں کی ایک لڑکی جمنا سے دل چسپی ہے۔ ایک دن جگتن پریشان تھا؛ چندا نے تجویز رکھی کہ وہ گرمی کے لیے کملا کے گھر ہو آئیں۔ وہ چاہتی تھی کہ کملا کے ہاں جانے جمنا سے ملنے سے جگتن کو ذہنی سکون ملے گا۔

چندا گھر میں میلے کپڑے پہن کر رہتی تھی۔ اپنی اور گھر کی صفائی اور آرائش کا سلیقہ نہیں تھا۔ جگتن کو یہ جان کر کہ اس کی ساس پڑوس کے سیٹھ کے یہاں ملازمہ کا کام کرتی ہے، سخت غم و غصہ تھا۔ ایک صبح چندا کے گندے کپڑے دیکھ کر اسے صاف کپڑے پہننے کو کہا۔ سوئے اتفاق سے اسی وقت کوئی چاٹک جی اور ان کی شریمتی منظور نظر ان کے یہاں آگئے۔ ان کے جانے کے بعد جگتن اپنی بیوی پر بہت برسا۔ رسوئی میں برتنوں اور فرش وغیرہ کو گندہ قرار دے کر انھیں خود صاف کرنے لگا۔ اسی وقت اس کی ساس آگئی۔ جگتن نے بیوی اور ساس کو جلی کٹی سنائیں، پاگل ہو کر چلاتا رہا۔ مصنف لکھتا ہے:

"اس کی ساس اپنی بیٹی سے نہ جانے کیا دکھ سکھ کی بات کرنے آئی تھی لیکن بات کرنا تو درکنار بیٹھنا بھی اس کے لیے دوبھر ہو گیا گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ اٹھی۔

تبھی چندا نے بھرے گلے سے کہا: "ماں آج سے تم یہاں پھر کبھی نہ آنا۔"

اس کی آواز میں نہ جانے کیسی بھراہٹ تھی کہ میز کا ایک کونا کندھے سے اٹھاتے اٹھاتے جگتن کی نگاہیں ادھر اٹھ گئیں۔ اس کی ساس ڈیوڑھی میں نکل گئی تھی۔ چندا بے حس و حرکت بیٹھی تھی اور آنسو خاموش اس کے رخسار پر بہہ رہے تھے۔ (ص ۱۴ - ۵۱۵)

اس کے بعد جگتن کو اپنی غلطی اور زیادتی کا احساس ہوا لیکن ایک ہفتے تک گہری سوچ اور الجھن میں مبتلا رہنے کے بعد۔ پھر بھی بیوی سے معافی مانگنے کی جرات نہ ہوئی۔ "چندا کی وہ معصوم، زخمی اور مغموم پیاری آنکھیں جگتن کے سینے میں دور تک اتر گئی تھیں اور اس کے دو اتنے دنوں سے جما ہوا اور آخر پھٹ پڑنے والا غصہ ان آنکھوں سے نکل کر اس کے رخساروں پر بہتی ہوئی دو بوندوں سے بالکل پانی پانی ہو گیا تھا۔ اس غصے کی جگہ اسی پرانے رحم نے لے لی۔ اپنی اور چندا دونوں کی بے بسی پر۔" (ص ۵۱۸)

اس کے بھائی کے حصے میں مکان کا کرایہ دینا تھا۔ وہ نہ دے سکا تھا۔ چندا نے اپنا اندوختہ ریزگاری کی شکل میں لا کر الٹ دیا۔

"رات جب جگتن بستر پر لیٹا تو اسے نیند نہ آئی تھی۔ وہ مسلسل چندا کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ اس کے برابر چارپائی پر لیٹی ہوئی اس کی بیوی جسے وہ شاید سیدھی سادی، بدھو اور گنوار سمجھتا ہے اندر سے کتنی گہری، عقلمند اور مہذب ہے۔ وہ محض اس کا ظاہری روپ دیکھتا رہا ہے۔ جب جب اس کے باطن کی جھلک اسے ملی ہے وہ دنگ رہ گیا ہے۔۔۔

کسی تاسف کے بغیر جگتن نے اس دن کی زیادتی کے لیے اس سے معافی مانگ لی۔ اس دن ہے کہ جی میرا دماغ خراب ہو گیا تھا، اس نے کہا۔" (ص [illegible])

آخر سے پہلے صفحے پر وہ چندا کے لیے کہتا ہے [illegible]۔ ہمیں بھی اس سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔

حوالی میں واقعہ نگاری بھی چٹخارے دار، دل کش، دل چسپ اور دل کو چھونے والی ہے۔ متعدد بیانات قاری کے دل پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس میں اس دور کی اردو صحافت کا کچا چٹھا ہی نہیں پیش کیا گیا، شعری پہلو کی بھی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ مشاعروں میں جہاں سب کو ہوٹ کردیا جاتا ہے۔ چیتن ایک مزاحیہ غزل کے ذریعے مشاعرے میں داد لوٹتا ہے۔ غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں۔ اس سے پہلے یہ واضح ہو کہ لاہور میں فلیکس جوتوں کی مشہور دکان کا مالک بھی تھا۔

شیخ کی داڑھی صفاچٹ ہوئی مس کی خاطر — رنگ عالم کا بدلتا نظر آتا ہے مجھے
آج کل پیٹ مرے گھس کے بنے ہیں جوتا — رات کو خواب میں بھلا نظر آتا ہے مجھے
سر سے فوراً ہی اچھل پڑتی ہے جیری پگڑی — ان کے جب ہاتھ میں جوتا نظر آتا ہے مجھے

ایک اہلِ زبان مرزا فہیم بیگ چغتائی آبِ حیات سے آتش و ناسخ کے معرکے، جرات کے قصے اور غزلیں سناتے ہیں۔ (ص ۴۵ تا ۵۰)۔ ہری چند اختر کی نوح ناروی کی غزل کی مشہور پیروڈی درج کی ہے۔

کہا۔ سرحد پہ جا بیٹھیں، کہا۔ سرحد پہ جا بیٹھو — کہا۔ افغان کا ڈر ہے، کہا۔ افغان تو ہوگا

لاہور کے چار غیر مسلم اردو ناشرینِ کتب کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ جن سے چیتن اپنا افسانوی مجموعہ شائع کراسکتا تھا۔ سنت سنگھ بک ڈپو، نارائن دت سہگل اینڈ سنز، لچھمن پال برادرس اور کھن بک ڈپو۔ ان میں سے کی یہ کیفیت تھی۔

"...سنت سنگھ بک ڈپو کی کسی کتاب پر کبھی کپڑے یا گتے کی جلد اس نے نہیں دیکھی تھی۔ قصے تو کاغذ پر چھپے ہوتے تھے۔ نہ کٹے نہ سلے۔ لیکن جن تخلیقات کو کتابیں کہا جاسکتا تھا وہ بھی پیپر کور اور قلعی نہایت ردی کاغذ اور اس سے بھونڈی لکھائی چھپائی کے ساتھ مارکیٹ میں بکتی تھیں۔۔۔ چیتن کے دل میں وہاں سے اپنی کتاب چھپوانے کی خواہش نہیں ہوئی۔" (ص ۳۰۶۔۳۰۵)

ایک جگہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے مرقعے دکھاتے ہیں کہ کس طرح ایک خاں صاحب نے فرقہ وارانہ قضیے کو۔ اس دور میں دونوں فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کے تیواروں میں شرکت کرتے تھے۔ وہیں کھڑکی میں کھڑے کے سامنے بچپن کے دن گھوم گئے۔ جب محرم کے دنوں میں تعزیے نکلتے تھے اور وہ دادی (پردادی گنگا وتی۔ جسے اپنے میں چیتن اور اس کے بھائی بھی ددادی ہی پکارتے تھے) کے ساتھ چوک قصے شاہ میں انھیں دیکھنے جاتے۔ دادی تعزیوں کا طواف کرتی، ان کے نیچے سے خود گزرتی اور بچوں کو گزارتی اور ان پر کوڑیاں چڑھاتی اور جن بازاروں سے ان میں ہندو دوکان دار بیٹھے شربت اور لسی کی سبیلیں لگاتے اور حال میں ایک بار گئے نوی کو مسلمان بھراتی بڑے گلے میں لٹکائے، ان سے کپڑے باندھے، انھیں بجاتے اور گلے پیر کی گیت گاتے ہوئے آتے۔ پردادی دیگ بھرائیوں کو کھلاتی گلے میں باندھتی اور انھیں کپڑے دے کر رخصت کرتی۔ چیتن کو یاد تھا کہ بسنت کا تہوار مسلمان شوق سے مناتے جتنا کہ ہندو۔ پیلی پگڑیاں باندھتے اور کنکوے اڑاتے۔۔۔" (ص ۵۰۵۔۵۰۴)

اس زمانے کے پنجاب میں امرد پرستی کا جو زور تھا اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کتنے عاشق کے نیچے

کی تربیت و ترقی پر ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں۔ ایک مرد دیہاں واسطہ آخرین یہ ہے کہ ایک طالب علم پر مجھ پر اپنی پوری تنخواہ خرچ کر دیتا تھا۔ (ص ۸۸) مزید تین دوستوں کا بیان ہے جو اسی شوق کے ہاتھوں تباہ ہیں (ص ۱۵ - ۲۲)۔ رام بھایا اپنے اخبار میں صرف حسین لڑکوں کو بہ طور صحافی ملازم رکھتے تھے۔ یہ سب متعلق ہندو ہیں۔

اردو ناولوں اور افسانوں میں ہندی کی ادبی فضا کا منظر پیش نہیں کیا جاتا۔ اس ناول میں اشک نے تفصیل سے اور پست کندہ لکھا ہے کیوں کہ انھوں نے یہ ناول دونوں زبانوں میں لکھا ہے۔ ہندی لیکھین کی ایک تقریب میں ایک ماہر طباعت نے رسم الخط اور ٹائپ کے مسئلے پہ تقریر کی (ص ۲۰ - ۲۲۲) ایک ادبی نشست سے پہلے ہندی کوئین کی جھنگ نوشی کا بیان ہے (ص ۲۱ - ۲۲۹) اس کے بعد کوی گوشٹی (شعری تقریب) ہوتی ہے (ص ۲۹ - ۲۳۱)۔ آخر الذکر بیان میں اردو میں ہندی کویتاؤں کے نمونے کسی حد تک اجنبی معلوم ہوتے ہیں لیکن چوں کہ یہ کتاب پہلے ہندی میں شائع ہوئی اس لیے اس رجحان سے مفر نہیں۔ چیتن چاتک جی سے کہتا ہے:

"میں دو ایک سال پہلے تک اردو میں غزلیں اور نظمیں کہتا تھا لیکن اردو میں غزلیں لکھنا میں نے بالکل چھوڑ دیا ہے۔ ایک دو گیت اپنے اخبار کے لیے ضرور لکھے ہیں لیکن ہندی گیتوں کے مقابلے میں وہ آپ کو کیا جچیں گے۔ (ص ۲۳۲)

چیتن ایک آریہ سماجی خاتون کے پاس اپنی ہندی تحریر کی اصلاح کے لیے گیا۔ "جب انھیں معلوم ہوا کہ چیتن لیچھ بھاشا، ترک کر کے "راشٹر بھاشا" میں لکھنا چاہتا ہے تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ ۔ ۔ چیتن کو اردو شاعری اور اردو زبان دونوں بہت اچھی لگتی تھیں اور اردو کے سلسلے میں "ملیچھ بھاشا" کا استعمال نہایت ناگوار لگتا تھا۔ ۔ ۔ پنجابیوں کی مادری زبان تو اس کے خیال سے صرف پنجابی ہی تھی۔ اسے کبھی کبھی یہ سوچ کر افسوس ہوتا تھا کہ وہ لوگ گھر میں جو زبان بولتے ہیں وہ لکھتے نہیں۔ انگریزوں نے پنجابیوں پر اردو لاد دی تھی اور چوں کہ سکھ گرمکھی کو گورو وانی بنا کر گوردواروں میں بند کیے ہوئے تھے، اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے کوئی کوشش نہ کرتے تھے، اس لیے اردو کے رد عمل میں پنجابی ہندوؤں نے خواہ آریہ سماجی ہوں یا سناتنی ہندی کو مادری زبان بنا لیا تھا۔" (ص ۳۵۲)

میرا خیال ہے آخری جملے میں "اردو کے رد عمل" کے بجائے "ان کے رد عمل" لکھنا مقصود رہا ہوگا۔

دو کامیاب دیدوں کے سلسلے میں اشک نے دو امراض کے تیر بہ ہدف نسخے لکھ دیے ہیں: ایک کنٹھ مالا (خنازیر) کا، دوسرا ابلتے گھی سے جل جانے کا جو ہر قسم کے جلنے میں مفید ہونا چاہیے۔ قلب عام کے خیال سے میں آخر الذکر کو درج کر رہا ہوں۔

"ایک سیر میٹھا تیل لے کر آگ پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ پھر جب وہ گرم ہو جاتا تو اس میں ایک چھٹانک لونگ ڈال دیے جاتے۔ لونگ جل جاتے تو چھلنی سے انھیں الگ کر لیا جاتا اور اس میں ایک پاؤ چھتے کا موم ڈال دیا جاتا۔ موم گھل جاتا تو تیل نیچے اتار لیا جاتا اور اس میں آدھ پاؤ بہترین سندور ڈال کر اس وقت تک گھوٹا جاتا جب تک وہ ٹھنڈا ہو کر گاڑھا مرہم نہ بن جاتا۔" (ص ۳۸۲)

اس مرہم کو بار بار لگانے سے تین چار مہینوں میں کھال اتنی صاف ہو جاتی ہے کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ ہاتھ ابلتے گھی کے کڑھاؤ میں گر کر جلا تھا۔

اشک ایک واقعی بڑے اور ہنگامی ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت کا یہ پہلو بھی بڑا کرتی [illegible] کی مثالیں [illegible] نفسیاتی مسائل کی گہرائی میں جانے کی بجائے [illegible] اور جنس کے مسئلے پر سوچتے ہیں اور تفصیل سے [illegible] لکھتے ہیں۔

"اگر [illegible] کے سامنے اس کے منہ سے جھوٹ نکل گیا تو کیا اس کو شرمندہ ہونا چاہیے۔ اس ملک کو یا اس کے [illegible] کو نہیں جو اپنے اظہار کی عادت اتنے بڑے جھوٹ، فریب اور ملازمین کے استحصال پر قائم کیے ہوئے تھا۔ ہر باپ، ہر گرو، ہر ملک سچ بولنے کی تلقین کرتا ہے۔ شاستروں میں لکھا ہے کہ ستیہ میو جیتے۔ سچ کی فتح ہوتی ہے۔ کہاں؟ چیتن کو [illegible] نہیں ملا۔ کس سچ کی فتح ہوتی ہے۔ فاتح ہمیشہ اپنے پہلو کو سچا ثابت کر دیتے ہیں۔" (ص ۲۰۰)

"جھوٹ مجھے اپنی بے بسی کا احساس دلاتا ہے بتاتا ہے کہ میں کتنا کم زور اور لاچار ہوں کہ ذرا ذرا سی بات کے لیے [illegible] ہو کے سر پر آجاتا ہے۔ دنیا میں سچ کی نہیں جھوٹ کی عمل داری ہے اور اسی لیے آدمی کی روح بغاوت کرتی ہے۔ سچ کہنے کے لیے [illegible] ہے۔" (ص ۲۰۱)

"ضمیر رکھنے والا (انسان) سچ اس لیے نہیں کہہ سکتی کہ سیدھے سچ سے شعلے لپکتے ہیں اور جھوٹ سے گو خلاصی ہوتی ہے لیکن چوں کہ اتنے جھوٹ میں آدمی کی روح گھٹتی ہے اس لیے وہ رک رک کر سچ کہتا ہے اور شاید یہی سچ کی فتح ہے" (ص ۲۰۲)

"یہ سارے دنیاوی سچ جھوٹ اضافی ہیں۔ ایک فریق کا سچ دوسرے کا جھوٹ ہوتا ہے اور جو ہار جاتا ہے وہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ جھوٹا ہو جیت جانے والے ہمیشہ حقیقت کو اپنا سچ ثابت کرنے کے لیے توڑ مروڑ لیتے ہیں۔" (ص ۲۰۳)

"تب بنیادی سچ کیا ہے؟ موت؟ ہاں موت ایک بنیادی سچائی ہے لیکن موت کی کوئی اضافیت نہیں ہے، شاید ایسا نہ کہا جا سکے۔ ایسی موت بھی ہو سکتی ہے جو زندگی سے بہتر ہو... تب زندگی؛ ہاں زندگی بھی ایک بنیادی سچائی ہے۔ کسی نے لکھا ہے کہ موت کے تن پر بھی ہمیشہ زندگی کے پھول کھلتے ہیں، لیکن اضافیت زندگی کی بھی ہے... ایسی زندگی جو موت سے بدتر ہو۔ ازلی سچائی شاید ان دونوں سے پرے ہوگی۔ جب نہ زندگی تھی، نہ موت، تب کیا تھا؟ اور جب زندگی رہے گی نہ موت تب کیا رہے گا؟ جو تھا اور جو رہے گا اسے خدا، ایشور یا برہم کہا جائے گا یا ازلی، شکتی یا محض خلا... وہی غیر اضافی خالص سچ ہے... بنیادی، ازلی، ابدی... اسی کی فتح کا ذکر شاستروں نے کیا ہو گا۔ وہی سچ ہے، باقی سب جھوٹ ہے۔" (ص ۲۰۳۔۲۰۴)

ایک جگہ ادیبوں کی نفسیات کی پول کھولتے ہیں۔

"ہم سارے ادیب اور شاعر جو دوسروں کی نفسیات کو جاننے اور اکیرنے کا دم بھرتے ہیں دوسروں کی حماقتوں کا مذاق اڑاتے ہیں، ان پر قہقہے لگاتے ہیں، خود کیسی کیسی بے وقوفیاں کرتے ہیں، یہ تم نہیں جان سکتیں۔" (ص ۳۳۹)

دو لفظ اس ناول کی لفظیات کے بارے میں۔ اشک پنجابی ہیں۔ ان کی مادری زبان نہ اردو ہے نہ ہندی۔ اس ناول میں متعدد ایسے الفاظ آ گئے ہیں جو اردو روزمرہ کا جزو نہیں۔ ان میں سے کچھ پنجابی ہوں گے کچھ ہندی۔ مجھے ان میں سے کئی کے معنی معلوم نہیں۔ صفحے کے حوالے سے ایک فہرست دیتا ہوں۔

ص ۹ میری شدنی ادیب ہونے میں ہے۔ ۱۲ کتر قوڑ گالیاں۔ ۱۹ دکان کے اندر پر جھجک۔ ۱۸، ۱۹۰ دانت چباتے۔ ۲۰ خاصا ازبک لگا۔ ۲۳ [illegible] کاڑیں۔ ۲۸، ۲۹ دانت کھوٹے۔ ۳۱ [illegible] سے بچیاتی ہے۔ ۳۲۔ اتر ڈھلان ہو گئی۔ ۴۳ دبلے پتلے لم سلے۔ ۵۹ چڑنے دانے وہاں سے کھسک دیا۔ ۶۰ خشتائی۔ ۶۳ ساکل تو اتنی نہیں کردی۔ ۶۵ گلے وار مشری باکری۔ ۶۹ گھٹنا پائجامہ۔ ۶۹ لونے (سر منڈے)۔ ۷۸ مستقل مغالطہ۔ ۸۱ منہ پھیلانا۔ ۹۰ سردئی روغن۔ ۱۱۳ ٹھکتے۔ ۱۲۹ [illegible]۔ ۱۳۹ [illegible]۔ ۲۰۹، ۲۱۰ کرسی چھپی۔ [illegible]۔ ۲۲۹ اس کی

کشش شروع ہوئی۔ ۱۹۳ کھودا (جس کے چہرے پر داڑھی مونچھ نہ اگے)۔ ۱۹۳ لیموں کٹا ہوا مونچھیں۔ ۲۰۰۔ چابک کھونٹی پر کینچلی سا لٹکا دیا۔ ۲۲۰ کنٹر کریہہ عورت۔ ۲۳۹ اٹنگ پائجامہ۔ ۲۵۰ مسلمان بھرائی ڈھولک گلے میں لٹکائے۔ ۲۶۸ پائنتی کے لیے وہاں میلی چادر اٹھا کر فرش پر بچھا دی۔ ۲۰۰ گھٹی ہوئی سماشی بگڑی۔ ۲۹۸ بھابی نے سندر دی تھی، نیز۔ ۲۵۳ مہینوں سدھ نہیں دیں گے۔ ۲۹۸، ۳۰۰ چندا رقاص کو ودیا ہی ہوئی۔ ۳۱۰ من میں کچوٹ اٹھتی رہی۔ ۳۳۸ جو اسے نچا تلنے تھے۔ ۳۳۹ ٹھنکتے ہوئے۔ ۳۵۸ پانی کا اشکارا۔ ۳۴۴ جلنے اور اکیرنے کا دم بھر کر۔ ۳۴۹ سیلی کی چھوہ (لسی)۔ ۳۰۰ سنکنی (چٹخنی)۔ ۳۸۹ چندرہ سولہ سال کی کنگنی سی لڑکی۔ ۳۹۱ وارج جمیز۔ ۳۹۰ آسمان میں مٹر مٹر تکتے ہوئے۔ ۳۵۳ انگشتِ شہادت سے ہوا کو ٹھکورتے ہوئے۔ ۳۰۵ چھوٹی سی ڑنکی (ایچی)۔ ۳۸۰، ۳۰۸ گرم گرم لیموں ہاتھ کی پشت پر چلا کر دیکھنا۔ ۳۸۰۔ ۳۰۸ سستی سستی تکور کرنا۔ ۳۸۹ ستھنی جیسا ڈھیلا چوڑی دار پائجامہ۔ ۵۱۸ پنیاری آنکھیں۔ ۵۲۲ نکیا کر بولیں۔ ۵۲۸ لٹکے دار بجلی رنگی پگڑی۔ ۵۵۵ ڈپٹی کلکٹر ہوتے ہی بورا گیا تھا۔ ۵۵۶ کہیں ہم بھینگی نہ مار دیں نیز۔ ۵۵۸ رشتے داروں کی بھینگیں۔ ۵۷۷ مضامین کا تعب۔

چیتن نے جدوجہد کر کے اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کرایا جس پر منشی چند شیکھر نے دیباچہ لکھا تھا۔ واضح ہو کہ ۱۹۳۳ء میں اشک کا افسانوی مجموعہ "عورت کی فطرت" منشی پریم چند کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ ہاں تو چیتن نے ہر کہانی سے پہلے فلائی لیف پر اس کا جوہر ایک نثری نظم میں نچوڑ لیا تھا۔ میں اس طویل جائزے کو ایسی ہی ایک نثری نظم کے اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔ ۱۹۳۳ء ہی میں اشک نے کتنی اچھی نثری نظم لکھی ہے۔

پیاسا مسافر تیرا دیوانہ گنگناتا رہا ہے
اسے اپنے ٹھنڈے کمرے میں بلا لے۔۔۔ کہ
خس کی ٹٹیوں سے آنے والی ہوا کے باعث
جاں فزا اور سرور انگیز ہو گیا ہے۔۔۔ اور
جہاں برف میں بیئر کی بوتلیں لگی
ہیں اور پانی یخ ہو گیا ہے
جہاں ٹھنڈے شربت
کسی پاک دل کے نیک خیالات کی طرح
عجب صورت بوتلوں میں دھرے ہیں۔
تو اسے بلا اور اگر اپنی قیمتی
شراب اور شربتوں سے وہ بوند نہیں دے سکتا
تو تسلی کے دو لفظ کے ساتھ
ٹھنڈا پانی ہی پلا دے۔۔۔ ورنہ
پیاسا مر جائے گا
(ص ۲۱۵)

ڈاکٹر عابد معز

آزادی کے بعد حیدرآباد میں اردو زبان

۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد اور تقسیم بھی ہوا۔ پاکستان وجود میں آیا جس کی قومی زبان اردو قرار دی گئی۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں فوجی اقدام کے ذریعہ حیدرآباد کا انڈین یونین میں انضمام عمل میں آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو چار برسوں میں اردو کی بساط الٹ گئی۔ آزادی کے وقت اردو ہی وہ واحد ہندوستانی زبان تھی جو نظم و نسق، عدالتوں اور ذریعہ تعلیم بننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے آزاد ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی بنائی گئی۔ ہندی زبان کے فروغ پانے تک آئندہ پندرہ سال کی مدت کے لیے انگریزی کو رابطے اور انتظامیہ کی زبان کے طور پر اپنایا گیا۔ حیدرآباد میں سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کے استعمال کو یک لخت ترک کر دیا گیا اور اردو کی جگہ انگریزی نے لے لی۔

سقوط حیدرآباد کے دو چار، دو سال بعد تک جامعہ عثمانیہ میں ذریعہ تعلیم کے تعلق سے افراتفری رہی۔ آخر کار تعلیمی سال ۱۹۵۱ء ۱۹۵۲ء سے جامعہ عثمانیہ سے اردو ذریعہ تعلیم ختم کر دیا گیا۔ اردو کی جگہ انگریزی نے لی۔ دارالترجمہ کا کام روک دیا گیا اور پھر ۱۸ ستمبر ۱۹۵۵ء کی شب دارالترجمہ آگ لگ جانے یا لگائی جانے سے اردو زبان کا عظیم سرمایہ جل کر ختم ہو گیا۔ رہی سہی کسر ۱۹۵۶ء میں پوری ہوئی جب ریاستوں کی لسانی بنیادوں پر تنظیم جدید ہوئی۔ ریاست اردو (حیدرآباد) تین مختلف لسانی ریاستوں، آندھرا پردیش (تلگو) مہاراشٹرا (مرہٹی) اور کرناٹک (کنڑ) میں تقسیم ہو گئی۔ حیدرآباد شہر اور اس سے ملحقہ تلنگانہ کا علاقہ آندھرا پردیش میں شامل ہوا۔ اس تلگو ریاست کا صدر مقام شہر حیدرآباد قرار پایا۔ اس کی وجہ سے اردو زبان کا بہت تیزی سے زوال شروع ہوا۔ معاش سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اردو داں ملازمین کو ہٹا دیا گیا یا انگریزی سیکھنے پر برقرار رکھا گیا۔ سرکاری ملازمین کو تلگو سیکھنا ضروری قرار دیا گیا۔ انتظامی اور عدالتی امور کے لیے انگریزی کے ساتھ ہندی اور تلگو کا استعمال شروع ہوا۔ تعلیمی اداروں سے اردو غائب ہونے لگی۔ ذریعہ تعلیم انگریزی اور تلگو بنتے گئیں۔ اردو ذریعہ تعلیم کے ادارے کس مپرسی کا شکار ہو کر بند ہونے لگے۔

اردو حکومت کی توجہ اور سرپرستی سے محروم ہوئی۔ نئے حکمرانوں کی اکثریت اردو جانتی نہ تھی اور جو اردو جانتے تھے، وہ اردو کو گزشتہ نظام کی دین سمجھ کر اردو کے مخالف تھے۔ مزید ستم یہ ہوا کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر اسے ملک کی تقسیم کا ذمہ دار قرار دیا جانے لگا۔ اردو کو بدیسی زبان ثابت کرنے کی کوشش کی گئی اور اردو کا رسم الخط تبدیل کرنے کے لیے تحریکیں اٹھیں۔ اردو داں لوگوں کا بیرونی ممالک کو ہجرت کرنا بھی اردو کے زوال میں اہم سنگ میل ثابت ہوا۔

مایوسی کا دور :

ہندوستان کی آزادی اور سقوط حیدرآباد کے بعد ہونے والی لسانی تبدیلیوں کا نتیجہ چھٹے، ساتویں اور آٹھویں دہوں کے دوران اس صورت میں سامنے آیا کہ عوام میں اردو کی اہمیت گھٹ گئی۔ اردو کی کوئی وقعت نہ رہی اور وہ ایک ماضی کی یادگار بن کر رہ گئی۔ اردو کے حلقوں میں بے دلی، پست ہمتی کا ہر سو ایک مایوسی کی صدا۔ محسوس ہوتا تھا کہ اردو زبان چند دنوں کی مہمان ہے۔ لوگ اردو میں تعلیم

حاصل کرنا تو دور اسے ایک زبان کی حیثیت سے سیکھتے ہوئے بھی ہچکچانے لگے۔ روزگار کے لیے انگریزی اور سرکاری زبانیں ہندی اور تلگو سیکھنا ضروری ہو گیا۔ تین زبانیں سیکھنے کے بعد چوتھی زبان سیکھنے کی سکت رہتی ہے اور نہ ہی وقت۔ اردو سیکھنے کا فائدہ بھی نظر نہ تھا۔ اردو مادری زبان والے تک اردو پڑھنے لکھنے سے کترانے لگے۔ ایک "بے فائدہ زبان" والے احساسِ ندامت اور احساسِ کمتری کا شکار بھی ہوئے۔ اردو نہیں آتی کہنا فخر کی بات بھی جانے لگی۔ غلط اردو بولنا اور اردو زبان میں بے تحاشہ انگریزی الفاظ استعمال کرنا فیشن بنا۔ اردو لکھنے اور پڑھنے والے آہستہ آہستہ ختم ہو رہے تھے اور ایک نئی نسل اردو لکھے پڑھے بغیر جوان ہوئی۔

اس پر آشوب دور میں ایک طرف اردو کے چاہنے والے اردو کی بقا کے لیے اپنے طور پر اقدامات کرنے کے ساتھ حکومت سے اردو کی نمائندگی کرنے لگے۔ دوسری جانب اردو زبان کی شیرینی، لطافت اور شعری سرمائے نے اردو کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اردو اپنے مخالفین کو متاثر بھی کرنے لگی۔

اردو زبان کی بقا کی کوشش :

اس صدی کے اواخر میں اردو کے چاہنے والوں کی کوشش رنگ لانے لگیں اور ان لوگوں نے اردو کی بقا کے لیے جو کام شروع کیے تھے وہ اثر دکھانے لگے۔ اردو زبان سے وابستہ تہذیب اور علمی خزانے کا احساس بھی اجاگر ہونے لگا۔ اردو سے وابستہ ہونے پر کمتری کا احساس زائل ہونے لگا۔ حکومت بھی اردو والوں کی نمائندگیوں اور مطالبات پر توجہ دینے لگی۔ یوں شہر حیدرآباد میں اردو کی بقا اور پھر سے ترقی و ترویج کے امکانات روشن ہونے لگے۔

اردو کی بقا اور ترویج کے امکانات اور کوششوں کا سرسری جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں اب مایوسی کا دور ختم ہو کر امید کی فضا قائم ہو رہی ہے۔

ذرائع ابلاغ :

ریڈیو، ٹیلی وژن، فلم، اخبارات، رسائل وغیرہ کسی زبان کو مقبول بنانے اور فروغ دینے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ہر دن کم از کم دو تا تین گھنٹے اردو پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ کسی زمانے میں ریڈیو پروگرام مقبول تھے لیکن دورِ حاضر میں ٹیلی وژن نے ریڈیو کی مقبولیت کافی حد تک گھٹادی ہے۔ ٹیلی وژن اور فلم نہ صرف حیدرآباد بلکہ سارے ملک کا پسندیدہ میڈیا ہے۔ ٹیلی وژن اور فلم پر اردو چھائی ہوئی ہے۔ لیکن ٹیلی وژن اور فلم میں استعمال ہونے والی اردو کو ہندی کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ چند لوگوں کے خیال میں فلم اور ٹیلی وژن کے ذریعے اردو، ہندی یا ہندستانی کی شکل میں کروڑہا لوگوں تک پہنچ رہی ہے مسئلہ ہے تو صرف رسم الخط کا ہے۔ چند برسوں سے یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ٹیلی وژن اور فلم کے اسکرین پر نظمیں اور شستہ اردو کا مزاح پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

اردو غزل :

اردو شاعری میں بالخصوص صنفِ غزل کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ غزل گائیکی کو پسند کرنے والوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ غزل گائیکی کے پروگرام میں ہزارہا لوگ ٹکٹ خرید کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ غزل کی مقبولیت اردو کی بقا کا ثبوت ہے۔

اردو روزنامے :

حیدرآباد سے اردو کے چار بڑے روزنامے شائع ہوتے ہیں ۔ ان میں سے دو اخبار رنگین اور عام دنوں میں بارہ تا بیس صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں ۔ اتوار اور دوسرے مخصوص موقعوں پر صفحات کی تعداد تیس سے زیادہ تک جا پہنچتی ہے ۔ ان اخبارات میں کم از کم چار صفحات کا ضمیمہ یا میگزین شامل رہتا ہے ۔ خبروں کی پیش کش اور مضامین کے معیار سے ان اخبارات کا مقابلہ کسی بھی قومی انگریزی اخبار سے کیا جاسکتا ہے ۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے اخبارات کی مجموعی تعداد و اشاعت ایک لاکھ سے زیادہ ہے ۔ ایک اندازے کے مطابق ایک اردو اخبار کو آٹھ تا دس لوگ پڑھتے ہیں ۔ اس حساب سے ہر دن آٹھ تا دس لاکھ لوگ اردو اخباروں سے مستفید ہوتے ہیں ۔ اخبارات خبریں پہنچانے کے علاوہ زبان کی خدمت بھی کرتے ہیں ۔

اردو رسائل :

الکٹرانک میڈیا سے رسائل زیادہ متاثر ہوئے ہیں ۔ ہندستان میں اردو رسائل کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے ۔ حیدرآباد سے دو ماہنامے ایسے ہیں جو ربع صدی سے زائد عرصہ سے پابندی کے ساتھ شائع ہونے کا ریکارڈ رکھتے ہیں ۔ ادارہ ادبیاتِ اردو ۔ نکلنے والا ادبی رسالہ "سب رس" اور زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان شگوفہ ۔ شگوفہ اردو دنیا کا منفرد رسالہ ہے جو صرف طنز و مزاحیہ ادب کی خدمت کررہا ہے ۔ ان کے علاوہ بھی چند رسائل شائع ہوتے ہیں جیسے شاداب ، خوشبو کا سفر ، وغیرہ ۔

مشاعرے :

اردو زبان میں مشاعرے کی حیثیت کسی ادارے سے کم نہیں ہے مشاعرے باذوق سامعین کی شعری تسکین کا باعث بننے کے ساتھ نئے لوگوں کو اردو سے روشناس کراتے ہیں اور کم ذوق حضرات میں شاعری اور زبان سے دل چسپی پیدا کرتے ہیں ۔ حیدرآباد میں سال کم از کم تین بین الاقوامی مشاعرے منعقد ہوتے ہیں ۔ ادبی ٹرسٹ ، شنکرجی اور زندہ دلانِ حیدرآباد کے مشاعرے پابندی کے ساتھ ہوتے ہیں جن میں ہزاروں لوگ ٹکٹ خرید کر مشاعرہ سنتے ہیں ۔ دوسرے مقامات اور ملکوں سے شاعر بلائے جاتے ہیں ۔ ریاستی گورنر ، سیاسی قائدین ، سرکاری عہدے دار اور زعما ان مشاعروں میں بہ طورِ خاص شریک ہوتے ہیں ۔ ان تین بڑے مشاعروں کے علاوہ حیدرآباد میں کئی اور مشاعرے وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہتے ہیں ۔

ادبی اجلاس ، سمینار اور سمپوزیم :

حیدرآباد میں اردو نثر کے اجلاس اور علمی اور ادبی سمینار اور سمپوزیم منعقد ہوتے رہتے ہیں ۔ یومِ محمد قلی قطب شاہ ، یومِ تصدق ، زندہ دلانِ حیدرآباد کے ادبی اجلاس اور مطالعہ اقبال کی محفلیں اس کی مثال ہیں ۔ پچھلے چند برسوں سے علمی موضوعات پر ہر ماہ توسیعی لکچر کا پابندی کے ساتھ اہتمام کیا جاتا ہے ۔ ان کے علاوہ مختلف جامعات کے اردو شعبوں کی جانب سے علمی اور ادبی سمینار اور سمپوزیم بھی منعقد کیے جاتے ہیں ۔

اردو مراکز :

مستقل طور پر ہفتے وار اردو کی محفلیں منعقد کرنے اور مختلف مشاغل کے لیے شہر میں مختلف مقامات پر اردو کے لیے

اردو کے نام سے تین مراکز قائم ہیں۔ اردو گھر، اردو ہال اور ایوانِ اردو۔ ان تین مختلف اور کشادہ ہال میں دریڑھ تا دو سو لوگ بیٹھ سکتے ہیں جہاں آئے دن اردو کی تقریبات منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

اردو کتب خانے :

اردو کے مختلف مراکز میں کتب خانے ملحق ہیں جہاں اردو کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ ادارہ ادبیات اردو میں بالخصوص دکنی تہذیب اور دکنی زبان کے تعلق سے بہت سارا مواد اکٹھا ہے۔ اردو کتابوں کا ایک اور شان دار ذخیرہ آصفیہ حکومت کا قائم کردہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری میں ہے۔ اس لائبریری میں اردو کی بے شمار قدیم کتابیں موجود ہیں۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کی لائبریری کے اردو سیکشن میں بھی اردو کی کئی ہزار کتابیں ہیں۔ اردو کی کتابوں سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے۔ وسائل کی کمی سے کتابوں کی حفاظت بھی مسئلہ بنتی جارہی ہے۔ اردو کتب خانوں کے حوالے سے ایچ۔ای۔ایچ۔ دی نظامس ٹرسٹ اور اردو اکیڈمی کے کتب خانے بھی اہم نام ہیں۔ کتابوں اور لائبریری کے تعلق سے ایک نام یاد آتا ہے۔ وہ نام اردو ریسرچ سنٹر کا ہے۔ اس سنٹر میں فردِ واحد نے کئی اردو رسالے اور کتابیں جمع کی تھیں۔ موصوف کا نام محمد عبدالصمد خاں ہے امریکہ کی دو یونی ورسٹیوں نے اس ذخیرے کو خرید کر کامریڈ سندرایا لائبریری میں محفوظ کرنے کے انتظامات کیے ہیں۔

اردو --- انگریزی لغت :

محمد عبدالصمد خاں جیسے حیدرآباد کے چند اور سپوت ایسے ہیں جنھوں نے اردو کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی ہیں۔ محبوب میراں مجتہدی نے ایک لاکھ الفاظ اور تین ہزار صفحات پر مشتمل اردو۔ انگریزی لغت مرتب کی ہے جو جلد ہی شائع ہو کر منظرِ عام پر آئے گی۔

اردو کی انجمنیں اور ادارے :

زبان و ادب کی بقا اور فروغ میں ادبی انجمنوں اور اداروں کا اہم رول رہتا ہے۔ حیدرآباد میں کئی انجمنیں فعال اور متحرک ہیں۔ ان کی تفصیل اور ان کے کارناموں کی تفصیل لکھنے کے لیے کئی صفحے درکار ہوں گے۔ صرف چند نام گنانے پر اکتفا کیا جاتا ہے انجمن ترقی اردو، ادارہ ادبیاتِ اردو، اردو گھر، ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈمی ایچ۔ای۔ایچ۔ دی نظامس اردو ٹرسٹ، ادبی ٹرسٹ، حلقہ انجمن ترقی پسند مصنفین، محبانِ اردو، زندہ دلانِ حیدرآباد وغیرہ وغیرہ۔

فنِ خطاطی اور اردو سافٹ ویر :

اردو رسم الخط تبدیل کرنے کی وکالت و مخالفت اور پھر اس موضوع پر بحث وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہے۔ اردو والوں کی اکثریت رسم الخط میں تبدیلی کی مخالف ہے۔ امید ہے کہ بیسویں صدی کے اختتام پر یہ بحث ختم ہوجائے گی۔ حیدرآباد میں خطاطی کی تربیت کے تین، چار ادارے کام کررہے ہیں۔ جہاں پر نوجوانوں کو خطاطی کا فن سکھایا جاتا ہے۔

حیدرآباد میں اردو سافٹ ویر پروگرام پر بھی کام ہورہا ہے۔ کمپیوٹر کا پولیٹی ٹاک ادارہ سرگرمِ عمل ہے۔ حالیہ عرصہ میں اس ادارے نے صفر ستار نامی اردو ورڈ پروسیسنگ سافٹ ویر تیار کیا ہے۔

کتابیں شائع کروانے کی سہولت :

کئی مراکز ہیں جہاں پر اردو کتابوں اور رسالوں کی مکمل کتابت کروائی جاسکتی ہے ۔ کتابت کے بعد اردو کتابیں چھپانے کے لیے لو پریس سے لے کر جدید ٹکنالوجی سے لیس آفسیٹ پریس کی سہولتیں بھی مہیا ہیں ۔ ان کی بہ دولت حیدرآباد اردو کتابیں شائع کرنے ایک بڑا مرکز بن گیا ہے ۔ ہر سال حیدرآباد سے کئی اردو کتابیں چھپتی ہیں ۔

دو کتابوں کی نکاسی :

اردو کتابوں کی نکاسی ناشرین اور مصنفین کے لیے ایک اہم مسئلہ ہے ۔ حیدرآباد میں تاریخی چارمینار کے اطراف اردو کی ابوں کی دکانیں ہیں ۔ شہر کے چند دوسرے مقامات پر بھی دینی کتابوں کے ساتھ اردو کتابیں بھی فروخت کی جاتی ہیں ۔ اردو کتابوں کی اس کے لیے ادبی ٹرسٹ نے بھی " اردو بک اسٹال قائم کیا تھا ۔ انجمن ترقی اردو اور ادارہ ادبیات اردو میں بھی فروخت کتب کے ۔ قائم ہیں ۔ حیدرآباد میں ہر سال منعقد ہونے والی صنعتی نمائش میں ادبی ٹرسٹ ، اردو کتابوں کا اسٹال قائم کرتا ہے ۔ اس اسٹال پر ی کتابیں فروخت ہوتی ہیں ۔

ی نسل میں اردو :

کسی زبان کے مستقبل کی ضمانت نئی نسل کی اس زبان سے واقفیت اور اس زبان میں تعلیم سے ملتی ہے حیدرآباد میں بہت سے بچوں اور نوجوانوں کی مادری زبان اردو ہے ۔ وہ اردو میں بات کرتے اور اردو کلچر میں رہتے ہیں لیکن انھیں مدارس میں اردو پڑھنے کے مواقع نہیں ہیں ۔ نئی نسل کے اردو سے تعلق کو مضبوط اور پائیدار کرنے کے لیے اردو والوں نے بیڑا اٹھایا ہے ۔ عابد علی خاں ۔ یجوکیشنل ٹرسٹ اور ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے اردو سکھانے کا باضابطہ انتظام کیا جاتا ہے ۔ کئی مقامات پر اردو کوچنگ کلاسس چلائی جاتی ہیں ۔ گرما کی چھٹیوں میں گرمائی اسکول کی صورت میں اردو تدریس کا اہتمام ہوتا ہے ۔ مقررہ نصاب کی تکمیل کے ۔ اردو دانی ، اردو زبان دانی ، اردو انشا اور دوسرے امتحانات سال میں دو مرتبہ جنوری اور جون میں منعقد کیے جاتے ہیں ۔ کامیاب یا کو اسناد دی جاتی ہیں ۔ حیدرآباد میں اردو کوچنگ کلاسس مقبول ہیں ۔ اب ان میں دوسری زبان اور بڑی عمر کے لوگ بھی شریک ہورہے ہیں ۔ اردو کوچنگ کلاسس کے علاوہ دینی مدارس میں بھی اردو سکھائی جاتی ہے ۔ شام یا صبح مساجد میں جزوقتی دینی مدارس کا انتظام ہے جہاں بچوں کو اردو سیکھنے کے مواقع ہیں ۔

اردو ذریعہ ، تعلیم :

آصفیہ حکومت کے قائم کردہ اردو مدارس ایک ایک کر کے ختم ہورہے ہیں ۔ اب صرف چند گنے چنے اردو مدارس باقی رہ گئے ہیں ۔ ان مدارس کا حال بہت خستہ ہے ۔ درسی کتب دستیاب نہیں ہیں تو کہیں عمارت بوسیدہ ہے ۔ اساتذہ غائب ہیں تو کہیں طلبہ پڑھنے کے لیے موجود نہیں ہیں ۔ نامساعد حالات کے باوجود اردو سرکاری مدارس کا نشان تو موجود ہے ۔ اردو مدارس تعلیم کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے دو ، تین ریسیڈنشیل (اقامتی) مدارس قائم کیے گئے ہیں ۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ چند خانگی اردو مدارس بھی قائم ہوئے ہیں ۔

انٹر میڈیٹ اور ڈگری سطح تک اردو ذریعہ ، تعلیم کا شہر حیدرآباد میں انتظام بھی ہے ۔ اردو کا معاش کے ساتھ رشتہ نہ ہونے کے سبب بہت کم لوگ اردو ذریعہ ، تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں ۔ دیگر کالجوں میں داخلہ نہ ملنے کی صورت میں اردو زبان کا انتخاب کرتے ہیں ۔ اردو ذریعہ ، تعلیم کے لیے اردو آرٹس کالج ، اسلامیہ گرلز کالج ، کالج آف لنگوئجس ، انوارالعلوم کالج ، ممتاز کالج وغیرہ ہیں ۔ کوششیں جاری

ہے کہ اردو ذریعہ، تعلیم کا معیار بہتر بنایا جائے تاکہ لوگ ترجیحاً ان میں داخلہ لیں۔

اردو بہ حیثیت اختیاری اور لازمی مضمون :

انگریزی، ہندی یا تلگو میڈیم میں تعلیم پانے والے اردو مادری زبان کے حامل بچوں کو اردو پڑھنے کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ صرف چند مدارس میں اردو مادری زبان والے بچوں کو اردو پڑھنے کے مواقع ہیں۔ مدارس میں سہ لسانی فارمولے کے تحت ریاستی سرکاری زبان تلگو، قومی زبان ہندی اور انگریزی پڑھانے کے انتظامات ہیں۔ چند برس پہلے ہندی کے بجائے اردو زبان یا کمپوزٹ اردو (۷۰ فی صد اردو اور ۳۰ فی صد ہندی) پڑھنے کا اختیار تھا لیکن اب سہولت موجود نہیں ہے۔ اردو مادری زبان والوں کے لیے اردو پڑھنے کی سہولت پھر سے فراہم کی جائے یا برطانوی قانون کی طرز پر بچوں میں مادری زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ اردو والوں کو اس کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

جامعات میں اردو :

حیدرآباد شہر کی یونی ورسٹیوں ... کے شعبے قائم ہیں جہاں اردو سے ایم۔ اے، ایم۔ فل، اور پی ایچ۔ ڈی۔ کرنے کی سہولت ہے۔ حال ہی میں حکومت ہند کی جانب سے حیدرآباد میں مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ کاش آج سے پچاس برس پہلے ہی فراخ دلی اور وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عثمانیہ یونی ورسٹی اور دارالترجمہ کو اپنی اصلی حالتوں میں برقرار رکھا جاتا تو اردو زبان کی ترقی رکنے نہ پاتی اور اردو زبان زوال پذیر نہ ہوتی۔ حکومت کی قائم کردہ مولانا آزاد قومی اردو یونی ورسٹی کس حد تک کامیاب رہے گی، یہ آنے والا وقت بتلائے گا۔

دینی تعلیم اور اردو :

پچھلی نصف صدی کے دوران اردو کے ساتھ یہ بھی زیادتی ہوئی ہے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی نشانی کے طور پر فروغ پانے کے بجائے صرف مسلمانوں کی مذہبی اور ثقافتی شناخت اور علامت بن گئی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کا دینی علوم کا بیشتر حصہ اردو میں ہے۔ دینی تعلیم اردو کے ذریعے ہی دی جاتی ہے۔ مذہبی لٹریچر کی اشاعت اور مذہبی تقاریر اور تبلیغ کا ذریعہ بھی اردو زبان ہے۔ اردو زبان کی بقا اور فروغ میں دینی مدارس، اسلامی تعلیمات اور مذہبی تقریبات کا رول بڑھتا جاتا ہے۔

حکومتی اقدامات :

اردو کی ترقی و ترویج کے لیے حکومت کی جانب سے ہونے والے اقدامات [illegible] پر سب سے [illegible] میں اس لیے کرتے ہیں کہ زبان کی [illegible] ترقی کے لیے ... کے بجائے [illegible] زیادہ [illegible] ہوتے ہیں۔ اس میں [illegible] نہیں [illegible]

[illegible]

بہت دیر [illegible] ہے کہ ترقی کی سمت [illegible] والے اقدامات [illegible]

اردو اکیڈمی :

[illegible] حکومت نے اردو اکیڈمی [illegible] ہے جس کے تحت اردو کی ترقی و ترویج کے بہت سارے کام [illegible]

کتابیں چھاپنے کے لیے مصنفین کو جزوی مدد دی جاتی ہے۔ اردو کتابوں پر انعامات دیے جاتے ہیں اور اردو ادیبوں اور شاعروں کو ایوارڈس سے نوازا جاتا ہے۔ گو کہ مالی امداد اور انعام کی رقم بہت معمولی ہے اور ہر سال پابندی سے دی بھی نہیں جاتی لیکن یہ ہر حال کچھ مدد ہو ہی جاتی ہے۔ اکیڈیمی اردو درسی کتابیں شائع کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مشاعرے اور ادبی اجلاس منعقد کرتی ہے۔ اکیڈیمی کی جانب سے ایک ماہوار جریدہ بھی شائع ہوتا ہے۔ یہ جریدہ تسلسل اور پابندی سے بے نیاز ہے۔ یہ چند کام ہیں جو اردو اکیڈیمی کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔

دوسری سرکاری زبان :

حکومت آندھرا پردیش نے حال میں قانون سازی کے ذریعے آٹھ اضلاع۔ حیدرآباد، رنگا ریڈی، میدک، نظام آباد، کرنول، محبوب نگر، اننت پور اور گلبرگہ میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد دس فی صد سے زائد ہے، اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے۔ اس قانون پر عمل آوری کیسے، کیوں کر اور کب سے ہوگی ابھی واضح نہیں ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو :

حیدرآباد میں جنوبی ہند کی شاخ قائم ہے۔ ہندستان کی مرکزی حکومت کا یہ ادارہ اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے کے اشاعتی پروگرام کے تحت سائنس و تکنیکی علوم، طب، سیاسیات، زراعت پر متعدد کتابیں اردو انسائیکلوپیڈیا اور اردو لغات شائع ہوئی ہے۔ کتابوں کی قیمتیں مناسب بلکہ کم ہیں۔ کونسل اردو قارئین کی ایک اہم ضرورت پوری کر رہی ہے۔

بیسویں صدی کے دوران اچانک اردو نے زوال کا مزا چکھا اور پھر اس صدی کے آخر میں اردو کی بقا اور ترقی و ترویج کی کوشش خلوصِ دل سے شروع ہو گئیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں حیدرآباد میں اردو کس حال میں رہتی ہے۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ اردو کو پہلے جیسا مقام تو حاصل نہ ہوگا لیکن اردو والوں اور خود اردو سے قوی امید ہے کہ وہ اپنا ایک منفرد اور الگ مقام بنا لے گی۔

ooo

پیکی معانی

محمد یوسف ٹینگ ... ایک مطالعہ

ریاست کے جن قلم کاروں عالموں اور دانش وروں نے اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کی اور تحقیق و تنقید کو اپنا موضوعِ خاص بنایا۔ ان میں عبدالاحد آزاد، نند لال کول طالب، نرسنگھ داس نرگس، دیا کشن گردش، بلدیو پرشاد شرما، عشرت کاشمیری، اکبر حیدری، رحمن راہی، قیصر قلندر، حامدی کاشمیری، شمیم احمد شمیم، برج پریمی، موتی لال ساقی، مرغوب بانہالی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ محمد یوسف ٹینگ کا نام عالموں اور دانش وروں کی اسی فہرست میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔

محمد یوسف ٹینگ ۱۹۳۵ء میں سری نگر سے تقریباً ۳۰ کلومیٹر دور شوپیاں کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ عبدالرزاق ٹینگ ایک باوقار اور خداترس بزرگ تھے۔ ٹینگ صاحب نے ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے حاصل کی۔ بی۔ اے آنرز پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی۔ چوں کہ بچپن سے ہی ان کو ادب اور صحافت سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس لیے آپ سب سے پہلے روزنامہ وار اخبار "جہانِ نو" سری نگر سے وابستہ ہوگئے۔ آپ کچھ عرصے تک ریڈیو کشمیر، سری نگر میں بہ حیثیت نیوز ریڈر بھی کام کرتے رہے (۱)۔ اس کے بعد ریاستی محکمہ اطلاعات کی طرف سے شائع ہونے والے جریدے ماہ نامہ "تعمیر" کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ بعد میں آپ اس کے مدیر ہوگئے۔ ۱۹۶۲ء میں آپ نے ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے "شیرازہ" کی ادارت سنبھالی۔ یہ رسالہ بہت ہی قلیل عرصے میں آپ کی محنت اور خداداد صلاحیت سے ادبی دنیا میں اپنا وقار بنانے میں کامیاب ہوا۔ ٹینگ صاحب مختلف اخبارات کے کالم نویس بھی رہے ہیں۔ ریاستی کلچرل اکادمی کے سکریٹری کے فرائض نبھاتے ہوئے آپ ڈائرکٹر جنرل کلچر بھی رہے آپ کچھ عرصے کے لیے ناظم اطلاعات بھی رہے۔ ابھی چند برس پہلے ریاستی کلچرل اکادمی کے سکریٹری کے عہدے سے آپ ریٹائر ہوئے اور اب لکھنے پڑھنے کے کام میں منہمک ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آپ ریاستی پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہیں۔ ٹینگ صاحب ساہتیہ اکادمی کے کشمیری ایڈوائزری بورڈ کے کنوینر ہیں۔ اس کے علاوہ آپ سکریٹری شیخ محمد عبداللہ میموریل کمیٹی، سکریٹری شیخ العالم ششش صدسالہ کمیٹی اور سکریٹری سالِ اقبال صد سالہ کمیٹی بھی ہیں۔ ٹینگ صاحب کو حال ہی میں ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

محمد یوسف ٹینگ صرف ایک فرد کا نام نہیں بلکہ وہ ایک ادبی انجمن ہیں۔ وہ ایک ادیب بھی ہیں اور صحافی بھی۔ وہ شاعر بھی اور محقق بھی۔ وہ کئی مقالوں اور انشائیوں کے مصنف ہیں۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت اور ان کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ ٹینگ صاحب کے تحریر ادبی کارناموں پر اس مختصر سے مقالے میں اجمالی خیال کرنا مقصود ہے۔ انھوں نے زبان و ادب، تاریخ و تمدن اور تہذیب و کلچر کے کئی پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے اور اپنے مطالعے کا اظہار خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ ان کا مطالعہ گہرا اور مطالعہ وسیع ہے۔ ٹینگ صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ وہ مظلوم تخلص کرتے تھے۔ بعد میں لکھ

... سب رس " حیدرآباد۔

...ت تک ... کے نام سے بھی لکھتے رہے (۲)۔ ٹینگ صاحب اردو اور کشمیری دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ا
... سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ انگریزی زبان سے بھی انھیں گہرا لگاؤ ہے۔ چناں چہ ڈریم اینڈ دی ڈلیما کے نام سے ان کی کتاب
جلد قریب ہی شائع ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ ٹینگ صاحب اردو اور کشمیری نظم و نثر میں تقریباً دو درجن کتابیں ایڈٹ کر چکے ہیں
جن میں ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے شائع ہونے والے رسالہ "شیرازہ" کے خاص نمبر اور سالنامہ "ہمارا ادب" کے تقریباً گیا
شماروں کے علاوہ داغ دہ دگ گل ریز، کلیات محمود، کلیات ولی اللہ متو، وطن مجھے ناد لایان (کشمیر) رسول میر کی نمائندہ نظموں
اردو ترجمہ، وطنی و قومی نظموں کا مجموعہ "وطن کی پکار" عبدالاحد آزاد کی کتاب "کشمیری زبان اور شاعری" کی دوسری اور تیسری
عبدالقادر سروری (مرحوم) کی "کتاب کشمیر میں اردو" لوک ادب نمبر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ٹینگ صاحب ایک بالغ نظر نقاد ہیں۔ وہ ادب کے مارکسی نظریے سے متاثر ہیں۔ میر، غالب، فیض، ناصر کاظمی، منٹو ا
کشمیری ادبیات میں رسول میر، محمود گامی، شیخ العالم، عبدالاحد آزاد، رسا، وغیرہ ان کے اہم موضوعات ہیں۔ وہ کشمیری تاریخ
ثقافت، تہذیب و تمدن اور کلچر پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور اس کے متعدد پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر برج پر
اپنی کتاب میں ٹینگ صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"محمد یوسف ٹینگ کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ ہمارے بالغ نظر نقاد ہیں۔ وہ اردو اور کشمیری ادب پر
گہری نظر رکھتے ہیں۔ غالب، اقبال، منٹو، ان کے محبوب موضوع ہیں۔ کشمیری اور ... کے شعر و ادب سے متعلق ان
کے بعض عالمانہ تحقیقی اور تنقیدی مقالے چھپ چکے ہیں ... ان کے شگفتہ اسلوب اور منطقی استدلال سے ایک
نئی سوچ و فکر کا احساس ہوتا ہے" (۳)۔

ٹینگ صاحب کا پہلا تحقیقی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ "شناخت" کے نام سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں ان کے اہم
مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین گزشتہ تیس پینتیس برس میں لکھے گئے مختلف ادبی و ثقافتی موضوعات پر دال ہیں اور عالمانہ بصیرت رکھتے
ہیں۔ اقبالیات کی نادر دریافت، ایک ادبی سرقے کا سنسنی خیز انکشاف، علامہ اقبال اور محمد دین فوق، بی بال ... اسطور، تاریخ ا
ادب، دہر کے مسائل، ہمالیہ کی گود میں، ارمانِ رقص اور رسول میر، گل ریز ... ترجمہ جو تخلیق بن گیا وغیرہ ان کے چند موضوعات
ہیں، جو دلچسپ بھی ہیں اور معنی خیز بھی۔ ان مضامین کا مطالعہ کرنے سے ٹینگ صاحب کی فنی بصیرت، ژرف نگاری اور دیدہ
کا پتہ چلتا ہے۔

ٹینگ صاحب اپنے مادرِ وطن کشمیر سے بے پناہ عشق کرتے ہیں۔ انھیں کشمیر کی تاریخ، تہذیب اور کلچر سے گہرا لگاؤ ہے
وہ یہاں کے صحت مند اقدار عزیز رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی اکثر تحریروں میں کشمیر کی مٹی کی بو باس محسوس کی جاسکتی ہے۔ کشمیر
شعر و ادب کا کوئی نادر ... یا کسی نادر نسخے کی دریافت، ٹینگ صاحب کی دور بین آنکھوں سے کبھی اوجھل نہیں رہتا بلکہ وہ ...
... سے رہ جانے کی ... ہیں ادھر توجہ مبذول کرتے ہیں اور یہی چیز ان کو اپنے معاصرین میں ایک الگ اور منفرد مقام
دلاتی ہے چناں چہ "شناخت" میں ان کا یہی جذبہ کارفرما ہے۔ خود تحریر فرماتے ہیں:

"اس کتاب میں کشمیر اور کشمیری رسائل ... مضامین میں ایک ادبی ربط قائم کرتی ہے اکثر مضامین
جو براہِ راست کشمیر یا کشمیری ادب سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ ایسے واقعوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے ...

کشمیر رہا تھا ۔ (۲)

ٹینگ صاحب کا دوسرا تنقیدی مضامین کا مجموعہ " تلاش " کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔ یہ کشمیری زبان و ادب کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے ۔ اس میں عملی تنقید کے بہت ہی اچھے نمونے ملتے ہیں ۔ شیخ العالم ہو یا للہ دید ، پرمانند ہو یا رسول میر ، محمود ہو یا کامل ، ٹینگ صاحب کا قلم بے تکان چلتا ہے اور نئے خیالات سے نئے نئے رنگ بھر دیتے ہیں اور اپنی تحریروں میں نئی روح پھونک دیتے ہیں ۔

ٹینگ صاحب کی ایک اور کتاب " محمود شناسی " بھی شائع ہو چکی ہے ۔ یہ کشمیری زبان و ادب میں منفرد کوشش ہے اور اضافے کا درجہ رکھتی ہے ۔ یہ کتاب شاعرِ کشمیر محمود کی شخصیت اور ان کی شاعری کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد دیتی ہے اور ان کے بعض اہم گوشے سامنے لاتی ہے ۔ اس کتاب پر ریاستی کلچرل اکادمی نے ٹینگ صاحب کو ایوارڈ سے نوازا ۔

ٹینگ صاحب کے اور بھی متعدد ادبی کارنامے ہیں ، جن کا ذکر کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے ۔ آپ نے کشمیری زبان کے چند اہم شعرا کے کلام کو تلاشِ بسیار کے بعد مرتب کر کے شائع کیا ہے اور ان کی شخصیت اور شاعری پر مدلل بحث کی ہے ۔ ان میں مقبول شاہ کرالہ واری ، محمود اور رسول میر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔ کلیاتِ رسول میر کو آپ نے منفرد انداز میں ایڈیٹ کیا ہے ۔ وہ نہ صرف قابلِ داد ہے بلکہ اس طرح سے آپ نے کشمیری زبان کے صفِ اول کے شعرا کے مکمل کلام کو تلف ہونے سے بچایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی آواز عام لوگوں تک پہنچائی ہے ۔

آپ کی نگرانی میں ریاستی کلچرل اکادمی نے چند بہت ہی اہم پروجیکٹوں پر کام کیا اور ان کو عملی جامہ پہنایا ۔ جن میں کاشر ڈکشنری (دو جلدوں میں) اردو کشمیری فرہنگ (۲ جلدوں میں) اور کاشر انسائکلوپیڈیا (دو جلدوں میں) شامل ہیں ۔ آپ کی سرپرستی میں ریاستی کلچرل اکادمی کے زیرِ اہتمام " اکادمی " کے نام سے ایک خوب صورت " خبرنامہ " برس ہا برس تک شائع ہوتا رہا ۔ اس خبرنامے نے ملک گیر مقبولیت حاصل کی تھی ۔ پرانے مسودات کے وضاحتی کیٹلاگ کی ترتیب ، مختلف شعرا کے قبروں پر کتبے نصب کروانا اور کشمیری زیورات کو جمع کر کے محفوظ کرنا بھی ٹینگ صاحب کے دیگر علمی ، ادبی اور تحقیقی کارناموں میں شامل ہیں ۔ آپ کی سربراہی میں بوک میں یوسف شاہ چک کی قبر پر کتبہ نصب کیا گیا اور اس طرح آپ نے کشمیر کے حقیقی فرزند ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے ۔

ٹینگ صاحب کے اور متعدد علمی و ادبی کارنامے ہیں جن کو کسی بھی صورت میں صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا ۔ انھوں نے نہ صرف اردو کشمیری ، ڈوگری ، پنجابی ، [illegible] زبانوں میں " شیرازہ " باقاعدگی کے ساتھ جاری کرنے کا کام عمل میں لایا بلکہ ان زبانوں کے علاوہ انھوں نے اپنی نگرانی میں انگریزی ، بلتی ، گوجری اور لداخی ادب اور کلچر تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کے لیے [illegible] ۔

ٹینگ صاحب نے [illegible] گوجری زبانوں میں [illegible] سیمیناروں اور مباحثوں کا انعقاد کروائے ۔ یہ [illegible] کہ جن علاقوں [illegible] تہذیب [illegible] ادب کے [illegible] پر معیاری [illegible] انھوں نے مختلف زبانوں کی بھی [illegible]

ٹینگ صاحب کی دیباچہ نگاری بھی ان کی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت ہے۔ انھوں نے کشمیری زبان کے معروف محقق عبدالاحد آزاد (مرحوم) سے لے کر جدید دور کے منفرد اسلوب کے شاعر [illegible] بیگ کے شعری مجموعہ [illegible] بیسیوں اہلِ قلم کاروں کے شعری اور نثری مجموعوں پر نہایت ہی فکر انگیز دیباچے اور مقدمات رقم کیے ہیں۔ انکی تصانیف پر تقریظ اور کچھ پر حواشی لکھی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان دیباچوں میں بھی وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ان کے دیباچے اور مقدمات ایک وقیع سرمایہ ہیں۔ جو تنقید و تحقیق میں ا[illegible] قدر ہے اور علمی و ادبی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ٹینگ صاحب کے حواشی بھی غور و فکر کی دعوت دیتے [illegible] سرپرستی میں ریاستی کلچرل اکادمی نے شعر و ادب، تاریخ، تحقیق اور آرٹ کے حوالے سے جو منازل طے کیے ہیں وہ ان [illegible] ذہانت اور خداداد صلاحیت کا ثبوت ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بہت سی ایسی چیزوں کو تلاش کیا [illegible] علمی ناقدری کی وجہ سے چھپی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں کشمیری زبان کے نامور شاعر اور محقق عبدالاحد آزاد (مرحوم) کی کتاب [illegible] زبان اور شاعری قابلِ ذکر ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے اور آج بھی جب کہ کشمیری شاعری نے ایک اور پڑاؤ [illegible] ہے، یہ تصنیف مستند تصور کی جاتی ہے لیکن آزاد کے انتقال کے وقت یہ تصنیف منتشر حالت میں تھی۔ ان کی بے وقت [illegible] انھیں اپنی اس گراں قدر تصنیف پر نظرِ ثانی کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ ٹینگ صاحب نے آزاد کے اس کارنامے کو از سرِ [illegible] اور اس پر جگہ جگہ حواشی سے گرہیں کھول دی ہیں اور یہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ([illegible] تصنیف "کشمیر میں اردو" کو بھی ریاستی کلچرل اکادمی نے ٹینگ صاحب کے بصیرت افروز مقدمہ اور حواشی کے ساتھ تین [illegible] شائع کیا ہے۔ اس قابلِ قدر کتاب کی اشاعت کا پروگرام بھی سروری مرحوم کے انتقال کے بعد کئی سال تک التوا میں [illegible] ٹینگ صاحب کی ذاتی کوششوں سے آج ہمارے سامنے جموں و کشمیر کے شعر و ادب کی مکمل تاریخ ہے۔

ٹینگ صاحب سائنٹیفک نظریہ تنقید کے حامی ہیں۔ اگرچہ وہ قدیم اور فرسودہ میزانِ نقد پر یقین نہیں رکھتے ہیں اور [illegible] روئے کار لاتے ہیں لیکن کسی ادب پارے کو جانچنے پرکھنے اور برتنے کے لیے اس عہد کا احاطہ ضرور کرتے ہیں جس میں ا[illegible] ہوئی ہو۔ انھوں نے نظری اور عملی دونوں طرح کی تنقیدیں لکھی ہیں۔ ٹینگ صاحب کے ہاں آج کل کے بہت سارے نقا[illegible] اشعار اور اقتباسات کی بھرمار نہیں ملتی ہے لیکن وہ اپنی تنقیدوں میں کتابوں اور ادبی شخصیتوں کے نام اور ادبی تحریکوں [illegible] واضح اشارے ضرور کرتے ہیں اور اس طرح اپنی تنقیدوں کو وزن دار بناتے ہیں۔ وہ ایسی نثر کو پسند کرتے ہیں جس [illegible] علمیت کا مظاہرہ کیا گیا ہو بلکہ خیال ستھرا اور نکھرا ہوا ہو۔ ٹینگ صاحب کی انھی خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے [illegible] (مرحوم) نے آج سے تقریباً ستائیس سال قبل اسے مخصوص انداز میں لکھا؛

"میں پوری ذمہ داری اور دیانت داری کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اردو زبان و بیان پر جو قدرت ٹینگ صاحب کو حاصل ہے وہ کم از کم اس ریاست کے کسی دوسرے ادیب اور صحافی کو حاصل نہیں ہے۔"

ٹینگ صاحب کی تحریروں میں اسلوبی وسعت ہے۔ قیاس آرائیوں پر عمل کرتے [illegible] کرتے ہیں اور تجربات کو وضاحت سے بیان کرنے کے قائل ہیں۔ ان کا اندازِ تحریر منفرد ہے اور [illegible] تنقیدی میزانوں کو اپنانے کے وقت تعصب سے کام نہیں لیتے اور نہ ہی فیصلہ دینے کے وقت دور کی کوڑی [illegible]

ہیں بلکہ اپنے ڈھنگ کے انداز میں بات کہنے کا گر رکھتے ہیں۔ زبان و بیان کے معاملے میں بھی وہ بڑے محتاط ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) لکھتے ہیں:

"یوسف ٹینگ اپنے سوچنے کے انداز میں اور لکھنے کے اسلوب میں ہر جگہ اپنی انفرادیت قائم رکھنے اور بعض اوقات اس کو نمایاں کرنے کی طرف بھی مائل ہیں اور اس میلان کی بدولت کبھی کبھی ان کے قلم سے کچھ ایسی ترکیبیں اچھے اشعار اور لفظ ادا ہوگئے ہیں۔" (۶)

ٹینگ صاحب شاعر نہیں لیکن ان کی نثر بڑی دل کش ہوتی ہے۔ تنقید کی زبان عام طور سے پیچیدہ کھردری اور سپاٹ ہوتی ہے لیکن اس طرح کا الزام ٹینگ صاحب کو نہیں دیا جاسکتا ہے۔ ان کا طرز استدلال بڑا دل نشین ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا ان کی تحریریں پڑھ کر قائل ہوجاتا ہے۔ ٹینگ صاحب زبان و بیان دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ دور حاضر کے ایک اہم قلم کار ہیں انھوں نے تحقیق و تنقید کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں۔ اسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ooo

حوالے:

(۱) رسالہ باوتھ۔ (محمد یوسف ٹینگ نمبر) اکتوبر ۱۹۹۹ء تا مارچ ۱۹۹۷ء، جلد ۹، ص: ۹۱۔

(۲) رسالہ باوتھ۔ (کشمیری) محمد یوسف ٹینگ نمبر ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۹ء تا مارچ ۱۹۹۷ء، ص: ۹۱

(۳) جلوہ صد رنگ۔ ڈاکٹر برج پریمی۔ ص: ۲۱۶۔

(۴) شناخت۔ محمد یوسف ٹینگ۔ ص: ۲۲۵۔

(۵) ہفت روزہ۔ آئینہ۔ سری نگر۔ ، جولائی ۱۹۷۵ء، ص: ۸۱

(۶) کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم)۔

o●o

شبنم عشائی

ایک نظم

o

میں اس کا کھویا ہوا کل ہوں
اس کی انا پرستی نے مجھے
اپنے قدموں سے روندا ہے
سیاست دانوں کا جھوٹ
مہذب ہوتا ہے
وہ اپنی غلطیوں کو تسلیم نہیں کرتے
دوسروں کے خوابوں کا سودا کرتے ہیں
اس کا آج، اس کی زندگی کی دوپہر ہے
اس کی زندگی کی شام اس کا کل ہے
اور وہ میں ہوں
آج وہ ہم سے دیکھے ہوئے آخری خواب کو
بھٹکتی ہوئی
آسمانوں میں سرایت کر رہی ہے
کل اس کو مجھ میں ڈھونا ہے
کل میں پیشانی کو پھر ہمکیں گی
جو کہ صدیوں کا لباس ہے
کیا کل اس کی آمد پر
میں اس کا ہاتھ تھام سکوں گی؟
آج میں اس کی چوکھٹ پر
مجھے جذبوں کے قحط میں پڑی
سکڑ رہی ہوں
لاتعلقی کی تلوار
میرے اندر ٹوٹ کے رہ گئی ہے
اس کو کون سنبھالے گا؟
مجھے اپنے اصل میں شامل نہ ہونے دیا گیا
میں اپنی بازگشت سے بھر گئی ہوں
میں اس کو کل کہاں رکھوں گی؟
دل میں
جو اس کی مکاری کے ہاتھوں
اجڑ گیا
اگر اجڑنے کا زہر
میرے سارے جسم میں پھیل گیا
میری سانسوں کو کون سنبھالے گا؟
وہ کل کہاں جائے گی؟

عطیہ ارسلان

نظمیں

(۱)

صبح جب
نیند سے بیدار ہوئی
کھڑکی کا پردہ کھینچ کر
باہر دیکھا تو
سورج
رات بھر اپنے بیڈروم میں
جلتے ہوئے دیے سے بھی
چھوٹا لگا

(۲)

صدف میں بند ہے قطرہ
موتی بننے کے انتظار میں
لیکن
اس کے زندگی کے دن پورے ہوگئے
اور وہ
موتی بننے سے پہلے
سوکھ گیا
صدف اپنی قسمت پر
اشک بہا رہا ہے !

انیس پروین

آئینہ

○

آج دفتر میں
اسے پاس بلاکر اپنے
تم نے چپکے سے کہا کہ
" مجھے ، پاپا نہ کہو "
لوگ پوچھیں گے تو
کہہ دینا
" میرے انکل ہیں "
اور کچھ بھی نہ بتانا ان کو !
یہ بھی سوچا ہے کبھی ؟
وہی چہرہ ، وہی آنکھیں
وہی ابرو ، وہی لب
یہ تو " آئینہ " ہے
جس میں نظر آتے ہو " تم " !
اور آئینے بھی
جھوٹ نہیں بولا کرتے !

○○○

من موہن تلخ

٥

فکر کی وہ حد، جس جا سب کے پاؤں جلتے ہیں
سیر کو ادھر ہم تو روز جا نکلتے ہیں

وہ سماں بھی کیا ہوگا جب خلاؤں میں پہنچوں
نور گھول کر اپنا آفتاب ڈھلتے ہیں

اک ذرا سا کہہ تو دے جو بھی تیرے دل میں ہے
دیکھ وقت کے تیور کس طرح بدلتے ہیں

کیا ملیں گے ہم گھر میں، ہو سکے بھی نہیں ہوتے
کیا ملیں کہیں باہر، گھر سے کب نکلتے ہیں

دس قدم کی دوری پر ساتھ چل رہے ہیں سب
ہم دہکتے شعلوں پر ننگے پاؤں چلتے ہیں

ایک ایک پل یہ جو، اب ہے ایک دن جیسا
ایک ساتھ دنیا میں کتنے دن نکلتے ہیں

میں نہ ہاتھ آؤں گا، کیا کہوں حریفوں کی
روز چال چلتے ہیں روز ہاتھ ملتے ہیں

صاف کیوں نہیں کہتے جانتے نہیں کچھ بھی
کچھ بھی جانتے ہیں تو بات کیوں بدلتے ہیں

تم ہوا کے رکنے کے منتظر ہو، مرضی ہے
ہم چراغ ایسے ہیں جو ہوا سے جلتے ہیں

یوں بلندیوں کے تو اور بھی تقاضے ہیں
جو زمیں کو تکتے ہیں وہ کہاں سنبھلتے ہیں

بوجھ کم نہ یادوں کی اور تھک گیا ہے یوں
ساتھ عمر کے ہم بھی روز شام ڈھلتے ہیں

اب ذرا سنبھل کر چل وہ مقام آیا ہے
جس جگہ سے ہر لحہ راستے بدلتے ہیں

ٹھیک ہے کہ اب آگے وسعتیں خلا کی ہیں
جو تھکے ہیں، دم لے لیں، تلخ ہم تو چلتے ہیں

٥٥٥

من موہن تلخ

○

یوں گم ہوئے خود میں کہ صدا بھی نہیں دیتے
ہم اپنی ہوا تک کا پتہ بھی نہیں دیتے
ہر بات سے یوں سب کا یقیں اٹھ سا گیا ہے
چپ خود کو لگا لی ہے ، دعا بھی نہیں دیتے
کٹتے بھی ہو اک دوسرے سے کٹ گئے بالکل
اور بیچ کی دیوار گرا بھی نہیں دیتے
اک دن میں کوئی بات سرے بھی نہیں چڑھتی
اور کل پہ کوئی بات اٹھا بھی نہیں دیتے
اسس عمر میں جینا ہمیں پیڑوں نے سکھایا
یوں سانس وہ لیتے ہیں پتہ بھی نہیں دیتے
اب اپنا کہا بھی تو کبھی ہم نے نہ مانا
ہم اپنی طرف دھیان ذرا بھی نہیں دیتے
یہ ٹھہرے ہوئے لوگ ڈبو دیں گے مرا نام
دو چار قدم اور چلا بھی نہیں دیتے
ہر بات پہ تم تلخ کی تصدیق بھی مانگو
اک بار مگر اسس کو بتا بھی نہیں دیتے

○○○

مظفر حنفی

○

میر نہیں ، بلبل[1] سے یاری کرتے کیا
اب آہوں میں ساجھے داری کرتے کیا
ایک نظر میں ہو جاتا ہے کام تمام
ان پر مرنے کی تیاری کرتے کیا
دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہم نے بھی
پتھر کے بدلے گل باری کرتے کیا
جی ہاں ، روکا تھا پھل دار درختوں نے
چلنا بھی ہے اک بیماری ، کرتے کیا
غم کی پگڈنڈی پر بس دو راہی تھے
ہم اک دوجے کی سالاری کرتے کیا
میرے سب احباب مظفر مخلص تھے
لیکن مخلص تھے غم خواری کرتے کیا

○○○

[1] آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

خرم بہزاد

○

رات ایک محفل میں گفتگو نمو پر تھی
ہر زبان تھی ساکت ۔ ہر نگاہ ششدر تھی
اک سوال کی لو سے ہونٹ جھلسے جاتے تھے
اک جواب کی ٹھنڈک آہ کے برابر تھی
ایک بے یقیں لہجہ خوف سے لرزتا تھا
اک چھپی ہوئی حیرت ۔ حیرتوں سے باہر تھی
وہ سخن زباں پر تھا جس کو دل میں رہنا تھا
وہ شکن جبیں پر تھی جو ادائے بستر تھی
میں بہت ہراساں تھا زخم کے نہ بھرنے سے
ایک شب کی مہلت تھی اور جنگ سر پر تھی
شاخِ دل کی ہریالی خواب کا بیاں ٹھہری
میں نے جس کو نم رکھا وہ زمیں ہی بنجر تھی
مجھ میں ایک دریا ہے جو بپھرتا رہتا ہے
پہلے ایک صحرا تھا جس پہ چپ کی چادر تھی
میں نے اس کو ہر لحظہ جسم سے پکارا تھا
اب کھلا کہ وہ خواہش روح کے برابر تھی
عشق کی کرامت ہے ورنہ عمر کے ہاتھوں
خال و خط کی ویرانی حسن کا مقدر تھی
کیا ہوئے وہ لب جن سے پھول ہی برستے تھے
کیا ہوئی وہ شادابی جو ہمیں میسر تھی
خرم بے سبب دیکھا تم نے خوابِ سیرابی
وحشت کے تسلسل میں تشنگی ہی بہتر تھی

○●○

جوش ملسیانی

○

ایک طوفان کی آمد ہے فضا بولتی ہے
سرنگوں سروِ چمن ہوگا ہوا بولتی ہے

آج پھر مشقِ ستم ہے کوئی مظلوم و غریب
درِ زنداں سے یہ چیخوں کی صدا بولتی ہے

ایک سورج جو شفق خون میں ڈوبا ہے ابھی
رنگ وہ لائے گا کرنوں کی ادا بولتی ہے

مرنے والے نے اٹھائی ہے اذیت کیا کیا
تم نہیں بولتے ۔ مخلوقِ خدا بولتی ہے

خونِ ناحق سے حنا دل کے بچے گا کیوں کر
سر پہ صیاد کے مشتاق قضا بولتی ہے

چلتے پھرتے ہوئے معتوب و ستم کش چہرے
سب گنہگارِ وفا ہیں یہ ہوا بولتی ہے

اب کے برسوں تو نکھر جائے گا سارا گلشن
جوش اٹھتی ہوئی گھنگھور گھٹا بولتی ہے

○●○

شکیل اعظمی

○

راستہ تھا تو کوئی گھات بھی ہو سکتی تھی
بچ نکلتے تو بری بات بھی ہو سکتی تھی

میں نے یہ سوچا کہ صحرا میں بھی تو رہتا ہے
اسی ایمان پہ برسات بھی ہو سکتی تھی

گہرے پانی میں اترتے ہوئے سائے کی طرح
ڈوبنے والی مری ذات بھی ہو سکتی تھی

وہ تو اچھا ہوا تم مل گئے رستے کی طرح
ورنہ جنگل میں ہمیں رات بھی ہو سکتی تھی

اب کہیں شام کو لوٹے گا وہ اندھا ہو کر
صبح آتے تو ملاقات بھی ہو سکتی تھی

موت کو اس لیے آنے دیا دروازے تک
زندگی ! یہ تری سوغات بھی ہو سکتی تھی

جانے کیا کھویا ہوا [illegible] ہیں شکیل
زندگی حسبِ [illegible] بھی ہو سکتی تھی

○○○

○

معتبر آئینہ ، لفظ و قلم ہونے لگا
میرا پیکر مری آواز میں ضم ہونے لگا

پتیاں سبز ہوئیں ، پھول کھلے شاخوں پر
بادلوں کا مری مٹی پہ کرم ہونے لگا

اب زمیں پائے گی مجھ کو تو بہت روئے گی
آسماں کو بھی مرے کھونے کا غم ہونے لگا

ایک تنہائی دعاؤں میں کبھی مانگی تھی
اسی تنہائی سے اب ناک میں دم ہونے لگا

دونوں جانب سے بڑھے ہاتھ گرانے کے لیے
فاصلہ بیچ کی دیوار کا کم ہونے لگا

میرؔ کا کرب مری روح میں در آیا ہے
میرا کاغذ بھی مرے اشکوں سے نم ہونے لگا [1]

○○○

[1] میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
[illegible] ۲۰۰۷

نزہت قادری

○

انا کی کمند فلک پہ ڈالیے
خود کو حصارِ ذات سے باہر نکالیے

بچھائیے خدا کے لیے دوستوں کو بھی
سانپوں کو آستینوں میں ہرگز نہ پالیے

شاید ہی اب سکوں کے گوہر نصیب ہوں
پتھر نچوڑیے کہ سمندر کھنگالیے

ہو جائے گا ضرور شفق رنگ آسماں
خونِ جگر کچھ اور فضا میں اچھالیے

احساس فراز ہو کے رہے گا شعورِ فن
دل کا لہو ، نچوڑ کے لفظوں میں ڈھالیے

مقصودِ فن خلوص و محبت ہے قادری
نفرت کی بات ہو تو اسے ہنس کے ٹالیے

○●○

نگار سجاد ظہیر

○

سحر کی طرح ، چراغِ نظر جلائے چلو
شبِ فراق ہے ، قلب و جگر جلائے چلو

یہ زہر ناک جوانی ، سفر بہ دوشِ حیات
وفا بہ دوش سبھی بال و پر جلائے چلو

رضا کے پھول ، وفا کے چراغ روشن ہوں
مگر فراشِ قناعت کے دکھ اٹھائے چلو

عوض ، معاوضہ ، بدلہ ، صلہ ، اجر کیسا ؟
مقامِ عشق ہے ، یاں سر ، نظر جھکائے چلو

وفا گریز ہے کوئی ، وفا شعار مجاز
وہ شر اٹھاتے رہیں ، تم بدن کٹائے چلو

جفا کا شکوہ [illegible] ، وفا کی [illegible]
خود اپنے [illegible]

○●○

انیس پروین

○

ہوا تھی تیز بہت • روشنی بھی کیا کرتے
بِنا تمہارے بسر • زندگی بھی کیا کرتے!

وہ شخص چھوڑ گیا • جس کو ٹوٹ کر چاہا
بھلا نہ پائے اسے • دشمنی بھی کیا کرتے!

جبیں تڑپتی رہی • ایک آستاں کے لیے
صنم ملا نہ کوئی • بندگی بھی کیا کرتے

ہیں آبگینوں سے نازک یہ دل کے رشتے بھی
لگے نہ ٹھیس انہیں • بے رخی بھی کیا کرتے!

ہے ظلم اور تشدد • دلوں میں نفرت ہے
خلوص مل نہ سکا • دوستی بھی کیا کرتے!

سبھی منافق بنے • زندگی میں جو پروین
ملاتے نہ نظر • دل لگی بھی کیا کرتے!

○○○

○

تری تلاش میں یوں روز و شب گزرتے ہیں
نہ جی ہی پاتے ہیں ہم اور نہ ہی مرتے ہیں!

صبا سے تیرا پتہ • پوچھتے ہیں رو رو کر
کلی سے ذکر ترا • بار بار کرتے ہیں!

سبب جدائی کا جب پوچھتے ہیں سب ہم سے
بتا بھی سکتے نہیں • اور نہ غم کرتے ہیں!

وفا شعاری تو مشکوک ہے ہماری یہاں
وطن کی آن پہ ہم • کچھ بھی کر گزرتے ہیں!

ہیں غرق بحرِ حوادث میں اس طرح پروین
کہ ڈوبتے بھی نہیں • اور نہ وہ ابھرتے ہیں!

○○○

اسلم عمادی

تجزیہ

نور پرکار کی نظم "کہا اس نے ۔۔۔ "

اسلوبیاتی مطالعہ کے لیے زمانہ ۔ حال میں ایک اہم موضوع مقیم (RESIDENT) اور غیر مقیم (NON-RESIDENT) شعرا اور ادبا کی تخلیقات کا تقابلی موازنہ بھی ہوسکتا ہے ۔ وطن اور دیارِ غیر میں بسنے والے فن کاروں کے تجربات ، مسائل اور موضوعات میں واضح تفاوت ہے ۔ شائع ہونے والی تخلیقات کا اگر بہ غور مطالعہ کیا جائے ، ایک ہی وقتی نقطہ پر دونوں ہی جانب دو جدا لب و لہجہ کے ادب و شعر فروغ پا رہے ہیں اور دونوں ہی اردو کی بقا اور ترقی کے لیے اہم کردار ادا کر رہے ہیں ۔

میرا ایک سطحی اندازہ یہ ہے کہ غیر مقیم شعرا جغرافیائی فضا اور بصری عناصر کے مقابل داخلی الوان اور لفظیاتی واسطہ کی جانب زیادہ مائل نظر آتے ہیں ۔

غیر مقیم شاعر کی ایک مثال نور پرکار ہیں ، جن کی زیرِ مطالعہ نظم اسی قسم کی داخلی کیفیت سے مملو ہے ۔ نور پرکار برسوں سے کویت میں مقیم ہیں ، یہاں کے ادبی اور ثقافتی حلقوں میں اردو کے ایک اہم نمائندہ ہیں ، ادبی تحریکات ، مشاعروں ، محفلوں اور مناظروں میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں ۔ ان کی ادبی خدمات میں مراٹھی کے تراجم ، افسانے ، نثری مضامین ، شاعری اور اہم ادبی رسائل کی "مہماں" ادارت سب شمار کیے جاسکتے ہیں ۔ اگر ان کی مصروفیات کو دیکھا جائے تو بے حد خارج پسند (EXTROVERT) شخص ملے گا لیکن ان کی نظموں کی طرف دیکھیں تو احساسِ ذات کی ایک داخلی سمت ان میں نظر آئے گی ۔ ایسا شخص جو اظہارِ ذات کے لیے عوام کی پسند اور رائج لب و لہجہ کی پروا نہیں کرتا ، عموماً غیر ممالک کی ادبی محفلوں میں نثری شاعری پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے ۔ اکثر متشاعر اور نیم شاعر تو بدک جاتے ہیں ۔ پھر محدود محفلوں میں گہرے ادب کا رواج نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے "زبانِ میر سمجھے ۔۔۔" والی کیفیت ہے ۔ لیکن نور نے بڑی دلیری (بلکہ دیدہ دلیری) سے روایت سے انحراف کیا ہے ، قصداً اور ارادتاً ۔ نور پرکار کی نظم کا واحد متکلم بالکل منفرد ہے ، تنہائی پسند بلکہ فراریت کی طرف مائل ، خارج کے مقابل داخل کی طرف راغب ، اکھڑا اکھڑا سا ایک شخص بھیڑ سے الگ ہوتا ہوا ۔۔۔ (یہ تو وہی نور پرکار نہیں [illegible]) ایک جداگانہ سا احساسات سے بوجھل فرد نظموں کے مرکزی کردار میں ملتا ہے ۔

نظم کا جائزہ نور پرکار بنیادی طور پر افسانہ گو ، بلکہ افسانہ گر ، ہیں ۔ ان کی بیشتر نظمیں نثری آہنگ میں ہیں بلکہ بڑی حد تک شعری نثر پارے نظموں کے ظروف میں احساسات کے لبالب چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

طرح ہیں جن کی ہر جھلک میں ایک تصویر کی لہر اٹھتی ہے۔

نور کی زبان مکالمے کی زبان ہے وہ مکالمے بولتے ہیں۔ مکالمے سنتے ہیں اور مکالموں کے واسطے سے اظہار کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی زیرِ تجزیہ نظم بھی ایک مکالماتی فن پارہ ہے۔ بالکل کسی افسانوی کردار کی زبان سے مدھم آہنگ میں خود کلامی سے قریب تر نج پر سادہ اور عام زبان میں اظہار درد ہے۔ اس نظم کا مرکزی کردار ایک ایسا شخص ہے جو ایک ایسی تشکیک کا شکار ہے جو تجربات کی تلخیوں اور رشتوں کی ناکامیوں سے منتج ہوتی ہے۔ لیکن یہ تشکیک سراسر شکست خوردنی نہیں ہے۔ اس کے پس پردہ بھی ایک ہلکی سی امید ہے جو سبزہ خودرو کی طرح حالات کی گرد کے تلے سے ابھرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

نور نے اس نظم میں جو تراکیب استعمال کی ہیں وہ بیش تر نیم تشبیہی ہیں۔ مستعمل علامات محدود ہیں۔ لفظوں کو ان کے مروجہ مطالب سے قریب تر رکھا گیا ہے۔

ان کی نظموں میں ایک عمومی رجحان یہ ہے کہ رواں دواں مکالماتی نہر میں کہیں کہیں اچانک ایک ایسا ان مل (بے جوڑ سا) جملہ یا نعرہ داخل کردیا گیا ہے۔ جو نہ صرف یہ کہ روانی کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے "ان کی فکری یکسانیت میں شکن پیدا کر کے معنویت کو نیا رخ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً "نہ جانے ان دنوں" سے "نہ رواں دواں میرا" تک ایک رواں جملہ ہے جو یکایک

"نہ روایت نہ کوئی عجیب قصہ ہے۔"

سے ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن تسلسل کو نبھاتے ہوئے شاعر فوراً "پھر بھی اس سے برقرار ہر رشتہ ہے" کے مصرعے سے پورے بیان کو دوبارہ نفسِ مضمون کی باز آمد کی کوشش کرتا ہے۔

اسی طرح دوسرے بند میں "یا نام کی یا وہ کوئی میں" ایک ایسا ہی ان مل سا جملہ ہے۔ اس نظم کے پہلے دو بندوں میں شاعر کا مقصود کردار ایک غائب سی شخصیت ہے۔ جس کی کوئی توصیف نہیں کی گئی ہے۔ کوئی رومانی نسبت نہیں بیان کی گئی ہے۔ ہاں ایسا ضرور لگتا ہے کہ وہ کوئی ایسی مونس شخصیت ہے جو شاعر کو اس کے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ بے تعلق ہوتے ہوئے قریب تر اور راز دار بھی۔ یہ غائبِ مقصود اپنی حرکات سے شاعر کی رفاقت کردار ادا کرتا ہے :

"اسے یقین ہے کہ
گنگناہٹ میں خاموشی بھی بولے گی۔۔۔
بانہوں میں انگلیاں ہزار زبانیں کھولیں گی۔۔۔"

یہ غیر حاشق طور پر ہم رازی نبھانے والا فرد سادہ بھی ہے کہ سنگلاخ حیات کا ادراک بھی نہیں رکھتا۔ یہ بالکل بے سبب بے مطلب طور پر شاعر کے ساتھ ساتھ سفر میں مصروف ہے۔ وہ تو اس بات سے بھی واقف نہیں :

"کہ دوست لپٹانے کی سی ہوا میں نہیں!"

(یہاں پر "سی" کا لفظ استعمال کر کے۔ شاعر نے بہ ظاہر ایک بے ربط لفظ کے ذریعے گہری معنویت پیدا کرنے

کوشش کی ہے۔

اور یہ کہ "سنہری سویرا آنگنوں میں پلتا ہی نہیں۔"

ایسے معاشرے میں جس میں آنگن ناپید بلکہ خیالی سا جزوِ مکان ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں سویرا اترنے یا پلنے کی شاعر میں بھی جیسے خواب آسا فن کار کی فکر سے نسبت رکھتی ہے۔ اپنے وطن سے دور "فلیٹوں کے (عمیق مرحوم کے بہ قول "بند کا ایک کمروں کے") مکین کچھ ایسے ہی کرب کا شکار ہیں جو وطن سے متعلق جغرافیائی، فکری، اقداری رشتہ کی کمزوری اور بعد کے سبب ہے۔ نہ اس میں کوئی آنگن ہے نہ کوئی مانوس موسم۔ یہاں کی خوشی مسرت اور تسکین خانوں میں بٹی ہوتی ہیں۔ کیوں کہ بہ قول شاعر:

"جسم کے خوش حال ہونے کا کوئی موسم نہیں"

نظم کے آخری بند میں پہنچتے ہی احساس ہوتا ہے کہ شاعر اپنے مقصود ہم راز، کو گھر کے ابعاد سے نکلتے اور باہر آتے ہی راستہ کی گرد میں فراموش کر چکا ہے۔ کیوں اجنبی راستے پر وہ بھی ان ہزارہا سفر کرنے والوں میں ایک ہے جو ایک سست رو خود کشی میں لگے ہوئے ہیں اور اس کا ان کو خود بھی علم ہے نہ اطلاع کیوں کہ:

"کہ آتما سے پرماتما تک
کھلے راستوں پر
کوئی قاتل ہی نہیں
اور سبھی مقتول ہیں"

انجام کار شاعر حقائق اور حقائق کے اظہار سے دامن کشاں ہونا چاہتا ہے، اپنی تخلیقی دنیا سے فرار چاہتا۔ اپنے، حساسات کے بھیانک در و بام سے گریزاں ہو رہا ہے:

"بجھے بجھائے کمروں میں
جب کبھی اپنے لکھے شبدوں سے ڈرتا ہوں
تو تنہا شہر کے گلی کوچوں میں
پھرا کرتا ہوں۔۔۔"

یہ شہر کے گلی کوچوں میں پھرنا، تھک جانے کے لیے ہے کہ اس کے سارے کریہہ کرب بھرے احساس فراموش کاری کے پردے میں چھپ جائیں بلکہ کھو جائیں، تاکہ سفر نصیب ہو۔

نور پرکار کی یہ نظم ان کے اسلوب کی ایک نمائندہ نظم ہے۔

○●○

نقد پرکار

کہا اس نے ۔۔۔۔

○

نہ جانے ان دنوں
یہ کیا ہو گیا ہے مجھے
کہ سوا اس کے کچھ نظر ہی نہیں آتا
نہ وہ کوئی غم گسار ، نہ رازداں میرا
نہ روایت نہ کوئی عجیب قصہ ہے
پھر بھی اسی سے برقرار ہر رشتہ ہے
کل پچھلے پہر کہا اس نے
کہ میری بخشش کی ضمانت میں
میں پھر کوئی نظم کہوں ؛
بے سبب چلوں
کسی اور آئینے میں نہ چہرہ دیکھوں
اسے یقین ہے کہ
گنگناہٹ میں خامشی بھی بولے گی
بالوں میں انگلیاں ہزار زبانیں کھولیں گی !

○

کون سمجھائے اسے
کہ دوست اپنانے کی سعی ہوا میں نہیں
کوئی سویرا آنکھوں میں پلتا ہی نہیں
صرف ہجر میں ، نہ اجالا میں سکھ آتی
جسم کے پھول کھلنے کا کوئی موسم ہی نہیں
میں یہ کیسا لکھتا ہوں

کہ محبت تو نرا جھوٹ ہے
جس کے اطراف میں
لعنت پہ لعنت جمی ہے
بڑی دیوار تنی ہے
یا نام کی یا وہ کوئی ہیں
غزل سرائی یا فلسفہ طرازی
ہر ترجمانی پرائی ہے ۔۔۔ !

○

یہ بھی عجیب بات ہے
کہ آتا ہے پتا تک
کھلے راستوں پر
کوئی قاتل ہی نہیں
اور سبھی مقتول ہیں
حقیقت تو صرف ظلم ہے
اور ظلم کی کس کو پہچان ہے ؟

○

بے جانے گروں میں
جب کبھی اپنے تجھے سجن سے ڈرتا ہوں
تو صدا عمر کے کچھ کونوں میں
بکھرا کرتا ہوں ۔۔۔ !!!

تجزیہ

علی ظہیر

بانگِ درا کی ایک مشہور غزل

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ ویسے بھی غزل اردو کی ایسی محبوب اور ہر دل عزیز صنف سخن رہی ہے کہ آج تک بھی اکثر شعرا اپنی شاعری کا آغاز غزل ہی سے کرتے ہیں۔ چند ایک کو چھوڑ کر آج کے جدید نظم گو شعرا بھی غزل کہتے رہتے ہیں۔ ترقی پسند دور میں بھی چاہے مخدوم ہوں، فیض ہوں یا سردار، سبھی نے اس خوب صورت صنف میں برابر طبع آزمائی کی ہے۔

۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب لاہور میں کئی ادبی انجمنیں تھیں اور چھوٹے چھوٹے مشاعرے اکثر منعقد ہوتے تھے۔ اقبال کو ان مشاعروں میں زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ لیکن کب تک۔ دوستوں کے مجبور کرنے پر انھوں نے ایک مشاعرہ پڑھا۔ اس میں شہزادہ مرزا ارشد گورگانی بھی تھے۔ جب اقبال نے اپنی غزل کا یہ شعر پڑھا۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے　　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو مرزا ارشد نے بے تحاشہ داد دی اور کئی بار اُس شعر کو پڑھوایا۔ اس طرح اقبال لاہور میں ایک نوجوان شاعر کی طرح منظرِ عام پر آئے۔ شاید اسی غزل کے ماحول نے انھیں اس وقت کے ہندستان کے سب سے بڑے غزل گو شاعر داغ دہلوی سے اصلاح لینے کی بھی ضرورت محسوس کروائی۔

گو کہ بہت جلد استادی اور شاگردی کا یہ مراسلاتی سلسلہ داغ کے ان جملوں پر ختم ہوا "کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے"۔ یہ داغ کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی زندگی میں ان کے شاگرد کا نام مشہورِ زمانہ ہو گیا چناں چہ داغ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال ان کا شاگرد ہے۔ شاگرد نے بھی استاد کا یادگار مرثیہ لکھا اور حق ادا کیا۔ اپنے ابتدائی دور میں اقبال نے نظم گوئی بھی شروع کردی تھی۔ چناں چہ ان کی نظم "ہمالہ" ۱۹۰۱ء کی ہے۔ اس ایک نظم نے انھیں وہ مقبولیت عطا کی جو ابھی تک غزل کی شاعری سے انھیں نہیں ملی تھی۔ شیخ عبدالقادر "بانگِ درا" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اقبال سے کہا کہ "ہمالہ" والی نظم ان کے رسالے "مخزن" میں شائع کرنے کے لیے دے دیں اور دوسرے مہینے کے لیے کوئی اور لکھیں۔ "انھوں نے (یعنی اقبال نے) اس نظم کے دینے میں پس و پیش کی کیوں کہ انھیں (یعنی اقبال کو) خیال تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں۔ مگر میں دیکھ چکا تھا کہ وہ بہت مقبول ہوئی اس لیے میں نے زبردستی وہ نظم ان سے لے لی اور مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا، شائع کردی۔

یہاں سے گویا اقبال کی شاعری کا پبلک طور پر آغاز ہوا۔ نظم سے ان کی مقبولیت کے آغاز کے باوجود غزل برابر ان کو اپنی طرف کھینچتی رہی۔

زیرِ مطالعہ غزل "کبھی اے حقیقتِ منتظر..." اسی زمانے یا اس سے تھوڑے عرصے بعد کی کہی ہوئی ہے۔ چناں چہ "ہمالہ" اور یہ غزل دونوں اقبال کے پہلے اردو مجموعہ کلام "بانگِ درا" میں شامل ہیں۔ وقت کا فیصلہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ "ہمالہ" کی شہرت تو

ہی۔ وہ نظم جس نے ۱۹۰۱ء کے اردو داں طبقہ کو جو یقیناً فارسی داں اور تھوڑا بہت عربی داں بھی تھا، متاثر کیا تھا اور آج یہ ابتدائی معمولی نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ جب کہ زیرِ مطالعہ غزل اپنی تخلیق کے تقریباً سو سال بعد بھی نہ صرف اردو جاننے بلکہ ہندی اور دیگر ہندستانی زبانیں جاننے والوں کو متاثر کرتی رہتی ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں جو آج کل کے فلمی گانوں اور کو ہی پسند کرتے ہیں۔ اقبال کی اس غزل سے نہ صرف روشناس ہیں بلکہ اسے گنگناتے اور گاتے بھی ہیں۔ شاید یہ اس لیے نظم پھیلنے کا عمل ہے اور جو چیز پھیلتی ہے وہ تحلیل ہوجاتی ہے اور غزل سمٹنے یا مرکوز ہونے کا عمل ہے اور جو چیز سمٹتی ہے concentra ہوتی ہے وہ ٹھوس ہوجاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر تحلیل ہونے والی چیز غائب ہوجاتی ہے۔ اس کا محلول کی طاقت پر ہوتا ہے۔ بعض محلول ایسے ہوتے ہیں جو اپنے solvent پر غالب آجاتے ہیں اور ہمیشہ اپنا اثر باقی رکھتے ہیں، مسجدِ قرطبہ۔ اسی طرح ہر ٹھوس ہوجانے والی شئے ضروری نہیں کہ خوب ۔ ۔ت بھی ہو۔ ۔ بہرحال یہ مسائل بہت ہیں۔ اب آئیے اقبال کی اس غزل کی طرف۔ اس کے مطالعے کے وقت اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ یہ غزل اقبال کے دور کی ہے جب اقبال اپنا تصوف کا بیک گراؤنڈ رکھتے ہوئے کسی نئے منظر نامے، جو اخلاقی وہ مذہبی فکر پر ہو کی طرف راغب لیکن ابھی وہ تشکیک کے دور سے پوری طرح باہر نہیں آئے تھے۔ پھر بھی بانگِ درا کی اشاعت سے قبل جو ۱۹۲۴ء میں ہوئی ان کے مجموعے فارسی میں شائع ہوچکے تھے۔ اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی اور پیامِ مشرق۔ یعنی انھوں نے اپنا "خودی" کا تصور دیا تھا۔ تو یہ غزل ہوسکتا ہے کہ اقبال نے اپنی ابتدائی وحدت الوجود والی فکر سے ہٹ کر "فلسفہ خودی" کے اعلان کے بعد۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں سوچنا پڑے گا کہ اقبال کبھی واقعی وحدت الوجود کے نظریے سے پوری طرح باہر آسکتے تھے یا نہیں۔

میرے خیال میں اٹھارویں صدی کے بعد اردو غزل دو بنیادی اسلوبوں یا دھاروں پر چلتی رہی ہے۔ ایک میر کا اور دوسرا۔ میر کا اسلوب دروں، زمینی یا نسوانی ہے اور سودا کا آفاقی، کائناتی اور مردانی ہے۔ یہاں نسوانی اور مردانی سے مراد کم زوری ت ور نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کی complimentary طاقتیں ہیں اور دونوں کے صرف افعال جدا ہیں لیکن قدرت یا برابر کی ہے۔ میر نے اپنے اسلوب کو اس قدر خلاقی سے بھرپور انداز میں استعمال کیا کہ کوئی میر کے اسلوب پر چلنے والا چپ ہی۔ جو بھی میر کے اسلوب میں شعر کہتا ہے پہچانا جاتا ہے۔ جب کہ سودا کا اسلوب غالب، اقبال اور فیض نے اپنایا اور اس کو نل میں ایسا لے اڑے کہ سودا کے اسلوب سے الگ اپنی پہچان قائم کرلی۔ اقبال کی غزل ملاحظہ ہو۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں ۔۔۔ کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے، محرمِ گوش ہو ۔۔۔ وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردہ، ساز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ ۔۔۔ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن ۔۔۔ نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی ۔۔۔ مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں ۔۔۔ نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں
جو میں سر بہ سجدہ کبھی ہوا تو زمیں سے آنے لگی صدا ۔۔۔ ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

، بحرِ کامل مثمن سالم میں کہی گئی ہے۔ یعنی متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن؛ اردو میں بحرِ کامل مثمن سالم بہت کم

استعمال ہوتی ہے۔ لیکن اس بحر کی دو اور غزلیں اس غزل کی طرح ہی اردو ادب میں مشہور ہیں اور تقریباً سب اردو داں ان سے واقف ہیں۔ ایک سراج اورنگ آبادی کی مشہور غزل:

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

اور مومن خاں مومن کی یہ غزل:

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اقبال نے اس بحر میں صرف ۲۰ شعر بانگِ درا میں کہے ہیں جن میں سے ایک یہ مشہور غزل بھی ہے۔ اس کے بعد اقبال نے اس بحر میں کوئی شعر نہیں کہا۔

۱ آئیے اس غزل کے مطلع پر غور کریں:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اس مطلع کے دو کلیدی الفاظ ہیں "حقیقت" اور "مجاز"۔ یہ صرف الفاظ ہی نہیں ہیں بلکہ تصوف کی معروف اصطلاحیں بھی ہیں۔ دونوں اصطلاحیں "عشق" سے متعلق ہیں۔ صوفی کا سفر عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف ہوتا ہے مجاز سے حقیت کی طرف سفر کرنے والا سب سے بڑا شاعر حافظ تھا۔ اقبال نے یہ کمال کیا ہے کہ "حقیقت" کو "مجاز" میں دیکھنے کی خواہش کی ہے۔ بہ قول ڈاکٹر یوسف حسین خاں "شروع کے زمانے میں اقبال کے یہاں مجاز سے مجاز ہی مراد ہے لیکن بعد میں اس نے اخلاقی اور اجتماعی مقصد پسندی کو حقیقت قرار دیا اور مجاز کو اس میں ضم کردیا۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں اسے جس حقیت کا انتظار تھا اسے وہ لباسِ مجاز ہی میں دیکھنا چاہتا تھا۔"

اس غزل کا دوسرا شعر ہے:

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے، محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردہ، ساز میں

یہ شعر اقبال کی اس لسانی روش کی طرف اشارہ کررہا ہے جو وہ آگے چل کر اختیار کرنے والے ہیں۔ یعنی ہندی الفاظ سے دوری اور فارسی اور عربی سے قربت۔ شاید اس کی وجہ نفسیاتی بھی رہی ہوگی۔ ان کے ابتدائی دور میں جس طرح دلی اور لکھنؤ کے بعض نافہم اہلِ زبان ان کے اردو محاوروں اور ترکیبات پر حرف زنی کرنے لگے تھے وہ اقبال کو پسند نہیں تھا۔ گو کہ ان کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو زبان اور فنِ شعر پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۲ء میں "تنقید ہمدرد" کا مدلل جواب دیا اور اردو کے ارتقا کا جس مضبوط عملی گرفت کے ساتھ محاکمہ کیا وہ خود ایک لسانی دستاویز سے کم نہیں۔ اقبال نے کہا تھا۔ "جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اس کے محاورات وغیرہ کی صحت اور عدم صحت کا معیار قائم کرنا میرے خیال میں محالات سے ہے۔ کیا تعجب کہ کبھی تمام ملک ہندستان اس کے زیرِ نگیں ہوجائے۔ ایسی صورت میں نا ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریقِ معاشرت، ان کے تمدنی حالات، ان کا طرزِ بیاں اس پر اثر کیے بغیر نہ رہے۔ علمِ لسان کا یہ مسلمہ اصول ہے اور یہ بات کسی لکھنوی اور دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے

اس غزل کا تیسرا شعر شاید حاصل غزل ہے:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

سارا معاملہ آئینہ کے اردگرد گھوم رہا ہے۔ شاید "عشق" اور "دل" کے بعد جس لفظ کو اقبال بہت پسند کرتے تھے وہ آئینہ ہے۔ اس لفظ کا استعمال ان کی شاعری میں کثرت سے ہوا ہے۔ صوفیانہ ادب میں آئینہ کائنات بالخصوص انسان کا استعارہ ہے جس میں حسنِ مطلق کے جلوے منعکس ہوتے ہیں۔ بارھویں، تیرھویں صدی عیسوی میں ابن العربی نے "فصوص الحکم" میں اس اصطلاحی مفہوم کو اتنا رائج کردیا کہ اب تک اس کا یہ مفہوم شاعری میں برقرار ہے۔ اگرچہ "کائنات" اللہ تعالیٰ کے جلووں کا آئینہ ہے لیکن ایک ایسا آئینہ ہے جس میں جلا نہیں، اس کمی کو تخلیقِ آدم نے پورا کیا۔ گویا انسان آئینہ، کائنات کی جلا ہے۔ لیکن اقبال نے اس میں اضافہ یہ کیا کہ فطرت میں صرف صفات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ انسان ایک ایسا آئینہ ہے جو ذات کا مشاہدہ کراتا ہے۔ اسی لیے یہ جتنا ٹوٹے گا اتنے عکس زیادہ نظر آئیں گے۔ اقبال نے اس لفظ کا استعمال شکسپیئر والی نظم میں اپنے ممدوح کو مخاطب کرکے کیا خوب کہا ہے:

حسن آئینہ، حق اور دل آئینہ، حسن   دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

چوتھا شعر ہے:

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایت سوز میں نہ مری حدیث گداز میں

"شمع" اور "پروانہ" بھی اقبال کے پسندیدہ استعارے ہیں لیکن انھوں نے شمع پروانے کے روایتی مفہوم میں ایسے ایسے نئے مفاہیم پیدا کیے ہیں جو صرف ایک بڑا شاعر ہی کرسکتا ہے۔ اقبال نے خود کو ہمیشہ "شمع" سے وابستہ کیا۔ ان کی بانگِ درا کی مشہور نظم "بچے کی دعا" کا مصرع "زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری" آخر تک ان کے ساتھ رہا۔ ان کی خواہش پروانے کو بھی شمع بنا دینے کی تھی اور شاید یہی عشق کی انتہا بھی ہے کہ عاشق و معشوق ایک ہوجائیں۔

پروانہ، بے تاب کہ ہر سو تگ و پو کرد   بر شمع چناں سوخت کہ خود را ہمہ او کرد   (اقبال)

یہاں انتہائے عشق کی نایابی کا گلہ کرمکِ شمع یعنی پروانہ، طواف کرتے ہوئے شمع سے کر رہا ہے کہ نہ تو تجھے جلا پانے سے اور نہ میں جل سکا ہوں۔ یا تو تیرا پہلے جیسا جلانے کا اثر ختم ہوگیا ہے یا پھر مجھ میں وہ بات باقی نہیں رہی کہ جل مروں۔

اس غزل کا پانچواں شعر یہ ہے:

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

گو کہ اس شعر کا مفہوم سیدھا ہے لیکن "جرم خانہ خراب" اور "عفوِ بندہ نواز" کی دو مرکب ترکیبیں اردو کے لیے نئی ہیں۔

اس غزل کا چھٹا شعر ہے:

نہ وہ عشق میں ہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

محمود و ایاز کی تلمیح فارسی اور اردو غزل میں نئی نہیں ہے۔ حافظ نے اسے بارہا برتا ہے لیکن ان کے پاس محمود و ایاز کا ذکر عشق کی کرشمہ سازیوں کے ضمن میں آیا ہے۔ مثلاً

غرض کرشمہ حسن است ورنہ حاجت نیست   جمالِ دولتِ محمود را بہ زلف ایاز

اقبال نے اس تلمیح کو مقصدیت کے لیے برتا ہے۔ بہ قول ڈاکٹر یوسف حسین خاں "اقبال سے قبل کسی دوسرے شاعر نے اسے اس انداز میں نہیں برتا"۔ اس شعر کا مفہوم تقریباً چوتھے شعر کے مفہوم کے مطابق ہے۔ وہاں شمع اور پروانہ کے استعمال ہوئے تھے اور یہاں محمود و ایاز کی تلمیح ہے لیکن "عشق" اور "حسن" کی ناکامی یا کمی کا دکھ مشترک ہے۔

اس غزل کا ساتواں شعر ہے:

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اس غزل میں مقطع نہیں ہے چنانچہ یہی اس کا آخری شعر ہے۔ اس شعر کا کلیدی لفظ ہے "دل" یہ اقبال کی شاعری کا سب سے محبوب استعارہ بھی ہے اور کنایہ بھی۔

اسلامی احسان و سلوک میں دل کو وجدانی ادراک کا مرکز مانا گیا ہے۔ اسی آئینہ میں جمالِ الٰہی جلوہ فگن ہوتا ہے۔ اس لیے دل کی پاکیزگی سب سے اول ہے۔ ورنہ نماز اور سجدہ سب بے کار ہیں اور بہ قول اقبال اگر سچے دل سے سجدہ کیا جائے تو:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

○●○

انور سدید

مطالعہ

دکنی ادب کے چار مینار

دکن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ قدیم اور جدید اردو ادب کا ہر دور میں گہوارہ رہا ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے لے کر ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی تک کا ابتدائی دور اور اب ڈاکٹر محی الدین قادری زور، نصیرالدین ہاشمی، مخدوم محی الدین سے لے کر مجتبیٰ حسین اور اشرف خوند میری تک ایک سلکِ گوہریں بن گئی ہے جو ہر دور میں تابندہ نظر آتی ہے۔ جناب رشید شکیب نے اس طویل سلسلہ، ادب سے دکنی ادب کے چار ایسے مینار منتخب کیے ہیں جو دکن سے دور کے دیاروں میں شاید زیادہ معروف نہیں لیکن ان چار میناروں نے ہمیں طنز و مزاح سے معاشرے کا چہرہ دکھانے کی اتنی کامیاب کوشش کی کہ اس کتاب کے وسیلے سے وہ ادب کے منارہ ہائے نور نظر آتے ہیں، اور جس طرح "چار مینار" حیدرآباد دکن کی پہچان ہے، اسی طرح یہ طنز و مزاح میں "چار مینار" کی طرح ممتاز دکھائی دیتے ہیں۔ یہ چار مینار۔۔۔ نذیر حسین دہقانی اور اعجاز حسین کھٹا جو حیدرآباد سے نقل مکانی کر کے پاکستان آگئے تھے۔ اور سلیمان خطیب اور سرور ڈنڈا جنھوں نے اپنے مرزبوم میں قیام کیا۔ پھر موت کی ہوا جو چلی تو ان چاروں کو اڑا کر ہفت افلاک پر لے گئی اب ان کی یادگار ان کی دکنی شاعری ہے جو دکن کی سرزمین پر ہر طرف اپنے مخصوص لب و لہجے میں صدائے دیروز بنی ہوئی ہے، دوسری یادگار یہ کتاب ہے جسے دکنی زبان و ادب کے ماہر رشید شکیب نے مرتب و تالیف کیا ہے۔

نذیر دہقانی، سلیمان خطیب، اعجاز حسین کھٹا اور سرور ڈنڈا میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ یہ چاروں طنز و مزاح کے شاعر ہیں اور انھوں نے خالص دکنی زبان میں شاعری کی ہے جو عرصہ، دراز سے شعروادب کی زبان نہیں ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ نگار میرے محترم دوست حمایت علی شاعر ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ:

"تحریکِ آزادی کے دوران جب برِ صغیر کے ہر گوشے اور ہر شعبے میں بغاوتیں بیدار ہورہی تھیں تو ریاستِ حیدرآباد دکن میں دکنی نے بھی اپنا جھکا ہوا سر اٹھالیا کچھ شعرا نے باضابطہ دکنی زبان میں شاعری شروع کردی اور وہ عوامی سطح پر مقبول بھی ہوئے ... متذکرہ چار شعرا نے دکنی لب و لہجے میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔"

رشید شکیب کی اس خدمت کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے متذکرہ چار شعرا کے کلام کو جناب فضل گلبرگوی، امجد فاروقی، بدر رضوان اور فاطمہ ہدایت علی کے تعاون سے جمع کیا اور پھر حمایت علی شاعر کے فاضلانہ مقدمے سے اسے شائع بھی کیا۔ رشید شکیب نے ان شعرا کے فن کے خصوصی زاویے دریافت کیے ان پر تجزیاتی مضامین لکھے اور آخر میں دکنی شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا پر ایک خیال انگیز مقدمہ بھی پیش کیا۔ اس کتاب کی تشکیل و ترتیب یوں کی گئی ہے کہ پہلے شاعر کے حالاتِ حیات اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور بعد میں اس کو منور کرنے کے لیے ہر شاعر کا کلام پیش کیا گیا ہے۔ اس کا اجمال کچھ یوں ہے:

(۱) نذیر دہقانی :

نذیر دہقانی ایک مزاحی شاعر تھے ۔ ۱۹۰۸ء میں تلنگانہ کے ایک گاؤں جنگاؤں میں پیدا ہوئے ۔ شاعری کا ذوق ابتدائے حیات میں پیدا ہوگیا ۔ حیدرآباد کے شعبۂ نشرواشاعت میں پروپگینڈہ افسر کے عہدے پر فائز تھے ۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان آگئے بہاول پور اور کراچی میں قیام کیا لیکن ۱۹۸۲ء میں انتقال لاہور میں ہوا ۔

رشید شکیب کے الفاظ میں :

" نذیر دہقانی نے نچلے اور متوسط طبقے کی گھریلو معاشرتی زندگی اور ان کے مسائل کو خوب صورتی سے ادا کیا ۔ طنز و مزاح کے پردے میں اصلاح کی کوشش کی ۔ واقعات نگاری میں کمال کے جوہر دکھائے اور اکثر جگہ زبان و بیان میں شگفتگی ، شوخی اور بیان کا سماں دکھائی دیتا ہے ۔"

نذیر دہقانی نے اپنے بارے میں لکھا ہے :

" میں دہقانی زبان میں صرف شعر ہی نہیں کہتا بلکہ میری پوری زندگی دہقانی پیداوار ہے ۔ میرے تجربات زندگی بھی کسی کے لیے ظرافت کا سامان مہیا کرتے ہیں ، تو سوچنے والوں کے لیے ایک لمحہ فکر اور شاید کچھ آنسو بھی ۔"

نذیر دہقانی نے اپنی شاعری کا تجزیہ مزاحی زاویے سے خود بھی کیا ہے :

تو کرنا شاعری ایسی نرالی دیک دہقانی
ترا مطلب بی نکلے ، دوستاں کا جی بہل جانا

اب نذیر دہقانی کے سماجی اصلاحی انداز کو دیکھیے جو دکن کے مقامی لب و لہجے میں اپنا رنگ بکھیرتا اور ہمارے لیے بھی مسرت کا سامان پیدا کرتا ہے ۔

تمہارے باغ میں بڑ باغلاں آ آ کے راتاں کو
پھلاں کو سارے کھا جاریں ، تمے سب کیا کی رہ چپ ہے
ارے بھولے پنے کی حد بی ہے تم جگنواں سمجھیں
گھراں بچھو سے سلگاریں ، تمے سب کیا کی رہ چپ ہے

○

" روز روز کے جلسے ، روز روز کے ہنگامے
کال جاں پہ تفلاں ہیں ، امتحاں کے باتاں ہیں
ہم زمیں پو رہتے ہیں ، آسماں کی باتاں ہیں
داغاں دل کے روشن ہیں ، کہکشاں کی باتاں ہیں

○

دل دھڑکتا ہوا نیچی نیچی نظر ، اُس کے ہوتاں پشانی پسینے میں تر
کچھ تحاور ، کچھ خوشی ، تھوڑا حیا ، پیار ، تم [illegible]

○

جڑاں سے جہاز آتا ہے ، اکڑ کو ایک جھٹکے میں
مگر کیا کی کتو ، اب سب کو طاقت کی ضرورت ہے

○

خشی سے سو جوتیاں حد سے بے حد
پڑے تو پڑے ، سر اٹھانا گنا ہے

○

نذیر دہقانی کی دکنی شاعری میں مزاح کم اور طنز زیادہ ہے ۔ انھوں نے معاشرے کی ناہمواریوں کو اجاگر کرنے میں گہری دل
لی ان کی نظم " قائدِ اعظم " ان کے داخل کے کرب کو آشکار کرتی ہے ۔ ایک بند اس طرح ہے ان کا رخ قوم کی طرف ہے ،
ب قائد ہیں :

یہ پھولاں بیچ رہیں اک دن چمن بی بیچ ڈالیں گے
کفن چوراں ہیں ، مردوں کے کفن بی بیچ ڈالیں گے
بھٹکتی ہے حیا بیچ ، من بی بیچ ڈالیں گے
خدا ، قرآن بیچا ، اب وطن بی بیچ ڈالیں گے
وطن پر پھیر کر جھاڑو ، یہ پھر تسبیح پھرائیں گے
یہ پھر کعبے کو جاکو ، سب گناہاں بخشوائیں گے

○

۱) سلیمان خطیب :

سلیمان خطیب گلبرگہ کے ایک قریبی گاؤں معین آباد میں ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی زندگی یتیمی ، بے سیری ، غربت اور
ت میں گذری لیکن حالات کی نامساعدت میں بھی خوش مزاجی اور خوش فکری کو قائم رکھا ۔ اپنے بارے میں سلیمان خطیب
ھا ہے :

" میرا ماحول دکنی تھا ، اس لیے میں نے دکنی زبان اپنائی "

ارشید قلیب کی رائے میں " سلیمان خطیب نے اپنی شاعری کو اسی لہجہ میں پروان چڑھایا ، اسی تہذیب کو اپنایا ۔ ۔ ۔ ان کی دکنی
ں نے موجودہ ماحول ، وقت اور جدید زمانے کے تقاضوں کو پورا کیا ۔ ۔ ۔ خطیب کی شاعری کسی ایک موضوع کا نام نہیں ، معاشی
ا پر بے شمار نظمیں لکھیں جن میں " ساس بہو " ۔ ۔ ۔ چھوٹا بھوری ۔ ۔ ۔ پہلی تاریخ ۔ ۔ ۔ لچھمی ، ایک کلرک بیوہ کی فریاد ،
، یاد حکیم ، بیراں کا پلنگ بہت مشہور ہیں " ۔ ۔ ۔ اپنے فن کے بارے میں سلیمان خطیب کا احساسِ افکار مندرجہ ذیل قطعہ
یاں ہے :

میں رستے کی بتی ہوں، دیپک ہوں فن کا
یہ سارا اجالا ہے، میرے سخن کا
مجھے نیچ پہچانے .. لوگا نچ میرے
میں انمول ہیرا ہوں دکھن کے کھن کا

فنی طور پر سلیمان خطیب نظم کے شاعر ہیں وہ بات کو پھیلانے اور اس میں گہرائی پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، سب سے اہم ا مشاہدہ ہے جو باریک جزئیات کو بڑی خوبی سے اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ ان کی نظم "میاں کے دوست" سے ایک بند ذیل ہے۔ ذکر جمیل ایک شاعر کا ہے، بیگم کہتی ہیں:

ایک شاعر ہے سو ماٹی ملا گاتے رہتے
تمیں سنے تو بی، سڑے شعراں سناتے رہتے
بڑا بن کو کوئی غلطیاں نچ بتاتے رہتے
نا سمجھ کو، کوئی منڈیاں نچ ہلاتے رہتے
رات بھر بیٹھ کو چائے میں بناتے رہتیوں
دوزخی پیٹ کو کڑ دی میں پلاتے رہتیوں

سلیمان خطیب کی شاعری میں عوامی گیت کا انداز بھی حرکت و حرارت پیدا کرتا ہے ایک اقتباس دیکھیے جو کوا میں گایا جاسکتا ہے:

کاٹو کھیتی کاٹو رے گھر گھر روٹی باٹو رے
خون پسینہ پیرو رے چاند ستارے کاٹو رے
کھیت میں پنچھی بولے رے سونا چاندی ڈولے رے
پاک پون کے پلو میں موتی مونگے رولے رے
کاٹو کھیتی کاٹو رے گھر گھر روٹی باٹو رے

حضرت امیر خسرو کی نعت "شب جائے کہ من بودم" کا ترجمہ سلیمان خطیب نے بڑی خوب صورتی سے کیا ہے۔ اس کا اقتباس حسب ذیل ہے:

نہ جانے کون منزل تھی، جہاں کل رات کو ہم تھے
کہ ہر جا رقص بسمل تھا، جہاں کل رات کو ہم تھے
غضب چتون، ستم مکھڑا، قیامت قد بالا تھا
سراپا آفتِ دل تھا، جہاں کل رات کو ہم تھے
محمد شمعِ محفل تھے، درونِ لامکاں خسرو
خدا خود صدرِ محفل تھا، جہاں کل رات کو ہم تھے

اپنے معاصر سرور ڈنڈا کی بے وقت موت پر سلیمان خطیب کا شخصی مرثیہ ان کے درد جاں گداز کی پوری نمائندگی کرتا ہے ۔ آخری بند یوں ہے :

دیکھو پھولاں میں پھول سویا ہے ۔ کتنا بانکا سجیلا ہے ، ہم دم
ایسے سونے پو آنکھ روتی ہے ۔ جیسے گرتی ہے پھول پو شبنم

(۳) اعجاز حسین کھٹا :

اعجاز حسین کھٹا ۲۲ مارچ ۱۹۲۲ کو شاد نگر حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم نظام آباد میں حاصل کی اور محکمہ مال اور محکمہ رسد میں ملازمت کے سبب گاؤں گاؤں قریہ قریہ پھرنے کا موقع ملا ۔ وہ ریڈیو حیدرآباد میں بچوں کے پروگرام کے نگران تھے ۔ سقوطِ حیدرآباد کے بعد کراچی آگئے اور یہیں ۱۹۹۲ء میں پیوندِ خاک ہوئے ، ان کے تخلص کا واقعہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بیان کیا ہے کہ شمالی ہند کے کسی شاعر نے چوٹ کی :

" کھٹا کھانے والے زبان کیا جانیں ۔ ۔ ۔ اعجاز حسین کو یہ چوٹ گہری لگی ، انھوں نے " کھٹا " تخلص کیا اور دکنی زبان میں شاعری شروع کردی ۔

رشید شکیب نے لکھا ہے :

" اعجاز کھٹا واقعات نگاری میں کمال کے جوہر دکھائے ہیں ، روز مرہ کی دکنی زبان میں معاشرتی ، سماجی ، ثقافتی اور تہذیبی مسائل پر اس طرح نشتر زنی کرتے ہیں کہ زخم لگنے کے باوجود اسے زخم پر مرہم رکھا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔ کھٹا کی پوری شاعری پر نظر دوڑائیں تو یہ محسوس ہوگا کہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو مزاح کا روپ دے کر زندگی کا سلیقہ اور جینے کا ڈھب سکھایا اور گھریلو مسائل اور الجھنوں کے کرب کو محسوس کر کے شعری حقیقت کا روپ دیا ۔ "

اعجاز کھٹا نے اکابر و مشاہیر دکن کو جو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ، وہ ان کے فن کا سرمایہ اور ان کی انفرادیت کا مظہر ہے ۔ محمد قلی قطب شاہ ، بہادر یار جنگ اور میر عثمان علی خاں پر ان کی نظمیں یہاں بہ طور مثال پیش کی جاسکتی ہیں ۔ اعجاز کھٹا کی نظم نگاری کی معراج " الی کا بن " ، " سوال " ، " نکوچ نکو " ، " آزاد ہیں ہم " ، " کب تلک " اور " پیارے " جیسے نظموں سے عیاں ہوتی ہے ۔ اعجاز کھٹا سماج کے کڑوے نقاد ہیں اور معاشرے کی ناہمواریاں بے ساختہ ان کی شاعری میں سماتی چلی جاتی ہیں ؛ ان کی شاعری کا رخ بلاواسطہ طور پر معاشرے کی طرف ہے ۔

مشرقی ہرنیاں کو چھوڑیا ، حق ڈبایا ان کا تو
راج تیرے گھر کریں ، مغرب کی گھوڑیاں کب تلک ؟
دل ہے چھاتی میں ، زباں منہ میں ، تو پھر جوہر دکھا
منہ کو قفلاں کب تلک ، پاواں میں بیڑیاں کب تلک ؟

٥

چنگ گی ہور یہ چھٹکنی، مگر آزاد ہیں ہم — گردناں پر جو قرضہ ہے سو اگنا ہوئینگا
کب تلک اپنے میں کھینچ رہیں گے پگڑیاں — کس وقت سر پہ کفن بن کو نکلنا ہوئینگا

○

کھٹے کی لاشش گور میں تنگیچ گاڑ دیو — اسس کے کفن کو خیر کی چدر نکوچ نکو
املی کے جھاڑ کی مجے بس بس ہے چھاؤں یہ — غیراں کے انچے محل، یہ چیمبر نکوچ نکو

○

گرل فرینڈ ہے یہ تو اپنی ایسی ویسی مت سمجو
ابی تو ہم آپس میں پرکھ رئیں سوچیں گے پھر شادی کو

اعجاز کھٹا دکن کو یاد کرتے ہیں تو انھیں اردو بھی یاد آتی ہے۔۔۔ دکن اردو کا گہوارہ تھا اور کھٹا نے اس گہوارے کی زبان بھی میں شاعری کی ہے۔۔۔ اس نظم کا ایک بند حسب ذیل ہے جس میں رثائی کیفیت درد انگیز ہے:

وہ اردو کا اب زورِ بازو ہے کاں
زمیں کھا گئی رے مرا آسماں
جسے روئیگا حشر لگ تک دکن ۔۔۔۔۔۔ وہ میرا وطن

(۴) سرور ڈنڈا:

غلام سرور خاں ڈنڈا حیدرآباد دکن میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۴ء میں فوت ہوگئے۔ اس کم عمری میں انھوں نے کمرشیل آرٹ سیکھا، مصوری کی، گتہ داری اختیار کی لیکن نام شاعری میں پیدا کیا۔ رشید شکیب نے لکھا ہے:

"سرور ڈنڈا کی شاعری امنگوں کی مظہر ہے۔ شاعر نے شہری و دیہاتی زبان میں ہر موضوع کو اپنایا ہے۔ انھوں نے دیہاتی شہری ماحول اور عوامی امنگوں کو اظہار کے خوب صورت پیرائے میں بیان کیا، جہاں طنز کے تیر برسائے، وہاں محبت بھرے گیتوں سے پیار کے رس گھولے۔ لوگوں کو ظلم، جبر، اور زیادتی کا احساس دلایا اور نجات کی راہ دکھائی۔"

سرور ڈنڈا کی شاعری سے جو کردار شخصیت پذیر ہوتا ہے وہ ایک معصوم بچے کا کردار ہے جو زمانے کو حیرت سے دیکھ رہا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے وہ معصومیت سے زبان پر لے آتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ کڑوی اور سچی بات سادگی اور معصومیت سے بیان کرجاتے ہیں۔ وہ اوکھلی میں سر دینے سے باز نہیں آتے لیکن موسلوں کا خوف بھی نہیں کھاتے۔ خود اپنے بارے میں ان کا ارشاد یہ ہے:

عادت ہے تیری ڈنڈے، ریچھاں سے کھیلنے کی
تیرا سداں رہا ہے، بیلاں سے دوستانہ

زمانے کے جزر و مد پر سرور ڈنڈا نے یوں تبصرہ کیا ہے:

رنگ لائیں کا مہاجن تیرا یہ سر اٹھانا
کبھی بھاؤ کو گرانا، کبھی بھاؤ کو چڑھانا

○

جینے کے تئیں ہیں، تمھارے یہ چالاں کب لگ گھٹالا، کب تک خسارہ
اجلی سرکار کا منہ کالا کرنے ڈنڈے کا لینا پڑیں گا سہارا

○

سمنٹ کی سڑخ پو ریلاں کا اے دوست چلانا مشکل ہے
ہور جب سے ملی ہے آزادی، عزت کا نبھانا مشکل ہے
پولس کے اندھے قانوناں، سڑخاں پو قیامت ڈھاتے ہیں
موٹر تو مزے سے چلتی ہے، سیکل کا چلانا مشکل ہے

○

ان کی قسمت میں مرغ ہور مچھی میری قسمت میں دال ہے سو ہے
اوڑھنے ہم کو ٹاٹ تک گت نئیں ان کے کاندھے پو شال ہے سو ہے

○

دنیا تمام ڈرتی ہے ڈنڈے کے نام سے
کیا بات ہے کہ وہ بتِ کافر نہ ڈر سکا

○

اب آخر میں مجھے اس بات کا اعتراف بھی کرنا ہے کہ میں نے "دکنی ادب کے چارمینار" کو تبصرے کے لیے منتخب کیا تو میرا خیال تھا کہ یہ حیدرآباد دکن سے چھپی ہوگی اور میرے تبصراتی سلسلے "کچھ وقت غیر ملکی کتابوں کے ساتھ" کے مدار میں سما جائے گی۔ کتاب اٹھائی تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ بہادر یارجنگ کراچی اکادمی سے چھپی ہے۔ مزید ورق گردانی کی تو میں پہلے حیدرآباد دکن پہنچا اور پھر خواجہ بندہ نواز گیسودراز"، برہان الدین جانم"، حسن شوقی، ملاوجہی، قلی قطب شاہ اور ولی اللہ قادری کی ابتدائی اردو کے دور میں پہنچ گیا۔ اب اس کتاب سے دل چسپی بڑھتی گئی اور میں نے سلیمان خطیب، اعجاز حسین کھٹا، سرور ڈنڈا اور نذیر دہقانی کو قدیم اردو اور جدید دکنی کی امتزاجی صورت میں پڑھا تو مجھے بڑی لطافت اور تازگی محسوس ہوئی اور اس کتاب کا مطالعہ پھیلتا گیا۔ میں رشید شکیب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے کم و بیش اردو کی چھ صدیوں میں سفر کرنے کا موقع عطا کیا۔ اس کتاب کے چاروں شاعروں نے سادگی، سلاست اور معصومیت سے جدید دور کے حالات اور معاشرتی جزر و مد کو "دکنی اردو" کا روپ دیا اور اس کثافت سے نیا جلوہ پیدا کیا۔ اس کتاب کو دکن کے دہقانی زاویوں سے پرکھیں تو بلند پایہ کتاب نظر آئے گی اور دہقانی، سلیمان خطیب، اعجاز حسین کھٹا اور سرور ڈنڈا اس زبان کے خدمت گزار محسوس ہوں گے۔ میں انھیں اس مطالعے سے خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ یہ کتاب محفلِ علم و ادب، حیدرآباد کالونی، کراچی۔ ۵، نے شائع کی ہے اور مجھے محمد سعید اللہ صاحب نے عطا کی جو بہادر یارجنگ اکادمی کے معتمدِ اعزازی ہیں، ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ قیمت ایک سو روپے۔

○●○

نثار راہی

کٹھ پتلی کے دھاگے

اپنے فرنیچر کے شوروم پہنچ کر اور پھر قریب ایک گھنٹہ میں کاغذی کام نمٹانے کے بعد جب مہندر نے سگریٹ سلگائی تو اسے بہت اطمینان کا احساس ہوا۔ وہ اپنے کاروبار میں کامیاب تھا اور اس کی ازدواجی زندگی بھی پُرسکون گوار تھی۔ پھر دکان اور کارخانے کے ملازمین بھی اسے ایسے وفادار ملے تھے جو اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کے کاروبار کو ٹھیک طرح چلالیتے تھے۔ یعنی زندگی کے ہر شعبے میں قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی اور جب قسمت ساتھ دے تو خوشیاں از خود ہی زندگی میں چلی آتی ہیں۔

اطمینان کی ایسی ہی گھڑیوں میں وہ مسرور ہوجاتا تھا۔ آج بھی مزاج میں وہی کیفیت تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا ایک معتمد نوکر بے سنگھ اس کے نزدیک آکر واپس چلا جاتا تھا۔ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا۔ عموماً قرض لیتے وقت وہ اسی طرح جھجکتا تھا۔ بے سنگھ کو قرض دینے سے اسے کبھی کوئی پریشانی محسوس نہیں ہوئی کیوں کہ بے سنگھ اس کا معتمد نوکر ہی نہیں، اس کے گھر کے ممبر جیسا تھا۔

"ہاں بولو بے سنگھ، تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔۔۔؟"

"وہ۔۔۔ آپ کو فرصت ہو تو۔۔۔؟"

"مجھے فرصت ہے۔ کچھ پیسے چاہیے کیا تمھیں۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ پیسے کی بات نہیں بھیا۔۔۔ کچھ گھر کی بات ہے۔"

"گھر کی بات۔۔۔ وہ کیا ہے؟ بیٹھ جاؤ ادھر۔"

"وہ۔۔۔ ماں جی۔۔۔ آپ کی ساس۔۔۔"

"ہاں کہو۔۔۔ بے جھجک کہہ دو۔۔۔"

بے سنگھ قریب آگیا اور بہت رازداری میں اس نے آہستہ آہستہ کہا۔ اور جو کچھ کہا وہ مہندر کے ذہنی سکون میں تلاطم لانے کے لیے کافی تھا۔ اور صرف تلاطم ہی نہیں، اس بات نے تحیر کے دریاؤں میں اسے غرق کردیا تھا۔

کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ وہ سوچنے لگا۔ وہ بات یقین کرنے لائق تھی ہی نہیں لیکن بے سنگھ نے وہ بات کہی تھی، اس لیے یقین کرنے کو وہ مجبور تھا۔ بے سنگھ نے جھوٹ کبھی نہیں بولا تھا۔

دوپہر کو گھر جاکر وہی بات جب اس نے اپنی بیوی پشپا کو بتائی تو پشپا بھی حیرت زدہ رہ گئی: "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔

"وہی تو میں کہتا ہوں کہ اماں ایسا کیسے کرسکتی ہیں۔"

"اگر یہ سچ ہے تو یہ بہت شرم کی بات ہے۔"

"وہ تو ہے ہی۔ اپنا بے سنگھ جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

" لیکن میں یہ کیسے مان لوں کہ ماں مندر کے دروازے پر کھڑی ہوئی بھیک مانگ رہی تھی ۔"

" بے سنگھ جب اپنے گھر گیا تھا تو اس نے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا تھا ۔ میں اس پر اوشواس (بے یقینی) نہیں کرسکتا اور مجھے یہ سب کچھ صحیح اس لیے لگتا ہے کہ تمھارا بھائی کمل شراب اور عیاشی میں اب اتنا ڈوب چکا ہے کہ اس کا فوٹو اسٹوڈیو بھی اب قریب قریب بند ہے ۔ پریشان ہوکر ماں بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئی ہوگی ۔ لیکن ایسا اسے قطعی نہیں کرنا چاہیے تھا ۔ کیا اسے ہماری عزت کا کچھ خیال نہیں ۔"

اس کی بیوی منھ پھیر کر آنسو بہانے لگی ۔

دو روز بعد ہی تین گھنٹوں کی مسافت کے بعد وہ اپنی کار سے بیوی کے ساتھ اپنی سسرال کے شہر پہنچ گیا اور بیوی نے جب اپنی ماں سے مندر پر بھیک مانگنے کی خبر کی تصدیق چاہی تو آنسو بہاتے ہوئے ماں نے الٹے ان سے فریاد کی ۔

" میں کیا کرتی ۔ لڑکا اب کسی کام کا رہا نہیں ۔ رات دن کسی نہ کسی کے ساتھ شراب پیتا ہے اور کام دھندہ بالکل نہیں کرتا ۔"

" تو تم میرے پاس آجاتیں ماں ، تمھیں ہماری عزت سے کھیلنے کا کیا اختیار ہے ۔"

" میں نے جو مانگا بھگوان کے گھر سے مانگا تھا ۔ میں تو پہلے پہلے پھول مالا بیچنے گئی تھی ۔ لیکن لوگوں نے بوڑھی کم زور پر دیا کرکے اور اپنا سمجھ کر میری مدد کرنا شروع کردیا ۔"

" جسے تم دیا کہتی ہو اماں ، وہ دیا ویا کچھ نہیں ، بھیک ہے بھیک " مہیندر نے تیور بدلتے ہوئے کہا ۔

" اب تم اسے بھیک کہہ لو ، میں نہیں کہتی ۔"

مہیندر دانت پیس کر رہ گیا ۔ پھر جب شام کو سالا آیا تو اسے بھی برا بھلا کہا ۔ پھر رات میں بیوی سے مشورہ کرکے مہیندر ساس اور سالے دونوں کو ساتھ ہی اپنے شہر لے آیا اور پھر چند روز بعد ہی سالے کو ایک فوٹو اسٹوڈیو کھلوایا اور ایک مکان اسے کرایہ سے دلواکر ساس اور سالے دونوں کو اس میں ٹھہرایا ۔ کمل اپنے بہنوئی سے ڈرتا تھا اس لیے قاعدے سے اسٹوڈیو چلانے لگا اور ماں کو بھی آرام دینے لگا اور تب ایک دن مہیندر نے بیوی سے کہا " وہ تو یہ اچھا ہوا کہ وقت پر بات معلوم ہوگئی تو معاملے کو سنبھال لیا گیا اور عزت بچ گئی ، ورنہ کچھ زیادہ دن ہوجاتے تو بہت بدنامی ہوتی ۔ عزت تو ہمیشہ کو چلی ہی جاتی ۔"

مہیندر اپنے سالے پر پوری نظر رکھ رہا تھا ۔ کبھی دوپہر میں اسے اس کے اسٹوڈیو جاکر چیک کرتا تو کبھی رات کو اسے اسٹوڈیو سے لے کر اس کے گھر چھوڑ آتا اور یہ بھی دیکھتا کہ وہ اپنی ماں کو کھانے اور کپڑے کی ساری آسانیاں دے رہا یا نہیں ۔ کبھی وہ تو کبھی اس کی بیوی شکنتلا اماں کو کپڑے اور روپے دے آتے اور کبھی گھر بلاکر اسے دو دو تین تین دن اپنے یہاں مہمان بھی رکھتے ۔

مہیندر کا سسر کپڑے کی ایک دکان پر سیلس مین کا کام کرتا تھا اور اپنی آخری سانس تک عزت ایمان داری اور خودداری کے ساتھ جیا ۔ اور جب ہارٹ اٹیک سے مرا تو رشتے داروں کے علاوہ جان پہچان والوں نے بھی اس کی موت کا غم منایا ۔ مہیندر کو فخر تھا کہ اس کا سسر ایک آدرش وادی انسان تھا ۔ لیکن شوہر کی موت کے بعد شکنتلا اماں کو اپنے شوہر کی موت کا صدمہ اتنا ہوا تھا کہ اس کا دماغ ہی چل گیا ۔ ہر کچھ بکنے لگی تھی اور دماغ کا توازن پہلے جیسا نہیں رہا تھا ۔ مہیندر نے سوچا کہ یہ شاید اس کی بگڑی ہوئی ذہنی حالت کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ پریشانی میں بھیک مانگنے پر آمادہ ہوئی ۔ لیکن اب تو سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا ۔ سالا بھی ٹھیک طرح کام کرہا تھا اور اماں کو بھی یہ بظاہر کوئی فکر نہیں تھی ۔ جب کبھی اپنے بیٹی داماد کے پاس آتی تو خوش و خرم نظر آتی ۔ ہاں یہ

... تھا کہ جب کبھی اپنے شوہر کو یاد کرتی تو بے تحاشہ آنسو بہانے لگتی اور ہر کچھ بکنے اور بڑبڑانے لگتی۔ ایسے وقت لگتا تھا کہ اس ... ذہنی توازن وقتی طور پر کھو دیا ہے۔

کوئی تین سال گزر گئے۔ اس دوران کمل کی شادی ہوئی اور اس کے یہاں ایک لڑکا بھی ہوا۔ کمل کی بیوی پہلے تو شگفتہ اماں کے ساتھ کچھ ٹھیک رہتی تھی لیکن پھر اس کے رویئے میں فرق آ گیا۔ ساس اور بہو میں کبھی کبھی نوک جھونک بھی ہونے لگی تھی۔ ... کی ساری آمدنی بہو رکھتی تھی جس سے شگفتہ اماں کے ہاتھ خرچ میں بھی فرق آیا اور وہ پھر سے اداس رہنے لگی۔ مہیندر کو اب اتنا وقت میسر نہیں تھا کہ وہ سالے کے کام دھندے کو جاکر دیکھتا یا ساس سے اس کی پریشانیاں پوچھتا۔

اتوار کی ایک صبح مہیندر بیوی کے ساتھ کار میں ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ اس نے شگفتہ اماں کو دیکھ کر کچھ فاصلے پر کار روک دی۔ اس نے دیکھا کہ برلامندر کے باہر کی دیوار پر تین چار بوڑھی عورتوں کے ساتھ شگفتہ اماں آنکھیں بند کیے بیٹھی ہے اور وہاں گزرنے والوں میں سے کوئی کوئی اس کے سامنے روپے ڈال دیتے ہیں۔

یہ منظر دیکھ کر مہیندر اور پشپا کے ہوش اڑ گئے۔ یعنی شگفتہ اماں نے پھر بھیک مانگنا شروع کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے لیکن بولا انھوں نے ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں۔ اب بولنے یا کہنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ بڑھیا سرِ راہ ان کی عزت نیلام کر رہی تھی۔ کیا پتہ ان کے شناساؤں میں سے کس کس نے اسے اس حالت میں بھیک مانگتے دیکھا ہوگا۔ اگر کسی ایک نے بھی دیکھ لیا ہوگا تو ان کی عزت تو مٹی ہو کر گئی۔ پشپا کار سے اتر کر شگفتہ اماں کو لینے مندر تک گئی لیکن مہیندر کار میں سر تھامے بیٹھا رہا۔

اور جب اماں کو لے کر وہ لوگ چلے تو مہیندر نے راستے میں اس سے ایک ہی سوال کیا - اب تمھیں بھیک مانگنے کی کیا ضرورت آن پڑی اماں۔ بیٹا ٹھیک سے کما رہا ہے اور تم کو بھی کھانا اور کپڑے دے رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

یہ سن کر شگفتہ اماں رونے لگی اور روتے روتے پھر کچھ دیر بعد بولی " بیٹا بہو مجھے تنگ رکھتے ہیں۔ ہاتھ خرچ کو کچھ نہیں دیتے۔"

" تو اس کے لیے بھیک مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔" بیٹی برس پڑی۔

" ہم لوگ مر گئے تھے کیا۔ ضرورت پر ہم سے روپے پیسے مانگ لیے ہوتے۔"

جواب میں شگفتہ اماں کچھ نہیں بولی۔ ساڑی کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔ مہیندر سوچنے لگا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی بھیک مانگنے کی۔ سیکڑوں ہزاروں بوڑھے لوگ ہاتھ سے تنگ رہتے ہیں لیکن کبھی وہ بھیک تو نہیں مانگتے۔ بھوکے سوتے ہیں تب بھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ اس بڑھیا کو کیا ہو گیا ہے۔ شاید دماغی توازن کچھ بگڑ جانے کے باعث ہی وہ ایسا کر رہی ہے۔

گھر آکر مہیندر نے پہلا کام یہ کیا کہ شگفتہ اماں کو اپنے گھر میں اور اپنی نگرانی میں رکھنے کا فیصلہ سنایا۔ پھر اگلے ہی دن اس نے اماں کو شہر کے ایک معروف نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے اماں کے ماضی سے متعلق کئی باتیں پوچھیں جن کا جواب اس کی بیٹی پشپا نے دیا۔ ڈاکٹر بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ماضی میں کوئی پریشانی نہ ہوتے ہوئے بھی بڑھیا بھیک مانگنے پر کیوں آمادہ ہوئی۔ لیکن پھر بھی اس نے اماں کا علاج شروع کر دیا۔

مہیندر اور پشپا کو اطمینان تھا کہ اب شگفتہ اماں ان کے یہاں ٹھیک سے رہ رہی ہے۔ گھر میں بنے ہوئے کرشن جی کے مندر میں بھجن گاتی ہے یا پھر بچوں کو کھلاتی رہتی ہے۔ کھانے اور کپڑے کی اب اسے کوئی تکلیف نہ تھی۔ وہ جب بھی چاہتی تو اپنے پہچان والے ملنے جلنے والوں کے گھر چلی جاتی یا اپنی مرضی اور خوشی سے گھر کا سودا سلف لینے بازار چلی جاتی۔

لیکن پھر چند ماہ بعد ہی پشپا نے شکنتلا اماں میں ایک اور تبدیلی دیکھی۔ وہ پڑوس کے گھروں سے ترکاری لے آتی تھی اور گھر میں سب کے کھانے سے فارغ ہو جانے کے بعد کچن میں ایک طرف بیٹھ کر اکیلے ہی کھانا کھاتی تھی۔ مہیندر نے بھی یہ دیکھا تو ایک دن شکنتلا اماں پر بگڑ ہی گیا۔

"کیا ہمارے یہاں ترکاری اچھی نہیں پکتی جو پانچ سات گھروں کی ہنڈی کا مزہ لیتی ہو۔ اور اس طرح تو تم ہمیں بدنام کر دوگی ہو۔ آخر کیا بگاڑا ہے ہم نے تمہارا۔۔۔؟"

شکنتلا اماں پھر رونے لگی اور دو منٹ بعد جب رو چکی تو بولی "کسی میں کوئی کھر ب نہیں۔ کھرابی تو سب میرے ہی اندر ہے۔ میں اب کسی کے پاس نہیں رہوں گی۔ میں تو اب اپنا بڑھاپا ہری دوار جاکر کاٹوں گی اور رام نام کرتے کرتے ہی کسی دن یہ پاپی سنسار چھوڑ دوں گی۔"

بڑھیا کی مکاری پر مہیندر کو بس غصہ ہی تو آ گیا۔ ایک دم سے بولا "اب تمہارے لیے ہری دوار ہی ٹھیک ہے۔ یہاں رہ کر تو تم ہماری عزت ہی خراب کروگی۔ تم کو اب اکیلے میں رام نام ہی کرنا چاہیے۔"

یہ سنتے ہی شکنتلا اماں نے اپنا سامان باندھ لیا اور ہری دوار جانے کی تیاری کرنے لگی۔ پشپا کے سمجھانے پر مہیندر نے اماں کو جانے سے روکا بھی، مگر وہ بس ایک رات کے لیے ہی مانی۔۔۔ اگلی صبح گھر والوں کے سو کر اٹھنے سے قبل ہی وہ گھر چھوڑ کر جا چکی تھی۔ عجیب طبیعت کی انسان ہے۔ مہیندر نے سوچا۔۔۔ کہ ساری آسائش میسر ہونے کے باوجود بھی وہ ہر ایک سے ناراض رہتی ہے اور روپے پیسے سے بے شرمی کی حد تک پیار کرتی ہے۔ بے شرمی بھی اتنی کہ بھیک مانگنے سے روکا تو پڑوسیوں کے گھروں سے ترکاری مانگ کر لانے لگی۔ ایسا کیوں ہے، یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

کئی ماہ گزر گئے۔ ایک قریبی رشتے دار عورت نے ہی ایک دن ہری دوار سے آکر بتایا کہ شکنتلا اماں ہری دوار میں خیریت سے ہے لیکن، لیکن ہر ایک کو اپنی مجبوریاں اور رشتے داروں کا خراب برتاؤ بتایا کرتی ہے اور۔۔۔ وہاں ایک مندر پر بلاناغہ صبح صبح جاتی ہے اور لکڑی کی ٹیک لگاکر کھڑی ہو جاتی اور۔۔۔ بھیک مانگتی ہے۔

پشپا مہیندر کو اور مہیندر پشپا کو دیکھ کر رہ گئے۔ بولے کچھ نہیں۔ رات میں مہیندر نے دیکھا کہ بیڈ پر لیٹے لیٹے پشپا رو رہی ہے۔

"تو رنج مت کر" مہیندر اسے سمجھاتے ہوئے بولا "اماں اب ایسی ہی رہے گی۔ وہ ایسا کیوں کرتی ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم لوگوں کو اب اسے بھول جانا ہی ہوگا۔ اور یہی ہمارے لیے اچھا ہوگا۔"

اور تب پھر ان دونوں میں سے کسی نے شکنتلا اماں کے بارے میں کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ دن گزرتے رہے اور بھولی بسری یاد بنتی گئی۔

اور پھر ایک دن۔۔۔ سفید ریش اور سفید بھنوؤں والے ایک بزرگ تیاگی بابا ان کے گھر آئے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ایک زمانے میں وہ تجارت کے ذریعہ اپنے شہر کے ایک بہت مال دار آدمی بن گئے تھے۔ لیکن جوان بیٹا مرا تو ساری دولت تیاگ دی اور جنگل جنگل بھٹکنے لگے۔ وہ جنگلوں اور دیہاتوں میں گھوم پھر کر زندگی بسر کرتے تھے اور موسمِ باراں میں چاڑھی کے اس اونچے پہاڑ پر ایک کٹیا میں رہنے لگے تھے کہ جہاں سے سامنے کی بے شمار پہاڑیوں میں غروبِ آفتاب کا منظر اس ملک میں سب سے زیادہ دل کش اور پرکشش نظر آتا ہے۔

کہتے ہیں کہ تیاگی بابا بہت گیانی آدمی ہیں۔ انھوں نے آکر گھر والوں کو بتایا کہ بچپن میں پشپا کے باپ اور وہ ساتھ ساتھ

تھے اور بہت اچھے دوست تھے۔ پھر جب شیاما چھوٹی سی تھی تو وہ اسے جیسے چاؤ سے اپنی گود میں کھلایا کرتے تھے۔ مہیندر نے ایک اور شفیق بزرگ کو مزید چند دنوں کے لیے روک لیا۔

مہیندر سے نہ رہا گیا تو ایک دن اس نے تنہائی میں شکنتلا اماں کا حل نہ ہونے والا عقدہ تیاگی بابا کے سامنے بڑی ہی عاجزی میں رکھا۔ اماں کے بارے میں سب کچھ بتاکر اس نے پوچھا۔

"بابا کیا کارن ہے کہ بوڑھی اماں کو روپے پیسے سے اس قدر موہ ہے کہ وہ بھیک مانگنے تک سے باز نہیں آتی۔"

بابا کچھ دیر تک خاموش رہے۔ جیسے کچھ سوچتے اور اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر بولے۔

"میں بھی یہ سمجھنے میں اسمرتھ (ناقابل) ہوں پتر کہ روپے پیسے کا کوئی کشٹ نہ ہونے پر بھی دھن دولت سے اس کو اتنا موہ کیوں ہے کہ وہ بھکشا مانگنے پر بھی اتارو ہوجاتی ہے۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وردھ (بوڑھے) ہوکر کچھ لوگوں کا مستشک (دماغ) اتنا دربل کم زور ہوجاتا ہے کہ ان کو اپنی اور اپنے گھرانے کی مان مریادا کا بھی کوئی خیال نہیں رہ جاتا۔ اس نے اچھا ہی کیا جو سارے رشتے ناتے تیاگ کر ہری دوار چلی گئی۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔۔۔ پانچویں روز جانے کے لیے بابا اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر روکے سے بھی نہ رکے۔ مہیندر اپنی جیپ میں انھیں اسٹیشن چھوڑنے گیا۔ بابا ریل میں بیٹھ گئے۔ گاڑی چھوٹنے میں بس ایک ہی منٹ باقی تھا کہ مہیندر سے وہ بولے۔

"تو نے میری اتنی سیوا کی ہے کہ پتر تو میں تجھے وہ رہسیہ (راز) بتائے دیتا ہوں جو میں پچھلے پانچ دنوں سے اپنے اندر دبائے بیٹھا ہوں۔ اسے جان کر تو اب اپنی ساس شکنتلا پر کرودھ (غصہ) نہیں کرے گا۔ وہ رہسیہ کی بات یہ ہے کہ شکنتلا کے دادا نے اپنے یوون (جوانی) کے دنوں میں اپنے گاؤں کے گھر میں کام کرنے والی ایک لڑکی کو اپنی واسنا (ہوس) کا شکار بنالیا تھا۔ گاؤں والوں کے دوش (مجبور) کرنے پر شکنتلا کے دادا کو اسے اپنانا پڑا تھا۔ وہ ان کی پتنی نہیں تھی مگر گھر میں دوسری پتنی بن کر رہی۔ وہ لڑکی کچھ سندر تو تھی مگر۔۔۔ وہ ایک بھکاری کی بیٹی تھی۔"

یہ کہہ کر تیاگی بابا چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئے اور مہیندر کے چہرے پر آئے تاثرات کو پڑھنے لگے اور پھر جلد ہی بولے۔

"انسان کا خون کبھی نہ کبھی بول کر رہتا ہے۔ ہر انسان کٹھ پتلی کے دھاگوں کی طرح اپنے پوروجوں (آبا و اجداد) کے خون سے اور ان کے سوبھاؤ (مزاج) سے بندھا ہوا ہے۔"

"لیکن شکنتلا اماں۔۔۔"

"بڑھاپے میں اسے اپنی سوچ سمجھ پر نینترن (ضبط) نہیں رہا اور اب وہ کیول (صرف) بے دماغ کی ایک کٹھ پتلی ہے۔۔۔"

"لیکن بابا میرے بچے۔۔۔؟"

"تم چنتا مت کرو۔ ان کے دھاگے تمھارے پوروجوں کے ہاتھوں میں ہیں، شکنتلا کے پوروجوں کے ہاتھوں میں نہیں۔۔۔"

"اور کبھی اگر۔۔۔"

ٹرین چل پڑی۔ بابا مسکرا دیئے اور اس کو دیکھتے ہوئے ایک ہاتھ ہلانے لگے۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے اور پھر ان کی ٹرین بھی۔

○●○

ماہ نامہ سب رس حیدرآباد

فی پرچہ — ... روپے — مشرق وسطیٰ اور امریکہ

زر سالانہ — ... روپے — پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش

خاص نمبر — ... روپے — انگلستان

اس شمارے میں

کتابیں

مضامین

شاعری

افسانے

○●○

پون درما
ترجمہ: اُسامہ فاروقی

کتاب: غالب، شخصیت اور عہد

باب چار: ۱۸۵۷ء کا صدمۂ جاں کاہ

(قسط: ۸)

۱۸۵۷ء سے ایک تاریخی دور کے اختتام کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں مغلوں کی، بڑی محنت سے بنائی ہوئی صدیوں پرانی، سماجی اور تہذیبی عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ غالب کے مقدر میں لکھا تھا کہ وہ ایک عہد کے اختتام کے لاچار اور دل شکستہ شاہد عینی کی حیثیت سے ۱۸۶۹ء تک جییں۔ نظریہ حیات کے لحاظ سے گنگا جمنی اور ظاہری شکل کے لحاظ سے شستہ و شائستہ اور تعلیق، وہ ترقی یافتہ اور خود اعتماد تہذیب جو ان کی زندگی اور کارناموں کا آسرا اور سہارا تھی اب اپنی اصلی حالت کو کبھی نہ لوٹے گی۔ انھیں لال قلعے یعنی قلعہ معلیٰ کو فوجیوں کی بارکوں میں تبدیل دیکھنے کے لیے جینا پڑے گا۔ ان کو وہ دن بھی دیکھنا پڑے گا جب حضور پرنور، ظل اللہ فی الارض بے صدائے نقیب اور خوش خوانوں کی نغمہ سرائی کے بغیر جلاوطن کردیے جائیں گے اور پردیس سے واپس کبھی نہ لوٹیں گے۔ وہ دن دیکھنا بھی ان کے نصیب میں ہے جب ان کی پیاری دلّی کے ساتھ منصوبہ بند طریقے سے ایسا بے رحمی کا سلوک کیا جائے گا کہ اس کو پہچاننا بھی مشکل ہوجائے گا۔

سبھی کو معلوم ہے کہ ”وہ مفروضی وجوہ کیا تھیں جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا باعث ہوئیں، ان کا متعدد علمی کاوشوں میں تفصیل سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ چناں چہ یہاں ان کے اعادے سے احتراز کیا جائے گا۔ تاہم موضوعی سطح پر شاید ہی ایسی کوئی شہادت ملے کہ اس اتھل پتھل کا دلّی والوں کو بہ ظاہر پہلے سے کوئی سان گمان تھا یا ان کے لیے یہ انقلابِ عظیم کوئی متوقع بات تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مبہم سی بے چینی ضرور تھی۔ لیکن بنیادی طور پر اس کا مرکز توجہ شاہی حکومت کے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائیاں تھیں۔ لوگوں کو عام طور پر اس کا علم تھا کہ انگریزوں کا منصوبہ یہ ہے کہ مغلوں کی سکونت کو لال قلعے کے شاہی پس منظر سے ہٹا کر کہیں شہر کے باہر قطب صاحب کے پاس منتقل کردیا جائے اور ظفر کے جانشین کا خطاب ”شاہ“ نہیں بلکہ ”شہزادہ“ ہو۔ محلِ شاہی اور شہر میں کم از کم چند افراد ایسے ضرور تھے جن کا خیال تھا کہ شہنشاہ ایران یا زارِ روس فرنگیوں کو نکال باہر کرنے اور مغل شاہی خاندان کی عہدِ گزشتہ کی عظمت کو بحال کرنے کے لیے مداخلت کریں گے۔ فی الحقیقت دو ماہ قبل اس مضمون کا اشتہار کہ شاہ ایران اپنے مظلوم مسلم ہم مذہبوں کی مدد کو آئیں گے چند گھنٹوں کے لیے جامع مسجد کی دیواروں پر چسپاں پایا گیا تھا۔ بعض نجومی اور فال نکالنے والے بھی، جن میں خود محلِ شاہی کے اندر کے ایک ”نکل“ ”مذہبی رس پیچن کے ایک مضحکہ انگیز نمونے“ پیرزادہ حسن عسکری شامل تھے، نامبارک واقعات کے ظہور کی پیشین گوئی میں سرگرم تھے۔ لیکن دلّی کی گپوں اور افواہوں کے بہاؤ میں ان کی حیثیت معمولی گردابوں اور ہلکورں کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۱ / مئی ۱۸۵۷ء کو جب دلّی میں بغاوت کا آغاز ہوا شاید ہی کوئی امر ایسا رہا ہو جو غالب کو خبردار کرتا کہ یہ دن ان کی زندگی کے بندھے ہوئے ڈھرے میں ایسی بنیادی تبدیلی لائے گا۔

میرٹھ کے سپاہیوں کی پہلے پہل بہادر شاہ ظفر نے اس وقت شناخت کی جب وہ کشتیوں کے پُل پر سے اپنے گھوڑے پویہ دوڑاتے ہوئے آ رہے تھے۔ ظفر اپنے نجی کمرے میں بیٹھے جمنا پار ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے فوراً اپنے معتمدِ خاص حکیم احسن اللہ خاں کو، جو غالب کے بھی قریبی دوست تھے، طلب کیا۔ صبح کے کم و بیش سات بجے تھے اور ابھی تک شہر قریب آتے ہوئے طوفان سے بے خبر تھا۔ دہلی کالج کے طالبِ علم اپنی اپنی جماعتوں میں تھے۔ کلکتے سے اخبار حسبِ معمول آچکا تھا۔ کلکٹر کی عدالت کا اجلاس جاری تھا۔ اور غالب غالباً قلعہ معلیٰ کو جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ دلی والے موسم گرما کے ایک عام دن کے بندھے ہوئے کاموں سے نپٹنے کے لیے جاگ پڑے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں سپاہیوں کے دستے لال قلعے کی فصیلوں تک پہنچ گئے اور بہادر شاہ ظفر سے التجا کی کہ انھیں اندر آنے دیا جائے۔ ظفر نے اس شورش کو پسند نہیں کیا اور سپاہیوں کو داخلے کی اجازت دینے کی بہ جائے انھوں نے شاہی محل کے پہرہ داروں کے انگریز کمیدان کیپٹن ڈوگلاس کو طلب کیا۔ سوار آگے بڑھ گئے اور شہر میں دریا گنج کے قریب راج گھاٹ دروازے سے داخل ہوگئے۔ اب شہر کے لوگوں کو اور دہلی میں تعینات فوجی دستوں کو باغیوں کے ساتھ آملنے میں دیر نہیں لگی۔ انگریزوں اور اینگلو انڈین افراد کا بلاتردد قتلِ عام کیا گیا۔ سب سے پہلے قتل کیے جانے والوں میں مشہور و معروف نو عیسائی ڈاکٹر چمن لال بھی شامل تھے۔ غالب کے روزنامچے میں ان واقعات کا یہ اندراج ملتا ہے: "۱۶ / رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ / مئی ۱۸۵۷ء اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں، جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا۔ ۔ ۔ ۔ ان مدہوش سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور محافظ مہمان نواز ہیں، دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے، جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا، ادھر سے رخ نہیں پھیرا۔ ۔ ۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور و غوغا سنا۔ چاہتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اتنے میں شور مچ گیا کہ اندرونِ قلعہ صاحب ایجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیے گئے۔ ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ۔ ۔" شام ہونے تک دیوانِ خاص سے ملحق باغوں میں سپاہیوں کے سرگروہوں اور مشتعل مغل شہ زادوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا تھا جو بہ یک آواز پُر جوش استدعا کر رہے تھے کہ بادشاہ اس بغاوت کے حق میں دعا کریں اور اپنا آشیرواد دیں۔ بادشاہ کو تامل تھا لیکن ان کے لیے شاید ہی کوئی دوسرا چارہ کار تھا اور انھوں نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ اس سارے ہنگامے سے ہوسکتا ہے کہ کچھ فائدے کی صورت بھی نکل آئے۔ انھوں نے بغاوت کے حق میں دعا کی اور اپنا آشیرواد دیا۔ دہلی نے بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ چار ماہ سے زاید عرصے تک یعنی ۱۴ / ستمبر ۱۸۵۷ء تک جب کہ انگریزوں نے شہر پر دوبارہ قبضہ کیا یہ جھنڈا اونچا لہراتا رہے گا۔

غالب کے اس بغاوت میں شمول کی نوعیت کیا تھی؟ یہ مسئلہ کسی قدر متنازع فیہ ہے۔ غالب اور ان کے طبقے کے دیگر بہتیرے افراد کے لیے، ان منقسم وفاداریوں کے دھندلکے کے پیش نظر جس میں ان کی زندگی بسر ہو رہی تھی، یہ بغاوت فی الحقیقت ایک بھیانک خواب تھا۔ انگریز بالفعل حاکم تھے۔ مغل بادشاہ از روئے قانون احترام کی علامت تھے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل کے سالوں کے سیاسی جھٹ پٹے میں، اس موقف کی بنیادی لغویت کو مرکزِ توجہ بنائے بغیر، دونوں کے سامنے اظہارِ اطاعت کو کسی نہ کسی طرح ہم آہنگ بنالینا ممکن تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے واقعات سے دفعتاً یہ دھندلکا چھٹ گیا۔ اب ضروری ہوگیا کہ آپ اپنے موقف کا دوٹوک انتخاب کرلیں: آپ یا تو انگریزوں کے خلاف اور مغل بادشاہوں کے حامی ہوسکتے ہیں یا بہ صورتِ دیگر مغل بادشاہ کے خلاف اور انگریزوں کے حامی۔ غالب نے "دستنبو" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی جو بہ ظاہر ایک روزنامچہ ہے، جسے انھوں نے جیسے جیسے ان پُر آشوب مہینوں میں واقعات رونما ہوئے بے ساختہ لکھا۔ کتاب شدت سے انگریزوں کی طرف دار ہے اور بغاوت کے تعلق سے سنگ دلی کی حد تک پُر ملامت ہے۔ اگر ہم اس کتاب کے لفظی معنی مراد لیں تو ہمارے لیے

یہ نتیجہ نکالنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ غالب نے ۱۱/ مئی ۱۸۵۷ء کو ہی غیر مبہم طور پر اپنے موقف کا انتخاب کرلیا تھا اور وہ یہ تھا انگریز ہندستان کے واحد قانونی فرماں روا ہیں۔ جنھوں نے ان کے خلاف بغاوت کی وہ بے ڈھنگے اور گنوار و نمک حرام ہیں اور بغاوت کا قلع انصاف اور فلاح و بہبود کی واپسی کا پیش خیمہ ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس کتاب کے لفظی معنی مراد لینا ہمارے لیے ممکن ہے؟ دست یاب شہادت ہمیں ایسا کرنے سے خبردا کرتی ہے۔ "دستنبو" شاید ہی ۱۸۵۷ء کے واقعات کی ایک بے ساختہ روداد یا غالب کے خیالات کا حقیقی اظہار ہے۔ "دستنبو" شہر پر انگریزوا کے دوبارہ قابض ہونے کے بعد یا کم از کم بالکل آخر میں اس وقت لکھی گئی جب یہ واضح ہوگیا کہ بغاوت ایک سعی رائیگاں ہے۔ اس کا محدا مقصد انگریزوں کی نظر میں غالب کی بے گناہی ثابت کرنے میں مدد دینا تھا۔ ایسا کرنا ذہنی کاسہ لیسی کی بات نہیں تھی، یہ اپنے وجود کو برقرار رکھے کی بات تھی۔ فتح مند انگریزوں کو رحم دلی سے کوئی سروکار نہیں تھا، ذرا سا شبہہ بھی کسی کو پھانسی پر چڑھانے کے لیے کافی تھا۔ غالب کے سامنے ا مقصد تھے۔ اولاً اپنے خلاف کسی انتقامی کارروائی کا تدارک کرنا، ثانیاً اپنے خلوصِ نیت کو اس حد تک ثابت کرنا کہ انگریز ان کی پنشن کے دوبا اجرا پر آمادہ ہوجائیں۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے، یہ بھی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی بات تھی۔ مغل دربار کے خاتمے کے بعد غالب کسی اور ذریعہ آمدنی کی آس نہیں لگا سکتے تھے اور انتہائی تنگ دستی کا شکار تھے۔ اس طرح سے "دستنبو" حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ تھا۔ گو کہ ظاہری شکل م یہ کتاب ایک بیانیہ تھی، اسلوب بیان میں یہ قصیدے سے مشابہ کوئی چیز تھی اور قصیدہ، جیسا کہ سب جانتے ہیں فرماں روا کو داد و دہش پر آما کرنے کے لیے شاعروں کا قدیم اور آزمودہ نسخہ تھا۔ اس کی توقع نہیں رکھی جاتی تھی کہ شاعر قصیدے میں کی جانے والی وافر اور پرشوکت مد سرائی اور اس میں مذکورہ ضمنی باتوں پر فی الحقیقت یقین بھی رکھتا ہے۔ قصیدہ ایک محدود مقصد رکھتا تھا اور وہ تھا صاحبانِ اختیار کو متاثر کرنا "دستنبو" کا تعلق بس اسی صنفِ ادب سے تھا۔ جاگیردارانہ ماحول کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے غالب بس اسی طریقے سے اپنی حفاظت کر جانتے تھے۔ آگے ہم دیکھیں گے کہ وہ خود بھی "دستنبو" کو اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسری شہادت بھی موجود ہے جس بغاوت سے ان کے تعلق کا اور اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے حقیقی خیالات اس طرزِ خیال سے بالکل مختلف تھے جس کی "دستنبو" جیسے پرزور طریقے پر انگریزوں کی طرف دار کتاب کے مصنف سے توقع رکھی جانی چاہیے۔

غالب نے "دستنبو" میں انگریزوں کی مدح سرائی اسی بلند آہنگی سے کی ہے جیسے کہ قصیدے میں کی جاتی ہے اور اتنی ہی کھلی ہ سخن سازی کے ساتھ بھی۔ انگریزوں کے ہر ذکر کو ستائشی اسمائے صفت کے ساتھ شروع کرنا اس شخص کے لیے کوئی ایسی مشکل بات نہیں تھ جس کو اقرار تھا کہ اس نے اپنی آدھی عمر احمقوں کی بھٹی میں صرف کی ہے۔ چناں چہ وہ ملکہ وکٹوریہ کو "ملکہ، انصاف پسند، فلک رفعت، ستا حشم" لارڈ کیننگ کو "سکندر جاہ، فریدوں حشم" اور سر جان لارنس کو "حاکم مہربان، خورشید طلعت، ستارہ حشم" قرار دیتے ہیں۔ انگریزوں کے عموماً "بہادر، نیک سرشت، باہمت، شیر دل اور انصاف پسند" جیسے دوسرے اسمائے صفت استعمال کیے گئے ہیں جب کہ باغیوں کے ہاتھ ماری جانے والی انگریز عورتوں کو "پری چہرہ، نازک بدن خواتین" قرار دیا گیا "جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچی چاند کی طرح دمکتے تھے۔" ایک مقام پر غالب خطیبانہ انداز میں پکار اٹھتے ہیں: "تم نہیں دیکھتے ہو کہ "دامن" و "دام" اور "داد" و "دد" میں زیا فاصلہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے علاوہ دوسری حکومت میں انصاف کی امید رکھنا بالکل نادانی ہے۔" یہ اس شخص کے رشحات قلم ہیں جس نے زرِ کثیر اور اپنی آدھی عمر انگریزوں سے انصاف پانے کی کوشش فضول میں صرف کی تھی! انیسویں صدی عیسوی کے ہندستا میں شاعر اور ادیب کے لیے بغیر سوچے سمجھے خوشامدانہ الفاظ کی بھرمار کر دینے کی صلاحیت پر عبور معمول کی بات تھی۔ یہ روزی روٹی کی اور لہ

... سب زندہ ... ہیں۔

زندہ رکھنے کی بات تھی اور کسی طرح سے بھی تعلق عمل سے بے تعلق نہیں تھی۔ فی الحقیقت یہ تعلق عمل کو جاری رکھنے [illegible] کے حصول کی ایک کوشش شروع کی۔ غالب کے لیے زیادہ حصول کام ضروری [illegible] کے بعد انگریزوں کی سرکار کو [illegible] باغیوں کے درمیان ہی پر [illegible] تھا۔ وہ اس پہلو کا کسی قدر ذکر کرنے سے گریز نہیں کر سکتے تھے۔ یہ اپنے بیانیہ کو اعتبار و استناد کا جامہ پہنانے کی کوشش کے لیے [illegible] لیکن ان کی یہ کوشش کسی طرح سے بھی معقول نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "میں نے ابھی کہا کہ جتنے شیروں (یعنی انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی کچھ بے سروسامان لوگوں کو قتل کرنا اور چند مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام کو فتح کرتے ہیں، لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔" چند صفحات کے بعد: "مشہور یہی ہے کہ عموماً سپاہی لوٹ لیتے ہیں، قتل عام ... (اگرچہ انگریزوں) کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی (لیکن انھوں نے) احتیاط کیا۔" "لیکن اسی لمحے پر، شہر کے اندر والے ... سب کے دل درد سے بھرے ہوئے ہیں اور سب قتل عام کے خوف سے ہراساں ہیں۔" اور پھر: "مختصر یہ کہ فاتحین نے جس شخص کو پایا قتل کر دیا۔ شہر کے عالی خاندان اور صاحب عزت افراد عزت اور آبرو کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کر بیٹھے۔" اسی انداز میں لکھتے ہیں: "جمعہ کے دن محرم کی ۲۶ تاریخ تھی اور ستمبر کی ۱۸ / ... فاتحین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ کشت اور [illegible] کی (آفت) اس گلی تک آگئی، خوف سے لوگوں کے دل دہل گئے ... (چاندنی) چوک کے آگے قتل و خون کا بازار گرم [illegible] ہے۔" [illegible] غالب کی تمام کوششوں کے باوجود حقیقت بے اختیار ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان کے حقیقی خیالات [illegible] عام ان کے [illegible] کرنے کے لیے مختص تھے۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے یہاں بھی اپنی جان کے خوف سے وہ انتہائی محتاط تھے۔

اصل فکر [illegible] سے تعلق کو کم کر کے دکھانے کی تھی۔ انگریز خصوصی جوش کے ساتھ ان سب کی تلاش میں تھے جن کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ دربار سے اندرونی طور سے تعلق رکھتے تھے۔ شاعری میں استاد شہ ہونے کے ناطے غالب پر شبہ تھا۔ [illegible] کارروائیوں کے خلاف [illegible] تھی۔ محل شاہی سے اپنے تعلقات سے سراسر انکار تو بے وقوفی ہوگی۔ لیکن وہ اس تعلق کو ہلکا بیان کر سکتے تھے۔ اس کی اہمیت کو کم سے کم کر کے دکھا سکتے تھے۔ وہ خود کو بادشاہ کے [illegible] کے حاشیے پر محض ایک ملازم کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اس تعلق کی اہمیت کو گھٹا کر تو دکھا سکتے تھے۔ "دستنبو" کے ابتدائی صفحات ہی سے وہ یہی طرز عمل اختیار کرتے ہیں:

"اس کتاب کے پڑھنے والے پر [illegible] کہ میں نے ... انگریزی حکومت کے نان و نمک سے پرورش پائی ہے اور بچپن سے ان فاتحین عالم کے دسترخوان کا ریزہ چین ہوں۔"

سات آٹھ سال ہوئے کہ بادشاہ دہلی نے مجھے بلایا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں تیموری خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھوں، جس کے عوض [illegible] دیا جائے گا۔ میں نے اس خدمت کو قبول کر لیا اور کام میں مشغول ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کے استاد کا انتقال ہو گیا اور اصلاح شعر کا کام بھی مجھ سے متعلق کر دیا گیا۔ (یہاں وہ چالاک [illegible] کے ساتھ غالب سرسری طور پر اپنے استاد شہ ہونے کا ذکر کرتے ہیں)۔

میں بوڑھا اور کمزور تھا۔ [illegible] اس کے ساتھ ساتھ بہرے پن کی وجہ سے [illegible] ہوتا تھا۔ [illegible]

"اس وقت میں جو کام مکمل ہو چکا اس کو لپیٹ کر رکھ دیا جاتا تھا کسی کے ہاتھ بیچ دیا جاتا ۔ یہ تو تھا تعلق اور جڑا کام ۔ لیکن یہ تیز رفتار جس میں ہم خیال میں کہ تھا کہ ایک سے ایک ۔۔۔ کا تاکہ مرتب کرے اور جیسے اس سکون و آرام کو جس میں تحقیقی فرصت کا کوئی حصہ نہیں تھا اور جو ہر قسم کی جلوگیری سے پاک تھا ، جاہ کرتے ۔"

لیکن یہ کافی نہیں تھا ۔ ہاں اگر انھوں نے بغاوت کی حمایت نہیں کی لیکن وہ اس کی مخالفت میں بھی تو کچھ کر سکتے تھے ، وہ غالب اس تحریک اٹھارہ سو ستاون کے خلاف بھی پیش بندی ہی کرتے ہیں ۔

"کچھ مسکین ، گوشہ نشین جن کو انگریزی حکومت کی مہربانی سے کچھ نان و نمک میسر تھا ، شہر کے مختلف علاقوں میں ایک دوسرے سے دور زندگی کے دن گزار رہے تھے (ایسے مسکین و صلح پسند) جو تیرہ و تبر کے فن سے ناواقف تھے اور اندھیری راتوں میں چوروں کے قدموں سے ڈر جاتے تھے ، جن کے ہاتھ تیر و تلوار سے خالی تھے ۔ سچ پوچھو تو ایسے لوگ ہر گلی کوچے اور شہر کے ہر حصے میں ہیں ۔ یہ وہ لوگ نہیں جو لڑائی کے ارادے سے کمر کس کر تیار ہو سکیں ۔ اس کے باوجود (کہ ایسے صلح پسند و خیر خواہ شہر کے ہر حصے اور ہر گلی کوچے میں تھے) اس وجہ سے کہ تیز بہنے والے پانی کو خس و خاشاک سے نہیں روکا جا سکتا ، اپنے کو مجبور سمجھ کر ہر شخص غمگین و ماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا ۔"

وہ بغاوت کے اشخاص ڈراما کے اہم ترین اداکار " سپاہی " کی نکتہ چینی خصوصی شدت کے ساتھ کرتے ہیں ۔ گمان ہوتا ہے کہ یہاں مصلحت اور ذاتی رائے میں توافق پایا جاتا ہے ۔ غالب انسانی مساوات پر عقیدہ رکھنے والوں میں سے نہیں تھے ۔ ان کی وفاداری جاگیردارانہ نظام ، امن کے ساتھ تھی ، جہاں ان کے خیال میں ان کا جائز مقام چوٹی کے آس پاس تھا ۔ اس نظام کو جسے دستور قدیم کی حرمت حاصل تھی انگریزوں کی طرف سے اتنا خطرہ نہیں تھا ۔ لیکن یہ اسی آسانی سے " فسادی پیادہ سپاہیوں " ، " عوام کالانعام " اور " انبوہ سرکش " کے حملوں سے بھی زیر و زبر ہو سکتا تھا ۔ چنانچہ اگر وہ متکبر انگریزوں کے وکیل نہیں تھے تو سپاہیوں کی اکثر کی بھی تائید ہرگز نہیں کرتے تھے ۔ اس امر کی شہادت ہے کہ جب بغاوت شروع ہوئی تو اپنی طاقت اور اہمیت کے نئے احساس سے شہ پاکر سپاہی اس اطاعت شعاری کے تعلق سے کسی حد تک لاپروا ہو گئے تھے جس کی جاگیردار طبقہ ، امرا کے افراد ان سے توقع رکھتے تھے ۔ رویے کی اس تبدیلی پر سب سے پہلے بادشاہ نے دھیان دیا اور انھوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا ۔ اپنے عہدہ داروں و مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے ۱۸۵۷ میں شکایت کی کہ ان کے حضور میں سپاہیوں کا گھوڑوں پر آنا قابلِ اعتراض تھا ۔ اپنے بیٹے مرزا مغل کے نام بھی ۔۔۔ وہ یہی رنگ جھلکتے ہیں ۔ " وہ اکثر سپاہی ۔۔۔ گھوڑے پر سوار (قصرِ شاہی کے) اندر چلے آتے ہیں ۔۔۔ " حالاں کہ جب کبھی انگریزی حکومت کا کوئی عہدہ دار بھی [illegible] کے دروازے پر گھوڑے سے اتر جاتا اور [illegible] پیدل چلتا ۔۔۔ [illegible] نہیں تھی ۔۔۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سرائی میں حقیقی کراہت کی گونج سنائی دیتی ہے :

"(زمانے کی) اس بے نیازی و بے امتیازی کو کیا کہوں کہ وہ کم رتبہ لوگ، جو سارا دن مٹی بیچنے کے لیے زمین کھودتے تھے، ان کو مٹی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی محفل میں رات میں آتشِ گل سے چراغ روشن رہتے تھے، اندھیرے گھروں میں ناکامی و نامرادی کے غم میں مبتلا ہیں۔

کوتوالِ شہر کی زن و دختر کے علاوہ ساری نازنینانِ شہر کا زیور بزدل اور سیہ کار رہزنوں کے قبضے میں ہے۔

(زیور اور آرائش سے معرا ہونے کے بعد) ان نازنینوں میں جو ہلکا سا اندازِ ناز باقی رہا تھا، اس کو ان نودولت گداززادوں نے چھین لیا کہ ان کی خودنمائی کے کام آتے۔ جو محبت کرنے والے نازنینوں کے ناز اٹھاتے تھے، وہ اب ان بد نہادوں کے ناز اٹھانے پر مجبور ہیں۔ ان گھٹیا لوگوں کے دماغوں میں غرور اس حد تک سما گیا ہے کہ اگر ان کی حرکات کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کچھ بگولے چکر کھاتے پھر رہے ہیں اور چھچھورے ہر وقت اس طرح نازِ خود نمائی میں محو رہتے ہیں، گویا پانی کی سطح پر کچھ تنکے بہتے چلے جارہے ہیں۔

بڑے بڑے عالموں اور نام وروں کی آبرو مٹی میں ملادی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزت، وہ بے اندازہ زر و جواہر اور عزت و آبرو کے مالک ہیں۔ جس کا باپ گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا، وہ ہوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے۔ جس کی ماں پڑوسی کے گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی وہ آگ پر حکم چلانے کا مدّعی ہے۔ کمین، آگ اور ہوا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔۔۔"

چناں چہ غالب کی طرف سے سپاہیوں کی مذمت کی تہ میں میلے کچیلے عوام کالانعام کے تعلق سے طبقاتی تنفر کا جذبہ بہ طورِ اساس کار فرما ضرور ہے ان کے ذہن کے کسی نہاں خانے میں یہ خیال ضرور ہے کہ ایسے لوگوں کی اپنے آقاؤں سے وفاداری کے معاہدے کی خلاف ورزی غیر اخلاقی اور نمک حلالی کے جاگیر دارانہ اصول کے برخلاف تھی۔ لیکن اس اساس پر کھڑی کی گئی عمارت کی غالب جان بوجھ کر حشو و زوائد سے تزئین و آرائش کرتے ہیں تاکہ "دستنبو" کے انگریزوں کی طرف داری سے مملو مشمولات کو تقویت پہنچے۔ سپاہیوں کے خلاف ان کے خیالات کا اس دو ٹوک انداز سے اظہار شروع سے محض اس وجہ سے ممکن نہ تھا کہ جب بغاوت شروع ہوئی تو انگریزوں کی فتح کو ایسا امرِ کلی سمجھنا مشکل تھا جو پہلے سے طے ہو۔ سپاہیوں اور ان کے سرگروہوں کے اقتدار کے نئے مرکز کی حیثیت سے ابھرنے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا اور ان لوگوں کے لیے انگریزوں کی طرف داری کے جذبات انتہائی ناقابلِ برداشت تھے، انگریزوں کے ہم درد اور مخبر ہونے کے ذرا سے بھی شبہ پر یہ لوگ بیسیوں کو قتل کر چکے تھے۔ دستنبو میں ہمیں باور کرانے کے لیے انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہو کیا غالب واقعی بغاوت کے دوران اپنے خیالات کو قلم بند کرنے کی غلطی کر سکتے تھے؟ دلی کی لڑائی میں انگریزوں کو فتح آسانی سے نصیب نہیں ہوئی تھی۔ "۳۰" ۲۱ / مئی کو ہنڈن ندی کے پاس پہلی راست جھڑپ میں انھوں نے فتح ضرور پائی۔ ایک ہفتہ بعد بدلی کی لڑائی بھی انھوں نے جیتی۔ لیکن شہر میں اس کی وجہ سے لوگ پست ہمت بالکل نہیں ہوئے تھے۔ اس کے برعکس، سرگروہوں کی کثرت کی وجہ سے پیدا ہونے والی الجھنوں اور وسائل کی انتہائی قلت کے باوجود عام موڈ جوش و خروش اور رجائیت کا تھا۔ پہاڑی سلسلے سے چپکے ہوئے ناکافی برطانوی فوجی دستے خستہ حالت میں تھے۔ ان کی تعداد کم تھی، ضروریات کا ذخیرہ گھٹتا جارہا تھا اور کمک دور تھی۔ موسم گرما اپنی شدت پر تھا، بود و باش کی انتہائی غیر تشفی بخش صورت حال، ہیضہ اور ملیریا بخار سے ہونے والا جانی نقصان قابلِ لحاظ تھا۔ اس کے برخلاف شہر میں بد انتظامی سے ہونے والے نقصان کی کم از کم ابتدا،

غلابی جوش و خروش اور جیتنے کے عزم سے معقول تلافی ہوجاتی تھی ۔ عام خیال یہ تھا کہ محصور انگریزوں کی شکستِ فاش کچھ ہی دنوں کی بات ہے ۔ بدلی کی شکست کے ایک ہی دن بعد ہندستانی فریق نے پھر سے جتھہ بندی کی اور اس پہاڑی سلسلے پر جہاں انگریز فوجی دستے تعینات تھے ںدت کے ساتھ حملہ شروع کیا ۔ قیادت کی ذمہ داری واقعی بہادر شاہ ظفر نے قبول کرلی تھی ۔ ان کے بڑے بیٹے مرزا مغل کو سپہ سالار اور ہوٹے چھیتے بیٹے جواں بخت کو وزیر مقرر کیا گیا تھا اور کوتوال کو اپنے کام میں حسبِ معمول لگے رہنے کی ہدایت دی گئی تھی ۔ بنیادی انتظامی ،انچہ برقرار رکھا گیا تھا گو کہ عہدوں کے نام اب فارسی میں تھے ۔ بعض پرانے منصبوں مثلاً شریعت اسلامی کے اعلیٰ ترین شارح صدرالصدور کے منصب کو پھر سے رواج دیا گیا ۔ بعض جدّتیں عمل میں لائی گئیں جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر مجلسِ انتظامی کی جدت تھی ۔ " اس کا رضِ منصبی مالی اور فوجی دونوں طرح کے امور کی نگرانی تھا اور اس کے دس ارکان میں چھ فوجی اور چار غیر فوجی نمائندے شامل تھے ۔ ۔ ۔ نصود ایسا لگتا ہے کہ وسیع ترین اختیارات کی حامل جنگی کابینہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔" بعض وقت کے وقت روبہ عمل لائے جانے والے امور کی شہادت ی ملتی ہے جن سے بدلتے ہوئے توازنِ قوت کے تعلق سے لچک اور اثر پذیری کا اظہار ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر بریلی سے آنے والے لائق لین متکبر سرگروہ محمد بخش خاں کو ، جو ایک بڑی اور وفادار فوجی جمعیت کا سردار تھا اور جس کے پاس سرکاری خزانے کی امداد کے لیے روپیہ سہ بھی تھا ، ازراہِ مروت "صاحبِ عالم بہادر" یعنی صوبہ دارِ اعلیٰ کا خطاب دیا گیا ، جو اس وقت تک مغل دربار کے لیے انوکھا تھا ۔ درپیش سائل ہمت شکن تھے ۔ الجھنیں کافی تھیں اور سازشیں اور بھی زیادہ تھیں ، لیکن سبھی معاصر روئدادوں اور دستاویزات سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کا دربار تمام امور کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھا اور اپنے فرائض سرگرمی کے ساتھ انجام دے رہا تھا ۔

اس صورتِ حال میں یہ نہایت دور از قیاس ہے کہ استادِ شہ اور قلعہ معلیٰ میں روزانہ حاضری دینے والے غالب خود کو ان امور سے لاعدہ رکھ سکتے تھے ۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ امر واقعہ کہ غالب درباری سازشوں سے پوری طرح باخبر تھے خود دستنبو سے ظاہر ہے ۔ غالب کے قریبی دست حکیم احسن اللہ خاں بادشاہ کے معتمد علیہ اور مشیرِ خاص تھے ۔ دربار میں بعض لوگوں کو شبہہ تھا کہ حکیم صاحب انگریزوں سے سازباز رکھتے یں ۔ غالب دستنبو میں اس واقعہ کا ذکر ، مناقشے کی تفصیلات دیے بغیر ، ضمنی طور پر کرتے ہیں ۔ لیکن اس شخص کی مذمت میں ، جو غالباً احسن اللہ کے خلاف مہم چلانے والے گروہ کا سرغنہ تھا ، وہ جو الفاظ استعمال کرتے ہیں کسی بے تعلق اور دور سے مشاہدہ کرنے والے کے شاید ہی ہوسکتے یں : " بُرے سے بُرا غلام اپنے آقا سے اس طرح پیش نہیں آسکتا بہ شرطے کہ وہ ولد الحیض نہ ہو ۔ یہ خبیث ، نمک حرام ، جس کے منہ پر چیچک کے داغ ہیں ، بے حیائی کے سبب سے جس کی آنکھیں پھیل گئی ہیں اور دہانہ فراخ ہوگیا ہے ، اپنے آپ کو زہرہ و مشتری کی طرح سمجھتا ہے ۔ ہر رف کولھے مٹکاتا ہوا ، انداز دکھاتا ہوا گزرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش خرامی میں کبک و تدرو کو شرماتا ہے ۔ میں نے اس کا نام اس لیے نہیں لکھا ہ وہ ایک گدازادہ ، گم نام ہے ۔" صرف اس مناقشے کا واقف کار ہی اس طرح سے ذاتیات پر حملہ کرتے ہوئے مذمت میں اتنے درشت الفاظ ستعمال کرسکتا ہے ۔

جنوری ۱۸۵۸ء میں نواب رام پور کے نام ایک خط میں غالب بڑی احتیاط کے ساتھ اور دبی زبان میں اپنے رول کا اعتراف کرتے ہیں :
"اس ہنگامے میں اپنے کو میں نے دربار سے الگ ہی رکھا ۔ لیکن اس اندیشے سے کہ اگر یک قلم ترکِ آمیزش کرتا ہوں تو کہیں میرا گھر تاراج نہ کردیا جائے اور خود میری جان کو خطرہ لاحق نہ ہوجائے ، میں باطن میں بے گانہ اور بہ ظاہر آشنا بنا رہا ۔" نواب رام پور مسلمہ طور پر انگریزوں کے طرف دار تھے ، زمانہ انتہائی کشیدگی کا تھا ، انگریزوں کی بربریت اپنے عروج پر تھی ۔ غالب سے ساری حقیقت بیان کرنے کی توقع شاید ہی کی جاسکتی ہے بالخصوص ایک خط میں جب کہ اس کے راستے میں پکڑے جانے کا احتمال بھی رہا ہوگا ۔ وہ دربار سے " بہ ظاہر آشنا " بنے رہنے کا اقرار کرنے

۔ تیار تھے ۔ یہی بات خاصی معنی خیز ہے ۔ انگریزوں کا شبہ صحیح تھا کہ ان کی یہ شناسائی اور تعلق کہیں زیادہ گہرا تھا ۔ غالب خوش قسمت تھے کہ محل شاہی کے کاغذات میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملی جس سے ان پر بالیقین الزام عاید ہوتا ہو ۔ ۱۸۵۸ ۔ میں تفتہ کے نام ایک خط میں غالب اطمینان کی سانس لیتے ہیں کہ شاہی کاغذات کی تلاش میں اب تک ان کو ماخوذ کرنے والی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی ہے ۔ یہ ظن غالب انگریزوں کے شہر پر دوبارہ قبضے کے عین قبل دستاویزات کی بڑی تعداد عمداً تلف کردی گئی تھی ۔ لیکن پھر بھی وہ الزام سے پوری طرح بچ نہیں پائے ۔ بغاوت کے دوران ایک اخبار کی اطلاع تھی کہ بہادر شاہ ظفر کے نام سے جو سکّے جاری کیے گئے تھے ان کی پشت پر کندہ کیے جانے کے لیے شعر غالب نے کہہ کردیا تھا ۔ انگریزوں کے پاس اس اخباری اطلاع کی ایک نقل تھی اور کمشنر غالب سے استفسار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اطلاع صحیح تھی ۔ غالب نے اس کو غلط ٹھیرانے کی کوشش کی ۔ اپنی صفائی میں ان کا یہ کہنا تھا کہ "بادشاہ شاعر ، بادشاہ کے بیٹے شاعر ، بادشاہ کے نوکر شاعر ۔ خدا جانے کس نے کہا ۔ " ان کے لیے باعثِ تقویت یہ امر تھا کہ اس وقت تک دربار کی دستاویزات میں کوئی ایسا کاغذ کا پرزہ دست یاب نہیں ہوا تھا جس کی بنا پر راست ان پر الزام عاید ہوتا ہو ۔ وہ یہ دلیل لاتے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں جیسے دربار کے اہم عہدہ دار ان کی بے گناہی کی تصدیق کرسکتے ہیں ۔ تاہم اپنے دوستوں کے سامنے وہ یہ ماننے کو تیار تھے کہ اگر انھوں نے یہ سکہ کہا تو اس لیے کہ ان کے پاس کوئی دوسرا چارہ کار نہ تھا اور اس لیے ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا ۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر باغی سپاہیوں کے لیے عام معافی کا اعلان ہوسکتا ہے تو شاعر کے دو مصرعے کیوں معاف نہیں کیے جاسکتے ۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں : " اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب نے مغل بادشاہ کا ساتھ دیا اور ۱۸۵۷ ۔ میں بہادر شاہ ظفر کے تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینے کے پُر مسرت موقع پر ایک سکّہ کہہ کردیا ۔ یہ سکّہ جس کا اب تک علم نہ تھا منشی جیون لعل نے اپنے (اصل) روزنامچے میں نقل کیا ہے اور منکاف نے اپنے انگریزی ترجمے میں اسے حذف کردیا ہے سکّہ حسب ذیل ہے :

بر زرِ آفتاب و نقرہ ، ماہ سکّہ زد در جہاں بہادر شاہ

(بہادر شاہ نے آفتاب کے سونے اور چاند کی چاندی پر اس جہاں میں اپنا سکّہ ڈھالا ہے) دربار سے ان کے باقاعدہ تعلق کی تصدیق ایک اور شہادت سے بھی ہوتی ہے ۔ منشی جیون لعل کے درباری روزنامچے میں ۱۳ / جولائی ۱۸۵۷ ء کو یہ اندراج ملتا ہے : " مرزا نوشہ " (غالب کا عرف) اور مکرم علی خاں نے انگریزوں پر بادشاہ کی فتح کی خوشی میں ایک قصیدہ ، مدحیہ پڑھا ۔ " اس کی بھی شہادت ہے کہ اگست ۱۸۵۷ ۔ میں جب انھوں نے ایک اور قصیدہ پیش کیا تھا بادشاہ کی طرف سے انھیں خلعتِ فاخرہ سے نوازا گیا تھا ۔

بغاوت کے دوران ہندستانیوں کے لکھے ہوئے دوسرے بیانیوں کی طرح سید مبارک شاہ نے بھی ، جو اس زمانے میں بہادر شاہ کے تحت دلی میں کوتوالِ شہر تھے ، اپنے بیانیے میں انگریزوں کی نظر میں خود اپنی اور اس وقت کے دیگر ممتاز ہندستانیوں کی بےگناہی ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : " حکیم (احسن اللہ خاں) کو فکر تھی کہ باغیوں کے لشکر کو دلی آنے سے باز رکھنے کا کوئی ذریعہ تلاش کریں ۔ لیکن اگر وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے تو فوراً مار ڈالے جاتے ۔ ایک موقع پر وہ طیش میں آگئے ، سپاہیوں کو برا بھلا کہتے ہوئے للکارا : " تم یہاں فساد برپا کرنے کے لیے کیوں آئے ہو ؟ تم اگر لڑنا چاہتے ہو تو باہر جاکر کیوں نہیں لڑتے ؟ " اس سے ساری دلی کو شبہ تھا کہ حکیم صاحب دل سے انگریزوں کے طرف دار ہیں ۔ اسی طرح سے لارڈ لیک کے قدیم جاگیردار نواب احمد بخش کے بیٹے نواب امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں درحقیقت حکومتِ انگریزی کے خیر خواہ تھے ، لیکن ان کے دلی خیالات اور جذبات کا پتہ کیسے چلتا ؟ لوگ تو صرف ظاہری اعمال سے رائے قائم کرسکتے ہیں (ان نوابین نے نہ تو باغیوں کے ساتھ کسی طرح کی شرکت کی تھی اور نہ ہی بادشاہ کے بیٹوں کے شریک کار تھے) اور ان کی وفاداری انگریزی فوج کے دلی پر قبضے کے بعد ہی حتمی طور پر ثابت ہوئی ۔ اسی زمرے میں شہر کے صدر امین مفتی صدرالدین آزردہ کو بھی رکھا

بانا چاہیے جن سے شہ زادوں اور سپاہ دونوں نے بار بار یہ فتویٰ دینے کی فرمائش کی کہ وہ جس جہاد میں لگے ہوئے ہیں جائز و برحق اور منشاءِ ربانی کے مطابق ہے ۔ مفتی صاحب نے ایسا فتویٰ دینے سے ہمیشہ گریز کیا ۔ ۔ ۔" غالب کے شمول کے بارے میں مبارک شاہ لکھتے ہیں : "لشکر میں واقعی س اطلاع کی شہرت تھی کہ مرزا نوشہ اور مرزا الٰہی بخش بھی انگریزوں سے موافقت رکھتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ باغیوں کی شکست ہزیمت کے دل سے آرزومند تھے ، لیکن اس اطلاع کو محض جزوی طور پر قابلِ یقین سمجھا گیا ۔ اگر شہ زادوں یا سپاہ کو محاصرے کے دوران س پر واقعی یقین ہوتا تو وہ انھیں بیخ و بن سے نیست و نابود کردیتے ، نہ عمر کا لحاظ رکھتے اور نہ جنس کا ، ان کے بیوی بچے اور سبھی متعلقین تہ یغ کردیے جاتے ۔ شہر پر قبضے کے بعد ہی ان افراد کی راہ و روش کا علم ہوا ۔"

ایک ایسے بیانیے میں ، جس کا بین طور پر مقصد ہی بغاوت میں اہم شخصیتوں کے شمول پر لیپ پوت کرنا تھا ، یہ امر واقعہ کہ مبارک ناہ یہ کہنے کو تیار ہیں کہ غالب کے بارے میں اطلاع کو شہ زادوں اور سپاہیوں نے محض جزوی طور پر ہی قابلِ یقین سمجھا ، اس بات کی نشان دہی تا ہے کہ اس دور میں دربار سے غالب کا تعلق اس حد تک عملی تھا کہ اس کو کلیتہً نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا ۔ مبارک شاہ بھی غالب کے رے میں اسی قطعی انداز میں لکھ کر دوسرے لوگوں کے تعلق سے اپنے بیان کو قابلِ اعتبار باور کرانے کی کوشش کو خطرے میں ڈالنے کے لیے یار نہیں تھے ۔

اس طرح سے دستنبو میں موافق انگریز جذبے کا اظہار جتنا زیادہ پُر زور ہو اتنی ہی زیادہ وضاحت سے اس تصنیف کی حقیقت منکشف وتی ہے ، وہ یہ کہ یہ محض بغاوت میں غالب کے واقعی شمول پر پردہ ڈالنے کی ایک اختراع پسندانہ کوشش تھی ۔ وہ اپنے حقیقی خیالات کو قلم د کرنے سے ڈرتے تھے ، لیکن دوستوں کے نام خطوط سے ان کے ان خیالات کا بڑی حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ حسبِ ذیل اقتباسات اسی مد کے ہیں جس کی نام نہاد روداد دستنبو ہے اور جس میں غالب نے شروع سے آخر تک انگریزوں کی مدح سرائی کی ہے :

- دسمبر ۱۸۵۷ء ، بہ نام تفتہ : "مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں ۔"
- دسمبر ۱۸۵۷ء ، بہ نام حکیم غلام نجف خاں : "تمہارا خط پہنچا ۔ ۔ ۔ تم جو کہتے ہو کہ : "تم نے کبھی مجھ کو خط نہیں لکھا ۔ ۔ ۔ انصاف رو ، لکھوں تو کیا لکھوں ؟ کچھ لکھ سکتا ہوں ؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے ؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھا ؟ اور اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں ؟ س اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں ۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے ، نہ میں لکھوں گا ۔"
- جنوری ۱۸۵۸ء ، بہ نام حکیم نجف خاں : "جو دم ہے غنیمت ہے ، اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں ، بعد گھڑی بھر کے کیا و ، کچھ معلوم نہیں ۔ قلم ہاتھ میں لیے پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ لکھ نہیں سکتا ۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔"
- فروری ۱۸۵۸ء ، پھر بہ نام تفتہ : "بھائی بری آ بنی ہے ۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا ۔ ۔ ۔"
- فروری ۱۸۵۸ء ، بہ نام مجروح : "اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی ۔"
- فروری ۱۸۵۸ء ، بہ نام ثاقب : "اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائے گا ، ورنہ قصہ مختصر قصہ تمام ہوا ، لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں ؟"

خاص بات یہ ہے کہ ان امور کی طرف ، جنھوں نے غالب کو دستنبو لکھنے پر مجبور کیا ، کتاب ہی میں اشارہ مل جاتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : میں تو بندہ ، شکم ہوں ، مجھ کو تو بس روٹی چاہیے ۔" وہ سعدی کے ایک شعر کا حوالہ دیتے ہیں :

چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرماں را چہ کند گوی کہ تن در نہ دہد چوگاں را

(غلام آقا کے حکم کے سامنے سر نہیں جھکائے گا تو کیا کرے گا۔ گیند چوگان کی اطاعت کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہے ؟") کتاب کی اصل عبار میں وہ بڑی ہوشیاری سے اپنے پنشن کے معاملے کی تفصیلات کی آمیزش کرتے ہیں۔ آخر میں قصیدے کی مخصوص شکل میں وہ اس التجا پر آ ہیں جس کا تمام لگے صفحات محض ایک پیش خیمہ تھے : " باقی پنشن اگر مل گئی ۔ تب بھی آئینہ ۔ دل سے زنگِ غم صاف نہیں ہوسکے گا ۔ نہیں ملی ، اس صورت میں شیشہ ۔ دل پتھر سے چور چور ہو جائے گا ۔ ۔ ۔ کاش میری ان تینوں خواہشوں یعنی خطاب ۔ خلعت اور پنشن کے بح حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آجائے ۔ جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی کچھ لکھا ہے ۔" جب کتاب اشاعت کے لیے تیار تھی ان مترددہ ہدایتوں سے اس کے لکھے جانے کے مقصد کے بارے میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی ۔

تفتہ سے ، جو طباعت میں ان کی اعانت کر رہے تھے ، وہ کہتے ہیں کہ یہ کام انھیں بہ عجلت اس لیے کروانا چاہیے کہ اس کی جلدیں نواب گورنر جنرل بہادر اور ان کے ذریعے جناب ملکہ ۔ معظمہ انگلستان کی نذر کرنی ہیں ۔ وہ اپنے نام سے عرفیت " نوشہ " کو نکال دینے کی خوا کرتے ہیں کیوں کہ " دلی کے حکام کو عرف معلوم ہے ۔ مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزرا کے محکمے میں اور ملکہ ۔ عالیہ کے حضور میں کوئی ا نالائق عرف کو نہیں جانتا ۔" وہ چاہتے ہیں کہ مصنف کا نام بس " اسد اللہ خاں " لکھا جائے کیوں کہ گو کہ ان کا پورا نام " محمد اسد اللہ خاں " انگریز حکام ان کو اس پورے نام سے مخاطب نہیں کرتے ۔ جب کتاب کے چھپنے میں کچھ دیر ہوئی تو وہ تفتہ کی خبر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس ط سے تو کتاب سے انھیں جس فائدے کی توقع ہے اس پر پانی ہی پھر جائے گا ۔ وہ خواہش کرتے ہیں کہ پانچ پُرتکلف جلدیں تیار کی جائیں ا پنجاب کے چیف کمشنر ، گورنر جنرل ، ملکہ وکٹوریہ اور برطانوی حکومت کے دو متعلقہ سکریٹریوں کی خدمت میں روانہ کی جائیں ۔ باآلآخر اس سرمایہ کار کا انھیں منافع بھی ملا ۔ مارچ ١٨٥٩ ء میں انگریزوں کی نظر میں ان کی بحالی کا پہلا اشارہ اس وقت ملا جب لفٹنٹ گورنر نے ان کے پاس پسندیدگی ایک خط بھیجا ۔ کتاب کی نکاسی بھی حوصلہ افزا تھی ۔ غالب کو اپنی نثر پر فخر تھا اور انھیں اس پیش رفت سے خوشی ہوئی ۔ لیکن کتاب کے مخاطہ کون تھے ، اس بارے میں انھیں کبھی کوئی شک و شبہہ نہیں تھا ۔ ایک دوست کے نام خط میں جنھوں نے " دستنبو " کی جلدیں بک جانے کی اطلا دی تھی وہ لکھتے ہیں : " کتب " دستنبو " کے بک جانے سے میں خوش ہوا ۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ صاحب لوگوں نے خریدیں یا ہندستانیوں نے لیں ۔ ۔ ۔ بھائی ، ہندستان کا قلم رو بے چراغ ہوگیا ۔ لاکھوں مر گئے ۔ جو زندہ ہیں ، ان میں سیکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں ۔ جو زندہ ہے اسس میں مقد نہیں ۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آئی ہوگی یا (انگریزوں کے شِدّت سے طرف دار) پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گ ہوں گی ۔" جہاں تک کتاب کے مندرجات کا تعلق ہے تو نواب رام پور کے نام ایک خط میں انھوں نے اتنا کھلا اعتراف کر ہی لیا ہے جتنا ا حالات میں ممکن تھا : " ۔ ۔ ۔ یہ رسالہ " دستنبو " جو اب بھیجا ہے ، اس کا دیکھنا ضرور درکار ہے ۔ فارسی قدیم اور پھر حسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ بہ ایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ ۔"

بیسویں صدی کی قوم پرستی کے نقطہ ۔ نظر سے غالب کی طرف سے انگریزوں کی خوش نودی کے حصول کی کوشش ایک ایسی مصالحت دکھائی دیتی ہے جسے کسی طرح بھی حالات کی نزاکت کی دہائی دے کر حق بہ جانب نہیں قرار دیا جاسکتا ۔ ایک سطح پر یہ نقطہ ۔ نظر معقول ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا غالب کے بارے میں رائے قائم کرنے میں یہ کسی حد تک بھی ۔ مناسب ہے ۔ غالب ایک ایسے جاگیردارانہ نظام کی پیداوار تھے جس میں حاکم بالفعل کے سامنے اظہارِ اطاعت معاشرتی حیثیت سے مسلّمہ قاعدہ تھا ۔ وہ دستنبو میں لکھتے ہیں : " چوں کہ میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم ، ہندستان ، خصوصاً اس شہر دلی میں آئیں ان کی مدح میں قصیدہ بھیجا جائے ، اس بنا پر اس والاشکوہ (سر جان لارنس) کی تعریف میں ایک

قصیدہ لکھا۔" ان کے زمانے میں قوم پرستی اپنے جدید مفہوم میں ابھی تک اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی۔ مخالف برطانیہ جذبات کو ایک مربوط یا قابلِ شناخت قوم پرست نظریے کی شکل دینا ابھی مستقبل کی بات تھی۔ انگریزوں کے دلی پر دوبارہ قبضے کے بعد باشندگانِ شہر کے سبھی گروہوں کے لیے وجود کا برقرار رہنا ہی نہایت فوری اور سب سے مقدم وجہ تحریک تھا۔ خود بادشاہ یعنی بہادر شاہ کی کوشش یہ ثابت کرنے کی تھی کہ ان کی انگریزی سرکار سے وفاداری کبھی مشکوک نہیں تھی۔ حکیم احسن اللہ خاں نے بھی اتنی ہی شدت سے خود کو انگریزوں کی نظر میں بحال کرنے کی کوشش کی۔ دلی کے باہر غالب کے سرپرستِ خاص نواب رام پور نے البتہ علانیہ انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ جب بغاوت ناکام ہوگئی اور اس صورت میں کہ غیر ملکی تسلط کے مقابلے کے لیے کوئی قابلِ اعتبار مخالف جماعت ابھی تک معرض وجود میں نہیں آئی تھی، عملی نقطہ نظر کا تقاضہ یہ تھا کہ صورتِ حال کو قبول کیا جائے اور ماضی کی مراعات کی ممکنہ حد تک بحالی کے لیے کوشش کی جائے۔ غالب کے معاملہ میں وجود کے برقرار رہنے کا سوال انتہائی نازک شکل اختیار کرچکا تھا۔ ان پر سرگرمی سے شبہہ کیا جارہا تھا اور انگریزوں کی طرف سے ادا کی جانے والی پنشن کے علاوہ ان کا اور کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ جن کا اس سے کہیں کم داؤ پر لگا ہوا تھا انھوں نے بھی ناگزیر صورتِ حال سے مصالحت کرلی تھی۔ چناں چہ ان کے بارے میں سیاق و سباق کو پیشِ نظر نہ رکھتے ہوئے جدید وطن دوستی کے بے لوچ معیار کی رو سے رائے قائم کرنا بے انصافی ہوگی۔ واقعی اہم بات یہ ہے کہ ان کے زمانے کے جاگیردارانہ مزاج کے باوجود ان کا فطری، مخالف استعمار میلانِ خاطر کافی ترقی یافتہ تھا۔ انگریزوں کی طرف سے اودھ کے الحاق پر تبصرہ کرتے ہوئے فروری ۱۸۵۷ء میں ایک دوست کے نام خط میں وہ لکھتے ہیں: "تباہی ریاستِ اودھ نے، باآں کہ بے گانہ محض ہوں، مجھ کو اور بھی افسردہ حال کردیا، بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہلِ ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔" بغاوت کے دوران، عوام کالانعام کی نودریافت اکڑ کے تعلق سے ان کے ذہنی تحفظات کے باوجود، انھوں نے مغل دربار سے اپنا تعلق مستعدی کے ساتھ برقرار رکھا اور دستنبو میں انگریزوں کی تمام مصلحت آمیز تعریفوں کے باوجود کبھی کبھی ان کے حقیقی خیالات کی جھلک پس پردہ دکھائی ہی دے جاتی ہے۔ ایک موقع پر وہ لکھتے ہیں:

> "شاہ زادوں کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ بعض کو گولی ماردی گئی، اس طرح موت کے اژدہے نے ان کو نگل لیا۔ کچھ کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا، اس طرح رسنِ دار کی کشاکش سے ان کی روح ٹھٹھر کر رہ گئی۔ چند افسردہ دل قید خانے میں ہیں اور بعض عالمِ غربت میں آوارہ و پریشان پھر رہے ہیں۔ کم زور و ... بادشاہ پر مقدمہ چل رہا ہے۔
>
> جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے جاگیرداروں کو علاحدہ علاحدہ مختلف دنوں میں پھانسی پر لٹکادیا گیا۔ اس طرح ان لوگوں کو ہلاک کیا کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ خون بہایا گیا۔"

آخری سطر کا طنز خطرناکی کے ساتھ نمایاں ہے۔ اختصار اور لہجے کی لاپروائی مصنف کے ذہنی کرب اور احساسِ ناانصافی کو بہ مشکل مخفی رکھ پارہی ہے۔ اور جب نومبر ۱۸۵۸ء میں یہ اطلاع ملی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ٹھیکہ ختم ہوا اور قلم روِ ہند خود برطانوی حکومت کی عمل داری میں آگئی جو اس امر کی حتمی شہادت تھی (اگر اب بھی کسی شہادت کی ضرورت رہی ہو) کہ کش مکش ساری ختم ہوئی، تو غالب خط میں اپنے ردِ عمل کو ظاہر نہ ہونے دینے کی کوشش بالکل نہیں کرتے: "شاہ جہاں آباد میں بعد غروبِ آفتاب افقِ غربی شہر پر (یہ دم دار ستارہ) نظر آتا تھا... بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہرِ الٰہی کی ہیں اور دلیلیں ملک کی تباہی کی ہیں۔ یہاں پہلی نومبر کو دوشنبے کے دن حسب الحکم حکام کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور سب کو کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلم روِ ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنایا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ

میلے فرزند ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندستان کا حاکم کیا ۔ ۔ ۔ اللہ اللہ اللہ : (خط بہ نام انورالدولہ سعدالدین خاں بہادر شفق ، مورخہ ۵ / نومبر ۱۸۵۸ء) ۔

بغاوت کے دوران اور اس کے فوری بعد غالب کو شخصی طور پر قابلِ لحاظ مصائب برداشت کرنے پڑے ۔ دستنبو میں وہ لوٹ کھسوٹ اور نظم و نسق کی ابتری پر افسوس کرتے ہیں ۔ بسیار نویس مراسلہ نگار ہونے کے ناطے وہ ڈاک کے نظام کی ابتری سے بالخصوص پریشان تھے ۔ " ڈاک کا انتظام درہم برہم ہوگیا ، جس کے سبب سے بہت سے کام رک گئے ۔ ہرکاروں نے آنا جانا اور ڈاک لے جانا بند کر دیا ۔" اخباروں کی حسبِ معمول ترسیل بھی بند ہوگئی تھی ۔ زیادہ اہم بات یہ کہ فرانسیسی شراب اب دست یاب نہیں تھی ۔ وہ دستنبو میں لکھتے ہیں ، " فی الحقیقت سچی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے ۔ میں نیم مسلمان ، مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں اور بدنامی و رسوائی کے رنج سے بے نیاز ، ہمیشہ سے رات میں صرف ولایتی شراب پینے کی عادت تھی ۔ ولایتی شراب نہیں ملتی تھی تو نیند نہیں آتی تھی ۔ آج کل انگریزی شراب شہر میں بہت مہنگی ہے اور میں بالکل مفلس ہوں ۔" وہ خوش قسمت تھے کہ کچھ مدت کے لیے ایک دوست نے ایسا لگتا ہے کہ کسی قسم کی رم کا تھوڑا سا ذخیرہ ان کے ہاں بھیج دیا ۔ یہ شرابِ قند یعنی گنے کی شراب تھی ۔ تشنہ لب غالب کے لیے اس کی خوش بو ولایتی شراب سے بڑھ کر تھی اور وہ اسے وہی آبِ حیات قرار دیتے ہیں جس کی سکندر کو تلاش تھی !

روپے پیسے کی کمی نہایت دشوار مسئلہ تھی ۔ ان کی پنشن جس کی ادائگی انھیں برطانوی کلکٹری کے ذریعے ہوتی تھی مئی ۱۸۵۷ء سے یعنی اس مہینے سے جب بغاوت کا آغاز ہوا ، بند ہوگئی تھی ۔ مغل دربار سے ان کی آمدنی بھی بند ہوچکی تھی ۔ بہ شمول بیوی ، دو پوتے اور متعدد خدمت گار ، سارے کنبے کی کفالت ان کے سر تھی ، جب کہ آمدنی مطلق نہیں تھی ۔ اس پریشانی کے زمانے میں رقم ادھار لینا آسان نہیں تھا ۔ تلخ ظرافت کے ساتھ وہ لکھتے ہیں ، " بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر زندگی گزار رہا ہوں ۔ گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں ، میں کپڑے کھاتا ہوں ۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے سب کھالوں گا عالمِ برہنگی میں بھوک سے مرجاؤں گا ۔" وہ قطعاً مایوس ہوچکے تھے ۔ دستنبو کے ایک نہایت رقت انگیز مقام پر اپنے دو پوتوں کے بارے میں لکھتے ہیں ، " وہ دونوں ناز پرورده بچے پھل ، دودھ ، مٹھائی مانگتے ہیں ، لیکن ان کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں ۔"

بارش شروع ہونے تک ۱۸۵۷ء کا غیر معمولی شدید موسمِ گرما غالب کے لیے مزید اذیت کا باعث رہا ۔ مئی اور جون سال کے سب سے زیادہ گرم مہینے ہیں اور سبھی اطلاعات کے مطابق ۱۸۵۷ء جہاں تک لوگوں کی یادداشت کام کرتی ہے ایک انتہائی گرم سال تھا ۔ غالب کی نظر میں گرمی کی اذیت اس لیے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ ان کی جان پہچان کے بہت سے لوگ جو گرمی کے مہینے اپنے محفوظ ، ہوادار گھروں میں گزارنے کے عادی تھے ، اب بے گھر تھے ۔ جنگ و جدال کے ہنگامے اور شور و غوغا کو گرمی کے مستقل پس منظر کی حیثیت حاصل تھی ۔ بارود کی بو ہوا میں سرایت کیے ہوئے تھی اور آتش باری اور توپ داغنے کی گھن گرج ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی ۔ ضروری اجناس اور ضروری خدمات بجالانے والوں کی شدید قلت تھی ۔ "شہر کے اندر ضروریاتِ زندگی کی بڑھتی ہوئی طلب ، اعتبار اور ادھار پر کاروبار کی موقوفی ، پہاڑی پر (جہاں انگریز متمکن تھے) وافر مالی وسائل سے تازہ دم حریف مقدی کی موجودگی اور دیہاتیوں کے شہر میں تازہ رسد لانے میں روز افزوں تامل کا مجموعی اثر عمومی قلت کی شکل میں ظاہر ہوا تھا ۔ اگر شہر پر آخر ستمبر تک ایک دم سے دھاوا کر کے قبضہ نہ کرلیا جاتا تو چند ہی مہینوں کے اندر وہ قحط سے مجبور ہوکر ہتھیار ڈال دیتا ۔" غالب شکایت کرتے ہیں کہ دکانیں اب کھلی نہیں ہیں ، اناج کی شدید قلت ہے اور ضروری خدمات بجالانے والے ، مثلاً بھنگی ، دھوبی اور نائی دفعتاً غائب ہوگئے ہیں ۔ شہر پر دوبارہ قبضے کے بعد انگریز فوجیوں کی طرف سے قتلِ عام اور لوٹ مار کے زمانے میں پانی تک ایک جنسِ

ب بن گیا تھا ۔ دوسروں کی طرح غالب نے بھی پانی کو ناپ تول کر استعمال کرنا شروع کیا ، اور اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ ایسے تھن مہیا کیا ہوا پانی ایسا تھا کہ گویا کنویں کو ناخنوں سے کھودنا پڑا ہو ۔ ایک دفعہ سارا جمع کیا ہوا پانی ختم ہوگیا اور دو رات اور دن وہ خود اور ان گھر والے پیاسے رہے ۔

غالب کی خوش قسمتی کہ ان کا گھر ایسی گلی میں تھا جو جلد ہی مہاراجہ پٹیالہ کی حفاظت میں آگئی ۔ مہاراجہ شروع ہی سے انگریزوں کی ۔ میں شامل ہوگئے تھے ۔ مشہور اطبا حکیم محمود خاں ، مرتضیٰ خاں اور غلام اللہ خاں جن کے گھر غالب کی گلی میں تھے ، پٹیالہ دربار سے متعلق اور انھیں اس دربار کی سرپرستی حاصل تھی ۔ جب انگریزوں کی فتح قطعی دکھائی دینے لگی تو پٹیالہ کے حکم ران نے ان پر دباؤ ڈال کر یہ وعدہ لیا حکیم صاحبان کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی ۔ شہر پر دوبارہ قبضے کے کچھ ہی دنوں کے اندر مہاراجہ نے گلی کے داخلے پر اس محلے کے باشندوں کی ت کے لیے خود اپنے آدمی تعینات کردیے ۔

انگریزوں کی فتح کے بعد تیسرے دن مہاراجہ کے سپاہی گلی میں اپنی جگہ پر آگئے ۔ تب محلے کے باشندے اتنی ہمت جٹا پائے کہ ے خوردنی اور پانی کے لیے باہر جائیں ۔ لیکن انھیں خبردار کردیا گیا تھا کہ چاندنی چوک کی دوسری طرف جانے کی جراءت کرنا اپنی ہلاکت کو ت دینے کے برابر ہوگا ۔ ڈرتے ڈرتے انھوں نے گلی کا پھاٹک کھولا اور ہر گھر سے ایک آدمی اور غالب کے دو خدمت گار ، جو بھی ہوسکا ے وغیرہ ساتھ لے کر قریب ترین کنویں تک پہنچے ۔ بدقسمتی سے اس کا پانی کھاری تھا ، لیکن چوں کہ میٹھے پانی کے کنویں بہت زیادہ دور تھے ں جو کچھ میسر تھا اسی سے اپنی پیاس بجھانی پڑی ۔

غالب کا گھر لوٹا نہیں گیا ۔ لیکن بدقسمتی سے انھیں اپنے نہایت بیش بہا مال و متاع سے ہاتھ دھونا پڑا ۔ جب بغاوت شروع ہوئی تو ی بیوی نے ، جو ایک دوراندیش خاتون تھیں ، اپنے جڑاؤ زیورات اور قیمتی اشیا اکٹھا کیں اور انھیں خفیہ طور پر ان کالے میاں صاحب کے گھر ت کے خیال سے بھیج دیا ، جو ظفر کے پیر طریقت اور محترم عام و خاص درویش تھے ، وہی جن کے ہاں ۱۸۴۷ء میں قید سے رہائی کے بعد ب ٹھیرے تھے ۔ امراؤ بیگم کی نظر میں اس کی توجیہ یہ تھی کہ شورش کے دنوں میں یہ اشیا ایک دین دار شخص کے گھر میں ، جسے بادشاہ کی پرستی بھی میسر تھی ، زیادہ محفوظ رہیں گی ۔ یہ قیمتی اشیا مناسب طریقے سے ایک تہ خانے میں امانت رکھ دی گئی تھیں اور دروازے پر مٹی پ کر ایسے بند کردیا گیا تھا کہ کسی کو اندازہ بھی نہ ہو کہ وہاں کچھ ہے ۔ تاہم جب انگریزوں کا شہر پر دوبارہ قبضہ ہوگیا تو کالے میاں صاحب کا گھر عام لوٹ مار کی زد میں آگیا ۔ بہ ظاہر اس کے بعد ہی غالب کو پتہ چلا کہ ان کی بیوی نے کیا کیا تھا ۔ اب کیا کیا جاسکتا تھا ۔ غالب نے اپنے دل کہہ کر سمجھا لیا کہ یہ چیزیں جانے والی ہی تھیں اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئیں ۔

اس سے کہیں زیادہ بڑا نقصان ان کے سارے کلیات نظم فارسی و اردو کا اس وقت تلف ہونا تھا جب قلعہ معلیٰ اور ان کے شاگرد و ہ دار نواب ضیاء الدین خاں کے کتب خانے تاراج کیے گئے ۔ غالب جو کچھ نظم و نثر میں لکھتے اس کا ایک نسخہ ضیاء الدین اپنے پاس رکھتے ۔ انھوں ، ایک قابلِ لحاظ رقم صرف کر کے اس سارے مجموعے کی جو نثر کے نو سو صفحات اور نظم کے ڈیڑھ تا دو ہزار صفحات پر مشتمل تھا سونے اور ی کے نقش و نگار والی خوش نما چرمی جلد بندی کروائی تھی ۔ مغل شاہ زادوں میں سے ایک نے (غالباً مرزا فخرو نے جو غالب کے شاگرد تھے) معلیٰ کے کتب خانے کے لیے ضیاء الدین احمد خاں کے اس مجموعے کی نقل تیار کروائی تھی ۔ غالب کی خاطر جمع تھی کہ ان کی ساری ادبی یقات مناسب انداز سے آئندہ نسلوں کے لیے یک جا فراہم ہیں ، کیوں کہ خود انھوں نے اپنی تحریروں کو باقاعدہ محفوظ رکھنے کی زحمت کبھی نہیں اکی تھی ۔ لیکن جب لوٹ مار شروع ہوئی تو دونوں کتب خانوں کو لوٹا کھسوٹا اور تاراج کیا گیا (جلدوں پر سونے چاندی کا کام لوٹ کا محرک رہا

ہوگا)۔ غالب بہت بے چین ہوئے ۔ وہ لکھتے ہیں : " کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے ، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا ۔ اس نے وہ کاغذ مجھے دکھایا ، یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا ۔ " (خط بہ نام حاتم علی مہر ، اوائل نومبر ١٨٥٨ء) ۔

ان کے فاتر العقل چھوٹے اور اکلوتے بھائی کی افسوس ناک حالت غالب کے لیے انتہائی تشویش اور ذہنی کرب کی ایک اور وجہ تھی ۔ مرزا یوسف اپنے گھر والوں کے ساتھ غالب کے گھر سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر رہتے تھے ۔ وہ خاموش اور اپنے خیالات میں مگن رہنے والے آدمی تھے ، تیس سال کی عمر میں دیوانے ہوگئے اور علاج معالجے سے انھیں کبھی کوئی فائدہ نہ ہوا ۔ انگریزوں کے حملے کے نتیجے میں دلی کے سقوط کے بعد مرزا یوسف کی بیوی ، بچے اور خادمائیں شہر چھوڑ کر بھاگ گئے اور بس دو معمر ملازم ان کی دیکھ بھال کے لیے رہ گئے ۔ غالب تک یہ اطلاع پہنچی لیکن اس وقت حالات ایسے تھے کہ غالب کا گھر سے نکلنا ممکن نہیں تھا ۔ بھائی کی حالت کا علم ہوتے ہوئے بھی اس سلسلے میں کچھ کرسکنے سے ان کی کلیتہً معذوری ان کے لیے مستقل سوہانِ روح تھی ۔

١٩ / اکتوبر ١٨٥٧ء کو غالب کو یہ خبر ملی کہ ان کے بھائی کا انتقال ہوگیا ۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا ادعا ہے کہ یوسف مرزا کو انگریز سپاہیوں نے گولی مار کر ہلاک کیا تھا اور اس امر واقعہ کو غالب نے دستنبو میں عمداً قلم انداز کیا ہے ۔ ایک اور بیان کے مطابق وہ بے ارادہ اس وقت مارے گئے جب باہر شور و غل کی طرف متوجہ ہوکر وہ گلی میں نکل آئے ۔ معین الدین حسن خاں نے ، جو بغاوت کے دوران مختصر سی مدت کے لیے دلی کے کوتوال تھے ، اپنے بیانیے میں لکھا ہے : " مرزا اسد اللہ خاں کے بھائی مرزا یوسف خاں جو ایک مدت سے فاتر العقل تھے ، بندوق چلنے کی آواز سن کر ، یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہورہا ہے بھٹکتے ہوئے باہر گلی میں آگئے اور مارے گئے ۔ " دستنبو میں غالب کا بیان یہ ہے کہ ان کے بھائی کا بیماری سے انتقال ہوا ۔ وہ پانچ دن شدید بخار میں مبتلا رہے اور ١٩ / اکتوبر ١٨٥٧ء کو آدھی رات کے کچھ دیر بعد انھوں نے دم توڑدیا ۔ اب ان کی تدفین کے انتظام کے تقریباً ناقابل حل مسائل سامنے آئے ۔ کوئی ایسی دکان کھلی نہیں تھی جہاں سے کفن کے لیے کپڑا خریدا جاسکے ۔ گورکنوں کا کہیں پتہ نہیں تھا ، میت کو قبرستان تک لے جانے کے لیے چار آدمی فراہم کرنا تک ممکن نہ تھا ۔ بالآخر بعض پڑوسیوں کو ترس آیا اور غالب کی مدد کو آئے ۔ پٹیالے کے ایک سپاہی کی حفاظت میں ان لوگوں نے یوسف مرزا کے گھر تک کی مسافت طے کی ، میت کو چند پرانی چادروں میں لپیٹا اور اسے مسجد میں جو مکان کے برابر تھی دفن کردیا ۔

○●○

(سلسلہ ص : ٢٥ سے)

گلم ، گلیم : دری ، قالین ۔ تاجک : گلیم ۔ جاک : جگہ ، نشست ، بستر ، بچھونا ۔ بچانو : بچھانا ۔ جاگ بچانو : بستر بچھانا ۔ چولو : چولھا ، جلانے کا کوئلہ رکھنے کا برتن ، آتش دان ۔ پنجابی ، لہندا : چلھا ، سندھی : چلو وغیرہ ۔ بیٹنو : بیٹھنا ۔ کش کینو : ہنکانا (چڑیوں کو) ۔ تاجک : کش : ہش (؟) ۔ کینو : کہنا ۔ زار : زہر ۔ سٹنو : ڈالنا ، ملانا ۔ کاسو : بڑا پیالہ ، طبق ۔ تاجک : کاسہ ۔ اَن : کھانا ، پلاؤ ۔ ہندستانی : ان ، لہندا ، پنجابی ، انّ ۔ گرد : مٹھی ۔ قدیم ہندستانی : گرہ یعنی لینا (؟) ۔ تزی / تازی : شکاری کتا ۔ تاجک ، ہندستانی : تازی ۔ ہیران : حیران ۔ پاں دو / پاندو : کپڑا ۔ سنسکرت : بھانڈا ۔ مس : مست ۔ کاڑنو / کڑنو : نکالنا ۔ ہیکاترنو : آگے ڈالنا ، ہانکنا ۔ (ہیک : سینہ ، چھاتی ۔ ترنو : دھرنا ، رکھنا ، ڈالنا ، آگے بڑھانا) ۔ پکا پٹا : ٹکڑے ٹکڑے (پٹنو : پھٹنا) ۔ ترٹنو / ترنو : گرنا ۔ پنجابی ترٹنا ، لہندا : تریڑنتر ۔ دوت / دُت : دودھ ۔ نپٹنو : لپٹانا ۔ پنجابی : نپڑنا ، لہندا : نپیٹرنتر ۔ تموم : تمام ۔ (قصہ) ختم ۔

○●○

یوسف علی [illegible]

ترجمہ: اسامہ فاروقی

حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان (وسط ایشیا) ماسکو ۱۹۷۰ء

حصاری پریا لوگوں کی زبان، ہند آریائی زبانوں کے وسطی زمرے کی ایک بولی

(قسط: ۹)

پریا لوک کہانیاں

پریا لوک کہانیاں پیش خدمت ہیں۔ امید ہے کہ پریا زبان کے جملوں کی ساخت کو اس زبان کی صرف و نحو کے بارے م
اب کے گذشتہ ابواب میں دی گئی معلومات کی روشنی میں قارئین بہ آسانی سمجھ لینے کے موقف میں ہوں گے۔ یہاں ہم قارئین
لت کے لیے ہر کہانی کے اردو ترجمے کے علاوہ آخر میں مشکل الفاظ کے معنی، ان کی اصل اور ہم رشتہ زبانوں میں ملتے جلتے الفاظ
ست بھی پیش کررہے ہیں۔ اس مواد کو بیشتر کتاب کے آخر میں فراہم کردہ مفصل لغات کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ حلِ لغات
بعض جگہ میں نے ڈاکٹر بھولاناتھ تیواری کی کتاب "تاج ازبکی" سے بھی استفادہ کیا ہے۔ — مترجم

I (Kam.)

(1) čʰo ni-čʰo, yek pāčā čʰo. (2) pāčā-ki do ran-i-ai čʰī. (3) ran-i-si-ko jatak ni-huva čʰī.

(4) ya pāčā šikār-ma jova čʰo. (5) vazir-ki ti, bāi-ki ti, pādvān-ki ti — tīni — yek jāg-a beṭé čʰe. (6) vazir-ki ti-na kiyo: pāčā ma-ta ran kará, me yek darsūxan sin'ke dāvaj, xalq-u-so berke ruṭi kʰaia bana, bi ziyati karāj. (7) bāi-ki ti-na kiyo ki: ma-ta kará, me yek rūmāl ain'ke dāvāj, lukūi(n) tamoša kʰri. (8) pādvān-ki ti-na kiyo: agar pāčā ma-ta kará, yek mundo, yek bitya janka dāvāj, ke dunya-ma na-ṭva.

(9) [illegible] pāčā-na kān-á rákeyo. (10) pāčā čalo go šikār-ma. (11) šikār-mātá murké ayó, vazir-ta dyakaliyó pādvān-ki ti-ṛamá. (12) pādvān-ta kiyo: ti-[illegible]-ta pāčā-ta [illegible] (13) pādvān-(n)a ti-pó-ta pāčā-ta [illegible], (14) pāčā-na [illegible] karké, [illegible] bāké, kār-a-[illegible] lāgiyo.

(15) [illegible] [illegible]-ma [illegible] vaxt [illegible], ya [illegible] [illegible] [illegible]. (16) [illegible]-ko jatak [illegible] rē giyo. (17) pāčā čalo giyo šikār-me. (18) [illegible] [illegible] diz [illegible], [illegible] jatak [illegible]. (19) pāčā-ke do ran-i-ai-na jaka, yek [illegible] [illegible]. (20) [illegible] ran-ko jatak-u-so hóyo, ran-ka tal-a do kuturu[illegible], [illegible]. (21) [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible], [illegible] [illegible] [illegible]. (22) [illegible] [illegible], jatak te giyo. (23) yek ow [illegible] [illegible]-ta [illegible] dia

(24) pačá-le xabar takyó: [illegible] kuturungo japiyá. (25) pačá-na kiyo: ran-ta juval-má [illegible] lamkóva.

(26) ye jaták yekdinánko hoyó, yekmahinko hoyá, [illegible] dosále, tinsále, panjsále hoyé.

(27) pačá koye-pá-ta pagi dene ayó. (28) ye jaták, [illegible] bi [illegible]-ri-ko kor(r)e-ta [illegible] ayé, koye-ta kiyo ki: pági pi [illegible] čálo giyo, pačá šikár-ma čálo giyo.

(30) pačá-ki [illegible]. (31) ta pačá-ke [illegible]-(n)a budi-ta [illegible] kaliyo ki: mai jatkun-ta [illegible] kari.

(32) budi gi jatkun-kulá, bitya-kulá betyo (beti), bitya-[illegible] gal karyo: tu ziq [illegible]? yek jág-a bulbul-i guyá čhe, us-ta paj-[illegible] leke ova, nai-tare gal karáj. (33) budi fer čali gi.

(34) mundo áváz bitya ziq-i, gal ni-kárta. (35) — a, peo, tu kajni gal ni-kárta, ziq-i? (36) — tu deát-a joválj, me iya ziq-u jovál; falán jág-á yek bulbul-i guyá čhe, agar us-ta lává, ó maré-nalá gal karáj.

(37) fadere-se mundo-na toša-topará-par-ta turre karyó. (38) mundo čálo g'yó, tin-čár din-u-ko ra máryó, jangal-ma giye, tiyaa kályó: yek tuvá lik°ryó.

(39) mundo g'yó, yek dev yek-[illegible]-ta partayi ak-pa:a kačé paké khovaj de. (40) ya mundo paš'ta giyo: as-salám-alejkum, áyai (41), dev murke dekhyo: agar salám na-detú, ta-ta me khova čho. (42) mundo-na kiyo ki: ebe bi khá-ná? (43) dev-na kiyo: ebe ni-khátú. (44) dev-na kiyo: [illegible]? (45) — [illegible] bulbul-i guyá-pačá aye čhú. (46) dev-na kiyo ki: us bulbul-i guyá-pačá ketoge anmi mar gé. (47) is mundo-na kiyo ke: aya, agar na-lá(m), n-óte.

(48) is dev-na, xat karké, mundo-ta díneo: falán toyaj-ma miri peo čhe; kágaz karké díneo: tu itjake del o tare kám-ta turre karáj. (49) is mundo-na kágaz-ta leke, čálo giyo.

(50) biákar-to ketupo din rah márgó, us toyaj rásiyo. (51) yek kálo dev betí. (52) ya giyo paš'ta, «as-salám-alejkum», — kiyo. (53) dev-na márke dekhyo: agar salám na-detú, me ta-ta khava čho. (54) mundo-na kiyo ke: ebe bi khá-na? (55) dev-na kiyo ki: me ta-ta ni-khátú, tu muro beta giyo.

(56) kágaz-ta dev-ta díneo. (57) dev-na paryó: oye, tu bulbul-i guyá-pačá aye; bulbul-i guyá [illegible] ketogé anmi ge-már gé. (58) fer is-ta mundo-na kiyo: [illegible] na-lová, n-óte.

(59) is mundo-ta leke, bage dev-kulá leg'yo ki: [illegible] bulbul-i guyá-ta yai dev leke dúvai. (60) is dev-na, mundo-ta leke, giyo.

(61) [illegible] gi, [illegible]-kulá [illegible] ge. (62) mundo-ta kiyo ki: me [illegible] čhú, me [illegible] dekin' čhi; tu [illegible], ta-ta na-degti, tu ja, [illegible]-ma vati bulbul-i guyá lámkai; leke [illegible]-tuni leke ajai [illegible] [illegible] samjhá.

(63) mundo giyo, devál-porta lángiyo, bulbul-i guyá-ta líuno. (64) mundo [illegible]. (65) paš'ta [illegible]. (66) mundo [illegible], [illegible]-kulá mundo ayá. (67) dev-na [illegible] kályo, leke [illegible]'yo, [illegible] pagiyo.

(68) dev-na jág-e-pere [illegible], us dev-ta díneo. (69) us dev-na, [illegible] ap-te jág-e ayá. ul(u)-ta mundo-ta leke, us dev-kulá [illegible].

(70) us dev-na kiyo ki: igi kuš gal ni hušerei kagen-ta kum-paré-mata berę na-ká(r)di, ke asmân-a dev-u pari šarin' čhi; agar dekhyó, leka čale jain' ši. (71) munde-na kum-pare-mata na-ka(r)dyo, leke čalo g'yo, pen-pari-kulá ras giyo, bulbul-i guyá-ta kádiyo. (72) bulbul-i guyá bitiya-nalá gal karâi, bitya vaxi-u-so xuš hogiyo.

(73) páčá fer kore-per-ta pegi dene ayó. (74) ya mundo g'yó. (75) munde-ta páčá-na kiyo: tu mere-pará mehmân huvái. (76) munde-na pen-per-ta kiyo: páčá kuwái ke more-pará mehmân húvai. (77) bitya-na «majli-si», — kiyo. (78) bulbul-i guyá-na bitya-ta kiyo: moré-ta yairi avqât ni-khovegi!

(79) bitya pal-pəré-nalá, bulbul-i guyá hát-a-se, páčá-labé ge (giyé). (80) páčá-na gilim jág bačáyo, ranun-se-na avqât pakáyo.

(81) bulbul-i guyá čule-pará bétyo. (82) bulbul-i guyá-ta kiš bi kiyo, na-giyo.

(83) páčá-ki ran-na is avqât-ma zâr sálye. (84) bulbul bitya-kulá giyo, bitya-ta kiyo ke: tu avqât-(t)a -na-khâi, avqât-ma zâr sátyo.

(85) avqât pa(k) giyo. (86) kâse-ma káike léke ayo. (87) munde-na na-khâyo. (88) páčá-na: kaini ne-khâtá? (89) — ham ne-khâta. (90) páčá-na kiyo ki: kaini ni-khâta? (91) — avval kuté-pəre-ta de, fer ham khóvai.

(92) páčá-na an-ki gis(d)-ta kuto-ta díneo. (93) tâzi-na khâyo, tâzi mér gi. (94) páčá hejrân-o hoyó. (95) xob. (96) dekhyo, ki haqiqatan zâr sâti; ranun-ta baláyo: tam koré luva čho ya pápdu? (97) ranun-(n)a kiyo ke: ham kore lúvai.

(98) sayis-per-ta baláyo: yek mas koro ka(r)di! (99) gále-matá yek kori láyo, ran-ta kori-ke dum-ma bándiyo, kore-ta kori-pačá yale karyá. (100) kore-na kori-ta ʰeké taryó. (101) iya mar, iya mari ri-ki goša-e-so bedan-e-se-matá pata-pata taryó giyo, ta-ta [illegible] bi an-ri.

(102) juval-ta stárke láyo, us ran-ta juval-máta ka(r)dyo. (103) ran-ki čiči-matá dut jaikun-ko mo-pərá udiyo. (104) ran-na jaikun-ta čiči-pari-ki biškar-ma nipiyó, ki ye jatak moré apré čhi.

(105) páčá-na xal(q)-ta xaber karyó, viyé díneo. (106) o mund-pore-ma ras giyo, me čaláyo. (107) tamâm.

(۱)

[illegible]

(۱)

تھا ، نہیں تھا ۔ ایک بادشاہ تھا ۔ بادشاہ کی دو بیویاں [illegible]

[illegible]

حسب ذیل - حیدرآباد۔

گا۔ ے کیک زقال ہو کے سن دانی انگوئیں تموشو کری ؛
پادوان کی تی تاکید اگر ہو تا کر ایک منتہ ایک ہیا جی کے
سن وانی کر دیتا

روٹی کھائے گی (اور دسترخوان کھانے میں) اضافہ ہی
گا۔ امیر کی بیٹی نے کہا : اگر مجھ سے بیاہ کرے گا میں
ریشمی رومال سی کے دوں گی (لوگ دیکھیں گے (تعجب
گے) ۔ گلہ بان کی بیٹی نے کہا : اگر پادشاہ مجھ سے
کرے ، ایک (ایسا) لڑکا اور لڑکی پیدا کرکے (جن کے)
گی کہ (ساری) دنیا میں نہ ہوں گے۔

۵

اس تا پاچا تا کانا پا گے یو۔ پاچا چلو گیو شکار تا
مڑ کے آیو ، وزیر تا دیا کھیو پادوان کی تی تما ۔ پادوان تا کیو ؛ تی
پرنا پاچا تا دے ؛ پادوان نا تی سے تا پاچا تا دنے یو۔ پاچا تا دیا کر
کے ، دکا بان کے ، گھرا اپنے لے گیو۔

اس بشکار ، کتنو وخت لگیو ۔ بادن گیاں ہو گیو۔
سات سی تن کو جنک پتا سے رے گیو۔ پاچا چلو گیو شکار سے۔
نو سی نا دنوں ہویو رن کو جنک ہویو۔

پاچا کے دو رن اس ناجا کے ، یک بڑی تالاں یو اسی رن
کو جکو سو ہویو رن سے تا دو کنوڑ گے تا نکایو ۔ ان جکھن بڑی
تانے کے گھر کے بی جا کے ، یک دشتا نکایو ۔ بڑی چل آیو ،
یک اور آئی ، جکھن تا چچی دینے لو۔

پاچا نے خبر کیو ، رن ترے تا کنوڑ گے جنڑیو۔ پاچا نا
کیو رن تا جال ماکل کے لم کھوا۔

ہے جاک یک دنوں کو ہویو ، یک ے نون کو ہویو ،
اسی نالا دو سالے ، تین سالے ، پنج سالے ہویے

پاچا کوڑے نے تا پانڑی دسترے آیو ۔ ہے جاک ،
انوں لکیری کو کوڑنے تا جڑ کے اسے کوشتے تا کیو کے ؛ پانڑی پی !
پاچا چلو گیو ، پاچا شکار تا چلو گیو۔

پاچا کی رن سام کی ۔ اس پاچا کے رتن نا جتی تا دیا کھیو
بچے تی جکھن جھکر کر !

پادشاہ کے کان تک (یہ بات) پہنچی ۔ پادشاہ
کو چلا گیا ۔ شکار سے واپس آیا ، وزیر کو گلہ بان کی بیٹی
واسطے بھیجا ۔ وزیر نے گلہ بان سے کہا : اپنی بیٹی پادشا
بیاہ دے ؛ گلہ بان نے اپنی بیٹی پادشاہ سے بیاہ دی ۔ پ
(گلہ بان کی بیٹی سے) بیاہ کرکے ، نکاح باندھ کے ، (ا۔
گھر لے گیا۔

اس بیچ کتنا وقت گزرا ، اس بیوی کو حمل ٹھہر
ستوانسا بچہ (اس کے) پیٹ میں تھا (تا جک ؛ اشکمش بہ ما
پادشاہ شکار کو چلا گیا ۔ نو مہینے اور نو دن ، بیوی کو بچے ہو۔
پادشاہ کی دو (بڑی) بیویاں جا کے ایک بوڑھی کو لائیں
بیوی کو بچے (پیدا) ہونے تھے ۔ (مگر اس نے) بیوی
پاس کتے کے دو پلے ڈال دیے ۔ ان بچوں کو بوڑھی نے
کر (کپڑے میں) لپیٹ کر ، لے جا کر ایک دشت میں پھینک
دیا ۔ بوڑھی چلی آئی ، بچے رہ گئے ۔ ایک ہرنی (آہو) آئی
بچے کو چونچ دی۔

پادشاہ کو خبر دی ، تیری بیوی نے کتے کے پلے
ہیں ۔ پادشاہ نے کہا ، بیوی کو تھیلے میں ڈال کر ٹانگ دیں
(اس اثنا میں) یہ بچے ایک دن کے ہوئے ، ا،
مہینے کے ہوئے ، اسی طرح (رفتہ رفتہ) دو سال ، تین سا
پانچ سال (کی عمر) کے ہو گئے۔

(ایک دن) بادشاہ اپنے گھوڑے کو پانی پلانے آیا۔ (ادھر) یہ بچے۔ یہ بچے لکڑی کے گھوڑے پر چڑھ کر آئے۔ گھوڑے سے کہا کہ، پانی پی! (پھر) بادشاہ چلا گیا، بادشاہ شکار پر چلا گیا۔

بادشاہ کی بیویاں سمجھ گئیں (پہچان گئیں بچوں کو)۔ بادشاہ کی ان بیویوں نے بڑھی کو بھیجا کہ ان بچوں کو گم کر! (نیست و نابود کر!)

○

بڑھی گی جتکن کلاُ، بھٹا کلاُ بیٹیو (بہن)، بٹیا نلا گل کریو، تو ذق نوتے؟ یک جا گا بلبلِ گویا چھے، اُس تا پائی ترُّو لے کے اودا، نال ترے گل کرائی۔ بڑھی فیر چلی گی۔

منڈو اَ وائی، بٹیا ذق ای، گل نی کارتا ۰۰۳، پیستر، تو کئی نی گل نی کرتا، ذق ای؟"

"تو وشا جو وائی، سے ایں یا ذق او جووائی۔ فلاں جاگا یک بلبلِ گویا چھے، اگر اس تالاوا، او مرے نلا گل کرائی۔

فدیرا سے منڈے نا توشہ تو بیرا پیرتا ٹھرے کریو۔ منڈو چالو گیو۔ تن چار دنو کورا مریو، جنگل ماگیو، تیاں کالیو: یک توں وا لکیریو۔

منڈو گنیو، یک دیو یک فیل تا پڑتی آک پیرا کچو پکے کھووئی دے۔ یا منڈو پہنتا گیو: السلام علیکم، آیا! دیو مڑ کے دیکھیو، اگر سلام نہ دیتوں، تا تاسے کھووا چھو۔ منڈے نا کیو کہ: ایسے پی کھانا؟ دیو نا کیو: ایسے نی کھاتوں۔ دیو نا کیو: کِتن سے ایے؟ "سے بلبلِ گویا پچھا ایے چھوں۔" دیو نا کیو کہ: اس بلبلِ گویا پچھا کتنتر سنہ امنی مرگے۔" اس منڈے نا کیو کہ: ایا، اگر نہ لام، نوتے۔

○

بڑھی بچوں لے ہاں گئی۔ لڑکی کے پاس بیٹھی، لڑکی سے باتیں کی، تو دق نہیں ہوتی؟ (تو اُداس نہیں؟) ایک جگہ بلبلِ گویا ہے۔ اس کو تیرا بھائی لے کے آئے، تیرے ساتھ باتیں کرے گی۔ بڑھی پھر چلی گئی۔

لڑکا آتا ہے، مگر لڑکی اداس (بیٹھی) ہے، بات نہیں کرتی۔ اے بہن، تو بات کیوں نہیں کرتی، اداس ہے؟ "تو دشت کو جاتا ہے، میں یہاں دق ہوجاتی ہوں۔ فلاں جگہ ایک بلبل گویا ہے اگر تو اس کو لائے تو وہ میرے ساتھ باتیں کرے۔"

اگلے دن لڑکے نے اپنا توشہ اکٹھا کیا / ٹھیک کیا۔ لڑکا چلا، تین چار دن کی راہ طے کی، ایک جنگل میں پہنچا، غور سے دیکھا (دھیان ڈالا)۔ دھواں نکل رہا ہے۔

لڑکا (آگے) گیا، (دیکھتا ہے): ایک دیو ایک ہاتھی کو آگ پر بھون کے کچا پکا (گوشت) کھا رہا ہے۔ یہ لڑکا پیچھے سے گیا؟ (کہا): السلام علیکم، بابی! دیو نے مڑ کر دیکھا۔ اگر تو سلام نہ کرتا (تو) میں تجھے کھا جاتا۔ لڑکے نے کہا "اب بھی کھاتا!" دیو نے کہا، اب نہ کھاؤں گا۔ دیو نے پوچھا کس لیے آئے ہو؟ "میں بلبل گویا کے پیچھے آیا ہوں۔" دیو نے کہا، اس بلبلِ گویا کے پیچھے کتنے آدمی مرگئے۔ لڑکے نے کہا، بابی، اگر نہ لاؤں (تو کام) نہ ہوگا۔

اس دیو نا خط کر کے منڈے نا دِتے اوہ: فلاں فلانی ا
جنگل وچ میری بھین ہے۔ کاغذ کر کے دِتے یو، تو ای جا کے دسے ۔ او تسے
کام پورا کرائی۔ اس منڈے نا کاغذ تالے کے چالو گیو۔
پتہ نہ کتنا دن راہ مرگو، اس تو ٹھائی راجیو۔ یک کالو
دیو بیٹھو تو آگیو تا۔ "السلام علیکم" کیو۔ دیو نا مڑ کے دیکھیو، اگر
سلام نہ کرتو تے تا کھاوا چھو۔ منڈے نا کیو کہ اب بی کھا تا؟
دیو نا کیو کہ اب تا نی کھاتو، تو مرو بیٹا گیو۔
کاغذ تا دیو نا دِتے او۔ دیو نا پڑھیو، او ھو! تو بلبلِ گویا پچھا
آئے۔ بلبلِ گویا خطرناک جگائی؛ کتنڑے آدمی گے، مار گئے۔ فیر اس تا
منڈے نا کیو، تاں نہ لوا، نہ تے۔
اس منڈے تالے کے باگے دیو کالا لے گیو کہ، اس
بلبلِ گویا آنے دیو لے کے دو دی۔ اس دیو نا منڈے تالے
کے گیو۔
رات ہو گئی، باغ کولا پاڑ گے۔ منڈے تا کیو کہ، مے بوڈو
چھوں، مے جیں آو، دیکھن چھی۔ تو نکو، تانا نے ویکھیں۔ تو جا،
باغ ماوڑ، بلبلِ گویا لاو کے ای، سنے کے مرے تئیں لے کے آجا!
اگے تے ٹپ سکاں ای۔
منڈو گیو، دیوال پرتا آگیو، بلبلِ گویا تالنے او۔ منڈو
پاگیو۔ چھا شور کن ہو یو۔ منڈو پاگیو، دیو کولا منڈو آیو۔ دیو نا کچھا
پرے کالیو، سنے کے پاگیو، کچھا کول کے پاگیو۔

(جب) اس دیو نے خط لکھ کے لڑکے کو دیا: فلاں
جنگل میں میری بہن ہے۔ کاغذ (خط) لکھ کر دیا۔ "تو لے جاکر
(اسے میری بہن کو) دے۔ وہ تیرا کام پورا کر دے گی۔ اس
لڑکے نے کاغذ لیا اور چلا گیا۔

اس بیچ (اس لڑکے نے) کتنے دن کی راہ طے کی۔
اس جنگل تک پہنچا۔ ایک کالا دیو بیٹھا ہے۔ یہ لڑکا پیچھے سے
گیا۔ "السلام علیکم" کہا۔ دیو نے مڑ کے دیکھا: "اگر سلام نہ کرتا
(تو) میں تجھے کھا جاتا۔" لڑکے نے کہا: "اب بھی کھانا۔" دیو
نے کہا کہ "اب میں تجھے نہ کھاؤں گا۔ تو میرا بیٹا ہو گیا۔"

(لڑکے نے) کاغذ دیو کو دیا۔ دیو نے پڑھا: اخاہ، تو
بلبلِ گویا کے پیچھے آیا ہے۔ بلبلِ گویا ایک خراب (ناکارہ
خطرناک) جگہ ہے۔ کتنے آدمی گئے (اور) مر گئے۔" جب اس
لڑکے نے کہا، جب تک (اسے) نہ لاؤں (کام) نہ ہو گا۔"
(دیو) اس لڑکے کو لے کر (اسے) سفید دیو کے پاس لے گیا
کہ اس بلبلِ گویا کو یہ دیو حاصل کر کے دے گا۔ یہ دیو لڑکے کو
لے کر روانہ ہوا۔

رات ہو گئی۔ (وہ) ایک باغ کے پاس لیٹ گئے۔
(دیو نے) لڑکے سے کہا: "میں بڑا ہوں۔ (اگر) میں جاؤں (تو
مجھے) دیکھ لیں گے۔ تو چھوٹا ہے۔ تجھے نہیں دیکھیں گے۔ تو جا،
باغ میں داخل ہو۔ (وہاں) بلبلِ گویا لٹک رہی ہے۔ (اسے)
لے کے میرے پاس لے کر آ جا۔ آگے (وہاں) میں جھپ کر
لوں گا۔

لڑکا گیا، دیوار پھلانگی، بلبلِ گویا کو لیا۔ لڑکا بھاگا۔
پیچھے چیخ پکار ہوئی۔ لڑکا بھاگا، لڑکا دیو کے پاس آیا۔ دیو نے
(بلبل کو) بغل میں لیا (اور) لے کے بھاگا، بغل میں لے
کے بھاگا۔

ο

دیوجا جاگا پہسے اایو ۰ اُسس دیوتا دسلے او ۔ اُس دیوتا ۰ لے کے ۰ اپسے جاگا آیو ۔ اُوئیں تا مُشے تا لے کے ۰ اسس دیو کالے گیو ۔

اس دیوتا کیو کہ ، اِگی کُش مُں نی ۔ ہُشارو ، کیہں تا مُم پسے ماتا بارا نہ کاڑ ۰ کہ آسمانا دیو و پری قرن چھی ۰ اگر وکھیو ۰ لے کے چلے جاءن شی ۔ مُشے تا مُم پسے ماتا نہ کاڑیو ۰ لے کے چلوگیو ۰ ویشر پیری کلاُرس گیو ۰ بلبلِ گویا تا کاڑیو ۔ بلبلِ گویا بٹیا نلاکل کرائی ، بٹیا وختو سو خوش ہوگیو ۔

پاچا فرکوڑے پرتا پانٹری دیتڑے آیو ۔ یا مُشُد گیو ۔ مُشے تا پاچا نا کیو ، تو مرے پرا مہمان ہوائی ۔ مُشے نا ویشتر پرتا کیو ، پاچا کووائی کہ میرے پرا مہمان ہوائی ۔ بٹیا نا " میلی سی " کیو ۔ بلبلِ گویا نا بٹیا تا کیو ، مرے تا غیری اوقات نی کھوائی

بٹیا پائی پرے نلا ۰ بلبلِ گویا پاتا سے ۰ پاچا لبا گے (گیے) ۔ پاچانا گلم جاگ بچایو ۰ رَنی سے نا اوقات پکایو ۔

بلبلِ گویا چوسلے پرا بیٹیو ۔ بلبلِ گویا تا کش بی کیو ۰ نہ گیو ۔

ο

دیو (بلبلِ کو مد بجڑے کے) اپنی (معمول کی) جگہ پر ڈالیا ۰ اس دیو کو دیا ۔ وہ دیو (اب) لے کے اپنی جگہ آیا ۰ وہاں سے لڑکے کو لے کر اس دیو (یعنی کالے دیو) کے پاس لے گیا ۔

اس دیو نے کہا کہ ، یہاں کوئی بات / کوئی خطرہ / نہیں ۰ (مگر) ہوشیار رہو ، قفس کو بغل کے باہر نہ نکالو کیوں کہ آسمان میں دیو ۰ پری گشت کرتے رہتے ہیں ۰ اگر دیکھ لیں گے (تو بلبلِ کو) لے کے چلے جائیں گے ۔ لڑکے نے (قفس کو) بغل سے نہیں نکالا ۰ (قفس کو) لے کے چلا گیا ۰ بہن کے پاس پہنچا ۰ بلبلِ گویا کو نکالا ۔ بلبل گویا لڑکی سے باتیں کرتی ہے ۰ لڑکی کی کیفیت مزاج بہتر ہو گئی ۔

بادشاہ پھر اپنے گھوڑے کو پانی پلانے آیا ۔ یہ لڑکا (بھی) گیا ۔ بادشاہ نے لڑکے سے کہا : " تو میرا مہمان ہو ۔ " لڑکے نے اپنی بہن سے کہا : " بادشاہ کہتا ہے کہ میرے پاس مہمان ہو ۔ " لڑکی نے کہا " اچھا " بلبلِ گویا نے لڑکی سے کہا : " میرے بغیر کھانا نہ کھانا ! "

لڑکی اور اس کا بھائی ۰ ہاتھ پر بلبل گویا کے ساتھ ۰ بادشاہ کے پاس گئے ۔ بادشاہ نے قالین بچھایا ۰ اس کی بیویں نے کھانا پکایا ۔

بلبل گویا چولے کے پاس بیٹھ گئی ۔ بلبلِ گویا کو بہت ہٹایا ۰ مگر وہ (چولہے کے پاس سے) نہ ہٹی ۔

ο

پاچا کی رنی نا اس اوقات نا زار تشیو ۔ بلبل بٹیا کاگیو ۰ بٹیا تا کیو کہ ، تو اوقات تا نہ کا ، اوقات مازار ساتھیو ۔

اوقات پک گیو ۔ کاسے نا کُل کے سے کے آیو ۔

مُشے تا نہ کایو ۔ پاچا نا ، کیئی نی کاتا ؟ " مَم نے کانا " ۔ پاچا نا کیو کہ ، کیئی نی کاتا ؟ وائی کے مرے تاتے ، زم کھن نی "

ο

(اُدھر) بادشاہ کی بیوی نے اس کھانے میں زہر ڈال دیا ۔ بلبلِ لڑکی کے پاس گئی ، لڑکی سے کہا کہ ، " تو (یہ) کھانا نہ کھا ، کھانے میں زہر پڑا ہے ۔

(کھانا پک گیا) کھانے میں / طبق میں / ڈال کے لے آئے ۔ لڑکے نے نہ کھایا ۔ بادشاہ نے (پوچھا) : " کیوں

پاپاہان کی کردہ تا کھوتا دِتے یو۔ تازی نا کھایو۔ تازی مرگی۔ پاپا حیران ہویو۔ خوب۔ دیکھیو کہ حقیقتاً زار ساٹی۔ رانٔی نا بلایو۔ تم کوڑے لٔی تا چھوپاٹڑدے ؟ رانٔی نا کیو کہ ہم کوڑے لل دئی۔

سائیس پسے تا بلایو : ایک مَس کوڑو کاڑ ! گالے ستا ایک کوڑی لایو۔ رن تا کوڑی کے دُم ما باندیو۔ کوڑے تا کوڑی پاپا کرایو۔ کوڑے تا کوڑی تا ہکا ٹڑیو۔ اِیں یا مار اوں یا مار : اس کی گوشت سو ہرنے سے ستا پٹا پٹا ٹڑیو گیو۔ تاتا ہڈی سی بی ناری۔

تھیلاں تا اُٹھر کے لایو۔ اس رن تا تھیلاں ما تا کاڑیو۔ رن کی چھچی ستا دوت جٹکُن کو موپا اُڑیو۔ رن نا جٹکُن تا چھچی پری کی لگیا دیتیو۔ کہ یے جٹک مرے اُپرے چھی۔

پاپا نا خلق تا خبر کریو۔ دیا دِتے یو۔ او مراد پسے مارس گیو سے چالایو۔ تموم۔

○●○

نہیں کھاتا ؟ / کھاتے ؟ " (لڑکا) " ہم نہ کھائیں گے۔ " پادشاہ نے پوچھا کہ " کیوں نہیں کھاؤ گے ؟ " (لڑکا) " پہلے اپنے کتے کو دے، پھر ہم کھائیں گے۔

پادشاہ نے مٹھی بھر پلاؤ کتے کو دیا۔ شکاری کتے / تازی کتے / نے (اسے) کھایا اور مرگیا۔ پادشاہ حیران ہوا۔ خوب۔ دیکھا / سمجھ گیا / کہ حقیقتاً / واقعی / زہر ڈالا ہے۔ بیویوں کو بلایا : " تم گھوڑے لیتی ہو یا کپڑے ؟ بیویوں نے کہا : " ہم گھوڑے لیں گی۔ "

(پادشاہ نے اپنے) سائیس کو بلایا : " ایک مست گھوڑا نکال ! " گلے میں سے ایک گھوڑی لے آئے۔ (پادشاہ) کی بیوی کو گھوڑی کی دم سے باندھا۔ (مست) گھوڑے کو گھوڑی کے پیچھے چھوڑ دیا۔ گھوڑے نے گھوڑی کا پیچھا کیا۔ اس کے (یعنی بادشاہ کی بیوی کے) بدن سے گوشت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرا۔ حتیٰ کہ ہڈیاں بھی نہ رہیں۔

تھیلا اتار کے لائے۔ اس بیوی کو (یعنی جس پر بہتان باندھا گیا تھا اس بیوی کو تھیلے سے) نکالا۔ (اس) عورت کی چھاتی سے دودھ (کی چھینٹیں) اُڑ کر (اس کے) بچوں کے منہ میں گریں۔ عورت نے بچوں کو اپنی چھاتی سے لگایا کہ یہ بچے میرے اپنے ہیں۔

پادشاہ نے خلق کو / لوگوں کو / خبر کی، دعوت دی۔ اس کی مراد بر آئی / وہ اپنی مراد کو پہنچا / میں چلا آیا۔ تمام۔

○●○

حلِ لغات :

چھوٹی چھو : تھا، نہیں تھا۔ بے پوری : چھو (اسی مفہوم میں) ، نیز گجراتی وغیرہ۔ پاچا : بادشاہ۔ تاجک : پادشاہ۔ کابلی پاچا۔ ہندستانی : بادشاہزن : بیوی۔ پنجابی : رنّ۔ لہندا : رنّ، رن۔ جتاک، جتک : بچہ، بچے، لڑکا، لڑکے۔ ہریانوی : جتک۔ تی : بیٹی۔ ہندستانی، پنجابی، لہندا، سندھی، راجستھانی، گجراتی : دِجی۔ بائے : امیر۔ تاجک : بایے۔ پادوان : چرواہا۔ تاجک : پادبان۔ درسے خان : درس خان : دسترخوان (تاجک، ہندستانی)۔ بن کے : تی کے۔ ہندستانی : سینا، لہندا : سین۔ خلق : لوگ۔ ہندستانی، تاجک : خلق۔ بیٹھ کے، بیٹ کے : بیٹھ کر۔ ہندستانی : بیٹھنا۔ پنجابی : بیٹھنا۔ لہندا : بے ہتر۔ رٹی : روٹی (ہندستانی، پنجابی، لہندا، گجراتی)۔ زیاتی کرانی : اضافہ کرنے کا۔ ہندستانی : زیادتی، زیادت۔ تاجک : زیادتی۔ تاجک علاقائی بولی : زیاتی، زیاتی کردن۔ رُشال : رومال (تاجک، ہندستانی)

[illegible] بعد [illegible] پانی۔ تھو تھو [illegible] (تعجب سے بولی)۔ تاجک [illegible]

تکو تھیں؛ اُف۔ قدیم ہندستانی؛ اوئی۔ پنجابی؛ تھو تھو کرنی؛ تماشہ کرنی؛ دیکھیں گے (تعجب سے بولی)۔ تاجک؛ تھو تھو (تماشہ)۔ ہندستانی؛
تماشہ۔ [illegible] ہندستانی [illegible] (تھوڑا ہوا)۔ پنجابی [illegible] (دیا لگا)، دیکھو، بھیجنا۔ تھا؛ واسطے۔ تجھے؛
پانی۔ قدیم ہندستانی [illegible] وقت [illegible] ہندستانی [illegible]۔ قدیم ہندستانی [illegible]
مکان۔ [illegible] کی رسم [illegible]۔ کر؛ گھر۔ پنجابی، سندھی، گجراتی، نیپالی؛ گھر۔ پنجابی (بول چال کی زبان)؛ [illegible]
بنگالی [illegible]۔ بھوجپوری [illegible] کا حصہ۔ وقت یا وقت۔ سنگھو؛ گزرنا، لانگھنا۔ پنجابی؛ لانگھنا، سندھی؛ لنگھنڑ۔ ملتانی؛
لنگھنڑ۔ [illegible] پنجابی [illegible] سندھی؛ گھمبیر۔ قدیم ہندستانی؛ گھمبیری۔ [illegible] سندھی [illegible] ملتانی۔ پوست، پون، کھال
پوست، چمڑا [illegible] مادر۔ ہندی [illegible]۔ تل؛ تل نیچے کا حصہ، تلا، تلے، نیچے۔ پنجابی [illegible]
کا پلا۔ پنجابی؛ [illegible] سندھی [illegible]۔ ہندستانی [illegible]۔ [illegible] لپٹی ہوئی چیز۔ [illegible]
[illegible] کرنا [illegible]۔ [illegible] ازبک [illegible] فارسی [illegible] پنجابی [illegible]
[illegible]۔ تاجک؛ ہندستانی [illegible]۔ ہندستانی [illegible] پنجابی [illegible]
[illegible]۔ ہندستانی، پنجابی، سندھی، نیپالی [illegible]۔ گجراتی [illegible]۔ قدیم ہندستانی [illegible]۔ [illegible] پائی۔ سندھی؛
پنجابی، سندھی؛ [illegible]۔ پنجابی [illegible] سندھی [illegible] (جمع)۔ [illegible] پنجابی؛
[illegible]۔ گم کرنا۔ غائب کرنا، گم کرنا، نیست و نابود کرنا۔ تاجک، ہندستانی [illegible] پریشان [illegible]۔ تاجک [illegible]
دق ہونا، [illegible]۔ پائی، بھائی۔ پنجابی؛ بھائی، [illegible] سندھی [illegible] پنجابی، سندھی [illegible]
سویرے۔ تاجک [illegible] (۹۲)۔ توشہ [illegible] سامان سفر۔ تاجک؛ توشہ۔ سنسکرت [illegible] (۹)۔ [illegible]
درست، تیار۔ تاجک، ازبک [illegible]۔ [illegible] ٹھیک کرنا، تیار کرنا۔ راہ [illegible] راہ طے کرنا، سفر کرنا، چلنا [illegible]
[illegible] دھیان دینا، غور کرنا [illegible]۔ ہندستانی [illegible]۔ پنجابی، سندھی [illegible]۔ قدیم ہندستانی [illegible]
[illegible]۔ تاجک، ازبک [illegible]۔ تاجک [illegible] ہندستانی [illegible] پیچھے پیچھے [illegible]
[illegible] گجراتی [illegible] وغیرہ۔ [illegible] پنجابی [illegible] سندھی [illegible]۔ [illegible]
آدمی۔ ہندستانی [illegible] آدمی [illegible]۔ ازبک [illegible]۔ ہندستانی [illegible]۔ پنجابی؛
[illegible] سندھی [illegible]۔ تاجک [illegible] (۹۴)۔ [illegible] ناکارہ [illegible] ہندستانی
تاجک؛ ناکارہ [illegible] سفید۔ پنجابی، سندھی [illegible]۔ ہریانوی [illegible] سفید [illegible]۔ پنجابی [illegible]۔ پنجابی، سندھی
[illegible] بلوچی [illegible]۔ پنجابی [illegible] سندھی [illegible]۔ ہندستانی [illegible]
پنجابی [illegible]۔ [illegible] بول چال کی [illegible] دیوان [illegible]
بھاگنا [illegible]۔ تاجک [illegible] کے [illegible] چیزیں [illegible] ہیں۔ ازبک [illegible]
اس طرف [illegible] ہندستانی [illegible] سندھی [illegible] ہندستانی [illegible]
آسان [illegible]۔ [illegible] ہندستانی [illegible] ہندستانی [illegible]۔ تاجک [illegible]
[illegible] ہندستانی۔ تاجک [illegible]۔ تاجک [illegible] طرف [illegible]

نعیم ہاشم

شاعرِ کردو عمل ـــ مخدوم محی الدین

مخدوم ہندستان میں اردو زبان کے ایک ایسے تنہا شاعر تھے جو اپنے نصب العین کی خاطر میدانِ کارزار میں بھی رہے۔ مخدوم کو جتنی ہر دل عزیزی، عقیدت اور محبت حاصل تھی وہ بھی کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ مخدوم اور فیض ہی وہ شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری اور شخصیت سے نسلوں کو متاثر کیا اور طوفانوں کے مدِ مقابل رہے۔ مخدوم کی اکثر نظموں کے ترجمے نہ صرف ہندی، تلگو، مراٹھی اور بنگالی میں بلکہ انگریزی، روسی اور چیک زبانوں میں شائع ہوچکے ہیں۔

مخدوم جنھوں نے مارکسی فلسفہ حیات سے روشنی حاصل کی تھی اپنے دور کی بنتی اور ٹوٹتی قدروں کا اس طرح تجزیہ کرتے ؛

یہی محشر ہے دو عالم کا تصادم ہے یہی
ایک پرانا عالم
ایک نیا
ایک مرتی ہوئی بڑھیا کا لنگڑاتا ہوا پاؤں
ایک ڈھلتی ہوئی چھاؤں

اور پھر انھوں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں ؟
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں ؟
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر ؟

اور اپنے فردوسِ وطن کو جہنم سے بچانے کے لیے مخدوم نے پہلے تو قلم کا انتخاب کیا اور پھر بڑھ کر تلوار بھی اٹھالی۔

ہندستان میں وہ انگریزی سامراج کے تسلط کا دور تھا اور سابق ریاست حیدرآباد میں شخصی حکومت کا ایسے میں مخدوم ایک کی مانند لپکا اس نے اعلان کیا۔

رات کے ہاتھ میں اک کاسہ، دریوزہ گری
....
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

اور پھر مخدوم نے اپنے نظموں کو زندگی کی کشاکش کے ساتھ ہم آہنگ کردیا۔

صبحِ دم جب مرے دروازے سے گزری ہے صبا
اپنے چہرے پہ ملے خونِ سحر گزری ہے
جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشانِ قاتل
روز ہو جشنِ شہیدانِ وفا ، چپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو

مخدوم کا خاندانی نام ابوسعید محمد مخدوم محی الدین تھا۔ وہ سابق ریاست حیدرآباد کے ضلع میدک تعلقہ اندول میں پیدا ہوئے۔ تاریخِ پیدائش ۱۹۱۰ء ہے۔ ان کا خاندان بڑا مذہب پرست تھا۔ وہ ابھی چار سال ہی کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ پرورش چچا کی سرپرستی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم قرآن، گلستان اور بوستان کے درس سے ہوئی اور جامعہ عثمانیہ سے انھوں نے ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۳۹ء میں وہ سٹی کالج حیدرآباد میں لکچرار ہوئے اور ۱۹۴۱ء میں اپنے نصب العین کی خاطر مستعفی ہوگئے۔ سبطِ حسن، اختر رائے پوری اور بےسوریا نائیڈو کے ساتھ مل کر حیدرآباد میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی بنیاد رکھی جس کے جلسے سروجنی نائیڈو کے بنگلے پر ہوا کرتے تھے۔

ایک روز مخدوم کو ۲۴ گھنٹوں کے فاقے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنے کسی دوست سے نہیں کیا۔ اپنے ایک رشتے کے چچا کے گھر گئے مگر وہاں بھی وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ اسی گھر کی ایک لڑکی نے مخدوم کے تھکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بہ دیدۂ نم کھانے پر اصرار کیا۔ اس روز اپنے ہاتھ سے روٹی پکا کر کھلانے والی وہی لڑکی بعد کو مخدوم کی شریک حیات بن گئی۔

اب کہاں جاکے یہ سمجھائیں کہ کیا ہوتا ہے
ایک آنسو جو سرِ چشمِ وفا ہوتا ہے

مخدوم کی ایک لڑکی ذکیہ اور دو لڑکے نصرت اور ظفر ہیں ایک بچے آصف کا انتقال بہت چھوٹی عمر میں ہوا۔ اس کی موت پر مخدوم نے نظم "پرسہ" کہی۔ "بچے کے انتقال پر ماں کے حضور میں":

نہ رو ہم نفس یہ جہاں اور ہی ہے
یہاں کی رہِ امتحاں اور ہی ہے
مرادوں کو برلانے والی دعائیں
نہ تیری دعائیں نہ میری دعائیں
نہ وہ اور نہ میں اور نہ تو جاودانی
ازل کے مصور کا ہر نقش فانی

ان کی ایک لڑکی رفیعہ کا انتقال تین سال کی عمر میں ہوا۔ ان کے ذکر سے ان کی آنکھیں نم ناک ہو جاتی تھیں۔

بات کیا تھی ذکر کس کا تھا کہ ہنگام تھا
مسکرانے والی آنکھیں بھیگیں چھلکے لگیں

[illegible]

[illegible] تصور ملتا ہے۔

دلوں میں ازدحامِ آرزو، لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی، دم الفت کا بھرتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

مخدوم کا پہلا مجموعہ کلام "سرخ سویرا" ہے۔ یہاں ایک ایسے شاعر سے ہماری پہلی ملاقات ہوتی ہے جسے حسن سے بھی لگاؤ ہے جسے زندگی اور انقلاب بھی عزیز ہیں۔ وہ کبھی اپنے محبوب کا اس طرح انتظار کرتا ہے

میرے محبوب، میری نیند اڑانے والے
میرے مسجود، مری روح پہ چھانے والے
آ بھی جا تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا تاکہ ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

اور کبھی "انقلاب" کی تمنا کو اس طرح کرتا ہے

اے جانِ نغمہ! جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہ گزار کب سے ہے
بہارِ حیات یہ کاکل کی برہمی ہی نہیں
نگارِ دہر میں انداز برہمی ہی نہیں
مسیح و خضر کی کہنے کو کچھ کمی ہی نہیں

وہی شاعر جو اپنے محبوب کا اور انقلاب کا اتنے پیار اور اتنی دل آویزی کے ساتھ انتظار کرتا ہے۔ کبھی اس طرح گرجتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

نالہ ہے اثر اللہ کے بندوں کے لیے
صلہ دار و رسن حق کے رسولوں کے لیے
قصرِ شداد کے در بند ہیں بھوکوں کے لیے
پھونک دو قصر کو گر "کن" کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

غالباً ایسے ہی رومانی انقلاب انگیز نعروں کے باعث اس وقت کی شخصی حکومت نے ان کے شعری مجموعے "سرخ سویرا" پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اس پابندی نے الٹا اثر کیا۔ اس کتاب کا ہر شعر سینہ بہ سینہ گھر گھر پہنچ گیا اور ہر شخص کی زبان پر تھا۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اور

حریت، آزادی، مساوات، زندگی پائندہ باد
سرخ پرچم اور اونچا ہو، بغاوت زندہ باد

اور اسی آزادی اور بغاوت کی خاطر مخدوم اس کاروان میں شریک ہوگئے جو جدوجہد کے مقصد سے تلنگانہ کے جنگلات میں رواں تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا۔ اس کے چند سال بعد مخدوم روپوشی سے باہر آئے تو قومی حکومت نے انھیں گرفتار کرلیا۔ اس گرفتاری کے زمانے میں انھوں نے ایک اہم نظم "قید" لکھی۔

قید پھر قید کی میعاد نہیں
جور ہے، جور کی فریاد نہیں، داد نہیں
رات ہے رات کی خاموشی ہے، تنہائی ہے
دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے
چونک جاتا ہے دماغ
جھلملا جاتی ہے انفاس کی لو
زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے
شاہراہوں میں، گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
ان کی آنکھوں میں غم دوش و اندیشۂ فردا کا خیال
سال ہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی امنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
مجھ کو غم ہے کہ مرا گنج گراں مایۂ عمر
نذر زنداں ہوا
نذر آزادیِ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا

اور آزادیِ زندانِ وطن کی خاطر مخدوم تمام عمر برسر پیکار رہے۔ پہلے عام انتخابات سے قبل انھیں رہا کردیا گیا۔ وہ قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اس کے بعد سے ان کی جدوجہد کے مراکز تلنگانہ کے جنگلوں سے اسمبلی اور کونسل کے ایوانوں میں منتقل ہوگئے اور پھر ان کی شاعری نے بھی ایک نیا موڑ اختیار کیا جس کا اظہار ان کے دوسرے مجموعہ کلام "گل تر" میں ہوتا ہے۔

"سرخ سویرا" کی شاعری میں ایک پختہ عقیدے کا اظہار ملتا ہے۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب کی کامیابی نے ساری دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کو شدید متاثر کر رکھا تھا۔ مارکسی فلسفہ کو عقیدے کی حد تک قبول کرلیا گیا تھا۔ نہ صرف ہندوستان کے بلکہ ساری دنیا کے دانشور، ادیب اور شاعر یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کمیونزم ہی ہر قسم کے استحصال، جبر اور اجتماعی و انفرادی مسائل کا واحد مداوا ہے۔ [illegible] نظام کی استحصالی طاقتوں کے خلاف [illegible] بھی آزادی کی اس جدوجہد کی پشت پناہی کرتا رہا۔ ہندوستان میں انگریزی تسلط کے خلاف جدوجہد میں کمیونسٹ پارٹی بھی شریک تھی اور

کیوں کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں اشتراکی نظام ہی غربت، افلاس اور استحصال کا خاتمہ کرسکتا ہے۔ مخدوم کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی آخر تک غیر متزلزل رہی۔ انھوں نے اپنی شاعری کو اپنے نصب العین اور اپنی حقیقی زندگی سے ممکنہ حد تک ہم آہنگ رکھا۔ اگر فن کار کی پہلی وابستگی فن اور زندگی سے ہے تو پھر کوئی عقیدہ اس کے فنی سفر میں رکاوٹ نہیں بنتا بلکہ اس کے فن کو جِلا بخشتا ہے۔ ہر باشعور اور سچا ادیب انسان دوست ہوتا ہے اور زندگی، سماج اور سیاست کے بارے میں اس کی کوئی نہ کوئی آئیڈیالوجی ضرور ہوتی ہے اگر وہ صحت مند اور مثبت قدروں پر مشتمل ہے تو قوتِ اظہار کا باعث ہوتی ہے۔ مخدوم کے یہاں زندگی کا گہرا شعور ہے۔ تاریخ اور سماجی حقائق سے ان کی فکر نے روشنی حاصل کی اور اپنے دور کے عصری مسائل ان کا موضوعِ سخن رہے۔

۴۴۔ ۱۹۴۲ء کے بعد کوئی پانچ چھے سال تک مخدوم کی سیاسی مصروفیت نے انھیں شاعری سے دور رکھا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا۔ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہونے والے ہولناک فسادات، درندگی اور وحشت کے ناقابلِ قیاس واقعات نے انسانی ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ سیاسی آزادی سے جو غیر معمولی توقعات وابستہ کرلی گئی تھیں وہ چکنا چور ہوگئیں۔ دانش وروں، ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں میں ایک طوفانی اضطراب نے تشکیک کو جنم دیا اور حساس ذہن یہ سوچنے لگے کہ اگر یہی سویرا ہے تو تاریکی کسے کہتے ہیں۔

مخدوم کی شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ان کی نظم "چارہ گر" سے ہوتا ہے اور ان کا دوسرا مجموعہ کلام "گلِ تر" ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ "گلِ تر" کی شاعری "سرخ سویرا" کی شاعری سے مختلف ہے۔ اب شاعر دو ٹوک بات نہیں کرتا۔ بلند بانگ دعووں اور نعرہ بازی سے گریزاں نظر آتا ہے اس کو علامتوں اور استعاروں کی اثر پذیری کا احساس ہوچکا ہے۔ اب وہ برق بن کر بتِ ماضی کو گرانے اور خوابِ فردا کو حال بنانے کا اعلان نہیں کرتا بلکہ نظم "چارہ گر" اس طرح کہتا ہے۔

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
مے کدے سے ذرا دور، اس موڑ پر
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرفِ وفا،
پیار ان کا خدا،
پیار ان کی چتا
دو بدن
اوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے

....

ہم نے دیکھا انھیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں

ازل تا ابد

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے ؟
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے ؟

اس نظم (چارہ گر) سے یہ بات ظاہر ہے کہ شاعر نے اپنی بات علامتوں اور استعاروں میں کہی ہے ۔ " دو بدن " محبت کی ست ہیں ۔ " مسجدوں کے منار ، مندروں کے کواڑ اور میکدے کے دراڑ ، علامتیں ہیں ملائیت ، برہمنیت اور آزادی کی ۔ یہاں یہ بات ، نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اوس میں بھیگنے ، چاندنی میں نہاتے ہوئے پیار کی آگ میں جل جانے والے " دو بدن " کی نشان دہی تے ہوئے شاعر " چارہ گر " سے سوال کرتا ہے کہ کیا تیری زنبیل میں کیمیائے محبت اور مداوائے الفت بھی ہے ؟ اس سے پہلے شاعر خیال تھا کہ سماجی انصاف پر مبنی اشتراکی نظام کے قیام سے وہ " سرخ سویرا " آئے گا جو اجتماعی اور انفرادی تمام مسائل کا علاج اور ر قسم کے دکھوں کا مداوا ہو گا لیکن اب شاعر کو اس بات کا ادراک ہو گیا کہ اجتماعی دور انفرادی ایسے بہت سارے سوالات ہیں جن ے جوابات منہ چھپائے ہوئے گریزاں نظر آئیں گے اور یہیں سے شاعر کا ذہنی سفر عقیدت سے حقیقت کی طرف اقرار سے انکار کی رف اور غیر ضروری ایقان سے صحت مند تشکیک کی طرف شروع ہوتا ہے ۔

نظم " آج کی رات نہ جا " میں زندگی کے حقائق کو اس طرح بیان کیا گیا ہے ۔

زندگی لطف بھی ہے ، زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی ، زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے ، حسرتِ دید بھی ہے
زہر بھی ، آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے

ر پھر شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ۔

آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
آج کی رات نہ جا

مخدوم نے بھاگ متی کی تاریخی اور افسانوی شخصیت پر بہت خوب صورت اور یادگار نظم کہی ہے ۔ بھاگ متی سے عشق و بت کی بنیاد پر شہر بھاگیہ نگر بسایا گیا تھا جو بعد میں " حیدر آباد " کے نام سے موسوم ہوا ۔ گول کنڈہ میں منعقد ہونے والے مشاعرے ں اپنی نظم " بھاگ متی " اپنے منفرد سحر انگیز ترنم میں سنائی تو سامعین مسحور ہو گئے تھے ۔ اس نظم میں محبت کی عظمت اور ابدیت کو ت دل کش انداز میں ظاہر کیا گیا ہے ۔

پیار سے آنکھ بھر آتی ہے کنول کھلتے ہیں

جب کبھی لب پہ ترا نام وفا آتا ہے

دھن کی سنگھاسن نہ اٹھتی نہ دھن کے بادل

سونے چاندی کے گلی کوچے نہ ہیروں کے محل

شہر باقی ہے محبت کا فسانہ باقی ہے

دل بری باقی ہے دل داری جاناں باقی ہے

سر فروشانِ نگاراں جہاں باقی ہے

وہ صبح ہے رقص سحر و آہنگِ نگراں باقی ہے

اس نظم مخدوم کی ایک نظم جو شاہکار بھی ہے اور بے مثال بھی۔ وہ ہے "چاند تاروں کا بن" ایک طویل دور کی داستان کو ایک ہی نظم میں استعاروں اور علامتوں کے ذریعے مخدوم کا اختصار کا اعجاز ہے اور یہ نظم بھی اپنی ہی آبشار کی طرح رواں دواں۔ اس نظم آزادی سے پہلے چند برس، آزادی کے سنہرے خواب اور آزادی کے بعد شکستِ خواب کا بیان ہے۔ مگر نظم شکستِ خواب کے المیہ پر ختم نہیں ہوتی بلکہ ڈوب کر ابھرتی ہوئی کشتی کی مانند ایک نئی منزل کی طرف چل پڑتی ہے۔ آزادی سے وابستہ تمناؤں سے مایوس ہو کر سردار جعفری نے کہا تھا:

کون آزاد ہوا ہے کس نے غلامی کی سیاہی دھوئی

کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی

میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا

اور اخترالایمان نے کہا:

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کس حسینہ کے چہرے کا غازہ نہیں ہے

جسے تم اٹھاتے لیے جا رہے ہو، یہ شب کا جنازہ نہیں ہے

اور فیض احمد فیض اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئے:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر

اگر چہ کہ فیض کی نظم "صبحِ آزادی" اور مخدوم کی نظم "چاند تاروں کا بن" کا موضوع اور سوچنے کا انداز ایک سا ہے۔ فیض اپنے دھیمے شائستہ انداز میں کہتے ہیں کہ یہ وہ سحر نہیں ہے جس کی آرزو لے کر آزادی کے متوالے نکلے تھے۔ گویا معلوم ہے کہ خواب ابھی ادھورے ہیں اور نگاری دلہن اور بدن جلاتے رہے مگر انھیں سحر کی تلاش زیادہ عزیز تھی۔ اب جب کہ ہر طرف وادی اور وسائل پر حصول کا نام ہو گیا ہے مگر اس کا کوئی ہمدرد نہیں کہ نظر کی امنگ اور دل کی جلن پر کچھ بس نہیں ہے۔ چراغ سرِ راہ کو خبر نہیں کہ کدھر سے آئی اور کدھر گئی۔ آخر میں فیض پیغام دیتے ہیں کہ آگے چلے چلو کہ ابھی نہ تو گرانیِ شب میں کمی آئی ہے اور نہ نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی آئی ہے

مخدوم کی نظم چاند تاروں کے بن میں تقریباً یہی بات کہی گئی ہے لیکن مخدوم کا اپنا منفرد انداز اور منفرد لے ہے۔ ان کی نظم کا کینوس بھی وسیع تر ہے اور ان کا تجربہ بھی زیادہ حقیقی اور موثر ہے۔ فیض کی نظم میں مشاہدہ ہے جب کہ مخدوم کی نظم میں ذاتی تجربہ دیکھیے مخدوم کس طرح یہ تاریخی نظم کہتے ہیں۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانک پن
رات کے جگمگاتے، دہکتے بدن
صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خار زارِ الم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا
کچھ امامانِ صد مکر و فن
اک کمیں گاہ سے
پھینک دے اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے
رات کی تلچھٹیں ہیں، اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے
ہمدمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

[illegible] اور سوشلسٹ انقلاب کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کی تھی۔ مگر جب آزادی ملی [illegible] کے ٹکڑے میں چل [illegible] اور سوشلسٹ انقلاب کا خیال محض ایک خواب ہو کر رہ گیا۔ ان حالات میں شاعر کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے اس کا عقیدہ متزلزل ہوتا ہے محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک دوراہے پر کھڑا پاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے۔

مجھے ڈر ہے کہ کہیں سرد نہ ہو جائے یہ احساس کی رات
رخِ طوفانِ حوادث کے دھوئیں کی لکار
یہ دھماکے، یہ بگولے شررِ راہ
جسم کا جان کا پیمانِ وفا کیا ہوگا
تیرا کیا ہوگا اے مضرابِ جنوں

....

اڑ نہ جائے کہیں یہ رنگِ جبیں
مٹ نہ جائے کہیں یہ نقشِ وفا
چپ نہ ہو جائے یہ بجتا ہوا ساز
شمعیں اب کون جلائے گا گزرگاہوں میں

....

میرے دل اور دھڑک
شاخِ گل اور مہک اور مہک

مگر شاعر مایوسی کا شکار نہیں ہے۔ وہ اپنی توانائیوں کو مجتمع کر کے نئے سرے سے جدوجہد کرنا چاہتا ہے لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ ہر طرف ایک سناٹے کا عالم ہے۔ "نہ کوئی دھڑکن ہے نہ کوئی چاپ / نہ سنچل / نہ کوئی موج / نہ ہلچل / نہ کسی سانس کی گرمی"۔۔۔ وہ چاہتا ہے "کہ ایسے سناٹے میں ایک آدھ تو پتا کھڑکے۔ کوئی بجلی تو گرے۔"

اس صورت حال کے باوجود شاعر مستقبل کی جانب سفر کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ رات بہت تاریک ہے۔ بھیانک ہے اور بہ ظاہر لامتناہی ہے مگر ضروری یہ ہے کہ جدوجہد جاری رکھتے ہوئے صبح کا انتظار کیا جائے اور ایسی کوئی رات نہیں جس کی سحر نہ ہو۔ اپنی نظم "وادیِ فردا" میں آزادی کے بعد کے حالات کا نقشہ مخدوم کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

جھاڑیاں درد کی
دکھ کے جنگل
ندیاں، جن میں بہا کرتے ہیں دل کے ناسور
کوہِ غم ناگ کی مانند سیہ پھن کھولے
ہر گزرگاہ کو کھا جاتے ہیں
رات ہی رات ہے، سناٹا ہی سناٹا ہے

...سب دیں " تمہید آباد ۔

وہ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

میری اس وادیِ فردا کے لالہ پوش پر قائم
یہ اندھیرا ہی تری راہ گذر
اس فضا میں کوئی دروازہ ، نہ دالان نہ در
تیری پرواز ہی بن جاتی ہے سامانِ سفر
دامنِ کوہ میں سوئی سی نظر آتی ہے
وہ ترے خواب کی زرین سحر

مخدوم نے جس " اشتراکی انقلاب " کا خواب دیکھا تھا۔ وہ صرف ان کا اپنا خواب ہی نہ تھا بلکہ وہ تو سارے ملک کا خواب بلکہ وہ ان تمام ممالک کا خواب تھا جو فسطائی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں۔

وہ شبِ مئے ، وہ شبِ مہتاب میری ہی نہ تھی
وہ جو میرا خواب کہلاتا تھا ، میرا ہی نہ تھا
وہ تو سب کا خواب تھا
سایۂ گیسو میں بس جانے کے ارماں دل میں تھے
میرے دل ہی میں نہ تھے
لاکھ دل ہوتے تھے لیکن
جب دھڑکتے تھے تو اک دل کی طرح
جب مہک اٹھتے تو دنیا کا مہک اٹھتا تھا دل
والگا کا یا ٹیمس کا ، نیل کا ، گنگا کا دل

اس خواب کی تعبیر کے امکانات انھیں موہوم ہوتے نظر آتے ہیں اور وہ اپنی بات اس طرح ختم کرتے ہیں۔

چاندنی سی میرے دل کے پاس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو لی (سب کا خواب)

ایک سچا فن کار ویسے بھی انسان دوست ہوتا ہے اور مخدوم کے مارکسی فلسفۂ حیات نے انھیں غریب ، بے کس ، مظلوم اور بے سہارا انسانوں کے زیادہ قریب کر دیا تھا۔ انھیں ایک طرف تو اپنے اطراف غم زدہ اور مجبور عوام نظر آتے ہیں اور دوسری طرف استحصال کرنے والا اجارہ دار مختصر سا طبقہ ہے جس نے حیات کے سارے وسائل پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ایسے ماحول میں وہ مغموم ہو جاتے ہیں۔

کوئی کسی کو بتاتا نہیں کہ کیا کھویا
کسی کو یاد نہیں ہے کہ دل پہ کیا گذری
دلوں میں بند ہیں کالے حیات کے غم

ہر ایک زخم کے اندر ہے زخم، درد میں درد
کسی کی آنکھ میں کانٹے، کسی کی آنکھ میں پھول
کہیں گلاب، کہیں کیوڑے کی بستی ہے
یہ سرزمین اک اک بوند کو ترستی ہے

مخدوم لمحہ لمحہ زندگی بسر کرنے کے قائل تھے۔ وہ لمحہ انقلاب کا ہو یا خواب کا۔ وہ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ محبوب سے کہا جائے کہ محبت کے گیت ابھی نہ چھیڑ، کیوں کہ ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں، کچھ دیر کے لیے ہی سہی، وہ اپنے اور دنیا کے غم کو بھول کر پُرمسرت اور وصال لے لمحات کو ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے اس رویے کا اظہار ان کی نظم "جانِ غزل" میں ہوتا ہے۔

دل گیا راہ میں اجنبی موڑ پر کوئی جانِ غزل
آج تو یاد آئیں نہ دنیا کے غم
آج دل کھول کر مسکرا چشمِ نم
آج چٹکی ہے رخسار کی چاندنی
کتنا بھاری تھا یہ زندگی کا سفر
خوابِ فردا کی دیوار کی چھاؤں میں
دو گھڑی بیٹھ کر
عشرتِ حال کی مے پئیں
دل کی سنسان گلیوں میں کچھ دیر، کچھ دور تک
آج تو ساتھ چل
میری جانِ غزل

بہ ظاہر "سرخ سویرا" اور "گلِ تر" کی نظمیں اپنے ڈکشن کے اعتبار سے مختلف نظر آتی ہیں۔ "سرخ سویرا" کی نظموں میں راست اور سادہ بیانیہ شاعری ہے جب کہ "گلِ تر" کی نظموں میں علامتوں، استعاروں اور رمزیت سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے باوجود انسان دوستی، عوامی جدوجہد، اجتماعی تمنائیں، ذاتی کرب، محبت اور جنس دونوں مجموعوں میں قدر مشترک ہیں۔ "مگر زمانے اور شعور کی پختگی کے فرق کے ساتھ۔"

مخدوم نے اپنی شاعری کی ابتدا نظموں سے کی۔ "سرخ سویرا" کے شاعر نے غزل کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھا۔ مگر "گل تر" تک پہنچتے پہنچتے نظموں میں غنائیت اور صوتی آہنگ کا حسن پیدا ہوگیا جو اسے غزل کے قریب لے آیا۔ بعض نظم گو شعرا غزل کے بے حد مخالف رہے ہیں۔ اخترالایمان کا خیال تھا کہ غزل میں کسی اظہار کی قوت باقی نہیں رہی۔ مگر مخدوم نے اپنے ذہن کا دریچہ کھلا رکھا اور غزل کو بھی اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔

بمبئی میں خدائے سخن میر تقی میر کا جشن منایا گیا۔ اس مشاعرے میں شرکت کے لیے پاکستان سے حضرت جوش ملیح آبادی

کمی اور سنائی۔

سیماب وشی، تشنہ لبی، باخبری ہے
اس دشت میں گر رختِ سفر ہے تو یہی ہے
اک شہر میں، اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی، نسبتِ پیمانہ رہی ہے
ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مئے تلخیِ ایام بھی پی ہے
دھڑکا ہے دلِ زار ترے ذکر سے پہلے
جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے
وہ عطر تری کاکلِ شب رنگ نے چھڑکا
مہکی ہے فردِ روح کلی بن کے کھلی ہے

غزل سن کر نہ صرف اہلِ نگاہ چونک گئے بلکہ سامعین نے بھی زبردست داد دی اس کے بعد انھوں نے ایک سے ایک خوب صورت اور خیال انگیز غزلیں کہیں۔

فیض کی غزلوں میں جس طرح پاکستان کی جبر سیاست کا عکس نمایاں ہے اسی طرح مخدوم کی غزلوں میں ان کی اپنی جدوجہد کا رنگ جھلکتا ہے۔

تیرے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے
دار سے گزرے تری راہ گزر سے پہلے
بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا، تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

○

تحفہ، برگ گل و بادِ بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے
ہم تو کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسم ہیں ندیم
مسکراتے ہوئے ٹکراتے ہیں طوفانوں سے

○

مہک مہک کے جگاتی رہی نسیمِ سحر
لبوں پہ یارِ مسیحا نفس کا نام لیے

بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی
اٹھا ہوں آنکھوں میں اک خوابِ ناتمام لیے

○

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب
کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیر در میکدہ
کوئی دیوانہ، کوئی آبلہ پا آخرِ شب

○

عالمِ تشنگیِ بادہ گساراں مت پوچھ
میکدہ دور ہے، مینائے زر افشاں چپ ہے
نہ کسی آہ کی آواز نہ زنجیر کا شور
آج کیا ہوگیا زنداں کو کہ زنداں چپ ہے

○

عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے
کوہِ غم اور گراں، اور گراں، اور گراں
غمزدہ شیشے کو چھلکاؤ کہ کچھ رات کٹے

○

ہم اپنے ایک دل بے خطا کے ساتھ آئیں
تم اپنے محشر دار و رسن کے ساتھ آؤ

○

غزل کے یہ اشعار، غزل کے تمام لوازمات کے ساتھ روایتی غزل سے یک سر مختلف ہیں۔ غزل کے فارم میں وہ مضامین ہیں جو غزل کے لیے نئے ہیں۔ مخدوم نے یہ ثابت کردیا کہ غزل تہی دامن نہیں ہے۔ بیان کے لیے جو وسعت نظم میں ہے وہی غزل میں بھی ہے۔ شرط یہ ہے کہ فن کار میں صلاحیت ہو۔

مخدوم نے غزل کے کینوس کو محدود نہیں رکھا۔ حسن و عشق ہمیشہ ہی سے ایک اہم موضوعِ سخن رہے۔ مخدوم نے حقیقیِ آہنگ کی رومانی غزلیں بھی کہی ہیں۔ مگر ان کا یہ رنگ محض روایتی نہیں ہے۔ ان کے رومانی اشعار میں حقیقی تجربے کی گرمی محسوس کی جاتی ہے۔

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر — چشمِ نم مسکراتی رہی رات بھر
یاد کے چاند دل میں اترتے رہے — چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

o

جہاں بھی بیٹھے ہیں، جس جا بھی رات جاگی ہے
انھیں کی آنکھوں کے قصے، انھیں کے پیار کی بات
دلوں کی تشنگی جتنی، دلوں کا غم جتنا . . .
اسی قدر ہے زمانے میں حسنِ یار کی بات

o

شمیمِ پیرہنِ یار کیا نثار کریں
تجھی کو دل سے لگائیں تجھی کو پیار کریں
کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں، دیدِ یار کریں

o

ساز آہستہ، ذرا گردشِ جام آہستہ
جانے کیا آئے نگاہوں کا پیام آہستہ
چاند اترا کہ اتر آئے ستارے دل میں
خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

o

بے صحبتِ رخسار اندھیرا ہی اندھیرا
گو جام وہی، مے وہی، مے خانہ وہی ہے
ہر دم ترے انفاس کی گرمی کا گماں ہے
ہر یاد تیری یاد لے پھولوں میں بسی ہے

o

مخدوم نے غزل کے لیے نئی لفظیات دریافت نہیں کی اور نہ کھردرے غیر مانوس الفاظ کے ذریعہ غزل کو نیا بنانے کی کوشش کی بلکہ غزل کے مروجہ الفاظ کی غیر صرف شدہ قوتوں کا استعمال فن کے ساتھ کیا ہے۔

مخدوم اگرچہ کہ ایک فعال کمیونسٹ لیڈر تھے مگر وہ کٹر نظریہ پرست نہ تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں دیگر مکتب خیال کے لوگ شامل تھے۔ سروجنی نائیڈو مخدوم کو اپنا بیٹا کہا کرتی تھیں۔ ۱۹۴۴ء میں مخدوم نے گاندھی جی سے ملاقات کی تھی۔ اس وقت [illegible] ذکیہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ سروجنی نائیڈو نے گاندھی جی سے مخدوم کا تعارف کروایا تھا۔ "یہ میرا بیٹا ہے اور یہ اس کی بیٹی"۔ مخدوم جواہر لال نہرو کی عظمت کے قائل تھے اور نہرو بھی مخدوم کے قدرداں۔ نہرو کی موت پر مخدوم نے ایک مختصر [illegible] کی۔ [illegible]

[illegible] اپنے اسلوب اور انفرادی انداز میں سب سے ممتاز اور منفرد ہے۔

ہزار رنگ ملے ایک میو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا غبار، مشتِ بہار
ہوا ہے وادیِ جنت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت اور جستجو بن کر

عام طور پر کہا جاتا ہے۔ ضروری نہیں ایک بڑا فن کار بڑا انسان بھی ہو مگر مخدوم جتنے بڑے شاعر تھے اس سے بھی بڑے انسان تھے۔ انھیں اپنی شاعرانہ عظمت، شہرت اور ہر دل عزیزی کا احساس تھا مگر مزاج میں انتہائی سادگی تھی۔ وہ بے احتیاج تو نہ تھے مگر بے نیاز ضرور تھے۔ کبھی یہ فکر نہیں کی کہ ان کا بھی ذاتی مکان ہو حالاں کہ وہ ہوزنگ بورڈ کے ممبر تھے سواری کے لیے ذاتی کار کا کبھی خیال نہیں کیا۔ ضرورت پر کرایہ کا رکشا استعمال کرلیتے حالاں کہ ان سے بہت ہی کم درجے کے قائدین نے اپنے لیے تمام آسائش کا سامان مہیا کرلیا تھا۔ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ وہ کسی مصروفیت کو خواہ وہ کتنی ہی منفعت بخش کیوں نہ ہو اپنے نصب العین کی راہ میں رکاوٹ بنتی دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ انھوں نے فلموں میں گیت لکھنے کی پیش کش کو ٹھکرادیا تھا جب کہ وہ پیش کش بمل رائے اور گرودت جیسے فلم سازوں نے کی تھی۔ مخدوم ترنم سے شعر سناتے تھے۔ ان کا ترنم دل کش سحر انگیز اور منفرد تھا۔ مخدوم کے شعر کہنے کا انداز بڑا معصومانہ تھا۔ جوں ہی شعر کہتے سنادیتے۔ نظم یا غزل مکمل ہوتے ہی چھپوادیتے۔ اب بات پر ہاتھ ملانا ان کا مخصوص انداز تھا۔ مخدوم کا پیغام تھا

جہاں میں جنگ نہیں، امن سر بلند چلے   نسیمِ صبح چلے، بادِ ناشستند چلے

یہ پیغام ہندوستان اور پاکستان کے آج کے حالات میں اور بھی زیادہ بامعنی ہوگیا ہے اور دونوں طرف کے سربراہانِ مملکت کے لیے لمحۂ فکر بھی ہے اور باعثِ نجات بھی۔

ایک میٹنگ کے سلسلے میں مخدوم دلی گئے ہوئے تھے۔ وہیں قلب کی تکلیف کے باعث ہاسپٹل میں شریک ہوئے اور ۲۶ اگست ۱۹۶۹ء کو ان کے اس دل نے ان کا ساتھ چھوڑدیا جو طوفانوں کے مدِ مقابل رہا اور وہ کوہ کن اس جہاں سے رخصت ہوگیا جو ناانصافی اور نابرابری کے کوہِ بے ستون کو کاٹ کر انصاف اور اشتراک کی جوئے شیر لانے کی سعی پیہم میں آخر دم تک مصروف رہا۔ ان کا جسد خاکی طیارے سے حیدرآباد لایا گیا۔ جلوسِ جنازہ میں لاکھوں سوگواروں نے شرکت کی۔ یوں لگتا تھا کہ گویا وہ کسی ہر دل عزیز سربراہ مملکت کا جنازہ ہے۔

شہر باقی ہے، محبت کا نشاں باقی ہے
دل بری باقی ہے، دل داریِ جاں باقی ہے
سرِ فرصت نگارانِ جہاں باقی ہے
تو نہیں ہے تری چشمِ نگراں باقی ہے

ہاشم حسن سعید

اردو میں مستعار الفاظ کے تلفظ کا مسئلہ

یہ حقیقت ہے کہ اردو میں ساٹھ فیصد سے زائد الفاظ دوسری زبانوں سے مستعار ہیں۔ ویسے یہ سبھی جانتے ہیں کہ اردو میں سے عربی اور فارسی الفاظ نکال دیے جائیں تو اردو کا ذخیرہ الفاظ برائے نام رہ جائے گا لیکن ان زبانوں کے علاوہ سنسکرت، ترکی، بنگالی اور انگریزی کے لاتعداد الفاظ بھی اردو میں مستعمل ہیں۔ اردو میں دخیل ان الفاظ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی وضع طور پر تین صورتیں ہیں۔

(۱) لفظ اپنے اصل معنی اور تلفظ کے ساتھ قبول کرلیا گیا ہے اور اس کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے (قطعِ نظر رسمِ خط)۔ جیسے میٹنگ (انگریزی) فرمان (فارسی) کتاب (عربی)۔

(۲) لفظ جوں کا توں لے لیا گیا ہے۔ نہ ساخت میں تبدیلی نہ تلفظ میں تبدیلی۔ لیکن معنی بدل گئے ہیں۔ جیسے لفظ مہتر کہ فارسی میں سردار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (مہترِ چترال) لیکن اردو میں بھنگی کا مترادف ہے۔

(۳) لفظ کی ساخت اور تلفظ میں تبدیل ہوئی ہے لیکن وہی ہیں۔ جیسے لالٹین (Lantern)، بوتل (Bottle)۔ شین سینی فارسی) ملائی (بالائی) وغیرہ۔

یہاں صرف ان ہی مستعار الفاظ سے بحث ہے جن کے معنی و مفہوم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے لیکن تلفظ میں فرق آگیا ہے۔ بعض وقت عوامی چلن کی وجہ سے یہ فرق پیدا ہوا ہے اور بعض وقت زبان کی صوتی خصوصیات اس کی متقاضی رہی ہیں۔ اگر عوام کا پڑھا لکھا طبقہ کسی مستعار لفظ کے تلفظ کو نظر انداز کرکے اپنے طور پر اس کو ملفوظ کرتا ہے تو غلط العام فصیح کے مصداق وہی مستند سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً عربی کا لفظ لَفافَہ ہے اہلِ اردو اسے لِفافہ کہتے ہیں اور یہی درست سمجھا جاتا ہے۔ ایک حد تک یہ کلیہ بنالیا گیا ہے کہ اگر عربی الفاظ کے تلفظ میں فرق سے معنی میں کوئی فرق نہیں آتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اس کے برعکس اگر معنی میں فرق پیدا ہوجائے تو یہ غلط ہے مثلاً منتظَر (اسمِ مفعول) کے لیے ہم منتظِر (اسمِ فاعل) استعمال نہیں کرسکتے۔ اسی طرح مہذَب اور مہذِب، مودَب اور مودِب وغیرہ تلفظ اور معنی ہر دو لحاظ سے الگ ہیں۔ لیکن اگر لفظ زیادہ مستعمل نہیں ہے اور ہم اصل تلفظ سے ناواقف ہونے کی وجہ سے زیر کی بجائے زبر اور زبر کی بجائے زیر لگادیتے ہیں تو یہ غلط ہے اور ایسی غلطیاں ہمیں اکثر ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں دکھائی دیتی ہیں۔ آپ نے اغوا کے لیے اَغوا کئی بار سنا ہوگا جو ظاہر ہے غلط ہے۔

اسی طرح شکوہٗ کو شِکوہ، نظم و نسقؔ کو نظم و نسِق، طُلبا کو طَلَبا، یوم کو یوم اور شہر کو شہر عام طور پر بولا جاتا ہے جس کو کسی صورت سے صحیح قرار نہیں دے سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کان صحیح تلفظ سے آشنا نہ ہوں گے یا صحیح اعراب کے ساتھ پڑھنے میں نہیں آئیں گے تلفظ کی۔ غلطیاں ہوتی رہیں گی۔اس مضمون میں اعراب کی بہت زیادہ اہمیت ہے اس لیے زبر، زیر، پیش

اور جزم کا خیال رکھ کر تصحیح کرتے جائیے غیر زبان کے اسمائے خاص کے تلفظ میں تو اور زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں۔ کیوں کہ اہلِ اردو کو یہ الفاظ نہ تو اعراب کے ساتھ پڑھنے کا موقع ملتا ہے اور نہ ہی وہ انھیں صحیح تلفظ کے ساتھ سن پاتے ہیں جیسے وارن ہیسٹنگز کو اکثر اردو میڈیم کے طلبہ وارن ہشین گیز بولتے ہیں۔ امریکہ کے مشہور شہر۔ لاس این جے لیس " (Losangeles) کو پڑھا لکھا اردو داں طبقہ بھی " لاس انجلس " کہتا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بتائی ہے۔ یعنی ہم ان الفاظ کو بغیر اعراب کے ساتھ پڑھ کر اپنے طور پر تلفظ ادا کرتے ہیں اور ہم نے اپنے کان سے ان کا صحیح تلفظ سنا نہیں۔ میرے ایک دوست جو ہندی سے قطعی نابلد ہیں اور جن کی عمر کا بڑا حصہ ممالک غیر میں گزرا ہے۔ " بلونت سنگھ " کو ہمیشہ " بلُونتّ سنگھ کہتے ہیں۔

یہ تو بات ہوئی صحیح تلفظ سے واقفیت کی۔ بے شک عدم واقفیت کی بناء پر ہم اکثر تلفظ کی غلطیاں کرتے ہیں جن کی اصلاح اگر ہم کوشش کریں تو کرسکتے ہیں لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم لفظ کے صحیح تلفظ سے واقف ہونے کے باوجود اس کو ادا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں کیوں کہ ہم اپنے نکلمی اعضا (Vocal Cords) کی ایک مخصوص ماحول میں نشوونما کے سبب صحیح ادائگی تلفظ کی قدرت نہیں رکھتے۔ یہ صورتِ حال صرف اردو بولنے اولوں کو ہی نہیں بلکہ ہر زبان کے بولنے والوں کو درپیش ہوتی ہے۔ فارسی اور فرانسیسی میں وہ کوزی آوازیں (Retroflex Sounds) نہیں ہیں جو اردو اور ہندی میں ہیں یعنی ٹ۔ڈ۔ڑ وغیرہ۔ فارسی اور فرانسیسی بولنے والوں کے نکلمی اعضا ان آوازوں کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ چناں چہ ایرانی اور فرانسیسی سڑک کو سرک، انڈہ کو اندہ، اور ٹال مٹول کو تال متول بولتے ہیں۔ پیرس یونیورسٹی کی ایک طالبہ ژیکلین فلیوزا جس کو میں اردو پڑھایا کرتا تھا تین ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد ان کوزی آوازوں کو ٹھیک ڈھنگ سے ادا کرنے کے قابل ہوسکی۔ دراصل نکلمی اعضا کی نشوونما پر جغرافیائی ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہمارا صوتی نظام بنیادی طور پر اس خطہ ، ارض کے جغرافیہ کے تابع ہوتا ہے جہاں ہم رہتے بستے ہیں۔ اسی طرح ہمارا لسانی ماحول بھی ہمارے صوتی نظام پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بچہ سب سے پہلے ان ہی آوازوں کی ادائگی پر قادر ہوتا ہے جو وہ پہلے پہل ماں باپ کی زبانی سنتا ہے۔ یا پھر رشتہ داروں ، بھائی بہنوں اور گھر کے دیگر افراد کو بولتا دیکھ کر مانوس ہونے لگتا ہے۔ بالکلیہ محروم بچے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ آپ غور کیجیے اردو میں خاص عربی زبان کے کتنے حروف ہیں ؟ اور ان میں سے کتنے حروف کی آوازوں پر آپ قدرت رکھتے ہیں۔ کیا آپ ث / س / ص یا ت/ط یا غ/ق یا ز/ذ یا ض/ظ کی آوازوں کو اسی طرح ادا کرسکتے ہیں جیسے اہلِ عرب کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے اردو بولنے والے تو عام طور پر خبر اور قبر یا تخریب اور تقریب کے تلفظ میں بہ اعتبارِ مخارج کوئی فرق نہیں کرتے ہیں۔ کیا آپ نے ہندی فلموں میں مزہ کے لیے مجا یا ضرورت کے لیے جرورت بولتے نہیں سنا۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟ یہی کہ ڈائیلاگ بولنے والوں کے نکلمی اعضا " ز " اور " ض " کی آواز ادا کرنے سے قاصر ہیں اور ان کے مخارج اصوارت مختلف ہیں۔

تلفظ کے تعلق سے یہ اہم بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تلفظ اور لہجے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک ہی زبان مختلف علاقوں میں مختلف لہجے کے ساتھ بولی جاسکتی ہے بعض جگہ یہ بولی (Dialect) کی شکل اور بعض جگہ (Cognate language) کی شکل میں بھی ملتی ہے جس کا کوئی خاص معیارِ تلفظ نہیں ہوتا جب کہ زبان کا تلفظ ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔ لغات میں شاید ایسی دوچار مثالیں ہی ملیں گی کہ ایک لفظ کے دو تلفظ دیے گئے ہوں۔ ہاں صدیوں بعد دوسری اقوام اور نسل کے اثرات سے کچھ تغیرات رونما ہوسکتے ہیں۔

یہ اثرات بالکلیہ بالواسطہ ہوتے ہیں۔ تلفظ میں تبدیلی دراصل نتیجہ ہوتی ہے اصوات میں تبدیلی کا۔ اصوات میں تبدیلیاں دو قسم کی ہوتی ہیں (Organic Change) اور (Acoustic Changes)۔ بچہ ہمیشہ تقلید سے آوازیں سیکھتا ہے۔ کبھی ناقص تقلید سے غلط تلفظ ادا کرنے لگتا ہے لیکن یہ صورت عارضی ہوتی ہے۔ اس کو Acoustic تبدیلی کہتے ہیں۔ اس کے برعکس لاپروائی اور تغافل کی وجہ سے کبھی کوئی تبدیلی مستقل ہوجاتی ہے۔ یہ (Organic) تبدیلی کہلاتی ہے۔ ان دو قسم کی تبدیلیوں کے تحت ہنری سویٹ (Henry sweet) نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف "تاریخِ زبان" The History of Languge میں تبدیلی کی اور بہت سی وجوہات بیان کی ہیں جس کی تفصیل کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے۔

جب ہم اردو میں مستعار الفاظ کے تلفظ پر بحث کرتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ خود اردو زبان کی صوتی خصوصیات کیا ہیں۔ اردو میں کتنے مصمتے (Consonants) ایسے ہیں جن کی آواز پر اہلِ اردو قادر ہیں۔ خاص طور پر وہ مصمتے جو عربی اور فارسی سے مستعار ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ابھی ہم نے کیا ہے۔ جب ہم ان آوازوں پر قادر نہیں ہیں تو پھر ان آوازوں سے تشکیل پانے والے الفاظ کا صحیح تلفظ کس طرح ادا کرسکتے ہیں۔ فارسی کا مصمتہ "ژ" اردو میں بہت کم مستعمل ہے تاہم اہلِ اردو اس آواز کی ادائیگی کی بڑی حد تک اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے انگریزی سے مستعار الفاظ ٹیلی وژن (Television) اور پروژن (Provision) کو بڑی آسانی سے ملفوظ کرلیتے ہیں جب کہ ہندی بولنے والوں کو کچھ تکلف محسوس ہوتا ہے۔

بات جب حروف اور مصمتوں کی نکلی ہے تو یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ عربی سے مستعار بےشمار اسماء کا تلفظ محض ہم اپنی ناواقفیت کے سبب صحیح ادا نہیں کرتے۔ حروفِ شمسی اور حروفِ قمری کون سے ہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ عبدالشکور کو عبدل شکور، عبدالستار کو عبدل ستار اور عبدالرحیم کو عبدل رحیم کہتے ہیں جو ظاہر ہے بالکل غلط ہے۔ یہ اور اسی قسم کی لاتعداد غلطیاں آئے دن سرزد ہوتی رہتی ہیں محض اپنی عدم واقفیت یا کم علمی کے سبب۔ اگر اس جانب کوئی متوجہ کرے تو پھر وہ موردِ عتاب ٹھہرتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی بھی زبان میں مصمتے (Consonants) خود کوئی آواز نہیں دیتے تاوقتیکہ یہ مصوتوں (Vowels) کے ساتھ جڑ کر استعمال نہ ہوں۔ مصوتے ہی مصمتوں میں صوتی جان پیدا کرتے ہیں۔ اردو میں صرف تین حروفِ علت ا۔ و۔ ی کے ساتھ زیر، زبر، پیش مل کر مصوتے تشکیل پاتے ہیں اردو میں مصوتے (Vowels) کتنے ہیں؟ یہ سوال ایک انٹرویو میں بتیس (۳۲) امیدواروں سے پوچھا گیا۔ افسوس کہ کسی امیدوار نے اس کا صحیح جواب نہیں دیا۔ حالاں کہ امیدواروں میں بیشتر اردو کے پی ایچ۔ ڈی تھے اور ان میں سے چند اساتذہ بھی شامل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی درجوں میں انھیں بتایا ہی نہیں گیا کہ اردو میں مصوتے کیا ہیں؟ اردو میں مصوتوں کی اتنی ہی تعداد ہے جتنی ہندی میں ہے۔ یعنی دس۔ ذیل میں یہ مصوتے دیے جاتے ہیں۔ آپ غور کیجیے ان میں سے کس پر اعراب نہیں لگتے:

اَ ، آ ، (اَ + اَ) ، اِ ، اِی ، اُ ، او ، اے ، او ، او

فارسی میں مصوتے یائے مجہول جیسے (تیل، بیٹا) اور واؤ مجہول (جیسے بول، مور) موجود نہیں ہیں۔ صرف یائے معروف اور واؤ معروف ملتے ہیں اردو میں فارسی سے جو مستعار الفاظ ہیں ان میں ہم اکثر یائے معروف کی جگہ یائے مجہول اور واؤ معرف کی جگہ

[illegible]

ذیل میں دی جاتی ہیں:

فارسی کا تلفظ	اردو کا تلفظ
دوست	دوست
کوشش	کوشش
پوشاک	پوشاک
سیب	سیب
زیور	زیور
زیبائش	زیبائش
جاوید	جاوید
خورشید	خورشید

(جاوید اور جاوید • خورشید اور خورشید ہر دو تلفظ مروج ہیں)

اگر ہم فارسی کے تلفظ کو معیار قرار دیں گے تو اردو میں بولے جانے والے ان تمام الفاظ کا تلفظ غلط نہ سہی • غیر فصیح ضرور سمجھا جائے گا ۔ زبان ایک بولی جانے والی چیز ہے ۔ یہ ایک دھارا ہے جو ہمیشہ بہتا رہتا ہے ۔ یہ دھارا کسی بھی رخ بہہ سکتا ہے اسے روک نہیں سکتے ۔ دریا پر بندھ تو باندھا جاسکتا ہے لیکن زبان کو ہمیشہ قواعد کے اصولوں میں جکڑ کر نہیں رکھا جاسکتا ۔ اگر ایسا جائے تو زبان اپنی موت آپ مرجائے گی ۔ اسی لیے لسانیات کا یہ بنیادی اصول ہے کہ زبان پہلے بنتی ہے اور قواعدِ زبان بعد میں اردو میں فارسی سے مستعار الفاظ کا وہی تلفظ درست ہے جسے اہلِ زبان کی طرف سے سند ملی ہو ۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اردو کے ان دو مصوتوں (یائے مجہول اور واؤ مجہول) کو ظاہر کرنے کے لیے کچھ نئی علامتیں وضع کی جائیں تاکہ مبتدیوں کو انھیں آسانی سے ساتھ سمجھایا جاسکے اور لغت میں بھی ادائیگیِ تلفظ کو واضح کرنے میں مدد ملے ۔ (واؤ مجہول اور واؤ معروف کو ظاہر کرنے کے لیے اب تک پیش اور الٹی پیش ـُو ـٗو سے کام لیا جاتا رہا لیکن آج کل اس کا استعمال برائے نام ہورہا ہے ۔)

اردو میں متذکرہ دس مصوتوں کے علاوہ کچھ نئے مصوتے بھی ہیں جس کے تحریری اظہار کی کوئی صورت ابھی تک نہیں نکالی گئی ہے ۔ یہ مصوتے جو بالعموم چھوٹے مصوتے (Short vowels) ہیں ۔ انگریزی زبان کی دین ہیں ۔ اردو میں آج انگریزی سے مستعار لاتعداد الفاظ مروج ہیں ۔ نہ صرف پڑھا لکھا طبقہ بلکہ ان پڑھ اور جاہل بھی انھیں برلتے ہیں ۔ مثلاً پاسپورٹ • سائین • ویزا • لائٹ • بورڈ • پوسٹ آفس • منسٹر • سر • سوٹ کیس • ڈریسنگ ٹیبل • ٹیلر • ڈاکٹر • ڈرائیور • آئیل • اکاؤنٹ • گلاس وغیرہ وغیرہ بے شمار الفاظ ۔ ان الفاظ کو نہ صرف ہم صحیح تلفظ کے ساتھ بول لیتے ہیں بلکہ ادائیگیِ تلفظ کو واضح کرتے ہوئے اعراب لگاکر لکھی بھی جاسکتی ہیں (صرف یائے مجہول اور واؤ مجہول کو چھوڑ کر جن کا بیان ابھی اوپر آیا ہے) ۔

ان الفاظ کے علاوہ انگریزی سے مستعار ایسے بھی بہت سے الفاظ ہیں جو ہم صحیح طور پر بول تو سکتے ہیں لیکن لکھ نہیں پاتے ۔ کیوں کہ ان چھوٹے مصوتوں کو ظاہر کرنے کے لیے نہ تو موزوں اعراب ہیں اور نہ اس کے لیے کوئی صورت نکالی گئی ہے ۔ ہم یہ الفاظ

محض لکھنے کو لکھ لیتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں لکھتے جو بولتے ہیں۔ ذرا انگریزی کے ان الفاظ پر غور کیجیے جنھیں ہم صحیح تلفظ کے ساتھ آئے دن استعمال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں اس طرح سے :

بیل (Bell)، پین (Pen)، بیڈ (Bed)، ریسلنگ (Wrestling) وغیرہ۔ کیا ہم اردو میں لکھے ہوئے ان انگریزی الفاظ کا تلفظ زیر، زبر، پیش لگاکر ظاہر کرسکتے ہیں؟ جب ظاہر نہیں کرسکتے ہیں تو انگریزی سے بالکل بے بہرہ ایک شخص جو اردو سیکھ رہا ہو بھلا کس طرح ان الفاظ کا تلفظ پڑھ کر ادا کرپائے گا۔ اس کے لیے تو (Bell) چنبیلی کی بیل ہوجائے گا۔ زبر لگائیں گے تو بیل گاڑی پڑھا جائے گا اور زیر دیں گے تو سبیل بے سین کی آواز دے گا۔ اگر یہاں ہمیں اردو زبان کی بے بضاعتی کا احساس ہوتا ہے تو یہ غلط نہیں ہے۔

" کسی زبان اور اس کے رسم خط میں مصوتوں کا نظام اتنا مکمل اور سائنٹفک نہیں ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اصل تلفظ کے ساتھ ظاہر کرسکے۔ انگریزی میں تو ایک Vowel مختلف آوازیں دیتا ہے جیسے بٹ (But) اور پٹ (Put) اسی لیے تلفظی لغات (Pronunciation Dictionaries) تیار کی جاتی ہیں۔" (م۔ت)

۱۹۷۴ء میں ترقی اردو بورڈ نئی دہلی کی جانب سے انجمن اسلام بمبئی کو طلبہ کے لیے ایک ڈکشنری مرتب کرنے کا کام تفویض کیا گیا تھا۔ میں نے بھی کچھ دنوں بمبئی میں اس پر بہ حیثیت ایڈیٹر کام کیا۔ میرے ذمہ اردو میں انگریزی سے مستعار ایسے الفاظ کے کارڈ تیار کرنا تھا جو عام بول چال میں آتے ہیں۔ میں نے جب ان الفاظ پر اعراب لگانا چاہا تو وہی دقت حائل ہوئی جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ تین ماہ بعد ایڈیٹوریل بورڈ کی میٹنگ ہوئی جس میں ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، علی سردار جعفری، دسنوی صاحب، شریف الدین صاحب اور قریشی صاحب شریک تھے میں نے ممبروں کے سامنے یہی مسئلہ رکھا کہ اردو کے موجودہ اعراب انگریزی کے دخیل الفاظ کے تلفظ کو ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کے لیے کوئی عملی صورت نکالی جانی چاہیے تاکہ انگریزی سے نابلد طلبہ ان الفاظ کا صحیح تلفظ جان سکیں۔ لیکن ممبروں میں سے کوئی بھی اس مسئلے کا حل نہیں پیش کرسکا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کہا کہ انگریزی میں چھوٹے مصوتے (Short Vowels) اتنے زیادہ ہیں کہ اردو میں ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے۔ لیکن ایسا کہنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا اور نہ اس کی اہمیت گھٹتی ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اردو زبان کے دانش ور مل بیٹھیں اور کوئی صورت نکالیں۔ کم از کم انگریزی کے ایسے الفاظ کے تلفظ کے اظہار کے لیے جو اردو کے خراد پر چڑھ گئے ہیں اور روز مرہ کی بول چال میں آتے ہیں۔ اس مسئلے سے ہم صرفِ نظر نہیں کرسکتے۔

جہاں تک کلسٹر (Cluster) یعنی جڑواں آواز کا تعلق ہے اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ اردو بولنے والوں نے اپنی سہولت کی غرض سے انگریزی کے بعض کلسٹر کے آگے جو لفظ کے شروع میں آتے ہیں الف لگالیا ہے اور اسی لحاظ سے وہ ان کا تلفظ کرتے ہیں۔ یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ مثلاً اسکول (School)، اسٹیشن (Station)، پنجاب میں اکثر لوگ اسکول کو سکول اور اسٹیشن کو سٹیشن لکھا کرتے تھے لیکن اہلِ اردو کے لسانی مزاج نے اس کو قبول نہیں کیا اور اس املا کو سندِ عام حاصل نہ ہوسکی۔ سنسکرت کے لفظ ستھان کو بھی ہم استھان بولتے ہیں۔

اردو میں مستعار الفاظ کا معیار تلفظ

ان مباحث کی روشنی میں اردو میں غیر زبانوں سے مستعار الفاظ کے تلفظ کا ایک معیار قائم کیا جاسکتا ہے :

(۱) اگر عربی سے مستعار لفظ کے تلفظ میں فرق سے معنی میں فرق نہیں پیدا ہوتا ہے تو اس کو رواج دیا جاسکتا ہے

بشرطیکہ یہ غلط العام ہو غلط العوام نہیں۔

(۲) عربی سے مستعار الفاظ کے تلفظ میں حروف شمسی اور حروف قمری کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(۳) جہاں مخارج اصوات کی مجبوری درپیش ہو یعنی نکلی اعضاء اصوات کی ادائیگی پر قادر نہیں ہیں وہاں ہم اپنے لسا مزاج کے اعتبار سے تلفظ ادا کرسکتے ہیں۔

(۴) ذو معنی الفاظ کا اگر اصل زبان میں ایک ہی تلفظ ہو اور اردو میں دو تلفظ رواج پاگئے ہوں تو انھیں دو علاحدہ ا قرار دینا درست ہوگا۔ جیسے شیر فارسی میں یہ ایک ہی لفظ دودھ اور ٹائیگر کے لیے استعمال ہوتا ہے اب اردو میں شیرِ دودھ کے اور شیر ٹائیگر کے لیے استعمال ہوگا۔

(۵) فارسی سے مستعار الفاظ میں یائے معروف اور واؤ معروف کو یائے مجہول اور واؤ مجہول سے بدلا جاسکتا ہے۔

(۶) فارسی کے بعض الفاظ میں لمبے مصوتہ کو ترک کرکے چھوٹا مصوتہ استعمال کرسکتے ہیں لیکن یہ تلفظ بول چال ا ضرورتِ شعری کی حد تک ہوگا۔ املا میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی جیسے خوش/خش، خود/خد وغیرہ۔

(۷) غیر مسموع یا خاموش حروف (Silent) ہر زبان میں ہوتے ہیں۔ اردو میں بھی مستعار الفاظ میں کئی جگہ خام حروف آتے ہیں۔ تلفظ میں ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ جیسے خواب، خواہش، بالکل وغیرہ۔

اردو میں مستعار الفاظ کے تلفظ کا جو معیار قائم کیا گیا ہے اسے حرفِ آخر نہیں سمجھنا چاہیے۔ جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا زبان کا دھارا کسی بھی رخ بہہ سکتا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ امتداد زمانہ سے تلفظ زبان کے معیارات بدل جاتے ہیں ز صدیوں کی شکست و ریخت سے بنتی ہے پھرتے حالات کے تحت نئی شکل اختیار کرتی ہے۔ عہدِ متوسط کی انگریزی کے الفاظ US اور eyen جدید انگریزی میں Mouse اور eyes ہوجاتے ہیں۔ جرمن سے مستعار لفظ Fraidi انگریزی میں Friday بن ہے اسی طرح قدیم اردو کا تلک جدید اردو میں تک اور دکنی کا بھوت معیاری اردو میں بہت کی شکل اختیار کرلیا۔ اگر مستعار الفاظ تلفظ بھی بدل جائے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ویسے ہند آریائی زبانوں کے عہد بہ عہد ارتقا سے واقف شخص یہ بہ خوبی ہے کہ کس طرح پراکرت سے لے کر اپ بھرنش اور جدید ہند آریائی زبانوں کے طلوع تک اصوات میں کیسی تبدیلیاں ہوتی رہی اور ان تبدیلیوں سے آگے چل کر تلفظ میں کیسے فرق آیا ہے۔ اسی لیے اردو میں غیر زبانوں سے مستعار الفاظ کے تلفظ کے متذکرہ معیارات کو مستقل نہیں سمجھنا چاہیے۔

o●o

تصحیح

"سب رس" کے شمارہ نمبر ۵، مئی ۱۹۹۹ء میں افسانہ "سائبان" کے افسانہ نگار کا نام سجاد ظہیر چھپا تھا یہ افسانہ ــ نگار سجاد ظہیر کا لکھا ہوا ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔ (مدیر)

ارنسٹ ہوزر
ترجمہ: ڈاکٹر اختر سلطانہ

"اوراقِ ماضی سے ... پمپائی"

۱۹۰۰ سالہ قدیم ایک رومن شہر پمپائی کی زندگی کے قابلِ دید و رشک اور نادر نظارے اور فنونِ لطیفہ کے نایاب عنوانوں کے خزانے سے جو منجمد حالت میں ہیں آج بھی ناظر کو دعوتِ نظارہ دیتے اور غرقِ حیرت کرتے ہیں۔

پمپائی کے بارے میں تحقیق کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی خواب میں محوِ خرام ہو۔ یا ۷۹ء میں پہنچ گیا ہو۔ جب کہ وہاں "Vesuvius" نامی کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا تھا، فٹ اونچی راکھ تلے دبا ہوا یہ مقبرہ نما شہر ایسی حالت میں موجود ہے جیسے کسی لاش کو مسالہ لگا کر ہمیشہ کے لیے ممی کی صورت میں محفوظ کردیا گیا ہو۔ اس کی بالائی سطح پر گری ہوئی راکھ سخت ہوکر پاش شدہ پتھر کی صورت اختیار کرچکی ہے۔ آثار بتاتے ہیں کہ یہ شہر کبھی بہت خوب صورت اور دل کش رہا ہوگا۔ ۱۰۰۰ سال تک، فٹ زمین کے نیچے وہ کس طرح جوں کی توں حالت میں نظروں سے اوجھل، محفوظ اور باقی رہا اس تعلق سے کچھ کہنا آسان نہیں۔ کیوں کہ ٹیبل پر لگا ہوا کھانا صرف آدھا ہی کھایا گیا تھا۔ ڈش میں رکھے ہوئے انڈے چھیلے نہیں گئے تھے۔ نان بائی کی دکان کے تندور میں رکھے ہوئے نان نکالے نہیں گئے تھے۔ دوکان کے کاونٹر پر رکھی ہوئی ریزگاری اٹھائی نہیں گئی تھی۔

راکھ کے کیپسول میں ملفوف قدیم زمانے کے اس شہر کی کھدائی کے کام کا آغاز ۱۸۸۰ء میں شروع کیا گیا۔ جو آج تک جاری ہے اب تک اس کا 3/5 حصہ ہی منظرِ عام پر آسکا ہے۔ جس کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے گویا کہ یہ وہاں کی دیدہ زیب زندگی کی ایک ایسی کتاب ہو جس میں فنونِ لطیفہ کے ان مول خزانوں کو مجتمع کردیا گیا ہے۔ آج پمپائی اٹلی کا ایک مشہور و معروف سیاحتی مقام بن چکا ہے جس کو ۱۹۷۸ء میں تقریباً دو لاکھ سیاحوں نے دیکھا۔

یہ عجیب و غریب چھوٹا سا شہر جو روم سے صرف ۲۴۰ کلومیٹر کی دوری پر جنوب مشرقی سمت میں آبنائے نیپلز کے قریب واقع ہے اس کے جنوب میں ۱۰۲۷۰ میٹر پر وہ کوہ آتش فشاں آج بھی موجود ہے۔ قیاس کیا گیا ہے کہ جب یہ سانحہ وقوع پذیر ہوا۔ تب وہاں کی آبادی صرف 20,000 نفوس پر مشتمل ہوگی۔ لیمو اور سنترے کے درختوں کے جھنڈ اور دوسرے میوہ دار درختوں اور انگور کے باغات سے گھرا ہوا یہ شہر جو خوب صورت انداز میں ۲۶ ہیکٹر زمین پر پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت اس کے اطراف ایک قدیم دیوار بھی تھی۔ جس میں سات دروازے اور چودہ مینار تھے۔

آج اس شہر کو دیکھنے آنے والے سیاحوں کے لیے اندرون شہر جانے کے لیے صاف ستھرے راستے بنادیے گئے ہیں۔ جن کے

اطراف گھاس کی روشیں ہیں۔ ایک بڑی اہم شاہ راہ سے نکلتی ہوئی بے شمار گلیوں کا جال شریانوں کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مرکزی مقام پر موجودہ عمارتوں کی طرزِ تعمیر رومن عمارتوں کی طرح دائرہ نما ہے جس میں کھانے پینے کی ہوٹلیں اور شراب کی دکانیں رہی ہوں گی۔ ان کے علاوہ وہاں پُرشکوہ محلات اور شان دار حویلیاں بھی موجود ہیں جن کے عقبی حصوں میں پنجرے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں وحشی درندوں کو مقید رکھا جاتا ہوگا۔ ان سب چیزوں کو دیکھ کر قیاس کے گھوڑوں کو زیادہ دوڑانے کی ضرورت نہیں پڑتی اور اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس وقت وہاں زندگی کی سرگرمیاں کس انداز کی تھیں؟ قیمتی کپڑوں میں ملبوس امرا اور تاجر گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے ان راستوں سے گزرتے ہوں گے، جن کے گاڑی بان، ہٹو، بچو کی آوازیں لگاتے گھوڑوں کو ہانک کر آگے لے جاتے ہوں گے۔ شہر کے مرکزی چوک میں سیاست داں اور مقررین دھواں دھار تقریریں کرتے ہوں گے۔ جو شہری حقوق اور مذہبی فرائض کے موضوعات پر مبنی ہوتی ہوں گی۔ ایک دوسرے کو ڈھکیلتے خوانچے اور پھیری والے۔ میوے کے فروخت کنندگان اور غلام اور دوسرے تجارت پیشہ افراد اور عوام مختلف اشیا کی خرید و فروخت میں مصروف رہتے ہوں گے۔ خوش بو دار عطریات سے مہکتی ہوئی معزز خواتین پالکیوں اور ڈولیوں میں بیٹھ کر وہاں سے گزرتی ہوں گی۔ دیواروں پر تشہیر کے لیے پینٹ کی ہوئی تصاویر میں موجود تحریری عبارتوں کو آج بھی آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے۔ صاف ستھرا، جا بجا کارخانہ، حیات۔ اچھی شراب کے دل دادہ اور فنونِ لطیفہ کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے وہاں کے مکین۔ تجربہ کار مصنفین اور عدالتیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ وہاں اس قدیم زمانے میں موجود تھا۔۔۔۔

اس شہر میں تنگ راستوں کی فراوانی ہے جو چوک پر پہنچتے ہیں۔ یہیں بازار لگتا ہوگا۔ یہیں لوگ مقررین کی تقاریر سننے کے لیے جمع ہوتے ہوں گے۔ اسی مقام پر مال و اسباب خرید و فروخت کے لیے لایا جاتا ہوگا۔ تازہ پکڑی ہوئی مچھلیوں کا مول تول بھی یہیں ہوتا ہوگا۔ مچھیروں کے ہاتھوں میں مچھلیاں پکڑنے کی چھڑیاں ایسے دکھائی دیتی ہیں جیسے وہ عصائے شاہی تھامے کھڑے ہوں۔

اشیائے خورد و نوش کی مارکٹ میں جو دکانیں ہیں وہ تین طرف سے بند ہیں۔ مارکٹ جہاں بازار لگتا تھا۔ وہ وہاں کی مشہور و معروف ہستیوں کے مجسموں سے سجی ہوئی ہے۔ مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لیے ایک مندر بھی ہے جس میں دو طاقت ور دیوتا "اپولو" اور "جوپیٹر" کے مجسمے موجود ملتے ہیں۔ یہاں سے آگے بڑھتے ہیں تو ایک عمارت ملتی ہے جو پمپائی میں اب تک جو عمارتیں ملی ہیں ان میں یہ سب سے بڑی اور شان دار عمارت کہی جاسکتی ہے جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عدالت ہوگی۔ اس میں داخل ہوں تو کسی گرجا گھر کے ہال کے مانند ایک وسیع و عریض ہال ملتا ہے۔ جہاں مقدمات دائر کرنے والے آتے ہوں گے۔ اس عمارت سے ملحق ایک اور ہال بھی ہے جہاں اناج کی مارکٹ ہوگی اس سے متصل دو عمارتیں ہیں جو غلے کے گوداموں کی طرح مستعمل ہوتی ہوں گی۔ کپڑے کے بیوپاریوں کے لیے ایک اور ہال موجود ہے جہاں ہم پیشہ تاجر جمع ہوتے ہوں گے۔ ایک اور ہال بھی ہے جس کے بارے میں قیاس کیا گیا ہے کہ وہ رائے شماری کے لیے ہوگا۔ اس طرح اس رفیع الشان شہر کے مرکزی مقام پر ہر شعبہ، حیات کے لیے مناسب اور موزوں ہال مختص شدہ موجود تھے۔

پمپائی ایک چھوٹا سا لیکن ترقی یافتہ شہر تھا۔ جسے دیکھ کر آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ۶۰۰ بی سی۔ کا کوئی شہر ہوگا۔ روم کے زیرِ اثر یہ ۸۰ بی سی۔ میں آیا۔ جس کے نشانات موجود ہیں جو رومن فوجوں نے اس کی دیواروں پر محاصرے کے بعد ثبت کیے تھے۔

کبھی یہ خطہ زمین امرا کے لیے کھیل کا میدان تھا اس وقت روم کے امیر ترین افراد ابنائے نیپلز کے سمندری کناروں پر تعمیر شدہ عالی شان مکانات میں فرصت کے اوقات بسر کرتے اور آرام لیتے تھے۔ پمپائی کی بنیاد ایک قدیم آتش فشاں کی سخت لاوے والی

میں پر رکھی گئی تھی۔ وہاں کے لوگ "VESURIUS" کے اندر آگ بھڑک رہی ہوگی یا تو اس بات کو بھول چکے تھے یا انھیں اس کا علم نہیں تھا۔ آتش فشاں کے ایک جانب کا علاقہ اس وقت سرسبز تھا۔ وہاں کاشت کی جاتی اور فصل اگانے کے لیے کھیت تیار کیے جاتے تھے۔ بادشاہ نیرو کے دورِ حکومت میں ایک بڑے زلزلے نے اس علاقے کو ہلا دیا تھا اور زیادہ نقصان ہوا تھا جس کے نقصانات پمپائی میں موجود ملے ہیں۔ لیکن جب بھی آتش فشاں کے پھٹنے کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے اور پمپائی میں دوبارہ تعمیراتی سرگرمیاں ۱۰ سال بعد تک بھی جاری رہیں اور ۲۴ / اگست ۷۹ء کو Vesurius پھٹ پڑا۔

اس آتش فشاں سے اٹھنے والے لاوے کے مزائلس نے پمپائی پر ہلہ بول دیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ یہاں کثیر تعداد میں اموات ہوئیں جلتے ہوئے لاوے کی گولہ باری۔ پھر راکھ کی بارش۔ ساتھ میں جلتے ہوئے لاوے کا سیلاب جس نے قیامت کی سی تباہی مچادی۔ دن کی روشنی غائب ہوگئی اور بخارات کے دھوئیں نے جو آتش فشاں سے نکلا تھا۔ اس شہر کی ہموار زمین کو اپنی راکھ سے ڈھک دیا۔ جب بارش ہوئی ہوگی تو وہاں کی زمین کی بالائی سطح پاش پاش شدہ پتھر کی طرح چکنی اور سخت ہوگئی۔ اس قیامت صغریٰ کی صحیح تصویر ایک چشم دید گواہ نے اتاری ہے۔ جو ہم تک اس کے لکھے ہوئے دو خطوط کے ذریعے پہنچی۔ ایک سترہ سالہ طالب علم جس کا نام PLINY تھا۔ اس نے یہ خطوط "Tucitus" نامی مورخ کو لکھے تھے۔ PLINY اپنے چچا کے ساتھ Masenum میں رہتا تھا جو بڑا ہو کر ایک ماہر حیوانات اور نباتات کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ آب نائے کے اس پار سے اس نے پمپائی کی قیامت خیز تباہی اور Vesurius کی غضب ناکی کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ غیر معمولی سائز کے بادل جو شکل میں شمشاد کے درخت یا چھتری سے مشابہ تھے حدِ نظر تک پھیل گئے اور بہت زیادہ بھڑکتی ہوئی آگ آتش فشاں سے نکلنے لگی۔ جس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرنے والی تھی پھر سیاہ دھوئیں کے سبب تاریکی چھا گئی۔ کافی عرصے تک اطراف و اکناف میں زلزلے کے جھٹکوں کے سبب زمین اور گھروں کی دیواریں ہلا کرتیں اور چھتیں ڈگمگاتی رہتی تھیں اس کے بیان کے مطابق وہاں کے لوگ جب زلزلے کے جھٹکے محسوس کرتے تب گھروں سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ کیوں کہ آتش فشاں سے نکلتے ہوئے گرم ریزوں کی بوچھار نیچے گرتی رہتی تھی۔

یہاں کے ۲۰۰۰ باشندے جو باہر نہیں نکل سکے تھے کرشماتی طور پر ان کی قبریں وہیں بن گئیں۔ ان کے جسم جو لاوے سے ڈھک گئے تھے اندر سے کھوکھلے ہوکر سخت ہوچکے ہیں۔ ان کے مجسموں کو دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پلاسٹر کی طرح لاوا ان پر انڈیلا گیا ہو۔ اور ان کی ہڈیاں ٹھوس خول کے سانچوں میں بند کردی گئی ہوں۔

ماہرینِ آثار قدیمہ نے ان ٹھوس مجسموں کی بالائی سطح سے منجمد شدہ راکھ کے ریزوں کو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ کئی افراد کے ڈھانچے جہاں وہ گرے تھے وہیں پڑے ہوئے ملے۔ انھوں نے اپنے چہروں کو اپنے ہاتھوں سے چھپا رکھا تھا۔ ایک ماں اپنی بچی کو مضبوطی سے لپٹائے ہوئے اسٹیچو کی شکل میں موجود ہے ایک فقیر ہاتھ میں تھیلی نما پرس پکڑے ہوئے ہے جس میں چھوٹے سکے بھرے ہوئے ہیں۔ ایک گھر کے باہر زنجیر سے بندھا ہوا نگرانی کرنے والا کتا بے بسی اور قابلِ رحم حالت میں مجسمے میں تبدیل ہوچکا ہے۔ یہاں کئی ایسے منجمد حالت مجسم ہوگئے ہیں جو اپنی کہانی آپ سناتے ہیں۔ بیشتر مضطرب اور پریشان افراد نے باہر نکلنے اور زندگی بچانے کی آخری کوشش اور امید میں اپنے گھروں میں سوراخ بنائے تھے لیکن لاوے کی زد میں آکر بہت سی آتش فشانی راکھ کے نیچے دب کر رہ گئے۔

[illegible] امرا اور دولت مند اصحاب کے شان دار محلات اور حویلیاں جو اس زمانے کی خوش حالی کی مظہر ہیں اصلی حالت

[illegible] ان کی زندگیوں کے درخشاں واضح نقوش نمایاں انداز میں سامنے آجاتے ہیں۔ اس گرم علاقے میں [illegible] بنایا تھا اور وہ کس انداز کی کدام وہ زندگی بسر کرتے تھے ان کے گھروں کو دیکھ کر اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ پمپائی کے کسی خاص گھر میں داخل ہوں تو اندرونی جانب پہلے برساتی اور برآمدے پھر دالان جو تیسرے پر ایک وسیع ہال کا۔ جس کی چھت دس فٹ بلند ہوگی اس ہال کی چھت کے درمیان میں ایک مستطیل کھلا حصہ ہوگا جس کے بالکل نیچے سنگ مرمر کا ایک حوض ہوگا تاکہ بارش کا پانی اس میں گر سکے۔ اس ہال کے چاروں جانب بڑے بڑے کمرے ہوں گے یہ طور آخر مہمان خانوں کے استعمال میں آتے ہوں گے جو خاص طور سے ملاقاتیوں اور گاہکوں کو ٹھہرانے اور خوش آمدید کہنے کے لیے مختص ہوں۔ زیبائشی کمرے اور خواب گاہیں گھر کے عقب میں ہوتی تھیں جو فرنیچر اور پردوں سے آراستہ کی ہیں کھلی گھر کے پچھلے حصے کو یہ عمارت سے ... نے والی ایک غلام گردش ہوتی جو اندرونی عمارت سے ہوتی ہوئی صحن میں جا کھلتی۔ صحن میں خوش بودار پھولوں، پودے اور سایہ دار درخت ایک قطار میں لگے جاتے تھے۔ یہاں کے کچھ گھروں میں اندرونی صحنوں کی چمن بندی بالکل قدیم انداز دوبارہ کی گئی ہے۔ ستونوں کی قطاروں پر مشدے کی طرح گلاب کی بیلیں چڑھائی گئی ہیں۔ چیری، لیمو، اسٹرابیریز کے پودے جو وہاں موجود تھے پھر لگا دیے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پمپائی کی حویلیاں پرشکوہ اور عالی شان ہیں۔ لیکن یہاں کی جس چیز پر فخر طور پر ناز کیا جا سکتا ہے اور اس پر نازاں ہوا جا سکتا ہے۔ وہ ہے وہاں کا آرٹ Bronze اور سنگ مرمر کے مجسمے جو کھدائی میں نکالے گئے ہیں وہ فن سنگ تراشی کے نادر، نایاب اور بے مثال نمونے کہے جا سکتے ہیں اور ابھی بہت سے صناعی کے شاہ کار اور آرٹ کے نمونے وہاں موجود ہوں گے۔ جن تک ابھی پہنچا نہیں جا سکا ہے۔ ڈیڑھ میٹر اونچا "اپولو دیوتا" کا ایک شان دار اسٹیچو جسے سال میں نکالا گیا۔ وہاں کے ایک مشہور سیاست داں Julius Polibus کی رہائش گاہ سے برآمد ہوا جو پہلے ایک غلام تھا۔

اٹھارویں صدی میں دریافت شدہ پمپائی کی دیواری پینٹنگس جب منظر عام پر آئیں تو فنونِ لطیفہ کی دنیا کے فن کار ان کو دیکھ کر متحیر رہ گئے پمپائی کی تصویروں میں استعمال شدہ سرخ رنگ بے مثال اور لاجواب ہے۔ قیاس ہے کہ اس میں چمک اور تابانی پیدا کرنے کے لیے موم ملایا گیا ہوگا۔ تصویروں میں سرخ رنگ کا استعمال ان گوشوں میں کیا گیا ہے جہاں روشنی کم تھی تاکہ وہاں کی تاریکی کو کم کیا جا سکے۔

پمپائی میں موجود اکثر عظیم شاہ کار یونان کے قدیم ابتدائی نمونوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ وہاں کا پسندیدہ موضوع "گریکو رومن آرٹ" ہے جو دیومالا اور اساطیر پر مبنی ہے۔ نیلگوں، بھورے اور خاکستری رنگ جو عموماً قدیم مصوری کے نمونوں میں استعمال شدہ ملتے ہیں۔ یہاں کی تصویروں میں یہ رنگ موجود نہیں ہیں Andromeda کی تصویر جسے پمپائی کے آرٹ کا ایک بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ اس تصویر میں سمندر کے پانی کو چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے دکھایا گیا ہے جس کی حفاظت اور نگرانی ایک اژدہا کر رہا ہے۔ ۱۰۰ میٹر اور ۲۰۰ میٹر کی دیوار پر بنی موزیک سے بنی سکندرِ اعظم کی ایک پرشکوہ تصویر بھی وہاں موجود ہے جس پر ایرانی آرٹ کی چھاپ نمایاں ہے یہ ۱۰۰ لاکھ سے زیادہ رنگین گلاس اور سنگ مرمر کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہے یہ [illegible] منگوائے گئے تھے آرٹ کا یہ شاندار نمونہ ایک دولت مند امیر کے گھر کی تزئین کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

پہلی صدی عیسوی کا زمانہ پمپائی کے عروج کا زمانہ تھا۔ جہاں دولت مند زمین دار اور مال دار تاجر رہائش پذیر تھے۔ جو گیہوں، شراب، میوہ جات اور زیتون کے تیل کے کاروبار میں مصروف تھے۔ [illegible] SANYO [illegible]

یاد تھا۔ حسب ادبی " جیتا جاگتا۔

پانچ تجارتی مرکز میں تبدیل ہو چکا تھا۔ "Profit is Joy" یہ الفاظ کسی نے ایک دیوار پر کندہ کیے تھے جو اب تک موجود ہیں۔

لیمپس، جاگلس، دو وسطی والے یونانی طرز کے کپڑے یہاں کے مقامی کارخانوں میں بنتے تھے۔ وہاں کے تاجر بڑے مال دار تھے اور خوش حال زندگی بسر کرتے تھے ایک سرجن کے گھر سے قیمتی قیمت آلات جراحی دست یاب ہوئے ہیں۔

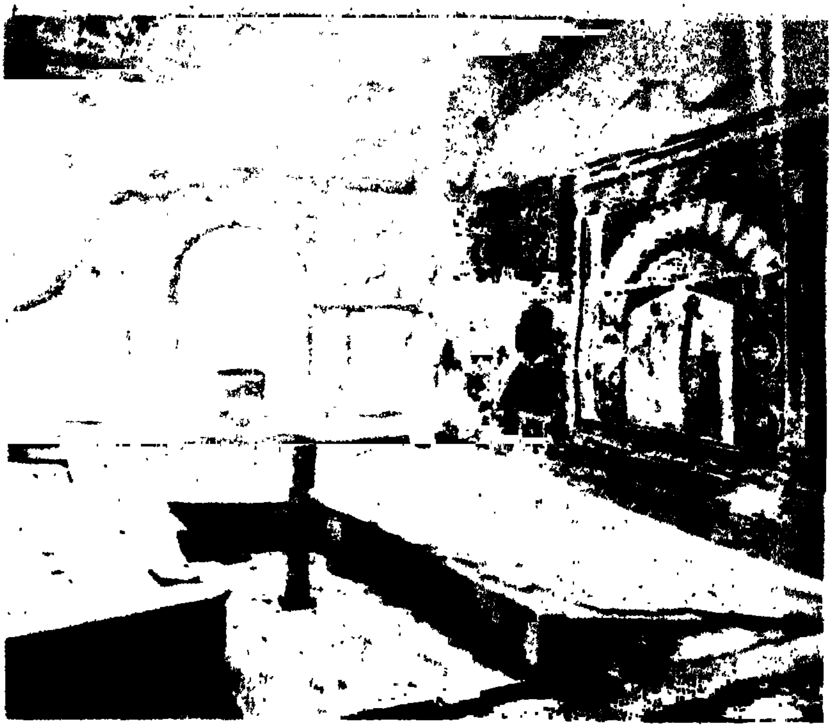
کرایہ کے لیے گھنٹوں سے چلنے والی گاڑیاں شہر کے پھاٹکوں پر موجود رہتی تھیں۔ قہوہ خانوں میں پیشہ ور جوہری جیسے خانوں میں پالے رکھے ہوئے ملے ہیں۔ شراب خانوں کے کاؤنٹر "L Shape" کے بنائے جاتے تھے جہاں سے گرم اور سرد مشروبات فراہم کی جاتی تھیں گاہکوں کی معلومات کے لیے لکھی گئی قیمتوں کی فہرستیں۔ دیواروں پر کاریاں اور چسپاں شدہ کیں گی دیکھی جاسکتی ہیں۔

وہاں ہر قسم کا ذوق اور مزاج رکھنے والے افراد کے لیے تفریح، دل چسپی اور دل بستگی کے سامان موجود تھے دو بند تھیٹر اور ایک اوپن ایر تھیٹر جہاں ڈرامے اسٹیج کیے جاتے ہوں گے اور ایک خاص ہال جہاں میکری، شاعری اور موسیقی کی محفلیں آراستہ ہوتی ہوں گی۔ وہاں ایک چھوٹا سا میدان بھی ہے جو بطور دنگل کے استعمال ہوا ہوگا۔ جس کے اطراف بنی ہوئی دیواروں کی طرز تعمیر بالکل کسی اسٹیڈیم سے مشابہ ہے وہاں تقریباً بیس ہزار 20,000 افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ یہ اسٹیڈیم خونی دنگلوں اور پیشہ ور جنگ جو افراد اور جان بازوں کی لڑائیوں کے لیے مخصوص ہوگا۔ یہیں سے عمدہ قسم کے خود اور تلواریں دست یاب ہوئی ہیں۔ یہیں بہادر فتح یاب جان بازوں، دلوں کو تسخیر کرنے والے ہیروز اور Caladus کے نام دیواروں پر کندہ کیے ہوئے ملے ہیں۔

پمپائی عیسیٰ کے بعد نصف صدی تک موجود تھا۔ لیکن موت، مذہبی عقیدوں پر غیر اہل کتاب خداؤں کی عمل داری تھی۔ پمپائی میں خاص طور سے نرم و نازک وینس (VENUS) کو پوجا جاتا تھا کہ عظیم الوہی طاقت اور فنائی حفاظت کرنے والی ماں کی سی حیثیت حاصل تھی۔ حالاں کہ وہاں ۲۸ قحبہ خانے موجود تھے۔ قدیم دیوی دیوتاؤں کا رواج ختم ہو رہا تھا لیکن پمپائی کے باشندوں نے "وینس" کے لیے خاص طور سے ایک اور عظیم الشان اور بہترین مندر تعمیر کرنا شروع کر دیا تھا۔ جس کے لیے کثیر تعداد میں پتھر گلیوں میں جمع کر دیے گئے تھے۔ لیکن آتش فشاں کی پھیلائی ہوئی تباہی نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔

مصر میں پوجی جانے والی ایک دیوی "ISIS" جو بادبری کی دیوی خیال کی جاتی تھی۔ پمپائی میں وہ بھی پوجی جاتی تھی۔ Vesurius آتش فشاں "ISIS" کے مندر کے پجاری پر دوپہر کے کھانے کے وقت حملہ آور ہوا۔ اس کے کھانے کے لیے رکھے ہوئے انڈے اور مچھلی میز پر رکھے رہ گئے۔ شاید وہ تنہا بیٹھے اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا اور باہر نکلنے سے پہلے اس نے مندر کے خزانے سے سونے کے سکوں سے ایک بیگ بھر لیا تھا لیکن وہ باہر نہیں نکل سکا اور وہیں گر گیا۔ اصل میں گرا کہیں کر آگے جانے کا راستہ ایک ستون کر گرنے سے مسدود ہو چکا تھا جس کے نیچے دب کر وہ اور لوگ بھی کچلے گئے تھے۔

پمپائی سے کے ویران شہر سے رخصت ہو کر میں "VESURIUS" کو دیکھنے کے لیے چل پڑا۔ پمپائی سے نکلنے والی سڑک جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے اوپر کی چوٹی تک جانے والے راستے کا فاصلہ تقریباً گھنٹے سے بھی کم میں طے ہو جاتا ہے۔ وہاں [illegible] کے کوئی [illegible] نہیں تھے۔ جہاں سے [illegible] پر کر گئے تھا وہ مقام کسی ویران سا تھا۔ یہاں کی زمین [illegible] ہو چکی ہے کہیں جس کے چٹانوں کے قریب [illegible] والی خاموشی سے [illegible] سا کھڑا ہوں نیچے ۲۰۰ میٹر کی گہری [illegible] میں [illegible] کے دہانے میں [illegible] افسردگی سی طاری ہے (چھ سو) ۶۰۰ میٹر کی عمودی پر [illegible] رنگ کی ڈھلوان چٹانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا گیا ہے جہاں سفید دھواں گہری



Bath in the beautiful House of Neptune and Amphitrite, showing the well-preserved vitreous mosaics on the wall and (right) a fine mural





Dangerously near to Vesuvius, Herculaneum and Pompeii were doomed to destruction



One of the oldest buildings in Herculaneum, the Samnite House, built towards the end of the second century B.C.

مگر میں لپٹی ہوئی کہیں [illegible] ہوئے ہیں کہ [illegible] کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہاں [illegible] گا۔

میرے دائیں کے راستے پر [illegible] کی [illegible] ہے جسے [illegible] FERDINAND-II نے جو سسلی کا رہنے والا تھا ۱۸۴۳ء میں بنوایا تھا۔ یہ آتش فشاں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والی سب سے قدیم آبزرویٹری ہے۔ سائنس دانوں کے بیان کے مطابق ہر آتش فشاں ایک نالی سی ہوتی ہے جس [illegible] باہر نکلتا ہے اس آتش فشاں کے [illegible] کے بعد تین سو سالوں تک اوسطاً ہر بارہ سال بعد اس سے لاوا نکلتا رہا۔ لیکن کافی عرصے سے [illegible] کا پہاڑ غیر معمولی طور پر اسرارانہ انداز سے خاموش ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس کا دہانہ بند ہو چکا ہے۔ ہم خطرے سے کس حد تک قریب ہیں۔۔۔؟ اس بارے میں سوائے کاندھوں کو اچکا کر حرکت دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ واپس لوٹتے ہوئے میں نیپلز کی [illegible] شاہراہ کو دیکھ رہا ہوں جس کی ایک جانب لاوے کی دیوار استادہ ہے اور دوسری طرف بڑے بڑے بالاخانے ہیں۔ میں اپنے خیالات میں گم یہ سوچ رہا ہوں کہ موت۔۔۔ موت۔۔۔ جو کہیں سے بھی۔۔۔ کبھی بھی آسکتی ہے جس نے اس بسے بسائے آباد و دل کش شہر کو آن کی آن میں قبرستان میں تبدیل کر دیا تھا۔ کیا یہ [illegible]۔۔۔

یہ آتش فشاں کے دہانے پر مطمئن انداز سے سکونت پذیر تھے جب کہ ان کی زندگیاں داؤں پر لگی ہوئی تھیں۔ پمپائی کے ان [illegible] مکینوں نے شاید یہ شرط لگائی تھی کہ وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے اور وہ جیت گئے۔ (یہ فسردہ عبرت ناک شہر جو کبھی ایک خوب صورت شہر تھا آج وہ داستانی کہانیوں کا سحر زدہ شہر دکھائی دیتا ہے، جیسے وہاں کے رہنے والوں کو کسی نے سحر کے ذریعے سنگی بتوں میں تبدیل کر دیا ہو۔ انھیں اب قیامت تک کوئی نہیں جگا سکتا۔ موت کے خوف کے باوجود فنونِ لطیفہ کے شائق اور سیاح آتے رہیں گے ان ہی سے یہ آباد رہے گا۔۔۔

○●○

(سلسلہ ص: ۸۸ سے)

منصور دم سادھے بیٹھا تھا۔ بیگم قیصر کی آنکھوں میں خدشات کی پرچھائیاں منڈلا رہی تھیں۔

"میری خواہش ہے کہ منصور کو آپ اپنا بیٹا بنالیں" قیصر رحمان کی آواز میں لرزش سی آگئی۔

"جی۔"

"بنالیجیے نا [illegible] منصور کو۔" قیصر رحمان کے لہجے میں التجا تھی۔

[illegible] بہت جلدی کر رہا تھا۔

[illegible] کے بعد بیگم قیصر تھوڑا سا مسکرائیں۔

"اچھی بات ہے۔۔۔ سوچ کر جواب دوں گی۔"

حیرت کے مارے [illegible] تو منصور نے کھل کر ماں کو دیکھا۔ ان کا چہرہ دمک رہا تھا اور وہ اب بھی تجسس کے ساتھ قیصر رحمان کو دیکھ رہی تھیں اور پھر بیگم قیصر رحمان کے ذہن کے جنگل میں بے شمار جگنو جگ مگ کرنے لگے تھے۔ [illegible] منصور چابی والی موٹر کو دوڑتا ہوا دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجا رہا ہے۔

○●○

ثمینہ راجہ

منتخب کلام

نعت

☆

متصل تو نہیں، ہوتی ہے عطا مجھ پر بھی
بابِ حیرت کبھی ہوجاتا ہے وا مجھ پر بھی

میرے آقا کے وسیلے سے ملا جو بھی ملا
عقدۂ دل جو نہ کھلتا تھا کھلا مجھ پر بھی

معتکف غارِ حرا کے غمِ ہستی میں جو ہوں
شاید اترے گا کوئی حرفِ وفا مجھ پر بھی

دشمن اک دوسرے کے میرے مہاجر انصار
تنگ ہونے لگا اب ملکِ خدا مجھ پر بھی

روزِ محشر جو شفاعت کے لیے آئیں گے آپ
سب پہ رحمت کی نظر ڈالیں گے، کیا مجھ پر بھی؟

○●○

نظم

○

اتر آ طورِ سینا سے زمیں پر
آ کے ہم سے مل
زمستاں اور خزاں کی آہٹیں ہیں موت سی چپ میں
پہاڑوں پر درختوں میں کوئی آسیب ہے
بارات اتری ہے
ہمارے برف زادوں کے کٹوروں میں
تو اپنی آگ کی خیرات دے
بھیگی ترائی میں سنہری دھوپ بن کر پھیل
وادی میں بنفشی پھول بن کر کھل
کسی سنسان رستے پر اچانک
سامنا ہونے کی حیرت دے
وہ جس کی برکتوں سے رزق زائد ہو
ہمارے جھونپڑے میں رات بھر کو وہ مسافر بن
ہماری ہمسیوں کا نور، زخمِ دل کا مرہم بن
ہمارے دشمنوں سے اب حذر کر
ہم میں ہو شامل

یہ حیرت گاہِ دنیا

○

یہ حیرت گاہِ دنیا ہے
بسر مت خواب میں کرنا
مسلسل جاگتے رہنا، اگر اس جا پہ رہنا ہے
یہ ممکن ہے کہ بس اک آن میں منظر بدل جائے
یہ ممکن ہے کسی کھائی پہ چل
یک لخت رستہ ختم ہو جائے
کبھی دریا پہ پہنچو اور کنارہ ختم ہو جائے
یہ ممکن ہے کبھی دیکھو
انھیں قدموں میں بیٹھے کچھ سراپا ناز لوگوں کو
کبھی دیکھو قبائے دوستی میں سب زمانہ ساز لوگوں کو
تھی جن سے حرفِ خوش کی آس، ان ہونٹوں پہ طعنہ ہو
وہ جن میں پھول ممکن تھے
انھیں ہاتھوں میں دشنہ ہو
بہت ہشیار رہنا ہے
یہ حیرت گاہِ دنیا ہے

ایلی ایلی لما سبقتنی

○

دل مرا خون ہوا
اور مرا تن خاک ہوا
پیرہن ذات کا بوسیدہ ہوا چاک ہوا
شہرِ جاں مثلِ کراچی سوزاں
لرزاں وترساں وگریاں ، ویراں
شام اترتی ہے تو اندھیارے سے ہول آتا ہے
اک دعا چاروں طرف گونجتی ہے
"لوٹ کر خیر سے گھر کو آئیں
وہ گل اندام وہ مہ رو میرے
آنکھ کے موتی جگر کے ٹکڑے"
رات آتی ہے تو دل ڈوبتا ہے
میرے اطراف میں اک وہم کا خونی سایہ
خونی ہتیار لیے گھومتا ہے
بند میں جائے پنہ ملتی نہیں
کسی منزل کی طرف رختِ سفر باندھنا کیسا
کوئی رہ ملتی نہیں
شہر یارانِ جدالِ کمی و بیشی میں گم
اور نادیدہ عدو
سازشِ پیہم میں مگن)
نہیں معلوم مرا کون سا دوست
صبح کی بانگ سے پہلے مرا شکار کرے
کس اندھیرے میں کہاں ، کوئی غنیم
گھیر کر وار کرے۔
نہیں معلوم کہاں تک مجھے خود اپنی صلیب
اپنے کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے اب چلنا ہے
نہیں معلوم مگر پاؤں مرے کانپتے ہیں
دل مرا ڈوبتا ہے
اک صدا ہونٹوں پہ سسکی کی طرح آتی ہے
"اے خدا میرے خدا
تونے بھلا
کیوں مجھے تنہا چھوڑا"

○●○

میرے دل میں

○

میرے دل میں اک جنگل ہے
جس کا ہر موسم گہرے رنگوں سے بنا ہے
اک دن میں نے اس جنگل پر
تیز برستا بادل دیکھا
اب بارش کے بعد کی خاموشی میں لپٹی
شدہ اداسی
میرے اندر ڈیرے ڈالے بیٹھی ہے

○●○

نئے دن سے معذرت

صبح کی پہلی سفیر
ایک کرن میرے دریچے سے لگی بیٹھی ہے
اور سرہانے کا ٹھنڈا جھونکا
مرے دروازے پہ پیغامِ سحر لایا ہے
چند لمحوں میں گلی شور سے بھر جائے گی
دودھ والے، کئی آوازیں لگاتے ہوئے پھیری والے
اور اسکول کو جاتے بچے
دفتروں کے لیے تیزی سے لپکتے ہوئے لوگ
گاڑیاں ہارن بجاتی ہوئی، دوڑاتی ہوئی گزریں گی
اور یہ دنیا بشاشت سے
نئے دن کے سواگت کے لیے نکلے گی
کوئی کانوں میں مرے کہتا ہے "اٹھ جاؤ بہت دیر ہوئی
رات بھر شہر میں اک جشن کا ہنگام رہا
اور نئی خواہشوں، امیدوں سے آئندہ کے
خیر مقدم کا چلن عام رہا
شہر والوں کو نئی صبح سے پیمانِ وفا باندھنا ہے
تم بھی اٹھ جاؤ کہ تم کو تو نئے سورج سے
اپنے حصے کا اجالا بھی ابھی مانگنا ہے"

ٹھیک ہے اب چاہیے اٹھ جانا مجھے
ہاں نئے سال کے پہلے دن کو
اپنا چہرہ بھی ہے دکھلانا مجھے
لیکن اس بیتی ہوئی رات کی تنہائی سے لپٹا
مرا دل ڈوبتا ہے
شدت گریہ سے سوجی ہوئی
یہ آنکھیں نہیں کھلتی ہیں

○●○

اس سال

میں نے سال کے پہلے دن پر
ایک اداس کہانی لکھی
اور اب اس کو ہوا کے ہاتھ میں دیتی ہوں
تاکہ وہ اس کو پڑھ لے
جس کے رونے کی باری ہے
اب مجھ کو اپنے کچھ آنسو دل کی مٹی میں بونے ہیں
اور راستے میں اک پودا نیا لگانا ہے
اور ایک شجر سے کہنا ہے "اب تو مجھ سے پیوستہ رہ"

اس سال میں دھوپ میں پوری آنکھیں کھولوں گی
اور اپنے لیے اک رنگ چنوں گی
پاؤں زمین پہ رکھوں گی اور آسمان کا
ایک کنارہ پہاڑ کے سر پر اوڑھوں گی
اس سال میں
میں اور مرا ستارہ ایک ہی گھر میں یکجا ہوں گے

○●○

تم کب میرے اپنے تھے

بادل !
تم کب میرے تھے
اک پل کی چھاؤں ہے تمھاری
اک پل کی برسات
من بھیگے تن جلتا جائے
تن بھیگے من راکھ
بادل اپنا زور نہیں کچھ
تم پر اور اس ہستی پر
جاؤ تم دریا پر برسو
مت برسو اس بستی پر
تم درویش کی چادر ہوتے
آدھی اوڑھی آدھی بچھائی
پھر بھی پوری
تم کشکول فقیر کا ہوتے
جس میں مانگنا اس میں کھانا
راضی رہنا
تم تو مگر کفن ہی نکلے
اک مفلس کا
پاؤں ڈھکو تو سر ننگا ہو
سر ڈھانپو تو پاؤں
عمروں جتنی لمبی دھوپ
اور بس اک پل کی چھاؤں

○●○

میں نے خود کو ترک کیا

میں نے اس کو ترک کیا ہے، جس کا دل پتھر جیسا تھا
میں نے دل پر ایک چٹان کا بوجھ سہا ہے
میں نے اس کو ترک کیا ہے، جس کی آنکھیں شیشے کی تھیں
میں نے سنورنا چھوڑ دیا ہے
میں نے اس کو ترک کیا ہے جس کی سانس میں آگ بھری تھی
میں نے جلتی دھوپ کا صحرا پار کیا ہے
میں نے اس کو ترک کیا ہے، جس پر نیند حرام ہوئی تھی ۔
میں نے خود پر خوابوں کا در بند کیا ہے
میں نے اس کو ترک کیا ہے، جس کو خوشیوں سے نفرت تھی
میں نے ہنسنا چھوڑ دیا ہے
میں نے اس کو ترک کیا ہے، جس کو اپنا تن پیارا تھا
میں نے سورج جیسے تن پر گہن لیا ہے
میں نے اس کو ترک کیا ہے، جس کے جسم میں میری روح تھی
میں نے جینا سیکھ لیا ہے

○●○

شب و روز

پھر اک کالا دن آیا
اور پچھلی رات بھی کالی تھی
دنیا اپنی دوزخ آنکھیں
پھاڑ کے مجھ کو تکتی تھی
بھلا برا جیسا سورج تھا
آخر اس کو ڈھلنا تھا
ناگوں کے اک جنگل میں
پھر ننگے پاؤں چلنا تھا

○●○

آسیب

دل پربت پر ہے
اور پاؤں ترائی میں
آنکھیں ساگر پر
نظریں گہرائی میں
ہنگامہ آرائی ہے
تنہائی میں
مدت سے میں اک آسیب اثر میں ہوں
دیواروں میں قید ہوں اور سفر میں ہوں

○●○

اشعار

○

میں تمھارے عکس کی آرزو میں بس آئنہ ہی بنی رہی
کبھی تم نہ سامنے آسکے، کبھی مجھ پہ گرد پڑی رہی

○

ہم اپنے آپ سے اس کے طفیل ملتے تھے
وہ جھٹپٹے کی اداسی کمال کرتی تھی

○

وہ جبر و اختیار کے موسم بھی خوب تھے
وہ شخص بھی عجیب تھا اور ہم بھی خوب تھے

○

یہ بھی اچھا ہی ہوا اب حوصلہ باقی نہیں
دیکھ سکتے تو نہ جانے اور کیا کیا دیکھتے

○

ان کے میرے دل کے بیچ میں اک خواہش کا فاصلہ ہے
اس کے گھر کی راہ میں لیکن سات سمندر آتے ہیں

○

ہم ایک دوسرے سے جب بچھڑ گئے تو یوں رہے
میں اپنے آپ سے الگ وہ اپنے آپ سے جدا

○

کیسے انھیں راستے میں چھوڑیں
برسوں سے جو ہم قدم رہے ہیں

○

o

میں سب سمتوں میں ایسے بتلا ہوں
کہ اک جانب سفر ممکن نہیں ہے

o

ہم اپنے ساتھ بھی کچھ دیر رہتے
یہ ممکن تھا مگر ممکن نہیں ہے

o

یاس نے بھی یہاں وہاں قبضہ جمالیا مگر
کوئی کوئی امید بھی دل میں کہیں کہیں رہی

o

ملے یا نہیں ، ہو خوشی کہ غم ، یہ تری رضا
کہ نہیں ہے حوصلہ اب تو ردّ و قبول کا

o

سرِ دشتِ شوقِ جدائی کا ، کوئی ہم سفر سے گلہ نہ تھا
کہ مرے سفر کی تو حد نہ تھی وہ مگر اسیرِ زمانہ تھا

o

تھی ایک عمر مگر دو دفعہ گزاری گئی
کہ ایک خواب میں رہ کر تو دوسری بے خواب

o

کوئی تو وجہ رہی ہوگی زردیِ رخ کی
یہ آنکھ سرخ اگر ہے کسی سبب سے ہے

o

اس لیے خواب سے آنکھوں کو نہ رکھیں خالی
رو کے ، یہ دل کے خزانے کو نہ کردیں خالی

o

وقتِ رخصت ترے آنسو تھے مرے آنچل میں
پھر ہوئی رات ہمیشہ رہی بھیگی ہوئی رات

o

چاند میں تجھ سی کوئی شکل نظر آتی ہے
اک ہنسی گونجتی ہے گھر کی بیابانی میں

o

جب جھک گیا ہے حسنِ مقابل کے سامنے
اب دہر کی بساط ہی کیا دل کے سامنے

o

یہ جو آنکھوں میں ہے اک خواب ذرا سا لے گی
زندگی مجھ سے بھلا اس کے سوا کیا لے گی

o

کچھ تو پامال کیا تیری تمنا نے سکوں
اور جو باقی ہے اسے خواہشِ دنیا لے گی

o

کبھی کبھی کوئی تعبیر یوں پکارتی ہے
کہ خواب دیکھنے والے بھی جاگ اٹھتے ہیں

o

ہر ایک آنکھ کو لاکھوں ہی خواب سونپ دیے
ہمارے عہد کو کس نے عذاب سونپ دیے

o

یہ بے وفائی نہیں وقت کا ستم ہے کہ تو
بچھڑ گیا تو ترا انتظار بھی نہ رہا

o

گھر کی ویرانی سے کب ہم کو پریشانی ہوئی
آنکھ تب چھلکی جب اس دل میں بھی ویرانی ہوئی

o●o

افتخار نسیم

خزاں کے پہلے دن کی شام کی اداسی

o

اب کے برس خزاں کچھ ایسے ٹوٹ کے آئی
کہ پتّے
پیلے ہونے سے پہلے ہی گر گئے
برہنہ درخت ایسے شرمندہ
زمین پہ نظریں گاڑے کھڑے ہیں
جیسے ہارنے والی قوم کی
ننگی عورتیں
اپنے فاتح کے سامنے کھڑی ہوں
درختوں کی برہنگی چھپانے کے لیے
برف بھی نہیں گری
ہجرت کرنے والے پرندے
قطاریں بنا کر ہمارے شہروں پر سے گزر رہے ہیں
بچپن میں ریڈیو کا ڈائل گھماتے ہوئے
کبھی کبھی شارٹ ویو پر
نادیدہ لوگوں کی گفتگو سن کر
میں کتنا خوش ہوتا تھا
اب تو لگتا ہے ساری دنیا دیکھ لی ہے
کوئی بھی اجنبی نہیں رہا
سب باتیں ایک سی ہیں
کسی میں کوئی اسرار نہیں ہے
میں کس ٹوئیلایٹ زون میں ہوں
کہ سب کچھ ہو رہا ہے
اور کچھ بھی نہیں ہوتا
کیا عمر اس تجارت کا نام ہے
جہاں سینت سینت کر رکھی ہوئی خوشیاں
اور یادیں
گزرے وقت کے سکوں کی طرح
بے قیمت ہو جاتی ہیں
اور ہم اس رقاص کی طرح ہو جاتے ہیں
جسے تمام رس، نرت، بھاؤ اور توڑے آتے ہیں
لیکن اسٹیمنا نہیں رہتا
بدن کے آتش دان میں اب صرف
ہڈیاں سلگ رہی ہیں
اس سے چمنوں پر پڑی ہوئی برف
نہیں پگھلنے والی
آؤ خزاں کے پہلے دن ان لوگوں کو یاد کریں
جن کے نام اور شکلیں بھی یاد نہیں

ooo

افتخار نسیم

سانپ سے مکالمہ

○

رات، اندھیرے میں، میں نے سانپ پر پاؤں رکھ دیا
سانپ مجھ سے ناراض ہو گیا
میں نے بڑی منت سماجت کی
"چھوڑو بابا میں انسان ہوں اندھیرے میں دیکھ نہیں سکتا"
سانپ نے بے رخی سے جواب دیا
"تم انسانوں کی آنکھیں غلط جگہ پر لگی ہوئی ہیں
انھیں تمھارے پاؤں کے انگوٹھوں پر ہونا چاہیے
تاکہ تم رینگتی ہوئی چیزوں کو دیکھ سکو
تم سے بہتر تو "اگوانا" ہے جو ہر طرف دیکھ سکتا ہے"
انسان اشرف المخلوقات ہیں اس کی توہین کیسے برداشت کر سکتا تھا
"تو تم اپنی ٹانگیں جسم کے اندر کیوں کیے ہوئے ہو
انھیں باہر نکالو اور رینگنے کی بجائے چلو"
سانپ نے متانت سے جواب دیا
"جب تم پیدا ہوتے ہو تو ہماری طرح رینگتے ہو
تھوڑے سے بڑے ہوجاتے ہو تو اگوانا کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں پر چلتے ہو
اور بڑے ہوجاتے ہو تو ریچھ کی طرح اپنے دو پاؤں پر چلنے لگتے ہو
اس وقت تم یہ بھول جاتے ہو کہ کبھی تم بھی رینگتے تھے۔"
اور پھر بل میں گھس گیا۔
یہ میری اس کی آخری ملاقات تھی

○○○

عطیہ ارسلان

نظم

○

سنا اور پڑھا ہے
کہ ہم
غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے
ہم کو آزاد کرانے
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
جو کبھی شیر و شکر تھے
پیوست رگِ جاں تھے
جن کی محبتیں اٹوٹ تھیں
اپنا لہو بہایا
اور شہید ہوئے
غلامی سے رہائی ملی
نیا سورج آزادی لیے طلوع ہوا
تو منظر یوں بدلا
جو کبھی شیر و شکر تھے
ایک دوسرے سے ٹوٹ کر بکھر گئے
ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے
اور یہاں پر نفرتوں کی دیواریں کھڑی ہو گئیں
ایک دوسرے سے باہم ہونے کے لیے
کیا گردن میں پھر غلامی کا طوق ڈالنا پڑے گا۔

○○○

افتخار نسیم

○

مجھ سے آزاد بھی نہیں کرتا
اور ناشاد بھی نہیں کرتا

میں اسے بھول بھی نہیں سکتا
وہ مجھے یاد بھی نہیں کرتا

شہرِ مفتوح ہوں مرا فاتح
مجھ کو برباد بھی نہیں کرتا

قفلِ دل کھول دے کچھ ایسا طلسم
وقت ایجاد بھی نہیں کرتا

پہلے دل احتجاج کرتا تھا
اب تو فریاد بھی نہیں کرتا

جیسی تنقید اس نے کی ہے نسیم
ایسی نقاد بھی نہیں کرسکتا

○●○

○

گھر بسا کر چھوڑ دینا کتنا مشکل ہوگیا
رفتہ رفتہ میں بھی اوروں جیسا بزدل ہوگیا

اینٹ کی دیوار چنوا دی تھی آتش دان پر
بند کرنے میں کہاں سے خوف داخل ہوگیا

آنکھ پتھراتی گئی ان رت جگوں کے درمیاں
دل کبھی آتش فشاں تھا برف کی سِل ہوگیا

سن کے لوگوں سے کبھی جن کا اڑایا تھا مذاق
دیکھ کر دنیا میں ان باتوں کا قائل ہوگیا

اس قدر چھایا ہے وہ میرے رگ و پے میں نسیم
کرنا چاہا اور ۔ نمبر اس کا ڈائل ہوگیا

○●○

عزم بہزاد

○

ہیں نے چپ کے اندھیرے میں خود کو رکھا اک فضا کے لیے
بڑہ۔۔ ذات میں روشنی لانے والی دعا کے لیے

بے صدا ساعتوں میں سماعت کی رفتار رکھنے کو تھی
یک آہٹ نے مجھ سے کہا جاگ جاؤ خدا کے لیے

یک دشمن نظر میری نرمی پہ ایمان لانے کو ہے
ہں عجب انتہا پر کھڑا ہوں کسی ابتدا کے لیے

دئی خوش قامتی آئینے کے مقابل سنبھلتی ہوئی
دئی تدبیرِ نظارہ سمٹی ہوئی اک ادا کے لیے

یک حیرت سے لپٹی ہوئی اک سبک دوشیِ پیرہن
مضطرب ہے اچانک بکھر جانے والی حیا کے لیے

ک سفر حوصلے اور خواہش کی تصدیق کرتا ہوا
یک رستے میں معدوم ہوتے ہوئے نقشِ پا کے لیے

یری آنکھیں اور ان میں چمکتے ہوئے مستقل فیصلے
لگاتے رہیں گے یوں ہی آنے والی ہوا کے لیے

ں سے پہلے کہ منزل اندھیروں میں تبدیل ہونے لگے
لے ہے کو رہنما۔ چھوڑ لے رہنما کے لیے

سمتِ آسماں صبحِ پرواز کا کوئی مژدہ سنا
اغِ حسرت پہ بیٹھے ہوئے طائرِ بےنوا کے لیے

یک باغِ تعلق کسی چشمِ حیراں میں آباد ہے
ے خدا اس تعلق کو سرسبز رکھنا سدا کے لیے

زم اس برہنہ ۔ ناآزادی سے گھبرا کے یہ مت کہو
ما ہے رنگ سی زندگی کس لیے کس جزا کے لیے

○○○

○

بدن سے خونِ حسرت بھی نچوڑا جا رہا ہے
یہ کس حیرت کی جانب مجھ کو موڑا جا رہا ہے

یہ کیسی بدحواسی موجِ تن ہے سر سے پا تک
یہ لشکر کس کی سرکوبی کو جوڑا جا رہا ہے

کراہوں، سسکیوں کو قہقہوں کا نام دے کر
کسی زخمی کی پے در پے جھنجھوڑا جا رہا ہے

تعجب ہے کہ اک لمحے کی غفلت کا تعلق
گلی کوچوں کو ویرانی سے جوڑا جا رہا ہے

بلند آواز ہونا جرم ہے، لیکن یہ دیکھو
مجھے تو شاخِ سرگوشی سے توڑا جا رہا ہے

جہاں وابستگی پیوستگی سے [illegible] چکی تھی
اسی منزل پہ [illegible] کر ساتھ چھوڑا جا رہا ہے

یہ عمرِ [illegible] تو [illegible] بے مصرف ہی نکلی
سو اب [illegible] ہے عبادت [illegible] موڑا جا رہا ہے

○○○

اے ۔ ایم ۔ احمد خواہ مخواہ

○

جس گھڑی جھوٹی انا کا میری ؛ پیراہن کھلا
میری غربت کی قبا کا ایک اک بندھن کھلا
بند دروازے پہ دل کے ، غم کی جب دستک سنی
فکر کے ظلمت کدے میں اک نیا روزن کھلا
ہم اسیرانِ چمن کو کیا قفس اچھا نہ تھا
بند ہونا ہی اگر تھا ، کیوں درِ گلشن کھلا
جانے کب آئے خیالِ یار مہماں کی طرح
اس لیے رکھا ہے ذہن و دل کا گھر آنگن کھلا
پیار کے دو بول بولیں اور اٹھالے جائیں سب
بیچنے رکھا ہے میں نے اپنا تن ، من ، دھن کھلا
کوئی گاہک مل ہی جائے گا متاعِ زیست کا
آج سنتے ہیں کہ ہے بازارِ فکر و فن کھلا
جو بھی آیا میری صورت دیکھ کر ہنستا رہا
یہ مرا چہرہ ہے یارو یا کوئی درپن کھلا
سامنے سے وار کرتا ہے مجھے للکار کر
دوستوں سے خواہ مخواہ اچھا لگا دشمن کھلا

○○○

○

محافظ قید میں ہیں ، شہر لٹ جانے کا خطرہ
فصیلِ شہر پر چاروں طرف چوروں کا پہرہ
فقط اندھا اگر ہوتا ہم اس پر صبر کرتے
ہمارے شہر میں قانون ، کانوں سے بھی بہرہ
جو پلکوں پر رکا ہے قطرہ ، شبنم نہ سمجھو
مری چاہت کا یہ آنسو ، سمندر سے بھی گہرا
تمہارے اور میرے درمیاں پردہ نہیں ہے
ہمارے بیچ ربطِ باہمی صدیوں سے گہرا
جو میرے دل کے درپن میں ہے وہ صورت تمہاری
جسے تم آئینے میں دیکھتے ہو ، میرا چہرہ
تم آجاؤ کہ بارش بھی غموں کی تھم چکی ہے
خوشی کی ہلکی ہلکی دھوپ ہے موسم سنہرا
سرابوں سے بھلا کیسے بجھاؤں تشنگی میں
مری حدِ نظر تک خواہ مخواہ ، صحرا ہی صحرا

○○○

نام : محمد عبدالرحمن جامی

قلمی نام : رحمن جامی

مقام و تاریخِ پیدائش : محبوب نگر ۸۰ / اکتوبر ۱۹۲۴ء

تعلیم : خواندہ

ملازمت : محاسب و منیجر فیمس میٹل ورکس، حیدرآباد، آندھرا پردیش۔

مختصر حالات زندگی و شعری سفر : چھٹی جماعت ہی سے شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ ضلع رائچور میں استاذی مولوی نور احمد خاں (جو شاعر نہیں بلکہ ٹھیٹ پٹھان تھے) کے زیرِ نگرانی بزمِ ادب قائم کی گئی تو انھیں اس کا سکریٹری بنایا گیا۔ کارکردگی کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کو جِلا ملتی گئی طالبِ علمی کے زمانے ہی میں اپنے ساتھیوں کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔ بعد میں معاصر شاعر بھی جن میں کچھ بزرگ بھی شامل تھے، نھیں اپنا کلام دکھانے لگے اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے لڑکپن ہی میں شرفِ استادی بخش دیا۔ دہم جماعت تک پہنچتے پہنچتے ضلع رائچور کے مشہور شعرا میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ان کے ہم جماعتوں میں حضرت علی احمد جلیلی کے برادر زادے صفی احمد بھی شامل ہیں مزید تعلیم کے لیے حیدرآباد بھجوایا گیا تو پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

ایوارڈز :

- اے۔ پی۔ اردو اکیڈمی ایوارڈ ۱۹۹۰ء
- پرائڈ آف حیدرآباد ایوارڈ ۱۹۹۰ء
- یونیٹی آرٹ ایوارڈ ۱۹۹۰ء
- شائننگ اسٹار بسٹ پوئٹ ایوارڈ ۱۹۹۶ء

تصنیفات :

- "جامِ انا" غزلوں کا مجموعہ مطبوعہ ۱۹۹۰ء
- "فسطاط" نظموں کا مجموعہ زیرِ اشاعت
- "ارمغن" " " زیرِ ترتیب
- "پیو" کہانیوں کا مجموعہ
- "قواعدِ شاعری" (عروض پر رسالہ اپنے شاگردوں کے لیے)
- "نظرِ انتقاد" تنقیدی مضامین کا مجموعہ زیرِ ترتیب
- "جہانِ رنگ و بو" سوانح حیات " "

○●○

[illegible] تو یہ مٹی

○

سلگتے ہونٹوں کی [illegible] سے کوئی نہ پوچھے
کہ ان میں کب سے تری نہیں ہے
خموشی آنکھوں کی جھیل میں
کب سے آنسوؤں کی تری نہیں ہے
صراحی کی یہ حسین گردن کی آبرو بھی
جھکی نہیں حلقِ آگہی میں
کہ عرقِ دل سے
رگِ حیات کی خشک ڈال بھری نہیں ہے
زباں سے کہہ دو
کہ خانۂ دل میں
آج تک ابتری نہیں ہے
زمیں کب تک نمی کو ترسے
کہیں سے کوئی تو ابر اٹھے
کبھی تو برسے کہیں تو برسے
یہ احساس اب تک مری نہیں ہے

○●○

نغمۂ ہوائے صحرا

○

ہوائیں صحرا سے آرہی ہیں
خموشی لے میں نہ جانے کیا گنگنا رہی ہیں
حسیں، جواں، پُر غرور نغمے
سمندروں سے گزر کے پیہم
افق پہ ابرِ رواں کے ٹکڑوں سے چھیڑ کرتے
نئی رسیلی رتوں کے پیغام لا رہے ہیں

مگر یہ کیا ــــــــ ؟
ان میں گھن گرج کی صدا ہے کیسی
یہ یک بہ یک
پھر اٹھی ہے کیسی مہیب آندھی
یہ کیسے بارود کے دھماکے
ہمارے کانوں میں گونج اٹھے ہیں
عظیم صحرا میں شور کیسا ہے آج برپا
ہوائے صحرا کے سارے نغمے دھواں دھواں ہیں

○●○

وطن لوٹنے کے بعد

یادوں کے میلے میں کب سے گھوم رہا ہوں
شہرِ وفا کی راہوں میں کب سے تنہا ہوں
لمحہ لمحہ دل کا درپن ٹوٹ رہا ہے
لمحہ لمحہ تیرا دامن چھوٹ رہا ہے

رنگ و بو کی وادی میں جو لوگ ملے ہیں
وہ بھی میری صورت تنہا گھوم رہے ہیں
اپنے اپنے چہروں کو ہاتھوں سے چھپائے
اپنے ہی سائے کے تعاقب میں حیراں ہیں
اپنی ہی آواز کے پیچھے سرگرداں ہیں
جسم سے اپنے بے پروا ہیں سب ہی سائے

جسم کی بھٹی جل کر خود ہی سرد ہوئی ہے
گہری سرخی گہری سیاہی گڈمڈ سی ہے
یہ تو تیری میری اپنی ہی بستی ہے
اس بستی کے ویرانوں میں گھوم رہا ہوں
تو جو نہیں ہے میں ہر سو بکھرا بکھرا ہوں

○●○

آواز کی پہچان

○

پکارو مجھے
میں تو آواز ہی سے تمھیں جانتا ہوں
صرف آواز ہی سے
میں اپنے پرائے کو پہچانتا ہوں
اگرچہ میں بینا ہوں
پھر بھی
مرے سامنے جتنے چہرے ہیں
سب اجنبی ہیں
کوئی ان میں
اصلی کسی کا بھی چہرہ نہیں ہے
مگر بول اٹھتا ہے جب کوئی چہرہ
تو آواز ان کی
بتاتی ہے مجھ کو
اسی سنگ بستہ زمیں پر
اجالوں اندھیروں میں اک فاصلہ ہے
صرف آواز ہی سے
میں اپنے پرائے کو پہچانتا ہوں

○●○

آئینہ در آئینہ

○

یہاں پر ہر شخص کا چہرہ مثالِ آئینہ ہے
نظر ہے تو پڑھو مکتوبِ چہرہ
غنیمت ہے زباں چپ ہے
وگرنہ چہرے پڑھ کر جانے کیا اظہار ہو جاتا

○

زباں سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے
نگاہوں کی ضرورت ہے حقیقت جاننے کو
نگاہیں جب کسی چہرے پہ پڑتی ہیں
تو چہرہ خود ہی بول اٹھتا ہے
حالِ اندروں کیا ہے

○

بہ ظاہر آئینہ تو بے زباں ہے
زبانِ حال سے دل کی حقیقت کھول دیتا ہے
یہاں ہر شخص کا چہرہ مثالِ آئینہ ہے
اور آنکھیں آئینہ در آئینہ ہیں
اگر ہے دیکھنے کی تاب دیکھو

○

بصارت ہے جو آنکھوں میں تو دیکھو
حقیقت کھل کے آئے گی
کہ یہ چہرے کتابیں ہیں
پڑھو ان میں لکھی ہے آپ بیتی
زندگی کی۔

○

کسی چہرے کا جب بھی سامنا ہوتا ہے
آئینے سے ٹکراتا ہے آئینہ
تو یوں محسوس ہوتا ہے
کہ میں بھی
بے لباس اس کی نگاہوں میں ہوا ہوں
کہ اس نے پھیرلی ہیں مجھ سے آنکھیں
یہ آنکھیں آئینہ خانہ ہیں
جن میں ہر طرف میرا ہی چہرہ ہے

○●○

فیصلہ

○

زندگی خود بھی ہے اک سمجھوتہ
کاش اس دل کو یقیں ہو سکتا
یوں دلاسوں کے سہارے اب تک
میں نے اس دل کو سنبھالا لیکن
اب مرے دل کی لگن چاہتی ہے
پھر کوئی حشر بپا ہو جس میں
فیصلہ دل کا مرے ہو جائے
چاہے جیسے بھی ہو جس طرح بھی ہو

○●○

فرعونِ عصر
(امریکی سامراج کی نذر)

○

محبت کے لیے
گردوں سے تارے توڑ لاتا ہے
پہاڑوں میں
سرنگیں کھود کر نہریں بہاتا تھا
جو صحرا میں بھٹکتا تھا
وفا کے نام کی خاطر
وہ دیوانہ
یہی انسان ہی تو تھا

مگر اب یہ
ہوا کا رخ بدل کر
آسماں کو فتح کر کے
زیر کرنے ان خلاؤں کو
خدا کی بستیوں میں بسنے والے
بے خطاؤں بے گناہوں پر
اٹل طاقت کی اپنی آزمائش کر رہا ہے
بموں کی ان پہ یورش کر رہا ہے
خدا کی بستیاں برباد کرنے پر تُلا ہے

وہ جوئے شیر اب ہے خشک ساری
وہ نخلستاں بھی ویراں ہو گیا ہے

یہی انسان ہے
جس کی محبت کا فسانہ تھا ہر اک لب پر
مگر اب
اس کو نفرت ہے محبت سے
شرافت سے مروت سے عداوت ہے
اب اس ماحول میں
جینے کی خاطر روز مرتا ہے
سحر تک
موت کو بانہوں میں لے کر رقص کرتا ہے

○●○

معذرت

○

تم نے کیوں آج سرِ راہ کیا مجھ کو سلام
بے تعلق ہی گزرتیں تو بہت اچھا تھا
آج پھر تم سے تعلق کا خیال آتا ہے

جانے کیا سوچا ہے تم نے مجھے معلوم نہیں
میں نے سوچا ہے کہ اب تم سے رہ و رسم نہ ہو
کیوں کہ اب غیر ہو تم غیر سے رشتہ کیا ہے
یوں بھی تنہائی مری اب نہ اجازت دے گی
کوئی در آئے مرے پیار کے ویرانے میں

○●○

محبت گنگناتی ہے

○

جبینوں پر حکایاتِ حزیں کے نقش
چہروں پر خطوطِ نفرت و تحقیر
دل مجروح احساسات پژمردہ
کوئی تو آگ کے شعلوں کو روکے
رہروؤں کو راہ سے دوزخ کی پلٹا دے
تجلی بخش دے ذہنوں کو غور و فکر کی
پھولوں کی نکہت دے خیالوں کو
دلوں کو آئینہ کر دے
محبت کی جوالا کے دہن کو کھول دے
امن و سکوں کی راہ دکھلا دے
یہی اک راستہ ہے جس پہ چل کر
زندگی انسانیت کے گیت گاتی ہے
محبت گنگناتی ہے

○●○

دستکِ درد

○

نیم شب
دل کے درون خانے پر
دستکِ درد ہوئی
درِ احساس کھلا
درد سے درد ملا
صرف تنفس کی صدا
ایک سیلاب بہا
قربت کے بعد جدائی کا کرب
پچھلی شب ہوا اُٹھا سناٹا
اور پھر دل کے درون خانے کا
بند ہوا دروازہ

○●○

میوزیم کا تجربہ

○

کہا یہ گائیڈ نے مجھ سے
"یہ وہ تنہا عجائب گھر ہے
جس میں
کتنی ہی نادر انوکھی چیزیں
دنیا بھر کے ملکوں سے اکٹھا کی گئی ہیں
مرا ذوقِ نظر تھا محوِ حیرت
کہ میں بھی دم بہ خود تھا
ساتھ ان کے ہی جنھیں ذوقِ تماشا کھینچ لایا تھا

○

کہا یہ گائیڈ نے مجھ سے
یہاں رک جائیے
ایک ایک کر کے آپ تنہا جائیے
اس کمرۂ نادر میں
ہے اک قدِ آدم آئینہ
ہر کسی کو کر کے ننگا دکھاتا ہے عریاں
مگر کمرے میں جانے پر
نہیں تھا کوئی آمادہ
ٹھہر کر میں نے یہ سوچا
جو پہلے ہی سے عریاں ہو
وہ کیا دیکھے گا آئینہ

○●○

قیوم راہی

چابی والی موٹر

موڑ مڑتے ہی ٹیکسی تیز جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

ایک سائیکل سوار ٹیکسی کی زد میں آنے سے بال بال بچ گیا۔ منصور نے گھبرا کر داہنی طرف بیٹھے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کو گھورا جس کا چہرہ غصے سے لال ہورہا تھا۔ ڈرائیور نے قہر آلود نگاہوں سے سائیکل سوار کو لعنت ملامت کی۔ پھر دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے دانت پیستے ہوئے کچھ بڑبڑانے بھی لگا۔

بعض موڑ کس قدر خطرناک بن جاتے ہیں۔ زندگی کے پُرپیچ راستوں پر کتنے ہی موڑ آتے ہیں۔ سنبھل کر چلا جائے تو خیریت ہے۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ منصور کی شاہ راہ حیات پر بھی ایک انتہائی اہم اور مشکل موڑ آنے والا تھا جس کے پرے لذت انگیز جوان امنگوں اور رنگ و نور سے مہکتا ہوا ایک شہر آباد تھا۔ شہر آرزو۔

فیصلہ تو وہ کب کا کرچکا تھا لیکن اس کے باوجود امید و یاس کے سنگم پر کھڑا تھا۔ مگر آج یہ گو مگو کی تکلیف دہ کیفیت ختم ہوجائے گی۔

منصور نے گردن پیچھے کی طرف گھمائی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ماں باپ کو اس نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا بیگم قیصر رحمان شوہر کے پہلو میں سمٹی سمٹائی کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھیں۔ ابھی تک تو منصور نے خاصی سعادت مندی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے انداز میں کوئی بغاوت کوئی کرختگی نہیں تھی۔ وہ تو بس کم سن بچے کی طرح منہ کیے جارہا تھا۔ رہا قیصر رحمان کا سوال۔ تو ان سے اس قسم کی بات کرنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی کیوں کہ وہ اپنے حکم کے جواب میں صرف "ہاں" سننے کے عادی تھے۔ وہ خاصی خوش فہمی میں مبتلا تھے سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ منصور ان کی گرفت سے باہر ہوچکا ہے۔ وہ اس مرحلے کو اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔ انھیں قوی امید تھی کہ اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہوجائیں گے۔ ان کا حربہ معمولی نوعیت کا نہیں ہوگا۔ فیصلہ کُن قدم اٹھائیں گے۔

کتنے دنوں سے گھر کی فضا سکوت سے بوجھل تھی۔ ٹھہری ٹھہری۔ گھٹی گھٹی۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو۔

قیصر رحمان کو اس بات کا علم چند دن قبل ہوا تھا کہ ان کا اکلوتا بیٹا اپنی شادی کے سلسلے میں ان کی رائے سے متفق نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے لیے لڑکی بھی منتخب کرلی ہے۔ اور اس میں اتنی جرأت بھی آگئی ہے کہ وہ مسلسل اپنے انتخاب پر اصرار کیے جارہا ہے۔ بیگم قیصر نے کافی دنوں تک اس راز کو چھپائے رکھا تھا۔ لیکن وہ اس بھڑکتے ہوئے شعلے کو ٹھنڈا نہ کرسکیں۔ اس کی آنچ قیصر رحمان تک پہنچ ہی گئی۔ بیگم قیصر نے بیٹے کو سمجھانے کی بہت کوششیں کی تھیں۔ باپ کی خواہش کا واسطہ دیا تھا جو اس کا رشتہ اپنی بھتیجی سے کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ خوش حال گھرانہ۔ تعلیم یافتہ خوب صورت لڑکی۔ اور کیا چاہیے۔ لیکن منصور کچھ سنتا ہی نہ تھا۔ وہ تو بس اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ اس کے سر میں تو بس ایک ہی سودا سمایا ہوا تھا۔

پہلی بار جب قیصر رحمان کو یہ سنسنی خیز خبر سنائی گئی تھی تو بہت برہم ہوئے تھے وہ۔ "تنہا خود سر کر دیا تم نے، جیسے گویا سنسنانے کی تھیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ نالائق میرے ہی جذبات سے کھیلنے کی جسارت کرے گا۔ کیا اسے نہیں معلوم کہ میرے ارادے اٹل ہوا کرتے ہیں۔ میں یہ گستاخی ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ کہہ دینا اپنے لاڈلے سے میری زندگی میں اس کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔"

اس گمن گرج میں بیگم قیصر چپ بیٹھی رہیں۔

پھر خاموشی کے طویل وقفے کے بعد انھوں نے نظریں ملائے بغیر بیوی سے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی تھیں جوان بیٹا باغی ہو جائے تو عزت کرو ملیا میٹ ہو جاتی ہے۔ میں نے سوچا ہے پہلے لڑکی کا گھر دیکھ لیں اس کی بیوہ ماں سے مل لیں پھر کوئی ترکیب سوچیں گے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

پھر شام کی دہلیز کی طرف بڑھ رہی تھی۔ راستوں پر دھول اڑ رہی تھی۔ بدلتا ہوا موسم فضا میں اداسیاں بکھیر رہا تھا۔ ٹیکسی اب ایک بارونق بازار سے گزر رہی تھی۔ خرید و فروخت کا سلسلہ تھا۔ جوش و خروش تھا۔ مسکراہٹیں تھیں۔ خوشبوئیں تھیں۔ لالہ رنگ۔ لیکن ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے تینوں افراد جیسے دم سادھے بیٹھے ہوں۔ یکایک بیگم قیصر نے سر سامنے والی سیٹ پر ٹکا دیا۔

"کیا ہوا؟" قیصر رحمان نے فوراً ہی پوچھا۔

بیگم قیصر نے تھکی تھکی آنکھوں سے شوہر کو دیکھا۔ "کچھ نہیں۔ ذرا سر میں درد ہو رہا ہے۔"

وہ پھر سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

ٹیکسی ایک کشادہ گلی میں رک گئی۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد نیچے قدم رکھتے ہی قیصر رحمان کی نظریں دیوار کے اس حصے پر پڑیں جہاں سفید پتھر پر سیاہ جلی حروف میں "ثمینہ کاٹیج" لکھا ہوا تھا۔ ایک جھٹکا سا لگا جیسے بجلی کا تار چھو گیا ہو۔ پھر قیصر رحمان کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور جب بیل بجانے پر کھلتے ہوئے رنگ والا نوجوان اندر سے آیا اور انھیں بیٹھک کی طرف لے گیا تو ان کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔

"امی ابھی آتی ہیں۔ آپ لوگ تشریف رکھیں۔"

نوجوان پھر اندر چلا گیا۔

بیگم قیصر شوہر کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ منصور دوسرے صوفے پر جم گیا۔

قیصر رحمان نے بڑے تجسس کے ساتھ کمرے کا جائزہ لیا۔ سجاوٹ اور رکھ رکھاؤ میں بڑا سلیقہ تھا۔ انفرادیت تھی، ہر شے سے نفاست عیاں۔ صاف ستھرا نکھرا نکھرا ماحول انھیں بڑا پُرسکون اور خواب آلود سا لگا۔ دریچوں پر سبز رنگ کے پردے لہرا رہے تھے۔ صوفے بھی سبز رنگ کے تھے اور سامنے کارنس پر ٹیبل لیمپ کا شیڈ بھی سبز تھا۔ قیصر رحمان کے تجسس نے وحشی سے کل کر دیا۔ ہر طرف سبز رنگ پھیل گیا۔ ہر شے اسی رنگ میں ڈوب گئی۔ پھر یکایک ان کی بے قرار نگاہیں دیوار پر آویزاں ایک تصویر پر پڑیں تو وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ دل کی عمیق گہرائیوں میں ایک آواز گونج اٹھی "ثمینہ" ... مادام ثمینہ سبز رنگ کی ساڑی میں ملبوس ان کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ اس مسکراہٹ نے ان کے جذبات کو سرد کر دیا۔ انھوں نے پیشانی کو انگلیوں سے تھام لیا۔ آنکھیں بند کیں تو ماضی پرانی ایک سہانی صبح بن کر ان کی آنکھوں میں اترتی چلی گئی۔ پھر کمرے میں صدا گھنٹیاں بجنے لگیں۔

وہ بہار کی ایک اجلی اجلی صبح تھی۔ قیصر رحمان اسکول کے برآمدے میں ننھے منصور کی فیس جمع کرانے کے لیے کھڑے تھے۔ کسی کام سے بڑی میڈم کے پاس گیا ہوا تھا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد انھوں نے منصور سے کہا "چلو بیٹے اپنی میڈم سے حاضری واپس آجانا۔ ابھی تو تمھیں دعا کے لیے ہال میں جانا ہے۔" وہ مڑے تو دیکھا قریب ہی میڈم ثمینہ کھڑی تھیں۔ پہلی ہی نظر میں وہ بے مثال کا پیکر معلوم ہوئیں۔ گورا رنگ دمکتا ہوا نورانی چہرہ۔ بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھیں۔ تیکھے ابرو۔ سڈول جسم اور اس چہرے پر جاتی دل موہ لینے والی مسکراہٹ۔ میڈم ثمینہ نے منصور کے رخسار پر ہاتھ پھیر کر پیار کیا "آؤ میرے ساتھ چلو" پھر قیصر رحمان سے مخاطب ہوئیں "ماشااللہ بڑا پیارا بچہ ہے۔"

"کلاس میں کیسا چل رہا ہے؟" قیصر رحمان نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"بہت اچھا۔ آپ ذرا گھر پر بھی توجہ دیا کریں۔"

"جی۔ جی ہاں۔ یہ تو بہت ضروری ہے۔"

"اور ذرا دیکھیے یونیفارم کا بھی خاص خیال رکھیں۔ کل دوسرے رنگ کی نیکر پہن کر آگیا تھا۔"

"جی۔۔۔ بہت اچھا۔"

میڈم ثمینہ منصور کا ہاتھ پکڑے کلاس روم میں داخل ہوگئیں۔

اس دن دفتر میں قیصر رحمان کا دل اچاٹ اچاٹ رہا۔ سارا دن وہ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بار بار متبسم چہرہ ان کے دل کو گدگداتا رہا۔۔۔ سوتے جاگتے ایک ہی جاں گزار تصور ان پر حکمراں رہنے لگا۔

ان کی ازدواجی زندگی خوش گوار تھی۔ گھر ان کے لیے خوشیوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ ایک دوسرے کی عزت اور چاہت میں قدم ملا کر چل رہے تھے۔۔۔ لیکن اب جو بیگم کی چاہت کا خمار ٹوٹنا شروع ہوا تو گھر کے در و دیوار جہاں ہمیشہ آسودگی اور راحت کا احساس ہوتا تھا۔ ان میں وہ پہلی جیسی کشش نہ رہی تھی۔۔۔ وہ اپنا معمول برقرار نہ رکھ سکے۔ چپ چپ رہنے لگے۔ دفتر سے آنے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرتے۔ منصور کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ رات کو بھی جلد بستر پر چلے جاتے۔

"کیا بات ہے؟" بیگم قیصر نے ایک رات ان کے قریب لیٹتے ہوئے پوچھ ہی لیا "آپ کچھ دنوں سے پریشان سے ہیں۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں" قیصر رحمان نے ایک لمبا سانس لیا۔ "دفتر میں کام بڑھ گیا ہے۔"

"لائیے، سر دبا دوں"

"نہیں۔۔۔ تم سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ بہت تھک گیا ہوں۔"

"پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔"

"کیا؟"

"یہی کہ کام کی زیادتی کے علاج کے طور پر بیوی کی طرف سے منہ موڑ لیا جائے۔"

"اب میں کیا بتاؤں۔"

[illegible]

"بھئی سن تو لو پہلے ۔۔۔ چاہتا تھا کہ تمھیں خواہ مخواہ پریشان نہ کروں۔ دفتر میں ایک صاحب مجھے نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ بس ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہتی ہے۔"

"تو فکر کرنے سے، بیوی سے بات نہ کرنے سے یہ بلا ٹل جائے گی۔"

قیصر رحمان لاجواب ہوگئے۔

"بتائیے نا ۔۔۔ بولتے کیوں نہیں ہیں ۔۔۔ دیکھئے" بیگم قیصر نے ان کے شانے کو تھپتھپایا۔ "کہاں کھوگئے؟"

"جی۔"

"میری ایک بات مان لیجیے۔"

"کون سی بات۔"

"اللہ مالک ہے۔ یقین کرلیجیے آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

قیصر رحمان نے نیم باز آنکھوں سے بیگم کو دیکھا۔ "ہاں کہہ تو ٹھیک رہی ہو۔"

"تو پھر یہ ڈھونگ ختم کردیجیے"

"لیجیے ختم کردیا۔"

قیصر رحمان نے بانہیں بیگم کی گردن میں حائل کردیں۔

"السلام علیکم"

"وعلیکم۔" میڈم ثمینہ بولیں "بڑا پیارا بچہ ہے ۔۔۔ اور ذہین بھی۔"

وہ منصور کو پیار کرنے لگیں

اور قیصر رحمان کی نگاہیں میڈم ثمینہ کے پاؤں پر ٹھہر گئیں۔ گلابی گلابی پاؤں۔ ناخنوں پر سرخ پالش۔ سنہرے سینڈل۔

"آپ اس کے ہینڈ رائٹنگ پر ضرور توجہ دیں" میڈم ثمینہ نے ہدایت کی۔

"کوشش تو کررہا ہوں۔ رفتہ رفتہ ہی Improve کرے گا۔"

برآمدے میں بچے شور مچاتے ہوئے اپنی اپنی کلاسوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میڈم ثمینہ نے ادھر ادھر دیکھا اور بولیں۔

"منصور کا کوئی بہن بھائی نہیں ہے؟"

"جی ۔۔۔" وہ چونکا۔

"میں نے کہا منصور کا کوئی بھائی ۔۔۔ بہن؟"

"نہیں"

"ارے یہ تو بہت بری بات ہے۔ بے چارہ اکیلا ہے۔ دل گھبراتا ہوگا گھر میں۔"

اور قیصر رحمان شرمندہ شرمندہ سے کھڑے رہے جیسے انھوں نے اپنا قصور تسلیم کرلیا ہو۔

قیصر رحمان کا اضطراب بڑھتا جارہا تھا۔ میڈم ثمینہ سے تنہائی میں کس طرح ملاقات ہو؟ کس طرح دل کا حال زبان پر لایا جائے۔ یہی سوچ ذہن کو کریدتی رہتی تھی۔ پھر انھوں نے کئی اسکیمیں بنائیں۔ لیکن اس معاملے میں وہ خاصے بزدل ثابت ہوئے۔ ایک بار انھوں نے میڈم ثمینہ کے لیے بہت قیمتی کپڑا خریدا۔ لیکن کپڑے کا پیکٹ لے کر میڈم ثمینہ کے نزدیک پہنچے تو اوسان خطا ہوگئے۔ تحفہ مٹھی میں بھنچا رہا۔ شام کو یہی پیکٹ بڑے چاؤ کے ساتھ بیگم کو پیش کردیا اور بیگم کی آنکھوں میں بہت دنوں کے بعد شمعیں سی جھلملانے لگیں۔

اس دن قیصر رحمان بڑے اعتماد کے ساتھ اسکول کے برآمدے میں کھڑے میڈم ثمینہ کا انتظار کر رہے تھے۔ انھیں آج میڈم ثمینہ کو ڈنر پر مدعو کرنا تھا۔ منصور کلاس روم میں جاچکا تھا۔ وہ ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگے۔ نگاہیں اسی راہ پر بچھی ہوئی تھیں جدھر سے ہوکر میڈم ثمینہ کو آنا تھا۔

پھر وہ نازک لمحہ چپکے سے دبے پاؤں آگیا۔

"منصور نہیں آیا آج ؟"

میڈم ثمینہ نے رک کر قیصر رحمان سے پوچھا۔ آج وہ دوسرے راستے سے آئی تھیں۔

"جی۔۔۔" قیصر رحمان نے مڑکر دیکھا۔ میڈم ثمینہ مسکرارہی تھیں۔ قیصر رحمان کو لگا جیسے آسمان سے کوئی اپسرا زمین پر اتر آئی ہو۔

"منصور نہیں آئے گا آج ؟"

"وہ آچکا ہے"

پھر جب قیصر رحمان نے وہ بات کہنی چاہی جس کا بوجھ اٹھائے وہ کئی دنوں سے گھبرائے گھبرائے پھر رہے تھے تو ان کا حلق خشک ہوگیا اور آواز کہیں راستے میں اٹک کر رہ گئی۔

پھر کئی دنوں تک قیصر رحمان بے چین رہے۔ منصور کو گیٹ تک چھوڑ کر واپس چلے جاتے۔ اس گریز سے ان کی آشفتگی میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پڑگیا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ وہ زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکے اور ایک صبح کوئی ان جانی طاقت دھکیل کر انھیں میڈم ثمینہ کے روبرو لے گئی۔

"آپ۔۔۔" قیصر رحمان نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"جی۔۔۔"

"میں کہہ رہا تھا" قیصر رحمان لڑکھڑا سے گئے "منصور کی پڑھائی سے آپ پوری طرح مطمئن ہیں ؟"

"جی۔۔۔ بالکل۔"

"یہی پوچھنا چاہتا تھا۔"

"میں نے تو پہلے ہی بتایا تھا کہ یہ خاصا ذہین ہے اور اب تو ہینڈ رائٹنگ میں بھی کافی بہتر ہوگیا ہے۔"

پھر جیسے کہنے کے لیے کوئی بات نہ ہو میڈم ثمینہ نے منصور کا ہاتھ پکڑے دھیرے دھیرے کلاس روم کی جانب بڑھ گئیں۔

قیصر رحمان بیزار بیزار سے رہنے لگے تھے۔ خود پر جھنجھلانے بھی لگتے تھے۔ بزدلی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کتنے دن ہوگئے لیکن

کام کی ایک بات بھی نہ کر سکا ۔

کئی ماہ گذر گئے ۔ حالات نے نیا رخ اختیار کیا ۔ قیصر رحمان تبادلے پر شیخوپورہ منتقل ہوگئے ۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ نورانی چہرے کے تصور نے ان کا تعاقب کرنا چھوڑدیا ۔ وہ پھانس بھی نکل گئی جو سینے میں کھٹکتی ہوئی محسوس ہوتی رہتی تھی ۔ وقت اور فاصلہ کیسے کیسے گھاؤ بھر دیتا ہے ۔ قیصر رحمان پھر اپنی پرانی دنیا میں لوٹ آئے تھے ۔

شہر در شہر گھومتے کتنے ہی طویل سال بیت گئے تھے ۔

قیصر رحمان کی نبضیں یک بارگی تیز ہوگئیں ۔ انھوں نے نیم وا آنکھوں سے بیگم اور منصور کو دیکھا ۔ بیگم قیصر رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھیں اور منصور اخبار پر جھکا ہوا تھا ۔ لیکن ننھا منصور قیصر رحمان کے سینے پر بیٹھا اپنے کھلونے کی ضد میں مچل رہا تھا ۔ صبح سے شام تک کا وقت اس نے بڑے انتظار میں گزارا تھا ۔ لیکن جب ابو آئے تو خالی ہاتھ تھے ۔ وعدہ بھول گئے تھے ۔ ابو اب منصور کو منانے کے لیے کیسے کیسے جتن کیے جارہے تھے ۔ کس کس طرح بہلانے کی کوششیں کی جارہی تھیں ۔ لیکن منصور تھا کہ قابو میں ہی نہیں آرہا تھا ۔ آخر قیصر رحمان کو اسی وقت بازار جانا پڑا اور جب چابی والی موٹر منصور کے ہاتھوں میں آئی تو وہ پھولا نہ سمایا ۔ موٹر دوڑتی تو منصور تالیاں بجا بجا کر خوشی کا اظہار کرنے لگتا ۔

یک بارگی قیصر رحمان کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوگئی ۔

عین اسی وقت کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی ۔ قیصر رحمان نے دروازے کی جانب دیکھا ۔ میڈم ثمینہ باوقار انداز میں داخل ہورہی تھیں ۔ قیصر رحمان کھڑے ہوئے تو بیگم قیصر اور منصور نے بھی ان کا ساتھ دیا ۔

میڈم ثمینہ سبز رنگ کی ساڑی میں ملبوس تھیں ۔ میک اپ کے باوجود ڈھلتی جوانی چغلی کھارہی تھی ۔ آنکھوں پر سنہری فریم والی عینک ۔ چہرے پر سکون اور بردباری کی جھلک ۔۔۔ جیسے ہی میڈم ثمینہ کی آنکھیں قیصر رحمان کی آنکھوں سے چار ہوئیں ان کے بڑھتے قدم تھم گئے ۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی ۔ انھوں نے فوراً خود کو سنبھالا ۔ مسکرانے لگیں ۔۔۔ اور پھر لمحوں کے سمندر میں جوار بھاٹا آگیا اور اس کی سطح پر ٹھہرا ہوا خاموشی کا سفینہ ڈوب گیا ۔

"آپ لوگ ۔۔۔" میڈم ثمینہ نے نظریں بیگم قیصر اور منصور پر گھمائیں ۔

"یہ میری امی ہے اور یہ ابو" منصور نے تعارف کرایا ۔

"اچھا آپ لوگ بیٹھیے نا"

میڈم ثمینہ اور وہ لوگ آمنے سامنے بیٹھ گئے ۔

پھر خاموشی کا غبار پھیل گیا ۔ نہ کوئی آہٹ ۔۔۔ نہ کوئی صدا ۔ ہر ایک اپنے اپنے خیالوں کے تہہ خانے میں اترا ہوا ۔

"آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا ۔ خصوصاً بیگم کئی دن سے اصرار کررہی تھیں ۔" قیصر رحمان نے لب کھولے ۔

"مسرت افزائی ہے آپ لوگوں کی" میڈم ثمینہ کا رخ بیگم قیصر کی طرف تھا ۔

لیکن بیگم قیصر کچھ نہیں بولیں ۔

"آپ جانتی ہیں میں اس وقت یہاں کیوں آیا ہوں ؟" قیصر رحمان کے ہونٹ ہلے تو فضا میں ارتعاش سا پیدا ہوگیا ۔

"جی ۔۔۔" میڈم ثمینہ نے انھیں چونک کر دیکھا ۔

(باقی ص : ۵۲ پر)

پروفیسر حسین الحق

بے تھاہ

چھوٹی بیٹی نے ان جانے میں اس کے دل کے تاروں پہ انگلیاں رکھ دیں!

اس کا پورا وجود جھنجھنا اٹھا۔ یک بارگی اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر ناچنا شروع کر دے۔ اسے لگا کہ اس نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت کی تو پھر شاید اس کا اپنے آپ پر سے اختیار اٹھ جائے گا۔۔۔ اس کے اندر اندر ایک وحشیانہ رقص اپنے عروج پر آچکا تھا "میں نے سن لی ترے ڈھول کی تھاپ / میں جلا چکا / ہست و بود / خاک باد / لوٹ آ / میرے ہاتھ میں علم / پاؤں لکڑیوں کا خم / تری رفیق تیلیوں کا انتظار ہے / خزاں میں سوکھ کر / بدن کی راکھ کو / ہوا کا انتظار ہے / لوٹ آ / میں اسی موڑ پر ہوں میری جان / لوٹ آ / میں نے سن لی ترے ڈھول کی تھاپ۔۔۔۔"

اسے لگا افریقہ کے گھنے تاریک جنگلوں کے اندر سے درختوں کا سینہ چیر کر یا شاید درختوں کے کاندھے کاندھے ہوتی یہ آواز اس تک آرہی ہے۔۔۔ اسے لگا کہ اگر اس نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت کی تو پھر شاید اس کا اپنے آپ پر سے اختیار اٹھ جائے گا۔۔۔۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ سرمئی جاڑے کی ایک انتہائی خوب صورت شام بارش کی ہلکی نرم پھوار کی طرح اس کے چاروں طرف ہولے ہولے گرتی رہی۔

باغ کا یہ گوشہ جسے اس نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا، نسبتاً پُرسکون گوشہ تھا۔ بچے اس سے بہت دور پر تتلیاں پکڑنے میں مصروف تھے۔ بیوی چھوٹے پوتے کو لیے اس چھوٹے سے تالاب کے کنارے بیٹھی تھی جسے اس نے کبھی بڑے شوق سے بنوایا تھا۔ اب اس کی دیکھ ریکھ پہلے کی طرح تو نہیں ہو پاتی تھی پھر بھی درجنوں رنگ بہ رنگی مچھلیاں، مچھلیوں کا تیرتے ہوئے اوپر نیچے آنا جانا، تالاب کے چاروں طرف لگے رنگ بہ رنگے برقی قمقموں کی ان رنگ بہ رنگ مچھلیوں پر فوکسنگ۔۔۔۔ نئے مہمان تو اب بھی اس سحر میں گم ہو جاتے۔ مگر اس کا جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ تو عادتاً ہر شام کوئی کتاب لے کر باغ کے اس گوشے میں آجاتا جہاں بید کی دو کرسیاں ایک ایزی چیر، اردگرد موسم کے پھول، پاس میں فوارہ، ذرا ہٹ کر بید ہی کا بنا ایک جھولا۔۔۔ اس نے روشنی کا انتظام کچھ یوں کروایا تھا کہ اس بڑے سے باغ میں بس یہی گوشہ نیم روشن رہتا، ساری فوکسنگ اس گوشے کی مخالف سمت میں تھی، بس جس ٹیبل کا وہ استعمال کرتا تھا اس کے نیچے اس نے اس طرح وائرنگ کرائی تھی کہ ضرورت پڑنے پر وہ اپنے اردگرد ضرورت بھر روشنی مہیا کر لیتا مگر اس انتظام میں بھی اس کا خاص خیال رکھا گیا تھا وہ خود اندھیرے میں رہے۔

اس وقت بھی چھوٹی بیٹی کے لیے وہ اندھیرے میں تھا مگر اپنے آپ پر روشن تھا۔ چھوٹی بیٹی نے تو ان جانے میں اس کے دل کے تاروں پر انگلیاں رکھ دی تھیں!

اس کا جی چاہا کہ وہ بیٹی کو بلا کر پیار کرے اور تھینکس کہے جس نے ایک مفلوج جسم میں سوئیاں چبھو دی تھیں ورنہ اس کے سارے موسم تو بے رنگ ہو گئے تھے جہاں پھول نہیں کھلتے، خوشبوؤں سے فضا نہیں مہکتی، ساون رت جھکٹ جھور نہیں آتی، بسنت رت

کی ہریالی پھوٹے بغیر کسی طرح نکل جاتی۔۔۔ اسے لگا کہ اب شاید بہت جلد بھی اس کا مسئلہ نہیں ہے، شاید اب دھرتی کا سینہ گرمی سے نہیں پھٹتا، اندر ہی اندر دھنس جاتا ہے، بے نمو ہو جاتا ہے، چلچلاتی دوپہر میں چیل سے اس کا گھونسلا نہیں چھڑواتیں، ساری ساری رات آنکھوں میں نہیں گزرتی وہ بے سدھ ہو کر سوتا اور سارا دن مصروف رہتا یا کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھ جاتا۔ عمر کا اثر جسم پر ظاہر ہونے لگا تھا۔ بال کھچڑی ہوگئے تھے، توند نکل آئی تھی اور جسم بھاری ہوگیا تھا۔ ایک گھنٹہ کرسی پر مسلسل نہیں بیٹھ پاتا، پیٹھ اکڑ جاتی۔ ایک طرف اونگھ دوسری طرف پیٹھ کا درد!

اس وقت کوئی اسے دیکھتا تو شاید یہی سمجھتا کہ وہ کسی آسیب کے حصار میں ہے۔۔۔ آنکھیں بند منہ ڈھلا ہوا، چہرے پر اذیت سہنے کا نشان!

"تم کو پتہ ہے؟" اس نے پتہ نہیں کس سے پوچھا۔۔۔ "میں کتنے برسوں سے اس سزا میں گرفتار ہوں؟ میں پور پور جلتا ہوں اور روم روم روتا ہوں اور میرا حال پوچھنے والا کوئی نہیں"۔۔۔ اس نے مندی مندی آنکھیں بس ذرا سی کھولیں۔۔۔ کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا، "آدھی رات گئے کون دروازہ پیٹ رہا ہے؟" اس نے سوچا مگر تب تک دروازے پر مکوں کی رفتار اور تیز ہو چکی تھی۔

"کون ہے بھائی؟" اس نے نیند سے بھری بوجھل آواز میں پوچھا۔

"ابرار ملک" باہر سے آواز آئی۔

"خیریت تو ہے؟ اتنی رات گئے؟"

"ابے دماغ تو نہیں خراب ہوگیا ہے۔ صبح کے نو بج رہے ہیں اور آپ کو رات دکھائی دے رہی ہے؟ دروازہ کھولو!"

"سوری یار۔ کھولتا ہوں۔ رات سونے میں دیر ہوگئی تھی۔"

وہ بڑبڑا کر اٹھنے لگا پھر چونک کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر جھینپی جھینپی مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔ بچے باغ میں رکھا پانی کا ڈرم پیٹ رہے تھے اور اسے لگا ابرار ملک پکار رہا ہے۔

ابرار ملک کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا؟

کہاں ہوگا؟ پبلک پروسیکیوٹر ہے۔ کسی جج کے ساتھ رمی کھیل رہا ہوگا یا کسی مقدمے کی فائل میں گم ہوگا۔ وہ کب ملا تھا؟

شاید ایم اے کے دوران۔ شاید اس سے بھی پہلے۔ شاید جنم جنمانتر کا یارانہ تھا۔۔۔"

اور اب؟

کسی درخت سے کوئی تنہا پرندہ چیختا ہوا کسی سمت تنہا اڑتا چلا گیا۔۔۔ پھولوں کے کئی پودوں میں ڈھیر سارے پھول آئے تھے اور ہوا کے جھونکوں سے ایک دوسرے پر جھوم جھوم کر لدے جا رہے تھے مگر گلاب کے ایک درخت پر بس ایک پھول کھلا تھا اور جب ہوا چلتی تو ہوا کے جھونکے اسے پتیوں کے اردگرد اگے کانٹوں تک جھکا دیتے۔ اسے لگا وہ پھول ہوا کے زور سے کانٹوں تک جھک تو آتا ہے مگر پھر ایک جھٹکے سے الگ ہو جاتا ہے۔

"ہم بچھڑ گئے ان سے اور مجھ سے کاہے کا سمبندھ تھا؟

اس نے سوچا اور دیکھا کہ جاڑے کی سرمئی شام بارش کی نرم پھوار کی طرح چپکے چپکے برس رہی تھی اور وہ بھیگ نہیں پایا تھا۔

اس وقت اس کا جی چاہا تھا کہ ایک دھواں دھار بارش اسے آن لیتی مگر یہ ہو نہ سکا۔ صرف جاڑے [illegible] کے ساتھ

کے پاس بیٹھی رہیں اور وقت گنگا کی لہروں کی طرح یادوں کی اندھیری سرنگ میں گرتا رہا اور وہ ناظمہ حسن کو دیکھتا رہا جن کو دیکھنا اس کے بعد پھر کبھی اس کی تقدیر نہ بن سکا۔۔۔

"ناظمہ! تمھارا مسئلہ کیا ہے؟"

"میں تمھیں بھلا نہیں سکوں گی اور ابا کے معیار پر تم پورے نہیں اترتے۔"

"تم مرجاؤ گی ناظمہ۔ اس کشمکش کے جہنم سے نکلو۔"

"کیا تم نکل پاؤ گے؟" ناظمہ اس کے کندھے سے لگ کر سسک اٹھی تھیں۔

اس کا جی چاہا کہ ناظمہ حسن ایک مرتبہ قبر سے اٹھ کر اس کے پاس آجاتیں اور وہ پوچھتا: "مس حسن! میں سچ کہتا تھا نا؟"

پھر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور جو ناظمہ حسن پوچھ بیٹھتیں: "انقلاب الرحمن میرے سوال کا جواب بھی تو دے دو!"

باغ کے اس نسبتاً پُرسکون گوشے میں بند آنکھوں اور ڈھلے منکے والے اس آدمی نے اپنے آپ کو اندھیرے میں رکھنے کا سارا نظام کرلیا تھا مگر چھوٹی بیٹی نے ان جانے میں اس کے دل کے تاروں پہ انگلیاں رکھ دیں: "بابا۔۔ میں آپ کے لیے ایک چیز لائی ہوں!"

"کیا لائی ہو بیٹا" باپ نے اشتیاق سے بیٹی کو دیکھا جو فوراً ہی کالج سے لوٹی تھی۔

"ابھی نہیں بابا۔۔۔ شام کو۔" بیٹی شرارت بھری ہنسی ہنستی ہوئی بولی۔

بیٹی اپنی شرارت سے لطف لے، اس لیے اس نے ضد نہ کی، ضبط کیا پھر بھول گیا مگر شام کو جب وہ باغ کے اپنے مخصوص گوشے میں آکر بیٹھا تو بیٹی ٹیپ ریکارڈ لیے حاضر ہوگئی: "بابا میں آپ کے لیے غزلوں کا کیسٹ لائی ہوں۔" اس نے ٹیپ آن کرتے ہوئے کہا۔ ناصر کاظمی اور فیض کی غزلوں کا کیسٹ تھا۔

فضا میں نغمے بکھرتے رہے اور وہ اپنے وجود میں اٹھتے زلزلے مسلسل جھیلتا رہا، ان اذیتوں سے وہ اوب چکا تھا، ان سے بچتا تھا اور اسی لیے برس ہا برس سے اس نے ٹیپ اور ریڈیو سننا بند کردیا تھا۔ اسے یقین سا ہوگیا تھا کہ ماضی ایک پھٹا ہوا کمبل ہے مستقبل کے کڑکڑاتے جاڑے سے بچا نہیں سکتا مگر اس سمے سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا جب ابرار ملک دروازے بیٹھنے لگا اور ناظمہ حسن سسک سسک رونے لگیں۔ اسے لگا وہ ایک بلیک ہال میں بند ہے، اس کا دم گھٹ رہا تھا پھر بھی وہ زندہ تھا اور دنیا کے میلے میں تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھنے پر مجبور تھا۔

یہ اتنا بڑا باغ، اس کی روشیں، پھول پودے، فوارے، جھولا، خوش رنگ پرندے، سریلی آوازیں اور دل کش رنگ روپ۔۔ ان سب کی دید اسے میسر تھی۔ کیا یہ سب کچھ اس کے لیے خوش ہونے کا سبب نہیں ہے؟ اس کا جی چاہا وہ چیخ لرکے۔۔۔ نہیں۔ نہیں"۔۔۔ مگر کیا وہ کہہ سکے گا؟ اس کے کہنے پر کوئی یقین کرے گا؟ اگر کوئی پوچھ بیٹھا کہ: "تمھارا اتنا بڑا گھر، محبت والے بیٹے بیٹیاں، ہر ضرورت کا خیال رکھنے والی بیوی۔۔۔ تمھارا مسئلہ کیا ہے؟"

تو وہ کیا کہہ سکے گا؟ کیسے بتائے گا کہ اس کا مسئلہ وہ بلیک ہال ہے جس میں وہ بند ہے، جس سے وہ باہر نہیں نکل سکتا اور دستے پر لگاتار دستک جاری ہے اور کوئی لگاتار سسکیاں بھر رہا ہے، وہ کیسے بتائے کہ باغ کی ساری روشیں اور ان میں لگے پھول اور سب مرجھاتے ہیں اور کہیں دور کسی آنگن میں لگا بس ایک بیلے کا درخت امر بیل کی طرح اس کے چاروں طرف لپٹ جاتا ہے۔

پورے منظر پر چھایا جاتا ہے۔

[redacted] ہے؟" اس نے پتہ نہیں کس سے پوچھا، "میں کتنے برسوں سے اس سزا میں گرفتار ہوں؟" اس نے مند مند آنکھیں بس ذرا سی کھولیں۔۔۔ ستیا کنڈ اور دھواں کنڈ کی پہاڑیوں پر شام اتر رہی تھی، گنگا کے سینے پر کشتیاں تیر رہی تھیں، شیرشاہ کے مقبرے کی برجیوں اور میناروں پر کبوتر جمع تھے، عشرت کدہ کی ممٹیوں پر چیلوں کا جمگھٹا تھا، واسکوڈی گاما میں سمندر کے کنارے لہریں اٹھ رہی تھیں، انڈیا انٹرنیشنل میں شموئل احمد پیشر پڑھ رہا تھا، انور خاں بمبئی میں ارون دھتی رائے کی نئی کتاب دکھا رہا تھا۔۔۔

اسے پھر وہ آواز سنائی دی۔۔۔ میرے ہاتھ میں علم / پاؤں لکڑیوں کا غم / لوٹ آ جانِ من / میں نے سن لی ترے ڈھول کی تھاپ۔۔"

اس تھاپ سے اس کی پرانی آشنائی تھی، سماع کی محفلوں میں، ہولی کے جھمیلے میں، اس کی شادی کے منڈوے میں، اس نے یہ آواز کہاں نہ سنی۔۔۔ آج پھر ڈھول پیٹا جا رہا تھا اور وہ سن رہا تھا مگر اس کا آج کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ڈھول اور ڈرم میں فرق نہیں کر پا رہا تھا۔ لان میں پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں کھیل رہی تھیں۔ بیٹے بیٹیاں خوش گپی میں مصروف تھیں، بیوی پاس کی ایک کرسی پر بیٹھی کسی بچے کو سوئیٹر بن رہی تھی، بہار کا موسم تھا، باغ پھولوں سے لدا پڑا تھا، فضا میں چاروں طرف خوش بوؤں میں لپٹی ہوا تیرتی پھر رہی تھی، بیٹی جزلان کا جو کیسٹ لائی اس پر فیض غزل سرا تھے، گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے، اور مند آنکھوں اور ڈھلے منکے والا آدمی میر کا وہ مصرعہ سن رہا تھا جو اس کیسٹ میں محفوظ نہیں تھا۔ اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے۔۔۔ ڈھول کی دھمادھم اس کا سر بھاری کیے جا رہی تھی، دروازے پر دستک مسلسل تھی، سسکیوں کی آواز ہوا کے لہریے اور پانی کے بہاؤ کی طرح اس تک چلی آ رہی تھی۔

اس نے سوچا۔ اس کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ یہ بلیک ہال جس میں وہ قید ہے؟ یا اس بلیک ہال کا وہ ساؤنڈ پروف سسٹم جس کے سبب باہر کی آوازیں اندر آ سکتی ہیں مگر اندر کی آواز باہر نہیں جا سکتی۔

کہانی کی ابتدا میں وادی کو اس عجیب و غریب ساؤنڈ پروف سسٹم کا قطعی علم نہیں تھا مگر آہستہ آہستہ یہ احساس ہونے لگا کہ اسی سسٹم کے سبب باغ کے اس نسبتاً پُرسکون گوشے میں بیٹھا مند آنکھوں اور ڈھلے منکے والا آدمی جو اپنے اردگرد موجود لوگوں کے لیے اندھیرے میں ہے، وہ شاید خود بہ خود اس پوائنٹ تک بھی پہنچنے والا ہے جہاں کہانی کی ابتدا میں زور و شور سے جاری وحشیانہ رقص آہستہ آہستہ اپنی ڈھلان پر اتر جائے۔

مند آنکھوں والے آدمی نے کان لگایا تو احساس ہوا کہ رقص کی آواز واقعی مدہم ہونے لگی ہے۔

اس نے کچھ اور دھیان لگایا، شاید کچھ اور سننا چاہتا تھا۔۔۔ بڑی مشکل کے بعد اسے صرف اتنا سنائی دیا۔۔۔"

میرے ہاتھ میں علم۔

پاؤں لکڑیوں کا غم۔

تری رفیق تیلیوں کا انتظار ہے۔

اور تب۔۔۔ جب اس کی آنکھیں کچھ اور مند گئیں، منکا کچھ اور ڈھل گیا اور اس نے سرگوشی کے انداز میں، گویا بس اپنے آپ سے کہا۔۔۔"

بدن کی راکھ کو۔۔۔

ہوا کا انتظار ہے۔۔۔!!۔۔۔ ○○○

نتیجہ امتحانات ادارہ ادبیات اردو منعقدہ مئی ۱۹۹۹ء

اردو ماہر

مرکز ونگور: سوم 2، 10۔
مرکز یوسف حسن: اول 11، 12، 17۔ دوم 12، 14، 15، 16، 19،
مرکز پہاڑی شریف: دوم 20، 21، 23، 24، 25، 26، 30، 31، 32، 33، 34، 35، 36، 37، 38، 39، 40، 157، 158، 160، 166 ۔ سوم 22، 159۔
مرکز تپکل: اول 362 ۔
مرکز گیٹور: اول 47۔ دوم 42، 43، 44، 45، 48، 50، 51، 52، 53، 54۔ سوم 46، 55۔
مرکز سیرپور کاغذ نگر: دوم 62، 63۔
مرکز ظہیر آباد: دوم 64، 65، 66، 67، 68۔ سوم 69۔ تکمیل 70۔
مرکز کاماریڈی: دوم 72، 72/A۔
مرکز کریم نگر: دوم 73، 73/A، 73/B۔
مرکز کرنول: دوم 74، 77، 78، 80، 81، 82، 83، 85، 86، 88، 91، 93، 94، 95، 363، 364۔ سوم 87، 92۔
مرکز گدوال: دوم 98، 100۔ سوم 97۔
مرکز گلبرگہ: دوم 102۔ سوم 105، 106۔ تکمیل 104۔
مرکز گوداوری کھنی: دوم 367، 368، 369، 372، 373، 374۔ تکمیل 370۔
مرکز محبوب نگر: دوم 108۔
مرکز نلگنڈہ: اول 111/2۔ دوم 109، 110، 111، 111/1، 111/3۔
مرکز نظام آباد: اول 114، 117۔ دوم 115، 116۔
مرکز ورنگل: اول 118۔
مرکز [illegible]: دوم 119، 120، 121، 123، 124، 125، 126، 127۔
مرکز عادل آباد: دوم 128۔
مرکز نرمل: سوم 129، 130، 131، 132، 133۔
مرکز آصف پور: اول 138، 140۔ دوم 135، 136، 137، 139، 141، 142، 143۔ سوم 134۔
مرکز بیدر: دوم 144، 145، 146، 147، 148، 149، 150، 151، 152، 153، 154۔
مرکز کھریال: دوم 375، 376۔
مرکز گنڈی والا: اول 365۔ دوم 362، 364، 366، 402۔ سوم 367، 401۔
مرکز حیدرآباد (ذکور): اول 161، 167، 172، 184، 185، 194۔ دوم 169، 170، 179، 187، 188، 193، 196، 198۔
مرکز حیدرآباد (اناث): اول 201، 203، 204، 210، 215، 219، 220، 227، 236، 242، 243، 256، 257، 259، 260، [illegible]، 277، [illegible]، 291، 292، [illegible]، 321، 327، 332، 222/A۔ دوم [illegible]، 205، 206، 208، 211،
213، 221، 224، 225، 226، 231 تا 236، 237، 239، 244، 245، 248، 251، 255، 263، 264، 266 تا 274، 278، 288، 294، 298، 307، 309، 311، 313 تا 315، 319، 323، 325، 329 تا 331۔ سوم 218، 238، 240، 241، 275، 296۔ تکمیل 222، 246، 247، 297، 317، 351، 357، 359، 363، 355، 361، 41/A۔

اردو عالم

مرکز ادونی: دوم 01، 04، 06۔ سوم 02، 05۔ ونگور: دوم 08 تا 12۔
مرکز یوسف حسن: دوم 14 تا 19، 22، 24 تا 26، 28، 30، 34، 35، 37، 38۔ سوم 20، 23، 27، 29، 32، 33، 36۔
مرکز کلن چیرو: دوم 40، 42، 43، 45، 46، 48، 50، 661، 662۔ سوم 39، 44، 47، 49۔
مرکز پوچم پاڈ: اول 51، 54، 58، 60، 664۔ دوم 52، 53، 55 تا 57، 59، 61، 62، 65، 71، 666۔ سوم 63، 64، 68، 69، 663، 665۔
مرکز پہاڑی شریف: اول 75، 349۔ دوم 72 تا 74، 76 تا 85، 360 تا 362۔
مرکز تپکل: دوم 86 تا 90۔
مرکز ججگلہ: دوم 91، 92، 94 تا 96۔ سوم 93۔
مرکز گیٹور: دوم 102، 103، 106، 111 تا 113، 120، 125، 129۔ سوم 115، 130۔
مرکز سنگاریڈی: دوم 134، 135، 137، 139، 140، 146، 147، 160، 171۔ سوم 132، 133، 138، 145، 152، 156، 159، 162، 164۔ تکمیل 172، 174، 176۔
مرکز سیرپور کاغذ نگر: دوم 178، 179، 181، 182، 184، 185، 188 تا 193۔ سوم 177، 180، 183۔
مرکز ظہیر آباد: دوم 214۔
مرکز کاماریڈی: دوم 220 تا 226، 228، 229۔ سوم 216، 227۔
مرکز کریم نگر: اول 230، 232، 234، 369، 371۔ دوم 231، 367، 368، 370۔ سوم 366 ۔
مرکز کرنول: دوم 235۔ سوم [illegible]۔
مرکز گدوال: اول 246۔ دوم 245۔ تکمیل 247، 247/A۔
مرکز محبوب نگر: دوم 248 تا 250، 675، 676، 678، 679۔ سوم 677۔
مرکز [illegible] پیٹ: اول 363۔ دوم 251 تا 254، 364، 365۔
مرکز نلگنڈہ: اول [illegible]، 372، 373، 378۔ سوم 257، [illegible]، 376، 379۔
مرکز نظام آباد: اول 270۔ دوم 267 تا 275، 278، [illegible]۔
مرکز ورنگل: اول 296، 298، 301، 301/A۔ دوم 281، 285 تا 287، 289، 290، 293۔ تکمیل 282۔
مرکز [illegible]: دوم 302 تا 304، 306 تا 308، 310۔ سوم 309۔
مرکز عادل آباد: دوم 311 تا 313، 315۔ سوم 314۔
مرکز نرمل: سوم 322، 323۔
مرکز آصف پور: اول 329۔ دوم 327، 328، 330، 331، 333، 335، 336، 337/A۔
مرکز بیدر: دوم 338 تا 345۔
مرکز شمس آباد: دوم 347، 348۔
مرکز کھریال: اول 705۔ دوم 692 تا 694۔ سوم 695۔
مرکز گنڈی والا: اول 696، 698، 703، 706۔ دوم 699، 701، 702، 704، 705، 709۔
مرکز حیدرآباد (ذکور): اول 372، 380، 382، 387، 392، 396، 409 تا 412، 420، 431، 432۔ دوم 373، 374، 379، 385، 386، 391، 393، 397 تا 399، 402، 403، 405، 408، 414، 422 تا 426، 429، 430، 435۔ سوم 436، 439۔ تکمیل 631، 632، 635، 377۔
مرکز حیدرآباد (اناث): اول 472، 474، 475، 476، 482، 487، 490، 561، 563، 575 تا 578، 580، 581، 584، 595، 596، 599، 601 تا 603، 606، 607، 612، 614۔ دوم 470، 471، 477، 479، 480، 484، [illegible]، 503، 505، 506، 508، 509، 516، 518، 519، 524، 530، 535 تا 537، 540 تا 542، 547، 549، 552، 555، 557 تا 559، 565، 567، 571، 573 تا 587، 589، 592، 598، 600، 604، 605، 609، 610، 615، 617، 618، 692، 716۔ سوم 613، 527 تا 529، 543۔ تکمیل 551، 483، 636، 637 تا 639، 640، 642، 643، 645 تا 650، 651، 652، 653، 660 تا 664، 116۔

اردو فاضل (پرچہ نصاب) مکمل

مرکز ادونی: اول 01، 04، 07، 08۔ دوم 03، 06۔
مرکز ونگور: دوم 11 تا 14، 16، 18۔
مرکز یوسف حسن: اول 19، 23۔ دوم 20 تا 22، 25 تا 27، 29، 30، 34، 41۔ سوم 24، 33۔
مرکز کلن چیرو: اول 42۔ دوم 43، 44، 540۔
مرکز پوچم پاڈ: اول 45، 48، 51۔ دوم 47، 49، 50، 52، 60، 543 تا 545۔ سوم 57۔
مرکز پہاڑی شریف: [illegible]
مرکز تپکل: [illegible]
مرکز ججگلہ: [illegible]
مرکز [illegible]
مرکز سنگاریڈی: اول 120۔ دوم 101، 105، 106، 108، [illegible]۔ سوم 132، [illegible]، 103، 104، 122۔

مرکز [illegible]: اول 143، دوم 138 تا [illegible]، [illegible]-[illegible]
[illegible] تا 168۔

مرکز [illegible] آباد: اول 170، دوم 166، 167، [illegible] تا 172،
[illegible] 178، 179 تا 180، 181، 184، [illegible]، [illegible]، 201،
[illegible]۔

مرکز [illegible]: دوم 210، سوم [illegible]۔

مرکز [illegible]: دوم 213 تا [illegible]، 217 تا 232، 237، [illegible]
[illegible]۔ سوم [illegible]، 541۔

مرکز [illegible]: اول [illegible]، دوم 244، 246 تا 248،
[illegible]، 262، 265، 266۔ سوم
[illegible]، 284۔

مرکز [illegible]: دوم 1586، 1587، 1591۔ سوم 1588۔

مرکز [illegible]: دوم [illegible] تا 271، 273، 276 تا 279، 282۔
سوم [illegible]، 275۔

مرکز [illegible]: دوم 1594۔

مرکز [illegible]: دوم 283 تا 285، 287، 289، 292 تا
[illegible]، 1556، 305، 311، 312۔ سوم 297
[illegible]، 316۔

مرکز [illegible]: اول 324۔ دوم 317، 319، 1551،
[illegible]۔ سوم [illegible]، 1558۔

مرکز [illegible]: اول 340، 341۔ دوم 335 تا 334،
[illegible]، 351، 355۔ سوم 350۔

مرکز [illegible]: اول [illegible]، 373، 387۔ دوم 360،
362، 361، [illegible]، 364 تا 366، 369، 373 تا 379،
391، 401، [illegible]، [illegible]، 411 تا 413،
415، [illegible]۔ سوم 357، 360، 363،
417، 418۔

مرکز [illegible] آباد: اول 427۔ دوم 421 تا 426، 428،
432، 434 تا 436، 438، 440، 445، 448، 449،
[illegible]، 451۔ سوم [illegible]۔

مرکز [illegible]: اول 455۔ دوم [illegible]، 458 تا 460۔

مرکز [illegible]: دوم 461 تا 465، 467، 468، 470، 472،
[illegible]۔

مرکز [illegible] آباد: دوم 476 تا 478، 483، 487۔ سوم 479،
[illegible]، 484 تا 486۔

مرکز [illegible]: دوم 488، 490، 494، 496، 510، 517، 521۔
سوم [illegible]، 491، 492، 495، 496، 498 تا 500،
[illegible]، 503، 507، 509 تا 512، 515، 516 تا 518،
[illegible]۔

مرکز [illegible]: دوم 522۔

مرکز [illegible] آباد: دوم 524، [illegible]۔ سوم 532۔

مرکز [illegible]: دوم 526 تا 530، 532، 536 تا 1571،
1573۔ سوم 1572۔

مرکز [illegible]: دوم 1574، 1575، 1580، 1581،
1585۔ سوم 1577 تا 1579، 1582، 1584۔

مرکز حیدرآباد (ذکور): اول 1128۔ دوم 1027، 1028،
1035، 1051، 1070، 1073، 1076، 1087، 1088،
1092، 1093، 1095، 1097، 1099، 1106، 1107،
1111، 1113 تا 1116، 1122، 1127، 1307، 1090،
1546۔ سوم 1028، 1038، 1041، 1075، 1089،
1123۔

مرکز حیدرآباد (اناث): اول 1210، 1228۔ دوم 1140،
1141، 1145، 1146، 1147، 1149 تا 1153، 1155، 1156، 1158،
1174، 1177 تا 1182، 1185، 1189، 1190،
1196، 1204، 1206 تا 1208۔ 1206، 1209، 1219،
1225، 1228، 1540، 1238۔ سوم 1142، 1143،
1158، 1160، 1161، 1165، 1173، 1178، 1184،
1186۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: 601 تا 616، 618، 620۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: 621 تا 644۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: 648 تا 650، 652، 653 تا 656، 658،
660 تا 663، 665، 667، 669، 670۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: 671 تا 676۔

مرکز [illegible]: 678، 680 تا 688۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: 689، 691، 693، 695 تا 698۔

مرکز [illegible]: 699۔

مرکز [illegible] آباد: 702 تا 706۔

مرکز [illegible]: 709 تا 714، 716۔

مرکز [illegible]: 717 تا 721، 782۔

مرکز [illegible]: 724، 727، 730، 731۔

مرکز گوداوری کھنی: 1618 تا 1622، 1628 تا 1631،
1633، 1634۔

مرکز [illegible] نگر: 733، 736، 737 تا 740۔

مرکز [illegible]: 741 تا 743، 749 تا 750۔

مرکز [illegible]: 752 تا 758۔

مرکز [illegible] آباد: 762 تا 790۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: 759 تا 765، 767۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: 770۔

مرکز [illegible] آباد پلیٹ سائنس: 768، 769۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: 771۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: 772 تا 776، 783۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: 777 تا 781، 1553۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: 782/A۔

مرکز حیدرآباد (ذکور) پلیٹ سائنس: 1259، 1261، 1267،
1289 تا 1292، 1294، 1296، 1298، 1300، 1301،
1305، 1363، 1364۔

مرکز حیدرآباد (اناث) پلیٹ سائنس: 1251، 1252، 1256،
1258، 1265، 1266، 1270، 1272، 1274 تا 1277،
1287 تا 1281، 1284، 1285، 1306 تا 1311،
1316 تا 1317، 1320، 1325 تا 1327 تا 1330،
1332 تا 1337، 1340، 1341، 1343، 1345، 1346،
1348، 1349، 1350۔

اردو فاضل قدیم نصاب مکمل

مرکز [illegible]: دوم 801، 804، 809، 810، 813، 815،
[illegible]، 818۔ سوم 802، 803، 806۔

مرکز [illegible]: دوم [illegible]، 845۔

مرکز [illegible] آباد: دوم 847، 848، 850۔

حیدرآباد (ذکور): دوم 1382، 1385، 1401، 1406،
[illegible]، 1405۔ سوم 1396۔

مرکز حیدرآباد (اناث): اول 1368۔ دوم 1356، 1366،
1376، 1380، 1384، 1386۔ سوم 1363، 1367،
1388۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: دوم [illegible]۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: دوم 851، 853، 854، [illegible] تا 855،
[illegible]۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: دوم 867 تا 870، 872، 873۔

مرکز [illegible] آباد پلیٹ سائنس: دوم 881، 883، 886۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: 887، 888، 889، 890۔

مرکز [illegible]: دوم 890۔

مرکز گوداوری کھنی مکمل: 1606 تا 1609۔

مرکز [illegible] مکمل: 894 تا 898، 898/A، 909۔

مرکز [illegible] آباد پلیٹ سائنس: دوم 899، 905۔ سوم 901۔

مرکز [illegible] پلیٹ سائنس: اول 913۔ دوم 909 تا 912۔

مرکز [illegible] مکمل: 920 تا 947۔

مرکز [illegible] مکمل: 948 تا 951۔

مرکز [illegible] مکمل: 952 تا 957۔

مرکز [illegible] مکمل: 960۔

مرکز [illegible] مکمل: 961۔

مرکز گوداوری کھنی مکمل: 1636 تا 1680۔

مرکز [illegible] مکمل: 966۔

مرکز [illegible] مکمل: 1646، 1650، 1651، 1653،
1670۔

مرکز [illegible] مکمل: 1760 تا 1763، 969، 973 تا
1763/A، 1763/B۔

مرکز [illegible] آباد مکمل: 976، 977، 1751۔

مرکز [illegible] مکمل: 978 تا 983۔

مرکز [illegible] آباد مکمل: 984، 986، 985، 1549،
1544۔

مرکز [illegible] مکمل: 987 تا 1616۔

مرکز حیدرآباد (ذکور) مکمل: 1481، 1483، 1487،
1488، 1492، 1494، 1497، 1499۔

مرکز حیدرآباد (اناث) مکمل: 1501 تا 1505، 1512،
1514، 1516، 1522، 1523، 1525، 1528، 1529،
1531، 1533، 1537، 1539 تا 1541۔

(ادارہ)

به یادگار سید محی الدین قادری زور

سنِ اجرا: ۱۹۳۸ء　　　　　　　　　　فون : 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۶۱　　　　　　اگست ۱۹۹۹ء　　　　　　شمارہ: ۸

فی پرچہ	۱۶ روپے	مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ	۲۵ ڈالر
زرِ سالانہ	۱۷۵ روپے	پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	۱۰ ڈالر
کتب خانوں سے	۲۰۰ روپے	انگلستان	۱۵ پونڈ

ناشر: ادارہ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲ (اے۔پی) انڈیا۔

کمپیوٹر کتابت: شعبۂ کمپیوٹرس، ادارۂ ادبیاتِ اردو

رمن راج سکسینہ، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے او۔ ایس۔ گرافکس، نارائن گوڑہ میں طبع کرواکے ادارہ ادبیاتِ اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

کتابیں

مضامین

نظمیں ○ غزلیں ○ رباعیات

افسانے

مطالعے

اشاریہ

رپورٹ

○●○

پون ورما

ترجمہ : اسامہ فاروقی

کتاب : غالب ، شخصیت اور عہد

باب چار : ۱۸۵۷ء کا صدمہ ، جاں کاہ

(قسط : ۹)

سقوطِ دہلی کے وقت غالب کا نام انگریزوں کی تیار کی ہوئی مشتبہ اشخاص کی فہرست میں کافی اوپر تھا ۔ ہر طرف لوگوں کو نہایت کم زور شہادت کی بنا پر بہ عجلت بغیر مزید تحقیقات کے سزائے موت دی جارہی تھی ۔ شہر پر دوبارہ قبضے کے فوراً بعد انھیں بہ غرض تفتیش کسی کرنل برن کے ہاں طلب کیا گیا ۔ غالب دستنبو میں اس کا ذکر کرتے ہیں مگر صریحاً اسے ایک غیر اہم بات باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں : "۵ / اکتوبر کو پیر کا مصیبت آفریں دن تھا ۔ دوپہر کے وقت اچانک چند گورے اس دیوار پر چڑھ گئے جو بند کردہ دروازے سے ملی ہوئی ہے ۔ وہاں سے ایک چھت پر اور چھت سے کود کر گلی میں آگئے ۔ راجہ نریندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا کچھ مفید نہیں ہوا ۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کر کے راقم الحروف کے گھر میں گھس آئے ۔ ان گوروں نے بھل منسی سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا ۔ مجھ کو ، ان دونوں بچوں ، دو تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر حقیقت پسند ، دانش ور کرنل براؤن (دراصل برن ۔ مصنف) کے پاس لے گئے ، جو چوک سے اسی طرف قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے ۔ کرنل براؤن نے مجھ سے بہت نرمی و انسانیت سے بات کی ۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا ۔ خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کردیا ۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا ، اس خوش اخلاق کرنل براؤن کی تعریف کی اور چلا آیا ۔" اس صورتِ حال میں جب انگریز گولی پہلے مارتے اور پوچھ تاچھ بعد میں کرتے تھے ، غالب ، ان کے گھر والوں اور سارے ملازمین کی پوچھ گچھ کے لیے گرفتاری اس میں شک نہیں کہ ایک جگر خراش تجربہ رہا ہوگا ۔ لیکن بہ ظاہر غالب نے اپنے حواس مجتمع رکھے تھے ۔ بہ قول حالی کرنل موصوف نے غالب سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا : "ول ، تم مسلمان ؟" غالب نے کہا : "آدھا ۔" کرنل متعجب ہوا اور کہا : "اس کا کیا مطلب ؟" تب غالب نے اپنا وہ مشہور جواب دیا : "شراب پیتا ہوں ، سور نہیں کھاتا ۔" کرنل یہ سن کر بہت محظوظ ہوا ۔ اس امر کے پیش نظر کہ انگریزوں کے لیے تمام مسلمان مشتبہ تھے ، غالب کا اپنے مذہبی تعلق کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ ، ان کے حقیقی خیالات کی عکاسی کرنے کے علاوہ ، قرینِ مصلحت بھی تھا ۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر وہ اپنے ساتھ ان چند رسیدوں میں سے ایک ، یا شاید وہ واحد رسید ، لے گئے تھے ، جو ان متعدد قصیدوں کے جواب میں لندن سے آئی تھیں جو انھوں نے ملکہ ، وکٹوریہ کی شان میں لکھ کر بھیجے تھے ۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ کرنل اس طرح کی اسنادِ خوش نودی سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں تھا ۔ اس نے غالب سے پوچھا کہ جب سرکار برطانیہ کا شہر پر دوبارہ قبضہ ہوا تو وہ حاضر کیوں نہ ہوئے ؟ غالب نے جواب دیا کہ "میں چار کہاروں کا افسر تھا ، وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے ، میں کیوں کر حاضر ہوتا ؟" آخر کار کرنل برن نے غالب اور ان کے گھر والوں کو رخصت ہونے کی اجازت دی ، گو کہ اس میں شک ہے کہ جیسا کہ حالی کہتے ہیں اس نے یہ کام واقعی "نہایت مہربانی" سے کیا ۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں غالب کے معاملے میں انگریزوں کے شبہات بالآخر انھیں مجرم قرار دینے کے لیے شہادت

کے قدردان اور ان کے دستنبو شائع کرنے کی بہ دولت دور ہوئے ۔

۱۸۵۷ ء کے بعد انگریزوں کی فرماں روائی نے دلی کا سیاسی ، سماجی ، مادی اور نفسیاتی نقشہ ناقابلِ تنسیخ طور پر بدل ڈالا ۔ غالب نے اس انقلابی کایا پلٹ کے ہر پہلو کو اپنے باطن میں سمو لیا ۔ ۱۸۵۷ ء کے پہلے شہر کا مقررہ اور جانے بوجھے نقاطِ حوالہ کے درمیان اہتزاز کرنے والا ایک داخلی آہنگ تھا ۔ فرنگیوں کی موجودگی سے ایک بے میل سرکا کا اضافہ تو ہوا لیکن اس سے بنیادی نظام میں تغیر نہیں آیا تھا ۔ مغل بادشاہ کی روز افزوں نمایاں سیاسی بے بسی پریشان کن ضرور تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اسے پچالیا گیا تھا ۔ اس کی تلافی کرنے والے دوسرے عوامل تھے مثلاً عام وخاص کی رگ و پے میں سرایت کیا ہوا شاعری کی دیوی کا عشق اور اس کی جستجو ۔ لیکن ۱۸۵۷ ء کے نتیجے میں ایک نئی رفتار اور ایک نیا آہنگ رائج ہوا ۔ غالب اور ان کی پیڑھی کے افراد اور ان کے جیسا سماجی و اخلاقی پس منظر رکھنے والے دیگر بے شمار لوگوں کا مقدر اس سے شدت کے ساتھ بے آہنگ رہنا تھا ۔

سقوطِ دلی کی رات کو انگریزی افواج کے سپہ سالار جنرل ولسن نے تین صدیوں سے زائد عرصے کے دوران مغل اقتدار کے مقام مقدس دیوانِ خاص میں پُرتکلف دعوت کا انتظام کر کے اپنی فتح کا جشن منایا ۔ اس کے بعد کے دنوں میں شاہی محل کو باقاعدہ لوٹا اور تاخت و تاراج کیا گیا ۔ ان چند کم قیمت جواہرات کو جو کندہ تصاویر اور پچی کاری میں بچ رہے تھے سنگینوں سے اکھاڑا گیا ۔ مدہوش فوجیوں نے نفیس جھاڑ فانوسوں کو قہقہے لگاتے ہوئے پاش پاش کیا ۔ چھت گیریوں میں طلائی مرصع کاری کے ایک ایک ٹکڑے کو تاراج کیا گیا ۔ موتی مسجد کے گنبد پر چڑھے ہوئے سونے کے پتر کو نکالا اور فوج کی نگہ داشت کے مصارف کی پا بہ جائی کے لیے بیچا گیا ۔ جب لوٹ کھسوٹ ہو چکی تو چند پرانی پوشاکوں ، دواؤں اور معدودے چند کتابوں کے علاوہ کچھ نہیں بچا تھا ۔ دیوانِ عام کو اسپتال میں تبدیل کر دیا گیا تھا ۔ " شاہ جہاں کے پرستان جیسے خوش نما شہ نشین ، شاہی ایوان اور چمن زار " فوجیوں کی بارکوں ، طعام خانوں اور رسد و شراب کی دکانوں میں تبدیل کر دیے گئے تھے ۔

شاہی خاندان کے اکیس شاہ زادوں کو ایک ہی دن میں " موت کا حکم سنایا گیا ، پھانسی دی گئی اور ان کی لاشوں کو چھکڑوں پر لاد کر لے جایا گیا ۔ " دوسرے کئی شہ زادوں کو ان کے ہار مان لینے کے بعد بے دردی سے گولی مار دی گئی اور ان کی لاشوں کو نمائش کے لیے چاندنی چوک میں اس حالت میں رکھا گیا کہ بدن پر ستر پوشی کے لیے محض ایک لنگوٹ تھا ۔ بہادر شاہ ظفر نے خود کو انگریزوں کے حوالے کیا اور انھیں لال قلعے میں نیچی چھت اور چونے کی قلعی کی ہوئی بے آرائش دیواروں والی تنگ و تار کوٹھری میں مقید رکھا گیا ۔ وہ ایک عجوبہ بن کے رہ گئے " جس کے تماشے سے کمشنر کی بیوی سے لے کر رتبے میں اس سے کم تر کوئی بھی وہ یورپین محظوظ ہو سکتا تھا جس کا دل کھڑے رہنے اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا کرے ۔ " ان کو دیکھنے والوں میں سے ایک نے جہاں پناہ کی حالت کی روداد یوں لکھی ہے : " ۔ ۔ ۔ وہاں ایک نیچی چارپائی پر میلے کچیلے سفید سوتی کپڑوں کے جوڑے میں ملبوس اور پھٹی پرانی شالیں اور رضائیاں لپیٹے ایک دبلا پتلا ، کوتاہ قامت آدمی جھکا ہوا بیٹھا تھا ۔ ۔ ۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو اس حقے کو جو وہ پی رہا تھا اس نے ایک طرف رکھ دیا اور وہی شخص ، جو پہلے اگر کوئی اس کے حضور میں بیٹھ جاتے تو اسے اپنی توہین سمجھتا تھا ، یہ کہتے ہوئے کہ اسے ہم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ، ہمیں بڑی عاجزی سے سلام پر سلام کرنے لگا ۔ " دوسروں نے لکھا ہے کہ " ان کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلتا تھا ، وہ دن رات فرشِ زمین پر نظریں گاڑے ہوئے ، چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے جیسے کہ ان حالات سے جن سے اب وہ دوچار ہیں وہ قطعی بے خبر ہیں ۔ " دوسروں کا کہنا ہے کہ انھوں نے بہادر شاہ کو " اپنے خوابوں کے بارے میں بے ربط باتیں کہتے اور اپنے بعض اشعار کا حوالہ دیتے سنا ۔ ۔ ۔ " کہا جاتا ہے کہ کاغذ اور قلم میسر نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اشعار اپنی کوٹھری کی دیوار پر ایک جلی ہوئی لکڑی سے لکھتے تھے ۔ اکتوبر ۱۸۵۸ ء میں وہ تاحیات رنگون جلاوطن کر دیے گئے ۔

غالب بہادر شاہ کے استاد تھے ۔ ان کی راہ و رسم کئی دہے پرانی تھی ۔ ان کے دوستانہ تعلقات ، کبھی کبھار کی کشیدگی کے باوجود ، ایک دوسرے کے لیے خاصے احترام اور محبت کے جذبات سے مملو تھے ۔ یہ امر معنی خیز ہے کہ دستنبو میں غالب بادشاہ کے خلاف کچھ بھی کہنے سے احتراز کرتے ہیں ۔ یہ روابط پشت در پشت کے تھے ۔ بہادر شاہ کے فرزند بھی غالب کے شاگرد تھے ۔ گزشتہ کئی سالوں سے غالب قلعہ ، معلی میں حاضری دے رہے تھے ۔ بہ حیثیت شاعر ان کی نشوونما کی ابتداء شاہی مشاعرے کے ماحول میں ہوئی ۔ نصف صدی سے زائد عرصے کے دوران وہ قلعہ ، معلی کو اپنی زندگی کا محور اور غیر متبدل تناظر سمجھتے رہتے تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مغل اقتدار کی روز افزوں کم زوری سے واقف تھے ۔ بالحقیقت وہ اس کے شاہد عینی تھے ۔ لیکن وہ اس کے زوال کے لیے اچانک اختتام یا اس کی عظمت کی ایسی پُر تشدد بے حرمتی کے لیے تیار نہیں تھے ۔ بادشاہ کی تذلیل ، شاہی محل کی تاراجی اور اس کی بعض نفیس ترین عمارتوں کا بےدردی سے فوجی بارکوں میں تبدیل کیا جانا تاحیات ان کے لیے ایک مستقل صدمہ ، جاں کاہ رہا ہوگا

اس وقت جب جنرل ولسن دیوانِ خاص میں شیمپین کی چسکیاں لگارہا تھا ، دہلی ایک شہر ویران بن چکا تھا ۔ اس کے باشندوں کی اکثریت ، مسلمان اور ہندو ، امیر و غریب سبھی ، انگریز فوجیوں کے قہر سے بچنے کے لیے شہر چھوڑ کر بھاگ چکی تھی ۔ بہتیروں نے جاڑے بھر شہر کے باہر عارضی پناہ گاہوں میں پڑاؤ ڈالا ۔ ان کی اذیت نہایت شدید تھی لیکن انگریز ان کو دوبارہ داخلے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھے ۔ قید خانے پاٹ کھچ بھرے ہوئے تھے اور جو لوگ قید ہونے سے رہ گئے تھے قتلِ عام نے انھیں ٹھکانے لگادیا تھا ۔ ایک انگریز فوجی افسر لکھتا ہے : " ان خاموش گلیوں میں سنائی دینے والی ہر آواز میں کوئی عجیب اور پُر اسرار بات تھی ، جہاں ہمارے قدموں کی چاپ یوں گونجتی تھی جیسے یہ مردوں کا شہر ہو ۔ جا بہ جا کوئی کتا کسی لاش پر دبکا ہوا دکھائی دیتا یا حلق تک بھرا ہوا اڑنے سے قاصر کوئی گدھ ہمیں آتا دیکھ کر پر پھڑ پھڑاتا ایک طرف کو ہٹ جاتا ۔ ۔ ۔" غالب ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو شہر چھوڑ کر نہیں گئے تھے ۔ دستنبو میں وہ اپنے ذہنی کرب کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں : " سارے شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گے ، میں بھی ان میں سے ایک ہوں ۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں ، ان میں سے کچھ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں گویا وہ اس سرزمین دہلی کے باشندے تھے ہی نہیں ۔ بہت سے عالی مرتبہ لوگ شہر کے ارد گرد دو دو ، چار چار کوس پر ٹیلوں ، گڑھوں ، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے پڑے ہیں ۔" نومبر ۱۸۵۸ء کو انگریزوں نے عام معافی کا اعلان کیا لیکن شہر میں داخلے کے لیے اجازت نامے (ٹکٹ) کی قید لگائی گئی ۔ فروری ۱۸۵۹ء میں غالب ایک دوست کے نام خط میں لکھتے ہیں : " یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاس بانی پر قناعت نہیں ہے ۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے ، جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے ، اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے ۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے ۔ آٹھ دن قید رہتا ہے ۔ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے ۔ ۔ ۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا ۔ ۔ ۔ سارے شہر میں مشہور ہے کہ (آبادی کے) پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں ۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے ، بہ قدر مقدور نذرانہ دے ، اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے ۔ ۔ ۔" اس پر بس نہ کرتے ہوئے انگریزوں نے حکم دیا کہ جو لوگ شہر کی فصیل کے باہر پڑاؤ ڈال کر ٹھیرے ہوئے ہیں جائے پناہ تعمیر کرنے کے حق دار نہیں ہیں ۔ غالب برہمی کے ساتھ لکھتے ہیں : " کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں ؟ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھادو اور آئندہ کی ممانعت کا حکم سنادو ۔" (بہ نام مجروح ۲۰ / فروری ۱۸۵۹ء) ۔

بازآبادکاری کا سارا طریقِ عمل وقفے وقفے سے رک بھی جاتا تھا اور مایوس کن بھی تھا ۔ غالب حالات کے پیچ در پیچ نشیب و فراز پر باریک بینی سے نظر رکھے ہوئے تھے ۔ شروع ہی میں جب اجازت نامے (ٹکٹ) چھپ گئے اور باشندوں کی واپسی کا ڈھنڈورا پٹوادیا گیا ، مجسٹریٹ

دہلی اجرٹن صاحب بہادر بغیر کسی پیشگی اطلاع کے کلکتہ روانہ ہوگئے اور بہ قول غالب "دلی کے حمقا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، منہ کھول کر گئے ۔۔۔" کچھ عرصے کے لیے بازآباد کاری کا کام بالکل کھٹائی میں پڑگیا۔ کبھی کبھی دفعتاً اسے پھر سے شروع کیا جاتا لیکن اس طرح کہ ناقابل تو طور پر احکام کا ایک زمرہ دوسرے سے منسوخ کردیا جاتا۔ غالب طنزیہ لکھتے ہیں کہ انشاء اللہ دوچار برس میں ایک محلہ آباد ہوجائے گا۔ جلدی ہے؟ آخر کار نومبر ۱۸۵۹ء ہی میں جاکر، یعنی شہر سے عام بھگدڑ کے تقریباً دو برس بعد، واپسی کی عام اجازت دی گئی۔ لیکن ۱۸۶۲ء تک بھی دہلی آبادی ۱۸۵۷ء سے قبل کی آبادی کی سطح سے کہیں نیچے ہی تھی۔

اس زمانے میں انگریز حکام کے تعلق سے غالب کی تنقید کی بڑھتی ہوئی صاف گوئی پر ایک نظر ڈالنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ تنقید دوستوں نام خطوط میں ملتی ہے اور دستنبو کے عام رنگ سے کلیتہً متناقض ہے۔ ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں بغیر کسی تبصرے کے یہ نظم بھی شامل ہے:

بس کہ فعالِ ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب، انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دلی کا ذرہ ذرہ، خاک — تشنہ، خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا؟ — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا، کیے شکوہ — سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے داغ دل سے ہجراں کا

مئی ۱۸۵۸ء میں وہ ایک دوست کو مطلع کرتے ہیں کہ دلی میں "نہ قانون نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں آوے، وہ ویسا کرے۔" جولائی ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ انگریزوں کی بے ذوقی اور مطلق العنانی پر تباہ کن تنقید کرتے ہیں کہ ایک شناسا حافظ ممّو تمام الزامات سے بری اور بے گناہ ثابت ہوچکے تھے اور اب ان کی املاک، جن پر ان کا قبضہ و تصرف ثابت ہوچکا ان کو واپس ہونی تھیں۔ جب مثل پیش ہوئی تو کمشنر نے پوچھا: "حافظ محمد بخش کون؟" عرض کیا کہ "میں"۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممّو کون عرض کیا کہ "میں، اصل نام میرا محمد بخش ہے، ممّو، ممّو مشہور ہوں۔" اس چھوٹی سی بات کو سمجھنے کے لیے جس سعی کی ضرورت تھی شاید کمشنر کی برداشت کے باہر تھی۔ مثل داخلِ دفتر ہوئی اور میاں ممّو خالی ہاتھ اپنے گھر چلے آئے۔ اسی مہینے کے ایک خط میں وہ پھر شکایت کر ہیں کہ معاوضے کے تعین اور املاک کی واپسی کے معاملے میں سراسر بے اصولی ہی مسلمہ قاعدہ ہے۔ "ہر شخص کی سرنوشت کے مطابق ہور ہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے، نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔" بعض اوقات ان کی تنقید خلافِ توقع گہرا سیاسی رنگ ہوئے ہوتی ہے۔ دسمبر ۱۸۵۹ء میں حسین مرزا کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: "ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ، نقصانِ رعایا کے واسطے تجویز ہے اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے، البتہ اس کا معاوضہ بہ حساب وہ ایک سرکار سے ہوگا، یعنی ہزار روپے مانگنے والے سو روپے ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہدر اور بحل، مباح اور معاف ہے، اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔۔۔"

لیکن بنیادی طور پر ان کی تلخی کا باعث ذاتی صدمے کا شدید احساس تھا جس کا اظہار برہمی سے زیادہ حزن و ملال کے ایک مستقل ساس میں ہوتا تھا ۔ موسموں کی تبدیلی ، شہر کے بدلتے ہوئے رنگوں ، مسرتوں اور تفریحوں اور اپنے وسیع حلقہ ، احباب کی رفاقت سے لطف روزی کے تعلق سے غالب کی شدید قوتِ احساس کو ان کی گرتی ہوئی صحت کھل نہیں پائی تھی ۔ ۱۸۵۷ء کے نتیجے میں ، جب غالب خستہ حال اور ش باری سے داغ داغ شہر میں اپنے کمرے میں گوشہ نشین تھے ، ہم کو ۱۸۵۸ء کے اوائل میں لکھے ہوئے اس خط سے ان کی مایوسی اور پریشانی کا کچھ دازہ ہوسکتا ہے جس میں وہ اس امرواقعہ پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ اس سال اس شہرِ خموشاں میں ماہِ فروردیں اور عیدِ نوروز دونوں بغیر اطلاع پنے جلو میں شادمانی لائے بغیر آئے بھی اور گزر بھی گئے اور اپنی قسمت پر روتے ہیں کہ وہ بہار کے استقبال ، سبزہ و گل کے نظارے اور گلاب ، خوش بو سے لطف اندوز ہونے کے لیے بھی باہر نہیں جاسکتے ۔ تنہائی اور دل گیری ان کے اہم مسائل تھے ۔ ۲۵ / اپریل ۱۸۵۸ء کو وہ تفتہ کو غم ودا نہ لکھتے ہیں کہ تنہا ، ہم نشینوں کے بغیر ، دن بھر ان کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا ۔ یہی بات وہ دستنبو میں بھی دہراتے ہیں : "غالب جس ے شہر میں ہزاروں دوست تھے ، ہر گھر میں شناسا اور واقف کار موجود تھے ، اس تنہائی میں قلم کے سوا کوئی اس کا ہم زباں اور اپنے سایے کے علاوہ ئی اس کا ساتھی نہیں ہے ۔" علاحدگی پسند اور اس کے باوجود دراصل ملنسار غالب ، خوش اسلوب و خوش گفتار غالب ، وہ خوش طبع جو حاضر جوابی ے کسی بھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا ، وہ ادیب جو کبھی اس شاعر اور کبھی اس شاعر کے کلام کے حسن و قبح پر طول طویل مباحثوں کا رسیا ھا ، وہ لطیفہ گو جس کی داد دینے والے کثیر التعداد حاضرین حوصلہ افزائی کرتے تھے ، اس کے اشارے پر چلنے والے ثناخواں شاگردوں کا پسندیدہ استاد ، نت کے وقت منعقد کی جانے والی محفلوں اور باضابطہ مشاعروں میں مکرر ارشاد کی بار بار سنائی دینے والی صداؤں کا عادی شہر کا سرکردہ شاعر غالب ۱۸ ء کے قبل کے نظام کے پرتشدد طور پر تہس نہس کردیے جانے سے خود کو محرومی کا شکار اور تن تنہا محسوس کرتا تھا ۔

بالخصوص اپنے احباب سے جدائی ان کے لیے سوہانِ روح تھی ، جن میں سے بیشتر ان کے لڑکپن کے ساتھی تھے ۔ فضلِ حق کو جو اید ان کے سب سے زیادہ قریبی دوست تھے ، حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا سنائی گئی تھی ۔ ان سے دوبارہ ملاقات غالب کی قسمت میں یں لکھی تھی ۔ ایک اور قریبی دوست شیفتہ کو سات سال قید کی سنائی گئی ۔ (بعد میں وہ ضمانت پر رہا کیے گئے) ۔ دوسرے بے شمار کو یا تو پھانسی ی گئی یا پھر وہ انگریزوں کی انتقامی کارروائی سے بچنے کے لیے فرار ہوگئے ۔ چوں کہ غالب کی روز مرہ کی زندگی اور معمولات استواری کے ساتھ ان باب کی موجودگی سے مربوط تھے ان کی غیر موجودگی غالب کی زندگی میں ایک خلا کی حیثیت رکھتی تھی ۔ اس دور کے ایک خط میں وہ اس وجہ سے پنے رنج و غم کا بار بار ذکر کرتے ہیں ۔ جون ۱۸۵۸ء میں وہ لکھتے ہیں : "کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دوچار دوست نہ ہوتے ہوں ۔ اب دوں میں ایک شیورام جی برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا ، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں ۔ (دوسرے شہروں کے) دوستوں کا حال ہی نہیں لوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں ۔" (خط بہ نام تفتہ ۱۹ / جون ۱۸۵۸ء) جب بھی بر سبیل تذکرہ کسی دوست کا نام خطوط میں آجاتا ہے یادِ ماضی کی سردگی ان کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ ان دنوں کی یاد میں محو ہو جاتے ہیں جب ان کا حلقہ ، احباب صحیح سلامت تھا اور وہ سب اکٹھا یکتے اور ہنسی دل لگی کی باتوں میں اپنا وقت گزار سکتے تھے ۔ ان کے خطوط ہمیں ان احباب کی ایک لاتناہی فہرست فراہم کرتے ہیں جن کی غیر دجودگی پر وہ ماتم کناں ہیں : مظفر الدولہ ، میر ناصر الدین ، مرزا عاشور بیگ ، احمد مرزا ، حکیم رضی الدین خاں ، مصطفیٰ خاں ، قاضی فیض اللہ ، حسین زا ، میر مہدی ، میر سرفراز حسین ، میرن صاحب ۔ ۔ ۔ جس طریقے سے انھیں کھڑے گھاٹ پھانسی دی گئی یا گھر اور املاک چھوڑ کر شہر سے بھاگنے پر بور کیا گیا اس کا خیال انھیں دن رات بار بار آتا ہے ۔ اس غم سے وہ تادمِ آخر چھٹکارا نہیں پاسکے ۔ ۱۸۵۷ء کے کافی عرصے کے بعد بھی وہ چشمِ تصور ے سامنے ان دنوں کی تشکیلِ نو کرتے ہیں جب احباب ان کے ہاں بے تکلف آجاتے ، دل لگی اور تفریح کا سامان مہیا ہوجاتا ۔ ۱۸۵۸ء میں وہ ایک

خط میں لکھتے ہیں: "وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں ۔ سیڑھیوں پر نظر کہ وہ میر مہدی آئے ۔ وہ یوسف مرزا آئے ۔ وہ میرن آئے ۔ وہ یوسف علی خاں آئے ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ اللہ ! ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں ۔ میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا ؟" (خط بہ نام میر سرفراز حسین ۱۸۵۸ء)۔

غالب کی آزردہ دلی کا سبب نہ صرف احباب اور مانوس چہروں کی عدم موجودگی بلکہ دراصل ہم زبانوں اور ہم سخنوں کی یعنی ان لوگوں کی عدم موجودگی تھی جو ذہنی اور جذباتی مفہوم میں ان کی زبان میں بول سکتے ہوں ۔ ان مہذب و شائستہ لوگوں کی عدم موجودگی جن کے ساتھ دسیوں سال کے عملِ باہمی کے نتیجے میں یگانگت اور احترام کا رشتہ استوار ہوا تھا اور جن کے ساتھ وہ جانے بوجھے محاورے میں بے تکلف گفتگو کر سکتے تھے ۔ ۱۸۶۱ء میں اپنے ایسے ہی ایک دوست کے نام خط میں وہ لکھتے ہیں: "اب اہلِ دلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں ۔ یا پنجابی ہیں ۔ یا گورے ہیں ۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے ؟ ۔ ۔ ۔ نظام الدین ممنون کہاں ۔ ذوق کہاں ؟ مومن کہاں ؟ ۔ ایک آزردہ سو خاموش ۔ دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش ۔ نہ سخن وری رہی ۔ نہ سخن دانی ۔ ۔ ۔"

شہر دلی مادی طور پر بھی بدل رہا تھا ۔ اس پر دوبارہ قبضے کے فوراً بعد بہتیرے انگریزوں کا خیال تھا کہ سارے شہر کو زمین کے برابر کردینا ہی غدار ملحدوں سے نپٹنے کا واحد طریقہ ہے ۔ دوسروں کی سنجیدہ رائے یہ تھی کہ جامع مسجد کو گرا دینا اور لال قلعے کو منہدم کردینا اور ان کی جگہ ایک بڑا گرجا اور وکٹوریہ محل تعمیر کرنا چاہیے ۔ بالآخر ایک نسبتاً معتدل تجویز کو ترجیح دی گئی ۔ لال قلعے کو ڈائنا میٹ سے نہیں اڑایا گیا ۔ اس کے لاہوری اور دلی دروازوں کو (خاصے بے ڈھنگے پن سے) وکٹوریہ اور الیگزانڈرا دروازوں کا نیا نام دیا گیا اور محل کو فوجی بارکوں میں تبدیل کردیا گیا ۔ اسی طرح جامع مسجد اور تعلیم و تعلم کے مقامِ مقدس مدرسہ غازی الدین (دلی کالج) کے بہ شمول بہتیری عمارتوں کو فوجی بارکوں میں تبدیل کردیا گیا ۔ نفیس و خوش نما فتح پوری مسجد کو نجی جائداد کے طور پر ایک ہندو بیوپاری کے ہاتھ بیچ دیا گیا اور زینت المساجد کو حسب الحکم افسرانِ مجاز ایک تنور خانے یا بیکری میں تبدیل کردیا گیا ۔

غیر ملکی فاتحوں کا اولین مقصد دلی کو حکم رانی کے لیے مزید دست رس پذیر بنانا تھا ۔ دلی کے پر پیچ گلی کوچوں ۔ اس کی تنگ خم دار سڑکوں اور غیر متوقع بند گلیوں ۔ ان کے علاحدہ علاحدہ اور اس کے باوجود باہم دگر مربوط محلوں کی ساخت نے باغیوں کے لیے ایک مثالی جائے پناہ اور اوٹ کا کام دیا تھا اور انگریزوں کے لیے شہر پر دوبارہ قبضے کے کام کو بہت مشکل بنادیا تھا ۔ چناں چہ انگریزوں نے طے کیا کہ اس گھنی نامیاتی ساخت کو بدلنا ہی ہوگا ۔ عملِ جراحی کے دوران نشتر سے کی جانے والی چیرے پھاڑ کی طرح ایسی نئی کشادہ سایہ دار سڑکیں بنانی ہوں گی جو شہر کی تاریخی نشوونما کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آنے والی خصوصیات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس میں سے صاف سیدھی گزر جائیں ۔ کھلے قطعاتِ زمین کو وجود میں لانا ہوگا تاکہ حکم ران کی متجسس نگاہ شہر کے آرپار بہتر دیکھ سکے ۔ شہری منصوبہ بندی کا کام اس بنیاد پر کرنا ہوگا کہ نتیجتاً دلی ایک محفوظ و مامون فوجی چھاؤنی والا شہر بن جائے جہاں بغاوت کے ابتدائی آثار کا فوراً پتہ چلایا جاسکے اور انہیں موثر طریقے سے کچل دیا جاسکے ۔

شہری منصوبہ بندی کے نئے تقاضوں کے پیش نظر اب یہ لازم ہوگیا کہ کشمیری دروازہ چوکی کی بہ جائے لال قلعے کو شہر کے اہم ترین فوجی مرکز کی حیثیت دی جائے ۔ چناں چہ حکم صادر کیا گیا کہ قلعے کی فصیلوں سے ۴۴۸ گز کے فاصلے کے اندر واقع تمام عمارتیں منہدم کردی جائیں ۔ ابتداءً مشہور کاروباری مرکز دریبہ بھی حلقۂ انہدام میں شامل تھا ۔ لیکن بعد میں سربرآوردہ شہریوں کی نمائندگی پر اسے بخش دیا گیا ۔ جامع مسجد کے اطراف بھی تمام رکاوٹیں دور کر کے ایک کھلے قطعۂ زمین کو وجود میں لانے کا حکم دیا گیا ۔ طے ہوا کہ دو نئی سڑکوں اور ریل کی پٹری کے راستے میں واقع تمام عمارتیں بھی ڈھادی جائیں ۔ ذہنی کرب کے ساتھ غالب لکھتے ہیں: "جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا ۔ دکانیں ۔ حویلیاں ڈھائی جائیں گی ۔ دارالبقا فنا ہوجائے گا ۔ رہے نام اللہ کا ۔ ۔ ۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے ۔" (خط بہ نام مجروح ۸ / نومبر ۱۸۵۹ء)

۔ (دارالبقا : آزردہ کی قائم کی ہوئی وہ مشہور درس گاہ جہاں ادب ، طب اور دینیات کی تعلیم مفت دی جاتی تھی ۔ مصنف) " انہدامی کارروائی بے رحمی کے ساتھ متاثر لوگوں کے جذبات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ، انجام دی جاتی تھی ۔ انگریزوں کے لیے یہ کام محض رسمی یا تکمیلِ ضابطہ کے لیے نہیں بلکہ مناسب انتقامی کارروائی کی حیثیت بھی رکھتا تھا ۔ لکھنو میں جہاں ایسی ہی ایک کارروائی روبہ عمل لائی جارہی تھی ، چیف کمشنر اپنے ایک غیر رسمی خط میں ذکر کرتا ہے کہ "کیسے انہدام کے لیے مخصوص علاقوں میں انہدامی جتھے وارد ہوتے اور اتنی معمولی سی احتیاط برتے بغیر کہ چند ہی لمحوں میں زمین کے برابر کردیے جانے والے گھروں کے خالی ہونے کی پوری طرح تصدیق کرلیں اپنا کام شروع کردیتے ۔" مجوزہ طور پر فصیل بند شہر کے کل رقبے کے ایک تہائی کو گھیرنے والی چھاؤنی کو معرضِ وجود میں لانے کے لیے زمین کے وسیع و عریض قطعات پر بھی " اصلی مالکوں کے حقوق کا ضرورت سے زیادہ پاس و لحاظ کیے بغیر ، بیش تر اس حق کی رو سے جو فاتحین کو حاصل ہوتا ہے " قبضہ کرلیا گیا تھا ۔ غالب ان ہزاروں انسانوں کی بپتا پر مغموم تھے جو راتوں رات اپنے گھر بار سے محروم کردیے گئے تھے ۔ ان کا ذہنی کرب صرف مسلمانوں کے لیے نہیں تھا بلکہ شہر دلی کے سبھی باشندوں کی افسوس ناک حالت اور انسانوں پر ٹوٹنے والی مصیبت کی انتہائی شدت کی وجہ سے تھا ۔ ایک اور سطح پر انھیں نئی شہری منصوبہ بندی کے نتیجے میں شہر کی قلبِ ماہیت کا بھی شدت سے احساس تھا ۔ جب انگریز کوئی کوچہ ، گلی یا محلہ مسمار کرتے اور ملبے پر ایک کشادہ اور سیدھی سانیہ دار سڑک تعمیر کرتے تو دراصل وہ اس طرزِ زندگی کا قلع قمع کرتے تھے جس سے شہر کے مادی خط و خال میل کھاتے تھے ۔ ہندستان کے پرانے شہروں میں سڑکیں شاذ و نادر ہی کشادہ یا سیدھی ہوتی تھیں ۔ وہ " بیش تر ان علاقوں کی حیثیت سے کام آتی تھیں جہاں لوگ بے مقصد گھومتے پھرتے تھے ، ملتے جلتے تھے اور ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے ، جہاں سڑک کے کنارے کنارے خوانچے والوں کی قطار لگی رہتی تھی ، جہاں تجارتی سامان اور خدماتِ لائقہ خریدی اور فروخت کی جاتی تھیں اور جہاں ٹریفک ، جو بیش تر پیدل راہ گیروں اور لدوجان وروں پر مشتمل ہوتی ، سست رفتار ہوتی اور ان لوگوں کا لحاظ کرنے پر مجبور ہوتی جو راستے میں کھڑے اور کاروبار میں مشغول ہوتے ۔ سڑک ایک عام جگہ تھی جس کے معاشرتی اور تفریحی مقاصد تھے ۔ عموماً سڑک پر لوگ کہیں جانے کے لیے نہیں نکلتے تھے ، سڑک خود ایک منزلِ مقصود تھی اور بجائے خود ایک اہم واقعہ ۔" اسی طرح بند گلیاں جن کے لیے شہری منصوبہ بندی کے انگریز ماہرین کے نقشوں میں کوئی جگہ نہیں تھی ، " ایک محلے کو گٹھا ہوا اور اپنوں کے لیے مخصوص رکھنے کے لیے ، راہ گیروں اور سواریوں کی آمد و رفت کو قابو میں رکھنے کے لیے اور شہر کے مختلف محلوں کے لیے مخصوص بھائی چارے کے خیالات اور ایکتا کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی ساخت کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل " تھیں ۔

اس شہر پر حکم رانی کے خواہش مند ایک غیر ملکی کے لیے بالکل نمایاں اپنی ان تمام مادی لغویات کے باوجود شہر دلی اپنے باشندوں کے لیے ، ان کے کاروباری اور تفریحی دونوں اغراض پورا کرنے والا ، ہر دل عزیز ، کارکرد اور اطمینان بخش ماحول فراہم کرتا تھا ۔ دلی کے شاعر اس کی دل فریبیوں کے تعلق سے کھلم کھلا جذباتی تھے ۔ اس کی باقاعدہ قطع و برید کا لاچار شاہد عینی ہونا غالب کی قسمت میں لکھا تھا ۔ جب انہدام کی کارروائی شروع ہوئی تو وہ بگڑ کر لکھتے ہیں : "کیوں میں دلی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں ؟ جب اہلِ شہر نہ رہے ، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں ؟ " (خط بہ نام یوسف مرزا ، ۲۶ / جولائی ۱۸۵۹ء) ۔ لیکن برہمی کی جگہ جلد ہی شدید دل شکستگی نے لے لی اور اس دور کے ان کے خطوط میں ہمیں ان کے پسندیدہ شہر سے جس انداز میں بے رحمی کا برتاؤ کیا جارہا تھا اس کے ہر پہلو کا تفصیلی بیان ملتا ہے ۔ یکے بعد دیگرے وہ دلی کے بعض نہایت مشہور بازاروں ، خاص بازار ، اردو بازار ، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خانم بازار کو خاک میں ملتا اور سارے کے سارے محلوں اور کٹروں کو بے نام و نشان دفعتاً غائب ہوتا دیکھتے ہیں ۔ جانی بوجھی مشہور عمارتیں اور احباب کے وہ محلات ، حویلیاں اور کوچے جہاں وہ اکثر ملاقات کے لیے آیا جایا کرتے تھے ان کی آنکھوں کے سامنے زمین کے برابر کردیے گئے ۔ ہر جگہ ملبے کے ڈھیر سے شہر دلی ایک بنجر ویرانہ دکھائی دیتا تھا ۔ غالب لکھتے ہیں کہ "شہ

صحرا ہوگیا ہے ، خصوصاً اس لیے کہ جنگ اور انہدامی کارروائیوں کے جوش کے نتیجے میں کنوؤں کی نگہ داشت سے غفلت پانی کی شدید قلت کا باعث ہوئی تھی ۔ وہ لکھتے ہیں : "مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں ، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے ۔ ۔ ۔ اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں ، واہ رے حسنِ اعتقاد ! ۔ ۔ ۔ دلی و اللہ اب شہر نہیں ہے ، کیمپ ہے چھاؤنی ہے ۔"

ایک انگریز نووارد جو ۱۸۵۷ء کے چند سال بعد دہلی آیا غیر جانب دارانہ لیکن حقیقتِ واقعہ کو ظاہر کرنے والی راست بیانی سے کام لیتے ہوئے لکھتا ہے : "بغاوت کے بعد سے ۔ ۔ ۔ دیسی شہر بڑی حد تک منہدم کر دیا گیا ہے اور جو بچا ہے اس سے شہر کی دس سال قبل کی وسعت یا آبادی کا نامکمل طور پر ہی اظہار ہوتا ہے ۔" انہدامی کارروائیوں سے شہر کے مادی خط و خال ہمیشہ کے لیے بدل گئے ۔ ان سے باشندگانِ شہر کے طرزِ زندگی کے نہایت اہم پہلوؤں میں خلل پڑا ۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کارروائیاں "غیر منقولہ شہری جائدادوں کی ملکیت کے تعلق سے ایک غیر معمولی انقلاب" کی آلۂ کار بھی ثابت ہوئیں ۔ وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ان لوگوں کی املاک ، جنھوں نے یا تو بغاوت میں حصہ لیا تھا یا جن کے بارے میں ایسا شبہہ تھا ، انگریز حکام نے ضبط کرلی تھیں ۔ اب انھوں نے طے کیا کہ جن کے گھر منہدم کیے گئے تھے انھیں بہ طور معاوضہ ان ضبط شدہ املاک میں سے اتنی ہی قیمت کا حصہ دیا جاسکتا ہے ۔ اس تجویز کو روبہ عمل لانے کے لیے مالکین کو ٹکٹ جاری کیے گئے جن پر ان کی منہدمہ املاک کی قیمت کی نشان دہی کی گئی تھی اور جن کے بدلے میں وہ ضبط شدہ املاک میں اپنا حصہ حاصل کرسکتے تھے ۔ بادی النظر میں یہ ایک سیدھی سادی اور عمدہ تجویز تھی ۔ لیکن اس طرح کی تجاویز کسی جامد سماجی و معاشی ماحول میں تو روبہ عمل آتی نہیں ۔ املاک جن کے نام دراصل منتقل کی گئی تھیں ان سے یہ ٹکٹ معدودے چند بیوپاریوں اور مہاجنوں نے خرید لیے اور انھوں نے اپنی ایک غیر رسمی اجارہ دارانہ انجمن کے ذریعے اس وقت جب کہ زمین کی قیمت غیر معمولی طور پر گر چکی تھی ، وسیع و عریض املاک ساری کی ساری حاصل کرلیں ۔ ضبط شدہ املاک کو نیلام کرنے کی انگریز حکام کی متبادل تجویز پر عمل آوری سے بھی انھی لوگوں کو فائدہ ہوا ، جنھوں نے ان املاک کے قابلِ لحاظ حصے پر اس ادعا کے ساتھ کہ پرانے مکین ان کے گروی دار تھے ، قبضہ کر رکھا تھا ۔ اس طرح اس سارے عمل درآمد نے ایک نئے تجارتی طبقے کے منظم ظہور اور قدیم جاگیردار روداروں کی مزید مفلسی کے لیے ایک عامل اور تیز کنندہ کا کام دیا ۔

ان دونوں طبقوں نے شہر پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے بعد لوٹ مار میں نقصان اٹھایا تھا ۔ اس وقت مالِ غنیمت کی نشان دہی کرنے والے جاسوسوں کا تقرر کیا گیا تھا اور دفینہ کھوجنے والوں کو سرکاری "کھدائی کے اجازت نامے" دیے گئے تھے ۔ انگریز فوجی افسر ، سپاہی ، ان کی بیویاں اور رشتے دار کدالیں اور کرچھے لیے ایسے ولولے اور بشاشت سے اس کام میں لگے تھے کہ اس کا اور باشندگانِ دہلی کی دل شکستگی کا تضاد مضحک طور پر نمایاں تھا ۔ روزانہ حاصل کیا جانے والا مالِ غنیمت ایک جوشیلے انگریز کے بہ قول "بہت ہی زیادہ ، تقریباً ناقابلِ یقین" تھا ۔ کھدائی میں پائے جانے والے دفینوں کا بیش تر حصہ "جو پائے وہی رکھے" کے اصول کے مطابق پانے والوں کے تصرف میں آیا ۔ ستم ظریفی یہ کہ اس مالِ غنیمت کا ایک حصہ دیوانِ خاص کے پاس ایک مکان کی چھت پر برائے فروخت نمائش کے لیے رکھا گیا ۔

بیوپاری ساہوکار طبقہ اس منظم لوٹ مار سے بری طرح متاثر ہوا تھا ۔ بغاوت کے دوران بھی اس طبقے کو باغی سپاہیوں کے سرگروہوں کی طرف سے کیے جانے والے بے روک ٹوک اور حدود سے متجاوز استحصالِ زر سے اتنا ہی زیادہ نقصان پہنچا تھا ۔ قابلِ تعریف ہے اس کی اقتصادی لچک ، کاروباری کس بل اور نظریاتی تغیر پذیری جس کی بہ دولت یہ طبقہ باقی رہا ۔ جاگیردار طبقہ ، امرا نسبتاً کم پھرتیلا تھا ۔ دونوں کے طرزِ زندگی میں بنیادی فرق تھا ۔ اول الذکر طبقہ کفایت شعاری کی روایتی اہمیت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے پشت در پشت پونجی جٹانے کے کام میں لگا رہا تھا ۔

موخرالذکر طبقہ اس طرزِ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے جس کے اخراجات کی پابہ جائی کے لیے اس کے پاس وسائل کا فقدان تھا، قرض لینے کو ترجیح دیتا تھا۔ یہ طبقہ، انگریزوں کی طرف سے کی جانے والی لوٹ مار، املاک کی بڑے پیمانے پر ضبطی اور انہدامی کاروائیوں سے مربوط پیچ در پیچ تجارتی معاملات کے نتیجے میں لاعلاج طور پر ہزیمت کا شکار ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس طبقے کا اقتصادی زوال کافی پہلے شروع ہوچکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے قبل بھی، بعض سربرآوردہ زمین داروں کو چھوڑ کر، روپے پیسے کی طاقت ساہوکاروں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء تک ان کی اقتصادی قوت او سماجی برتری میں توافق نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد لالہ شاہی کا ابھار خود اعتمادانہ علانیہ تھا۔ چنا مل، صاحب سنگھ، رام جی داس، نارائن داس مہیش داس، جاگی داس، مہرچند اور مرزا علی جیسے لوگ سماج کی پیشوائی کے دعوے دار ہوئے اور انگریزوں نے، جو جاگیردار روداروں کی وفاداری کو شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے اور اپنی حکم رانی کے اگلے مرحلے میں نئے شرکاءِ کار کی تلاش کے خواہش مند تھے، یہ پیشوائی ان کو عطا کردی۔

اس سیاسی اور سماجی توازن میں تبدیلی کا اور توازنِ قوت کے خود ان کے اور قدیم طبقہ، امرا کے خلاف متغیر ہونے کا غالب نے جلد ہی اندازہ لگالیا۔ نظریاتی مفہوم میں اس رجحان کے پیچھے کارفرما سماجی اور معاشی عوامل سے چاہے وہ واقف نہ رہے ہوں لیکن جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھ اس کا ادراک ایک حد تک انھیں ضرور تھا اور اس تعلق سے اپنے رنج و غم کے اظہار میں انھوں نے ابہام سے بالکل کام نہیں لیا۔ ۱۸۵۸ء میں ایک دوست کے نام خط میں، جو ایک اخبار کے لیے دلی میں خریداروں کی تلاشش میں تھے، وہ لکھتے ہیں: "صاحب ۔۔۔ یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو؟ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں، وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے۔ کاغذ (بہ طورِ اخبار) روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے۔" (خط بہ نام شیونرائن آرام ۱۸۵۸ء)۔ اسی رنگ میں کچھ دنوں بعد وہ لکھتے ہیں "ساہوکاروں کے اور جوہریوں کے گھر روپے اور جواہر سے بھرنے ہوتے ہیں۔ میں ۔۔۔ وہ مال کیوں کر اٹھاؤں گا (خط بہ نام حاتم علی بیگ مہر ۲۰ دسمبر ۱۸۵۸ء)، نومبر ۱۸۵۹ء میں سارے طبقے کی فریاد کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ نواب رام پور کو لکھتے ہیں کہ وہ حکام میں سے کسی سے بھی متعارف نہیں ہیں، سارا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ ۱۸۵۹ء میں گورنر جنرل کی دلی میں آمد متوقع تھی۔ اس موقع پر روایتی پُرتکلف دربار منعقد ہونے والا تھا۔ اس سے پہلے دلی میں گورنر جنرل کا آخری دربار لارڈ ہارڈنگ نے منعقد کیا تھا۔ اس دربار میں غالب کے لیے ایک معزز جگہ یعنی داہنی طرف دسویں نشست مقرر تھی اور ہمیشہ "سنہرے اساوری کے سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالاے مروارید تین رقم" اور خلعتِ فاخرہ پاتے تھے۔ لیکن اب طبقہ امرا میں سے بہتیروں کو، جن کی پہلے دربار میں معزز جگہیں مقرر تھیں، مدعو تک نہیں کیا گیا تھا۔ غالب بھی انھیں میں سے تھے اور ناگواری کے ساتھ لکھتے ہیں: "نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ / دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے ۔۔۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے (دلی کے آس پاس سے سات چھوٹی ریاستیں) کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا: جھجر، بہادر گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے، اس میں دوجانہ و لوہارو تحتِ حکومتِ ہانسی حصار۔ پاٹودی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں (دوجانہ و لوہارو) کو یہاں لے آئے تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس ۔۔۔ اہلِ اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں: میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدالدین خاں، بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و مطرود، محروم و مغموم۔" (خط بہ نام مجروح ۲۰ / دسمبر ۱۸۵۹ء)۔ کچھ ہی دنوں بعد وقوع پذیر سماجی تغیر کلی کے ناقابلِ منسوخی ہونے کے حیرت انگیز ادراک کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ایک دوست کو مشورہ دیتے ہیں: "اب یوں سمجھو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے، نہ جاہ و حشم رکھتے تھے، نہ املاک تھے، نہ پنشن رکھتے تھے۔" (خط بہ نام حسین مرزا ۳۱ / دسمبر ۱۸۵۹ء)۔

غالب کے خطوط میں طبقہ امرا کے مسلمان ارکان کے خصوصی ذکر سے ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ انھیں صرف مسلمانوں کی رنجش کا احساس تھا۔ درحقیقت اسی زمانے میں وہ یقینِ کلی کے ساتھ تفتہ کو لکھتے ہیں کہ میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھ

ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دلی کے مغل امرا کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی جب کہ نئی نئی ابھر کر سامنے آنے والی لالہ شاہی میں بیشتر ہندو پیش پیش تھے۔ اس کی وجہ سے نظامِ نو پر دلبستہ زنی کے دوران بعض اوقات غالب ہندوؤں اور مسلمانوں میں امتیاز کرتے ہیں۔ لیکن میں ذرہ برابر بھی شبہہ نہیں کہ اس طرح وہ اپنے فرقے نہیں بلکہ اپنے طبقے کی شکایات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اپنے اس رول میں وہ ان افراد معاشی بربادی اور تذلیل کے تعلق سے، جو پیش تر متمول اور بارسوخ تھے اور جن میں سے بعض کا ان کے قریبی دوستوں میں شمار تھا، برہمی تفویش کے اظہار کے اہل تھے۔ وہ طنزیہ ذکر کرتے ہیں کہ حکیم احسن اللہ خاں نے اپنے دیوان خانے کو زنانہ مکان بنالیا ہے اور خود جہاں اصطب تھا وہاں بیٹھتے ہیں۔ باقی سارے مکان میں ایک انگریز اترا ہوا ہے۔ وہ برہمی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ انہدامی کارروائیوں کے بعد ملبہ تک مالک کی ملکیت نہیں سمجھا جاتا ہے، یوں سمجھو کہ سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا ہے۔

نومبر ۱۸۵۹ء میں وہ لکھتے ہیں: "یہاں اغنیا اور امرا کے ازدواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اس مصیبت کی تاب لا کو جگر چاہیے۔" (خط بہ نام یوسف مرزا ۲۸ / نومبر ۱۸۵۹ء)۔ دو سال بعد بھی یہ منظر مستقل سوہانِ روح تھا۔ اپریل ۱۸۶۱ء میں وہ تفتہ کے نام میں لکھتے ہیں: "۔۔۔ تم یہاں ہوتے اور بیگماتِ قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔"

غیر واضح طور پر، صورتِ حال کے تجزیے سے زیادہ شاعرانہ وجدان کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء ہی میں غالب کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ نظا کہن ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا ہے۔ تفتہ کے نام اس دور کے ابتدا ہی یعنی دسمبر ۱۸۵۷ء میں لکھے ہوئے ایک خط میں مغل بادشاہ کے زما کے نظمِ عالم اور اس طرزِ زندگی کو جس سے وہ (یعنی غالب اور تفتہ) مانوس تھے محض فریبِ نظر، خواب و خیال کی بات اور کسی پچھلے جنم کی یادداشت قرار دیتے ہیں۔ اس دوسرے جنم میں بعض اشخاص شاید وہی ہوں لیکن اور کوئی بھی چیز اصلی حالت کو کبھی لوٹ نہ پائے گی۔ شہر کے بدلے ہوئے مادی اور سماجی خط و خال سے اس جذباتی احساس کی صریحی تصدیق ہوتی تھی۔ دسمبر ۱۸۵۹ء میں غالب لکھتے ہیں: "دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں، کوئی شہر قلم رو ہند میں اس نام کا تھا۔" (خط بہ نام مجروح ۲۰ / دسمبر ۱۸۵۹ء)۔

یہ ایک تاریخی دور کے گزر جانے پر اسی غالب کی لکھی ہوئی خبر موت ہے جو خود ۱۸۵۷ء کے قبل کی دلی کی ایک منتخب علامت تھے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ بہ جز اس کے جو وہ فی البدیہہ لکھ لیتے تھے ان کو اب شعر گوئی سے کوئی رغبت نہیں رہی تھی۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں تفتہ کے نام خط میں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ "شعر کہنا اب مجھ سے بالکل چھوٹ گیا ہے۔ اپنا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیوں کر کہا تھا۔" ان دنوں اکثر انھیں علائقِ دنیوی سے ماورائیت کا ایک شدید احساس، انسان کی مسلسل جدوجہد کی لاحاصلی اور وجودیاتی مفہوم میں اپنی تمام امنگوں اور خواہشوں کے کھوکھلے پن کا تصور اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ ۱۸۵۹ء میں تفتہ کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> "بو علی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری، سب خرافات ہے۔۔۔ ہندوؤں میں کوئی اوتار ہوا تو کیا، اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا! دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گم نام جیے تو کیا! کچھ وجہِ معاش ہو اور کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ جس سناٹے میں میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے، اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں،

مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے ۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا ؟ "

انھیں یقین کلی تھا کہ اب وہ زیادہ نہیں جئیں گے ۔ بڑھاپا ، گرتی ہوئی صحت اور روزانہ زندگی کے لامتناہی نشیب و فراز اس فلسفیانہ یوسی کا سبب تھے ۔ دسمبر ۱۸۵۹ء میں ایک دوست کے نام خط میں وہ لکھتے ہیں : "میری زندگی کب تک ؟ ۔ ۔ ۔ اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا بیٹھا ہوں ۔ وہاں نہ روٹی کی فکر ، نہ پانی کی پیاس ، نہ جاڑے کی شدت ، نہ گرمی کی حدت ، نہ حاکم کا خوف ، نہ مخبر کا خطر ، نہ مکان کا کرایہ دینا ہے اور نہ کپڑا خریدنا پڑے ۔ نہ گوشت گھی منگاؤں ، نہ روٹی پکواؤں ۔ عالم نور اور سراسر سرور ۔" (خط بہ نام حسین مرزا ۳۱ / دسمبر ۱۸۵۹ء) ۔
اقبت کی اس مبالغہ آمیز حمد و ثنا کے پیچھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک حقیقی روحانی ایقان تھا ، علائق دنیوی سے ذہنی لاتعلقی تھی اور بنی نوع سان کے لیے مقدر صدمات اور پریشانیوں سے ماورا ہوجانے کی سچی لگن ۔ جنوری ۱۸۶۱ء میں تفتہ کے نام خط میں وہ ویدانتی لہجے میں لکھتے ہیں :
بہت گزر گئی ہے ، تھوڑی رہی ۔ اچھی گزری ہے ، اچھی گزر جائے گی ۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفی کے قصائد کی شہرت سے عرفی کے کیا ہاتھ آیا ، ؤ میرے قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا ؟ سعدی نے "بوستاں" سے کیا پھل پایا ، جو تم "سنبلستان" سے پاؤ گے ؟ اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہوم و معدوم ہے ۔ نہ سخن ہے ، نہ سخن ور ہے ، نہ قصیدہ ہے نہ قصد ہے ۔ لاموجود الا اللہ ۔"

اور اس کے باوجود بہ حیثیت ایک فرد بشر غالب کا تناقض یہ تھا کہ ان کے نہایت ارفع و اعلیٰ فلسفیانہ خیالات ان کے ذاتی مقاصد ، راعات ، اور غیر معمولی انا کے فطری مطالبات کے تعلق سے پیہم انہماک کے ساتھ ہم وجود ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ جب وہ تفتہ سے کہتے ہیں کہ ن کے تمام قویٰ محض عدم کے حصول کے آرزو مند ہیں تو ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انھیں مسلسل یہ فکر کھائے ڈالتی ہے کہ گورنر نرل کے دربار میں انھیں مدعو کیا جائے گا یا نہیں ۔ دو متضاد ذہنی کیفیتوں کی ہم وجودی ایک کو غلط یا دوسری کو ریاکارانہ نہیں ثابت کرتی ۔ اس کے عکس لکھے وہ غالب کی شخصیت کی پیچیدگی کا اصلی سراغ فراہم کرتی ہیں ، اس غالب کی شخصیت کا سراغ جو ایک سطح پر سب سے الگ تھلگ ، دحانیت کا علم بردار ، علائق دنیوی سے ماورا اور لاتعلق تھا تو دوسری سطح پر مال و متاع کے حصول کا آرزو مند ، مغرور ، خودپسند اور خود غرض تھا ۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد غالب اور بارہ سال جیے لیکن وہ اس کے صدمہ ، جاں کاہ سے کبھی سنبھل نہیں پائے ۔ ۱۸۵۷ء کی اس صبح کو ب باغی سپاہی اپنے گھوڑے پوپہ دوڑاتے ہوئے دہلی میں داخل ہوئے تو یہ ان کے لیے ایسی حیرت انگیز بات تھی جس کے لیے وہ بالکل تیار ہیں تھے ۔ لیکن جب انگریز شہر سے نکال دیے گئے تو بہادر شاہ کے ایک درباری کی حیثیت سے آئندہ پیش آنے والے واقعات میں ان کا شمول ں سے کہیں زیادہ تھا جتنا چار ماہ بعد وہ انگریزوں کو شہر پر ان کے دوبارہ قبضے کے بعد باور کرانا مناسب سمجھتے رہے ہوں گے ۔ دستنبو کی حیثیت نگریزوں کی طرف سے ممکنہ طور پر کی جانے والی انتقامی کارروائی کے خلاف بروقت پیش بندی کی تھی ۔ اس کی ان کے حقیقی خیالات کے ترجمان ی حیثیت سے تعبیر نہیں کی جاسکتی ۔ بغاوت کے دوران ذاتی طور پر انھیں بہت مصیبت جھیلنی اور نقصان اٹھانا پڑا ۔ اس وقت تک وہ جوان ہیں رہے تھے اور ان کی صحت بھی گرتی جا رہی تھی ۔ لیکن یہ نتیجہ نکالنا کہ ان ہنگامہ خیز دنوں میں جب مغل بادشاہ دوبارہ لال قلعے سے حکم رانی رنے لگے تھے تو غالب کی حیثیت محض ایک علاحدگی پسند ، غیر جانب دار یا دل چسپی نہ رکھنے والے شاہد عینی کی تھی ان کی شخصیت اور اہم بات ہ کہ احباب کے نام ان کے خطوط کے بہ شمول دیگر شہادت ، دونوں کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہوگا ۔ وہ جدید مفہوم میں قوم پرست نہیں تھے لیکن چاہے وہ جتنا بھی چاہتے رہے ہوں کہ انگریز ان کے بارے میں ایسا سوچیں وہ انگریزوں کے شریک کار بھی نہیں تھے ۔ دیسی سپاہیوں کی بعض زیادتیاں انھیں ناگوار ضرور گزریں لیکن اس داعیہ کے تعلق سے ، جس کے یہ سپاہی علم بردار تھے ، ان کا رویہ غیر ہمدردانہ ہرگز نہیں تھا ۔ بغاوت کے بعد انگریزوں کی دہشت گردی نے انھیں جذباتی طور پر چور چور کردیا تھا ۔ ایک سارا طرز زندگی ہمیشہ کے لیے درہم برہم ہوگیا تھا ۔ ان

(باقی ص : ۳۴ پہ)

یوسف میخائلوچ ارانسکی
ترجمہ: اُسامہ فاروقی

حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان (وسط ایشیا) ماسکو، ۱۹۷۷ء

حصاری پریا لوگوں کی زبان، ہند آریائی زبانوں کے وسطی زمرے کی ایک بولی

(قسط: ۱۰)

پریا لوک کہانیاں

II (Xк.)

(1) č^{h}o ni-č^{h}o, yek pâšâ č^{h}o. (2) čali beṭá ta:a č^{h}o. (3) is-ko beṭá sare-γâya-ma ráske, yek-si-ti bi ran karake na-diné č^{h}o.

(4) in beṭu(n)-na kiyo ki: kaịni yek marta bi ran karake ni-detâ? (5) use kenja beṭa-sə-na kiyo ki: o, payo, kaịni aba-maro yek marta bi ran karaki ni-detá? jau, is palez-ma vaṛóu, apre-yaraša xarbuzo čúṇóu, is-ta javâl-ma kálou; is-ta — vazir avá — dôvai; vazir dânai, is-ta lijovái aba-m^{ə}re-kulá. is-ta paṛke k^{h}óvai, use-ba'd samjin č^{h}i: ya har xela xarbuzoi (č^{h}e). (6) is-ta vazir-na paṛke, aba-məra ^{h}eka-so taryó, aba-məre-na k^{h}ayô. (7) vazir-na kiyo ke: ka xel xarbuzo č^{h}o, tija k^{h}ayô? pâšâ-na kiyo ke: me ni-samtū. (8) vazir-na kiyo ke: tu kaịni ni-samtâ? čali dâṇe xar-buze-ta tija k^{h}ayō, isi-ki mane-ta keke dei. (9) pâšâ-na kiyo ke: me ni-samtū. (10) vazir-na kiyo ke: kétuno beṭa tarái? (11) us-na kiyo ke: čali dâṇu beṭá tarúí. (12) xob, keṛká ta-sə-ta ran karáke díni? na? beṭa-təre ran mangin č^{h}i.

(13) pâšâ kovai ke: tunḍoui (14) elči k^{h}itá karái, har kala-ma tâkái. (15) tuṇke ayin č^{h}i, ni-lati. (16) munḍé-kulá vazir jovái: na-lade. (17) ebé abá-maró juvab dôva, ham apəre tuṇke ladai.

(18) aba-sə-na jovab díno, isi-ki yaraša koṛe díno, azoqô díno, š'amš'er díno, bundux díno; jovab díno. (19) čalo ge. (20) xob. (21) ra-ma dova leke, lik^{ə}riye.

(22) ketuno din ra maré, ūya paṛ-kulá suté, avqât pakáye. (23) vaxt-a namâz-a úṭke, yek paị-pə-ta coṛke, hor-e-se čaịi gi. (24) ruṭi pakovái, ye ov-ma ge.

(25) is paye-se-na čali ruṭi pakáyo. (26) yek hat ayo zimin-ki bišta, yek ruṭi-ta leke čálo go.

(27) is munḍe-na ruṭi-ta káṛke târyó, avqât karyó. (28) pay-ū(n)-si ayé, avqat-a beṭkē, k^{h}âyé. (29) is payi-sə-na gai na-karyo yek-sə-ta be. (30) fe rat-a so ge.

(31) fazəra fer payū(n)-se čale ge. (32) munḍe-na fe čali ruṭi fer pakáyo. (33) fe yek hat ayo zimin-matá, fe yek ruṭi-ta leke čalo go.

(34) munde-na six-ta lal kâryó, ke fer u (oi) hat ayo, fe: yek ruti-ta lino, munde-na six-nalá láγad karyo hat-sə-ma, ruti tepar go.

(35) fer payū(n)-se aye. (36) xub. (37) fer avqat-(t)a betke kʰā lini. (38) payū(n)-pəre-kula gal ná-karyo. (39) fer vaxt-a namaz hôyo, fer payū(n)-se čale ge.

(40) munde-na usi tandur-ke jag-ta ku:uryó, do metir kuturyó, yek puri likəró. (41) ji karái, tal-a-se darvazui. (42) darvaze-ta kʰolái. (43) kʰolyo, ye kar čʰe. (44) mundo fe bára likuró, šamšer-pə -ta leke, fe varyo.

(45) yek biyo hor be čʰo. (46) us biye-ta kʰolyó, čali dev bete čʰe gard kam, qimár marin′ čʰi, sarun-ko lungo čʰo.

(47) mundo saran-ke-fera kalo go. (48) yek-e-se-na: bui-bu-yi âdamzât; murke dekʰai, biye-ma yek anmi kaloi (kanoi).

(49) us dev-na keko (kiyo ki): o, payo, in anmizât kanói (kalói). (50) un-(n)a kiyo ke: anmizât ustái, pai-mare-ko hat-ə-so sar gi. (51) is-ta jor kárke de sagái? is munde-na kiyo: me jor karke dūvái. (52) xub. (53) un-(n)a ke: jor karke dová, tu paimaro. (54) munde-na kiyo ke: maili-si. (55) — ka kâm-a təré? (56) munde-na kiyo ke: yek man paxta lâu, ketuno kila niltu-ta lâu, pai-tare-ke hat-(t)a jor karui. (57) xob. (58) un-(n)a lâyé. (59) xob. (60) munde-na tâbipí kâryó, hat-a-so jor hogiyo.

(61) xob. (62) dev kuyin′ čʰí: o pai, iya čâli bitya čʰi, isi-ko kuto-soi, havli-sə-ma bând-i, bexi kule-se ja néta; is-ta kul (kur) karái? (63) munde-na kiyo: yek man paxta lau, yek veró laui (64) in-(n)a lâyé. (65) munde-na vere-ta koyó, goš-e-sə-ta devū(n)-ta dino, kale-sə-ta ap-ə-na lino. (66) kale-sə-ta yek bôrri lakri-ma langáyo, isi bityən-ko kute-ko ʰeka-se bagáyō. (67) kuto kalepəra čaryó. (68) tal-ta munde-na sekin-sekin ji karto. (69) giyo. (70) xob. (71) havâ-ma čaráyo, kuto havâ-ma re giyo. (72) munde-na tal-ta kute-ko mate-sə-ma taponča máryo. (73) kuto tepar g′yo. (74) gal-a-se xunrezo čʰo. (75) munde-na katke lino. (76) paxtanará biya-sə-ta mustaqam kâryó — so halová, rijas ni-karta.

(77) mundo bityū(n)-kula varyo, gino: čali dane bitiya sute čʰi. (78) use kenja bitya-ko unguti-sə-ta lino, dasmal-e-sə-ta munde-na lino, apre dasmal-ta dino, apre unguti-ta dino.

(79) bára likʰró, devun-ta baláyo: yek-yek ate jaui (80) yek-yek ate ge. (81) munde-na martó g′yo, sare mâr sato. (82) oi čolaq dev re giyo. (83) tunke mar sató. (84) fe mundo bára likʰro. (85) fe: payun-se nav-a ayé, mundo beté čʰo.

(86) bit(iy)un-ko aba-so xabar-a g′yo: kuto-muro mar g′yo, bityun-muro-ko darvazo-so makam kâri. (87) iliči kuče-ma kádyo: tund, kis-na karil (88) iliči jatkun-kula ayó: o payo, mare qalama ya kur gâl-i: kute-ta. marke bagái, devun-ta marke bagái, bityun-ko be-ta makam kari; kis-na kari? (89) munde-na kiyo ke: mija kari. (90) xob. (91) tija kari, pâšâ-kula čal jūva.

(92) mundo g′yo. (93) pâšâ-na pišná karyó: «kis-na kari?» (94) munde-na: «mija kari». (95) — ki nišano? munde-na kiyo ke: «ya, le nišanō», kute-sə-ke nišane-ta dino, bitya-se-ko dasmal-ta dino, bitya-se-ko unguti-ta dino, devun-ko nišane-ta dino.

(96) pâšâ-na kiyo ke: ja, payun-pə-ta lekajai (97) mundo ilči-nára g'yo, payun-pə-ta lekayó. (98) pâšâ-na sad din-o sad rat viyâ dino, in-ta neka banke, biṭyun-pə-ta dino.

(99) ketuno din furé, munḍe-ko aba-so nind-a-se ayó. (100) ya mundo fe pâšâ-kula g'yo, javob mang'yo ke: ham aba-pəre-ke šar-ma jövâi. (101) pâšâ-na jovab dino.

(102) mundo rayiki hoyo, aba-pəre-ke šar-lab-a g'yo. (103) ketuno din čali jawuna rannn-pə-nára ra máre, aba-pəre-ko šar-ma rasé. (104) aba-so qarib budo gi, vazir abá-sə-ko ajag-a pâšâ hui. (105) ayi-si? — ō bi budi gi čʰe. (106) jatak utaré aba-pəre-ke šar-ma. (107) pâšâ: memân ayé čʰi, dumbo, ketuno čaval in-ṭamá dekaie!

(108) iya un jatkun-na ayé, anmún-kul-ta pišna karyó ke: falânča pâšâ čʰe, ni? (109) un anmun-(n)a kiyo ke: us pâšâ-ko jatak-a-se ge čʰe, o pâšâ kár bagáye, vâzír pâšâ hui. (110) in jatkun-(n)a pišna karyo: oi pâšâ čʰe ya mar gi? (111) anmun-(n)a kiyo ke: oi pâšâ čʰe, ran-i-si, pâšâ-ke kaniz-i, o pâšâ andoi. (112) jatkun-(n)a kiyo: ma-ta dakʰaui

(113) xob. (114) munḍe-ta leke ge aba-so-kulâ, mundo aba-pəre-kulá varyó. (115) munḍe-na aba-pə-ta dékʰyo, aba-pə-ta kune-ma leke, ji káriyo, baṭâyo, dasmâl-pə-ṭa ank-a-se maléo, ank-i-si kʰul giyo. (116) ayi-məré ki(n)? — keke aba-pəre-kul-ta pišna karyó. (117) ayi-taxi pâšâ-ki kaniz-i.

(118) mundo qâr-nára giyo pâšâ-kulá. (119) pâšâ uturo taxt-parta, mundo čaṛyó taxt-pará, zang máryo ke: davur falânča pâšâ-kui. (120) use ba'd is pâšâ-ta bakəri durayo. (121) sad din, sad rat viya dino.

(۲)

چھونی چھو یک پاشا چھو۔ چالی بیٹا ترا چھو۔ اس کو بیٹا
سارے فایا ماراس کے۔ یکیں سی تی بی رن کرا کے نہ دنے چھو۔
ان بیٹن ناکیو کہ: کینی یک مرتا بی رن کرا کے نی دیتا؟
انسے کینجا بیٹا سے ناکیو کہ: او، پایو، کینی ابا مارد یک مرتا بی
رن کرا کی نی دیتا؟ جاؤ، اس پلیز ماوڑو، اپسے یرشا خربوزو چنٹرو،
اس تا جوال ما کالو۔ اس تا، وزیر اوا، دو وئی۔ وزیر دانائی، اس تا
لجووائی ابا مرسے کلاُ۔ اس تا پاڑ کے کھووئی، اُسے بعد سجن چھی
یا ہر خیلا خربوزوئی چھے۔

(۲)

تھا، نہیں تھا، ایک پادشاہ تھا۔ اس کے چالیس بیٹے تھے۔ اس
کے سارے بیٹے سن بلوغ کو پہنچ چکے تھے (لیکن) ایک کی بھی
اس نے شادی نہیں کی تھی / حرف بہ حرف: ایک کو بھی اس
نے بیوی نہیں دی تھی)۔

یہ بیٹے کہتے تھے: "(باپ نے) کیوں (ہم میں سے)
ایک کی بھی شادی نہیں کی؟" اس کے چھوٹے بیٹے نے کہا
کہ: "لو بھائیو، ہمارے باپ نے کیوں (ہم میں سے) ایک
کی بھی شادی نہیں کی؟ جاؤ، اس باغیچے میں داخل ہو، اپنے
مطابق / اپنی عمر کے مطابق / خربوزے چنو، ان کو (ایک)
تھیلے میں ڈالو۔ (جب) وزیر آئے گا، اسے (وزیر کو) دیں گے۔
وزیر دانا ہے، (وہ) اسے ہمارے باپ کے پاس لے جائے گا۔
(ہمارا باپ) انھیں (یعنی خربوزوں کو) کاٹ کر کھائے گا۔

اس کے بعد (وہ) سمجھ جائے گا (عرف بہ عرف : سمجھ جائیں گے) (کہ) یہ (مزے میں) قسم قسم کے خربوزے ہیں۔"

●

اسس تا وزیرنا پاڑ کے ابا مرے ہیکا سو ترپو ۰ ابا مرے ناکھایو۔ وزیر ناکیو کہ : کا خیل خربوزو چھو۔ تجا کھایو ؟ پاشا ناکیو کہ : مے نی سمتو۔ وزیر ناکیو : تو کینی نی سمتا ؟ چالی دانٹرے خربوزے تا تجا کھایو ۰ اسی کی مانے تا کے کے دے ! پاشا ناکیو کہ : مے نی سمتو۔ وزیرناکیو کہ : کیتنو بیٹا ترائی ؟ اس ناکیو کہ : چالی دانٹرو بیٹا تروئیں۔ خوب ۰ کیڑ کاتا سے تارن کرا کے دینی ؟ نا ؟ بیٹا ترے رن مانگن چھیں۔

پاشا کو دئی کہ : ٹُنڈو ! ایلچی بھتا کرائی ۰ ہر کلاما حکائی۔ ٹُنٹر کے آئن چھیں ۰ نی لاتی۔ ٹُنڈے کُلا وزیر جو وائی : نہ لادے۔ یے آبا مرد جُواب دوں وا ۰ ہم اپرے ٹُنٹر کے لدائیں۔

انھیں کاٹ کر وزیر نے (خربوزوں کو) ہمارے باپ کے سامنے رکھا ۰ ہمارے باپ نے (خربوزے) کھائے۔ وزیر نے پوچھا : "کیسے خربوزے تھے (جو) تونے کھائے ؟" پادشاہ نے کہا کہ : "میں نہیں جانتا / میں نہیں سمجھتا / "۔ وزیر نے پوچھا : "تو کیوں نہیں جانتا / سمجھتا / ؟ تو نے چالیس عدد (چالیس دانہ) خربوزے کھائے ۰ اس کا مطلب بتا ! / اس کے معنی کہہ کے دے ! / پادشاہ نے کہا کہ : "میں نہیں سمجھتا "۔ وزیر نے پوچھا کہ : تیرے کتنے بیٹے ہیں ؟ اس نے (یعنی پادشاہ نے) کہا کہ : میرے چالیس عدد بیٹے ہیں۔" (وزیر) : "خوب" (پھر) ان میں سے کتنوں کی (تو نے) شادی کی ؟ نہیں ؟ (ایک کی بھی نہیں ؟) / تو اب / تیرے بیٹے بیویاں مانگتے ہیں۔"

پادشاہ کہتا ہے کہ : "ڈھونڈو ! " (وزیر) ایلچی اکٹھا کرتا ہے ۰ ہر بستی میں / قلعے میں / بھیجتا ہے۔ (ایلچی) ڈھونڈھ کے آئے ۰ پتہ نہ لگا پاسے / پا نہ سکے / وزیر لڑکوں کے پاس جاتا ہے (کہتا ہے) : "پتہ نہ لگا پائے / پا نہ سکے / ۔ (لڑکوں نے کہا) : "اب ہمارے باپ اجازت دیں ۰ ہم آپ ہی ڈھونڈ کر پائیں گے۔

●

ابا سے نا جواب دنو ۰ اسی کی یرشا کوڑے دنو ۰ اذوقو دنو ۰ شیر دنو ۰ بندوخ دنو ۰ جُواب دنو۔ چلو گے۔ خوب۔ راما دودا لے لے ۰ لکیریے۔

کِتُو دن راما رسے ۰ اُوں یا پاڑ کُلاسُتے ۰ اوقات پکا یے۔ وختا ازاُٹ کے ۰ یک پائی سپے تا چوڑٹ کے ۰ ہورسے سے چلی گی۔ پکودائی ۰ یے اود ماگے۔

اس پایے سے ناچال رُٹی پکایو۔ یکث بات ایو زمین کی بِتا رُٹی تالے کے پلوگو۔

باپ نے (ان کو) اجازت دی ۰ (ہر ایک کو اس کی عمر کے) مطابق گھوڑا دیا ۰ آذوقہ دیا ۰ شمشیر دی ۰ بندوق دی۔ رخصت کیا۔ چلے گئے۔ خوب۔ دعائیں لے کر سفر پر / راہ پر / نکلے۔

(نہ معلوم) کتنے دن سفر کیا ۰ وہاں (ایک) پہاڑ کے پاس ٹھہرے / لیٹے ۰ آرام کیا / کھانا پکایا۔ وقتِ نماز / صبح سویرے / اٹھ کر ۰ ایک بھائی کو (پڑاؤ پر) چھوڑ کر اور سب (بھائی) چلے گئے۔ (یہ بھائی) روٹی پکاتا ہے (اور) وہ شکار کو گئے۔

اس بھائی نے چالیس روٹیاں پکائیں۔ (اچانک) زمین کے

اِس مُنڈا ۔۔ مارُتی تا کاٹ کے تدیو، اوقات کریو ۔ پایوں
سی اپے اوقاتا بہیٹ کے کھایے۔ اس پایی سے ناگل نہ کریو یک
سے تاپے ۔ نے راتا سو گے۔

نیچے سے ایک ہاتھ (باہر) آیا، ایک روٹی لے کر چلا گ
اس لڑکے نے روٹیاں (تنور سے) نکالیں، کھا
اس کے بھائی آئے، بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اُن کے اِس
کسی سے بھی (اس واقعے کے بارے میں کوئی) بات نہ
پھر رات کو (سب) سو گئے۔

●

فزیرا فیر پایوں سے چلے گے ۔ مُنڈے نا فنے چالی رُٹی فیر
پکایو۔ فنے یک ہات آیو زمین متا فنے یک رُٹی تالے کے چلو گو۔
مُنڈے نا سیخ تالال کریو، کہ فیر اُدہات ایو، فیر یک رُٹی تالنو،
مُنڈے نا سیخ نلالغد کریو ہات سے ما، رُٹی ٹپٹر گو۔
فیر پایوں سے اُیے۔ خوب۔ فیر اوقات تابیٹ کے کھالنی۔
پایوں پرسے کُلا گل نا کریو۔ فیر وقتا نماز ہویو، فیر پایوں سے چلے
گے۔
مُنڈے نا اُسی تندور کے جاگ تا کُترّیو، دو میتر کُترّیو، یک
پڑہی لکیڑو۔ جی کرائی، تلاسے دروازوئی۔ دروازے تا کھولائی۔
کھولیو، یک کرچھے۔ مُنڈے نے بارا لکڑو، شمشیر پے تالے کے،
فنے وڑیو۔

اگلے دن سویرے بھائی پھر چلے گئے۔ لڑکے نے
روٹیاں پھر پکائیں۔ پھر زمین میں سے ایک ہاتھ (باہ
دوبارہ ایک روٹی لے کر چلا گیا۔
لڑکے نے ایک سیخ تپائی / لال کی / (اور) جب وہ
(باہر) آیا اور پھر ایک روٹی لی، لڑکے نے سیخ سے ہاتھ
دیا، روٹی (ہاتھ سے) گر گئی۔
پھر بھائی آئے۔ خوب۔ پھر بیٹھ کر کھانا کھایا۔
نے) اپنے بھائیوں سے کچھ نہ کہا۔ پھر صبح ہوئی / نماز
ہوا / ، پھر اس کے بھائی چلے گئے۔
لڑکے نے اس تنور کی جگہ کو کھودا، دو میٹر (گہرائی
کھودا، ایک بوریا نکلا۔ (بوریا) اٹھاتا ہے، نیچے / اس کے
دروازہ ہے۔ دروازہ کھولتا ہے۔ کھولا، (دیکھتا کیا ہے کہ
ایک گھر ہے۔ لڑکا پھر باہر نکلا، شمشیر لے کر دوبارہ وا
(گڑھے میں)۔

●

یک ہیو ہور بے چھو۔ اُس سے تا کھولیو، چالی دیو بیٹے چھے
گرد کم، قمار مارن چھی، سَرن کو لنگو چھو۔
مُنڈو سَرن کے نیرا کلوگو۔ یکے سے نا: بوئے بوئے آدم
ذات۔ مُڑکے دیکھنی، ہیے ما یک اُمی کلوئی۔
اس دیونا کیو کہ: او، پایو، ان اُمی ذات کلوئی۔ اُن نا کیو
کہ: اُمی ذات اُستائی، پائی مَرے کو ہاتے سو سڑگی۔ اس تا جور
کار کے دے سکائی ؟ اس مُنڈے نا کیو: ے جوڑ کر کے دوں

(وہاں) ایک دروازہ اور بھی تھا۔ (کیا دیکھتا
وہاں) حلقہ بنا کر چالیس دیو بیٹھے ہیں، قمار بازی کر رہے
ان کے سر ننگے ہیں۔
لڑکا اُن کے پاس (حرف بہ حرف، ان کے سروں پر
ہو گیا۔ اُن میں سے ایک (نے کہا): بوئے، بوئے آدم زاد
گندھ)۔ مُڑ کے دیکھتا ہے، دروازے میں ایک آدمی کھڑا۔
اُس دیو نے کہا کہ: او بھائیو، یہ آدم زاد کھڑا ہے۔

وئی۔ خوب۔ اُن ناکہ، جور کر کے دودا، تو پائی مَرو۔ منڈے ناکیو کہ، میلی سی۔ "کا کاما ترے؟" منڈے ناکیو کہ، یک من پختا لاؤ، کتو کلا نِلتو تا لاؤ، پائی ترے کے ہاتا جوڑ کروئی۔ خوب۔ اُن نا لالیے۔ خوب۔ منڈے نا طبیبی کاریو، ہاتا سو جوڑ ہو گیو۔

نے کہا، "(یہ) آدم زاد استاد ہے، ہمارے (چھوٹے) بھائی کا ہاتھ جل گیا ہے۔ (دیووں نے لڑکے سے پوچھا)، (تو اس کا) ہاتھ اچھا کر سکتا ہے؟ اس لڑکے نے جواب دیا، میں اچھا کردوں گا۔ خوب۔ انھوں نے کہا، (اگر) اچھا کردے (تو پھر) تو ہمارا بھائی ہے۔ لڑکے نے کہا، "اچھا"۔ (دیووں نے پوچھا): "تجھے کیا چاہیے؟" لڑکے نے کہا کہ، "ایک من کپاس لاؤ، اتنے کیلو نیل لاؤ۔ تمھارے بھائی کا ہاتھ اچھا کردوں گا۔ خوب۔ وہ (یہ سب) لائے۔ خوب۔ لڑکے نے طبیبی کی / علاج کیا /، اُس (دیو) کا ہاتھ اچھا ہو گیا۔

•

خوب۔ کوین چھی، اوپائی، ایا چالی بٹیا چھی، اِسی کو کتو سوئی، حولی سے ماباندی، بیجی کلے سے جانتیا۔ اس تا کر کرائی؟ منڈے ناکیو، یک من پختا لاؤ، یک ویٹرو لاؤ! اِن نا لالیے۔ منڈے نا ویٹرے تا کویو، گوشے سے تا دیوں تا دِنو، کلے سے تا اپنے لنو۔ کلے سے تا یک بوڑی لکڑی ما لنگایو، اِسی بٹیں کو کتے کو ہیکا سے لگایو۔ کتو کلے پیرا چڑیو۔ تل تا منڈے نا سے کن سے کن جی کرتو۔ گیو۔ خوب۔ ہوا ما چڑایو، کتو ہوا مارے گیو۔ منڈے نا تل تا کتے کو سٹے سے ما طمونچا ماریو۔ کتو تیر گیو۔ گلا سے خُن ریزو چھو۔ منڈے نا کاٹ کے لنو۔ پختا نزا بیا سے تا مستحکم کاریو، سو بلودا، عجبس نی کرتا۔

خوب۔ دیو کہتے ہیں: "او بھائی، یہاں چالیس لڑکیاں ہیں، اُن کا ایک کتا ہے، اُن کی حویلی میں بندھا ہے، اُس کے (اُن کے؟) پاس جانا بالکل ناممکن ہے، اس سے کیسے نبٹا جائے؟ (حرف بہ حرف: یہ کیسے کرے گا؟) لڑکے نے کہا: ایک من کپاس لاؤ، ایک سانڈ لاؤ۔ وہ (یہ سب) لائے۔ لڑکے نے سانڈ کو مارا / ذبح کیا /، گوشت دیووں کو دیا، اس کا سر خود لیا / آپ لیا /۔ اس کا سر ایک بڑی / لمبی / لکڑی پر بٹھایا، (لکڑی) کو ان لڑکیوں کے کتے کے آگے ڈال دیا۔ کتا سر پر چڑھ گیا / سر سے گتھ گیا /۔ نیچے سے لڑکے نے (اس لکڑی کو) آہستہ آہستہ اٹھانا شروع کیا۔ (لکڑی اوپر) اٹھی۔ خوب۔ ہوا میں اٹھایا، کتا ہوا میں رہ گیا۔ لڑکے نے نیچے سے کتے کے ماتھے پر طمنچہ چلایا۔ کتا گر گیا۔ (اس کتے کے) بدن پر زرہ تھی۔ لڑکے نے (اسے) اتار کر لے لیا۔ کپاس سے اُن کے (یعنی لڑکیوں کے) دروازے کو مستحکم کیا، سو بار ہلاؤ، چر چراتا نہیں۔

•

منڈو بیٹوں کلا وڑیو، گنترو، چالی دانڑے بٹیا ستے چھی۔ اُسے کینجا بٹیا کو انگوٹی سے تالنو، دسلے سے تا منڈے نالنو، اپرے دسل تا دنو، ابرے انگوٹی تادنو۔

لڑکا لڑکیوں کے پاس داخل ہوا، گنا، چالیس عدد لڑکیاں سو رہی ہیں۔ لڑکے نے ان میں سے سب سے چھوٹی لڑکی کی انگوٹھی / ، رومال / لیا، اپنا رومال، (اُسے) اوما، اپنا انگوٹھی (اُسے) دی۔

باہار نکلیو دیوں تا بلایو: یک یک اتے جاؤ! یک یک اتے گے۔ منڈو تا مارتو گیو۔ سارے مارستو۔ اوسے چولق دیو نسے گیو۔ تنڑکے مارستو۔ نے منڈو بارا لکڑو۔ فیر بایوں سے نوا اسپے۔ منڈو بیٹے چھو۔

(لڑکا) باہر نکلا۔ دیوؤں کو بلایا: "ایک ایک (کرکے) آتے جاؤ!"۔ (وہ) ایک ایک (کرکے) آتے گئے۔ لڑ (انھیں) مارتا گیا۔ سب کو مارڈالا۔ (صرف) وہ زخمی دیو رہ گیا (اسے بھی) ڈھونڈ کر مارڈالا۔ پھر لڑکا باہر نکلا۔ پھر اس کے بھائی دوبارہ آئے۔ (اور) لڑکا (بے کر) بیٹھا ہے۔

•

بٹیں کو ابا سے خبرا گیو: کتو مورد مرگیو۔ بٹیں مرو کو دروازہ سو بکم کری۔ ایلچی کوچے ما کاڑیو: تنڑڈ۔ کس ناکری! ایلچی جنگلن گلا آیو: او پایو۔ مارے قلاما یا کر گال ای: کتے تا مار کے بگائی۔ دیوں تا مار کے بگائی۔ بٹیں کو بے تا بکم کری۔ کس ناکری؟ منڈے ناکیو کہ: مجا کری۔ خوب۔ تجا کری، پاشا گلا چل جوں وا۔

منڈو گیو۔ پاشا نا پچھنا کریو: "کس ناکری؟" منڈے نا: "مجا کری"۔ "کی نشانو؟" منڈے ناکیو کہ: "یا، لے نشانو"۔ کتے سے کے نشانے تا دنو، بٹیا سے کو دسمال تا دنو، بٹیا سے کو آنگوٹی تا دنو، دیوں کو نشانے تا دنو۔

لڑکیوں کے باپ تک خبر پہنچی۔ "کتا میرا مرگیا۔ میری بیٹیوں (کے کمرے) کا دروازہ بند ہے۔" (اس نے) قاصد / ایلچی / گلی میں / کوچے میں / بھیجا: پتہ چلاؤ۔ کس نے (یہ کام) کیا ہے!" قاصد / ایلچی / (ان) لڑکوں کے پاس آیا: او بھائیو ہمارے گاؤں میں / قلعے میں / اس طرح کی بات (سننے میں آرہی ہے: (کسی نے) کتے کو مار کے پھینک دیا، دیوؤں کو مار کے پھینک دیا، لڑکیوں (کے کمرے کا) دروازہ بند کر دیا۔ (یہ سب کام) کس نے کیا؟ لڑکے نے کہا کہ: "میں نے کیا" خوب۔ (اگر) تو نے (یہ سب کام) کیا ہے (تو) پادشاہ کے پاس چل! لڑکا گیا۔ پادشاہ نے پوچھا: "یہ کام کس نے کیا؟" لڑکے نے کہا: "میں نے کیا"۔ نشانی / ثبوت / کیا ہے؟ لڑکے نے کہا کہ: "یہ لو نشانیاں"۔ کتے کی نشانی (یعنی زرہ) دی، لڑکی کا رومال دیا، لڑکی کی انگوٹھی دی، دیوؤں کی نشانیاں دیں۔

•

پاشا ناکیو کہ: پایں پے تا لیکاجا! منڈو ایلچی نارا گیو، پایں پے تا لے کایو۔ پاشا ناساد دنو ساد رات دیا دنو، ان تانیکا بان کے، بٹیں پے تا دنو۔

کتو دن فرے، منڈے کو ابا سو تندا سے آیو۔ یا منڈو نے پاشا گلا گیو، جواب مانگیو کہ: ہم ابا پرے کے شارما جوں وائی۔

پاشا نا جواب دنو۔

منڈو رسکی ہویو، ابا پدے کے شار لبا گیو۔ کتو دن چالی جو دنا رنں پہ نارا رامارے، ابا پرے کو شارمارے سے۔ ابا سو

پادشاہ نے کہا کہ: جا، بھائیوں کو لے کر آ!" لڑکا قاصد / ایلچی / کے ساتھ گیا، اپنے بھائیوں کو لے کر آیا۔ پادشاہ نے سو دن اور سو رات ضیافت کی، نکاح پڑھوا کر / نکاح باندھ کر / انھیں اپنی بیٹیاں دیں۔

کتنے دن گزر گئے، لڑکے کو اس کا باپ خواب میں دکھائی دیا۔ پھر یہ لڑکا پادشاہ کے پاس گیا، اجازت چاہی کہ: ہم اپنے باپ کے شہر / ملک / کو جاتے ہیں۔ پادشاہ نے اجازت دی / انھیں رخصت کیا /۔

قریب بُڈو گی • وزیر ابا سے کو جا گا پاشا ہوئی ۔ اَئی سی ؟ او بی بُڈی گی چھے ۔ جنک اُتیرے ابا پرے کے شارما ۔ پاشا : میمان اَیے چھی • دُمبوُ کتنو چاول اِن غما دکلے !

لڑکے نے راہ پکڑی • اپنے باپ کے شہر کی جانب چلا ۔ کتنے دن چالیس جوانوں نے اپنی بیویوں کے ساتھ سفر کیا • اپنے باپ کے شہر میں پہنچے ۔ (ان کا) باپ تقریباً بالکل بوڑھا ہوگیا تھا • (ان کے) باپ کی جگہ وزیر پادشاہ ہوگیا تھا ۔ (اور اُن کی) ماں ؟ وہ بھی بوڑھی ہوگئی تھی ۔ لڑکے اپنے باپ کے شہر میں اترے ۔

پادشاہ (نے کہا) : " مہمان آئے ہیں • دُنبہ اور اتنا چاوَل ان کے لیے بھیجو !

●

اِیا اُن جنکن نا ایے • اَنموُن کُل تا پِشنا کریو کہ : فلان چا پاشا چھے • نی ؟ ان اَنمُن نا کِیو کہ : اُس پاشا کو جنکا سے گے چھے • او پاشا کار بگایے • وازِر پاشا ہوئی ۔ ان جنکن نا پِشنا کریو : اوئی پاشا چھے یا مرگی ؟ انمُن نا کیو کہ : اوئی پاشا چھے • رَنی سی پاشا کے کنیزی • او پاشا اَنڈوئی ۔ جنکُن نا کیو : ماتا دکھاؤ !

خوب ۔ مُنڈے تالے کے گے ابا سو کُلا • منُڈو ابا پرے کُلا وڑیو ۔ منُڈے نا ابا پے تا دیکھیو • ابا پے تا کُشٹرے مالے کے • جی کاریو • بکایو • دَسمال پے تا آنکاسے ملے او • آنکی سی کھُل گیو ۔ " ائی مِرے کیں ؟ " کے کے ابا پرے کُل تا پِشنا کریو ۔ آئی ترِی پاشا کی کنیزی ۔

منُڈو قار نارا گیو پاشا کُلا ۔ پاشا اُترو تخت پُرتا • منُڈو چڑیو تخت پَرا • زَنگ ماریو کہ : دَوُر فلان چا پاشا کوئیں ۔ اُسے بعد اِس پاشا تا بکیری وُڑایو ۔ ساو دن ساو رات دیا دِنو ۔

○●○

یہاں وہ لڑکے آئے • لوگوں سے / آدمیوں سے / پوچھا کہ : فلاں پادشاہ ہے کہ نہیں ؟ ان آدمیوں / لوگوں / نے کہا کہ : اُس پادشاہ کے بیٹے چلے گئے ہیں • اُس پادشاہ کو کام سے بےدخل کر کے وزیر پادشاہ بن گیا ہے ۔ ان بیٹوں نے پوچھا : وہ پادشاہ ہے یا مر گیا ؟ ان لوگوں / آدمیوں / نے کہا کہ : وہ پادشاہ ہے • اس کی بیوی (نئے) پادشاہ کی کنیز ہے اور (وہ) پادشاہ اندھا (ہوگیا) ہے ۔ بیٹوں نے کہا : " ہم کو دکھاؤ ! "

خوب ۔ لڑکے کو اس کے باپ کے پاس لے کر گئے • لڑکا باپ کے پاس پہنچا ۔ لڑکے نے باپ کو گلے لگا کر اوپر اُٹھایا • بٹھایا اپنے رومال سے اس کی آنکھیں ملیں • اس کی (یعنی پادشاہ کی) آنکھیں کھُل گئیں (یعنی ان کی بینائی لوٹ آئی) ۔ " میری ماں کہاں ہے ؟ " کہہ کر (اس نے) اپنے باپ سے پوچھا ۔ " تیری ماں (نئے) پادشاہ کی کنیز ہے ۔ "

لڑکا غصے میں / قہر میں / پادشاہ کے پاس گیا ۔ پادشاہ تخت سے اُترا • لڑکا تخت پر بیٹھا • اعلان کیا کہ : (اب سے) دور (حکم رانی) فلاں پادشاہ کا ہے ۔ اس کے بعد اُس پادشاہ کو گھسیٹا گیا (جیسا کہ بزکشی کے کھیل میں بکرے کی لاش کو گھسیٹتے ہیں) ۔ (لڑکے نے) سو دن • سو رات ضیافت کی ۔

○●○

حلِ لغات :

(نوٹ : قارئین سے گزارش ہے کہ کہانی ہذا کے ذیل میں دیے گئے حلِ لغات کو بھی پیشِ نظر رکھیں - مترجم)

چالی : چالیس۔ ہندستانی : چالیس ، پنجابی : چالی ، لہندا : چالی ، چالھی۔ قایا : سنِ بلوغ۔ تاجک : وایا۔ قایا مارسترو : سنِ بلوغ کو پہنچنا۔ مرتا : مرتبہ ، بار۔ تاجک علاقائی بولی : مرتا۔ عربی : مرتبہ۔ رن کرا کے دینو : (بیٹے کی) شادی کرنا۔ پلیز : باغیچہ ، تربوز ، خربوزے کا کھیت۔ تاجک : پالیز ، ازبکی : پالِز ، ہریانوی : پلیج بہ معنی تربوز یا خربوزے کا کھیت ، بھوج پوری : پہلیج بہ معنی تربوز یا خربوزہ۔ کینجا : خاندان میں سب سے چھوٹا بچہ۔ تاجک علاقائی بولی : کینجا۔ یرشا : مطابق ، ازبکی : یرشا۔ پاڑنو : پھاڑنا۔ کھونٹرد / کھانو : کھانا۔ سجنو / سجنترو : سمجھنا۔ خیل : طرح۔ تاجک : خیل۔ وانترد / وانو : عدد۔ تاجک ، ہندستانی : دانہ۔ مانے : معنی ، مطلب۔ تاجک ، ہندستانی معنٰی ، معنی۔ ٹنڈنو / ٹنڈنو : ڈھونڈھنا۔ ہندستانی ، پنجابی : ڈھونڈھنا ، لہندا : ڈھونڈھنتر۔ ایلچی / ایلی ، قاصد۔ تاجک ، ترکی : ایلچی۔ کِھتا / کھتو : اکٹھا۔ پنجابی ، ہریانوی : کٹھا۔ سنسکرت : ایکتھ ، ایکتر۔ کھتا کرنو : اکٹھا کرنا۔ کلا / قَلا : بستی۔ ہندستانی : قلعہ۔ حکانو : بھیجنا ، روانہ کرنا۔ جَواب : اجازت ، جواب۔ جواب دینو : اجازت دینا۔ تاجک : جواب دادن۔ لدنو / لدنترد۔ ہندستانی : لادھنا ، پنجابی : لدھنا۔ اذوقو : آذوقہ۔ تاجک ، ہندستانی : آذوقہ ، سفر میں کھانے کی چیزیں۔ بندوخ : بندوق۔ دووا : دُعا۔ پاڑ : پہاڑ۔ وختا نماز / وختر مز : وقتِ نماز ، صبح سویرے۔ چوڑنو / چوڑنو / چوڑنو : چھوڑنا۔ لہندا : چھوڑنتر۔ ہور : اور ، دوسرے۔ لہندا ، پنجابی : ہور۔ رُٹی : روٹی۔ پکونترد / پکانترد / : پکانا۔ اود : شکار۔ ازبکی : اود بہ معنی شکار نیز ہرن۔ لال کرنو : تپانا۔ لغد کرنو : کچوکا دینا۔ تاجک : لغد۔ کتڑنو / کتڑنو / کتورنو : کھودنا۔ لہندا : کھوترنا۔ گجراتی : کھوترووں۔ جاگ : جگہ۔ میتر : میٹر۔ پُڑی : چٹائی ، بوریا۔ تاجک : بوریا ، لہندا : پُھوڑی۔ جی / جِگ / جِک : اونچا ، اوپر۔ جی کرنو : اوپر اٹھانا۔ بیو / بیے : دروازہ۔ گَرد گَم : حلقہ بناکر۔ ازبکی : گردکم (جوا کھیلتے وقت کہا جانے والا لفظ)۔ قِمار : جُوا۔ قِمار مارنو : جُوا کھیلنا۔ لنگو : ننگا۔ بول چال کی پنجابی ، ہریانوی ، بھوج پوری : لنگا۔ کلنو / کنو : کھڑا ہونا۔ بوئے آدم ذات : بوئے آدم زاد۔ اُستا : اُستاد بہ معنی حکیم ، لوہار ، جراح۔ سڑنو : جلنا۔ پنجابی : سڑنا۔ لہندا : سڑنتر بہ معنی جلنا۔ جوڑ / جور : ٹھیک ، صحت مند۔ جوڑ کرنو : ٹھیک کردینا۔ کابلی : جور : تیار ، صحت مند۔ کام / کم : کام۔ کا کاما ترے ؟ : تجھے کیا چاہیے ؟ پَختا : روئی ، کپاس۔ تاجک ، ازبکی پَختا۔ کِلا : کیلو گرام۔ نِلتو : نیل۔ ہندستانی ، پنجابی تاجک وغیرہ نیل۔ عربی نیلة۔ طبیبی : علاج ، طبیبی ، طبابت۔ حولی : آنگن۔ تاجک ازبکی : حولی بہ معنی آنگن۔ اصل حویلی بہ معنی بڑا مکان۔ بندھنترد : باندھنا ، بندھا ہونا۔ بیخی / بیخے بالکل۔ اصل : بیخ بہ معنی جڑ۔ ویڑو : بیل ، سانڈ۔ بچھڑا ؟ کُشترا ، کونترا : مارنا ، ذبح کرنا۔ پنجابی : کُھسترا۔ لہندا : کُھسترڑ وغیرہ۔ فارسی : کُشتن۔ گوش / گوشت / گُش / گُشت : گوشت۔ کلو : سر۔ تاجک ازبکی ، فارسی : کلا۔ بوڑی : بڑی ، لمبی۔ لنگانو / لنگانترد : بِتانا ، گزارنا۔ ہیک / ہک : آگے ، چھاتی۔ سے رِکن سے رِکن : آہستہ آہستہ ، دھیرے دھیرے۔ تاجک ، ازبکی : سے رِکن۔ جی / جِگ / جِک : اوپر۔ جی کرنو : اوپر اٹھانا۔ مَنو / منتو / ماتھو : ماتھا۔ پنجابی لہندا : متھا۔ سنسکرت : مستک۔ طلپونچا / طلپنچہ : طپنچہ۔ گل / گال / فل / ہل : بدن۔ سنسکرت : گل۔ خَن ریزو / خُلی زیرو : زرہ۔ فارسی : خول + زرہ۔ زِغِس کرنو : چرچرانا ، آواز کرنا ، شور کرنا۔ ازبکی : زِغِس : دروازے کی آواز ، چرچراہٹ۔ دس مل / دس مال : دستی ، رومال۔ ہندستانی ، تاجک : دست مال۔ اُنگوٹی : انگوٹھی۔ پنجابی : اُنگوٹھی ، اُنگوٹھی۔ چولق : زخمی ، لنگڑا۔ تاجک ، ازبکی : چولاق : لنگڑا۔ مکم / محکم : بند ، مضبوط ، محکم۔ مکم کرنو : بند کرنا۔ تاجک ، ہندستانی : محکم۔ کوچہ / کوچا : کوچہ ، گلی ، محلہ۔ ہندستانی ، تاجک : کوچہ۔ قلا : گاؤں ، بستی ، قلعہ بند بستی۔ ہندستانی ، تاجک : قلعہ۔ پِشنا : سوال۔ پِشنا کرنو : سوال کرنا۔ پوچھنا۔ سنسکرت : پرشن۔ نشان / نشانی : نشانی ، ثبوت۔ تاجک ، ہندستانی : نشان۔ نیکا : نکاح۔ نیکا بانو : نکاح باندھنا۔ فُرنو : بیتنا ، گزرنا۔ ہندستانی ، پنجابی : پھرنا۔ تند : تنبند ،

(باقی ص ۴۳ پر)

شمس الرحمن فاروقی

نقد داستان کی تمہید

داستانیں ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں ۔ اس سرمائے کا سب سے قیمتی حصہ وہ جلدیں ہیں جو " داستانِ امیر حمزہ "
کے عنوان کے تحت نول کشور پریس لکھنو / کان پور سے ۱۸۸۳ اور ۱۹۱۷ء کے درمیان شائع ہوئیں ۔ اگر " بوستانِ خیال " کے اردو
اردو داستانوں میں شمار کیا جائے (اور ایسا نہ کرنے کی کوئی وجہ ہیں) ، تو بھی " داستانِ امیر حمزہ " کی یہ جلدیں اپنے حسن و خوبی
رنگارنگی ، قوت ایجاد کے غیر معمولی اظہار ، نثر کے تنوع اور لچک دار قوت ، ہر طرح کی صنف نظم کی کثرت اور سب سے بڑھ کر یہ
تخیلاتی وسعت کی بنا پر " بوستانِ خیال " سے بہتر ٹھہریں گی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ " داستانِ امیر حمزہ " کی یہ جلدیں نہ صرف
تمام دنیا کے تخیلاتی ادب میں بے مثال کارنامہ ہیں ۔

لکھنو نے اردو ادب کو اور اردو کی ادبی تہذیب کو بہت کچھ دیا ۔ لیکن اس شہر کی اداؤں میں سے ایک ادا یہ بھی ہے کہ اپنے جاں
کو مار رکھتا ہے ، یا گاڑ کر بھول جاتا ہے ۔ اس کے چاہنے والے اس کا شکوہ بھی کرتے ہیں اور اس کے ناز اٹھانے میں اپنی مدتِ
بھی گزار دیتے ہیں ۔ سودا اور میر حسن ، میر و مصحفی ، آتش و ناسخ ، کتنے ہی ایسے ہیں جن کے مزار کیا ، لوحِ مزار بھی مفقود ہیں ۔

مت تربت میر کو مٹاؤ رہنے دو غریب کا نشاں تو

مصحفی کا نہ نشاں پوچھ کہ مدت ہوئی میاں
پائینتی گھس گئی ، تربت کا سرہانا نہ رہا

سودا اور میر و مصحفی وغیرہ کے بارے میں اتنا تو معلوم ہے کہ وہ خاکِ لکھنو میں آسودہ ہیں (اگر " آسودہ " کا لفظ ایسوں کے لیے
ہو) ، ان کا مزار نہیں ملتا نہ سہی ۔ " داستانِ امیر حمزہ " کی نول کشوری روایتوں کی تخلیق کرنے والوں کے بارے میں تو یہ بھی نہیں
وہ لکھنو میں دفن ہیں ، یا کہاں دفن ہیں ؟ کسی قوم اور کسی تہذیب نے کم ہی اپنے محسنوں کے ساتھ وہ سلوک کیا ہوگا جو اہلِ اردو
ہند نے داستانِ امیر حمزہ جیسی عظیم الشان کارگاہ نیرنگ کے صانعوں کے ساتھ کیا ۔ اگر لکھنو کے ادبی کارناموں کی قیمت لگائی
انیس کے مرثیوں اور ناسخ کی غزلوں کے علاوہ بہت کم تن ایسے نکلیں گے جنھیں کیفیت کے لحاظ سے داستان امیر حمزہ کی چھیالیس
کے مقابل رکھا جاسکے اور جہاں تک سوال کمیت کا ہے ، تو لکھنو اور اردو ہی کیا ، دنیا میں کم تن ایسے ہوں گے جو داستانِ امیر حمزہ
یس جلدوں کے بیالیس تینتالیس ہزار صفحات کے آگے ٹھہر سکیں ۔ لیکن ہماری قدردانی کا یہ عالم ہے کہ تمام اردو دنیا میں کوئی
کوئی کتب خانہ ایسا نہیں جہاں یہ تمام چھیالیس جلدیں موجود ہوں ۔ میں نے کوئی بیس سال کی محنت لگا کر کہیں کی اینٹ کہیں کا
مصداق دور نزدیک سے فوٹو کاپیاں اور مطبوعہ جلدیں اکٹھا کر کے چھیالیس جلدیں جوڑی ہیں ۔

داستان سنانا اور داستان سننا ، دونوں ہی ہمارے یہاں (یعنی ہند + مسلم تہذیب میں) کئی صدیوں سے موجود ہیں ۔ ظاہر ہے کہ
سنانے والا جب ہی وجود میں آئے گا جب اس کا سامع دستیاب ہو ۔ لہذا داستان گوئی اور داستان شنوندگی ، دونوں کم و بیش ایک

ہی ساتھ وجود میں آئے ہوں گے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہمارے ملک میں داستانِ امیر حمزہ (فارسی) کا رواج شمال میں ۱۵۹۰ء کے آس پاس اکبر اعظم کے دربار میں، اور جنوب میں حاجی قصہ خواں ہمدانی کی ترتیب کردہ روایت "رموزِ حمزہ" / "زبدۃ الرموز" کے ذریعے ۱۶۱۲ء میں محمد قطب شاہ کے دربار میں شروع ہوا۔ لیکن یہ داستان اردو میں کب سے سنائی جارہی ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ مرزا سنگی بیگ نے اپنی کتاب "سیر المنازل" (زمانہ تصنیف، تقریباً ۱۸۲۰ء) اور سرسید نے "آثار الصنادید" (اول اشاعت ۱۸۴۹ء) میں جامع مسجد کے سامنے داستان گویوں کا ذکر کیا تو ہے، لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان کی زبان کیا تھی۔ اغلب ہے کہ وہ اردو رہی ہو۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح، رجب علی بیگ سرور نے "فسانہ عجائب" (اولین تحریر کی تاریخ ۱۸۲۵ء) کے دیباچے میں لکھنو کے داستان گویوں کے بارے میں کہا ہے کہ وہ امیر حمزہ کی داستان سناتے ہیں۔ کس زبان میں، اس کا ذکر انھوں نے نہیں کیا۔ لیکن یہاں بھی قیاس کہتا ہے کہ ان کی زبان اردو رہی ہوگی۔

رام پور میں اردو داستان گوئی کا رواج ۱۸۴۰ء / ۱۸۵۰ء کے آس پاس ہوا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ لکھنو / فیض آباد میں بھی اس کا آغاز اسی زمانے میں ہوا ہوگا۔ چوں کہ انیسویں صدی کے اوائل، بلکہ اٹھارویں صدی کے اواخر ہی، سے تمام ہندستان میں ہندو + مسلم ادبی تہذیب کی قیادت دلی کے ہاتھ میں تھی، لہذا اغلب ہے کہ رام پور، لکھنو، فیض آباد وغیرہ میں اردو داستان گوئی دلی کے تتبع میں اور دلی کے بعد شروع ہوئی ہو۔

تاریخِ ادب کا یہ دل چسپ طنز ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں منشی نول کشور کی یہ دولت داستان امیر حمزہ کو ایک نئی مقبولیت اور نئے شائقین حاصل ہورہے تھے۔ داستان دور دور تک پھیل رہی تھی اور اسی زمانے میں داستان کا زوال بھی شروع ہوگیا تھا۔ ناول، یا ناول نما تحریریں جو اس وقت بازار میں آرہی تھیں، وہ داستان کی جگہ نہیں لے رہی تھیں۔ ان کے پڑھنے والے عام طور پر کچھ اور طرح کے لوگ تھے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انیسویں صدی کے واخر میں داستان پڑھنے والے لوگ زیادہ تھے اور ان میں سے کم لوگ ایسے رہے ہوں گے جو نئے زمانے کا ناول بھی پڑھتے ہوں۔ یعنی دونوں طرح کی تحریروں کے پڑھنے والوں کا حلقہ الگ تھا۔ لہذا ناول کی مقبولیت کو داستان کے زوال کا سبب قرار دینا درست نہ ہوگا۔ "فسانہ آزاد" (اول اشاعت ۱۸۸۰ء) کی چار ضخیم جلدوں کو بعض لوگوں نے "جدید" طرز کی داستان سمجھا ہو تو کچھ عجب نہیں۔ لیکن داستان کے سارے بنیادی عنصر اس میں مفقود تھے، بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "فسانہ آزاد" ایک طرح کی اینٹی داستان ہے اور اس کے بنیادی قضایا کا مقصد داستان کی دنیا اور داستان کو فروغ دینے والی تہذیب کو زوال آمادہ بتانا اور اس کا مذاق اڑانا تھا۔

"فسانہ آزاد" ایک انگریز عالم کے لکچر سے شروع ہوتی ہے اور لکچر کا موضوع ہے قدیم ہندستانی مقدس کتابوں، یعنی وید مقدس کی خوبیوں اور فلسفیانہ نکات پر گفتگو۔ اس میں جو پیغام پوشیدہ ہے اسے سمجھنے کے لیے کسی بڑے دراک ذہن کی ضرورت نہیں۔ پیغام یہ ہے کہ ہندستانیوں کے تہذیبی اور علمی ورثے کی معنویت اسی حد تک ہے جس حد تک انگریز اس کو بامعنی قرار دیں اور یہ معنویت صرف اس صورت میں قائم ہوسکتی ہے کہ انگریز اس کام کا بیڑا اٹھائیں۔ ہندستانیوں کے اپنے تہذیبی ورثے میں یہ قوت نہیں کہ وہ اپنا جواز، یا اپنے معنی قائم کرسکے۔ اس طرزِ فکر کی روشنی میں داستان امیر حمزہ کا قائم ہونا مشکل تھا۔ یہاں بہت سے بہت "باغ و بہار" یا "فسانہ عجائب" کی گنجائش تھی اور وہ بھی ادب پاروں کی حیثیت سے نہیں، بلکہ مکتبی متون کی حیثیت سے۔ "باغ و بہار" کی اہمیت ہندستانیوں کی نظر میں یہ تھی کہ اس کتاب میں دلی کی مستند زبان لکھی گئی تھی اور انگریز صاحب بہادر لوگ ان کی مدد سے اردو سیکھتے تھے۔ اس کی

مقبولیت اس وقت اور بھی بڑھی جب اسے انیسویں صدی کے وسط دوم میں بنگال کے تمام اسکولوں میں اردو متن کی حیثیت سے رائج کیا گیا ۔ (رائج کرنے کے پہلے اس کے " قابلِ اعتراض " یعنی " فحش " اور " اخلاق سوز " حصے حذف کر دیے گئے تھے ۔)

" فسانہ ء عجائب " کی مقبولیت زیادہ تر اس وجہ سے تھی کہ اس میں لکھنؤ کی تہذیب (یا لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں بعض مقبول تصورات) کی بھرپور تصویر کشی تھی ۔ عام طور پر اس کے دیباچے کو ، جس میں لکھنؤ کا حال تھا ، کتاب کا مغز قرار دیا گیا ۔ پھر ۱۸۴۵ء / ۱۸۴۶ء کے آس پاس یہ کتاب بھی کلکتے میں " صاحبانِ عالی شان " کی نظر پر چڑھی اور ۱۸۶۸ء میں یا شاید اس سے بھی پہلے ، اسے اعلیٰ درسی کتب میں شامل کر لیا گیا ۔

اگر چہ " باغ و بہار " اور " فسانہ ء عجائب " صحیح معنی میں داستان نہیں ہیں ، لیکن ان دونوں کتابوں کو " داستان " کے طور پر پڑھایا گیا ۔ اس طرح داستانی متون میں " داستان امیر حمزہ " کی مرکزی حیثیت باقی نہ رہی ۔ داستان امیر حمزہ میں جو دنیا پیش کی گئی تھی وہ بہ ظاہر " غیر اخلاقی " باتوں سے بھری ہوئی تھی ۔ لیکن دراصل اس دنیا میں ایک بڑے پر قوت اور منضبط ، اگر چہ غیر تحریری ، نظامِ اخلاق کا دور دورہ تھا ۔ یہاں ظالم کو منصف اور باطل کو حق کے مقابلے میں ہمیشہ شکست ہوتی تھی ۔ یہاں جنگ اور صلح ، عشق اور عیاری ، جواں مردی اور فتوحات ، دشمنی اور دوست داری ، ملک گیری اور جہان بانی ، انسانی طاقت بہ مقابلہ غیر انسانی جبلت ، خدائے خالق بے اسباب کی جگہ انسان بہ طور خالق بے اسباب ، انسانی علم اور بے واسطہ علم ، تقدیر اور توفیق ، ان سب کے بارے میں واضح اور مضبوط تصورات تقریباً سب کے سب انگریزی تصور کائنات Worldview کے منافی تھے ۔ داستان امیر حمزہ کے برخلاف " باغ و بہار " یا " فسانہ ء عجائب " میں اخلاقی اور مابعد الطبیعیاتی تاملات و تصورات کا فقدان ہے ۔ ان میں کسی مخصوص تصور کائنات Worldview کو نہیں پیش کیا گیا ہے ۔ لہذا نئے زمانے کی اخلاقیات ، جو بڑی حد تک انگریزوں کی رائج کردہ تھی ، اسے " باغ و بہار " اور " فسانہ ء عجائب " سے کوئی خطرہ نہ تھا ، داستان امیر حمزہ سے تھا ۔

لہذا داستان ، اور خاص کر داستانِ امیر حمزہ کے زوال کا سبب محض یہ نہیں کہ اس زمانے میں ناول نے آکر دوسری طرح کے تمام بیانیوں کو مقبولیت کی دوڑ میں اتنا پیچھے چھوڑ دیا کہ ان کا نشان ہی نہ رہا ۔ آخر " داستان " ہی کی جنس میں شمار ہونے کے باعث تو " باغ و بہار " اور فسانہ ء عجائب " کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی ۔ ان کتابوں کی یہ ہر دل عزیزی اب بھی پہلے ہی جیسی ہے اور ہمارے یہاں تمام اسکول ، کالج ، اور یونیورسٹی کے نصاب میں یہ کتابیں (یا ان کے اقتباسات) داستان ہی کے نام سے پڑھائے جاتے ہیں ۔ لہذا یہ بات صاف ہے کہ " نئی " روشنی کا جھگڑا فی نفسہ داستان سے نہ تھا ۔ وہ داستانیں تو معرض خطر میں آئیں اور بالآخر تقریباً نابود ہوئیں ، جن کا اپنا ایک تصور کائنات تھا ، اپنی اخلاقیات تھی اور اپنے وجودی سرو کار تھے ۔ لیکن وہ داستان نما تحریریں ، جن میں نئی روشنی کو چنوتی دینے کو کوئی سکت نہ تھی اور جن سے " ترقی " کے سفر میں کوئی خطرہ نہ تھا ، داستان کے نام پر خوب خوب مقبول ہوئیں اور اب بھی موجود ہیں ۔ ان کے نئے سے نئے اعلیٰ درجے کے تدوینی ایڈیشن نکل رہے ہیں ۔ لیکن داستان امیر حمزہ کی طرف ایسی کوئی توجہ نہیں ۔

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ناول ہمارے یہاں حقیقی معنی میں مقبول ہونے لگا " امراؤ جان ادا " (اول اشاعت ۱۸۹۹ء) کی غیر معمولی کامیابی ایک طرف تو صنف ناول کی مقبولیت کا ثبوت ہے ، لیکن دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ اس ناول کی کامیابی نے صنف ناول کی ہر دل عزیزی بڑھانے اور قائم کرنے میں بڑا اہم کام کیا ۔ اسی زمانے میں پارسی تھیٹر بھی مقبولیت کے بامِ عروج پر تھا اور تھوڑے دنوں بعد خاموش فلمیں بھی سامنے آگئیں ۔ آج تھیٹر ، پارسی یا غیر پارسی ، ہمارے یہاں الشاذ کالمعدوم ہے ۔ خاموش ، اور پھر

ہوئی فلم کو تھیٹر کی موت کا ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں۔ لیکن اسی قاعدے کی رو سے ناول کی بھی موت ہوجانی چاہیے تھی، کیوں کہ اثریت ان کی وسعت، تنوع کے امکانات اور کثیر الذرائع یا multi-media فن ہونے کے باعث فلم جو کچھ کر سکتی ہے، ناول اس کا عشیر نہیں کر سکتا۔ ہنری جیمس کو تا عمر تمنا ہی رہ گئی کہ وہ ناول کے فن کو ڈرامے سے ہم آہنگ کر دے، یعنی ناول کا منصب یہ ٹھہرے ہ واقعات کو بیان کرنے کے بہ جائے، ان کو "دکھانے" کا کام کرے۔ ظاہر ہے کہ ناول میں یہ صلاحیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ ے (گویا کہ فلم) کا بدل بن جائے۔ ایسی صورت میں اگر فلم نے ڈرامے کو موت کے گھاٹ اتار دیا، تو ناول کو اس سے بھی پہلے فلم کی آجانا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

یہ استدلال بھی بے معنی ہے کہ نئے زمانے میں پڑھنے والوں کے پاس فرصت نہ تھی۔ وہ لمبی لمبی داستانیں پڑھنے کے لیے کہاں وقت نکالتے؟ دو ڈھائی سو صفحے کا ناول تو خیر کسی نہ کسی طرح پڑھ بھی لیا جا سکتا ہے۔ اس بیان میں کئی مغالطے ہیں۔ اول تو یہ کہ تان پڑھنے پڑھانے کی چیز نہیں، سننے سنانے کی چیز ہے۔ اور ظاہر ہے کہ داستان کا سنانے والا سامعین کی فرصت اور رجحان کو مدِ نظر رکھ ں داستان سنائے گا۔ اگر سننے والوں کو فرصت کم ہے، تو وہ اپنی داستان حسبِ منشا چھوٹی کر لے گا، یا آئندہ پر اٹھا رکھے گا۔ فرصت کی اور داستان کی طوالت میں کوئی رشتہ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر داستان کا مطبوعہ روپ زیرِ بحث ہے، جہاں ہر جلد اوسطاً نو سو ات کی ہے، تو یہاں مزید مغالطے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر داستان کا اس قدر طویل ہونا ضروری نہیں۔ بہت سی داستانیں چھوٹی چھوٹی ۔ احمد حسین قمر کی "طلسم نارنج" بہ مشکل ۲۰۸ صفحے کی ہے۔ محمد حسین جاہ کی "طلسمِ فصاحت" سب کچھ ملا کر ۲۸۶ صفحے کی ہے۔ فخرالدین ین سخن دہلوی کی "سروش سخن" میں تو محض ۱۳۹ صفحے ہیں، بعد کے گیارہ صفحے تقریظوں اور تاریخوں کے ہیں۔ میر موجد دہلوی کی "طلسم ں افزا" جلد اول میں ۲۷۱ صفحے ہیں، اور وہ بہت پاستاں لکھی ہوئی ہے۔ منیر شکوہ آبادی کی "طلسمِ گوہر بار" میں ۳۳۳ صفحے ہیں۔ خود ل علی اشک اور غالب لکھنوی کی بیان کردہ دونوں روایتیں (اور عبداللہ بلگرامی / تصدیق حسین / عبدالباری آسی کی روایت کو الگ قرار جائے تو یہ تیسری روایت بھی) ایک ایک جلد کی ہے اور ہر روایت چار سے چھ سو صفحوں میں بہ آسانی سما جاتی ہے۔ لہذا یہ کہنا غلط ، کہ داستان کا زوال اس کی طوالت کے باعث ہوا۔ بہت سی داستانیں بے شک بہت طویل تھیں، لیکن اگر پڑھنے والے تقاضا کرتے تو تان گو کے لیے چھوٹی اور بہت چھوٹی داستان بنانا کیا مشکل تھا؟

دوسری بات یہ کہ داستان کو مطبوعہ روپ میں پیش کرنے والے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ داستان سننے کے بجائے داستان پڑھنا و لطف انگیز کام ہے۔ رتن ناتھ سرشار نے ایک داستان کی تقریظ میں یہی لکھا ہے۔ (اس پر بحث کے لیے باب موسوم بہ "سامعین" ظہ ہو۔) یا کم سے کم اتنا ہے کہ داستان کو سننے کے علاوہ پڑھا بھی جا سکتا ہے اور پڑھ کر لوگوں کو سنایا بھی جا سکتا ہے۔ منشی نول کشور اور کے ورثا بہر حال ایک بڑے کاروبار کے مالک تھے، وہ بازار کے بھاؤ تاؤ سے خوب واقف رہے ہوں گے کہ کس طرح کی کتابیں فروخت سکتی ہیں اور کتنی؟ انھوں نے داستان امیر حمزہ کی ایک جلد ۱۹۱۱ء میں چھاپی، کئی جلدیں انھوں نے ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان چھاپیں ض جگہ داستان گو نے شکایت ضرور کی ہے کہ بابو صاحب (مالک مطبع) کا حکم ہے کہ داستان جلد سے جلد ختم کرو، لہذا مجبوراً بیان کو تصر کرتا ہوں۔ یہ شکایت اپنی جگہ، لیکن جن جن جلدوں میں یہ شکایت ہے، وہ سب کی سب نو سو / ہزار صفحات سے کچھ اوپر ہی کی ہیں۔ ا نول کشور پریس کو فی نفسہ ضخامت سے کوئی کد نہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بازار میں کتنی ضخامت چل سکے گی۔ داستانوں کی بہت سی جلدوں کی دوبارہ / سہ بارہ اشاعت ۱۹۳۰ء میں بلکہ ایک آدھ کی اشاعت تو اس کے بھی بعد ہوئی، لیکن سب کی ضخامت پہلے ہی جیسی تھی،

کسی جلد میں کچھ کاٹ چھانٹ نہ کی گئی۔

انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کے مقبول ناولوں کی ضخامتوں کا حوالہ اس سلسلے میں کار آمد ہو گا۔ آج سے کوئی پچاس سال پہلے جب میں بی۔ اے، اور پھر انگریزی میں ایم۔ اے کررہا تھا، تو انگریزی میں مختصر ناولوں کا فیشن ایک عرصے سے رائج تھا۔ ہارڈی (۱۸۲۸ء تا ۱۹۱۰ء) نے اپنا آخری ناول Jude the Obscure ۱۸۹۶ء میں لکھا۔ اس کی ضخامت پانچ سو سے کچھ اوپر صفحات کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی لمبے ناولوں کا فیشن بھی گھٹنے لگا۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس (۱۸۸۵ء تا ۱۹۳۰ء)، ای۔ ایم۔ فارسٹر (۱۸۷۹ء تا ۱۹۷۰ء) اور پھر سومرسٹ مام (۱۸۷۴ء تا ۱۹۳۶ء) وغیرہ کے ناول عام طور پر ڈھائی سے چار سو صفحات کے اندر ختم ہو جاتے تھے۔ ایچ۔ جی۔ ولز (۱۸۶۶ء تا ۱۹۴۶ء) اور ورجنیا وولف (۱۸۸۲ء تا ۱۹۴۱ء) کے بیش تر ناول ان سے بہت کم ضخامت کے ہیں۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی ختم ہوتے ہوتے عام طور پر ناولوں کے صفحات کی گنتی اور کم ہونے لگی۔ گریہم گرین (۱۹۰۴ء تا ۱۹۹۱ء) کے تمام اہم ناول ڈھائی سو صفحات کے اندر ختم ہوجاتے ہیں۔ نوبل انعام یافتہ ولیم گولڈنگ William Golding (۱۹۱۱ء تا ۱۹۹۳ء) اور رچرڈ ہیوز Richard Hughes (۱۹۰۰ء تا ۱۹۷۶ء) کے مشہور ترین ناول دو ڈھائی سو صفحات سے آگے نہیں جاتے۔ امریکہ میں طویل ناول کا چلن اس صدی کے وسط تک رہا، پھر وہاں بھی ناول چھوٹے ہونے لگے۔

لمبے ناولوں میں یہ ہر حال ایک کشش تھی (خاص کر ناول نگار کے لیے) اس لیے ان کا شوق یوں پورا کیا جانے لگا کہ چھوٹے چھوٹے سلسلہ جاتی ناول لکھے جانے لگے۔ ہر ناول اپنی جگہ مکمل ہوتا لیکن ہر ناول ایک دوسرے سے مربوط بھی ہوتا۔ چناں چہ، لارنس ڈرل Lawrence Durrell (۱۹۱۲ء تا ۱۹۹۰ء) اور جوائس کیری Joyce Carey (۱۸۸۸ تا ۱۹۵۷ء) اور پھر ڈورس لیسنگ Doris Lessing (پیدائش ۱۹۱۹ء) کے سلسلہ جاتی ناول بہت مقبول ہوئے۔ اول الذکر کے زمانے میں چھوٹے ناولوں کا فیشن زوروں پر تھا، لہٰذا اس کے سلسلہ جاتی ناولوں کی ہر کڑی ڈھائی اور ساڑھے تین سو صفحات کے اندر رہ جاتی ہے۔ ڈورس لیسنگ کے سلسلہ جاتی ناولوں کا زمانہ آتے آتے لمبے ناول فیشن میں آگئے تھے، چناں چہ اس کے موجودہ سلسلہ جاتی ناول میں پانچ کڑیاں ہیں اور ہر ایک کی ضخامت چار سو صفحات سے زیادہ ہے۔

اس صدی کی آٹھویں دہائی یعنی ۱۹۷۰ء دہائی آتے آتے ناولوں کی ضخامت بڑھنے لگی اور آج کا فیشن لمبے ناولوں کا ہے۔ پانچ سو صفحات کے ناول تو عام ہیں اور انگریزی زبان کا طویل ترین ناول، یعنی وکرم سیٹھ کا A Suitable Boy ہمارے ہی وقتوں میں لکھا گیا۔ اس کا امکان ہے کہ وکرم سیٹھ کا ناول لمبے ناولوں کا منتہائے کمال ثابت ہو، کیوں کہ اس کے بعد ادھر ایک دو برس میں جو "سنجیدہ" انگریزی ناول آئے ہیں، ان کی ضخامت چار سو صفحات کے آگے کم ہی جاتی ہے۔

اس درمیان وہ ناول بھی، جنھیں، یعنی ادبی لحاظ سے بہت اہم نہیں، لیکن عوام میں بے حد مقبول ناول، popular novel کہا جاتا ہے، بالکل اسی راستے پر چلے۔ اس صدی کے شروع میں جان بکن John Buchan نے سیکرٹ سروس اور غیر ملکی جاسوسی کے موضوع پر انگریزی کے اولین ناول لکھے۔ اس کا مقبول ترین ناول The Thirty-Nine Steps بہ مشکل ڈیڑھ سو صفحے کا ہے۔ اس صدی کی آٹھویں دہائی تک مقبول ناولوں کی ضخامت ۱۸۰ سے ۲۰۰ صفحات تھی اور شاذ ہی ۲۲۰ صفحات سے تجاوز کرتی تھی۔ فیشن بدلا تو ہر طرح کے مقبول ناولوں کی ضخامت بڑھنے لگی اور اب بعض ناول آٹھ اور نو سو صفحات کی حد پار کرچکے ہیں۔ پانچ سے سات سو صفحے کے ناول تو بے شمار ہیں۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ یورپ کے کسی بڑے ہوائی اڈے کی دکانوں پر اور بڑے یورپی شہروں میں

اوسط سے بڑے کتب فروشوں کے یہاں انگریزی کے مقبول اور ضخیم ناولوں کے تراجم فرانسیسی، جرمن، ڈچ اور دوسری زبانوں میں بے تکلف دست یاب ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ میرے وہ اساتذہ جو چھوٹے ناولوں کی جدید، معروف اور تیز رفتار زندگی کی ضرورت اور مجبوری بتاتے تھے۔ آج زندہ ہوتے تو اپنی تھیوری کو یوں پاش پاش ہوتے دیکھ کر کس قدر رنجیدہ ہوتے۔ مغربی زبانوں میں تنقید نے عرصہ ہوا ادب کی سماجیات کے بارے میں سادہ اور بہ راہ راست اثرات کے مفروضوں پر مبنی احکام لگانے سے توبہ کرلی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں اب بھی یہی خیال عام ہے کہ نئے، معروف اور تیز رفتار زمانے میں لوگوں کو داستان کو پڑھنے کی فرصت نہ تھی اور یہ داستان کے زوال کی ایک اہم وجہ ہے۔ اگر چھوٹے ناول، یا مختصر بیانیہ تحریریں اس صدی کی کچھ دہائیوں میں مقبول تھیں تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہوسکتی کہ ایسی تحریریں جدید، معروف اور تیز رفتار زندگی کی مجبوری اور اس کا تقاضا ہیں اگر ایسا ہوتا تو آج کی زندگی جو ۱۹۲۰ء تا ۱۹۷۰ء کی دہائیوں سے کہیں زیادہ تیز رفتار ہے، بڑے ناول کیا، چھوٹے ناول بھی پڑھنا چھوڑ چکی ہوتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صورت حال اس کے برعکس ہے: مختصر افسانے کا چلن گھٹ رہا ہے اور طول طویل ناول کا چلن بڑھ رہا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر آج مغرب میں اس بات کو خوب شہرت دی جائے کہ ہماری داستانیں کس قدر طویل اور رنگارنگ ہیں، اور پھر داستان امیر حمزہ کی دو چار جلدیں ترجمہ کر کے چھاپ دی جائیں تو انھیں بے حد مقبولیت حاصل ہوگی۔

داستان کے زوال کے جو اسباب عام طور پر بیان کیے جاتے ہیں ان کا ذکر ہم نے اوپر دیکھا۔ ناول، فلم، نئے زمانے کی تیز رفتاری، داستان میں بہ ظاہر کسی "سماجی معنویت" کا نہ ہونا وغیرہ۔ یہ سب چیزیں مل کر بھی اتنی قوت مند نہ تھیں کہ داستان کی روایت کو چند دہائیوں، بلکہ چند برسوں میں ہمارے ادبی اور تہذیبی ماحول سے باہر کردیتیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" کو غیر معمولی شہرت ملی۔ لیکن انھیں ناول نہیں، داستان ہی کہا گیا۔ (یہ بات دیگر ہے کہ یہ کتابیں داستان کی شرائط پوری نہیں کرتیں، لیکن عالم و عامی سب ہی انھیں داستان کہتے ہیں)۔ لہذا اصل بات یہ نہ تھی کہ داستان کو نئے زمانے نے شکست دے دی تھی۔ کہ اس میں نئی چنوتیوں کا سامنا کرنے کی قوت نہ تھی۔ اصل بات یہی تھی کہ داستان امیر حمزہ میں ہند + مسلم تصور کائنات غیر معمولی قوت اور تحرک کے ساتھ جاری تھا اور یہ بات انگریزوں کی جدید کارانہ پالیسی کے خلاف جاتی تھی۔ جدید زمانے کا تقاضہ یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہوسکے ہندستانیوں کی تہذیبی اور دانش ورانہ میراث، اور خاص کر ہند + مسلم میراث، کو معرض سوال میں لایا جائے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہندستانیوں کو یقین دلایا جائے کہ اپنی تہذیب کو پڑھنے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے انھیں مغرب کی عینک استعمال کرنی چاہیے۔

انیسویں صدی کے اواخر کی انگریز سیاست اور تربیت نے ہمیں اپنے ورثے پر شرمندہ ہونے اور اپنی تہذیبی دنیا سے متنفر ہونے کی راہ پر چلانے کی بھی کوشش کی۔ یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہوئی۔ نصوح نے کلیم کا کتب خانہ بے وجہ ہی نذر آتش نہ کیا تھا اور وہ "گلستان سعدی" سے کچھ یوں ہی مجوب نہ تھا۔ اپنی بیوی سے اس نے کہا کہ تمھیں پڑھاتے وقت مجھے "گلستان" کے صفحے کے صفحے کاٹنے پڑے، کیوں کہ وہ شریف بہو بیٹیوں کو پڑھانے کے لائق نہ تھے۔ بہ قول نصوح، یہ ہیں وہ لوگ جو ہمارے بزرگان سلف ہیں اور جن کا نام ہم "رحمۃ اللہ علیہ" اور "شیخ" کہہ کرلیتے ہیں۔ "توبۃ النصوح" مطبوعہ صدیقی پریس دہلی ۱۹۱۰ء کے صفحہ ۱۲۱ پر یہ واقعہ شروع ہوتا ہے:

[کلیم کے خلوت خانے میں] (۱۲۱) کتابوں کی ایک الماری تھی۔۔۔ کیا اردو کیا فارسی سب کی سب کچھ ایک ہی طرح کی تھیں۔ جھوٹے قصے، بے ہودہ باتیں، فحش مطلب، لچر مضمون، اخلاق سے بعید، حیا سے دور۔۔۔ معنی و مطلب کے اعتبار سے ہر جلد

سوختنی اور دریدنی تھی۔۔۔ / نصوح / بار بار کتابوں کو الٹ الٹ کر دیکھتا تھا اور رکھ رکھ دیتا تھا۔ آخر کار یہی رائے قرار پائی کہ ان کا جلادینا ہی بہتر ہے۔ چناں چہ بھری الماری کتابیں لکڑی / کے / کندے کی طرح اوپر تلے رکھ آگ لگادی۔ نصوح کا یہ برتاؤ دیکھ کر اندر سے باہر تک تہلکہ اور زلزلہ پڑ گیا۔ علیم دوڑا دوڑا جا اپنا کلیات آتش اور دیوانِ شرر اٹھا لا۔۔۔ (۱۲۲) علیم نے آتش کو دہکتی آگ اور شرر کو انگاروں میں پھینک دیا۔ علیم کی دیکھا دیکھی میاں سلیم نے بھی واسوخت امانت لا، باپ کے حوالے کی اور کہا۔۔۔ بڑے بھائی جان نے فسانہ عجائب، قصہ، گل بکاولی، آرائشِ محفل، مثنوی میر حسن، مضحکات نعمت خاں عالی، منتخب غزلیات چرکین، ہزلیات جعفر زٹلی، قصائد ہجویہ، مرزا رفیع السودا، دیوانِ جان صاحب، بہارِ دانش باتصویر، اندر سبھا، دریائے لطافت میر انشاء اللہ خاں کی، کلیات رند وغیرہ بہت سی کتابیں / کتب فروش / سے لی تھیں۔ میں بھی بیٹھا ہوا تھا۔۔ کتاب والے کی ساری گٹھڑی میں سے یہ واسوخت اور دیوانِ نظیر اکبرآبادی دو کتابیں انھوں نے میرے لیے نکالیں۔۔۔ میں نے دونوں کتابیں پھیردیں، مگر بھائی جان نے یہ واسوخت زبردستی میرے (۱۲۳) سر مڑھی۔۔۔ [حضرت بی کے نواسے نے اسے دیکھ کر] کہا کہ آہا میاں سلیم چھپے رستم نکلے۔۔۔ اگر نانی اماں دیکھ پائیں گے تو شاید ہم لوگوں کو تمھارے پاس اٹھنے بیٹھنے کی ممانعت کریں۔ بھلا کوئی ایسی گندی کتاب بھی پڑھتا ہے؟ تب سے میں نے اس کتاب کو طاق میں ڈال دیا تھا۔ آج مجھ کو یاد آگئی تو میں نے کہا، یہ بھی اپنی مراد کو پہنچ جائے۔ جب کلیم کا خرمن عیش و عشرت جل بھن کر خاک سیاہ ہوگیا تو نصوح اندر گھر میں گیا۔]

اب گھر کے اندر کا حال سنیے کہ نصوح اپنے فعل کو کس طرح برحق ٹھہراتا ہے اور اپنی بیوی فہمیدہ کے علم میں کیا اضافہ کرتا ہے:

[۱۲۴] فہمیدہ: کوئی کہتا تھا تم نے غصے میں آکر دیوان خانے میں آگ لگا دی۔ نصوح: اگر چہ وہ مکان جس میں وحشیوں کے سے کام ہوتے ہیں، اسی قابل ہے، لیکن میں نے مکان میں تو آگ نہیں لگائی۔ فہمیدہ: کچھ دھواں سا مردانے میں ضرور اٹھ رہا تھا۔ نصوح: وہ تو چند کتابیں تھیں جن کو میں نے بےہودہ سمجھ کر جلا دیا۔۔۔ فہمیدہ: خیر کچھ ہی سہی، مگر کتاب ہے تو ادب کی چیز۔ پھر تم نے جلائی کیوں؟ نصوح: جن کتابوں کو میں نے جلایا، ان کی مضامین شرک اور کفر اور بےدینی اور بے حیائی اور فحش اور بدگوئی اور جھوٹ سے بھرے ہوئے تھے۔ فہمیدہ: کتابوں میں ایسی بری بری باتیں بھی ہوتی ہیں؟ نصوح: کتابیں بھی آدمی بناتے ہیں اور آدمی ایسا مخلوق سرکش ہے کہ اس نے تمام دنیا میں بدی اور خدا کی نافرمانی پھیلا رکھی ہے۔ کیا تم شعر و شاعری کے نام سے واقف نہیں ہو؟۔۔۔ (۱۲۵)

فہمیدہ: یہ مجھ کو آج معلوم ہوا کہ پڑھنے لکھنے کی چیزوں میں بھی لوگوں نے خرابیاں پیدا کی ہیں۔ نصوح: کیا تم کو اپنا "گلستان" پڑھنا یاد نہیں؟ فہمیدہ: یا کیوں نہیں۔۔۔ نصوح: بھلا تم کو یہ بھی یاد ہے کہ میں تمھارے سبق سے آگے سطروں کی سطروں پر سیاہی پھیر دیتا تھا۔ بلکہ بعض دفعہ صفحے کے صفحے ایسے آپڑے ہیں کہ مجھ کو اوپر سے سادہ کاغذ لگا کر ان کو چھپانے کی ضرورت ہوئی۔۔۔ وہ تمام بےہودہ باتیں تھیں جن کو میں کاٹتا اور چھپاتا پھرتا تھا۔ فہمیدہ: سچ کہو، لو میں سمجھی مشکل جان کر چھڑا دیتے ہیں۔ نصوح: بڑی مشکل یہ تھی کہ میں ان واہی اور فحش باتوں کو تمھارے رو بہ رو بیان نہیں کر سکتا تھا۔ پھر یہ اس کتاب کا حال ہے جو پندواخلاق میں ہے، اور تصنیف بھی ایسے بزرگ کی ہے کہ کوئی مسلمان کم تر ایسا نکلے گا کہ ان کا نام لے اور شروع میں حضرت اور آخر میں رحمۃ اللہ علیہ یا قدس سرہ العزیز نہ کہے۔ یعنی ان کا اعتقاد اولیاء اللہ میں ہے۔

چودھری محمد نعیم نے کہا کہ نصوح کے ہاتھوں کلیم کا کتب خانہ سپردِ آتش کیے جانے سے زیادہ بھیانک اور رونگٹے کھڑے کرنے والا منظر تمام اردو فکشن میں نہ ملے گا۔ اس پر اتنا اضافہ کرلیجے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے کس خوب صورتی سے ساری عمر کی اکٹھا کی ہوئی

کتابوں کو "چند کتابیں" کہہ کر اور یہ کہہ کر کہ وہ سب اخلاق سوز اور مبنی بر کفر تھیں، ان کا قصہ پاک کردیا۔ شاعری کو گردن زدنی قرار دینے کے لیے تو ایک نگاہ غلط انداز کافی ٹھہری (انسان نے تمام دنیا میں بدی اور خدا کی نافرمانی پھیلا رکھی ہے۔ کیا تم شعر و شاعری کے نام سے واقف نہیں ہو ۹) پھر آخری وار coup de grace کے طور پر انھوں نے "گلستان سعدی" کے مصنف کے ساتھ مسلمانوں کے تمام اولیاء اللہ اور ان کی کتابوں کو بھی سوختنی قرار دے دیا۔ پھر کیا تعجب کہ فراق صاحب "گلستان" سے نالاں تھے، کہ اس کتاب میں دنیا داری بہت ہے۔ اور کیا تعجب کہ اسکندریہ کا مشہور عالم عظیم الشان کتب خانہ نذر آتش ہوا تو عیسائیوں کے ہاتھوں، لیکن عیسائیوں نے مسلمانوں کو اس جرم کا مرتکب قرار دے دیا اور آج تک یہ جھوٹ مغرب کی بہت سی کتابوں میں مندرج ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم میں نصوح ایسے جوشیلے کردار ہوں اور نذیر احمد جیسے نثر۔ اصلاح میں چور مصنف ہوں، اس سے کتاب خوانی کی جگہ کتاب سوزی ہی بن آئے گی۔

بیسویں صدی کے وسط میں بعض بالغ نظر نقادوں نے ہماری داستانوں پر نئے سرے سے نگاہ ڈالی۔ لیکن اب یہ تصور عام ہوچکا تھا کہ بیانیہ کی اصناف "ارتقا پذیر" ہوتی ہیں، اس معنی میں کہ کوئی صنف اسی مفہوم میں مرتقی ہوتی ہے جس مفہوم میں حیاتیاتی زندگی مرتقی ہوتی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی سے عاری جانوروں میں ریڑھ کی ہڈی پیدا ہوجاتی ہے۔ بصارت سے عاری جانور میں آنکھ پیدا ہوجاتی ہے۔ بے پاؤں والے جانوروں میں پاؤں پیدا ہوجاتے ہیں وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ارتقا کی ہر منزل گذشتہ کے مقابلے میں بہتر کی طرف قدم دھرتی ہے۔

ہمارے نقادوں نے فرض کرلیا کہ ادبی اصناف کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے اور ناول کا معاملہ تو بالکل یہی ہے کہ وہ داستان کی "ارتقا یافتہ" شکل ہے۔ داستان میں "واقعیت" اور "دانش وری" کم تھی۔ "ارتقا" کے ذریعے داستان نے یہ صفات حاصل کرلیں۔ اور ناول بن گئی۔ وہ یہ بھول گئے کہ ارتقا کی منزلیں ہر جنس اور ہر نوع کے ساتھ لازمی نہیں ہیں۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ ارتقا کا عمل دوچار سو، چار ہزار برس میں نہیں بلکہ لاکھوں برس میں مکمل ہوتا ہے۔ جب تک اتفاق (chance)، تحویل (mutatation) اور فطری انتخاب (natural selection) میں سے کم از کم دو عناصر کارفرما نہ ہوں، ارتقا ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ بھلا غور کیجیے، کہاں یہ پیچیدہ چیونٹی کی چال سے لاکھوں گنا زیادہ سست رفتار عمل، جو محض نامیاتی وجودوں پر کارفرما ہوتا ہے اور کہاں یہ معصوم تصور کہ ادبی اصناف ارتقا پذیر ہیں اور داستان نے مرتقی ہوکر ناول کی شکل اختیار کرلی۔ اس بات سے قطع نظر، کہ ادبی اصناف میں ارتقا ہوتا ہی نہیں اور اس طرح تو ہرگز نہیں ہوتا کہ کوئی صنف وہ تشخیصی صفات identifying characteristics حاصل کرلے جو اسے پہلے سے میسر نہیں تھیں، اہم بات یہ ہے کہ داستان اور ناول بیانیہ کے الگ الگ دھارے ہیں۔ ایک کا دوسرے سے موازنہ تو شاید ہوسکے، لیکن ایک کے معیار پر دوسرے کا محاکمہ نہیں ہوسکتا۔

"داستان" کے بارے میں فی الحال اتنا کہنا کافی ہے کہ "داستان" ایسا بیانیہ ہے جو زبانی سنانے کے لیے تصنیف کیا جائے، چاہے فی البدیہہ، چاہے سوچ سوچ کر، خواہ دن رات کی محنت سے لکھ کر، یا دل میں گڑھ کر پھر زبانی یاد کر کے صرف سنانے کے لیے یا چھپوانے اور سنانے کے لیے۔ یعنی طریقہ تصنیف و تشکیل جو بھی ہو لیکن مقصود یہی ہوتا ہے کہ اس بیانیہ کو زبانی سنایا جائے گا۔

باختن نے لکھا ہے کہ ناول نگار سے زیادہ تنہا کوئی فن کار نہیں، کیوں کہ اس کی تحریر کو پڑھنے والا اجنبی، خالق تحریر سے دور، اور اکثر خالق تحریر سے بالکل غیر متعلق شخص ہوتا ہے۔ ناول تنہائی میں یا چپ چاپ پڑھا جاتا ہے۔ یعنی ناول ایسا بیانیہ ہے جس کی

target audience یعنی اس سے لطف اندوز ہونے والے دکھائی نہیں دیتے ۔ جیرلڈ پرنس Gerald Prince اور بعض دوسر وضعیاتی نقادوں نے فکشن کے "مستمع" یا narratee کا تصور پیش کیا ہے اور کہا کہ ہر فکشن نگار کے ذہن میں ایک تصور اس شخص ہوتا ہے جو اس کے فکشن کا قاری ہوگا ۔ یعنی ہر فکشن لکھنے والے کے ذہن میں ایک مفروضہ قاری ہوتا ہے اور وہ اپنے فکشن کو اس مفروضہ قاری کے جذباتی حدود اور علمی معلومات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترتیب دیتا ہے ۔ مثلاً یہ بات تو سامنے کی ہے کہ اگر میں اردو میں فکشن لکھ رہا ہوں تو میرا مفروضہ قاری ایسا شخص نہ ہوگا جو اردو نہ جانتا ہوگا ۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ میرا مفروضہ قاری "غزل" "رباعی" وغیرہ اصطلاحوں سے اور شاید میر اور غالب اور میرانیس و اقبال سے واقف ہوگا ۔ لیکن اغلب ہے کہ اس نے خاقانی کا نام نہ سنا ہو ۔ وغیرہ لیکن اس مفروضہ قاری کا بھی وجود فکشن نگار کے ذہن ہی میں ہوتا ہے اور وہ اس کے ساتھ کسی قسم کا مکالمہ نہیں قائم کرسکتا اور نہ قاری سے فکشن نگار کو کسی طرح کی مدد مل سکتی ہے ۔

اس کے برخلاف ، داستان گو کا سامع اس کے سامنے ہوتا ہے اور اکثر ان دونوں کے درمیان فوری تاثرات اور ردِ عمل کا لین دین بھی ہوسکتا ہے ۔ کم سے کم اتنا تو ہے کہ داستان گو اپنے سامعین کو دیکھ کر اندازہ لگاسکتا ہے کہ وہ توجہ سے سن رہے ہیں ، یا اکتار ہیں یا وہ کس چیز کے مشتاق ہیں ۔ داستان گو اور سامع دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں ۔ اس کے برخلاف ناول نگاری کی مثا اندھیرے میں بیٹھ کر گانے والے کی ہے اسے کچھ نہیں معلوم کہ اس کا گانا کون سن رہا ہے ۔ کس طرح سن رہا ہے کوئی سن بھی رہا کہ نہیں اور اگر سن رہا تو وہ اسے پسند کررہا کہ ناپسند یا بہت زیادہ متاثر ہورہا ہے ، یا بہ مشکل برداشت کر رہا ہے ۔

اگر بیانیہ سنایا نہ بھی جارہا ہو لیکن اسے اس غرض سے تصنیف کیا گیا ہو کہ اسے زبانی سنایا جائے گا ، تو بھی اس کی بدیعیات Rhetoric وہی ہوگی جو زبانی بیانیہ کی ہوتی ہے ، اس کی رسومیات اور سارے سبھاؤ بھی زبانی بیانیہ کے ہوں گے ۔ یہ کہا جاسکتا ہے اگر کسی نے کوئی زبانی بیانیہ کبھی نہ سنا ہو یا سنایا ہو ، تو وہ ایسا بیانیہ ترتیب بھی نہیں دے سکتا ۔ اردو کی داستان امیر حمزہ زبانی بیانیہ اعلیٰ ترین مثالوں میں تو ہے ہی ، لیکن چوں کہ یہ لکھی ہوئی بھی موجود ہے اس لیے اسے دنیا کے طویل ترین اور بہترین زبانی بیانیوں م رکھا جاسکتا ہے ۔

جب ہم اردو میں "داستانِ امیر حمزہ" کا فقرہ استعمال کرتے ہیں تو اس کے معنی کم از کم مندرجہ ذیل ہوتے ہیں ۔ یہ تمام معنی یک وقت موجود تو ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہر بیان میں یہ ہر وقت بہ روئے کار بھی آئیں ۔

(۱) وہ زبانی بیانیہ یا زبانی / تحریری بیانیہ جو اردو ، فارسی ، عربی ، ترکی ، جارجیائی ، انڈونیشیائی ، بنگالی ، ہندی ، پشتو ، سندھ اور بہت سی دیگر زبانوں میں موجود ہے اور جس میں امیر حمزہ اور یا ان کی اولادوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔

(۲) وہ داستان جسے خلیل علی اشک نے فورٹ ولیم کالج کے لیے فارسی سے اردو میں منتقل / ترجمہ کیا (۱۸۰۱ء) کہنے کو یہ چا جلدوں میں ہے لیکن دراصل یہ چار حصے ہیں جو ایک ہی جلد میں بندھے ہوئے ہیں ۔ اپنی اصل شکل میں اور ذرا بدلی ہوئی شکل میں بھی داستان اس وقت دست یاب ہے ۔ اس کی فارسی اصل کا پتہ نہیں لگ سکا ہے ۔ اسکا جو نسخہ پیش نظر ہے ، وہ مطبع چیون پرکاش دہلی کا ہوا ہے (تاریخ ندارد) ۔ اس میں ۲۳ سطری مسطر کے ۴۲۴ صفحات ہیں ۔ کتاب باتصویر ہے ۔ تصویریں کیا ہیں ، حسب معمولی قلم سے کھینچے ہوئے خاکے ہیں لیکن صفحہ ۱۲ اور ۱۹ کی تصویریں ارباب مطبع نے ہاتھ سے رنگوائی ہیں ۔

(۳) وہ داستان جسے امان علی خاں غالب لکھنوی نے کلکتہ میں فارسی سے اردو میں منتقل / ترجمہ کیا (۱۸۵۵ء) ۔ اس کی

اصل ابھی تک نہیں مل سکی ہے۔ خود یہ ترجمہ بھی اب بہت کم یاب ہے۔ یہ بھی کہنے کو چار جلدوں میں ہے لیکن دراصل یہ چار حصے ہیں جو ایک ہی جلد میں بندھے ہوئے ہیں۔ میرے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ کولمبیا یونیورسٹی کی پروفیسر فرانسس پرچٹ کے مملوکہ نسخے کی فوٹو کاپی ہے۔ یہ بڑی تقطیع ،لیکن صرف اکیس سطری مسطر کے پورے ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۴) نول کشور پریس نے غالب لکھنوی کے ترجمے کو تقریباً بلا تغیر ۱۸۷۱ء میں چھاپا لیکن "مترجم" کا نام عبداللہ بلگرامی درج کیا۔ یہ "ترجمہ" عرصہ ء دراز تک نول کشور پریس سے چھپتا رہا۔ عبداللہ بلگرامی کے بعد سید تصدق حسین (داستان گو شیخ تصدق حسین نہیں) اور پھر عبدالباری آسی نے اس میں تھوڑے بہت ردو بدل کیے۔ عموی اعتبار سے یہ متن وہی ہے جو غالب لکھنوی نے ۱۸۵۵ء میں شائع کیا تھا۔ اشک اور غالب لکھنوی میں بھی بہ اعتبار قصہ بہت کم فرق ہے۔ انھیں ایک ہی داستان کی دو روایتیں کہہ سکتے ہیں، ایسی روایتیں جن میں آپس میں بہت بڑی حد تک اتفاق ہے۔ ممکن ہے کہ اشک کے سامنے "رموز حمزہ" (فارسی) کا کوئی نسخہ رہا ہو اور ممکن ہے غالب لکھنوی کے سامنے "رموز" ہی کی کوئی اور روایت رہی ہو۔ عبداللہ بلگرامی کے نام سے شائع ہونے والے ایڈیشنوں میں سے جو ایڈیشن اس وقت میرے پیش نظر ہیں۔ ان میں سے ایک اول ایڈیشن (۱۸۷۱ء) ہے۔ اس کا قلم موٹا، مسطر ۲۳ سطری اور ضخامت ۵۰۷ ہیں۔ تصدق حسین / عبدالباری آسی کے نام سے شائع ہونے والے ایڈیشنوں میں سے بھی کئی میرے پیشِ نظر ہیں۔ سب سے آخری کی تاریخ طباعت ۱۹۶۹ء ہے اس میں پچیس سطری مسطر کے ۵۴۴ صفحات ہیں۔

(۵) امیر حمزہ یا امیر حمزہ اور ان کی اولادوں کے متعلق وہ داستان جس کی مختلف جلدیں یا جس کے مختلف اجزا پر مبنی جلدیں رام پور میں ترتیب دی گئیں اور جو اب رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہیں۔

(۶) وہ داستان جو چھیالیس جلدوں میں بہ زبانِ اردو نول کشور پریس لکھنو / کانپور سے چھپی۔ ۱۸۸۳ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان پینتالیس جلدیں چھپیں۔ ایک جلد ۱۹۱۷ء میں چھپی۔ یہ ساری چھیالیس جلدیں پیش نظر ہیں۔

(۷) وہ متفرق اردو داستانیں جو دلی یا لکھنو سے زیادہ تر انیسویں صدی کے اواخر اور کم تر بیسویں صدی کے اوائل میں چھپیں اور جن میں امیر حمزہ یا / اور ان کی اولادوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں سے کئی پیش نظر ہیں۔

(۸) وہ متفرق داستانیں یا داستانوں کے اجزا جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ربع اول کے دوران اردو داستان گویوں نے سنائے اور جن میں امیر حمزہ یا / اور ان کی اولادوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

(۹) داستانِ امیر حمزہ فارسی کی وہ تحریری روایت جو "رموز حمزہ" اور اس طرح کے دوسرے ناموں سے مطبوعہ شکل میں ملتی ہے۔ "زبدۃ الرموز" اگرچہ نامکمل مخطوطے کی صورت ہی میں دستیاب ہے، لیکن اسے بھی اس شق میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ فارسی داستانوں میں سے بھی کچھ میرے پیش نظر ہیں۔

مندرجہ بالا فہرست سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ داستان امیر حمزہ کا ایک عینی وجود ہے جس میں اس داستان کے سب وجود شامل اور شریک ہیں۔ اس کتاب میں زیادہ تر بحث اس داستان امیر حمزہ سے ہوگی جو چھیالیس جلدوں میں نول کشور پریس سے ۱۸۸۳ء اور ۱۹۱۷ء کے مابین شائع ہوئی۔ لیکن داستانوں کی دوسری روایتیں بھی حسبِ ضرورت معرض گفتگو میں آئیں گی۔ داستان کے عینی وجود سے بھی بہ وقت ضرورت کام لیا جائے گا۔ اگر لفظ "داستان" تنہا آئے تو اس سے "داستان" بہ طور صنف یا کوئی خاص داستان جو کسی کتاب یا جلد میں مذکور ہو، مراد ہوگی یا عمومی صورت میں داستان امیر حمزہ مراد ہوگی۔ معنی بہ ہر صورت سیاق کلام سے متعین ہوں گے اور یہ بات

) رہے گی کہ داستان کی کون سی روایت اس وقت زیرِ بحث ہے۔

داستان امیر حمزہ کی کوئی بھی داستان یا کسی داستان پر مبنی کوئی جلد ایسی نہیں جس میں صرف ایک ہی قصہ ہو یا جس میں ایک پلاٹ ہو۔ ذیلی پلاٹوں کی کثرت اور وقوعوں کی کثرت کے باعث لفظ "داستان" کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ "کسی کردار کے ساتھ ں آنے والے واقعات کا مربوط سلسلہ" لہذا مثال کے طور پر تین جلدوں پر مشتمل احمد حسین قمر کی ترتیب دی ہوئی ایک داستان کا نام سم ہفت پیکر" ہے۔ اس میں ایک داستان شاہزادہ جہاں گیر کی ہے، جب وہ سفاک تیرہ دروں نامی ساحر کو مار کر عازم سفر ہوتا ہے۔ ، اور اس کے ایک سردار بامان صحرا نورد کو کئی مہمات پیش آتی ہیں۔ اس طرح کی کئی داستانیں "طلسم ہفت پیکر" نامی داستان میں ۔ ہر داستان وقوعوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ "وقوعہ" سے مراد ہے، واقعات کا محدود سلسلہ جو آپس میں پوری طرح مربوط اور جو عام طور پر ،سے لے کر تین مواقع location میں پورا ہو جائے۔ کسی وقوعے میں بہت سے منظر ہو سکتے ہیں۔ "منظر" سے ہم کسی مقام یا کسی .ت حال کا بیان مراد لیتے ہیں۔ ایک منظر بہت سے واقعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ "واقعہ" سے مراد ہے "جو صورت پہلے سے موجود ہو ں میں کسی تبدیلی کا پیدا ہونا"۔

داستان کی آخری بنیادی اصطلاح کو ہم "عنصر یا motif" کہہ سکتے ہیں۔ "عنصر" سے مراد ہے کسی واقعے یا کردار یا وقوعے کا پہلو جو اس واقعے، کردار یا پہلو کو انفرادی رنگ یا امتیازی صفت عطا کرتا ہو یا بار بار پیش آتا ہو۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل باتوں ںصر یا motif سے تعبیر کر سکتے ہیں:

(۱) ہیرو / شہزادہ / کوئی اہم کردار (اگر وہ "اچھے" لوگوں کے طبقے میں ہے) بہت ہی کم عمری میں (مثلاً تین یا پانچ یا سات رہ سال کی عمر میں) اپنے سے بہت زیادہ عمر اور ظاہری قوت والے مدِ مقابل پر غالب آتا ہے۔

(۲) ہیروئن / شہزادی / لڑکی، اپنے چاہنے والے کی خاطر اپنے باپ یا والد کو / چھوڑ دیتی ہے / دغا دیتی ہے / باپ کا خون ا ہے وغیرہ۔

(۳) ہیرو / شہزادے / اہم کردار کو کسی بزرگ کی طرف سے تحائف ملتے ہیں جن کی وجہ سے اس کی قوت اور کارکردگی میں غیر لی اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۴) ہیرو / شہزادے / اہم کردار کے پاس اڑنے والا گھوڑا / جناتی گھوڑا ہے۔

(۵) ہیرو / شہزادہ / اہم کردار، شکار کو جاتا ہے، دورانِ شکار اس کی ملاقات کسی مدِ مقابل سے شہزادی / ڈاکو / دشمن روپ میں ہوتی ہے۔

(۶) ہیرو / شہزادے / اہم کردار کا ایک جاں نثار دوست ہوتا ہے، ہیروئن / شہزادی کی ایک وزیر زادی / سہیلی ہوتی ہے۔ یہ ر منجملہ اور کاموں کے قاصد اور ہم راز کے بھی فرائض انجام دیتے ہیں۔

(۷) ہیرو / شہزادہ، اپنے منجم / ستارہ شناس / مرد دانا کی رائے پر عمل کرتا ہے / نہیں کرتا۔

(۸) ہیرو / شہزادہ / اہم کردار سے شکست کھایا ہوا حریف ہیرو / شہزادے / اہم کردار کا مطیع ہو جاتا ہے۔

(۹) عقل مند شخص / چالاک شخص / عیار کے پاس کوئی تھیلا / زنبیل ہوتی ہے جس میں بہت ساری چیزیں سما جاتی ہیں۔

(۱۰) جادوگرنیاں (خاص کر وہ جو ہیرو / شہزادے / اہم کردار کی دشمن ہیں) بدصورت اور بوڑھی ہوتی ہیں، لیکن جادو سے

اپنی شکل ٹھیک بنائے رہتی ہیں۔

(۱۱) بعض اہم کردار اولا نقاب دار کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

(۱۲) ہیروئن / شہزادی کا چاہنے والا (اگر وہ خراب لوگوں کے زمرے میں ہے) ہیروئن / شہزادی سے انکار کی صورت میں اسے بہ جبر حاصل کرنے کے لیے فوج بھیجتا ہے۔

(۱۳) انتہائی خوش خوراک شخص۔

(۱۴) دشمن کی ڈاڑھی / سر کے بال مونڈ دینا۔

(۱۵) ہیرو شہزادہ ہاتھی کی سونڈ / گھوڑے کی دم اکھاڑ دیتا ہے۔

ہمیں تین باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اول یہ کہ داستان کی شعریات کو ہم اردو کی دیگر کلاسیکی اصناف کی شعریات سے الگ کرکے نہیں دیکھ سکتے۔ دوسری بات یہ کہ جس کلاسیکی اصناف کی شعریات کا پورا شعور حاصل کیے بغیر ہم ان کی صحیح تحسین نہیں کرسکتے ،اسی طرح داستان کی شعریات کو جانے بغیر داستان کا مطالعہ کرنا ہمیں طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا کردے گا۔ تیسری اور شاید سب سے اہم بات یہ ہے کہ داستان کا مطالعہ شروع کرنے کے پہلے ہمیں اپنے رویے کو منفی سے مثبت کرنا ہوگا، مربیانہ طرزِ فکر کو ترک کرنا ہوگا اور اس بات کا یقین کرکے چلنا ہوگا کہ داستان بھی اعلیٰ درجے کی تخلیقی کارگزاری ہے بچوں یا غیر ترقی یافتہ ذہنوں کا کھیل نہیں۔

○●○

(سلسلہ ص: ۱۳ سے)

کے متعدد عزیز ترین احباب کو یا تو سزائے موت دے دی گئی تھی یا انھیں جلاوطن کردیا گیا تھا۔ دلی کے بہتیرے باشندوں کو روزانہ چاندنی چوک پر پھانسی دی جاتی تھی۔ ان کے بادشاہ کو دور دراز برما جلاوطن کردیا گیا تھا۔ پرانے جاگیردار طبقے کے زیادہ تر افراد سماج میں اپنے خود اعتمادی کے رتبے سے محروم اور ناداری میں کسی طرح گزارہ کرنے پر مجبور کردیے گئے تھے۔ ان کے پسندیدہ شہر کا بڑا حصہ منہدم کیا جاچکا تھا۔ خود اپنے انجام کے بارے میں مذبذب، اپنی پرانی پنشن کے بغیر وہ اس مسلسل اتھل پتھل کے افلاس زدہ، تنہا اور ساکت و صامت شاہد عینی تھے۔ شاید انہی دنوں انھوں نے اپنا یہ مشہور شعر کہا ہو،

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے، ابھی دیکھیے، کیا کیا، مرے آگے

○●○

(سلسلہ ص: ۲۲ سے)

خواب۔ ہندستانی، پنجابی: نیند، لنڈا: تندر، سنسکرت: ندرا۔ شار / شہر: شہر، ملک۔ ہندستانی، تاجک: شہر۔ راہی ہونو: روانہ ہونا تاجک بول چال کی زبان: راہی شدن۔ راسے / را / رہ: راہ، راستہ۔ جوون: جوان۔ ہندستانی، تاجک: جوان۔ قریب: تقریباً، قریب، پاس۔ ہندستانی، تاجک: قریب۔ اٹرنو / اٹرنو، اٹرنا۔ کاربگانو: کام سے بے دخل کرنا۔ (تاجک: وے پاشارا از کار خالی کردند)۔ وازر / وزر / وزیر: وزیر۔ تاجک، ہندستانی، عربی: وزیر۔ کنیز: نوکرانی، کنیز۔ ہندستانی، تاجک: کنیز۔ انڈو / اندو: اندھا۔ ہندستانی، پنجابی، لنڈا: انہ ھا۔ کشترو: آغوش، گود۔ قار: غصہ، قہر۔ ہندستانی، تاجک: قہر۔ زنگ مارنو: اعلان کرنا۔ تاجک، ازبکی: زنگ: گھنٹہ۔ دوڑ: دور، دوا علم رانی۔ فلان چا / فلاں: فلاں۔ تاجک، ہندستانی: فلاں۔ بکیری دڑانو: گھسیٹنا (جیسا کہ بزکشی کے کھیل میں بکرے کی لاش کو گھسیٹتے ہیں) دڑانو: دوڑانا۔

○●○

راشد آزر

بحروں میں تجربوں کے امکانات

اس مضمون کا مقصد صرف ان امکانات کی طرف اشارہ کرنا ہے جو ہمارے عروض میں ہیں اور جن سے شعرا فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ چوں کہ قارئین میں سے اکثر عروض کی تاریخ اور بنیادی باتوں سے واقف ہیں اس لیے میں آپ کا وقت ضائع کیے بغیر صرف چند ضروری نکات کا ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ پہلے آہنگ کی بناء پر چند بحریں تشکیل دی گئیں، پھر آہنگ کے اضافے کے ساتھ ان میں زحاف کی گنجائش پیدا کی گئی، پھر اور بحروں کا اضافہ کیا گیا اور اس مشقت کے لیے چند اصولوں کا ڈھانچا تیار کیا گیا جس میں مزید اضافے کیے گئے۔ اس بات سے بھی سب واقف ہیں کہ جس طرح زبان پہلے بنتی ہے، جو بولی کی ارتقائی شکل ہے اور پھر اس کو قاعد کے ذریعے اصولوں کے سانچوں میں منظم کیا جاتا ہے اور انھی اصولوں کی بنیاد پر زبان کو وسعت دی جاتیہے، اسی طرح شاعری میں آہنگ پہلے آتا ہے اور اس کے بعد قواعد کا، یعنی عروض کا سانچا بعد میں بنتا ہے اور اصول گڑھے جاتے ہیں اور نئے آہنگ کی روشنی میں ان اصولوں کی بنا پر اس سانچے کو مزید پھیلایا جاتا ہے اور پھر جب یہ اصول بھی آہنگ کی وسعت کے لیے کم پڑتے ہیں تو ان میں تبدیلی کی جاتی ہے اور اس طرح بحروں میں مزید اضافہ کیا جاتا ہے۔

ترانے کی، جو رباعی کے نام سے مشہور ہے ابتدا کا قصہ بڑا دل چسپ ہے کہ ایک لڑکے نے کھیل کھیل میں چار اخروٹ ایک گڑھے کی طرف لڑھکائے تو تین تو سیدھے گڑھے کے منھ تک جا پہنچے لیکن ایک بھکتا، بھٹکتا لڑھکتا بہ ہر صورت آخر کو اس گڑھے کے منھ تک پہنچا۔ اس لڑکے نے بے ساختہ کہا:

"غلطان غلطان ہمی رود، تا لبِ گو" (گو گڑھے کو کہتے ہیں)

روایت ہے (اور دروغ برگردن راوی) کہ رودکی نے، جو وہاں سے گزر رہا تھا، سنا تو پھڑک اٹھا اور اس پر تین مصرعے لگائے اور اس کو "ترانہ" کے نام سے رواج دیا۔ یہ بھی ایجاد رباعی کے نام سے مشہور ہوئی اور عرب میں بہت پسند کی جانے لگی۔ اس مصرعے کا وزن ہے، مفعولن فاعلن مفاعیل فَعِل۔

رباعی کے لیے بحر ہزج مخصوص ہے جس کے چوبیس مروجہ اوزان ہیں جن میں سے بارہ مفعولن سے شروع ہوتے ہیں۔ یہاں ان اوزان کو دہرانا غیر ضروری ہے۔ میں جس نکتے کی اہمیت پر قارئین کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان سارے اوزان کی تقطیع بحر رجز سے بھی کی جاسکتی ہے اور ان چوبیس اوزان میں سے بارہ جو ہزج میں مفعول سے شروع ہوتے ہیں وہ رجز میں فع مفتعلن سے شروع ہوں گے اور جو بارہ اوزان ہزج میں مفعولن سے شروع ہوتےہیں وہ رجز میں فع مفعولن سے شروع ہوں گے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اس پر ایک بڑا دل چسپ مضمون لکھا ہے جو ان کی کتاب "تحقیق کی روشنی میں" میں شامل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ امیرالاسلام شرقی صاحب کی دریافت ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ایک بحر کی تقطیع دوسری بحر سے کی جاسکتی ہے۔ اس سے قطعِ نظر کہ یہ

دونوں ایک ہی دائرے کی بحریں ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم کو اس کی حقیقت سے پیدا ہونے والے امکانات پر غور کرنا چاہیے۔ مزید یہ کہ بحروں میں اوزان کے اضافے کے امکانات اور دوسری بحروں میں اس قسم کی گنجائش اور نئی بحروں کی ایجاد کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔

میں نے ۱۹۶۹ء یا ۱۹۷۰ء کے قریب ایک تجزیہ کیا تھا جو میرے دوسرے مجموعہ کلام "صدائے تیشہ" میں، جو ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا، شامل ہے۔ میں نے انگریزی کی بحر آئیامبک پنٹامیٹر (Iambic Pentameter) میں چار نظمیں اردو میں کہیں اور ان کے آخر میں انگریزی مصرعوں کی تضمین کی ہے۔ انگریزی کی اس بحر کے وزن میں اتنی گنجائش ہے کہ اس میں ہمارے عروض کے لحاظ سے بحرِ ہزج میں بھی اردو نظم لکھی جاسکتی ہے اور بحرِ رجز میں بھی۔ مثلاً:

بحرِ ہزج میں ______ تم آج تک یہ سوچتے رہے (مفاعلن مفاعلن فعل)
ہے دہر ایک امتحان گاہ (مفاعلن مفاعلن فعول)

اور انگریزی کی تضمین ____ O, Throw away the worser part of it,
(شیکسپیر) And live the pured with the other half. وغیرہ۔

اور بحرِ رجز میں ____ جب بھی دہانِ زخم سے کہا ، افسانہ مرگِ زیست کا تو وہ
(مستفعلن مفاعلن فَعِل) وغیرہ۔

اور انگریزی کی تضمین ____ O, What a fall was there
(شیکسپیر) My Country men, وغیرہ۔

میں نے ایک تجربہ دو بحروں کے اختلاط کا ۱۹۹۴ء میں کیا جس کا یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس سے پہلے کہ میں وہ تجربہ آپ کے سامنے پیش کروں ان دو بحروں کے مختلف اوزان پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ بحرِ مجتث کے زحاف کے ساتھ کئی اوزان بنائے گئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن : ہر ایک با / ت پہ کہتے / ہو تم کہ تو / کیا ہے
(۲) مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلان : کسی رئی / س کی محفل / کا ذکر کیا / ہے امیر
(۳) مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلاتن : عجب نشا / ط سے جلا / د کے چلے / ہیں ہم آگے
(۴) مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن : خدا کے گھر / بھی نہ جائیں / گے بے بلا / ئے ہوئے
(۵) مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلان : کسی کو ہر / گز اپنا / نہ جانیو / اے شاد (شاذ بدایونی)
(۶) مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلن : کہ دشمن / جاں ہوتا / ہے بھائی کا / بھائی
(۷) مفاعلن فعلاتن مفاعلن فاع : دلِ فر / دہ سے یکسر / عذاب میں / ہوں
(۸) مفاعلن فعلاتن مفاعلن فع : مزید یہ / کہ ہوا ہے / خلاف وہ / بُت

بحرِ مجتث کا سالم وزن ہے : مستفعلن فاعلاتن، مستفعلن فاعلاتن۔

اب بحرِ وافر کے زحاف کے ساتھ جو اوزان بنائے گئے ہیں وہ ملاحظہ کیجیے:

(۱) مفاعلتن مفاعیلن مفاعلتن مفاعیلن : کسی نے کہا / حسیں ہے وہ / مثال سا ہے / جمال اس کا
(۲) مفاعلتن مفاعیلن مفاعلتن : ترا عاشق / نہ جی ہی سکا / نہ مر کے وہ / سکوں سے رہا
(۳) مفاعیلن مفاعلتن مفاعیلن مفاعلتن : ترا عاشق / نہ جی ہی سکا / نہ مر کے وہ / سکوں سے رہا
(۴) مفاعلتن مفاعیلن فعولن : سکوں نہیں / زمانے میں / کریں کیا
(۵) مفاعلتن مفاعلن فعولن : کسی کی صدا / سنا کیے / ہمیشہ
(۶) مفاعلتن مفاعیل فعولن : رکھا ہے کہاں / کہاں ڈھونڈ / رہا ہے

بحر وافر کا سالم وزن ہے : مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن

ہمارے کان جس آہنگ سے آشنا ہیں۔ اس کی روشنی میں بحرِ مجتث اور بحر وافر کے اوزان جو ماہرینِ عروض نے بنائے ان کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو بادی النظر میں ساقط البحر لگتے ہیں۔ صرف ماہرِ عروض ہی پہچان سکتا ہے کہ یہ درست ہیں۔

میں نے یہ تجربہ کیا کہ بحر مجتث کے وزن مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن سے آخری رکن فعلن نکال کو بحرِ وافر کا رکن مفاعلتن لگا دیا۔ اس سے جو وزن حاصل ہوا وہ یہ ہے:

مفاعلن فعلاتن مفاعلن مفاعلتن۔ مجھے یہ آہنگ اچھا لگا۔ دراصل میں نے اس آہنگ میں غزل کہنے کے بعد جب اس کی دھمک مجھے اچھی لگی تو تقطیع کی اور اس وقت محسوس کیا کہ غیر ارادی طور پر ایک نئے آہنگ کے تجربے سے اور دو بحروں کے اختلاط سے ایک نیا وزن ہاتھ لگا ہے۔ اس وزن میں غزل کے تین شعر نمونے کے طور پر پیش ہیں "

تمام عمر یہ غم تھا کہ میرے ساتھ کوئی نہیں
خوشی یہ ہے کہ مرے واسطے اداس کوئی نہیں
ہمیشہ یاس میں ڈوبا رہا یہ فکر بھی نہ ہوئی
کہ میرے دل کے خزانے میں اب تو آس کوئی نہیں
ستارے یوں تو ہمیشہ بھلا نصیب لکھتے رہے
مگر یہ کیا ہے کہ میرے لیے تو راس کوئی نہیں

میں نے جو تجربہ کیا ہے اس کو ممکن ہے کہ مروجہ عروض کے اصولوں کو حتمی سمجھنے والے غلط قرار دیں لیکن میرا کہنا یہ ہے کہ جن بحروں کے اختلاط کا آہنگ کے پسند آنے کی بنیاد پر میں نے تجربہ کیا ہے اس کو یکسر مسترد کرنا مناسب نہیں ہے کیوں کہ آج عروض کے جو اصول ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ بنے ہیں اور ان میں وقتاً فوقتاً ضرورت کے لحاظ سے آہنگ کے تجربات کی بنیاد پر اضافے کیے گئے ہیں۔ میں یہاں چند بنیادی باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

شاعری کے آہنگ کی بنیاد ہماری سانس کا اتار چڑھاؤ، ہماری رگوں میں خون کے دوران کی رفتار اور ہماری نبض کا زیروبم ہے۔ اس آہنگ کی مختلف شکلوں سے بحروں کے اوزان بنے ہیں، جن میں سے بعض ایسے ہیں جن سے ہمارے کان آشنا ہیں اور بعض سے ناآشنا۔ میں جس نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آہنگ کی بنیاد، جو ہمارے زندہ ہونے کی دلیل ہے اور جس کو

ہمارے تحقیت یافتہ کان رد نہیں کرتے اسی ایما پر ہمارے جذباتی اظہار کی عمارت کھڑی ہے ، جس کو ہم شاعری کہتے ہیں ۔ ایک ایسے آہنگ کو جس کو ہم من کر محظوظ ہوتے ہیں صرف اس لیے غلط قرار دے کر رد کرنا کہ یہ مروجہ اصولوں کے تحت بنائے ہوئے چوکھٹے میں نہیں بیٹھتے ، مناسب نہیں ہے ۔ ہم کو ان اصولوں میں اضافہ کرکے ایسے امکانات کے لیے گنجائش فراہم کرنی ہوگی جیسا کہ وقتاً فوقتاً ماہرینِ عروض اور بعض اساتذہ ماضی میں کرتے رہے ہیں ۔ فی الوقت میری ایک گزارش یہ ہے کہ میرے ایجاد کردہ وزن کو جس کے ارکان یہ ہیں : مفاعلن فعلاتن مفاعلن مفاعلتن ، بحرِ مخلط کی تجرباتی شکل کے طور پر قبول کریں ، یا کم از کم رد کرنے سے پہلے ان مروجہ اصولوں کو ان کے تاریخی پس منظر میں دیکھیں کہ یہ اصول کب کب بدلے گئے اور ان میں کیوں اور کس کس طرح سے اضافہ کیا گیا اور بعض اوزان کو غیر فطری ہونے کے باوجود ماہرینِ عروض نے اپنے بنائے ہوئے اصولوں اور قواعد کی بنا پر کیسے رواج دیا ۔ اور پھر سوچیں کہ ایک آہنگ فطری ہونے اور کانوں کو اچھا لگنے کے باوجود صرف اس لیے کیوں رد کیا جائے کہ وہ موجودہ اصولوں کے دائرے سے باہر ہے ۔ جب ہمارے پیش رو ان اصولوں میں اضافے کر کے بحریں ایجاد کر سکتے تھے اور زحاف کے ذریعے ان بحروں میں آہنگ کی پسندیدگی کی بنا پر تبدیلی کر سکتے تھے تو ہم ان کی تقلید میں نئے آہنگ کو ، اگر وہ بارِ سماعت نہ ہو تو ، رواج کیوں نہیں دے سکتے؟

بہت غور کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاید اس موضوع سے گریز کے تین بنیادی اسباب ہیں ۔ ایک تو یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر شعرا علمِ عروض سے واقف نہیں ہیں ، صرف آہنگ سے فطری لگاؤ کی بنا پر چند مقبول تجربوں کے مقبول اوزان میں شعر کہتے ہیں ۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جو علمِ عروض سے واقف ہیں ان میں سے اکثر اس موضوع کی طرف توجہ نہیں کرتے ، جو اصول رائج ہیں ان کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں ۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ شاید ان کو اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لیے ایسا آہنگ نہیں ملا جو مروجہ عروض کے موجودہ اصولوں کے حصار سے باہر ہو ۔ اس ساری مشقت کا مقصد یہ ہے کہ ہم نئے آہنگ کے لیے نئے اصول بنانے اور مخلط بحروں کے اضافے کے امکانات کا سنجیدگی سے جائزہ لیں ۔ مروجہ اصولوں کی بنا پر ، جو خود بار بار اضافے سے پھیلائے گئے ہیں ، نئے آہنگ کو رد کرنا صحت مند رویہ نہیں ہے ۔ آج نہیں تو کل شاعری میں نیا آہنگ اپنی جگہ ضرور بنائے گا ۔ جدید طرزِ زندگی کے تقاضے اپنی رفتار کی تیزی کے ساتھ ساتھ نئے آہنگ کو جنم دے رہے ہیں ۔ ہم اگر اس سے نظریں چرائیں گے اور اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں گے تو بھی نیا آہنگ ہماری آنے والی نسل کی زندگی کا حصہ بنے گا اور اس وقت ہم بہت پیچھے رہ گئے ہوں گے ۔ پھر تو میر کا شعر پڑھ کر سر پیٹتے رہنا پڑے گا ۔

کیا کہوں ، کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہو گیا
قافلہ جاتا رہا ، میں صبح ہوتے سو گیا

○●○

مصطفیٰ شہاب

آخری خواہش

○

وہ کل مجھ سے
ذرا سی دیر کو مل کر گیا ہے
وہ جب آیا تھا
اس نے زور سے دروازہ پیٹا تھا
مری بیوی نے غصے سے کہا
"دیکھو تو باہر کون آیا ہے"
بہت ہی سخت سردی تھی
ہوا بھی تیر جیسی تھی
وہ باہر یوں کھڑا تھا
جیسے کوئی بھیڑ میں کھویا ہوا بچہ
وہی اس کا پرانا کوٹ
وہ بے استری پتلون
کالے گھس پٹے جوتے
مگر ان پر بھی اس کے بانکپن کی
چھوٹ پڑتی تھی

مجھے دیکھا تو اس کا سارا چہرہ
تمتما اٹھا
قریب آیا مگر کچھ کہہ نہ پایا
اس نے میرا ہاتھ تھاما
اس کے ٹھنڈے ہاتھ سے میں کپکپا اٹھا
وہ کچھ کہنے ہی والا تھا
کہ پھر بیوی نے سختی سے پکارا
"کون آیا ہے"
میں اس کا نام بتلانے
ذرا سی دیر کو پلٹا
تو جب تک جاچکا تھا وہ

ابھی میں نے سنا کل شام اس نے خودکشی کرلی

وہ شاید جانتا ہوگا
میرے ہاتھوں کی گرمی
اس کے ٹھنڈے ہاتھ کی
مٹتی لکیروں کو جو پڑھ لیتی
تو میں اس کو یقیناً روک سکتا تھا
وہ شاید اور
کچھ دن اور
جینا چاہتا تھا

○●○

مصطفیٰ شہاب

ہاتھوں والا

o

میں نے کل اک شخص کو دیکھا
جس کے دونوں ہاتھ کٹے تھے
لیکن اس کو یوں لگتا تھا
جیسے اس کے ہاتھ ابھی تک
اس کی روح میں زندہ ہیں
وہ کہتا تھا
ہاتھ ملانے، رخصت کرنے
پانی پینے، سر کھجلانے
بچوں کو باہوں میں لینے
لوگوں کو رستہ دکھلانے
شام ہوئی تو لیمپ جلانے
غصے میں مکا دکھلانے کو
اس کے بچھڑے ہاتھ اچانک
جسم میں پھر سے اگ آتے ہیں

ooo

وارث کرمانی

معتوب نہ فرما

o

ان کو معتوب نہ فرما یہ خطاوار نہیں
دیکھنے میں تو یہ سرکش بھی ہیں باغی بھی مگر
جذبۂ عشق میں سرشار رہے ہیں یہ لوگ
شب کے کہسار میں تیشے کی چمک بن بن کر
عمر بھر برسرِ پیکار رہے ہیں یہ لوگ
لیکن اب کوئی تقاضا تری خدمت میں نہیں
وہ تقاضا جو یہ وارستہ مزاجوں کا گروہ
آج کرنے کے لیے تجھ پہ امڈ آیا ہے
جس نے ہونٹوں سے فقط تیری عبادت کی ہے
جسم سے عالمِ ارواح کی منڈی کے لیے
عمل و اجر کی دن رات تجارت کی ہے
مسلکِ حق کا وہ نادیدہ و مشکوک سفر
وہ اندھیرا وہ سمندر کا غضب ناک خروش
نفع خواروں کو ترے جن کی خبر بھی نہ ہوئی
اس سمندر میں سر افراز رہے ہیں یہ لوگ
جب انھیں روشنیِ فکر و نظر نے مارا
میرے ہاتھوں پہ بھی کرنوں کی خراشیں آئیں
میرا نغمہ بھی اسی بھیڑ میں مجروح ہوا
میں تو خود اپنے لیے کچھ نہیں کہتا لیکن
ان کو معتوب نہ فرما یہ خطاوار نہیں

ooo

وارث کرمانی

○

دل کے زخموں کو چراغِ زندگی کرتے رہے
آندھیاں چلتی رہیں ہم روشنی کرتے رہے

ریت پر یوں ہی کبھی ہم نے لکھا تھا اپنا نام
مدتوں جھونکے ہوا کے سرکشی کرتے رہے

عکس تھا یا عکس کا بھی عکس تھا یا کچھ نہ تھا
لوگ کیا کیا خوش گمانی ۔ بدظنی کرتے رہے

وادیِ غربت سے گھر کا فاصلہ ایسا نہ تھا
ہم مگر اک اک قدم پر خود کشی کرتے رہے

اور کیا ہوگا ہماری بے گناہی کا ثبوت
ہم تو منظورِ خدا جو تھا وہی کرتے رہے

کوئی تو ہوگا سبب اے حاضرینِ بزمِ ناز
ہم جو اس کے عشق میں بھی خود سری کرتے رہے

ہم کہ اتنے زخم کھا کر دادگر سمجھے تمھیں
تم کہ اعلانِ سزا بے جرم ہی کرتے رہے

○●○

○

بہت دنوں میں ہم ان سے جو ہم کلام ہوئے
دل و نظر ہمہ تن سجدہ و سلام ہوئے

ہنوز جیسے مسیحا کی آمد آمد ہے
اگرچہ عمر ہوئی زندگی تمام ہوئے

شفق سی خیمہ ۔ جاناں کی سمت باقی ہے
تمام وادی و کہسار غرقِ شام ہوئے

کسی طرف جنھیں راہِ گناہ مل نہ سکی
کچھ ایسے لوگ بھی دنیا میں نیک نام ہوئے

کئی گلے تھے جو شورِ جہاں میں ڈوب گئے
کئی ستم تھے جو احسان بن کے عام ہوئے

افق کے پار کہیں سے لہو اچھلتا ہے
زمیں سے دور بھی کیا کیا نہ قتلِ عام ہوئے

چلے تھے اس کی شکایت کو حضرتِ وارث
کچھ اور، موردِ تضحیکِ خاص و عام ہوئے

○●○

وارث کرمانی

○

(نذرِ غالب)

لبوں پہ اس کے تبسم اگر ہے کیا کہیے
وہی عتاب بہ رنگِ دگر ہے کیا کہیے

جو کچھ کہیں تو اشارے سے بات کٹتی ہے
وہاں زباں سے نگہ تیز تر ہے کیا کہیے

وہ اک سوال کہ جس کا کوئی جواب نہیں
وہی اک عمر سے پیشِ نظر ہے کیا کہیے

ستم پہ اس کے گلہ بھی یہ سوچ کر نہ کیا
ہمیں پہ اس کی نظر خاص کر ہے کیا کہیے

ہم اس زمیں کی شکایت کریں تو کس سے کریں
تمام عرش ہی زیر و زبر ہے کیا کہیے

بجا کہ اس کی نگاہوں نے قتلِ عام کیا
خود اپنے ظلم سے وہ بےخبر ہے کیا کہیے

مجھے تو ڈر ہے ستم بھی نہ چھوڑ دے ظالم
یہی بس ایک متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

ستم کے ماروں کی روداد کون سنتا ہے
جو داد رس ہے وہی فتنہ گر ہے کیا کہیے

مری غزل کے مخالف بھی ٹھیک ہیں وارث
ہر ایک شخص کی اپنی نظر ہے کیا کہیے

○●○

مصطفیٰ شہاب

○

اسے دیکھا تو ہر بے چہرگی کاسہ اٹھا لائی
تمنا اپنے خالی ہاتھ میں دنیا اٹھا لائی

مجھے تو اپنی ساری کھیتیاں سیراب کرنی تھیں
مگر وہ موج اپنے ساتھ اک صحرا اٹھا لائی

رفاقت کو کبھی تنہائی بھولی بسری یادوں سے
کوئی سایہ اٹھا لائی کوئی چہرہ اٹھا لائی

چرانے کے لیے خوش بو مجھے نرمی سے چھونا تھا
ہوائے شام تو پھولوں کی کوملتا اٹھا لائی

وہاں تو آبِ شیریں کی کئی لب ریز جھیلیں تھیں
تو پھر کیوں تشنگی میری مجھے پیاسا اٹھا لائی

کبھی ان وادیوں میں دور تک رستے فروزاں تھے
شہاب اک سر پھری موجِ ہوا کہرا اٹھا لائی

○●○

قاضی سلیم

رباعیات

o

جب آرزو حسرت میں بدل جاتی ہے
ہر خواب پہ بس جان نکل جاتی ہے
دیپک میں اگر تیل نہ ہوتو بتی
پل بھر بھی سلگتی ہے تو جل جاتی ہے

o

دنیا سے پرے دوسری دنیا کیا ہے
برحق ہے اگر موت تو جینا کیا ہے
ہم چھوڑ بھی دیں عالمِ اسفل کو مگر
اس زیست سے اس زیست کا سودا کیا ہے

o

مہرہ کوئی بڑھتا کوئی پٹتا دیکھیں
جو چال چلے موت ، مسیحا دیکھیں
اچھا ہے اب دور کھڑے ہوکر ہم
خود اپنے تڑپنے کا تماشا دیکھیں

o

ذروں نے سورج سے نظر پائی ہے
پروانوں میں شمع کی بینائی ہے
اے نورِ سماوات و زمیں روشن کر
وہ آنکھ جو دیدار کی شیدائی ہے

o●o

o

گن گن کے ہر سانس گزرنا ہوگا
میزانوں پہ پورا اترنا ہوگا
وہ قرض جو قسطوں میں ادا ہونا تھا
لگتا ہے کہ یک مشت ہی بھرنا ہوگا

نوٹ : قاضی سلیم ان دنوں علیل ہیں۔ علالت کے دوران انھوں نے یہ رباعیاں لکھیں۔

ooo

شاہدہ احمد (لندن)

تفاوت

ملینیم کی دہلیز کے اس طرف رہنے والی اماں پیاری، بہت مشکل حالات میں آپ سے رجوع کر رہی ہوں۔ ورنہ تو ہم پردیس آباد کر بیٹھنے والے ہجرتی پرندے ہمیشہ اپنے تمام مسئلے مسائل ساری پریشانیاں شکر الحمدللہ، سب اچھا سب ٹھیک ہے کی صلیب اٹھائے عمر گلا دیتے ہیں۔ آپ لوگوں کو پتا ہی نہیں چل پاتا خوشی اور آسودگی کی تلاش کے نام پر شروع کیے جانے والے سفر کی منزا احساسِ زیاں کے کسی پڑاؤ پر ہوتی ہے۔

ہماری نسل کے لوگوں کی جان ہمیشہ ماضی کا مہاجن اپنے پاس گروی رکھتا ہے جس کی حفاظت پر ہمارا حال مامور رہتا ہے۔ اپنے آپ بھلا کر سوچتے ہیں وقت زندگی کے کاغذ پر کھونے اور پانے کا جو گوشوارہ درج کر رہا ہے اس کی پڑتال سے اپنے پیاروں کو کیوں آزرا کیا جائے۔ عذاب بن جانے والے خوابوں کی کانٹوں بھری فصل تو ہر حال میں اپنے طور ہی پر اتارنی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اپنی موت کا ذائقہ اپنے سوا دوسرا نہیں چکھ سکتا۔ کسی کو کیا خبر قرض کی بنیاد پر ملکیت کا دعویٰ رکھنے والے گھروں میں قسطوں پر خریدی آسائشوں کے منظر نامے یا ریجنٹ موسک کے سبزے پہ کھینچی گئی وہ ہنستی مسکراتی رنگین تصویریں جو ہر عید تہوار پر وطن بھیجی جاتی ہیں کتنی جھوٹی کس قدر مصنوعی ہوتی ہیں۔

زندگی یہاں بہت مختلف بہت اور طرح ہے۔ محسوسات سے عمل تک سبھی کچھ الگ سا ہے۔ یہ تصویریں دیکھ کر رشک کرنے والوں کو کیا خبر کس سجے سجائے گھر کا چولھا کب خودداری اور محنت کے عوض جلتا ہے۔ کب عزتِ نفس پہ بے کاری الاونس کا بوجھ لیے۔ مجبوری ہم سے تِل تِل قدم قدم وہ قرض بھی ادا کرواتی ہے جو ہم پر واجب ہیں۔ ان تصویروں کے پس منظر میں دکھائی دینے والے مخملی پردے، قالین، سنٹرل ہیٹنگ کے ریڈی ایٹر اور معیار کی ضمانت سمجھی جانے والی وہ ساری چیزیں جنھیں ہماری خوش حالی کا ثبوت سمجھا جاتا ہے شوق سے زیادہ مجبوری کے سودے ہیں۔ ان کے بغیر لکڑی کے ٹھنڈے، تنگ مکانوں میں ٹھٹھر کر مر جائیں۔ تصویروں کے شوخ رنگ یہ نہیں بتاتے۔ جیب کتنی ہی محروم کیوں نہ ہو قسطوں کی ادائیگی کا بوجھ اٹھانا مقدر کے لکھے جیسا اٹل ہوتا ہے۔ نئی چیزوں کی سکت نہ ہو تو برتی ہوئی استعمالی اشیاء کی خرید سے ضرورت پوری کرنا عام ہے۔ دھندلی گیلی ٹھنڈی رتوں میں کتنا جی چاہتا ہے ساری کی ساری نام نہاد لگشری کے بدلے گھر کو مٹھی بھر دھوپ کی روشنی اور کنکنے پن سے بھر دیا جائے۔ مگر مٹھی میں دھوپ کی یہ خواہش پانی پر پڑنے والا وہ عکس ہوتا ہے جو چھوتے ہی بکھر کر ہاتھ سے پھسل جاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ یہاں دھوپ کبھی کھلتی ہی نہیں گیندے، گلاب، ٹیولپس اور ہنی سکل پھولنے کے خوش گوار موسم میں خوب نکھر کر کھلتی ہے۔ لیکن تب ایسا کوئی نہیں ملتا جس کے برا بھی پلنگڑی پر نیلے آسمان تلے کھلے صحن میں سنگترے کے چھلکے فرش پہ ڈھیر کرتے ہوئے نمک لگتی کھٹ مٹھی پھانکیں چوسی جائیں کھانے کی میز یا باورچی خانے کے سلیب پر سیب، انگور، ناشپاتی اور جانے کون کون سی قسموں کے پھلوں سے بھری ٹوکریوں کی موجودگی میں اس ناشکری کا جواز اتنا نازک اس قدر حساس ہے جسے محسوس بھی کرانا چاہوں تو نہیں کرا پاؤں گی۔ بہت کچھ ہوتے ہوئے کچھ، ہونے کی کہانی خود کہانی کا کردار بنے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لیے ہم ڈار سے بچھڑی کونجوں کی زبان پر، دیس میں رہنے والے

پیاروں کے سامنے ہمیشہ ایک ہی کلمہ رہتا ہے۔ شکر الحمدللہ، سب اچھا سب ٹھیک ہے۔

لیکن اب معاملہ کچھ اور ہے اماں پیاری۔ ایک مدت سے پردیس کے ٹھنڈے، المناک، مغموم اور اندھے موسموں میں رہنے والی آپ کی اس بیٹی کو دواؤں کے بجائے دعاؤں کی ضرورت آ پڑی ہے اور ملاوٹ کے اس دور میں یہ خالص و سچی دل سے نکلنے والی ان مول جنس ماؤں کے علاوہ کہیں دست یاب نہیں۔ عمر کے اس حصے میں ایسی عجیب و غریب سمجھ میں نہ آنے والی بیماری کی دیمک لگ گئی ہے جس کا کوئی توڑ نہیں مل پارہا۔ ڈاکٹروں کی حکمت عملی جواب دے چکی ہے۔ طبی تحقیق کی پیش رفت ٹھٹکی کھڑی ہے۔ اسکیننگ مشینوں کے آگے لٹانے، ایکسریز سے گزارنے، اور تحلیلِ نفسی کے ماہرین کی تمام تر مغز ماری کے باوجود مرض سمجھ سے باہر ہے۔ پوچھ تاچھ اور فکر مندی سے زچ ہوکر ماہرینِ امراض کی ٹیموں نے مرض کو ناقابلِ علاج ٹھہراتے ہوئے کیس کے آگے نامعلوم موروثی عارضہ لکھ کر فائل بند کردی ہے۔ مگر دل کہتا ہے ناامیدی کی آکاس بیل خوش امیدی کی سبز شاخ کو نہیں کھاسکتی۔ اس لیے آپ سے رجوع کیا ہے، کوئی ٹوٹکا، کوئی گھریلو نسخہ اور دعائیں۔

میرے اندر گھر بناکر بیٹھ رہنے والی یہ بیماری جاگتے خوابوں کا ایسا ناقابلِ فہم، ناقابلِ یقین سلسلہ ہے جس نے نیند اور بیداری کو آپس میں یوں گڈ مڈ کردیا ہے کہ نہ خواب کا پتہ چلتا ہے نہ بیداری کا۔ کھلی آنکھیں سوتی ہیں۔ جاگتی آنکھیں بیداری مانگتی ہیں۔ وقت موجود کو چپکی لگی ہے۔ بھولے بسرے فراموش لمحے باتیں کرتے ہیں۔ وہ باتیں وہ لفظ جو کبھی مجھ پر پگھلی موم کے کھولتے قطروں کی طرح گرا کرتے تھے پتہ نہیں تھا ٹھنڈا پڑنے پر اندر جم کر بیٹھ رہے ہیں۔ آئینے میں جو چہرا نظر آتا ہے، ہے تو میرا ہی لیکن میں ہی اسے پہچان نہیں پاتی۔

رہ رہ کر دیکھتی ہوں اکیڈمی کی کلاس سے فارغ ہونے پر گھر پلٹی ہوں۔ گرمی کی شدت، پسینے کی چپچپاہٹ اور لو کی تپش کے علاوہ جگہ جگہ رفو مانگتی اور ادھڑی ہوئی سڑک پہ تانگے کے ہوش ربا جھٹکوں نے خستہ حال کر رکھا ہے۔ چیل کے انڈے چھوڑ بھاگنے کا موسم ہے۔ پنکھے کی پرسکون ہوا میں بیٹھنے کے بجائے آپ مجھ سے زیادہ ابتر حالت میں بیرونی دروازے پر کھڑی ہیں۔ تھکن مجھ پر اتری ہوئی ہے، رنگت آپ کی اڑی ہے۔ جیسے پبلک ٹرانسپورٹ کی خواری میں نے نہیں آپ نے اٹھائی ہو۔

"کہاں رہ گئی تھیں؟"

سادہ سا سوال فلیتہ لگا دیتا ہے۔ میں سراپا خفگی بن جاتی ہوں۔ میری جھلاہٹ میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ آپ کی تمام تر فکر مندی پر مجھے آپ کے تعلقِ خاطر کا نہیں اپنے بے اعتبار ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ آپ لہجے کی تیزی پر قابو پاکر تحمل سے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ مجھے آپ کی تنگ نظری ایک آنکھ نہیں بھاتی، چڑکر سوچتی ہوں۔ "ایک بالغ و عاقل کو وقت سے پہلے پیدا ہونے والے بچے کی طرح باہر کی آلودگی سے بچاکر شیشے کے کیبن اور آکسیجن سلنڈر کے ساتھ رکھنے کی کوشش اندھیر ہے کہ نہیں؟" اپنا نکتہ۔ نظر سمجھانے کی میری دبی دبی جوابی کوشش آپ کے لہجے میں دوبارہ تندی بھر دیتی ہے۔ چھوٹی سی بات بڑا فساد بن جاتی ہے۔ کھانا کھانے سے انکاری ہوکر سڑی گرمی میں سر سے پاؤں تک چادر تان کر پڑ رہتی ہوں۔ اولاد کی بھوک ہڑتال کے سامنے ماں کتنی دیر ٹھہر سکتی ہے۔ میرا حربہ کامیاب رہتا ہے۔ آپ کے کمزور پڑتے ہی وعدہ لینے بیٹھ جاتی ہوں۔ آئندہ اس طرح دروازے پہ حواس باختہ نہیں ملیں گی۔"

راضی نامہ ہوجاتا ہے۔ مگر چند روز نہیں گزرتے کہ ایکشن ری پلے کی شکل میں پھر سے وہی صورت حال دہرائی جارہی ہوتی ہے۔ آپ کی فکر مندی اور تردد عاجز کیے جاتی ہے۔ ہزار قائل کرتی ہوں میں بچی نہیں رہی مگر آپ سمجھنے کو تیار نہیں۔ نہ چاہنے کے

باوجود جزیشن گیپ نے ہم دونوں کے درمیان چپکے چپکے فاصلہ پیدا کرنے کی سیندھ لگائی ہے۔ جھلائی ہوئی سوچ رہ رہ کر سر پٹختی ہے۔

"پتہ نہیں ماؤں کو یہ غلط فہمی کیوں ہوتی ہے ان سے زیادہ ان کی اولاد کو کوئی نہیں جانتا جب کہ ان ہی کو ان کے بارے میں سب سے کم پتہ ہوتا ہے۔"

قدم قدم پہ آپ کی روک ٹوک مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

"دوپٹہ قرینے سے اوڑھو۔"

"لباس قاعدے کا پہنو۔"

"چال میں ٹھہراؤ اور نشست و برخواست میں وقار ضروری ہے۔"

"مغرب کے بعد گھر سے باہر رہنا نازیبا۔"

آپ چاہتی ہیں میں آپ کے تجربوں کی پناہ اوڑھ کر دنیا کو گھونٹ گھونٹ پیتے زندگی کا سفر طے کروں۔ مگر میں ٹھوکر کھا کر گرنے یا سنبھلنے کا تجربہ آپ کے نہیں اپنے قدموں سے کرتے ہوئے اسے ایک ہی سانس میں پینا چاہتی ہوں۔ یہ خواہش مجھے سرکشی کے راستے پہ لے آئی ہے۔ آپ کی لاعلمی میں آپ سے چوری چوری کسی چھوٹے سے کام کی کمینی خوشی بڑی سنسنی خیز لگتی ہے۔ آپ گھل مل کر مجھ سے قریب رہنے کی کوشش میں رہتی ہیں۔ مگر یہ چھوٹی چھوٹی چوریاں مجھے پکا تو نہیں ہاں نیم شاطر ضرور بنا چکی ہیں۔ اس لیے پہلے کی طرح کھل کر بات کرنے میں احتیاط برتنے لگی ہوں۔ جانتی ہوں زبان کھلتے ہی پلک جھپکنے میں کئی بھید میری تحویل سے نکل کر آپ تک پہنچ جائیں گے اور آپ کی قنوطیت فوراً میری خوش رفتاری پر کانٹے ڈالنے کے جتن میں لگ جائے گی۔ آپ کو صرف میرا وجود دکھائی دیتا ہے، دو ٹانگیں، دو ہاتھ، دو آنکھیں آپ اسے ہی کل سمجھتی ہیں مگر یہ کل کہاں ہے۔ کل تو دل ہے جس کی اپنی خواہشیں ہیں۔ کل تو دماغ ہے جس کی اپنی سوچ ہے۔ اسے دنیا قبول کرتی ہے، نہیں کرتی تو بس آپ جیسی قدامت پسند مائیں۔ جو بیٹوں کو سیپ میں بند موتی کی طرح رکھتی ہیں اور ساری عمر سیپ ہی میں بند رکھنے کی خواہش مند رہتی ہیں۔ نہ جانتی ہیں نہ جاننا چاہتی ہیں کہ ہزار حفاظت کے باوجود جن موتیوں کے مقدر میں لکھا ہو انھیں سیپ کے اندر بھی گھن لگ جاتا ہے، وہ اندر ہی اندر برادہ بن جاتے ہیں۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود میرے بدصورت رویوں کے جواب میں جب آپ بھی ہونٹ سی کر چپ ہوجاتی ہیں تو آپ کی شکایت بھری نظروں کی خاموشی مجھ پر ملامت کے دروازے کھول دیتی ہے۔ میں اندر ہی اندر پریشان ہو اٹھتی ہوں۔ آپ شور کرتی رہا کریں۔ اونچی اونچی آواز میں ڈانٹ پھٹکار کرتی رہا کریں۔ اس برا بھلا کہنے سے آپ کا غبار بھی نکل جاتا ہے اور میں بھی پشیمانی کی آنچ سے بچی رہتی ہوں۔ پلیز مجھے غافل رہنے دیں۔ جاگنے کی اذیت سے بچائے رکھیں۔ سوئے رہنے کی بے خبری میں عافیت ہے، فرار ہے۔ جاگتی ہوں تو پتا نہیں کیسے آپ کی جگہ خود کو اپنے گھر کے دروازے پہ پریشان کھڑا پاتی ہوں۔

اماں پیاری اب میرے پاس شکر الحمدللہ، سب اچھا سب ٹھیک ہے کا سرمایہ نہیں رہا۔ عجیب سی بے کلی دسمبر کے سرد اور سفاک ہڈیوں تک اتر جانے والے کہرے کی طرح اندر گھس آئی ہے۔ میں تو ترقی پسندی اور روشن خیالی کے گمان میں رہنے والوں میں شامل تھی۔ مجھ میں آپ اور آپ میں میں کس طرح سما گئے؟ آپ کی قدامت مجھ میں کیسے حلول کر گئی؟

یہ کیسا آسیب ہے جس کی پکڑ نے زندگی کی ساری ترتیب الٹ پلٹ کردی ہے۔ اس پر کیوں ہر طرف سے بند گلی کا گمان ہونے لگا ہے۔ میری روشن خیالی کی کتاب میں تو اپنی بیٹی کے حوالے سے جزیشن گیپ جیسے اندھے لفظ کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ بیٹھے بٹھائے پورے کا پورا باب کہاں سے آگیا؟ . . . کب، کیسے اور کہاں یہ سانحہ گزرا کہ آج ان جانے میں عورت اور

معاشرے کے حوالے سے اسے مصلحت کوشی کا وہی سبق دہراتے دیکھنا چاہتی ہوں جو کبھی میرے تعلق سے آپ کی خواہش تھی۔ مصلحت اور مکاری میں فرق ہوتا ہے۔"

ایک بھڑکی ہوئی آواز اور ناراض چہرے پر آپ کی بیٹی کے عکس کا گمان گزرتا ہے۔ میرا وجود بیچ سے مٹ جاتا ہے صرف آپ ہوتی ہیں یا میری بیٹی۔ ونڈر لینڈ کی ایلس اپنی تلاش اپنی وحشت کی دھند میں کہیں گم جاتی ہے۔

خدا گواہ ہے اماں پیاری میں چپ رہتی ہوں اور آپ کی آواز قیامت کے روز پھونکے جانے والا صور بن کر روئی کے گالوں کی طرح مجھ میں اڑنے لگتی ہے۔ آپ میری خاموشی زیر و زبر کر کے مجھ میں سے پھوٹ نکلتی ہیں۔

"قوت برداشت اور مصلحتوں کی زرہ بکتر پہنے بغیر عورت زندگی میں جگہ لینے والی تبدیلیوں کی جنگ نہیں لڑسکتی۔ اسے ساری عمر بہن یا بیٹی نہیں رہنا ہوتا۔ بدلتے رشتوں کے تقاضے پورے کرنا آسان نہیں۔ ماں بن کر گود کے بچے کو بہلانا پڑتا ہے تو بیوی بن کے بچے کے باپ کو پرچائے رکھنا اس سے زیادہ ضروری۔ شادی بنائے رکھنے کی نزاکتوں میں نہ میکے والوں کا دل دکھاسکتی ہے نہ سسرا کو نظر انداز کرسکتی ہے۔ یہ سب نبھانے، اتنے سارے محاذوں پر ایک ساتھ لڑنے کے لیے برتی جانے والی مصلحتوں کو مکاری یا فریب دہی کیسے کہا جاسکتا ہے؟"

مگر اماں پیاری تیر کمان اور وقت میری مٹھی سے ریت کی طرح نکل چکا ہے۔ وہ کسی طور ہماری یہ ایشیائی سوچ قبول کرنے تیار نہیں کہ نکاح کے کاغذ پر دستخط ہوتے ہی زندگی کا عنوان یکسر بدل جاتا ہے، کہتی ہے!

"یہ کیسے ممکن ہے گھر بدلنے سے دلی تعلقات اور دماغی سوچ بدل جائے۔ نئے رشتے قائم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے موج حقیقی رشتوں کی اہمیت کم ہوجائے۔"

وہ پرانے گھر سے نئے گھر کے سفر کو فٹ بال کا کھیل سمجھتی ہے، جس میں ہاف ٹائم پر ٹیم کے ڈی بدلنے سے کھیل کے کہ بنیادی اصول میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ میری زبان میں مصلحت آمیزی کہی جانے والی دور اندیشی اس کی نظر میں برملا ہوکرلا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نظریاتی اختلافات ہم دونوں کے بیچ مضبوطی پکڑ رہے ہیں۔ میں پب کو صرف شراب خانہ سمجھتی ہوں۔ اس کے نزدیک سماجی میل ملاپ کی جگہ جہاں شراب نوشوں کے علاوہ دوستوں کی صحبت یا سادہ مشروبات سے دلچسپی رکھنے والے بھی اٹھانے جاتے ہیں۔

میری نگاہ میں کسی ایشیائی لڑکی کو ایسی جگہ داخل ہوتے، وہاں سے باہر نکلتے یا وہاں بیٹھے پایا جانا معیوب ہے۔ خواہ اس موجودگی کا مقصد کتنا ہی بے ضرر کیوں نہ ہو۔ مقصد کی گہرائی میں جھانکنے کی ضرورت کون سمجھتا ہے جگہیں خود اپنا تاثر ہوتی ہیں۔ اس کے خیال میں ایسی نزاکتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ مجھے تنگ نظری کی عینک اتار کر چیزوں کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے کا دیتے دیتے جھجک جاتی ہے۔ کب تک اماں پیاری کب تک؟ ۔ ۔ ۔ ڈرتی ہوں کہیں کسی روز یہ جھجک ٹوٹ نہ جائے۔ بڑی قیامت سامنا ہے۔ آئینہ جتنا صاف ہو عیب یا وصف اتنا ہی صاف دکھائی دیتے ہیں۔ میری بیٹی بھی ایسا صاف آئینہ ہے جس کے شفاف سے ڈر لگتا ہے۔ تریاق اماں پیاری تریاق، کوئی ٹوٹکا کوئی گھریلو نسخہ کہ ایسی آئینہ صفت لڑکیاں جن کے مزاج میں وقت ضرورت پر دنیا داری کا ملمع چڑھانے کی گنجائش نہیں مصلحت کی ہلکی سی گرد کے ساتھ سمجھوتے کا ڈھنگ سیکھ لیں۔ ان کی سختی کو تھوڑی سی لگ جائے یہ ذرا سا لچک کر اپنی بے لچک سوچ میں نرماہٹ کو جگہ دے دیں۔ اپنے مستقبل یا زندگی کے حوالے سے یہاں پرورش پا والی لڑکیوں کی ذہنی بلوغت اور سوچ اپنی نسل کے لڑکوں کے مقابلے میں اتنی پختہ راسخ ہے کہ دولہا بننے والے لڑکوں کی مائیں ان۔

خوف زدہ ہیں۔ اس خوف کے نتیجے میں اکثر گھرانے اپنے شہزادوں کی دلہنیں پردیس بن چکنے والے بھولے بسرے دیسوں سے لانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ الگ کہانی ہے کہ اپنے ملکوں سے برآمد کی جانے والی ان دلہنوں کو پہلے یہاں کیا حیثیت ملتی ہے اور کچھ عرصہ بعد یہ مقامی سسرال یا شوہر سے کیسے نپٹتی ہیں۔ جن غریبوں کو لایا ہی خدمت گزاری اور اپنے شکنجے میں جکڑ کر رکھنے کے نظریے سے گیا ہو ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا تصور ہی کسے کے پاس ہوتا ہے۔ پھر اگر یہاں ان کے وجود سے گھروں کے مقابلے میں حکومتی پناہ گاہیں زیادہ آباد ہوتی ہیں یا شہ سرخی میں خبریں لگتی ہیں تو کیا تعجب۔ دبنے پر تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔ زندہ رہنے کے تقاضے انسان کو بہت کچھ سمجھا اور سکھا دیتے ہیں، چاہے وہ سیکھنا اور سمجھنا چاہے یا نہیں۔

مسئلہ یہ ہے اماں پیاری۔ لندن میں پیدا ہونے والی میری ہم درد شائستہ اور نرم مزاج، اچھائی برائی میں تمیز اور انسانیت پر ایمان رکھنے والی بیٹی نہ تو شراب نوش ہے نہ سگریٹ کی شوقین، بوائے فرینڈ کی علت سے بھی اب تک دور ہے۔ لباس مشرقی ہو یا مغربی ماں کی تربیت کے زیر اثر ہمیشہ پُروقار، بد زبان یا بدتہذیب بھی نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے پھر مزید کیا چاہتی ہوں؟

اس کے یونیورسٹی یا کام سے واپسی میں دیر پر رات برات اجنبی انجان ٹیکسی ڈرائیوروں کے بجائے ہم جماعت لڑکوں پر بھروسہ کرنے کی عادت، اپنے لوگوں کے سامنے ساتھ پڑھنے یا کام کرنے والے لڑکوں کا ذکر بھی بلا جھجک لڑکیوں کے ذکر جیسی بے تکلفی سے کرنے، پب میں بیٹھ کر جوس یا کوک پینے کے شغل میں کوئی ہرج نہ سمجھنے، یا ارینج میرج کے نام پر زندگی کا ساتھی خوش نما کاغذ میں لپٹے تحفے کی طرح عین شبِ عروس کو وصول کرنے کے بجائے چناؤ سے پہلے تھوڑی بہت جانچ پرکھ کے شرعی حق پر یقین رکھنے کے خیال سے میرا فشار خون کیوں بڑھ جاتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اونچ نیچ سمجھانے کی ہر کوشش کے جواب میں فلسفہ بگھارنے بیٹھ جاتی ہے۔

"سچ بولنے کا سبق اس معاشرے نے بعد میں، آپ نے پہلے سکھایا ہے پھر کیوں اب اس حسن کو منافقت کی گندگی سے میلا دیکھنے کی خواہش مند ہیں۔ کہتی ہے "ہماری دیانت داری کا محتسب صرف ہمارا ضمیر ہے کوئی اور نہیں۔"

اعتبار اور اندیشوں یا کھرے اور کھوٹے کے آپس میں گڈمڈ ہوئے ریشم کا سرا ہاتھ نہیں لگ رہا۔ اس عمر میں آکر پتہ چلا ہے جو لفظ کتابوں میں لکھے جاتے ہیں، لوگ پڑھتے ہیں، سنتے ہیں ان کے سوا بھی کچھ الفاظ ہیں جو نہ لکھے جاتے ہیں نہ پڑھے اور نہ ہی بولے مگر سب کچھ انہی لفظوں میں ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کا کہا سنا اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا اس لیے ہمارے درمیان درد اور شکایتوں سے لبریز ان خاموش الفاظ کے لیے جگہ بننی شروع ہو چکی ہے۔ جانتی ہوں زندگی نہ کوئی کہانی ہے نہ فلم جس کا انجام مرضی کے مطابق کیا جاسکے۔ اسے تو اپنے تمام تر حسن اور بدصورتی کے ساتھ یوں ہی بسر ہونا ہے۔ لیکن پھر بھی تیزی سے جڑ پکڑنے والے مرض کی طرح متضاد سمتوں کو بڑھتی سوچ کی ٹیڑھ بروقت درست کر کے نقصان کے امکانات کم کرنا چاہتی ہوں۔ وہ اپنی شخصیت سے پوری طرح خوش اور مطمئن ہے۔ اعتراف مجھے بھی اس کی تمام خوبیوں سارے اوصاف کا ہے۔ مگر اس برہنہ حقیقت سے کیسے آنکھ چراؤں کہ دیانت داری اور صاف گوئی کا یہ وصف آج کے معاشرے میں سب سے بڑی خامی ہے۔ سچ یہ ہے اماں پیاری بیٹی پر تو اعتبار ہے دودھ میں کتنا ہی پانی مل جائے دودھ ہی رہتا ہے، میری بیٹی ہے مجھ سے کتنی مختلف ہو سکتی ہے، اعتبار نہیں ہے تو وقت اور حالات پر۔ عجیب بے بسی ہے صبر کرنا چاہتی ہوں تو دل مرنے لگتا ہے۔ صبر نہ کروں تو سنگسار کرتا ہے۔ کوئی ٹوٹکا کوئی گھریلو نسخہ اماں پیاری جس سے اس مرض لاعلاج کا علاج ممکن ہو۔ جب دیکھو تب آپ کا سوانگ بھرے کبھی گھر کے دروازے پر تو کبھی اس کھڑکی کے پٹ سے لگی کھڑی ملتی ہوں جس سے دور تک کی سڑک نظر آتی ہے۔ سڑک جو گھروں تک آتی بھی ہے اور گھروں سے کہیں دور جاتی بھی ہے۔

●○

دیپک کمار بدکی

بکھرے ہوئے لمحوں کا سراب

شلپی اور بھاسکر اسٹیج کی بہ دولت ہی ایک دوسرے کے قریب آچکے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ڈائرکٹر شو چرن رستوگی نے اپنے ۔۔زہ ترین ڈرامہ "جنگ جوؤں کے ساتھ ایک رات" کے لئے شلپی اور بھاسکر کو چنا تھا اور دونوں اپنا اپنا رول نبھانے میں کامیاب ہو ۔۔لے تھے۔

ایک روز ڈرامہ ریہرسل کے دوران تھوڑی سی فرصت پاکر بھاسکر نے ہمت جتائی اور شلپی کو پاس ہی ریستوران میں کافی پینے کی ۔۔خواست کی۔ حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ شلپی، جو کم گو، دروں بین اور تجرد پسند تھی، نے بلا تامل رضامندی ظاہر کی اور لومڑی کی طرح ۔۔ں کے پیچھے پیچھے چل دی

"تم اتنی کھنچی کھنچی سی کیوں رہتی ہو؟ تمہاری اس چپ سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم گھمنڈی ہو۔" گفتگو کا دائرہ نجی ۔۔دگیوں کو چھونے لگا۔

"مجھے بھیڑ سے وحشت ہوتی ہے۔ خلوت ہی میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور پھر یہ بے ہودہ ہنسی مذاق، فضول ۔۔اسس، ایک دوسرے کی چغلیاں، کیا ملتا ہے ان سب سے؟"

"ملتا کیا ہے، دوسروں کو خوش کرنا اور ان کے ساتھ خوشیاں بانٹنا، اس سے بڑھ کر زندگی کا کون سا مقصد ہوسکتا ہے۔"

"یہ کام جوکروں کا ہوتا ہے، تمہارا ہوسکتا ہے۔ میرا نہیں۔" شلپی کا چہرہ سنجیدہ ہوچکا تھا۔

تمھیں میں جوکر دکھائی دے رہا ہوں؟"

"اور کیا۔ تم دراصل اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ دوسروں کی خوشی تمہارا نصب العین نہیں ہے البتہ تم اپنی آسودگی ۔۔ونڈ رہے ہو۔ تم غیر سنجیدگی سے اپنی زندگی اس لیے بسر کر رہے ہو تاکہ تمھیں اس زندگی کے اتھاہ سمندر کے دروں میں اٹھ رہی لہروں کا ۔۔ساس ہی نہ ہو۔ تم فراریت پسند ہو اور کچھ نہیں۔"

یہ سراسر بہتان ہے۔ تہمت ہے مجھ پر۔"

"بھاسکر۔ اپنے ماضی پر ذرا غور کرو۔ کتنی لڑکیوں کو چاہا ہے تم نے۔ آج تک کتنوں سے محبت کی ہے۔ اور پھر ... انجام کیا تھا ایک ایک کرکے سب بچھڑتے رہے، اپنے دلوں پر کاری ضرب لیے اور تم سوچتے رہے کہ تم خوشیاں بانٹتے رہے۔ کیا تم ان کے ملائم ۔۔موں سے لذت کے طلب گار نہیں تھے؟ کیا تم ان کے بدن کو چاٹ چاٹ کر مسرت نہیں ڈھونڈ رہے تھے؟"

شلپی۔ تم غلط سوچ رہی ہو۔ میں نے یہ مان لیا کہ میری زندگی میں بہت ساری لڑکیاں آئیں۔ مگر میں نے کسی سے کوئی زبردستی نہیں ۔۔۔ جھوٹے وعدے نہیں کیے۔ زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملائے۔ ان کو جھوٹی محبت کا واسطہ نہیں دیا۔ جتنی بھی لڑکیاں میری زندگی ۔۔ں آئیں وہ سب آنکھیں کھولے آئیں بند کرکے نہیں۔ انھیں میری زندگی اور میرے اسٹائل کا بہ خوبی علم تھا انھیں آغاز سے پہلے

انجام کی خبر تھی۔

میں نے کسی کو بھی ایکسپلائیٹ نہیں کیا۔ وہ سبھی خوشی کے ان لمحوں کی کوشاں تھیں جو انھیں مجھ ایسے بے نام آدمیوں سے ہی مل سکتے تھے۔"

"اور خود ... تمھیں کیا ملا ... ؟"

"خود مجھے ... ؟ مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہیے تھا۔ میں تو بس اپنی کلا کا پجاری ہوں۔ میری زندگی کا مقصد تو صرف میرا آرٹ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ باقی سب لایعنی ہے۔ زندگی میں ان سب کا حمایتی رول ہے۔ میری زندگی کا بس ایک ہی مدعا ہے کہ ایک دن میں خود ایک ایسا ڈرامہ لکھ کر اسٹیج پر پیش کروں جس کو دیکھ کر لوگ عش عش کریں۔

"اس ڈرامے میں میرا کیا رول ہوگا۔"

"ایکسٹرا کا"۔ بھاسکر نے سوال کو مذاق میں ٹال دیا مگر شلپی کو اپنے سوال کا غیر ارادی طور پر جواب مل گیا۔ پھر بھی اس کو بھاسکر سے ہم دردی ہوئی۔ باوجود یہ کہ بھاسکر ایک لاابالی قسم کا آدمی تھا جو زندگی کو کبھی متانت سے جی نہیں سکا تب بھی وہ اسے پیار کرنے لگی اور اس کے کالے بالوں سے بھرے ہوئے سینے پر اپنے گال سہلانے لگی۔

وقت گذرنے کے ساتھ شلپی کی خواہشیں شدید تر ہونے لگیں۔ ایک روز وہ ریہرسل کے دوران بھاسکر سے مخاطب ہوئی۔

"ریہرسل کے بعد کوئی ڈیٹ تو نہیں ہے بھاسکر"

"ہاں، تین بہنوں کے ساتھ اکٹھے ڈنر کا پروگرام ہے" بھاسکر نے قہقہہ لگا کر اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

"ان تین میں ایک اور لڑکی شامل ہو تو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔" شلپی نے ترکی بہ ترکی سنائی۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ مگر ان کو ضرور ہوگا اور پھر ہندوستان میں اتنی ترقی تو ہوئی نہیں کہ ایک گھر کی لڑکیاں کسی پرائی لڑکی کو اپنے محبوب کے ساتھ برداشت کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر میں جارہی ہوں۔"

"کہاں جاؤگی۔ میں تو بس یوں ہی دل لگی کررہا تھا۔ چلو آج روز ڈیل میں ڈنر ہوجائے۔"

ریہرسل کے بعد دونوں چل دیئے۔ شلپی بھاسکر کے ساتھ سائے کی طرح چپکی رہی۔ پہلے ڈنر پھر سمندر کے ساحل پر نرم نرم ریت پر ننگے پاؤں ٹہلتی رہی اور بعد میں بھاسکر کی مضبوط بانہوں میں رات بھر جھولتی رہی۔ وہ رات بھر بھاسکر کو اپنے جسم کے ہر مسام میں سماتی رہی یوں کہ اس کو معلوم تھا کہ بھاسکر سورج نکلتے ہی بلبلے کی مانند بھاپ بن کر اڑ جائے گا اور وہ دیکھتی رہ جائے گی۔ خوشی کی یہ پر بھاشا بھی ہوسکتی ہے اسے معلوم نہ تھا۔

اسٹیج کی وجہ سے بھاسکر کے لاکھ جتن کے باوجود وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوسکے۔ بھاسکر شلپی کی زندگی میں رنگ بھرتا رہا اور خود کو فراموش کرتا رہا۔

وقت کے جیسے پر لگ گئے۔ شلپی پورے ہفتے غائب رہی۔ بھاسکر سے رہا نہ گیا۔ سیدھے شلپی کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں شلپی کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اسے حالات کا اندازہ خود بہ خود ہوگیا۔

بھاسکر کو دیکھتے ہی شلپی کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی نظریں حیا سے جھک گئیں۔

"کیوں ... ایسے ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہے ہو۔"

"شلپی کو دیکھ رہا ہوں۔"

"شلپی تو سچ مچ ہی تخلیق کرنے لگی ہے۔ بھاسکر! ایک نیا وجود پلنے لگا ہے اس کے اندر۔ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم مجھے کیا کرنا چاہیے۔

"حمل گروا دو"

"بھاسکر۔ تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اتنے بزدل نہ بنو۔ میں تمہارے نظریہ حیات سے باخبر ہوں۔ تاہم مجھے نہ جانے کیوں یقین سا ہو گیا کہ شاید تم میرا دل رکھنے کے لئے کچھ اور ہی کہو گے۔

یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ شلپی! تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں زندگی میں اکیلا رہنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے کسی بھی چیز کے ساتھ زیادہ دیر جڑے رہنے سے کوفت ہوتی ہے۔"

"تجرد پسند تو خیر میں بھی ہوں۔ مگر عورت کی کوکھ جب سنسناتی ہے تو وہ اپنا وجود ہی بھول جاتی ہے۔ ویسے تو بھاسکر میں نے تمہیں بلایا بھی نہیں۔ تم خود ہی چلے آئے۔

مجھے تو تمہارے آنے کی توقع بھی نہ تھی۔ تمہارا جواب سن کر مجھے کوئی اچنبھا نہیں ہوا۔ مگر میں اسقاط حمل کے حق میں نہیں ہوں۔ یہ میرے پہلے پیار کی پہلی نشانی ہے۔ میں اس ننھے وجود کو عمر بھر سینے سے لگا کر جینا چاہتی ہوں۔ چاہے تم میرے پاس ہو یا نہ ہو۔"

"شلپی، پاگل مت بنو۔ مجھے اس میں کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ میں پھر بھی یہی رائے دوں گا کہ تم کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر کے اسقاط کروا لو۔ باقی جو تمہاری مرضی۔"

بھاسکر ایسے چلا گیا کہ پھر کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ خدا جانے اس کو کیوں ڈر سا لگنے لگا تھا۔ شلپی پہلی لڑکی تھی جو اس کو کمزور بنانے کے درپے تھی۔ اس کو خدشہ تھا کہ کہیں شلپی اس بچے کی آڑ میں اسے اپنے جال میں پھنسا نہ لے۔

انسان کو سب سے زیادہ ڈر اس وقت لگتا ہے جب اس کی کمزوریاں بے نقاب ہو جاتی ہیں اور اس کے چہرے پر چڑھا ہوا خول اتر جاتا ہے۔

بھاسکر تو شہر چھوڑنے پر مجبور ہوا۔

شلپی نے جو بچہ جننے کی ٹھان لی تھی۔ وہ اس پر دوبارہ سوچنے لگی۔ جنون میں لیا گیا فیصلہ کبھی بہت مہنگا پڑتا ہے۔ سہیلیوں سے مشورہ لے کر اسے یہ احساس ہوا کہ بھارتیہ سبھیتا اس بات کی کبھی اجازت نہیں دے گی کہ تم اپنے بچے کو ایک نارمل زندگی دے سکو۔ اس کو زندگی کے ہر موڑ پر طعنے سننے پڑیں گے۔ ہر مرحلے پر کٹھنائیاں اٹھانی پڑیں گی اور پھر جب وہ بچہ تم سے سوال کرے گا۔ "ماں تم کو مجھے اس حالت میں وجود میں لانے کا حق کس نے دیا تھا؟" تو تم کیا جواب دو گی؟

اسی افراتفری میں شلپی نے حمل گروا دیا اور پھر اپنے تھیٹر کے کام میں جی جان سے جٹ گئی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس کے کردار میں اندر کا کرب جھلکتا جس کے سبب اس کی ایکٹنگ میں کافی نکھار آ گیا۔

شلپی نے کئی سال نئے نئے اداکاروں کے ساتھ مختلف رول نبھائے۔ گو ان میں وہ بات نہیں تھی جو بھاسکر میں تھی۔ ان کے باہمی تعلقات بالکل تجارتی سے ہوتے۔ وہ پیار کا جواب پیار سے اور نفرت کا جواب نفرت سے دینے لگی۔ وہ اب اپنی انٹری اور ایگزٹ سے باخبر تھی اور کبھی چوکتی نہ تھی۔

اپنی تخلیق کے ضائع ہونے کے غم نے شلپی کو حساس اور جذباتی بنایا تھا ۔ اس کی اداکاری میں ایک نکھار اور میچورٹی آچکی تھی ۔ اس کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی ۔ یہاں تک کہ ممبئی کے ایک فلم پروڈیوسر نے اسے اپنے نئے فلم میں لانچ کرنے کی دعوت بھی دی ۔ شلپی کو اپنی قابلیت اور اپنی اداکاری پر کبھی کوئی شک نہیں تھا البتہ ایسی آفر ملنے کا اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا ۔ شلپی نے حامی بھرنے میں ذرا بھی دیر نہ کی ۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ جس جگہ وہ جارہی تھی وہاں پچھلے تین سال سے بھاسکر اپنی شناخت ڈھونڈرہا تھا ۔ شلپی کے بڑے بڑے پوسٹر، سینما گھروں میں لگے ہوئے اشتہار اور میگزینوں میں چھپی تصویریں اس کے دل میں ایک نیا طوفان کھڑا کرنے کے لئے کافی تھے ۔

بھاسکر اپنے بیتے ہوئے دنوں کا تجزیہ کرنے لگا ۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا اس نے اپنا مدعا پالیا یا نہیں ۔ مڑکر جو دیکھا تو سب کچھ سنسان سا لگ رہا تھا ۔ پچھلے کئی برسوں میں اس کا زیادہ تر وقت روزگار کی تلاش میں صرف ہوا تھا اور ابھی بھی وہ کہیں پر قدم جمانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا ۔ اپنی آئیڈیل تخلیق کا تو سوال ہی نہیں یہاں تو زندگی گزارنا بھی دوبھر ہوگیا تھا اور خاص کر ایسی دنیا میں جہاں نوے فیصدی سے بھی زیادہ لوگ ناکام رہتے ہیں ۔ بس چند ایک کلاکار ہی اپنا لوہا منواسکتے ہیں ۔ اس کے لئے ہنر، سرمایہ اور جان پہچان کی ضرورت ہوتی ہے ۔ باقی ماندہ تو گلیوں کی خاک چھانتے ہوئے دم توڑدیتے ہیں ۔

اپنی پہچان بنانے کے لئے وہ انتظار کرتا رہا ۔ چہرے پر نمودار ہوئی جھریوں نے اسے بے چین کردیا ۔ اس کو اپنی تخلیق کی یاد آئی اور کھلے بازوؤں سے اس کو اپنانے کے لئے دوڑ پڑا ۔

یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے بھاسکر ۔ یہ سفید بال ۔ یہ چتکبری داڑھی ۔ یہ پوشاک اور پھر بیڑی پر بیڑی پینا ۔ ۔ ۔ تم کہیں اپنے آپ کو کنزیوم تو نہیں کررہے ہو ۔ خیریت تو ہے ؟ " بھاسکر کا وجود شلپی کے ڈرائنگ روم میں مخمل پر ٹاٹ کے پیوند سا لگ رہا تھا ۔

" ہاں ۔ خیریت ہی سمجھو ۔ شلپی ! کئی برسوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں پر ہمت ہی نہیں ہوئی ۔ بار بار اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا ۔ اپنی نظروں میں گرتا رہا ۔ اس لئے اپنے آپ کو سنبھال نہیں پایا ۔ مگر اب مجھ سے رہا نہ گیا ۔

نوکرانی سامنے میز پر چائے کی ٹرے رکھ کر چلی گئی ۔

تم نے بہت اچھا کیا جو تم چلے آئے ۔ تمہاری صورت سے ایسے لگ رہا ہے کہ تم اپنے آپ کو فریب دے رہے ہو ۔ زندگی کی سچائی کو اپنانے سے ہی آدمی کو نجات مل سکتی ہے ورنہ تو روح ہمیشہ پھڑپھڑاتی رہے گی ۔ چائے پی لو ٹھنڈی ہوجائے گی ۔ میں ذرا سیکریٹری کو کچھ ہدایتیں دے کر آؤں گی ۔

" بھاسکر نے پھر ایک بیڑی سلگائی اور چائے کے گھونٹ سِپ کرنے لگا ۔

" وہ جس کو کچھ بھی کرنے کی خواہش نہیں تھی ۔ اس نے اپنی ساری مرادیں پالیں اور میں ہوں کہ ایک خواہش بھی پوری نہ کرسکا ۔ کس کو دوش دوں ۔ لگن کی کمی کو ۔ ۔ ۔ بدنصیبی کو ۔ ۔ ۔ یا پھر اپنے نظریہ ، حیات کو ۔ ۔ ۔ !

اکثر ایسے ہوتا ہے کہ آئیڈیلسٹ اپنے آئیڈیل پانے کے بغیر ہی اس دنیا سے سدھار جاتے ہیں کیوں کہ ان میں عملی زندگی کا فقدان ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو ہواؤں کے رخ پر اپنی ناؤ چھوڑتے ہیں اکثر ساحل تک پہنچ جاتے ہیں ۔

شلپی ڈرائنگ روم میں واپس چلی آئی اور بھاسکر کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی ۔

" تم نے اپنی تخلیق مکمل کرلی ہوگی میں تو اس دن کا بے صبری سے انتظار کررہی ہوں "

"وہ تخلیق اب نہیں بنے گی۔ شلپی! میں ٹوٹ چکا ہوں۔ بکھر چکا ہوں۔ اب میرے اندر کسی بھی تخلیق کی کوئی تمنا نہیں۔"

"پھر۔۔۔!"

"میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے پاس میری تخلیق امانت ہے۔ اگر تم مجھے غلط نہ سمجھو تو میں اسے اپنانا چاہتا ہوں۔"

شلپی سنجیدہ ہو گئی۔ اس کے سامنے سارا منظر گھومنے لگا۔ پرائیوٹ نرسنگ ہوم، سفید یونیفارم میں ملبوس ڈاکٹر اور نرسیں اور پھر بے ہوشی کرنے والی وہ ماسک۔۔۔ اس ٹیبل پر وہ زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ کھو چکی تھی۔ اس کے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہو گئی۔

"بھاسکر! تم نے بہت دیر کردی۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہاری امانت کو میں بہت کوشش کے باوجود بھی سنبھال نہ سکی۔ مجھے اس کے وجود میں آنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اس لیے اس کی تضیع میں ہی اپنی خیر سمجھی۔ آخر کار بہت ڈرپوک ثابت ہوئی۔

"وہاٹ۔۔۔!" بھاسکر کے سر پر بجلی سی کوند پڑی۔

"ہاں۔۔۔ میں نے اسقاط کروالیا۔"

"اوہ نو۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا۔۔۔ شلپی۔"

"میرے پاس اور چارہ بھی کیا تھا۔ تم تو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ تمہارے واپس آنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ ویسے بھی تم مرد لوگ ایسے ہی ہو عورت کو لاچار سمجھ کر اس کے جذبات سے کھیل کر اپنی ہوس کا کھلونا بنالیتے ہو اور بعد میں اس کو بے سہارا اور بے بس منجھ دھار میں چھوڑ دیتے ہو۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں اب تمہارا کھلونا بننا نہیں چاہتی۔ میں سارا قصور مردوں پر لادنا نہیں چاہتی سچ تو یہ ہے کہ عورتیں بھی اپنی اس تذلیل کی خواہاں ہوتی ہیں۔ شاید اگر میں نے اپنی الگ راہ نہ ڈھونڈلی ہوتی تو آج تم میرے سامنے فریادی بن کر نہ بیٹھے ہوتے بلکہ میں تمہارے پاؤں پکڑ کر گڑگڑاتی، آنسو بہاتی اور اپنے پیار کا واسطہ دیتی۔

بھاسکر اپنی ناکامیوں کے تلخ گھونٹ چائے کے ساتھ حلق سے اتارتا چلا جارہا تھا۔ اسے اب یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے کتنے کپ پی لیے تھے۔

"میڈم آپ کی کار باہر کھڑی ہے۔ اپائنٹ منٹ ساڑھے نو بجے کی ہے۔ صرف دس منٹ رہ گئے۔" شلپی کا شوفر اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔" اور پھر وہ بھاسکر سے مخاطب ہوئی۔ "لیٹ از ہری اپ"

بھاسکر اٹھ کھڑا ہوا۔ شلپی تو پہلے سے ہی کھڑی ہو چکی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے پر ایسے نظر ڈالی جیسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ دھیرے دھیرے دونوں اپنے اپنے راستوں پر سفر کرنے کے لئے صدر دروازے سے باہر نکلے۔

○●○

سجاد ظہیر

آسیب

زمین نے اپنے محور پر تقریباً نصف چکر مکمل کر لیا تھا وہ سورج جس کا انتظار ہمیں سال بھر سے تھا اب غروب ہونے کو آج ۱۴ / اگست کا دن تھا پوری قوم نے آزادی کی گولڈن جوبلی پورے جوش و خروش سے منائی۔ اتنا جوش و خروش تو اس گلی میں کے موقع پر بھی نہیں ہوتا تھا۔ تقریباً ہر گھر پر سبز ہلالی پرچم لہرارہا تھا۔ دکانوں سے قومی نغموں کی ولولہ انگیز صدائیں آرہی تھیں۔ گلی میں چراغاں کیا گیا تھا۔ لگتا تھا کہ قوم آج ہی آزاد ہوئی ہو۔

میں نے باہر کھڑے ہوئے ٹرک پر آخری الماری رکھوائی اور خالی مکان کو تالا لگا کر باہر آگیا۔ ٹرک پر سامان لادا جاچکا میں نے ٹرک کو اپنے بیٹے کی نگرانی میں اپنی نئی منزل کی طرف روانہ کردیا۔ مجھے ابھی انتظار تھا مالکِ مکان کا جن سے ساڑھے سات کا وقت مقرر ہوا تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی سات بجے تھے۔ مجھے ابھی اس گلی میں مزید تیس منٹ گزارنا تھا۔ اس ہی گلی میں نے میری زندگی کی تیس بہاریں دیکھی تھیں۔ لڑکپن سے جوانی اور اب اس سے آگے کے سفر کے لیے میں نے مکان تبدیل کر فیصلہ کرلیا تھا۔

مجھے باہر کھڑا دیکھ کر سامنے نائی کی دکان سے ایک لڑکا کرسی لے کر آیا اور آم کے درخت کے نیچے رکھ کر مجھ سے کہا "انکل اس پر آرام سے بیٹھ جائیں۔"

میں نے شکریہ کے ساتھ کرسی کو اپنی کار کے نزدیک کیا اور گاڑی کے بمپر پر اپنی ٹانگیں دراز کرلیں۔ آج کا سارا دن کھڑے یا گاڑی چلاتے گزرا تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر بچے اپنی آخری اننگ کھیل رہے تھے۔ کبھی میں بھی دوستوں کے ساتھ یہاں کھیلا کرتا تھا۔

جب میرے والد مرحوم نے اپنے چھوٹے سے آبائی شہر کو چھوڑ کر کراچی میں ملازمت کرلی تو دو تین چھوٹے مکانوں میں قیام کرنے کے بعد ہم سوسائیٹی کے اس مکان میں آگئے تھے۔ اس زمانے میں یہ سوسائیٹی شہر کی جدید بستی گنی جاتی تھی۔ پہلی بستی پاکستان کے بعد سرکاری ملازمین کے رہائشی مسائل کو پیش نظر رکھ کر بنائی گئی تھی۔ اس زمانے کے سرکاری ملازمین نے اپنے کاٹ کر یہاں پلاٹ حاصل کیے۔ قرض لے لے کر مکانات تعمیر کیے۔ آدھا آدھا حصہ کرایہ پر اٹھا کر قرض کی رقم ادا کی۔

اس گلی میں بھی اکثریت ان ہی لوگوں کی تھی جو پرانے سرکاری ملازم تھے۔ میں نے سامنے دیکھا شاہ جی اپنے پوتے کو گو لیے اپنی بالکنی میں کھڑے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ستر کے لگ بھگ ہوگی۔ پرانی روایتوں کے امین۔ ایک بنک سے منسلک ریٹائر ہونے کے بعد فارغ اوقات میں ایک شیعہ تنظیم میں شمولیت اختیار کرلی لیکن جو روایت برسوں سے برقرار تھی برقرار رہ بلاتفریق مسلک ہر سال رمضان کے مہینے میں تمام اہلِ محلہ کی افطاری کا اہتمام۔ شاہ جی کا ایک داماد بھی سنی ہے۔ شاہ جی کے والد جنھیں ہم دادا جی کہتے تھے دہلی میں سرکاری ملازم تھے۔ شاہ جی کے دوست میجر زماں بھی ان کے ہمراہ دہلی میں مقیم تھے۔ ۱۹۴۷ء میں دہلی میں فسادات پھوٹ پڑے تو ان دونوں نے مل کر اپنی بستی کا دفاع کیا تھا۔ یہ دونوں اس زمانے میں طالب علم تھے۔ شاہ جی

تعلق مشرقی پنجاب سے تھا جب کہ میجر زماں یو پی کے سنی گھرانے تعلق رکھتے تھے۔ شیعہ سنی کی تفریق تو اب ہوئی تھی تقسیم سے پہلے دونوں مسلمان تھے اور مسلم لیگ جھنڈے تلے متحد۔ یہی ان کا مسلک تھا۔

میجر زماں اور شاہ جی کی بہت گہری دوستی تھی۔ میجر زماں اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ تقریباً دس سال قبل ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ مجھے یاد ہے جس روز میجر زماں کا انتقال ہوا شاہ جی کی آنکھوں نے اتنے آنسو بہائے جتنے شاید مشترکہ طور پر میجر زماں کے گھر والوں نے نہ بہائے ہوں۔ میجر زمان کے چار بیٹے تھے ایک جو تعلیم میں اچھا تھا انجینیرنگ کی تعلیم کے لیے امریکہ گیا مگر پھر لوٹ کر نہ آیا۔ دوسرے نے ایک پرائیوٹ کمپنی میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ باقی دو میں سے ایک احمد محی الدین نے ایک مذہبی جماعت میں شمولیت اختیار کرلی۔ شلوار کو اونچا اور ڈاڑھی کو نیچا کرلیا تھا۔ سب سے چھوٹا ایک لسانی تنظیم کا سیکٹر انچارج بن گیا تھا۔ اسی گھر سے تقریباً ایک سال قبل شاہ جی پر گولی چلائی گئی تھی اور پھر گھر کے باہر کھڑی ان کی کار کو رات کی تاریکی میں نذر آتش کردیا گیا۔

دوسری طرف شاہ جی کے اپنے بچے بھی زندگی میں کوئی نمایاں کامیابی نہ حاصل کرسکے۔ سب نے تعلیم تو حاصل کی مگر خالی ڈگریاں نوکری کے حصول میں مددگار ثابت نہ ہوئیں۔ اب پورے خاندان کا گزارا گھر کے نیچے بنی دکان کے کرایہ پر ہوتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے شاہ جی کا وہ بیٹا جس نے زندگی میں کبھی نماز نہیں پڑھی تھی ایک مذہبی تنظیم کا رکن بن گیا۔ آخر وقت گزاری کے لیے بھی تو کوئی شغل ہونا چاہیے۔ اگر دنیا نہیں بنی تو کیا ہوا آخرت کے بن جانے کی امید تو باقی تھی۔ یہی میجر زمان اور شاہ جی کی نئی نسلوں کا نصب العین بن گیا تھا۔

مجھے کرسی پر بیٹھے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ میرا پڑوسی مائیکل آم کے درخت کے سائے میں کھڑی اپنی موٹر سائیکل لینے آیا۔ مجھے دیکھا تو میرے قریب آگیا۔

"السلام علیکم سر۔ آپ جارہے ہیں۔"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔ "سامان تو چلا گیا ہے میں انتظار میں ہوں کہ کب مالکِ مکان نماز پڑھ کر آئیں گے۔"

"سر ملتے رہیے گا۔" مائیکل نے اداسی سے کہا۔

"مائیکل تم بھی آنا بچوں کے ساتھ یہ میرا نیا پتہ ہے۔" میں نے نئے گھر کا پتہ اس کو دیتے ہوئے کہا۔

"سر، اللہ آپ کو ہر جگہ خوش رکھے۔" یہ کہہ کر مائیکل نے اپنی بیوی اور دونوں چھوٹے بچوں کو موٹر سائیکل پر بٹھایا اور گلی سے نکل کر سڑک کی ٹریفک کے ہجوم میں گم ہوگیا۔

میں ایک بار پھر سوچنے لگا۔ مائیکل کے بارے میں جو ایک سیدھا سادا شریف انسان تھا گلی کی ہر اچھائی اور برائی سے لاتعلق اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ چند سال پہلے کی بات ہے میں بنک میں بیٹھا تھا جب مائیکل کے والد مسٹر اسٹیفن بیکر میرے پاس آئے تھے۔ ان کے پاس کچھ ٹراویل چیک تھے جو انھوں نے کیش کرانے تھے۔ میں نے پاسپورٹ طلب کیا پہلے ہی نظر ان کے نام پر پڑی۔ اسٹیفن بیکر ولد محمد ابوبکر۔ جیسے مجھے اچانک کرنٹ لگا۔ میں حیران رہ گیا تھا مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ یہ تو میرے خطہ کی تاریخ کا حصہ ہے۔ کبھی میرے اجداد نے بھی تو مذہب تبدیل کیا تھا۔ دور کی بات نہیں قیامِ پاکستان سے قبل میرے رشتہ کی دو خالاؤں میں سے ایک نے ہندو نوجوان سے شادی کی میرے یہ خالو مسلمان ہوگئے دوسری خالہ نے ایک پارسی سے شادی کی۔ اب اس خالہ کا پوتا تبلیغی جماعت کا رکن ہے۔ پہلی خالہ جنھوں نے ہندو سے شادی کی ان کا اکلوتا بیٹا ظفر میرا جگری دوست بھی تھا۔ وہ تعلیم کے لیے

امریکہ چلا گیا وہاں ظفر نے ایک جاپانی لڑکی سے شادی کرلی۔ آخری بار ظفر اپنی والدہ کے انتقال پر پاکستان آیا تھا۔ یونیورسٹی زمانے میں ظفر ایک بار دلی گیا تھا تو وہاں اپنے دادا اور دادی سے مل کر آیا تھا۔ وہ لوگ گوجرانوالہ سے دلی میں جاکر آباد ہوگئے اور پوتا پاکستان چھوڑ کر امریکہ چلا گیا تھا۔ میں سوچتا رہا تین نسلوں میں سے ایک ہندو، دوسری مسلمان اور ظفر جو تیسری نسل کا نم تھا شادی کے بعد چرچ جانے لگا۔ یہ اس خاندان کی پچاس سال کی کہانی تھی۔

سورج ڈوب چکا تھا شام گہری ہونے لگی تھی۔ قریب ہی کی مسجد سے اذاں کی آواز آرہی تھی۔ بچے اب اپنا کھیل ختم کر اپنے گھروں کو واپس پلٹ رہے تھے۔ مجھے وہ زمانہ یاد آرہا تھا جب ہم رات کے دو دو بجے تک ایسے موقعوں پر کھیل کود میں مصرا رہتے تھے۔ گھر والوں کو اطمینان ہوتا تھا کہ جب کھیل ختم ہوگا تو بچے گھر آجائیں گے۔ اب صورت حال بدل چکی تھی۔ تھوڑی تھ دیر کے بعد کسی نہ کسی گھر کا دروازہ یا کھڑکی کھلتی اور گھر کے بڑے جھانک کر اطمینان کرلیتے کہ ان کا پیارا خیریت سے ہے یا نہیں

اذان ختم ہوتے ہی مجھے اظہر اور مظہر دونوں بھائی نظر آئے جو نماز کے لیے جارہے تھے۔ دونوں بچپن ہی سے نمازی اور پرہیز تھے۔ باپ جو وکیل تھا، پاکستان آنے کے کچھ عرصے بعد دوسری شادی کرلی تھی اور ماں اپنے دونوں بچوں کو لے کر بھائی کے گھر تھی۔ یہ خاندان سہارن پور سے پاکستان آیا تھا۔ مجھے یاد آیا ایک دن مظہر کی والدہ ہمارے گھر آئی تھیں اور میری بیوی کے سامنے بیٹ پنجابیوں کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ میری بیوی نے جو یو۔ پی سے تعلق رکھتی ہے میری والدہ کی طرف دیکھا تو امی نے اشارے سے ا بولنے سے منع کیا جب وہ اپنی بات پوری کرچکیں تو میری والدہ نے کہا "ہمارا آپ کا تعلق گزشتہ ۲۵ برس سے ہے مگر شاید آپ کو نہیں کہ میں بھی پنجابی ہوں۔" تو مظہر کی والدہ کو یقین نہیں آیا۔ انھوں نے تصدیق کے لیے میری بیوی سے پوچھا اور جب جواب اثبا میں ملا تو کہنے لگیں پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ پھر ایک دن میں تھکا ہارا دفتر سے آیا تھا اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا اس دن اسی سیاسی لیڈر کا ایک جلوس سڑکوں پر نکل رہا تھا جس کی تقریر سے متاثر ہوکر مظہر کی والدہ پنجابیوں کو برا بھلا کہہ رہی تھیں میرے چھوٹے بھائی نے آکر مجھے اطلاع دی کہ مظہر بھائی کو گولی لگ گئی ہے۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے جواب دیا کہ اسے سیاسی جلسہ میں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اسی دوران میری والدہ نے اپنی چادر سنبھالی الماری میں سے کچھ رقم نکالی اور مجھے ساتھ لے کر مظہر ہاں چلی گئیں۔ وہاں معلوم ہوا کہ مظہر دفتر کی بس سے اتر کر گھر کی طرف آرہا تھا کہ اچانک سڑک پر استقبال کیمپ پر فائرنگ شر ہوگئی۔ جب مظہر کے ہاتھ سے ٹفن گرا اور اسے اپنے کندھے پر جلن کا احساس ہوا تب اسے پتہ چلا کہ وہ تو زخمی ہوگیا ہے۔

زخمی مظہر کو جناح ہسپتال لے جایا گیا۔ وہاں زخمیوں کی تعداد زیادہ تھی لہذا فوراً مرہم پٹی کرکے ہسپتال سے رخصت کردیا وجہ صرف یہ تھی کہ حکومت حزب اختلاف کے مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد کو کم سے کم ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ مظہر کے شا سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا خدا کا شکر تھا کہ گولی نے کسی ہڈی کو نہیں چھوا تھا۔ وہاں اس لسانی جماعت کے کسی کارکن نے آ زحمت نہیں کی جس کو وہ ووٹ دیا کرتا تھا یا جس کے جلسوں کی شان بڑھایا کرتا تھا۔ میں نے محلے کے دو بزرگوں کو ساتھ لیا۔ مظہ اظہر کو گاڑی میں بٹھایا۔ سڑکوں پر سناٹا اور شہر پر دہشت طاری تھی۔ ہم گلیوں سے ہوتے ہوئے آغا خاں ہسپتال گئے۔ واپسی پر سڑ پر جگہ جگہ پولیس نے ناکہ بندی کی ہوئی تھی تاکہ مجرموں کو پکڑا جاسکے۔ جب کہ پورا شہر جان چکا تھا کہ مجرم اس وقت ایوان اقتدار اپنی تھکن اتار رہے تھے۔ اس وقت میرے کان میں کسی نے سرگوشی کی کہ اگر ان لڑنے مرنے والوں نے اپنی اپنی مذہبی کتابیں کھول

دیکھی ہوتیں تو انھیں معلوم ہوتا کہ انسانی جان کی حرمت کیا ہے۔ کاش انھیں معلوم ہوتا کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کے قتل کے برابر ہے۔ مگر سہل پسند لوگ کتاب نہیں کھول سکتے وہ تو کسی شعلہ بیان مقرر کے منتظر ہوتے ہیں کہ وہ کتاب پڑھ کر انھیں بتائے کہ ان کے نظریہ حیات کو تسلیم نہ کرنے والے "کافروں" کو قتل کرکے جنت میں کیسے Short out سے داخل ہوا جاتا ہے۔

میرے لیے یہ تیس منٹ تیس سال کی ایک بازگشت تھے اب مجھے جلدی تھی اپنے نئے گھر جانے کی جو جامعہ کراچی نے میری بیوی کو الاٹ کیا تھا۔ ایک ایسے ماحول میں جس میں ہر طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ قابلِ احترام کھلے ذہن والے لوگ بستے ہوں گے جن کے ذہنوں کو کوئی شعلہ بیان مقرر پراگندہ نہیں کرسکتا جو آج ایک نئی نسل کو ہمارے آنے والے کل کے لیے تیار کررہے ہیں وہ نسل جو ہمارے کل کی معمار ہوگی۔ ابھی میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک کسی نے آہستہ سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ مالک مکان تھا۔

کم بخت آج بھی وقت پر آگیا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ گھڑی میں ٹھیک ساڑھے سات بجے تھے۔

"اندر چل کر ایک نظر دیکھ لیں" میں نے چابی اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں" مالک مکان نے جواب دیا۔ دل نے کہا ضرورت بھی کیسے ہوسکتی ہے اس علاقے میں تو پرانے کرائے دار لاکھ لاکھ روپیہ لے کر مکان خالی کرتے ہیں اور میں نے ویسے ہی مکان خالی کردیا تھا۔ چابی مالک مکان کے ہاتھ پر رکھتے ہی وہ تیس سال پرانا معاہدہ بھی ختم ہوگیا تھا۔ جو میرے والد نے ان کے ساتھ کیا تھا جب مالک مکان نے میرے والد سے پوچھا تھا۔

"آپ کتنے عرصہ اس مکان میں رہیں گے۔"

میرے والد نے جواب دیا تھا "جب تک زندہ رہوں گا یا آپ مجھے نکال نہیں دیں گے۔"

میرے والد جب تک زندہ رہے اسی گھر میں رہے مالک مکان نے کبھی مجھ سے مکان خالی کرانے کی بات نہیں کی جسکی وجہ یہ تھی کہ یہ مکان آسیب زدہ تھا۔ مکان میں رہائش پذیر بھوتوں نے ایک بار مالک مکان کے چانٹا بھی مارا تھا۔ پھر جو بھی کرائے دار آئے وہ سال چھ ماہ رہ کر چلے گئے۔ ہم پہلے لوگ تھے جو اس گھر میں اتنے طویل عرصہ تک رہے۔ اب مالک مکان نے مکان کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اس کی بڑی وجہ اب مکان کے باہر والا آسیب تھا جس کی لپیٹ میں پورا شہر تھا۔ گھر کے اندر والا بھوت تو صرف چانٹا مارتا تھا مگر گھر کے باہر والا آسیب جس نے شہر کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا انسانی خون پیتا تھا اور انسانی گوشت چباتا تھا۔

اسی دوران میں محلے کے سب پرانے بزرگ جو نماز پڑھ کر آرہے تھے میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ میں نے آنکھوں میں آنسو لیے سب کو خدا حافظ کہا۔ گلے ملے۔ تیس سال پرانی رفاقت ختم ہورہی تھی۔ میں نے ان سب سے ملنے کا وعدہ کیا ویسا ہی وعدہ جو مجھ سے پہلے گلی چھوڑ کر جانے والوں نے مجھ سے کیا تھا۔

میں نے گاڑی سٹارٹ کی اور شاہراہ قائدین پر آگیا شاہراہ قائدین جو شاہراہ فیصل سے شروع ہوتی ہے۔ راستہ میں تین سڑکیں اس سے ملتی ہیں طارق بن زیاد، خالد بن ولید، تیسری سڑک کا نام ہے ــــ۔ میں ــــ روڈ سے ہوتا ہوا جیل کے سامنے سے ہوکر یونیورسٹی روڈ پر آگیا۔ یونیورسٹی روڈ کے ایک کونے پر جیل ہے تو دوسرے سرے پر فوجی چھاونی۔ کیا کبھی یونیورسٹی جانے

والوں نے کبھی اس نکتے پر بھی غور کیا ہوگا۔ "نہیں" میں نے خود کلامی میں کہا۔ اگر ہم غور و فکر کے عادی ہوتے تو آج شہر میں بے شمار یونیورسٹیاں ہوتیں۔

میں آہستہ آہستہ یونیورسٹی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جگہ جگہ ٹوٹی پھوٹی سڑک، گٹر سے نکل کر بہتا ہوا پانی جو سبزی منڈی کے قریب گلی سڑی سبزیوں اور سبزی فروشوں کے جسموں سے نکلی ہوئی بو سے دو آتشہ ہوکر دماغ کو اڑا دینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ میں نے فوراً گاڑی کے شیشے اوپر کیے۔ ابھی میں اس عمل سے فارغ ہوا ہی تھا کہ سارا ٹریفک خود بہ خود ہی رک گیا۔ سامنے آوارہ گدھے سڑک پار کر رہے تھے۔

اسی طرح کبھی سست کبھی تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا میں تقریباً تیس منٹ میں اسٹاف ٹاؤن کے گیٹ پر پہنچا۔ رینجر نے گاڑی کو آتے دیکھ کر روکنے کا اشارہ کیا پھر گاڑی پر لگے پاس کو دیکھ کر جانے کا اشارہ کر دیا۔

میں ہرے بھرے درختوں سے پٹی سڑک پر آنے والے چار پانچ اسپیڈ بریکر کے پاس گاڑی کی رفتار دھیمی کرتا ہوا گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ تین چار مزدور ٹرک پر سے سامان اتار کر ان کو بیگم صاحب کے احکامات کے مطابق رکھ رہے تھے۔ نو بجے پڑوس سے ایک پیاری سی بچی نے آکر بتایا کہ کھانا تیار ہے آپ لوگ آجائیں۔ ہم نے اس دعوت پر لبیک کہا کہ خاتونِ خانہ تقریباً سولہ سترہ برس قبل میری استاد رہ چکی تھیں۔

جب کھانا کھاکر ہم واپس آئے تو سامان اتر چکا تھا۔ کچھ چیزیں اپنی حتمی جگہ پر رکھ دی گئی تھیں باقی کے لیے لفظ مہاجر ہی مناسب تھا کہ ابھی ان کے لیے جگہ بنانا باقی تھی۔

دن بھر کی تھکن نے ہمیں بے ترتیب بستروں پر ڈھیر کر دیا تھا۔ لہذا جسے جہاں جگہ ملی وہ وہاں ہی سو گیا۔ پھر تین دن گھر کو ترتیب دینے ہی میں گزر گئے۔ اب مکان گھر لگنے لگا تھا۔ بچوں نے بھی پرانے دوستوں کو بھلا کر آس پڑوس میں دوستیاں کر لیں تھیں۔

چوتھے دن جب میں دفتر سے گھر آیا تو گیٹ پر لگے لیٹر بکس میں میرے نام چار عدد خطوط موجود تھے۔ میں نے بریف کیس بیٹے کو پکڑایا اور خود ڈرائنگ روم میں ٹی۔ وی کے سامنے بیٹھ کر سی۔ این۔ این لگا کر حالاتِ حاضرہ سننے میں مصروف ہو گیا۔ اسی دوران میری بیوی مغرب کی نماز سے فارغ ہوکر میرے پاس آ بیٹھی اور بڑی بیٹی نے چائے کی پیالی ہم دونوں کے سامنے رکھ دی۔

"کس کے خط ہیں؟" بیگم نے سوال کیا۔

"پتہ نہیں۔ ابھی دیکھتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

یکے بعد دیگرے چاروں خط کھولے۔ سارے خطوط اللہ کے بابرکت نام سے شروع ہوئے تھے۔ سب کا مضمون ایک ہی طرح کا تھا۔ طرزِ تحریر لفظوں کا چناؤ۔ یوں لگتا تھا جیسے ان سب Stereo type خطوط کا منبع ایک ہی تھا۔ ہمیں دعوت دی گئی تھی کہ ہم ان کی سیاسی جماعتوں میں شامل ہوکر ثوابِ دارین حاصل کریں اور ملک دشمنوں کے خلاف جہاد میں شریک ہوکر اپنے قومی اور دینی فریضہ کو پورا کریں۔ چاروں خطوط مختلف تنظیموں کے نام سے تحریر تھے۔ ایک مہاجر تنظیم ایک پنجابی تنظیم ایک شیعہ تنظیم اور ایک سنی تنظیم۔

میری تھکن بے پناہ بڑھ گئی میرے شہر کا آسیب مجھ سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا۔

○●○

پروفیسر محمد انورالدین

مطالعہ

چودہ زبانیں چودہ کہانیاں

چودہ زبانیں چودہ کہانیاں اپنے نام کے عین مطابق ہندستان کی چودہ مختلف ریاستی زبانوں کے افسانوں کے اردو ترجموں کا مجموعہ ہے اس کے مترجم عظیم الدین عظیم ارضیات کے ماہر ہیں کرناٹک کے شہر بنگلور سے تعلق رکھتے ہیں ریاست کرناٹک کے محکمہ معدنیات و ارضیات کے اڈیشنل ڈائرکٹر رہ چکے ہیں انھیں اردو زبان سے گہرا لگاؤ ہے وظیفہ حسنِ خدمت پر سبک دوشی ہونے کے بعد پوری طرح ادب کی خدمت میں جٹے ہوئے ہیں پیش نظر کتاب ان کے شغف مطالعہ اور ذوقِ ترجمہ کا حاصل ہے۔

اس مجموعے میں شامل مختلف زبانوں کی کہانیاں عظیم الدین نے مرکزی ساہتیہ اکیڈمی کے دو ماہی مجلے "انڈین لٹریچر، کنٹمپرری انڈین شارٹ اسٹوریز" دلی اور کرناٹک ساہتیہ اکیڈمی کے سہ ماہی رسالے "اَنی کیتنا" (بنگلور) کی مختلف اشاعتوں سے منتخب کی ہیں اور ان کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کرنے اور اسے شائع کرنے کے لیے انھوں نے تخلیق کاروں سے باقاعدہ اجازت بھی حاصل کی ہے۔

ترجمہ ایک نہایت ہی مشکل، دشوار گزار اور وقت طلب فن کا نام ہے لیکن یہ جس قدر کٹھن ہے اسی قدر اہم بھی ہے کیوں کہ اس کے ذریعے نہ صرف ایک زبان کا علمی و ذہنی ورثہ دوسری زبان کے دامن میں پہنچتا ہے بلکہ اس کے وسیلے سے ایک زبان کا طرزِ احساس اور جذباتی رویے بلکہ ایک پوری تہذیب دوسری زبان میں منتقل ہوتی ہے۔ یہ نیا عنصر جو ترجموں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے دوسری زبانوں کے لیے نئے خون کی طرح ہوتا ہے۔ جس سے اس زبان کی قوت اور توانائی میں اضافہ ہوتا ہے۔

ترجمہ دو زبانوں کے درمیان پل کا کام کرتا ہے۔ یہ الگ الگ زبانیں بولنے والوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ ترجمہ دو لسانی وحدتوں کے درمیان آپسی میل ملاپ فرقہ وارانہ ہم آہنگی، ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کی فضا پیدا کرنے کے لیے نہایت مفید اور ممد ثابت ہوتا ہے اس پہلو سے تراجم کی ادبی اہمیت کے ساتھ ساتھ قومی اہمیت بھی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں عظیم الدین عظیم نے ہندستان کے چودہ زبانوں کی منتخب کہانیوں کو اردو کے پیرہن میں پیش کیا ہے اس طرح انھوں نے قریب قریب بھارت کی ساری ریاستی زبانوں اور تقریباً تمام علاقائی تمدنوں کا احاطہ کیا ہے۔ یہ چودہ کہانیاں درحقیقت ہندستان کی چودہ تہذیبوں کی عکاسی اور نمائندگی کرتی ہیں تبصرے کے دامن میں راقم کے لیے اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس مجموعے میں شامل ہر کہانی پر تفصیلی نظر ڈالے اور تحلیل اور تجزیے کی روشنی میں ان کے فنی محاسن و معائب کا تعین کرے اس لیے یہاں صرف ان کہانیوں کے ناموں اور ان کی زبانوں کا تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مشکِ ہرن (اڑیہ) شہر (آسامی) گناہ (بنگلہ) خالی ہاتھ (پنجابی) بوڑھا آدمی (ٹمل) راستے پر وہ آدمی (تلگو) انتظار (راجستھانی) بھائی عبدالرحمٰن (سندھی) دلہن کی شلوار (کشمیری) جوگی انجیا کی مرغی (کنڑا) غلام مزدور (گجراتی) نمی اور روشنی (مراٹھی) ردی (ملیالم) دوسرا جھٹکا (ہندی)۔

تبصرہ نگار کے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کہانیاں خود ان کی اپنی زبان میں ادبی قدروقیمت اور فنی معیار کے لحاظ سے کس

مقام [illegible] حامل ہیں۔ لیکن ان کے ترجمے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ ان میں سستے رومان اور غیر حقیقی تصورات کی کارف
نہیں ہے بلکہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں اور سنجیدہ مسائل کو برتا گیا ہے۔ ان کہانیوں کے واقعات اور کردار ہماری اپنی دنیا سے
رکھتے ہیں اور ان کے نمونے ہم اپنے معاشرے میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کہانیوں کا پلاٹ سیدھا سادہ اور آسان اور اسلوب بیان دا
شفاف ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں کہانی پن پایا جاتا ہے ہر کہانی ابتدائی سطور ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے
ہے جس کی وجہ سے ان کی ترسیل میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ تقریباً تمام ہی کہانیاں زندگی کی اعلیٰ اور مثبت قدروں کی عکاسی
ہیں اور ان میں قاری کو ایک مقصدیت اور ایک پیغام کا احساس ہوتا ہے۔ ان کہانیوں کے موضوعات میں فسادات، فرقہ وار
ناخواندگی، بندھوا مزدور جہیز، بیماری، بے روزگاری، بھوک، بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے بعض مخصوص نفسی رویئے، سرمایہ دا
اور دنیا پرست دین داروں کے سیاہ کرتوت وغیرہ اہم ہیں۔ ہر کہانی سے قبل مترجم نے اس کے تخلیق کار کی تصویر اور اس کے با
میں ضروری معلومات بھی فراہم کی ہیں۔

ان کہانیوں سے ہندستان کے مختلف خطوں کے عوام کا رہن سہن، طرزِ معاشرت ان کے مسائل و مصائب ان کے دکھ
عادات و اطوار سیرت و کردار اور نفسی رویوں کا اظہار ہوتا ہے گویا ہر کہانی اپنے علاقے کی زندگی کے ایک یا ایک سے زائد ابعاد کا آئینہ۔
یہ باور کرنا مشکل ہے کہ مترجم نے ان چودہ کہانیوں کا راست ان کی زبان ہی سے ترجمہ کیا ہے۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے
انھوں نے ان کہانیوں کے انگریزی یا کسی ترجمے کا اردو میں ترجمہ کیا ہے لیکن انھوں نے کہیں اس کی صراحت نہیں کی ہے۔

ترجمہ خصوصاً تخلیقی ادب کا ترجمہ مشکل ہوتا ہے کیوں کہ اس میں ایک زبان کے لسانی و تہذیبی سیاق کو دوسری زبان
لسانی و تہذیبی سیاق میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ ایک زبان کے فن پارے کو سمجھنا اس کے موضوع کو اپنے احساس کا حصہ بنانا اور اس
تخلیق کار کے منشا سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنا اور اس خاص ہیئت اور خاص لفظی و معنوی محاسن اور جمالیاتی قدروں کا اپنی ز
میں متبادل پیش کرنا دماغ سوزی نہیں بلکہ دل سوزی کا کام ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے فاضل مترجم قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے نہایت دل سوزی سے ان کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے
ان کہانیوں کے موضوع، پیام، تہذیبی پس منظر، ہیئت و اسلوب اور لفظ و بیان کی جمالیاتی قدروں کو اپنے ترجمے میں باقی رکھنے
کوشش کی ہے اور بیش تر اپنی کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔ البتہ بعض مقامات پر طرزِ بیان کی ناہم واری اور جملوں
غیر موزونیت کا احساس ہوتا ہے اور کہیں کچھ الفاظ معیاری اردو کے مغائر معلوم ہوتے ہیں۔ بعض مقامات پر صیغوں اور تصریف کے
کا بھی احساس ہوتا ہے لیکن مصنف کو اس کا دعویٰ بھی نہیں ہے کہ ان کی ترجمہ کی ہوئی کہانیاں نقل مطابق اصل کے درجے کی ہ
خود مترجم کے بہ قول ان کہانیوں کو اردو جامہ پہنانے کے پیچھے ان کا مقصد یہ تھا کہ مختلف زبانیں بولنے والوں کو اہلِ اردو کے قریب
کرنا کرنا اور قاری کے ذہن میں اصل تخلیق کی بازگشت پیدا کرنا۔ حق تو یہ ہے کہ مترجم اپنے ان دونوں مقاصد میں کامیاب ہے۔ ان
نے مختلف زبانوں کی کہانیوں کے تراجم کے ذریعے اردو زبان کے دامن کو علاقائی ادب کی وقیع سوغات سے مالامال کیا ہے جس
لیے وہ لائقِ تحسین و ستائش ہیں۔

دیدہ زیب رنگین ٹائیٹل اور کمپیوٹر کی کتابت آفسیٹ کی طباعت، ڈیمائی سائز کے ۱۴۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مجلہ
ادب پبلی کیشنز بنگلور کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہے جس کی قیمت پچاس روپے ہے۔ ○○○

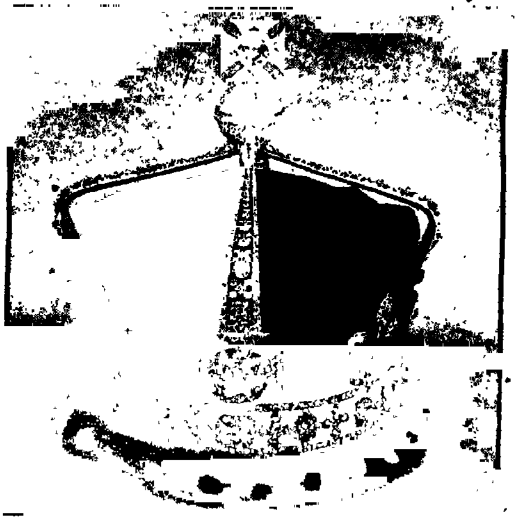
موہن پرشاد

مطالعہ

رومانس آف دی گول کنڈہ ڈائمنڈس

مصنف : ڈاکٹر عمر خالدی

گول کنڈہ کا شہرہ آفاق ہیرا " کوہ نور " کسی مرد شہنشاہ مملکت یا بادشاہ سلطنت کو راس نہیں آیا ۔ جس کسی کے قبضے میں رہا اس کی مملکت یا سلطنت کا خاتمہ ہوگیا ۔ البتہ ملکہ برطانیہ کو راس آیا اور اسی ملکہ کے تاج برطانیہ کی زینت تھا اور ۱۹۹۴ ء سے ٹاور آف لندن میں نمائش کے لیے رکھا گیا - (موہن پرشاد)



ڈاکٹر عمر خالدی پروفیسر خالدی مرحوم استاد شعبہ ، تاریخ جامعہ ، عثمانیہ کے فرزند ہیں ڈاکٹر عمر خالدی ۱۹۵۶ ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں ہوئی ۔ اعلیٰ تعلیم امریکہ میں ہوئی اور آج کل امریکہ کی شہرہ آفاق جامعہ M.I.T وابستہ ہیں ۔ ڈاکٹر خالدی نے اس سے قبل کئی کتابیں اور مضامین لکھے ہیں ۔ ان کی انگریزی کتاب Hyderabad After The Fall اور اس کا اردو ترجمہ " سقوطِ حیدرآباد " ۱۹۹۸ ء بےحد مشہور ہوئے ۔ یہ کتاب ریاست حیدرآباد کے پچھلے پچاس برسوں کے جائزے پر مشتمل ہے اس کتاب میں Syndney Corton Pilot ہوا باز | جو پولیس ایکشن سے قبل جنگی ہتھیار افواج آصفی کو غیر قانونی طور پر مہیا کیا کرتا تھا | کی سوانح عمری بھی اس کی تصویر کے ساتھ شامل ہے ۔ روز نامہ " سیاست " میں گزشتہ برسوں میں ان کے کئی تاریخی اور محلاتی مضامین شائع ہوچکے ہیں ۔ ان کی نئی تصنیف " رومانس آف دی گول کنڈہ ڈائمنڈس " Romance of the Golconda Diamonds میں انھوں نے قطب شاہی سلطنت اور قطب شاہی حکمرانوں ، ریاست حیدرآباد اور آصف جاہی سلاطین کے بارے میں روزنامہ " سیاست " میں شائع شدہ دیگر مورخین اور محققین کے مضامین کے مواد سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی اس وقیع تصنیف میں

"سیاست" کے حوالے سے اظہار تشکر بھی کیا ہے۔ اس تصنیف میں ریاست گول کنڈہ کے قیمتی ہیرے جواہرات و زیورات کے علاوہ قطب شاہی اور آصف جاہی سلاطین کی کوئی (۹۰) رنگین اور سیاہ و سفید نایاب تصاویر بھی ہیں جن میں سے چند تصاویر عکسِ حیدرآباد Images of Hyderabad جس کو ادارہ "سیاست" نے ایک البم کی صورت میں شائع کیا ہے سے بھی لی گئی ہیں۔ بعض تصویریں خود ان کی اپنی لی ہوئی ہیں۔ دکن کی معدنی دولت کا دلآویز نقشہ اس مسدس میں یوں کھینچا ہے۔

الماس و لعل و سنگ یشپ، نقرہ و طلا — نیلم، عقیق، سنگ سمیہ اور کوئیلا
پکھراج، سنگِ مرمر و یاقوتِ باصفا — بلور، مس، حدید، نمک، جست، سنکھیا
کانیں ہیں ان کی ارضِ دکن میں دبی ہوئی
یہ دولتیں ہیں پاؤں کے نیچے گڑی ہوئی

مقامی افراد شہر حیدرآباد کے اپنی تاریخ سے نابلد ہیں اور قلعہ گول کنڈہ کو محض ایک ویران کھنڈر کی حیثیت سے جانتے ہیں حالاں کہ قلعہ کے علاوہ گول کنڈہ پوری ایک سلطنت کا نام بھی ہے جو تقریباً موجودہ ریاست آندھرا پردیش کے تمام علاقوں پر گھری ہوئی تھی جس کا جملہ رقبہ تقریباً 2,75,045 مربع کیلو میٹر تھا۔ جس پر قطب شاہی سلاطین حکم راں تھے۔ ان کے معتبرے قلعہ، گول کنڈ کے شمال مغرب میں واقع ہیں۔ یہ عظیم الشان سلطنت معدنی دولت سے مالا مال تھی۔ اضلاع گنٹور، اننت پور، کدری، کڑپہ اور کرنول میں ہیروں کی کانیں تھیں۔ یہاں کی کانوں سے ہیرے نکال کر میر جملہ کی نگرانی میں قلعہ گول کنڈہ روانہ کردیے جاتے تھے۔ جہاں ان کو تراشا اور کاٹا جاتا تھا۔ پالش، جلا کے بعد ان کو تول کر بھاری قیمت میں فروخت کیا جاتا تھا اور قلعہ کے مشرقی جانب کاروان ساہو کار [موجودہ محلہ کاروان کلثوم پورہ] میں بڑے بڑے سرمایہ دار تاجر ان ہیروں کو عالمی منڈیوں میں بھیج دیتے تھے۔ ۱۶۷۹ء میں فرانس کا ایک ہیروں کا سوداگر و سیاح ٹیورنیر (Jean Baptiste Tavernier) بہ راہ راجمندری، ہیروں کی خریدی کے لیے کئی مرتبہ گولکنڈہ آیا تھا۔ دنیا کے ہر بڑے ملک کے دربار میں اس کا رسوخ تھا۔ اس نے اپنے سفر نامے میں گول کنڈہ کے ہیروں کا تفصیلی ذکر کیا ہے اس کی ایک قدیم نایاب تصویر سیاہ و سفید میں شریکِ کتاب ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ کوہ نور، دریائے نور، ریجنٹ egent ہوپ Hope اور شاہ Shah نامی ہیرے گول کنڈہ کی کانوں سے نکالے ہوئے ہیں۔ گول کنڈہ کا شہرہ آفاق ہیرا کوہ نور کسی مر شہنشاہ مملکت کو راس نہیں آیا۔ جس کسی کے قبضے میں رہا اس کی مملکت / سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ البتہ یہ ہیرا صرف ملکہ برطانیہ کو راس آیا اور اسی ملکہ کے تاج برطانیہ کی زینت تھا۔ ۱۹۹۳ء سے ٹاور آف لندن (Tower of London) میں نمائش کے لیے محفوظ ہے۔ عمر خالدی صاحب کی تصنیف میں کوہ نور ہیرا انگریزوں کے قبضہ میں کن واسطوں سے آیا اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے:

میر جملہ ۱۶۵۰ء، گول کنڈہ شاہ جہاں ۱۶۵۶ء، نادر شاہ ۱۷۳۹ء، احمد شاہ ابدالی ۱۷۴۷ء، تیمور لنگ ۱۷۷۳ء، شاہ شجاع ۱۸۰۳ء، مہاراجہ رنجیت سنگھ والیِ پنجاب ۱۸۱۳ء، ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۸۴۹ء۔ کوئن وکٹوریہ کو ۱۸۵۰ء بہ طور تحفہ دیا گیا منجانب لارڈ ڈلہوزی وائسرائے ہند۔ نواب میر عثمان علی خاں سلطنت آصفیہ کے آخری تاج دار ۱۹۱۱ء تا ۱۹۴۸ء اور حکومت حیدرآباد کے پہلے راج پرمکھ ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۶ء اپنے عہد کے متمول ترین انسان تھے۔ ان کے بیش بہا قیمتی ہیرے اور جواہرات کا ساری دنیا میں شہرہ تھا ان کی دولت کے بارے میں قیاس آرائیاں بہت ہیں ڈاکٹر خالدی نے اس موضوع پر جتنا شائع شدہ مواد ان کو حاصل ہوچکا انھوں نے نہایت عمدہ طریقہ سے پیش کیا ہے۔ تصنیف کے صفحہ (۱۱۳) پر روزنامہ "سیاست" مورخہ ۱۹ / جنوری ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع شدہ اس پوری خبر کا عکس ٹائیٹل کے ساتھ شائع کیا گیا ہے کہ

نظام دکن کے شہرہ آفاق ہیرے جواہرات حکومت ہند کی ملکیت بن گئے ۔ عالمی منڈی میں نظام کے (۱۰۳) قیمتی و نایاب ہیرے جواہرات کی قیمت کا تخمینہ (۱۵۰۰) کروڑ روپے کیا گیا تھا مگر حکومت ہند نے (۲۱۸) کروڑ روپے کا ایک بنک ڈرافٹ نظامس جیولری ٹرسٹ کو دے کر (۱۰۳) قیمتی و نایاب ہیرے جواہرات کے مالک بن گئے ۔ کتاب کے ٹائیٹل کی پشت پر قلعہ گول کنڈہ اور بالاحصار کی رنگین تصویر ڈاکٹر خالدی نے لی جو نہایت جاذبِ نظر ہے سے تصنیف کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں قطب شاہی اور آصف جاہی سلاطین کے عہد کی پوری تاریخ سمودی گئی ہے اس طرح یہ تصنیف نہ صرف ہیرے جواہرات کے سوداگروں کے لیے بلکہ تاریخ اور تاریخی تحقیق سے دل چسپی رکھنے والوں اور اسکالروں کے لیے اہم معلوماتی مواد فراہم کرتی ہے اس کتاب کو اعلیٰ قسم کے art paper پر شائع کیا گیا ہے ۔

یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں سب سے پہلے امریکہ میں Grantha Corporation نے شائع کی ہے ● قیمت ایک ہزار چارسو روپے ● صفحات : ۱۲۰ ● عمدہ گٹ اپ ، ناشر : Grantha Corporation ہیں ۔

Grantha Corporation
80 - Cliffedway - Middle Town
New Jurcy - U.S.A. - 07701.

In Association with
MAPIN Publicaiton Pvt. Ltd.
Chidambaram - Ahmedabhad - 380013.
Gujrat State - INDIA.

○●○ ○●○ ○●○ ○●○ ○●○ ○●○ ○●○ ○●○ ○●○

(سلسلہ ص : ۸۰ سے)

○●○

نسیم الدین فریس

مطالعہ

اوراقِ مورخ (حیدرآباد دور عثمانی میں)

مصنف: ڈاکٹر سید داؤد اشرف

دکن میں جامعات سے باہر علمی و ادبی تحقیق کی جو روایت شمس المورخین حکیم سید شمس اللہ قادری اور مولوی نصیر الدین ہاشمی نے قائم کی تھی عہد حاضر میں اس روایت کو زندہ رکھنے والوں میں ڈاکٹر سید داؤد اشرف کا نام سرِ فہرست ہے۔ سابقہ ریاست حیدرآباد کی علم پروری۔ اربابِ کمال اور اہلِ علم کی قدردانی اور علوم و فنون کی اشاعت کے سلسلے میں سلاطینِ آصفیہ خصوصاً آصف سابع میر عثمان علی خاں کی بے دریغ فیاضی اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے۔ لیکن یہ تاریخ انقلاب وقت اور جمود و مرور ایام کی زد میں آکر نسیاً منسیاً ہوچکی ہے۔ ڈاکٹر داؤد اشرف نے مملکتِ آصفیہ کی تاریخ کے اسی پہلو کو خصوصی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔

ڈاکٹر داؤد اشرف آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے طویل عرصے تک وابستہ رہے۔ انھیں اس ادارے میں مخزونہ ہزاروں تاریخی کاغذات، قدیم سرکاری امثلہ جات، اہلِ غرض کے معروضات، یادداشتوں، عہدے دارانِ مجاز کی تجاویز اور شاہانِ سلف کے احکام و فرامین کی ترتیب و تہذیب کا موقع ملا۔ انھوں نے اس ادارے میں محفوظ بعض اہم تاریخی دستاویزات کی وضاحتی فہرستیں بھی مرتب کی ہیں۔ اس طرح اب وہ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں مخزونہ مغلیہ اور آصف جاہی رکارڈز کے سب سے بڑے ماہر ہیں۔ گزشتہ دس برسوں کے دوران انھوں نے آرکائیوز میں محفوظ معتبر اور مستند قدیم سرکاری دستاویزات سے اخذ کردہ مواد پر مبنی اپنے تحقیقی و انکشافی مقالات کے ذریعہ ہندستان کے سرکردہ علما، چوٹی کے شعرا، صف اول کے ادیبوں اور دیگر اصحابِ کمال کی زندگی کے ان پہلوؤں کو آشکارا کیا ہے جو عام ادبی مورخوں اور محققوں کی نظروں سے پنہاں تھے۔ انھوں نے ناقابلِ تردید دستاویزی شہادتوں کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ ان مشاہیر کی کیریر سازی میں مملکتِ آصفیہ کے بذل و نوال اور الطاف و عنایات کا بڑا دخل ہے۔ اگر ریاست حیدرآباد ان مشاہیر کی فراغ دلانہ مالی امداد اور معاشی کفالت نہ کرتی تو شاید وہ اپنے فن میں ایسے شان دار کارنامے انجام نہ دے پاتے جن کی بہ دولت آج ان کے نام بقائے دوام حاصل کرچکے ہیں۔

ڈاکٹر داؤد اشرف نے آرکائیوز کے گنجینہ نوادرات کا برسوں نہایت دیدہ ریزی اور دماغ سوزی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے اس مطالعے کا حاصل وہ ٹھوس اور گراں مایہ تحقیقی مضامین ہیں جن کے چار مجموعے۔ ○ بیرونی مشاہیر ادب اور حیدرآباد ○ حاصلِ تحقیق ○ نقوشِ تاباں اور ○ قدرداں حیدرآباد " کے نام سے شائع ہوچکے ہیں۔ سابقہ ریاست حیدرآباد کے بارے میں شاہ تجلی علی کی تزکِ آصفیہ۔ غلام امام خاں کی تاریخ خورشید جاہی، غلام حسین خان کی گلزارِ آصفیہ، غلام صمدانی خاں گوہر کی تزکِ محبوبیہ اور مانک راؤ وٹھل راؤ کی بستانِ آصفیہ مستند مصادر و مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر داؤد اشرف کی کتابیں اس فہرست میں ایک نیا اضافہ ہیں۔ سلطنتِ آصفیہ کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور ملکی انتظام وغیرہ کے سلسلے میں ان کی پانچویں تصنیف " اوراقِ مورخ " ہے جو حال ہی میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ کتاب کا عنوان پڑھتے ہی ذہن میں میر کا یہ مشہور مصرعہ گونجنے لگتا ہے۔ " دل کے بہ تہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے "

نے دہلی کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کو اوراقِ مصور سے تعبیر کیا تھا لیکن مصور کی تخلیق میں حقیقت کے ساتھ تخیل کا عنصر بھی
ں رہتا ہے۔ ڈاکٹر داؤد اشرف نے سابقہ ریاست حیدرآباد۔ کے علمی و تہذیبی کارناموں کو اوراقِ مورخ کا عنوان دیا ہے جو نہایت
ں خیز ہے کیوں کہ مورخ کی تحریر حقائق پر مبنی ہوتی ہے اس میں تخیل کی کارفرمائی نہیں ہوتی۔ تقابل مقصود نہیں لیکن واقعہ یہ ہے
ہلی کے متعلق میر کے مشاہدے اور حیدرآباد کے متعلق ڈاکٹر داؤد اشرف کے مطالعے میں وہی فرق ہے جو ایک مصور اور مورخ میں
اہے۔

" اوراقِ مصور " پندرہ مضامین میں محطوی ہے۔ زمانی اعتبار سے یہ تمام مضامین سلطنتِ آصفیہ کے آخری فرماں روا نواب
عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مضامین کے مزاج اور موضوعات کی وضاحت خود مصنف نے اپنے "
ں ورق " (پیش لفظ) میں مختصر اور جامع انداز میں اس طرح کی ہے " ان میں چند مضامین بیرونی نام ور شخصیتوں کی ریاست حیدرآباد
. وابستگی اور ان کی قدردانی کے بارے میں ہیں جیسے مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی، سر راس مسعود اور مولوی (مولانا) شوکت علی۔
مضامین حیدرآباد کی اہم اور ممتاز شخصیتوں کے اعترافِ خدمات اور قدر افزائی کی بابت ہیں جیسے نواب عماد الملک، سر فریدون
ب بہادر اور فضیلت جنگ بہادر (مولانا انوار اللہ خاں بانی جامعہ نظامیہ) دو مضامین عاملہ سے عدلیہ کی علاحدگی اور " بیگار کی لعنت "
ست کے نظم و نسق میں اہم اصلاح اور ایک دیرینہ سماجی برائی کے خاتمے کے لیے اٹھائے گئے اقدامات کی نسبت ہیں۔ دیگر مضامین
ز داب کی سرپرستی اور تعلیم کی اشاعت و فروغ کے لیے دیے گئے۔ گراں قدر عطیوں سے متعلق ہیں۔"

ڈاکٹر داؤد اشرف کی تحقیق سے سابقہ ریاست حیدرآبد کی تاریخ کا ایک روشن اور تاب ناک پہلو سامنے آتا ہے۔ آزادی کے
تواتر کے ساتھ ایسی کتابیں لکھی گئیں جن میں سابقہ دیسی حکم رانوں کی نجی زندگی۔ عیش پرستی اور دوسری سماجی و تہذیبی خرابیوں کو
ِ تنقید بنایا گیا ہے۔ چناں چہ ریاست حیدرآباد کے بارے میں بھی تنقیدی نقطۂ نظر سے بہت کچھ لکھا گیا اور ہنوز یہ سلسلہ جاری
۔ تنقید میں کوئی قباحت نہیں بہ قول شخصے یہ سانس لینے کی طرح ضروری ہے۔ اس لیے تنقید ہونا چاہیے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ یک
.نہ ہو۔ اس میں خراب پہلوؤں کے ساتھ اچھے پہلو، خامیوں کے ساتھ خوبیاں اور معائب کے ساتھ محاسن بھی دکھائے جانے چاہئیں
ں ان کے برعکس آصف جاہی سلاطین خصوصاً اس خاندان کے آخری حکم راں نواب میر عثمان علی خاں کے بارے میں لکھنے والوں
، عموماً یک رخی تنقید اور تعریض سے کام لیا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مملکتِ آصفیہ میں خرابیاں نہیں تھیں۔ لیکن ان خرابیوں
، ساتھ اس میں خوبیاں بھی تھیں۔ اس کے تاریک پہلوؤں کو اجاگر کرنا اور روشن پہلوؤں سے صرف نظر کرنا معروضی تحقیق و تنقید
. اصولوں کے مغائر ہے۔ نیز اس ضمن میں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ریاست حیدرآباد کی بیش تر خرابیاں شاہی طرزِ
ست اور جاگیر دارانہ نظام کا لازمہ اور اس کا ناگزیر نتیجہ تھیں۔ موجودہ جمہوری اصولوں اور معیاروں پر اس دور کے نظم و نسق اور تہذیب
ِ اشرت کا محاکمہ معدلت اور معقولیت سے بعید ہے۔ لکھنے والوں نے اس شدت اور تسلسل کے ساتھ مملکت آصفیہ کے فرماں رواؤں
جاگیر داروں کی لذت کوشیوں اور عیش و عشرت کی داستانیں بیان کیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہاں کے تمام حکم راں اور امرا و
یردار نااہل نکمے اور علم و ہنر سے ناآشنائے محض تھے حالاں کہ ایسا نہیں ہے سابقہ ریاست حیدرآباد کے حکم رانوں کو ملکی انتظام اور
ی فلاح و بہبود سے گہری دل چسپی تھی۔ وہ عدل گستر اور رعایا پرور تھے اسی طرح یہاں کے سبھی امرا و جاگیردار لہو و لعب اور
بات میں گرفتار نہیں تھے بلکہ ان میں سے اکثر اعلیٰ انتظامی صلاحیت اور علمی لیاقت کے حامل تھے۔ ان امرا نے علوم و فنون کی
انی اور اہلِ علم کی سرپرستی میں بے دریغ اپنی دولت صرف کی۔ علوم و فنون کی اشاعت سے دل چسپی ریاست حیدرآباد کے حکم

رانوں اور امرا کی زندگیوں ہی کا نہیں بلکہ حیدرآباد کی تاریخ کا درخشندہ زاویہ ہے لیکن عوام کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اس سے متا
تمام مواد تاریخی دستاویزات اور سرکاری امثلہ جات کی شکل میں ریاستی آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ بہ حیثیت محقق ڈاکٹر داؤد اشرف
انفرادیت اور ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس گنجِ گراں بہا کو پردہ ء خفا سے نکال، معرض شہود میں لایا۔ اس طرح انھوں
سابقہ ریاست حیدرآباد کی تاریخ و تہذیب پر خامہ فرسائی کرنے والوں کی اس جماعت میں جن کی نظر سابقہ حیدرآباد کے حکم رانوں
صرف عیوب و نقائص اور کم زوریوں کو تلاش کرتی ہے، اس ریاست کے علمی و ادبی کارناموں کی مستند تاریخ مرتب کر کے اپنی اَ
علاحدہ شناخت بنائی ہے۔

پیشِ نظر کتاب اوراقِ مصور کے مشمولات سے نہ صرف قاری کے علم و بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اسلاف کے علمی
تمدنی کارناموں پر اعتماد اور طمانیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ یہ کتاب سلطنت آصفیہ سے متعلق متعدد سلبی تصورات کی نفی کرتی
اور بعض ایسے مفروضات پر سوالیہ نشان لگاتی ہے جنھیں مسلمہ تاریخی حقائق کی حیثیت دی گئی تھی۔ ایک طرف تو یہ کتاب ر
ریاست حیدرآباد کی علوم و فنون کی قدردانی، زبان و ادب کی سرپرستی، مملکتی کارناموں اور انتظامی اصلاحات کے بارے میں مثبت حق
کے لیے ٹھوس اور ناقابلِ تردید اسناد و شواہد فراہم کرتی ہے اور دوسری طرف اردو کے بعض مشہور ادیبوں اور شاعروں کی زندگی کے
گوشوں کو پہلی مرتبہ علم و تحقیق کی روشنی میں لاتی ہے جو مملکت آصفیہ سے ان اہلِ قلم کے تعلق و توسل پر مبنی ہیں مثلاً بابائے ا
مولوی عبدالحق کی شخصیت سے کون واقف نہیں لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے باخبر ہوں گے کہ مولوی عبدالحق کو بابائے ا
بنانے میں حیدرآباد کا بڑا حصہ ہے۔ ڈاکٹر داؤد اشرف نے آرکائیوز میں محفوظ رکارڈ کی اساس پر حیدرآباد میں بابائے اردو کی ملازم
اور مختلف عہدوں پر ان کی سرفرازی کی ساری تفصیلات مرتب کی ہیں ان کے بارے میں آصف جاہ سابع کے مختلف فرامین کا عَ
پیش کیا ہے۔ ایک فرمان سے واضح ہوتا ہے کہ ریاست حیدرآباد۔ مولوی عبدالحق کو اردو لغت کی تیاری کے لیے دس سال تک،
ایک ہزار روپیہ کی امداد دیتی رہی۔ المیہ یہ ہے کہ مولوی صاحب نے یہ لغت تیار کرنے کے باوجود ریاست حیدرآباد کے حوالے نہیں
ایک اور فرمان کے ذریعے نظام حیدرآباد نے مولوی عبدالحق کی درخواست پر انجمن ترقی اردو کو چھ سال تک پینتالیس ہزار روپیہ سالا
امداد جاری کی بعد میں ایک دیگر فرمان کے ذریعے انجمن مذکور کو دواماً چالیس ہزار روپیہ سالانہ امداد کی منظوری دی۔ بابائے اردو کی
حیات اور بعد از وفات ان کی شخصیت اور کارناموں پر بے شمار مضامین اور متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن کسی میں ریاست حیدرآبا
جانب سے ان کی سرپرستی، سرفرازی اور قدردانی کی یہ تفصیلات نہیں ملتیں جب کہ مولوی صاحب نے، اردو زبان اور علم و ادب
شعبے میں جو بیش بہا خدمات انجام دیں وہ بڑی حد تک آصف سابع کی علم پروری اور فراخ دلانہ مالی امداد کی مرہونِ منت ہیں۔ اسی
دیگر مشاہیر مثلاً جوش ملیح آبادی کے قیامِ حیدرآباد، ملازمت اور دیگر اہم امور کے بارے میں ڈاکٹر داؤد اشرف نے آرکائیوز کے ر
سے استشہاد کرتے ہوئے بہت سی ان کہی باتوں، اچھوتے حقائق اور بعض رازہائے سربستہ کی پردہ دری کی ہے۔ جوش کے بارے
نظام کے بعض فرامین کے عکس در جوش کے "معافی نامے" کا دستاویزی ثبوت فراہم کر کے انھوں نے نظام کے بالمقابل جوش
مزعومہ اس خودداری اور انانیت کو آئینہ دکھایا ہے جس کے "یادوں کی بارات" میں انھوں نے بہت ڈھول پیٹے ہیں۔ اس کتاب
نواب عمادالملک، مولانا انواراللہ خاں فضیلت جنگ اور سرفریدون الملک کے بارے میں لکھے گئے مضامین میں ان مشاہیر کے مناصب
مراتب میں ترقی اور سرفرازی کے بارے میں رئیسِ دکن کے جو فرامین پیش کیے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست حیدرآبا
حکومت کس قدر جوہر شناس اور لیاقت و کمال کے اعتراف میں کس قدر فراخ دل واقع ہوئی تھی۔

پیش نظر کتاب میں ڈاکٹر داؤد اشرف نے مختلف مشاہیر علم و ادب کے حوصلہ افزائی ان کی تقرر و ترقی، مالی امداد اور مختلف
تحقیقی اداروں کی اعانت اور علمی منصوبوں کی کفالت کے سلسلے میں کی گئی کارروائیوں کی آغاز سے لے کر پایان کار تک پہنچنے
میلات مرتب کی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مطلق العنان حکمراں ہونے کے باوجود آصف سابع کسی مقدمے میں احکام
نے سے قبل متعلقہ محکموں اور عہدیداران مجاز کی آراء طلب کرتے اور ان کی سفارشات کی بنیاد پر فرمان جاری کرتے تھے خواہ یہ
ان کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سابقہ ریاست حیدرآباد کی حکومت مزاج و منہاج میں شاہی
باوجود انتظامی امور میں جمہوری اصولوں پر کاربند تھی۔ آج کے جمہوری دور میں ہم تقسیم اختیارات یا اقتدار کی غیر مرکوزیت
تے ہیں۔ لیکن شخصی حکم رانی کے دور میں عدالتی نظم و نسق کی اصلاح اور عوام کی سہولت کی خاطر آصف سابع نے عاملہ اور
عدہ کرنے کے احکام جاری کیے تھے۔ جس کا عکس پیش نظر کتاب میں شامل ہے۔

سابقہ ریاست حیدرآباد کا طرز فکر سیکولر تھا۔ اس نے مذہب اسلام کی اشاعت سے زیادہ علمی کاموں سے دل چسپی لی۔ علمی
کسی مذہب کا ہو ریاست حیدرآباد نے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے اسے مالی امداد بہم پہنچائی۔ اس کی فیض رسانی محدود اور
یں تھی۔ اسس ضمن میں ڈاکٹر داؤد اشرف نے ان فرامین کا عکس پیش کیا ہے جن میں آصف سابع نے پونا کے بھنڈارکر
کو مہمان خانے کی تعمیر کے لیے پچیس ہزار روپے اور مہابھارت کی اشاعت کے لیے دس سال تک ایک ہزار روپے سالانہ
بنارس ہندو یونیورسٹی کے لیے ایک لاکھ روپے کی امداد جاری کرنے کا حکم دیا تھا۔ آج کے دور میں بھی ہندستان میں بیگار
مزدوری کے واقعات سننے میں آتے ہیں۔ اس خصوص میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آصف سابع نے کسی کی سفارش،
ندگی کے بغیر از خود اپنی ریاست میں بیگار کو موقوف کرنے اور اسے مستوجب سزا جرم قرار دینے کے احکام جاری کیے تھے۔
میل زیرہ تبصرہ کتاب میں موجود ہے۔

مختصر یہ کہ اوراق مورخ کا ہر مقالہ تاریخ اور ادب کے وقیع موضوعات پر نئے اور نادر تحقیقی مواد کا حامل ہے۔ قدیم فرامین
ی شمولیت کی وجہ سے یہ کتاب مملکت آصفیہ کی تاریخ اور اردو ادب کے بعض مشاہیر پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے
در حوالے کی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈیمائی سائز کے ایک سو چالیس صفحات، دیدہ زیب ٹائیٹل اور کمپیوٹر کی کتابت پر
تاب شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد کے توسط سے شائع ہوئی ہے اور سو روپیہ قیمت کے عوض دفتر روزنامہ سیاست حیدرآباد اور
شگوفہ، حیدرآباد سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

○●○

سید جلیل الدین

اشاریہ ماہ نامہ "سب رس" حیدرآباد

جنوری تا دسمبر ۱۹۹۸ء

○○○ مقالے

اثر فاروقی	جگر صاحب، بے لوث خدمات کی عظیم روایت	محبوب حسین جگر نمبر	مارچ ص: ۶۹
اثر۔ محمد علی، ڈاکٹر	۱۔ پروفیسر عبدالستار دلوی اور "نئی تحریریں"		اکتوبر ص: ۲۷
	۲۔ محترمہ تہنیت النساء بیگم اور ان کی نعتیہ شاعری	تہنیت النساء بیگم زور نمبر	نومبر ص: ۵۴
اختر سلطانہ، ڈاکٹر	غاروں کی تصویریں ۔۔۔ ایک معمہ		فروری ص: ۱۷
اختر۔ ہاشم علی	محترم بھائی جگر	محبوب حسین جگر نمبر	مارچ ص: ۱۵
اشرف رفیع، پروفیسر	۱۔ حرفِ روشن		مئی و جون ص: ۲۴
	۲۔ ہندستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری		اگست ص: ۱۷
	۳۔ تہنیت زور کی نعتیہ شاعری	تہنیت النساء بیگم زور نمبر	نومبر ص: ۳۹
اعجاز احمد / اسامہ فاروقی	اردو کے تعلق سے چند افکار		جنوری ص: ۲۲
اعجاز، ایس۔ ڈیڈ / اسامہ فاروقی	ایک گم شدہ قبیلے کا آخری فرد	محبوب حسین جگر نمبر	مارچ ص: ۸۸
اقبال متین	میرے جگر بھائی	محبوب حسین جگر نمبر	مارچ ص: ۲۴
اکبر رحمانی، پروفیسر	اشاریہ مکاتیبِ اقبال اور لمعہ حیدرآبادی		فروری ص: ۲۵
انور الدین۔ محمد، پروفیسر	۱۔ جدوجہدِ آزادی میں اردو صحافت کا حصہ		اگسٹ ص: ۲۵
	۲۔ اردو زبان اور سماجی سیاق (اردو میں لسانی مطالعے کی ایک نئی جہت)		اکتوبر ص: ۳۲
انور صدیقی	۱۔ منظروں کا مسافر		ستمبر ص: ۲۶
	۲۔ نئی شعری روایت		ستمبر ص: ۳۴
بیگ احساس، ڈاکٹر	جذبہ حب الوطنی اور اردو افسانہ		اگست ص: ۷
تہذیب یحییٰ فاروقی	تہنیت النساء بیگم تہنیت (مقدس آغوشِ محبت و عظیم گہوارہ تربیت)	تہنیت النساء بیگم زور نمبر	نومبر ص: ۴
جعفر نظام، پروفیسر	نواب سالار جنگ سوم (شخصیت اور کارنامے)		مئی، جون ص: ۱۴
جگر۔ محبوب حسین	۱۔ عابد علی خاں (نصف صدی کی مسلسل خدمات)	محبوب حسین جگر نمبر	مارچ ص: ۱۰۱

ہن لال نگم، ڈاکٹر	دکن کے اسلو اور اسلحہ سازی (ادارہ ادبیاتِ اردو کے خصوصی حوالے سے)	اپریل ص: ۳۶
یمہ تراب الحسن	انسان دوست محبوب حسین جگر	محبوب حسین جگر نمبر مارچ ص: ۵۰
صرت عالم۔ سید	۱۔ اردو ... انگریزی کی ایک جامع لغت	فروری ص: ۲۹
	۲۔ کچھ حرفِ روشن سے آگے	مئی و جون ص: ۳۷
قار حسین۔ سید د	مجھے گھر یاد آتا ہے	ستمبر ص: ۳۸
قار خلیل	محترمہ تہنیت زور کی نعتیہ شاعری	تہنیت النساء بیگم زور نمبر نومبر ص: ۳۱
شم سعید	محبوب حسین جگر	محبوب حسین جگر نمبر مارچ ص: ۱۱
سف سرمست، پروفیسر	اردو ناول اور جدوجہد آزادی	اگست ص: ۳
سف ناظم	۱۔ حیدرآباد کی محبوب شخصیت کو وداع	محبوب حسین جگر نمبر مارچ ص: ۲۲
	۲۔ تخاطب ... خامہ بگوش سے	مئی، جون ص: ۴۴

○○○ تعارف

ادارہ	۱۔ علی سردار جعفری	جنوری ص: ۳
	۲۔ روحی قادری	مئی، جون ص: ۲۴
امد بیگ، مرزا	آغا بابر	دسمبر ص: ۵۲
۔ حسین	پروفیسر عبدالستار دلوی ... ایک نظر میں	اکتوبر ص: ۲۴
ظہر مہدی	اوکتا ویو پاز	مئی، جون ص: ۱۷
نی تبسم	شمیم حنفی	ستمبر ص: ۱۹

○○○ آپ بیتی

تر حسن	یادوں کی سیر گاہ (چھٹی قسط)	جنوری ص: ۱۱
" "	یادوں کی سیر گاہ (ساتویں قسط)	فروری ص: ۲
" "	یادوں کی سیر گاہ (آٹھویں قسط)	مئی، جون ص: ۵
" "	یادوں کی سیر گاہ (نویں اور آخری قسط)	جولائی ص: ۳

○○ انٹرویو

رشیہ جبین	۱۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ سے شخصی انٹرویو	تہنیت النساء بیگم زور نمبر نومبر ص: ۲۶
" " "	۲۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید سے انٹرویو	تہنیت النساء بیگم زور نمبر نومبر ص: ۲۷
" " "	۳۔ سید امتیاز عطا اللہ خاں اور ثریا مہر سے شخصی انٹرویو	تہنیت النساء بیگم زور نمبر نومبر ص: ۳۰
مت کاظمی	شہریار سے بات چیت	اکتوبر ص: ۱۶

○○○ کتاب

لوئی ورما / ترجمہ: اسامہ فاروقی	غالب، شخصیت اور عہد	(پہلی قسط)	ستمبر ص: ۳
" "	" " " " " "	(دوسری قسط)	اکتوبر ص: ۳
" "	" " " " " "	(تیسری قسط)	دسمبر ص: ۳
یوسف میخائلوچ ارانسکی / ترجمہ: اسامہ فاروقی	حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان	(پہلی قسط)	اگست ص: ۲۵
" " " "	" " " " " " " "	(دوسری قسط)	ستمبر ص: ۵۲
" " " "	" " " " " " " "	(تیسری قسط)	اکتوبر ص: ۱۸
" " " "	" " " " " " " "	(چوتھی قسط)	دسمبر ص: ۲۳

○○○ ناول

غلام جیلانی	فریب زار	(پہلی قسط)	مئی، جون ص: ۱۰
" " "	" "	(دوسری قسط)	جولائی ص: ۲۸
" " "	" "	(تیسری قسط)	اگست ص: ۵۱
" " "	" "	(چوتھی قسط)	ستمبر ص: ۷۳
" " "	" "	(پانچویں قسط)	اکتوبر ص: ۹۶
" " "	" "	(چھٹی قسط)	دسمبر ص: ۷۹

○○○ افسانے

آغا بابر	۱۔ کبو		دسمبر ص: ۵۵
	۲۔ بڑے میاں سو بڑے میاں۔۔۔		دسمبر ص: ۶۱
افتخار نسیم	تابی		فروری ص: ۳۸
امراؤ طارق	صحراء میں اذاں		ستمبر ص: ۸۲
ترنم ریاض	مائیں		ستمبر ص: ۸۹
جگر۔ محبوب حسین	۱۔ اکیلی عورت	محبوب حسین جگر نمبر	مارچ ص: ۱۱۳
	۲۔ مت اشک بہاؤ	محبوب حسین جگر نمبر	مارچ ص: ۱۱۸
	۳۔ مہرومہ و انجم	محبوب حسین جگر نمبر	مارچ ص: ۱۲۱
خواہ مخواہ۔ اے یم احمد	دل کے رشتے		جولائی ص: ۳۸
رفیعہ منظورالامین	تیسری دنیا کی تلاش		جنوری ص: ۳۱
شبیہہ عباس جارچوی	اک بات جو کہنا تھی۔۔۔		جنوری ص: ۴۵
گلاب سنگھ کوہری / ترجمہ: جے این جگنو	کہرا		دسمبر ص: ۸۵

نگار سجاد ظہیر	سیف الملوک اور بدیع الجمال	دسمبر ص: ۸۵
نمیتا سنگھ / ترجمہ: قاسم ندیم	اسس کا خواب	اکتوبر ص: ۱۰۵

○○○ ڈرامہ

آغا بابر	فالتو چیزیں	دسمبر ص: ۶۸

○○○ خاکہ

نریندر لوتھر	۔۔۔ صاحب نظر بنے ہے	فروری ص: ۱۱

○○○ نظمیں

اسلم عمادی	۱۔ محبوب حسین جگر مرحوم کی یاد میں	محبوب حسین جگر نمبر مارچ ص: ۹۴
	۲۔ روشنائی	دسمبر ص: ۴۵
امتیاز الدین۔ سید	نذرِ محبوب حسین جگر	محبوب حسین جگر نمبر مارچ ص: ۹۳
اوکتا ویو پاز / ترجمہ: مظہر مہدی	۱۔ بھوت کا سایہ	مئی، جون ص: ۱۹
" " "	۲۔ سحر	" " "
" " "	۳۔ مطلع الفجر	" " "
" " "	۴۔ مشابہت	" " "
" " "	۵۔ وہ دوسرا تھا	" " "
" " " / ترجمہ: تبسم کاشمیری	۶۔ جھنڈ	" " " : ۲۰
" " " / " " " "	۷۔ پرارتھنا	" " " : ۲۱
" " " / " " " "	۸۔ شام	" " "
" " " / " " " "	۹۔ شجرِ ذات	" " " : ۲۲
" " " / " " " "	۱۰۔ ہر رات میں انبساط	" " " : ۲۳
بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر	سانٹ (شکتی	" " " : ۴۰
پنیزی نیپل جاری / ترجمہ: خالد سہیل	کنگرو	فروری ص: ۳۲
تہنیت، تہنیت النساء بیگم	نعت	جولائی ص: ۲۰
توصیف تبسم	نعت	جولائی ص: ۲۱
جامی وجودی	دکن کی شان تھے حضرت جگر صاحب	محبوب حسین جگر نمبر مارچ ص: ۹۶
جعفر جری	نعت	جولائی ص: ۲۱
جمشید مسرور	شہر پہ پھر وہ شبِ درد	اکتوبر ص: ۸۴

دلوی۔ عبدالستار، پروفیسر	بمبئی یونی ورسٹی کے تذر	اکتوبر ص: ۵۲
راشد آزر	۱۔ مدادا	جنوری ص: ۲۵
" "	۲۔ ایک حادثہ	" " "
" "	۳۔ بے تابی	اگست ص: ۴۷
" "	۴۔ خوابوں کا سودا	" " "
" "	۵۔ کل	دسمبر ص: ۳۶
" "	۶۔ جستجو	" " : "
روشن ۰ آر۔ کے	۱۔ انتقام	" " : ۴۳
" " "	۲۔ مسخ منظر	" " "
" " "	۳۔ صراطِ مستقیم	" " "
زہرہ نگاہ	چلو اس کوہ پر۔۔۔	جنوری ص: ۳۴
شاہد کلیم	میراث	دسمبر ص: ۴۷
شاہین	۱۔ ہم اپنا جسم واپس مانگتے ہیں	اکتوبر ص: ۸۲
" "	۲۔ پہلا تاج محل	" " "
" "	۳۔ دعا	" " : ۸۳
شہریار	۱۔ ایک نظم	اکتوبر ص: ۸۱
" "	۲۔ پہلی شرط	" " "
صدیقی۔ صفدر حسین	نعت	جولائی ص: ۲۰
عزیز الرحمن	۱۔ مضطرب	اکتوبر ص: ۸۵
	۲۔ ضرورت	" " "
عزیز بگھروی	نعت	جولائی ص: ۱۹
عطیہ ارسلان	۱۔ تنہائی	ستمبر ص: ۶۵
" " "	۲۔ دعا	" " "
" " "	۳۔ چار نظمیں	ستمبر ص: ۶۶
علی سردار جعفری	۱۔ پتھر کی دیوار	جنوری ص: ۵
	۲۔ فریب	جنوری ص: ۷
	۳۔ ایک خواب اور	جنوری ص: ۹
	۴۔ آبلہ پا	جنوری ص: ۱۰

علی ظہیر	ایک نظم جو کمزور دل قاریوں کے لیے نہیں ہے	ستمبر ص: ۹۳
فہیم ایس۔ اے	ایک نظم	دسمبر ص: ۳۲
قلی قطب شاہ۔ محمد	کلام محمد قلی قطب شاہ	اپریل ص: ۲۶
قمر ساحری	محبوب حسین جگر	محبوب حسین جگر نمبر مارچ ص: ۹۹
کاوش عباسی	۱۔ ستم بھی سنے	مئی، جون ص: ۶۸
" "	۲۔ سلاخیں	" " "
" "	۳۔ ہم تو مرتے رہے	دسمبر ص: ۳۱
مجیدہ موسوی	آہ!! جگر مرحوم	محبوب حسین جگر نمبر مارچ ص: ۹۲
مصحف اقبال توصیفی	۱۔ نعت	مئی، جون ص: ۵۹
" " " "	۲۔ تیری آنکھیں	اکتوبر ص: ۸۱
مظہر مہدی	۱۔ آخری نظم	مئی، جون ص: ۶۹
" "	۲۔ اے میری روح	" " "
" "	۳۔ دوست کے دشمن کے لیے ایک نظم	دسمبر ص: ۴۴
" "	۴۔ مہاجر	دسمبر ص: ۴۵
مناظر عاشق ہرگانوی	انیسویں صدی کی ایک نظم	دسمبر ص: ۴۷
میر ہاشم	الزام نہ دو	دسمبر ص: ۴۳
میری ڈورو / ترجمہ: خالد سہیل	ایک نظم	فروری ص: ۳۲
وزلاواشم بورسکا / ترجمہ: کاوش عباسی	میں اس سے بے حد قریب ہوں	جنوری ص: ۳۶
وقار خلیل	۱۔ بہ یاد محبوب حسین جگر	محبوب حسین جگر نمبر مارچ ص: ۹۵
	۲۔ تین یخ بستہ نظمیں	مئی، جون ص: ۶۰

○○○ غزلیں

اسعد بدایونی	۱۔ جلے چراغ بھلا کیسے تا سحر کوئی	جولائی ص: ۲۲
	۲۔ تمی کبھی اپنی جگہ مسندِ شاہی کے قریب	" " "
	۳۔ جب آسمان اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے	" " : ۲۳
	۴۔ چمک رہا ہے مرا سر بھی، میں بھی، دنیا بھی	" " "
	۵۔ زمیں کے جسم پہ عیار گھر اٹھاتے ہیں	ستمبر ص: ۶۰
	۶۔ سیاہ رات سے ہم روشنی بناتے ہیں	" " "
اسلم عمادی	گہری شب میں یوں کس حد تک سوچا جائے	دسمبر ص: ۵۱

اقبال متین	۱۔ جانے والے تو بھلا کس کے نگر جائے گا	ستمبر ص: ۶۹
	۲۔ ذہن و دل بے سروساماں تھے جدھر سے گزرے	مئی و جون ص: ۶۵
بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر	زندگی مایا جال ہے اے دوست	" " : ۶۵
تلخ۔ من موہن	۱۔ ہر مشکل رفتہ رفتہ انجان ہو گئی	ستمبر ص: ۶۸
	۲۔ یہ اب انتہائے جنون ہے یا کوئی اور سطح شعور ہے	" " "
جگر۔ محبوب حسین	مجھے وہ دیکھتے ہی مسکرائے	محبوب حسین جگر نمبر مارچ ص: ۱۲۵
جمال اویسی	۱۔ زندگی دور تک ایسی جائے	مئی و جون ص: ۶۳
	۲۔ زندگی سے مرا رشتہ کیا ہے	" " " "
	۳۔ دور تک آنکھ بچھائی میں نے	" " " "
جمشید مسرور	۱۔ تنہا ہر ایک رہ سے گزر جانا چاہیے	جولائی ص: ۲۳
	۲۔ فریاد کا اک حرف سنائی نہیں دیتا	اگست ص: ۴۹
	۳۔ داغِ شکست و نکہت تقدیر دیکھنا	اکتوبر ص: ۸۹
	۴۔ صبر کرتے تو لبِ یار کو وا ہونا تھا	" "
حبیب اجملی	۱۔ دل خدا کا گھر بھی ہے اصنام کا مندر بھی ہے	جولائی ص: ۲۶
	۲۔ نہ رنگ ہے نہ خوش بو نہ وہ گل تازہ	اکتوبر ص: ۹۵
خالد عبادی	یہ کھڑکی اب کھلی تو اور ہی منظر نظر آیا	اگست ص: ۵۰
خواہ مخواہ۔ اے، یم احمد	جو خبر دلوں کو دکھا گئی، وہ یہاں کی تھی نہ وہاں کی تھی	جولائی ص: ۲۷
راشد آذر	۱۔ جھک نہ سکے جو سر کبھی، دوش پہ بار ہو گئے	اگست ص: ۴۸
	۲۔ وہی تعلقِ خاطر جو برق و باد میں ہے	دسمبر ص: ۵۰
روحی قادری	○ انتخابِ کلام	
" " "	۱۔ سورج تھے، چاند تھے نہ چراغِ سخن تھے ہم	مئی و جون ص: ۴۱
" " "	۲۔ قسمت کے ہیں مارے لوگ	" "
" " "	۳۔ روحیں پیاسی ہیں ذہن بھوکے ہیں	" "
" " "	۴۔ پڑھ ہوں میں، مجھ کو کیا لے جائے گی	" "
" " "	۵۔ کس کے حصے میں آئی ہے ایسی بڑی تقصیر میاں	" "
" " "	۶۔ باتیں واتیں سب بے معنی لکھنا وِکھنا سب بے کار	" "
" " "	۷۔ جنوں اور میرے سر میں؟ پھر محبت کا جنوں وہ بھی!	" "
" " "	۸۔ اس طرح آج مجھ سے نظریں ملا رہے ہیں	" "

حی قادری	۹۔ دل کی آہوں سے داغ جلتے ہیں	مئی و جون ص: ۴۳
	۱۰۔ اشعار	" " "
میں۔ رئیس الدین	۱۔ سروں سے گرد سفر ہم جو صاف کرتے ہیں	جنوری ص: ۳۹
" " "	۲۔ پہلے دل سے آنکھوں تک تھا منظر ریگستانی کیوں	ستمبر ص: ۴۲
ر شفائی	کیسے کیسے ان دیکھے منظر گم اپنی ذات میں ہیں	مئی و جون ص: ۶۶
مر شوی	جو تیری یادوں میں گزری زندگی اچھی لگی	اگست ص: ۳۸
سید۔ سید انور	فلک پر جگمگاتا اک ستارا دیکھتا ہوں	جنوری ص: ۳۹
د۔ چندر پرکاش	فلک نشان نقش ہیں کہ اب ٹوٹتے بہت ہیں	اکتوبر ص: ۹۰
داب رضی	۱۔ آپ نے سب کو ایک طرف سے اپنے غضب میں رکھا	فروری ص: ۳۷
" "	۲۔ آپ نے سب کو ایک طرف سے اپنے غضب میں رکھا	مئی و جون ص: ۶۲
" "	۳۔ یہ دنیا ایک تازہ کربلا ہے	اکتوبر ص: ۹۱
" "	۴۔ منظر پس منظر میں ڈھلتے جائیں گے	" " "
ہین	۱۔ دل کو عجب بیماری ہو گئی	اکتوبر ص: ۸۸
"	۲۔ جلوے کا سرِ طور تقاضا نہیں کرتے	" " "
"	۳۔ گھر سی ویراں ہوا پھر بھی گل افشانی کرے	دسمبر ص: ۳۸
سر رسول۔ ڈاکٹر	واقعوں کو بھول دامن سے ہوا کرتے رہے	مئی و جون ص: ۶۶
لیل اعظمی	۱۔ فلک پہ رہتا تھا لیکن زمیں پہ ملتا تھا	ستمبر ص: ۴۱
	۲۔ تمام عمر جنوں کا ہدف بنے ہم لوگ	" " "
	۳۔ انا کی پشت پہ خود کو سوار رہنے دیا	اکتوبر ص: ۹۲
	۴۔ سنگ، دست ہنر سے نکلا تھا	" " "
ق۔ رضی اختر	۱۔ تھا مری جست پہ دریا بڑی حیرانی میں	ستمبر ص: ۶۲
شہریار	تجھ کو کھو کر کیوں یہ لگتا ہے کہ کچھ کھویا نہیں	اکتوبر ص: ۸۶
لب۔ مرزا / ترجمہ، مضطر مجاز	۱۔ گر نہ نوا سرودہ چہ غم است / نہیں ہوتا نوا کا مجھ کو سود، تو برا کیا تھا	مئی، جون ص: ۵۵
" " " "	۲۔ در پردہ شکایت زتو داریم و بیان نیچ / در پردہ گلہ تجھ سے ہے مجھ کو یہ بیاں نیچ	" " "
" " " "	۳۔ چوں زبان بالا و جاں ہا پر زغوغا کردہ ای / گنگ کر ڈالی زباں، جاں میں بپا غوغا کیا	" "
" " " "	۴۔ تا فصلے از حقیقت اشیا نوشتہ ایم / جب تم نے باب ہستی اشیا رقم کیا	ستمبر ص: ۱۶
" " " "	۵۔ رفتم کہ کہنگی ز تماشا برافگنم / سوچا ہے کہنگی کا مداوا کوئی کروں	" " "
" " " "	۶۔ بہ وادی کہ درآں خضر را عصا خفت است / راہ وہ جس میں عصا بھی خضر کا خوابیدہ ہے	" " "

ب ۔ مرزا / ترجمہ : مضطر مجاز	۷ ۔ دل برد وحق آنست کہ دل بر نہ تواں گفت /	
	دل لے اڑے لیکن اسے دل بر نہ کہا جائے	اکتوبر ص : ۱۴
" " " "	۸ ۔ بہ شغل انتظار مہ و شاں در خلوت شب ہا /	
	ہے شغلِ انتظار مہ و شان اور خلوت شب ہے	" " "
" " " "	۹ ۔ گر نہ نوا با سرودمے چہ اسی / نہیں ہوتا نوا کا مجھ کو سودا تو برا کیا تھا	" " "
زاحمد قاضی	۱ ۔ اس کی چوکھٹ پہ نہ جا اور کسی در ہی پہ رک	اکتوبر ص : ۹۲
	۲ ۔ تیرا ستم بھی مجھے خوش خیال کردے گا	" " "
م ۔ الیس ۔ اے	۱ ۔ سرِ سڑگاں نہ اگر جلتے ستاروں کے چراغ	جولائی ص : ۲۶
	۲ ۔ اندازہ ، امروز ہے ، اندیشہ ، فردا میں گم	اگست ص : ۵۰
	۳ ۔ کھلا کھلا سا بدن رنگ و روشنی کی طرح	اکتوبر ص : ۹۵
	۴ ۔ ہم ان کی بزم میں ناحق بہ راہ سادگی آئے	دسمبر ص : ۵۲
۔ اخلاق	کیا جانیے کیوں چھوڑ کے صحرا نہیں آیا	مئی و جون ص : ۶۲
سن بھوپالی	۱ ۔ زمین شاداب کرتا جارہا ہوں	اکتوبر ص : ۸۷
	۲ ۔ کرلیا طے یوں تو مریخ و قمر کا فاصلہ	" " "
	۳ ۔ ہم سخن اور ہی سفر میں ہیں	دسمبر ص : ۵۰
سعود سراج	ریاض کرتا رہا گرچہ عمر بھر کوئی	اکتوبر ص : ۹۴
سعود ۔ مسعود صدیقی	۱ ۔ ہیں حجابات حسنِ کامل کے	جنوری ص : ۳۰
	۲ ۔ نگاہ ناز میں نیرنگِ مرگِ ناگہانی ہے	مئی و جون ص : ۶۴
	۳ ۔ ان کو جفا پہ ہم کو وفا پر غرور تھا	جولائی ص : ۲۵
	۴ ۔ کس کام کی نگاہ جو زخمی جگر نہیں	ستمبر ص : ۷۲
	۵ ۔ تو ہی تو دنیائے الفت کی ہر اک منزل میں ہے	اکتوبر ص : ۹۴
	۶ ۔ ہر ناز کو اسے ہمتِ مردانہ اٹھالے	دسمبر ص : ۵۱
مشیر صدیقی	۱ ۔ یہ جھوٹ ہے اک وقت بھی ایسا نہیں آیا	فروری ص : ۳۷
	۲ ۔ کل تیرگی شب میں کوئی خواب تھا روشن	" " "
مصحف اقبال توصیفی	۱ ۔ ہم تھے کسی کا دھیان تھا ، وہ بھی نہیں رہا	جنوری ص : ۳۸
	۲ ۔ آسمانوں میں سدا گھوما کریں	مئی و جون ص : ۴۰
مصحفؔ اقبال توصیفی	۳ ۔ اپنے غم کی حد میں رہنا ، کیوں اس سے بے کار ملیں	دسمبر ص : ۴۸
مصطفیٰ شہاب	۱ ۔ کوئی آنسو بھی کاغذی نہ ہوا	جنوری ص : ۳۰

○○ قطعات

○○ اشاریہ

○○ اداریے

○○○ مطالعے

○○○ تبصرے

(باقی ص : ۹۳ پر)

رپورٹ

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

(اپریل تا جون ۱۹۹۹ء)

انفارمیشن ٹکنالوجی اور اردو : اردو کے ہمہ جہتی فروغ اور بین الاقوامی سطح پر ترویج کے لیے قومی اردو کونسل نے کمپیوٹر ٹکنالوجی سے وابستگی کو اپنی ترجیحات میں شامل کیا ہے کیوں کہ آج کے دور میں جو زبان کمپیوٹر سے وابستہ نہیں اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ اس سلسلے میں کونسل نے پونے کے Centre for Development of advanced Computing کے ساتھ اشتراک کر کے اردو سافٹ ویئر، معیاری کمپیوٹر فانٹس، مشین ٹرانسلیشن وغیرہ کی سہولتیں اردو میں بھی فراہم کرانے کے لیے وسیع پیمانے پر کام شروع کیا ہے تاکہ اردو بھی بین الاقوامی سطح پر کمپیوٹر ٹکنالوجی میں دنیا کی بڑی زبانوں کے ہم پلہ بن جائے اور اردو عوام انفارمیشن ٹکنالوجی کے جدید ترین دور میں داخل ہوجائیں۔ اس سلسلے میں ۳۰/ اپریل کو ایک میٹنگ کا انعقاد CDAC کے دفتر میں کیا گیا جس کا مقصد اردو کی ترویج میں ٹکنالوجی اور ٹکنالوجیکل مصنوعات (Products) کے فروغ کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

نیشنل لیول مانیٹرنگ کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ، CDAC کے ایگزیکٹیو ڈائرکٹر مسٹر آر۔ کے۔ اروڑا، CILL میسور کے ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر دی۔ گیان سندرم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ماہرین لسانیات ڈاکٹر اے۔ آر فتیحی اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، CDAC, GIST کے جناب انوپم سوربھ اور جناب ایس۔ کے موفتی، کمپیوٹر کارپوریشن حیدرآباد کے ڈائرکٹر جناب اشہر فرحان، روزنامہ ہندستان، بمبئی کے مدیر جناب سرفراز آرزو اور لینگویج ایکسپرٹ جناب انیس چشتی نے شرکت کی۔ میٹنگ میں یہ طے کیا گیا کہ 2000-1999 کے دوران کونسل CDAC کے اشتراک سے درج ذیل مقاصد کا حصول متعین کرے۔

۱ اردو سافٹ ویئر اور نستعلیق کے مشترکہ encoding standards۔

۲ اردو / ہندی کا پبلشنگ سافٹ ویئر۔

۳ اردو / ہندی خود کار ترجمہ۔

۴ اسپیل چیکر (Spell Checker)۔

میٹنگ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب "املا نامہ" کے ترمیم شدہ ایڈیشن کو اردو کے معیاری متن کے طور پر بنیاد بنایا جائے اور اردو کے ساتھ عربی فارسی کے تمام حروف بھی مکمل طور پر اردو سافٹ کا حصہ بنیں۔

مشین ٹرانسلیشن اور اسپیل چیکر میں استعمال کے لیے اردو Word corpus تیار کیا جارہا ہے۔ اس میں وہ مجموعی الفاظ بھی شامل کیے جارہے ہیں جو اردو سافٹ ویئر کی تیاری کے مقصد سے پہلے ہی تیار کیے جا چکے ہیں۔ ان کو ترمیم و اضافے کے ساتھ کمپیوٹر سافٹ ویئر کا حصہ بنایا جائے گا۔

کمپیوٹر مانیٹرنگ کمیٹی کی میٹنگ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کی طرف سے بادہ مولہ، سری نگر اور

اور اننت ناگ میں تین کمپیوٹر سینٹر قائم کیے گئے ہیں جن میں ایک سال کے لیے Diploma Computer Applications and DTP Urdu کی ٹریننگ دی جارہی ہے۔ ان سینٹروں میں دی جانے والی تعلیم کے معیار کو متعین کرنے کے لیے مونیٹرنگ کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر ایم۔ وانی۔ قادری وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی نے فرمائی۔ اس میٹنگ میں کمپیوٹر سینٹروں کے منتظمین اور فیکلٹی ممبران کے علاوہ ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل، پروفیسر وانی، ڈین الیکٹرانکس REC سرینگر اور پروفیسر مشتاق احمد، ڈائرکٹر کمپیوٹر سائنس۔ کشمیر یونیورسٹی اور ڈاکٹر محمد زمان آزردہ نے شرکت کی۔

بحث کی ابتدا کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے کہا کہ آج کے دور میں جو زبان کمپیوٹر کو قبول نہیں اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ آج کے Technological دور کے تناظر میں کمپیوٹر کا استعمال فروغِ اردو کی بنیادی شرط ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم عصر سائنس اور ٹکنالوجی پر مبنی علوم کو اردو میں منتقل کرنا ضروری ہے اور اس ضمن میں Information Technology کو اردو میں مہیا کرانا کونسل کے مقاصد میں شامل ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ چوں کہ ہمارے تمام اسکول اردو میڈیم سے تعلیم دے رہے ہیں اس لیے جدید تعلیمی Input میڈیم میں مہیا کرنا از حد ضروری ہے تاکہ اردو میڈیم کا استحکام ممکن ہوسکے۔ اس سلسلے میں اچھی نصابی کتابیں اور اساتذہ کی تربیت کے نظام کو ایک نئے انداز سے استوار کیا جارہا ہے۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ قومی اردو کونسل ریاست جموں و کشمیر سے ان معاملات میں تعاون کررہی ہے اور تمام اردو میڈیم اسکولوں میں کمپیوٹر تعلیم کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔ پہلے مرحلے میں پچاس سیکنڈری اسکولوں کی نشان دہی کی جائے گی جن میں یہ کورس شروع کیا جائے گا۔

پروفیسر قادری، وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی نے قومی اردو کونسل کے ان اقدام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ کونسل مجوزہ اقدام اردو تعلیم میں نئے انقلاب کے نقیب ثابت ہورہے ہیں جس سے ملک بھر میں فروغِ اردو کا تناظر بدل گیا ہے۔

مونیٹرنگ کمیٹی کے ممبران نے سینٹروں کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا۔ ان سینٹروں میں اردو ڈی۔ ٹی۔ پی کے علاوہ تمام دیگر انگریزی سافٹ ویر کی ٹریننگ دی جارہی ہے۔ میٹنگ میں اس بات پر خوشی کا اظہار کیا گیا کہ قومی کونسل نے کمپیوٹر تعلیم کو عوام کی نچلی سطح پر پہنچا کے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

کمپیوٹر مراکز کا افتتاح : گزشتہ سال قومی اردو کونسل نے ہندستان بھر کی مختلف ریاستوں میں ۳۲ کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر قائم کیے تھے۔ سالِ رواں میں مزید ۱۸ مراکز کو منظوری دینے کا منصوبہ ہے۔ یہ مراکز اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ یا اردو جاننے والے طلبہ کو ایک سالہ Diploma in Computer Application & Desk Top Publishing (Urdu) کی ٹریننگ دیں گے تاکہ اردو میڈیم کے طلبہ بھی انفارمیشن ٹکنالوجی کا حصہ بن سکیں اور جدید عصری تقاضوں کے مطابق اپنی روزی روٹی مہیا کرسکیں۔

۱۴/ اپریل کو انجمن ترقی اردو کامپلکس، گل برگہ میں کمپیوٹر سینٹر کے افتتاح کی رسم اقلیتی کمیشن، کرناٹک کے صدر جناب قمرالاسلام کے ہاتھوں انجام پائی۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کے اقدام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ کمپیوٹر ایجوکیشن اور سائنسی تقاضوں کے ذریعے اردو زبان نہایت تزک و احتشام سے اکیسویں صدی میں داخل ہوگی۔ جناب قمر محمود منہار، رکن اسمبلی گل برگہ نے تقریب کی صدارت کی اور قومی کونسل کی رکن کی حیثیت سے محترمہ جیلانی بانو اور پروفیسر لئیق صلاح نے شرکت کی۔ دیگر شرکا میں صدر انجمن ترقی اردو، گل برگہ جناب سید مجیب الرحمان، جناب وہاب عندلیب، محترمہ کوثر پروین، جناب امجد جاوید، مسز عالم شاہ پوری اور خواجہ پاشاہ انعام دار وغیرہ شامل تھے۔

گوا کی انجمن توحید المسلمین جدید اردو ہائی اسکول چمپیل میں جدید کمپیوٹر اکیڈمی کے افتتاح کی رسم ۱۹ / اپریل ۱۹۹۹ء کو گوا
ن ساز اسمبلی کے اسپیکر جناب توماذن کاردوز کے ذریعے ادا کی گئی۔ گوا فینانس سکریٹری، جناب ووڈیک رائے کی صدارت میں منعقد
نے والے اس جلسے میں محترمہ وکٹوریہ فرنانڈیز، سابق وزیر زراعت، جناب پرکاش ویلپ، سابق وزیر تعلیم، حکومت گوا، ڈاکٹر محمد
ید اللہ بھٹ، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل، مسز انکتا اگروال، مینجنگ ڈائرکٹر، کمپیوٹر کلنک اور جناب راجیو راٹھی نے شرکت کی۔

چنئی میں مرتضادیہ ایجوکیشنل اینڈ کلچرل فاؤنڈیشن آف ساؤتھ انڈیا کے زیر اہتمام Diploma in Computer
Application and DTP (Urdu کی شروعات کی گئی ہے۔ اس مرکز کے افتتاح کی رسم ۱۸ مئی ۱۹۹۹ء کو تمل ناڈو کے وزیر تعلیم
ب کے۔ امبزھگن کے ذریعے انجام پائی اور سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس ایس۔ موہن نے صدارت کے فرائض ادا کیے۔ نواب
عبدالعلی، پرنس آف آرکاٹ اور جناب ایس۔ اے۔ ایس۔ رضوی، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی اردو کونسل نے بہ حیثیت
ان خصوصی اس جلسے میں شرکت کی۔

کونسل نے ۱۹۹۸ تا ۱۹۹۹ کے مالی سال میں ہندستان بھر کی بارہ ریاستوں میں ۳۲ کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر قائم کیے ہیں جن میں سے
ع آندھرا پردیش میں، پانچ دلی میں، چار اتر پردیش میں، چار کشمیر میں، چار مہاراشٹرا میں، تین کرناٹک میں، دو بہار میں ہیں اور
یہ پردیش، ویسٹ بنگال، کیرلا، تمل ناڈو اور گوا میں ایک ایک مرکز قائم کیا گیا ہے۔

دو ٹیچرز کے لیے اورینٹیشن کورس : اردو میڈیم تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے نصاب کی فراہمی، معاون کتب،
ٹریننگ وغیرہ کے معقول انتظامات کے علاوہ وقفے وقفے سے ٹیچرز کے اورینٹیشن کورسز کا انعقاد بے حد ضروری ہے۔ اس قسم کے کورس کو
روغ کرنے کے لیے ایک جامع منصوبہ متعین کرنا ہوگا۔ قومی اردو کونسل نے اساتذہ کے لیے اورینٹیشن کورس CIIL میسور کے
راک سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک میٹنگ کونسل کے دفتر میں منعقد کی گئی جس میں CIIL کے ڈپٹی
رکٹر ڈاکٹر وی۔ گیان سندرم، UTRC، سولن کے ڈاکٹر ایس جمال محمد خاں، NRLC، پٹیالہ کے ڈاکٹر نذیر حسین، NCERT
دلی کے ڈاکٹر محمد صابرین، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ڈاکٹر زبیدہ حبیب اور ڈاکٹر اصرار حسین نے اپنے اداروں کے نمائندگان کے طور پر
کت کی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے کہا کہ اردو میڈیم تعلیم کی کامیابی کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ اردو اساتذہ کی تربیت کا جامع
سوبہ اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ہندستانی Ethos کے ساتھ اردو ذریعہ تعلیم ایک کامیاب میڈیم کے طور پر ابھرے۔ انھوں نے
یز رکھی کہ قومی اردو کونسل، این سی ای، جامعہ ملیہ اسلامیہ، سی آئی آئی ایل، میسور اور اس کے علاقائی مراکز کو باہمی اشتراک سے اردو
فروغ کے لیے کام کرنا چاہیے۔ میٹنگ میں طے کیا گیا کہ اردو میڈیم ٹیچرز کے لیے ایک جامع پروگرام ترتیب دیا جائے جس کے نفاذ کا
CIIL کے ریسرچ سینٹرز کریں۔ اس پروگرام کو مکمل طور پر قومی اردو کونسل کی مالی معاونت حاصل ہوگی۔ ٹریننگ دینے کا کام مذکورہ
اداروں کے مختلف مضامین کے ماہرین انجام دیں گے۔ ابتدا تجربے کے طور پر ۲۵ تا ۳۰ ٹیچرز کو ٹریننگ دی جائے گی۔ آندھرا پردیش
اساتذہ کو ٹیچرز ٹریننگ دینے کے لیے دسمبر ۹۹ء میں حیدرآباد میں ڈاکٹر محمد صابرین کے کوآرڈی نیشن سے تربیتی مرکز کا قیام ہوگا۔
اراشٹرا کے ٹیچرز کی ٹریننگ پونے میں جنوری ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر ایس جمال محمد خاں کے زیر نگرانی ہوگی۔ کرناٹک کے ٹیچرز کی ٹریننگ بیل
میں اور کیرل کے ٹیچرز کی ٹریننگ کالی کٹ میں ڈاکٹر ایم۔ کے۔ کول (UTRC، لکھنو) اور ڈاکٹر نذیر حسن (NRLC پٹیالہ
کے زیر نگرانی عمل میں آئے گی۔ اس پروگرام کے خاتمے پر نتائج کی روشنی میں قومی اردو کونسل ٹیچرز کے لیے ایک گائیڈ تیار کرے گی۔

جس سے مختلف مضامین کے ٹیچر مدد حاصل کریں گے۔ سبھی مراکز پر یہ پروگرام پندرہ دن کے لیے منعقد کیا جائے گا جس میں اورینٹیشن کورس (Orientation Course) اور پانچ دن ورک شاپ کے لیے مختص ہوں گے۔

اردو میں فاصلاتی کورسس، پر ورک شاپ : قومی اردو کونسل اردو میں فاصلاتی کورس کی شروعات اکتو
سے کرنا چاہتی ہے۔ یہ کورس ہندی اور انگریزی میڈیم سے اردو سیکھنے کے خواہاں لوگوں کے لیے شروع کیا جارہا ہے۔ نصاب
اور لائحہ عمل طے کرنے کے لیے کونسل نے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجیس (CIIL) میسور سے اشتراک کیا۔
سلسلے کا ایک ورک شاپ ۲۱، ۲۲ جون ۹۹ء کے درمیان کسولی (ہماچل پردیش) میں منعقد کیا گیا جس میں CIIL میسور
ڈائرکٹر پروفیسر او۔ این۔ کول، NRLC پٹیالہ کے ڈاکٹر آر۔ کے بھٹ، ڈاکٹر نذیر حسن اور ڈاکٹر ایس۔ ایچ۔ زیدی،
سولن کے ڈاکٹر ایس۔ جمال محمد اور ڈاکٹر ضیا الرحمان صدیقی، UTRLC لکھنو کی ڈاکٹر ایم۔ کے۔ سلطانہ اور قومی ک
اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب شرف الدین صدیقی نے شرکت کی۔

ورک شاپ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اس ورک شاپ کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور زور دیا کہ آئندہ IL
تینوں اہم مراکز کو (پٹیالہ کا NRLC، سولن کا UTRC اور لکھنو کا UTRLC) تعلیمی معاملات میں کونسل کے سا
روابط استوار کر کے فاصلاتی تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرنا چاہیے۔ ورک شاپ میں طے کیا گیا کہ ہندی کے ذریعے اردو سکو
سرٹیفیکٹ کورس کا اہتمام UTRC لکھنو کرے اور انگریزی کے ذریعے اردو کے سرٹیفیکٹ کورس کی ذمے داری LC
سنبھالے۔ اسی طرح اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے نصاب کی تیاری کا کام UTRC سولن کرے گا۔

ان امور پر لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے علاوہ ورک شاپ میں ملک بھر کے مدرسوں اور اردو میڈیم اسکولوں میں سائنس
علوم پر مبنی نصاب کے لیے تربیتی کورس کے سلسلے میں منصوبہ تیار کیا گیا جس میں مناسب ٹریننگ مواد کی بروقت تیاری پر زور دیا گ
ورک شاپ کے دوران اردو رسم خط اور متن کے تعلق سے تقریباً ۲۰ سبق تیار کیے گئے جو ایڈیٹنگ کے بعد اگ
اشاعت کے لیے تیار کر دیے جائیں گے۔

طب یونانی کی نصابی کا اکیڈیمک آڈٹ : طلبہ کو اہم موضوعات پر معیاری نصابی کتابوں کی فراہمی کے لیے
کونسل نے پیش رفت کی ہے اور ان کی اشاعت کو اپنی پالیسی کا حصہ بنایا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف مضامین اور plines
کتب کی تیاری کے لیے مختلف کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں۔ ان کمیٹیوں کا کام نہ صرف نئی نصابی کتب کی اشاعت کو یقینی بنا
پہلے سے موجود کتب کا اکیڈیمک آڈٹ کرنا بھی ان کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ہماری نصابی کتابوں میں
خامیاں ہیں۔ نئی ضرورتوں کے تحت نئے اسباق کی شمولیت، غیر ضروری مواد کا انخلا اور معیاری اور آسان زبان میں منضبط
تشکیل ضروری ہے۔ اس طرح نصابی کتب کو معیاری بنانے کے لیے ان کمیٹیوں کے تحت ان کا اکیڈیمک آڈٹ شروع کیا گیا
طب یونانی کی نصابی کتابوں کے آڈٹ کے لیے بنائی گئی کمیٹی کی ایک میٹنگ ۶ مئی ۱۹۹۹ء کو قومی اردو کونسل کے
منعقد کی گئی۔ پروفیسر ابوبکر خاں، صدر شعبہ معالجات، طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہونے والی ا
میں پروفیسر اقبال احمد قاسمی، شعبہ علم الادویہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، حکیم مشکور احمد، ڈپارٹمنٹ آف ہائجین، جامعہ ہمدرد
حکیم غلام مہدی اور حکیم وسیم احمد اعظمی، مرکزی کونسل برائے تحقیقات طب یونانی، نئی دلی اور حکیم حافظ حبیب الرحمان

بہ حیثیت ممبر اور ڈاکٹر ایس۔ اے۔ ایس رضوی، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی اردو کونسل نے کنوینر کے طور پر شرکت کی۔

اس کمیٹی نے یہ طے کیا کہ کونسل کے ذریعے شائع شدہ یونانی طب کی درجِ ذیل کتابوں کا اکیڈمک آڈٹ ماہرین سے کرایا جائے۔

۱ امراض النساء / حکیم کے۔ اے۔ ایس۔ اعظمی

۲ نسائیات / حکیم ایس۔ این۔ اے۔ رضوی

۳ قبالیات / ایم۔ اے۔ رضوی

۴ امراض الاطفال / حکیم کے۔ اے ایس۔ اعظمی

۵ معالجات (۴ جلدیں)

۶ الامراض / ڈاکٹر ایس۔ اے۔ آر۔ زیدی

کمیٹی نے یہ بھی طے کیا کہ حکیم بو علی سینا کی کتاب "القانون فی الطب" جدول اور آسان اردو ترجمہ مرکزی کونسل برائے تحقیقاتِ طب یونانی، نئی دلی کے حکیم غلام مہدی کریں جس کے لئے وہ القانون کے کشوری کے ترجمے کو بنیاد بنائیں۔

ماہرین نے پرائیویٹ اداروں کے ذریعے شائع کی جانے والی طب کی کتابوں کا بھی جائزہ لیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان میں بہت سی کتابیں کم معیاری اور اغلاط سے پُر ہیں۔ اس لیے یہ طے کیا گیا کہ ۱۵ جولائی سے دو روزہ ورک شاپ کا انعقاد کیا جائے جس میں طب یونانی کے نصاب کا تفصیلی سلابس تیار کیا جائے اور اس کے اسباق / موضوعات کی تقسیم بھی واضح طور پر کی جائے۔

اردو انگریزی طبی لغت پر ورک شاپ : اردو میں طبی اصطلاحات خاصی بڑی تعداد میں رائج ہیں جن کے بارے میں کونسل یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ انگریزی متبادل اصطلاحات کے ساتھ ایک جامع لغت کی صورت میں منظرِ عام پر آئیں۔ اس طرح طب کے وہ طلبہ ان سے استفادہ کرسکیں گے جو جدید نصاب سے علمِ طب حاصل کرتے ہیں۔ اردو میں علمِ طب کی کتابوں کے نادر ذخیرے کے مطالعے اور اس کی فہم کے لیے بھی طبی لغت کی اشاعت ناگزیر ہے۔ اس زاویے کے پیشِ نظر ہی قومی اردو کونسل نے اردو انگریزی طبی لغت کی اشاعت کا فیصلہ کیا جس کی ترتیب کا کام حکیم عزیز الرحمان کر رہے ہیں۔

اس سلسلے میں قومی اردو کونسل میں چار روزہ ورک شاپ کا انعقاد ۱۲ تا ۱۶ مئی کے درمیان کیا گیا۔ پروفیسر ابوبکر خاں، صدر شعبہ، معالجات، طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بہ حیثیت چیئرمین اور پروفیسر عبدالجبار، آیورویدک یونانی طبیہ کالج، نئی دلی، پروفیسر اقبال احمد قاسمی، شعبہ، علم الادویہ، طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، حکیم مشکور احمد، ڈیپارٹمنٹ آف ہائجین، جامعہ ہمدرد، نئی دلی نے ممبران کی حیثیت سے شرکت کی۔

اس ورک شاپ میں ۱۵۰۰ طبی اصطلاحات کو بحث و مباحثے کے بعد لغت میں شامل کرنے کے لیے منتخب کیا گیا۔

اس سلسلے کا دوسرا ورک شاپ پروفیسر ابوبکر خاں صدر شعبہ، معالجات، طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صدارت میں ۶ تا ۹ جون ۱۹۹۹ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقد کیا گیا۔ علی گڑھ میں یہ ورک شاپ اس لیے منعقد کیا گیا تاکہ لغت کی ترتیب میں مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ نادر لغات سے استفادہ کیا جاسکے۔ پروفیسر کمال الدین ہمدانی، علی گڑھ، پروفیسر عبدالجبار آیورویدک یونانی طبیہ کالج، دلی، پروفیسر شجیع حید منگلور، پروفیسر احمد قاسمی، طبیہ کالج، علی گڑھ، حکیم مشکور احمد، دلی اور حکیم غلام مہدی، نئی دلی نے ورک شاپ میں حصہ لیا۔ ان حضرات کی مجموعی مساعی کے نتیجے میں تقریباً ۲۰۰۰ طبی اصطلاحات کو آخری شکل دے کر انھیں اشاعت کے لیے ادارے [illegible] کردیا گیا۔

پروگرام کمیٹی کی میٹنگ : ۱۶ / جون ۱۹۹۹ء کو قومی اردو کونسل کے کمیٹی روم میں پروگرام کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں گزشتہ فیصلوں پر عمل درآمد کا جائزہ لیتے ہوئے آئندہ کے لیے تجاویز منظور کی گئیں ۔ خصوصاً خطاطی اور کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی کے مراکز کی کامیاب شروعات کے لیے مفید مشورے دیے گئے ۔ میٹنگ میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے پروگرام کمیٹی کو statute Standing Committee قرار دیتے ہوئے کہا کہ فروغ زبان کے لیے کونسل کا مرکزی نکتہ دراصل ابتدائی اور ثانوی درجوں پر تعلیم کا فروغ ہے لیکن کونسل نے اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی معیاری معاون مواد کثرت سے فراہم کرایا ہے ۔ مثلاً ۹۹ ۔ ۱۹۹۸ کے درمیان کونسل نے ۶۵ نئی کتابیں شائع کیں ہیں ۔ اردو زبان کے فروغ اور تحقیق کے لیے طالب فیلوشپ بھی جلد ہی شروع کی جائے گی ۔

میٹنگ میں ان مختلف پروجیکٹوں میں چل رہے کام کی رفتار اور لائحہ عمل پر تبادلہ خیال کیا گیا جن پر کونسل نے کام شروع کردیا ہے ۔ ان پروجیکٹوں میں CDAC پونے کے اشتراک سے کمپیوٹر کے اردو سافٹ ویئر کی تیاری کا پروجیکٹ ، پرائمری تعلیم پروجیکٹ ، اردو میڈیم ٹیچرز ٹریننگ پروگرام اور اردو کے دوسری قومی زبان کے ساتھ رابطے پر سروے وغیرہ شامل ہیں ۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں منعقد ہونے والی اس میٹنگ کے دیگر اراکین میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد ، پروفیسر لئیق صلاح ، محترمہ جیلانی بانو ، محترمہ محمود بیگم بخشی ، پروفیسر زماں آزردہ ، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد ، جناب راجیندر ملہوترا اور پروفیسر سید منظور احمد موجود تھے ۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے کنوینر کے طور پر شرکت کی ۔

ریاستی اردو اکاڈمیوں کی رابطہ کمیٹی کی میٹنگ : قومی اردو کونسل نوڈل ایجنسی کی حیثیت سے حکومت ہند کے لیے اردو کی پالیسی وضع کرتی ہے ۔ اردو کے فروغ کے تئیں اس کی پالیسی کے نفاذ میں قومی اردو کونسل اور ریاستی اکادمیوں کے مابین مشترکہ حکمت عملی ناگزیر ہے ۔ کونسل یہ محسوس کرتی ہے کہ ریاستی اکادمیوں نے محدود وسائل کے باوجود اردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ کل ہند پیمانے پر باہمی اشتراک ابھی تک وجود میں نہیں آسکا ہے ۔ ملک میں اس وقت تیرہ اکادمیاں ہیں ۔ اردو کے ملک گیر پھیلاؤ کے سبب یہ ضروری ہے کہ قومی اردو کونسل اور اکادمیوں کے درمیان باہمی رشتے مزید مستحکم اور بامعنی ہوں تاکہ ایک مشترکہ لائحہ عمل کے تحت مختلف پروجیکٹوں کو عملی جامہ پہنایا جاسکے ۔ اس سلسلے میں ہر سال ریاستی اردو اکادمیوں کا مشترکہ اجلاس منعقد کیا جاتا ہے جس میں اکاڈمیاں سال بھر کی کارکردگی کا جائزہ لیتی ہیں اور آئندہ سال کے لیے لائحہ عمل بھی مرتب کرتی ہیں ۔ اس قسم کے کوآرڈی نیشن کے سبب نہ صرف یہ کہ وہ ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے باخبر رہتی ہیں بلکہ اس نظم و ضبط کی وجہ سے ایسے اقدام کی تکرار کے امکانات ختم ہوجاتے ہیں جو ایک دوسرے کے کاموں سے لاعلمی کے سبب عمل میں لائے جاسکتے ہیں ، مثلاً ایک ہی موضوع پر دو مختلف اکادمیوں میں پروجیکٹوں کی منظوری ، کتب کی اشاعت وغیرہ ۔

۲۰۰۰ ۔ ۱۹۹۹ء کے لیے صوبائی اکاڈمیوں کے عہدے داران کی رابطہ کمیٹی کی ایک میٹنگ ۲۹ / اپریل کو پونے میں منعقد کی گئی جس میں بہت سی ریاستی اکاڈمیوں کے چیئرمین اور سکریٹریز یا ان کے نمائندوں نے شرکت کی ۔ مہاراشٹرا کے وزیر تعلیم و ثقافت جناب انل دیش مکھ نے صدارت کی ۔

میٹنگ میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ، وائس چیئرمین قومی اردو کونسل ، ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل ، جناب کشمیری لال ذاکر (سکریٹری ، ہریانہ اردو اکاڈمی) ، پروفیسر عبدالغفار شکیل (صدر ، کرناٹک اردو اکادمی) ، ڈاکٹر شمیم رضوی (چیئرپرسن ، اترپردیش اردو اکاڈمی) ، جناب اقبال مسعود (مدھیہ پردیش اردو اکادمی) ، جناب سید شاہ نورالحق قادری (صدر آندھرا پردیش اردو

اکاڈمی) ، جناب سید منظور احمد قاسمی (اڑیسہ اردو اکاڈمی) ، جناب شائق احمد (سکریٹری ، بنگال اردو اکاڈمی) جناب یامین اختر قارعی (سکریٹری ، مہاراشٹرا اردو اکاڈمی) اور جناب حامد اے ۔ سیفی (رجسٹرار ، کرناٹک اردو اکاڈمی) نے شرکت کی ۔

اردو صحافت اور سماجی استحکام پر سمینار : سادہ اور عام فہم زبان کے فروغ میں اخباروں کا رول بہت اہم ہوتا ہے اس لیے اردو میں معیاری اور معروضی صحافت کو فروغ دینا دراصل معیاری اردو کی ترویج میں معاونت کرنا ہے ۔ اس نظریے کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو صحافت پر دو روزہ سمینار پونے میں مہاراشٹرا اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقد کیا ۔ ۲۹، اور ۳۰ / اپریل کو پونے کے اعظم ٹرسٹ کیمپس میں منعقد ہونے والے اس سمینار کا افتتاح مہاراشٹرا کے وزیر ثقافت اور مہاراشٹرا اردو اکاڈمی کے وائس چیئرمین جناب انل دیش مکھ نے کیا ۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے فرمائی ۔ شرکا میں جناب مشتاق انتولے ، سابق ایم ۔ یل ۔ سی ، جناب پی ۔ اے ۔ انعام دار ، صدر حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ ، بیگم عابدہ انعام دار ، صدر دکن ایجوکیشن ٹرسٹ ، ڈاکٹر ماجدہ حسین ، مدیر اردو / ہندی ایکشن ، بھوپال اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ شامل تھے ۔

اس سمینار کی افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب انل دیش مکھ نے کہا کہ سماجی ترقی اور ملکی فلاح و بہبود میں اردو صحافت نے اہم کردار ادا کیا ہے ۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے عظیم ورثے کی پاسداری کریں ۔ اس موقعے پر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ اردو کے صحافیوں نے ہر دور میں ملک کی خدمت کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے ۔ اردو زبان کے ادیبوں اور صحافیوں نے قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہوکر یک جہتی کی بنیادیں مضبوط کرنے اور سماج کو صحیح سمت میں لے جانے کی ہمیشہ کوشش کی ہے ۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ نے زور دے کر کہا کہ اردو صحافت نے مختلف مذاہب اور علاقوں کے لوگوں کے دلوں کو جوڑ کر بڑے تعمیری مقاصد حاصل کیے ہیں ۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمارے ملک ہندستان میں اردو کی تاریخ صرف ڈیڑھ سو سال ہی ہے لیکن فخریہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آزادی کے بعد اردو صحافت ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والوں کے دلوں کو جوڑنے اور قربت کا احساس دلانے میں مصروف ہے ۔ مقررین نے قومی کونسل کے ذریعے سمینار کے انعقاد کو صحافت اور صحافیوں کے لیے ایک مثبت اور اہم قدم بتایا اور امید ظاہر کی کہ کونسل کے ذریعے ایسے عملی اقدام اور کاروائیاں مسلسل کیے جاتے رہیں گے جن سے اردو صحافت کو درپیش مسائل کا تدارک ہوسکے ۔ کونسل نے یو ۔ این ۔ آئی اردو سروس جاری کرا کے ایسے اقدام ماضی میں بھی کیے ہیں اور وہ اپنی ان کوششوں میں کامیاب بھی ہوئی ہے ۔

شملہ میں فروغِ اردو پر کانفرنس : شملہ میں فروغِ اردو کے موضوع پر ایک کانفرنس ۲۶ / جون کو منعقد کی گئی جس میں ہماچل پردیش کے وزیرِ تعلیم جناب آئی ۔ ڈی ۔ دھیمان نے مہمانِ خصوصی کے طور پر شرکت کی ۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا کہ قومی اردو کونسل فروغ اردو کے لیے ہماچل پردیش میں ملٹی لنگول کمپیوٹر سینٹر قائم کرے گی ۔ اس کے علاوہ ریاست میں دس اردو ٹیچنگ سینٹر بھی قائم کرے گی جن کو کمپیوٹر سہولیات بھی مہیا کی جائیں گی ۔ انھوں [illegible] زبان ، آرٹ اور کلچر کی ریاستی اکاڈمی ان مراکز کی بہتر کارکردگی کے لیے نوڈل ایجنسی کا کام کرے گی ۔ اس کے علاوہ اردو ٹیچرز کی [illegible] کے لیے فنڈ بھی مہیا کیے جائیں گے ۔ ہماچل پردیش کے وزیرِ تعلیم جناب آئی ۔ ڈی ۔ دھیمان نے یقین دلایا کہ حکومت اردو کے فروغ میں ہر ممکن تعاون دے گی ۔ ○●○

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے دوامی رکن

۱ جناب محمد عبدالرحمن صدیقی صاحب (امریکہ)
۲ جناب غلام نورالدین صاحب "
۳ جناب سید فرید محی الدین صاحب "
۴ ڈاکٹر وحید رومی صاحب "
۵ محترمہ رقیہ جیلانی صاحبہ "
۶ جناب ایل۔ کے۔ چوپڑا صاحب "
۷ جناب عزیز احمد صاحب (کینیڈا)
۸ محترمہ مسعود صدیقی صاحبہ "
۹ جناب جوش مندوزئی صاحب "
۱۰ ڈاکٹر بدرالدین خاں صاحب "
۱۱ جناب محمد قمرالدین صاحب "
۱۲ جناب ڈبلیو۔ اے۔ شاہین صاحب "
۱۳ محترمہ صدیقہ شبنم (برطانیہ)
۱۴ جناب محمد عابد صدیقی صاحب "
۱۵ جناب مرزا مظفر بیگ صاحب "
۱۶ جناب خواجہ قمرالدین صاحب "
۱۷ جناب محمد عبداللہ شاہ صدیقی صاحب "
۱۸ ڈاکٹر عابد معز صاحب (سعودی عرب)
۱۹ جناب شریف اسلم صاحب "
۲۰ جناب سلیم فاروقی صاحب "
۲۱ ڈاکٹر مجید قاضی صاحب "
۲۲ ڈاکٹر خالد عبدالسمیع صاحب "
۲۳ ڈاکٹر عفار حسینی صاحب "
۲۴ جناب سید وسیم الدین صاحب "
۲۵ جناب محمد اسلم عمادی صاحب (کویت)
۲۶ جناب سید عبدالقدوس صاحب (حیدرآباد)
۲۷ محترمہ شاہدہ صمد صاحبہ "
۲۸ جناب خان محمد عمر خاں صاحب "
۲۹ محترمہ اختر سلطانہ صاحبہ "
۳۰ محترمہ نجمہ نفیس صاحبہ
۳۱ جناب سلیم فاروقی صاحب "
۳۲ جناب مضطر مجاز صاحب "
۳۳ جناب کریم اللہ خاں صاحب "
۳۴ جناب عبدالرحمن انصاری صاحب "
۳۵ جناب سید سیادت علی صاحب "
۳۶ جناب عبدالرحیم آرزو صاحب (گلبرگہ)

○●○

اطلاع

قارئین "سب رس" سے التماس ہے کہ مراسلت کے لیے ہمارا صحیح پتہ اور پن کوڈ نوٹ فرمائیں تاکہ خطوط بروقت پہنچ سکیں اور پوسٹل ڈپارٹمنٹ کو دشواری نہ ہو۔

The EDITOR,
"SABRAS" Urdu monthly,
"A' van-e-Urdu", Panjagutta Road,
P.O. Somajiguda, Hyderabad - 500'082.

○●○

ماہ نامہ سب رس حیدر آباد

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نمبر

شمارہ [illegible] — ستمبر ۱۹۹۹ء

فی پرچہ : ۱۶ روپے	مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ	۲۵
زرِ سالانہ : ۱۰۵ روپے	پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش :	۱۰
کتب خانوں سے : ۲۰۰ روپے	انگلستان	۱۰

ناشر: ادارہ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲ (اے پی) انڈیا

کمپیوٹر کتابت: شعبہ کمپیوٹرس، ادارہ ادبیات اردو

اس شمارے میں

٥●٥

پہلی بات

"سب رس" کے زور نمبر کی اشاعت یومِ زور (۲۶ ستمبر ۹۹ء) کے موقع پر عمل میں آرہی ہے۔ اس نمبر میں وہ تقاریر اور مضامین شامل ہیں جو گذشتہ سال یومِ زور (۲۷ ستمبر ۹۸ء) کے ادبی اجلاس میں "ڈاکٹر زور یادوں کی انجمن میں" کے عنوان سے پیش کیے گئے تھے۔ بعض تقاریر تحریری شکل میں دست یاب نہ ہوسکیں اس لیے وہ شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔ اس کے علاوہ اس "زور نمبر" میں ڈاکٹر زور اور مولوی عبدالحق کی مراسلت شامل ہے۔ ڈاکٹر زور کے فرزندوں کے پاس ڈاکٹر زور کے موسومہ، مشاہیرِ ادب کے ہزاروں خطوط موجود ہیں۔ ڈاکٹر زور جو خطوط لکھتے تھے عموماً ان کی نقل یا مسودے محفوظ رکھتے تھے۔ یہ مسودے بھی ذخیرہ، خطوط میں شامل ہیں ہم آئندہ "سب رس" کی ہر اشاعت میں یہ خطوط شائع کرتے رہیں گے۔ ڈاکٹر زور کے بے شمار مضامین مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ ان میں سے صرف چند مضامین یک جا کرکے "نگارشاتِ زور" کے نام سے شائع کیے گئے تھے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر زور کے تمام مضامین فراہم کریں اور انھیں مرتب کرکے کتاب کی صورت میں شائع کریں۔ جو مضامین دست یاب ہوں انھیں فی الحال سب رس میں دوبارہ چھاپ کر محفوظ کردیا جائے گا۔ پیشِ نظر زور نمبر سے ہم نے اس کام کا آغاز کردیا ہے۔

اس بار یومِ زور کے ادبی اجلاس کے لیے "معمارانِ ادارہ، ادبیاتِ اردو" عنوان تجویز کیا گیا ہے۔ جب ۱۹۳۱ء میں ادارے کا قیام عمل میں آیا، والاشان نواب میر حمایت علی خاں اعظم جاہ بہادر ولی عہد سلطنت اس کے سرپرستِ اعلیٰ تھے۔ سر اکبر حیدری، نواب سالار جنگ ثالث، نواب معین الدولہ بہادر اور راجہ دھرم کرن بہادر کے نام ادارے کے سرپرستوں میں شامل تھے۔ ادارے کی مجلسِ انتظامی کے پہلے صدر نواب مہدی یار جنگ بہادر (معین امیر جامعہ عثمانیہ) تھے۔ ادبی اجلاس میں ان اصحاب کے علاوہ دو اراکینِ مجلسِ انتظامی مولوی خواجہ معین الدین انصاری اور مولوی عبدالقادر صدیقی کی شخصیت اور خدمات پر مقالے پیش کیے جائیں گے۔ سب رس کی آئندہ کسی اشاعت میں ان مقالوں کو شائع کیا جائے گا۔

ہم جناب سید رفیع الدین قادری (فرزند ڈاکٹر زور) کے ممنون ہیں کہ انھوں نے مولوی عبدالحق کے خطوط اور ڈاکٹر زور کے خطوط کے مسودے "سب رس" میں اشاعت کے لیے عنایت کیے نیز ڈاکٹر زور کی تصاویر کی "سب رس" میں اشاعت کے لیے فرزندانِ ڈاکٹر زور جناب سید شاہ تقی الدین قادری، جناب سید علی الدین قادری اور جناب سید صفی الدین قادری کے شکر گزار ہیں۔

(ادارہ)

سید ہاشم علی اختر

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

میں یہ مختصر مضمون شکاگو کے مضافاتی علاقے سے لکھ رہا ہوں اس لیے کہ پروفیسر جعفر نظام صاحب، پروفیسر مغنی تبسم صاحب اور جناب منظور احمد صاحب کے خطوط مجھے ایک ساتھ کل ہی ملے اس جلسے کے سامعین کو میری طرف سے پُر خلوص سلام اور دعائیں۔

جامعہ عثمانیہ میں میرے طالب علمی کے زمانے (۱۹۳۸ - ۱۹۴۴ء) میں جن اساتذہ کی شہرت اپنے شعبے سے باہر بھی تھی ان میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بھی شامل تھے۔ میرے بہت سے دوست جو شعبہ اردو کے طالب علم تھے ان سے ڈاکٹر صاحب کی باتیں سننے میں آتی تھیں۔ اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ میں حیدرآباد کے باہر کے اساتذہ کی اکثریت تھی اس لیے کہ جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دور میں سارے ہندستان کے بہترین دماغوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور جامعہ کی سیاست پر ان کا زبردست اثر تھا۔ ڈاکٹر زور نے ایسے وقت حیدرآبادی طلبہ میں احساسِ کم تری کو کم کرنے، خود اعتمادی پیدا کرنے اور حیدرآبادیت اور دکھنی تہذیب پر فخر کرنے کا غیر معمولی کام انجام دیا تھا۔ ہمارے ساتھیوں میں انکسار، ملنساری اور اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر نہ سمجھنے کی جو تہذیب تھی۔ اس کم زوری کو دور کرنے کے لیے زور صاحب اپنے طلبا کو لکھنے کی ترغیب دیتے تھے اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنے کام کو پیش کرنے کے لیے ان کی ہمت افزائی کیا کرتے تھے۔ حیدرآباد سے تو بہت شاعر اور لکھنے والے پیدا ہوئے ان کی تربیت اور ترقی میں زور صاحب کا بڑا حصہ ہے۔

ان سے میرا ربط اس وقت سے شروع ہوا جب میں گورنر آندھرا پردیش جناب بھیم سین سچر صاحب کے معتمد کی حیثیت سے حیدرآباد آیا۔ بھیم سین سچر صاحب اردو تہذیب کے آدمی تھے۔ صوبۂ سرحد میں ان کی ابتدائی تعلیم اردو میں ہوئی تھی اور سرکاری کام کے سلسلے میں بھی وہ مجھ سے اردو ہی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ زور صاحب نے انھیں ادارہ ادبیاتِ اردو اور یومِ محمد قلی قطب شاہ میں شرکت کے لیے مدعو کیا تھا۔ ابتدائی ملاقاتوں کے بعد میں زور صاحب سے ملتا رہا اور مجھ پر بڑی شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔ ان کے کشمیر جانے کے بعد استادِ محترم پروفیسر مسعود راج سکسینہ صاحب نے جو ادارے کے معتمدِ عمومی تھے مجھ سے خواہش کی کہ میں ادارے کی معتمدی قبول کرلوں۔ اس طرح میں ادارہ ادبیات اردو سے وابستہ ہوا اور معتمد، نائب صدر اور صدر ہونے کا شرف مجھے حاصل ہوا اور اس دوران میں مجھے

ان کی پُر خلوص خدمات اور ان کی شخصی عظمت کا حقیقی اندازہ ہوا ۔ جو باتیں مجھے یاد رہ گئیں ان میں وہ دو شامیں شامل ہیں جو ان کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا ۔ ایک شام وہ تھی جب انھوں نے جوش صاحب کو ادارے میں مدعو کیا تھا جو برسوں بعد حیدرآباد آئے تھے ۔ وہ ایک نہایت بے تکلف اور محدود محفل تھی جس میں جوش اور علامہ حیرت بدایونی کی نوک جھونک نے اس محفلِ شعر کو ایک یادگار محفل بنا دیا تھا ۔ میں نے زور صاحب سے عرض کیا تھا کہ کاش اس محفل کو ٹیپ ریکارڈ کیا جاتا ۔ ایک دوسری شام کنور مہندر سنگھ بیدی اور زور صاحب کے ساتھ گزری ۔ میں ان دونوں کو ساتھ لے کر اس چاندنی رات کو دیر گئے تک حسین ساگر کے بند پر ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے ان دونوں کی شاعری اور دل چسپ باتوں کو سنتا رہا ۔ یہ دونوں شامیں میرے لیے بڑی یادگار شامیں رہیں ۔

ادارہ ادبیاتِ اردو کا قیام محترم زور صاحب کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آج تک حیدرآباد میں اردو کی بقا، ترویج اور ترقی کا کام ہورہا ہے ۔ آزادی کے بعد حکومتِ ہند اور ریاستی حکومت کے اردو کے ساتھ جو سلوک کیا ہے ۔ اس کی وجہ سے اردو والوں کی نئی نسل اردو سے نابلد ہونے لگی ہے ۔ اس کی بقا کے لیے ادارہ ادبیاتِ اردو اور عابد علی خاں ٹرسٹ کے اشتراک سے جو کام ہورہا ہے اس کی تمام اردو علاقوں میں تقلید ہونی چاہیے ۔

زور صاحب کی دور اندیش نظر اور تخلیقی صلاحیت کا اندازہ ادارے کی عمارت کی طرزِ تعمیر سے بھی ہوتا ہے ۔ زور صاحب نے اس عمارت میں مینار کے اضافہ پر اس لیے زور دیا کہ یہ خوب صورت لیکن مختصر عمارت ہر آنے جانے والی کو اپنی طرف متوجہ کرسکے اور اگر یہ مینار نہ ہوتا تو یہ عمارت آج کل کی فلک بوس عمارتوں میں گم ہوکر رہ جاتی ۔

زور صاحب نے پروفیسر کی حیثیت سے اور اس ادارے کے بانی اور معتمد کی حیثیت سے بھی بے شمار نوجوانوں کے شاعر اور مصنف بننے میں مدد کی ہے ۔ وہ اس ادارے کے علاوہ ان کی میراث ہیں اور اس وجہ سے زور صاحب کا نام اور کام اردو زبان کی بقا تک جاری رہے گا ۔

اللہ انھیں فردوس میں اونچا مقام عطا فرمائے ۔ ۔ ۔ آمین ○

○●○

منظور الامین

ڈاکٹر زور

(ایک شخصی تاثر)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیدرآباد کی سربرآوردہ اور شریف وضع شخصیت کا دوسرا نام ہے یہ آج سے نصف صدی پہلے کی بات ہے کہ اس خاک سار کا تقرر مرحوم دکن ریڈیو حیدرآباد میں ٹاکس پروڈیوسر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ میں یونیورسٹی سے تازہ تازہ ریڈیو میں وارد ہوا تھا۔ ہم عصروں میں لیکن مجھ سے عمر میں کافی سینیر میر حسن، اشفاق حسین، جے پال راؤ اور علی احمد جیسی معتبر شخصیتیں تھیں، نیا نیا جاب، نئی نئی ذمہ داریاں، حوصلے بلند، ایک دن مرحوم اشفاق حسین صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے کہا "بیٹا تو شور صاحب کا شاگرد ہے اور میں زور صاحب کا، زور صاحب کافی دنوں سے ریڈیو پر نہیں آئے ہیں۔ وہ سوماجی گوڑے میں رہتے ہیں تو ان سے فوراً جاکر مل ورنہ میں تجھے عاق کردوں گا۔" میں نے زور صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اشفاق صاحب کے مشورے پر عمل پیرا ہوکر میں زور صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ بہت تپاک سے ملے۔ میں نے اپنا تعارف کروایا تو خوش ہوئے۔ مشرقی تہذیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ چائے سے تواضع کی۔ میں نے عرض کیا ہندستان کے معروف قلعوں پر ہم نے تقریروں کا ایک سلسلہ ترتیب دیا ہے جس میں لال قلعہ، جھانسی فورٹ اور گول کنڈہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان سے درخواست کی کہ وہ گول کنڈہ قلعے سے متعلق تقریر کریں۔ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوصف انھوں نے حامی بھرلی۔ ضمنی طور پر مجھے بتایا کہ "کونڈا" تلگو زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "پہاڑ"، مقررہ تاریخ پر ہم نے ان کی نہایت عالمانہ تقریر دکن ریڈیو سے نشر کی جسے سامعین نے پسند کیا۔ اشفاق صاحب کا میں نے شکریہ ادا کیا کہ حیدرآباد کی ایک اہم ہستی سے ان کی وجہ سے میری ملاقات ہوئی۔ زور صاحب کی تقریر معیاری تھی اور لب و لہجہ شستہ، ان کی زبان میں فصاحت، سلاست اور شیرینی تھی۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے حسب نسب اور علم و فضل کے لحاظ سے زور صاحب کا منصب بہت اعلیٰ تھا وہ مشرقی تمدن اور شائستگی کا پیکر تھے ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ اپنے چہرے سے وہ بہت سنجیدہ (Serious) انسان نظر آتے تھے لیکن ان کی شخصیت میں زندہ دلی اور ظرافت کے عناصر موجود تھے۔ برسوں پہلے انھوں نے ایک رباعی سنائی تھی جو مجھے آج بھی یاد ہے۔ ذکر چندے کا ہورہا تھا انھوں نے فرمایا: آج کل لوگ ایک فن میں مہارت حاصل کرتے جارہے ہیں اور وہ فن ہے چندہ وصول کرنا۔ لوگوں نے کئی طرح کے مشکوک ادارے قائم کیے ہیں۔ کئی قسم کی رسیدیں ساتھ لاتے ہیں۔ ملنے پر بڑی لفاظی کرتے ہیں لیکن تان آخر میں ٹوٹتی ہے چندے پر، تب انھوں نے یہ رباعی سنائی:

چندے کے لیے نیچری خلیفہ دوڑے   روٹی کے لیے غریب ضعیفہ دوڑے
سوئے جنت جو سدھارے سید   لٹو لے کے امام ابوحنیفہ دوڑے

معلوم نہیں رباعی کس کی ہے ۔ گمان غالب ہے کہ اشعار اکبر الہ آبادی کے ہیں ۔

ڈاکٹر زور نے اپنی زندگی اردو زبان اور اردو علم و ادب کے لیے وقف کردی تھی ۔ جہاں تک میرے علم میں ہے یہ عمارت ں ہم سب اکٹھے ہیں اس کی زمین بھی ڈاکٹر زور ہی نے ادارہ ادبیاتِ اردو کو عنایت (Donate) کردی تھی ۔

اردو زبان سے محبت کی لگن انھیں کشمیر لے گئی وہاں غالباً ۱۹۶۰ء میں وہ کشمیر یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے تھے ٹیلی وژن کے ، سے ریٹائر ہونے پر راقم الحروف نے کشمیر یونیورسٹی ہی میں عوامی ذریعہ ، ترسیل و ابلاغ و صحافت Mass Communication and Journalisı کا ڈپارٹمنٹ (Department) قائم کرنے کی ذمہ داری سنبھالی تھی ۔ سری نگر میں جب لوگوں کو پتہ چلا کہ بھی تعلق حیدرآباد سے ہے تو اکثر لوگ پروفیسر زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری کی بات کرتے تھے ۔

ڈاکٹر زور کے بارے میں پتہ چلا کہ سری نگر میں قیام کے دوران وہ اکثر خانیار شریف جایا کرتے تھے جہاں کئی بزرگوں کے ہیں ۔ وہ قبروں کے کتبے پڑھتے اور کئی بزرگوں کے مزاروں کے کتبوں کے چربے بھی انھوں نے بنوائے تھے ۔ ممکن ہے ان بزرگانِ ں کے بارے میں انھوں نے مضامین بھی لکھے ہیں جن کا مجھے علم نہ ہوسکا ۔

کشمیر کے بزرگانِ دین سے ڈاکٹر زور کو جو عقیدت تھی اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کا انتقال کشمیر ہی میں ہوا اور وہ یار شریف ہی میں دفن کیے گئے ۔

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے "

○●○

سلسلہ صفحہ ۷ سے)

وہ کام کرنے کے معاملے میں "موڈ" کے قائل نہیں تھے وہ اس بات کو برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ "آج طبیعت نہیں چاہی ں لیے لکھ نہیں سکا یا آج موڈ نہیں تھا اس لیے کام نہیں کرسکا وہ اس اندازِ فکر کے دشمن تھے ۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جس طرح اروں پیشوں میں چھ یا سات گھنٹے بلکہ اس سے زیادہ کام کیا جاتا ہے اسی طرح شاعر ، ادیب اور ری سرچ اسکالرس بھی مسلسل کام ں موڈ اور طبیعت کا حیلہ بنا کر کام چوری سے احتراز کریں ۔

میں ایک دل چسپ واقعہ سنا کر اپنی گفتگو کو ختم کرتا ہوں ۔ جس وقت میں فیلوشپ پر کام کررہا تھا زور صاحب کشمیر سے یدرآباد آئے ہوئے تھے کافی تھکے تھکے نظر آتے تھے وہ اپنے تخت پر بیٹھے مسلسل کام کرتے رہے میں بھی اپنی جگہ مصروف رہا ۔ جب ں نے یہ دیکھا کہ وہ لنچ لینے کے لیے اپنے دولت خانہ میں گئے ہیں میں بھی چپکے سے باہر نکل آیا ۔ ادارہ ادبیاتِ اردو کے سامنے ایک انی ہوٹل میں کچھ کھاپی کر واپس آگیا ۔ استادِ محترم میرے آنے سے پہلے ہی آچکے تھے ۔ جس کی مجھے توقع نہیں تھی ۔ مجھے دیکھتے ہی ں پڑے کہنے لگے ؛ کہاں گئے تھے ؟ میں نے ادب سے جواب دیا ۔ بھوک لگی تھی اس لیے کھانا کھانے گیا تھا ۔ یہ سنتے ہی غصہ اور ید ہوگیا کہنے لگے یہ "کٹری بیلوں اور بھینسوں کی طرح مت کھاؤ ۔" کچھ جلیبی اور ملائی (بالائی) ساتھ رکھ لیا کرو ۔ "کھاتے بھی جاؤ اور لتے بھی جاؤ ۔ اس سے وقت بچے گا ۔" ڈٹ کر کھانے کے طریقوں کو چھوڑ دو ۔"

حق مغفرت فرمائے ــــ ایک مثالی استاد تھے ۔

○●○

مضطر مجاز

آبروئے دکن

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

(پیدائش: ۲۵ دسمبر ۱۹۰۵ء — وفات: ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء)

اردو اور حیدرآبادی تہذیب کے خشک ہوتے ہوئے شجر کو اپنی محنت شاقہ اور خونِ جگر سے شاداب اور برومند کرنے میں ڈاکٹر زور کا جتنا حصہ رہا ہے شاید کسی اور کا رہا ہو۔ ڈاکٹر زور جس مشن کو لے کر اٹھے تھے اس کی تکمیل محض شخصی جدوعمل سے ممکن نہ تھی چناں چہ انھوں نے اپنی نگاہ بلند، سخنِ دل نواز اور جانِ پُرسوز کی بے پایاں دولت اس کاز میں لگاکر اپنے ساتھ پوری ایک ٹیم تیار کر جس سے ظاہر ہے کہ خاطر خواہ نتائج بھی ظاہر ہوئے۔ وہ محض قدمے اور سخنے کے آدمی نہ تھے جب وقت آیا تو وہ دامے درمے سے اتفاق سے بھی پیچھے نہ ہٹے زبانی جمع و خرچ میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والے جب بھی تھے اور اب بھی ہیں مگر سچ تو یہ ہے ڈاکٹر زور بہت کم لفظوں کے آدمی تھے۔ دکن، دکنی اور دکنیات سے انھیں جنون کی حد تک محبت تھی۔ صوتیات اور لفظیات پر ار میں سب سے پہلا کام ڈاکٹر زور کا ہے۔ تنقید پر حالی کے بعد ڈاکٹر زور کی تحقیقات کو اولیت حاصل ہے۔ ہر کمال میں کچھ نہ کچھ آشفتگی ضرور درکار ہوتی ہے۔ اسی آشفتگی کے فیضان نے سید محی الدین قادری کو ڈاکٹر زور بنایا۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا کہ حیدرآباد بلکہ سارے جنوب ہی کے دیوانِ گانِ شوق کی شہرت کبھی بندھیاچل سے آگے نہیں پہنچ پائی۔ اس کا اگر کوئی استثنا ہے تو زور اور صرف زور ہیں۔ جن لوگوں نے حیدرآباد سے باہر نکل کر اس تکونے دیس کے مختلف کونوں یا بیرونِ ملک مشرق و مغرب کی خاک چھانی ہے وہ بتاتے ہیں کہ حیدرآباد کو لوگ ڈاکٹر زور اور کسی قدر مخدوم کے حوالے ہی سے جانتے ہیں ؎

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

مئے خانۂ اردو کا زور جیسا رند قدح خوار مشکل ہی سے ملے گا۔ ڈاکٹر زور دو مصرعوں کی دانش وری، میں مرنے والے فرد نہیں تھے۔ اگرچہ انھوں نے شاعری کی جو بہ لحاظ کمیت کم سہی مگر کیفیت میں کسی اچھے سے اچھے شہرت کی سند یافتہ شاعر سے کم بھی نہیں اگر وہ اس کی طرف اپنی پوری توجہات دیتے تو شاید داد و تحسین کے ڈونگرے وصول کر کے اپنے نفس کی خاصی تسکین کا سامان مہیا کرلیتے مگر ان کی بے نفسی نے ان کے اس راہ گزر پر بڑھتے ہوئے قدموں کو روک لیا۔ انھوں نے دورِ آصفی کے جلال بادشاہی میں شعور کی آنکھ کھولی مگر آزادی کے بعد کے "جمہوری تماشے" میں وہ محو ہوکر بھی نہیں رہ گئے۔ بدلتی ہوئی اقدار کے منظر نامے کے ایک ایک ڈراپ سین کا انھوں نے بہ غور مطالعہ اور مشاہدہ کیا اور بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ نئی روشنی کے منشور سے چھن کر آنے والے رنگ برنگی طیفوں میں انھیں صرف رنگ بے رنگی ہی کو اپنانا ہے اور یہ رنگ بے رنگی انھیں "قطب شاہی" تہذیب میں نظر آیا جس کی پاس داری کسی حد تک آصفی حکم رانوں نے کی تھی۔ مختلف زبانوں اور تہذیبوں کے ٹکراؤ کا منظر ان کی چشمِ بینا نے دیکھا او

ان کی بصیرت نے محسوس کرلیا کہ الصلح خیرا ہی میں ملت کی نجات ہے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ تیلگو اور اردو کے ادیبوں کو ایک رنگ منچ پر جمع کیا اور یگانگت اور یک جہتی کا ڈول ڈالا۔ جسے بعد میں بہت سے سیاست کاروں نے CO-EXISTANCE جیسی اصطلاحوں میں اس کی فلسفیانہ توجیہات اور توضیحات کے پل باندھے۔ ڈاکٹر زور نے یوم قلی اور ادارہ ادبیات اردو کی شکل میں ٹکراؤ اور گھیراؤ کے بہ جائے " اپناؤ " کا نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے جلوس اور سنگھٹن ترتیب نہیں دیے۔ مطالبات کی فہرستیں نہیں بنائیں۔ عنایات اور نوازشات کے لیے دامن نہیں پھیلایا۔ ان کے کام کرنے کا ڈھنگ جداگانہ تھا۔ اس میں پابستگی رسم و رہ عام کا شائبہ نہ تھا۔ اس میں ایک وجاہت تھی ایک شکوہ تھا، خودداری تھی، عزت نفس تھی۔ ڈاکٹر زور کے کارناموں کا اس مختصر سے مضمون میں احاطہ ممکن نہیں۔ تاہم فی الوقت دو نہایت اہم کارناموں کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے اولاً یہ کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ پیدائش کا تعین جو انھوں نے قلی قطب شاہ کا دیوان دریافت کرکے انجام دیا اور شاید آج تک بات اس سے آگے نہ بڑھ سکی ثانیاً حیدرآبادی ادیبوں اور شاعروں کا ملکی سطح پر تعارف، ڈاکٹر زور پہلے شخص تھے جنھوں نے اہل زبان کو سمجھایا کہ دکن میں بے زبان اور گونگے نہیں بستے۔ فکروفن اور گہرائی اور گیرائی قدرت نے انھیں بھی بخشی ہے۔ یہ انھیں کا فیضان اور احسان ہے کہ قومی اور بین قومی سطح پر حیدرآبادی ادب و شعر کا نام روشن ہوا۔

حیرت ہوتی ہے کہ ایسا شخص جس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ قرطاس و قلم کی صحبت میں گزرا۔ جس کے سبھی کھاتے میں (۲۰) نہایت اعلیٰ پائے کی محققانہ اور ناقدانہ تصانیف ہوں (۱۵) تدوین و ترتیب کردہ کتابیں ہوں جس کے دو سو کے قریب غیر مطبوعہ مضامین ہوں جن کو جمع کیا جائے تو ۲۰ تا ۲۵ کتابوں کا مواد مہیا ہوسکتا ہے جو ملک کی کسی بھی جامعات میں بی۔ اے ، ایم۔ اے ، اور پی ایچ۔ ڈی کا ممتحن رہا ہو۔ ایک کالج کی پرنسپالی کی ہو، ایک جامعہ کا صدر شعبہ اور ایک دور میں ڈین فیکلٹی آف آرٹس رہا وہ اتنا عملی آدمی بھی ہوسکتا ہے کہ ایک تحریک کی نہ صرف نیو رکھے بلکہ اس کی آب یاری کر کے اس کو تناور شجر میں تبدیل کردے۔ یہ ان کی شبانہ روز کی محنتیں تھیں جو اندر ہی اندر ان کی صحت کو کھائے جارہی تھیں۔ بہ ظاہر وہ بڑے تنومند اور توانا آدمی تھے۔ نہایت شکیل و جمیل شخصیت کے مالک، قدرت نے تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور خوب صورتیوں سے انھیں نوازا تھا اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ایسی دل نواز اور دل آرا شخصیت کا سفر حیات فردوس بر روئے زمین، کشمیر جنت نظیر کی وادیوں میں پہنچ کر ختم ہوگیا۔ صرف ۵۰ سال کی عمر میں ان کی کشتیِ حیات کتنے جھکولے کھاتی رہی ہم سبک سارانِ ساحل اس کی تحسین و تفہیم سے عاری ہیں۔ ڈاکٹر زور ان نہایت کم یاب شخصیتوں میں تھے جنھوں نے جتنا تصنیفی اور تالیفی کام کیا ہے اس کے کچھ حصے کو پڑھنے کے لیے بھی شاید ہمارے پاس وقت نہیں۔ رہ گئیں ان کے علمی میدان کی کاوشیں تو ان کے سائے کو بھی شاید ہی ہم چھوسکیں۔ ایسے ہی انسانوں کو بارے میں شاید میر کہہ گیا ہے ؂

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں!

○●○

پروفیسر رزاق فاروقی

ڈاکٹر زور بہ حیثیت استاد

استاذی سید غلام محی الدین قادری زور ایک عہد آفریں شخصیت کے حامل تھے ۔ ان کی علمی ، ادبی اور تعلیمی خدمات میں جو تنوع پایا جاتا ہے اس نے ان کی شخصیت کے ایک اہم پہلو کو ہماری نظروں سے اوجھل کردیا ہے ۔ ان کی تحقیقی خدمات ، ان کی دکنی ادب سے دل چسپی اور ادارہ ادبیات اردو کا قیام اور اسی وضع کے کارناموں پر ہماری نگاہیں ٹھہر جاتی ہیں لیکن ان کی شخصیت کا وہ وصفِ جمیل جس میں ایک شفیق اور مثالی استاد کار فرما ہے بسا اوقات ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے ۔ میرا یہ خیال ہے کہ ڈاکٹر زور بنیادی طور پر ایک استاد تھے ۔ یہ صفت ان کو ورثہ میں ملی تھی ان کے والد حضرت زم صاحب نہ صرف ایک صوفی اور صاحبِ سلسلہ بزرگ تھے ، وہ ایک صاحبِ طرز واعظ بھی تھے ۔ کسی کلاس روم کے بند ماحول کے بہ جائے وہ کھلی فضا میں اپنی وعظ کی محفلوں میں ذہنِ انسانی کی تربیت کا گراں قدر کام انجام دیا کرتے تھے ۔ حضرت زم کی وعظ کی محفلوں میں مردوں سے زیادہ عورتیں شریک ہوا کرتی تھیں ۔ وہ عورتوں کے مولوی صاحب کے نام سے زیادہ مشہور تھے ۔ مذہب اور اخلاق زندگی کے دو اہم شعبہ جات ہیں ان کی تربیت کا کام ایک بنیادی خدمت ہے ۔ زم صاحب کی طرح ان کے لائق صاحب زادے زور صاحب نے رشد وہدایت کی عظیم ذمہ داری کو سائنٹیفک انداز میں پورا کیا ۔ وہ اصطلاحی معنی میں بھی استاد تھے اور تدریس جیسے وسیع مفہوم کی ترجمانی کے لیے بھی ان کی خدمات ان کی زندگی کا ماحصل بن گئیں ۔ جس طرح ایک استاد ایک محدود فضا میں چند منتخب طلبا کی ذہنی تربیت کی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے اسی طرح ڈاکٹر زور نے وسیع تر بنیادوں پر علم و ادب کے فروغ و اشاعت کے ساتھ اس کی حفاظت کی بھی گراں قدر ذمہ داری کو نہ صرف قبول کیا بلکہ ایک عظیم ورثے کی شکل میں آنے والی نسلوں کے ہاتھوں اپنی خدمات کو منتقل بھی کیا ۔

ڈاکٹر زور کی تدریسی خدمات جامعہ عثمانیہ کے قیام کے مقصد و منشا کے اثر کی وجہ سے کام کرتی نظر آتی ہیں ۔ سقوطِ حیدرآباد سے پہلے انھوں نے پُرسکون انداز میں دکن اور اہلِ دکن کو حرکت اور حرارت عطا کی تھی کہ وہ اپنے ادب اور خاص کر اپنے تہذیبی ورثے کی حفاظت کریں ۔ میں ان کے اس دور کا شاہد نہیں ہوں اس لیے ۱۹۴۷ء سے قبل ، ان کی خدمات پر اظہارِ خیال نہیں کروں گا ۔

پولیس ایکشن کے وقت جب ڈاکٹر زور کو حیدرآباد کی قدیم دانش گاہ دارالعلوم کا پرنسپل بنایا گیا تھا ، میں دسویں جماعت کا طالبِ علم تھا ۔ دارالعلوم حیدرآباد کی قدیم درس گاہ تھی جو سرسید احمد خاں کے قائم کردہ علی گڑھ کے مدرستہ العلوم سے پہلے قائم ہوئی تھی ۔ میں جامعہ عثمانیہ کو دارالعلوم کی ترقی یافتہ شکل سمجھتا ہوں ۔ اس درس گاہ کے دو حصے تھے مدرسہ فوقانیہ اور "کلیہ" زور صاحب کالج کے پرنسپل تھے ۔ ہم اسکول کے طلبا ان کو موٹر میں ڈرائیور کے بازو اگلی نشست پر بیٹھ کر کالج کو آتے جاتے دیکھتے تھے ۔ پولیس ایکشن ۱۹۴۸ء کے بعد حیدرآباد کی قدیم ثقافت اور اس کے تعلیمی اداروں پر برے دن آنا شروع ہوگئے تھے ۔ جامعہ عثمانیہ کا کردار بدلنے سے پہلے دارالعلوم کا خاتمہ کردیا گیا ۔ اس قدیم دانش گاہ کو قدیم شہر حیدرآباد سے بہت دور چادر گھاٹ کالج میں جو عابد شاپ سے آگے واقع تھا

م کردیا گیا تھا۔ زور صاحب نے اس انتظامی تبدیلی کو بڑی خندہ پیشانی سے اس طرح قبول کیا کہ دارالعلوم کی قدیم روایات کو ادر گھاٹ کالج میں منتقل کردیا۔ دارالعلوم مشرقی علوم کا گہوارہ تھا اس کی حیثیت تو کبھی کے ختم ہوچکی تھی لیکن مقصد اور منشا کو کبھی ا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو استقامت اور تدبر کے سہارے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے دارالعلوم کے مقصد اور منشا کی حفاظت ی۔ چادر گھاٹ اردو میڈیم کا کالج تھا اس کا مقابلہ انگریزی میڈیم کے نظام کالج سے تھا۔ ڈاکٹر زور یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے کالج کے طلبا کی اکثریت غریب طلبا کی ہے خاص طور پر اضلاع سے آئے ہوئے سینکڑوں طلبا کی ضرورتوں کا انھیں احساس تھا۔ ڈاکٹر زور نے نواب علی یاور جنگ کو جو اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے کالج ڈے کے موقع پر مدعو کیا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے A ہاسٹل اور B ہاسٹل کی طرح شہر میں ایک ہاسٹل کی تعمیر اور قیام کے لیے ایک اسکیم پیش کی تھی۔ نواب علی یاور جنگ نے تالیوں کی بچ میں ہاسٹل کی تعمیر کا اعلان تو کیا تھا۔ لیکن سنہ کا اعلان نہیں کیا کہ وہ کب اور کہاں تعمیر کی جائے گی۔۔۔!

ڈاکٹر زور طلبا میں احساسِ کم تری کو دور کرنے کی ہمیشہ کوشش کیا کرتے تھے۔ چوں کہ نظام کالج کے طلبا کو وہاں کی شان دار وایات کے تحت کالج میگزین، اسٹوڈنٹس یونین، تعلیمی تفریح، اسپورٹس وغیرہ کی سہولتیں حاصل تھیں۔ ڈاکٹر زور نے یہ تمام سہولتیں پنے کالج میں بھی مہیا کی تھیں۔ اس وقت انڈین نیشنل کانگریس کو ملک بھر میں اقتدار حاصل تھا اس کے اثر سے آل انڈیا نیشنل سٹوڈنٹس یونین قائم ہوئی تھی جس کا ایک عام اجلاس احمدآباد میں ہوا تھا۔ چوں کہ نظام کالج کی ٹیم شریک ہورہی تھی اس لیے زور ماحب نے اپنے کالج سے تین طلبا کو احمدآباد بھیجا تھا جس کو جواہر لعل نہرو مخاطب کرنے والے تھے۔ تین طلبا کا انتخاب تقریری مقابلے کے ذریعے کیا گیا تھا۔ میں بھی ان تین طلبا میں شامل تھا۔ نظام کالج کا ترجمان مجلہ نظام ادب کی طرح انھوں نے چادر گھاٹ کالج کا جمان "فکر نو" جاری کیا تھا۔ چوں کہ چادر گھاٹ کالج میں کامرس کے طلبا کی اکثریت تھی اس لیے مجلہ کامرس بھی شائع کیا تھا جو رو میں شائع ہوتا تھا۔ میں پہلے کالج یونین کا معتمد منتخب ہوا تھا، دوسرے سال مجھے نائب صدر چنا گیا تھا۔ بزمِ کامرس کے صدر خود نسپل ہوا کرتے تھے اس لیے مجھے ہر وقت زور صاحب سے ملنے اور اپنے مطالبات کو منوانے اور متعدد پروگراموں کی منظوری لینے کا قع ملتا تھا اس لیے میں ان کے بہت قریب ہوگیا تھا۔ وہ کامرس میگزین میں بہت دل چسپی لیا کرتے تھے کامرس جیسے مضمون پر ختلف فنی موضوعات پر انھوں نے طلبا اور اساتذہ سے مضامین لکھوائے اور خود اس مجلہ کے لیے "پیام" عنایت کیے تھے۔

دارالعلوم کے چادر گھاٹ کالج میں ضم ہوجانے کے بعد طلبا اور اساتذہ کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگیا تھا لیکن ان کے دور نسپلی میں نہایت عمدہ نظم و نسق تھا۔ کالج کا ذریعہ تعلیم اردو تھا، پچاس فی صد سے زائد طلبا غیر مسلم تھے ڈاکٹر زور بہ حیثیت پرنسپل ہر شعبے کی مصروفیتوں میں شریک ہوا کرتے تھے اکثر اہم اہم شخصیتوں کو کالج میں مدعو کرتے اور ان کی تقاریر کا اہتمام کرتے تھے۔ ڈاکٹر بنا ریڈی اس وقت نہایت کم عمری میں پہلی مرتبہ وزیر بنائے گئے تھے ان کو مدعو کرکے اردو اور اردو والوں سے ان کو قریب کرنے کا م ڈاکٹر زور نے انجام دیا تھا۔ یہی چنا ریڈی جب ترقی کی منزلوں کو طے کرکے چیف منسٹر اور پھر گورنر بنائے گئے وہ رسماً ہی سہی اردو ر اردو بولنے والوں کی حمایت کرتے رہے۔ ان کی پرنسپلی کے زمانے میں نہایت لائق اساتذہ کا اجتماع ہوگیا تھا۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء کے سالانہ جلسہ کے موقع پر عاقل علی خاں کا ڈرامہ "سودا" اسٹیج کیا گیا تھا جس کے لیے ایک معقول رقم پرنسپل زور صاحب نے منظور کی تھی ۱۹۵ء تا ۱۹۵۲ء میں عبدالقیوم خاں باقی کا لکھا ہوا ڈرامہ "دیوانہ" کالج کی جانب سے پیش کیا گیا تھا۔ میں نے ان دونوں ڈراموں میں کام یا تھا ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۳ء میں کالج کا طالبِ علم نہیں تھا لیکن زور صاحب نے مجھے طلب کیا اور حکم دیا کہ ہر سال کی طرح میں ڈرامہ پیش

کروں میں نے اپنا لکھا ڈرامہ سیوا کالج کے اسٹیج پر پیش کیا تھا۔ وہ ڈراموں کے ری ہرسل کے وقت خود تشریف لاتے تھے۔ لیکن تنقید یا تبصرہ نہیں کرتے تھے۔

بعض حلقوں میں یہ بات مشہور ہے کہ پروفیسر عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر زور میں معاصرانہ چشمک تھی اور دونوں ایک دوسرے کے مخالف تھے یہ بات میرے نزدیک بالکل غلط ہے ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۴ء میں بی۔ اے کی کلاسس یونیورسٹی میں ہوا کرتی تھیں۔ اس سال بی۔ اے میں اردو مضمون اختیاری Optional Main کے طور پر کسی طالبِ علم نے داخلہ نہیں لیا تھا۔ یہی حال فارسی اور عربی کے شعبہ جات کا تھا۔

اس وقت پروفیسر دورا سوامی جو کبھی آرٹس کالج کے پرنسپل بھی تھے وائس چانسلر بن گئے تھے وہ اردو فارسی اور عربی کے شعبہ جات سے خوب واقف تھے انھوں نے ان تینوں شعبہ جات کو ایک شعبہ بنانے کی اسکیم تیار کی تھی بی۔ اے کی جماعتوں میں اردو کے طلبا کے فقدان کی وجہ سے دورا سوامی اسکیم کی کامیابی یقینی تھی اگر یہ تینوں شعبوں کو ایک دوسرے میں ضم Main Optional کیا جاتا تو آج ان شعبوں کا وجود ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت زور صاحب نے سروری صاحب اور سید محمد صاحب کے ذریعے مجھے طلب کیا اور شعبہ اردو کو بچانے کے لیے مجھ سے یہ خواہش کی گئی کہ میں بہ جائے بی۔ کام کے بی۔ اے میں منتقل ہوجاؤں۔ اس طرح میں نے اپنے مشفق استاد کے حکم کی تکمیل کی۔ آج شعبہ اردو کا وجود زور صاحب کی حکمت عملی اور میری ناچیز قربانی کی وجہ سے باقی ہے۔ میرا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ ان ہی کی دعاؤں کی وجہ سے میں کچھ اردو ادب سے واقف ہوسکا ورنہ میں بھی کسی بینک کا کلرک ہوتا یا کسی دفتر میں اکاؤنٹینٹ ہوتا۔

میں زور صاحب کے ان خوش نصیب شاگردوں میں سے ہوں جن کو ان کی زندگی کے آخری دور میں ان سے استفادہ کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ وہ وظیفہ پر سبک دوش ہونے کے بعد کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ بنادیے گئے تھے۔ اس وقت میں ایم۔ اے کی تکمیل کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ری سرچ انسٹیٹیوٹ میں ری سرچ فیلو منتخب ہو گیا تھا۔ ادارہ ادبیات اردو کی طرح ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ ڈاکٹر زور کا قائم کردہ ادارہ ہے۔ وہ اس ادارے کے ذریعے مختلف علوم و فنون میں اعلیٰ تحقیقاتی کام کرنے اور کروانے کا منصوبہ رکھتے تھے اس وقت پروفیسر ہمایوں کبیر تعلیم کے وزیر تھے۔ ڈاکٹر زور کو ان کی تائید حاصل تھی افسوس ہے کہ زور صاحب کی رحلت کی وجہ سے یہ سارا کام اور انسٹیوٹ دوسرے اصحاب کے ہاتھوں میں منتقل ہوگیا اور آج بھی موجود ہے جو اپنے بانی کی یاد دلاتا ہے۔

چوں کہ میں نے "مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات" پر مقالہ پیش کرکے ایم۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کی تھی اس لیے ڈاکٹر زور نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی خدمات پر کام کرنے کے لیے فیلو شپ منظور کیا تھا وہ خود میرے کام کے نگراں تھے۔ وہ سری نگر کشمیر میں رہتے تھے اور میں حیدرآباد میں۔ خطوط کے ذریعے وہ میری رہنمائی اور علمی اعانت فرمایا کرتے تھے۔ میں نے ان کے مشوروں اور اصلاحوں کو ایک مضمون کی صورت میں مرتب کیا تھا جس کو سلیمان اریب مرحوم نے اپنے رسالہ "صبا" میں شائع کیا تھا اس لیے اس کا اعادہ غیر ضروری ہوگا۔

ڈاکٹر زور بہ حیثیت استاد یہ جانتے تھے کہ استاد خود طلبا کے قریب ہوجائیں اور ان کو تیار کریں۔ اگر ان سے ملاقات میں دو چار دن کا وقفہ ہوجاتا تو برا مان لیتے تھے اور صاف کہتے تھے کہ "جو نگاہ سے دور وہ دل سے دور"۔

(باقی ص: ۷ پر)

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

استادِ محترم زور صاحب !

زور صاحب ! ______

اس ایک نام میں کتنی بزرگی، کتنی برگزیدگی، کتنی علمیت، کتنی شفقت، کتنا الطاف، کتنا کرمِ بے پایاں، کتنی اپنائیت، کتنی آسانی، کیسی سازگاری، کتنا اخلاص اور کیا کچھ پوشیدہ و پنہاں ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کو لوگ اردو کے اولین ماہرِ لسانیات، دکنی (قدیم اردو) کے محقق ادارہ ادبیات اردو کے بانی اور ایک ممتاز صاحبِ قلم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ میں بھی اپنی ذہنی بساط کے مطابق زور صاحب کی شخصیت کے ان پہلوؤں سے آگہی رکھتا ہوں لیکن زور صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو ہے اور وہ ہے بہ حیثیت استاد ______ !

زور صاحب کے بارے میں سنتے تو ضرور تھے۔ ممکن ہے اچٹتے ہوئے ایک آدھ بار دیکھ بھی لیا ہو لیکن ان سے نیاز حاصل کرنے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ اس کی ضرورت شاید پیش بھی نہیں آئی۔ اس کا کوئی سوال بھی نہیں تھا لیکن جب چادر گھاٹ ہائی اسکول (واقع عابد روڈ) سے میٹرک پاس کرکے وہیں قریب چادر گھاٹ کالج میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا تو خواجہ حمیدالدین شاہد صاحب اور قبلہ حامد صدیقی صاحب کے ساتھ جن اساتذہ کی شاگردی نصیب ہوئی ان میں زور صاحب بھی تھے۔ زور صاحب چادر گھاٹ کالج کے پرنسپال تھے ! ان جیسا پرنسپال کا ٹھاٹ باٹ میں نے بہت کم پرنسپالوں میں دیکھا ہے۔ زمانہ، طالب علمی میں نہیں، ایک دہ سال کالج اور تیس بتیس سال یونیورسٹیوں میں ملازمت کے دوران بیش تر ملحقہ اور یونیورسٹی کے کئی کالجوں کے پرنسپالوں کو ادھر ادھر دیکھا اور ان سے سابقہ بھی پڑا لیکن عہدہ کی وجاہت، کروفر، شان و شکوہ، آن بان، وزن وقار اور تزک و احتشام کسی میں نہیں پایا۔ زور صاحب کو پہلی مرتبہ بہ حیثیت پرنسپل ان کے اجلاس پر دیکھا کیا، بس دیکھتا رہ گیا اور آنِ واحد میں جوش کی نظم "الوداع" کا ایک مصرعہ ذہن میں گونجنے لگا جو انہی دنوں کہیں پڑھا تھا۔

اب بھی ہے نظروں میں آبائی امارت کا خمار

زور صاحب، نہایت کلے ٹھلے کے آدمی تھے۔ فربہ جسم لیکن موزوں اور متناسب، رعب دار چہرہ، چوڑی تھوڑی، اونچی پیشانی، روشن اور ذہین آنکھیں، زلفیں نہیں لیکن قدرے لمبے بال، کھنک دار اور بلند آہنگ آواز۔ شیروانی کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے پھولوں والی جو ان دنوں دیکھنے میں کم ہی آتی ہے اور بسا اوقات اسی کپڑے کی ٹوپی ___ مجموعی طور پر اپنے دور کی شستگی و شائستگی اور زیب و شرافت کا پیکر۔ یقین سے تو کہہ نہیں سکتا۔ زور صاحب کو ممکن ہے ایک آدھ مرتبہ سوٹ میں بھی دیکھا ہو۔

اپنے دولت کدہ پر تو زور صاحب تخت نشین ہوتے۔ پشت پر اور بازو گاؤ تکیے، سامنے پاندان اور کاغذات بکھرے ہوئے

لیکن کالج میں زور صاحب کرسی پر سامنے ایک بڑا اور پھر لمبا میز اطراف کرسیاں ___ وہ ہماری کلاس بھی وہیں لیتے۔ چادر گھاٹ کا انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ اردو ثانوی زبان تو کوئی اور پڑھاتا لیکن زور صاحب کے ذمہ اردو مضمونِ اختیاری تھا۔ ظاہر ہے کہ طلبہ کی تعداد کچھ زیادہ نہیں، بس چند ایک طالب علم۔ زور صاحب نے کبھی بھی صرف ہماری کلاس نہیں لی بلکہ وہ ہمارے گھنٹے میں بہ حیثیت پرنسپال کالج کی ذمہ داریوں کو بھی دیکھتے رہتے اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ ایسا نہیں کہ یوں تدریس کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہو اور تدریس بے مزہ! زور صاحب تدریس کے سلسلے کو بہت کم منقطع کرتے کیوں کہ زیادہ تر رسمی نوعیت کی درخواستیں ہوتیں جو یا تو طلبہ لے آتے یا متعلقہ کلرک اور زور صاحب اس پر دو الفاظ لکھ دیتے۔ "حسبِ قاعدہ!!" ___ یہ "حسبِ قاعدہ" ہم طلبہ میں اس قدر مقبول ہوگیا تھا کہ جب بھی کوئی فرد درخواست یا کوئی کاغذ لیے اجلاس پر آتا تو ہم میں سے کوئی دبے الفاظ میں کہہ دیتا: "حسبِ قاعدہ" ___ اس وقت زور صاحب کے لکچر کی آواز دھیمی ہوجاتی۔ ہاں کوئی بحث طلب بات ہو اور کسی مسل کو تفصیل سے دیکھنا ہوتا اور بات۔ ایسے میں چند منٹ زور صاحب کے مخاطب ہم نہ رہتے۔ متعلقہ طالبِ علم یا کلرک چلا جائے پھر زور صاحب کا لکچر جاری ___ زور صاحب کا لکچر، ایسا مربوط، ایسا مبسوط، ایسا پُرمغز اس قدر معلوماتی اور زبان و بیان کے اعتبار سے ایسا سجا سجایا ہوتا کہ گویا وہ کوئی لکچر نہ دے رہے ہوں، مقالہ پڑھ رہے ہوں۔ ہم لوگ نوٹس لیتے رہتے۔ میرے پاس آج بھی زور صاحب کے لکچرس کے کئی نوٹس مل جائیں گے۔ ہم میں سے کوئی طالبِ علم، مشکل لفظ، ترکیب یا اصطلاح وغیرہ کے معنی و مفہوم دریافت کرتا تو زور صاحب اس کی تشریح کرتے، کئی طرح اس لفظ یا ترکیب کا استعمال کرتے کہ متعلقہ طالبِ علم ہی کی نہیں ہم سب کی بھی تشفی ہوجاتی۔ زور صاحب متعلقہ مضمون یا موضوع پر لکچر دیتے ہوئے، مصنف کے بارے میں گفتگو کرتے، موضوع کے پس منظر پر تھوڑی بہت بات چیت ہوتی اور پھر توضیح و تصریح کا سلسلہ جاری رہتا اور گھنٹہ ختم ہونے کے بعد لگتا ہم علمی طور پر خاصے تونگر ہوگئے ہیں۔ زور صاحب نے کبھی اپنے علم کی دھونس نہیں جمائی لیکن جب ہم محسوس کرتے کہ ہمارا دامن اب تہی نہیں رہا تو ہم خود انھیں منبعِ جود سخا، سمجھنے پر مجبور ہوجاتے۔ کلاس سے قطع نظر زور صاحب "ہوم ورک" بھی دیتے یا ہم ہی چاہتے کہ اپنا کوئی مضمون وغیرہ زور صاحب کی نظر سے گزر جائے۔۔ چند ایک مضامین جن کو زور صاحب نے دیکھا میرے کاغذات میں کہیں نہ کہیں مل جائیں گے میں نے زور صاحب کی ان تصحیحات کو تعویذِ جاں بناکر رکھا ہے۔ ویسے آج بھی بعض اصحاب جن میں اساتذہ بھی شامل ہیں "تیغ" میں "و" اور "سوچ" میں "ن" کا استعمال کرتے ہیں۔ میں تو کم از کم طالبِ علمی کے اس دور میں کرتا تھا۔ زور صاحب نے اس کی صحت کی۔ ویسے وہ مضامین میں کہیں ایک آدھ لفظ کو محذوف کرکے یا کہیں کسی لفظ کا اضافہ کرکے یا یہاں وہاں تھوڑی بہت تبدیلی سے جملے کو کہیں کا کہیں پہنچا دیتے، مضمون کی تقدیر روشن ہوجاتی۔ قطعِ نظر اس کے زور صاحب باتوں باتوں میں مضمون نویسی وغیرہ کے بارے میں کئی باتیں کہہ جاتے۔ کئی نکات کی تصریح کرتے۔ کاش وہ ساری باتیں ذہن نشین ہوجاتیں۔

ایک وقت یوں ہوا ___ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے ہندی شعرا کا ایک پروگرام رکھا۔ میرے علاوہ دو شاعر اور بھی تھے۔ کارروائی یوں رہی کہ ہم میں سے ہر ایک نے اپنا کلام سنایا اور زور صاحب نے ہمارے ہر شعر کے بارے میں اپنی رائے دی۔ جہاں موقع ہوا سراہا اور جہاں خامی محسوس ہوئی اس کی طرف اشارہ کیا، اس کی اصلاح کی۔ شاعری میں دعویٰ تو خیر آج بھی نہیں لیکن مجموعی طور پر زور صاحب سے نظم و نثر میں فیض اٹھانے کے جو مواقع ملے انھیں میں اپنی زندگی کا مبارک ساعتوں میں شمار کرتا ہوں۔ ادبی زندگی میں آگے چل کر اور اساتذہ و اصحاب سے استفادہ کا موقع ملا لیکن اس ابتدائی دور میں زور صاحب کی چشمِ التفات نے کیا کیا

جادو نہیں جگایا۔ آج بھی کئی بار یہ خیال آتا ہے، بار بار یہ خیال آتا ہے کہ زور صاحب کی شاگردی نصیب نہ ہوتی تو شاید میں یہ نہ ہوتا۔ ایسا نہ کرتا، ایسا نہ لکھ پاتا۔ زور صاحب کی تربیت شاخِ گل میں بادِ سحرگاہی کے نم کی طرح اپنی شخصیت میں ہمہ وقت محسوس ہوتی ہے۔

زور صاحب سے میں نے صرف کلاس روم ہی میں نہیں سیکھا اور نہ صرف شعروادب کے باب میں بلکہ اس سے ہٹ کر بھی لوگوں سے ملنے ملانے کے آداب، گفتگو کرنے کے طریقے، اپنے ورثے کی تعظیم، تہذیبی اقدار کی پاس داری، لاکھ انتظامی ذمہ داریوں اور دیگر مصروفیات کے باوجود لکھنے پڑھنے سے غافل نہ رہنا۔ کام سے اخلاص، اوروں ہی کا نہیں اپنا بھی احترام کہ لوگ آپ کا احترام کریں اور ایک اونچے اور عالی مقصد کے لیے سرگرداں رہنا۔ میرے بی۔ اے میں داخلے کے بعد زور صاحب سے نیاز حاصل کرنے کے مواقع کم رہے۔ کبھی ادارہ، ادبیاتِ اردو میں، کبھی اردو فسٹیول میں، کبھی کسی ادبی جلسے میں۔ اسی زمانے میں اسٹانلی گرلز ہائی اسکول میں وہ تاریخی مشاعرہ ہوا جس میں جوش ملیح آبادی نے بھی شرکت کی تھی۔ زور صاحب اس مشاعرہ کے روحِ رواں تھے۔

زور صاحب کی خدمت میں حاضری کا جب بھی موقع ملتا وہ الطاف و عنایات کی بارشیں کرتے ملتے۔ پڑھنے پڑھانے کے بارے میں دریافت کرلیتے اور پھر زور صاحب کشمیر چلے گئے۔ تعطیلات وغیرہ میں جب بھی ان کا حیدرآباد آنا ہوتا ہم لوگ ان سے ملاقات کے لیے ایوانِ اردو پہنچتے۔ ان دنوں حیدرآباد میں ان کی مصروفیات زیادہ رہتیں۔ پھر بھی وہ ہم طلبہ کو وقت دیتے۔ وہ اپنے تمام ملنے والوں کو بلا تخصیص کشمیر آنے کی دعوت دیتے۔ اس زمانے میں ایسی کوئی صورت کہاں نکلتی اور جب ہم کشمیر پہنچے تو زور صاحب اس جنت ارضی سے جنت الفردوس کی طرف کوچ کرچکے تھے۔ خانیار میں ان کے مزار پر زیارت کے لیے جانا تھا ہی۔ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھایا، آواز گلوگیر ہوگئی، آنکھیں اشک بار ـــــ من بعد جب بھی کشمیر جانا ہوا خانیار میں زور صاحب اور جواہر نگر کے قبرستان میں سروری صاحب کے مزارات پر حاضری معمولات میں شامل ہوگئی۔ ان اساتذہ کے شاگرد ہونے کے احساس کو کچھ جلا مل جاتی۔ اپنی شخصیت میں کچھ مہک کچھ رنگینی کچھ روشنی محسوس ہوتی۔ زور صاحب کے مزار پر وہی رعب داب پایا جو ان کی شخصیت کا جزو تھا۔ زور صاحب کا مزار ایک اونچے چبوترے پر ہے۔ لگتا ہے زور صاحب جیسے اب بھی تخت نشین ہیں اور میرے آنے پر مسکراکر دیکھتے ہوئے کہہ رہے ہیں: "آگئے پھر، حسبِ قاعدہ"!

●○

ڈاکٹر غیاث صدیقی

پروفیسر ڈاکٹر زور مرحوم

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور دکن سے اسی طرح پیار کرتے تھے جس طرح Consper اپنی محبوبہ سے کرتا ہے۔

With all thy faults

I love thee still

تیری ساری کمزوریوں کے باوجود میں تجھ سے محبت کرتا ہوں ایک شاعر اختصار و اجمال کو پیشِ نظر رکھ کر یوں بھی کہہ چکا ہے:

شاخِ گل پر پھول بھی میرا، خار بھی میرے

جب اردو زبان علم و فن کے چٹخاروں سے ناواقف تھی، عوام کے دلوں اور ذہنوں پر حکمرانی کی لذت سے ناآشنا تھی تو دلی اور لکھنو کے اردو داں اہلِ زبان کہلاتے تھے۔

اس میں کیا شک ہے کہ انھوں نے ادب کے بیش تر میدانوں میں اپنے جوہر دکھائے اور خوب دکھائے لیکن کسی عظیم زبان کی منزل داستان، تمثیل، ناول، افسانہ، کہانی، مثنوی، قصیدہ و ہجو اور نظم و نثر کے ادبی سرمائے تک ہی محدود نہیں رہتی اور اگر ایسا ہو تو وہ زبان، عظیم زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔

جس طرح حیات و کائنات کی وسعت متقاضی ہے کہ ہزاروں فنون کی آنکھوں سے اسے دیکھا جائے، ان گنت انگلیوں سے چھوکر اسے محسوس کیا جائے، لاتعداد احساسات و جذبات سے اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ شش جہت سے اس پر روشنی کے جھماکے ٹوٹ پڑیں اور ان کے ہر پہلو کا عکس ایک نئے تجسس کا متقاضی ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ ایک عظیم زبان نے اپنے وجود کا اعلان کیا ہے۔

تخلیقِ ادب کے گلشن میں اگر دلی اور لکھنو کے محسنوں نے رنگ رنگ کے پھول کھلائے تو اردو کے دامن میں اہلِ دکن نے بھی علوم و فنون کے خزانے بھر دیے۔

جامعہ عثمانیہ نے محبوبہ، اردو کو گلشنِ ادب کے علاوہ تاریخ سائنس، فلسفہ، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات اور فلکیات وغیرہ کے گلشنوں کی بھی نہ صرف سیر کروائی بلکہ اپنے دل و دماغ سے روشنیاں برسائی ہیں۔

فنِ ترجمہ کے دکنی اساتذہ نے اردو زبان کو عالمی زبان کا درجہ عطا کیا ہے۔ اب وہ گل و بلبل اور حسن و عشق کی وادیاں طے کرکے ہمالیہ کی چوٹی پر کھڑی ہے اور دنیا کی کسی بھی عظیم زبان سے آنکھیں ملاسکتی ہے اور اہلِ دکن کو اس کارنامے پر مسرت ہے کہ انھوں نے یہ سب کچھ کیا اور اب بھی کررہے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ نے کئی نامور سپوت پیدا کیے جن کے نقوشِ پا کے آگے شاید بین الاقوامی شہرت کے چاند، سکندری دکھاتے ہیں۔ میں یہاں مادرِ جامعہ کے ان تمام فرزندوں کے نام نہیں گنواؤں گا جن کی پیشانیوں کو بین الاقوامی شہرت نے چوما اور ان کے

ں پر فضیلت علم کے تاج رکھے بلکہ ایک ایسے عاشقِ اردو کا ذکر کروں گا جو محبوبہ ۔ دکن کی ہر ادا پر مرمٹا ۔ کیا شاعری ، کیا نثر ، ں کی تاریخ و تہذیب کے ہر پہلو کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور بہ صد افتخار پیش کیا ۔ جھجک ، شرم ، ندامت اور احساس کم تری کے ہیوں نے تلواریں ، ڈھالیں پھینک کر گم نامی کے غاروں میں اپنے چہرے چھپالیے اور اہلِ زبان کے گھسے پٹے سکّے چند مٹھیوں میں رہ ۔ اس نئی سلطنت کا حکم ران ڈاکٹر زور تھا جس نے اہلِ دکن کو نئی راہیں دکھائیں ۔ عزم و ہمت کے اسپ و شتر و فیل عطا کیے ۔ یق و تنقید کی قچیاں دیں ۔ مہمیز دیے ، نوجوانوں کے بازوؤں کو پرِ پرواز لگا کر منزل کی جانب گام زن کیا پروفیسر رشید احمد صدیقی نے تھا اگر غالب نہ ہوتے تو اقبال نہ پیدا ہوتے ۔ میں کہتا ہوں کہ اگر زور نہ ہوتے تو صاحب زادہ میکش ، مخدوم ، سکندر علی وجد ، اور ثر راج بہادر گوڑ دکن میں اپنے ساتھیوں کے دلوں اور آنکھوں میں روشنی کہاں سے لاتے ۔ کم بخت دکن کی مٹی بھی ایسی ہے کہ کیا ں ، کم سخن شرمیلی ! اوروں کی طرح نہ اشتہار بازی آتی ہے نہ اس کو باتوں کے طوطا مینا بنانا آتا ہے ۔ دوسری ریاستوں میں تو ایک ی فن کار کو بھی اس کے ساتھی اپنے سروں پر بٹھا لیتے ہیں ، باہمی توصیف کے نقارے بجائے جاتے ہیں ۔ تحقیق و تنقید میں ان کی یں آس پاس سے آگے نہیں جاتیں ۔

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

آنکھیں دکن پر کم اٹھتی ہیں ۔ ڈاکٹر زور نے اس طلسم کو توڑا ادارہ ۔ ادبیات اردو کے لیے قابل شخصیتوں کا انتخاب کیا ۔ ایوانِ اردو ر کیا ۔ اس میں اہلِ علم و دانش کو ان کے اعزاز کے مطابق تخت و تاج عطا کیے اور دکن کی زبان و تاریخ زبان کو تسخیر ذہن و قلب ہ جادو عطا کیا جو عظیم بھارت کے ہر شعبہ ۔ حیات میں سرچڑھ کر بول رہا ہے ۔ جس نے ڈاکٹر زور کو قریب سے بھی دیکھا ہے اور سے بھی ان کے جاں نثاروں کی محفل میں بیٹھ کر بھی ان کے مخالفین کی صفوں میں گھس کر بھی اگر دیانت داری ، غیر جانب داری ، گوئی ۔ بے باکی اپنی آنکھیں کھولیں ، وسعت قلب و نظر کے ہاتھ تعصب کے پردوں کو اٹھادیں تو یہ حقیقت ضرور نظر آئے گی کہ ایک قِ اردو قبلہ رو بیٹھا ہے اور اپنے رب سے اردو کی بقا اور ترقی کی دعائیں مانگ رہا ہے اور کشمیر سے دکن تک ایک عجیب روشنی پھیلی ہا ہے ۔

○●○

سید صفی الدین قادری

میرے والدِ محترم

اردو کے صاحبِ طرز ادیب ، ماہرِ لسانیات ، مورخِ دکن ممتاز محقق و بلند پایہ نقاد اور بانیِ ادارہ ، ادبیاتِ اردو و ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کی علمی و ادبی شخصیت سے اردو دنیا کا ہر فرد بہ خوبی واقف ہے۔ ڈاکٹر زور نے نصف صدی سے زیادہ کا زمانہ علم و ادب ، تہذیب و تمدن اور اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں گزارا وار اپنی وفات تک بھی اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔ اردو بنیاد شہرِ حیدرآباد میں ان کا جنم ہوا اور اردو زبان کی ریاست کشمیر کے شہر سری نگر میں وفات پائی۔ ڈاکٹر صاحب کی حیات و موت دونوں کا سرچشمہ اردو ہی رہا۔ ایسی فضیلتیں اور سعادتیں بہت کم حضرات کو نصیب ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر زور نے اردو کے لیے اتنا کچھ کیا کہ اس کا سرسری اظہار بھی کیا جائے تو کئی ایک گھنٹے اور دن درکار ہوں گے۔ ان کی یاد اور خدمات کے اعتراف میں ملک کے ہر چپہ سے مضامین لکھے گئے شاعروں نے منظوم خراجِ عقیدت ادا کیا۔ استادوں اور شاگردوں و طالبِ علموں نے ان کی یاد منائی ، آنسو بہائے اور ان کی طرح اردو کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہونے کا بیڑا اٹھایا۔ ادارہ ادبیاتِ اردو تو ڈاکٹر زور کا دوسرا نام ہے جو ان کے کاموں کی طرح تا ابد انشاء اللہ سلامت باکرامت رہے گا۔ حیدرآباد کے چپے چپے سے ان کو عشق تھا۔ ڈاکٹر زور صاحب نے علم و دانش کا جو چراغ اردو دنیا میں روشن کیا تھا اس کی جوت قائم ہے اور انشاء اللہ قائم رہے گی۔ مرحوم کی یاد میں ادارہ ، ادبیاتِ اردو کی طرف سے سب رس کا ضخیم زور نمبر اور یادگار کتابیں "یادگار زور" شائع ہوئی تھیں ریاست جموں کشمیر نے بھی اپنے پہلے اردو پروفیسر کی خدمت کے اعتراف میں سرکاری طور پر مجلہ "شیرازہ" کا قیمتی اور باتصویر "زور نمبر" شائع کرکے خراجِ عقیدت ادا کیا۔ ادارہ ، ادبیاتِ اردو کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کی سالانہ یاد اور یومِ زور تقاریب نہایت اہتمام سے منائی جاتی ہیں۔ یہ اور ایسی کئی باتیں تو سب حضرات جانتے ہیں۔

اب ہم اپنے والدِ محترم کے چند خانگی حالات بھی پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر زور صاحب اپنے خسر نواب رفعت یار جنگ ثانی کی کوٹھی رفعت منزل کے وسیع و عریض احاطہ میں واقع ایک خوش نما بنگلہ تہنیت منزل میں رہا کرتے تھے۔ تہنیت منزل شہر حیدرآباد کے شمال میں اس گرانڈ ٹرنک روڈ پر واقع ہے جو بمبئی جاتی ہے جو ایک پُر فضا اور پُرسکون مقام تھا اب تو یہاں آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ بابا ۱۹۲۷ء سے کشمیر جانے تک ۱۹۶۱ء یہیں اپنی علمی و ادبی زندگی کے تیس اکتیس سال گزارے آپ کو اپنے خسر سے اتنی عقیدت تھی کہ آپ نے اپنے مکان تہنیت منزل علیحدہ ہونے کے باوجود بھی رفعت منزل ہی کہا کرتے تھے اور تمام کتب و خطوط میں یہی رفعت منزل کا پتہ لکھا ہے۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا بابا کو لکھتے پڑھتے اور رات دیر گئے تک علمی ادبی تحقیقاتی اور ادارے و کالج کے کاموں میں مصروف پایا۔ ہم نے دیکھا ہے ہر روز دیکھا ہے کہ بابا تڑکے سویرے بیدار ہوتے۔ تہنیت منزل کے بالائی حصہ میں آرام فرماتے تھے۔ صبح گجردم بابا کی آنکھ کھلتی درود و وظائف میں مصروف رہتے

یڈ ٹی نوش فرما کر ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد اخبارات کا مطالعہ فرماتے ۔ سیاست ، ملاپ ، رہنمائے دکن اور دکن کرانیکل بریں ملاحظہ فرماتے ۔ پہلے مقامی خبروں کی طرف نظر جاتی پھر ملکی و بین الاقوامی خبروں کا مطالعہ کرلیتے ۔ ہفتہ میں دو بار عبدالرشید ن سے سارے جسم کی مالش کرواتے اور غسل سے فارغ ہوکر سات بجے نیچے اترتے ۔ اس سے قبل ہم لوگ یا تو لوگ جاگ جاتے یا بگائے جاتے کیوں کہ صبح عربی کے استاد مقرر تھے جب امتحانات کا زمانہ ہوتا تو بابا ہم لوگوں کو بڑی ہی شفقت اور محبت سے جگایا ے ہمت بڑھاتے اور مطالعہ کی طرف توجہ دلاتے اور کبھی ڈانٹ بھی پڑتی کیوں کہ بابا کو دیر میں اٹھنا پسند نہیں تھا اور پھر ناشتے پر ہم ، کو بابا کے ساتھ رہنا پڑتا تھا صبح سویرے جاگنے اور صحت کے بارے میں اکثر ہم لوگوں کو تاکید فرمایا کرتے تھے ۔

اس طرح بابا کی مصروفیات علی الصبح پانچ بجے سے شروع ہوجاتیں ۔ صبح کے ناشتے سے فارغ ہوکر ریڈیو سے خبریں سنتے اور مختلف کام ایک ساتھ شروع ہوجاتے ، خطوط کے جواب لکھے جاتے ۔ مخطوطات کا مطالعہ اور ان کی شیرازہ بندی کا کام چلتا ۔ تذکرہ ، طات کی وضاحتی فہرستوں پر نظر ثانی کی جاتی ۔ ٹیلیفون آتے ، کیے جاتے ، بات بھی ہوتی اور تخت پر تشریف فرما پیڈ پر قلم بھی چلتا ۔ نوکر یا گھر کے کسی فرد سے بات چیت بھی کرتے ، ہدایات بھی دیے جاتے ۔ غضب ناک بھی ہوجاتے ہیں تو دیکھتے ہی دیکھتے اہٹ بھی ان کے لبوں پر کھیل جاتی تھی ۔

غرض ساڑھے نو بجے صبح تک والد صاحب لکھنے پڑھنے کے کاموں میں یک سر ڈوبے رہتے ۔ اور پھر ہم سب کو ہمارے اسکولوں چھوڑتے ہوئے بہ ذریعہ کار چادر گھاٹ کالج تشریف لے جاتے ۔ ہر روز کالج جانے سے پہلے اپنے والد صاحب کی درگاہ جاتے کالج سے ں پر ہم سب کو لیتے ہوئے گھر آتے ہم لوگ تو کھیل کود میں لگ جاتے اور بابا منھ ہاتھ دھوکر چائے پیتے اور پھر اپنے تخت پر بیٹھ ے تو ادارے کی ڈاک پیش کی جاتی ، ملاقاتی اور غرض مند آتے سفارشیں لکھی جاتیں ۔ ٹیلیفون کیے جاتے مضامین ٹائپ کروائے دفتر کے کاروبار پر تجویزیں کی جاتیں ادارہ کی ترقی کے منصوبوں پر مختلف شخصیتوں کو مدعو کرنے کے بارے میں اور کتب خانہ و یم کی ترقی و وسعت کے منصوبوں پر غور کرنے لگتے ۔ پروفیسروں ، ادیبوں ، شاعروں اور طالب علموں سے لے کر گھر کے افراد تک بات چیت اور صلاح مشورہ کرتے ۔ یہ سب چیزیں بہ یک وقت عمل میں آتیں اور تھوڑی دیر میں ان سب کاموں سے فارغ ہوکر ر شکل آتے چمن کی کیاریوں میں محو گل گشت ہوتے ۔

بابا کو باغ بانی سے گہری دل چسپی تھی ۔ اپنی گو ناگوں مصروفیات کے باوجود روز صبح و شام ایک آدھ گھنٹہ باغ بانی میں ف کرتے تھے ۔ مختلف انواع و اقسام کے پودوں اور بیلوں کو لاکر خاص طور پر لگاتے خود مالی کو ساتھ لے کر باغ میں جاتے درختوں کو نتے اور سوکھے پتوں اور ڈالیوں کو توڑ کر الگ کرتے اور صفائی کے بارے میں ہدایات دیتے ۔

بعد مغرب چہل قدمی کے لیے نکلتے کھلی فضا میں دور تک ٹہلتے اور اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے سوچا کرتے ۔ اکثر اوقات گ بھی بابا کے ساتھ تفریح میں رہتے اردو مشاہیر ، قطب شاہی تہذیب و تمدن اور بالعموم حیدرآباد والوں کی تہذیب ، رہن سہن اور کے بارے میں ہم لوگوں کو دل چسپ واقعات سناتے اور اس قدر عمدہ انداز میں ایک ایک بات کا اظہار کرتے کہ بات دل و دماغ بیٹھ جاتی ۔ نمائش کے دنوں میں بابا ہم سب بچوں کو لے کر نمائش جاتے ساتھ مراد علی صاحب طالع اور نواب عبدالرحمن شریف بھی تے ۔ ہر بار ہم لوگوں کو کچھ نہ کچھ دلا ہی دیتے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی خالی ہاتھ آئے ۔

اکثر قلعہ گولکنڈہ جایا کرتے جب بھی ہم کو چھٹیاں ہوتیں تو ہم لوگ بھی ساتھ ہوتے ۔ کبھی دوپہر کا کھانا قطب شاہی گنبدان

پر کھاتے تو کبھی شام کی چائے کاقدی برج پر ہوتی کبھی درخت ہاتیان کے نیچے شام ہوتی تو کبھی محلات شاہی میں دن گزرتا۔

عمدہ غذا کے شوقین تھے اور اوقات مقررہ پر کھانا کھاتے تھے کثرت سے چائے پیتے اور پان کے شائق تھے میٹھے پر بھی خاص رغبت تھی۔ خود کھاتے عزیزوں اور دوستوں کی تواضع فرماتے۔ ہم سب بھائی بہنوں کو خوب کھانے کی تلقین کرتے اور کہتے تھے کہ جلد کھاکر ختم کرو خدا اور دے گا۔

وہ خلوت میں بھی انجمن تھے اور بجائے خود ایک ادارہ، ایک تحریک تھے صاف دل کشادہ دماغ صاف گو تو تھے ہی کسی کے برے وقت پر خندہ پیشانی سے کام آتے اور لوگوں کی جائز امداد میں کبھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ زندگی بھر کسی کو کسی قسم کی اذیت اپنے قلم یا زبان سے نہیں پہنچائی۔ ہر دم بھلائی اور نیکی پیشِ نظر رہی۔ نیکی کر دریا میں ڈال کے مصداق کسی کی دست گیری کرتے تو اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

غصے کے نہیں آتا بابا کو بھی غصہ آتا تھا مگر پانی کے ابال کی طرح آیا اور دیکھتے کے دیکھتے ٹھنڈا ہوگیا۔ غصہ میں بے قابو ہوکر کبھی کسی کی زندگی کو ناکام بنانے یا نقصان پہنچانے کے درپے نہیں رہے۔

والد مرحوم کو تعمیر سے بھی دل چسپی تھی انھوں نے خود اپنی نگرانی میں کئی عمارتیں بنائیں تہنیت منزل میں دو مکان درگاہ کی عمارتیں اور خانقاہ عنایت اللٰہی اور پھر یہ ایوانِ اردو کی عالی شان عمارت کو بھی آپ نے اپنی کاوشوں سے پایہء تکمیل کو پہنچایا۔

والد صاحب نے ہمارے دادا حضرت غلام محمد زمؒ کی ایک شان دار گنبد اور خانقاہ اور اس سے ملحقہ کئی عمارتیں بنائیں جو پل مسلم جنگ کے بازو واقع ہے۔

بابا ہر سال اپنے والد کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا کرتے تھے۔ تین روز تک تقریبیں منعقد ہوتی رہتیں مسجد چوک سے صندل درگاہ لایا جاتا، صندل مالی ہوتی پھول و چادر چڑھائی جاتی۔ وعظ ہوتا مشاعرہ، قوالی اور ختمِ قرآن ہوتا لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہر کام بہ نفسِ نفیس کرتے۔ ہندو مسلم سب ہی شریک ہوتے گویا بابا انگریزی تہذیب سے تو خوب واقف تھے اور انھوں نے کئی سال لندن اور پیرس میں گزارے تھے پھر بھی انھوں نے اپنے والد صاحب کی اتنی عزت و قدر کی شاید ہی کوئی کرے۔ بابا کی نظر میں دادا حضرت کی قدر اور منزلت اس وقت سے اور بھی بڑھ گئی جب سے کہ بابا نے ان کو دفن سے چالیس دن بعد قبر میں تر و تازہ پایا۔ بابا کا بیان ہے کہ جب وہ قبر کو پختہ بنانے کا ارادہ کرچکے تو چہلم کے بعد جب بابا نے ایک گورکن کو قبر کی ایک کڑی ہٹانے کو کہا تو وہ اس سے انکار کرڈالا لیکن بابا نے جب خود ہی کڑیاں ہٹائیں تو پہلے خوب خوشبو آئی اور پھر جب اندر نظر ڈالی تو کیا دیکھتے ہیں کہ کپڑا چہرے پر سے ہٹا ہوا ہے ڈاڑھی اور چہرا بالکل ویسا ہی ہے جیساکہ دفن کے وقت تھا۔ اس کا بابا پر بہت اثر ہوا کیوں کہ حافظِ قرآن کا سینہ اور دماغ تو اللہ تعالیٰ محفوظ ہی کرلیتے ہیں۔

ہم نے بابا کو ایوانِ اردو کی تعمیر سے لے کر اس کے افتتاح تک بھی دیکھا اور یومِ قلی سے لے کر سری نگر کشمیر میں جشنِ کشمیر اور شعبہء اردو کی توسیع و ترقی تک بھی دیکھا ہے۔ عوام سے لے کر شاہ زادوں، وزیروں، راجاؤں اور صدہ داروں تک سبھی سے انکار ربط و ضبط تھا انھوں نے کبھی دروغ گوئی اور زمانہ سازی سے کام نہیں لیا۔ برابر والوں سے برابری کا سلوک روا رکھا۔

وزیروں اور سفیروں سے بھی بابا کے مخلصانہ مراسم تھے۔ سب کو اردو کے لیے استعمال کیا۔ ملازموں اور شاگردوں سے بھی ان کے تعلقات کچھ ایسے تھے کہ سب انھیں جی جان سے چاہتے تھے۔ مزاج میں سادگی کے ساتھ نفاست اور ستھرائی بھی تھی کیفیان نہ ہو خود

ایک شعر ہے جو ان کے مزاج اور کردار کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے فرماتے ہیں۔

ذوقِ پاکیزہ سے ہر چیز ہے پُر لطف و حسیں
یہ نہ حاصل ہو تو بے کار ہے دنیا ہو کہ دیں

ہم کو اچھی طرح یاد ہے کہ ایوانِ اردو عمارت کی تعمیر میں بابا خود بہ نفسِ نفیس عملی حصہ لیتے تھے بلکہ چھٹیوں میں ہم بھائیوں کو اور تھاپی پھاوڑا ہاتھ سے دے کر کہتے آؤ اردو کے گھر کی تعمیر کرو ہم سب مزدوروں کے ساتھ مل کر خوشی خوشی اینٹ پر اینٹ اور پتھر رکھتے اور گارہ مٹی اٹھا اٹھا کر دیواروں پر ڈالتے تھے۔ بڑے بھائی صاحب کو بابا نے ایک اسپرے مشین دلواکر ایوان کے در و ں اور کھڑکیوں کو پینٹ کروایا اور کلر خود پسند کرتے تھے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے بابا خود جاکر کتبوں اور مزاروں کی تحریروں کے کے چربے لاتے اور ہماری بہنوں کو دیتے کہ اس میں رنگ بھرو جب وہ خوشنما تحریریں تیار ہوجاتیں تو بابا خوش ہوتے چہرہ چمکنے ر خود ان کو لے کر اس عمارت میں آتے اور اس کی دیواروں پر اس کو لگاتے سب کو پڑھ پڑھ کر سناتے اور خوش ہوتے۔ اب تزئینِ موقعہ پر پتہ نہیں ان کو کیوں نکال دیا گیا۔

یہ قلمی تصاویر کو یہاں ہال کی دیواروں پر آپ آویزاں دیکھ رہے ہیں یہ بابا نے اپنے بچپن کے ساتھی نواب صاحب لرحمٰن شریف) سے اتروائی ہیں اور خود اس کے نوکِ پلک ٹھیک کیے ہیں۔ جو بھی تصویر بابا کو پسند نہ آتی اسے پھر بنواتے اور ب تعریف کرتے تھے۔

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ یہ جو بڑی پینٹنگ آپ کو اوپر نظر آرہی ہے یہ ایک چھوٹی سی تصویر تھی جس کو بابا نے بڑی ں سے حاصل کیا اس کی فوٹو لے کر اسے دکھن کے مشہور زماں فوٹوگرافر راجہ دین دیال کے صاحب زادے امین چند صاحب سے ں میں ایک بڑے کینویس پر پروجیکٹر کے ذریعے اندراج کرواکر اتروایا ہے اور اس کی رنگ سازی کروائی جس کے تیار ہونے میں تے لگ گئے۔ ہمیں خوب یاد ہے کہ بابا ہر آنے والے معزز مہماں کو اس کی تفصیل سناتے کہ قلی قطب شاہ جب شکار کو نکلتے تو ان اتھ کیا کیا ہوتا۔ ماہی مراتب علم نشاں جھنڈا ہوتا وزیرِ اعظم میر مومن کسی گھوڑے پر سوار ہیں اور بادشاہ کا دشمن کس طرح قیدی نکار کے موقع پر بھی ساتھ رکھا جاتا وغیرہ وغیرہ۔ ان کا اندازِ بیاں اتنا دل کش ہوتا کہ سننے والا کچھ دیر اس منظر میں گم ہوجاتا۔

بابا کی فراست اور دور بینی نے بھانپ لیا تھا کہ ادارہ کو جو امداد حکومتِ ہند اور دوسری ریاستی حکومتوں جیسے آندھرا پردیش، ، بنگال، اترپردیش اور کشمیر سے ملتی ہے وہ آگے چل کر بند ہوجائے گی اس فکر نے انھیں مجبور کیا اور بابا نے اس وقت کے بواڑا گوپالا ریڈی صاحب کو ساتھ لے کر اپنے مخلص ساتھیوں ڈاکٹر مندر راج سکسینہ صاحب محامد علی عباسی صاحب وغیرہ کے تعاون ولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ قائم کیا ہمیں یاد ہے بابا فرمایا کرتے تھے آگے چل کر اردو کے نام پر اتنی بڑی امداد ملے گی اس لیے میں مولانا آزاد کے نام پر ایک ادارہ ریسرچ کے لیے کھول رہا ہوں تاکہ ادارہ، ادبیات کے کام جاری رہیں۔ اس لد صاحب نے نہ صرف ادارے کی مجلسِ انتظامی کے لوگوں کو آزاد انسٹیٹیوٹ کے Executive بورڈ میں شامل کیا بلکہ یوٹ کا دفتر ایوانِ اردو میں اور اس کی لائبریری اپنے مکان تہنیت منزل میں رکھی تھی اور سوچ رہے تھے کہ ایوانِ اردو کے شمالی کی کھلی اراضی خریدلی جائے اس لیے جعفر علی خاں صاحب کے لے پالک قطب علی کو بلوا کر بات چیت بھی شروع فرمادی تھی اور بست شان دار نقشہ بھی تیار کرلیا تھا کہ ایوانِ اردو سے متصل ایل شیپ کی عمارت اور ایک درمیان میں Lawn بنانے کا نقشہ

ذہن میں تھا مگر حیات نے ساتھ نہ دیا۔ گو بابا کو ہم سے رخصت ہوئے ۳۶ سال کا عرصہ ہورہا ہے مگر ہمارا جی نہیں مانتا کہ وہ ہم میں نہیں ہیں ہر دم وہ ہمیں یاد آتے ہیں ان کی زندگی ان کے کام ان کا ذوقِ عمل شوقِ طلب ہر دم ہمیں حیات اور حرکت کا سبق دیتا ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم اس برگزیدہ ہستی کے خاکِ پا ہیں جس نے اردو زبان و ادب کی تا دمِ آخریں خلوص جراءت اور بے باکی کے ساتھ بے لوث اور ان تھک خدمت کی۔ کبھی نام و نمود اور شہرت کے وہ طلب گار نہ ہوئے اور نہ کبھی دولت و ثروت اور امارت، راحت کی طرف دوڑے کیوں کہ وہ خود اس کا اظہار اس شعر میں کرتے ہیں کہ

اے زور نہ کر راحت کی ہوس دنیا ہے یہ سب دھوکے کی جگہ
چشمہ بھی سراب آتا ہے نظر جب پیاس بجھانے جاتا ہوں

ڈاکٹر زور صاحب کی زندگی قلندری اور سادگی کی ایسی مثال ہے جس سے ہم کو سبق لینا ضروری ہے۔ بابا کے اس شعر پر اب ہم اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں جو بالکل صحیح ثابت ہورہا ہے۔

موت سے بھی مریں گے نہیں زور ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

ادارہ ادبیات اردو کے دوامی رکن

۱	جناب محمد عبدالرحمن صدیقی صاحب	(امریکہ)
۲	جناب غلام نورالدین صاحب	"
۳	جناب سید فرید محی الدین صاحب	"
۴	ڈاکٹر وحید رومی صاحب	"
۵	محترمہ رقیہ جیلانی صاحبہ	"
۶	جناب انیل۔ کے۔ چوپڑا صاحب	"
۷	جناب عزیز احمد صاحب	(کینیڈا)
۸	محترمہ مسعود صدیقی صاحبہ	"
۹	جناب جوش مندوزئی صاحب	"
۱۰	ڈاکٹر بدالدین خاں صاحب	"
۱۱	جناب محمد قمرالدین صاحب	"
۱۲	جناب ڈبلیو۔ اے۔ شاہین صاحب	"
۱۳	محترمہ صدیقہ شبنم صاحبہ	(برطانیہ)
۱۴	جناب محمد عابد صدیقی صاحب	"
۱۵	جناب مرزا مظفر بیگ صاحب	"
۱۶	جناب خواجہ قمر الدین صاحب	"
۱۷	جناب محمد عبداللہ شاہ صدیقی صاحب	"
۱۸	ڈاکٹر عابد معز صاحب	(سعودی عرب)
۱۹	جناب شریف اسلم صاحب	"
۲۰	جناب سلیم فاروقی صاحب	"
۲۱	ڈاکٹر مجید قاضی صاحب	"
۲۲	ڈاکٹر خالد عبدالسمیع صاحب	"
۲۳	ڈاکٹر غفار حسینی صاحب	"
۲۴	جناب سید وسیم الدین صاحب	"
۲۵	جناب محمد اسلم عمادی صاحب	(کویت)
۲۶	جناب سید عبدالقدوس صاحب	(حیدرآباد)
۲۷	محترمہ شاہدہ صمد صاحبہ	"
۲۸	جناب خان محمد عمر خاں صاحب	"
۲۹	محترمہ اختر سلطانہ صاحبہ	"
۳۰	محترمہ نجمہ نفیس صاحبہ	"
۳۱	جناب سلیم فاروقی صاحب	"
۳۲	جناب مضطر مجاز صاحب	"
۳۳	جناب کریم اللہ خاں صاحب	"
۳۴	جناب عبدالرحمن انصاری صاحب	"
۳۵	جناب سید سیادت علی صاحب	"
۳۶	جناب عبدالرحیم آرزو صاحب	(گلبرگہ)

ڈاکٹر زیب حیدر

ڈاکٹر زور شخصیت و کارنامے

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

یوں تو بچپن ہی سے میں زور صاحب کی شخصیت سے معنوی طور پر متاثر تھی اور ان کی شخصیت اور ان کی شہرت جو دانش ور بقے میں تھی اس سے مجھ میں مجھے زور صاحب سے ایک قسم کی یگانگت اور عقیدت کا احساس پیدا ہوگیا تھا۔ میں جس وقت اسس چہارم کی طالبہ تھی میری کہانی سب رس میں چھپی۔ اس وقت سب رس میں بچوں کا حصہ بھی رہتا تھا اور میں بڑے فخر کے اتھ وہ کہانی سب کو دکھاتی پھری کہ دیکھیے میری بھی کہانی سب رس میں چھپی ہے۔ زور صاحب کو دیکھنے اور ان سے بات چیت کرنے بہت آرزو تھی اور یہ اشتیاق آخر ایک دن پورا ہو ہی گیا۔

جس وقت میں بی۔ اے فرسٹ ایر میں تھی تہذیب آپا صاحبہ ویمنس کالج میں عربی کی لکچرر تھیں اور شریف آپا صاحبہ ذکیہ پا صاحبہ اور لیاقت آپا صاحبہ سے ان کی دوستی تھی اور یہ لوگ زور صاحب کے گھر آیا جایا کرتے تھے۔ اتفاقاً اس سال "یوم قلی قطب اہ کے موقع پر تہذیب آپا صاحبہ نے ان تینوں اساتذہ کو اپنے گھر لے آنے کا پروگرام بنایا۔ ان کو "یوم قلی قطب شاہ" کے موقع پر جو بی اجلاس ہوتا ہے اس میں اپنا مقالہ سنانا تھا۔ مجھے بھی تہذیب آپا نے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی اب حال یہ تھا کہ اندھا کیا چاہے آنکھیں۔ مجھے اس طرح زور صاحب کو دیکھنے اوران سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ شریف آپا صاحبہ نے زور صاحب سے میرا ارف کروایا انھوں نے بہت ہی شفقت سے میرا حال احوال پوچھا اور کچھ دیر مجھ سے بات کی۔ اس کے بعد وہ توفیق و توقیر کے ساتھ ے اطمینان سے چپس کھیلتے رہے۔

اس وقت میں نے ایوان کی جو شان و شوکت دیکھی تھی وہ مغنی صاحب کے زمانے میں پھر لوٹ آئی۔ درمیان میں کچھ سالوں ب میوزیم بند رہا۔ کتابیں تو آسانی سے پڑھنے کے لیے دستیاب ہوجاتی تھی لیکن اگر کوئی چیز میوزیم کی دیکھنی ہوتی تو مشکل پیش آتی ہے۔ مرحوم سراج الدین صاحب سے جب میں کہتی کہ مجھے میوزیم میں فلاں چیز دیکھنی ہے تو وہ کہتے آپ کی پیاسس اور بڑھنے دیجیے ر دو تین دن کے بعد مطلوبہ چیزیں جیسے سکہ اور اسناد وغیرہ دیکھنے کا موقع ملے گا۔

زور صاحب ایک شخص نہیں بلکہ خود ایک ادارہ اور انجمن تھے اور انھوں نے بہت ہی کدو کاوش کے بعد ایوان کے میوزیم لے لیے اتنی ساری نایاب اور کم یاب چیزیں جمع کیں اور کتب خانہ کے لیے مختلف جگہوں سے کتابیں اور مخطوطات جمع کرنے کے ادہ انھوں نے اس کی توضیحی ایک فہرستیں بھی مرتب کیں جو آج بھی پڑھنے والوں کے لیے رہ نمائی کرتی ہیں اور یہی نہیں بلکہ دکنی ادب انھوں نے کام کروایا۔ اس ادارہ میں جو کام ہوا وہ ایک کاروان کی طرح تھا اور زور صاحب اکیلے میر کارواں تھے۔ آپ کی ان تھک ششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ کئی دکنی کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں اور حیدرآباد خصوصاً قطب شاہی و عادل شاہی دور کی تاریخ کو

(باقی ص = ۲۵ پر)

اظہر افسر

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ جب کبھی یہ نام لبوں پر آتا ہے ایک بھاری بھرکم شخصیت مسکراتی ہوئی آنکھوں میں گھوم جاتی ہے بڑے بڑے چوخانے والی پتلی اونی شیروانی ، اسی شیروانی کے کپڑے کی ٹوپی ۔ جان پہچان کے لیے بعض لوگ کہتے ہیں زور صاحب بڑے غصیلے تھے لیکن جب بھی وہ مجھ سے ملے نہایت شفقت سے ملے ۔ ان سے پہلی ملاقات ۱۹۴۰ء میں ہوئی ایک دن خواجہ حمید الدین شاہد صاحب کا فون آیا ۔ میں اس زمانے میں اخبار میزان میں کام کرتا تھا ۔ میزان ان دنوں کا مشہور اخبار تھا بہت بڑے سائز کا تین زبانوں میں نکلتا تھا ۔ اردو ، انگلش ، تلگو اور اردو کے ایڈیٹر حبیب اللہ اوج تھے انگریزی کے مرزا عابد علی بیگ اور تلگو کے اروی بالو راجو ۔

میزان میں مجھے کام کرتے ہوئے دو تین مہینے ہی ہوئے ہوں گے کہ اوج صاحب نے کہا خواجہ حمیدالدین شاہد "سب رس" والے بلا رہے ہیں ۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو بولے واپسی میں مجھ سے سب رس کے دفتر پر ملتے ہوئے جاؤ ۔ ہر جمعہ کو اخبار میزان میں بچوں کا صفحہ نکلتا تھا اور میں جمعرات کو ۱۰ بجے سے دو بجے تک کام کرتا تھا ۔ خسرو منزل میزان کے دفتر سے سائیکل پر چلا ۔

سب رس رفعت منزل کی پاسس والی عمارت میں تھا خواجہ حمیدالدین شاہد مجھے دیکھتے ہی بولے پہلے زور صاحب سے مل چکے ہو ۔ میں نے کہا نہیں ۔ شاہد صاحب مجھے ساتھ لے کر پاس ہی رفعت منزل آئے ۔ رفعت منزل میں زور صاحب کچھ پڑھ رہے تھے ۔ میری طرف اشارہ کر کے زور صاحب سے کہا یہ اظہر افسر آج کل اخبار میزان میں بچوں کا صفحہ دیکھتے ہیں ۔ میں نے زور صاحب کو سلام کرکے کہا ۔ آپ کا نام تو بہت سنا ہے لیکن آج مل رہا ہوں ۔ زور صاحب بولے کیسے سنا ۔ میں نے کہا آپ کی کتاب سیرِ گول کنڈہ پڑھ چکا ہوں جو بہت مشہور کتاب ہے کئی بار چھپی ہے میں نے خود ساتواں ایڈیشن پڑھا ہے ۔ ہنسنے لگے ۔ پوچھا کیا کرتے ہو ۔ میں نے کہا ۔ ابھی دو مہینے ہوئے اخبار میزان میں کام کرتا ہوں ۔ شاہد صاحب بولے منیر صفوی آج کل نہیں آرہے ہیں کچھ دنوں کے لیے سب رس کا بچوں کا صفحہ ان کو دینے کا ارادہ ہے زور صاحب بولے اچھی بات ہے مگر وہ تختہ جات تیار ہوگئے یا نہیں ۔ بڑی جلدی جانا ہے بھئی ۔ شاہد صاحب ابھی لاتا ہوں کہہ کر چلے گئے اتنے میں سائیکل پر جمال الدین صاحب ہانپتے ، کانپتے ، ایک بڑی تھیلی لٹکائے ڈاکٹر صاحب کے پاسس آئے ڈاکٹر صاحب بولے ۔ سب چیزیں آگئیں؟ جمال الدین صاحب نے کہا ۔ جی ہو ۔ تین روپیے آٹھ آنے اور تین پیسے کی ہری مرچیاں کوتھمیر ۔ ڈاکٹر صاحب کا موڈ اچانک بگڑ گیا ۔ بولے ۔ اجی حضرت ہری مرچ کوتھمیر اوپر ڈالتے ہیں ۔ آٹھ آنے کا سودا لیے تو بھی ہری مرچ کوتھمیر اوپر ڈالتے ہیں جاؤ واپس کرآؤ ۔ جمال الدین صاحب بغیر کچھ کہے واپس ہوگئے ۔ ساری ترکاری لے کر منڈی میر عالم کو ۔

ادھر شاہد صاحب بڑے بڑے کاغذ لے کر زور صاحب کو کچھ بتانے لگے ۔ ہفتے عشرہ بعد جب جمال الدین صاحب واپس لوٹے تو میں نے شاہد صاحب کو یہ واقعہ سنایا ۔ شاہد صاحب نے کہا ابھی یہاں آپ کو بہت دن گزارنا ہے ۔

میں نے سب رس میں ڈیڑھ سال کام کیا۔۱۹۵۹ء میں جب آل انڈیا ریڈیو کے لیے سرٹیفیکٹ لکھوانے چادر گھاٹ کالج پہنچا وہ کے پرنسپال تھے۔ انھوں نے اس قدر عمدہ سرٹیفیکٹ دیا کہ ایک ہفتے کے اندر میری ملازمت کے کاغذ تیار ہوگئے۔ ایک بار پھر ـ منزل میں زور صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا کہ جمال الدین صاحب پاس سے گزرے۔زور صاحب پکارے "۔۔اجی جمال الدین صاحب"۔ اکٹر صاحب کہتے ہوئے جمال الدین صاحب قریب آئے۔ زور صاحب بولے صبح پیسے ہونا تھا بولے نا۔ جمال الدین صاحب بولے و روپے۔ زور صاحب نے شیروانی کی اوپری جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور بولے جمال الدین صاحب کل کشمیر کے بخشی غلام ـ رہے ہیں صبح جلدی آنا۔جمال الدین صاحب "ہو ڈاکٹر صاحب" کہتے ہوئے روانہ ہوگئے۔

۱۹۶۰ء میں یوم قلی منایا جارہا تھا افتتاحی اجلاس زوروں پر چل رہا تھا کافی مجمع تھا۔ مسز عائشہ ارشاد نے اناؤنس منٹ دیا کہ اردو ـ کے سرتاج محمد خاں، اب مخدوم محی الدین کی نظم "بھاگ متی" پیش کریں گے۔لڑکے نے نظم پڑھنی شروع کی۔

پیار سے آنکھ بھر آتی ہے کنول کھلتے ہیں
جب کبھی لب پہ ترا نامِ وفا آتا ہے

مخدوم صاحب ایک طرف بیٹھے تھے۔زور صاحب بولے مخدوم کتنا اچھا پڑھ رہا ہے تم سے اچھا پڑھ رہا ہے۔ جب میں یہ شعر پڑھا۔

سرِ فہرستِ نگارانِ جہاں باقی ہے
تو نہیں ہے تری چشمِ نگراں باقی ہے

آخر میں لڑکے نے باقی ہے باقی ہے چار مرتبہ پڑھا۔زور صاحب بولے۔ یہ باقی نہیں۔ مخدوم ہے۔یہ بھی سٹی کالج میں تھے اور صاحب بھی تھے وہ بھی شاعر تھے اور ستار بجاتے تھے۔ مجمع پر ہنسی کا سیلاب آگیا۔ واقعی زور صاحب دکنی تہذیب کی نمایاں یت تھے۔ وہ یومِ قلی لوگوں کو مدتوں یاد رہے گا۔

دل بری باقی ہے دل داریِ جاں باقی ہے
تو نہیں ہے تری چشمِ نگراں باقی ہے

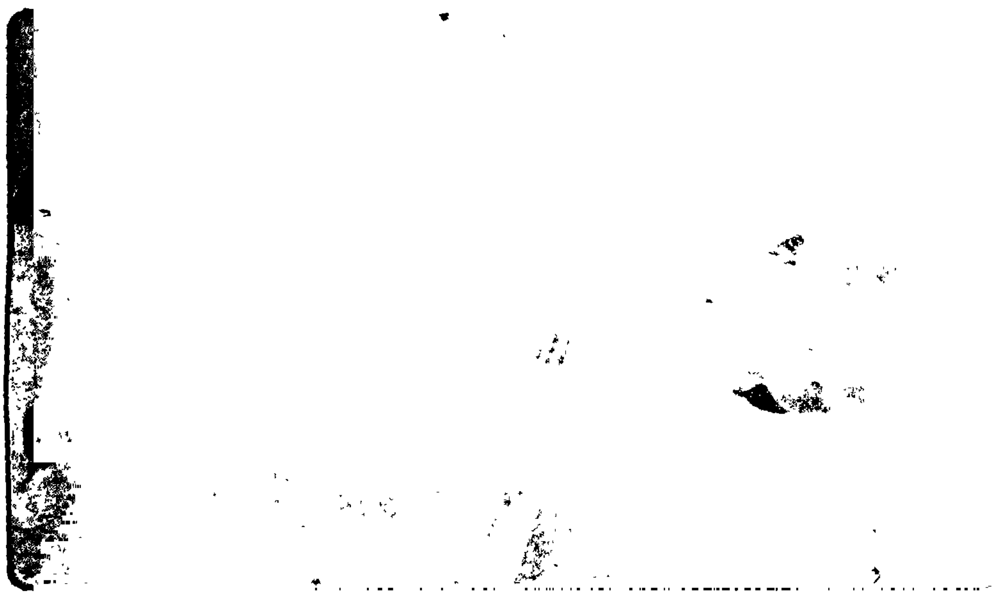
○●○

(سلسلہ نمبر ۲ صفحہ ۲ سے)

اگر کیا گیا۔ "یومِ قلی قطب شاہ" منانا بھی زور صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس طرح گول کنڈہ اور دکن کی تاریخ کے کئی اگر ہوجاتے ہیں۔ ان شاہانِ سلف کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

ادارۂ ادبیات میں بہت سی کتابیں اور مخطوطات، خلعت، اسنادات، تصاویر خصوصاً حیدرآباد کا نقشہ وغیرہ یہ چیزیں نواب ـ جنگ کا عطیہ ہیں۔ اس ادارے کی بنیاد بہت ہی نیک نیتی سے رکھی گئی اسی لیے وہ الحمدللہ آج تک پھولتا رہا ہے اور میری دعا ـ آئندہ بھی اسی نیک نیتی کے ساتھ اس میں کام ہوتا رہے۔۔۔ آمین ۔

○●○



ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی پیرس میں (۲ / اپریل ۱۹۳۰ء)



ڈاکٹر زور لندن میں



ڈاکٹر زور (فوٹو ۱۹۲۸ء)



ڈاکٹر زور پیرس میں (۲۳/ستمبر ۱۹۳۰ء)

پروفیسر سید محی الدین قادری زور

ہندستانی کا ارتقا

زمان و مکان کے حالات کے مطابق، زبانیں خود بہ خود بدلتی رہتی ہیں اور اسی تبدیلی کو ماہرینِ لسانیات، زبان کا فطری قرار دیتے ہیں۔ اس ارتقا کا انحصار زیادہ تر صوتی تشکیل اور تغیر و تبدل پر ہوتا ہے۔ تاریخِ السنہ میں صوتی تبدیلیوں اور ارتقا کو ا سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کہ زبان کی اکثر دوسری تبدیلیاں اور ارتقا، کم و بیش اسی کے تحت ہوتے ہیں جو حالات تل لب و لہجہ میں تغیر پیدا کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق و تفتیش اکثر دفعہ دل چسپ ثابت ہوتی ہے۔

صوتی تبدیلیوں کی سب سے پہلی اور اہم وجہ عضویاتی ہے۔ ایک نسل دوسری نسل کے لیے جو لسانی ورثہ چھوڑ جاتی ۔ بعینہ ایک اور معین نہیں ہوتا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر نسل کے بعد کسی قوم کی آوازیں اور عضوی عادات واطوار غیر محسوس طو نہ کچھ تبدیلی پاتے ہیں۔ یہ تبدیلی اکثر نتیجہ ہوتی ہے ہمسایہ زبان کے اثر کا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کی ایک ن ایک اجنبی زبان بولنے والوں سے سابقہ پڑتا ہے تو اس اجنبی زبان کی آوازیں اس نسل کے اپنے لفظوں پر جو عمل یا ردِ عمل کرتی ہیں ان کے نتیجے کے طور پر اس تمام نسل کے مخارج تلفظ، آہستہ آہستہ اپنی جگہوں سے ہٹنے لگتے ہیں۔ یہ محض خیال نہیں ہے۔ ا کی واقعیت کا عملی ثبوت اس طرح بہم پہنچ سکتا ہے کہ ایک ایسے نوجوان کی گفتگو صوتی گردونہ پر اتاریں جس نے اپنی زبان کے کسی اور زبان کی بھی تحصیل کی ہو اور اس کے ساتھ ہی اس کے کسی معمر عزیز سے بھی وہی جملہ کہلائیں (مگر شرط یہ ہ اس دوسرے شخص کی زبان پر کسی اور زبان کا اثر نہ پڑا ہو) تو آپ معلوم کریں گے کہ دونوں کے مخارج میں ایک معین فر ہوگیا ہے۔

یہ تو ایک جدید عملی ثبوت تھا۔ اس کے تاریخی ثبوت سے ہماری اردو زبان محروم نہیں ہے۔ آپ صرف اردو حرف "سے" لے لیجیے اور دیکھیے کہ زمانہ اور نسلوں کے ساتھ ساتھ اس نے بھی کیا تغیر حاصل کیے ہیں۔ لفظ "سے" کی موجودہ شکل اردو زبا صرف دو سو سال ہی سے مستعمل ہے اس سے پہلے یہ لفظ "سیں" یا "سوں" کی شکل میں رائج تھا۔ چناں چہ ولی اور اس کے ہم ع کے کلام میں آپ کو ہمیشہ یہی نظر آئیں گے۔ ولی کا مشہور شعر ہے۔

مت غصہ کے شعلہ سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی، سوں یہ آگ بجھاتی جا

ولی سے تقریباً پچاس سال قبل یہ لفظ "ستے" اور "ستیں" تھا۔ چناں چہ قطب شاہی سلطنت کے عہدِ آخر کے شاعروں ک اس کا شاہد ہے۔ ابوالحسن تانا شاہ اور اورنگ زیب کے معاصر غلام علی کی نظم پدماوت کا ایک مصرع ہے۔

بھلائی ستے تو بھلا پائے گا۔

غلام علی سے پچاس سال قبل اس لفظ میں "س" کی آواز موجود نہیں تھی اس زمانے کے گولکنڈہ کے بسنے والے "مجھ سے کہ

کھیا" لکھتے تھے۔ چناں چہ مشہور قطب شاہی بادشاہ محمد قلی اور اس کے درباری شاعروں کے کلام میں لفظ "تھے" ہی نظر سے
د قلی کے مصرعے ہیں:

o ۱ معانی کے باتاں تھے جھوٹا ننگ

o ۲ مرا گلستاں تازا اس تھے ہوا ہے

. قلی کے عہد سے پہلے اور غالباً گولکنڈہ کی تعمیر کے وقت یہ لفظ "تے" کی شکل میں رائج تھا۔ وجہی جس نے ابراہیم قطب شاہ
ے شاعری میں شہرت حاصل کرلی اکثر "تے" لکھتا ہے۔ مثلاً
تے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل دے پیا"۔ وجہی سے پہلے کی تمام اردو تحریروں میں بھی "تے" ہی ملتا ہے۔ چناں چہ
ہ بندہ نواز سے جو اردو نثر منسوب ہے اور جو اگر ان کی نہیں تو ان کے قریبی زمانے کی ضرور ہے اس میں بھی "تے" ہی لکھا
لاً "معراج العاشقین" کا ایک جملہ ہے:
لر اس میں "تے" یک پردہ اٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں"۔
ں وقت تک جس کتاب کو اردو زبان کی قدیم ترین نظم سمجھا جاتا ہے وہ میاں خوب محمد گجراتی کی "خوب ترنگ" ہے۔ اس
ب جر کا بہت کم استعمال کیا گیا ہے مگر چند مقامات پر حرف "تھیں" نظر آتا ہے مثلاً غیرت تھیں سب کیا قبول۔
ں تفصیل سے ظاہر ہوا کہ لفظ "سے" کی صوتی شکل مرورِ ایام کے ساتھ آہستہ آہستہ بدلتی گئی اور جو لفظ دراصل پہلے تھیں یا
، ستے، ستیں، سوں، تیں ہوتا ہوا آخر کار "سے" بن گیا (۱)۔ اور ابھی نہ معلوم آگے چل کر اس کا کیا حشر ہو۔
ں سلسلے میں یہ واقعہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے کہ بعض دفعہ نئی پود آبا و اجداد کے کسی خاص تلفظ کو ادا کرنے سے قاصر بھی
. دنیا کی متعدد زبانوں میں اس امر کے ثبوت موجود ہیں کہ زمانہ سلف میں کسی حرف کا ایک خاص تلفظ تھا جب بعد میں
از ہی غائب ہوگئی تو اس حرف کے تلفظ کے لیے زبان کی موجودہ آوازوں میں سے کوئی آواز کام دینے لگی۔ خود ہماری زبان
ہ لفظ موجود ہیں جن میں کی ایک خاص آواز آج تلفظ نہیں ہوتی۔ قدیم برہمن دور میں اس کا ایک معین تلفظ تھا مگر موجودہ
موم اس کے بولنے سے قاصر ہے۔
حرف "ری" ہے جو الفاظ "کرشنا" اور گھرتم (لفظ گھی کی قدیم شکل) میں موجود ہے اور آج بالعموم حرف صحیح "ر" کی
دتا ہے۔ حالاں کہ یہ اصل میں ایک حرف علت تھا۔ ہمارے اردو لفظ "تھی" میں وہ "ی" بن کر رہ گیا اور "کرشنا" میں

(۱)

ثر دفعہ یہ ہوتا ہے کہ کسی حرف کا تلفظ پوری طرح نہ سننے کی وجہ سے بولتے وقت وہ غلط طریقہ پر ادا کیا جاتا ہے۔ اس قسم
اثر بالعموم کم زور آوازوں اور خاص کر حروفِ علت پر ہوتا ہے جو یا تو اصلی حالت میں باقی نہیں رہتے یا لفظوں میں سے
تے ہیں۔ اردو الفاظ لالٹین (لانٹرن) فلالین (فلانل) اور لمبر (نمبر) کی تشکیل اسی اثر کے تحت عمل میں آئی ہے (۲)۔
وتی ارتقا اور تبدیلیاں نہایت باضابطہ ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ماہرینِ لسانیات زبانوں کے متعلق اٹل قوانین و قواعد
آج کے آریائی لسانیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ سنسکرت کے ابتدائی حرف "د" اردو، بہاری، بنگالی اور اڑیا زبانوں

میں بالعموم "ب" کی شکل میں منتقل ہوگیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اردو کے اکثر الفاظ کا ابتدائی حرف "ب" پہلے "و" تھا مگر صوتی ارتقا و تبدیلی کے تحت آج "ب" بن گیا۔ اس قسم کے چند اردو اور ان کے اصل سنسکرت الفاظ کی مثال یہ ہے :

اردو	سنسکرت	اردو	سنسکرت	اردو	سنسکرت
بات	ورتمن	بیس	ونشتی	بن	ونم
بیت	ویتر	بڑ	وٹ	بالو	والوک

ایک ہی زبان ایک حصہ ملک کے کسی خاص زمانہ کے بولنے والوں میں جن خصوصیات کے ساتھ مستقل رہے گی اسی حصہ ملک میں کسی دوسرے زمانے میں نہیں رہے گی۔ اسی طرح ایک حصہ ملک کے باشندے اس کو جس طرح بولیں گے دوسرے حصہ کے اسی عہد کے رہنے والے نہیں بولیں گے۔

اردو زبان میں متعدد لفظ ایسے موجود ہیں جن میں دو مرتبہ کوزی (رٹروفلکس) آوازیں آتی ہیں ایک ابتدا میں اور ایک لفظ کے بیچ میں مثلاً ٹاٹ، ٹکڑا، ٹوٹنا، ٹھنڈا، ڈانٹ وغیرہ مگر انھیں اور اس قسم کے اور لفظوں میں اس زبان میں پہلے کوزی (رٹروفلکس) آواز نہیں تھی بلکہ دندانی تھی۔ چناں چہ یہ اصلی خصوصیت اردو کی دکنی شاخ میں اب تک موجود ہے۔ دکن میں انھیں لفظوں کو تاٹ، تکڑا، توٹنا اور دانٹ کہتے ہیں۔ اور اس سرزمین میں یہ خصوصیت اس شدت سے باقی ہے کہ اگر اب بھی کسی اجنبی زبان سے کوئی نیا لفظ ایسا مل جاتا ہے جس میں دو دفعہ یعنی ایک ابتدائی حرف اور ایک بعد کا کوزی (رٹروفلکس) ہے تو دکنی (۲) اردو میں اس کی ابتدائی آواز دندانی ہوجاتی ہے۔ مثلاً انگریزی لفظ ٹکٹ کو دکھنی عوام تکٹ کہتے ہیں۔

شمال کی زبان میں یہ ابتدائی دندانی آواز کوزی (رٹروفلکس) میں کیوں تبدیل ہوئی اس کا سبب غالباً نفسیاتی ہے۔ "ٹ" بہ مقابلہ "ت" کے ایک سخت آواز ہے اور سخت آواز کے تلفظ کے لیے اعضائے مخارج پہلے ہی سے تیار ہوجاتے ہیں۔ چناں چہ ماقبل کے حرف پر اس تیاری کا اثر پڑتا ہے اس کی توضیح کے لیے ادعا میں اثر کی یہ مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ اگر کسی لفظ میں مصیتی (Voiced) اور غیر مصیتی (Unvoiced) دونوں آوازیں بالکل یکے بعد دیگرے آئیں تو اگر مابعد کی آواز مصیتی ہو اور اگلے کی غیر مصیتی جیسے لفظ "اکبر" اور "اخبار" میں تو ماقبل کی غیر مصیتی آواز بھی مصیتی خصوصیت حاصل کرلیتی ہے۔ چناں چہ اکبر کا "ک" اور اخبار کا "خ" قریب قریب "گ" اور "غ" بن جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر ماقبل کی آواز مصیت اور مابعد کی غیر مصیتی ہو تو ماقبل کی آواز بھی غیر مصیت ہوجاتی ہے مثلاً "آج تک" اور "بازپرس" میں "ج" اور "ز" دونوں مصیت ہیں لیکن اگر آپ انھیں کسی سے صوتی گردونہ (گراموفون کے رکارڈ) پر کہلوائیں تو معلوم کریں گے کہ "ج" اور "ز" کی آوازیں "چ" اور "س" کی طرح نکلتی ہیں۔

(۲)

صوتی تغیر و تبدل سے متعلق ایک اور خاصیت بھی ہے جو زبانوں کے ارتقا میں کسی نہ کسی طرح عمل کرتی رہتی ہے۔ ہر زبان میں آپ کو ایسے لفظ ملیں گے جن کے تلفظ میں نہایت سرعت کے ساتھ تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ حالاں کہ انھیں کے ساتھی دوسرے لفظ ابھی زیادہ بدلنے نہیں پائے ہیں۔ ان غیر طبعی تبدیلی حاصل کرنے والے الفاظ میں اکثر وہ ہوتے ہیں جو کسی کو مخاطب کرنے کے لیے یا آداب و روایات معاشرت یا روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے کثرت سے بولے جاتے ہیں۔ اگر آپ کسی بے تکلف گفتگو میں لفظ "مولوی" کے تلفظ پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ لفظ صوتی تبدیلی کی دو منزلیں طے کرچکا ہے یعنی "مولی" پھر "ملی"۔ پہلی منزل

دوسرا "و" اڑ گیا اور دوسری میں پہلا۔ اس طرح انگریزی (۴) لفظ "سٹیشن" عوام کی زبان میں پہلے "اسٹیشن" ہوا اور پھر ابتدائی اور "ش" اڑ کر "ٹیشن" رہ گیا اور دکن میں بعض موقعوں میں تو لفظ "ٹھیشن" بھی سنا جاتا ہے۔

اسی قسم کی اور صوتی تبدیلیاں بھی ہیں جن میں اگرچہ لفظ کے معنی اور ایک حد تک شکل بھی قریب قریب وہی رہتی ہے مگر یہ یلیاں نہ تو کسی باضابطہ صوتی اصول کے تحت عمل میں آتی ہیں اور نہ زبان کے اس قسم کے جملہ الفاظ پر حاوی ہوئی ہیں۔

اسی قبیل کی ایک تبدیلی یہ ہے کہ قریب المخرج حروفِ صحیح ایک دوسرے کی شکل میں منتقل ہو جاتے ہیں جیسے غالب نے بر" کو لمبر" لکھ دیا جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اسی طرح لفظ "بیرسٹر" کا تلفظ "بیشٹر" بھی کیا جاتا ہے یا "کاغذ" کو قاغذ" کہتے ہیں۔ شار کو شرشار، شمس الدین کو شمش الدین اور سٹیشن کو کو اشٹیشن کہنا بھی اسی صوتی طریقہ عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ اور اس قسم کی سری مثالوں پر غور کرنے سے آپ معلوم کریں گے کہ تبادلہ ہمیشہ قریب المخرج حروف ہی کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ حروف "ن" اور "س" کے تلفظ کے لیے تالو پر زبان جن حصوں کو مس کرتی ہے وہی حصے "ل" اور "ش" کی آوازوں کے اظہار کے لیے بھی نعمال ہوتے ہیں۔

بعض اردو لفظوں میں آوازیں اپنی ترتیب بدل دیتی ہیں۔ یہ الفاظ اگرچہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہتے مگر ان میں کوئی آواز یا حرف بھی داخل نہیں ہوتا۔ مثلاً رجحان کا تلفظ رحجان، فصیل کا صفیل، مطلب کا مطبل، کیچڑ کا چیکڑ کیا جاتا ہے۔ یا یہاں میاں اور وہاں کو ھواں کہتے ہیں۔ ان تبدیل شدہ شکلوں میں آپ کو نیا حرف ایک بھی نظر نہیں آئے گا۔ حروف وہی ہیں مگر ترتیب نہیں۔

اس وقت تک جن تبدیلیوں کا ذکر ہوا ان میں اور ارتقائے زبان کی باضابطہ اور غیر محسوس تبدیلیوں میں فرق ہے۔ متذکرۂ بالا وں کو ہم کسی اصول اور قاعدے کے تحت نہیں لاسکتے۔ یہ محض اتفاقات کا نتیجہ ہیں۔ ان کے مقابلے میں اگر آپ اردو الفاظ "کوڑی" "مچھلی" پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ سنسکرت الفاظ کپرد، اور "متسیہ" سے مشتق ہیں۔ یعنی کوڑی کے حروف "ڑ" اور "و" آج قائم ہیں کپرد کے حروف "رد" اور "پ" کے ان کا لسانیاتی ارتقا یوں ہوا۔ کپرد ۔۔ کپڑا ۔۔ کوڈا اور کوڑی۔

اسی طرح متسیہ سے باضابطہ صوتی اصولوں کے تحت لفظ مچھلی کا ظہور ہوا۔ اور یہ تبدیلیاں محض انھی الفاظ تک محدود نہیں ۔ جہاں سنسکرت میں "رد" کی آواز تھی آج اردو میں اکثر "ڑ" ہے۔ اسی طرح "پ" کی آواز "و" میں اور "تس" کی آواز "چھ" منتقل ہو گئی۔

(ہندستانی _ الہ آباد، اکتوبر ۱۹۳۲ء)

ooo

حوالے:

(۱) "سے" اور "سین" سنسکرت لفظ "سون" سنسکرت لفظ "سیتی" سنسکرت لفظ اور "تے" "تین" وغیرہ سنسکرت کے سے نکلے ہوئی تسلیم کیے جاتے ہیں۔

(۲) اس کی وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ "ل" اور "ن" کے مخارج کے مقامات باہم بہت نزدیک واقع ہوئے ہیں اس اکثر "ل، ن، میں اور ن، ل میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اور کبھی لفظوں میں حروف کے مقامات بھی تبدیل ہوجاتے ہیں جیسے لکھنؤ سے ؤ۔ فلالین اور لمبر کے بننے میں ممکن ہے یہ وجہ بھی ہو۔

پروفیسر سید محی الدین قادری زور

دلی میں اردو شاعری کا آغاز

شمالی ہند اور خاص کر دوآبہ گنگ و جمن جو ہمیشہ تہذیب و تمدن اور علم و فن کا سرِ چشمہ رہا ہے اور کے لیے صدیوں تک ثابت ہوتا رہا۔ اس کے اسباب نہایت دل چسپ اور اہم ہیں۔ ہم نے اپنی مطبوعہ انگریزی کتاب "ہندستانی صوتیات" میں اس پر بحث کی ہے مگر دلی میں اردو شاعری کے آغاز پر گفتگو کرتے وقت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب و علل کا ذرا وضاحت کے سا ذکر کردیا جائے جنھوں نے شمالی ہند اور خاص کر دلی کو اردو شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف سے عرصہ دراز تک محروم رکھا۔

اردو زبان کے ارتقا کی نسبت یہ نظریہ اب روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتا جاتا ہے کہ شمال مغربی سرحد سے جو مسلمان ہندستا میں داخل ہوئے وہ پہلے پہل پنجاب میں آکر ٹھہرے۔ وہاں کے باشندوں کے میل جول سے جو نئی مشترکہ ہندو مسلم زبان پیدا ہوتی ر اسی کو لے کر وہ دوآبہ میں اترے اور اسی کو بولتے ہوئے گجرات اور دکن میں بھی داخل ہوئے۔

فتح دلی سے قبل مسلمان پنجاب میں قریب دو سو سال تک رہے اور یہ عرصہ ایک نئی زبان کے آغاز کے لیے ناکافی نہیں ہے وہاں جو زبان تیار ہوئی تھی اس میں لاہور کے ایک درباری فارسی شاعر مسعود سعد سلمان نے طبع آزمائی بھی کی تھی مگر افسوس ہے کہ ا کا کلام آج ناپید ہے اور اس کے متعلق سوائے عوفی اور خسرو کے بیانات کے کوئی اور معلومات حاصل نہیں۔ اگر قدیم دکنی اور گجرا کتابوں کی طرح مسعود کا یہ دیوان بھی آج دستیاب ہوجائے تو اردو کی آغازی تشکیل کی نسبت بہت کم گتھیاں باقی رہ جائیں۔

جب مسلمانوں نے سنہ ۱۱۹۲ء میں دلی کی چوہان سلطنت فتح کرلی تو وہ اسی زبان کو لے کر راج دھانی میں داخل ہوئے اور دلی اور اس کے مشرقی علاقہ یعنی سرزمین برج میں آباد ہوگئے جو پنجاب میں بن رہی تھی اور ابھی خام حالت میں تھی۔ فاتحین کے سا ہریانی یا بانگڑو ۔ مشرقی پنجاب) علاقہ کے سینکڑوں باشندے بھی غالباً ملازمین اور بھیر و بنگاہ کی حیثیت سے چلے آئے۔ جس کی بنا آج اردو زبان میں مشرقی پنجابی یا ہریانوی عنصر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

برج کے علاقے میں اس عہد میں جو زبان بولی جاتی تھی اسے برج بھاشا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی زبان میں امیر خسر نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا جو مسعود کے ہندوی دیوان کی طرح آج ناپید ہے۔ مگر خسرو کا کچھ ہندوی کلام سینہ بہ سینہ محفوظ چلا آیا جس میں اگرچہ بعد کے زمانوں میں لفظی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکے گا کہ وہ خسرو ہی کی یادگار ہے

سرزمینِ برج میں مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان ابھی پختہ نہیں ہونے پائی تھی اور اس پر برج کا زیادہ اثر نہیں پڑ سکا تھا کہ مسلمانوں نے جنوب کا رخ کیا اور ان کا ایک بڑا سیلاب محمد تغلق کے ساتھ دلی سے اٹھا اور دکن میں جاکر رک گیا۔ یہ فاتحین اپ ساتھ جو زبان دکن میں لیتے گئے وہ وہاں آزاد نشوونما حاصل کرنے لگی اور چوں کہ برج بھاشا کی سرحد سے دور جا پڑی تھی اس لیے اس پ برج کا صرف وہی اثر باقی رہا جو سرزمینِ برج سے نکلنے سے پہلے اس پر مستولی ہوچکا تھا۔

جو مسلمان دوآبہ ہی میں رہ گئے ان کی وہ خام ہندوی جو مشرقی پنجابی اور ہند ایرانی عناصر سے مرکب تھی رفتہ رفتہ برج سے

متاثر ہوتی گئی اور آخر کار اس رنگ میں اتنی رنگی گئی کہ دو تین صدیوں ہی میں بول چال کے لیے برج بھاشا کی جانشین بن گئی۔ اور اسے ایک تحریری اور ادبی شان حاصل ہو گئی۔

اس سلسلے میں اس واقعہ کا اظہار دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دوآبہ میں زبانوں کا ارتقا عجیب و غریب مگر باضابطہ رہا ہے۔ ابتدا میں ویدی زبان آریاؤں کی عام بول چال کی زبان تھی چناں چہ اسی میں مذہبی مقدس کتابیں مرتب ہوئیں۔ ایک عرصہ کے بعد یہ زبان عام طور پر مستعمل نہیں رہی۔ اس وقت سنسکرت رائج ہو گئی۔ سنسکرت میں بھی مذہبی اور ادبی تصنیفات مرتب ہوئیں چناں چہ دو تین سو سال کے بعد وہ بھی عام گفتگو کی زبان باقی نہ رہی۔ کیوں کہ عوام ہمیشہ اپنی زبان میں اپنی ضرورتوں اور نئے نئے حالات کے ماتحت صوتی اور معنوی تغیر کرتے رہے ہیں۔ چناں چہ اس وقت عوام کی زبان کو پراکرت کہا گیا اور سنسکرت جو اب ادبی یا علمی زبان تھی محض برہمنوں اور عالموں تک محدود رہی۔

پراکرتیں بھی چار پانچ سو سال تک رائج رہیں اور ان میں بھی گیت اور نظمیں لکھی گئیں مگر جب مرورِ ایام کے ساتھ ان میں تبدیلیاں ہونے لگیں تو اس تغیر یافتہ عام گفت و شنید کی زبان کو بھاشا کہا گیا چناں چہ علاقہ برج میں جو بھاشا بولی جاتی تھی وہ برج بھاشا کہلائی۔

برج بھاشا پہلے یعنی مسلمانوں کے اوائل عہد میں عام بول چال کی زبان تھی مگر مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے سو ڈیڑھ سو سال بعد ان کی لائی ہوئی زبان کے ساتھ مل جل کر وہ بھی متاثر ہونے لگی اور آخر کار دہلی اور سرزمینِ برج کے باشندوں میں خواہ وہ مسلمان ہوں کہ ہندو جو زبان عام طور پر بول چال اور کاروبار کے لیے مستعمل ہو گئی وہ یہی ہندستانی ہے جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں۔ مگر اورنگ زیب سے پہلے تک ہندستانِ خاص کی تحریری اور علمی اگر کوئی زبان تھی تو وہ برج بھاشا ہی تھی۔ "ہندستانی" عوام کی بازاری زبان تھی اور اس میں لکھنا پڑھنا معیوب تھا۔ چناں چہ اس زمانہ میں ہندستانِ خاص میں اگر کسی مسلمان نے ہندوی زبان میں لکھنا بھی چاہا تو اس نے برج ہی میں لکھا جو اس عہد کے ہندوؤں کی علمی و ادبی زبان تھی۔

اس کے مقابلے میں دکن کی حالت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہاں برج بھاشا کی طرح کوئی ویسی زبان ایسی نہ تھی جو وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ علمی یا ادبی زبان قرار دی جاسکتی۔ دکن میں یا تو دراوڑی زبانیں تھیں یا مرہٹی اور یہ زبانیں اس ہندستانی زبان کو کوئی اصولی یا اہم فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھیں جو مسلمانوں کے ساتھ دکن میں گئی اور آزاد نشو و نما حاصل کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ یہ دیسی زبانیں برج بھاشا کی طرح دکن کے ہندوؤں کی اعلیٰ ادبی اور علمی زبانیں بھی نہیں تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکن کے مسلمان یا تو فارسی میں لکھتے یا اپنی اس ہندستانی میں جو ان کے ہم راہ آئی تھی اور ان کی حکومت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جا رہی تھی۔

دہلی میں اردو شاعری کے مقابلتہً دیر میں شروع ہونے کی یہ سب سے بڑی وجہ تھی مگر اس کے سوا وہ چار سیاسی اسباب بھی ہیں جنھوں نے ایک طرف تو دکن میں ہندستانی کو تصنیف و تالیف کے لیے مقبول بنا دیا اور دوسری طرف ہندستانِ خاص کو اس نعمت سے بری طرح محروم کر دیا۔

دکن کی سلطنتوں کے بانی، شمالی حکمران سلسلوں کے بانیوں کی طرح نووارد ترک یا افغانی نہیں تھے۔ دہلی میں قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک جتنے شاہی خاندان گذرے سب کے سب دیگرے ان شمال مغربی حملہ آوروں میں سے تھے جن کی زبانیں ہندستان کے لیے اجنبی تھیں۔ دکنی سلطنتوں کے بانی وہی تھے جو دکن یا ہندستان میں ایک مدت سے مقیم تھے ہندستانی زبان و طرزِ

معاشرت سے مانوس تھے ۔ دکن کی پہلی سلطنت بہمنیہ کے بانی حسن کی نسبت تو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ایک برہمن کا غلام تھا ۔ اس کا ہندستانی نہ جاننا اسی طرح تعجب خیز ہے جس طرح تیمور کا ہندستانی سے واقف ہونا ۔

بہمنیہ کے زوال کے بعد جب دکن میں جدا جدا حکومتیں قائم ہوئیں تو ان کے بانی بھی اکثر وہی تھے جو بہمنیہ دربار میں بچپن سے پرورش پاچکے تھے اور جن کا ہندستانی سے ناواقف رہنا محال تھا ۔ سلطنت احمد نگر کا بانی تو خود ایک نومسلم تھا ۔ قدیم فارسی تاریخیں شاہد ہیں کہ وہ کنٹری اور ہندوی (یعنی اس عہد کی اردو) کا اچھا ماہر تھا ۔ عادل شاہی خاندان کی پہلی ملکہ ایک طاقت ور مرہٹہ امیر مکٹ راؤ کی لڑکی تھی ۔ اس کے بطن سے یوسف عادل شاہ کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہوا ۔ لڑکا اسمٰعیل عادل شاہ تھا جو باپ کے بعد بادشاہ ہوا اور جس کی اولاد نے آخر تک بیجاپور پر بادشاہت کی ۔ تینوں لڑکیوں میں سے ہر ایک کسی نہ کسی دکنی بادشاہ سے بیاہی گئی مثلاً مریم سلطان ، برہان نظام شاہ والی احمد نگر سے ، خدیجہ سلطان ، علاء الدین عماد شاہ والی برار سے اور بی بی ستی سلطان ، محمود شاہ بہمنی کے لڑکے سے بیاہی گئی ۔

ٹ راؤ کی لڑکی پوجی خانم کے علاوہ عادل شاہی خاندان میں اور بھی ہندو رانیاں جنوبی ہندو ریاستوں سے حاصل کی گئی تھیں ۔ ان ں رمبھا رانی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس نے محمد عادل شاہ جیسے جلیل القدر حکم ران کا دل موہ لیا تھا اور جس کی خاطر بادشاہ نے اپنے مشہور و معروف آثار محل میں جو نقش و نگار تیار کرائے تھے ۔ وہ آج تک بیجاپوری ذوقِ فنونِ لطیفہ کی یاد تازہ کر رہے ہیں ۔

حکم ران سلسلوں کے بانیوں کے علاوہ شمال کے بالعموم تمام بادشاہوں کی زبان فارسی یا کوئی اور بیرونی زبان تھی، محمد تغلق سے محمد شاہ تک دہلی کے کسی بادشاہ نے ہندستانی میں نہ نثر لکھی نہ نظم ۔ اس کے خلاف دکن میں کئی بادشاہ مثلاً قطب شاہیوں میں محمد قلی ، محمد عبداللہ اور ابوالحسن ، اور عادل شاہیوں میں ابراہیم ثانی ، علی ثانی اور سکندر ایسے گذرے ہیں جن کی ہندستانی نظم و نثر اس وقت بھی موجود ہے ۔

بادشاہوں کی بے توجہی کے علاوہ شمالی سلطنت کے امرا اور علما و فضلا بھی ہندستانی زبان کے ذوق سے عاری تھی ۔ ان پر ہمیشہ فارسی اثر غالب رہا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب کبھی ترکستان ، ایران ، یا افغانستان میں کوئی سیاسی انقلاب ہوتا یا تباہی آتی تو وہاں کے باشندے پناہ لینے کے لیے یا تلاشِ معاش کی خاطر ہندستان ہی کا رخ کرتے ۔ چناں چہ آئے دن ان کی ٹکڑیاں ہندستان میں داخل ہوتی رہتی تھیں اور چوں کہ دہلی کے امیروں اور قدر دانوں کے دسترخوانوں کی وسعت میں اس وقت تک کوئی کمی نہیں ہوئی تھی اس لیے سب کے سب ہی جم جاتے اور چوں کہ یہاں رہنے والے ان نوواردوں کے مقابلے میں بالخصوص جہاں تک زبان و محاورہ کا تعلق ہے اپنے تئیں کم درجہ سمجھتے تھے اس لیے یہ ان کا احساسِ پستی (Inferiority Complex) نوواردوں کو سرکار دربار میں بڑے بڑے رتبے حاصل کر لینے کا موقع پیدا کر دیتا ۔

ان خانگی در آمدوں کے علاوہ شمال مغرب کی جانب سے اکثر حملے بھی ہوا کرتے تھے جن کا سلسلہ احمد شاہ درانی کے پانچویں حملے ۱۱۵۵ھ تک برابر جاری رہا ۔ یہ تمام حملہ آور غیر زبانیں بولتے تھے ۔

سیاسی مداخلتوں کے سوا علمی و ادبی فضا میں بھی ہر وقت ایرانی اثر غالب رہتا تھا ۔ شاہی درباروں سے محمد شاہ کے زمانے تک بالعموم ٹھیٹ ایرانی شاعر اور عالم گراں بہا صلے حاصل کرتے رہتے تھے ۔ پردیسی شعرا کی قدر و منزلت میر و سودا کے زمانہ تک جاری تھی ۔

فارسی کو امیروں اور عالموں کی اس آئے دن کی در آمد اور اقتدار و اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال میں فارسی حاوی عام اور لازمی ہوگئی۔ اگر کبھی مہلت پاکر فارسیت کا پیدا کیا ہوا زخم مندمل بھی ہونے پاتا تو پھر فارسی زبان بولنے والوں کا ایک ایسا حملہ ہوتا کہ وہ زخم از سر نو ہرا ہو جاتا۔ اس طرح سے شمال کے شاعر ہندستانی میں شعروشاعری کرنے کی طرف متوجہ نہ ہوسکے۔

دکن، فارسی گو ممالک سے نسبتاً دور تھا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں ایرانی نہیں گئے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ وہاں بادشاہ اور امرا بھی دیسی یعنی ہندستانی زبان استعمال کرتے ہیں تو انھوں نے بھی اس کے استعمال کو اپنے لیے باعث ننگ و عار نہیں سمجھا۔ اس کے علاوہ تاریخیں ثابت کرتی ہیں کہ دکن کے علما زیادہ تر دیسی ہی ہوتے تھے اور جو دیسی نہ ہوتے وہ دیسیوں کی تفہیم کی خاطر دیسی زبان ہی میں لکھنے کی کوشش کرتے۔ اس کی واضح مثالیں حضرت خواجہ بندہ نواز اور میراں جی شمس العشاق کی بزرگ ہستیوں کے علاوہ عبدل، مصنف ابراہیم نامہ کی شخصیت بھی ہے جو دراصل دلی کا رہنے والا تھا اور اردو شعروسخن کی قدرومنزلت کی شہرت سن کر بیجاپور پہنچ گیا تھا۔

غرض جیسا کہ اس مضمون میں پہلے بھی بیان کردیا گیا ہے شمال پر فارسی کا رنگ گہرا چڑھتا گیا اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندو بھی اسی میں تصنیف و تالیف کرنے لگے۔ اگر کبھی مسلمان چاہتے بھی کہ ہندوؤں سے قربت حاصل کریں اور ان کی زبان میں لکھیں تو وہ برج بھاشا میں لکھتے تھے جیسا کہ اکبر اعظم کے عہد میں عبدالرحیم خان خاناں وغیرہ نے کیا تھا۔ کیوں کہ وہی وہاں کی دیسی علمی اور ادبی زبان سمجھی جاتی تھی۔ اور "ہندستانی" بول چال کی ایک عام مشترکہ زبان تھی۔ اس سے ہندوؤں کو اتنا ہی تعلق تھا جتنا مسلمانوں کو تھا نہ اس میں ہندو لکھنا پسند کرتے تھے اور نہ مسلمان۔ اس کے مقابلے میں دکن میں اگر مسلمان، دیسیوں کی زبان میں لکھنا چاہتے تو یہ ان کے لیے دشوار امر تھا اور جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے وہاں رعایا کی کوئی ایک معین علمی و ادبی زبان برج بھاشا کی طرح موجود نہیں تھی۔ ان کے لیے صرف ایک ہی چارہ۔ کار تھا۔ یعنی ہندستانی میں لکھنا۔ چناں چہ یہی وہ زبان ہے جو آج بھی نہ صرف دکن کے ہندوؤں اور مسلمانوں بلکہ وہاں کے جدا جدا زبانیں بولنے والے افراد کا مشترکہ ذریعہ۔ گفتگو قرار دی جاسکتی ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ادھر دکن مجبور تھا اردو زبان میں لکھنے کے لیے اور ادھر ہندستان خاص اردو کو حقیر سمجھنے اور اس میں تصنیف و تالیف کرنے کو معیوب قرار دینے کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں دکن کے بیسیوں بلند مرتبہ شاعروں کے قدیم اور قابل وقعت شہ پارے دست یاب ہوگئے ہیں اور آئے دن ہوتے جارہے ہیں حالاں کہ شمال میں اورنگ زیب سے پہلے باضابطہ اردو تصنیف و تالیف کا پتہ تک نہیں چلتا۔

کچھ دنوں سے خیال پیدا ہو چلا ہے کہ شمالی ہند کے بھی قدیم اردو کے نمونوں کا پتہ لگایا جائے۔ مگر اب تک کم کامیابی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی ان تحقیقات کا ذکر نہ کرنا خون انصاف کرنا ہے جو اورینٹل کالج میگزین میں شمالی ہند کی قدیم اردو پر شائع ہورہی ہیں۔ مگر ان کا مطالعہ بھی اسی خیال کو ثابت کرتا جارہا ہے کہ دکن کی طرح شمال کو اس زبان کی علمی و ادبی سرپرستی کرنے کے موقعے حاصل نہیں ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں یہ زبان عام طور پر رائج تھی اور عوام کے علاوہ بعض بادشاہ اور امرا و فضلا بھی اس سے واقف تھے۔ چناں چہ ان کے متعدد اردو جملے اور الفاظ فارسی کتابوں میں نظر سے گزرتے ہیں۔

عہد اورنگ زیب سے پہلے کے جن شمالی شاعروں کی نسبت اس وقت تک علم حاصل ہوا ہے وہ سعدی اور نوری ہیں۔ پہلے شاعر کی صرف ایک غزل دست یاب ہوئی ہے اور دوسرے کا محض ایک شعر۔ ان کے متعلق تفصیلی اور یقینی معلومات بھی اس وقت

تک حاصل نہیں ہوئے۔ دونوں غالباً اکبرِ اعظم کے ہم عصر ہیں۔ اول الذکر کو بعض بزرگوں نے سعدی شیرازی سمجھ لیا ہے۔ حالاں کہ وہ ایک ہندستانی شاعر تھا۔ اس کی مشہور و معروف غزل کی زبان ظاہر کرتی ہے کہ وہ شمالی ہند میں لکھی گئی ہے اس پر ایک طرف تو برج بھاشا کا مخصوص اثر ہے اور دوسری طرف فارسی کا۔ اس عہد کی دکنی تصنیفات کی زبان، اس قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے۔ چناں چہ سعدی کی غزل کے تین شعر اور اس کے ایک ہم عصر گولکنڈہ کے شاعر وجہی کی غزل کے تین شعر یہاں تقابلی مطالعے کے لیے نقل کیے جاتے ہیں۔ سعدی کے شعر ہیں:

قشقہ چو دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا دیت ہے — گفتا کہ در رسے بادرے اس ملک کی یہ ریت ہے
ہمنا تمھن کوں دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا — ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلا کیا پیت ہے
سعدی بگفتا ریختہ در ریختہ دُر ریختہ — شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

اس عہد کے دکن کے اردو شعر یہ ہیں:

طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آ مل رے پیا — تجھ بن منجے جینا بہت ہوتا ہے مشکل رے پیا
منجو تمیں تنپش جانے تمہیں، منجو ٹھار جیولانے تمہیں — منج دل مندھر میانے تمہیں، کیتا ہے منزل رے پیا
تو جیو میرا میں ہو دل، تجھ سات رہنا کیوں نہ مل — دن رات میں میں ایک تل، نہیں تجھ تے غافل رے پیا

نوری کا صرف ایک شعر فی الحال دستیاب ہوا ہے۔ اس کا اسلوب بھی سعدی سے ملتا جلتا ہے:

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد — بے چارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

اس شاعر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دہلی کے ملک الشعرا فیضی کا دوست اور قاضی اعظم پور کا لڑکا تھا۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ عبدل، مصنف ابراہیم نامہ کی طرح نوری بھی ابراہیم عادل شاہ کی معارف پروری کی شہرت سن کر بیجاپور گیا تھا چناں چہ وہاں کی اردو مرثیہ نگاری کی اس نے قابلِ ذکر خدمت کی ہے۔ مگر یہ بیان ابھی تحقیق طلب ہے۔

ان دو شاعروں کے بعد اورنگ زیب کے معاصر، شمالی اردو شاعروں، افضل اور جعفر، کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان کی زبان کی خصوصیات بھی متذکرہ شاعروں کی خصوصیتوں کے مشابہ ہیں۔

محمد افضل، میرٹھ کے قریب جھنجھانہ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۰۱ھ کے لگ بھگ برج بھاشا کی نظموں کے اسلوب میں ایک ہندستانی بارہ ماسہ لکھا جو بکٹ کہانی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی زبان، دکن کی ہندستانی سے خاص طور پر مختلف ہے۔ ہم یہاں اس کے اور اس کے ایک معاصر گولکنڈہ کے اردو شاعر، طبعی کے اشعار زبان و نہج زبان کے مطالعے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ افضل لکھتا ہے:

سکھی رے چیت رت آئی نواہی — اجھوں امید میری بر نیاہی
بہالم پھولیاں پھلواریاں سب — کرے سیراں پیا سنگ ناریاں سب
سکھی یہ رت مجھے ناگن دست ہے — پھروں بوری تمامی جگ ہست ہے
اری میں عشق سوں ڈرتی پھروں تھی — نصیحت میں اپن سوں یوں کروں تھی
کہ پنچھی سوں لگن ہرگز نہ کیجے — ادسے دل دے ہزاراں غم نہ لیجے

جنھوں نے دل مسافر سوں لگایا   انھوں نے سب جنم روتے گنوایا
بہ بیں عالم صبا سہر خدا ری   پیا کوں جا سنا باتے ہماری
اگر باشد خطا ہم بخشش دیجو   خبر میری سویرا آئے لیجو

کے اردو شاعر طبعی نے بہرام کے سوال اور گل اندام کے جواب میں اسی زمانہ میں یہ شعر لکھے ہیں :

ہوا مجنوں برہ تے سدھ گنوا میں   اتھا دانا سو دیوانہ ہوا میں
تجھے دل میں چھپایا ہوں اپس کے   خرابے میں لگایا ہوں دیوا میں
اچایا ہوں ترے غم کے پہاڑاں   عجب ہے ضعیف سینہ پھٹ کر موا میں
مجھے کیا دیکھتی ازما گل اندام   پرانا ہوں ضعیف عاشق نوا میں

گل اندام کا جواب :

تجھے حاصل نہیں ہے منج تے بن غم   نکو کر غم میں اپنا پانو محکم
ترا دل ہو گیا پھوڑا دکھوں تے   نہیں اس زخم کا منج پاس مرہم
مرا پانوں یہ سر تیرا نہ اڑے   کرے کھن کی نمن گر تو کمر خم
نپاگا اس چمن میں تے تو میوہ   ہوا کوتہ سخن واللہ اعلم

افصل کے بعد میر جعفر زٹلی کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ شاعر کئی سال شہزادہ کام بخش کے ساتھ، دکن میں رہ چکا ہے۔ چناں چہ کے مجموعہ کلام میں شمالی اور دکنی دونوں رنگ کی نظمیں موجود ہیں۔ حسبِ ذیل نظم میں وہی ریختہ پن ہے جو سعدی، نوری اور ں کے کلام میں جھلک رہا ہے۔ جعفر، اورنگ زیب کی مدح میں لکھتا ہے :

زہے دھاک اورنگ شاہ دلی   در اقلیم دکھن پڑی کھل بلی
دریں پیر سال و ضعیف بدن   مچائی دھما چوکڑی در دکن
زہے شاہ شاہاں کہ گاہ دغائے   نہ ہلا نہ تلا نہ جنبد زجائے
کمر بستہ ہشیار میدان پر   شب و روز طیار گھمسان پر

اس کے مقابلے میں جعفر زٹلی کے حسبِ ذیل شعر ملاحظہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس پر دکن کے قیام اور وہاں کے اردو شاعروں مطالعے کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور تھا۔ اس کی ایک مثنوی سلوک سے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

ارے من باورے اب سو ونا کیا   رسیلے نینوں بن دن کھودنا کیا
بڑھاپا آگیا جوبن گیا بھاگ   اندھیری رین میں لٹکن لگے ناگ
نہ تو رے گی نہ یہ پنجرا رہے گا   ہلا کر لال تجھ سے کیا کہے گا
جو پوچھے بات تجھ کوں لال پیارا   کہ پنجرے بیچ تیں کیا کیا سنوارا
بھیانی رات تجھ کو سوتی ہے   بھیانان دن تجھے دکھ دودتی ہے
کمھن سے آج توں رلیاں مناے   رنگیلے سیج پر کلیاں بچھائے

وگر نہ کیا بھروسا اس پون کا ۔۔۔ یکایک آئے پہنچے دن مرن کا
اندھیری گور میں دیا نہ باقی ۔۔۔ یکایک چل بسے سکھی سنگاتی
بیا جعفر توکل پر قدم رکھ ۔۔۔ خدا کی یاد دل میں دم بدم رکھ

جعفر، پہلا شمالی شاعر ہے جو دکن کے اردو کارناموں سے متاثر ہوا تھا اور جس کے کلام میں فارسی اور برج کی بے تناسب آمیزش نہیں پائی جاتی، مگر چوں کہ اس کا زیادہ تر وقت، زٹل اور ہزل گوئی میں صرف ہوتا تھا وہ اعلیٰ درجہ کی شاعری کے نمونے اپ یادگار چھوڑ نہ سکا ۔

مگر اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد، شمال اور دکن میں ملاپ ہو جانے کی وجہ سے، شمال کے لوگ دکن اور دکن کے شمال آنے جانے لگے ۔ اس اختلاط نے ان دونوں میں اپنی زبانوں کے اختلاف کا احساس پیدا کیا ۔ چوں کہ دکن کے اہلِ قلم نے اپنے اسلوب میں بہت کچھ ادبی کام کیا تھا شمال کے شاعروں نے معلوم کیا کہ ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اپنی گفتگو کی زبان کی علمی سرپرستی طرف بالکل توجہ نہیں کی ۔ جعفر علی کا کلام تو خیر اسی دورِ اختلاط اور اسی اثر کا نتیجہ تھا مگر اس کے علاوہ اور دو تین شاعروں کے جو نمو ہم نے ابھی پیش کیے ہیں انھیں قدیم اردو تذکرہ نویس، سنجیدہ اور صحیح اردو شاعری نہیں سمجھتے ۔ ان کا خیال ہے کہ تفنن کے طور شاعری کی گئی تھی ۔

موسوی خاں فطرت، عہد اورنگ زیب کے ایک فارسی شاعر ہیں ان کا یہ اردو شعر تذکروں میں ملتا ہے ۔

از زلف سیاہ تو بدل دوم پری ہے ۔۔۔ در خانہ آئینہ گتا جوم پری ہے

مرزا معز کے ساتھ ایک اور شاعر، قزلباش خاں امید، کے بھی اردو شعر ملتے ہیں جن کا ایک نمونہ یہ ہے ۔

بامن کی بیتی آج میری آنکھ موں پری
غصہ کیا وہ گالی دیا اور وگر لری

اس طرح کے فارسی شاعروں میں، جنھوں نے دوچار شعر اردو میں بھی لکھے ہیں، شاہ سعداللہ، گلشن اور عبدالقادر، بیدل کے نام بھ گنائے جاسکتے ہیں ۔ یہ اور ان کے بعد کے دوسرے فارسی شاعروں نے جب دیکھا کہ دکن میں اردو شعر گوئی کا ذوق ترقی کرچکا ہے ا وہاں بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں تو وہ شوق سے دکنی ادب کی طرف بڑھنے لگے اور چوں کہ اس اثنا میں فارسی شاعری سے اکتا گئے ۔ ایک غیر ملک کی زبان میں کمال حاصل کرنے کے لیے انھیں کافی محنتیں کرنی پڑتی تھیں اور اس کے بعد بھی وہ ایرانی شاعروں ۔ مقابلے میں اپنے تئیں کم زور پاتے تھے ۔ فارسی اب ان کی اپنی زبان نہ رہی تھی ۔ وہ اپنی طرف سے ادائے خیال کے نئے نئے طریقے اختی کرنے سے قاصر تھے چناں چہ وہ ایسا کرتے بھی تو اہلِ زبان معترض رہتے تھے ۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ فارسی کی قدر کرنے والی سلطنتیں کم زور ہوتی جارہی تھیں ۔ حکم رانوں میں اس کا پہلا سا ذوق با نہ رہا تھا ۔ اس کے علاوہ چوں کہ فارسی میں ہندستانی شاعروں کے لیے خیالات ادا کرنے کے نئے نئے طریقے مسدود تھے اور وہ مقامی خصوصیات، اپنے فارسی کلام میں بے دھڑک نہیں ظاہر کرسکتے تھے، اس لیے جب انھوں نے دکنی اردو کا مطالعہ کیا جو ان ۔ لیے فارسی سے زیادہ قریب تھی اور جس کے ذریعے سے ان کے فطری رجحانات ظاہر ہوسکتے تھے تو انھوں نے فارسی کو ترک کر شروع کیا ۔ یہ بیزاری اس حد تک پہنچی کہ جب سودا یا میر جیسا کوئی بڑا شاعر فارسی میں لکھتا تو لوگ یہ سمجھتے کہ وہ اپنے رتبے سے ا

نام کہا ہے۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا اور فارسی کے ترک کرنے کا سبب، میر نے شاعرانہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی، ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا، باشندہ دکن کا تھا

اس زمانے میں دکن کے جو اردو شاعر، شمال گئے ان کی تعداد میں (جیسے جیسے اردو کے تذکرے دست یاب ہوتے جارہے اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ایک مصحفی ہی کے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ، اردو شاعر دلی گئے تھے جہاں انھوں نے قدر و یت حاصل کی۔ تذکرہ اعظم الدولہ، سرور سے بھی اس بارے میں اچھا مواد حاصل ہوتا ہے۔

مصحفی کے تذکرہ، ہندی میں شمال کے تیس کے قریب ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جو دکن گئے تھے۔

یہ تو شاعری کا ذکر تھا۔ اس زمانے میں دکن کی بہت سی اردو کتابیں بھی شمال پہنچیں۔ چناں چہ شاہان اودھ کے کتب خانوں کن کی معتدبہ اردو قلمی کتابیں جمع ہوگئی تھیں۔ اسپرنگر، کا کٹلاگ ان کے تذکروں سے معمور ہے۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت دیتا۔ دکن کے اردو ادب نے، شمال میں کس درجہ مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ اس کی شہادت اس طرح سے بھی ملتی ہے کہ یورپ مختلف کتب خانوں میں جو قدیم دکھنی مخطوطے، محفوظ کرلیے گئے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے کاتب، شمالی ہند کے ے تھے اور جنھوں نے محمد شاہ کے اوائل عہد میں دکن کی ان اردو کتابوں کو نقل کیا تھا۔

قدیم تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دلی کی مجلسوں میں دکن کے اردو اشعار، دل چسپی سے سنے جاتے تھے اور دکنی ں کی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ ولی نے تین دفعہ سے زیادہ دلی کا سفر کیا اور پھر بھی جی نہیں بھرا۔ ایک غزل میں لکھتے ہیں:

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین　　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

دلی کے شاعر، ولی کی غزلوں کی تقلید میں غزلیں لکھتے اور انھی کے شعروں سے اپنے مشاعروں کے لیے مصرعِ طرح حاصل کرتے اگر چہ اب تک شمال کے اس زمانے کے اردو شاعروں کے کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوئے ہیں، تاہم دیوان زادہ حاتم سے اس بوت ملتے ہیں۔ دیوان زادہ اس عہد کی تنہا محفوظ یادگار ہے۔ اس کا نفیس اصلی نسخہ، انڈیا آفس میں موجود ہے۔ چناں چہ راقم نے ، مرتب کرکے شائع کرنے کا سامان مہیا کردیا ہے۔

دیوان زادہ کے دیباچہ میں حاتم نے ولی کی استادی کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں انھیں کی طرز میں لکھتا ہوں۔ اس کے اپنی غزلوں میں ولی کی استادی کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے اس مختصر انتخابِ کلام میں بھی تیرہ غزلیں ایسی ہیں جن پر صراحت کردی لہ یہ ولی کی زمین اور تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ بعض شعروں میں وہ ولی سے مخاطب بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ولی کی ئی ہی میں لکھے گئے ہیں۔ اس ضمن میں مزید معلومات: میرے اس مضمون میں درج ہیں جو شاہ حاتم پر ہندستانی کے گذشتہ نمبر میں ہوچکا ہے۔

تذکرہ قاسم میں ولی کی تعریف کرنے کے بعد اس زمانے کے ایک شاعر کا مصرعہ اپنے خیالات کی شہادت کے طور پر نقل کیا ہے۔ لکھا ہے: "بیر خاں کم ترین یکہ خدایش بیامرزد بسیار بہ موقعہ و بجا گفتہ کہ

"ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں"

سس زمانے کی ایک اور تصنیف "تذکرہ بے جگر" ہیں ۔ جس کا خود مصنف کا لکھا ہوا مخطوطہ ، انڈیا آفس میں موجود ہے ۔ ولی کی بابت لکھا ہے :

"در حقیقت کسے کہ اسپ در میدانِ ہندی دوانید آن بود ، و فی الواقع شخصے کہ آب رفتہ ، باز در جوئے ایں زبان ہندی رسانید ، ہمان بود ، چوں در سنہ اثنا جلوس محمد شاہی ، دیوانِ او بہ دہلی رسید ، موزوں طبعاں بلند فکر و عالی تلاشانِ ہم عصر ، مثل حاتم وابرو و فغاں وغیرہ بہ تتبع زبانش پیرو و ہم زبان شدند ۔"

ایک اور تذکرہ ، طبقات سخن میں آبرو کے ذکر میں لکھا ہے کہ :

" چوں دیوانِ ہندی شاہ ولی اللہ گجراتی بہ عصر محمد شاہ بہ دہلی رسید ، تتبع آں شد "

مصحفی نے اپنے تذکرہ ، ہندوی میں حاتم کا قول نقل کیا ہے جس سے دہلی میں اردو شاعری کے آغاز پر روشنی پڑتی ہے ۔ حاتم کے ذکر میں لکھتے ہیں :

" روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سنہ دوئم فردوس آرام گاہ ، دیوان ولی در شاہ جہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ ۔ بادو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد ، بنائے شعر ہندی را بایہام گوئی نہادہ ، دادِ معنی یابی و تلاشِ مضامین تازہ میدادیم ۔"

ولی کے علاوہ دکن کے جن اردو شاعروں کے کلام نے دہلی میں شہرت حاصل کی ، ان میں فقیر اللہ آزاد اور فراقی بھی شامل ہیں ۔ میر حسن اپنے تذکرہ کے آغاز میں یہ لکھنے کے بعد کہ " باید دانست کہ ریختہ اول از زبان دکنی است " فقیر اللہ آزاد کا حال لکھتے ہیں اور پھر اس کی شاعری کی تعریف یوں کرتے ہیں :

" ہمراہ فراقی دکنی در شاہ جہاں آباد آمدہ بود ، طبع دردمندے داشت و بسیار بصفا حرف می زند خدا لیش بیامرزد ۔"

غرض ان اسباب اور حالات کے نتیجہ کے طور پر دہلی میں اردو شاعری کا آغاز ہوا اور فارسی کا اثر کم ہونے لگا ۔ چوں کہ دکن کے اردو کلام کے اثر سے ابتدا ہوئی اس لیے اول اول دکنی طرز کی پیروی کی گئی ۔ اس کے خلاف لکھنے والے کی شاعری غلط سمجھی جاتی تھی ۔ چناں چہ اس آغازی دور کے ایک مشہور شاعر ، شاہ مبارک آبرو نے اس کے متعلق جو نصیحت کی تھی اس کو حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں نقل کیا ہے :

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ہے	ان سیتی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لائے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف	لغو ہیں گے فعل ، اس کے ، ریختہ میں حرف ہے

لیکن شعرائے دہلی کا یہ اسلوب ، عرصے تک قائم نہیں رہ سکا ۔ دکنی طرز کی پیروی ، ان کے لیے غیر فطری تھی ۔ اس میں بھی خیال ادا کرنے کے لیے انھیں تکلف اور تصنع سے کام لینا پڑتا تھا ۔ اب انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی روز مرہ کی زبان میں فارسی اجزا کی آمیزش کرکے شعر لکھیں ۔ اگرچہ پہلے پہل بعض شعرا نے اس کی مخالفت بھی کی مگر یہ تحریک کامیاب ہوگئی اور بہت جلد اردوئے معلیٰ کی زبان میں شعروشاعری ہونے لگی ۔ اس رجحان کا آغاز ، مرزا مظہر جانِ جاناں نے کیا اور اس کی ترقی عہدِ ناسخ تک جاری رہی ۔ حاتم نے اس تبدیلی کا ذکر اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں کیا ہے اور چوں کہ وہ دہلی میں اردو شاعری کے آغازی اور اصلاحی دونوں

رجحانوں کی ترویج و ارتقا کے وقت زندہ تھے اس لیے ان کا بیان اس بارے میں زیادہ دل چسپ اور مستند ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

درین ولا، این ترتیب طلب از دہ دوازدہ سال، اکثر الفاظ را از نظر انداختہ، لسان عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد، و روز مرہ دہلی کہ میرزایانِ ہند فصیح گویانِ رند در محاورہ دارند، منظور داشتہ، سوائے آن، زبان ہر دیار، بہ ہندوی، کہ را بھاکا گویند، موقوف نمودہ فقط روز مرہ کہ عام فہم و خاص پسند بودہ، اختیار کردہ۔"

پھر قدیم و جدید لفظوں کی فہرست لکھنے کے بعد کہتے ہیں "دیوان زادہ میں قدیم یعنی دکنی طور کے اشعار، میں نے نہیں درج ہیں۔ اگر کوئی مل جائیں تو مجھے معاف کیجیے۔" لیکن اب تذکروں سے حاتم کی قدیم طرز کی نظمیں بھی دستیاب ہو گئی ہیں۔ حمد و نعت ان کی ایک نظم تذکرہ، گلشنِ گفتار میں منقول ہے۔ اس کے چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں تاکہ یہ ظاہر ہوسکے کہ دہلی کی آغازی شاعری، کس رنگ کی تھی اور اس کے ساتھ ہی دیوان زادہ کی ایک نظم کے چند شعر بھی پیش کیے جاتے ہیں جو ثابت کریں گے کہ تبدیلی کے رجحان نے دہلی کی آغازی شاعری کے اسلوب کو کس قدر بدل دیا۔ حاتم کی ابتدائی شاعری کا نمونہ یہ ہے:

الٰہی داغ سیں دل کو جلادے — برہ کی آگ مجھ تن میں لگادے
جلا جیوں پھل جھڑی اس ناتواں کوں — شرر لبریز کر ہر استخواں کوں
فنا کر عشق میں یہ جانِ بے تاب — کہ جیوں آتش میں گھٹ جاتا ہے سیماب
کہ ہو مست آپ سیں یکبار جاؤں — پیمبر کی صفت کرنے کو دھاؤں
رکھے ہیں جس کے دروازے پہ موسیٰ — سعادت جان، دربانی کا عاصا
مسیحا ناک گھس تج آستاں پر — دماغ اپنا چڑھایا آسماں پر
اوتر سدرہ ستے ہر پیر جبریل — کیا عِلم حقیقت خوب تحصیل
نبی کی آل پر سے وار جانا — اسی بارہ پنے میں پار جانا

حاتم کی یہ وہ طرزِ شاعری تھی جو ان کے آخری عہد میں متروک ہو گئی تھی اور جس کا انتخاب انھوں نے دیوان زادہ میں کیا۔ یہاں ہم دیوان زادہ کی ایک نظم سے چند شعر نقل کرتے ہیں:

کیا بیاں کیجیے نیرنگیِ اوضاعِ جہاں — کہ بہ یک چشم زدن ہوگیا عالم ویراں
جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پانو — پھریں ہیں جوتے کو محتاج، پڑے سرگرداں
نعمتیں جن کو میسر تھیں ہمیشہ ہر وقت — روز پھرتے ہیں یہاں قوت کو اپنے حیراں

چوں کہ یہ نظم، ہمارے مضمون کے سلسلہ میں، ہندستانی کے گذشتہ نمبر میں چھپ چکی ہے اس لیے یہاں اس کے اتنے ہی شعر کافی ہیں۔

جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اس لسانی تبدیلی کو ابتدا میں بعض حضرات نے پسند نہیں کیا۔ تذکرہ، مخزنِ نکات میں قائم نے اس کے متعلق اپنے خیالات اس طرح ظاہر کیے ہیں:

"بر مشا سائے سلوکِ سخن مخفی و محتجب نیست کہ از عہدِ عبداللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانِ بہادر شاہ اول، کسانے کہ شعر ریختہ گفتہ اند، نسقِ کلام این ہا، بسیار مربوط و معقول است، ہر چند اکثر

الفاظ غیر مانوسِ گوش ما مردم مستعمل ایشان است ۔ لیکن چون کہ موافق زبانِ دکن ، راست و درست است ، پیش ہر کس راہ بند دارد۔"

قائم کے اس بیان کے سلسلے میں ان کا یہ اردو شعر غالباً دل چسپی سے سنا جائے گا کہ :

قائم ، میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　　اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

طبقۂ سوم یعنی میر ، سودا اور سوز وغیرہ کے ذکر سے پہلے قائم لکھتے ہیں :

"مخفی و محتجب نماند کہ آں چہ الحال اشعار و احوال شعرائے متاخرین نوشتہ می آید۔ طرزِ کلام ایں ہا ، مانا بروبہ شعر فارسی است ۔ چناں چہ جمیع صنایع شعری قرار دادہ ۔ اساتذہ ء اسلاف است ۔ بکار می برند و اکثرے از ترکیبات " فرس " موافق محاورہ ، اردو ئے معلّیٰ ، مانوسِ گوش می نمایند ، جوار البیان می دانند ۔ الا ترجمہ زبان مغل بہ ریختہ کردن مقبوح است ۔ چہ درین صورت صحت زبان یکے ازہر دو نمی ماند۔"

مگر قائم اور ان کے ہم خیالوں کے اعتراف کے باوجود دلی کی اردو شاعری ، فارسی سے متاثر ہوتی گئی ، یہ رجحان اس لیے بھی کامیاب ہوگیا کہ اس کے علم بردار مظہر جانِ جاناں ، میر و سودا اور قائم و سوز جیسے بلند مرتبہ شاعر تھے ۔ اب رہی یہ بحث کہ اردو شاعری نے ان شعرا کے زیرِ اثر کس طرح وہ قالب اختیار کیا جو آج تک بدل نہ سکا ، اس مضمون کے موضوع سے باہر ہے ۔ اس کا تعلق دراصل ہمارے اس مقالے سے ہے جو دلی میں اردو شاعری کے ارتقا پر زیرِ تحریر ہے ۔ دلی کے ابتدائی مشاعروں ، شعر و سخن کے سرپرستوں اور شاعروں کی آپس کی نوک جھونک اور مختلف شاعروں کے موجودہ کلام کے اوقات و سنین پر گفتگو کرنا بھی اسی مضمون سے متعلق ہوگا۔

(مطبوعہ "ہندستانی" الہ آباد ، جولائی ۱۹۳۳ء)

○●○

(سلسلہ ص ۳۱ سے)

(۳) دکنی میں ان لفظوں کے شروع میں جو "ٹ" ملتا ہے یہ غالباً کوئی نئی تبدیلی ہے ، اس کا کوئی اور سبب ہوگا ۔ ایسے لفظوں میں سنسکرت میں "ت" ضرور تھا ، لیکن وہ پراکرت کے زمانے میں ہی "ٹ" میں تبدیل ہوچکا تھا مثلاً سنسکرت لفظ ہے ، اس کا پراکرت اور ہندی ہے۔

(۴) یہ بھی ممکن ہے کہ ہندی میں جہاں دو حروف صحیح شروع لفظ میں ایک ساتھ آتے ہیں وہاں عموماً یا تو شروع میں ایک حرف علت لگا دیتے ہیں یا پہلے حرف صحیح کو چھوڑ دیا جاتا ہے ، اس طرح لفظ کے ادا کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے ، اس کے ماتحت لفظ "سٹیشن" سے "اسٹیشن" اور "ٹیشن" دونوں ایک ساتھ نکل سکتے ہیں۔

○●○

سید محی الدین قادری زور

مشرقی طب عہدِ قطب شاہی میں

یہ میرے احباب کی ستم ظریفی ہے کہ اس وقت مجھے ایک ایسے موضوع پر خیالات و معلومات کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے۔ جس کے لیے یا تو مورخ کی ضرورت تھی یا طبیب کی۔ اردو زبان و ادب کی تلاش اور اس کی نسبت معلومات سے حاصل کرنے کے سلسلے میں البتہ میں گزشتہ پندرہ بیس سال سے قطب شاہی عہد کی کتابیں پڑھتا رہا ہوں اور اردو کی نشوونما کا پتہ چلانے ہی کی خاطر اس دور کی تاریخ اور معاشرت سے بھی واقف ہونا ضروری تھا۔ اسی واقفیت اور تعلق کی بناء پر مجھے اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ عہدِ قطب شاہیہ سے مجھے ایک طرح کی دل چسپی پیدا ہوگئی ہے جس کے نتیجہ کے طور پر میری بعض کتابیں حیات محمد قلی قطب شاہ۔ حیات میر محمد مومن پیشوائے سلطنت قطب شاہیہ۔ سیر گولکنڈہ اور گولکنڈے کے ہیرے وغیرہ ظہور پذیر ہوئیں لیکن اپنے مطالعے اور تلاش و تجسس کے دوران میں طب کی نسبت معلومات جمع کرنے کا خیال کبھی میرے ذہن میں نہ گزرا تھا۔ ورنہ یہ موضوع ایسا بسیط اور اہم ہے کہ اگر کوئی دل لگا کر اور وقت نکال کر کام کرے تو خود اس موضوع پر ایک جداگانہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

قطب شاہی سلاطین نے سرزمینِ دکن پر تقریباً دو سو سال حکومت کی اور اس طویل مدت میں انھوں نے اس کو ہسار کو تہذیب اور شائستگی کی جس اعلیٰ منزل پر پہنچا دیا تھا اس کی نظیریں دوسرے ممالک کی تاریخ میں بہت کم نظر سے گزرتی ہیں۔ اگر آپ اپنے زمانے کے بنجارہ کوہستان پر غور کریں اور یہ اندازہ لگائیں کہ کس طرح ان سیاہ فام ہیبتناک پہاڑیوں کو چند صاحبانِ ذوق نے عہد حاضر کی جملہ سہولتوں اور سائنٹیفک ترقیوں سے کام لے کر گزشتہ دس بارہ سال کے عرصہ میں حیدرآباد کے ایک ایسے بارونق حصے کی شکل میں منتقل کر دیا جسے بعض لوگ شائد جنت ارضی سمجھتے ہیں تو آپ یہ بھی اندازہ لگا سکیں گے کہ قطب شاہیوں نے آریاؤں کے قول کے مطابق راکشسوں کی اس کوہستانی سرزمین کو آج سے چار سو سال قبل ایک لہلہاتے ہوئے سبزہ زار کی شکل میں منتقل کر دیا تھا اور شہرِ حیدرآباد کو تمام ہندوستان کے لیے ایک ایسا نمونہ کا شہر بنا دیا تھا جس کو دیکھ کر ایک شاعر کو ماننا پڑا کہ

ع حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہان ثانی

سلسلہ رفیعہ قطب شاہیہ کے سلاطین نے نہ صرف دور دراز ممالک کے علماء و فضلاء اور صاحبانِ کمال کو اس خطہ ملک میں جمع کیا اور ان کی سرپرستی کی بلکہ خود اہلِ دکن کو بھی اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں سے اس دور میں زیادہ سے زیادہ مستفید ہوتے رہتے ہیں اس رجحان کے تحت ان بادشاہوں نے نہ صرف فارسی اور اردو ہی میں کتابیں لکھیں اور لکھائیں بلکہ تلنگی زبان کی بھی سرپرستی کی۔ اور ان میں سے ایک نے تو اس زبان میں ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا۔

زبان اور ادب کی طرح عہد قطب شاہیہ میں دوسری دیسی چیزوں کی بھی قدر و منزلت کی گ[illegible] ۔ اس دور میں ایرانی اور فرنگی اطبا کے ساتھ اپنی اطبا کو بھی ترقی کرنے اور اپنے علاج معالجے کے اصولوں اور تجربوں کو وسیع کرنے [illegible] موقع دیا گیا۔ چناں چہ دیسی

اطبا اور ان کا طریقہ علاج سلطان محمد قطب شاہ بانی مکہ مسجد کے عہد میں اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ جب یہ حشتی بادشاہ ۱۰۳۵ء میں علیل ہوا تو اس کے علاج کے سلسلہ میں دربارِ شاہی میں دو الگ الگ جتھے بن گئے۔ ایک جتھے میں خود بادشاہ کی ماں مخدومہ جہاں خانم آغا اور حبشی وزیر منصور خاں عین الملک شامل تھا اور دوسرے گروہ میں دیگر امرائے دربار کے ساتھ بادشاہ کی ملکہ حیات بخشی بیگم بھی شریک تھی جو حیدرآباد میں بی کے علم اور حسینی علم کو رائج کرنے والی ماں صاحب کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

پہلا فریق یہ کہتا تھا کہ بادشاہ چوں کہ سرزمین ہند میں پیدا ہوا اور یہیں پرورش پائی اس لیے ہندی علاج اس کے مزاج کے موافق ہوگا اور ہندی طبیبوں ہی کا علاج کرانا چاہیے۔

اور دوسرا فریق اس خیال کا مخالف تھا۔ اس کا بیان تھا کہ ایرانی اطبا کا علاج زیادہ بہتر ہے اور ان ہی سے فائدہ ہوگا غرض اصل بحث علاج بالمثل اور علاج بالضد کی آن پڑی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہندی طبیبوں کا اثر و اقتدار زیادہ تھا۔

چناں چہ آخر کار ہندی طبیبوں کے طرف دار ہی بازی لے گئے اور ان ہی کا علاج کرایا گیا لیکن طرف داروں کے بازی لے جانے کا یہ مطلب نہیں کہ خود طبیب بھی بازی لے گئے افسوس تو اس کا ہے کہ ان کو شکست ہوئی اور اس سے زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ یہ جواں سال بادشاہ اپنی عمر کی صرف پینتیس بہاریں دیکھنے پایا تھا کہ بڑی بڑی حسرتیں اور آرزوئیں دل میں لیتا گیا۔ وہ نہ صرف مکہ مسجد ہی کی عمارت کو مکمل حالت میں نہ دیکھ سکا جس کا اس نے سنگِ بنیاد رکھا تھا بلکہ سرو نگر سے آگے جو عظیم الشان قلعہ اور شہر سلطان نگر تعمیر کرا رہا تھا اس کو بھی ادھورا ہی چھوڑ گیا۔

سلطان محمد قطب شاہ کا پیش رو جو اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر، شہر حیدرآباد کے بانی، اور اس خاندان کے سب سے عظیم الشان بادشاہ کی حیثیت سے مشہور ہے اصل میں حیدرآباد کی طبی ترقیوں کا پہلا سرپرست تھا۔ اس نے اپنے ملک کو عمرانی اور سماجی نقطہ نظر سے ایک بلند سطح پر پہنچانے کی جو کوششیں کیں ان میں حفظانِ صحت اور طبی اصول کی مطابقت کو سب سے بڑا دخل تھا۔ خود شہرِ حیدرآباد کی بنا ہی اس لیے ڈالی گئی تھی کہ قطب شاہیوں کے قدیم پایہ تخت گولکنڈے کی آبادی اتنی گنجان ہو چکی تھی کہ وہاں بیماریوں اور وباؤں کا بازار گرم ہونے لگا تھا۔ اور ضرورت تھی کہ پایہ تخت کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر ایک ایسا شہر بنایا جائے جو کھلے میدان میں واقع ہو اور جس میں شروع ہی سے طبی اصولوں کے مطابق بازاروں۔ محلوں۔ مسجدوں۔ حمام خانوں اور دواخانوں کے لیے مقامات متعین کر دیے جائیں اور درمیان میں جگہ جگہ باغ اور تالاب نما حوض بنائے جائیں جو شہر کی گرمی اور گرد و غبار کو اس طرح جذب کر لیں کہ متعدی بیماریاں پھیلنے نہ پائیں۔ اس لیے باغ محمد شاہی خود بادشاہ نے بنوایا جو موسیٰ ندی کے کنارے کنارے شہر کے سب سے بڑے دواخانے کے صحن تک پہنچ گیا تھا جس کو دارالشفا کہتے تھے اور اب بھی اس کی عمارت اور اطراف و اکناف کے محلہ کو اسی نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس شاہی باغ کے علاوہ میر جملہ امین الملک الف خاں نے بھی ایک باغ بنایا تھا جو امین باغ کے نام سے عرصہ تک موسوم رہا اور جس میں اب وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل اور ہائیکورٹ کی عمارتیں بن گئی ہیں اور باغ محمد شاہی میں میر عالم کی بارہ دری بعد کو بنائی گئی۔ یہ تو شہر کے شمالی سمت کے باغ تھے۔ اسی طرح دوسری سمتوں میں بھی باغ بنائے گئے جن کی تفصیلات تاریخوں میں مندرج ہیں۔

خود شہر کے اندر بڑے بڑے میدان چھوڑ کر ان میں حوض بنائے گئے تھے جن میں سے ایک حوض کو تو اس عہد میں عجائب روزگار سمجھا جاتا تھا۔ یہ حوض داد محل کے مقابل اس جگہ بنایا گیا تھا جہاں اب چوک کی گھڑیال محبوب مارکٹ اور خزانہ عامرہ واقع

..... اس کی نسبت فرونی استر آبادی نے جو اسی زمانے میں حیدرآباد آیا تھا اپنی تاریخ فتوحات عادل شاہی میں لکھا ہے کہ :۔

"ودریا چہ ۔ کہ در برابر داد محل قرار دادہ اند فیلے کہ از طلا ساختہ اند ۔ چناں چہ آب از خرطوم فیل مثل فوارہ لا ینقطع در دریا چہ ریزد کہ بر ہوا ساختہ اند ۔ نوعے کہ طاقہا زدہ اند کہ حوضے بدیں بزرگی را کہ زیرا و خالی است و محل مرور مردم است پرداختہ اند در آن رات و مواضع اعجوبہ کاران را وقت بسیار بکار رفتہ"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتنے اعلیٰ درجہ کے طبی اصول کو پیشِ نظر رکھ کر حوض کو سطحِ زمین سے اتنی بلندی پر بنایا گیا کہ اس ۔ نیچے بلند کمانیں بنانی پڑیں اور یہ کمانیں اتنی اونچی تھیں کہ مرور و عبور کا کام دیتی تھیں ۔

حوضوں اور نہروں کے علاوہ محمد قلی قطب شاہ نے شہر کو بیماریوں اور گندگی سے دور رکھنے کے لیے متعدد حمام لنگر خانے ۔ مہمان نے ۔ کاروان سرائیں اور دواخانے بھی بنائے تھے جن میں سے بعض کے شکستہ آثار اب بھی موجود ہیں ۔ اور یہ تمام عمارتیں شہر کا نہ ڈالتے وقت ہی اس ترتیب سے بنائی گئی تھیں کہ اگر شہر میں کوئی بیماری پھوٹ پڑے یا دوسرے مقامات سے متعدی امراض میں مبتلا ہو کر لوگ حیدرآباد آئیں تو شہر کی اصل آبادی زیادہ متاثر نہ ہونے پائے ۔ چناں چہ شہر کا سب سے بڑا دواخانہ یعنے دارالشفا جس بوسیدہ عمارت اب بھی موجود ہے اس کے محل وقوع پر غور کرنے سے خود اندازہ لگا سکیں گے کہ اس کو شہر کے شمال مشرقی گوشہ ں ایک ایسی پُر فضا جگہ دی گئی تھی جس کے ایک طرف باغ محمد شاہی واقع تھا اور دوسری طرف موسیٰ ندی لیکن ندی اور دارالشفا ۔ درمیان ایک بڑا صحن چھوڑا گیا تھا جس میں مسجد اور حمام بنائے گئے تھے ۔

طبی اصولوں کی اسی نگہ داشت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس زمانے میں جب بیرونی ممالک کے سیاح حیدرآباد آتے تو یہ شہر ان کو ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں نہایت پاک صاف اور صحت مند نظر آتا تھا ۔

چناں چہ ابوالقاسم فرشتہ جس نے اکبر اعظم کے بنائے ہوئے آگرہ اور فتح پور سیکری کے علاوہ لاہور اور دلی جیسے عظیم الشان یہ شہروں میں بھی بود و باش کی تھی حیدرآباد کے متعلق اپنی تاریخ کے مقالہ ، سوم میں لکھتا ہے ۔

"شہرے کہ در تمامی ہندوستان شرقاً غرباً شمالاً جنوباً مثل آں در لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود ۔"

شہر حیدرآباد کی یہ صفائی و پاکیزگی محض اس امر کا نتیجہ تھی کہ اس کے بناتے وقت بادشاہ اور اس کے پیشوائے اعظم میر محمد مومن دونوں نے طبی امور کا خاص طور پر خیال رکھا تھا ۔ اور خود موخر الذکر فن طب سے اتنی دلچسپی رکھتے تھے کہ انھوں نے طبیبوں کی سہولت اور ہدایت کے لیے ایک کتاب رسالہ ، مقدار یہ لکھی تھی کہ جس میں طبی اوزان بیان کیے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ عراق ۔ ایران ۔ ہندوستان میں وزنوں میں کیا فرق ہے اور ہندوستانی اطبا اپنے نسخوں میں دواؤں کے وزن کی صحت و مناسبت کا کیوں کر خیال رکھتے ہیں ۔ یہ ایک نہایت اہم مسئلہ تھا کیوں کہ طب کی جو کتابیں اس زمانے میں متداول تھیں ان میں دواؤں کے جو وزن لکھے گئے تھے عراق اور ایران میں خود مختلف فیہ تھے اور ہندوستان کے اطبا کو ان اوزان کی صحیح قدر و قیمت سے واقف کرانا ضروری تھا ۔

غرض جس شہر کے بانیوں میں ایسے محتاط اربابِ فکر شامل تھے اس کی نسبت شہنشاہ اورنگ زیب کے مورخ محمد ساقی نے اگر لکھا ہے تو وہ حق بہ جانب تھا کہ ۔

"آرام گاہے است بر قطعہ ، زمینِ بہشت ، راحت جسم و آرام جان ۔ آبادی وسیع تر از احاطہ ، خیال ۔ عمارات رفیع تر از پایہ ، شہ ۔ رطوبت ہوا و عذوبت روانی چشمہ ۔ شادابی سبزہ بمرتبہ ، کہ پنداری گل و سبزہ ، این سرزمین را آب و رنگ زمرد و لعل است ۔"

اسی طرح شاہ جہان آباد دہلی کے رہنے والے ایک اور مورخ خافی خان نے جب اورنگ زیب کے ساتھ شہر حیدرآباد کو دیکھا تو اس کے متعلق لکھا کہ۔

" خوش ہائے آں شہر، لطافت و آب و ہوائے آں سرزمین و حسن ہائے نمکین آں سبزہ فام و سیر حاصلی آں مرز بوم اگر پردازم از سررشتہ سخن باز می مانم۔"

شہر حیدرآباد میں جب سب سے بڑا شفا خانہ یعنی دارالشفا کی عمارت ۱۰۰۳ء میں تیار ہوئی تو اس کے انتظام کے لیے چوٹی کے اطبا مامور کیے گئے جو علاج معالجے کرنے کے علاوہ ہمارے اس نظامیہ دواخانے کے بعض اطبا کی طرح طلبہ طب کا درس دیا کرتے تھے۔ ان اطبا کے لیے خزانۂ شاہی سے بیش قرار مواجب مقرر تھے اور یہ لوگ ہر روز شمالی راستے یعنی موجودہ کالی کمان میں سے دولت خانہ عالی میں داخل ہو کر بادشاہ کے ساتھ اس دسترخوان پر خاصہ تناول کرتے جس پر ہر وقت ایک ہزار اصحاب شریک رہتے تھے۔ تاریخ قطب شاہی میں لکھا ہے کہ۔

اطبائے مذکور بے زحمت اجر و محنت معالجہ، مریضاں حاضر باشند و مواجب ایشان از سرکار مقرر۔ وادویہ از دواخانہ سرکار میرسانیدند۔

ہر دواخانے کے لیے بیماروں کی غذا اور دوا کے اخراجات جو معقول ہوا کرتے تھے سرکاری خزانہ سے ارسال کیے جاتے تھے۔

اس زمانے میں طب کی نصابی کتابیں حسب ذیل تھیں جن کا ذکر میر محمد مومن نے اپنے رسالہ، مقداریہ میں کیا ہے:۔

- قانون رئیس الحکما شیخ ابوعلی
- ذخیرہ سید اسماعیل جرجانی
- جوامع الادویہ عمدۃ المطببین بدر الدین الزنجانی
- ذخیرہ خوارزم شاہی، اختیارات بدیعی وغیرہ

لیکن ان کتابوں میں چوں کہ اوزان میں اختلاف تھا اس لئے رسالہ، مقداریہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی فرمائش پر تحریر کیا گیا اور اس کے سبب تالیف کے طور پر مصنف نے لکھا کہ

چوں قدر مقدار بعضے وزن ہا و پیمانہا دانستنی است و بجہت رعایت بعضے امور شرعیہ و بعضے اعمال طبیہ دانستن آنہا واجب و ضروری است بنا براں دریں باب چند کلمہ کے مناسب حال و مقتضائے سیق مجال باشد مرقوم و مصروف میگردد بحکم اشارت واجب الاطاعت اعلیٰ حضرت اشرف اقدس ارفع شاہی خلایق پناہی سکندر سپاہی سلیماں جاہی مورد فیوض لاتناہی۔ مشمول عنایات بے غایات الٰہی محمد قطب شاہ آں شہریار عادل کامل کہ منت ازو جویش برہمہ خلق است یزدان را"

اس رسالہ کی تالیف سے چند سال بعد میر محمد مومن استرآبادی کے ایک شاگرد تقی الدین محمد بن صدر الدین علی نے جو شاہی طبیب تھے ایک کتاب "میزان الطبائع قطب شاہی" مرتب کی تھی۔ جس کے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس سے قبل ایک طبی کتاب تالیف کرکے بادشاہ کو نذر دی تھی۔ بادشاہ نے ایک وقت جب کہ علماء و فضلا جمع تھے اور طبی مسائل پر گفتگو اور مباحث ہو رہے تھے حکیم تقی الدین سے کہا تم اس کتاب کو ترمیم و اضافے کے ساتھ از سر نو مرتب کرو چناں چہ مؤلف نے اس کی ترکیب میں "اختیارات بدیعی" سے استفادہ کرنے کے علاوہ ایک جگہ وہ خاص خاص نسخے بھی درج کردیے ہیں جن کو علامہ میر محمد باقر داماد نے بادشاہ کے لیے خاص طور پر بہ طور تحفہ ایران سے روانہ کیا تھا۔ اس دوسری ترتیب کے وقت تک چوں کہ رسالہ مقداریہ مرتب ہو چکا تھا اس لیے مؤلف نے میزان الطبائع قطب شاہی میں اوزان کا بھی ذکر کرایا ہے لکھا ہے کہ حضرت استادی ملاذی بدرالملۃ السامی کی کتاب سے تبرکاً

ں کو تا معلوں کیوں کہ اوزان کے متعلق اس سے بہتر مجموعہ تصور میں نہیں آسکتا۔

میزان الطبائع قطب شاہی کی تالیف سے تقریباً تیس پینتیس سال قبل گولکنڈہ میں ایک اور طبی کتاب خود عمارت دارالشفا کی تعمیر سے تقریباً دس بارہ سال قبل محمد قلی قطب شاہ کے حکم سے متعدد اطبا کے مشورے کے بعد مرتب کی گئی تھی۔ اس کا نام اختیارات قطب شاہی ہے۔ جس کا ایک نسخہ میر مجد الدین محمد الحسینی الکاشانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا اب تک موجود ہے۔ جس نے اس کتاب کو ۱۰۱۱ء میں نقل کیا تھا اور سلطان محمد قطب شاہ نے اوائل شہرِ ذی قعدہ ۱۰۲۴ء میں اس کا مطالعہ کرکے اپنے دستِ خاص سے اس پر ایک نوٹ تحریر کیا تھا۔ اس کتاب کے شارح کا نام محمد صادق بن الحسینی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود محمد قطب شاہ کو طبی امور کی تحقیق اور تحصیل سے خاص دلچسپی تھی اسی لیے اس نے ہندی طریقۂ علاج کی بھی قدر افزائی کی تھی اور یہ ہندی اطباء اتنے با اقتدار ہوگئے تھے کہ آخر کار ان ہی کو بادشاہ کا علاج تفویض کیا گیا۔ اطبا کی سرپرستی کے علاوہ خود بادشاہ نے بھی چند طبی رسالے تالیف کیے جن میں مصباح الارواح احکام المطببین وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

سلطان محمد قطب شاہ کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں پہلے ایرانی اطبا کا دور دورہ رہا اور بعد کو جب فرنگستان سے طبیب آنے لگے تو اپنی جراحی کی قابلیت کی وجہ سے ان کی قدر و منزلت بھی شروع ہوئی۔ لیکن مشرقی طب نے اس دور میں جو ترقی کی وہ بہ جائے خود تاریخ طب مشرقی میں یادگار رہے گی۔ اسی زمانے میں ابن روز بہان نے خرقۃ العلماء کے نام سے انسائکلوپیڈیا کے قسم کی ایک کتاب لکھی جو چھ جلدوں پر مشتمل تھی۔ ان کا سب سے بڑا حکیم نظام الدین احمد حکیم الملک جیلانی تھا۔ علامہ میر محمد باقر داماد کا شاگرد رشید تھا اور حیدرآباد میں عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے اس نے کئی طبی رسالے تالیف کیے تھے۔ جن میں سے ایک رسالہ عسلِ مصفا کے سبب تالیف سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں بھی محمد قطب شاہی درباروں کی طرح طبی مسائل پر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ اسی قسم کے ایک مباحثہ میں شہد کی مکھی پر گفتگو ہونے لگی اور اس وقت بادشاہ حکیم الملک نظام الدین احمد کی طرف مخاطب ہوا کہ تم اس کے متعلق ایک کتاب مرتب کرکے پیش کرو جس کی بنا پر حکیم الملک خداداد محل شاہی کی ایک منزل "الٰہی محل" میں پہنچ کر رسالہ کی ترتیب میں مصروف ہوگیا۔ اور شہد کی مکھی کے علاوہ دوسرے مخصوص جانوروں کے حالات بھی اس سلسلے میں قلم بند کردیے۔ ساتھ ہی حکیم ذکریا رازی کے ایک عربی رسالہ کو بھی چار گھنٹوں میں اغلاط و اسقام کو دور کرکے نقل کیا۔ یہ عربی رسالہ جسم کے مختلف حصوں کے علاج پر لکھا گیا تھا۔

حکیم نظام الدین احمد نے تقریباً سو چھوٹے چھوٹے رسالے طب کے مختلف موضوعوں پر قلم بند کیے تھے۔ جن کے مجموعے اب بھی بعض کتب خانوں مثلاً خدا بخش لائبریری پٹنہ اور کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر میں موجود ہیں۔ ایک کتاب کے دیباچہ میں نظام الدین احمد نے اپنی آمد حیدرآباد کے جو اسباب بیان کیے ہیں ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت حیدرآباد میں مشرقی طب کو کس قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا وہ کہتا ہے کہ جب شاہ جہاں کے حکم سے خان خاناں مہابت خان نے دولت آباد پر چڑھائی کی اور قلعہ فتح کرلینے کے بعد مال و دولت پر قبضہ کرلیا اور لوگوں کو تکلیف دینی شروع کی تو اس دار و گیر میں خان خاناں نے میری بیک تکلیف بھی جلادی جس کی وجہ سے مجھے اتنا رنج پہنچا کہ ایران کے ارادے سے مچھلی بندر پہنچا جہاں سلطان عبداللہ قطب شاہ کا فرمان ملا جو اس نے میری آمد کے اطلاع پاتے ہی روانہ کیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے حاضر دربار ہونے کا حکم دیا اور داد و دہش اور انعام و اکرام کے وعدے کیے۔ چناں چہ شاہی پیغام کے اصرار اور بادشاہ کی دلی خواہش معلوم کرکے جب میں حیدرآباد پہنچا تو عبداللہ قطب شاہ

بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آیا اور اپنے خاص مقربین میں مجھے جگہ دی اور میری دل جوئی کے لیے کلمب کی نادر نادر کتابوں کا ایک بہت بڑا کتب خانہ میرے یہاں مہیا کر دیا جس کے مطالعے میں میں رات دن مصروف ہو گیا۔ حیدرآباد کا یہ طبیب ۱۰۵۹ھ میں انتقال کر گیا۔ اور اس پر فضا پہاڑی پر مدفون ہوا جو بنجارہ کوہستان یعنی جدید جوبلی ہلز کے انتہائی جنوب مغربی گوشہ میں ٹولی چوکی کے جانب شمال واقع ہے۔ اس نے غالباً اپنے لیے ایک عالیشان گنبد بنا لیا تھا جس کے داخلی دروازہ پر بادشاہ کے حکم سے تاریخ وفات کندہ ہے جو الفاظ فوت الحکیم سے نکلتی ہے۔

عہد عبداللہ قطب شاہ اور عہد ابوالحسن قطب شاہ میں بھی دوسرے علوم و فنون کی طرح طب کی بہت سی کتابیں تالیف کی گئیں۔ لیکن ان میں شاہ محمد جامی کی ایک کتاب لذات النساء اپنے موضوع کی وجہ سے بہت مشہور و مقبول ہوئی اور اس کا اردو ترجمہ حیدرآباد کے ایک پیرزادے سید میران حسینی نے تحفۃ العاشقین سے کیا تھا۔

یہ تو ان کتابوں کا تذکرہ تھا جو عام طور پر معروف ہیں اور بڑے بڑے کتب خانوں میں نظر سے گزر سکتی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ عہد قطب شاہیہ کی بہت سی کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے متعلق عام طور پر ابھی خود علماء و اطبا کو علم نہیں ہے۔ چناں چہ بعض قلمی نسخے ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے میں محفوظ ہیں جن میں ایک عہد قطب شاہیہ کا لکھا ہوا ایسا قدیم و پاکیزہ نسخہ بھی ہے جس کی نسبت اب تک پتہ نہ چل سکا کہ اس کا مصنف کون ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ ارباب ادارہ نے اپنے بعض طبیب دوستوں نیز کتاب اسلامی طب کے لائق مؤلف معین الدین صاحب رہبر سے بھی مشورہ لیا اور یہ کتاب دکھائی لیکن افسوس ہے کہ اب تک اس کے نام اور مصنف کا پتہ نہ چل سکا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ نسخہ ناقص الطرفین ہے۔ ماہرین طب اور قلمی نسخوں کے شائقین کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ مخطوطہ ہمیں گولکنڈے ہی کے قریب ایک گاؤں کی ویران لیکن عالی شان مسجد کی طاق سے ملا ہے جب کہ ادارہ ادبیات اردو کے شعبہ تاریخ دکن کے اراکین گزشتہ سال حسب معمول تاریخی آثار و تحقیق و تلاش کے سلسلے میں اس طرف سیر و سیاحت کر رہے تھے۔ نہ معلوم یہ نادر تحفہ کتنے قرنوں سے وہاں رکھا ہوا تھا اور لوگ اس کو قرآن شریف سمجھ رہے تھے۔ کیوں کہ وہ نہایت عمدہ خط نسخ میں لکھا ہوا ہے جو عہد قطب شاہیہ میں عام طور پر رائج تھا۔

ہم اپنی اس خوش بختی پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے کہ اعلیٰ حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم کی ذاتی دلچسپی اور مسیحا نفسی کی وجہ سے اہل ملک پھر سے مشرقی طب کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ اور شفا خانہ کے علاوہ ایک شایان شان طبیہ کالج بھی قائم ہو چکا ہے جس کے سرگرم طلبہ اور لائق اساتذہ سے قوی توقع ہے کہ وہ مشرقی طب کی تحقیق و تحصیل کے سلسلے میں جملہ سرکاری اور خانگی کتب خانے چھان ڈالیں گے اور ان تمام طبی کتابوں اور طب مشرقی سے متعلقہ دیگر آثار کی حفاظت اور اشاعت کا کام بھی انجام دیں گے۔ جو اس سرزمین میں ازمنہ ماضیہ کی یادگار ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک ہم اپنے اسلاف کے کارناموں سے بخوبی واقف نہ ہوں گے اور ان سے پوری طرح استفادہ نہ کریں گے اس وقت تک ہم اس قابل نہ ہو سکیں گے کہ آنے والی نسلوں کے لیے ایسے کام چھوڑ جائیں جن کو دیکھ کر وہ ہماری یاد تازہ رکھ سکیں۔ (یہ مقالہ نظامیہ طبی کالج کے سالانہ اجلاس کی تقریب کے طور پر قلم بند کیا گیا ہے۔)

○●○

مکاتیبِ ڈاکٹر زور و بابائے اردو مولوی عبدالحق

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

۱۵ / فبروری ۱۹۲۸ء

مخدومی محترمی

میں یہاں اپنے فرصت کے اوقات برٹش میوزیم اور انڈیا آفس اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ار[illegible] مخطوطوں کے مطالعے میں صرف کررہا ہوں۔ اس اثنا میں بعض ایسی باتیں نظر سے گزریں جن کا آپ سے ذکر کرنا غالباً ضروری ہے۔

یہاں بعض مخطوطے ایسے بھی ہیں جن کا ذکر مطبوعہ فہرستوں میں نہیں ہے اور اس کے علاوہ چند اہم چ[illegible] ہیں جو مخطوطوں کے درمیان یا ضمن میں آگئی ہیں لیکن ان کی طرف فہرست لکھنے والوں کی توجہ منعطف نہیں ہو سکی حالاں کہ ان[illegible] ادبیاتِ اردو کی تحقیق و تفتیش میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

چوں کہ میرا قیام ابھی ایک خاص مدت تک رہے گا اور مجھے ادب اردو سے دلچسپی بھی ہے اگر آپ ا[illegible] یا انجمن کے ادبی کاموں کے متعلق یہاں سے کوئی مواد طلب فرمائیں تو میں ضرور اپنے فرصت کے اوقات میں اس کی انجام د[illegible] کوشش کروں گا۔

زبانِ اردو پر جدید اصولِ لسانیات کے انطباق کے ساتھ میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں مکمل ہونے کے انشاء اللہ رسالہ اردو کے لیے روانہ کروں گا۔ اگر آپ مناسب تصور فرمائیں تو "اردو" کے لیے میں یہاں کے مخطوطوں میں سے ک[illegible] مضمون لکھ سکتا ہوں۔

آپ کا

سید محی الدین قادری

○●○

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

،نگ آباد دکن۔

، مارچ ۱۹۲۸ء

شفیقی و مکرمی سلمہٗ

آپ کا اشفاق نامہ پہنچا جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نے انڈیا آفس اور بعض دیگر کتب خانوں کی ، کتب کی فہرستیں دیکھیں تو ان میں کوئی کام کی چیز نہ ملی۔ برٹش میوزیم کی اردو قلمی کتب کی فہرست ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ ب ہے کہ آپ نے ان کا مطالعہ شروع کردیا۔ ہمارے ملک سے بہت سے نوجوان علم کی تلاش و تحقیق میں جاتے ہیں مگر انھیں نہ باتوں کا ذوق ہوتا ہے نہ شوق۔ آپ کی نظر سے جو چیزیں وہاں ایسی گزری ہیں جو آپ قابلِ قدر اور قابلِ ذکر سمجھتے ہیں ان کے لق عنایت فرما کر آپ ضرور ہی مجھے لکھیے۔ میں بہت ممنون ہوں گا۔

میں نہایت ممنون ہوں کہ آپ نے وہاں سے مجھے اپنے اور انجمن کے ادبی کاموں میں مدد دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ میں انشاء اس کے متعلق ہفتے عشرے میں آپ کی خدمت میں عرض کروں گا۔ اس وقت صرف یہ مقصود ہے کہ آپ جو مضمون زبان اردو (جدید اصولِ لسانیات کے انطباق کے ساتھ) تحریر فرما رہے ہیں وہ بعد تکمیل ضرور مجھے روانہ فرمائیے میں نہایت خوشی سے اردو میں ح کروں گا۔ وہاں کے مخطوطات پر بھی ضرور تحریر فرمائیے میں آپ کے مضمون کا منتظر رہوں گا۔

ہاں یہ فرمائیے کہ اگر وہاں سے کسی کتاب کی نقل لینی ہو تو اس کی کیا صورت ہوگی؟ آپ کا قیام وہاں کب تک رہے گا؟

نیازمند

عبدالحق

○●○

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

سنیڈن۔

۲۸ / مارچ ۱۹۲۸ء

محترمی

کرم نامہ نے سرفراز کیا۔ ممنون ہوں۔ یہاں ہندستانی کانفرنس ہے۔ ایک ہفتہ قیام رہے گا۔ تقریباً دو سو ہندستانی جمع ہیں۔ مہاراجہ بردوان اور مہارانی کوچ بہار بھی یہیں ہیں۔ آب و ہوا بڑی اچھی ہے۔ لندن کے دھوئیں، برسات اور غلیظ فضا سے طبیعت بیزار ہو گئی تھی۔

میں جو مضمون اردو پر لسانیاتی نقطہ نظر سے لکھ رہا ہوں اس کو ابھی ختم نہیں کر سکا۔ لندن واپس ہونے کے بعد تعطیلات میں بھی شاید ہی ختم کرنے کا موقعہ ملے۔ کل ہی لندن سے یہاں آیا ہوں۔

میں نے اس اثنا میں گلزارِ ابراہیم کا مطالعہ کیا ہے اور ساتھ ہی علی لطف کے گلشنِ ہند سے اس کا مقابلہ کر کے نوٹ لے لیے ہیں۔ جن شعرا کو علی لطف نے چھوڑ دیا ہے ان کے حالات لکھ لیے ہیں اور جو کچھ اختلافات یا اضافے کیے گئے ہیں ان پر بھی اشارے درج کر لیے ہیں۔ اگر آپ مناسب تصور کریں تو میں اس کو مضمون کی شکل دے کر اردو کے لیے روانہ کروں۔ یہ چیز بہ طور ضمیمہ، گلشنِ ہند یا خلاصہ گلزارِ ابراہیم کے کتاب کی صورت میں مکتبہ ابراہیمیہ یا کسی اور جگہ سے شائع کی جا سکتی ہے۔ بعض جگہ علی لطف نے علی ابراہیم کی سہواً (اور عمداً بھی) غلط ترجمانی کی ہے۔ اس قسم کی کوشش سے شاید بہت سے شک دور ہو سکیں گے۔

اگر آپ کسی کتاب کی نقل منگانی چاہیں اور وہ میرے مذاق کے موافق ہو اور زیادہ طویل نہ ہو تو غالباً میں ضرور آپ کی فرمائش پوری کر سکوں گا۔

آپ نے مہربانی فرما کر میرے قیام کے متعلق دریافت فرمایا ہے جس کا جواب اس کے سوا اور کیا دے سکتا ہوں کہ خدا دلی خواہشات کو پورا کر سکتا ہے لیکن افسوس مجھے اس کی کوئی امید نہیں کہ میں حیدرآباد رہ بھی سکوں گا۔

زیادہ نیاز

سید محی الدین قادری

○●○

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

عنایت نامہ (مورخہ ۱۸ / اپریل) نے سرفراز کیا۔ انگریزی اردو ڈکشنری کے متعلق جو اندازہ قائم کیا گیا ہے۔ وہ یقیناً کسی کو پست ہمت بنادے سکتا ہے لیکن مجھے یقین ہے آپ کسی نہ کسی طرح اس میں کامیاب رہیں گے۔ میں نے گلزارِ ابراہیم اور گلشنِ ہند پر جو مضمون لکھا ہے وہ بالکل تیار ہے ساتھ ہی اول الذکر کا خلاصہ بھی۔ میں نے کم فرصتی کی وجہ سے شعرا کے حالات کے ساتھ ان کے اشعار نہیں نقل کیے۔ کیا اس کی ضرورت ہوگی۔ میں اسی پس و پیش میں ہوں کہ دونوں کو ایک ساتھ روانہ کروں یا پہلے مضمون بھیج دوں۔ آپ گلشنِ ہند کے دوسرے اڈیشن کو کب تک شائع کرنا چاہتے ہیں۔ گلزار ابراہیم کے خلاصے کو اس میں کس طرح شامل کرنا ہوگا۔ آیا گلشنِ ہند کے اختتام پر بہ طور ضمیمہ کے خلاصہ، گلزار شامل رہے گا۔ یا گلشن ہند کا پورا ڈھچر تبدیل کرکے گلزارِ ابراہیم کا خاکہ قائم کیا جائے اور اس میں جن جن شعرا کا لطف نے ترجمہ کیا ہے انھیں لطف کے الفاظ میں مختصر سے نوٹ کے ساتھ کہ اس ترجمہ میں لطف نے اپنی طرف سے کوئی اضافہ کیا یا نہیں اور اگر کیا تو وہ کون سا ہے۔ نقل کردیا جائے یہ امر غالباً غور طلب ہے۔ گلشنِ ہند کے بھی یہاں مخطوطے ہیں اور گلزار ابراہیم کے بھی ایک سے زیادہ۔

معلوم ہوا تھا کہ انجمن کی جانب سے کلیاتِ حسن شائع ہونے والا ہے۔ یہاں کلیاتِ حسن کا ایک نفیس مخطوطہ ہے۔ میں نے اس بارے میں شروانی صاحب سے بھی خط و کتابت کی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہاں ان کے مخطوطے سے زیادہ کلام موجود ہے۔ نہ معلوم انجمن کا مخطوطہ کس حد تک مکمل ہے۔ آپ یہ معلوم کرکے ضرور متعجب ہوں گے کہ مجھے یہاں میر و سودا کے ایک ہم عصر شخص کا ایسا مخطوطہ بھی ملا ہے جس میں اس نے ضمناً اپنے دوست شعرا کا خاصا ذکر کیا ہے اور جس کا ایک اہم بیان یہ بھی ہے کہ میر حسن کی مثنوی بدرمنیر میں مرزا قتیل نے بہت سی اصلاحیں دی ہیں۔

اردو لسانیات اور صوتیات کے متعلق میں نے جو کام کیا ہے اور کر رہا ہوں اس کو "اردو" میں اشاعت کے قابل بنانا اس وقت تک دشوار معلوم ہورہا ہے جب تک کہ ان قصوں کی اصطلاحوں کا اردو ترجمہ نہ کرلیا جائے۔ اس میقات میں ہندستان کے انگریز عہدہ دار (جو چھٹیوں میں یہاں آئے ہوئے ہیں اور اردو میں بات چیت بھی کرتے ہیں) میرے ساتھ اردو کے لسانی اور تحقیقاتی کاموں میں شریک ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اس کام کو انگریزی ہی میں شائع کردوں۔ میرے پروفیسر کا تو خیال ہے کہ "لندن یونیورسٹی کے شعبہ مشرقی کی جانب سے ان چیزوں کو پہلے اردو زبان میں شائع کرکے ملک کے صاحبِ رائے افراد کے آگے پیش کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سی باتیں وہاں کے لیے غیر مانوس ہوں گی لیکن چند ایسی ضرور ہیں جو خاص طور پر بحث طلب ہیں۔ بہ ہر حال اصطلاحوں کے ترجمے کی سخت ضرورت ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ مولوی سلیم صاحب کے یہاں روانہ کروں لیکن افسوس ہے کہ وہ ایک عرصہ سے نہیں ہیں اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہے۔ کیا آپ اس بارے میں کسی طرح میری مدد کرسکتے ہیں۔

بہ راہِ کرم میرے پتے پر "اردو" کے جاری کرنے کے لیے دفتر کو مطلع کیجیے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کتنے شلنگ مجھے روانہ کرنے ہوں گے۔

جواب کا منتظر

سید محی الدین قادری زور

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

اورنگ آباد۔
یکم / جولائی ۲۸ء

شفیقی و مکرمی ــ تسلیم

آپ کا اشفاق نامہ پہنچا۔ میری رائے میں جو مضمون آپ نے گلزار ابراہیم اور گلشنِ ہند تحریر فرمایا ہے وہ فوراً بھیج دیجیے۔ میں اسے اردو میں شامل کردوں گا۔

گلشنِ ہند کے دوسرے ایڈیشن کے متعلق میری رائے ہے کہ گلزار ابراہیم کا اصلی خاکہ قائم رکھ کر مختصر نوٹوں میں یہ بتا د جائے کہ لطف نے اپنی طرف سے کیا اضافہ کیا۔ یہ غالباً بہتر ہوگا اور جس وقت آپ یہ تیار کریں گے۔ اسی وقت دوسرا ایڈیشن شا کرنے کا انتظام کیا جائے گا۔

انجمن کلیاتِ حسن شائع کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ انجمن کو صرف شروانی صاحب کا نسخہ ملا تھا اس کی نقل لے لی گئ دوسرا نسخہ اب تک دست یاب نہیں کہ مقابلہ کیا جاتا۔ اگر آپ وہاں کے قلمی نسخوں سے ایک نسخہ مرتب کردیں تو پھر ہماری سار مشکلات رفع ہو جائیں گی۔

میر و سودا کے جس ہم عصر کا آپ نے ذکر فرمایا ہے وہ بات تعجب سے خالی نہیں اور بالکل نئی بات ہے جس کا کسی۔ ذکر نہیں کیا۔ آپ اسے ضرور لکھ لیں۔

فنی اصطلاحات کی دشواری بے شک ایسی ہے جو اس راہ میں حائل ہے۔ مولوی سلیم صاحب بہت بیمار ہوگئے تھے اور علا کے لیے رانچی گئے ہوئے ہیں۔ مجھ سے جہاں تک ممکن ہوگا میں حاضر ہوں۔ آپ میرے پاس بھیج دیں، میں دوسرے اصحاب۔ مشورے سے جو کچھ ہوسکے گا اس خدمت کو انجام دے دوں گا۔

میں نے آپ کا پتہ دفتر میں دے دیا ہے۔ اردو اور سائنس کے رسالے آپ کی خدمت میں برابر پہنچتے رہیں گے۔ قیمت روانہ کرنے کی ضرورت نہیں غالباً آپ کو اطلاع ہوگی کہ انجمن نے ایک اور سہ ماہی "سائنس" کے نام سے شائع کرنا شروع کردیا۔ جس میں صرف سائنس سے بحث ہوتی ہے۔ دو نمبر نکل چکے ہیں۔ خریدار بہت ہی کم ہیں یعنی اب تک سو بھی نہیں ہوتے۔ بہرحال ایک کوشش ہے ممکن ہے کہ آگے چل کر کچھ کامیابی ہوجائے۔ ــ نیاز مند

عبدالحق

ہ●ہ

مجھے آپ سے بالکل اتفاق ہے کہ پہلے آپ اپنی تحقیقاتیں اردو زبان میں شائع کیجیے اس کے بعد انگریزی میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ اول انگریزی میں شائع ہوں اور بعد اردو میں۔

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری ام۔ اے (عثمانیہ)

۳ جولائی ۱۹۲۸ء

محترمی __ گذشتہ ڈاک سے آپ کا عنایت نامہ اور رسالہ اردو دونوں پہنچے۔ شکریہ۔ خلاف عادت گذشتہ ڈاک میں جواب اس لیے نہیں روانہ کیا ہے کہ میری تعلیمی میقات کے آخری دن تھے اور کام زیادہ باقی رہ گیا تھا۔ اب تعطیل ہو گئی ہے لیکن آئندہ ہفتہ تک موعودہ مضمون نہیں روانہ کرسکوں گا کیوں کہ یہاں پرسوں سے حیدرآباد کانفرنس شروع ہورہی ہے۔ یہاں آج کل ۲، حیدرآبادی ہیں۔ ان میں سے اکثر ہن لے میں جمع ہوں گے۔ میں بھی ایک پرچہ پڑھ رہا ہوں۔ دکنی زبان پر۔ آج کل اسی کی تیاری کر رہا ہوں۔

کانفرنس سے مکان واپس ہوکر گلزارِ ابراہیم کا مضمون صاف کرکے آپ کے نام رجسٹری کردوں گا اس کے بعد ایک مہینہ پیرس میں گزارنا چاہتا ہوں۔ یہاں اس اثنا میں فرانسیسی سیکھ رہا تھا۔ وہاں بھی تعلیم جاری رکھوں گا۔ گارساں دتاسی کے جمع کیے ہوئے ردو مخطوطوں کا بھی مطالعہ کرنا ہے۔ پیرس سے واپس ہونے پر ارادہ ہے کہ اردو کے لیے اور اہم مخطوطے پر مضمون لکھ دوں۔ نوٹ تو بہت سوں پر لے لیے ہیں۔ آپ کے خیال کے مطابق کلیات حسن کے نسخے کو میں یہاں مرتب کردیتا۔ لیکن اس کے لیے وقت چاہیے۔ نقل کرنے میں بہت وقت صرف ہوگا۔ ڈگری لینے کے بعد یا اگر آئندہ مجھے کوئی فرصت مل سکے تو میں آپ کو لکھوں گا۔ آپ انجمن کا نقل کردہ نسخہ میرے یہاں روانہ کردیں میں یہاں مقابلہ کرکے ایک صحیح متن تیار کرسکوں گا۔

آئندہ ڈاک سے یا اس کے بعد لسانیات اور صوتیات کی انگریزی اصطلاحات بھی ترجمہ کے لیے روانہ کروں گا۔ یہاں مجھے اس کام کے لیے زیادہ وقت صرف کرنے کی مہلت نہیں ہے۔

انڈیا آفس میں "خوب ترنگ" نامی ایک کتاب ہے جس کے متعلق بلوم ہارٹ نے لکھا ہے کہ قدیم دکنی ہے۔ خود مصنف کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گجراتی ہے۔ ساتھ ہی فارسی شرح سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے لیکن اس بات سے زیادہ یہ امر قابلِ عجب ہے کہ اس کی زبان بالکل قدیم دکنی کی کتابوں کی زبان ہے۔ میں نے اس پر ایک گجراتی طالب علم کی شریک کاری میں تحقیق شروع کردی ہے۔ یہ طالبِ علم بمبئی یونیورسٹی کے وظیفہ یاب ہیں اور یہاں لسانیات کی پی ایچ۔ ڈی کے لیے پہلے بی۔ اے کر رہے ہیں۔ فرانس سے آنے کے بعد اس کام کو ختم کرسکوں گا۔ اس اثنا میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ گجرات کی قدیم اردو کتابوں کے علاوہ وہاں کے شاعروں کا ایک قدیم تذکرہ بھی دست یاب ہوا ہے۔

اگر میں خوب ترنگ کی لسانی تحقیقات میں کامیاب ہوجاؤں تو میرا خیال ہے کہ دکنی اور گجراتی دونوں کی نسبت بعض اہم انکشافات ہوسکیں گے۔

آپ کا

زور

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

ایڈن برا۔

۲۶ دسمبر ۱۹۲۸ء

مخدومی و محترمی۔ خیال نہیں پڑتا کہ عنایت نامے کا میں نے جواب بھی دیا ہے یا نہیں۔ میں چھٹیوں میں جزائرِ برطانیہ کے باہر یورپ کے کسی اور حصے میں جانا چاہتا تھا آخر کار اسکاٹ لینڈ کی سیاحت کا فیصلہ کیا۔ تعطیلوں کے آغاز سے ہی لندن سے نکل کھڑا ہوا۔ کچھ دن لیڈز میں ٹھہر کر ایڈنبرا آیا ہوں۔ یہاں سے پرتھ، گلاسگو اور مانچسٹر ہو کر ختم تعطیل پر لندن جاؤں گا۔

ایڈنبرا چند دنوں کے خیال سے آیا تھا مگر یہاں کے اردو مخطوطے ایسے چھپے رستم نکلے کہ اب ان سے سر براہ ہونا آسان نہیں نظر آتا۔ آپ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ یہاں پچاس، ساٹھ دکنی شاعروں کے مرثیے مل گئے ہیں۔ ہاشم علی کے ایک مکمل دیوان کے علاوہ۔۔۔ ہر ایک کے متعدد مرثیے محفوظ ہیں۔ میں نے اب تک صرف ۱۲۰ مرثیے دیکھ ڈالے اور ان پر نوٹ لیے ہیں۔ باقی کا تین چوتھائی حصہ نہ معلوم ابھی اور کتنے دنوں میں ختم ہو۔ حیران ہوں کہ آیا دکنی مرثیوں پر ایک خاص کتاب ہی لکھوں یا ہر مرثیہ گو پر علاحدہ مضامین۔ اس وقت تک دکنی ادب کے متعلق اتنا مواد جمع ہو گیا ہے کہ نہ معلوم اس سے کام لینے کی فرصت بھی ملے گی یا نہیں

"پنجاب میں اردو" کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایک سرسری نظر کے بعد پیچھے ڈال دیا۔ اس میں کئی مقام ایسے ہیں جن پر تنقید و تحقیق کی بڑی ضرورت ہے۔ تنقید شعر العجم کے بعد سے مجھے اس طرح کے غیر ذمہ دارانہ مواد کے پیش کرنے کی ہرگز امید نہ تھی۔ کئی ایسے مخطوطوں کے انھوں نے حوالے یا اقتباس دیے ہیں جن کی نسبت پتہ تک نہیں چلتا کہ وہ موجود ہیں بھی یا نہیں اور اگر ہے تو کہاں ہے اور کس حد تک قابلِ اعتماد۔ رہی یہ بحث کہ اردو پنجاب سے نکلی لسانی حیثیت سے تفتیش طلب ہے اور میری موجودہ لسانیاتی معلومات کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اصولی طور سے بالکل غلط۔ پنجاب کے اردو شاعروں وغیرہ کے متعلق بھی میں نے ضمناً خاصے نوٹ لیے تھے۔ مجھے فی الحال اتنی فرصت نہیں کہ اس موضوع پر قلم اٹھاؤں۔ ببلیو تھیک مینول میں ان کے بہت سے مخطوطے ہیں۔

ارادہ ہے کہ خود شیرانی کو ان امور سے متنبہ کروں تا کہ وہ خود اپنی کتاب کے متعلق کوئی مضمون لکھیں۔

میں نے اس اثنا میں ایک دوست سے کہہ کر نصرتی کے قصیدے نقل کرائے ہیں۔ اس کی زندگی کے متعلق بھی بہت کچھ باتیں مجھے ملی ہیں۔ ارادہ ہے کہ ایک مقدمہ کے ساتھ اس کو ایڈیٹ کر کے شائع کر دوں۔ یہاں اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ اگر آپ کچھ مواد بھیجیں تو شاید کچھ لکھا جائے۔ ہاں! میں نے ایک مضمون روانہ کیا تھا دکنی اور شمال کے متعلق۔ اسے ابھی نہ چھاپیے شاید کہ شرح کی ضرورت پڑے۔ امید ہے کہ آپ خیر و عافیت سے ہوں گے۔

آپ کا

زور

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

اورنگ آباد۔

۱۸ / اپریل ۲۸ء

شفیقی و مکرمی ــ تسلیم

آپ کا خط پہنچا۔ اچھا ہوا چند روز کے لیے لندن سے باہر ہو آئے اور تفریحِ طبع ہو گئی۔

آپ نے گلزارِ ابراہیم کا جو خلاصہ کیا ہے اسے مضمون کی شکل میں لکھ کر بھیج دیجیے میں "اردو" میں شائع کردوں گا۔ گلشنِ ہند کا پہلا ایڈیشن اب ختم بھی ہوگیا ہے میرا ارادہ اس کو چھپوانے کا تھا اسے بہ طورِ ضمیمے کے شریک کردوں گا۔ گلشنِ ہند کے طبع میں بھی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ میرے پاس (اس) کا ایک اچھا قلمی نسخہ موجود ہے۔

میں آج کل انگریزی اردو لغت (جو کنسائز اکسفورڈ ڈکشنری کا ترجمہ ہے) کے طبع کا اہتمام کررہا ہوں۔ اس کے لیے ایک جدید ٹائپ بنوا رہا ہوں۔ کاغذ بھی خاص طور پر انتخاب ہے۔ حساب لگایا تو کل لاگت چالیس ہزار ہوتی ہے۔ ہوش اڑ گئے۔ بہ ہر حال کوشش کررہا ہوں اور امید ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو رہے گا۔

خیر طلب

عبدالحق

○●○

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری (حیدرآبادی)

مخدومی و محترمی

عنایت نامے نے ممنون کیا ۔ افسوس ہوا کہ میرا پہلا مضمون بغیر حذف و اضافے چھپ گیا ۔ آپ کی اس کرم گستری کا ابھی سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مرثیوں والے مضمون کے پروف آپ خود دیکھنے کی زحمت کریں گے ۔

آپ نے اپنی مہربانی سے دریافت کیا ہے کہ میں کب تک ہندستان واپس ہوں گا اس کے متعلق میں نے پہلے بھیج ہے کہ میرا ارادہ ابھی اور چند سال یورپ خصوصاً فرانس میں گزارنے کا ہے لیکن اگر اس اثنا میں واپسی کا کوئی سبب نکل آ یورپ چھوڑنا پڑے گا ۔ اس سال بہت ممکن ہے کہ مجھے پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری مل جائے ۔ اس کے بعد ذرا فرصت رہے گی اور ہوں کہ آپ مجھے کوئی ایسی رائے دیں کہ میں فرصت کے اوقات میں اردو ادبیات کی بھی کسی نہ کسی طرح خدمت کرتا رہوں کیا میں انجمن کے کسی کام میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں ۔ امید کہ آپ خیر و عافیت سے ہوں گے ۔

آپ کا

○●○

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

لندن۔
۵ فروری ۲۸ء

محترمی

ایڈن برا سے ایک عریضہ روانہ کیا تھا۔ پہنچا ہوگا۔ ارادہ تھا کہ وہیں سے یہ مضمون بھی بھیج دوں۔ مگر پھر یہ سوچتا ہی رہ گیا کہ بھیجوں بھی یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں ذرا اور تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں مگر آپ جانتے ہیں کہ یہاں اتنا وقت کہاں۔ بہ ہرحال ایک مہینہ کے پس و پیش کے بعد آخر تصفیہ کیا کہ بھیج دینا ہی بہتر ہے۔ اپریل کی چھٹیوں میں بہت ممکن ہے کہ اس کی دوسری قسط بھی لکھ دوں۔

جنوری کا اردو اب تک نہیں ملا۔ ہاں اس مضمون کو ذرا احتیاط سے شائع کرائیے۔ میرے گزشتہ مضمون میں کئی بری طرح کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ایک جگہ تو کمپوزر نے ایک پوری سطر چھوڑ دی ہے عنایت ہوگی اگر میرا دکنی اردو اور شمال کی اردو مضمون واپس روانہ فرمائیں۔ اس میں بعض جگہ اضافے کرنے ہوں گے۔ کیا یہ قسط مارچ کے رسالے میں شائع ہوسکے گی۔

امید کہ آپ خیر و عافیت سے ہوں گے۔

آپ کا

سید محی الدین قادری زور

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

اورنگ آباد۔
۱۳/ مارچ ۲۹ء

مکرم بندہ ــــ تسلیم

میں دو مہینے سے متواتر سفر میں رہا۔ اورنگ آباد میں طاعون رہا ہے اور کالج بند ہے یہی وجہ ہوئی کہ اب تک آپ کے خط کا جواب نہ لکھ سکا۔ آپ کا آخری خط بھی مجھے سفر ہی میں ملا۔ اس تازہ مضمون کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ کا پہلا مضمون چھپ گیا ورنہ واپس کر دیتا۔ آپ کا یہ مضمون آپ کی ہدایت کے موافق احتیاط سے چھاپا جائے گا اور اس کے پروف میں خود دیکھوں گا۔ میری غیر حاضری کی وجہ سے چھپنے میں بعض اوقات بے احتیاطیاں ہو جاتی ہیں۔

اب آپ یہاں کب تک واپس آئیں گے؟ آج عید ہے اور میں یہیں سے آپ کو مبارک باد بھیجتا ہوں۔

نیاز مند
عبدالحق

○●○

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

SCHOOL OF ORIENTAL STUDIES UNION SOCIETY
(UNIVERSITY OF LONDON)
FINSBURY CIRCUS, E.C.2.

، لندن

میں اس اثنا میں لندن سے باہر تھا۔ گذشتہ ہفتہ ساحل سے واپس آیا تو کاغذوں میں آپ کا خط بھی ملا۔ اس وقت مجھے یاد ، آیا میں نے اس کا جواب بھی لکھا تھا یا نہیں۔

اس ہفتہ اردو کا ۴۴ واں نمبر ملا۔ آپ کے خط سے تو میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ میرا مرثیوں والا مضمون اس میں چھپا ہے۔ فسوس رہا کہ یہ مضمون بغیر ترمیم ہی کے چھپ گیا۔

عن قریب میں جرمنی جارہا ہوں وہاں بھی اردو کے چند مخطوطے ملیں گے۔ اگلے خط میں ان کی نسبت آپ کو لکھوں۔

مولوی سراج الحق صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی ہے اور زیادہ تر آپ ہی کا ذکر رہتا ہے۔ انھوں نے آپ کو سلام لکھنے کے بھی کہا ہے۔ وہ چوں کہ یہاں کی فضا کے لیے ابھی نئے نئے ہیں ذرا تکلیف محسوس کررہے ہیں۔ مگر خیروعافیت سے ہیں۔

غالباً آج کل وہاں کی آب و ہوا اچھی ہوگی۔

آپ کا

سید محی الدین قادری

○●○

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

GRAND

HOTEL DU GLOBE

4. Tue Croix des Petits Champs

res Les Tuileries.Louvre et Palais Royal,

PARIS

R. du C PARIS 1647

25 - 7 - 28

مخدومی و محترمی۔

گزشتہ ہفتہ کے خط میں جو وعدہ کیا تھا میں اس کو حسنِ اتفاق ہی سمجھتا ہوں کہ اس ہفتہ (اس) کو پورا کرنے کے قابل ہوسکا حالاں کہ یہاں آج کل چند احباب آئے ہوئے ہیں جنھیں پیرس دکھانے میں جو کچھ وقت تصحیح سے بچ رہا تھا وہ بھی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ وہ اجزا جو گلشنِ ہند اور گلزارِ ابراہیم کے مقابلے کے متعلق تھے غلطی سے لندن میں ہی چھوٹ گئے اب انھیں ازسرِنو تیار کرنا پڑا۔ غالباً پہلے کا لکھا ہوا حصہ اس سے بہتر تھا۔ لیکن میں اس کی خاطر مضمون کو روک تو نہیں سکتا تھا کیوں کہ اب میں لندن سپٹمبر سے پہلے نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بہرحال مضمون مرسلِ خدمت ہے۔ نہ معلوم آپ کو پسند بھی آتا ہے یا نہیں یہ ظاہر ہے کہ میں نے گلزار ابراہیم پر تفصیلی روشنی نہیں ڈالی ہے اور نہ اس کا موقع تھا۔ اس کے متعلق کوئی قرینے کا عنوان نہیں سوجھا۔ بہ راہِ کرم اس تعلق سے مطلع فرما کر ممنون کیجیے کہ کس عنوان سے اور کب شائع ہوگا۔

○●○

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

GRAND

HOTEL DU GLOBE

4, Tue Croix des Petits Champs

Pres Les Tuileries, Louvre et Palais Royal.

PARIS

R. du C PARIS 1647

4 - 9 - 28

مخدومی و محترمی۔

ایک عنایت نامہ پیرس میں ملا تھا اور آج ہی دوسرا جیس میں میرے۔ مضمون کے پہنچنے کی اطلاع ہے اور پیرس ہوتا ہوا یہاں آیا ہے لندن میں ملا۔ میں ابھی آکسفورڈ سے آیا ہوں۔ اور وہیں مولوی سلیم صاحب کی بے وقت وفات کی خبر مجھے ملی تھی۔ اس سے ان کے خاص شاگرد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور یہ بے جا احساس افتخار نہیں اگر میں لکھوں کہ میں بھی ان مخصوص طالب علموں میں سے تھا جن پر مولانا کی نظرِ عنایت تھی اور اگر مجھے ان کی وفات کی خبر سے کوئی صدمہ ہوا ہو تو میں اس کو فوق فطری بات نہیں سمجھتا۔

مولانا اپنی علالت کے زمانے میں بھی مجھ سے برابر مراسلت کرتے رہے۔ چناں چہ رانچی سے انھوں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ میں جب اچھا ہوکر حیدرآباد جاؤں تو تم اصطلاحات کی فہرست لکھ بھیجنا۔ میں جلد سے جلد ترجمے کردوں گا۔ خود انھیں بھی اس کی یہ خبر نہ تھی یہ میرے نام ان کا آخری خط ہوگا۔

میں نہیں سمجھتا کہ مولانا کا صحیح جانشین ابھی ایک طویل عرصے تک کوئی مل سکے گا۔ بہ ظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں اصطلاحات سازی کے فن کے موجد اور خاتم دونوں وہی تھے۔ خصوصاً جامعہ عثمانیہ کا شعبہ اردو اس قدر کم زور ہوگیا ہے کہ نہ معلوم کب اس کی تلافی ہوسکے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ مجھے یورپ سے کامیاب واپس ہوتا ہوا دیکھیں۔

○●○

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

GRAND

HOTEL DU GLOBE

4, Tue Croix Des Petits Champs

res Les Tuileries. Louvre ET Palais Royal.

PARIS

R. du C pARIS 1647

جب مجھے یورپی وظیفہ ہوا تو انھیں بڑی خوشی ہوئی تھی کیوں کہ وہ ہمیشہ شکایت کرتے تھے کہ دوسرے فنون والوں کو وظیفے ملے ہیں اور میرے شاگردوں کو نہیں ملتے۔ مجھے وہ سماں اچھی طرح یاد ہے کہ حیدرآباد سے نکلتے وقت جب میں نے اسٹیشن پر ان سے آخر دفعہ رخصت مانگی تو ان کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل پڑے۔ اور انھوں نے مشرقی طرز کی کئی دعائیں دیں۔

کاش وہ چند اور سال زندہ رہتے۔ اور ان کے زیر اثر جامعہ عثمانیہ سے چند اور نوجوان ادبی تربیت حاصل کرتے۔ اگرچہ وہ ضعیف ہوگئے تھے مگر ان کی ہمت جوان تھی۔ ان کی جوشیلی گفتگو اور ہمت افزا باتیں نوجوانوں کو برمانے کا کام دیتی تھیں۔

میرے مضمون کا عنوان آپ نے اچھا تجویز کیا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ حاتم پر بھی ایک مضمون اردو کے لیے روانہ کردوں دیکھیے کب توفیق ہوتی ہے۔ باڈلین لائبریری آکسفورڈ میں بھی اردو کے کئی مخطوطے ہیں۔ ان کی اب تک فہرست شائع نہیں ہوئی ہے اور پٹنل کانگریس کے متعلق آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اس میں شریک ہوسکا۔

آپ کا

زور

○●○

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

اورنگ آباد دکن۔
۱۷ / اگست ۲۸ء

مکرم بندہ ___ تسلیم

آپ کے دونوں خط پہنچ گئے۔ میں رخصت پر چلا گیا تھا ابھی واپس آیا ہوں۔ مضمون بھی پہنچا۔ میں نے اس کا عنوان "تذکرہ گلزارِ ابراہیم پر ایک نظر" رکھا ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو اسی عنوان سے شائع کردیا جائے۔

پہلے خط کے ساتھ اصطلاحات کی فہرست بھی وصول ہوئی۔ اس پر غور کروں گا۔ اگر کچھ سمجھ میں آگیا تو عرض کردوں گا افسوس مولوی وحید الدین سلیم صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ یاد آئیں گے۔ اب کوئی دوسرا شخص ایسا نظر نہیں آتا۔ آپ کا مضمون اکتوبر نومبر میں شائع ہوگا۔

عبدالحق

○●○

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری ام۔اے (عثمانیہ)

مورخہ 28 - 9 - 26

مخدومی و محترمی

آئندہ ہفتہ سے کالج رہا ہے۔ پھر ایک زمانہ تک بنتے رہنا پڑے گا۔ میں نے اس ہفتہ اردو کے لیے ایک مضمون صاف کیا ہے جو اس خط کے ساتھ شامل ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس مضمون کی اہمیت اس وقت تک نہیں محسوس کی جاسکے گی جب تک کہ میری تحقیقات کا وہ حصہ پیش نظر نہ ہوگا جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ دکھنی اور صوتی اور لسانی دونوں نقطہ نظر سے ایک دوسرے سے خارج ہیں لیکن افسوس ہے کہ یہ اس وقت تک اردو زبان میں نہیں شائع ہوسکتا جب تک کہ اصطلاحی دقتیں حل نہ ہوجائیں۔

میرے لسانیات کے پروفیسر نے میرے اس کام کے متعلق خود بھی غور و خوص شروع کی ہے۔ اس وقت تک وہ میرے پیش کردہ مواد اور اس کے نتائج سے متفق ہے۔

اس دفعہ ایک کاروباری زحمت بھی دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہم حیدرآباد میگزین میں اس کا اردو حصہ بھی رکھنا چاہتے ہیں اور اس کو ٹائپ کے حروف میں چھپانے کا ارادہ ہے۔ بہ راہِ کرم آپ اپنے مطبع کے منیجر صاحب سے فرمائیے کہ حسبِ ذیل استفسار کے جواب کی طرف بہ عجلت ممکنہ متوجہ ہوں۔

معارف کی تقطیع کے ۳۲ صفحے اردو کے ٹائپ اور کاغذ پر کتنی مدت میں چھاپ دیں گے اور کاغذ وغیرہ ملاکر اخراجات کا تخمینہ کیا ہوگا۔

ہاں اردو کا گذشتہ نمبر مجھے نہیں ملا۔ اور سائنس کا تو کوئی نمبر بھی نظر سے نہیں گزرا۔ شاید آپ مطلع فرمائیں گے کہ مرسلہ مضمون کون سے نمبر میں جگہ حاصل کرسکے گا۔

آپ کا

زور

مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ یورپ آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کیا ہی بہتر ہو اگر میرے یہاں کے قیام کے زمانہ میں آپ کا یہ ارادہ پورا ہو۔

○●○

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

ورنگ آباد۔
۲۵ / اکتوبر ۲۸ء

شفیقی و مکرمی ___ تسلیم

میں اس مدت میں تقریباً دو مہینے اورنگ آباد سے باہر رہا اور اب پھر جا رہا ہوں۔ آپ کا مضمون پہنچا جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پہلا مضمون طبع ہو گیا۔ میری غیر حاضری کی وجہ سے رسالے کی اشاعت میں ذرا تاخیر ہو گئی۔ اب دو چار روز میں شائع ہو جائے گا اور آپ کی خدمت میں بھی پہنچ جائے گا۔ اردو اور سائنس کے رسالے بھیج دیے گئے ہیں۔ یا تو پہنچ گئے ہوں گے یا اب پہنچ جائیں گے۔

آپ نے یہ نہیں لکھا تھا کہ رسالہ کس تعداد میں چھپے گا لہذا ۲۵۰، ۵۰۰ اور ہزار کے تین تخمینے لکھ دیے گئے ہیں۔ تخمینے کا پرچہ ملفوف ہے۔

اگر آپ کو فرصت ہو تو مہربانی کر کے مولانا وحیدالدین سلیم مرحوم پر ایک مضمون لکھ دیجیے۔ آپ چوں کہ ان کے شاگرد تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے اس لیے آپ کا لکھنا زیادہ مستند ہو گا۔

نیاز مند
عبدالحق

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

مخدومی و محترمی

اسی وقت

کرم نامہ وصول ہوا۔ سلیم صاحب پر میں خود ایک مضمون لکھنا چاہتا تھا لیکن ابھی نہیں، جب کہ ان کے متروکہ کلام یعنی نظم و نثر دونوں کا مجموعہ شائع ہو جاتا لیکن اب آپ کے فرمانے پر خیال ہے کہ آئندہ تعطیلات میں جو ڈسمبر میں شروع ہوں گی اور جنوری کے آدھے مہینے تک باقی رہیں گی اس کام کو بھی انجام دے دوں۔ اگرچہ یہ ذاتی خیالات اور مرحوم کے کردار اور خانگی زندگی سے متعلق رہے گا تاہم شاید زیادہ بہتر ہو اگر آپ ان کی زندگی اور کاروبار کے متعلق کچھ ضروری مواد اس خط کے جواب میں روانہ فرمائیں۔ جو مجھے دسمبر کے تیسرے ہفتے کے شروع میں مل جائے گا اور میرا مضمون جنوری کے ... ہفتے آپ کی خدمت میں پہنچ سکے گا۔ اگر اس اثنا میں بغیر کسی اور مواد کے کوئی اچھا مضمون تیار ہوسکے تو میں آپ کے مواد کا انتظار کیے بغیر ہی روانہ کردوں گا۔ اس وقت فرصت نہیں ورنہ تفصیل سے گول کنڈہ کے وجہی کے متعلق کچھ لکھتا۔ شاید انجمن کی جانب سے اس کی سب رس شائع ہورہی ہے۔ مجھے یہاں اس شخص کی ایک اہم مثنوی ملی ہے جو ادبی حیثیت سے میری نظر میں غواصی اور ابنِ نشاطی کے کارناموں سے کہیں بہتر ہے اور تاریخی لحاظ سے بھی ان سے بہت پیش تر کی۔ میں اس کے مطالعہ سے اس قدر محظوظ ہوا کہ ہر ہفتہ دو گھنٹے صرف اس کی نقل کے لیے وقف کردیے ہیں۔ اسی اثنا میں گولکنڈہ اور بیجاپور کے بعض نامعلوم شاعروں کے متعلق بھی مواد ملا ہے جن پر کبھی فرصت سے نوٹ لکھنے کا ارادہ ہے۔ بیجاپور کے اردو شعرا میں آسی، ایاغی، مرزا دولت شاہ، مرزا مقیم، ملک خوشنود اور گولکنڈہ کے محمود، فیروز، مقیمی وغیرہ کے متعلق اگر آپ کے یہاں کوئی مواد ہو تو مطلع فرمائیے۔ مجھے یہاں سنسکرت اور لسانیات وغیرہ کے درسوں نے اس قدر مشغول کر رکھا ہے کہ ان ذوقی باتوں کے لیے بہت کم وقت رہ جاتا ہے۔

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

اورنگ آباد دکن۔

۶/ دسمبر ۲۸ء

مکرمی و شفیقی

تسلیم

میں یہاں نہیں تھا آپ کا خط مجھے حیدرآباد میں ملا۔ اس وقت تک میرے پاس مولانا سلیم مرحوم پر دو مضمون وصول ہوئے ہیں۔ ایک سراج الحسن صاحب ترمذی کا اور دوسرا مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا۔ ترمذی صاحب کچھ دنوں تک مرحوم کے ساتھ رہے ہیں اور انھوں نے بہت سے حالات ان کی زندگی اور طالب علمی کے لکھے ہیں۔ مرزا صاحب کی ملاقات صرف چند روزہ تھی جو کچھ انھوں نے دیکھا، لکھ دیا۔ آپ سے میری استدعا یہ تھی کہ آپ ان کے متعلق بہ حیثیت پروفیسر کے کچھ لکھتے اور اس کے ضمن میں جو کچھ آپ کو معلوم ہے وہ لکھ دیتے۔ اگر فرصت ہو تو ابھی لکھ ڈالیے ورنہ ان مضامین کے شائع ہونے پر تحریر فرمادیں۔

"سب رس" انجمن کی طرف سے شائع ہوگی۔ نسخہ مکمل طور پر مرتب ہوچکا ہے۔ جو مضمون میں نے اس کتاب پر لکھا تھا وہ ایسی جلدی میں لکھا گیا کہ کتاب کی آخری سطروں پر نظر پڑی حالاں کہ اس میں سنہ تصنیف صاف لکھا ہوا ہے۔ ۱۰۴۵ء بالکل صحیح ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کو اس کی مثنوی مل گئی ہے اور آپ اسے نقل کر رہے ہیں۔

جن شعرا کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ ان میں سے بعض کی کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔ آئندہ خط میں میں ان کے متعلق آپ کو لکھوں گا۔ اس وقت مجھے مطلق فرصت نہیں ہے ورنہ ابھی لکھ بھیجتا۔

آپ کا

عبدالحق

○●○

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

اورنگ آباد۔

۲۲ / اپریل ۱۹۲۹ء

مکرمی جناب ___ تسلیم

عنایت نامہ پہنچا، شکریہ۔ اداس ہوں۔ میں کئی ماہ سے بے حد گردش میں ہوں۔ سارے کام ابتر ہیں۔ میں نے وعدہ کیا تھا آپ کے مضمون کے پروف خود دیکھوں گا لیکن وقت پر مجھے اورنگ آباد سے مجبوراً جانا پڑا۔ اورنگ آباد میں چھ ماہ سے طاعون ہے۔ اپریل کے پرچے میں تاخیر ہو گئی۔ اب یہ بلا کہیں جا کر دفع ہوئی ہے۔

اس کا خیال بھی نہ تھا کہ آپ اتنی مدت تک وہاں رہیں گے۔ مجھے کسی نے حیدرآباد میں کہا تھا کہ آپ جلد آجائیں گے۔ خیر اب آپ کے خط سے ایک گونہ اطمینان ہو گیا ہے۔

آپ نے جو مضمون گلزارِ ابراہیم پر لکھا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن شعرا کا ذکر گلشنِ ہند میں نہیں، ان میں سعادت بھی ہیں۔ ایک صاحب جو سعادت کے ہم وطن یعنی امروہہ کے رہنے والے ہیں ان کے حالات جمع کر رہے ہیں ان کے خاندان میں بھی بعض کاغذات ہیں۔ اگر آپ عنایت فرما کر گلزارِ ابراہیم سے سعادت کے حالات نقل کر کے مجھے بھجوا دیں تو میں بہت ممنون ہوں گا۔

اب چوں کہ آپ کا قیام وہاں کافی مدت تک ہے لہذا میں آپ سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ کلیاتِ میر حسن کی تصحیح فرمائیے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں اپنا نقل کیا ہوا نسخہ آپ کی خدمت میں بھیج دوں۔

میرٹھ پھر طلبی ہوئی ہے، ریل کا وقت قریب ہے۔ جارہا ہوں دوسرے خط میں پھر کچھ لکھوں گا۔

آپ کا

عبدالحق

(۶)

○●○

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زورؔ

.نگ آباد۔

شفیقی و مکرمی ـــ تسلیم

مجھے خط لکھتے ہوئے خود بھی تامل ہوا تھا مگر میں کیا کرتا آپ کے خط پر صرف شاہ گنج لکھا اور کوئی دوسرا پتا نہ تھا ناچار وہی لکھ دیا۔ اسں خط میں میں نے یہ لکھا تھا کہ فی الحال حیدرآباد جانے کا ارادہ ہے نہ موقع۔ اگر ب دو ہفتے میں جانا ہو تو اطلاع دے دوں گا ورنہ پھر آپ ہی کو زحمت کرنی ہوگی۔ اورنگ آباد کی سیر بھی ہوجائے گی۔ موسم بھی خوش رہے۔ لیکن اتفاق سے ایک ضرورت ایسی نکل آئی کہ مجھے حیدرآباد جانا پڑا۔ ایک کمیٹی میں میری شرکت ضروری سمجھی گئی اور ,بہ اصرار طلب کیا گیا ہے۔ میں آج آپ کو خط لکھنے ہی والا تھا اچھا ہوا آپ کا خط آگیا ورنہ اس کا بھی وہی حشر ہوتا۔ اب آج سہ ,حیدرآباد روانہ ہوجاؤں گا اور کل صبح پہنچ جاؤں گا۔ ڈاکٹر سراج الحسن صاحب (نواب سراج یار جنگ) سوماجی گوڑہ کے ہاں ٹھہروں گا۔ ان کا مکان نواب فخرالملک بہادر کے مکان کے بالکل محاذی ہے۔

نیاز مند

عبدالحق

○●○

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

اورنگ آباد۔

مکرمی ــ تسلیم

مرزا یار جنگ بہادر کے فرزند ہفتے میں صرف دو روز ادارہ کے لیے دے سکتے ہیں کیوں کہ انھیں دوسرے مضامین کی تیاری بھی کرنی ہے۔ اردو میں صرف ترجمے کا پرچہ ہوتا ہے۔ انھیں صرف انگریزی سے اردو ترجمے کی مشق کی ضرورت ہے اور اس میں سروری صاحب کی مدد درکار ہوگی۔ یہ دو دن کون سے ہوں اس کا فیصلہ سروری صاحب پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ اپنی سہولت کے لحاظ سے تجویز کریں۔ وقت ۲ سے ۴ تک ہوگا۔ معاوضہ جو آپ تجویز کریں۔ سروری صاحب کو خود ان کے مکان پر آنے کی تکلیف کرنی ہوگی۔

براہ کرم سروری صاحب سے گفتگو کر کے مطلع فرمائیے کہ وہ کون سے دو دن تجویز کرتے ہیں۔

نیاز مند

عبدالحق

○●○

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

اورنگ آباد۔
۲۴ / جولائی ۲۹ء

شفیقی و مکرمی __ تسلیم

درحقیقت مجھے آپ کا خط دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ آپ یہاں کہاں ! ۔ تعجب کے بعد خوشی بھی ہوئی کہ آپ سے ملاقات کا موقع ملے گا۔ ابھی تو میرا ارادہ حیدرآباد آنے کا نہیں ہے۔ اگر ایسا موقع ہو تو آپ کو ضرور اطلاع دوں گا ورنہ پھر آپ ہی زحمت فرمائیے گا آپ نے شاید اورنگ آباد کی سیر بھی نہ لی ہوگی۔

نیاز مند

عبدالحق

○●○

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

ANJUMAN-E-TARAQQI-E-URDU

انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن)

Aurangabad, (Dn)

۲۸ جنوری /

مشفقی محترمی — تسلیم

کتاب پہنچی، بہت بہت شکریہ۔ میں اسے ضرور پڑھوں گا آپ نے غضب کیا میرا نام پروگرام میں درج کردیا۔ میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں۔ ولی کی وفات کے متعلق میں "اردو" میں لکھ چکا ہوں اسے دہرانا بہت نازیبا ہوگا۔

نیاز مند

عبدالحق

○●○

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

ANJUMAN-E-TARAQQI-E-URDU

انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن)

Aurangabad, (Dn)

۳۰ مئی ۱۹۳۶ء

شفقی مکرمی _ تسلیم

عنایت نامہ پہنچا۔ بے شک میرے پاس شہاب ثاقب کا اچھا بڑا ٹکڑا موجود ہے۔ یہ وہ نہیں جو گنگاپور ں گرا تھا۔ بلکہ کئی سال ہوئے۔ اس سڑک کے نزدیک جو اورنگ آباد سے پھلمری کو جاتی ہے ایک کھیت میں گرا تھا۔ چوکے اور ملمری کے درمیان۔

اب کے اورنگ آباد میں بھی آٹھ نو روز خوب گرمی رہی۔ گذشتہ اور پیوستہ سال ایسی گرمی نہیں تھی لیکن اب موسم بدل گیا ہے اور گرمی نہیں رہی۔ آپ کا ارادہ خلدآباد آنے کا تھا۔ کب آئیے گا۔

نیاز مند

عبدالحق

ooo

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

Anjuman - e - Taraqqi - e - Urdu

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

Aurangabad, (Dn.)

۹ جون ۱۹۳۲ء

مشفقی و مکرمی

تسلیم

آپ کا خط پہنچا۔ پروفیسر بلوک کی دونوں کتابیں آج ہی روانہ کردی جائیں گی۔ آپ انھیں اطلاع دے دیں خاں صاحب کے استفسارات میں نے دیکھے۔ ان کا جواب اتنی مدت کے بعد بہت مشکل ہے۔ جن صاحب نے وہ پتھر مجھے لاکر دیا تھا۔ ان کا پتہ لگاتا ہوں۔ وہ مل گئے تو جو کچھ معلوم ہوگا دریافت کر کے لکھ بھیجوں گا کیوں کہ استفسارات ایسے ہیں کہ ان جواب انھیں صاحب سے مل سکتا ہے۔ پتھر آتے وقت میں اپنے ساتھ لیتا آؤں گا اس وقت خاں صاحب جتنے فوٹو چاہیں لے سکتے ہیں۔

عبدالحق

○●○

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

Anjuman - e - Taraqqi - e - Urdu

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

Aurangabad, (Dn.)

مشفقی و مکرمی ــ تسلیم

آج کالج میگزین کی میٹنگ ہے۔ مجھے وقت یاد نہیں رہا یا تو ۳۰ : ۱۰ بجے ہے یا ۳۰ : ۱۱ بجے۔
اگر ۳۰ : ۱۰ بجے ہے تو میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ مجھے اس وقت وائس چانسلر صاحب نے بلایا ہے اور اگر ۳۰ : ۱۱ ہے ضرور آؤں گا۔ ۳۰ : ۱۰ بجے کی صورت میں آپ بہ راہِ کرم قاضی صاحب سے میری طرف سے معذرت کردیں اور یہ کہہ دیں کہ اس مت مجھے وائس چانسلر صاحب نے طلب کیا ہے اور میں وہاں چلا گیا ہوں۔

عبدالحق

○●○

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

سب رس

ماہ نامہ ادارۂ ادبیات اردو

خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

مدیرِ عمومی : ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مدیر : صاحبزادہ محمد علی خاں میکش

محترمی

دیوانِ بیدار مرسلِ خدمت ہے۔ آپ نے سب رس میں انجمن کی اطلاعات اور اپنی رپورٹیں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ مئی کے نمبر کا کام قریب الختم ہے۔ براہِ کرم جلد روانہ فرمائیں۔ اردو کے نئے شمارہ میں سب رس اور نند ولی پر تنقید ضرور شائع کیجیے۔

آپ کا

سید محی الدین قادری زور

۱۱/اپریل ۳۸ء

○●○

مولوی عبدالحق کا جواب

دیوان پہنچا۔ بہت شکریہ بے حد مصروف ہو کلکتہ جانے سے پہلے بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ ہوش و حواس درست ہوجائیں تو لکھ بھیجوں گا۔

عبدالحق

مولوی عبدالحق بہ نام ڈاکٹر زور

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) مورخہ ۱۶/ اگست ۱۹۳ء

نمبر ۹۹۶

مکرم بندہ ــــ تسلیم

میں ان تعطیلوں میں خلدآباد کے قریب ایک مقام پر چلا گیا تھا۔ آپ کا خط دیر سے پہنچا۔ تذکرہ، مصحفی جامعہ، یہ دہلی کے مطبع میں چھپ رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس قدر چھپ چکا ہے مگر میرا قیاس ہے کہ بہت سا حصہ چھپ گیا ہو۔ لر ایسی حالت میں آپ کسی قسم کی امداد دے سکتے ہوں تو بتائیے۔

مجھے ہفتے کے روز یہاں جائزہ دینا تھا اور یہاں سے دفتر کے منتظم کا خط میرے نام پہنچا کہ جائزہ پٹی تیار کرنی ہے۔ بعض امور یصلہ طلب ہیں۔ اگر جائزے سے قبل آجائیں تو مناسب ہے۔ میں جس کمیٹی کے لیے بلدہ گیا تھا اس کا کام ختم ہوچکا تھا اس لیے میں ورا چلا آیا۔ عین جائزے کے روز حسب الحکم صدراعظم یہاں تا حکمِ ثانی روک لیا گیا جس سے مجھے بہت تکلیف ہوئی کیوں کہ میں نے ،نڈ جانے کا کامل انتظام کرلیا تھا اور جائزے کے دوسرے ہی روز روانہ ہوجانے والا تھا۔

کل مجھے معلوم ہوا کہ میرا تقرر (باوجود میرے انکار کے) اور بغیر استمزاج کے یونی ورسٹی میں کردیا گیا ہے۔ میں حیدرآباد ں تھا۔ مجھے کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی تو کسی نے اطلاع دی۔ اس سے میں ایک عجیب کشمکش میں ہوں۔

عبدالحق

○●○

ڈاکٹر زور بنام مولوی عبدالحق

محترمی

تین کتابیں ملیں۔ مرسل ہیں۔ آئینِ اردو بھی میرے یہاں ہے مگر اس وقت نہیں مل رہی ہے یا کسی طالبِ علم کو دی ہے۔ معلوم نہیں۔ البتہ فلسفہ۔ امثال میری نظر سے نہیں گذری کالج کے کتب خانے سے منگا لیجیے۔ وہ کھلا ہوتا ہے۔ کسی خانگی کتب خانہ میں ملنے کی توقع نہیں۔

علم لسان کے متعلق میرے یہاں اور متعدد کتابیں ہیں مگر نہ معلوم آپ نے کس ضرورت کی بنا پر یہ کتابیں منگوائی ہیں۔

آپ کا

سید محی الدین قادری زور

○●○

کتابیں واپس کرتا ہوں۔ یونیورسٹی کا پرچہ بنانا تھا وقت گزر گیا تھا۔ عجیب بے تکی کتابیں نصاب میں رکھی ہیں۔ آج بمبئی جارہا ہوں وہاں سے علی گڑھ چلا جاؤں گا۔ جلدی میں لکھا ہے جس کی معافی چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر زور بہ نام مولوی عبدالحق

رفعت منزل ۔

محترمی

آج میں کالج میں ملنا چاہتا تھا مگر معلوم ہوا کہ آپ جلد تشریف لے گئے ۔ میرے یہاں چہارشنبہ کی شام میں آپ اور آلِ احمد صاحب سرور مدعو ہیں۔ سرور صاحب کو بھی علاحدہ لفافہ روانہ کر رہا ہوں۔ شام کا کھانا میرے ساتھ تناول فرمائیں۔
میں نے جس جلسے کا ذکر کیا تھا اس کے متعلق بھی گفتگو کرنی تھی ۔ کل کالج میں انشاء اللہ اس کا موقع ملے گا۔ اس کے لیے ابھی سے تیاری کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ وہ آپ کی خدمات کے شایانِ شان ہوگا۔

آپ کا

سید محی الدین قادری زور

حیدرآباد۔

دوشنبہ ۲۰ مئی ۳۶ء

○●○

مولوی عبدالحق کا جواب

آج میں خاصی ضرورت سے جلد چلا آیا۔ سرور صاحب کل جارہے ہیں۔ میں نے بہت ٹھہرانا چاہا مگر وہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہیں ٹھہر سکتے۔ جلسے کا ذکر آپ فی الحال ملتوی رکھیے۔ اس وقت باہر جارہا ہوں جلدی میں آپ ہی کے خط پر جواب لکھ رہا ہوں معافی چاہتا ہوں۔

عبدالحق

○●○

از مولوی عبدالحق بنام [illegible]

انجمن ترقی اردو پاکستان

اردو روڈ، کراچی ۔ ۱

۲۸ ستمبر ۱۹۵۳ء

شفیقی و مکرمی ـــ السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ باعثِ مسرت ہوا۔ [illegible] بات یہ ہے کہ انجمن کی طرف سے عثمانیہ یونی ورسٹی کو لکھا تھا کہ وہ اپنے نمائندے انجمن کی سالہ جوبلی میں شرکت کے لیے بھیجے۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ عثمانیہ یونی ورسٹی جس نے اردو کی اتنی بے نظیر خدمت کی ہے، نمائندے بھیجنے سے قاصر رہی حالاں کہ دوسری یونی ورسٹیوں نے بہ خوشی ہماری دعوت قبول کی۔ انجمن نے آپ کا نام پیش کیا تو یونی ورسٹی نے نمائندے بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس لیے میں نے خاموشی اختیار کی کیوں کہ آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ آپ اسی حالت میں آسکتے ہیں کہ یونی ورسٹی اپنی طرف سے بھیجے۔ اگر آپ جوبلی کے اجلاسوں میں شریک ہوں تو ہمارے لیے موجبِ مسرت ہوگا۔ جوبلی کا پروگرام وغیرہ ارسالِ خدمت ہیں۔ بہ راہِ کرم اپنی آمد سے بہ ذریعہ تار مطلع فرمایا جائے۔

عبدالحق

مولوی عبدالحق — اعزازی صدر

انجمن ترقی اردو پاکستان

اردو روڈ، کراچی ۱

نمبر

اگست ۱۹۵۳ء

مکرمی — تسلیم

عنایت نامہ پہنچا۔ فی الحال مندرجہ ذیل دکنی کتابیں چھپ کر شائع ہوئی ہیں۔ جن کا ایک نسخہ آپ کی خدمت میں بھیجا جاتا ہے۔

۱۔ سب رس ۲۔ قطب مشتری ۳۔ گلشنِ عشق (نصرتی) ۴۔ کلیاتِ ولی۔

ان کے علاوہ چھ سات اور دکنی کتابیں زیرِ طبع یا زیرِ ترتیب ہیں۔ مکمل ہونے پر وہ بھی آپ کی خدمت میں روانہ کی جائیں گی۔

حیدرآباد جانے کو بہت جی چاہتا ہے لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ وہاں گیا تو دل کو دکھ ہوگا۔ پرانی صحبتیں اور احباب نہیں رہے تو صدمہ ہوگا۔ جو کچھ کہ اب کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہ حیدرآباد جب تھی وہاں تھا۔ خواب و خیال ہو گیا ہے۔ ایسا انقلاب ابھی ہمارے ہندوستان میں کہیں اور نہیں ہوا۔ اب اس کا پنپنا محال ہے۔ ہماری تہذیب اور زبان دونوں ختم ہو گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مخلص

عبدالحق

مولوی عبدالحق بابائے اردو

انجمن ترقی اردو پاکستان

اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

نمبر ۹۹۶   ۱۰ ستمبر ۱۹۵۳ء

مشفقی و مکرمی ــ تسلیم

آپ کا خط پا کر بہت شکر گزار ہوں۔ آپ نے ظفر نامہ نظام شاہ تصنیف حسن شوقی کی اشاعت کی فرمائش کی ہے۔ ان شاء اللہ اس کی تعمیل کی ضرور کوشش کروں گا۔ اس سال کے پروگرام میں تو گنجائش نہیں البتہ آئندہ سال اس کی تعمیل ہو سکے گی۔

آپ نے جن نیم درد اور مہر آمیز الفاظ میں میری خدمات حیدرآباد کا ذکر فرمایا ہے اس کے لیے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ اس زمانے کے حیدرآباد کا جب خیال آتا ہے تو دل کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے اور جب میں اس کا مقابلہ بھارت پاکستان بلکہ بعض دوسرے اسلامی ممالک سے کرتا ہوں تو اس کی عظمت و منزلت اور بڑھ جاتی ہے۔ میرے بعض اور احباب نے بھی یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اپنے زمانے کے حیدرآباد پر کچھ لکھوں۔ آپ کے توجہ دلانے سے اس خیال کو اور تقویت ہوئی۔ اگر فرصت نکال کر اس فرمائش کی بھی تعمیل کروں گا۔ مجھے سنہ و سال یاد نہیں رہتے۔ اس میں اور بعض دوسرے امور میں آپ سے مدد لینے کی ضرورت ہوگی۔

انجمن کی جو کتابیں وقتاً فوقتاً شائع ہوں گی وہ آپ کی خدمت میں پہنچتی رہیں گی۔

ایک نسخہ "سیر الافلاک" کا بھیجتا ہوں جو حال ہی میں انجمن نے شائع کی ہے۔

خیر طلب

عبدالحق

○●○

بہ یادگار سید محی الدین قادری زور

سنِ اجراء: ۱۹۳۸ء — فون: 3310469

ماہ نامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۶۱ — اکتوبر ۱۹۹۹ء — شمارہ: ۱۰

فی پرچہ	: ۱۶ روپے	مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ	: ۲۵ ڈالر
زرِ سالانہ	: ۱۰۵ روپے	پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	: ۱۷ ڈالر
کتب خانوں سے	: ۲۰۰ روپے	انگلستان	: ۱۵ پونڈ

ناشر: ادارہ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲ (اے۔ پی) انڈیا۔

کمپیوٹر کتابت: شعبہ کمپیوٹرس، ادارۂ ادبیاتِ اردو

رمن راج سکسینہ، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے او۔ ایس۔ گرافکس، نارائن گوڑہ میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیاتِ اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

○●○

پہلی بات

جیسا کہ ہم گذشتہ شمارے میں کہہ چکے ہیں کہ سب رس کے ہر شمارے میں ہم ڈاکٹر زور کے وہ مضامین دوبارہ شائع کریں گے جو ایک عرصہ پہلے ہندستان کے مختلف علمی ادبی رسالوں میں شائع ہوئے تھے اور جو ان کے کسی مجموعہ مضامین میں شامل نہیں ہیں۔ بعد ازاں ان مضامین کو کتابی صورت دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ہم ڈاکٹر زور کے نام مشاہیر کے خطوط بھی شائع کرتے رہیں گے۔ مشاہیر کے خطوط کی دو طرفہ اہمیت ہے ایک تو یہ کہ ان خطوط سے ڈاکٹر زور کی زندگی کے مختلف حالات پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی علمی ادبی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے دوسرے یہ کہ خود مکتوب نگار مشاہیر کے حالات اور ان کی ادبی زندگی کے بعض نامعلوم پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں گوشہ زور میں ڈاکٹر زور کا مضمون "اردو کی ابتدا" اور مولوی وحیدالدین سلیم کے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔

○●○

ادارہ ادبیات اردو کی عمارت ایوانِ اردو کے سامنے سڑک کی توسیع کا کام چل رہا ہے۔ حیدرآباد میونسپل کارپوریشن نے اس سلسلے میں سڑک سے ملی ہوئی ادارے کی 121.11 مربع گز زمین کو بھی کارپوریشن کے حوالے کرنے کی ہدایت دی ہے۔ اگر اس ہدایت پر عمل کیا جائے تو پھر ایوانِ اردو کی خوب صورت عمارت جو شہر میں اردو تہذیب کی علامت ہے اپنے اعلیٰدہ طرز کے باب الداخلہ اور قطب شاہی طرز کے گنبد سے محروم ہو جائے گی بہ الفاظ دیگر عمارت اپنی شناخت ہی کھو بیٹھے گی۔ اس کا حلیہ ہی بدل جائے گا۔ ادارے کی طرف سے بلدیہ حیدرآباد کے عہدہ دارانِ مجاز کو جوابی مراسلہ لکھا گیا ہے جس میں ایوانِ اردو کی ثقافتی اہمیت کے پیش نظر ان سے درخواست کی گئی ہے کہ سڑک کی توسیع کے لیے ایوانِ اردو کے مقابل سڑک کی دوسری جانب واقع وافر افتادہ زمین کو کام میں لائیں اور ادارے کی اس بے مثال عمارت کی جان بخشی فرمائیں۔ اس مراسلے کی نقل عزت مآب وزیرِ اقلیتی فلاح و بہبود اور عزت مآب وزیرِ اعلیٰ ریاستِ آندھرا پردیش کو بھی ہمدردانہ غور اور مناسب کاروائی کے لیے بھیجی گئی ہے۔ ادارے کے لیے آزمائش کے اس موقع پر محبانِ اردو سے بالعموم اور قارئینِ "سب رس" سے بالخصوص گزارش ہے کہ وہ بھی ایوانِ اردو کو انہدام سے بچانے کے لیے حتی الامکان کوشش فرمائیں۔ ایک تجویز یہ ہے کہ وہ ہماری ریاست کے ہر دل عزیز وزیرِ اعلیٰ کی توجہ اس مسئلے کی اہمیت کی طرف ذیل کی عبارت کا ایک تار بھیج کر مبذول فرمائیں:

Shri CHANDRA BABU NAIDU,

Chief Minister, A.P., Hyderabad (A.P.) INDIA,

KINDLY INTERVENE TO SAVE THE BEAUTIFUL BUILDING OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU, PANJAGUTTA, HYDERABAD --- A CULTURAL INSTITUTION OF NATIONAL IMPORTANCE --- FROM IMMINENT DAMAGE AND DISFIGUREMENT BECAUSE OF ROAD-WIDENING PROGRAMME.

○●○

(ادارہ)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

اردو کی ابتدا

اردو، دنیا کی ایک ایسی عجیب و غریب زبان ہے جو ہمیشہ غلط فہمیوں میں گھری رہی اور جس کو اپنوں اور بیگانوں نے اکثر بیش تر نقصان پہنچانے ہی کی کوشش کی۔ اس کی شکل و صورت ہر دور میں بہت سوں کو دھوکہ دیتی رہی ہے اس طرح اس کے آ اور ارتقا کی نسبت بھی بڑے بڑے ادیب اور محقق اکثر بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے ہیں اور بعض اب تک بھٹک رہے ہیں۔

بعض لوگ غلط فہمی یا مقامی تعصب کی وجہ سے اردو کو ہندی یا سندھی یا برج بھاشا یا کھڑی بولی کی بیٹی سمجھ لیتے ہیں ا دوسروں کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ایسی غلطی ہے کہ اس کو مان لینے کی وجہ سے ہر منزل پر نت نئی غلطیو گوارا کرلینا پڑتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی بن کر بلند پایہ صاحبان فضل و کمال کو بھی گم راہ کردیتا ہے۔ یہ غلطیاں اور غلط فہمیاں زیادہ یوروپی محققین اور ماہرینِ لسانیات کی پیدا کردہ ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جرمن۔ فرانسیسی اور انگریز ماہرینِ لسانیات نے ہما زبان سے متعلق قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں اور ہم ان کے احسان کے ہمیشہ معترف رہیں گے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں اعترافِ احسان کے ساتھ ساتھ ہم ان کی غلطیوں کو بھی آنکھ بند کرکے قبول کرلیں۔

ہمارے ملک کی سیاسی و سماجی آزادی کے بعد سے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی ذہنی آزادی بھی حاصل کرلیں اور ا زبانوں اور ان کے ادب کے متعلق آزادانہ اور صحت مندانہ رجحانات کو پیشِ نظر رکھ کر تحقیقات کریں اور ایسے غلط نظریوں اور پادر خیالات کو چھان بین کے بعد علی الاعلان رد کردیں جن کو ہم اپنی کم علمی یا یورپ کے ماہرینِ لسانیات پر اعتقاد یا ان کے بے جا رعب وجہ سے صحیح مان لیا کرتے تھے اور مان رہے ہیں۔

یہ بات عجیب ہے کہ اردو اور پنجابی کے اصل تعلق کی نسبت کسی یورپی ماہرِ لسانیات کا ذہن اب تک منتقل نہیں ہ اس کی طرف سب سے پہلے ہندستانیوں ہی کی توجہ منعطف ہوئی اور ہندستانی اہلِ قلم ہی نے اردو اور پنجابی کے اس بنیادی تعلق کو س سے پہلے بے نقاب کیا۔ چناں چہ ۱۹۲۸ء میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں اس خیال کو نہایت وا انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایک سال قبل ہی راقم الحروف اردو کے آغاز و ارتقا کے موضو لندن یونی ورسٹی میں لسانی تحقیقات میں مصروف تھا۔ میرے مطالعے اور تلاش و جستجو میں بھی یہی حقیقت بے نقاب ہوئی تھی۔ صرف اتنا تھا کہ میں نے یہ واضح کیا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبہ گنگ و جمن کی زبان میں بہ کم فرق پایا جاتا تھا۔ برج بھاشا کھڑی بولی اور جدید پنجابی زبانیں بعد کو عالمِ وجود میں آئیں۔ چناں چہ میں نے اپنے مقالے میں اس نظر شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا۔ اس مقالے کی تکمیل کے بعد راقم الحروف نے صوتیاتی نقطہ نظر سے اس کی مزید توثیق کی اور اس سلس میں جو علمی تحقیقات کی تھیں ان کو کتابی صورت میں "ہندستانی فونی ٹکس" کے نام سے ۱۹۳۰ء میں پیرس سے انگریزی زبان میں شا کیا۔ بعد میں اس نظریے کی مزید وضاحت اور اہلِ اردو میں اشاعت کے لیے ایک اردو کتاب "ہندستانی لسانیات" لکھی جو ۱۹۳۲ء

شائع ہوئی۔

غرض ۱۹۲۸ء کے بعد سے اہلِ اردو اور ماہرینِ لسانیات کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور اردو کے سرزمین پنجاب میں پیدا ہونے اور لسانی نشوونما حاصل کرنے کا نظریہ مستحکم اور مسلم الثبوت بن گیا۔

۱۹۴۲ء میں ہماری زبان کے ایک قابلِ احترام شاعر اور ادیب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے اپنی کتاب "کیفیہ" شائع کی تو اس میں بھی انھوں نے راقم الحروف اور محمود شیرانی دونوں کے اس نظریے سے اختلاف نہیں کیا بلکہ صفحات ۲۵ تا ۲۹ پر میرے اس خیال کی تائید کی کہ اردو کی پیدائش کے وقت شمالی اور شمال مغربی ہند کی زبان تقریباً ایک ہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی شاید دہلوی ہونے کی وجہ سے اس واقعہ کا صاف طور پر اعتراف نہیں کیا کہ اردو پنجاب ہی میں پیدا ہوئی بلکہ ذرا دامن بچاتے ہوئے یوں لکھ دیا کہ:

"راقم کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ کسی خاص مقام یا خطے کو اردو کا مولد ہونے کے امتیاز سے محروم کیا جائے یا یہ طرہ ایک سے چھین کر دوسرے کی دستار میں لٹکایا جائے۔"

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کی مخالفت بھی نہیں کی، بلکہ اس کے کئی صفحات میں ایسے اسماء افعال ضمائر وغیرہ پیش کیے ہیں جن سے اردو اور پنجابی کا تعلق ظاہر ہوتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں زبانوں کا ربط نہایت گہرا اور نہایت قریبی ہے۔

پنڈت کیفی کے اس گومگو اندازِ بیان کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کتاب کی اشاعت سے دو سال قبل ہی مولانا سید سلیمان ندوی جیسے فاضل اجل کی ایک کتاب "نقوشِ سلیمانی" ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکی تھی جس میں مولانا کے مختلف مضامین اور خطبے شامل ہیں۔ ان میں سے بعض بہت ہی قدیم یعنی ۱۹۱۵ء کے لکھے ہوئے تھے۔ لیکن ۱۹۳۲ء کے ایک مقالے میں مولانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو سندھ ہی میں بنی ہے۔ چناں چہ وہ طویل بحث کے بعد جو نتیجہ اخذ فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ:

"قرینِ قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔" (ص: ۳۱)

اس سے پہلے ایک خطبے میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ:

"اردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا کام نہیں۔ بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے۔ اردو شاہ جہاں کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں خلجیوں اور تغلقوں ہی کے زمانے میں یہ پیدا ہو چکی تھی۔" (ص: ۹)

ایک اور مضمون میں مولانا نے یہ رائے قائم فرمائی ہے۔

"یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔" (ص: ۲۵۱)

واضح ہو کہ مولانا سلیمان ندوی کے یہ عجیب اور متضاد بیانات پنجاب میں اردو اور ہندستانی لسانیات کی اشاعت کے بعد شائع ہوئے ہیں جن میں اس مسئلے کو پوری طرح واضح کر دیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان تحقیقی اور لسانیاتی کتابوں کے مطالعے کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائی لیکن ان متضاد بیانات اور رایوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد جب پنڈت کیفی نے قلم اٹھایا تو قطعی طور پر

کسی نتیجے پر پہنچنے سے گریز کیا اور چوں کہ یہ دونوں اصحاب لسانیات سے زیادہ تاریخ و ادب و نقد شعر کے ماہر تھے اس لیے اپنے علم فضل اور وسعت معلومات کے باوجود اصل مسئلے سے دور ہوگئے شاید انھوں نے دوسرے مصنفوں کی تحقیق یا نظریے سے ہم خیال ہونے کو اپنے تبحرِ علم کے لیے کسرِ شان تصور کیا۔

غرض "نقوشِ سلیمانی" اور "کیفیہ" کی اشاعت کے بعد اردو کے آغاز و ارتقا اور جائے پیدائش کے بارے میں اردو اور ہند کے اربابِ قلم پھر تذبذب میں پڑگئے اور اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کے مسلم الثبوت نظریے کو نظر انداز کرنے کا میلان شروع ہوگیا۔ اس میلان میں شاید اس لیے بھی تقویت پیدا ہونے لگی کہ اس نظریے کے آغاز کا سہرا کسی یورپی محقق کے سر نہیں باندھا گیا تھا اور ہم ہندستانیوں کے نزدیک اب تک کسی انگریز یا جرمن یا فرانسیسی مصنف کا نام ہی کسی خیال یا نظریے یا رائے کی صداقت صحت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

دوسری وجہ شاید یہ ہے کہ اس میلان کو ہوا دینے والے اردو اور ہندی کے ادیب چوں کہ خود لسانیات پر کافی عبور نہیں رکھتے تھے اس لیے خود ذاتی تحقیق و تفتیش کرنے سے معذور تھے۔

تیسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے اکثر صوبہ داری عصبیت کا شکار ہیں اور اتر پردیش اور دلی کے سوا کسی اور مقام کو اردو اور ہندی کا مرکز و منبع ماننے کے لیے تیار نہیں اور نہیں چاہتے کہ برج کی مقدس سرزمین اور اس کے نواحی علاقے اس عظمت سے محروم ہوجائیں اور اردو کے آغاز کا سہرا پنجاب کے سر باندھا جائے۔

اردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق اردو کی جدید ترین لسانیاتی تحریروں کے تجزیے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کی انگریزی کتاب "انڈو آرین اور ہندی" اور پروفیسر ڈاکٹر سدھیشور ورما کی اردو کتاب "آریائی زبانیں" کا بھی تذکرہ کیا جائے۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کلکتہ یونی ورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر اور ہندستان کے سب سے بڑے عالمِ لسانیات اور محقق ہیں۔ ان کی تصنیفات کی اولیت و اہمیت اور ان کے تبحرِ علمی کی وجہ سے اگر ان کو عہد حاضر میں ہندستانی لسانیات کا امام کہا جائے غلط نہ ہوگا۔ ان کی تحقیقات نے یورپ کے بڑے بڑے ماہرین اور خاص کر "لسانیاتی جائزہ ہند" کے مرتب سر جارج ابراہیم گریرسن کی غلطیوں کو بے نقاب کردیا ہے۔ گجرات کی ورناکولر ریسرچ سوسائٹی نے ۱۹۴۰ء میں ان کو ہندی ہندستانی کے نشوونما پر تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا تھا اور یہ تقریر اس سوسائٹی کی طرف سے ۱۹۴۲ء میں "انڈو آرین اور ہندی" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی گئی تھی۔

پروفیسر چٹرجی نے اپنی اس کتاب میں "ہندستانی لسانیات" سے ان الفاظ میں اتفاق کیا تھا کہ

"he language that they (Muslims) first adopted was naturally that current in the unjab, Even in these days, there is not much difference between the Punjab dialects, articularly those of Eastern Panjab from those spoken in the western most parts of ie United Provinces; and eight or nine hundred years ago, we might imagine that ie difference was still less. It is even likely that an almost identical speech was urrent in Central and Western United Provinces and Eastern Panjab". ...(p. 167)

اس کے بعد دہلی میں مسلمانوں کی آمد اور وہاں اپنی بنائی ہوئی بولی کو پنجاب سے ساتھ لانے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"It is likely that Panjab Muhamadans who came to Delhi as followers of the Turki and Persian Conquerers had the greatest importance of all the Indian groups in the new capital. They brought their dialect to Delhi and their dialect, which agreed with those of the districts to the north and north west of Delhi in some mportant matters, gave the tone and supplied some sailent characteristics to the new Verkehrsspracha or Business speech which came into being in the new Capital City"...(p. 168 - 169).

اس بیان کے آخر حصے میں چٹرجی نے بھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی عظمت قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سے آگے (چند صفحات بعد ہی) ڈاکٹر چٹرجی "اردو شہ پارے" کے حوالے سے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اردو بولنے والے پنجاب ہی سے آئے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"Judging from the kind of speech the descendants of these North Indian Muslims still speak in the Deccan and from the language of early Dakni poetry of the 16th and 17th centuries (cf. Urdu Shahpare by Dr. Syed Mohiuddin Qadri, Hyderabad Dakan, Part - I, 1929), it is clear that they mostly hailed from the Panjab and from the Bangaru and "Vernacular Hindustani" dialect areas of North India"... (p.184).

مگر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ جب سنیتی کمار جیسا محقق آگے کی چند سطروں میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ دکنی اردو کسی اور بولی سے بنی اور شمالی اردو کسی اور بولی سے۔

The North Indian Vernacular which became established in the South was a sister speech to Hindustani; if not exactly identical with it, being of same Panjab and Western United Provinces origin"...(p.184).

چند اور سطروں کے بعد چٹرجی پھر اردو کا اصلی وطن پنجاب ہی کو قرار دینے کی طرف مائل ہوتے ہیں چناں چہ شاہ برہان الدین جانم کی نظم "سکھ سہیلا" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"Shah Burhan's language has some distinct Panjabi affinitics. and it is note worthy that he calls it Guj (a)ri as contrasted with Bhaka i.e. Braj Bhasha. This name Gujri gives an indication of the origin and affinity of this dialect. Evidently the Gujars of the Punjab had come in good numbers with the North Indian armies and they maintained their name and their dialect in the Deccan for sometime"...(p...185 - 186)

یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کے ان بہ ظاہر متضاد بیانات کے اسباب اور حسن و قبح پر تنقیدی نظر

ڈالی جائے۔ البتہ اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ یہ مبہم بیانات بھی ان غلط فہمیوں کا باعث ہیں جو بعد کے اردو اربابِ قلم کی لسانیا تحریروں کو گم راہ کردینے کا باعث ہوئے اور جن کا ذکر آئندہ درج ہے۔

پروفیسر چٹرجی کی تقریروں کے اس مجموعے کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی ادارہ ادبیاتِ اردو کی طرف سے پروفیسر ڈاکٹر سدھیشور ورما کی ایک کتاب "آریائی زبانیں" میرے ہی مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی۔ سدھیشور ورما پرنس آف ویلز کالج جموں سنسکرت اور لسانیات کے عرصے تک پروفیسر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے موضوع کی مناسبت سے آریائی زبانوں پر تو اس کتاب تفصیل سے بحث کی ہے لیکن اس کی تمہید میں ہندوی زبان کے ماخذ و ارتقا پر بھی سرسری طور پر اظہارِ خیال کیا ہے لیکن اس سے چلتا ہے کہ انھوں نے اس مسئلے پر غور ہی نہیں کیا۔ نہ تو محمود شیرانی کی کتاب پنجاب میں اردو ہی پڑھی، نہ پنڈت کیفی کی کتاب کیفیہ" اور نہ "ہندستانی لسانیات" ہی کا مطالعہ کیا۔ اگرچہ چٹرجی کی مذکورہ بالا کتاب کے جا بہ جا حوالے دیے ہیں لیکن اردو یا ہند کے آغاز کی نسبت یورپی ماہرینِ لسانیات کے پرانے خیال کو دہرا دیا ہے کہ وہ دلی کے بازاروں اور ضلع میرٹھ کی زبان سے مل کر ہے (ص: ۱۲۔ ۱۳)۔

آخر میں اردو اور ہندی کی ان کتابوں کا ذکر ضروری ہے جو گزشتہ چند سالوں میں شائع ہوئی ہیں ان میں خاص طور پر تم کتابیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ لسانی انداز میں لکھی گئی ہیں اور اردو کی ان معدودے چند کتابوں سے ہیں جو اس مخصو موضوع پر اب تک شائع ہوئی ہیں۔ پہلی کتاب پروفیسر احتشام حسین کی "ہندستانی لسانیات کا خاکہ" ہے۔ احتشام حسین صاحب دراصل جان بیمز کی مشہور کتاب کا ترجمہ اپنے ایک سیر حاصل مقدمے کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں شائع کیا ہے۔ ان کا مقدمہ اگرچہ بہ طور دیبا کتاب کے ساتھ شریک ہے لیکن بہ جائے خود ایک مبسوط مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں احتشام صاحب نے اس موضوع کی مطبوعہ کتابوں کے مطالعے کا بہت عمدہ نچوڑ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں کیا ہے۔ لیکن بڑی حیرت ہوتی ہے جب یہ جملہ بھی ا مقدمے میں نظر سے گزرتا ہے کہ:

> "جیولز بلاک (فرانسیسی ماہرِ لسانیات) نے جو نظریہ پیش کیا ہے اور جسے ڈاکٹر زور نے تسلیم کیا ہے وہ یہ ہے کہ ابتدا میں پنجابی اور کھڑی بولی میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا۔ بعد میں ایک پنجابی بن گئی دوسری کھڑی بولی" (ص: ۵۲)۔

حالاں کہ نہ تو جیولز بلاک نے یہ نظریہ پیش کیا اور نہ میں نے کہیں اپنی کتابوں میں ان کے کسی نظریے کی وضاحت کی۔ ا نظریے کے اگر کوئی بانی قرار دیے جاسکتے ہیں تو وہ دراصل پروفیسر چٹرجی ہیں جن کی طرف میں نے "ہندستانی لسانیات" میں ص اور "ہندستانی فونے ٹیکس" میں (ص: ۱۹) پر اشارہ کیا ہے۔ پروفیسر جیولز بلاک نے دراصل اپنے ایک مضمون میں اس کی طر اشارہ کیا تھا کہ ہندستانی کے آغاز و ارتقا پر غور کرتے وقت دلی کے اطراف و اکناف کی بولیوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اور از یہ مضمون اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن کے بلیٹن میں ۱۹۲۸ء میں اس وقت چھپا تھا جب کہ میرا مقالہ پی ایچ۔ ڈی مکمل ہوچکا تھا اگر یہ مضمون اس ترتیب کے دوران میں چھپتا تو میں اس کی تائید تو یقیناً نہیں شاید تردید ہی کرتا۔

پروفیسر جیولز بلاک خود بھی محمود شیرانی کی کتاب اور میری تحقیقات سے اس وقت تک ناواقف تھے اور جب ۱۹۲۹ء لندن سے پی ایچ۔ ڈی کرلینے کے بعد ڈی لٹ کے لیے پیرس پہنچا اور پروفیسر جیولز بلاک کے ساتھ گجراتی فارم آف ہندستانی پر م

لکھنا شروع کیا تو وہ اس وقت ان مباحث اور نظریے سے پوری طرح واقف ہوئے ۔ چناں چہ جب پیرس سے "ہندستانی فونے ٹیکس" شائع ہوئی تو اس پر خود پروفیسر جیولز بلاک ہی نے مقدمہ تحریر فرمایا اور چوں کہ وہ اس نظریے کو سمجھ چکے تھے اس لیے اپنے مقدمے میں ان کی کوئی مخالفت بھی نہیں کی ۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ہندستانی مصنفین کے لیے کسی یورپی محقق کا نام ہی ضمانت کا کام دیتا ہے چناں چہ جیولز بلاک کے اس ابتدائی خیال کو صحیح سمجھ لینے کے بعد پروفیسر احتشام نے اپنے مقدمے کو اردو کے آغاز اور جائے پیدائش کے بارے میں کوئی قطعی نتیجہ قائم کیے بغیر ہی ختم کردیا ہے ۔

یہی حال اس کی ہم عصر ایک اور کتاب "مقدمہ تاریخ زبانِ اردو" کا بھی ہے اس کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی پی ۔ ایچ ڈی کے مقالے کے طور پر مرتب کیا تھا ۔ یہ مقالہ بھی کتابی صورت میں شائع ہوا ہے ۔ اس مقالے میں اگرچہ زیادہ تر پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کا انداز اختیار کیا گیا ہے اور ان کی تحقیقات سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ لیکن جیولز بلاک کے مذکورہ بالا مضمون کو بنیاد قرار دے کر پوری کتاب میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ پنجابی سے توجہ ہٹاکر ہریانی کو آگے بڑھایا جائے اور کچھ اس انداز میں کتاب لکھی گئی ہے کہ پنجابی واقعی پس منظر میں چلی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر مسعود حسین یہ تو مانتے ہیں کہ :

> "یہ بات پایہ ء ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانوی اور پنجابی میں خطِ فاصل قائم کرنا دشوار تھا ۔" (ص : ۱۰)

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عجیب و غریب خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ

> "البتہ شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی زبان کے مقابلے میں ہریانوی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا پڑے گا" (ص : ۱۰)

اس کتاب میں مسعود صاحب سے ایک اہم فرو گذاشت یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانوی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کرکے نتائج اخذ کیے ہیں حالاں کہ دکنی اردو نے جس وقت پنجاب میں نشوونما حاصل کیا ۔ اس وقت ہریانی اور کھڑی تو کجا خود برج بھاشا بھی ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے عالمِ وجود میں نہیں آئی تھی اور خود انھوں نے پروفیسر شیرانی کے اس نظریے کو قبول کیا ہے کہ ہریانی کی پیدائش مسلمانوں کی آمد دہلی کے بعد عمل میں آئی ہے (ص : ۱۳۱) ۔

ڈاکٹر مسعود حسین مانتے ہیں کہ لاہور کی ترکی ہندی فضا میں خواجہ مسعود سعد سلمان پرورش پاتے ہیں جو ہندوی زبان کے بھی پرگو شاعر تھے (ص : ۱۲۸ ۔ ۱۲۹) اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "خواجہ مسعود کسی ہندوی زبان میں بھی شاعری کرتے تھے اور شاید ان کا دیوان خسرو کے وقت تک دستیاب تھا" لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہندوی زبان کون سی تھی اس لیے قیاس قائم کرتے ہیں کہ یہ زبان لاہوری ہوگی ۔

یہ ایک عجیب قیاس ہے ۔ جب ہم کو معلوم ہے کہ امیر خسرو ہر جگہ کی زبانوں کا فرق جانتے تھے اور اپنے عہد کے بہت بڑے ماہر و محققِ لسانیات تھے ۔ چناں چہ انھوں نے اپنے عہد کی ہندسانی زبانوں کی فہرست بھی لکھ دی تھی جس کو مسعود صاحب نے بھی صفحہ ۱۳۰ پر نقل کیا ہے ۔ ایسی صورت میں اگر مسعود سعد سلمان کی زبان لاہوری ہوتی تو امیر خسرو اس کی لاہوری ہی لکھتے اور اگر ان کی زبان اور مسعود کے دیوان کی زبان میں فرق ہوتا تو وہ ضرور یہ بھی واضح کرتے کہ میں نے دہلوی میں شاعری کی اور مسعود نے لاہوری میں

لیکن اس کی بجائے انھوں نے اپنی اور مسعود دونوں کی زبانوں کا نام ہندوی لکھا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی واضح کردینی ضروری ہے کہ امیر خسرو نے اپنی زبانوں کی فہرست سے ہندوی کو الگ ہی رکھا۔ اس لیے کہ یہ زبان بین صوبہ جاتی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ ان کے عہد میں یہ کوئی مقامی زبان نہیں رہی تھی اور انھوں نے جن زبانوں کے نام لکھے ہیں وہ صرف مقامی ہیں اور ان مقامی زبانوں کی فہرست میں برج بھاشا کو انھوں نے دہلوی اور پنجابی کو لاہوری لکھا ہے۔

مسعود صاحب دہلوی ہی کو اردو سمجھتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو خسرو پر یہ الزام رہتا کہ انھوں نے برج بھاشا جیسی اہم زبان کا ذکر ہی نہیں کیا۔

قصہ مختصر یہ کہ ہریانوی کو اردو کا ماخذ ثابت کرنے کی کوشش میں ڈاکٹر مسعود حسین کی پوری کتاب گنجلک اور مبہم و متضاد بیانات سے معمور ہوگئی کہ ان پر ایک سرسری تبصرے کے لیے بھی کافی وقت اور فرصت درکار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب محنت اور تلاش و جستجو سے لکھی گئی ہے اور مصنف نے لسانیاتی مسائل سے گہرے شغف کا ثبوت دیا ہے لیکن محض جیولز بلاک کی سند پر ایک پورا نظریہ قائم کرنے اور پنجاب میں آغازِ اردو کے نظریے کو غلط ثابت کرنے کی سعی میں اپنی ساری قابلیت وقف کردی ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر شوکت سبزواری کا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ بھی مغربی مصنفین کے اقتباسات اور ان کے موقع بے موقع حوالوں سے معمور ہے۔ یہ مقالہ "اردو زبان کا ارتقا" کے عنوان سے ۱۹۵۶ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوا ہے اس میں شوکت صاحب نے ایک ستم ظریفی یہ کی ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کے ادبی و تنقیدی مضامین کے بعض ٹکڑوں اور بیانات کو بھی بہ طور سند پیش کیا ہے۔ حالاں کہ مولوی صاحب کو نہ ماہرِ لسانیات ہونے کا خیال آیا اور نہ انھوں نے کبھی جدید لسانیات کی تالیفات اور تحقیقات کی طرف توجہ ہی کی۔ اس کتاب میں بھی مسعود صاحب کی طرح جدید لسانیاتی نقطہ، نظر سے کام لیا گیا ہے اور اس کے آخری ابواب میں اردو کے اکثر و بیش تر الفاظ کے صوتی و لسانیاتی ارتقا پر فنی طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اصل مسئلے کے بارے میں شوکت صاحب یورپی مصنفوں کے اقتباسوں اور متضاد بیانات کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ البتہ اس مقالے سے آئندہ تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لیے ایک نئے زاویہ، نگاہ سے اردو کے ارتقا پر غور کرنے کا امکان سجھائی دیتا ہے اور وہ ہے پالی زبان سے اردو کا تعلق۔ پالی بھی اردو کی طرح تمام ہندستان میں پھیل چکی تھی اور ان دونوں میں ایک ایسی مشابہت نظر آتی ہے جس کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں عام طور پر انتشار خیال پیدا ہوگیا ہے اور ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی کوشش کرنے لگا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان سب کتابوں اور ان کے مندرجہ مبہم و متضاد بیانات کی جانچ کی جائے اور ان میں جہاں جہاں غلطی ہے اس کی تردید دلائل کے ساتھ پیش ہو اور ایک ایسی مبسوط کتاب ترتیب اور شائع کی جائے جس میں لسانیاتی نقطہ، نظر اور دلائل و براہین کے ساتھ اردو کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی جاسکے۔

اس کتاب میں ان امور کا پھر سے تفصیلی جائزہ لینا پڑے گا جن کے بارے میں شیرانی، کنی، چٹرجی، مسعود حسین خاں اور شوکت سبزواری نے بھی بحث کی ہے اور جس کے سلسلے میں ان کے آپس میں اتفاق یا اختلاف رائے پیدا ہوا ہے۔

اس بات کو صاف طور پر واضح کرنا پڑے گا کہ ہریانی زبان کی پیدائش اردو کی پیدائش کے بعد عمل میں آئی اور اگر قدیم دکنی اردو کی بعض خصوصیات ہریانی زبان سے ملتی جلتی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اردو ہریانی سے بنی بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے

(باقی ص: ۵۰ پر)

پروفیسر وحیدالدین سلیم کے خطوط ڈاکٹر زور کے نام

(۱)

زیزی و محبی

اسلام علیکم ـــــ

محبت نامہ پہنچا۔ بہ خیریت لندن پہنچنے سے خوشی ہوئی۔ آج جمعرات کا دن ہے
ب جارہی ہے۔ فرصت نہیں کہ پرنسپل صاحب سے دریافت کیا جائے۔ ایک طالب علم نے یہ خوش خبری پرنسپل صاحب کی زبانی
ئی کہ آپ ایک ہی سال میں فارغ ہوکر آجائیں گے اور بہت سی شرطیں آپ کے لیے معاف کردی گئی ہیں۔ اس سے نہایت خوشی
ئی۔ مگر افسوس ہے کہ آپ نے مجھے یہ خوشخبری نہیں لکھی۔ کیا مجھے بدخواہ تصور کرتے ہو۔ کیوں کہ مجھے خوشی کی خبر نہیں
ں۔ (دل اور زبان دونوں مطابق رکھو) میں تمھاری ہر ترقی اور کامیابی کے لیے دل سے دست بہ دعا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمھیں تمھارے
دوں میں جلد تر کامیاب کرے اور خیریت کے ساتھ تم واپس آؤ۔

چلتے وقت جو آپ نے کہا تھا کہ منصور سے کہہ جاؤں گا۔ وہ تصویر کی ایک کاپی دے جائے گا۔۔۔ افسوس ہے کہ اب تک
ر میرے پاس نہیں پہنچی۔ اپنی خیریت اور تازہ حالات سے برابر مطلع کرتے رہو۔

میں ہوں تمھارا دلی ہوا خواہ اور دعا گو

وحیدالدین سلیم

۲۰/اکتوبر ۲۷ء

○●○

(۲)

عزیز محترم ـــــ آج ۲۲/مارچ ۱۹۲۸ء کو عزیزی سروری نے ایک کیلنڈر آپ کی طرف سے مجھے لاکر دیا۔ آج ہی
ل جانے کا دن ہے۔ اس لیے آج ہی خط لکھ کر اس کیلنڈر کا نہیں بلکہ آپ کی دلی محبت اور سعادت مندی اور شرافت کا شکریہ ادا
تا ہوں۔ آپ مجھے نہیں بھولے حالاں کہ آج کل کالجوں کے شاگرد استادوں کو بھول جاتے ہیں۔ ان کی طرف رخ بھی نہیں کرتے۔
ں ہوکر ان سے دور ہوجاتے ہیں۔ تم سید ہو اور میں بھی سید ہونے کا مدعی ہوں۔ لازم ہے کہ تم میں شرافت کا جوہر موجود ہو۔
رافت کا ادنیٰ جوہر یہ ہے کہ ادنی احسان کو بھی کبھی فراموش نہ کرے یقین ہے کہ یہ جوہر کبھی تمھاری ذات سے ناپید نہ ہوگا۔

ساری عمر سید جیو گے اور سید ہی مرو گے۔

عزیزی سرداری نے یہ کلنڈر دیر سے دیا۔ اس کا سبب یہ کہ جنوری میں ان کے پاس پہنچا تھا۔ میں جنوری میں سیول ہاسپٹل سکندرآباد میں زیرِ علاج تھا۔ مکان مقفل پڑا تھا۔ آئے ہوں گے اور چلے گئے ہوں گے۔ مجبوراً جنوری اور فروری کا تاریخ نامہ کاٹ مارچ کا تاریخ نامہ دیوار پر لگالیا۔ اب دس مہینے تک برابر سامنے رہو گے۔ ہر وقت یاد آؤ گے۔ کبھی فراموش نہ ہوگے۔ جب اس کو دیکھوں گا تمھارے لیے مسرت اور کام یابی کی دعا کروں گا۔ واہ کیا تحفہ ہے تحفہ ہو تو ایسا ہو جو ہمیشہ بھیجنے والے کو یاد دلاتا رہے۔

اب اپنی بیماری کا حال لکھتا ہوں۔ چار مہینے ہوئے کہ دانتوں میں پایریا کی شکایت ہوئی۔ دانتوں میں درد رہنے لگا۔ دانتوں سے پیپ آنے لگی، ڈاڑھوں میں درد رہنے لگا۔ پہلے اسی شکایت کے سبب گیارہ بارہ دانت اکھڑوائے جا چکے تھے۔ اب ارادہ ہوا کہ سب باقی دانت اکھڑوا دیے جائیں اور مصنوعی دانت بنوالیے جائیں۔ چناں چہ سب دانت اکھڑوائے گئے۔ بعض دانتوں کے اکھڑنے سے دانت کے ٹکڑے باقی رہ گئے۔ انھوں نے سخت تکلیف دی۔ کلورا فارم دے کر وہ ٹکڑے نکالے گئے۔ مدت میں ان کے زخم اچھے ہوے۔ مگر بائیں طرف دونوں جبڑوں کے درمیان ایک زخم ایسا ہٹیلا ثابت ہوا کہ آج تک اچھا نہیں ہوا۔ اس کے سبب منہ اچھی طرح نہیں کھلتا۔ کھانے کی چیز نہیں کھا سکتا۔ صرف پینے کی چیزیں پی سکتا ہوں۔ اس زخم کا درد بھی کان اور آنکھ تک پہنچا ہے۔ غرارے کیے جاتے ہیں مگر یہ زخم اچھا نہیں ہوتا نہ اس سے پیپ آنی بند ہوتی ہے۔ مقام ایسا نازک ہے کہ ڈاکٹروں کی رائے میں یہاں آپریشن نہیں ہوسکتا۔ پھر زخم اچھا ہو تو کیوں کر۔ بعض نے رائے دی ہے کہ رانچی (بنگال) میں ریڈیم انسٹیٹیوٹ ہے وہاں ایسے امراض کا علاج ریڈیم کی کرنوں سے ہوتا ہے۔ تم بھی اس زخم کا علاج وہیں کراؤ۔ میں نے رانچی کو خط لکھا ہے۔ انسٹیٹیوٹ کے قواعد منگائے ہیں جب وہ قواعد آجائیں گے تو یہاں کے انگریز ڈاکٹروں سے رائے لوں گا پھر لکھنو جاکر مڈیکل کے انگریز ڈاکٹروں سے مشورہ کروں گا۔ اگر ان کی رائے ہوئی تو میں رانچی چلا جاؤں گا اور اسی طریقے سے زخم کا علاج کراؤں گا۔

زیادہ دعا اپنی تعلیم اور دیگر ضروری حالات سے مطلع کرو۔

میں ہوں تمھاری یاد آوری کا دل دادہ و ممنون

وحیدالدین سلیم

کرشنا منزل، چراغ علی کی گلی،

حیدرآباد دکن۔

۲۲ / مارچ ۱۹۲۸ء

○●○

(۳)

عزیزِ محترم ــــ ایک خط ۲۲ مارچ کو دوسرا ۱۲ / اپریل کو حیدرآباد سے منتقل ہوکر میرے پاس رانچی پہنچے ہیں۔ ۱۰ پریل سے رانچی (صوبہ بہار) کے ریڈیم انسٹیٹیوٹ میں زیرِ علاج ہوں اور وارڈ نمبر ۵ میں مقیم ہوں۔ یہی میرا پتہ ہے۔ یہاں ریڈیم سے سرطان بننے والے پھوڑوں یا انسس کے مشابہ زخموں کا علاج ہوتا ہے۔ سارے ہندستان میں یہی ایک جگہ ایسی ہے اور سرکاری ہے۔ مجھ پر دو اپلی کیشن ریڈیم کے ہوئے۔ ایک منھ کے اندر ۱۶ / اپریل کو۔ یہ چھے گھنٹے کا اپلی کیشن تھا۔ دوسرا ۲۴ / اپریل کو باہر کی رف جو چوبیس گھنٹے کا اپلی کیشن تھا۔ ہر دو اپلی کیشن کے درمیان سات آٹھ دن کا فاصلہ دیتے ہیں مگر حسبِ ضرورت کبھی پندرہ بیس دن کا وقفہ بھی ہوتا ہے۔ ۲۴ / اپریل والے اپلی کیشن کے دو چار روز بعد پہلے اپلی کیشن یعنی ۱۶ / اپریل والے کا ری ایکشن ہوا۔ خم جو بائیں طرف رخسارہ میں ہے اس کے چاروں طرف رخسارہ میں۔ اوپر کے جبڑے میں نیچے کے جبڑے میں، زبان کے دائیں کنارے میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آگ رکھ کر ان مقامات کو جلا دیا ہے۔ یہی کیفیت اب ہے۔ اس لیے تیسرا اپلی کیشن رک گیا۔ جب تک کہ یہ ری ایکشن ختم نہ ہو اس پر ہر روز دوا اندر کی طرف ٹچ کی جاتی ہے۔ غرارے کرائے جاتے ہیں۔ درد بہت ہوتا ہے یعنی اندر کی طرف ان تمام مقاماتِ سوختہ میں اور اس کی وجہ سے کان میں آنکھ میں حلق میں اور بائیں طرف کی گلٹی جو اس زخم کے سبب متورّم ہے اس میں بھی۔ دیکھیے یہ کیفیت کب تک باقی رہے اور تیسرے اپلی کیشن کی نوبت کب آئے اور کتنے اپلی کیشن مجموعی ر پر ہوں اور کب تک یہاں ٹھہرنا پڑے۔ اخراجاتِ کثیر ہیں، اس کی پروا نہیں۔ تنہائی ہے، اس کا علاج نہیں۔ نیا نوکر حیدرآباد سے ساتھ لایا تھا اس نے تنگ کیا، واپس بھیج دیا۔ یہیں ایک نوکر بیس روپے ماہوار پر رکھ لیا ہے۔ یہ کیفیت علاج کی اب تک کی ہے اور کیا لکھوں دعا کرو کہ خدا صحت عطا فرمائے۔

وحیدالدین سلیم

از: رانچی

۴ / مئی ۱۹۲۸ء

ooo

یوسف میخائلوچ ارانسکی

ترجمہ: اسامہ فاروقی

حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان (وسط ایشیا) ماسکو ۱۹۷۷ء

حصاری پریا لوگوں کی زبان، ہند آریائی زبانوں کے وسطی زمرے کی ایک بولی

(قسط: ۹)

III (Amyp.)

(1) čo ni-čo, yek pâčâ čo. (2) yek ran tara čo. (3) ya ran bekar mana čʰo. (4) ...do.. ..... kōṛṛo-so čʰo. (5) yek-e-se-ke na Badal, yek-e-se-ke na Vâ.

(6) yek din-ko din oyo pâčâ šikar-ma lakṛai. (7) in is-ki ran-i-si yek habaš-nala saz ovai. (8) unti ki pâčâ âvai ya ran čar čapati pakavai, us-ta lak-a-pəre bandai. (9) u čapati suk jovái, igi luṇ marái, u čapati tarakas karái. (10) ya pâčâ pišʲna karái ki: e, ran, ta-ta kaine? (11) ya kui ke: muro lak dukai. (12) ya pâčâ ziq jovai.

(13) is-ki bišta keṭuno vax langái, ya pâčâ-ke nin âvai. (14) ya ran kale-pə-tə ji karái, dekai, ke pâčâ so giyo. (15) ya asta karái, kaniz-ta keyo ke: kōṛṛe-ta zin kari (16) ya rat-a kōṛṛə-pəra čarái. (17) fer ya ran hai karái. (18) yek vaxt ovai, paṛ-ma jovai. (19) unya ya utərai. (20) yek ɣâr-ma varai, ke dekai, ke yek habaš unya beṭei.

(21) fer pâčâ nin-bišta uṭó. (22) pâčâ-nâ dekyo — ran ni. (23) pâčâ uṭó, duryó kaniz-kula: tu dek, dun kōṛṛo čʰe? (24) kaniz ayó, pâčâ-te keyo: ye(k) kōṛṛo ni, Badal ni. (25) pâčâ keyo: Va-ta zin kari (26) pâčâ lakᵊryo us-ke pačá. (27) pâčâ-ke pačá lakᵊryo gurji. (28) ha-ha-ha. (29) ya be use-tara pača beyó us-ke paṭya (pača)[1] kalo giyo. (30) tiyan kaliyo, ke ran-i-si unya.

(31) habaš ya do dan ag-nala pare ran-ta habaš-na maryó. (32) is habaš ran-ta: dukyo? (33) ran-na keyo ke: kurban-tire jon-me; me na-dukyo, turo hat duk giyo.

(34) pâčâ-na keyo ke: ya toba, me is-ta kand-a kandolat dova čo, is-te yekmeti(r) kurpača-para sata čo, us-ma te ran kuva čo ke: muro lak dukai. ebe ke ya habaš ya soṛtá is-nala marái, habaš kuvai ke: tu dukyo? ran keyo ke: me ṇa-dukyo, turo hat dukyo.

(35) pâčâ-ta taqat na-dikyo. (36) paṭya (pača)-pare dekyo. ki gurji kalui. (37) bismilla karke varyo. (38) varti sari darav habaš-

[1] В произношении Амур. звук č час о слышится как ť', ťy

ko yakka-se-ta puguryo. (39) duyin čang-a hogiyo. (40) inya ran uṭi, habaš uṭyo, pāčā-nala čang-a hogiyo. (41) ya gurji dekyo, ke mire sinya-ta habaš ma(r?) sataj. (42) gurji račyo, habaš-ko xayo dan-nala puguryo. (43) gurji kisatyo, is-ki xayo putkę, baga satye. (44) ya habaš mar giyo. (45) ya pāčā gurji-ta dasmal karyo, iz-na gurji-na mala maloyo.

(46) ya ran darav Badal-para čaryo. (47) ta ya pāčā barā lakr'yo, ran ni. (48) fer ya korre-para čaryo, ya gurji-ta hek-a-pere lineo, ran-pača lakr'yo... (49) fer kar-a-pare ayo, utaryo. (50) korre-ta fer kaniz-ta dine(y)o.

(51) ya kar-a-pare fer ayó, dekaj, ke ran lef-ma paṛi. (52) izne kęyo ke: ran, tu kúr-i? (53) — muro lak dukaj. (54) pāčā-ne kęyo ke: habaš kúr-i? (55) ran-na kęyo ke: habaš kĭ(n)? me nipešantu habaš-ta. (56) pāčā-na kęyo ke: tu mangar-pre-ta mare lab-a paṇi ya tu čadar, ya kĭ(n)ya saryó? o habaš ta-ta ke maryo, o čadar-turo ũ(n)ya ya sar'yo — ya turo nišan-i.

(57) pāčā-na kęyo ke: tu korro lũ(n)vaj ya ke kamčin? (58) ran kęyo ke: me korre-ta lũ(n)vaj. (59) do aiṛir kadyo, dum-i-se ran-ta bandiyo, yila karyo. (60) inya mar, unya mari (61) ran mar gi. (62) tamam.

(کہانی - ۳)

چونی چو۔ یک پاچا چو۔ یک رَن تَرا چو۔ یا رَن بکر مانا چھو۔۔
دو۔۔۔ کوڑو سو چھو۔ یکے سے کے نا بادل۔ یکے سے کے ناوا۔
یک دن کو دن اویو پاچا شکار مالکڑے۔ ران اس کی رنی سی
ـ حبش تلا ساز اودے۔ اُنتی کہ پاچا آدے یا رن چار چپاتی
ـے۔ اُس تا لکاپرے بندانے۔ اوچپاتی سک جو واتی۔ اِگی لنتر
ـی۔ او چپاتی ترکس کرائی۔ یا پاچا پُچھنا کرائی کہ: یے۔ رُن۔
؟ کینے؟ یا کوئی کہ: موروک ڈکی۔ یا پاچا زق جوئی۔

(کہانی - ۳)

تھا نہیں تھا۔ ایک بادشاہ تھا۔ اس کی ایک بیوی تھی (لفظی ترجمہ: ایک بیوی رکھتا تھا)۔ اس بیوی کو (وہ) بہت چاہتا تھا۔ (بادشاہ کے پاس)... دو... گھوڑے تھے (نامکمل جملہ)۔ ایک کا نام بادل تھا، دوسرے کا نام ہوا تھا۔ ایک دن بادشاہ شکار کو نکلتا ہے۔ (اس دوران) اس کی یہ بیوی ایک حبشی کے ساتھ یارانہ کرلیتی ہے۔ جب بادشاہ آتا ہے یہ بیوی چار چپاتیاں پکاتی ہے، انھیں اپنی کمر پر باندھ لیتی ہے۔ یہ چپاتیاں سوکھ جاتی ہیں۔ (جب وہ) ہلتی جلتی ہے، وہ چپاتیاں چرچراتی ہیں۔ بادشاہ پوچھتا ہے: "اے بیوی، تجھے کیا ہوا؟ وہ کہتی ہے کہ: میری کمر دکھ رہی ہے۔ بادشاہ رنجیدہ ہوا۔

●

اس کی بھتا کیتو وخ لنگائی۔ یا پاچا کے ین آوتی۔ یا رَن
ـپے تا بی کرائی، دیکی کہ پاچا سو گیو۔ یا استا کرائی، کنیز تا کے
ـر: کوڑے تا زین کر! یا راتا کوڑے پیرا چڑائی۔ فیر یا رن بے
ائی۔ یک وخت اودے، پاڑا جودے۔ اُنیا یا اُتیرے۔ یک

●

اس بیچ کچھ وقت گزرتا ہے۔ بادشاہ کو نیند آجاتی ہے۔ یہ بیوی سر اٹھاتی ہے، دیکھتی ہے کہ بادشاہ سو گیا۔ وہ آہستہ سے (اٹھتی ہے)، کنیز سے کہتی ہے کہ: "گھوڑے پر زین کس!" وہ رات کو گھوڑے پر چڑھتی ہے۔ پھر یہ بیوی (گھوڑا)

غارما ورسے، کہ دیکھے، کہ یک حبش اُنیا بیٹے تی۔

سرپٹ دوڑاتی ہے۔ کچھ وقت گزرتا ہے۔ (بیوی) پہاڑ کو جاتی ہے۔ وہاں وہ اترتی ہے۔ ایک غار میں داخل ہوتی ہے، دیکھتی ہے کہ وہاں ایک حبشی بیٹھا ہے۔

●

فیر پاچان بشتا اُٹو۔ پاچانا دیکیو: رن نی۔ پاچا اُٹو۔ ڈوریو کنیز کُلا: تو دیک، دُن کوڑو چھے؟ کنیز ایو، پاچاتے کے یو: یک کوڑونی، بادل نی۔ پاچا کے یو: واتاژین کر! پاچا لکیریو اُس کے پچا۔ پاچا کے پچا لکیریو گرجی۔ ہاہاہا۔ یاہے اُسے ترا پچا ہیو اس کے پچا کلو گیو۔ تی ین کلیو کہ رَنی سی اُنیا۔

پھر بادشاہ جاگا / نیند سے اٹھا /۔ بادشاہ نے دیکھا۔ بیوی نہیں ہے۔ بادشاہ اٹھا، کنیز کی طرف دوڑا: "تو دیکھ، دونوں گھوڑے (جگہ پر) ہیں؟ کنیز آئی، بادشاہ سے کہا: ایک گھوڑ نہیں ہے، بادل نہیں ہے۔ بادشاہ نے کہا "ہوا پر زین کس!" بادشاہ اس کے (یعنی بیوی کے) پیچھے (یعنی تعاقب میں) نکلا۔ بادشاہ کے پیچھے گرجی (شکاری کُتا) نکلا ہا، ہا، ہا (یعنی دوڑتا ہے، سانس لیتا ہے)۔ یہ بھی اسی جگا دروازے کے پیچھے (یعنی غار کے منہ پر) اس کے (یعنی بادشا کے) پیچھے کھڑا ہو گیا۔ (متن یہاں پوری طرح واضح نہیں ہے مصنفِ کتاب)۔ (بادشاہ نے) دیکھا کہ اس کی بیوی وہاں ہے۔

●

حبش یا دو دَن اگ نلا پرے رن تا حبش نا مَرلو۔ اس حبش رن تا: دُکیو؟ رن نا کیو کہ: قربان ترے جان سے۔ سے نہ دُکیو، ترُو ہت دُک گیو۔

پاچا نا کیو کہ: یا توبہ، سے اس تاکندا کندولت دودا چو، اس تے یک میتر کُر پچا پرا ستا چو، اُس ماہے رن کو دا چو کہ: مُرو لک دُکئی، یے ہے کہ یا حبش یا سوڑٹا اس نلا مرائی، حبش کو دئی کہ: تو دُکیو؟ رَن کیو کہ: سے نہ دُکیو، ترُو ہت دُکیو۔

اس حبشی نے دو بار (؟) (بادشاہ کی) بیوی کو تپائے ہوئے (لفظ بہ لفظ ترجمہ: آگ سے بھرے) ڈنڈے (چھڑ) سے مارا۔ حبشی نے (بادشاہ کی) بیوی سے (پوچھا): "دکھ رہ ہے؟" (بادشاہ کی) بیوی نے کہا: "میں تیرے قربان جاؤں مجھ کو تکلیف نہیں ہو رہی ہے، تیرا ہاتھ (البتہ) دکھنے لگا۔

بادشاہ نے کہا کہ: "ارے توبہ، میں اسے (طرح طرح کی) مٹھائیاں دیتا تھا، اسے ایک میٹر (موٹی) توشک پر لٹاتا تھا اور تب (بھی یہ) عورت کہتی تھی کہ: "میری کمر دکھتی ہے" اور اب کہ یہ حبشی اسے اس طرح اس سونٹے سے مارتا ہے اور (جب) یہ حبشی پوچھتا ہے کہ: دکھ رہا ہے؟" (اس) عورت نے کہا کہ: "مجھے درد نہیں ہو رہا ہے، تیرا ہاتھ دکھ رہا ہے۔"

پاچا تا طاقت نہ دنیو۔ پچا پرے دیکھیو کہ گُرجی کلوتی ۔ بسملا کے وریو۔ ورتی سَری دَرَو حبش کو یکاّ سے تا گُگریو۔ ڈوین چَنگا لیو۔
اُنیارَن آئی ۔ حبش اُٹیو ۔ پاچا نَلا چَنگا ہوگیو ۔ یا گُرجی دیکھیو کہ ے بِنیا تا حبش مرستے ۔ گُرجی رَچیو ۔ حبش کو بَیو دَن نلا گُگریو ۔ ں کسیٹیو ۔ اُس کی بَیوہُٹ کے ۔ بکاستیو ۔ یا حبش مَرگیو ۔ یا پاچا ں تا دَس کَل کریو ۔ ازنا گُرجی تا مَلا لویو ۔

بادشاہ میں برداشت کی طاقت نہ رہی ۔ پیچھے مڑ کے دیکھا کہ گُرجی (شکاری کُتّا) کھڑا ہے ۔ بسم اللہ کہہ کے (غار میں) داخل ہوا ۔ داخل ہوتے ہی فوراً حبشی کا گریبان پکڑا ۔ دونوں گتھ گئے (یہ جنگ ہوئے) ۔ یہاں (بادشاہ کی) بیوی اٹھی ۔ حبشی اٹھا ۔ بادشاہ سے یہ جنگ ہوئے ۔ اس گُرجی (شکاری کُتّے) نے دیکھا کہ میرے مالک کو حبشی مار ڈالے گا ۔ گُرجی (شکاری کُتّا) جھپٹا ۔ حبشی کے فوطے دانتوں سے پکڑے ۔ گُرجی (شکاری کُتّے) نے گھسیٹا ۔ اس کے فوطے نوچ کر پھینک دیے ۔ یہ حبشی مرگیا ۔ بادشاہ نے گُرجی (شکاری کتّے) کو سہلایا (دست مال کیا) اس پر ہاتھ پھیرا (اس کو مَلا) ۔

یا رَن دَرَو بادل پَرا چَریو ۔ تایا پاچا بَرا لکریو ۔ رَن نی ۔ فیریا سے پرا چَریو ۔ یا گُرجی تا ہیکا پیرے بِلنے او ۔ رن پچا لکریو ۔ فیر پیرے الیو ۔ اُتیریو ۔ کوڑّے تا فیر کنیز تا دِنے یو ۔
یا کرا پیرے فیر اَیو ۔ دیکائے کہ رَن لیف ما پڑی ۔ اُزنے کے ۔ رن ۔ تو کوری ؟ " مورو لک ڈُکے ۔ پاچانا کے یو کہ : حبش ں ؟ رن نا کے یو کہ : حبش کیں ؟ سے نی پیشنو حبش تا ۔ نا کے یو کہ : تو منگر پرے تا میرنے لبا پٹر ! یا تو چادر ۔ یا کیں مریو ؟ او حبش تا تا کہ مَریو ۔ او چادر تو رو اُوں یا یا سریو ۔ یا تو رو تا ای ۔

(ادھر اس کی) یہ بیوی فوراً بادل پر سوار ہوئی/چڑھی/۔ جب یہ بادشاہ باہر نکلا (دیکھا کہ) بیوی نہیں ہے ۔ پھر وہ گھوڑے پر سوار ہوا / چڑھا / ۔ اس گرجی (شکاری کتّے) کو آگے لیا (یعنی آگے چھوڑا) ۔ بیوی کے پیچھے نکلا ۔ ۔ ۔ پھر گھر پر آیا ۔ اُترا ۔ گھوڑے کو پھر کنیز کو دیا (کنیز کے حوالے کیا) ۔
پھر وہ گھر میں داخل ہوا ۔ دیکھا کہ بیوی لحاف میں پڑی ہے ۔ (لحاف اوڑھ کر لیٹی ہے) ۔ اس نے پوچھا کہ : " بیوی تو کیسی ہے ؟ (تیری طبیعت کیسی ہے ؟) ۔ " میری کمر دکھتی ہے ۔" بادشاہ نے پوچھا کہ : " حبشی کیسا ہے ؟ (حبشی کی طبیعت کیسی ہے ؟) ۔ بیوی نے کہا کہ : حبشی کہاں ؟ (یعنی حبشی کون ؟) میں حبشی کو نہیں پہچانتی (نہیں جانتی) ۔ بادشاہ نے کہا کہ : تو میری طرف پیٹھ پھیر ! یہ تیری چادر ہے : یہ کہاں جلی ؟ جب اس حبشی نے تجھے مارا ۔ تبھی تیری یہ چادر جلی ۔ یہ تیری نشانی ہے (یعنی یہ اس کا ثبوت ہے) ۔

پاچانا کے یو کہ : تو کوڑّو لون دَتی یا کہ کم چَن ؟ رَن کے یو

بادشاہ نے کہا کہ : " تو گھوڑا لے گی یا قیچی ؟ " بیوی نے

کہ : سے کوڑے تاول ذتی۔ دوا سے پرکدیو۔ ڈی سے زن تا بندیو۔ پیا کریو۔ اتیا مار۔ اُتیا مار : زن مرگی۔ تمام۔

○●○

کہا کہ : میں گھوڑا لوں گی۔ دو گھوڑے نکالے، بیوی کو ان دُموں سے باندھا، (گھوڑوں کو بے لگام) چھوڑ دیا۔ اِدھر اُدھر مار : بیوی مرگئی۔ تمام (تمام شد)

○●○

حلِ لغات

(نوٹ : قارئین سے گزارش ہے کہ اس سے قبل کی کہانیوں کے ذیل میں دیے گئے حلِ لغات کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔)

چونی چو / چھونی چھو : تھا، نہیں تھا۔ بے پوزی : چھو (اسی مفہوم میں) نیز گجراتی وغیرہ۔ پاچا : بادشاہ۔ تاجک : پادشاہ، کابلی پاچا، ہندستانی : بادشاہ۔ زن : بیوی۔ پنجابی : زنّ، لہندا : زن، زنّ۔ ترنو : رکھنا، دھرنا، ڈالنا، آگے بڑھانا۔ بکر : خوب صورت، اچھا، خوش گوار، مناسب، مزے دار، خوش ذائقہ۔ فارسی، ہندستانی : بہ کار۔ بکرمانو : محبت کرنا، پسند کرنا۔ منّو : ماننا۔ ہندستانی : ماننا، پنجابی : منّنا، لہندا منّنڑ وغیرہ۔ سنسکرت : مانَن۔ کوڑو / کوڑو : گھوڑا۔ سندھی : گھوڑو۔ گجراتی : گھوڑو۔ سنسکرت : گھوٹک۔ نا : نام تاجک، فارسی، ہندستانی : نام، ناؤں پنجابی، لہندا : ناں۔ سنسکرت : نامَن۔ بادل : بادل (یہاں گھوڑے کا نام)۔ ہندستانی، نیپالی بادل۔ پنجابی : بدّل۔ سندھی : بادلو۔ گجراتی : وادل۔ سنسکرت : وارد۔ واردلا : برسات کا دن۔ وا : ہوا (یہاں گھوڑے کا نام) ہندستانی : باؤ۔ پنجابی : وا، واؤ۔ لہندا، گجراتی : وا۔ سندھی : واؤ وغیرہ۔ سنسکرت : وایو۔ عربی : ہوا۔ دن / دن۔ ہندستانی، پنجابی وغیرہ دن۔ سنسکرت : دن۔ ایک دن کو دنویو : دنوں میں ایک دن، ایک دن، ایک دفعہ۔ شکار / شِکر : شکار۔ ہندستانی، تاجک۔ شکار۔ لکر نکلنا، جانا۔ حبش : حبشی، کالا آدمی۔ ازبکی : حبش۔ ہندستانی، تاجک، عربی : حبشی۔ ساز / سز : انتظام، بندوبست، سازش۔ تاجک ساز۔ سازانو : یارانہ کرلینا۔ اُتی کہ : جب۔ چپاتی / چُپتی : چپاتی۔ تاجک، ہندستانی : چپاتی۔ لک : کمر۔ پنجابی، لہندا : لک۔ سنسکرت : لَگ۔ بندنو / باندنو / بنّو : باندھنا۔ ہندستانی : باندھنا۔ پنجابی : بنّھنا۔ سُکنٹرد / سُکھنٹر : سوکھنا۔ ہندستانی : سوکھنا۔ پنجابی : سُکنّا۔ لہندا سُکنّٹر۔ سنسکرت : شُشک۔ فُنتر ہرنو : کروٹ بدلنا (؟) ہلنا جلنا (؟)۔ ترکس کرنو : پُرمُر کرنا، پرپرانا۔ تاجک : ترکاس۔ پشنا : سوال۔ سنسکرت : پرشن۔ پشنا کرنو : پوچھنا سوال کرنا۔ ڈُکنٹرد / ڈُکھنٹرد : ڈُکھنا۔ ہندستانی : ڈُکھنا۔ پنجابی : ڈُکھنّا۔ لہندا : ڈُکھنٹر۔ زِق : رنجیدہ، پریشان، اداس۔ تاجک : زِق، زِق شُدن۔ ہندستانی : دق۔ بِشنا : بیچ۔ اِس کی بِشتا : اس بیچ۔ دخ / وخت : وقت۔ لنگنو / لنگنٹرد : گزرنا۔ نِتند : نیند۔ ہندستانی، پنجابی : نیند۔ لہندا : نِتند۔ کھاؤنی : نیند۔ سنسکرت : نِدرا۔ کلو : سر۔ تاجک، ازبکی، فارسی : کلا۔ بی / بِگ / رِجک اوپر۔ بی کرنو : اوپر اٹھانا۔ اُستا / اُستا اُستا : آہستہ سے، چپکے سے۔ تاجک، ہندستانی : آہستہ۔ کنیز : نوکرانی، کنیز۔ تاجک، ازبکی ہندستانی : کنیز۔ کِنٹرد : کھنا۔ ہندستانی : کھنا۔ پنجابی : کھیٹرا۔

زِن : زین۔ تاجک، ہندستانی : زین۔ زِن کرنو : زین کسنا۔ تاجک : زین کردن۔ رات / رَ : رات، شام۔ ہندستانی، پنجابی، لہندا : رات۔ سنسکرت : راتری۔ راتا : رات کو۔ چَرنو / چَڑنو : چڑھنا، سوار ہونا۔ ہندستانی : چڑھ پنجابی : چڑھنّا۔ لہندا : چڑھنٹر۔ بے کرنو : سرپٹ دوڑانا (گھوڑے کو)، (موٹر کار) چلانا، نکال باہر کرنا، ہانکنا، ہٹانا، مل چا

تاجک ؛ بے کردن ۔ آنٹرو / اونٹرو ؛ آنا ۔ ہندستانی ؛ آنا پنجابی ؛ آونٹرا ۔ لسندا ؛ آونٹر ۔ پڑ / پاڑ ؛ پہاڑ ۔ ہندستانی ۔ پنجابی ۔ لسندا ؛ پہاڑ ۔
جٹرو ؛ جانا ۔ ہندستانی ؛ جانا ۔ پنجابی ؛ جانٹرا ۔ اُترنو / اُترنو / اُترنو / اُترنو ؛ اُترنا ۔ ہندستانی ؛ اُترنا ۔ پنجابی ؛ اُترنٹرا ۔ غار / غر ؛ غار ۔ ہندستانی ۔
تاجک ؛ غار ۔ وَرنو / وَڑنو ؛ گھسنا ۔ اندر جانا ، داخل ہونا ۔ ہندستانی ؛ بڑنا ۔ بیٹھو / بیٹھنو / بیرنو ؛ بیٹھنا ۔ ہندستانی ؛ بیٹھنا ۔ پنجابی ؛ بیٹھنٹرا ۔
۔ لسندا ؛ بے ہنٹر ۔ اُٹنو ؛ اُٹھنا ۔ ہندستانی ؛ اُٹھنا ۔ پنجابی ؛ اُٹھنٹرا ۔ لسندا ؛ اُٹھنٹر ۔ دُڑنو / دُڑنو ؛ دوڑنا ۔ ہندستانی ؛ دوڑنا ۔ پنجابی ؛ دوڑنٹرا ۔
لسندا ؛ دوڑنٹر ۔ دِن / دِوِین ؛ دونوں ۔ رِلکرنو / رِلکرنو / رِلکرنو ؛ مکلنا ۔ ہریانوی ۔ بھوج پوری ؛ رِلکرنا ۔ گرجی ؛ شکاری کُتا ۔ ہندستانی ؛ گرجی ۔
تاجک ۔ ازبکی ؛ گرجی ۔ گرگی ۔ ہاہا ؛ دوڑتے ہوئے کتے کے ہانپنے کی آواز کی نقل ۔ اُسے ترا (تمرا ؟) اُسس جگہ (؟) ۔ اُسی طرح (؟) ۔
پچا / پاپا ؛ پیچھے ۔ ہندستانی ؛ پیچھے ۔ پیچھا ۔ پنجابی ؛ پچھے ۔ لسندا ؛ پچھا ں ۔ رہیو / بے ہیو ؛ دروازہ ۔ کلنو / کتوکلو ہونو / کلو جانو ؛ کھڑا ہونا ۔
ہندستانی ۔ پنجابی ؛ کھڑا ۔ سندھی ؛ کھڑو ۔ وغیرہ ۔ تی ین / تیان ؛ دھیان ۔ سنسکرت ؛ دھیان ۔ تی ین / تیان کلنو ؛ نظر / نگاہ ڈالنا ۔ دیکھنا ،
غور سے دیکھنا ۔ دَن ؛ ڈنڈا ۔ سنسکرت ؛ دَنڈ ۔ آگ / آک / آک ؛ آگ ۔ ہندستانی ؛ آگ ۔ پنجابی آگ ۔ سنسکرت ؛ اگنی ۔ پراکرت
؛ اگی ۔ ٹرسے / پَر ؛ بھرا ہوا ۔ ہندستانی ۔ پنجابی ؛ بھر ۔ لسندا ؛ بھری مرنو ؛ مارنا ۔ ہندستانی ۔ پنجابی ؛ مارنا ۔ لسندا ؛ مارنٹر ۔ سنسکرت ؛ مارنٹر ۔

کُربن / کُربان ؛ قربان ۔ ہندستانی ۔ تاجک ۔ عربی ؛ قربان ۔
کُربن تیرسے جون سے ! ؛ قربان تیرے جاؤں میں ! ۔ توبہ / توبا ؛ توبہ ۔ ہندستانی ۔ تاجک ؛ توبہ ۔ کند / قند / کنت / کن ؛ قند ، شکر کے
ڈلے ۔ ہندستانی ۔ تاجک ؛ قند ۔ کندا کدولت ؛ مٹھائیاں ۔ دو ونٹرو / دینٹرو / دینو ؛ دینا ۔ ہندستانی ؛ دینا ۔ پنجابی ؛ دینٹرا ۔ لسندا ؛ دیونٹر ۔
میتر ؛ میٹر ۔ کُرپچا ؛ توشک ، گدا ۔ تاجک ، ازبکی ؛ کورپچا ۔ سٹنو / سٹنو / سَرٹنو ؛ ڈالنا ، لٹانا ۔ ہندستانی ؛ سادھنا ۔ پنجابی ؛ سادھنٹرا ۔ سوڑنا ؛
سوٹنا ، سونٹا ، ڈنڈا ۔ طاقت / تکت ؛ طاقت ۔ تکت / طاقت دینو ؛ برداشت کرنا (تاجک ؛ طاقت آور دن) ۔ طاقت / تکت نہ دینو ؛
برداشت نہ کرنا ۔ بسملا ؛ بسم اللہ ۔ بسملا کرنو ؛ بسم اللہ کہنا ۔ سری / سرے ؛ فوراً (؟) ۔ دَرَد ؛ فوراً ۔ تاجک ؛ دَرَد ۔ سری دَرَد ؛ فوراً (؟) ۔
یکا ؛ گریبان ، گلا ۔ ازبکی ؛ یوقا ۔ جنگ ؛ جنگ لڑائی ۔ جنگ ہونو / جنگا ہونو ؛ بہ جنگ ہونا لڑنا ، گتھ جانا ۔ اُٹنو / اُٹنو ؛ اُٹھنا ۔ ہندستانی ؛ اُٹھنا
۔ پنجابی ؛ اُٹھنٹرا ۔ لسندا ؛ اُٹھنٹر ۔ سنیا / سیں یا / سیا / سیَن ؛ مالک ۔ ہندستانی ؛ سائیں ۔ پنجابی ؛ سیاں ۔ رچنو ؛ چھپٹنا (؟) ۔ خیو ؛ فوطہ ۔
ہندستانی ۔ تاجک ؛ خایا ۔ دَن / دان / دَنت / دَند / دانت ؛ دانت ۔ ہندستانی ؛ دانت ۔ پنجابی ۔ لسندا ؛ دَند ۔ کسٹرو / کھسٹرو ؛ کھینچنا ۔
گھسیٹنا ۔ ہندستانی ؛ گھسیٹنا ، گھسٹنا ۔ پٹنو / پُٹنو ؛ پھوڑنا ، پھاڑنا ، توڑنا ، پھٹنا ، پھوٹنا ، ٹوٹنا ۔ ہندستانی پھوٹنا ۔ پنجابی ؛ پھٹنٹرا ۔ لسندا پھٹنٹر ۔
سنسکرت ؛ اسپھوٹ ۔ پٹ کے پکا ستیو ؛ پھاڑ کر / نوچ کر پھینک دیے ۔ دَس مَل کرنو ؛ سہلانا ۔ تاجک ؛ دست مال کردن ۔ ملنو ؛ ملنا ۔ ملنو
لولو ؛ ملنا ملانا ۔ پیٹنو / پیٹانو ؛ پہچاننا ، جاننا ۔ منگر ؛ پنجابی ؛ مگر ۔ بے پوری ۔ میواتی ؛ منگر ۔ پٹرنو ؛ مڑنا ، پھرنا ۔ چدر ؛ چادر ۔ ازبکی ؛
چدر ۔ تاجک ۔ ہندستانی چادر ۔ سَرنو / سَرنو ؛ جلنا ۔ کچن / قچن ؛ قچی ۔ تاجک ؛ قچن ۔ ہندستانی قچی ۔ اَسے خر ؛ گھوڑا ۔ بول چال کی تاجک ؛
اَسے خر ۔ کدنو ؛ نکالنا ، کاڑھنا ۔ ہندستانی ؛ کاڑھنا ۔ پنجابی ؛ کڈھنٹرا ۔ لسندا ؛ کڈھنٹر ۔ یلا کرلو / الا کرنو ؛ (بے لگام) ۔ چھوڑ دینا ۔ بول چال کی
تاجک ؛ یلا بہ معنی کھلا ، بے لگام ۔

○●○

پون ورما

ترجمہ: اسامہ فاروقی

کتاب: غالب، شخصیت اور عہد

باب پانچ: "زندگی کے آخری سال"

۱۸۵۹ء میں جب دلی بینک دوبارہ کھلا شہر اب بھی نہایت ٹوٹی پھوٹی حالت میں اور شہری پست ہمت تھے۔ تین سال بعد فوج جامع مسجد سے بے دخل کیے گئے اور اس میں نماز پھر سے پڑھی جانے لگی گو کہ ۱۸۵۷ء کے بعد املاک کے انقلابی تبادلے کے دوران لالہ چُنّا مل کی خریدی ہوئی فتح پوری مسجد ۱۸۷۷ء تک اس کی ذاتی ملکیت میں رہی۔ پھول والوں کی سیر کی ۱۸۶۰ء کے دہے میں تجدید ہوئی ۱۸۶۴ء میں دہلی کالج میں پڑھائی پھر شروع ہوئی اور ۱۸۶۷ء میں دلی نہر میں پانی پھر سے جاری ہوا۔ لیکن اس وقت جب کہ قدیم معمولات تذبذب کے ساتھ اپنا پرانا مقام دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش میں تھے نئے طور طریقوں کی تحکمانہ ترویج سے انھیں دھکا بھی مسلسل لگتا ہی رہتا تھا۔ پہلی ریل گاڑی ۱۸۶۷ء میں چھک چھک کرتی ہوئی شہر میں داخل ہوئی اور باشندگانِ شہر میں خاصی کھل بلی اور ان کے بڑے اچنبھے کا باعث ہوئی۔ ریل کی پٹری بچھانے اور دو نئی سایہ دار کشادہ سڑکوں کوئنس روڈ اور ہیملٹن روڈ کی تعمیر کے کام کی وجہ سے ۱۸۶۰ء کے دہے کے اواخر تک بھی انہدامی کارروائیاں وقفے وقفے سے جاری رہیں۔ جب کدالیں اور کلہاڑیاں تھوڑے سے وقت کے لیے رکتیں تو شہر میں سناٹا چھا جاتا، بہ قول غالب ایسا لگتا کہ دلی شہرِ خموشاں ہے۔ ماضی کے پاس پاس مستقبل اور نظامِ نو کی علامتیں ابھر کر سامنے آرہی تھیں۔ ریلوے اسٹیشن کے مقابل ٹاؤن ہال تعمیر ہوا اور اس میں ۱۸۶۳ء میں بلدی امور کی ذمہ دار شہر کی میونسپل کمیٹی کا افتتاح ہوا۔ فصیل بند شہر کے شمالی علاقے میں کشمیری دروازے کی طرف ایک ڈاک اور تار گھر اور ایک ڈاک بنگلہ تعمیر کیا گیا۔ چاندنی چوک میں انگریزوں کی مخصوص، پسندیدہ عمارت، گھنٹہ گھر کی تعمیر عمل آئی۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے لیے مخصوص طرز میں بنائی ہوئی نئی عمارتیں بقیہ شہر سے بے میل اور الگ نظر آتی تھیں۔ کشمیری دروازے کے اس طرف ۱۸۵۷ء کے قبل کے عہد سے تعلق رکھنے والی ابتدائی سیول لائن کی، انگریزوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے گنجائش فراہم کرنے کی غرض سے تیز رفتاری کے ساتھ توسیع کی جارہی تھی اور فصیلِ شہر اور پہاڑی سلسلے کے درمیان کے بیش تر منظر میں نوآبادیاتی طرز کے بنگلے اور نئی سڑکیں جا بجا نظر آتی تھیں۔

ان تبدیلیوں کے دوران پہلے ہی سے مصیبتوں کے نرغے میں گھرے دلی کے باشندوں پر تازہ مصیبتیں ٹوٹنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۶۰ء اور ۱۸۷۷ء شدید قحط کے سال تھے۔ زیادہ مال دار بیوپاریوں کی طرف سے بڑے پیمانے پر ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے اناج کی قلت اور بھی شدید ہو گئی۔ عام انہدامی کارروائیوں اور بہتر فوجی حکم رانی کے لیے شہر کو زیادہ دست رس پذیر بنانے میں انگریزوں کے انہماک کے نتیجے میں بنیادی بلدی نظام اور بالخصوص کنوؤں پر توجہ نہیں دی گئی تھی جس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ پینے کا پانی آلودہ ہو گیا تھا۔

ہر میں گندگی پھیل گئی تھی ۔ نتیجتاً دہلی کے لیے مخصوص پھوڑے اور ناقابلِ تشخیص بخار کی عام وبا کا دور دورہ ہوگیا اور مزید طرناک بات یہ کہ ہیضہ پھوٹ پڑا ، یعنی وہ بیماری جس کا اس سے پہلے دہلی میں نام و نشان تک نہ تھا ۔ غالب اس پہر سے نازل ہونے الی مصیبت کے عاجز آئے ہوئے شاہد عینی لیکن ہمیشہ کی طرح نہ تھکنے والے وقائع نگار بھی تھے ۔ ۱۸۶۰ء میں وہ دہلی کو یکے بعد دیگرے ارت کرنے والے پانچ لشکروں کا ذکر کرتے ہیں ۔ پہلے تو باغیوں کا لشکر تھا ، پھر انگریزوں کا ، اس کے بعد قحط ، ہیضہ کی وبا اور پھر آخر یں مگر موخر نہیں کسی غیر معمولی شدید بخار کی لہر جس کا زور کسی طرح ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا ۔ اشیائے مایحتاج کی شدید قلت ھی ۔ باجرہ روپیہ کا سولہ سیر اور ماش کی دال روپیہ کی آٹھ سیر بک رہی تھی ۔ غالب لکھتے ہیں کہ غلہ گراں ہے ، موت ارزاں ہے ۔ ۱۸۶۲ء یں حد سے زیادہ بارش کی وجہ سے بڑی تباہی آئی ۔ شہر کے حالات قابلِ افسوس تھے ۔ ہزاروں لوگ بے گھر ہوگئے تھے دوسرے عام ہنگامے کی وجہ سے اور انہدامی کارروائیوں کے اندیشے میں اپنے مکانات کی بروقت مرمت پر توجہ دینے سے قاصر رہے تھے اور ایسے بھی بہتیرے تھے جو حال میں پیسے پیسے کو محتاج ہوکر یہ کام کروانے کی استطاعت ہی نہیں رکھتے تھے ۔ اس وقت جب کہ نئی ، کشادہ اور سایہ دار سڑکیں زیرِ تعمیر تھیں اور ملکہ ، وکٹوریہ کے عہد کے لیے مخصوص طرز کی عالی شان عمارتیں بن رہی تھیں شہر میں روزانہ سینکڑوں گھر بیٹھے جارہے تھے ۔ جولائی ۱۸۶۲ء میں وہ اپنے شاگرد اور لوہارو والے رشتے دار علاء الدین خاں علائی کے نام خط میں لکھتے ہیں : "میاں ! بڑی مصیبت میں ہوں ۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں ۔ پاخانہ ڈھ گیا ۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں ۔ تمہاری پھوپھی کہتی ہیں ہائے دبی ، ہائے مری ۔ دیوان خانے کا حال محل سرا سے بھی بدتر ہے ۔ ۔ ۔ چھت چھلنی ہے ۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے ۔"

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

بہ قول غالب لگاتار شدید بارش کے باعث واقع ہونے والی طغیانی کی وجہ سے ہزاروں گھر ڈھ گئے اور ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں ۔ پہلے حط کی وجہ بارش کا فقدان تھا اور دوسرے قحط کی وجہ اس کا حد سے تجاوز ۔ اشیائے خوردنی کی قلت اور بیش تر لوگوں کا نادار ہوجانا نظم و ضبط کی نمایاں ابتری کا ایک سبب تھا ۔ انگریزوں نے کوچہ بندی کے قدیم طریقے کو ، جس کے لحاظ سے رات میں ایک محلے سے دوسرے محلے تک پہنچنے کا راستہ مقفل کردیا جاتا تھا ، غیر ضروری قرار دے کر ترک کردیا تھا ۔ شہر کے دروازے بھی قدیم عمل درآمد کے برخلاف اب رات میں ہمیشہ مقفل نہیں رکھے جاتے تھے اور بہ ہرحال ریل کی پٹری کی تعمیر کی وجہ سے شہر میں رسائی اب بہت آسان ہوگئی تھی ۔ قدیم چوکی داری کا طریقہ موقوف کردیا گیا تھا اور نئی پولیس کی جمعیت تعداد کے لحاظ سے کم زور بھی تھی اور ابھی ٹھیک سے قائم بھی نہیں ہو پائی تھی ۔ غالب لکھتے ہیں کہ ایک دن بھی ایسا نہیں گزرتا تھا جب نقب زنی کی متعدد وارداتوں کی اطلاع نہ ملے ۔ نھوں نے خود اپنے خرچے سے ایک چوکی دار مقرر کیا ۔

۱۸۵۷ء کے بعد "از سرِ نو تعمیر" کے برطانوی تصور کے مطابق بلدی امور کے انصرام میں صحیح سماجی پس منظر کے حامل ہندستانیوں کی ذیلی شرکائے کار کی حیثیت سے شرکت کی اجازت تھی ۔ بلدیہ اور جامع مسجد کمیٹی میں ہندستانیوں کو نمائندگی دی گئی تھی ۔ دہلی کے روایتی طبقہ ، امرا کے ارکان کو بالعموم اور بالخصوص ان کو جن کا تعلق مغلیہ دربار سے رہا تھا ، باہر رکھا گیا تھا ۔ قدیم طبقہ ، امرا کے وہ افراد جنھوں نے کسی نہ کسی طرح برائے نام کچھ اپنا اثر و رسوخ بنائے رکھا تھا ، غالب کے لوہارو والے رشتہ دار نواب ضیاء الدین جیسے لوگ تھے ۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے دوران اپنی وفاداری کی تشفی بخش شہادت فراہم کردی تھی اس لیے ان کی شرکت

وقتی مصلحت کے لحاظ سے مفید مطلب تھی۔ جامع مسجد کی انتظامی کمیٹی دس ارکان پر مشتمل تھی۔ غالب اس کی کارکردگی کا جائزہ ایک جملے میں لیتے ہیں: "مسجد جامع واگزاشت ہو گئی۔ چلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا ہے۔" (خط بہ نام مجروح ۱۹۰ / دسمبر ۱۸۶۲ء) بلدیہ میں نئے نئے بارسوخ، وفادارِ حکومت بیوپاری طبقے کے متمول نمائندوں کی قطعی اکثریت تھی۔ بیوپاریوں کے چار گھرانے، جنھوں نے غیر معمولی رسوخ پیدا کیا، حسب ذیل تھے: "سالگ رام اور گردھر لال گھرانے دونوں جین اور چناّلال، گڑوالا اور نہر والا گھرانے، جو سب کھتری تھے۔" میونسپل کمیشن نئے نئے تعمیر شدہ ٹاؤن ہال میں شائستگی کے ساتھ اپنا اجلاس منعقد کرتا۔ اس ٹاؤن ہال کے، عہدِ وکٹوریہ کے طرز میں تعمیر شدہ اگلے رخ کے پرے اور راہ میں حائل گھنٹہ گھر کے پیچھے، اس عہد کی یاد دہانی کی حیثیت سے جو کبھی تھا اور جو اب ہمیشہ کے لیے ختم ہوچکا، خاموش اور فوجیوں کی بارکوں سے ٹھساٹھس بھرا لال قلعہ دکھائی دیتا تھا۔ جب رنگون میں جلاوطنی کی حالت میں بہادر شاہ ظفر کی وفات کی خبر آئی غالب ایک دوست کو طنزیہ انداز میں مطلع کرتے ہیں: "۷ / نومبر، ۱۴ / جمادی الاول سالِ حال (۱۲۷۹ء ہجری / ۱۸۶۲ء عیسوی) جمعہ کے دن ابو المظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ اور قیدِ جسم سے آزاد ہوگئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔" (خط بہ نام مجروح ۱۹۰ / دسمبر ۱۸۶۲ء) ۔ لیکن اس زمانے میں لکھے ہوئے خطوط کے متفرق ٹکڑوں سے ہمیں حق تلفی کے مسلسل احساس اور دبے ہوئے جذبات کی سطح کے نیچے کی چوٹ کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔ اگر کوئی ایسا خیال ظاہر کرے کہ دلی کے حالات پھر سے معمول پر آگئے ہوں گے تو وہ بے حد خفا ہوتے ہیں۔ ۱۸۵۸ء ہی میں ایسا سوچنے پر وہ تفتہ کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں: "مرزا تم بڑے درد ہو۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں صحاف اور نقاش کہاں؟" ۱۸۶۳ء میں وہ ایک اور دوست کی خبر لیتے ہیں: "خداوند، کیا تم دلی کو آباد اور قلعے کو معمور اور سلطنت کو بہ دستور سمجھے ہوئے ہو؟ ۔ ۔ ۔ "این دفتر را گاو خورد، گاو را قصاب برد و قصاب در راہ مرد۔" بادشاہ (ظفر) کے دم تک یہ باتیں تھیں۔" (خط بہ نام احمد حسن مودودی، یکم ستمبر ۱۸۶۳ء) ۔

بادشاہ کی فرماں روائی اب نہیں رہی تھی۔ دربار ہمیشہ کے لیے برخواست ہوچکا تھا۔ نظامِ کہن کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ غالب کے لیے عملی سطح پر اگر کچھ برقرار تھا تو وہ تھی پہلے کی طرح اب بھی مالی امداد کی ان کی ضرورت۔ انگریزوں کے ہاں سے ملنے والی پنشن مئی ۱۸۵۷ء سے بند تھی۔ اس کے فقدان میں وہ مالی سہارے کے ایک ہی چوکھٹے، صاحبانِ تمول و اقتدار کی سرپرستی، سے واقف تھے، اس کے زمانے میں جس کا مطلب بیش تر شاہی سرپرستی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے پہلے ہی انھوں نے مہاراجہ جے پور اور نواب اودھ کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کی کوشش کی تھی۔ ایک تعلق جو اب بارآور ہوا وہ تھی رام پور کے حکم راں نواب یوسف علی خاں سے ان کی راہ و رسم۔ ۱۸۵۵ء میں غالب نے ان کی خدمت میں ایک فارسی قطعہ پیش کیا تھا جس کے جواب سے وہ محروم رہے تھے۔ تاہم ۱۸۵۷ء میں غالب کے دوست فضلِ حق نے، جو نواب سے قربت رکھتے تھے، ان کے حق میں سفارش کی۔ فضلِ حق کے صلاح دینے پر غالب نے فوراً نواب موصوف کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ اس بار تخم ریزی زرخیز زمین میں ہوئی: نواب رام پور نے غالب کو شاعری میں اپنا استاد مان لیا اور اصلاح کے لیے اپنے کلام کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً روپے پیسے بھی تحفے میں بھیجنے لگے۔ جولائی ۱۸۵۹ میں غالب کی درخواست پر انھوں نے شاعر کا باضابطہ اعزازیہ سو روپے ماہانہ مقرر کردیا۔ تعلق کی نشوونما کے لیے اس مالی انتظام نے صحیح چوکھٹے کا کام دیا۔ جنوری ۱۸۶۰ء میں نواب رام پور کی بار بار کی فرمائش کی تعمیل میں تین دہوں کے تقریباً مسلسل قیام کے بعد دلی چھوڑ کر عارف کے دو بیٹوں کی معیت میں غالب نے رام پور کا سفر کیا۔ ان کی رام پور میں اچھی پذیرائی ہوئی۔ نواب صاحب نے ان کی

پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ایک بڑا سا مکان ان کے تصرف میں دے دیا گیا اور روزانہ جاۓ قیام پر ان کے لیے کھانا بھجوانے کا اہتمام کیا گیا۔

غالب دو مہینے اور کچھ دن بعد دلی کو واپس لوٹے۔ واپسی کے فوری بعد (اپریل ۱۸۶۰ء میں) ان کی پنشن بحال ہو گئی۔ یہ امر تقریباً یقینی ہے کہ انگریزوں کے پاس نواب رام پور کے رسوخ سے اس فیصلے کے حصول میں مدد ملی ہوگی۔ رام پور سے لکھے ہوئے متعدد خطوط میں غالب اس مسئلے کے تعلق سے نواب صاحب کی شمال مغربی صوبے کے لفٹننٹ گورنر سے گفتگو کے امکان کا کنایۃً ذکر کرتے ہیں۔ غالب نے اپنی کوشش اسی تن دہی سے جاری رکھی تھی اور ایسے کچھ اشارے ملے تھے کہ انگریز نرم پڑ رہے ہیں۔ لفٹننٹ گورنر نے "دستنبو" کے موصول ہونے کی ایک حوصلہ افزا رسید بھیجی تھی۔ اسی لفٹننٹ گورنر کی شان میں لکھے ہوئے ایک قصیدے کی رسید ایک مراسلے کے ذریعے بھیجی گئی تھی جس میں غالب کو خاں صاحب کے لقب سے مخاطب کیا گیا تھا۔ پنجاب کے لفٹننٹ گورنر رابرٹ منٹگو مری نے بھی جس کے ہاں بہت موقع کا ایک مدحیہ قصیدہ غالب نے بھیجا تھا، جواب میں خط لکھ کر اپنی خوش نودی کا اظہار کیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا یہ ساری باتیں بے ارادہ نہیں تھیں۔ پنشن مئی ۱۸۵۷ء سے بقایے کی ادائگی کے ساتھ بحال کر دی گئی۔ اس وقت کے معیار کے لحاظ سے یہ ایک اچھی خاصی بڑی رقم تھی، لیکن ساہوکاروں کو ادائگی کے بعد اس میں سے کچھ بھی نہیں بچا۔ غالب کی سالانہ پنشن سات سو پچاس روپے تھی۔ تین سال کی بقایا رقم کل ملا کر دو ہزار دو سو پچاس روپے ہوئی۔ اس میں سے ایک سو روپے جو زرِ پیشگی کی مد میں منہا کیے گئے جو چند ماہ قبل غالب کو ادا کیا گیا تھا۔ مزید ڈیڑھ سو روپے متفرق واجبات (غالباً واجب الادا محاصل) کی مد میں منہا کیے گئے۔ اس طرح سے دو ہزار روپے بچے، جب کہ اس وقت غالب کے ذمے واجب الادا قرضوں کی کل رقم اس سے کچھ سو روپے زیادہ ہی تھی۔

۱۸۶۳ء میں گورنر جنرل کے دربار میں غالب کی خلعتِ فاخرہ اور اعزازی نشست بھی بحال ہو گئی۔ غالباً یہاں بھی نواب رام پور ہی کا وسیلہ کام آیا تھا اور بادی النظر میں ہدایات خود گورنر جنرل لارڈ ایلِ جن کے ہاں سے موصول ہوئی تھیں۔ یہ پیش رفت غالب کے لیے نہایت باعثِ طمانیت تھی۔ پنشن کی بحالی انگریزوں کے لطف و کرم کی تجدید پر دال تھی اور اس سے غالب کو اپنی سدا کی ڈانواڈول مالی حالت کو سدھارنے میں مدد ملی۔ لیکن دربار میں ان کے رتبے کی بحالی نے ایک فیصلہ کن نفسیاتی خلا کو پُر کرنے کا اہم کام انجام دیا۔ یہ بحالی سماجی نظامِ مراتب میں ان کے مقام کو پھر سے تسلیم کیے جانے پر دلالت کرتی تھی۔ ان کے اسی مقام کو مغل دربار نے تسلیم کیا تھا اور اسی کی بنا پر انگریزوں کے حضور میں بھی، خصوصاً اپنی پنشن کے تعلق سے طول طویل مقدمے کے دوران، انھوں نے پُر زور طریقے سے اپنے حقوق جتائے تھے۔ اب مغلیہ دربار کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت چند روزہ تھی اور اس سے وابستہ امیدوں پر پانی پھر چکا تھا۔ نئے نظامِ حل و عقد میں قدیم طبقۂ امرا کی اکثریت کے ساتھ غالب کو نظر انداز کیا گیا تھا اور ان کی خود داری کو صدمہ پہنچایا گیا تھا۔ ہندستان میں مسلّمہ اقتدارِ اعلیٰ کے حامل اب انگریز تھے۔ جب انگریزوں نے وہ رسمی اعزاز، جسے بلاشک و شبہ غالب اپنا حق مانتے تھے، انھیں دوبارہ عطا کرنے کا فیصلہ کیا تو غالب کی طرف سے اس کی قبولیت کو نظریاتی مصالحت پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو ان کے اپنے دعوے کی صحت کا ثبوت تھا۔ اس سے نہ صرف ان کی عزتِ نفس کی بحالی (گو کہ بلاشک و شبہ وہ اسے محض ایک علامتی کارروائی سمجھتے تھے) بلکہ ان کے ہم سروں کی نظر میں بھی استحقاق کے مطابق ان کے رتبے کی بحالی میں مدد ملی۔ بعض نقاد جدید قوم پرستانہ سیاق و سباق کو غالب کے زمانے پر منطبق کرنے کی غلطی کرتے ہیں تو دوسرے اپنے رتبے کو تسلیم کروانے کی ان کی مساعی کو بلالحاظ سیاق و سباق جانچنے پرکھنے کی غلطی کرتے ہیں۔ موخر الذکر رویے کی مثال حسب ذیل رباعی میں ملتی ہے۔ "غالب

،خود پسندی بعض اوقات مضحکہ خیز حد تک پہنچ جاتی تھی ۔ ان کے برابر شہرت اور خوبیوں کا حامل شاید ہی کوئی اور شاعر ہو ۔۔۔ جسے خطابوں ، اعزازات ، خلعتِ فاخرہ اور درباروں میں دعوت سے ایسی بچوں کی سی خوشی حاصل ہوتی رہی ہو یا جو خارجی دنیا سے اپنے روابط پر اتنا اتراتا رہا ہو ۔" اس سے انکار نہیں کہ غالب خطابوں اور خلعتِ فاخرہ سے مسرور ہوتے تھے ۔ لیکن وہ خطاب و خلعت کی مرحمت پر اپنی مسرت کو حق بہ جانب سمجھتے تھے اور آنے والی پیڑھیوں سے یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ وہ ان کے بارے میں آدابِ معاشرت کے کسی فوق انسانی ضابطے کی رو سے رائے قائم کریں گی ۔ ان معاملات کے تعلق سے ان کی مساعی محض اس بچے کی سی نہیں تھیں جو بے حقیقت کھلونوں کی نظر فریب خوش نمائی سے دھوکا کھاجاتا ہے ، بلکہ ان کی حیثیت اس آدمی کی محکم گیری کی سی ہے جو ایک فردِ بشر ہے اور جو اپنے زمانے کے سیاق و سباق میں بالکل بجاطور پر اپنے رتبے کو اس لائق سمجھتا ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے اور اس کی نفی کی صورت میں اس کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں بچتا جس سے وہ چپکا رہے ، نہ ہی انگریزوں کی طرف سے اس کے رتبے کو تسلیم کرلیے جانے پر وہ راتوں رات انگریزوں کی للو پتو کرنے والے کاسہ لیس میں تبدیل ہوجاتا ہے ۔ دہلی میں جو کچھ وقوع پذیر ہورہا تھا اس کے بارے میں ان کے ذاتی خیالات میں اور ان کی اس زمانے کی حسرت آمیز یاد میں جب بادشاہ کی حکم رانی تھی کوئی فرق نہیں آیا تھا ۔ اعزاز کی بحالی انگریزوں سے ان کی غیر متزلزل وفاداری کے ثبوت سے زیادہ ان کی گذشتہ بےوفائی کی انگریزوں کی طرف سے بادلِ ناخواستہ اور تاخیر سے دی جانے والی معافی کی حیثیت رکھتی تھی ۔ غالب ایک دفعہ گزرے ہوئے واقعے کا ذکر کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے کچھ ہی دنوں کے بعد لارڈ کیننگ کی خدمت میں انھوں نے جو قصیدہ بھیجا تھا وہ اس جواب کے ساتھ واپس کردیا گیا تھا تم غدر کے دنوں میں بادشاہ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں ۔ لیکن مستقل مزاجی کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا : کچھ عرصے کے بعد بھیجے ہوئے ایک اور قصیدے کی رسید حسبِ معمول قدیم گورنمنٹ کے چیف سکریٹری نے اپنے خط کے ذریعے ان کے پاس بھیجی ۔ اپنے رتبے کو انگریزوں سے تسلیم کروانے کا مطمحِ نظر غالب کے خیال میں مقصود بالذات تھا ۔ اس کے ذرائع حصول کے تعلق سے انھیں کبھی کوئی خوش فہمی نہیں رہی ۔ جولائی ۱۸۶۰ء میں مخصوص صاف دلی کے ساتھ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں : "گورنمنٹ کا بھاٹ تھا ، بھٹئی کرتا تھا ، خلعت پاتا تھا ۔" (خط بہ نام علائی) ۔

رام پور کے نواب یوسف علی خاں نے ۱۸۶۵ء میں راج پھوڑے کے عارضے میں انتقال کیا ۔ ۱۸۵۹ء سے لے کر ۱۸۶۵ء کے عرصے میں رام پور میں مقیم نہ ہوتے ہوئے بھی فی الواقع وہ نواب موصوف کے درباری شاعر کے فرائض انجام دیتے تھے ۔ نواب اپنا کلام پابندی سے ان کے ہاں بہ غرض اصلاح بھیجتے اور غالب اس پر مستعدی سے اپنی توجہ مبذول کرتے ۔ ایک اعتبار سے شاہی سرپرست اور درباری شاعر کے جانے بوجھے چوکھٹے کو برقرار رکھتے ہوئے دربارِ رام پور نے دربارِ دہلی کی جگہ لے لی تھی ۔ سو روپے جو نواب ماہ بہ ماہ بھیجتے غالب کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے ۔ انگریزوں کی طرف سے ملنے والی باسٹھ روپے آٹھ آنے ماہانہ کی پنشن ان کے طرزِ زندگی کے لیے کبھی بھی کافی نہیں رہی ۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی انھوں نے دوسرے ذرائع آمدنی سے اس میں اضافے کی کوشش کی تھی ۔ قیمتوں میں ہر طرف اضافے کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی پنشن بری طرح سے ناکافی ہوگئی تھی ۔ باقر علی اور حسین علی ، دونوں لڑکے ، سنِ بلوغ کو پہنچ چکے تھے ۔ باقر علی کی فی الحقیقت شادی بھی ہوچکی تھی اور گو کہ بعد میں انھیں الور میں منفعت بخش نوکری مل گئی ، ابتداءً ان کی اور ان کے گھر والوں کی کفالت غالب کو کرنی پڑتی تھی ۔ رام پور سے ملنے والا وظیفہ بھی درحقیقت ان کے اخراجات کی بھرپائی کے لیے کافی نہیں تھا ۔ (جیسا کہ غالب شکایت کرتے ہیں طرح طرح کے اخراجات تھے جن کو پورا کرنا ضروری تھا ، انکم ٹیکس ، چوکی دار کی

تنخواہ، ملازمین کا مشاہرہ، اصل کی ادائگی اور پھر سود کی ادائگی)۔

ان حالات میں انھیں رام پور پر اپنے کلی مالی انحصار کا بہ خوبی احساس تھا۔ اس زمانے کے ایک خط میں وہ عالمِ ناداری میں آزادانہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں، لیکن یہ محض ان کی خوش فہمی تھی۔ علاوہ اپنے اخراجات کم کرنے سے قاصر تھے اور اپنی زندگی کے اس آخری مرحلے میں اپنے طرزِ زندگی کو بدلنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ لکھتے ہیں: " میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔" (خط بہ نام علائی) انصاف کی بات یہ ہے کہ ایک دفعہ ۱۸۶۲ء میں جب حالات بہت ہی زیادہ تکلیف دہ ہوگئے انھوں نے اپنی عادتیں بدلنے کی کوشش ضرور کی۔ انھوں نے اپنی صبح کی شراب نوشی ترک کردی، گوشت کی خوراک آدھی کردی اور اپنی قوتِ ارادی کا حیرت انگیز مظاہرہ کرتے ہوئے عمر بھر کا اپنا بلا ناغہ ہر رات کا شراب و گلاب راتب بھی موقوف کردیا۔ ان کے اس مظاہرے سے ان سے زیادہ ان کے دوست احباب کو حیرت ہوئی۔ تاہم ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہِ مقرری کے اور روپیہ آگیا۔ قرض کی نہایت ضروری قسطیں کسی نہ کسی طرح ادا کردی گئیں، راحت کے احساس کے ساتھ پرانا معمول پھر شروع کردیا گیا اور زندگی پھر ہمیشہ کی طرح بسر ہونے لگی۔

اس امر کی شہادت ہے کہ غالب کی اپنے مقررہ وظیفے کے علاوہ مالی امداد کی بار بار کی درخواستوں پر نواب یوسف علی خاں کا ردِ عمل کافی ہم دردانہ ہوا کرتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے حقیقی احترام کا جذبہ رکھتے تھے۔ لیکن، بہادر شاہ ظفر سے تعلق کی طرح نواب موصوف سے غالب کا تعلق بھی کبھی کبھی غیر اطمینان بخش ہو ہی جاتا تھا۔ محسن و احسان مند کے اس رابطے میں غالب خود کو شریک کم زور ماننے کے لیے تیار تھے لیکن ان کی زودرنج انا اور شخصیت کا ادعا اس کم زوری کو قابلِ نفرت یا بے زبان کاسہ لیسی سے تعبیر کیے جانے پر جزبز ہوتا تھا۔ موقع پر وہ ناپ تول کر ٹھیک اس درجے کے لاابالی پن اور بے باکی کا مظاہرہ کرسکتے تھے جو ان کے رول کی ملتجی سے تقریباً ہم سر میں تقلیب کرسکے۔ ۱۸۶۱ء میں نواب موصوف اپنے منجھلے بیٹے کی شادی کا جشن بڑے تزک و احتشام سے منا رہے تھے۔ غالب شریک نہ ہوسکے لیکن معمول کے مطابق ایسے موقعوں پر تقسیم کی جانے والی خلعت فاخرہ، اشیائے خوردنی کے خوان اور تحائف کی بہ جائے انھیں ایک سو پچیس روپے ملے۔ غالب نے جواب میں نواب صاحب کو شکریے کا خط لکھا۔ انھوں نے لکھا کہ یہ رقم ضیافت اور خلعت کے عوض میں انھیں دی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مذاق میں پوچھا کہ چوں کہ میں بھوکوں مر رہا ہوں، اگر یہ سارے روپے اپنی خوراک پر خرچ کردوں تو کیا اس پر بھی خلعت کی رقم نواب صاحب پر واجب الادا رہے گی؟ غالب جانتے تھے کہ ان کا مالی انحصار ایسا ہے کہ وہ اپنے محسن کو ناراض و برگشتہ کرنے کے موقف میں بالکل نہیں تھے، لیکن سبکی کے ہر شائبے کے تعلق سے ان کی زود حسی ان کے لیے اس ادراک سے پوری طرح مطابقت میں عمل پیرا ہونا ہمیشہ مشکل بنادیتی تھی۔ ۱۸۶۱ء میں ان کے تعلقات میں تناؤ اس وقت نمایاں ہوا جب ملازمت کی ان دو سفارشوں کو نواب صاحب نے نظر انداز کردیا جو غالب نے ان کے دربار میں بھیجی تھیں۔ غالب نے ایک وضاحتی مکتوب کے ذریعے غلط فہمی کو کسی طرح دور کیا تاہم اپنی یہ رائے وثوق کے ساتھ دہرائی کہ دونوں ہی اشخاص جن کی انھوں نے سفارش کی تھی لائق اور ہوش مند ہیں۔ اسی زمانے میں ایک دوست کے نام لکھے ہوئے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب کے طریقِ عمل سے ان کو واقعی صدمہ پہنچا تھا۔ ان واقعات سے قطعِ نظر کریں تو ماننا پڑتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں غالب کے سِن و سال اور بہ حیثیت شاعر ان کی شہرت کا کما حقہٗ احترام مدِ نظر رکھتے تھے اور خود غالب اُن کے لیے ان کی عزت کرتے تھے۔

ان کے انتقال کے بعد کلب علی خاں یوسف علی خاں کے جانشین ہوئے ۔ ان کی مسند نشینی کے موقع پر غالب نے رام پور کا پھر ایک بار سفر کیا ۔ نواب کی طرف سے دعوت کے علاوہ اس تقریب میں ان کی شرکت کی دو اور وجوہ تحریک بھی تھیں ۔ اولاً وہ اس بات کو پکا کر لینے کے سخت آرزو مند تھے کہ نئے نواب ماہانہ سو روپے بھیجنے کا اپنے باپ کا معمول جاری رکھیں ۔ ثانیاً وہ پُر امید تھے کہ مسند نشینی کے موقع پر نواب دستور کے مطابق انھیں مناسب تحفے سے نوازیں گے ۔ کلب علی خاں نے غالب کے ساتھ اگر خصوصی گرم جوشی کا نہیں تو عزت و احترام کا سلوک ضرور کیا ۔ ماہانہ وظیفے کا معمول بھی انھوں نے جاری رکھا ۔ وقتِ رخصت انھوں نے غالب کو علی الحساب ایک ہزار دو سو روپے کی رقم مرحمت فرمائی ۔ رقم اچھی خاصی تھی لیکن غالب کو کسی قدر مایوسی ہوئی ۔ بہ ظاہر نواب صاحب نے ان لوگوں کو انعام و اکرام میں زیادہ بڑی رقم عطا کی تھی جو غالب کے خیال میں ان کے جود و کرم کے نسبتاً کم حق دار تھے ۔ نواب صاحب نے بڑی حد تک مقررہ وظیفے کے علاوہ رقوم کے عطیے کی غالب کی درخواستوں کو ماننے کا دستور بھی موقوف کردیا ۔ یوسف علی خاں مرحوم اور غالب کے مابین ہم عصری اور ادبی مطابقت زیادہ تھی جب کہ کلب علی خاں شاعری کم ہی کرتے تھے۔ اور بیش تر غالب سے اپنی فارسی نثر کے بارے میں صلاح مشورہ کرتے تھے ۔ رام پور پر غالب کا مالی انحصار اب کچھ بڑھ ہی گیا تھا ۔ وہ اس امر سے بھی پوری طرح واقف تھے کہ وہ نئے نواب سے ان کے باپ کی سی داد و دہش کی توقع نہیں رکھ سکتے ۔ لیکن عادت کے مطابق ، اپنی مالی مجبوری کے باوجود ، وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کے رجحانِ طبع کو دبا نہیں پاتے تھے ۔ تعلقات میں خاصی کشیدگی اس وقت پیدا ہوئی جب غالب نے ایسی فارسی بندشوں کے بارے میں نواب کے خیالات کو ، جو فارسی میں لکھنے والے ہندوستانی ادیبوں کے ہاں تو مستعمل ہیں لیکن جنھیں ایران کے مستند ادیبوں نے نامقبول قرار دیا ہے ، کسی قدر اکھڑ پن سے مسترد کردیا ۔ نواب موصوف روایات پرست تھے اور غالب اس حقیقت سے ضرور واقف رہے ہوں گے ۔ نواب بہت ناراض ہوئے اور وظیفے کی موقوفی کے خدشے سے غالب معافی کے خواست گار ہوئے ۔ مناقشہ ختم ہوا ، لیکن یہ امر واقعہ کہ دربارِ رام پور کی سرپرستی کی موجودہ انتہائی غیر یقینی صورتِ حال سے بہ خوبی واقف ہوتے ہوئے بھی غالب نواب سے اختلاف کی جسارت کرنے کے لیے تیار تھے ان میں عملیت کے فقدان کا بھی ثبوت ہے اور ان کی ذہنی جراءت کا بھی ۔ گو کہ ان کی دست تنگی کی وہ حالت جس سے مخلصی ناممکن تھی اس طرح کی صورتِ حال میں انھیں بالآخر سر جھکانے پر مجبور کردیتی تھی وہ ایسا خیال کرنا پسند کرتے تھے کہ جب کبھی ممکن ہوا انھوں نے اپنی ذہنی آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ۔ ادبی امور میں وہ ذہنی مصالحت کو بالخصوص ناقابلِ قبول سمجھتے تھے ۔ ۱۸۶۶ء میں اپنے ایک دوست کے نام خط میں تھوڑی سی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ خوشامد کبھی میری عادت نہیں رہی ، لیکن آگے جب وہ لکھتے ہیں کہ جہاں تک امور شاعری کا تعلق ہے انھوں نے نہایت دیانت داری کے ساتھ اس سے احتراز کیا ہے تو یہاں وہ بالکل حق بہ جانب ہیں ۔

غالب رام پور میں تین ماہ سے کم عرصے مقیم رہے اور دسمبر ۱۸۶۵ء میں دلی واپس لوٹے ۔ ۱۸۶۰ء میں بھی جب وہ پہلی بار وہاں گئے تھے وہ وہاں زیادہ دن نہیں ٹھیرے تھے ۔ اس وقت ان کے وہاں قیام کا ایک واضح محرک بھی تھا کیوں کہ سابق نواب نے ان کے رام پور میں مستقل قیام کی صورت میں وظیفے کو دگنا کرنے کا وعدہ کیا تھا ۔ جب غالب اس بار واپس لوٹے تو قیاس آرائیاں تھیں کہ یا تو نواب نے انھیں برخاست کردیا ہے یا پھر انگریزوں نے مداخلت کرکے نواب کو اس تعلق کو ختم کرنے پر مجبور کیا ہے ۔ لیکن غالب اس کی وجہ باقر اور حسین ، دونوں لڑکوں کی یادِ وطن میں افسردگی بتاتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود دلی کی جدائی میں بے چین تھے ۔ دلی بھلے ہی ایک "کیمپ" میں تبدیل ہوگیا رہا ہو لیکن پھر بھی وہ ایک جانا بوجھا شہر تھا جس سے وہ مانوس تھے ۔ انھوں نے ساری عمر اس

گلی کوچوں میں گزاری تھی ۔ شہر دہلی ایک طرزِ زندگی کی علامت تھا ، اس واحد طرزِ زندگی کی جس سے وہ واقف تھے ۔ ایک دوست
جن کا خیال تھا کہ انھوں نے دلی چھوڑدی ہے وہ حیرت زدہ ہوکر پوچھتے ہیں : " یہ کسی نے خلاف واقع آپ سے کہا ہے ۔ میں مع
و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزمِ خوں کا شناور رہا ہوں ۔" (خط بہ نام عبدالغفور سرور ، ستمبر ۱۸۶۰ ء) ۔ اب اس عمر میں دلی چھوڑ کر
ں اور گھر بسانا ان کے لیے ممکن نہیں تھا ۔ شاید ان میں اتنی قوت بھی نہیں رہی تھی کہ ایک فعال اور حاضر باش درباری شاعر کی
داریاں پوری کرتے رہیں ۔ قیامِ دہلی کا یہ فائدہ تھا کہ اپنے وظیفے یا دربارِ رام پور میں رسائی کے حق سے دست بردار ہوئے بغیر وہ
نے بوجھے ماحول میں بہ دستور اپنی وضع کی زندگی گزارنے کے لیے آزاد تھے ۔ روپے پیسوں کے لحاظ سے یہ گھاٹے کا سودا تھا لیکن ان کے
نظر سے دوسرا کوئی فیصلہ ممکن نہ تھا ۔ سوال ان کی بیوی کا بھی تھا ۔ وہ رام پور کے سفر میں ان کے ساتھ نہیں گئی تھیں اور غالباً
کا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا ۔ رام پور سے غالب کے خطوط اپنی بیوی سے ان کے تعلقِ خاطر پر بڑی پسندیدہ روشنی ڈالتے ہیں ۔ ان کا
ار تھا کہ دونوں لڑکے پابندی کے ساتھ اپنی دادی بی بی کو خط لکھا کریں اور چوں کہ وہ پڑھ نہیں سکتی تھیں غالب نے یہ انتظام کیا کہ
ا ان کو خطوط پڑھ کر سنا دیا کریں ۔ انھوں نے بڑے جتن سے یہ انتظام بھی کیا کہ ان کے غیاب میں خانہ داری کے لیے بیوی کے
ں روپیہ پیسوں کی کمی نہ ہو اور ملازمین کو تنخواہ بروقت ملتی رہے ۔

اس میں شک نہیں کہ ادبی مشاغل کے میدان کی حیثیت سے ، جس میں اپنی کبرسنی کے باوجود وہ بہ دستور کافی سرگرم تھے ،
پور غالب کے لیے دلی کا مرجع بدل ہرگز نہیں ہوسکتا تھا ۔ ۱۸۶۱ ء میں ان کے اردو کلام کا ایک نیا نسخہ چھپا ۔ ۱۸۶۲ ء میں ان کے فارسی
ت نظم کا ایک ایڈیشن شائع ہوا ۔ اسی سال فارسی لغت " برہانِ قاطع " پر ان کی تنقید پر مشتمل ان کی نثری کاوش " قاطعِ برہان " منظرِ
پر آئی ۔ ۱۸۶۳ ء میں ان کے احباب نے بالآخر انھیں ان کے مجموعہ خطوط کی اشاعت پر آمادہ کرلیا : ایک مجموعہ " عودِ ہندی " کے
سے ۱۹۶۸ ء میں شائع ہوا اور دوسرا " اردوئے معلیٰ " کے نام سے ان کی وفات کے بعد ۔ بلاشبہہ ان کے ہاں بہ غرض اصلاح نہ صرف
بلکہ باہر سے بھی نظم و نثر کی بہ دستور بھرمار رہتی تھی ۔ یہ رشحاتِ قلم بریلی ، لکھنو ، کلکتہ ، بمبئی اور سورت جیسے دور دراز مقامات سے
ول ہوتے تھے اور حتیٰ الامکان اپنے معمول کے مطابق وہ ان میں سے ہر ایک پر شخصی توجہ دیتے تھے ۔

اس کے باوجود گرتی ہوئی صحت نے غالب کو سنجیدہ نظم نگاری کی مشقت کو کم و بیش ترک کردینے پر مجبور کردیا تھا ۔ غالباً
ں نے اپنی آخری فارسی غزل ۱۸۶۵ ء میں اور آخری اردو غزل ۱۸۶۶ ء میں لکھی :

سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

۱۸ ء میں وہ دلی کے لیے مخصوص پھوڑے سے بری طرح متاثر ہوئے ۔ ان کے دونوں ہاتھوں اور داہنی ٹانگ پر دنبل نمودار ہوئے اور
ہی زخم بن گئے ۔ جب روایتی علاج معالجے سے فائدہ نہیں ہوا طبِ مغرب کے تربیت یافتہ ایک ہندستانی سرجن کو پھوڑوں کے
اف فاسد گوشت گرم لوہے سے جلانے اور کاٹ کر نکالنے کے لیے طلب کیا گیا ۔ کچھ افاقہ ہوا لیکن پھر ان کے پاؤں پر فاسد ورم آگیا ۔
تا نہیں پہن سکتے تھے اور انھیں چلنے میں بے حد دقت ہوتی تھی ۔ مضر اشیا کی پھیلائی ہوئی اس بیماری میں وہ کم و بیش ایک سال
مبتلا رہے ۔ ۱۸۶۳ ء میں زیادہ تر انھیں مستقل درد رہا ، جس کی وجہ سے رات کو وہ سو نہیں پاتے تھے ، جب کہ ان کے سارے بدن پر
نکلا رہتا اور پٹیاں بندھی رہتیں ۔ ختم سال تک افاقے کے آثار دکھائی دیے لیکن کمزوری اتنی تھی کہ ، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں ، اگر اٹھتا

چلیں تو اتنی دیر میں کہ جتنی دیر میں ایک قدِ آدم دیوار اٹھے۔

غالب نے جو مثال دی ہے اس میں حقیقت کی رمق بھی ضرور ہے۔ اب وہ صرف لاٹھی کے سہارے ہی چل پاتے تھے۔ ان کی قوتِ سامعہ جو ادھر کئی برسوں سے ناقص تھی، تیزی سے جواب دے رہی تھی۔ ان کی بینائی رفتہ رفتہ کم زور ہوتی جارہی تھی اور حافظہ بھی ان کے لیے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ اکثر بہ غرضِ اصلاح ان کے ہاں بھیجے گئے نظم یا نثر کے اوراق بے جگہ رکھ دیتے یا انھیں غلط پتے پر سپردِ ڈاک کردیتے۔ اس سے ہمیشہ ان کا دل دکھتا لیکن وہ لوگوں کو اپنے روبہ تنزلِ قویٰ دماغی کے بارے میں مطلع کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتے۔ ۱۸۶۴ء میں یک گونہ جھلاہٹ کے ساتھ وہ ایک دوست کے نام خط میں لکھتے ہیں: "جنابِ عالی! وہ غزل جو بہار لایا تھا وہاں پہنچی، جہاں اب میں جانے والا ہوں۔ یعنی عدم، مدعایہ کہ گم ہوگئی۔" (خط بہ نام قاضی عبدالجلیل جنون بریلوی، جون ۱۸۶۴ء)۔ جب لوگ اپنے رشحاتِ قلم کے بارے میں بار بار دریافت کرتے تو وہ برہم ہوجاتے لیکن ظاہر ہے کہ یہ برہمی ان کی یاد دہانیوں سے زیادہ اپنی معذوری و بے بسی پر ہوتی۔ وہ اپنے شاگرد لوہارو والے علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں: "مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا۔ مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کہ کون سی رباعیاں مانگتے ہو۔ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج۔ معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے، اب کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، اوستا کی قسم، گرو کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ، نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔۔۔" اب وہ دن کا بیش تر وقت گھر کے مردانے میں اپنے کمرے میں گوشہ نشینی کی حالت میں گزارتے۔ وہ لیٹے رہنے ہی کو ترجیح دیتے۔ اسی وقت اٹھتے جب ملاقاتیوں کے آنے پر اٹھنا ناگزیر ہوجاتا۔ وہ مرنے سے نہیں ڈرتے تھے:

موت کا ایک دن معین ہے　　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

علم نجوم کی رو سے حساب لگا کر انھوں نے یہ ادعا کیا تھا کہ ان کی موت ۱۸۶۱ء میں واقع ہونے والی ہے۔ یہ ہیضے کی وبائے عام کا سال تھا۔ جب ۱۸۶۱ء کا سال آیا اور گزر گیا تو اسے انھوں نے یہ کہہ کر ہنسی میں ٹالا کہ اس وقت مرنے میں جب کہ وبائے عام میں سبھی مر رہے تھے، میری کسرِ شان تھی!

بیماری سے وہ اتنا نہیں ڈرتے تھے جتنا اس فقدانِ آسائش سے جو وہ اپنے ساتھ لاتی تھی اور جب وہ اپنے سارے جسم پر نکلے ہوئے پھوڑوں اور ورم کی وجہ سے پریشان تھے تو ایک شدید افسردگی کے دور سے گزرے۔ ساتھ ہی ساتھ ان گزرے ہوئے دنوں کا غم اور حسرت آمیز یاد بھی تھی جب وہ جوان تھے اور ان دل بہلاووں سے لطف اندوز ہونے کے زیادہ اہل تھے جو زندگی انھیں فراہم کرتی تھی۔ ان کے متعدد اشعار موثر طور پر اسی ذہنی کیفیت کا احاطہ کرتے ہیں:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

مارا زمانہ نے اسداللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں ، وہ جوانی کدھر گئی

ں کے باوجود جب درد سے افاقہ ہوتا یا جب معذور نہ ہوتے تو ان کی دبائے نہ دبنے والی شگفتہ مزاجی کے وقفے اور شاعر کا ایک ایک ے کو غنیمت جان کر اسے جینے ، اسے صیقل کرنے ، اسے سنوارنے اور مکمل تجربے کی شفاف وضاحت کے ساتھ ان کی الفاظ میں تصویر ھینچنے کا ذوق پھر سے عود کر آتا۔ اگست ۱۸۶۲ء میں وہ لکھتے ہیں: "مینہ کھل گیا ہے۔۔۔ کھلا ہوا کوٹھا۔ چاندنی رات ، ہوا سرد ، تمام ت فلک پر مریخ پیشِ نظر۔ دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا ، ادھر مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبوحی کا وہ لف ، روشنی کا وہ عالم۔" (خط بہ نام علاء الدین خاں علائی ۱۶ / اگست ۱۸۶۲ء)

وہ اب خود کو اپنے حجرے میں معتکف فقیر یا درویش سمجھنا پسند کرتے ہیں جو واقعات کا شاہد تو ضرور تھا لیکن ان میں شریک ہیں ہوتا تھا۔ چنوتیاں کم تھیں لیکن ایک اعتبار سے ساحل پہ کھڑے طوفاں کا نظارہ کرنے کے اپنے فائدے بھی تھے:

نے تیر کماں میں ہے ، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

جانتے تھے کہ ان کے قوائے جسمانی اب ایسے نہیں تھے کہ وہ میدانِ عمل میں فعال کردار ادا کرسکیں اور اس لیے اب پیچ و تاب کھانا ر جدوجہد کرنا بھی کم ہوگیا تھا ، حبِ جاہ اور عناد بھی کم تھا اور صلح صفائی کی طرف رجحان زیادہ ہوگیا تھا:

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے ؟

پنے کمرے میں لیٹے ہوئے وہ نہ صرف روزمرہ کے واقعات ، اپنے مسائل اور اپنی صحت کے ذکر بلکہ زندگی اور موت ، بنی نوعِ انسان کی ہ مندیوں اور اخلاقی کم زوریوں کے بارے میں مفصل گفتگو پر مشتمل بے شمار خطوط لکھتے۔ اپنے سے چھوٹے رشتہ داروں اور دوستوں ے نام خطوط میں وہ انھیں مشورے دیتے اور اپنی پیڑھی کے بہ قیدِ حیات معاصرین اور احباب سے مراسلت میں ان کا رویہ پر ستغراق اور مشاہدہ ، نفس کا ہوتا:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

ب ان کے لیے باعثِ تقویت ان کی پہلے کی طرح مذہبی ظاہر پرستی کی آلودگی سے پاک گہری روحانیت تھی۔ ۱۸۶۲ء میں وہ بڑے یقین ے ساتھ تصریح کرتے ہیں: "یہاں لاموجود الا اللہ کے بادہ۔ غالب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ (خط بہ نام علائی ۱۰ / مارچ ۱۸۶۲ء)۔ ان کی سرشت کے کئی امتیازی اوصاف جن کا ان کی معرکہ آرائیوں سے پُر زندگی کی سرگرمیوں اور مشاغل کی وجہ سے اظہار نہیں ہو پایا تھا اب یقینِ کلی کے ساتھ جامہ ، الفاظ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ۱۸۶۵ء میں وہ نتِ قلب کے ساتھ لکھتے ہیں کہ میری دلی خواہش ہے کہ "اگر تمام عالم میں نہ ہوسکے نہ سہی ، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا ر نہ آئے۔" (خط بہ نام علائی ۱۴۰ / فروری ۱۸۶۵ء)۔ گذشتہ زندگی میں بھی انھوں نے اپنے دوستوں اور شناساؤں کی حتی الامکان مدد کی کشش کی تھی ، لیکن اب جب کہ وہ اس سلسلے میں زیادہ کچھ کرنے کے موقف میں نہیں تھے ، ان کی خطوں میں شدید جذبۂ ہمدرد

احساس ہوتا تھا اور یہ انسان دوستی پر مبنی سچے تعلقِ خاطر سے مملو ہوتی تھیں۔ پنڈت جے نرائن ایک نوجوان تھے جن کے باپ دادا لوہارو خانوادے کے ملازم رہ چکے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں وہ پٹیالہ میں حصولِ ملازمت کے لیے غالب سے مدد کے طالب ہوئے۔ غالب نے فوراً پٹیالہ میں حکیم غلام مرتضیٰ خاں کو لکھا: "خوب یاد کیجیے کہ میں نے کبھی کسی امر میں آپ کو تکلیف نہیں دی۔ اب ایک طرح کی عنایت کا سائل ہوں۔ حاملِ ہذالمکتوب پنڈت جے نرائن میرا یہ خط لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ آپ کو میرے سر کی قسم جہاں تک ہوسکے سعی کر کے ان کو موافق ان کی عزت کے کوئی عہدہ دلوادو گے تو میں یہ جانوں گا کہ تم نے مجھے نوکر رکھوادیا ہے۔ بڑا احسان مند ہوں گا۔" (خط بہ نام حکیم غلام مرتضیٰ خاں ۲۰ / مارچ ۱۸۶۵ء)۔

جب وہ کبر سنی کو نہیں پہنچے تھے تب بھی اپنے آپ پر ترس کھانے سے انھیں کبھی کوئی خاص احتراز نہیں تھا۔ اب ان کے پاس ایسا کرنے کے لیے وقت بھی زیادہ تھا اور وجہ بھی۔ وہ خطوط میں اکثر خود کو مردود خلائق اور مبتلائے عذابِ الٰہی بتاتے ہیں اور اپنے عوارض اور اپنی انتہائی ناداری کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں۔ یہ ان کی حسِ مزاح تھی اور چونچال رواقیت یعنی ضبطِ جذبات اور راحت و الم کے احساس سے ماورائیت، جس نے ہمیشہ انھیں خود رحمی کا شکار بننے سے بچائے رکھا تھا۔ وہ افسردگی کے ان دوروں سے ہمیشہ نجات حاصل کرلیتے، اس بات پر پھر سے زور دینے کے لیے کہ زندگی اپنے سارے دکھ درد اور رنج و غم کے باوجود اس لائق ہے کہ اسے بسر کیا جائے اور اس سے لطف اندوز ہوا جائے۔ لیکن ایک امر ایسا تھا جس پر ان کی آزردگی نہ کم ہوئی اور نہ دور ہوئی: یہ یقینِ واثق کہ ان کے جیتے جی ان کی شاعری کی مادی لحاظ سے بھی اور ذہنی سطح پر بھی وہ قدرشناسی نہیں ہوئی جس کی وہ مستحق ہے۔ جیسا کہ وہ اپنے فارسی شعر میں لکھتے ہیں:

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

(میرے ستارے کو اوجِ قبولیت عدم میں حاصل ہوگا۔ اس دنیا میں میرے اشعار کو شہرت میرے بعد نصیب ہوگی)۔

ان کی زندگی کے آخری سالوں میں ان کی اس جاں کاہ آزردگی میں اضافہ ہی ہوا اور وہ اپنے متعدد خطوط میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ۱۸۶۳ء میں بہ ظاہر نہایت افسردگی کی حالت میں لکھے ہوئے ایک خط میں وہ اپنی زندگی کی ادبی تخلیقات کا خلاصہ بیان کرتے ہیں: ایک اردو دیوان، ایک دیوانِ فارسی، تین کتابچے، سب کے سب انعام و اکرام سے محروم اور ناقدری کا شکار۔ ۱۸۶۵ء میں وہ پھر لکھتے ہیں: "میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازہ بایست نہیں پائی۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔" (خط بہ نام علائی، ۱۳ / فروری ۱۸۶۵ء)۔ ایسا نہیں ہے کہ غالب اس قبولیتِ عام اور شہرت سے جو انھیں ملی ناواقف رہے ہوں۔ یہ ان کی شخصیت کی امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی کام یابی کو ان تخلیقات کے مقابلے میں ہیچ گردانتے تھے جو اپنے خیال میں وہ قاری کے سامنے پیش کرنے کے اہل تھے۔ ان کا معاملہ اس اوسط درجے کی جھنجھلاتی ہوئی انا کا نہیں تھا جو دائماً غیر مطمئن رہتی ہے۔ بلکہ یہ معاملہ تھا ایک اصل سے بڑی، اعلیٰ و ارفع انا کا جو اپنی کام یابی کا اندازہ خود اپنے معیار کی رو سے کرتی ہے۔ ان کی آزردگی مسابقت کو نہ برداشت کرنے والے یا اپنی شامِ زندگی میں دوسروں کی کام یابی پر رشک کرنے والے شخص کی آزردگی نہیں تھی۔ ان کی آزردگی اس شخص کی تھی جس کو اپنے کمال و افضلیت کے بارے میں کبھی کوئی شبہ نہیں تھا اور جو واقعی ایسا سمجھتا تھا کہ اس کے زمانے میں اس کی شعری تخلیقات کی قدرشناسی کے لیے درکار ادبی بصیرت رکھنے والے یا ان کا کما حقہٗ صلہ دینے کے لیے مادی وسائل رکھنے والے افراد شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ

پنے فارسی دیوان میں لکھتے ہیں :

غالب سخن از ہند بروں بر کہ کس ایں جا — سنگ از گہر و شعبدہ ز اعجاز نہ دانست

(غالب اپنے کلام کو ہندستان کے باہر لے جاؤ چوں کہ یہاں کوئی بھی سنگ و گہر میں اور شعبدہ و اعجاز میں تمیز نہیں کرتا، ان کا فرق نہیں پہچانتا)

ان کی شعری سرگرمیوں کے آغاز میں ان کے کلام کو حد سے زیادہ مبہم ہونے کی بنا پر متعدد اربابِ علم کی طرف سے تمسخر آمیز م قبولیت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تب انھوں نے اپنے اسلوبِ بیان کو اس کی تبدیلی کی ضرورت کے واقعی قائل ہونے کی وجہ سے اتنا میں جتنا اپنے نکتہ چینوں کی فہم و ادراک کا لحاظ کرتے ہوئے، تبدیل کر دیا تھا۔ بعد میں انھیں مغل دربار تک رسائی میں دقت کا سامنا نا پڑا تھا، جہاں کے، بہادر شاہ ظفر کی صدارت میں منعقد ہونے والے مشاعرے ہر آرزو مند شاعر کے لیے انتہائی اعلیٰ و ارفع میدانِ ل کی حیثیت رکھتے تھے۔ جب آخر کار وہاں تک ان کی رسائی ہو گئی تو انھیں ذوق کو، جنھیں وہ محض ایک اوسط درجے کا شاعر سمجھتے ، درباری شاعر کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑا۔ ذوق کے انتقال کے بعد انھیں درباری شاعر مقرر کیا گیا۔ لیکن ان کے خیال میں انھیں اعزاز حد سے زیادہ تاخیر سے ملا تھا اور اس سے انھیں شاید ہی کچھ فائدہ ہونے کی توقع تھی۔ ساری عمر انھوں نے اپنی فارسی نظم و نثر کو حث فخر سمجھا تھا لیکن اس وقت جب اردو نے فیصلہ کن طور پر ادبی اغراض میں استعمال ہونے والی زبان کی حیثیت سے فارسی کی لہ لے لی تھی انھیں پتہ چلا کہ بیش تر افراد کے لیے موخر الذکر زبان کے تعلق سے ان کی عقیدت قدر شناسی سے زیادہ استعجاب کا مقام ما۔ فارسی دانی اور اس زبان کا علم و فضل ایسی چیز تھی جس کے لیے وہ اپنی شہرت کو خطرے میں ڈالنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ لیکن س میدان میں بھی وہ بار بار دشنام آمیز مناقشوں میں گھسیٹے جانے سے بچ نہ سکے۔ ان کے دیوانِ اردو اور کلیاتِ فارسی کے متعدد یڈیشن شائع ہو چکے تھے لیکن اس کے دوران شاید ہی انھوں نے کچھ روپیہ پیدا کیا۔ ان کے نہایت ہوش یاری سے لکھے ہوئے تمام مدحیہ صاید کے صلے میں انگریزوں نے انھیں ان کی اصل موروثی پنشن سے ایک پیسہ بڑھ کر نہیں دیا۔ جب کہ مغل بادشاہ کے پاس قدردانی کے علاوہ اور رکھا ہی کیا تھا جو انھیں مرحمت فرماتے۔ بہ حیثیت شاعر اپنی شہرت کے باوجود غالب نے اپنی زندگی عسرت اور قرض اری میں بسر کی۔ یہ امر ان کے لیے اور بھی زیادہ ناگواری کا باعث تھا کیوں کہ نہ بھولنا چاہیے کہ ان کے لیے کسی کی کام یابی کا اندازہ نے کے لیے سند کی حیثیت ماضی کو حاصل تھی جب ان سے کہیں کم درجے کے شعرا کو بھی معمولاً بہ درجہا بیش قیمت انعام و اکرام ے نوازا جاتا تھا۔ چناں چہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں جب وہ تنگ دست، مقروض اور مار تھے اپنی کام یابیوں کے لیکھے جوکھے پر غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بہ حیثیت شاعر اپنی شہرت کے ثبوت میں سلک کے ر سے بتانے کے لیے تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ تاہم مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی آزردگی سبب ایک وسیع تر ملال تھا، اس شخص کا ملال جو ماضی میں جینے کو ترجیح دیتا تھا لیکن اس دور میں جینے پر مجبور تھا جب انقلابِ زمانہ کے جھکڑ نے ماضی کا تو ذکر ہی کیا حال تک کے نظریات و اعتقادات کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔

۱۸۶۶ء تک پہنچ کر غالب کی خرابیِ صحت بالکل واضح تھی۔ جنوری ۱۸۶۶ء میں رام پور سے واپسی کے سفر کے دوران وہ ایک ادثے سے دوچار ہوئے اور خوش قسمت تھے کہ ان کی جان بچ گئی۔ پالکی جس میں وہ بیٹھے ہوئے تھے جیسے ہی پار ہوئی پل دفعتاً ڈہ یا۔ سامان اور ملازمین جس گاڑی میں تھے وہ دوسری طرف رہ گئی۔ ان کا بستر سامان کے ساتھ تھا اور رات کڑکڑاتے جاڑوں کی تھی۔

غالب نے بہ مشکل ایک سرائے کا پتہ لگایا اور رات خاصی بے کلی میں گزاری۔ سفر کی مصیبتوں کا ان کے پہلے ہی سے کم زور قوائے جسمانی پر بہت خراب اثر پڑا۔ اس سال جاڑے میں غیر معمولی سردی پڑی تھی جس پر بارش اور تیز ہوا نے سونے پر سہاگے کا کام دیا تھا۔ سرائے اور پڑاؤ پر دست یاب کھانا ان کی پسند کا نہیں تھا اور وہ اکثر کھانے کے بغیر ہی گزر کرلیتے۔ گھر واپس لوٹنے پر ان کی صحت میں کچھ بہتری آئی لیکن افاقہ چند روزہ تھا۔ پرانے عارضے جو اس سے قبل قابو میں تھے یا کبھی کبھی ہوجاتے تھے دفعتاً شدت کے ساتھ عود کر آئے۔ قولنج، جس کی انھیں ہمیشہ شکایت رہی، اب مستقل ہوگیا۔ ان کے جگر کا فعل درست نہیں تھا اور وہ شکایت کیا کرتے کہ انھیں بہت سارا پانی پینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ انھیں بار بار پیشاب کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی: یہ غالباً غیر تشخیص مرضِ ذیابطس کی علامات تھیں۔ ان کی مقررہ غذا، جیسی کہ انھوں نے ایک ماہرِ غذائیات کے نپے تلے انداز سے بے کم و کاست قلم بند کی ہے، دن بہ دن گھٹتی جارہی تھی: "(میری) غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی۔ قریب شام، کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب، چھے گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر شراب خانہ ساز (خط بہ نام حبیب اللہ ذکا ۲۰ / دسمبر ۱۸۶۶ء)۔ اگر چہ یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ اپنے عوارض کے باوجود وہ اب بھی تھوڑی سی شراب پی لیتے تھے ان کا جسمانی انحطاط اب روکے نہ رکتا تھا۔ ۱۸۶۷ء کے آغاز تک ان کے حافظے نے تقریباً جواب دے دیا تھا اور قوتِ سامعہ بالکل زائل ہوچکی تھی۔ دل چسپ بات یہ کہ ذہنی طور پر وہ پہلے کی طرح اب بھی چاق و چوبند تھے اور اپنے جسمانی انحطاط کے ہر مرحلے کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے رہتے تھے۔ ادھر کچھ دنوں سے انھیں رعشے کی شکایت ہوگئی تھی اور ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں ذکر کرتے ہیں کہ رعشہ اتنا شدید ہے کہ وہ کوئی بھی چیز ٹھیک سے پکڑ نہیں پاتے۔ ۱۸۶۷ء میں وہ شکایت کرتے ہیں وہ اپنے قلم بھی تراش نہیں پاتے۔ وہ اتنے کم زور ہوگئے تھے کہ بالآخر انھوں نے مان لیا تھا کہ زیادہ تر وقت انھیں بستر پر پڑا رہنا چاہیے لیکن جلد ہی وہ چلنے کے قابل بھی نہیں رہے۔ ۱۸۶۷ء میں وہ لکھتے ہیں: "۔۔۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں۔ صبح کو دو آدمی ہاتھوں پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری، اس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اس گوشہ، تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بہ دستور لے جاکر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔" (خط بہ نام میاں داد خاں سیاح ۱۱ / جون ۱۸۶۷ء) اس حالت میں بھی، جب تک ممکن تھا، وہ حتی المقدور بہ غرضِ اصلاح موصولہ اشعار پر توجہ دینے کی کوشش کرتے۔ لیکن جون ۱۸۶۷ء تک وہ لکھنے کے قابل بھی نہیں رہ گئے تھے اور اس سے وہ خطوط نویسی کے اپنے پرانے ذریعہ تفریح کی مسرت سے بھی محروم ہوگئے۔ اب انھوں نے خطوط لکھانے شروع کیے، جب بھی کوئی دوست فرصت سے ہوتا وہ اس سے یہ کام لیتے۔ ان کی جواب دیتی ہوئی بینائی اور لرزاں ہاتھوں نے انھیں اس قابل نہیں رکھا تھا کہ قلم پکڑ سکیں۔ اشعار اب بھی ان کے پاس بہ غرضِ اصلاح بڑی تعداد میں آتے۔ وہ ہمیشہ ان پر کما حقہ توجہ دینے کے معاملے میں پابندِ اصول رہے تھے اور اب ایسا کرنے سے ان کی معذوری ان کے لیے نہایت تکلیف دہ تھی۔ اگست ۱۸۶۷ء میں تنگ آکر انھوں نے اخباروں میں ایک اعتذار چھپوایا تھا لیکن بہ ظاہر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا: "اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاحوں کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔ بوڑھا، اپاہج، پورا بہرا، آدھا اندھا، دن رات پڑا رہتا ہوں۔" (خط بہ نام میاں داد خاں سیاح ۲۵ / اگست ۱۸۶۷ء)۔

افسوس کی بات ہے کہ زندگی کے ان آخری سالوں میں، جب ان کی وفات اتنی قریب تھی، انھیں اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تلخ مناقشے کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں ۱۸۵۹ء میں غالب نے دکنی عالم مولوی محمد حسین تبریزی کی کلکتے

سے شائع شدہ مشہور فارسی لغت "برہانِ قاطع" پر معترضانہ تنقید لکھی تھی۔ ان کی تنقیدی کاوش "قاطعِ برہان" (اور "درفشِ کاویانی" کے نام سے شائع شدہ اس کا دوسرا مفصل ایڈیشن) ایران کے مستند ادیبوں کے مقابلے میں ہندستانی دبستان کے فارسی میں لکھنے والے ادیبوں کی سند کو معتبر تسلیم کرنے والوں کے تعلق سے غالب کے متواتر اور سدا کے اعتراض سے توافق رکھتی تھی۔ لیکن مولوی محمد حسین ایسے عالم تھے جن کے ہندستان میں کثیر التعداد پیرو تھے۔ غالب کی تنقید شدید ناراضگی کا باعث ہوئی۔ ایک تنک اس کو غالب کی تنقید کے بعض اوقات تمسخر آمیز اور پُر حقارت لہجے سے بڑھاوا ملا۔ ان کی تنقید میں امر واقعہ کے تعلق سے بعض صریحی تسامحات بھی تھے۔ ان کے پُر جوش مداح حالی تک تسلیم کرتے ہیں کہ غالب بعض "لغزشوں" کے قصوروار تھے اور اضافہ کرتے ہیں کہ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ بیش تر حافظے کی مدد سے لکھتے تھے اور ان کے پاس "فرہنگ لغات تھی اور نہ کوئی ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیقِ لغات کی بنیاد رکھی جاتی۔" (یادگارِ غالب، ص: ۴۴)۔ بہ ظاہر جب غالب نے ان تحشیوں کو وقتاً فوقتاً بہ عجلت لکھا تو غالب کا انھیں شائع کرنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ یہ تنقید بعد میں اپنے دوستوں کی درخواست پر انھوں نے شائع کروائی۔ ممکن ہے کہ اگر غالب نے یہ تنقید اشاعت کے خیال سے لکھی ہوتی تو رائے زنی کے دوران وہ درشتی سے کام کم لیتے اور ان کا رویہ زیادہ محتاط ہوتا۔ دوسری طرف ادبی امور کے تعلق سے اپنے خیالات کے اظہار میں انھوں نے کبھی بھی موقع شناسی سے کام نہیں لیا اور ہوسکتا ہے وہ یہ خوش منتظر رہے ہوں کہ ان کی پُر زور تنقید معمول سے زیادہ قارئین تک پہنچے گی۔ تاہم اس میں شاید ہی کوئی شک ہو کہ نتیجتاً وقوع پذیر ہونے والے ہنگامے کا انھوں نے صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا۔ ان کی کتاب کے رد میں کئی رسالے منظرِ عام پر آئے اور ایسا لگتا تھا کہ سارا شہر غالب سے محاربت کے لیے تیار ہے۔

حالی کا خیال ہے کہ یہ سارا ہنگامہ اس لیے کھڑا ہوا کہ غالب نے مسلمہ ادبی نظریے پر اعتراض کیا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ دوسرے عوامل بھی تھے۔ غالب کی زندگی میں ادبی قدامت پسند عناصر کے لیے ان کے باعثِ اشتعالِ طبع ہونے کا یا ادبی مناقشے کا مرکزِ توجہ بن جانے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ ۱۸۲۸ء میں کلکتے میں انھوں نے شاید اور بھی زیادہ ڈرامائی انداز میں بھڑ کے چھتے کو چھیڑا تھا۔ لیکن تب اور اب کے ان دو واقعات کی نوعیت جداگانہ تھی۔ تب اردو فارسی ادب کی باریکیوں پر بحث بیش تر جاگیردار ردداروں پر مشتمل چھوٹے سے حلقے تک کم و بیش محدود تھی۔ متوسط طبقات کے نمائندے اور سماجی نظامِ مدارج میں ان سے کم رتبہ ادب میں دخل رکھنے والے افراد اس مباحثے کا دل چسپی کے ساتھ لیکن دور ہی سے مشاہدہ کرنے والوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ شاعری سے لطف اندوز ہوتے تھے، بہتیروں کا مطالعہ کافی وسیع بھی تھا، لیکن بالعموم ان میں سے کسی سے بھی ان امور پر اپنے خیالات کے اظہار کی نہ ہی توقع رکھی جاتی تھی اور نہ ہی انھیں اس کا کوئی خاص موقع دیا جاتا تھا۔ تب ادبی قیل و قال، اختلاف آرا اور نقاطِ نظر کے جواز پر بحث اور معرکہ آرائی زیادہ متانت اور شائستگی کے ساتھ کی جاتی تھی۔ ۱۸۶۵ء تک صنعتِ نشر و اشاعت کے پھیلاؤ اور ذرائع ابلاغ کی ترقی کی بہ دولت ادبی سردکار کا سیلاب شائستہ مشاعروں کی حدود پار کرچکا تھا۔ پرانے سیاسی و سماجی نظام کی شکست و ریخت اور اس کے ساتھ ساتھ وقوع پذیر ہونے والے معاشی طبقے کے نقلِ مکان اور آدابِ معاشرت اور سماجی شعور میں آنے والی تبدیلیوں نے متوسط اور نچلے طبقوں کو یہ جواز اور موقع فراہم کردیا تھا کہ ان کی بات بھی سنی جائے۔ ادبی مباحثے کا چوکھٹا اب قطعی طور پر فراخ ہوچکا تھا اور اسے حسبِ مرضی قابو میں رکھنا یا محدود کرنا ممکن نہ تھا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ مناقشے کے عروج پر پہنچنے پر بعض بدگویوں کی دریدہ دہنی کے خلاف اپنے سماجی رتبے کی دہائی دیتے

ہوئے غالب نے ٹھیک یہی کام کرنے کی کوشش کی تھی۔ اپنے ایک نکتہ چیں کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں : " اس نے میرے بلاسخن طرح طرح کی دشنام طرازیاں کی ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر غالب عالم و شاعر نہیں تو وجاہت خاندانی کی وجہ سے ایک رتبہ تو رکھتا ہے ۔ ۔ ۔ ایک ممتاز خاندان کا فرد ہے۔ ایسا شخص ہے جس سے ہندوستان کے امرا و رؤسا اور مہاراجہ واقف ہیں اور جس کا انگریزوں کے ہاں رئیس زادوں میں شمار ہے۔ " لیکن اس طرح کی کوششیں لاحاصل تھیں۔ ۱۸۶۹ء میں پٹیالہ کے امین الدین خاں نے ایک نہایت ہی خلاف تہذیب اور مغلظات سے پُر رسالہ لکھا۔ غالب کا ابتدائی ردِ عمل اسے نظر انداز کرنے کا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ غالب سے جب کسی نے پوچھا کہ آپ نے اس رسالے کا جواب کیوں نہیں دیا تو انھوں نے فرمایا کہ اگر کوئی گدھا آپ کے لات مار دے تو کیا آپ بھی اسے لات ماریں گے ؟ ان میں معرکہ آرائی کے لیے زیادہ دم خم اب نہیں رہا تھا اور وہ شاید اپنے حسبِ ذیل اشعار کے مشورے پر عمل کرنے کی طرف مائل تھے :

نہ سنو ، گر برا کہے کوئی — نہ کہو ، گر برا کرے کوئی
روک لو ، گر غلط چلے کوئی — بخش دو ، گر خطا کرے کوئی

لیکن رسالے کے مندرجات اس ناقابلِ برداشت حد تک اہانت آمیز تھے کہ دسمبر ۱۸۶۷ء میں غالب نے برطانوی اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔

طرفین کی جانب سے بہ طور گواہ معتبر اشخاص پیش ہوئے۔ غالب کے طرف داروں کی صف میں لالہ پیارے لال آشوب ، حکیم لطیف حسین ، مولوی نصیرالدین اور لالہ حکم چند تھے۔ مدعا علیہ کی طرف سے دہلی کالج میں عربی کے استاد مولوی ضیاء الدین ، مولوی سعیدالدین اور دیگر چند اہلِ علم پیش ہوئے۔ متنازع فیہ قانونی مسئلہ یہ تھا کہ آیا امین الدین کی کنایتہً لگائی ہوئی چوٹوں کو غیر مبہم طور پر خلاف تہذیب اور فحش گردانا جاسکتا ہے۔ عذرداری کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ رسالے کے جملوں کی تشریح غالب کے بتائے ہوئے ان کے مفہوم سے مختلف بھی کی جاسکتی ہے۔ ایسا کرنا مشکل نہیں تھا کیوں کہ امین الدین معتبر اہلِ علم کو اپنے حق میں گواہی دینے کے لیے رضا مند کرنے میں کام یاب ہوئے تھے اور دلائل ایک انگریز جج کے سامنے پیش کیے جارہے تھے جس کی موضوعِ بحث سے واقفیت نہیں کے برابر تھی۔ غالب جلد ہی سمجھ گئے کہ موجودہ قانون کی خصوصیات ان کو انصاف دلانے سے قاصر ہیں بلکہ اس کے برعکس حلفی بیانات کا ہر دن معاملات کو بد سے بدتر ہی بنا رہا تھا۔ بہ قول حالی غالب کے لیے مولوی ضیاء الدینؒ جیسے لوگوں کے بیانات سننا انتہائی تکلیف دہ امر تھا ، جو نہ صرف امین الدین کی لکھی ہوئی بین طور پر لائقِ مواخذہ عبارتوں پر لیپ پوت کر کے اپنے علم و فضل کو ایک ذلیل کام میں صرف کر رہے تھے بلکہ غالب پر شرابی ہونے اور خوفِ خدا نہ رکھنے کا الزام عاید کرتے ہوئے نہایت اہانت آمیز دراز زنی بھی کر رہے تھے۔ چناں چہ ۲۳ / مارچ ۱۸۶۸ء کو غالب نے اس مسلسل اہانت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور مقدمہ واپس لے لیا۔

حالی کے بیان سے اس واقعے کا ایک اہم عنصر سامنے آتا ہے : مناقشہ تو ادبی تھا لیکن غالب پر تنقید بہ تدریج ذاتیات پر حملے کا رنگ اختیار کرتی گئی۔ اس کی تاویل محض اس طرح کے مناقشوں کو روبہ عمل لانے کے مسلمہ قاعدوں اور معیارات کے فقدان یا اختلاف رائے کے مروج اسلوب کے حوالے سے نہیں کی جاسکتی۔ ایسا واضح تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قدامت پسندی کے حق میں مہم چلانے والے مسلمانوں کے گروہ نے غالب کی منظم مذہب اور تقلید پسندوں کے بااثر گروہ سے عمر بھر کی علی الاعلان بے زاری کی پاداش میں ان پر حملے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اس نوعیت کی مخالفت کا وجود پہلے بھی تھا۔ لیکن انیسویں صدی عیسوی

کے اوائل میں صوفی طریقت کا ایسا اثر تھا اور اسے ایسی مقبولیت عامہ حاصل تھی جس کی بہ دولت غالب اسلامی تقلید پسندی کے علم برداروں کی چلنے نہیں دیتے تھے اور اس کے بعض پُر جوش حامیوں سے مقاومت اور ان کی طرف سے مروّت کی امید بھی رکھ سکتے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلم فرقے کو ظلم و تعدی کا بہ طور خاص نشانہ بنایا گیا اور اس کے سربرآوردہ افراد کو انگریزوں کے قہر و غضب کی کاری ضرب برداشت کرنی پڑی تو فرقے کے بعض ارکان میں مسلّمہ مذہب اور اس کے رسوم کی چھتر چھایا کی طرف " بازگشت " یا لوٹنے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس سے مراد ایسا کوئی ادعا نہیں ہے کہ کوئی منظم بنیاد پرست تحریک معرض وجود میں آئی تھی بلکہ محض یہ تسلیم کرنا ہے کہ جاں کاہ صدمے کے لمحات میں مذہبی فرقے بعض اوقات مذہبی عقائد کی بے چون و چرا قبولیت میں جائے پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے مراد اس امر پر بھی توجہ دلانا ہے کہ اسلامی تقلید پسندوں کا بااثر گروہ گذشتہ دہوں کے دوران مذہبی وسیع المشربی کی قبولیت عامہ کی وجہ سے فی الواقع کبھی از کار رفتہ نہیں ہوا تھا۔ یہ امر بہ ظاہر معقول معلوم پڑتا ہے کہ ۱۸۶۰ء کے دہے میں مُلّاؤں کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ اثر پذیر سامعین مل رہے تھے اور اگر صورت حال واقعی ایسی تھی تو یہ امر واضح ہے کہ غالب یعنی اُنیسویں صدی کے ہندستان میں مذہبی تقلید پسندوں کے بااثر گروہ کے نہایت شوخ اور ارادتاً برانگیختہ کرنے والے نقّاد کے معاملے میں ایک ادبی مناقشہ ذاتیات پر حملے کی ایسی زہر آلود تقریب کیوں بن گیا۔ اس مفروضے کو حالی کے اس بیان سے اعتبار ملتا ہے کہ اس زمانے میں غالب کو بڑی تعداد میں ایسے گم نام خطوط موصول ہو رہے تھے جن میں ان کے طرز زندگی پر نہایت رکیک اور بے ہودہ الفاظ میں حملے کیے جاتے تھے۔ مزید براں ۱۸۶۶ء تک غالب کے اثر و رسوخ کی ذاتی بنیاد تقریباً نیست و نابود ہو چکی تھی ؛ بادشاہ، جو راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود ان سے مروت کا سلوک کرتے تھے، جلاوطنی میں وفات پاچکے تھے، مسلمانوں کا قدیم جاگیردار طبقہ، امرا، جس کے بااثر ارکان ان کی عزت کرتے تھے اور غالب جن کا اپنے ذاتی احباب میں شمار کرسکتے تھے، تباہ و برباد ہوچکا تھا، انگریزوں نے شہر میں حکم رانی کے لیے نئے شرکائے کار چن لیتے تھے، غالب خود بوڑھے، بیمار اور مقروض تھے، جن کی شاہی سرپرستی کے لیے رسائی صرف رام پور تک تھی اور وہاں بھی نئے نواب صاحب ان پر اتنے مہربان نہیں تھے جتنے کہ ان کے والد مرحوم۔ چناں چہ مختلف وجوہ کی بنا پر " قاطع برہان " والا مناقشہ محض ادب سے متعلق ایک معاملہ نہیں تھا ؛ بڑی حد تک اس نے قدامت پسند مسلم رائے عامہ کو غالب پر حملے کے لیے ہتھیار ٹھیک اس وقت فراہم کیا تھا جب وہ صریحی طور پر بے یار و مددگار اور غیر محفوظ تھے اور جب ادبی مباحث میں شرکت کے دائرے میں توسیع کی وجہ سے معرکہ آرائی میں لوگوں کی زیادہ بڑی تعداد کو شامل کیا جاسکتا تھا۔ ساری عمر غالب نے واعظ پر طعنہ زنی کی تھی، اپنے شراب کے شوق کا ڈھنڈورا پیٹا تھا اور رسمی مذہب کے تقاضوں کے تعلق سے اپنی بے پروائی کا برملا اظہار کیا تھا۔ اب مُلّا اپنا حق وصول کر رہے تھے۔ ایک لحاظ سے یہ امر حیرت انگیز نہیں ہے کہ ایک ادبی مناقشہ ایسی صورتِ حال میں متبدل ہوگیا۔ غالب جس بات پر عقیدہ رکھتے تھے اسی کو اپنی تحریروں میں اجاگر کرتے تھے۔ جہاں ان کا تعلق تھا ادبی سطح پر تنقید بہ آسانی بہ حیثیت مجموعی ان کے خیالات پر تنقید کی شکل اختیار کرسکتی تھی۔ عجیب الٹی بات ہے کہ " قاطع برہان " والا مناقشہ اس غالب کا ثبوت فراہم کرتا ہے جو ایک مکمل ادبی شخصیت تھا، اپنے خیالات سے کُلیتہً توافق رکھنے والا شاعر تھا اور ایک ایسا انسان تھا جس کے لکھے میں اور خود اس میں فرق نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ بات ان کے نکتہ چینوں کے لیے خاص طور پر سخت ناگوار رہی ہوگی کہ ان کے حملے کی شدت کے باوجود اظہار ندامت سے انھوں نے انکار کیا۔ شاید اس جوش کے ساتھ جیسا کہ وہ چاہتے رہے ہوں گے، مقابلہ کرنے کے لیے وہ بہت تھک چکے تھے اور جسمانی طور پر بہت کم زور ہوچکے تھے، لیکن ان میں اب بھی اتنی طاقت تھی کہ اپنی روحانی اسیرت سے وفاداری پر اڑے رہ کر اپنے بدگویوں کو شکست دے

سکیں ۔ اس زمانے میں ان کے بعض قریبی دوستوں نے نادانستہ ان کے جذبات کو ٹھیس بھی لگائی ۔ حالی بڑے افسوس اور پشیمانی کے ساتھ ذکر کرتے ہیں کہ کم و بیش اسی زمانے میں کیسے اپنی مذہبی ظاہر پرستی کی رو میں بہہ کر انھوں نے غالب کو نماز پنج گانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر دیا ۔ غالب نے ناگواری لیکن ثابت قدمی کے ساتھ یہ جواب دیا کہ ہاں میں نے نہ کبھی نماز پڑھی ، نہ روزہ رکھا اور چناں چہ میں ایسا "فاسق و فاجر" ہوں کہ "جب مروں تو میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے ہاتھ پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جاکر کتوں اور چیلوں اور کووں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں ۔ ۔ ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں ۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں : "لا الہ الا اللہ لاموجود الا اللہ لاموثر فی الوجود الا اللہ"

زندگی کے آخری سال میں غالب کو اپنے قرضوں کی ادائگی کی فکر کھائے جاتی تھی جن کی مجموعی رقم ایک ہزار روپے سے کچھ زیادہ تھی ۔ چوں کہ ان کا وقت آخر صریحی طور پر قریب آچکا تھا قرض خواہ جارحانہ طور پر مصر تھے ۔ قرض ادا کیے بغیر مرجانا بھی ایک اچھے مسلمان کا طریقہ نہیں تھا ۔ غالب کے لیے یہ وہ مخصوص صورت تھی جہاں مذہب کی طرف سے دی گئی ہدایت اور شریفانہ عمل درآمد میں توافق پایا جاتا تھا ۔ ستم ظریفی ہے کہ وہ شخص جو ساری عمر روپے پیسے کے معاملے میں ایسا لاابالی رہا ہو ، جان بوجھ کر اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا اور بے دھڑک قرض لیتا رہا ہو ، اپنے آخری دنوں میں حساب چکتا کرنے کے لیے اتنا فکرمند تھا ۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی موت کے بعد قرض کی ادائگی کی کوئی سبیل نہیں تھی ۔ فی الحقیقت ان کو ایک بہت بڑی فکر یہ تھی کہ کسی ذریعہ ، آمدنی کے بغیر ان کی بیوی کی ان کے بعد گزربسر کیسے ہوگی ۔ بڑے پوتے باقر حسین کو الور میں اچھی خاصی آمدنی کی نوکری مل گئی تھی لیکن ان کے سر ان کے اپنے بال بچوں کی ذمہ داری تھی ۔ چھوٹا پوتا حسین علی ابھی تک انھیں کے ساتھ اور بے روزگار تھا ۔ مزید پیچیدگی یہ کہ حسین علی کی شادی طے ہوچکی تھی ۔ شادی کو روپے پیسے کی کمی کی وجہ سے بار بار ملتوی کرنا پڑا تھا اور یہ صورتِ حال غالب کے لیے بڑی سبکی کا باعث تھی ۔ ظاہر ہے کہ قرض ادھار سے کام چلانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا ۔ قرض تو اس شخص کو دیا جاتا ہے جس کے پاس ادائگی قرض کے لیے وقت ہو ۔ دوسرا واحد وسیلہ رام پور کا تھا ۔ جولائی ۱۸۶۸ء میں غالب نے نواب کے پاس تین درخواستیں لکھ کر بھیجیں ۔ پہلی یہ کہ ان پر واجب الادا تمام قرضے نواب صاحب ادا کردیں ، دوسری یہ کہ حسین علی کی شادی کے انتظام کے لیے ایک خصوصی عطیہ مرحمت کیا جائے ، اور تیسری درخواست یہ کہ ان کا ماہانہ سو روپے کا وظیفہ ان کے بعد حسین علی کے نام کردیا جائے ۔ غالب کو اپنے شاہی یا باثر سرپرستوں سے مالی امداد کی درخواست کرنے میں کبھی کوئی تامل نہیں ہوتا تھا ۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسا کرکے وہ نہ صرف مروجہ قاعدوں کے مطابق ایک معزز درباری کا اپنا کارِ منصبی انجام دیتے تھے بلکہ اس طرح وہ اپنے سرپرستوں کو اپنے جیسے قابل قدر اور لائق شاعر کو دادودہش سے خوش کرنے کا ایک عمدہ موقع بھی فراہم کرتے تھے ۔ لیکن اب ان کی درخواست میں ان کے مزاج سے کلیتہً غیر ہم آہنگ فرومایگی اور بے باکی تھی ۔ وہ جانتے تھے کہ اب ان کے آخری دن ہیں اور اپنے روز افزوں بے باکانہ خطوط میں وہ وہی ایک راگ الاپتے ہیں کہ نواب صاحب فوری حکم صادر فرمائیں ۔ کچھ عرصے کے لیے کچھ امید بندھی جب مرزا خاں داغ نے رام پور میں ان کے حق میں سفارش کی ۔ لیکن نواب قطعی رائے نہ دینے کے موقف پر قائم رہے ۔ جب غالب کا انتقال ہوا تو اس وقت تک رام پور سے نہ ہی روپیہ پیسہ آیا تھا اور نہ ہی کوئی قطعی وعدہ ۔

موت سے کچھ دن پہلے غالب پر وقفے وقفے سے غشی طاری ہوجاتی تھی ۔ لیکن تقریباً دمِ آخر تک ان کا ذہن فعال رہا ۔ خواجہ

عزیزالدین عزیز لکھنوی ان کی موت سے کچھ ہی قبل ان سے ملاقات کے لیے آئے تھے ۔ انھوں نے دیکھا کہ ۔ وہ (یعنی غالب) ایک مجلد کتاب (بہ گمانِ غالب دیوانِ قاآنی) سینے پر رکھے ہوئے آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ " خواجہ عزیزالدین کی موجودگی میں غالب کا کھانا لایا گیا ۔ خواجہ عزیزالدین رخصت ہونے کے لیے اٹھے لیکن غالب نے انھیں ٹھیرنے کا اشارہ کیا ۔ غالب نے ان سے کم زور آواز میں کہا : " آپ کی غایت اس تکلیف فرمائی سے یہ تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں ، ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے ، بصارت کی حالت دیکھی ، کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں ، سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھ کو خبر نہیں ہوتی ، غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا ، کلام سنا ، اب ایک بات رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں ، اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے ۔" ان کی جودتِ طبع اور بے مثال حسنِ مزاح آخر تک برقرار رہی ۔

ان کے انتقال سے ایک دن قبل حالی ان کی مزاج پرسی کو گئے ۔ غالب کئی گھنٹوں تک بے ہوش رہنے کے بعد ہوش میں آئے تھے اور لوہارو والے نواب علاء الدین خاں کو ، جنھوں نے ان کی خیریت دریافت کی تھی ، جواب لکھوا رہے تھے ۔ غالب کا جواب تھا : " میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ۔ ایک آدھ روز میں میرے ہم سایوں سے پوچھنا ۔" آخری لمحات میں وہ اکثر اس شعر کا ورد کیا کرتے تھے :

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے　　　عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

۱۵ / فروری ۱۸۶۹ء کو ان کا انتقال ہوا ۔ دوپہر کے وقت حضرت نظام الدین اولیا کے مقبرے کے پاس ، لوہارو گھرانے کے خاندانی قبرستان سلطان جی میں ان کی تدفین عمل میں آئی ۔ اس موقع پر موجود سربرآوردہ لوگوں میں لوہارو کے نواب ضیاء الدین خاں ، حکیم احسن اللہ خاں اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ شامل تھے ۔ مراسمِ تجہیز و تکفین کے تمام اخراجات نواب ضیاء الدین خاں نے ادا کیے ۔ رسمی مذہب سے اس شخص کی ماورائیت کو آخری خراجِ تحسین کے طور پر کچھ الجھن درپیش ہوئی کہ آخری مراسم شیعہ یا سنی مذہب کے مطابق ادا کیے جائیں ۔ نواب ضیاء الدین خاں کے اصرار پر غالب کو اہلِ سنت کے طریقے کے مطابق دفنایا گیا ۔

ان کی بیوی کا ٹھیک ایک سال بعد انتقال ہوا ۔

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا ؟ کیجیے ہائے ہائے کیوں ؟

○●○

انوار رضوی

غالب کا ایک شعر (۲)

بیضہ آسا تنگ بال و پر یہ ہے کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

مرزا غالب کے متداول دیوان کے ہم عصر ایڈیشنوں میں مذکورہ بالا شعر اسی ہئیت میں ملتا ہے۔ یہ اس شکل مصرعہ اولیٰ میں بیضہ آسا کنجِ قفس کی تشبیہہ ہے۔ شاعر خود کو پرند کے ساتھ شناخت کررہا ہے قید کنایہ ہے نامساعد اور بے چارگی کے حالات کا۔ انڈے میں کوئی سوراخ یا در نہیں ہوتا۔ مصرعہ ثانی میں رہائی کی خواہش اور دعا ہے۔ آزادی حیاتِ نو کا پیام ثابت ہوگی مگر یہ نئی زندگی رہائی کے بعد حاصل ہوگی۔

ہماری دانست میں جب غالب ۱۸۶۲ء میں اپنے دیوان کے چوتھے ایڈیشن کے لیے پریس کاپی تیار کر رہے تھے تب انھوں نے اس شعر کو بدل کر درجِ ذیل ہئیت کا بنا دیا تھا۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

(پوری بحث کے لیے دیکھیں راقم کا مضمون "غالب کا ایک شعر" مشمولہ رسالہ "کتاب نما" شمارہ اگست ۹۹ء)

اپنے شعر سے غیر مطمئن ہونا، خود اصلاح کر کے اسے خوب سے خوب تر بنانا یا غیر مطمئن ہوکر رد کردینا مرزا غالب کا رویہ تھا۔ پہلے ہی اس رویہ کی نمود میں معتبر دوستوں کی تحریک رہی ہو مگر اس کی مثالوں سے نسخہ حمیدیہ اٹا پڑا ہے۔ اس شعر کی اصلاح میں انوکھا پن صرف اتنا ہے کہ اشعار میں ترمیم و اصلاح، رد و قبول کا تمام کام وہ دیوان کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت سے پہلے ختم کرچکے تھے۔ بعد کے ایڈیشنوں میں اشعار کا اضافہ البتہ کیا ہے۔ شعر بدلا نہیں ہے۔ ان کے اشعار کے ضمن میں قرات کے جو تنازعے اٹھتے بھی ہیں ان کا تعلق سکون و اوقاف، اضافت یا عدم اضافت، یائے معروف و مجہول کے تعین سے ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دیوان کی اشاعت تک اردو میں کاما، فل اسٹاپ کا نفوذ نہیں ہوا تھا، کسرہ، اضافت خال خال تھا اور یائے معروف و مجہول کا خلط تھا۔

دیوان کے تیسرے ایڈیشن میں کتابت کی بہت سی غلطیاں راہ پاگئی تھیں اور اس وجہ سے وہ دن رات کی محنت سے مرزا غالب نے چوتھے ایڈیشن کے لیے کاپی تیار کی تھی۔

مطبعِ نظامی کانپور سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہونے والا دیوان غالب کا چوتھا ایڈیشن اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ غالب کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری ایڈیشن ثابت ہوا۔ مذکورہ شعر چوتھے ایڈیشن میں درجِ ذیل طریقہ پر شائع ہوا،

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے۔

اس کی کتابت میں غلطی تو ضرور رہ گئی کیوں کہ تنگ پر کسرہ، اضافت روز مرہ کے خلاف تھا۔ مصرعِ اولیٰ میں "پہ" کا "یہ" بن گیا ہے اور "یہ" ہے کے بعد آ گیا۔ مصرعِ ثانی میں "گر" کا کر بن گیا اور "یہ" ہے کہ بعد آگیا۔ مصرعِ ثانی میں "گر" کا "کر" بن گیا۔ گویا کاتب نشے میں تھا۔ تیسرے ایڈیشن میں بہت سی غلطیوں کے باعث کاتب کو کتنا پھٹکار کر رکھا گیا ہوگا پھر بھی ایک شعر میں چار غلطیاں کاتب کی مان لی گئیں اور بعد کے ایڈیشنوں میں یہ شعر اپنی پہلی قرات کو رجوع کرگیا اور آج تک اسی صورت میں چلا آتا ہے۔

زیرِ بحث شعر کی مقبول عام ہئیت کا مطلب ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ البتہ مصرعِ اولیٰ میں اگر بال و پر کی بجائے پرند رکھ دیا جائے۔ تو معنی میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ مصرعِ اولیٰ کی نثر اس صورت میں یہ بنے گی کہ بیضہ کے مانند کنجِ قفس پرند پر تنگ ہے۔ بال و پر پہ کنجِ قفس تنگ ہے ایک سیدھی بات ہے مگر پرند پر قفس تنگ ہے، میں ایک محاورہ بن گیا۔ "احمد پر گھر تنگ ہے" کے معنی ہیں احمد کے لیے گھر میں گنجائش نہیں ہے۔ احمد کو باہر نکال دیا جائے گا یا احمد گھر سے باہر نکل جائے گا۔ قیدی (پرند) قفس سے باہر نکل جائے گا کوئی رنج کی بات نہیں ہے بلکہ نوید ہے۔ یہ معنی منشائے مصنف کے خلاف تھے۔ یہ بے لطفی مرزا موصوف کے ذوق لطیف پر گراں گزری ہوگی وہ عاجز الکلام ہرگز نہ تھے۔ شعر کو بدل کر درجِ ذیل ہئیت کا کر دیا گیا۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہوکر رہا ہو جائیے

دراصل چوتھے ایڈیشن میں یہ شعر محض ایک سہوِ کتابت کا شکار تھا یعنی مصرعِ اولیٰ میں کاتب نے تنگ کی بجائے تنگِ کتابت کردیا تھا۔ کسرہ، اضافت اپنی جگہ ٹھیک تھا۔

نسخہ حمیدیہ، مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی بھوپال، طبع دوم ۱۹۸۲ء میں یہ شعر واضح طور پر درجِ ذیل طریقے پر شائع ہوا ہے۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

اس میں مصرعہ اولیٰ توجہ طلب ہے جو چوتھے ایڈیشن کے طرز پر ہے علاوہ تنگِ کے۔

شعر کی دوسری ہئیت جس کو ہم درست سمجھتے ہیں یعنی

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہوکر رہا ہو جائیے

اس میں شعر کا تیور بدل گیا۔ پہلی شکل میں بے چارگی اور فریاد تھی (وہ بھی غالب کے کلام میں ایک مستقل تھیم ہے) بدلی ہوئی شکل میں قیدی گویا قید کا چیلنج قبول کر رہا ہے اور آمادہ، پیکار ہے۔ شعر کی نثر اب یہ ہوگی:

بیضہ آسا کنجِ قفس بال و پر یا پرند کے لیے باعث تنگ ہے (کنایہ: آزادی یا پرواز کے بغیر زندگی موت کے مساوی ہے) مصرعہ ثانی کا پیغام ہے (خود کلامی ہے) پھر سے زندگی ہوجا اور قید و بند سے آزاد ہوجا۔ اس میں ترتیب بدل گئی یعنی پہلے زندگی ہو تو آزادی مل جائے گی۔ زندگی ہوجا میں قم باذن اللہ کے دھمک سنی جاسکتی ہے اور یہ کہ آدمی خود ہی اپنا مسیح بھی ہے۔ زندگی ہوتا یا زندگی فلاں اردو یا فارسی میں محاورہ نہیں ہے مگر بہ قول شمس الرحمٰن فاروقی۔ غالب کوئی ذوق یا ناسخ تو تھے نہیں جو اردو زبان کو مکمل سمجھتے ہوں۔

(باقی ص: ۴۴ پر)

ڈاکٹر یونس اگاسکر

اولین ڈراما - "راجا گوپی چند جالندھر" اور اس کا مصنف

اردو کے اولین ڈراموں میں "راجا گوپی چند جالندھر" کا شمار ہوتا ہے یہ ڈراما پہلی بار ۱۸۵۲ء یا ۱۸۵۳ء میں ممبئی کے گرانٹ روڈ تھیٹر میں کھیلا گیا۔ سب سے پہلے غالباً ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے اس ڈرامے کی طرف اردو والوں کو متوجہ کیا۔ لیکن اس ڈرامے کے تعلق سے ڈاکٹر نامی نے جو تحقیقی مواد پیش کیا ہے، اس کی صحت میں شک اور تردد کی گنجائشیں باقی رہ گئی ہیں۔ خصوصاً ان کی یہ تحقیق کہ اس ڈرامے کے خالق انیسویں صدی کی صد آفریں شخصیت ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ ہیں، قطعی قابلِ قبول نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "راجا گوپی چند جالندھر" کے خالق مراٹھی ناٹک اور اسٹیج کے بانی وشنوداس امرت بھاوے ہیں جو سانگلی کے رہنے والے تھے اور جنھوں نے اپنی تشکیل کردہ "ہندو ناٹک منڈلی" کے ساتھ کیے گئے ممبئی کے تین دوروں میں سے کسی ایک (غالباً دوسرے) دورے میں یہ ناٹک نئے سرے سے ترتیب دے کر پیش کیا (وشنوداس بھاوے کے حالات اور خدمات سے متعلق تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے "مراٹھی ادب کا مطالعہ از یونس اگاسکر ۱۹۷۰ء، ص: ۱۲۲ تا ص: ۱۳۰)

اس ناٹک کے اصل مصنف وشنو امرت بھاوے نے اپنی کتاب "ناٹیہ کویتا سنگرہ" میں خود اس بات کا واضح اعتراف کیا ہے کہ وہ جب ممبئی کے دورے پر آئے تو انھوں نے یہاں کی عام فہم "ہندستانی" زبان میں ایک ناٹک "راجا گوپی چند جالندھر" تیار کر کے پیش کیا۔ مراٹھی کے مشہور محقق اور مراٹھی اسٹیج کے مستند مورخ سری۔ نارین ہٹ نے اپنی کتاب "مراٹھی رنگ بھومی چا اتہاس" (مراٹھی اسٹیج کی تاریخ) میں بھاوے کے اسی "ہندوستانی" ناٹک کا ذکر کیا ہے اور اسے ۱۸۵۲ء یا ۱۸۵۳ء کی تصنیف بتایا ہے۔ بن ہٹ صاحب کی کتاب کے ضمیمے میں وشنوداس بھاوے کے "آکھیانوں" (منظوم ڈراموں) کی فہرست پیش کی گئی ہے اس میں سب سے اخیر میں "گوپی چند آکھیان" درج ہے جس کے تعلق سے موصوف لکھتے ہیں:

سب سے آخری یعنی گوپی چند آکھیان مکمل طور پر ہندوستانی میں ترتیب دیا گیا ہے۔ (اسی میں) گنپتی کی حمد اور آشیرواد کے دو پد ہندوستانی ہیں۔ یہ دونوں پد گوپی چند آکھیان کی پیشکش کے وقت گائے جانے کے لیے لکھے گئے ہوں گے ....
اسی آکھیان پر وشنوداس نے ایک نوٹ بھی دیا ہے کہ "اس آکھیان کی کچھ کویتا پرانے کویوں سے لی ہے اور کچھ میں نے کی ہے۔" (ص: ۴۱۳) (۱)

بن ہٹ صاحب نے وشنوداس بھاوے کی جس تحریر کا حوالہ دیا ہے وہ ان کی کتاب "ناٹیہ کویتا سنگرہ" کے ص ۳۰۵ پر "گوپی چند آکھیان" کے تحت دیے گئے فٹ نوٹ کے طور پر موجود ہے۔ "ناٹیہ کویتا سنگرہ" بھاوے کے منظوم ناٹکوں یا ان میں مستعمل کویتاؤں کا مجموعہ ہے یہ کتاب جنوری ۱۸۸۵ء میں پونا سے چھپی ہے اور اس میں ان کا مقدمہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے اپنی ڈراما نگاری اور ڈرامے کی پیشکش کے لیے کیے گیے دوروں کا ذکر بہ تفصیل کیا ہے۔ (۲)

"گوپی چند آکھیان" کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس منظوم ناٹک کی زبان نہ تو معیاری ہندی ہے نہ ہی معیاری ردو ۔۔۔ ناٹک کا پس منظر ہندو دیومالا سے ماخوذ ہے۔ اس لیے اس کے مکالموں پر سنسکرت، برج بھاشا اور راجستھانی کا اثر فارسی یا ٹھیٹ اردو کے مقابلے میں زیادہ نظر آتا ہے۔

ذیل کی مثال سے میرے اس بیان کی تصدیق ہوگی:

नाथ जालंदर रहत गालिनमों जोगा जुगत संजोग ।
काया नछाया नाहि मुलमाया जुगम जोतसे भोगा ॥

दिनानाथ बोले माहिपाल भाई । नहीं मे किसे मंत्रमाला सुनाई ॥
नही सार संसार की सूत पाई । नहीं जोगा अंजोग बानी बताई ॥

ظاہر ہے کہ یہ برج بھاشا کا وہ روپ ہے جو ہندوستانی موسیقار اور گایک سینکڑوں سال سے برتتے آئے ہیں۔ بھاوے نے بھی کویتا میں بھاشا کا یہی پٹ اختیار کیا ہے اور اس میں مراٹھی الفاظ و تراکیب کی آمیزش کی ہے۔ "ناٹیہ کویتا سنگرہ" میں شامل اقتباس کے پیش نظر "راجا گوپی چند جالندھر" کو ہندوستانی یا اردو کا ناٹک کہنا مشکل ہے۔ اس ناٹک کا مکمل مسودہ دست یاب ہونے پر ہی اس کے بارے میں فیصلہ کرنا آسان ہوگا۔ البتہ مہاراشٹر میں اردو اسٹیج کی روایت کو پروان چڑھانے میں اس ناٹک کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

فی الوقت اس ناٹک کی اولیت و اہمیت سے زیادہ اس کا انتساب زیر بحث ہے۔ اگرچہ مشہور محقق اور "اردو تھیٹر" کی تاریخ کے مصنف مرحوم ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے اسے ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ کی تخلیق بتایا ہے لیکن اس تحقیق کو تسلیم کرنے میں مجھے حسب ذیل نکات کے سبب سخت تردد ہے:

۱ ڈاکٹر لاڈ کی ڈراما نگاری کا کوئی ثبوت ڈاکٹر نامی نے فراہم نہیں کیا ہے۔

۲ ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ کے تذکرے پر مشتمل کسی انگریزی یا مراٹھی کتاب میں ان کی ڈراما نگاری کا ذکر نہیں ملتا۔

۳ ڈاکٹر لاڈ کے سوانح نگاروں اے۔ کا۔ پریولکر (مراٹھی) اور جی۔ ایم۔ لاڈ (انگریزی) نے ڈاکٹر لاڈ کی ڈراموں سے دلچسپی اور دیسی اسٹیج کی ہمت افزائی پر بہ تفصیل روشنی ڈالنے کے باوجود ان کی ڈراما نگاری کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

۴ مراٹھی ڈرامے کی کسی تاریخ میں بہ حیثیت مصنف ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ کا یا ان کے کسی ڈرامے کا ذکر نہیں ملتا۔

۵ شری اَ۔ کا۔ پریولکر نے واضح الفاظ میں ڈاکٹر نامی کے خیال کی تردید کی ہے اور حوالوں کے ساتھ اس نسبت سے انکار کیا ہے۔

اننت کاکبا پریولکر (اَ۔ کا۔ پریولکر) مراٹھی کے مشہور محقق ہیں انھوں نے "ڈاکٹر بھاؤ داجی: شخص، عہد اور کارنامے" کے زیر عنوان ڈاکٹر لاڈ کی سوانح عمری لکھی ہے جو ممبئی مراٹھی ساہتیہ سنگھ کے زیر اہتمام ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ڈاکٹر لاڈ کی ڈرامے سے دل چسپی اور اس صنف کی سرپرستی کا بہ تفصیل ذکر ملتا ہے۔ ذیل میں اس کتاب کے چند اقتباسات یا حوالے درج کیے جاتے ہیں، جن سے میرے مندرجہ بالا بیانات کی تائید ہوگی۔ سب سے پہلے "دی ٹائمز آف انڈیا" کی یکم جون ۱۸۶۴ء کی اشاعت سے

ماخوذ ایک انگریزی اقتباس ملاحظہ ہو:

(الف)

"To his exertions also the Native drama owes the place which it has of late years taken amongst the amusements of the native public of Bombay. He was the first to encourage the cultivation and has always been spoken of as the parton of Bombay native Drama"... (The Times of India.... 1st June 1874).

(ب) نیٹیو اوپنین" نے ۶ جون ۱۸۷۴ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ اصل سانگلی کرچا (یعنی وشنوداس بھاوے) کا ناٹک جب پہلی بار ممبئ آیا تب انھوں (بھاؤ داجی) نے ان کی بہت مدد کی جس کی بنا پر آج ناٹک کی صنف کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ (ص: ۱۹۲)۔

(ج) پریولکر صاحب نے ڈاکٹر لاڈ کو پتا سمان ماننے والے ان کے ایک غیر معمولی ہم عصر شری وشنو ناتھ نارایَن منڈلیک کے نام لکھے گئے ایک خط کے چند جملے بھی نقل کیے ہیں جن سے ڈاکٹر لاڈ کے اس شوق کی تصدیق ہوتی ہے۔

مصنف نے یہ اقتباس شری منڈلیک کی سوانح عمری مولفِ شری جولدار سے اخذ کیا ہے:

"۱۸۵۳ء میں سانگلی کی ایک ناٹک منڈلی ممبئ آئی تھی۔ وہ رامایَن اور مہابھارت پر مبنی ناٹک گرانٹ روڈ کے ناٹک گھر میں پیش کیا کرتی تھی۔ اداکاروں کی تعداد ۳۰ تھی۔ اس کے چکر میں کافی لوگ آگئے تھے اس لیے شو میں کافی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ تعلیم یافتہ شوقینوں میں ڈاکٹر بھاؤ ایک باذوق انسان ہونے کے ناتے بہت نمایاں تھے۔" (ص: ۱۹۵)

(د) پریولکر صاحب نے گجراتی زبان میں چھپنے والے پارسیوں کے اخبار "راست گفتار" میں ڈاکٹر لاڈ کی موت پر شائع شدہ شذرے کا حوالہ بھی دیا ہے۔ جس میں مرحوم کی کوشش سے بھاوے کو گورنر لارڈ الفنسٹن کی رہائش گاہ واقع پریل میں شو کرنے کا موقع ملنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن انھوں نے اسے قابلِ اعتبار نہیں سمجھا ہے۔ (ص: ۱۹۶)

ڈاکٹر نامی نے نہ صرف "راجا گوپی چند جالندھر" کی تخلیق کا سہرا ڈاکٹر لاڈ کے سر باندھا ہے بلکہ ان سے یہ ناٹک لکھوانے کا کریڈٹ انیسویں صدی کی ایک اور عہد ساز شخصیت ناناشنکر شیٹ کو دیا ہے۔ چناں چہ نانا شنکر شیٹ کے سوانح نگار پو۔ با۔ گلگرنی نے ان کے حوالے سے اس غلط فہمی کا اعادہ کیا ہے۔ پریولکر صاحب نے گلگرنی صاحب کا جو اقتباس پیش کیا ہے اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

"ہندی آسانی سے سب کی سمجھ میں آنے والی بھاشا ہے۔ اس لیے اس زبان میں ناٹک کیے جائیں تو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فایدہ پہنچے گا۔ اس خیال کے تحت انھوں (ناناشنکر شیٹ) نے اپنے شریک کار بھاؤ داجی سے اصرار کر کے راجا گوپی چند کتھا تک کے سارے ایک ہندی ناٹک لکھوایا اور شاہی ناٹک گھر میں اس کے شو کرائے۔" (ص: ۲۵۸)

یہ حوالہ دے کر پریولکر لکھتے ہیں:

(د) ڈاکٹر نامی سے میں واقف ہوں۔ میں نے انھیں سرکاری دفتر خانے (رکارڈ آفس) میں مدعو کیا اور ڈاکٹر بھاؤ داجی سے متعلق اس قسم کا تذکرہ جس پرانے اخبار میں ملتا ہے اس کی نشان دہی کرنے کی درخواست کی کیوں کہ یہ عین ممکن تھا کہ میری نظر

اس پر نہ پڑی ہو۔ میری درخواست پر وہ رکارڈ آفس آئے بھی لیکن مذکورہ حوالہ نکال کر نہیں دکھا سکے۔" (ص: ۱۹۶)

(ڈ) اسی صفحے پر پریولکر صاحب نے یہ بھی درج کیا ہے کہ انھوں نے انگریزی اخبار "ٹیلی گراف اینڈ کوریئر" (جس کا حوالہ نامی صاحب نے جا بہ جا دیا ہے) کی ۷ نومبر ۱۸۵۳ء کی اشاعت میں "راجا گوپی چند جالندھر" ناٹک کا اشتہار دیکھا ہے لیکن اس میں کہیں بہ طور مصنف ڈاکٹر بھاؤ داجی کا نام مذکور نہیں ہے۔

مذکورۂ بالا بیانات اور بحث سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اولین ہندوستانی ناٹک "راجا گوپی چند جالندھر" کے خالق ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ ہرگز نہیں ہیں۔ البتہ جہاں تک وشنوداس بھاوے کے ڈراما نگار ہونے کا تعلق ہے، ذیل کے مآخذ اور دلائل سے اس کا اثبات ہوتا ہے:

۱ بھاوے کا ڈراما نگار ہونا مسلم و معلوم ہے۔

۲ ان کے ممبئی کے دوروں کا تذکرہ معاصر اخبارات اور مراٹھی ڈرامے کی تاریخوں میں ملتا ہے۔

۳ انیسویں صدی میں پونا اور ممبئی سے شایع ہونے والے اخبارات کی فائلوں میں بھاوے کی ناٹک منڈلی کے ذریعے "راجا گوپی چند جالندھر" کے کھیلے جانے کی خبریں اور اشتہارات ملتے ہیں۔

۴ وشنوپنت بھاوے کے سوانح نگار راو صاحب بھاوے نے "راجا گوپی چند جالندھر" کو بھاوے کی تصنیف بتا کر اس کی اولین پیشکش کا ذکر کیا ہے۔

۵ سری نا بن ہٹی نے اپنی کتاب "مراٹھی رنگ بھومی چا اتہاس" (مراٹھی اسٹیج کی تاریخ) بھاوے کے ہندوستانی ناٹک "گوپی چند جالندھر" کا تذکرہ کیا ہے اور اسے ان کے دوسرے دورہ ممبئی یعنی ۱۸۵۲ء۔۱۸۵۳ء کے زمانے کی تصنیف بتایا ہے۔

۶ خود وشنوپنت بھاوے کے بیانات سے ان کے مصنف ہونے اور بھاؤ داجی لاڈ اور ناناشنکرشیٹ کے ڈراما نگار کے بہ جائے ڈرامے کے شوقین اور سرپرست ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اپنے منظوم آکھیانوں کے مجموعے "ناٹیہ کوتیا سنگرہ" کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں:

"میرے کھیل البتہ وہاں کے (ممبئی کے) مقتدر لوگوں کو بہت پسند آئے۔ اور میری بہت تعریف ہوئی۔ ساتھ ہی ڈاکٹر بھاؤ داجی، شری آبا صاحب شاستری، ناناشنکرشیٹ اور سر جمشید جی جیسے بڑے لوگوں سے میرے دوستانہ مراسم قایم ہوگئے۔" (ص: ۸۹)

۱۸۴۰ء میں گرانٹ روڈ پر انگریزوں نے انگریزی ڈرامے کھیلنے کے لیے ایک تھیٹر تعمیر کیا تھا۔ وشنوپنت بھاوے وہاں اپنا ناٹک کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں جن لوگوں نے ان کی مدد کی ان میں ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ اور ناناشنکرشیٹ کا نام انھوں نے خاص طور سے لیا ہے۔ بھاؤ داجی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"میں نے ایک ناٹک تیار کرکے وہاں پیش کیا۔ اس دن ممبئی کے سیٹھ ساہوکار، سرکاری نوکر، یورپین، پارسی وغیرہ بڑی بڑی اسامیاں موجود تھیں۔ ناٹک ختم ہونے پر بھاؤ داجی گورنر صاحب کے سیکریٹری کو لے کر گرین روم میں آئے۔ ہمارا سارا انتظام اور ٹیپ ٹاپ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور بولے "آپ کا شو دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔" (بہ حوالہ ڈاکٹر بھاؤ داجی، شخص ت صد

... بہار حیدرآباد

اور کارنامے ص: ۱۲۵)

کتابیات

1- Laud G.M : Dr Bhai Daji Lad Parsekar - A Biography: Government of Goa, Daman & Diu. 1974

2- प्रियोलकर, अ. का.: डॉक्टर भाऊ दाजी : व्यक्ति, काल व कर्तृत्व; मुंबई मराठी साहित्यसंघ, मुंबई, १९७१

3- श्री. ना. बनहट्टी : मराठी रंगभूमीचा इतिहास; व्हीनस प्रकाशन पुणे, १९५७

4- विष्णुदास उर्फ विष्णु अमृत भावे : नाट्य-कविता संग्रह; श्री शिवाजी छापखाना, पुणे, जानेवारी १८८५

٭ ونس اگاسے: مراٹھی ادب کا مطالعہ۔ نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ ممبئی ۱۹۸۰

حوالے:

1- मराठी रंगभूमीचा इतिहास : श्री. ना. बनहट्टी; व्हीनस प्रकाशन, पुणे; १९५७.

2- नाट्य कविता संग्रह : विष्णुदास उर्फ विष्णु अमृत भावे; श्री शिवाजी छापखाना पुणे; जानेवारी १८८५.

○●○

(سلسلہ ص: ۳۹ سے)

غالب نے یہاں ایک نیا اور بولتا ہوا محاورہ تخلیق کردیا ہے۔

اس شعر میں کرشمہ تشبیہ بیضہ آسا کا ہے۔ پہلی شکل میں یہ تشبیہ مصرعہ اولیٰ پر ختم ہوجاتی تھی مگر دوسری شکل میں یہ مصرعہ ثانی تک پھیل گئی۔ زردی سفیدی کے ملغوبہ پر انڈہ کسا رہتا ہے بند رہتا ہے مگر جیسے ہی اس ملغوبہ سے چوزہ بنتا ہے اور اس میں زندگی سرایت کرتی ہے انڈہ خود بہ خود ٹوٹ جاتا ہے اور چوزہ باہر نکل آتا ہے۔

غالب ہمہ اوست کے صوفیانہ فلسفہ کو عزیز رکھتے تھے۔ متعدد اشعار ان کے دیوان میں اس کے اثبات میں ہیں۔ غالب فرد کو خود کفیل بھی مانتے ہیں یعنی قوت کا منبع آدمی کے بطون میں ہے مثلاً:

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

زیرِ بحث شعر اپنی دوسری ہیئت یعنی صحیح ہیئت میں غالب کا نمائندہ شعر ہے اور ان کے بلیغ ترین اشعار میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

○●○

ایڈورڈ ہیوز
ترجمہ: ڈاکٹر اختر سلطانہ

ابلہ

(ابلہ (Ebla) ایک بھولی ہوئی مملکت)

شام میں آرکیالوجی کا حیران کن انکشاف جو بائبل کی گھنٹیوں کی آواز کی بازگشت میں ایک بالکل نئے زاویہ سے اس زمانے کی تاریخ پر روشنی ڈالتا ہے۔

------ ------ ------

کچھ ہی عرصہ قبل آنکھوں کو چندھیا دینے والی سورج کی تیز روشنی میں میں شام (Syria) کے شمالی جانب واقع ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا آثارِ قدیمہ کے ان ماہرین اور محققین کو دیکھ رہا تھا جو کھدائی میں مصروف تھے۔ وہ ایک عرصہ دراز قبل فراموش شدہ ایک قدیم مقام "Ebla" کے اسراروں کو جاننے کے لیے کوشاں اور سرگرمِ عمل تھے۔ Ebla جو کبھی ایک عظیم اور طاقتور مملکت تھی۔ اٹلی کے ایک ارکیالوجسٹ نے اس شہر کی تلاش میں وہاں کی ایک ایک اینٹ کھود نکالی تھی۔ اس مملکت کے جو آثار برآمد ہوئے ان کو دیکھ کر آثارِ قدیمہ کے ماہرین دنگ رہ گئے کیوں کہ وہ دو درخشاں تہذیبوں "مصر" اور "میسو پوٹیمیا" میں موجود آثارِ قدیمہ کے نمونوں سے بہت حد تک مشابہ تھے (جن کا زیادہ حصہ آج عراق میں ہے) ان تہذیبوں کے تعلق سے خیال یہ تھا کہ وہاں کی سلطنتیں تاریخ کے بالکل ابتدائی دور میں برسرِ اقتدار تھیں۔ اٹلی کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہاں کی تہذیب جیسا کہ قیاس کیا گیا اس سے کچھ زیادہ ہی قدیم ہے۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ اب تک کی تحقیقات کی روشنی میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ دونوں تہذیبیں ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو پھلتی پھولتی رہیں۔ Ebla کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ۲۳۰۰ ق ۔ م ۔ میں ایک ترقی یافتہ تجارتی مرکز کے ساتھ آرٹ اور فنِ تعمیر و تحریر میں کسی اور قدیم تہذیب سے پیچھے نہیں تھا۔ اس سرزمین کو ان سلاطین نے فتح کیا تھا جن کا اثر و رسوخ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ متقدمین کی تحقیقات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک بالکل نئی تہذیب تھی جہاں نہ صرف ایک نئی زبان رائج تھی بلکہ جو ایک نئی تاریخ کی حامل بھی تھی۔ شکاگو کے ممتاز مورخین اس جدید تحقیق کے بعد یہ جان کر پھولوں نہ سماتے کہ Ebla کے ایک طاقت ور حکم راں بادشاہ کا نام "Ebrum" تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ بائبل کے اسکالرس کے لیے بھی یہ انکشاف متحیر کن تھا کہ یہاں کا ایک عظیم حکم ران "ابراہیم" نامی شہنشاہ تھا۔ کھدائیوں کے بعد حاصل شدہ معلومات سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ یہ نام "Eber" سے ملتا جلتا ہے جس کا ذکر بائبل میں یہودی قوم کے بڑے کی حیثیت سے آیا ہے ان کے اسلاف میں وہ نام بھی ملتے ہیں جن کا ذکر بائبل میں موجود ہے جیسے "Abraham", "Saul", "Esau", "David" وغیرہ اور چند ایک ایسے مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے جو آج بھی موجود ہیں۔ مثلاً اسرائیل ، سینائی ، Gaza اور یروشلم وغیرہ۔

ان حاصل شدہ معنی خیز معلومات کی روشنی میں اور آئندہ آنے والے سالوں میں جو تحقیقات اس ضمن میں ہوں گی۔ اس تعلق سے "ماہرین اور محققین ابھی غور و فکر میں منہمک اور مصروفِ تحقیقات ہیں۔ اس بارے میں مزید تفحص اور اس کی وضاحت کرنے کے لیے ایسے چشم بینا رکھنے والے ماہر آرکیالوجسٹوں کی ضرورت تھی جو اس بے برگ و گیاہ، لق و دق، بے رنگ، اجاڑ سلسلہ، کوہ پر واقع اس گم شدہ شہر کی تصویر کشی کر سکیں اور ان تفصیلات کو منظرِ عام پر لاسکیں جو کبھی سرگرمِ عمل اور زندگی سے بھرپور تھا۔

اس کے لیے آرکیالوجی کے ایک ۳۸ سالہ پروفیسر Padlc Matthiae کا انتخاب کیا گیا جس نے ۱۵ سال کی تگ و دو اور جدوجہد کے بعد روم کی یونی ورسٹی میں اس شہر کا سراغ لگانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس نے وہاں کے ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوکر ایک تودہ، ریگ پر جس کا قطر ۸۰ میٹر تھا۔ ایک تین میٹر چوڑا نشان لگایا جو اس کی ایک سمت کو قطع کرتا ہوا گزرا تھا اور اس بات کی نشان دہی کی کہ اس شہر کا اصلی دروازہ نشان کردہ مقام پر واقع تھا اور اس پہاڑ کی چوٹی کے نشیب میں ایک جانب سے دوسری جانب تک "Ebla" کے عوام رہائش پذیر تھے۔ اس نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ پہاڑ کی چوٹی پر وہاں پوجے جانے والے دیوتاؤں کا ایک مندر بھی ملے گا اور بادشاہوں کے رہائشی محلات بھی۔

۱۹۶۵ء میں اطالوی ماہرین نے اپنی نگرانی میں ایک جانب سے کھدائی کا آغاز کرنے کا عزم کیا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں سے روم کی یونی ورسٹی میں مہم کو شروع کرنے کی نشان دہی کی گئی تھی۔ جس کے بارے میں خیال تھا کہ وہاں آثارِ قدیمہ مدفون ہوں گے۔ اس کے لیے شام کی سرزمین کا انتخاب کیا گیا کیوں کہ شام مغربی اشیاء کا وہ سب سے چھوٹا علاقہ تھا جہاں سے کھدائی کا آغاز کیا جاسکتا تھا۔ اس خطہ زمین پر سینکڑوں مٹی کے ٹیلے تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے تھے ان پر نقاط لگائے گئے۔ اس سرزمین کے بارے میں تحقیقات کے بعد یہ معلومات علم میں آئی تھیں کہ یہاں کئی فاتح حکم رانوں نے نئی نئی تہذیبوں کی نشو و نما کی تھی۔ جو مٹی کے بنے ہوئے اس شہر کے کھنڈرات میں پوشیدہ تھیں اور جہاں کی آبادی کثیر تھی وہاں کے صرف چند درجن ٹیلوں کو کھدائی کے لیے منتخب کیا گیا۔

دو فرنچ محققین نے ۱۹۳۰ء میں دو قدیم ترین اور نظر فریب شہروں کا سراغ لگایا تھا۔ جن کے نام تھے "Ugarit" اور "Mari" جنھوں نے خاص طور سے اس دور کی وضاحت کی جو ۱۹۰۰ قبلِ مسیح اور ۱۲۰۰ قبلِ مسیح کا ہے لیکن اس کی قدامت کے تعلق سے "Matthiae" کا خیال تھا کہ یہ ۲۰۰۰ قبلِ مسیح اور ۳۰۰۰ قبلِ مسیح کا مصری دور تھا جب کہ میسوپٹیما اور مصر میں تحریر پہلے پہل وجود میں آئی تھی۔

MATTHIAE وہاں موجود ان سینکڑوں پہاڑ کی چوٹیوں کو دیکھ کر متذبذب تھا کہ اپنے کام کا آغاز کہاں سے کرے۔ اسے ۵۶ ہیکٹر پر پھیلی ہوئی وہ زمین پر کشش محسوس ہوئی جو "Aleppo" کے قریب ۵۵ کیلومیٹر کی دوری پر جنوب مغرب میں واقع تھی۔

کھدائی کے دوران وہاں سے ایک سنگی بیسن اور سفالی برتن کا ایک شکستہ ٹکڑا جو قدیم زمانے میں مروجہ ظروف کے مماثل تھا۔ دستیاب ہوا اور اس کا خیال یقین میں بدل گیا کہ نیچے کسی مقام پر کبھی ضرور ایک عظیم پر کشش سوسائٹی موجود تھی ہوگی۔

Matthiae موسم گرما میں ایک چھوٹی سی اطالوی اسسٹنٹوں کی ٹیم کے ساتھ Aleppo کو پھر واپس ہوا اور شام کے محکمے آثارِ قدیمہ کی مدد سے کچھ مزدوروں کو لے کر کھدائی کا آغاز کیا۔ اس نے جن کھنڈرات کو پہلے کھدائی کے لیے منتخب کیا دراصل وہ مڈل برانز ایج (جس کی ابتداء ۲۰۰۰ بی۔ سی کے قریب قیاس کی گئی ہے) کا ایک کافی ترقی یافتہ شہری مرکزی مقام نکلا۔ اس مقام پر کچھ ہفتوں کی کھدائی کے بعد ایک عظیم الشان شہری دروازہ ملا اور ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیانی عرصے میں ایک محل کا کچھ حصہ اور پھر ایک سال بعد ایک

بڑا مندر ملا۔ لیکن وہ اس بات سے لاعلم اور متجسس تھا کہ آخر یہ کس شہر کے کھنڈرات ہیں؟

۱۹۶۸ء میں ایک دن کھدائی کرنے والوں نے ملبے کے ڈھیر سے ایک شکستہ اسٹیچو کا آدھا دھڑ برآمد کیا۔ جو بہ ظاہر وہاں کی کسی نام ور ہستی کے مجسمے کے مانند تھا۔ اس کا سینہ اور کاندھا ایک مثلثی وضع کے تہہ کیے ہوئے کپڑے کی ایک سنگی پٹی سے ڈھکا ہوا تھا جس پر قدیم آشور خط میں کوئی عبارت تحریر تھی۔

ٹیم کا ایک ممبر جو بالکل ابتدائی "Akkadian" میسو پوٹیمین زبانیں پڑھنے کا ماہر تھا اس نے ۲۶ لائینوں کا ترجمہ کیا۔ یہ تحریر وہاں کی ایک مقامی دیوی کے نام نذرِ عقیدت کے طور پر لکھی گئی تھی۔ اس عبارت کی ساتویں لائن میں ایک لفظ "IN EBLA" اس لفظ کو پڑھنے کے بعد ٹیم کے ممبران متحیر رہ گئے کہ کیا یہ وہی پُر اسرار شہر Ebla ہے جس کا ذکر میسوپوٹیمیا اور مصر میں ملنے والے کتبات میں موجود تھا؟ بہت سے محققین نے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ مقام "Anatolia" جدید ترکی" کا بھی ہوسکتا ہے۔

مجسمے پر کندہ تحریر کے غائرانہ مطالعے کے بعد Matthiae اور اس کی ٹیم اس نتیجے پر پہنچی کہ انھوں نے جس شہر کو کھوج نکالا ہے وہ یقیناً قدیم شہر "Ebla" ہی ہے اور یہ اعلان کیا کہ اس تحقیق سے جو نتیجہ انھوں نے اخذ کیا اس کو سائنسی دنیا تک پہنچادیا جائے گا۔ اس کا ردِ عمل کہیں پر جوشانہ، کہیں مشکوک قسم کا رہا۔ کچھ پارٹیاں حرکت میں آئیں اور کچھ نقادوں نے شکوک کا اظہار بھی کیا۔ نتیجے میں اطالوی ٹیم نے ایک بار پھر پورے استقلال سے تفتیش شروع کی تاکہ مزید تحقیق کے ذریعے ٹھوس ثبوت اور شہادتیں فراہم کی جاسکیں۔ اس مقصد سے ۱۹۷۳ء میں پہلے سے زیادہ گہرائی میں جاکر ان کھنڈرات کا جائزہ لیا گیا اور کافی محنت و کاوش کے بعد کئی سفالی برتن اور تحریر شدہ کتبے برآمد کیے گئے۔ جو کچھ دستیاب ہوا انھیں چھانٹ کر الگ الگ رکھا گیا اور ان کو دھوکر صاف کرنے کے بعد ایک فہرست مرتب کی گئی ہے جس کے ذریعے یہ معلومات علم میں آئیں کہ یہ قدیم شہر کم از کم ۲۴۰۰ قبلِ مسیح کا ہے۔

اس نئی تحقیق کے بعد کھدائی کرنے والے کھنڈرات میں تلاش کرتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچے جہاں ایک دو منزلہ شان دار شاہی محل اور ایک وسیع ہال موجود تھا۔ جہاں عوام جمع ہوتے ہوں گے وہاں ایک زینہ اور کمرے بھی تھے جن میں رنگین فرش بچھا ہوا تھا۔ ان کمروں میں جلے ہوئے سفالی ظروف اور ملبے کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ جب ان سفالی ظروف کا موازنہ دوسرے مغربی ایشیائی کھنڈروں سے دست یاب شدہ سرمیک ظروف سے کیا گیا جن پر تاریخیں کندہ تھیں تو ان کو پیشِ نظر رکھ کر آرکیالوجسٹ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ محل ۲۲۵۰ بی۔ سی تک موجود تھا۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ اس کو تباہ اور نیست و نابود کرنے کی غرض سے آگ لگادی گئی تھی یہاں کے اسرار پر سے پردے ہٹنے لگے تھے۔ کئی میسوپوٹیمین کتبات میں یہ درج تھا کہ Elba کو طاقت ور میسوپوٹیمین اسٹیٹ "AKKAD" نے فتح کیا تھا اور اس کو ۲۲۵۰ ق۔ م میں نذرِ آتش کردیا گیا تھا۔ ۲۲۵۰ بی۔ سی کی تاریخ کا تعین جلے ہوئے سفالی برتنوں کے معائینے کے بعد حساب لگاکر کیا گیا۔

۱۹۷۴ء میں جب کہ شاہی محل کے ایک کمرے کو صاف کیا گیا تو اطالویوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ یہ شہر Elba ہی کے کھنڈرات ہیں۔ کھدائی میں مصروف ایک آدمی کے بیلچے سے دو گول چیزیں ٹکرائیں جب انھیں نکالا گیا تو وہ ۲۰ چھوٹی تحریر شدہ لوحیں تھیں جو قدیم آشور خط میں لکھی ہوئی تھیں۔ ان کی گرد صاف کرنے کے بعد انھوں نے جانا کہ یہ سخت مٹی کے بنے ہوئے کتبات تھے۔ مل ملا کر یہاں سے کوئی ۴۲ لکھے ہوئے کتبات برآمد ہوئے۔ اس تحقیقی کام میں مصروف کوئی بھی فرد ان کو پڑھنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ Matthiae نے ایک اطالوی ماہرِ کتبیات Pettinato کو فوراً تار دے کر شام طلب کیا۔ Pettinato بھی ان کتبوں

کو دیکھ کر چکرا گیا۔ اس نے کہا کہ میں ان کا ایک حرف بھی سمجھنے سے قاصر ہوں آثار سے ظاہر ہے کہ یہ یقیناً قدیم آشوری تحریر ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ الفاظ نہ تو Akkadian ہیں نہ Sumerian بلکہ قدیم ابتدائی سیمٹیمین کی زبان ہو سکتی ہے جو ایک نئی زبان ہے۔

۱۹۷۵ء میں Matthiae کی ٹیم نے ایک کمرے کی کھدائی کی جو محل کے داخلی دروازے کے بالکل بازو لگا ہوا تھا۔ وہاں سے ایک ہزار کتبات دستیاب ہوئے جو فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ اس سے متصل ایک اور کمرے سے کام کرنے والوں نے ایسے کئی کتبات نکالے جو ایک کے اوپر ایک قطار در قطار رکھے ہوئے تھے کوئی ۱۷۰۰۰ کے قریب تحریر کردہ لوحیں انبار کی صورت میں فرش پر پڑی ہوئی ہیں جن کو دیکھ کر یہ محسوس کیا گیا کہ یہ آگ لگنے کے بعد جلے ہوئے طاقوں اور خانوں سے ڈھیر کی صورت میں فرش پر آکر گری ہوں گی۔ ان میں زیادہ تر بالکل صحیح و سالم حالت میں تھیں۔ جو کچھ بھی Matthiae اور اس کی ٹیم نے کھوج نکالا اس کو انھوں نے اپنی زندگی بھر کا سرمایہ قرار دیا۔

نئی دریافت شدہ ۱۰۰ سے زیادہ مٹی کی بنی ہوئی لوحیں تھیں جو ڈکشنری کی طرح تھیں ان میں ۳۰۰۰ Eblite الفاظ کے متوازی Sumerian زبان کے ہم معنی الفاظ تحریر تھے۔ جو اس نئی دریافت شدہ قدیم زبان کے کتبوں کو پڑھنے میں مددگار ثابت ہوئے۔

اطالویوں نے جلد ہی اس بات کو تسلیم کرلیا کہ انھوں نے دنیا کے سب سے قدیم تاریخی آثار قدیمہ کی شہری مملکت کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ سرکاری طور پر موجود ریکارڈ میں یہ تحریر تھا کہ Elba کو دریافت ہوئے صرف ۱۰۰ سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ ہوا ہے لیکن اور کوئی تفصیل اس بارے میں درج نہیں تھی۔ کچھ درجن کتبات کے مطالعے کے بعد یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ Ebla کی ریاست اس کے بارڈر سے بھی آگے دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ مالی اعتبار سے وہ مستحکم تھی اور دور دراز پھیلے ہوئے کئی شہر اس کے اطاعت گزار تھے اور ان شہروں سے جو فرات کی وادی میں بسے ہوئے تھے اسے خراج حاصل ہوتا تھا جو تین ہزار قبل مسیح کے بعد کی تین صدیوں تک بھی ملتا رہا۔ Pettenato کے کہنے کے مطابق Ebla مغربی ایشیا میں سب سے طاقت ور مملکت تھی۔ کئی کتبات جو وہاں ملے ایسے تھے جو رسیدوں اور فہرستوں کے مشابہ تھے جس میں اس مال و اسباب کی قیمتیں درج تھیں جو گدھوں پر لدوا کر قافلوں کے ساتھ روانہ کرنے کے لیے تیار کیے گئے تھے۔

Ebla کے پارچہ باف اور دھات کی چیزیں بنانے والے دست کار بہت مشہور تھے وہاں لکڑی کا خوب صورت فرنیچر اور دریچے بھی تیار کیے جاتے تھے۔ اکثر پر طلائی نقشی کام بھی کیا جاتا تھا۔ ان قیمتی مصنوعات کو یہاں کے صنعت کار برآمد کرتے تھے۔ قیاس کیا گیا ہے کہ Ebla سے سامان خرید کر لے جانے والے تاجر چاندی کے ڈلوں کی صورت میں خریدے ہوئے سامان کی قیمت ادا کرتے ہوں گے یا پھر "بارلی" کی شکل میں جو ایک مفید اور کارآمد اناج تھا۔ جس کو وہاں کے باشندے بہ طور غذا کے استعمال کرتے تھے۔ بارلی غالباً اس لیے بھی اہم تھی کیوں کہ بیئر بنانے کے لیے اس کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔ Ebla میں Beer کو اہم مشروب کی حیثیت حاصل تھی۔

کوئی ۵۰۰ دیویاں اور دیوتا Ebla میں پوجے جاتے تھے جن میں سے مشہور دیوتاؤں کے نام "Ishtar" اور "Dagan" تھے۔ وہاں کے مندر خاص اہمیت کے حامل تھے۔ جہاں کی زمینوں اور جانوروں کے گلوں سے جو آمدنی ہوتی تھی۔ اس سے مندر کے ملازمین کی پرورش اور ان کے کھانے اور کپڑے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ کسی بحران یا قلت کے وقت کوئی بھی شہری مندر میں پناہ گزیں

دیکھتا تھا۔

وہاں سب سے بڑا ملازمت پیشہ عملہ بادشاہ کے محل کے نوکروں کا تھا۔ ان کی پرورش اور دیکھ بھال شاہی حکومت کی آمدنی، جاگیرداری ٹیکس اور شہروں سے وصول ہونے والی خراج کی رقومات سے کی جاتی تھی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۱۰۰۰ نوکر وہاں ملازم تھے جو آبادی کا ۴/۱ حصہ کے برابر تھے۔ کئی خدمت گار پارچہ باف اور کپڑے بنانے کی صنعت سے وابستہ تھے ان کی تنخواہوں کی ادائیگی بھی بادشاہ کے ذمے تھی۔

بہت ساری مٹی کی تختیاں جو برآمد ہوئی ان میں طلبا نے اپنے اسباق تحریر کیے تھے جن کی تصحیح ماسٹروں اور منشیوں نے ان پر نشان لگاکر کی تھی۔

بادشاہ فرمان جاری کرتا تھا اور تاجر قیمتوں کے معاملات آپسی گفتگو سے طے کرتے تھے اور محررین تختیوں پر نشان لگادیتے تھے ان محررین کی حیثیت Ebla کی سوسائٹی میں Keymen (کی مین) تھی اور وہ ایسی زبان لکھتے تھے جو عام بول چال کی زبان تھی۔ جسے عوام بہ آسانی سمجھ سکتے تھے ٹیچروں کی لکھی ہوئی تحریروں کو طلبا مہینوں نقل کرتے تھے۔ جو Eblaite یا Sumerian میں لکھی جاتی تھیں۔ کئی تختیاں ایسی بھی ملی ہیں جنھیں طلبا نے رگڑ اور مٹاکر پھر سے ان کی تصحیح کی تھی جن پر ان کے استادوں نے تصحیح شدہ کے نشان لگائے تھے۔

Ebla کے بارے میں تحقیقات کے بعد ایسا محسوس کیا گیا جیسے کہ وہ ایک خوش حال شہر رہا ہو۔ وہاں کی عظمت رفتہ کو ظاہر کرنے والا نفیس امیرانہ ٹھاٹ باٹ۔ پاکیزہ آرٹ اور تجارتی لین دین کا ایک مکمل نظام۔ یہ چیزیں اس بات کی مظہر تھیں کہ Ebla کی فضا پرسکون اور پرامن تھی اور عوام کو پوری آزادی حاصل تھی۔ اس بات کی تصدیق بھی کی گئی کہ بادشاہ عوام سے بہت قریب اور نہایت مہربان تھا۔ شاہی محل کے ایک جانب کا حصہ عوام کے لیے کھلا رہتا تھا اور اس کے ملحق جو میدان تھا ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے کہ وہ روزانہ کی شہری زندگی کی ہل چل اور ہماہمی کا مقام رہا ہو۔

Ebla کی سب سے پیچیدہ اور متحیر کرنے والی چیز وہ کتبات تھے جو آسمانی صحیفوں اور قدیم منشور سے مشابہت رکھتے اور پیراگراف کی شکل میں تحریر شدہ تھے جن کو ضبطِ تحریر میں آئے ہوئے ہزاروں سال گزر چکے تھے مثال کے طور پر ان دو گنہ گار شہروں "Sodon" اور "Gomorah" کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اسکالرس کو ان مقامات کے نام و نشان بائبل کے باہر کسی اور مقام پر نہیں ملے لیکن ان کا ذکر Ebla کے تحریر شدہ کتبوں میں موجود تھا۔

بائبل کے علاوہ Ebla کی ایک اور متاثر کرنے والی چیز یہ ہے کہ وہاں کے کتبات سے بادشاہ ابراہیم کو اس کے دورِ حکومت میں ایک ہی طاقت ور شہنشاہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور یہ معلومات بھی حاصل ہوئی ہیں کہ اس کے دورِ حکومت میں ایک
ست ہی طاقت ور شہنشاہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور یہ معلومات بھی حاصل ہوئی ہیں کہ اس کے دورِ حکومت میں Ebla میں مذہب کی تبدیلی بھی عمل میں آئی تھی۔

اس زمانے میں ناموں کے ساتھ لفظ "EL" فخریہ طور پر لگایا جاتا تھا۔ مثلاً "Micha-EL"، "Isra-EL" (اظہار عقیدت یا احترام کے لیے مختلف خداؤں کے لیے حرف "YA" کا بھی استعمال ہوتا تھا) جیسے "Micha-YA"، "Isra-YA" وغیرہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لفظ اہم لوگوں یا خداؤں کے لیے احتراماً استعمال کیا جاتا ہو۔ یہودی دو اور الفاظ کا استعمال ایک ساتھ بھی

کرتے تھے جیسے "Yeh Weh" یہ لفظ خاص طور سے خدا کے لیے مستعمل تھا۔ Ebla یہودیوں کا مرکزی مقام ہوگا۔ اس کو نہیں کیا گیا۔ کیونکہ Cyrus Gordon جو نیویارک یونی ورسٹی کے یہودی علوم کے ماہر سمجھے جاتے تھے ان کا بیان ہے کہ واسطہ اسی تہذیبی پس منظر سے ہے جس سے کہ یہودی ابھرے ہیں۔ انھوں نے جو رائے پیش کی تھی وہ بیس یا تیس سال قبل کی جب کہ Ebla کے شاہی محلات سے دستیاب شدہ پورے کتبوں کا ترجمہ نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کتاب پورے کے پورے "Aleppos" کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔

کبھی ماضی میں آباد "Tell Mardikh" کی اس سرزمین پر یہ میری آخری شام ہے میرے سامنے بہت بڑے بڑے تودے اور ڈھیر پڑے ہوئے ہیں۔ نئی تحقیق کے بعد Ebla کے ماضی کے اسرار۔ اسرار نہیں رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سے زندہ ہوگیا ہے۔ میری نظروں کے سامنے سے ایک لمحے کے لیے یہ منظر گزرتا ہے اور میں اپنی تصور کی آنکھ سے دیکھتا ہوں کہ لوگ کا انبوہ کثیر شہر کے وسیع پھاٹک کی جانب رواں ہے ان کی گفتگو کی آوازوں کا شور بلند ہورہا ہے اور گدھوں کے قدموں کی آوازیں گونج رہی ہیں جن پر بھاری بوجھ لدا ہوا ہے اور ان کے قافلے پہاڑی ڈھلان پر سے تیز روی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں اور بادشاہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اس رعایا پرور باوقار شہنشاہ کا انداز ویسا ہی پُرتمکنت اور محبت آمیز ہے جیسے کہ عوامی دربار میں موجود ہو۔

نیلے وسیع آسمان پر کئی ستارے جھلملارہے ہیں میں یہاں ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ایک بڑھتے تاباں ستارے کو جگمگاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ جو اس بات کی نشان دہی کررہا ہے کہ ۴۲۰۰ سال بعد کا ایک اور دن ختم ہوا۔

○●○

(سلسلہ ص : ۱۰ سے)

کہ اردو اور ہریانی دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔

قدیم دکنی اردو کی بہت سی کتابیں اس اثنا میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکی ہیں اور آرہی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جن تک شیرانی، چٹرجی اور مسعود حسین خاں کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔ اس لیے اب قدیم ترین زبان کے ان نمونوں کا گرونانک، کبیر تلسی داس، سورداس اور خود چند بردے کی زبان سے مقابلہ کرکے ان کے آپس کے لسانی اختلافات کو واضح اور معین کرنا پڑے گا۔

دکن کی طرح گجرات، مالوہ، خاندیس کے قدیم مصنفین کی کتابوں اور نظموں کی زبان بھی اس مقابلہ و موازنہ میں زیرِ بحث آنی ضروری ہے۔ اس لیے کہ ان علاقوں میں بھی سرزمینِ پنجاب ہی کے فیض یافتہ صدیوں سیاسی اور علمی حیثیت سے برسرِ اقتدار رہے۔

ان تمام امور کو پیشِ نظر رکھ کر جو کتاب مرتب ہوگی۔ اس سے نہ صرف اردو کی ابتدا اور جائے پیدائش کے مسئلے کی یکسوئی ہوجائے گی بلکہ پنجابی اور پنجاب سے اردو کے دیرینہ اور بنیادی تعلق کے بارے میں جو شبہات عہد حاضر کے ادیبوں اور محققوں کے دماغوں میں نشوونما پارہے ہیں ان کی تردید ہوجائے گی اور اردو ہندی اور پنجابی زبانوں کے اربابِ علم کو معلوم ہوگا کہ یہ تینوں زبانیں باہم دگر کتنی پیوست ہیں۔

(اردوئے معلیٰ لسانیات نمبر ج: ۰۳ ش: ۴-۵)

○●○

سید خالد قادری

خاکہ

بی نرسنگ راؤ

(کچھ یادیں کچھ باتیں)

چہرے پر سنجیدگی اور متانت کا پرتو مگر آنکھوں میں ایک غیر معمولی ذہانت کی چمک۔۔۔ بہ مشکل پانچ فٹ دو انچ قد کے اس قد آور شخص کا نام نرسنگ راؤ ہے۔ آج سے تقریباً پچیس سال پہلے انوارالعلوم کالج کے دو سینئر اساتذہ فصیح الدین احمد اور غوث الدین مرحوم نے ان سے میرا تعارف کروایا تھا۔ میں ابتدا میں یہ سمجھ پانے سے قاصر رہا کہ یہ آدمی جو اب قریب قریب آدھی عمر گزارنے کے بعد کسی کالج میں لکچرر بن کر آیا ہے اس میں آخر ایسا کیا ہے کہ میرے علاوہ دوسرے تمام لوگ اسے اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔ یہ گتھی دوچار دنوں میں ہی سلجھ گئی۔ معلوم ہوا ہے کہ موصوف کا تعلق حیدرآباد کے اس خاندان سے ہے جس کے ہاتھ ریاست کے زوال کے فوراً بعد تتے سیاسی نظام کی باگ ڈور رہی ہے۔ وہ حیدرآباد کے پہلے وزیرِ اعلیٰ جناب بروگل رام کرشنا راؤ کے بھتیجے ہیں اپنے دوسرے کولیگس کی طرح جن کے ذہن جاگیردارانہ نظام سے محبت کی جکڑ سے اب تک آزاد نہ ہوئے تھے اور وہ سیاسی تحقیق جو اب ان کا متبادل بن گئی تھیں ان سے بھی مرعوب رہا کرتے تھے۔ میرے اوپر نرسنگ راؤ کی اس مخصوص شناخت کا کوئی خاص اثر نہ پڑسکا۔ مگر کچھ دنوں بعد مزید ملاقاتوں کے نتیجے میں جب ان کی شخصیت کے کئی اور پہلو سامنے آئے تو میں اپنی ساری انانیت کے باوجود دل میں ان کے لیے نہ صرف ایک نرم گوشہ محسوس کرنے لگا بلکہ بہ تدریج ان سے دوستی کی طرف بھی مائل ہوچلا اور نرسنگ راؤ مجھ سے عمر میں کافی بڑے ہونے کے باوجود ایک قابلِ لحاظ عرصے تک میرے لیے ایک بے حد ذہین مخلص اور مشفق دوست ثابت ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد کے بدلے ہوئے حالات و مصروفیات نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کردیا۔

جب مجھے پتہ چلا کہ نرسنگ راؤ طالبِ علمی کے زمانے میں اپنے تایا کے کانگریسی ہوں کے باوجود ایک Radical اسٹوڈنٹ لیڈر اور بائیں بازو کے انقلابی رہ چکے ہیں۔ اور اب بھی اصولی طور پر پرولیٹیرین (Proletarian) اور سوشلسٹ خیالات رکھتے ہیں اور یہ کہ اپنے اس Stance کی قیمت وہ اپنی زندگی کے قیمتی سالوں اور اپنے کیریر سے چکاچکے ہیں تو میں دوست کے ساتھ ساتھ ان کا قدردان بھی بن گیا۔ نرسنگ راؤ بھی چھوٹے بڑے اور جونیر سینیر میں یقین رکھنے والے لوگوں میں سے نہ تھے اور شاید اسی لیے وہ بہت جلد مجھ سے بے تکلف ہوگئے۔

کالج کے ان کے احباب میں فصیح الدین احمد اور غوث الدین مرحوم تھے۔ شاید انہی حضرات کے اثرورسوخ کی بنا پر ان کے لیے وہاں آنا ممکن ہوسکا تھا۔ پھر بھی لوگوں کے لیے یہ سمجھ پانا دشوار تھا کہ جس کالج کے پرنسپل خلیل اللہ حسینی صدر تعمیرِ ملت ہوں اس میں نرسنگ راؤ جیسے Black listed اشتراکی کا در آنا کیوں کر ممکن ہوسکا۔ مگر ایک بار کالج سے وابستہ ہونے کے بعد وہ جلد ہی سبھی پر اپنی قابلیت اور شرافت Gentlemanliness کا سکہ بٹھانے میں کامیاب ہوگئے۔

یوں تو ہماری دوستی کی بنیاد ان دنوں ہنسی مذاق اور میرے تفریح کے پروگرام بنانے یا پھر کسی کلب یا ہوٹل میں مل بیٹھنے تھی مگر اسی کے درمیان کبھی کبھی نرسنگ راؤ سے سنجیدہ موضوعات پر گفتگو کرنے کے مواقع بھی ملے۔ ان کے مخصوص میدان سیاسیات اور سماجیات تھے جس میں میں تھوڑا بہت اپنا دخل بھی سمجھتا تھا۔ خاص طور پر ہیگل، مارکس، لینن اور ماوزے تنگ نظریات، مارکسٹ اور Capitalist جمالیات (aestheties) اور Capitalist اور سوشلسٹ Impuralism کا شاذ و نادر کا تقابل۔ نرسنگ راؤ سے ان موضوعات پر گفتگو کرنے کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا علم اس ضمن میں نہ صرف کافی وسیع تھا وہ اسے کسی خارجی ضرورت کے نہ ہونے کے باوجود update بھی کرتے رہتے تھے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کے حالات مخصوص طرزِ زندگی کے باعث ان کے اس علم اور ذہانت سے دوسروں کو مستفید ہونے کے خاطر خواہ مواقع میسر نہ آسکے۔ انھوں اپنے طور پر بھی لکھنے لکھانے پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور اس طرح ایسے مواقع مزید محدود ہوگئے۔ اس سلسلے میں نرسنگ راؤ کا موقف کسی درجہ میں عالم صاحب کا سا نظر آتا ہے جو اپنی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کے باوجود اس سب کا اتنا عملی ثبوت چھوڑ کر نہ گئے ان سے توقع کی جاتی تھی۔ نرسنگ راؤ کو جاننے والے نئی نسل کے بیش تر لوگ ان کی ماضی کی بڑی بڑی سیاسی اور سماجی ہنگامہ آرائی سے سیدھی وابستگی کے تعلق سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ مجھے بھی ان باتوں کا پتا کافی بعد میں اس لیے چلا کہ نرسنگ راؤ کی متانت شائستگی انھیں اپنی زندگی کی ان فتوحات کے ذکر کا موقع شاذ و نادر ہی دیتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے صدر رہ چکے ہیں جب پولیس ایکشن کے فوراً بعد ان کے تایا جناب بی رام کرشنا راؤ یہاں کے وزیرِ اعلیٰ تھے اور ملک کا حصہ سیاسی و سماجی اتھل پتھل کے ایک انتہائی نازک دور سے گزر رہا تھا۔ ان دنوں اپنے تایا کے سیاسی اقتدار کی تائید کرنے کے بجا انھوں نے کئی محاذ پر ان کی مخالفت کی اور نتیجتاً قید و بند اور روپوشی کی صعوبتیں برداشت کیں۔ یہاں کے عوام کو ان کا جائز حق دلا کے لیے پچاس کے دہے میں شروع کی گئی ملکی تحریک کی کمان بھی ایک جوشیلے اسٹوڈنٹ لیڈر کی حیثیت سے ان کے ہاتھوں میں تھی

اس دور کا ایک واقعہ وہ آج بھی پوچھے جانے پر کبھی کبھی بڑے پُر اثر انداز میں بیان کرتے ہیں جب افضل گنج میں عثما دواخانے کے سامنے اسی ملکی تحریک کی حمایت میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا جس میں لاکھوں کی تعداد میں عوام شریک ہوئے تھے پھر کس طرح ان کی اور ان کے ساتھیوں کی تقریروں سے یہ ہجوم مشتعل ہو کر تشدد پر اتر آیا تھا جس کے نتیجے میں پولیس فائرنگ ہوئی اور درجنوں لوگ مارے گئے تھے۔ مگر آخر میں حکومت کو ان کے مطالبے ماننے پڑے تھے۔

نرسنگ راؤ نظام کالج گراؤنڈ پر منعقد کیے گئے اس جلسے کے بارے میں بھی Nostalgic ہوجاتے ہیں جو پولیس ایکشن کے مرحلے بعد ہوا تھا اور جس میں جواہر لال نہرو مولانا ابوالکلام آزاد اور پدمجا نائیڈو وغیرہ کے ساتھ ایک ہی ڈائس سے انھوں نے حیدرآباد کے عوام کو مخاطب کیا تھا۔

ماضی کے ان یادگار لمحات کے ساتھ وہ کبھی کبھی ایک اشتراکی لیڈر کی حیثیت سے اپنے روس، چین، ہنگری، یوگوسلاویا ایسے ہی کئی اور ملکوں کے سفر کی تفصیلات بھی بتاتے ہیں جس کے دوران انھوں بلگانن، خروشچیف اور ماوزے تنگ جیسی اہم تاریخی شخصیتوں کے ساتھ گلاس ٹکرائے تھے۔

ریاست حیدرآباد کا زوال اور دکن کی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز اور ایشیا، آفریقہ اور یورپ میں اشتراکیت کا عروج نرسنگ راؤ ایک نوجوان انقلابی لیڈر کی حیثیت سے تاریخ کے ان دونوں اہم ابواب سے جڑے رہے ہیں۔ شاید اسی لیے آج انھیں ا

نمبر ۱۲ کے کارنر کے ایک مکان میں کسی Recluse (گوشہ نشین) کی سی زندگی گزارتے ہوئے دیکھ کر یہ یقین کرپانا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نرسنگ راؤ ہیں۔۔۔ مگر پھر میں سوچتا ہوں کہ نرسنگ راؤ ہی کیوں، ماضی کے ہنگامہ خیز دنوں سے جڑی کتنی ہی ہستیاں اجالوں کے کتنے ہی نقیب جو کبھی رزم گاہ حیات کی اولیں صفوں میں تیشہ بر کف نظر آتے تھے آج نہ جانے کہاں بستے ہیں۔ اب انھیں کہاں جاکر ڈھونڈیے۔ شیکسپیر کا یہ خیال سچائی سے کتنا قریب ہے کہ دنیا ایک بہت بڑے اسٹیج کی مانند ہے اور ہم سب اس پر نمودار ہونے والے چھوٹے بڑے اداکار جو باری باری سے اپنا اپنا رول نبھاتے ہیں اور پھر وقت ختم ہونے پر پردے کے پیچھے غائب ہوجاتے ہیں۔

نرسنگ راؤ سے جب میری ملاقات ہوئی ان دنوں وہ نسبتاً معمول کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس زمانے میں ان کے پاس ایک ہرالڈ کار تھی جس سے ہم لوگ وقت بے وقت فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ فصیح صاحب، جی ایس شرما، نسپال سنگھ ورما اور ایسے ہی ایک دو اور دوست مل کر کبھی گنڈی پیٹ کبھی حمایت ساگر یا پھر قدوائی کاٹیج یا Zoo وغیرہ کے House کو چلے جایا کرتے تھے۔ نرسنگ راؤ کی گاڑی ایسے موقعوں پر کام آتی انھیں خود بھی ایسی outings پر جانا بہت پسند تھا۔ ہم لوگ حیدرآباد کے outskirts پر کئی خوب صورت جگہ جاکر بولڈرس پر بیٹھتے یا پھر حمایت ساگر اور گنڈی پیٹ کی جھیلوں کے اطراف کے چکر لگاتے۔ وہ ہم سبھی کے لیے بڑی بے فکری کے دن تھے۔ ایسی تفریحات شام کے بعد شہر واپس آکر رات گئے تک جاری رہتیں۔ جن دنوں فصیح صاحب کالج کی پرنسپل شپ کی دوڑ میں شامل ہوگئے تھے اور کبھی کبھار نظام کلب جانے کے علاوہ ان کے مشاغل ہم سے مختلف ہوچکے تھے تو ہمارے ساتھ صرف جی ایس شرما ہی بچے رہے تھے جو عموماً ہمارے ہم راہ ہوا کرتے تھے۔ شرما بڑا ذہین آدمی تھا اور ساتھ ہی ساتھ تخلیقی اور فن کارانہ صلاحیتوں کا حامل بھی۔ اس کی یہ صلاحیتیں ادب اور آرٹ پر اس کی گفتگو میں اجاگر ہوا کرتی تھیں۔ وہ ایک عمدہ فوٹو گرافر بھی تھا مگر ہر اچھے فن کار کی طرح اس کی زندگی کے زوال کے اسباب بھی خود اس کی مزاج کی شعریت اور طبیعت کے اضطراب میں پوشیدہ تھے۔

شرما کو نرسنگ راؤ سے بہ یک وقت نفرت بھی تھی اور محبت بھی۔ وہ ان کا بدترین نکتہ چین تھا اور ساتھ ہی ساتھ ان کی صحبت کا مشتاق بھی۔ آج جب وہ ہمارے بیچ نہیں تو ان کی نفسیات پر غور کرنے پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شاید وہ نرسنگ راؤ کے خاندانی رتبہ اور بہتر مالی موقف سے مرعوب رہا کرتا تھا۔ چوں کہ اس کا باغی مزاج ان کی اس حیثیت کو قبول نہ کرپاتا تھا اس لیے وہ اپنے طور انھیں ان کے اس مرتبہ سے گھسیٹ کر نیچے لانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ مگر نرسنگ راؤ بھی اپنی حیثیت اور اپنے وقار کو Carry کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ اس لیے شرما اپنی اس کوشش میں آخر تک کامیاب نہ ہوسکا۔ میں چوں کہ ان دونوں کو ہی اپنے اپنے انداز میں پسند کرتا تھا اس لیے ان کے مباحث یا چھیڑ چھاڑ میں ایک غیر جانب دارانہ رول ادا کیا کرتا تھا۔

نرسنگ راؤ سے میری مزید قربت کی وجہ ایک سکینڈ ہینڈ کار تھی جو میں نے ان کے مشورے اور تعاون سے خریدی تھی۔ اس حد تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا مگر وہ اس وقت مشکل میں پھنس گئے جب نہ صرف مجھے کار چلانا سکھانے بلکہ میری کار کو اپنے گھر میں رکھنے اور پھر صبح مجھے سکھانے کے لیے میرے گھر لانے کی ذمہ داری بھی ان پر آ پڑی۔ ان دنوں مجھے اندازہ ہوا کہ نرسنگ راؤ میں صبر و تحمل کی کمی نہیں اور یہ ایک مخصوص طرزِ زندگی اور کوئی باقاعدہ کیریر نہ اپنانے کی وجہ سے ان پر لگے غیر مستقل مزاجی Inconsistency کے الزام کو سچائی سے کوئی نسبت نہیں۔ نرسنگ راؤ نہایت خلوص مستقل مزاجی اور ضبط و تحمل سے مجھے کار چلانا

سکھانے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں ہی ایک نالائق اور غیر مستقل مزاج شاگرد ثابت ہوا اور اس سلسلے میں ان کی کوششیں بار آور نہ ہوسکیں۔ انھیں مجھ سے چھٹکارہ یوں ملا کہ میری گاڑی کو ٹکر ہو گئی اور اسے ایک لمبے عرصے تک گیرج میں چھوڑنا پڑا۔ اسی بیچ میں حیدرآباد سے باہر چلا گیا اور واپس آنے پر جب نرسنگ راؤ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے میرے کسی استفسار سے قبل ہی میری طرف یہ کہتے ہوئے ایک موٹا لفافہ بڑھا دیا کہ Mechanic کی رائے میں اس گاڑی کو فروخت کردینے ہی میں اپنا زیادہ فائدہ تھا۔

سگریٹ، پائپ یا سگار پینا، لمبی ڈرائیو پر جانا یا پھر فرصت کے اوقات میں اپنی پسند کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ان دنوں یہی کچھ ان کے معمولات ہوا کرتے تھے۔ ایک آدھ شام کسی کلب یا ہوٹل کی بھی نذر ہوجاتی تھی۔ اس زمانے میں حیدرآباد کے ہوٹلوں میں کیبرے کا بڑا چلن تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شائقین کے لیے عریاں ترین رقص فراہم کرنے کے سلسلے میں ہوٹل مالکین ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ ایک دن ہم لکڑی کے پل کے ایک ایسے ہی ہوٹل میں داخل ہوئے تو وہاں ایک نوخیز گوانی ڈانسر کا رقص چل رہا تھا۔ اس کے بدن سے لپٹی ہوئی کپڑے کی چند دھجیاں اس کے ہیجان انگیز شباب پر ایک تہمت سی لگ رہی تھیں۔ ہمیں ہال کے کونے میں بیٹھے ہوئے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ وہ اچانک ناچتی تھرکتی ہماری طرف آئی اور نرسنگ راؤ کے کچھ سمجھ پانے سے پہلے ہی ان کی گود میں یوں بیٹھ گئی جیسے وہی اس کی فطری جگہ ہو۔ اس زمانے میں نرسنگ راؤ کا چہرہ داڑھی سے بے نیاز تھا۔ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال ان کے کھردرے رخساروں پر اپنی ملائم اور چکنی انگلیاں پھرانے لگی۔

نرسنگ راؤ یوں تو کافی شریف آدمی ہیں اور اپنے گھر پر دی گئی ایک پارٹی میں ایک عام زندگی میں پرہیز گار خاتون دوست کے Orange squash کے گلاس میں چپکے سے جن (Gin) ملادینے کی شرارت سے زیادہ انھوں نے کبھی کچھ نہیں کیا مگر اس وقت ان میں نہ جانے کہاں سے اتنی جراءت رندانہ عود کر آئی کہ انھوں نے اخلاقیات کا ظاہری لبادہ اتار پھینکا اور ہونٹوں کے بیچ دبے سگار کا کثیف دھواں چھوڑتے ہوئے گود میں بیٹھی رقاصہ کے سینے کی مدح سرائی بہ زبانِ انگریزی ان الفاظ میں کرنے لگے۔

"Hai Baby ! your boobs are amazing !

مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے ذوقِ جمال کی تسکین کے لیے کوئی عملی اقدام کرسکیں وہ ہنستے ہوئے یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی

"Don't be silly, Darling ! These are falsies

اس کی یہ بات سن کر میرا منھ تو کھلا کا کھلا رہ گیا مگر نرسنگ راؤ اسے کچھ عجیب نظروں سے جاتے ہوئے دیکھتے رہے شاید وہ اپنے پہلو میں اس کے جسم کی تمازت اب بھی محسوس کررہے تھے۔

بے فکری اور سیر و تفریح کا یہ دور اس وقت ختم ہوا جب نرسنگ راؤ ریڈی کالج کے سامنے واقع اپنے آبائی مکان کے سلسلے میں مشکل میں پڑ گئے۔ در اصل انھوں نے اپنا یہ مکان ایک کالج کے لیے کرائے پر دے رکھا تھا جس کے کرتا دھرتا پی وی نرسمہا راؤ کے کنوارے فرزند پی وی رنگا راؤ تھے۔ رنگا راؤ نے اپنی طرف سے کالج لے تمام مسائل وویک وردھنی کالج کے ایک لکچرر اور اپنے دیرینہ دوست "رؤف" پر چھوڑ رکھے تھے۔ جب رؤف صاحب کا بیشتر وقت شراب خانوں اور ریس کورس میں گزرنے لگا اور رنگا راؤ صاحب کا Venture ایک mis-adventure میں بدل گیا تو نرسنگ راؤ کو اپنی آبائی جائیداد کی فکر ستانے لگی۔ وہ اسے کسی طرح کالج والوں کے چنگل سے واپس چھڑانے کی فکر میں لگ گئے۔ خاصی دشواریوں کے بعد انھیں اس سلسلے میں کامیابی نصیب ہوئی۔ اب

ـیں اپنے لیے ایک ایسے مکان کی ضرورت تھی جس میں وہ اور ان کے اہلِ خاندان رہ سکیں ۔ ان کی اہلیہ منگوتا نرسنگ راؤ جو ڈاکٹر ہیں ان کے کلینک کے نقطہ نظر سے بھی وہ جگہ موزوں ہونی چاہیے تھی ۔ ان دنوں ہم لوگ کافی وقت ساتھ رہا کرتے تھے ۔ سو ہم نے ان یا زمین کی جستجو میں نبجارہ ہل کی روڈ نمبر ا سے روڈ نمبر ۱۰ اور پھر روڈ نمبر ۱۲ تک کا چپہ چپہ چھان مارا ۔ وہاں ان دنوں زمین کے بے شمار قطعے خالی پڑے تھے اور ان کے لیے انتہائی سستے داموں میں بھی خریدار میسر نہ آتے تھے ۔ نرسنگ راؤ نے تو روڈ نمبر ۱۲ پر بنے ہوئے ایک کارنر کے مکان کو خریدنے کا فیصلہ کرڈالا (جہاں وہ اب بھی رہتے ہیں) مگر اس کے آس پاس خالی پڑی بے شمار زمین ن سے ان کے بے حد اصرار کے باوجود میں اپنے لیے ایک بھی پلاٹ نہ لے سکا ۔ کم عمر ہونے کے باعث مجھ میں اس وقت تک ان کی سی دور اندیشی نہ پیدا ہوسکی تھی ۔ آج جب کہ شہر میں زمین کی قیمت آسمان کو چھو رہی ہے اور مجھے بھی کبھی کبھی اپنے سر پر ایک تھی آسمان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے میں نرسنگ راؤ کے پُرخلوص مشورہ پر عمل نہ کرنے کے لیے پچھتاوا محسوس کرتا ہوں۔

پچھلے دس بارہ سالوں سے میرا ان سے کوئی ربط باقی نہیں رہا ۔ اس بیچ ان کے بچوں کی شادیاں ہوگئیں اور وہ بیرونِ ہند بھی تے جاتے رہے ۔ مشترکہ دوستوں سے پتہ چلا کہ وہ نیوز ٹائم یا اے پی ٹائم سے وابستہ ہوگئے ہیں اور کالم اور فیچر وغیرہ لکھ رہے ہیں ۔ پھر نا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ اپنے آبائی گاؤں میں جاکر رہنے لگے ہیں اور وہاں کے سرپنچ بن گئے ہیں ۔ میں سوچنے لگا کہ واقعی انسان ذہن کے مسلسل اضطراب پر قابو پانے اور وقت کے خلاء کو پُر کرنے کے لیے کیا کیا سوانگ رچاتا ہے ۔ انفرادی حقوق کے لیے آواز اٹھانے الے بے باک صحافی اور امروز کے ایڈیٹر، عوام کے اللہ خان قریبی رفیق اور پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے بانی ممتاز حیدرآبادی سن ناصر کا ساتھی، ماضی کا ایک انقلابی لیڈر اور حال کا ایک شہری دانشور urban intellectual کون سوچ سکتا تھا کہ وہ کسی دور راز گاؤں کی پنچایت کا سرپنچ بن کر کسی پیڑ کے نیچے بنے چبوترے پر بیٹھا گاؤں کے جھگڑے نبٹارہا ہوگا ۔ ۔ ۔ مجھے اپنے بزرگ دوست ـسنگ راؤ کی زندگی میراجی کے اس شعر کے مصداق نظر آتی ہے ۔

ـبھی بدلے بھیس نئے
جب پریت دکھائے دیس نئے

ـسنگ راؤ کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے R.K.Narayan کی ناول " گائیڈ " (Guide) کے مرکزی کردار " راجو " کا خیال ئیا جو زندگی کے مختلف تجربوں سے گزرتا ہوا حسن اور جوانی اور پھر تھیٹر اور گلیمر سب کچھ پیچھے چھوڑ آخر میں ایک گاؤں کے مندر میں ـای کے روپ میں ترجمان دکھائی دیتا ہے جس سے گاؤں کے سیدھے سادے لوگ بارش کے لیے دعا کرواتے ہیں ۔ وہ لوگ صرف ـس کے حال سے واقف ہیں انھیں اس کے ماضی کا کوئی علم نہیں ۔ ۔ ۔

ادھر شاید نرسنگ راؤ دوبارہ گاؤں سے شہر واپس آگئے ہیں ۔ ۔ ۔ روپوش انقلابی اور کٹر اشتراکی Tame Lecture ، فری ـنس جرنلسٹ اور پھر Village سرپنچ وقفہ وقفہ سے اتنے سارے سوانگ بھرنے کے بعد اب نرسنگ راؤ اپنے آپ کو کس نئے رول ـسٹ کرنے کی تیاری کررہے ہیں مجھے نہیں معلوم پتا ہو سکتا ہے وہ اب تک اپنے لیے کوئی نیا رول دریافت کرچکے ہوں یا پھر ایسا بھی ـ سکتا ہے کہ اتنے سارے الگ الگ رول نبھانے کے بعد وہ اب تھک چکے ہیں اور ہمیشہ کے لیے میک اپ اتار کر خلوت نشینی کی ـدگی جینا چاہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ایک ایسی بے نام زندگی (Anonymous Life) جو دنیا کے بیچ ہوکر دنیا سے پرے ہوتی ہے ۔ ۔ ۔

○●○

کاوشس عباسی

زنجیر کی چوٹ

☆

ہوا میں کسی کونج کی دستکیں ہیں
دیوار کے پار اندھیرا سفر کے لیے اپنے پر کھولتا ہے
مسافت کا بھیگا ازل، فاصلوں کا سیہ آسماں
رتجگوں اور نیندوں بھری رات
ویران اندر کے سمٹے ہوئے ایک کونے میں بیٹھا ہوا میرا دل،
وہ سینکڑوں میل دور، اپنے کمرے میں
فرقت کی سنگینی کی اوٹ میں، خشک اشکوں میں سوئی ہوئی
رات کا سرد طوفاں
مرے ضبط کی پھڑ پھڑاہٹ کی زنجیر کی چوٹ کھایا ہوا
دوش پر اس کی تصویر اٹھائے ہوئے
اور بھی چیختا ہے

○●○

اکیلا

☆

صحت مری یوں ہی قائم رہے
ٹی۔ وی چینل سبھی یوں ہی چلتے رہیں
سوچیں مری سارے عالم کے انسانوں کے ہم قدم گنگناتی رہیں
میں تاریخ، ادب، شاعری کی کتابیں اسی شوق سے یوں ہی پڑھتا رہوں
شاعری اپنی لکھتا رہوں
گھر میں تم بن جو تنہائی کا دکھ ہے، گھر پن کی پر یاد راحت سے مُتار ہے
بے دوست ہو کر بھی دل جینے کی تھاپ پر، یوں ہی خود مست چلتا رہے
میں نہ بیمار ہوں
تو بن تمہارے ادھوری سی یہ زندگی پھر بھی جینے کے قابل ہی ہے
مجھ پہ بھاری نہیں

○●○

محسن بھوپالی

انحطاط

☆

وہ کیسا دور تھا
دفتر کا وہ ماحول اب تک یاد ہے مجھ کو
اگر کوئی ملازم حادثے کا لقمہ بنتا
یا کسی موذی مرض کے ہاتھوں وہ دنیا سے اٹھ جاتا
___ تو ساتھی سوگ کرتے
اس کے نائب کو ترقی مل بھی جاتی تھی
تو کچھ دن احتراماً اس کی کرسی سے علیحدہ بیٹھتا
اور مرنے والے کا وہ اکثر تذکرہ کرتا

___ اور اب یہ دور آیا ہے
کوئی ساتھی جدا ہو تو
تگ و دو کرنے لگتے ہیں
انھیں اس کی جگہ مل جائے
اور اپنی جگہ اپنے ہی رشتہ دار کو دے کر
وہ اپنے اقربا میں سرخ رو ہوں،
اور دعائیں لیں!

○●○

ڈرائنگ روم ٹارچر

☆

جاتے جاتے لڑکے کی آپا نے،
اس کی ماں کے پاس آکر جب بتلایا
آنٹی آپ کی لڑکی کا قد چھوٹا ہے
وہ پردے کے پیچھے سن کر
ایک دفعہ پھر ٹوٹ گئی
شام ہوئی تو ماں سے ابّو بول رہے تھے
حوصلہ رکھو کل میرے اک ملنے والے
بیگم کے ساتھ آئیں گے

دوسرے دن جب لڑکے والی آئیں تو
ہمت کر کے لڑکی نے وہ پلیٹ بڑھا دی
جس کے اندر زعفران سے لکھا ہوا تھا
رشتہ نا منظور!

○●○

مصحف اقبال توصیفی

تم کہتے ہو۔۔۔۔

تم کہتے ہو تو مان گئے
ورنہ ہم نے یہ دیکھا ہے
کوئی دکھ ہو ۔ کوئی راحت ہو
کوئی پیماں ۔ کوئی چاہت ہو
ہم نے دیکھا ہم اپنے ہی
اشکوں سے جل تھل ہوتے ہیں
کوئی لاش ہو بیتے لمحوں کی
اپنے کاندھے شل ہوتے ہیں

تم کہتے ہو، تو مان گئے
ورنہ ان لمحوں کی آہٹ
تم نے بھی سنی ۔ ہم نے بھی سنی
کون آیا تھا ؟ کون آیا ہے ؟
کون آئے گا ؟ پہچان گئے
ہم ایک ادھورا سپنا ہیں
اک رات ان اچھی آنکھوں میں
مہمان رہے ۔ مہمان گئے
ہم ٹوٹ چکے ۔ ہم تنہا ہیں
ہم تنہا ہیں ۔ ہم جان گئے
تم کہتے ہو " یہ جھوٹ ہے سب"
تم کہتے ہو " تم میرے ہو
تم میرے ہو ۔ تم میرے ہو "
تم کہتے ہو تو مان گئے ! !

○●○

مصطفیٰ شہاب

یکسانیت

●

بوڑھا سورج
دن بھر آگ میں جلتے جلتے
اپنی ساری حدت کھو کر
سرد سمندر کی لہروں میں
ڈوب رہا ہے

●

ساحل کے سینے سے لپٹی
ملکوں ملکوں گھوم کے آئی
لہریں سانسیں توڑ رہی ہیں

●

غول پرندوں کے ریتی پر
لمبی پروازوں سے تھک کر
اتر رہے ہیں

●

چند مچھیرے ۔ شام کی بڑھتی تاریکی میں
اپنے اپنے جال اٹھائے
واپس گھر کو لوٹ رہے ہیں

●

اس تصویر کے اک کونے میں
اک ٹیلے پر بیٹھا ۔ میں بھی
اس منظر سے جڑا ہوا ہوں
میرا سفر بھی کسی سفر سے جدا نہیں ہے

○●○

چندر پرکاش شاد

☆

سبز پتے کہاں ، ہوا ہے کہاں
آج پیڑوں کی آتما ہے کہاں

مجھ پہ کہسار کیسے گرنے لگے
جا کے پتھر مرا لگا ہے کہاں

گرد زاروں میں پھرتا رہتا ہوں
وہ چھلکتی ہوئی انا ہے کہاں

پل بہ پل زاویے بدلتا ہوا
میری دنیا کا من چلا ہے کہاں

سائے ، ہم سائے کیا جنم لیں گے
آدمی ہے کہاں دیا ہے کہاں

وہ کہ مینار بن کے اڑنے لگا
دیکھنا ہے کہ ٹوٹتا ہے کہاں

ان رتوں کو خبر کہاں ہے ابھی
بھیگ جائیں تو سوکھنا ہے کہاں

وہ ہے اپنے نواح کا دشمن
اور ہمارا بھی ہم نوا ہے کہاں

یوں اکھڑنا کبھی نہ دیکھا تھا
میں کہاں اور نشانِ پا ہے کہاں

تہ نشینی سہی مقام اپنا
میرے حق میں کوئی ہوا ہے کہاں

○●○

☆

گو جسموں کے جل جانے کا خطرا ہے بہت
پر دھوپ جلی دیواروں میں سایا ہے بہت

گہرائی سے پاگل سا دھواں اٹھتا ہے بہت
پاتال اگر چہ اوجھل ہے افشا ہے بہت

اس پھلتے پھولتے ریگستان کے سینے پر
آسیب زدہ آوازوں کا دریا ہے بہت

کیوں اپنے گھر میں اکھڑے اکھڑے رہنے لگے
ان سوتے جاگتے لمحوں میں دنیا ہے بہت

ہر لفظ کو کوئی شکل بھی دے آواز بھی دے
ماحول ہماری بستی کا سونا ہے بہت

سب آتے جاتے لوگ لگائیں ضرب اسے
شبہات کا کوہستان ابھی اونچا ہے بہت

○●○

مصحف اقبال توصیفی

☆

آسمانوں میں سدا گھوما کریں
اک ستارہ دور سے دیکھا کریں
ہم نے پوچھا ان دکھوں کا کیا علاج
ہنس کے بولے خواب کم دیکھا کریں
ہاں وہ پتھر ہی سہی ، تم کون ہو ؟
ہم جسے چاہیں ، جسے سجدہ کریں
دوش پر سر ، پاؤں کے نیچے زمیں
آئینے کو طاق پر رکھا کریں
لاکھ رنگیں ہوں کھلونے ہی تو ہیں
آپ اگر لفظوں سے کم کھیلا کریں
یاد بولی ، تم کہو تو رات کو
پائینتی ہم آکے سو جایا کریں
بے وفا ہے وہ تو اس در پر نہ جائیں
آپ ادھر آئیں یہاں بیٹھا کریں
مصحف اس کا دل دکھا کر کیا ملا
آپ سچ بولیں ، مگر سوچا کریں

○●○

محسن بھوپالی

☆

زمیں شاداب کرتا جارہا ہوں
لہو سے رنگ بھرتا جارہا ہوں
وہ کانٹے بو رہے ہیں ہر قدم پر
میں ہنس ہنس کر گزرتا جارہا ہوں
مخالف نکتہ چینی میں لگے ہیں
میں اپنے کام کرتا جارہا ہوں
زمانہ دیکھ کر حیرت زدہ ہے
بگڑنے میں سنورتا جارہا ہوں
کوئی تو ہم سفر آئے برابر
میں رستے میں ٹھہرتا جارہا ہوں
نظر سے تم گراتے جارہے ہو
مگر دل میں اترتا جارہا ہوں
مرا تم راستہ روکو گے کب تک
میں سورج ہوں ابھرتا جارہا ہوں

○●○

مظفر حنفی

☆

تہمت کیوں بے کار اٹھائی
بے کشتی پتوار اٹھائی

ہم نے سر اونچا رکھا ہے
لوگوں نے دستار اٹھائی

کب سے لوٹ رہی تھی دنیا
تنگ آ کر تلوار اٹھائی

رستہ کاٹ دیا ہستی کا
کاٹی دن بےگار اٹھائی

سنتے تھے مرنا مشکل ہے
یہ زحمت سو بار اٹھائی

دستِ خزاں نے ہر گلشن سے
چادر دھبے دار اٹھائی

اک مینار گرا کر تم نے
ہر دل میں دیوار اٹھائی

○●○

☆

تمام آب سے بھر گیا ہے صحرا میں
پیاسا آج کوئی مر گیا ہے صحرا میں

جو خانہ زاد ہے میرے غریب خانے کا
وہ گردبادِ سبک سر گیا ہے صحرا میں

اسی کے نام سے تر ہے زبان کانٹوں کی
گلاب آبلہ پا دھر گیا ہے صحرا میں

نمی جو آنکھ میں بھی بڑھ کے آبشار ہوئی
وفورِ شوق اسے لے کر گیا ہے صحرا میں

بہت دنوں میں پلٹ کر میں گھر میں آیا تو
پتہ چلا کہ مرا گھر گیا ہے صحرا میں

نظر لگے نہ کسی کی ۔ اسی لیے سیلاب
مرے نقوشِ قدم پر گیا ہے صحرا میں

بڑھی ہوئی ہے بہت میرے خون کی رفتار
نہ جانے کون مظفر گیا ہے صحرا میں

○●○

حامدی کاشمیری

☆

کسی دھوکے میں دیوانے نہ آئے
لبوں تک دل کے افسانے نہ آئے

دو رویہ اجنبی چہرے نصب تھے
تھے جتنے جانے پہچانے ، نہ آئے

حکایت میں سنا تھا ذکر جن کا
کہیں وہ عافیت خانے ، نہ آئے

فسوں پھونکا تھا سایوں نے یہ کیسا
قریبِ شمع پروانے نہ آئے

سمندر سے پرندے وادیوں میں
بہاروں کی خبر لانے نہ آئے

نہ جانے کیوں وہ موسم اس برس بھی
مشامِ جاں کو مہکانے نہ آئے

○●○

شاہ جہاں

☆

دل کی لگی بھی ایک عجب دل لگی رہی
یک طرفہ ساری وحشت و وارفتگی رہی

معصومیت سے ٹالے ہے کیسے ستم ظریف
وعدہ کہ پھر ملیں گے اگر زندگی رہی

عہدِ وفا میں دشت نوردی رہی نصیب
ہر گام خار خار ، تھکن ، تشنگی رہی

نکلا حریف کار سدا شغل ناؤ نوش
آخر کو تنگ دستی و کم مائیگی رہی

عشق و شباب پر ہوا فکرِ جہاں محیط
اک آگ تھی جو سینے کے اندر لگی رہی

وابستہ ہر خیال تری ذات ہی سے ہے
ہر یاد تیری باعثِ آشفتگی رہی

○●○

محمد علی اثر

☆

خود اپنی ہی پہچان کا جوہر نہیں رکھتے
وہ لوگ جو ایقان خدا پر نہیں رکھتے

جذبات کے آئینوں کو توڑا ہے جنھوں نے
وہ لوگ کبھی ہاتھ میں پتھر نہیں رکھتے

مخلوق کو دینے کا جو وعدہ کیا اس نے
ہم کل کے لیے کچھ بھی اٹھا کر نہیں رکھتے

اس شہر میں مل جائیں گے ایسے بھی بہت لوگ
جیتے ہیں مگر جینے کے تیور نہیں رکھتے

دل تھا سو دیا آپ کو رکھ لیجیے صاحب
ہم اس کے سوا شئے کوئی بہتر نہیں رکھتے

افکار کی دولت تو بہت پائی ہے لیکن
ہم تاجِ تکبر کبھی سر پر نہیں رکھتے

رکھتے ہیں اثر رکھنے کو ہم طبعِ قلندر
یہ بات الگ بختِ سکندر نہیں رکھتے

○●○

☆

بے چہرگی کا اپنی سبب بولتے نہیں
ہم جیسے لوگ نام و نسب بولتے نہیں
آوارگانِ شوق بنے پھر رہے ہیں لوگ
کس چیز کی ہے ان کو طلب بولتے نہیں
تشہیرِ پارسائی مبارک تمھیں کو ہو
ہم اپنی گم رہی کا سبب بولتے نہیں
پی لیں گے صبر و ضبط کے آنسو بھی ہم مگر
کیسے گزاری ہجر کی شب بولتے نہیں
پہلے تو دل جلا تھا سو اب تن بھی جل گیا
افتاد وہ پڑی ہے کہ لب بولتے نہیں
کیوں درد و غم کی آگ میں میرا ہی گھر جلا
باشندگانِ شہرِ طرب بولتے نہیں
ان ساکنانِ شہرِ خموشاں کو کیا ہوا
کیا ہوگیا وہ شور و شغب بولتے نہیں
ہم نے بھی دوستوں سے مروت کے نام پر
کیا کیا سہے ہیں رنج و تعب بولتے نہیں
توسیعِ فکر و فن کے صلے میں اثر ہمیں
کس کس سے کیا ملے ہیں لقب بولتے نہیں

○●○

محمد علی اثر

☆

اتنے تنہا ہم نہ پہلے تھے کبھی
اس طرح اس سے نہ بچھڑے تھے کبھی

اب ثمر آور ہوئی ہے زندگی
درد کے سائے میں بیٹھے تھے کبھی

جن غموں میں آج تم ہو غوطہ زن
ان غموں میں ہم بھی ڈوبے تھے کبھی

وہ زمانے خواب بن کر رہ گئے
چاہنے والے بھی اپنے تھے کبھی

دوریاں اب تو مقدر بن گئیں
قربتوں کے خواب دیکھے تھے کبھی

ٹوٹ کر جو چاہتے تھے کل ہمیں
روٹھ جائیں گے نہ سوچے تھے کبھی

دیکھنے خوشیوں کی اونچائی اثر
غم کی گہرائی میں اترے تھے کبھی

○●○

☆

بوسیدہ تار تار قبا سے جڑے ہوئے
کیا لوگ تھے وہ نورِ خدا سے جڑے ہوئے

ہر لحظہ زندگی کو اجل کا ہے سامنا
سارے بشر ہیں دارِ فنا سے جڑے ہوئے

وحشی ہوا نے چھین لیے پیرہن مگر
کچھ پیڑ ہیں زمیں کی قبا سے جڑے ہوئے

زور آندھیوں نے اپنا دکھایا بہت مگر
دیوار و در ہیں فضلِ خدا سے جڑے ہوئے

اک وہ کہ جن کو ذکرِ وفا بھی ہے ناگوار
اک ہم ہیں اپنے عہدِ وفا سے جڑے ہوئے

لہجے کے لوچ میں ہے عجب بانکپن اثر
ہیں شعر حسنِ صوت و صدا سے جڑے ہوئے

○●○

آغا مرزا محمود سروش

☆

قیامتیں جو مرے سر سے ٹل گئی ہوں گی
نہ جانے کتنے مناظر بدل گئی ہوں گی

یہ دھوپ ہے کہ برستی ہے آتشِ نمرود
کہاں کی برف چٹانیں پگھل گئی ہوں گی

وہ راہیں جو درِ میخانہ تک پہنچتی تھیں
بہ فیضِ دیر و حرم کیا بدل گئی ہوں گی

نئے خداؤں سے مایوس ہم کدھر جائیں
کہ ساری کشتیاں اب تک تو جل گئی ہوں گی

ذرا سے ظلم پہ اک حشر کرتی تھیں برپا
وہ سب طبیعتیں آخر بہل گئی ہوں گی

سروش درس نئی آگہی کا کیا لیتے
وہی نصاب کتابیں بدل گئی ہوں گی

○●○

ایس۔ اے۔ فہیم

☆

نہ میرے پاس کبھی اور نہ گھر میں رہتا ہے
نظر کے ساتھ ہے، دل بھی سفر میں رہتا ہے
یہ میرا وہم ہے، یا پھر کوئی حقیقت ہے
خیال و خواب میں جو تھا وہ گھر میں رہتا ہے
اسی کا عکس ہمیں آئینہ دکھاتا ہے
پسِ خیال جو منظر، نظر میں رہتا ہے
وہ خوش خیال سہی دوسروں کے ساتھ مگر
بہت ہے کام مگر عمر مختصر اپنی
خیالِ دوریِ منزل سفر میں رہتا ہے
بجھا بجھا سا مری چشمِ تر میں رہتا ہے
وہ رنگ و بو میں ڈھلا تتلیوں کے ساتھ کبھی
چمن بدوش نظارہ نظر میں رہتا ہے
کسی عذاب سے دوچار وہ رہے نہ رہے
خود اپنی ذات کے لیکن اثر میں رہتا ہے
خلا فورو ملا مجھ سے وہ جہاں بھی ملا
فہیم عزم و ارادہ سفر میں رہتا ہے

○●○

محمد شاہد عظیم

لذتوں کا عذاب

جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو ابو شاہ کے تکیے پر مہیب سناٹا چھا جاتا بڑی چوکھنڈی سے جس کی سیلن اور کائی زدہ دیواریں بوسیدہ ہوکر گرنے لگی تھیں کسی ملنگ کا حق اللہ ہو کا نعرہ گونجتا تو "ہو" کی آواز سے جو دور تک سنائی دیتی ایسا معلوم ہوتا کہ برسوں پرانی قبروں کے کھنڈروں میں اچانک مردے جی اٹھے ہیں اور ایک ساتھ بول رہے ہیں۔ پھر سناٹا چھا جاتا۔ تکیے کے ایک کونے میں بنے ہوئے حویلی نما مکان میں جو قبرستان کا ہی ایک حصہ معلوم ہوتا تھا اس وقت چہل پہل اچانک بڑھ جاتی مزیدار کھانوں کی اشتہا انگیز خوش بو برتنوں کی کھڑ کھڑاہٹ، باتوں کا ہلکا ہلکا شور اسی شور میں سے ایک آواز ابھرتی ارے منّو مرگیا کیا رے۔ یہ بھاری اور گونج دار آواز نظام کی افواجِ بے قاعدہ نظم جمعیت کے دفعدار برہان الدین کی ہوتی۔ دوسری آواز سے قبل لرزتے کانپتے منومیاں دونوں ہاتھوں میں رنگین تورہ پوش سے ڈھکی ہوئی ایک بڑی کشتی لے کر نمودار ہوتے۔ کشتی میں سالن کے دو تین کٹورے ایک قاب میں چاول اور خوب سینکی ہوئی گھی میں تر بہ تر گیہوں کی روٹیاں ہوتیں۔ برہان الدین اپنے بڑے بیٹے منو میاں کو ہدایت دیتے کہ کن کن لوگوں کے گھروں پر وہ پہنچا دینا ہے۔ منو میاں کو روز ہی ایسے دو تین چکر لگانے پڑتے جب پڑوسیوں کے گھروں پر پابندی سے حصہ روانہ کیا جاتا تھا ان کے گھروں سے جوابا آدھی روٹی بھی نہیں آتی۔ یہ یک طرفہ نوازش منومیاں کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ انھیں بس اتنا معلوم تھا کہ ان کے باپ کی سخاوت اور دریا دلی کے دور دور تک چرچے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس دریا دلی کے نتیجے میں بعض اوقات منومیاں اور ان کے بھائی بہنوں کو کبھی کبھی کم کھانا ملتا۔ منومیاں نے ایک دن مالن بی آپا سے جن کے شوہر کی کرانہ کی دوکان تھی ایک دن ہمت کرکے پوچھ لیا، تمہیں بھی کبھی کسی کو دو نوالے بھیجے! اس بدتمیزی پر منومیاں کو بے بھاؤ کی پڑی۔ برہان الدین گٹھیلے ورزشی جسم کے مالک تھے۔ لمبی ستواں ناک، یہ بڑی بڑی مونچھیں، بھاری جبڑے خاصے وجیہہ تھے۔ پہلے نظام سرکار کی افواج بے قاعدہ "علی عول" میں تھے سیاہ فوجی لباس پہنتے تھے لمبی قمیص جو گھٹنوں تک آتی تھی، شلوار اور پگڑی میں ان کی شخصیت بڑی متاثر کن لگتی۔ بالکل ابدالی کی فوج کے سپاہی معلوم ہوتے تھے بعد میں نظم جمعیت میں شامل ہوئے تو سال بھر میں دفعدار بنادیے گئے۔ ایک چھوٹی موئی کے سالار جس پر ان کا حکم چلتا تھا۔ بیوی کا تو ان سے دم نکلتا تھا۔ مسالے تو ملازمہ پیس دیتی تھی لیکن پکانا بیوی کو پڑتا تھا۔ قسم قسم کی پکوان آئے دن نئی نئی فرمائش۔ جو لوگ اچھے کھانوں سے شوقین ہوتے ہیں وہ ہاتھ جلاکر خود بھی پکاتے ہیں برہان الدین اس سے مستثنیٰ تھے یوں بھی اپنے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ میرے نانا تھے۔ کھاتے وقت اکثر میں ان کی گود میں ہوتا۔ ایک نوالہ مجھے کھلاتے اور دوسرا خود کھاتے۔ ایسی محبت اور لاڈ و پیار شاید ہی کسی نواسے کے حصے میں آیا ہوگا۔

ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بیٹا جلد سے جلد بڑا ہوجائے۔ بچے تو وقت پر ہی بڑے ہوتے ہیں۔ انھیں لاکھ اچھا کھلاؤ پلاؤ، لیکن پودوں کی طرح آہستہ آہستہ ہی بڑھتے ہیں۔ امی کو ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کہ ان کا بیٹا کچھ کھاتا ہی نہیں۔ آخر منتوں مرادوں کی

اولاد تھی۔ اللہ میاں نے دو بہنوں کے بعد بیٹے کی صورت دکھائی تھی۔ ای کی اس بے جا محبت نے مجھے خوش خوراک بنادیا۔ یوں بھی ان دنوں آسودگی تھی۔ پیسہ کم تھا لیکن لوگ اچھے سے اچھا کھاتے اور پہنتے تھے۔ ماں کی محبت کی کوئی انتہا نہیں تھی اس نے بیٹے کو کھلا کھلا کر ان معنی میں بڑا کردیا کہ وہ اپنی عمر سے زیادہ نظر آنے لگا۔

لڑکیاں اور لڑکے جب بڑے ہوجاتے ہیں تو وہ آہستہ آہستہ خود گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیتے ہیں۔ انھیں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ماں باپ بھی غیر محسوس طریقے پر گھر کے سارے کام انھیں سونپ دیتے ہیں۔ ہنڈکلیاں پکانے والی لڑکیاں بڑی ہوکر گھر کے تمام افراد کے لیے کھانا پکانے لگتی ہیں۔ گھر میں جب کئی لڑکیاں ہوں تو گویا ان میں مسابقت ہوتی ہے کہ دیکھیں کون اچھے اچھے مزے دار سالن پکاتا ہے۔ ہر گھر کا سلیقہ، آداب اور پکوان الگ الگ ہوتے ہیں۔ لڑکیاں دوسرے گھروں سے نئے نئے پکوان سیکھ کر آتی ہیں۔ یہاں ایک نہیں اکٹھے سات بہنیں تھیں پکوان میں ایک سے بڑھ کر ایک۔ کونسی چیز تھی جو گھر میں تیار نہیں ہوتی تھی۔ رس گلے، دال موٹھ، نمک پارے اور پلم کیک تک گھر میں بنائے جاتے تھے۔ اپنے بڑے بھیا کو خوش کرنے ان میں گویا ایک طرح کا مقابلہ ہوتا تھا۔ رات دیر گئے وہ اخبار کے دفتر سے تھکا ماندا لوٹتا تو منجھلی بہن دروازے کا پٹ تھامے کھڑی رہتی کہ نہ جانے کب کیا مانگیں۔ بھیا کا چہرہ دیکھ کر بھانپ لیتی کہ سالن جی کو نہیں لگا۔ جھٹ پٹ کوئی چیز بناکر لاتی اور اصرار سے کھلاتی۔ جو لوگ راتوں میں کام کرتے ہیں یا زیادہ دیر تک کام کرتے ہیں انھیں آدھی رات کو خوب بھوک لگتی ہے اور اگر اچھا کھانے کو ملے تو کیا کہنے۔ نت نئے پکوان قسم قسم کے چٹخارہ دار سالن، دعوتیں الگ۔ بہنیں ایک ایک کرکے اپنے گھر سدھاریں۔ اسے یوں لگا جیسے وقت پر لگاکر اڑ گیا۔

اسے لوگوں کے گھروں میں ہانڈیاں ٹٹولنے کی جیسی عادت سی پڑ گئی۔ دوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ ان میں سے بعض ایسے خاندان تھے جو یو۔ پی کے مختلف شہروں سے آکر بس گئے تھے۔ اگر کبھی کوئی دوست جھوٹے منہ بھی کھانا کھانے کے لیے کہتا تو وہ فوری شریک ہوجاتا۔ ایک دو گھرانوں نے اسے اچھا خاصا چٹورا بنا دیا تھا۔ بعض دوست اسے بلا جھجک دسترخوان کا بلاوڈ تک کہہ دیتے تھے جن لوگوں کو گھر میں اچھا کھانے کو نہیں ملتا وہ ہوٹلوں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہوٹلوں کی تلاش کی مہم سر کرنی پڑتی ہے۔ شکم پری اور شکم سیری کا فرق ہوٹلوں میں ہی معلوم ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ کافی پیسے خرچ کرکے بھی کھانے میں مزہ نہیں آتا۔ وقت نے ایک اور پلٹا کھایا قسمت سے بیوی ملی بھی ایسی جس کے پاس دو وقت پیٹ بھر لینا ہی سب کچھ تھا۔ اسے بھی مجبوراً زہر مار کرنا پڑتا۔ شادی کے بعد نرم و نازک ہاتھوں کے پکے ہوئے اچھے اچھے کھانے کا جو ارمان تھا وہ دل ہی میں رہ گیا۔ بیوی کو صرف دو ہی شوق تھے نئی نئی ساڑیاں خریدنا اور پیسے جمع کرنا پیسے ساڑیاں خریدنے کے لیے جمع کیے جاتے تھے یعنی ساری تگ و دو ساڑیوں کے لیے تھی۔ قیمتی سے قیمتی ساڑی دو تین بار پہننے کے بعد پرانی ہوجاتی تھی۔ دو وقت کا کھانا پکانا ان کے لیے کسی سزا سے کم نہیں تھا۔ میں کبھی یہ نہیں سمجھ پایا کہ آیا انھیں کھانا پکانا نہیں آتا یا محض شوہر کو جلانے اور ستانے کیے الم غلم قسم کے کھانے جو بہ قول ان کے محنت سے پکائے جاتے تھے دسترخوان پر سجا دیتیں۔ بیوی سے کوئی گلہ یا شکایت نہیں تھی بس سالنوں پر کھٹ ہوجاتی تھی۔ غصہ اور برہمی پر بیوی کا بڑا ہی معصومانہ جواب ہوتا سنو اتا (اتنا) ہی شوق تھا تو کسی بورچن (باورچن) سے شادی کیوں نہیں کرے۔ اچھا اچھا پکا کو کھلاتی۔ مجھے غصہ آجاتا تو نہایت پُرخلوص مشورہ دیتیں۔ ۔ ابی (اب بھی) کچھ نہیں گیا۔ مجھے بولے تو میں کوئی بورچن ڈھونڈ کو لاتیوں۔ ایسے بیہودہ

جوابات سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ عمر نے اس منزل پر لا کر کھڑا کر دیا تھا جہاں محض اپنے ذوق کی تسکین کے لیے اچھی خاصی بیوی کو جس سے تین بچے ہوں طلاق نہیں دی جا سکتی تھی۔

* اف کس قدر گھپ اندھیرا ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کم بخت بجلی کو بھی ابھی فیل ہونا تھا۔ بھوک بھی اتنی زوروں کی لگ رہی ہے کہ اب ذرا بھی صبر نہیں ہوتا۔ پیٹ میں گویا چوہے دوڑ رہے ہیں۔ ماچس بھی نہیں ملتی۔ یہیں کہیں میز پر رکھی تھی۔ پانی کا جگ بھی شاید قریب رکھا ہے۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں۔ یہ واقعی بڑا عذاب ہے مسلسل عذاب۔ فوزی کو ہر روز تفریح اور پارٹیاں چاہئیں۔ گھر میں تو قدم ٹکتے ہی نہیں۔ وقار کہنے کو میرا بیٹا ہے لیکن بیٹا کہنے میں شرم آتی ہے۔ جورو کا غلام ہے باپ کا کون سا خیال رکھتا ہے کرتا وہی ہے جو بیوی کہتی ہے۔ یہ بھی کوئی ماں باپ ہیں جنھوں نے اپنے اکلوتے بچہ کو ہاسٹل میں ڈال دیا ہے میں حیدرآباد میں اچھا بھلا تھا۔ کم از کم وہاں میرے دوست احباب تھے۔ میری طرح بوڑھے زور زور سے کھانستے۔ بلغم کے لوتھڑے تھوکتے ہوئے خمیدہ کمر رعشہ زدہ ہاتھوں والے لکڑی ٹیک کر چلتے ہوئے ایک دو تو روز ہی آجاتے تھے خیر خیریت پوچھنے ایک دوسرے کی سننے۔ عمر کی اس منزل میں اب بچا ہی کیا تھا نہ میرے پاس نہ ان کے پاس سب کچھ پرایا ہو گیا تھا۔ دو گھڑی باتیں کر لیتے تو ساری کلفتیں اور دکھ بھول جاتے۔ پھیکی میٹھی آدھی پیالی سے بھی کم چائے پی کر اور آدھا پان کھا کر تازہ دم ہو کر چلے جاتے۔ دوستوں سے گلے شکوے لڑائی جھگڑے کب کے ختم ہو گئے تھے بس ایک دوسرے کی صورت دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ پرانی باتیں چھڑ جاتیں تو وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کب پر لگا کر اڑ گیا اور پھر وہاں بے شمار بھانجے بھانجیاں۔ نواسے اور نواسیاں تھیں ان کے آجانے سے کتنی چہل پہل رہتی تھی۔ دل خوشیوں سے بھر جاتا تھا۔ بوڑھی رگوں میں نیا خون دوڑتا ہوا محسوس ہوتا۔ عمر جیسے کچھ بڑھ جاتی۔ پھر حالات نے یہاں لا پٹکا۔ یہ فلیٹ میرے لیے کوٹھے سے کم نہیں میں یہ سب کیوں سوچ رہا ہوں۔ بے کار باتیں سوچنے سے کیا فائدہ؟ اب بھوک بھی ستا رہی ہے۔ صبر نہیں ہوتا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ دنوں نہیں بلکہ برسوں سے بھوکا ہے۔ کبھی کوئی اچھا کھانا پیٹ بھر نصیب نہیں ہوا۔ وہ اچھے اچھے کھانوں کے لیے ترس گیا۔ میری امی اور پیاری بہنیں کیسے مزے دار کھانے کھلاتی تھیں۔ کیا ذائقہ ہوتا تھا۔ ان کا مزہ اب تک زبان پر ہے۔ ریفری جنیٹر الم غلم قسم کے کھانوں، ابلی ہوئی ترکاریوں، ڈبہ بند سالنوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں پکانے کی کسے فرصت ہے۔ ہفتہ بھر کے کھانے پینے کی چیزیں ایک ہی دن خرید لاتے ہیں۔ اب ٹھنڈے سیٹھے سالن ہی زہر مار کرنے پڑیں گے بجلی جو بند ہے۔ لیکن اس کے سوا کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔ وہ ہمت کر کے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور ٹٹول ٹٹول کر ریفری جنیٹر، کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

وقار اور فوزی نے جب کمرے کا دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر ان کی بے اختیار چیخ نکل گئی کہ ابو فرش پر پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی کھلی بے نور آنکھیں دروازے کی سمت اٹھی ہوئی ہیں سامنے سالن کا کٹورہ اوندھا پڑا تھا اور فرش پر گرا ہوا شوربہ اور چاول صاف دکھائی دے رہے تھے دونوں نے مل کر بڑی مشکل سے بھاری بھر کم ریفری جنیٹر سیدھا کیا ورنہ نعش ہلانا بھی مشکل تھا۔

○●○

نگار سجاد ظہیر

چھتری گلی

معاف کرنا یار مجھے واپس آنے میں کافی دیر ہوگئی۔ اصل میں چچا جان گھر میں نہیں ملے تو میں ان کی تلاش میں نکل گیا۔ دو تین جگہوں پر پوچھنے کے بعد بالآخر وہ مجھے اپنے ایک دوست کے یہاں مل گئے۔ تم فکر نہ کرو میں تمہارا مسئلہ حل کرآیا ہوں۔ چلو چھتری گلی چلتے ہیں۔ یہ ٹرنک تم اٹھالو اور لاؤ یہ بیگ مجھے پکڑا دو۔

کسی سواری کی ضرورت نہیں، یہاں سے چھتری گلی کا فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ میں نے تمھیں بتایا تھا کہ وہاں میرے چچا کی ایک تین منزلہ عمارت ہے۔ اس کے چھے حصے ہیں، ایک حصے میں خود چچا رہتے ہیں اور باقی پانچ حصے کرایہ پر اٹھے ہوئے ہیں۔ اوپر چھت پر بھی تین کمرے بنے ہوئے ہیں وہاں بھی تین لڑکے کرایے پر رہتے ہیں۔ ایک کمرہ خالی ہے میں نے چچا سے بات کرلی ہے تم اسی کمرے میں رہنا۔ کرایہ زیادہ نہیں ہے۔ اڈوانس کی بھی فکر نہ کرو۔

پتہ نہیں یار اس کا نام چھتری گلی کیوں ہے، نہ وہاں چھتریوں کی کوئی دکان ہے، نہ وہاں چھتر نما کوئی یادگار ہے۔ ابھی تم دیکھنا یہ بھی تنگ سی ایک گلی ہے۔ جیسی یہاں کی دوسری گلیاں ہیں۔ یہاں دن میں بھی ہلکا ہلکا اندھیرا رہتا ہے۔ کیوں کہ دونوں طرف تین تین، چار چار منزلہ عمارتیں ہیں۔ پتہ نہیں یہ عمارتیں کب بنی تھیں، اب کافی بوسیدہ ہوگئی ہیں۔ لال پتھروں کی ان عمارتوں کے نیچے بعض دکانیں بھی ہیں۔ اس کی وجہ سے تمھیں کافی سہولت رہے گی۔ یہ گلی آگے جاکر بند ہوجاتی ہے۔ بلدیہ کے دفتر کی دیوار نے اس کو بند کردیا ہے۔ چھتری گلی میں جانے اور آنے کا ایک ہی راستہ ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے یار؟

بس ہاں، یہ سیدھے ہاتھ مڑو۔ یہی چھتری گلی ہے۔ یہ دیکھو گلی کے نکڑ پر ہی یہ ہینڈ پمپ لگا ہوا ہے۔ چچا کے گھر کے اوپر والے حصے میں پانی بہت کم آتا ہے لہذا تمھیں صبح ہی صبح یہاں سے ایک دو بالٹی پانی بھر کر لے جانا پڑے گا۔ تم اکیلے کے لیے ایک دو بالٹی پانی، کافی ہوگا۔ ویسے غسل خانے میں نلکا لگا ہوا ہے۔ کبھی کبھی بوند بوند پانی ٹپکنا شروع ہوجاتا ہے۔ صبح خالی بالٹی رکھو تو رات تک ایک بالٹی ویسے ہی بھر جاتی ہے۔ مگر یار ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔

یہ سیدھے ہاتھ پر پہلی دکان مٹھے نائی کی دکان ہے۔ پتہ نہیں اس کا اصلی نام کیا ہے۔ مگر نام سے کیا ہوتا ہے بال بڑے غضب کے کاٹتا ہے۔ پہلے پانچ روپے لیتا تھا اب ریٹ بڑھا دیے ہیں۔ پورے سات روپے لیتا ہے۔ یہ دکان اس کے باپ نے خریدی تھی، میرے چچا سے قرضہ لے کر، جس سال قرضہ پورا کیا اسی سال چل بسا۔ اب بیٹا اس کی دکان پر بیٹھتا ہے۔ بڑا ہوشیار ہے، بغیر دیکھے بال کاٹتا ہے۔ تم تجربہ کرلینا، بال تمہارے کاٹ رہا ہوگا، نظریں گلی میں آتے جانے والی عورتوں پر گاڑے ہوگا۔ جیسی عورت گزرے گی اس کے حساب سے فلمی گانا گائے گا کبھی ریشماں جوان ہوگئی، کبھی پتلی کمر ہے ترچھی نظر ہے، کبھی چلی ہو چلی ہو تم کہاں دل ربا، بس اس کا یہی کام ہے۔

یہ الٹے ہاتھ پر کرانہ اسٹور ہے۔ اس کے مالک کا نام افضل خان ہے، اس کا بڑا فائدہ ہے۔ یہ ادھار دے دیتا ہے تم چاہو تو سارا مہینہ یہاں سے سودا خریدو اور مہینے کی شروع کی تاریخوں میں جب تمھیں تنخواہ ملے اس کا حساب بے باق کردو۔ اس کی دکان پر ہر

وقت رش لگا رہتا ہے۔ وہ ادھر جو تیسرا مکان ہے اس کے ایک حصے میں یہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ اولاد کوئی نہیں ہے۔ اس کا اسے بڑا دکھ ہے بیوی بڑی ہٹیلی ہے۔ دوسری شادی کرنے نہیں دیتی۔

یہ رنگو دودھ والے کی دکان ہے۔ یہاں سے تم کو دہی بھی مل جائے گا۔ اس سے ذرا بچ کر رہنا۔ غصہ ہر وقت اس کی ناک پر دھرا رہتا ہے۔ کبھی غلطی سے بھی اس سے ادھار کی بات نہ کرنا۔ ذرا ذرا سی بات پر اپنے بیوی بچوں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی پہلی بیوی خون تھوک تھوک کر مر گئی تو اس نے دوسری شادی کرلی۔ الھڑ سی کم عمر لڑکی ہے۔ گھر کے کام کاج کا زیادہ تجربہ نہیں۔ لہذا ہر تیسرے چوتھے روز شوہر کے ہاتھوں پٹتی ہے۔ سوکن کے ڈھیر سارے بچے الگ اس کی جان کھاتے ہیں۔ یار مجھے تو اس بے چاری پر بہت ترس آتا ہے۔

یہ پنکچر کی دکان ہے۔ بابا خیرو سائیکلوں کا پنکچر لگاتا ہے۔ ابھی تو تمہارے پاس سائیکل نہیں۔ ہوگی تو پنکچر لگوانے میں آسانی رہے گی۔ یہ دکان اس کی اپنی نہیں ہے ساجد پلمبر کی دکان میں ساجھا کیا ہوا ہے۔ ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کرایہ دیتا ہے۔ یہ جو چھوٹا سا لڑکا دکان پر بیٹھا ہے اس کا نام اسلم ہے۔ یہ بابا خیرو کا پوتا ہے۔ بابا کا بیٹا رکشا چلایا کرتا تھا۔ عین جوانی میں حادثہ میں مر گیا۔ چوک کے قریب اس کے رکشا کی بس سے ٹکر ہوگئی۔ یار اس کا رکشا مڑتڑ کر رہ گیا۔ اس کی لاش ہی اندر پھنس گئی تھی۔ بڑی مشکل سے نکالی گئی اب بیوہ اور اس کے چھ بچوں کی ذمہ داری بھی اس کے بوڑھے کاندھوں پر آ پڑی ہے۔

یہ ہے میرے چچا کا گھر۔ ذرا دیکھ کر آنا۔ دروازہ تنگ ہے۔ ٹھہرو پہلے میں چلا جاؤں۔ اب ایسا کرو پہلے اپنا ٹرنک اندر کردو۔۔۔

ہاں اب آجاؤ۔۔۔ یہ سیدھے ہاتھ پر جو حصہ ہے یہاں ملک صاحب رہتے ہیں۔ یہیں کے ایک پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ ان کا ایک ہی بیٹا ہے۔ عمر میں ہم سے تھوڑا ہی بڑا ہوگا۔ وہ شہر میں کالج میں پڑھتا ہے۔ وہیں ہاسٹل میں رہتا ہے۔ بس گرمیوں کی چھٹیوں میں یا عید کی چھٹیوں میں یہاں آتا ہے باقی ملک صاحب کی بیوی اور تین بیٹیاں یہیں رہتی ہیں۔ لڑکیوں کا سن کر کسی چکر میں نہ آجانا ملک صاحب کی لڑکیاں بہت سخت پردہ کرتی ہیں۔ گھر سے بھی بہت کم ہی نکلتی ہیں۔ نکلتی بھی ہیں تو یا اپنے باپ کے ساتھ یا ماں کے ساتھ۔ میں نے تو آج تک ان لڑکیوں کو نہیں دیکھا۔

یہ الٹے ہاتھ والے حصے میں میرے چچا رہتے ہیں۔ اس وقت گھر پر نہیں ہیں ورنہ تم سے ملواتا۔ میری چاچی بہت اچھی ہیں بہت ہنس مکھ اور ملنسار۔ میرے چچا کے تین بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں۔ بڑی بیٹی کی شادی ہوگئی ہے۔ وہ قبرستان کے پچھلے محلے میں رہتی ہے۔ اس کا میاں اور سسرال والے بڑے ہی خرانٹ ہیں۔ اس کو میکے نہیں آنے دیتے۔ چاچی کو اس بات کا بڑا دکھ ہے۔۔۔ چھوٹی بیٹی۔۔۔ یار اب تم سے کیا چھپانا۔۔۔ مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ میں نے اماں ابا سے کہہ دیا ہے کہ فاطمہ سے ہی شادی کروں گا۔ ابا تو راضی ہیں۔ اماں آنا کانی کررہی ہے۔ وہ اپنی بہن کی بیٹی سے میری شادی کرنا چاہتی ہے۔ میری خالہ زاد کا نام نسرین ہے۔ مجھے تو بالکل اچھی نہیں لگتی۔ ہر وقت دانت نکلے رہتے ہیں۔ ہر وقت ہنسی ٹھٹھول میں لگی رہتی ہے۔ پانچویں میں بار بار فیل ہوکے پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔۔۔ گھر میں ٹکتی ہی نہیں اسے ڈھونڈنا ہو تو محلے بھر کے گھروں میں جھانکتے پھرو۔ یار مجھے ایسی لڑکیاں زہر لگتی ہیں۔ لیکن یہ جو میری چچازاد ہے۔ فاطمہ اس سال دسویں پاس کرلے گی۔ گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ اس کے ہاتھ کے پکے کھانے کھالو تو اور کچھ اچھا نہ لگے۔۔۔ پھر دیکھنا یار۔۔۔ روز میرا انتظار کرتی ہے۔۔۔

دیکھنا ذرا آرام سے۔۔۔ میرا خیال ہے بکس سر پر رکھ لو۔ اصل میں سیڑھیاں تنگ ہیں۔ ویسے تو سیڑھیاں مضبوط ہیں مگر کہیں کہیں سے کوئی اینٹ اکھڑی ہوئی ہے اس لیے ذرا قدم جماکر رکھنا۔ اب تو تمہاری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوگئی ہوں گی دوچار

یار ان سیڑھیوں سے گزرو گے تو عادی ہو جاؤ گے۔ زندگی میں بہت سی بے ڈھنگی چیزوں کے ہم آخر عادی ہو ہی جاتے ہیں۔

ہاں بھئی، یہ دوسری منزل ہے۔ اس کے سیدھے ہاتھ والے حصے میں شکور صاحب رہتے ہیں، یار ان کے ساتھ تو بڑی ٹریجڈی ہوئی۔ پہلے یہ ریلوے کالونی میں رہتے تھے، وہیں محلے کی کسی لڑکی سے ان کا چکر چل گیا۔ بڑی مشکل سے انھوں نے اپنے ماں باپ کو راضی کیا۔ شادی طے ہوگئی، شکور صاحب بہت خوش، ان کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ایک ہفتے پہلے سے دونوں گھروں میں ڈھولک رکھی گئی اور طرح طرح کی رسمیں شروع ہوگئیں۔ خدا کی قسم یار وہ لڑکی تھی یا آفت کی پرکالہ، شادی سے تین دن قبل کسی کے ساتھ بھاگ گئی، آج تک پتہ نہیں چلا کہاں گئی؟ اس کے بھائی شکاری کتوں کی طرح اس کی تلاش میں تھے۔ اب تو یہ کتے بھی تھک چکے ہیں، اس واقعے کے بعد شکور صاحب مہینوں بستر پر پڑے رہے، پچھلے سال ان کے گھر والوں نے ان کی دوسری جگہ شادی کردی، یہ اپنی بیوی کے ساتھ اس حصے میں رہتے ہیں، میاں بیوی میں بڑے ہی رسمی سے تعلقات ہیں، بعض اوقات تو سارا دن گزر جاتا ہے دونوں میں کوئی بات نہیں ہوتی۔ تمھاری مرضی ہے اگر تم ان سے دوستی رکھنا چاہو، عجیب ہی آدمی ہیں۔ تم ان کے پاس سے گزر جاؤ گے انھیں پتہ بھی نہیں چلے گا، ابھی تم اپنا تعارف کراؤ گے، گھنٹہ بھر ان سے باتیں کرو گے، اگلے ہی دن اگلی ہی ملاقات پر تمھیں پتہ چلے گا کہ یہ تمھیں تمھارے نام سمیت بھول چکے ہیں!

یہ الٹے ہاتھ پر جو حصہ ہے یہاں رفیق صاحب اپنی ماں اور بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں یہ گھر کم اور پانی پت کا میدان زیادہ ہے۔ اگر تمھیں کبھی چیخ و پکار اور دنگے فساد کی آواز آئے تو سمجھ لینا ساس بہو کا ڈرامہ چل رہا ہے۔ یار بڑھیا بڑی ہی غرانٹ ہے دیا تو بہو سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی ہے یا پھر دروازے پر آکر بیٹھ جاتی ہے اور آنے جانے والے کو کوستی کاٹتی رہتی ہے۔ شکر کرو یار اس وقت دروازہ بند ہے۔ اس سے ذرا بچ کر رہنا، اگر تم اس کے ہتھے چڑھ گئے تو کم از کم تمھارا گھنٹہ ضرور ضائع کرے گی اپنی بہو اور اس کے خاندان کے "مقصیدے" سناتی ہے۔ حالاں کہ اس کا اور اس کی بہو کا خاندان ایک ہی ہے، یعنی وہ اس کی سگی بھتیجی ہے۔۔۔ ایک دن تو یار حد ہوگئی، بیٹے سے ایسی لگائی بجھائی کی کہ رفیق بھائی آپے سے باہر ہوگئے، مارپیٹ کر بیوی کو گھر سے نکال دیا۔ وہ بے چاری یہیں سیڑھیوں پر بیٹھی روتی رہی، میری چاچی کو پتہ چلا وہ بھاگی ہوئی آئی، بڑی مشکل سے صلح صفائی کرائی۔ بڑھیا تو اسے گھر میں رکھنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ کہتی تھی میرے ساتھ اس نے زبان چلائی ہے لہذا اس حرافہ کو طلاق دو۔۔۔ یار اگر ساسوں کو طلاق دلوانے کا حق مل جائے تو کسی عورت کا گھر نہ بچے، سوائے ان کے جن کی ساسیں مر چکی ہوں۔

تیسری منزل کا یہ سیدھے ہاتھ والا حصہ ابھی خالی ہے۔ تھوڑے دنوں میں یہ بھی آباد ہو جائے گا اصل میں یہ حصے چھوٹے ہیں، بڑے خاندان کے لیے تنگ پڑتے ہیں، تم نے تو یہ حصے اندر سے نہیں دیکھے، ہر حصے میں دو کمرے ہیں، ایک باورچی خانہ، ایک غسل خانہ اور بیت الخلاء ایک چھوٹا سا برآمدہ۔

یہاں الٹے ہاتھ والے حصے میں زبیدہ رہتی ہے۔ اس کے چار بچے ہیں، ابھی جوان ہی ہے اور خوب صورت بھی، برقعہ اوڑھتی ہے مگر منھ کھلا رکھتی ہے۔ اس کا شوہر کریم آج کل جیل میں ہے، اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ اگر اسے پھانسی نہ ہوئی تو چودہ سال کی قید ہو جائے گی۔ زبیدہ فیکٹری میں کام کرتی ہے۔ یہاں کریم کے دوست فضل کا بہت آنا جانا ہے۔ فضل زبیدہ اور اس کے بچوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ جب آتا ہے کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتا ہے، پھل، مٹھائی، کھانا، کپڑا، یار مجھے تو دال میں کالا لگتا ہے، چھٹی والے دن تو فضل تقریباً سارا دن ہی یہاں پڑا رہتا ہے میں تو کہتا ہوں اگر کریم جیل سے چھوٹ کر آگیا تو وہ ایک قتل اور ضرور کرے گا، یہی فضل کا قتل۔۔۔

پتا: نام صاحب زمی " حیدرآباد۔

یہ لو ہم چھت پر آگئے ، یہ تینوں کمرے ہیں ۔ اس پہلے کمرے میں ناصر رہتا ہے ۔ صبح سے دوپہر تک ڈاک خانے میں کام کرتا ہے ۔ شام سے رات تک ہوٹل میں کام کرتا ہے ۔ سارا دن کولھو کے بیل کی طرح جتا رہتا ہے ۔ یار اسے دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی ہے ۔ باپ ہے نہیں ۔ ماں ایک بھائی اور پانچ بہنوں کا بوجھ اٹھایا ہوا ہے ۔ بہنیں تو چھ تھیں ، سب سے بڑی بہن کی شادی باپ کی زندگی میں ہی ہوگئی تھی مگر شادی کے چند ماہ بعد ہی اس لڑکی کو اس کے ساس سسر اور شوہر نے جلا کر مار ڈالا کہ یہ ان کی مرضی کے مطابق جہیز کیوں نہیں لائی ۔ کیسا ظلم ہے یار ۔ ۔ ۔ اب ایک بھائی کو پڑھانے اور باقی پانچ بہنوں کے جہیز بنانے کے چکر میں نہ دن کو دن سمجھتا ہے نہ رات کو رات ۔ ہر مہینے ڈیڑھ ہزار روپے پابندی سے اپنے گھر والوں کو بھجواتا ہے ۔ تیس ہزار کی کمیٹی ڈالی ہوئی ہے ۔ اگلے سال اس کی کمیٹی نکلے گی ۔ کہہ رہا تھا دوسری بہن کو اچھا جہیز دے گا تاکہ اسے جل کر مرنا نہ پڑے ۔ میں کہتا ہوں یار ، تو کچھ اس کی مدد کر ۔ اس کی جو بہن جل کر مری تھی اس کی شادی کی تصویر میں نے دیکھی تھی ۔ بڑی خوب صورت تھی یار اگر باقی بہنیں بھی ایسی ہی ہیں تو کیا برا ہے ۔ کم سے کم تجھ میں اتنی انسانیت تو ہے کہ کم جہیز پر اس پر مٹی کا تیل نہیں چھڑکے گا ۔

یہ دوسرا کمرہ ہے یہاں سلطان رہتا ہے ۔ آج کل اپنے بھائی کی شادی پر گاؤں گیا ہوا ہے کچھ دنوں میں آجائے گا ۔ یاروں کا یار ہے ۔ تیری اس سے دوستی اچھی رہے گی ۔

یہ لو تمہارا کمرہ آگیا ، چلو یار بکسہ تو اتارو ۔ یہ رہا تمہارا بیگ ۔ ۔ ۔ کمرہ چھوٹا ہے لیکن تیرے لیے کافی ہے ۔ تمھیں اس کی تھوڑی صفائی کرنی پڑے گی ، دو مہینے سے بند پڑا تھا نا اس لیے ۔ اوہو بلب فیوز لگتا ہے ، چلو کوئی بات نہیں افضل خان کی دکان سے بلب لے آنا ، ویسے بھی یہاں آدھا دن تو لوڈشیڈنگ میں گزر جاتا ہے ۔

یہ برابر میں چولہا لگا ہوا ہے ۔ وہ اس طرف ایک غسل خانہ اور بیت الخلا ہے ۔ چھت کی دیواریں تمھیں اونچی لگ رہی ہوں گی ۔ اصل میں یار پچھلے سال یہاں دو لڑکے رہتے تھے امجد اور سلیم ، دونوں ہی بڑے بدمعاش اور تاڑو تھے ۔ اردگرد کے گھروں کی چھتوں پر آنے والی لڑکیوں کو تاڑنے اور اشارے کرتے ۔ کچھ عرصہ تو یہ سلسلہ چلتا رہا پھر پڑوسیوں کو پتہ چل گیا ۔ انھوں نے چچا سے شکایت کردی ۔ چچا نے انھیں چلتا کیا ، پھر یہ دیواریں اونچی کردی گئیں ۔ ویسے تو جالیاں بھی لگائی گئی ہیں تاکہ ہوا نہ رکے ، ان جالیوں سے اب بھی نظر تو آتا ہے ۔ اردگرد کی چھتوں کا ماحول بھی بڑا خوش گوار ہے یار ، لڑکیاں اپنی اپنی چھتوں پر ضرور آتی ہیں ، کبھی کپڑے پھیلانے آتی ہیں کبھی کپڑے اتارنے ۔ مگر یار ذرا خیال رکھنا ، چچا کو تمہاری شرافت کی گارنٹی دی ہے ۔ اچھا یار اب تم اپنا کمرہ سیٹ کرو ۔ مجھے تھوڑا کام ہے ، میں چلوں گا ، یہاں کوئی پریشانی ہو تو چچا کے پاس چلے جانا ۔ ۔ ۔ میں بھی چکر لگاؤں گا ۔ ۔ ۔ اچھا یار اللہ بیلی ! !

ooo

آنند یادو

ترجمہ: قاسم ندیم

آخری جوڑی چپل

گاؤں جانا تھا۔ چپل خریدنے کے لیے پونہ کے لکشمی روڈ پر بھٹک رہا تھا۔ جگمگاتے سونے چاندی کے گہنوں کی دکانوں کے پاس ہی جوتے چپلوں کی دکانیں بھی تھیں۔ جوتوں کو زیورات کی طرح سجایا گیا تھا۔ کسی قیمتی چیز کی طرح خوب صورت چپلیں نکال کر نوکر کرسیوں پر آرام سے بیٹھے گاہکوں کے پیروں میں پہنا رہے تھے۔ جس طرح مائیں بچوں کو آہستگی سے کپڑے پہناتی ہیں۔ ویسے ہی پیروں میں نوکر چپلیں پہنا رہے تھے۔ مالک بھی گاہکوں کے پیروں کو قیمتی سمجھتے ہیں۔

چپلوں کے ناپ، رنگ، بناوٹ، پیروں کی بجائے دل میں اچھی لگنے پر بھنوئیں اوپر چڑھا کر دیکھ رہے تھے۔ نوکر جھک کر قیمت سے پہلے "صرف" لفظ لگا رہے تھے اور پیروں کے گہنے پیک کر کے بڑے ادب سے دے رہے تھے۔

قیمت سنتے ہی مَیں اندر اندر دہل جاتا تھا۔ ایک ایک جوتے کی قیمت کا مطلب تھا کھیتوں میں مزدوری کے لیے جانے والے میرے والد کے پورے مہینے کی کمائی۔ یوں کہیے، اگر بابوجی سال بھر میں ایک بھی دن آرام نہ کر کے صرف کام کرتے رہیں تو وہ سال میں بارہ جوڑی جوتے خرید سکتے ہیں۔ میرے گھر میں ہم آٹھ بھائی بہن۔ ماں اور بابوجی سمیت دس۔ اس طرح گھر کے ہر فرد کی چپلوں کے لیے بابوجی کو ساری زندگی ہی کام کرنا پڑے گا۔ یہ چپلیں بھی ان کے پیروں میں پتھروں، ڈھیلوں میں صرف پانچ چھ مہینے ہی چلیں گی، اتنی نازک ہیں۔ ایسی چپلیں کیسے خرید سکتے ہیں۔

سبھی مزدوروں کو جو ملتا ہے وہی بابوجی کو ملتا ہے۔ ایک بات اچھی ہے۔ چماروں کی چپلوں کی یہاں قدر ہے۔ مہنگے کپڑوں اور سونے چاندی کی دکانوں کے پاس انھیں سجا کر رکھا ہے۔ چپلوں کی حیثیت زیورات تک بڑھ گئی ہے۔۔۔ گاؤں میں چمارواڑی ہے دسا میدان کے پاس۔ جوتوں کو وہاں پیروں کی شان نہیں سمجھتا۔ وہاں اسے دھتکارا جاتا ہے۔ پیر کی جوتی پیر میں بھلی، کہہ کر کوئی اسے زیور سمجھ کر سجا کر نہیں رکھتا۔ وہ سارے گاؤں کی گندگی چیر کر "کھیت کھلیان بھٹک آتے۔ وہاں ان کی اتنی ہی قیمت۔ ان کے نصیب میں گھر سے موٹر، موٹر سے آفس اور پھر آفس کے قالین اور ہر چوتھے دن پالش والے لڑکوں کی سروس کہاں تھی؟ لکشمی روڈ کی عالی شان دکانوں پر ممتا، بنات والا کے نام نظر آتے ہیں۔ چپلوں پر باٹا کا قانونی سیل۔ چماروں کے ایسے نام نہیں ہوتے۔ چمار کو اس لکشمی روڈ پر کون آنے دے گا؟ ۔۔۔ "لکشمی" کا روڈ!

یہاں چپل لینی ہی نہیں چاہیے۔ چپل کے لیے اتنے پیسے دینا میرے لیے ممکن نہیں۔ اوپر سے یہ سب دکھاوا۔ چار مہینے استعمال کرنے پر ٹوٹ جاتی ہیں۔ روز ایک دو گھنٹے چپل کی مرمت میں نکل جاتا ہے۔ پچاسوں بار ٹانکے لگوانے پڑتے ہیں۔ گاؤں جا کر ہی خریدنا بہتر۔

دکانوں میں گھومتے ہوئے دل کچوٹتا رہا۔ چپل بنا خریدے ہی لوٹ آیا۔ گھر میں ہم چاروں کی چپلوں کا وہ ڈھانچہ سال میں ایک ایسر سا لگ گیا تھا۔ گاؤں جاتے وقت ان ساری چپلوں کو ایک تھیلی میں ٹھیک سے رکھ لیا۔ دوسرے دن گاؤں کے لیے روانہ ہوا۔

چپلوں کی تھیلی ساتھ تھی۔ بیوی کی سسرال اور میکہ ایک ہی گاؤں میں ہونے کی وجہ سے اسے اس کے گھر پہنچا دیا اور رات میں آٹھ نو بجے کے آس پاس گھر پہنچا۔ بھائی بہنیں انتظار کر رہے تھے۔ کھانے کے لیے رکے ہوئے تھے۔ گھر پہنچتے ہی چھوٹی پھوپی نے میرے ہاتھ سے تھیلی چھین لی۔

"اس میں کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ٹوٹی ہوئی چپلیں ہیں۔" اس کے دل کی بات جانتے ہوئے میں نے کہا۔

"انھیں کیوں یہاں لے کر آیا؟" ماں نے حیرت سے کہا۔

"لے آیا، بس۔" میں ہاتھ منہ دھو کر آیا۔ وہ چائے بنانے گئی۔

"ٹھہرو۔ تمھیں چپل دکھاتا ہوں۔" کہہ کر میں نے تھیلی کھولی۔

"رام، رام۔۔۔ یہ تیرے ہی گھر کی ہیں؟"

"ہاں۔"

"اچھی ہیں رے۔ کہیں انگوٹھا ٹوٹا ہے۔ تو کہیں سلائی ادھڑ گئی ہے۔ سِل کر آرام سے پہن سکتے ہیں۔"

پھر سب یہ دیکھنے میں مصروف ہوگئے کہ کس کے پیر میں کون سی چپل ٹھیک طرح آتی ہے۔ سب اپنی چپلوں میں کھو گئے۔ میرے پیر کی چپلیں بابوجی کے پیروں میں ٹھیک سے بیٹھیں گی، یہ مجھے معلوم تھا۔ وہ جوڑی بھی میں ساتھ لایا تھا۔ پیروں میں دوسرا جوتا تھا۔ اسے بھی اب پھینکنا ہی تھا۔ ٹوٹی چپلوں کی ماں کی سوچ کچھ اور تھی۔

ایڑی گھس گھس کر آدھی رہ گئی ہو، آدھے کا بھی تلا گھس جائے پر اس پر پرانے جوتے کا تلا لگا کر سی لینا۔ وہ بھی گھس گھس کر ان میں بھی سوراخ پڑجائیں، انگوٹھا ٹوٹ ٹوٹ کر بنے ہوئے بڑے سوراخوں میں بھی پیوند لگا کر انگوٹھا لگانا۔ وہ بھی گھس جاتے اور سلائی کرنا ناممکن ہوجاتے تب، اسے ٹوٹی چپل کہتی۔ ایسی ٹوٹی چپل مجبوری میں بے رخی سے پھینک دیتی۔ ایسی ایک بھی ٹوٹی ہوئی چپل اس میں نہیں تھی۔ اس وجہ سے بھائی بہنوں کو ان چپلوں کو دیکھ کر نئی چپلوں کی ہی خوشی ہوئی۔

کھاتے وقت ماں نے بتایا "چپلوں پر بلاسبب پیسہ خرچ مت کرو۔ زیادہ تر پیسوں کی بچت کرو۔ اس طرح مت اڑاؤ۔ ایک جوڑی جوتا پھٹ جانے پر ہی دوسرا خریدو۔ میں ہاں، ہاں کہہ رہا تھا۔ شہروں کی زندگی سے وہ واقف نہیں تھی اور میرے پاس سادگی پسند طبیعت نہ تھی۔ دھیرے دھیرے میں پرانا سب کچھ بھول کر شہری زندگی کا شکار ہوتا جارہا تھا۔

صبح اٹھ کر ماں نے بھینس کا گوبر صاف کرکے دودھ دوہا۔ دودھ نکال کر، ٹوٹی چپلوں کی تھیلی انڈیل کر بیٹھ گئی۔ ایک ایک جوڑی باندھ کر رکھی۔ یہ شیوا کے لیے، یہ میری کے لیے، یہ لکشمی کے لیے، کہتے ہوئے تھیلی میں رکھتی گئی۔ پھر جانے لگی۔

"کہاں جارہی ہو ماں؟" میں نے پوچھا۔

"تکا چمار کے پاس جاکر آتی ہوں۔"

"میں بھی آتا ہوں نا! میں بھی پیروں کا ناپ دے دونگا۔ چار، چھ دنوں میں وہ جوتے بنا دے گا؟"

"بنا کیوں نہیں دے گا؟"

میں کپڑے پہن کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ جاتے جاتے یوں ہی پوچھا۔ "تکا چمار کون سا؟"

"ہمارا پرانا چمار ہے۔ گورا تکا، بالو کے باغ کے پاس بیٹھتا ہے، یاد ہے؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اب بھی ہے، وہ؟"

"ہاں۔۔۔ ہے، پر اب بہت بوڑھا ہوگیا ہے۔"

پچیس تیس سال پہلے کے دن یاد آگئے۔ نو دس سال کا میں تھا۔ حکا چمار کو بابوجی نے آپسی لین دین پر طے کرلیا تھا۔ ان دنوں بابوجی دوسروں کے کھیت بٹائی پر لیتے تھے۔ چمار کا کام اکثر ہی ہوتا۔ میں، موٹھ کے لیے چمڑے کا ٹکڑا لانے، ٹوٹے چابک کا سرا بنانے، ٹوٹی چپل ٹھیک کرانے کے لیے اس کے پاس جاتا تھا۔ پہلے دن شام کو اگر موٹھ لگانا طے ہوتو بابوجی مجھے صبح اس کے گھر دوڑاتے جاسے، دیکھ کر آ حکا نے موٹھ لگادی ہے یا نہیں! اگر ٹھیک نہ کی ہو تو اپنے سامنے ٹھیک کروالینا۔ کہنا، بابوجی پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ جلدی موٹھ ٹھیک کردو۔ باغیچے میں لے جانا ہے۔ موٹھ لگانی ہے، تب تک میں آتا ہوں۔ اگر رات میں ہی ٹھیک کرلیا ہو تو بھاگتے ہوئے میرے پاس آنا بتانے کے لیے۔" ہاں کہہ کر میں نکل جاتا۔

کبھی حکا نہا دھوکر دکان میں لگے سب ہی دیوی دیتاؤں کے فوٹو کو گھنٹی بجا بجا کر اگربتی لگاتا۔ گورا اور کسا ہوا بدن۔ داڑھی بڑھا بناتا۔ دھوتی دھلی ہوئی۔ جنیو پہننے پر برہمن لگے، اتنا صاف ستھرا رہتا تھا۔ بات چیت میں ہوشیار۔ کبھی کبھار کام میں مصروف رہتا۔

دکان میں کھونٹیوں کے اوپر رنگین تصویروں کی قطار تھی۔ سب دیوی دیوتاؤں کی تصاویر۔ تینوں دیواروں پر پھیلے ہوئے۔ تصویروں کے نیچے مزدور چمار نیچے گردن جھکائے چمڑا کاٹتے، سلوٹ ٹھیک کرتے، چمڑے کے ٹکڑے بناتے۔ کوئی پریس چپکا کر تلا بٹھاتا۔ دکان گھر میں ہی تھی۔ پتھروں کے بڑے بڑے کمرے تھے۔ سڑک سے لگا برآمدہ ہی دکان تھی۔ سامنے تختیاں لگی ہوتیں۔ دیواروں پر سفیدی تھی دکان کے اوپر پیلا چمڑا سوکھتا اور نیچے کام کی مصروفیت۔۔۔ کام ہی کام تھا۔

ایک جانب کرسی ڈال کر حکاما سارے کام پر نظر رکھتا۔ دکان پر آئے لوگوں یا گاہکوں سے باتیں کرتا۔ آنے والے بینچ پر بیٹھتے۔

پانچ چھ سال تک وہ ہمارے لین دین پر کام کرتا رہا۔ ایسے کئی کسان اس کے گاہک تھے۔ اسے ایک کے بعد ایک لڑکیاں ہی تھیں۔ لڑکا ہو، اس کے لیے کئی منتیں مانگتا۔ بیٹیاں خوب صورت تھیں۔ ادھر ادھر بھٹکتی رہتیں۔ دروازے پر ہی گولیاں کھیلا کرتیں۔ پارو خالہ کبھی کبھی دکان سے لگی دیوار سے ٹک کر بیٹھ جاتی۔ پان کھاتی، منہ ہمیشہ لال رہتا۔ ہنستے ہوئے بولنے کی عادت تھی۔ کبھی کبھی باغیچے کی جانب کچھ مانگنے کے لیے نکل پڑتی۔ تب لگتا کہ باغیچے کی مالکن ہی آگئی ہو۔ کام کرتے لوگ، آنے جانے والے، گاہکوں اور بچیوں سے گھر ہمیشہ بھرا بھرا رہتا۔

ساتواں بیٹا ہی ہوا۔ اس کی خوشی میں حکاما نے سارے چمار واڑے کو چھٹی کا کھانا کھلایا۔ ہم نے گیہوں اور مکئی کا آٹا پہلے ہی لے کر چھٹی کا انتظام کیا۔

ان سارے خیالات میں میں ڈوبا ہوا تھا۔۔۔ آج حکاما کیا دکھائی دیتا ہوگا۔ پارو خالہ کیسی ہوگی، بچیاں اور اس کا بیٹا کتنا بڑا ہوگیا ہوگا؟۔۔۔ بس یہی سوچتا ہوا میں حکاما کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ دکان ابھی کھلی نہیں تھی۔ صرف دروازے کے دو پٹ کھلے ہوئے تھے۔ اندر میں خاموش ہی خاموش۔

"حکاما!" ماں نے باہر سے ہی پکارا۔

"کون ہے؟" ایک ڈوبتی ہوئی۔۔۔

"میں ہوں پارو۔"

ماں اندر گئی۔ پیچھے پیچھے میں گیا۔ برآمدے سے اندر جھانکا تو صرف اندھیرا تھا۔ دکان سے سجا برآمدہ منحوس لگ رہا تھا دھیرے دھیرے اندر کا اندھیرا ایک شکل لینے لگا اور وہ ایک لاٹھی کے سہارے آتی ہوئی ایک کم زور بڑھیا بن گیا۔

"کیوں مالکن؟" اتنا ہی کہنے سے اس کی سانس پھول گئی۔ دھوپ میں گھائل چڑیا سی اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔ برآمدے کے دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھوں والا چہرہ کھوپڑی سا لگ رہا تھا۔ سفید بال تھے۔ صرف گورا رنگ ہی باقی تھا۔ مگر منھ میں پان تھا۔۔۔ پارو موچی صرف ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گئی تھی۔

"حکاما کہاں ہے؟"

"اسٹینڈ پر گئے ہیں۔ اب کھانے کے وقت آئیں گے۔ کوئی کام تھا؟"

"یہ پرانے جوتے، چپلیں لائے ہیں ٹھیک کروانے۔"

"یہاں رکھیے اور شام کو آئیے۔ دوپہر میں آتے ہی ٹھیک کر دیں گے۔" پارو موچی نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔ میں بھی دس سے پینتیس سال پار کر گیا تھا۔ ماں نے اسے بتایا۔ "یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔" اتنا کہنے پر پرانی یادیں ابھرنے لگیں۔ اس کے چہرے پر کچھ اجالا بکھرا۔ پھر دونوں پرانی باتوں میں کھو گئیں۔

میں برآمدے کے خالی پن کو دیکھنے لگا۔ وہاں کی چہل پہل پوری طرح بجھ گئی تھی۔ اس کے اوپر کی جگہ پوری خالی پڑی تھی۔ دکان میں لگی دیوی دیوتاؤں کی تصاویر غائب تھیں۔ مگر دروازے کے پاس حکاما کا جوانی کا، بیوی اور بچوں کے ساتھ والا فوٹو اور شاید بارہ پندرہ سال کے اس کے بیٹے کا فوٹو چھوٹے سے فریم میں لگا ہوا تھا۔ پھیکا نیلا رنگ اڑ چکا تھا اور دیواروں پر سفید مٹی پتی ہوئی تھی۔ برآمدے میں موچی کام کا ایک بھی اوزار نہیں تھا۔ برآمدے پر جیسے نیلامی کا حکم آیا ہو، اس قدر وہ خالی خالی پڑا تھا۔

پارو موچی کی سانس پھول گئی تھی اور وہ گھبرانے لگی تھی۔

"ماں اب بس بھی کرو۔ اس کی سانس پھول رہی ہے۔ اسے آرام کرنے دو۔ پرانا جتنا یاد کروگی، کم پڑے گا۔" میں بھی اس سے کافی باتیں کرنا چاہتا تھا مگر سب رہ گیا۔

شام میں چار بجے اسٹینڈ کی جانب گیا۔ اسکول کے راستے کے کنارے احاطے کے پاس حکاما بیٹھا تھا۔ اسکول کے احاطے میں آم کا پیڑ کافی بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی ایک ڈالی احاطے پر جھک گئی تھی۔ دیوار اور ڈالی کے بیچ بیٹھا ہوا حکاما سایے میں کام کرتا۔۔۔ اس کے پاس ریڈیو بجتے ہوئے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔

راستے کے کنارے سیمنٹ کا کھلا گٹر بنانے کے لیے نالی کھودی گئی تھی۔ اس کی کھدی ہوئی مٹی حکاما کے سامنے پڑی تھی۔ وہ اسی مٹی میں اگا ہوا لگ رہا تھا۔ زمین پر ٹکی اس کی گردن جھکی ہوئی۔ دونوں پیروں میں موٹا ٹائر پکڑ وہ جوتے کے تلے کاٹ رہا تھا۔ رانپی کو بار بار گھستا۔ پھر بھی ٹائر میں گھسنے پر آگے نہ سرکتی۔ اسے وہ آگے نہ کھینچ پاتا۔ اس کے پاس ٹوٹے ہوئے جوتوں، چپلوں کا کالا کالا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ پاس ہی، کچرے کے ڈھیر میں مریل کتا پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کچرا الٹ پلٹ کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

سارا گاؤں حکاما کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ گٹر بنایا جا رہا تھا۔ ادھر حکاما ان سارے لوگوں سے بے خبر جوتوں کے ڈھیر میں گاؤں والوں کے پیروں کے جانب نظریں گڑائے بیٹھا تھا۔

"رام رام ٹھکا رام! پہچانا مجھے؟"

پل بھر کام روک کر اس نے اوپر دیکھا۔ ماتھے پر پسینے کی دھار تھی اس بڑھاپے میں بھی۔

"رام رام! پہچان کیسے نہ ہوگی؟ صبح گھر گیا تھا نا۔" اس نے ریڈیو کی آواز دھیمی کی۔

"ہاں۔" پہلے کی رعب دار آواز اب تھر تھرانے لگی تھی۔

"بڑھاپے میں یہ کیا چل رکھا ہے؟ گھر بیٹھ کر آرام نہیں کرسکتے؟"

"گھر بیٹھ کر کون کھلائے گا؟ ہمارے کیا کھیت کھلیان ہیں؟ زندگی بھر گاؤں کے جوتے ٹھیک کیے تو ہمیں کوئی پنشن دے گا؟"

"نہیں کوئی نہیں دے گا۔"

"پھر کیسے کہتے ہو؟ ایسے ہی جوتے سیتے ہوئے مرجائیں گے ایک دن، اسی گٹر پر کنارے!"

"ایسا نہیں، تمہارا بیٹا اب بڑا ہوگیا ہوگا۔"

"تب کیا با۔۔ تھی؟ اسے مرے ہوئے تو دس سال ہوگئے۔"

"کیسے:" میں ہکلانے لگا۔

"یکا کے پٹرول پمپ پر اس کا خون ہوگیا۔ کیا کریں!" اس نے حقیقت بیان کی۔ محنت سے بچے کو پڑھا رہا تھا۔ ہائی اسکول پڑھائی پوری ہونے والی تھی۔ امتحان کے بعد گرمی کی چھٹیاں لگی تھیں۔ گھر بیٹھ کر کیا کرے۔ سوچ کر وہ نئے پٹرول پمپ پر کام کرنے کے لیے جانے لگا۔ رات میں اس پمپ پر کسی ٹرک والے نے ہی رقم لوٹنے کی کوشش کی۔ اس چھینا جھپٹی میں اس کے سر پر لوہے کی سلاخ دے ماری اور اس کی کھوپڑی پھوٹ گئی۔ دوسرے دن ہسپتال میں وہ مرگیا۔ میری اونچائی کا ہوگیا تھا وہ۔ پر بھگوان دیکھ نہیں سکا۔ اسے لگا یہ جوڑی توڑ دیں۔ اسے گانے کا بہت شوق تھا۔ امتحان ختم ہوتے ہی گرمی میں وہ ادھر ادھر گھومتا جنگل میں کام کے لیے وہ جاتا۔ ایسا کچھ کر کے پیسے بھی کماتا۔ کبھی کپڑے خریدتا، کبھی کتابیں۔۔۔ اس میں سے یہ ریڈیو خریدا بس یہی نشانی رہ گئی ہے اس کی۔ میں بھی کس طرح سیل ڈال کر اسے زندہ رکھتا ہوں۔۔۔ گانا بجاکر، کام کرتے میں اچھا لگتا ہے۔ کیا کریں؟

"بچوں کے کیا حال ہیں؟ چھ بیٹیاں تھیں نا؟"

ہاں، ان کا ٹھیک ہی چل رہا ہے۔ اپنے اپنے گھر پیٹ بھر رہے ہیں، یہ کیا کم ہے؟ اچھے دنوں میں پہلی چار بیٹیاں کچھ کھاتے پیتے گھروں میں دیں۔ چھوٹی دو بیٹیوں کے گھر والے بوٹ پالش کرتے بھٹک رہے ہیں بمبئی میں۔ سگے بھائی ہیں دونوں۔ سوچا موقع آیا ہے تو نپٹا دیں۔ کیا کریں؟ اجڑی ہوئی عزت و وقار کا افسوس چہرے پر اوڑھے بنا ہی وہ سب بتارہا تھا۔ پیدا شدہ حالات کا سامنا کررہا تھا۔ ادھر اس کے بارے میں میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔

"ٹھکا، پہلے تو تمہارا بہت اچھا چل رہا تھا، اب اچانک اتنی خراب حالت کیسے ہوگئی؟"

"میرے اکیلے کی بات کیا لے کر بیٹھ گئے۔ سارا چمار واڑہ ہی زمین سے اکھڑ گیا ہے۔"

"کیوں؟"

"ربر کی چپلیں آئیں۔ پھر چمار کا مال کیوں لے؟"

"میرا تجربہ تو یہی ہے کہ آپ کا مال بھی ٹھاٹھ ہے۔"

ٹکاؤ چیز کون دیکھتا ہے ؟ اب تو بس فیشن چاہیے نا ! آپ کے پونے ، بمبئی میں فیشن کے جوتے چپلوں کے کارخانے شروع ہوگئے اور ہمارا چمار واڑہ اجڑ گیا۔ پھر بھی شروع شروع میں ٹھیک چل رہا تھا۔ اب گاؤں دیہاتوں میں پکی سڑکیں آگئیں۔ گنے والے کسانوں کے پاس جیپ گاڑیاں آگئیں۔ موٹر سائیکلیں ہیں، ٹریکٹر آگئے ہیں۔ آپ کو بتاؤں، ٹرک بھی آگئے ہیں۔ کسی نہ کسی کا ٹریکٹر، جیپ ٹرک روز کولھاپور جاتا ہے۔ پھر کیا، اسی سے آدھے خرچ میں کولھاپور جاتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں۔ ہوٹل میں کھاتے پیتے ہیں۔ ربر کے جوتے چپل خریدتے ہیں۔ سستا کہے تو سستا یا مہنگا چاہیں تو مہنگا ملتا ہے۔ خرید کر یہاں آجاتے ہیں۔۔۔ ہم یہاں بے قیمت ہوگئے۔ دس سال میں سب بدل گیا۔ چمار کے ہاتھوں سے سارا دھندہ ہی نکل گیا۔ اب ایسے بیٹھ کر ربر کی چپلیں دھاگے سے سیتے ہیں۔ اب کے چمار کے بچوں کو سل یعنی کیا، یہ بھی نہیں معلوم۔"

"مگر ٹکاما، میں انھیں ربر کی چپلوں سے اوب کر تمھارے پاس آیا ہوں۔ میرے لیے چمڑے کی سادہ کولھاپوری چپل باندھ دو۔ پہلے تمھاری بنائی چپل جنگل میں بھی دو تین سال چل جاتی تھی۔ اب مجھے وہ تین تین سال تک شہر میں چل جائے گی۔ پیروں کا ناپ دینے کے لیے ہی میں تمھارے پاس آیا ہوں۔"

"اب پہلے کے دن گئے صاحب۔ پہلے چمار کا دھندہ ڈوبتا، پھر بھی چمڑا ملتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ملتا۔"

"کیوں نہیں ملتا ؟ جانور تو روز لاکھوں کی تعداد میں قصائی خانے جارہے ہیں۔"

"جاتے ہیں نا۔ مگر سارا مال فارین میں جاتا ہے۔ اب یہاں بس ربر کا استعمال رہ گیا ہے۔"

مطلب اب چمڑا نہیں ملتا، ہے نا !"

دیسے تو ملتا ہے، مگر مہنگا کتنا ہے ؟ اس لیے ربر کی چپلیں ہی ٹھیک رہتی ہیں۔ اب دیکھیے، آپ کے لیے اگر چمڑے کی چپلیں بنائیں تو چالیس روپے لگیں گے۔ اتنا روپیہ کون دے گا ؟ اس کے مقابلے میں ربر کی چپلیں غریبوں کے لیے دس پندرہ روپے میں جاتی ہیں اور اچھی دکھائی دیتی ہیں۔"

"مگر وہ پائیدار نہیں ہوتیں۔ برسات میں اچانک ٹوٹ جاتی ہیں۔۔۔ مجھے چمڑے کی ہی چاہیے۔ کم از کم تین ساڑھے تین سال تک پیروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"آرزو ہوگی تو بناؤں گا، مگر مجھے تیس روپے پیشگی چاہیے۔ چمڑا لانے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ باقی پیسے چپل بنانے کے بعد دیجیے۔"

ناپ دے کر اٹھا۔ اس نے اپنی گردن بہت جھکالی۔۔۔ ریڈیو کی آواز کچھ اور بڑھادی۔

گھر آکر چپل کے لیے ٹکاما کو پیشگی تیس روپے کی بات بتائی۔

ماں فوراً بول اٹھی۔ نا بابا نا، اسے پہلے تیس روپے مت دینا۔ پانچ دس دن ہی تو رہنے والا ہے۔ وہ اگر آج دوں گا، کل دوں گا، کہتا رہے تو تو کیا کرے گا ؟ اس کے گھر میں اب زہر کھانے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔ تیرے تیس روپے سے دونوں میاں بیوی گھر بیٹھ کر کھائیں گے اور تان کر سو جائیں گے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ کولھاپور جاکر ربر کی چپل خرید لے۔

"ٹکاما ایسا نہیں کرسکتا۔"

"سارے چمار اب ایسا ہی کرتے ہیں۔ میری زندگی بیت گئی ہے یہاں ؟ مجھے ان کی عادتیں اچھی طرح معلوم ہیں۔" ماں کی

ت سے میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کافی دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا۔ ماں چلی گئی۔ میں اٹھا اور حکاما کو تیس روپے دے کر آگیا۔ تین دن
ں چپل تیار کرنے کا اس نے یقین دلایا۔ تیسرے دن میں اور بیوی قصبے کی طرف گھومنے گئے۔ لوٹتے وقت حکاما کے گھر میں جھانکا۔
پیر کا ناپ لے کر اس کا پڑ لگا دیتا ہوں۔" پٹے تیار تھے۔ سرے سے اس نے دونوں چپلوں میں اسے لگا دیا۔ عمر ہو گئی تھی۔
ر بھی ہاتھ اتنی ہی تیزی سے چل رہے تھے۔ "پیر میں ڈال کر دیکھیے۔"

میں نے چپل پیر میں ڈالی۔ اس نے پٹے کا اندازہ لیا اور پیر ہٹانے کے لیے کہا۔

"جائیے اب۔ اب کل صبح آئیے۔ میرا آنا بچ جائے گا اور کچھ کام ہوا تو کر دوں گا۔ چپل پہن کر ہی آپ جائیے، میں اسٹینڈ
لا جاؤں گا۔" "ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں اور بیوی باہر آئے۔ اچھے یا خراب چمڑے کی پہچان تھوڑی بہت مجھے تھی۔ چپل کا تلا اس
نے اچھا بنایا تھا اوپر کا کام بھی دل کے لائق ہو گیا تھا۔

چپل اچھی بن گئی۔ مجھے پسند آئی۔" بیوی نے کہا۔

"بچوں کے لیے، تمہارے لیے ایک ایک جوڑی بنانے کے لیے کہوں؟ ایک بار بنوائی کہ تین سال کی فرصت۔"

مجھے نہیں چاہیے اور نہ بچوں کے لیے! مجھے ایسی چپلیں اچھی نہیں لگتیں اور بچے ایک ہی چپل تین سال پہنتے پہنتے اوب
ئیں گے۔ ہر دیوالی پر وہ نئی چپل مانگتے ہیں۔ ایسی چپلیں وہ نہیں پہنیں گے۔

بچوں کے بارے میں بات درست تھی۔ ان کے دل میں گاؤں کے بارے میں اور گاؤں کے لوگوں سے متعلق لگاؤ ہونے کا
ئی سبب ہی نہیں تھا۔ کاروباری دنیا کے اصولوں کو ماننے والے۔ شہر میں وہ پیدا ہوئے۔ پیدائش سے ہی ان کے آس پاس فیشن اور
رکی چپلیں تھیں۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کے لیے پیسے برباد کرنے کے لیے نفسیاتی طور سے تیار نہیں تھا۔ وقت بھی نہیں
ا۔ حکاما کو چھوٹی مدد بھی ہو جائے گی، اس سے میں بے چین تھا۔ مگر میں وہ کر نہیں پایا۔

گھر آنے کے بعد چپل بن جانے کی بات ماں سے کہی۔ وہ خوش ہوئی۔

"اچھا ہوا بابا، حکاما آج بھی اپنی زبان کا پابند ہے۔ صرف اس کی بیوی تھوڑی اچھی ہوتی تو ٹھیک رہتا۔"

"وہ کس وجہ سے اتنی بوڑھی ہو گئی ہے بے وقت؟"

"پہلے سے ہی اسے دمہ ہے۔ عمر کے اتار پر اور بڑھتا جا رہا ہے۔"

"دوا پانی، کیا کچھ ہوتا ہی نہیں شاید؟"

"جوانی میں دیکھا ہوگا بھرپور۔ دمے کی کیا کوئی دوائی ہے؟ زندگی بھر پان ہی تو کھاتی رہی۔"

"اچھا، پان اسی لیے کھاتی ہے؟"

"اور نہیں تو کیا؟ ایسے میں اکلوتا بیٹا بھی گیا۔ سبھی بیٹیوں کی شادیاں کی۔ جو کچھ کمایا تھا وہ ختم ہو گیا۔ کیسے ٹک پائیں گے
ب یہ لوگ؟"

ماں اپنی پچھلی ساری باتیں بھول کر اچانک جذباتی ہو کر بول اٹھی، "سچ ہے۔"

صبح اٹھ کر میں حکاما کے پاس گیا۔ مجھ سے بھی پہلے وہ اپنے کام میں لگ گیا تھا۔

"آئیے! بس ہو گیا دیکھیے۔ پانچ منٹ بیٹھیے۔" پاروموسی ہاتھ منہ دھو کر دروازے سے لگ کر بیٹھی تھی۔ پر صبح کے مقابلے

میں آج طبیعت کچھ ٹھیک تھی۔ میں بنچ پر بیٹھ گیا۔

ٹکاما بڑی باریکی سے چپل کی کانٹ چھانٹ کر رہا تھا۔ گھوم کر چمڑا چکنا کر رہا تھا۔ پاس میں پڑے ہوئے ریڈیو نے میرا بانی کا دھیمی آواز سے بھجن شروع کر دیا تھا۔ ٹکاما کو ریڈیو کی عادت پڑ گئی تھی۔ سیل ڈال کر وہ اسے ہمیشہ گاتا ہوا اور زندہ رکھتا ہے۔ بیٹے کی یادوں کا ساتھ ضروری لگتا ہو گا۔ پورے گھر کا خالی پن اس آواز سے بھر اٹھتا ہے۔

دروازے کے پاس ہی پرانے جوتوں، چپلوں اور ٹائر کے ٹکڑوں کا بورا پھٹا منہ لیے پڑا تھا۔ پاس ہی موٹر بیاٹری کا خالی کالا ڈبہ۔ اس کی جانب دیکھ کر میں نے پوچھا "اس کی کیا ضرورت ہوتی ہے ؟"

"پانی کے لیے بھائی۔ گاؤں باہر گیریج میں پڑا تھا۔ جوتے بھگونے کے لیے پانی رکھنا چاہیے۔ یہ سوچ کر مانگ لیا۔ کیا کریں ؟"

اور جوتے چپلوں کا یہ بورا روز گھر لانا پڑتا ہو گا ؟ وہیں پڑا رہے تو اسے کون لے جائے گا ؟"

بہت چور ہیں۔ گاؤں کے سارے چمار اب یہی دھندہ کرنے لگے ہیں۔ یہ ٹائر کا ٹکڑا پہلے مفت میں ملتا تھا۔ اب اس کے لیے بھی پیسے دینے پڑتے ہیں۔ غریب لوگوں کے جوتوں کے لیے اب اسی کا سہارا ہے مالک۔" نیچے دیکھتے ہوئے وہ بول رہا تھا۔

میں ان ٹوٹے پھوٹے جوتوں اور بیاٹری کے ڈبے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ آزاد بھارت کے دیے ہوئے دو قیمتی انعامات وہ لگ رہے تھے۔ اس کے پیٹ کو سہارا دینے والے ستون۔

ایک کڑوی ہنسی میرے ہونٹوں پر رینگ گئی۔ ٹکاما کو وہ عجیب لگی۔ اسے ایسا نہ لگے اس لیے میں نے مذاقاً کہا "اچھا، تو اندرا گاندھی کی یہ تصویریں پورے دروازے پر آڑے ترچھے کیوں لگا دیے ہیں ؟ میرے دل میں ان تصویروں کے بارے میں تجسس تھا۔

"اندر سرد ہوائیں گھس آتی ہیں اس لیے سردیوں میں لگا دیا ہے۔ یہ دروازہ اب ہم نہیں کھولتے۔ کھلی ہوا سے ایسی ہوا بہت خراب ہوتی ہے۔ ارے صاحب، چناؤ کا ہمارے لیے بس اتنا ہی استعمال ہے۔"

اس نے چپل پوری طرح تیار کر لی۔ "اب پہنیے تو۔ دیکھیں۔"

میں نے پہنی۔ ایک دم ٹھیک تھی۔ ان سے پیر اچھے لگے۔

"یہ بچے ہوئے دس روپے اور پارو موسی، یہ تمہارے پان کے لیے دو روپے۔"

"بڑا احسان ہوا، بابا !"

"تھیلی میں کلو بھر جوار ہے۔ ماں نے تمہارے لیے دی ہے۔"

"ہے بھگوان ! پچیس سالوں بعد میرے گھر یہ تحفہ آیا ہے۔" پارو موسی کا چہرہ کھلکھلا اٹھا۔

"تحفہ کہاں سے آئے گا ؟ ہماری کھیتی بھی چک بندی میں آنے کے بعد مالک نے کب سے بیچ دی۔ یہ جوار بھی خریدی ہوئی ہے۔"

"بھلے ہی خریدی ہوئی ہو۔ مالکن کا دل بہت بڑا ہے چہرہ ٹا ہی ہے یہ۔" موسی بولی۔

اب پیروں میں ڈال کر ہی جائیں۔ پچیس سال بعد آپ پہچان بتا کر میرے پاس آئے اس لیے دل سے یہ جوڑی میں نے بنائی۔"

"بہر حال اب میں تمہارے ہاتھوں سے ہی چپل بنواؤں گا۔ دنیا بھلے ہی کہیں بھی نکل جائے۔"

"یہ چپل تین سال تک خراب نہیں ہوگی مالک۔"

(باقی ص: ۹۴ پر)

نقد و نظر

[تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں روانہ کی جائیں۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے]

کتاب کا نام: مدح و قدحِ دکن ☆ مرتبین: عمر خالدی، معین الدین عقیل ☆ تبصرہ نگار: علی ظہیر

"مدح و قدح دکن" کے مرتبین جناب عمر خالدی اور جناب معین الدین عقیل دونوں کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے۔ عمر خالدی صاحب نے اسکول کی تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم امریکہ میں جب کہ عقیل صاحب نے پی ایچ۔ ڈی کی سطح تک شروع سے آخر تک کراچی میں تعلیم حاصل کی۔ دونوں حضرات نے ابھی تک دکن کی تاریخ، ثقافت اور سیاسی، سماجی حالات پر خاصا کام کیا ہے اور ان حضرات کی مختلف عنوانات پر کئی کتابیں بھی انگریزی، اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔

مدح و قدح دکنی بیت مختصر سی کتاب ہے جس میں دکن سے متعلق اچھی بری لیکن مزے دار باتوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن زیادہ تر اچھی باتیں ہی جمع کی گئی ہیں۔ کتاب چار حصوں میں مشتمل ہے۔ پہلا حصہ "شعر فارسی میں" دکن کا ذکر ہے دوسرا حصہ "سلاطین و مابعد" تیسرا "عہدِ آصفیہ" اور چوتھا "عہد عثمانیہ" کے عنوانات پر ہے۔ ان کے علاوہ پانچواں حصہ بہ عنوان "ضمیمے" بھی ہے جس میں اہلِ حال و اہلِ قال سے متعلق اور چند دیگر حکایتوں پر مشتمل دل چسپ معلومات ہیں۔

"شعر فارسی میں" حافظ، جامی، بیدل سے ہوتے ہوئے محمد حبیب اللہ ذکا شاگرد غالب (۱۸۲۳ء تا ۱۸۷۵ء) تک کے زمانے کے شعرا کے چیدہ چیدہ دکن سے متعلق اشعار مندرج ہیں۔ حصہ دوم عہدِ سلاطین و مابعد میں مرتبین نے دکن سے متعلق پرانی اور جدید اردو میں بعض شعرا کے اشعار منتخب کیے ہیں۔ اس میں پرانے سے جدید کی طرف آنے کے بعد بجائے جدید سے قدیم کی طرف سفر کیا ہے۔ ویسے انتخاب میں کوئی تاریخ وار پیش کش کی کوشش نہیں کی گئی ہے صرف دکن کے ذکر کو ہی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس حصے میں شروعات وحیدہ نسیم سے کی گئی ہے اور بعد میں عبدالرحمن قادری، حسن شوقی، نصرتی، غواصی، لچھمی نرائن شفیق، وغیرہ کے اشعار دیے گئے ہیں۔

تیسرے باب میں عہد عثمانی یعنی حیدرآباد اسٹیٹ کے نظامِ ہفتم میر عثمان علی خاں کے زمانے کے چیدہ چیدہ دل چسپ واقعات اور اشعار ہیں جن کا تعلق دکن سے ہے لگتا ہے۔ یہ حصہ سب سے زیادہ توجہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس سے مرتبین کا حیدرآباد اسٹیٹ سے لگاؤ اور تعلق خاطر بھی ظاہر ہوتا ہے۔

آخری حصہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اہلِ حال و اہلِ قال کے واقعات پر مشتمل ہے۔ دکن میں صوفیائے کرام اور اللہ والوں کا جمع ہونا دورِ بہمنی سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اس ضمیمے کے بعد بھی "چند حکایتیں" درج کی گئی ہیں جو "عہدِ عثمانی" والے حصے کا ہی سلسلہ ہے۔ شاید یہ پچھلے وقت مرتب ہوئیں اسی لیے بجائے اس کو عہد عثمانی میں رکھنے کے ایک ضمیمے کے طور پر شامل کرلیا گیا۔ مجموعی حیثیت سے دکن کی حکایتوں سے متعلق ایک مختصر کتاب کے طور پر "مدح و قدحِ دکن" یقیناً ایک دل چسپ کتاب

ہے اور سستی بھی ہے۔ دکن سے متعلق معلومات حاصل کرنے والوں کے لیے یہ بہت کام کی کتاب ہے۔

● صفحات : ۱۲۰ ● قیمت : ۲۲ روپے ● ناشر : مجلسِ تاریخِ دکن ، امریکہ

● کتاب ملنے کے پتے : مکتبہ شاہد ۱/۹ علی گڑھ کالونی ، کراچی - 75800 پاکستان

56 - Duff Street. Water Town, Ma 02172 - 3016 (USA). Phone:(617) 924 - 0809. ●

● 16-5-64 / 5-2, First Lancer, Hyderabad - 500028, (A.P.) INDIA.

کتاب کا نام : دکن کا عہدِ اسلامی ☆ مرتبین : عمر خالدی ، معین الدین عقیل ☆ تبصرہ نگار : علی ظہیر

"دکن کا عہدِ اسلامی" ۱۳۰۰ تا ۱۹۵۰ء کے زمانے پر محیط ایک منتخب کتابیات ہے۔ اس میں چھے باب ہیں پہلا باب اسناد و مآخذ کے عنوان سے ہے جس میں کتب خانے ، سرکاری محکمے جہاں سے دکن کی تاریخ سے متعلق مواد مل سکتا ہے اور کتب کے حوالے ہیں جن میں دکن کا ذکر ہے۔ دوسرا باب تاریخِ دکن کے عنوان سے ہے ، تیسرا مذہب اور معاشرت ، چوتھا سوانحی مآخذ ، پانچواں دکنی ادب اور چھٹا متفرقات جس میں علمی و ادبی ادارے ، سیاسی جماعتیں ، صحافت اور سفر ناموں کے حوالے ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی دکن پر کام کرنے والوں کے لیے یہ نہایت مفید کتابیات ہیں اس میں بعض کتابوں کا ذکر ضروری تھا جو کسی وجہ سے مرتبین کی نظر سے چوک گئے مثلاً میر باقر ضیا کی مثنوی "ضیاءِ دکن" وغیرہ۔ امید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں ایسی کتابوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔ ● صفحات : ۱۵۵ ● قیمت : ۵۰ روپے ● ناشر : مجلسِ تاریخِ دکن ، امریکہ

● کتاب ملنے کے پتے : مکتبہ شاہد ۱/۹ علی گڑھ کالونی ، کراچی - 75800 پاکستان

56 - Duff Street. Water Town. Ma 02172 - 3016 (USA). ●

○●○

(سلسلہ ص: ۸۰ سے)

"بھلے ہی تین سال لگ جائیں۔ ٹوٹنے پر میں ضرور آؤں گا۔"

"کیا فائدہ؟" وہ آہستگی سے بولا۔ پھر ہنسا۔

"کیوں؟"

"پیڑ کی ساری جڑیں اب اکھڑنے لگی ہیں۔ تین سال بعد آپ کے یہاں آنے پر کوئی دکھائی دے گا یا نہیں ، کون جانے!"

"نہیں ، نہیں ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تکاا! تمہاری طبیعت ابھی اچھی ہے۔" میں اس کی بات سے چونک گیا۔ ٹھیک بھی لگتی ہو ، پر اب امید کچھ نہیں بچا۔ اب صرف دن شمار کرنے میں آپ کی ماں نے جیسے ٹوٹے جوتے لادیے ، ایسے سات آٹھ روز آتے رہیں بس ۔۔۔ دنیا کے بڑے احسان ہوں گے ہم پر۔

میں نے کچھ کہا ، مگر اس میں دم نہیں تھا۔ چپ چاپ نئی چپل پہن کر لوٹ آیا۔ اس جاڑے کی یہ آخری جوڑی چپل ہوگی!!

○●○

سب رس کتاب گھر کی کتابیں

ایوانِ اردو ، پنجہ گٹہ ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
شاعری		
مٹی مٹی میرا دل	مغنی تبسم	50=00
اگلے موسم کا انتظار	اسلم عمادی	16=00
قریہ فکر	اسلم عمادی	60=00
تنہائی	صدیقہ شبنم	55=00
خاکِ انا	راشد آزر	10=00
آب دیدہ	راشد آزر	15=00
منزلِ شوق	راشد آزر	25=00
جمع و خرچِ وفا	راشد آزر	16=00
اندوختہ	راشد آزر	150=00
کفِ گل فروش	سعید شہیدی	50=00
خود رو	بشارت علی بشارت	80=00
صباحتِ زہرہ	صبیحہ نسرین	70=00
دھواں دھواں چراغِ جاں	علی الدین نوید	60=00
رقصِ تنہائی	علی اصغر	50=00
گماں کا صحرا	مصحف اقبال توصیفی	80=00
شام ڈھلے سویرا	مصطفیٰ شہاب	65=00
کسے سنائیں	حمید رونق	60=00
سرہانے کا چراغ	عزیز تمنائی	50=00
ید بیضا	برق موسوی	100=00
آنگن آنگن دکھ کے پیڑ	سلیمان اطہر جاوید	50=00
نقوشِ حیات	ریاست علی تاج	80=00
کلیاتِ مسعود	مسعود صدیقی	25=00
شیرازۂ افکار	حکیم طوسی	75=00
رنگ و آہنگ	سعید بن محمد نقش	15=00
موجوں کا مکاں	وقار لطیف	30=00
شہ زور کشمیری	فرید پربتی	125=00
آبگینۂ شعر	بشیر النساء بشیر	60=00
نا تمام	حسن داد خان	60=00
کمالِ سخن	الحاج کمال حیدرآبادی	20=00
ذکر و فکر	ساجدہ خاتون	200=00
اظہار آرزو	عبدالرحیم آرزو	20=00
بادۂ گل	شیخ حسین سالک	40=00
متاعِ حیات	-	20=00
غزال	خورشید حسین مضطر	60=00
دکنی کی تین مثنویاں	ڈاکٹر محمد علی اثر	15=00
افسانے		
تیسرا مجسمہ	عوض سعید	15=00
بے نام موسموں کا نوحہ	عوض سعید	30=00
میں کتھا سناتا ہوں	عاتق شاہ	35=00
سونے چاندی کے بت	خواجہ احمد عباس	35=00
ادھورا سفر	قدیر زماں	60=00
آٹھواں سفر	غلام جیلانی	50=00
حنظل	بیگ احساس	60=00
جینے والے	عابد سہیل	80=00
حیات کا رقص	ندیم عباس	70=00

o0o

ناول

بڑا آدمی	محسن علی	200=00
کسی دن	اقبال مجید	80=00
نمک	اقبال مجید	100=00
حیات کا رقص	وسیم عباس	70=00

ڈرامے

ماورا	قدیر زماں	100=00

خاکے

سوگند مٹی کے بت ۔	اقبال متین	97=00
رہ و رسم آشنائی	عبدالقادر حبیب حیدرآبادی	30=00

تحقیق و تنقید

لفظوں سے آگے	پروفیسر مغنی تبسم	60=00
تحقیقی نقوش	ڈاکٹر محمد علی اثر	75=00
پسِ پردہ	آغا حیدر حسن دہلوی	25=00
تحقیق و تجزیہ	وہاب عندلیب	50=00
مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے	ڈاکٹر شاذ تمکنت	50=00
مبادیاتِ تحقیق	ڈاکٹر جاوید حیات	60=00
نوادراتِ تحقیق	ڈاکٹر محمد علی اثر	100=00
صاحب زادہ میکش	سید جلیل الدین	40=00
وصیت النور	صبیحہ نسرین	40:00
حیدرآباد کے علمی اور ادبی رسالے	ڈاکٹر محمد انورالدین	250=00
شیخ چاند حیات اور ادبی خدمات	ڈاکٹر سحر سعیدی	200=00
جدید اردو افسانے میں عصری حسیت	یاسمین فاطمہ	25=00
فنِ تاریخ گوئی	ڈاکٹر مسعود سراج	30=00
دبستانِ گولکنڈہ	ڈاکٹر عبدالستار ساحر	120=00

تراجم

مخدوم محی الدین	اسامہ فاروقی	100=00
پیامِ مشرق	سید احمد ایثار	220=00

تاریخ

تاریخ یورپ عہدِ جدید	سید علی محسن	150=00

سیاسیات

برطانیہ کی سیاسی جماعتیں اور پارلیمنٹ	حبیب حیدرآبادی	75=00

تذکرہ اور آپ بیتی

یادوں کی رہ گذر	کے۔ ایس۔ شفیق	125=00
فضائلِ سید المرسلین	سید علی حسینی	25=00
ولا اکیڈمی	ادارہ اوپا	10=00
بہار میں اردو ظرافت	سلطان آزاد	50=00
حیدرآباد کے بنسی راجہ	بھاسکر راج سکسینہ	100=00

سائنس

سائنس کے نئے افق	وہاب قیصر	80=00

مجلہ

شعر و حکمت	پروفیسر مغنی تبسم	100=00

○●○

کتابیں ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲

○●○

یادگار سید محی الدین قادری زور

سن اجراء: ۱۹۳۸ء فون: 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۶۱ نومبر، ڈسمبر ۱۹۹۹ء شمارہ: ۱۱ ، ۱۲

فی پرچہ	:	۱۶ روپے	مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
زرِ سالانہ	:	۱۷۵ روپے	پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۷ ڈالر
کتب خانوں سے	:	۲۰۰ روپے	انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر: ادارہ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲ (اے۔پی) انڈیا۔

کمپیوٹر کتابت: شعبۂ کمپیوٹرس، ادارۂ ادبیاتِ اردو

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر و پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے بی او۔ ایس۔ گرافکس، نارائن گوڑہ میں طبع کرواکے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

○●○

پہلی بات

۸ نومبر ۱۹۹۹ء کو یہ الم ناک اطلاع ملی کہ بانیِ ادارہ سید محی الدین قادری زور کی دختر محترمہ تہذیب النسا بیگم زور کراچی میں وفات پاگئیں۔ ان کی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی تھی۔ جامعہ عثمانیہ سے عربی زبان و ادب سے ایم۔ اے کیا اور ساری یونیورسٹی میں اول آئیں بعدازاں کلیہ اناث (جامعہ عثمانیہ) میں عربی کی لکچرر کی حیثیت سے خدمت انجام دیتی رہیں۔ ان کی شادی یحییٰ علی احمد فاروقی سے ہوئی۔ شادی کے بعد وہ پاکستان چلی گئیں۔ کراچی میں بھی درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہیں۔ اسی سال وظیفے پر سبک دوش ہونے کے بعد فریضہ حج ادا کیا۔ کراچی لوٹنے کے بعد کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوگئیں۔ کسی علاج سے افاقہ نہیں ہوا آخر داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ انا للله و انا الیه راجعون۔

مرحومہ اردو کی اچھی شاعرہ تھیں۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ان کا کلام نشر ہوتا تھا۔ مختلف کل ہند مشاعروں میں اپنا کلام سناکر سامعین سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اپنی لیاقت اور اردو سے گہرے لگاؤ کی بنا پر وہ ڈاکٹر زور کی جانشین بن سکتی تھیں۔ مرحومہ نیکی و شرافت کا مجسمہ تھیں۔ سنجیدگی، متانت، صبر و تحمل اور عزم و ہمت عجز و انکسار جیسی اعلیٰ صفات کی حامل تھی۔ ادارہ اس عظیم سانحے پر ڈاکٹر زور کے ارکانِ خاندان کا شریکِ غم ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں۔

○●○

گذشتہ ماہ نجم الثاقب شحنہ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ وہ شاذ تمکنت اور وحید اختر کے ساتھی تھے۔ جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کرنے کے بعد انھوں نے ایک سہ ماہی رسالہ "گجر" شائع کیا تھا جس کی مجلسِ ادارت میں سری نواس لاہوٹی، وحید اختر اور شاذ تمکنت شامل تھے۔ یہ رسالہ آب و تاب سے نکلا لیکن زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا۔ یہ اتنا معیاری جریدہ تھا کہ اہلِ اردو نے آج تک اسے نہیں بھلایا۔ گجر کے بند ہونے کے بعد وہ اپنے وطن یادگیر چلے گئے اور کسی کاروبار میں مصروف ہوگئے۔ انھیں کرناٹک اردو اکیڈمی کا رکن نامزد کیا گیا اردو کنڑ، کنڑ اردو ڈکشنریوں کی تدوین کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ انھوں نے بڑی لگن اور محنت سے یہ ڈکشنریاں مرتب کیں جو شائع ہوچکی ہیں۔ شحنہ صاحب کو اردو زبان اور اس کے محاورے پر بڑا عبور حاصل تھا ان کا اردو اور انگریزی ادب کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ اردو رسائل کی ترویج و اشاعت میں وہ عملی دل چسپی لیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں۔

○●○

"سب رس" کے اس شمارے میں ہم اپنے اعلان کے مطابق گوشہ ڈاکٹر زور میں ڈاکٹر زور کا ایک مقالہ اور ان کے موسومہ خطوط شائع کررہے ہیں۔ یہ خطوط ڈاکٹر زور کے رفیق کار مولوی سید محمد صاحب کے مرقومہ ہیں۔ انھوں نے یہ خطوط اس زمانے میں تحریر کیے جب ڈاکٹر زور یورپ میں زیر تعلیم تھے۔ ان خطوط کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر زور اور ان کے ساتھیوں میں طالب علمی کے زمانے ہی سے تحقیق و تنقید سے دل چسپی پیدا ہوچلی تھی اور وہ نہایت لگن کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں جٹ گئے تھے۔ مکتبہ ابراہیمیہ کو انھوں نے اپنی علمی ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا تھا۔ انھوں نے مکتبے کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کے دلوں میں یہ احساس جاگزیں ہوچکا تھا کہ علمی و ادب کے میدان میں انھیں اپنی جداگانہ شناخت بنانی ہے۔

○●○

پیشِ نظر شمارے میں ایک گوشہ ملک کے ممتاز مزاح نگار ادیب مجتبیٰ حسین کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کا شمار ہند و پاک کے بلند پایہ مزاح نگار ادیبوں میں ہوتا ہے۔ چند سال پہلے ماہنامہ شگوفہ کا مجتبیٰ حسین نمبر شائع ہوا تھا۔ اس گوشے میں شامل مضامین میں ان کی شخصیت اور فن کے چند نئے پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔

○●○

ناگزیر وجوہات سے نومبر ۱۹۹۹ء کا شمارہ بروقت شائع نہ ہوسکا۔ اس لیے نومبر اور دسمبر کا مشترکہ شمارہ شائع کیا جارہا ہے۔ پرچے کی ضخامت میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ اگلا شمارہ جنوری ۲۰۰۰ء میں شائع ہوگا۔ نئے ہزار سالہ عہد کے استقبال کے لیے اس شمارے سے ہم بیسویں صدی میں جنوبی ہند کی تہذیب و ثقافت ادب اور فنونِ لطیفہ کے بارے میں مضامین کا سلسلہ شروع کریں گے۔ اس کے لیے ہم اہلِ قلم اصحاب سے تعاون کی درخواست کرتے ہیں۔

(ادارہ)

سید محی الدین قادری زور

دلی میں اردو شاعری کا آغاز

شمالی ہند اور خاص کر دوآبہ گنگ و جمن ہمیشہ تہذیب و تمدن اور علم و فن کا سرِ چشمہ رہا ہے اردو کے لیے صدیوں تک بنجر ثابت ہوتا رہا۔ اس کے اسباب نہایت دل چسپ اور اہم ہیں۔ ہم نے اپنی مطبوعہ انگریزی کتاب "ہندستانی صوتیات" میں اس پر کچھ بحث کی ہے مگر دلی میں اردو شاعری کے آغاز پر گفتگو کرتے وقت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب و علل کا ذرا وضاحت کے ساتھ ذکر کردیا جائے جنھوں نے شمالی ہند اور خاص کر دلی کو اردو شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف سے عرصہ دراز تک محروم رکھا۔

اردو زبان کے آغاز کی نسبت یہ نظریہ اب روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتا جاتا ہے کہ شمال مغربی سرحد سے جو مسلمان ہندستان میں داخل ہوئے وہ پہلے پہل پنجاب میں آکر ٹھہرے۔ وہاں کے باشندوں کے میل جول سے جو نئی مشترک ہندو مسلم زبان پیدا ہوتی رہی اسی کو لے کر وہ دوآبہ میں اترے اور اسی کو بولتے ہوئے گجرات اور دکن میں بھی داخل ہوئے۔

فتح دلی سے قبل مسلمان پنجاب میں قریب دو سو سال تک رہے اور یہ عرصہ ایک نئی زبان کے آغاز کے لیے ناکافی نہیں ہے۔ وہاں جو زبان تیار ہوئی تھی اس میں لاہور کے ایک درباری فارسی شاعر مسعود سعد سلمان نے طبع آزمائی بھی کی تھی مگر افسوس ہے کہ اس کا کلام آج ناپید ہے اور اس کے متعلق سوائے عرفی اور خسرو کے بیانات کے کوئی اور معلومات حاصل نہیں۔ اگر قدیم دکنی اور گجراتی کتابوں کی طرح مسعود کا یہ دیوان ہندوی بھی آج دست یاب ہوجائے تو اردو کی آغازی تشکیل کی نسبت بہت کم گتھیاں باقی رہ جائیں۔

جب مسلمانوں نے سنہ ۱۱۹۲ء میں دلی کی چوہان سلطنت فتح کرلی تو وہ اسی زبان کو لے کر راجدھانی میں داخل ہوئے اور دلی اور اس کے مشرقی علاقہ یعنی سرزمینِ برج میں آباد ہوئے جو پنجاب میں بن رہی تھی اور ابھی خام حالت میں تھی۔ فاتحین کے ساتھ ہریانی یا بانگڑو (مشرقی پنجاب) علاقہ کے سینکڑوں باشندے بھی غالباً ملازمین اور بہیر و بنگاہ کی حیثیت سے چلے آئے۔ جس کی بنا پر آج اردو زبان میں مشرقی پنجابی یا ہریانوی عنصر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

برج کے علاقے میں اس عہد میں جو زبان بولی جاتی تھی اسے برج بھاشا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی زبان میں امیر خسرو نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا جو مسعود کے ہندوی دیوان کی طرح آج ناپید ہے۔ مگر خسرو کا کچھ ہندوی کلام سینہ بہ سینہ محفوظ چلا آیا جس میں اگرچہ بعد کے زمانوں میں لفظی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکے گا کہ وہ خسرو ہی کی یادگار ہے۔

سرزمینِ برج میں مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان ابھی پختہ نہیں ہونے پائی تھی اور اس پر برج کا زیادہ اثر نہیں پڑسکا تھا کہ مسلمانوں نے جنوب کا رخ کیا اور ان کا ایک بڑا سیلاب محمد تغلق کے ساتھ دلی سے اٹھا اور دکن میں جاکر رک گیا۔ یہ فاتحین اپنے ساتھ جو زبان دکن میں لیتے گئے وہ وہاں آزاد نشو و نما حاصل کرنے لگی اور چوں کہ برج بھاشا کی سرحد سے دور جا پڑی تھی اسی لیے اس میں برج کا صرف وہی اثر باقی رہا جو سرزمینِ برج سے نکلنے سے پہلے اس پر مستولی ہوچکا تھا۔

جو مسلمان دوآبہ ہی میں رہ گئے ان کی وہ خام ہندوی جو مشرقی پنجابی اور ہند ایرانی عناصر سے مرکب تھی رفتہ رفتہ برج سے متاثر ہوتی گئی اور آخر کار اس رنگ میں اتنی رنگی گئی کہ دو تین صدیوں ہی میں بول چال کے لیے برج بھاشا کی جانشین بن گئی اور برج کو ایک تحریری اور ادبی شان حاصل ہو گئی۔

اس سلسلے میں اس واقعہ کا اظہار دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دوآبہ میں زبانوں کا ارتقا عجیب و غریب مگر باضابطہ رہا ہے۔ ابتدا میں ویدی زبان آریاؤں کی عام بول چال کی زبان تھی چناں چہ اسی میں مذہبی مقدس کتابیں مرتب ہوئیں مگر ایک عرصے کے بعد یہ زبان عام طور پر مستعمل نہیں ہوئی۔ اس وقت سنسکرت رائج ہو گئی۔ سنسکرت میں بھی مذہبی اور ادبی تصنیفات مرتب ہوئیں چناں چہ دو تین سو سال کے بعد وہ بھی عام گفتگو کی زبان باقی نہ رہی۔ کیوں کہ عوام ہمیشہ اپنی زبان میں اپنی ضرورتوں اور نئے نئے حالات کے ماتحت صوتی اور معنوی تغیر کرتے رہتے ہیں۔ چناں چہ اس وقت عوام کی زبان کو پراکرت کہا گیا اور سنسکرت جو اب ادبی یا علمی زبان تھی محض برہمنوں اور عالموں تک محدود رہی۔

پراکرتیں بھی چار پانچ سو سال تک رائج رہیں اور ان میں بھی گیت اور نظمیں لکھی گئیں مگر جب مرورِ ایام کے ساتھ ان میں تبدیلیاں ہونے لگیں تو اسی تغیر یافتہ عام گفت و شنید کی زبان کو بھاشا کہا گیا چناں چہ علاقہ۔ برج میں جو بھاشا بولی جاتی تھی وہ برج بھاشا کہلائی۔

برج بھاشا پہلے یعنی مسلمانوں کے اوائل عہد میں عام بول چال کی زبان تھی مگر مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے سو ڈیڑھ سو سال کے بعد ان کی لائی ہوئی زبان کے ساتھ مل جل کر وہ بھی متاثر ہونے لگی اور آخر کار دہلی اور سرزمینِ برج کے باشندوں میں خواہ وہ مسلمان ہوں کہ ہندو جو زبان عام طور پر بول چال اور کاروبار کے لیے مستعمل ہو گئی وہ یہی ہندستانی ہے جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں۔ مگر اورنگ زیب سے پہلے تک ہندستانی خاص کی تحریری اور علمی اگر کوئی زبان تھی تو وہ برج بھاشا ہی تھی ___ "ہندستانی" عوام کی بازاری زبان تھی اور اس میں لکھنا پڑھنا معیوب تھا۔ چناں چہ اس زمانہ میں ہندستانی خاص میں اگر کسی مسلمان نے ہندوی زبان میں لکھنا بھی چاہا تو اس نے برج ہی میں لکھا جو اس عہد کے ہندوؤں کی علمی و ادبی زبان تھی۔

اس کے مقابلے میں دکن کی حالت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہاں برج بھاشا کی طرح کوئی دیسی زبان ایسی نہ تھی جو وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ علمی یا ادبی زبان قرار دی جاسکتی۔ دکن میں یا تو ڈراویڈی زبانیں تھیں یا مرہٹی اور یہ زبانیں اسی ہندستانی زبان کو کوئی اصولی یا اہم فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھیں جو مسلمانوں کے ساتھ دکن میں گئی اور آزاد نشوونما حاصل کر رہی تھی۔ اسی کے علاوہ یہ دیسی زبانیں برج بھاشا کی طرح دکن کے ہندوؤں کی اعلیٰ ادبی اور علمی زبانیں بھی نہیں تھیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکن کے مسلمان یا تو فارسی میں لکھتے یا اپنی اسی ہندستانی میں جو ان کے ہم راہ آئی تھی اور ان کی حکومت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جارہی تھی۔

دہلی میں اردو شاعری کے مقابلتہً دیر میں شروع ہونے کی یہ سب سے بڑی وجہ تھی۔ مگر اس کے سوا دو چار سیاسی اسباب بھی ہیں جنھوں نے ایک طرف تو دکن میں ہندستانی کو تصنیف و تالیف کے لیے مقبول بنادیا اور دوسری طرف ہندستان خاص کو اس نعمت سے بری طرح محروم کردیا۔

دکن کی سلطنتوں کے بانی، شمالی حکم ران سلسلوں کے بانیوں کی طرح نووارد ترکی یا افغانی نہیں تھے۔ دہلی میں قطب الدین

بیک سے بہادر شاہ ظفر تک جتنے شاہی خاندان گزرے سب یکے بعد دیگرے ان شمالی مغربی حملہ آوروں میں سے تھے جن کی زبانیں ہندستان کے لیے اجنبی تھیں۔ دکنی سلطنتوں کے بانی دہی تھے جو دکن یا ہندستان میں ایک مدت سے مقیم تھے ہندستانی زبان و طرزِ معاشرت سے مانوس تھے۔ دکن کی پہلی سلطنت بہمنیہ کے بانی حسن کی نسبت تو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ایک برہمن کا غلام تھا۔ اس کا ہندستانی نہ جانتا اسی طرح تعجب خیز ہے جس طرح تیمور کا ہندستانی سے واقف ہونا۔

بہمنیہ کے زوال کے بعد جب دکن میں جدا جدا حکومتیں قائم ہوئیں تو ان کے بانی بھی اکثر وہی تھے جو بہمنیہ دربار میں بچپن سے پرورش پاچکے تھے اور جن کا ہندستانی سے ناواقف رہنا محال تھا۔ سلطنت احمد نگر کا بانی تو خود ایک نومسلم تھا۔ قدیم فارسی تاریخیں شاہد ہیں کہ وہ کنڑی اور ہندوی (یعنی اس عہد کی اردو) کا اچھا ماہر تھا۔ عادل شاہی خاندان کی پہلی ملکہ ایک طاقت ور مرہٹہ امیر مکٹ راؤ کی لڑکی تھی۔ اس کے بطن سے یوسف عادل شاہ کے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکا اسمٰعیل عادل شاہ تھا جو باپ کے بعد بادشاہ ہوا اور جس کی اولاد نے آخر تک بیجاپور پر بادشاہت کی۔ تینوں لڑکیوں میں سے ہر ایک کسی نہ کسی دکنی بادشاہ سے بیاہی گئی مثلاً مریم سلطان، برہان نظام شاہ والیِ احمد نگر سے، خدیجہ سلطان، علاؤالدین عماد شاہ والی برار سے، اور بی بی ستی سلطان، محمود شاہ بہمنی کے لڑکے سے بیاہی گئی۔

مکٹ راؤ کی لڑکی پوجی خانم کے علاوہ عادل شاہی خاندان میں اور بھی ہندو رانیاں جنوبی ہندو ریاستوں سے حاصل کی گئی تھیں۔ ان میں رنبھا رانی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس نے محمد عادل شاہ جیسے جلیل القدر حکم ران کا دل موہ لیا تھا اور جس کی خاطر بادشاہ نے اپنے مشہور و معروف آثار محل میں جو نقش و نگار تیار کرائے تھے۔ وہ آج تک بیجاپوری ذوق فنونِ لطیفہ کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔

حکم ران سلسلوں کے بانیوں کے علاوہ شمال کے بالعموم تمام بادشاہوں کی زبان فارسی یا کوئی اور بیرونی زبان تھی۔ محمد تغلق سے محمد شاہ تک دہلی کے کسی بادشاہ نے ہندستانی میں نہ نثر لکھی نہ نظم۔ اس کے خلاف دکن میں کئی بادشاہ مثلاً قطب شاہیوں میں قلی، محمد عبداللہ اور ابوالحسن اور عادل شاہیوں میں ابراہیم ثانی، علی ثانی اور سکندر ایسے گذرے ہیں جن کی ہندستانی نظم و نثر اس وقت بھی موجود ہے۔

بادشاہوں کی بے توجہی کے علاوہ شمالی سلطنت کے امرا اور علما و فضلا بھی ہندستانی زبان کے ذوق سے عاری تھے۔ ان پر ہمیشہ فارسی اثر غالب رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب کبھی ترکستان، ایران، یا افغانستان میں کوئی سیاسی انقلاب ہوتا یا تباہی آتی تو وہاں کے باشندے پناہ لینے کے لیے یا تلاشِ معاش کی خاطر ہندستان ہی کا رخ کرتے۔ چناں چہ آئے دن ان کی ٹکڑیاں ہندستان میں داخل ہوتی رہتی تھیں اور چوں کہ دہلی کے امیروں اور قدردانوں کے دسترخوانوں کی وسعت میں اس وقت تک کوئی کمی نہیں ہوئی تھی اس لیے سب کے سب وہیں جم جاتے اور چوں کہ یہاں رہنے والے ان نوواردوں کے مقابلے میں بالخصوص جہاں تک زبان و محاورہ کا تعلق ہے اپنے تئیں کم درجہ سمجھتے تھے اس لیے یہ ان کا احساسِ پستی (Inferiority Complex) نوواردوں کو سرکار و دربار میں بڑے بڑے رتبے حاصل کرلینے کا موقع پیدا کردیتا۔

ان خانگی در آمدوں کے علاوہ شمال مغرب کی جانب سے اکثر حملے بھی ہوا کرتے تھے جن کا سلسلہ احمد شاہ درانی کے پانچوں حملے (۱۱۸۵ھ) تک برابر جاری رہا۔ یہ تمام حملہ آور غیر زبانیں بولتے تھے۔

سیاسی مداخلتوں کے سوا علمی و ادبی فضا میں ابھی ہر وقت ایرانی اثر غالب رہتا تھا۔ شاہی درباروں سے محمد شاہ کے زمانہ تک بالعموم ٹھیٹ ایرانی شاعر اور عالم گراں بہا صلے حاصل کرتے رہتے تھے۔ پردیسی شعرا کی قدر و منزلت میر و سودا کے زمانہ تک جاری تھی۔ فارسی گو امیروں اور عالموں کی اس آئے دن کی درآمد اور اقتدار و اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال میں فارسی دانی عام اور لازمی ہو گئی۔ اگر کبھی مہلت پاکر فارسیت کا پیدا کیا ہوا زخم مندمل بھی ہونے پاتا تو پھر فارسی زبان بولنے والوں کا ایک ایسا حملہ ہوتا کہ وہ زخم از سرِ نو ہرا ہوجاتا۔ اس طرح سے شمال کے شاعر ہندستانی میں شعر و شاعری کرنے کی طرف متوجہ نہ ہوسکے۔

دکن، فارسی گو ممالک سے نسبتاً دور تھا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں ایرانی نہیں گئے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ وہاں بادشاہ اور امرا بھی دیسی یعنی ہندستانی زبان استعمال کرتے ہیں تو انھوں نے بھی اس کے استعمال کو اپنے لیے باعث ننگ و عار نہیں سمجھا۔ اس کے علاوہ تاریخیں ثابت کرتی ہیں کہ دکن کے علما زیادہ تر دیسی ہی ہوتے تھے اور جو دیسی نہ ہوتے وہ دیسیوں کی تفہیم کی خاطر دیسی زبان ہی میں لکھنے کی کوشش کرتے۔ اس کی واضح مثالیں حضرت خواجہ بندہ نواز اور میراں جی شمس العشاق کی بزرگ ہستیوں کے علاوہ عبدل، مصنف ابراہیم نامہ کی شخصیت بھی ہے جو دراصل دہلی کا رہنے والا تھا اور اردو شعر و سخن کی قدر و منزلت کی شہرت سن کر بیجاپور پہنچ گیا تھا۔

غرض جیسا کہ اس مضمون میں پہلے بھی بیان کردیا گیا ہے شمال پر فارسی کا رنگ گہرا چڑھتا گیا اور نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی اسی میں تصنیف و تالیف کرنے لگے۔ اگر کبھی مسلمان چاہتے بھی کہ ہندوؤں سے قربت حاصل کریں اور ان کی زبان میں لکھیں تو وہ برج بھاشا میں لکھتے تھے جیسا کہ اکبرِ اعظم کے عہد میں عبدالرحیم خان خاناں وغیرہ نے کیا تھا۔ کیوں کہ وہی وہاں کی دیسی علمی اور ادبی زبان سمجھی جاتی تھی اور "ہندستانی" بول چال کی ایک عام مشترکہ زبان تھی۔ اس سے ہندوؤں کو اتنا ہی تعلق تھا جتنا مسلمانوں کو تھا۔ نہ اس میں ہندو لکھنا پسند کرتے تھے اور نہ مسلمان۔ اس کے مقابلے میں دکن میں اگر مسلمان، دیسیوں کی زبان میں لکھنا چاہتے تو یہ ان کے لیے دشوار امر تھا اور جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے وہاں رعایا کی کوئی ایک معین علمی و ادبی زبان برج بھاشا کی طرح موجود نہیں تھی ان کے لیے صرف ایک ہی چارہ، کار تھا۔ یعنی ہندستانی میں لکھنا۔ چناں چہ یہی وہ زبان ہے جو آج بھی نہ صرف دکن کے ہندوؤں اور مسلمانوں بلکہ وہاں کے جدا جدا زبانیں بولنے والے افراد کا مشترکہ ذریعہ، گفتگو قرار دی جاسکتی ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ادھر دکن مجبور تھا اردو زبان میں لکھنے کے لیے اور ادھر ہندستانی خاص اردو کو حقیر سمجھنے اور اس میں تصنیف و تالیف کرنے کو معیوب قرار دینے کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں دکن کے بیسیوں بلند مرتبہ شاعروں کے قدیم اور قابلِ وقعت شہ کارے دست یاب ہوگئے ہیں اور آئے دن ہوتے جارہے ہیں حالاں کہ شمال میں اورنگ زیب سے پہلے باضابطہ اردو تصنیف و تالیف کا پتہ تک نہیں چلتا۔ کچھ دنوں سے یہ خیال پیدا ہوچلا ہے کہ شمالی ہند کے بھی قدیم اردو کے نمونوں کا پتہ لگایا جائے۔ مگر اب تک کم کام یاب ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی ان تحقیقات کا ذکر نہ کرنا خونِ انصاف کرنا ہے جو اورینٹل کالج میگزین میں شمالی ہند کی قدیم اردو پر شائع ہورہی ہیں۔ مگر ان کا مطالعہ بھی اسی خیال کو ثابت کرتا جارہا ہے کہ دکن کی طرح شمال کو اس زبان کی علمی و ادبی سرپرستی کرنے کے موقعے حاصل نہیں ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں یہ زبان عام طور پر رائج تھی اور عوام کے علاوہ بعض بادشاہ اور امرا و فضلا بھی اس سے واقف تھے۔ چناں چہ ان کے متعدد اردو جملے اور الفاظ فارسی کتابوں میں نظر سے گزرتے ہیں۔
عہدِ اورنگ زیب سے پہلے جن شمالی شاعروں کی نسبت اس وقت تک علم حاصل ہوا ہے وہ سعدی اور توری ہیں۔ پہلے شاعر

ل صرف ایک غزل دست یاب ہوئی ہے اور دوسرے کا محض ایک شعر۔ ان کے متعلق تفصیلی اور یقینی معلومات بھی اس وقت تک حاصل نہیں ہوئے۔ دونوں غالباً اکبرِ اعظم کے ہم عصر ہیں۔ اول الذکر کو بعض بزرگوں نے سعدی شیرازی سمجھ لیا ہے حالاں کہ وہ ایک ہندستانی شاعر تھا۔ اس کی مشہور و معروف غزل کی زبان ظاہر کرتی ہے کہ وہ شمالی ہند میں لکھی گئی ہے اس پر ایک طرف تو برج بھاشا کا مخصوص اثر ہے اور دوسری طرف فارسی کا۔ اس عہد کی دکنی تصنیفات کی زبان، اس قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے۔ چناں چہ سعدی کی غزل کے تین شعر اور اس کے ایک ہم عصر گول کنڈہ کے شاعر وجہی کی غزل کے تین شعر یہاں تقابلی مطالعہ کے لیے نقل کیے جاتے ہیں۔ سعدی کے شعر ہیں:

قشقہ چو دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا ریت ہے — گفتا کہ وررسے باورسے اس ملک کی یہ ریت ہے
ہمنا تمھن کوں دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا — ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلا کیا پیت ہے
سعدی بگفتا ریختہ در ریختہ در ریختہ — شیر و شکر آمیختہ، ہم ریختہ ہم گیت ہے

اسی عہد کے دکن کے اردو شعر یہ ہیں:

طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آمل رے پیا — تجھ بن مجھے جینا بہت ہوتا ہے مشکل رے پیا
منجہ تیئں تنپش جانے تہیں، منجہ ٹھار جیو لانے تہیں — منج دل مندر ہو میانے تہیں، کیتا ہے منزل رے پیا
تو جیو میرا میں سو دل، تجھ سات رہنا کیوں نہ مل — دن رات میں میں ایک تل نہیں تجھ تے غافل رے پیا

نوری کا صرف ایک شعر فی الحال دست یاب ہوا ہے۔ اس کا اسلوب بھی سعدی سے ملتا جلتا ہے:

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد — بے چارہ، نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

اس شاعر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دہلی کے ملک الشعرا فیضی کا دوست اور قاضیِ اعظم پور کا لڑکا تھا۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ عبدل، مصنف ابراہیم نامہ کی طرح نوری بھی ابراہیم عادل شاہ کی معارف پروری کی شہرت سن کر بیجاپور گیا تھا۔ چناں چہ وہاں کی اردو مرثیہ نگاری کی اس نے قابلِ ذکر خدمت کی ہے۔ مگر یہ بیان ابھی تحقیق طلب ہے۔

ان دو شاعروں کے بعد اورنگ زیب کے معاصر، شمالی اردو شاعروں، افضل اور جعفر، کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان کی زبان کی خصوصیات بھی متذکرہ شاعروں کی خصوصیتوں کے مشابہ ہیں۔

محمد افضل، میرٹھ کے قریب جھنجھانہ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۰۰ھ کے لگ بھگ برج بھاشا کی نظموں کے اسلوب میں ایک ہندستانی بارہ ماسہ لکھا جو بکٹ کہانی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی زبان، دکن کی ہندستانی سے خاص طور پر مختلف ہے۔ ہم یہاں اس کے اور اس کے ایک معاصر گول کنڈہ اردو شاعر طبعی کے اشعار زبان و نہج زبان کے مطالعہ کے لیے پیش کرتے ہیں۔ افضل لکھتا ہے۔

سکھی رے چیت رت آئی نواہی — ابھوں امید میری بر نیاہی
یہ عالم پھولیاں پھلواریاں سب — کرے سیراں پیا سنگ ناریاں سب
سکھی یہ رت مجھے ناگنِ دست ہے — پھروں بوری تمامی، جگ مست ہے
اری میں عشق سوں ڈرتی پروں تھی — نصیحت میں اپن سوں یوں کروں تھی
[illegible]

جنھوں نے دل مسافر سو لگایا — انھوں نے بھو جنم روتے گنوایا
یہ ہیں حالم صبا ہر غدا ری — پیا کوں جاسنا باتے ہماری
اگر باشد خطا ہم بخش دیجو — خبر میری سویرا آئے لیجو

دکن کے اردو شاعر طبعی نے بہرام کے سوال اور گل اندام کے جواب میں اسی زمانہ میں یہ شعر لکھے ہیں:

ہوا مجنوں برہ تے سدہ گنوا میں — اتھا دانا سو دیوانہ ہوا میں
تجھے دل میں چھپایا ہوں اپس کے — غرابے تیں لگایا ہوں دیوا میں
اچایا ہوں ترے غم کے پہاڑاں — عجب ہے نہیں سینہ پھٹ کر موا میں
مجھے کیا دیکھتی ازما گل اندام — پرانا ہوں نہیں عاشق نوا میں

گل اندام کا جواب:

تجھے حاصل نہیں ہے منج تے بن غم — نکو کر غم میں اپنا پانو محکم
ترا دل ہو گیا پھوڑا دکھوں تے — نہیں اس زخم کا منج پاس مرہم
مرا پانوں پہ سر تیرا نہ انپڑے — کرے کھن کی نمن گر تو کمر خم
نیا گا اس چمن میں تے تو میوہ — ہوا کوتہ سخن واللہ اعلم

افضل کے بعد میر جعفر علی کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ شاعر کئی سال شہزادہ کام بخش کے ساتھ دکن میں رہ چکا ہے۔ چناں چہ اس کے مجموعہ، کلام میں شمالی اور دکنی دونوں رنگ کی نظمیں موجود ہیں۔ حسب ذیل نظم میں وہی ریختہ پن ہے جو سعدی، نوری اور افضل کے کلام میں جھلک رہا ہے۔ جعفر، اورنگ زیب کی مدح میں لکھتا ہے:

زہے دھاک اورنگ شاہ ولی — در اقلیم دکھن پڑی کھل بلی
دریں پیر سال و ضعیف بدن — مچائی دھما چوکڑی در دکن
زہے شاہ شاہاں کہ گاہ وغائے — نہ ہلا نہ ٹلا نہ جنبد زجائے
کمر بستہ ہشیار میدان پر — شب و روز طیار گھمسان پر

اس کے مقابلے میں جعفر علی کے حسب ذیل شعر ملاحظہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس پر دکن کے قیام اور وہاں کے اردو شاعروں کے مطالعہ کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا تھا۔ اس کی ایک مثنوی سلوک سے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

ارے من باورے اب سو وتا کیا — رسیلے نینوں بن دن کھوونا کیا
بوڑھاپا آ گیا جوبن گیا بھاگ — اندھیری رین میں لگن لگے ناگ
نہ تو رہے گی نہ یہ پنجرا رہے گا — بولا کر لال تجھ سے کیا کہے گا
جو پوچھے بات تجھ کوں لال پیارا — کہ پنجرے بیچ تیں کیا کیا سنوارا
بھیانی رات تجھ کو سوتی ہے — بھیاناں دن تجھے دکھ روتی ہے
سجن سے آج توں رلیاں منالے — رنگیلے سیج پر کلیاں بچھالے

وگر نہ کیا بھروسہ اس پون کا | یکایک آئے پہنچے دن مرن کا
اندھیری گور میں دیا نہ باتی | یکا یک چل بسے سنگی سنگاتی
بیا جعفر توکل پر قدم رکھ | خدا کی یاد دل میں دم بہ دم رکھ

جعفر، پہلا شمالی شاعر ہے جو دکن کے اردو کارناموں سے متاثر ہوا تھا اور جس کے کلام میں فارسی اور برج کی بے تناسب آمیزش نہیں پائی جاتی۔ مگر چوں کہ اس کا زیادہ تر وقت زٹل اور ہزل گوئی میں صرف ہوتا تھا، وہ اعلیٰ درجہ کی شاعری کے نمونے اپنی یادگار چھوڑ نہ سکا۔

مگر اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد، شمال اور دکن میں ملاپ ہوجانے کی وجہ سے شمال کے لوگ دکن اور دکن کے شمال، آنے جانے لگے۔ اس اختلاط نے ان دونوں میں اپنی زبانوں کے اختلاف کا احساس پیدا کیا۔ چوں کہ دکن کے اہلِ قلم نے اپنے اسلوب میں بہت کچھ ادبی کام کیا تھا شمال کے شاعروں نے معلوم کیا کہ ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اپنی گفتگو کی زبان کی علمی سرپرستی کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ جعفر علی کا کلام تو خیر اسی دورِ اختلاط اور اسی اثر کا نتیجہ تھا مگر اس کے علاوہ اور دو تین شاعروں کے جو نمونے ہم نے ابھی پیش کیے ہیں انھیں قدیم اردو تذکرہ نویس، سنجیدہ اور صحیح اردو شاعری نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ تفنن کے طور پر شاعری کی گئی تھی۔ مرزا معز موسوی خاں فطرت، عہدِ اورنگ زیب کے ایک فارسی شاعر ہیں ان کا یہ اردو شعر تذکروں میں ملتا ہے۔

از زلفِ سیاہ تو بدل دوم پری ہے | در خانۂ آئینہ گتا جوم پری ہے

مرزا معز کے ساتھ ایک اور شاعر، قزلباش خاں امید، کے بھی اردو شعر ملتے ہیں جن کا ایک نمونہ یہ ہے۔

بامن کی بیتی آج سری آنکھ موں پری | غصہ کیا د گالی دیا اور وگر لری

اس طرح کے فارسی شاعروں میں، جنھوں نے دوچار شعر اردو میں بھی لکھے ہیں، شاہ سعداللہ گلشن اور عبدالقادر بیدل کے نام بھی گنائے جاسکتے ہیں۔ یہ اور ان کے بعد کے دوسرے فارسی شاعروں نے جب دیکھا کہ دکن میں اردو شعر گوئی کا ذوق ترقی کرچکا ہے اور وہاں بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں تو وہ شوق سے دکنی ادب کی طرف بڑھنے لگے اور چوں کہ اس اثنا میں فارسی شاعری سے اکتا گئے تھے ایک غیر ملک کی زبان میں کمال حاصل کرنے کے لیے انھیں کافی محنتیں کرنی پڑتی تھیں اور اس کے بعد بھی وہ ایرانی شاعروں کے مقابلے میں اپنے تئیں کم زور پاتے تھے۔ فارسی اب ان کی اپنی زبان نہ رہی تھی۔ وہ اپنی طرف سے ادائے خیال کے نئے نئے طریقے اختیار کرنے سے قاصر تھے چناں چہ وہ ایسا کرتے بھی تو اہلِ زبان معترض رہتے تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ فارسی کی قدر کرنے والی سلطنتیں کم زور ہوتی جارہی تھیں۔ حکم رانوں میں اس کا پہلا سا ذوق باقی نہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ چوں کہ فارسی میں ہندستانی شاعروں کے لیے خیالات ادا کرنے نئے نئے طریقے مسدود تھے اور وہ اپنی مقامی خصوصیات، اپنے فارسی کلام میں بے دھڑک نہیں ظاہر کرسکتے تھے، اس لیے جب انھوں نے دکنی اردو کا مطالعہ کیا جو ان کے لیے فارسی سے زیادہ قریب تھی اور جس کے ذریعے سے ان کے فطری رجحانات ظاہر ہوسکتے تھے تو انھوں نے فارسی کو ترک کرنا شروع کیا۔ یہ بے زاری اس حد تک پہنچی کہ جب سودا یا میر جیسا کوئی بڑا شاعر، فارسی میں لکھتا تو لوگ یہ سمجھتے کہ وہ اپنے رتبے سے اتر کر یہ کام کررہا ہے۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا اور فارسی سے ترک کرنے کا سبب، میر نے شاعرانہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　معشوق جو تھا اپنا، باشندہ دکن کا تھا

اس زمانہ میں دکن کے جو اردو شاعر، شمال گئے ان کی تعداد میں (جیسے جیسے اردو کے تذکرے دست یاب ہوتے جارہے ہیں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ایک مصحفی ہی کے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ، اردو شاعر دہلی گئے تھے جہاں انھوں نے قدر و مقبولیت حاصل کی۔ تذکرہ اعظم الدولہ، سرور سے بھی اس بارے میں اچھا مواد حاصل ہوتا ہے۔

مصحفی کے تذکرہ، ہندی میں شمال کے تیس کے قریب ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جو دکن گئے تھے۔

یہ تو شاعروں کا ذکر تھا۔ اس زمانہ میں دکن کی بہت سی اردو کتابیں بھی شمال پہنچیں۔ چناں چہ شاہانِ اودھ کے کتب خانہ میں دکن کی معتدبہ اردو قلمی کتابیں جمع ہوگئی تھیں۔ "اسپرنگر" کا کٹلاگ ان کے تذکروں سے معمور ہے۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ دکن کے اردو ادب نے شمال میں کس درجہ مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ اس کی شہادت اس طرح سے بھی ملتی ہے کہ یورپ کے مختلف کتب خانوں میں جو قدیم دکھنی مخطوطے، محفوظ کرلیے گئے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے کاتب، شمالی ہند کے باشندے تھے اور جنھوں نے محمد شاہ کے اوائل عہد میں دکن کی ان اردو کتابوں کو نقل کیا تھا۔

قدیم تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی مجلسوں میں دکن کے اردو اشعار دل چسپی سے سنے جاتے تھے اور دکنی شاعروں کی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ ولی نے تین دفعہ سے زیادہ دہلی کا سفر کیا اور پھر بھی جی نہیں بھرا۔ ایک غزل میں لکھتے ہیں۔

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

دہلی کے شاعر، ولی کی غزلوں کی تقلید میں غزلیں لکھتے اور ان ہی کے شعروں سے اپنے مشاعروں کے لیے مصرع طرح حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ اب تک شمال کے اس زمانہ کے اردو شاعروں کے کلام، عام طور پر دست یاب نہیں ہوئے ہیں۔ تاہم دیوان زادہ سے اس کے ثبوت ملتے ہیں۔ دیوان زادہ اس عہد کی تنہا محفوظ یادگار ہے۔ اس کا نفیس اصلی نسخہ انڈیا آفس میں موجود ہے، چناں راقم نے اس کو مرتب کرکے شائع کرنے کا سامان مہیا کردیا ہے۔

دیوان زادہ کے دیباچہ میں حاتم نے ولی کی استادی کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں ان ہی کی طرز میں لکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی غزلوں میں ولی کی استادی کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے اس مختصر انتخابِ کلام میں بھی تیرہ غزلیں ایسی ہیں جن پر صراحت کردی ہے کہ یہ ولی کی زمین اور تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ بعض شعروں میں وہ ولی سے مخاطب بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ولی کی موجودگی ہی میں لکھے گئے ہیں۔ اس ضمن میں مزید معلومات میرے اس مضمون میں درج ہیں جو شاہ حاتم پر ہندستانی کے گذشتہ نمبر میں شائع ہوچکا ہے۔

تذکرہ، قاسم میں ولی کی تعریف کرنے کے بعد اس زمانے کے ایک شاعر کا مصرع اپنے خیالات کی شہادت کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔ لکھا ہے "پیر خاں کم ترین کہ غدائش بیامرزد، بسیار بہ موقعہ و بجا گفتہ کہ

"ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں"

اسی زمانے کی ایک اور تصنیف "تذکرہ، بے جگر" میں جس کا خود مصنف کا لکھا ہوا مخطوطہ انڈیا آفس میں موجود ہے، ولی کی نسبت لکھا ہے:

"در حقیقت کسے کہ اسپ در میدانِ ہندی دوانید آن بود، و فی الواقع شخصے کہ آب رفتہ، باز در جوے ایں

زبان ہندی رسانید، ہماں بود۔ چوں دور سنہ اثنا جلوس محمد شاہی، دیوان او بہ دہلی رسید، موزوں طبعانِ بلند فکر و عالی تلاشانِ ہم عصر، مثل حاتم و آبرو و فغاں وغیرہ بہ تتبع زبانش پیرو و ہم زبان شدند۔"

ایک اور تذکرہ، طبقات سخن میں آبرو کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

"چوں دیوانِ ہندی شاہ ولی اللہ گجراتی بہ عصر محمد شاہ بہ دہلی رسید، تتبع آں شد۔"

مصحفی نے اپنے تذکرہ، ہندوی میں حاتم کا قول نقل کیا ہے جس سے دہلی میں اردو شاعری کے آغاز پر روشنی پڑتی ہے۔ حاتم کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"روزے پیشِ فقیر نقل می کرد کہ در سنہ دوئم فردوس آرام گاہ، دیوانِ ولی در شاہ جہاں آباد آمد، و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ۔ بادو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد، بنائے شعر ہندی را بہ ایہام گوئی نہاد، دادِ معنی یابی و تلاشِ مضامین تازہ میدادیم۔"

ولی کے علاوہ دکن کے جن اردو شاعروں کے کلام نے دہلی میں شہرت حاصل کی، ان میں فقیر اللہ آزاد اور فراقی بھی شامل ہیں۔ میر حسن، اپنے تذکرہ کے آغاز میں یہ لکھنے کے بعد کہ "باید دانست کہ ریختہ اول از زبان دکنی است" فقیراللہ آزاد کا حال لکھتے ہیں اور پھر اس کی شاعری کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"ہم راہ فراقی دکنی در شاہ جہاں آباد آمدہ بود، طبع درد مندے داشت و بسیار بصفا حرف می زند۔ خدایش بیامرزد۔"

غرض ان اسباب اور حالات کے نتیجہ کے طور پر دہلی میں اردو شاعری کا آغاز ہوا اور فارسی کا اثر کم ہونے لگا۔ چوں کہ دکن کے اردو کلام کے اثر سے ابتدا ہوئی تھی اس لیے اول اول دکنی طرز کی پیروی کی گئی۔ اس کے خلاف لکھنے والے کی شاعری غلط سمجھی جاتی تھی۔ چناں چہ اس آغازی دور کے ایک مشہور شاعر، شاہ مبارک آبرو نے اس کے متعلق جو نصیحت کی تھی اس کو حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں نقل کیا ہے:

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ہے ان ستے کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف لغو ہیں گے فعل، اس کے ریختہ میں حرف ہے

لیکن شعرائے دہلی کا یہ اسلوب عرصے تک قائم نہیں رہ سکا۔ دکنی طرز کی پیروی ان کے لیے غیر فطری تھی۔ اس میں بھی خیال ادا کرنے کے لیے انھیں تکلف اور تصنع سے کام لینا پڑتا تھا۔ اب انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی روز مرہ کی زبان میں فارسی اجزا کی آمیزش کر کے شعر لکھیں۔ اگرچہ پہلے پہل بعض شعرا نے اس کی مخالفت بھی کی مگر یہ تحریک کامیاب ہو گئی۔ اور بہت جلد اردوئے معلیٰ کی زبان میں شعروشاعری ہونے لگی۔ اس رجحان کا آغاز مرزا مظہر جانِ جاناں نے کیا اور اس کی ترقی صد ناسخ تک جاری رہی۔ حاتم نے اس تبدیلی کا ذکر اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں کیا ہے اور چوں کہ وہ دہلی میں اردو شاعری کے آغازی اور اصلاحی دونوں رجحانوں کی ترویج و ارتقا کے وقت زندہ تھے اس لیے ان کا بیان اس بارے میں زیادہ دل چسپ اور مستند ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"ودریں ولا، ایں ترتیب طلب از دہ دوازدہ سال، اکثر الفاظ را از نظر انداختہ، لسان عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیرالاستعمال باشد و روز مرہ، دہلی کہ میرزا یانِ ہند و فصیح گویانِ رند در محاورہ دارند، منظور داشتہ، سوائے آں، زبان ہر دیار، تا بہ ہندوی، کہ آں را بھاکا گویند، موقوف نمودہ فقط روز مرہ کہ عام فہم و خاص

پسند یوہم، اختیار کردہ۔"

پھر قدیم و جدید لفظوں کی فہرست لکھنے کے بعد لکھتے ہیں "دیوان زادہ میں قدیم یعنی دکنی طرز کے اشعار، میں نے نہیں درج کیے ہیں۔ اگر کوئی مل جائیں تو مجھے معاف کیجیے۔" لیکن اب تذکروں سے حاتم کی قدیم طرز کی نظمیں بھی دستیاب ہو گئی ہیں۔ حمد و نعت پر ان کی ایک نظم تذکرہ، گلشنِ گفتار میں منقول ہے۔ اس کے چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں تاکہ یہ ظاہر ہوسکے کہ دلی کی آغازی اردو شاعری کس رنگ کی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی دیوان زادہ کی ایک نظم کے چند شعر بھی پیش کیے جاتے ہیں جو ثابت کریں گے کہ لسانی تبدیلی کے رجحان نے دلی کی آغازی شاعری کے اسلوب کو کس قدر بدل دیا۔ حاتم کی ابتدائی شاعری کا نمونہ یہ ہے:

الہٰی داغ سیں دل کو جلا دے — برہ کی آگ مجھ تن میں لگا دے
جلا جیوں پھلجھڑی اس ناتواں کوں — شرر لبریز کر ہر استخواں کوں
فنا کر عشق میں یہ جانِ بے تاب — کہ جیوں آتش میں گھٹ جاتا ہے سیماب
کہ ہوسٹ آپ سیں یک بار جاؤں — پیمبر کی صفت کرنے کو دھاؤں
رکھے ہیں جس کے دروازے پہ موسیٰ — سعادت جان، دربانی کا عاصا
مسیحا ناک گھس تج آستاں پر — دماغ اپنا چڑھایا آسماں پر
اوتر سدرہ ستے ہر پیر جبریل — کیا علمِ حقیقت خوب تحصیل
نبیؐ کی آل پر سے وار جانا — اسی بارہ پلے میں پار جانا

حاتم کی یہ وہ طرز شاعری تھی جو ان کے آخری عہد میں متروک ہو گئی تھی اور جس کا انتخاب انھوں نے دیوان زادہ میں نہیں کیا۔ یہاں ہم دیوان زادہ کی ایک نظم سے چند شعر نقل کرتے ہیں:

کیا بیاں کیجیے نیرنگیِ اوضاعِ جہاں — کہ بہ یک چشم زدن ہو گیا عالم ویراں
جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پانو — پھریں ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں
نعمتیں جن کو میسر تھیں ہمیشہ ہر وقت — روز پھرتے ہیں یہاں قوت کو اپنے حیراں

چوں کہ یہ نظم ہمارے مضمون کے سلسلے میں، ہندستانی کے گذشتہ نمبر میں چھپ چکی ہے اس لیے یہاں اس کے اتنے ہی شعر کافی ہیں۔

جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اس لسانی تبدیلی کو ابتدا میں بعض حضرات نے پسند نہیں کیا۔ تذکرہ، مخزنِ نکات میں قائم نے اس کے متعلق اپنے خیالات اس طرح ظاہر کیے ہیں:

"بر شناسائے سلوک سخن، مخفی و محتجب نیست کہ از عہد عبداللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانہ، بہادر شاہ اول کسانے کہ شعر ریختہ گفتہ اند، نسق کلام ایں ہا، بسیار مربوط و معقول است۔ ہر چند اکثر الفاظ غیر مانوسِ گوشِ ما مردم مستعمل ایشان است، لیکن چوں کہ موافق زبان دکن، راست و درست است، پیش ہمہ کس راہ بدو دارد۔"

قائم کے اس بیان کے سلسلے میں ان کا یہ اردو شعر غالباً دل چسپی سے سنا جائے گا کہ

قائم، میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

طبقہ سوم یعنی میر، سودا اور سوز وغیرہ کے ذکر سے پہلے قائم لکھتے ہیں:

"مخفی و محتجب نماند کہ ان چہ الحال اشعار و احوال شعرائے متاخرین نوشتہ می آید۔ طرز کلام این ہا، مانا بروبہ شعر فارسی است۔ چناں چہ جمیع صنایع شعری قرار دادہ، اساتذہ، اسلاف است بکار می برند و اکثرے از ترکیبات فرس کہ موافق محاورہ، اردوئے معلیٰ، مانوسِ گوش می نمایند، جواز البیان می دانند۔ الا ترجمہ، زبان مغل بہ ریختہ کردن مقبوح است چہ ترجمہ زبان مغل بہ ریختہ کردن مقبوح است۔ چہ دریں صورت صحت زبان یکے ازہر دو نمی ماند۔"

مگر قایم اور ان کے ہم خیالوں کے اعتراف کے باوجود دہلی کی اردو شاعری، فارسی سے متاثر ہوتی گئی یہ رجحان اس لیے بھی کامیاب ہوگیا کہ اس کے علم بردار مظہر جانِ جاناں، میر و سودا اور قایم و سوز جیسے بلند مرتبہ شاعر تھے۔ اب رہی یہ بحث کہ اردو شاعری نے ان شعرا کے زیرِ اثر کس طرح وہ قالب اختیار کیا جو آج تک بدل نہ سکا، اس مضمون کے موضوع سے باہر ہے۔ اس کا تعلق دراصل ہمارے اُس مقالے سے ہے جو دہلی میں اردو شاعری کے ارتقا پر زیرِ تحریر ہے۔ دہلی کے ابتدائی مشاعروں، شعر و سخن کے سرپرستوں اور شاعروں کی آپس کی نوک جھونک اور مختلف شاعروں کے موجودہ کلام کے اوقات و سنین پر گفتگو کرنا بھی اسی مضمون سے متعلق ہوگا۔ ●

(سلسلہ ص: ۹۰ سے)

کتابیات اردو

BIBLIOGRAPHY URDU

۱ دیوانِ غالب، اردو: مرتبہ نور بنی عباسی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء

۲ الطاف حسین حالی: یادگارِ غالب۔

کتاب کے اردو ایڈیشن کے لیے بیش تر حسبِ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱ ڈاکٹر تنویر احمد علوی: اوراقِ معانی، اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۲ء

۲ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: غالب اور انقلابِ ستاون، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۸۸ء (بہ شمول "دستنبو" ترجمہ: رشید حسن خاں)

۳ غالب کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم، جلد اول تا چہارم غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۳ء

نوٹ: فارسی خطوطِ غالب اور "دستنبو" کی محولہ عبارتوں کے اردو تراجم کے لیے مترجم ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور جناب رشید حسن خاں کا شکر گزار ہے جن کی محولہ بالا کتابوں سے یہ تراجم لیے گئے ہیں۔ غالب کی فارسی مثنوی "چراغ دیر" کے محولہ اشعار کا اردو ترجمہ اختر حسن مرحوم کا ہے۔ بہ جز دو اشعار کے جن کی نشان دہی ستارے (☆) کے نشان سے کی گئی ہے۔ ان کا ترجمہ مظفر مجاز نے کیا ہے۔

○●○

مولوی سید محمد صاحب کے مخطوط ڈاکٹر زور کے نام



مولوی سید محمد صاحب ۱۹۰۶ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید عبدالرحمن صاحب منصب دار تھے۔ مدرسہ مفید الانام سے ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ سٹی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ بعدازاں جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لے کر ۱۹۲۴ء میں انٹرمیڈیٹ کامیاب کیا۔ ۱۹۲۶ء میں بی۔ اے اور ۱۹۲۷ء میں ام۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال سٹی کالج میں ان کا تقرر ہوا جہاں وہ ۱۹۳۵ء تک تدریس کا کام انجام دیتے رہے۔

۱۹۴۳ء میں آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ میں ان کا تبادلہ ہوا۔ ۱۹۴۵ء میں ریڈر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ جامعہ عثمانیہ کی نصابی کمیٹیوں کے علاوہ اکاڈمک کونسل اور سینیٹ کے بھی رکن رہے۔

زمانہ طالب علمی ہی سے سید محمد صاحب اور ڈاکٹر زور کا ساتھ رہا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب کے ساتھ چند سال تک مجلہ مکتبہ شائع کرتے رہے۔ مجلہ طیلسانین جاری کیا۔ ادارہ ادبیات اردو کے قیام اور ترقی میں مولوی سید محمد صاحب کا نمایاں حصہ رہا۔ نواب سالار جنگ کی سرپرستی میں "مجلس دکنی مخطوطات" کا قیام عمل میں آیا تو سید محمد صاحب کو اس کا معتمد بنایا گیا۔ سید محمد صاحب نے کئی کتابیں مرتب کر کے اپنے عالمانہ مقدموں کے ساتھ شائع کیں جن میں ارباب نثر اردو، تذکرہ گلشن گفتار، مثنویات میر، ایمان سخن، کلیات عبداللہ قطب شاہ، یادگار ولی، قابل ذکر ہیں۔

○●○

<<< ١ >>>

حیدرآباد دکن۔
٢٠ / اکتوبر ١٩٢٧ء

مکرمی زور صاحب

السلام و علیکم ___ کئی ہفتوں سے آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ آج بھی ڈاک کا وقت قریب الختم ہے اس لیے مختصر طور پر چند سطریں لکھ دیتا ہوں۔ آئندہ ہفتہ مفصل خط بھیجوں گا۔ میں نے جن کتب کے اقتباس کے ارسال کے لیے آپ کو لکھا تھا ان کی ضرورت نہیں صرف دیوانِ جہاں مخزونہ برٹش میوزیم کا ایک نمونہ، عبارت چاہیے۔ آپ کے مقدمے کا سخت انتظار ہے۔ براہِ کرم جلد روانہ فرمائیے۔ مولوی سلیم صاحب نے میری کتاب کے لیے "کلکتہ کی بزمِ اردو" نام تجویز کیا ہے مگر مجھے یہ نام کچھ زیادہ پسند نہیں۔ آپ کوئی موزوں نام تجویز کر کے لکھ بھیجیے۔ مجلہ، عثمانیہ شائع ہوگیا۔ آپ کا مطلوبہ مضمون بھی انشاء اللہ روانہ، خدمت کردوں گا۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں دکھنی شعرا کی جو کتابیں آپ مناسب اشاعت خیال فرمائیں ان کو نقل کرلیجیے مگر اس سے پیش تر مجھے بھی ان کے اسما سے مطلع کیجیے تاکہ میں مزید معلومات بہم پہنچاسکوں۔ میر حسن کی مثنویاں بجز ان مثنویوں کے جو شائع ہوچکی ہیں نقل کرنے کے قابل ہیں۔ آپ اپنی مفصل کیفیت سے مطلع فرمائیے۔

کالج کے حالات آپ کو دوسرے احباب کے خطوط سے معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ میری کتاب کی طباعت شروع ہورہی ہے۔ آپ کے مقدمہ کا ہی انتظار ہے۔

مخلص خاکسار

سید محمد

<<< ٢ >>>

حیدرآباد دکن۔
٩ نومبر ١٩٢٧ء

مکرمی

السلام و علیکم ___ آپ کے دو کارڈ اور مقدمے کا لفافہ وصول ہوا۔ مقدمہ اور اقتباس کے لیے ممنون ہوں۔ میری کتاب خدا کے فضل سے تقریباً طباعت کے قابل ہوگئی ہے۔ انشاء اللہ ہفتہ عشرہ میں طباعت شروع ہوجائے گی۔ پہلے نسخے کے آپ ہی مستحق ہوسکتے ہیں اور انشاء اللہ سب سے پہلے آپ کی خدمت میں ایک کاپی ارسال کروں گا۔ آپ کے حسب الطلب رہبر کا

سالانہ نمبر مرسلِ خدمت ہے۔ آج کل میں انڈیا آفس کے دکنی مخطوطات پر ایک بسیط مضمون جو (۵۰) پچاس صفحوں پر مشتمل ہوگا لکھ رہا ہوں۔ وہ بھی شائع ہوتے ہی آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ آپ نے جو اقتباسات بھیجے ہیں ان سے میری کتاب ضرور شان دار ہوجائے گی۔ ان میں سے ایک شکنتلا تو مجھے یہیں سے دست یاب ہوگئی باقی دو اقتباس نہایت ہی اہم ہیں اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو جن کتابوں کے نمبرات دوسرے صفحے پر درج کیے ہیں ان کی دس دس پندرہ پندرہ سطریں نقل کرکے ارسال فرمائیے۔ مجلے کا دوسرا نمبر شائع ہوگیا ہے غالباً کل آپ کو مل گیا ہوگا۔ یہاں کے حالات حسبِ سابق ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں۔ غالباً تجلی اور نظر وغیرہ رسائل آپ کو پہنچتے ہوں گے۔ میر امن پر میرا مضمون تجلی میں شائع ہوچکا ہے۔ فی الوقت میں انڈیا آفس کے مخطوطات پر جو کام کر رہا ہوں، اسں کے شائع ہونے کے بعد آپ کو چند دکھنی کتابیں نقل کرنے کے لیے لکھوں گا۔ آج کل آپ کس کام میں مشغول ہیں مطلع فرمائیے۔ مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک ماہ وار ...... نکالنے کی تجویز ہوئی ہے۔ سروری صاحب ایڈیٹر قرار پائے ہیں۔ میں، چاؤش، تمکین کاظمی صاحب اور سعیدی صاحب اراکین مشاورت ہیں مگر ایڈیٹر پابند مشاورت نہیں ہے۔ مکتبے کی مجلسِ انتظامی میں یہ مسئلہ زیرِ غور اور عن قریب منظوری کے بعد اشاعت رسالہ کی کارروائی شروع ہوجائے گی۔ رشدی صاحب اور وقار صاحب، ایک ہفتہ وار اخبار نظام گزٹ شائع کرنے والے ہیں اور آج کل میں پہلا نمبر شائع ہوجائے گا۔ نرسنگ راؤ نامی ایک سابق طالب علم دارالعلوم نے بھی رعیت کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا ہے مگر کوئی معرکتہ الآرا پرچہ نہیں۔

اگر کوئی ہم خیال صاحب وہاں مل جائیں تو آپ بعض اہم کتابوں کا وہاں کے قلمی نسخوں سے مقابلہ کیجیے اور بعض نایاب کتابیں نقل کرلیجیے۔ مولوی غلام رسول صاحب سے اسں کے متعلق گفتگو آئی تھی۔ فی الحال میں دکھنی کتابوں کے متعلق کچھ نہیں لکھتا جب میرا مضمون شائع ہو جائے گا تو اسں کو بھیج کر آپ کو بعض کتابوں کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ میں نے انڈین ڈیلی میل میں لندن کے رسالے حیدرآباد میگزین پر تنقید دیکھی تھی۔ اگر ممکن ہو تو ایک آدھ پرچہ روانہ فرمائیے۔ نیز آپ کا کوئی فوٹو بھی ممکن ہو تو ضرور بھیجیے۔

میں کاروبار اور کچھ خرابیِ صحت کی وجہ سے اطمینان کے ساتھ خط و کتابت نہیں کرسکتا ہوں۔ آپ جو امور معلوم فرمانا چاہیں ان کو نمبروار درج خط کردیجیے۔

مجھے مطلع فرمائیے کہ آپ کس پروفیسر کے تحت کام کر رہے ہیں اور کیا کام آپ کے سپرد کیا گیا ہے۔ کیا آپ اپنی تعلیم کے علاوہ اور اپنے ڈھب کے کاروبار مثلاً نقلِ کتب و تحقیقِ کتب دکھنی کتب دکھن کے لیے کچھ وقت نکال سکتے ہیں۔ چاؤش کو آپ کا نامہ دکھا دیا۔ ان کا پتہ درجِ ذیل ہے۔

ابو محمد عمر بن صلاح صاحب کوچہ حسن صالح مکہ مسجد، حیدرآباد۔

مخلص خاکسار

سید محمد قادری

<<< ۴ >>>

حیدرآباد دکن

۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء

مکرمی

مکرمی و مشفقی ___ آپ کا عنایت نامہ ہم پست ہوا۔ مطلوبہ کتابوں کے اقتباسات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میری کتاب کی لکھائی شروع ہو چکی ہے اس وقت تک دو جزو لکھے جا چکے ہیں۔ انشاء اللہ مہینے سوا مہینے میں شائع ہو جائے گی۔ لیکن میں نے "دکنی ادبیات انگلستان میں" کے عنوان سے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے ذخیرہ، دکھنیات پر یہاں کی معلومات اور کتب کی روشنی میں محققانہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ یہ بھی لکھا جارہا ہے طبع ہونے کے بعد ارسال کر دوں گا۔ مکتبے سے جو رسالہ شائع ہو گا وہ ماہ وار ہے۔ معارف کی تقطیع ہو گی اور انشاء اللہ جنوری کی آخر میں شائع ہو جائے گا۔ چاؤش کو آپ کے مرسلہ خطوط ملے۔ ان کے اپنے خط کے جواب کا انتظار ہے۔

تذکرہ، ہندی مصحفی کا ایک نسخہ دارالمصنفین میں ہے۔ اس کے سوا ہندستان میں کسی اور نسخے کا پتہ نہیں چلا۔ مصحفی کے متعلق عبدالماجد صاحب نے ان کی مثنوی بحرالمحبت شائع کی ہے اس سلسلے میں جو مواد انھوں نے پیش کیا ہے اس کے علاوہ میر تقی، میر حسن کے تذکروں، "گلشن ہند" از لطف وغیرہ سے بھی مواد مل سکتا ہے۔ غالباً مصحفی کی یہ مثنوی ہی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ دیوان چھپا ہو گا مگر پرانی طرز پر۔ انشاء اللہ تذکرہ۔ محبوب الزمن روانہ کروں گا۔ آپ نے انگلستان میں اپنا تعلیمی اور غیر سرکاری طور پر کونسا ادبی کام شروع کیا ہے مطلع فرمائیے۔

میں، چاؤش اور مولوی غلام رسول صاحب باہمی مشورہ کر کے عن قریب کو آپ اطلاع دیں گے کہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس سے کونسی چیزیں نقل کر لینی چاہئیں۔ پہلے مجھے یہ معلوم فرمائیے کہ آپ کو یونیورسٹی نے کونسا ادبی کام آپ کے سپرد کیا ہے اور اس وقت آپ نے خانگی حیثیت سے کیا کام کیا ہے۔

مولوی جمال اللہ صاحب نے انگلستان جانے کے بعد ہمیں یاد بھی نہیں کیا۔ اگر آپ سے ملاقات ہو تو میرا سلام فرمائیے اور یہ بھی بتا دیجیے۔

مکتبے سے جو رسالہ شائع ہو گا وہ انشاء اللہ حسن و خوبی کے ساتھ اردو ادب کی خدمت گزاری کرے گا۔ زیادہ کرم ہے۔

آپ کا مخلص

سید محمد قادری

آپ اگر چاہیں تو مصحفی کا تذکرہ نقل کریں اور جو کچھ مواد انگلستان میں موجود قلمی تذکروں سے اس کی لطف وغیرہ پر مل سکے اس کو لے کر مقدمہ بھی تحریر کر دیں تو کچھ حرج نہیں ہے۔

کتب قلمی مخزونہ برٹش میوزیم

(۱)	نمبر ۸۸	نوطرز مرصع	
(۲)	نمبر ۹۶	چار گلشن	
(۳)	نمبر ۹۲	قصہ مادھونل اور کام کندلا	

کتب قلمی مخزونہ انڈیا آفس لائبریری

(۴)	نمبر ۴۱	تاریخ شیر شاہی	ترجمہ : مظہر علی ولا
(۵)	نمبر ۱۹	تنبیہ الغافلین	ترجمہ : بینی نارائن جہاں

کیا میری کتاب کے لیے "اربابِ اردو" ٹھیک نام ہوسکتا ہے۔ میرا خیال مختصر نام رکھنے کا ہے۔

○●○

<<< ۴ >>>

سید محمد قادری بی۔ اے (عثمانیہ)
بہادر منزل، گھانسی بازار،
حیدرآباد دکن۔

مورخہ ۴ / اردی بہشت ۱۳۳۷ ف (۸ مارچ ۱۹۲۸ء)

محبی و مشفقی

السلام علیکم ــــ گزشتہ ہفتہ آپ کا مکتوب ملا۔ اس ہفتہ مطلوبہ اقتباس سخت انتظار رہا۔ غالباً آپ کو انڈیا آفس جانے کا موقع نہیں ملا۔ براہِ کرم جس قدر جلد ممکن ہو انڈیا آفس کے مخطوطات سے تاریخِ شیر شاہی از مظہر علی ولا اور تنبیہ الغافلین از بینی نارائن جہاں اور برٹش میوزیم، جہانگیر نامہ از ولا کے مختصر اقتباسات روانہ فرمائیے۔ آپ کے حسب ایما کتابت میں اس کے لیے چند صفحات چھوڑ دیے گئے ہیں۔ کتابت کی طباعت بھی شروع ہوگئی ہے۔ تکمیل کے لیے مذکورہ نمونوں کی سخت ضرورت ہے۔ آپ کے یم۔ آر۔ اے۔ یس ہونے پر مسرت ہوئی مگر آپ کی اعلیٰ قابلیتوں اور آئندہ ملنے والی ارفع ڈگریوں کے آگے اس کی وقعت ہی کیا ہے۔ مکتبے کا رسالہ طبع ہوگیا ہے۔ اس ہفتہ شائع ہوجائے گا۔ چاؤش کے موسومہ خط میں آپ کی ہدایات دیکھیں۔ انشاء اللہ ایسا ہی عمل ہوگا۔ سروری صاحب کو میرے مضمون کے بارے میں کچھ غلط فہمی ہوگئی۔ میں نے یقین پر کوئی مضمون لکھا ہی نہیں نہ یہاں کچھ مواد ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اس موضوع پر قلم اٹھاکر اردو کی خدمت کردی۔ دکنی شعرا میں کوئی یقین نہیں ہے۔ مکتبے کے پہلے نمبر میں آپ کا کوئی مضمون نہیں ہے۔ انشاء اللہ دوسرے نمبر میں میلنزی والا مضمون آجائے گا۔ آپ مکتبہ کے لیے ضرور مضامین بھیجیے بلکہ تمام اہم مضامین اسی میں شائع ہوں تو اچھا ہے۔ فضلی کے متعلق یہاں بہت ہی ناقص مواد ہے۔ اگر آپ کو اس پر مواد مل جائے تو قلم بند کرکے مکتبہ کو بھیج دیجیے۔ اگر ضرورت ہو تو مدیر کی طرف سے بہ طور حاشیہ کچھ اضافہ کردیا جائے گا۔ فی الوقت اس

کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں کوشاں ہوں ۔ کچھ مواد ملے تو ارسالِ خدمت کروں گا ۔ چاؤش نے فتح علی گردیزی کا تذکرہ مرتب کرلیا ہے ۔ مکتبے سے اس کو شائع کرنے کا ارادہ ہے ۔ میں نے اپنے کسی گذشتہ خط میں آپ کو تذکرہ " گل زارِ ابراہیم نقل اور ایڈٹ کرنے کے لیے لکھا تھا ۔ آپ اس کی فکر کیجیے ۔ نہایت اچھی چیز ہوگی ۔ میں نے قائم چاند پوری کے متعلق کافی مواد فراہم کیا ہے ۔ اس کا قلمی دیوان اور ایک نفیس انتخاب بھی یہاں موجود ہے ۔ البتہ تذکرہ نہیں ملا ۔ اگر آپ اس کے تذکرے مخزنِ نکات کو کسی طرح نقل کراکے روانہ فرمائیں تو میں نہایت ممنونیت کے ساتھ اس کو ایڈیٹ کرسکوں گا ۔ میرا خیال اس کے انتخابِ دیوان اور تذکرہ دونوں ایڈیٹ کرنے کا ہے ۔ میرے پاس اس کی شاعری پر مفصل تبصرہ تیار ہے ۔ چاؤش نے شفیق پر نہایت کافی مواد فراہم کرلیا ہے اور انشاء اللہ اس کا تذکرہ " چمنستانِ شعرا " ایڈٹ کریں گے ۔ اگر آپ گل زارِ ابراہیم ایڈٹ کردیں تو اس طرح مکتبے سے ایک نہایت مفید اور قدیم تذکروں کا سلسلہ شائع ہوسکے گا ۔ جو یقیناً مکتبے کے مطبوعات میں سب سے زیادہ شان دار ہوگا ۔ آپ نے دکنی شعرا کے متعلق چاؤش کے موصولہ خط میں جو استفسار فرمائے ان پر غور و خوص کے بعد آئندہ ہفتہ جواب دیا جائے گا ۔ حیدرآباد میں چند ماہ سے طاعون کی شدت تھی اب بہ فضلِ خدا بالکل موقوف ہوگیا ۔ اس کی وجہ سے ہمارا امتحان ۱۲ مئی کو قرار پایا ہے ۔ آپ نے اپنے کسی سابقہ خط میں اپنی تصویر بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا ۔ جلد کوئی تصویر بھیجیے میں بے چینی سے اس کا مشتاق ہوں ۔ نیز لندن یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کا ایک نصاب اور ضروری معلومات کے کاغذ درکار ہیں ۔ آپ آسانی سے حاصل کرسکیں گے ۔ آئندہ ڈاک میں وہ بھی روانہ فرمائیے ۔

رشدی و وقار احمد صاحب یہاں نظام گزٹ ایڈٹ کررہے ہیں ۔ عمومی موضوعات اور علم و ادب کے ایسے مضامین بالکل فنی نہ ہوں بلکہ عام دل چسپی کا سامان بہم پہنچاتے ہوں اس کو بھیجا کیجیے ۔ یہاں غیر مستحق اور صاحبِ سفارش اشخاص ناجائز ذرائع سے نہ صرف حکومت کے اعلیٰ عہدوں بلکہ علمی و ادبی خدمات و انعامات حاصل کرنے میں مساعی رہا کرتے ہیں ۔ حال ہی میں ایک صاحب نے اردو لٹریچر اور بالخصوص دکنیات کی تحقیق کے لیے خوشامد و سفارش کا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یورپی وظیفہ حاصل کرنے اور اردو کے پروفیسر بننے کی عجیب مضحکہ انگیز کارروائی شروع کی ہے ۔ آپ صدر صاحب کلیہ کو اپنے خطوں میں اردو لٹریچر کے تحقیقی کام کے لیے اپنی جامعہ سے اہل گریجویٹ کے انتخاب کرنے اور اردو لٹریچر میں تحقیقی کام کی اہمیت و قدرشناسی کرنے کی طرف متوجہ کرائیے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صدر صاحب حتی المقدور مستحق اور ملکی طلبا کی حمایت کرتے ہیں لیکن اردو کی طرف ان کی توجہ جیسی چاہیے مبذول نہیں ہے اس لیے ضرورت ہے آپ ان کو توجہ دلائیے ۔

مولوی سلیم صاحب آپ کے خط کے منتظر تھے ۔ وہ چند روز سے علیل ہیں ۔ دانت خراب ہوجانے کی وجہ سے نکال ڈالے ابھی صحت یاب نہیں ہوئے ۔ بہت کم زور ہوگئے ہیں ۔ ہمارے وطنی طلبا انگلستان میں جو نمایاں کام انجام دیں اور جو ڈگریاں وقتاً فوقتاً حاصل کرتے رہیں اس کی اطلاع اپنے خطوط میں دیتے رہیے ۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسی باتیں یہاں کے اخباروں کے لوکل کالموں میں شائع ہو کر اہلِ ملک کی مسرت اور حوصلہ افزائی کے باعث ہوں ۔ فقط

خیر طلب

سید محمد قادری

<<< ۵ >>>

سید محمد قادری بی۔ اے (عثمانیہ)
بہادر منزل، گھانسی بازار،
حیدرآباد دکن۔

مورخہ ۹ / امرداد ۱۳۳۷ف (۱۴ جون ۱۹۲۸ء)

ڈیر زو۔ السلام و علیکم ___ حقیقت میں آپ کو ایک عرصے کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ اس عرصے میں آپ کے دو عنایت نامے ملے۔ دونوں کا تفصیلی جواب لکھتا ہوں۔ طاعون کی پریشانیوں سے فارغ ہوکر امتحان کی تیاری کی ور بحمدللہ امتحان بخیر خوبی سے ختم ہوگیا۔ نتیجے کا انتظار ہے۔ سال ہائے گزشتہ کے مقابلے میں اس سال پرچوں کا معیار بہت بڑھا دیا گیا ہے۔ بعض پرچے نہایت طویل اور سخت تھے۔ اردو نظم اور فارسی نثر کے پرچوں کے لیے بے حد محنت کی تھی پھر بھی ان پرچوں کی سختی ناقابلِ برداشت معلوم ہوئی۔ اس سال چار امیدوار ان میں شریک ہیں۔ ایک میں، دوسرے عبداللطیف صاحب پالونچہ والے، تیسرے قریشی صاحب اور چوتھے علی محمد خاں صاحب۔ قریشی صاحب نے میرے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ انشاء اللہ کامیاب ہوجائیں گے۔ امتحان سے فارغ ہوکر تھک گیا ہوں اور جیسی امنگ کام کرنے کی تھی کام نہیں ہورہا ہے۔ انشاء اللہ چند روز کے بعد اطمینان سے کام کروں گا۔ آج کل نہایت تکلیف بار پڑ رہا ہے۔ فکرِ معاش، ادبی کام کی امنگ کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کے خلاف اور تعلیم یافتہ گروہ کی مخالفت میں خاص دم کے خیالات سن کر طبیعت پریشان رہتی ہے۔ چند روز قبل بولیٹن میں ایک افتتاحیہ جامعہ کے خلاف نکلا تھا۔ اس کا میں نے جواب لکھا ہے جو روانہ کر رہا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ اپنی جامعہ کے مخالفین کو دنداں شکن اور مسکن جواب دینے کے لیے اپنی حد تک کوشش کروں۔ تاوقتیکہ ہمارے جامعہ کا دائرہ عمل وسیع اور اس کی اہمیت مسلم نہ ہوگی ہمارے گریجویٹ خاطر خواہ ترقی نہیں کرسکیں گے۔ مجلہ مکتبہ کے بارے میں آپ کا خط دیکھا۔ ہماری کوشش جاری ہے۔ انشاء اللہ عمدہ ثمرات مرتب ہوں گے۔

میری کتاب نے واقعی بڑا انتظار دکھایا۔ مصروفیت اور کچھ فطری سستی نے اب تک اس کا کام خراب رکھا۔ اب خدا کے فضل و کرم سے کتاب چھپ گئی ہے۔ متفرق کام ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ ہفتہ آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ آپ نے بالکل آخری وقت میں اپنا مقدمہ نہ شائع کرنے کے لیے لکھا۔ احباب سے مشورہ کیا اور بالآخر دوسرا مقدمہ لکھوایا جارہا ہے۔

آپ کے گزشتہ عنایت نامہ کے ساتھ تصویر بھی ملی۔ شکریہ۔ مگر یہ تصویر مجھے پسند نہیں آئی۔ آپ نے آسمان کو آنکھیں لگادیں اور ستارہ بینی میں مشغول ہیں۔ اہلِ دنیا کی طرف نظر نہیں۔ مہربانی کرکے کوئی دوسری تصویر زیادہ واضح بھیجیے جو میز کی زینت اور آپ کی یاد تازہ کرنے کا باعث ہو۔ بڑی چھوٹی سے بحث نہیں۔

آپ نے جن کتابوں کے نمونے بھیجے اس سے میرا کام زیادہ قابلِ قدر ہوگیا ہے۔ میں اس عنایت کا رسمی شکریہ ادا کرنا نہیں چاہتا۔ "تذکرہ قائم چاند پوری" کی نقل کرنے میں اپنا قیمتی وقت نہ دیجیے۔ پہلے آپ ڈگری لے لیں پھر اس کی طرف توجہ فرمائیے مگر بالکل بھول نہ جائیے۔ سب کی یہی رائے ہے کہ آپ اپنی ڈگری حاصل کرنے کے لیے بے حد محنت کریں۔ صدر صاحب نے ایک گفتگو

میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

مکتبے نے آپ کے لیے رسالہ اردو کی جملہ جلدیں بڑی دقت سے فراہم کی ہیں۔ اس ڈاک سے روانہ ہورہی ہیں مگر ان کی روانگی بڑی تکلیف دہ ہے۔ علی ابراہیم کے متعلق آپ کی مطلوبہ معلومات بھی مکتبہ کے پارسل میں روانہ کی جارہی ہیں۔ آپ ضرور رسالہ اردو کو مضمون بھیجیے مگر احتیاط سے کہیں لاپتہ نہ ہو جائے۔

یہاں کے حالات حسبِ سابق ہیں۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ دوست احباب سب بہ خیر وعافیت ہیں اور ہر شخص تھوڑی بہت علمی خدمت میں مشغول۔ عام حالات کے لیے رہبر کی گھر کی باتیں اور کبھی مقالہ افتتاحیہ دیکھ لیجیے۔ یہ ان کا آئینہ ہے۔ مکتبہ سے آپ کی مطلوبہ کتابیں وقتاً فوقتاً روانہ ہوتی رہتی ہیں۔ جو کتابیں منگوائیں مجھے بھی لکھ دیجیے تو تاکید کے ساتھ روانہ کروں گا۔ مولوی عمر یافعی صاحب اکثر آپ کو خط لکھتے رہتے ہیں مگر نہ معلوم کیوں آپ کو نہیں ملتے۔ میں نے چند لفافوں پر آپ کا پتہ لکھ دیا ہے۔ انشاء اللہ پابندی سے خط وصول ہوا کریں گے۔ غالباً میرا خط کافی تفصیلی ہے۔ یہاں کی فضا میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہی ہم ہیں۔ وہی حیدرآباد جو آپ کے انگلستان جانے سے قبل تھا۔ آپ اپنے ہاں کی کیفیت سنائیے۔ جو چیز آپ دریافت فرمائیں سوالات کی صورت میں ہو تو پابندی سے جواب دیا جاسکتا ہے۔

آپ کا خیر طلب

سید محمد

<<< ۹ >>>

سید محمد قادری بی۔ اے (عثمانیہ)
بہادر منزل، گھانسی بازار،
حیدرآباد دکن۔

مورخہ ۹ / خورداد ۱۳۳۷ف (۱۲ جولائی ۱۹۲۸ء)

مکرمی زور صاحب ــــ السلام و علیکم ــــ عمر یافعی صاحب کے نام آپ کا خط دیکھا آپ کا عتاب بجا ہے کہ میں نے خط لکھنے میں کوتاہی کی۔ میری صحت خراب ہوگئی تھی جس کی وجہ سے کچھ روز بالکل بے کار رہا۔ آج کل اطمینان بخش حالت نہیں ہے جس کے سبب میرا کام وقت پر نہیں ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ آپ کو جلد جلد خط لکھا کروں گا۔ مجھے یہ سن کر بھی افسوس ہوا کہ اہلِ مکتبہ نے آپ کے پاس علی ابراہیم خاں متعلق صفحات نہیں بھیجے حالاں کہ میں نے کہہ دیا تھا۔ اس خط کے ساتھ وہ کاغذ بھیج رہا ہوں۔ علی ابراہیم پر کچھ زیادہ تفصیل سے لکھنا میری بحث سے خارج تھا اس لیے مختصراً لکھا ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف صاحب نے میری کتاب، حسب ایمائے صدر صاحب مقدمہ لکھنے پر رضامندی ظاہر کی مگر اب تک لیت و لعل ہو رہی ہے اور کتاب شائع نہیں ہوئی۔ خدا جانے حیدرآبادیوں کی یہ سستی کب رفع ہو۔

میں نے امتحان ایم۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی سال السنہ اردو فارسی میں (۱) میں (۲) قریشی صاحب

(۳) عبداللطیف صاحب (۴) علی محمد صاحب شریک تھے۔ قریشی اور علی محمد خاں درجہ سوم میں پاس ہوئے۔ میں درجہ دوم۔ بد قسمتی سے لطیف صاحب فیل ہوگئے۔ رسالے کے لیے ہم ممکنہ کوشش کررہے ہیں۔ آپ اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ سروری صاحب کے خط میں لکھ کر انھیں زیادہ توجہ کرنے کے لیے لکھیے۔ قریشی صاحب کے پاس "انجمن ترقی حیدرآباد" کا ایک مراسلہ دیکھا۔ اس میں "حیدرآباد میگزین" کا ذکر بھی تھا۔ غالباً وہ شائع ہوگیا ہوگا۔ اگر ایسا ہو تو رہبر کو ایک کاپی بھجوائیے میں اس پر مفصل ریویو کرکے آپ حضرات کے کاموں کو اجاگر کرنے کا خواہش مند ہوں۔ اپنی اچھی تصویر آپ نے ابھی تک عنایت نہیں کی۔

خطوط لکھنے میں دیر ہونے کی وجہ سے مسلسل مراسلت ہو نہیں سکتی ایک چیز لکھتا ہوں دوسری بھول جاتا ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ ایسا نہ ہوگا اور ہر ہفتہ ایک خط ضرور لکھا کروں گا۔

فقط

آپ کا

سید محمد

<<< ۷ >>>

سید محمد قادری بی۔ اے (عثمانیہ)
بہادر منزل، گھانسی بازار،
حیدرآباد دکن۔

مورخہ ۲ / مہر ۱۳۳۷ف (۹ / اگست ۱۹۲۸ء)

مشفق من سلامت ___ السلام علیکم ___ امید کہ آپ خیریت عافیت سے ہوں گے۔ میں پھر ایک عرصے کی خاموشی کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ آپ بھی شاید میری اس غفلت پر ناراض ہیں۔ بھائی زور بات یہ ہے کہ میری مصروفیات کم نہیں ہوتیں۔ فرصت اور باقاعدگی کا یک جا ہونا مشکل ہوگیا ہے۔ آپ نے بھی ایک عرصے سے مجھے یاد نہیں کیا۔ میرے خط نہ لکھنے کی ایک وجہ میری کتاب کی طباعت میں دیر بھی تھی۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ جب تک کتاب ارسالِ خدمت نہ کروں خاموش رہوں گا۔ بحمداللہ آج حسبِ وعدہ سب سے پہلا نسخہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا جاتا ہے۔ نفس مضمون پر میں نے بہت کچھ مواد جمع کیا ہے اور یہ شاید دیر آید درست آید کی توجیہ پورا کردے۔ کتاب کی طباعت جیسی بری ہوئی ہے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس بارے میں مکتبہ کے پریس کی بے پروائی نے بہت دق کیا۔ میرا بہت سا قیمتی وقت اس کی نذر ہوا مگر طباعت خراب ہی رہی۔ تقریباً دو ہفتہ سے جلد بندی ہورہی ہے مگر ابھی تک صرف ایک نسخہ مل سکا ہے۔ اگر ڈاک کے وقت تک کچھ اور نسخے مل جائیں تو روانہ کرتا ہوں۔ ایک برٹش میوزیم میں دے دیجیے ایک انڈیا آفس میں۔ باقی آپ جن حضرات کو وہاں مناسب خیال فرمائیں تحفتہً مرحمت فرمائیے۔ صدر صاحب نے بعض انگریز صاحبوں کے نام بتائے تھے مگر وہ آپ کی اطلاع آنے تک ان کی کتابیں نہیں بھیجوں گا۔ آپ ان کے ناموں سے مطلع فرمائیں تو میں دیگر حضرات کو کتابیں روانہ کروں گا۔

کتاب کا ذکر ختم کر کے میرے حالات سنیے۔ کوئی بیس روز ہوئے کہ میں مولوی غلام قادر صاحب کی سعی سے سٹی کالج میں ملازم ہوگیا۔ فی الوقت ۔ تا۔ پر تقرر ہوا ہے۔ انشاء اللہ ترقی ہوجائے گی۔ ابتدائی گریڈ مکان کے اس قدر قریب مل گیا یہی غنیمت ہے۔ آپ نے میرے خطوط کے کئی سوال حل نہیں فرمائے ذرا ان کی طرف توجہ کیجیے۔ آپ کیا کر رہے ہیں کچھ خبر نہیں۔

یہ خبر سن کر آپ یقیناً نہایت رنج و افسوس کریں گے کہ ہمارے محترم استاد مولوی سلیم صاحب نے ۱۹ جولائی کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ خدا مغفرت نصیب کرے۔ ان کی وفات سے اردو کو اور بالخصوص جامعہ عثمانیہ کو موجودہ حالات کے پیشِ نظر نہایت ناقابلِ برداشت نقصان پہنچا۔ اس وقت کوئی بہ مشکل ان کا جانشین مل سکے گا۔ مولوی صاحب کا دم غنیمت تھا۔ کاش چند سال اور زندہ رہتے اور کچھ زیادہ اہلِ قلم ان کی تعلیم و تربیت سے ملک میں پیدا ہوجاتے۔ رانچی کو علاج کے لیے گئے وہاں سے لکھنو آئے اور ملیح آباد میں اپنے کسی دوست کے مکان میں وفات پائی۔ افسوس ہوا کہ مولوی صاحب کو اپنے شاگردوں کا کی ترقیوں اور اعلیٰ کارناموں کے دیکھنے کا کچھ موقع نہ ملا۔ حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد۔ میری بدنصیبی دیکھیے گا۔ اپنی کتاب ان کی حیات میں شائع نہ کرسکا۔ سنا ہے مولوی سید سجاد صاحب، جوش اور ہوش بلگرامی ان کی جگہ کے لیے کوشاں ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ موجودہ امیدواروں میں سے کوئی ان کا مناسب جانشین ہوسکے گا۔ مولوی صاحب نے بلدہ سے روانہ ہونے سے چند روز قبل میرے سامنے ہی جو مایوسانہ گفتگو اپنی صحت کی بابت کی تھی وہ سراپا درد و تصویر درد تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس حسرت کے ساتھ انھوں نے مجھ سے فرمایا۔ میں لوگوں کو چلتے پھرتے دیکھتا ہوں تو حیرت معلوم ہوتی ہے۔ لوگ کھاتے پیتے، میں نہیں کھاسکتا۔ افسوس زندگی مستعار رہے" یہ الفاظ ان کی زبان (سے) اس طرح نکلے تھے کہ میں اس کا اثر اپنے میں اب تک پاتا ہوں اور جب کبھی ان کا خیال آتا ہے وہ حسرت بھری تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے۔ انتہائی رنج ہے کہ ایسا استاد اٹھ گیا۔ اگر چہ ان کی ضعیفی سے کوئی توقع نہیں تھی کہ کچھ کرسکتے مگر ان کی ولولہ انگیز گفتگو نوجوانوں کو برتانے کے لیے کیا کم تھی۔ خدا تعالیٰ سے خلوصِ دل سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ یقین مانیے کہ اس تحریر کے لکھتے وقت میرے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔ میرا قلم نہیں لکھ سکتا مجھے مولوی صاحب کے انتقال سے کیا صدمہ پہنچا۔ آج جامعہ عثمانیہ میں شعبہ ٔ اردو کی سقیم حالت اور بھی میرے رنج میں اضافہ کرتی ہے۔ خدا کرے کہ ان کا لائق جانشین ملے کہ شعبہ ترقی کرے اور مولوی صاحب کی آبیاری تخم ریزی سے اصطلاحاتِ علمیہ اردو میں منتقل کرنے کی جو اچھی بنیاد پڑ چکی ہے وہ ترقی کر جائے۔

فقط

سید محمد

سید محمد قادری ایم۔اے (عثمانیہ)
رحمن کالج، گھانسی بازار،
حیدرآباد دکن۔

۲۷ ستمبر ۱۹۲۸ء

مکرمی زور صاحب ــــ السلام علیکم ــــ گذشتہ تین ہفتے سے آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کرتا رہا مگر نہ لکھ سکا۔ آج ڈاک جانے کا روز ہے۔ تنگیِ وقت کے ساتھ ایک ساتھ تین عنایت ناموں کے جواب بھیج رہا ہوں۔ آپ کے تینوں عنایت نامے پیشِ نظر ہیں ایک ایک کا تفصیلی جواب لکھ دیتا ہوں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی ایک سال کے لیے توسیع ہو گئی ہے اس لیے انجمن ترقی اردو کا دفتر منتقل نہیں ہوا۔ میں سٹی کالج میں کارگزار ہوں۔ مولانا سلیم صاحب کی جگہ کے لیے عام درخواستیں طلب کی جارہی ہیں اس طرح کوئی نہ کوئی باہر کا شخص اس جگہ پر مامور ہوگا۔ سروری صاحب کو قاری حکیم اللہ صاحب کی جگہ مل جائے گی۔ میں اس وقت کوئی درخواست دینا چاہتا ہوں سروری صاحب کی محفوظ جگہ کو کسی خطرے میں ڈالنا مناسب نہیں۔ سنا کہ مولانا سلیم صاحب کا تمام علمی سرمایہ مولوی عبدالحق صاحب اورنگ آباد لے گئے اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے ان کی اشاعت وغیرہ ہوگی۔ آپ نے جن پروفیسروں کے نام لکھے ہیں ان کے لیے میں آپ کے توسط ہی (سے) کتابیں بھیجوں گا۔ آپ کو اس وقت جو کتابیں وصول ہوئی ہیں ان میں سے اپنی کتاب کی سوا اگر آپ چاہیں تو انھیں دے دیجیے۔ بہ ہرحال آپ کا خط وصول ہونے پر میں اپنی کتابیں روانہ کروں گا۔ پیرس میں اردو مخطوطات کی نسبت آپ نے جو انکشاف کیا ہے اس کو مکتبہ کے لیے سروری صاحب کے ہاں بھیج دیجیے۔ مکتبے کے لیے اعلیٰ مضامین کی ضرورت ہے۔ آپ کے مفید مشورے ہر پرچے کی نسبت بھیجتے جائیے تاکہ ہم اپنے پرچے کو روز بہ روز بہتر بنائیں۔

آپ نے اپنی اور دیگر مناظر کی جو تصویریں بھیجیں مجھے وصول ہوئیں میرا شکریہ قبول فرمائیے۔ مجھے آثارِ قدیمہ اور لطیف مناظر کی تصویروں سے جو دل چسپی ہے آپ کو معلوم ہے۔ ضرور اپنی تصاویر مرحمت فرمائیے۔ آپ نے اپنا مقدمہ واپس طلب فرمایا ہے۔ اس وقت ڈاک کا وقت تنگ ہے آئندہ خط کے ساتھ روانہ کروں گا۔

آپ مولوی سلیم کی جگہ کے لیے ایک دخواست لکھ کر بھیجیے اور ضرور بھیجیے۔ صدر صاحب کو خاص طور پر آپ کے لیے تائید کرنے پر آمادہ کرائیے تاکہ آپ کے لیے یہ جگہ محفوظ ہو جائے۔

آپ نے مولوی سید محمد اعظم کے لیے جو مشورہ میری نسبت دیا ہے اس کا ممنون ہوں۔ رسالے کے متعلق مجھ سے براہ راست تو اس وقت تک کوئی گفتگو نہیں ہوئی لیکن مولوی غلام قادر صاب نے اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں حتی الامکان عمدگی سے انجام دوں گا۔ آپ رہبر کے پرچے ہر ہفتہ ملاحظہ کرتے ہوں گے اس لیے میں واقعات بلدہ پر کچھ نہیں لکھتا۔ آپ کی شکایت یہی ہے کہ میرے خط تفصیلی نہیں ہوتے انشاء اللہ آپ دوسرا خط کافی تفصیلی پائیں گے۔ سب دوست احباب بخیریت ہیں اور سلام کہتے ہیں۔ چاؤش

صاحب آئندہ ہفتہ خط لکھیں گے۔ مظفر بیگ صاحب ایک کتاب "پنجاب میں اردو" مولوی محمود شیرانی کی آپ کو بھیج دیں گے۔ لیکن عظمت اللہ خاں کا مجموعہ نثر و نظم ابھی شائع نہیں ہوا۔ برٹش میوزیم کے ذخیرہ، تصاویر سے یزدانی صاحب نے قطب شاہی بادشاہوں کی تصویریں حاصل کر کے ان کے بلاک بنالیے۔ اگر آپ کو دکن کے مشاہیر ملیں قدیم تصاویر ملیں تو آپ ان کی تصاویر بنائیے اور یہاں بھیج دیجیے ہم بلاک بنا کر مکتبہ میں شائع کریں گے۔ فقط

خیر طلب

سید محمد

<<< ۹ >>>

سید محمد قادری ایم۔ اے (عثمانیہ)
بہادر منزل، گھانسی بازار،
حیدرآباد دکن۔

۲۴ / اکتوبر ۱۹۲۸ء

مکرمی زور صاحب ___ السلام و علیکم ___ اس ہفتہ آپ کا گرامی نامہ موسومہ مولوی عمر یافعی صاحب میری نظر سے گزرا۔ اس میں میرے بروقت خط نہ لکھنے کا آپ نے ذکر فرمایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ہر خط میں دیر سے خط لکھنے کا عذر کرتے رہتا ہوں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہاں سے جمعہ کی صبح کو ڈاک روانہ ہوتی ہے۔ جمعرات آپ لو خط لکھنے کا دن ہے۔ اور اسی روز "مکتبہ" کی کمیٹی مقرر ہوجاتی ہے اور کئی ہفتے اس طرح گزر جاتے ہیں۔ اب میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ بدھ کے دن خط لکھا کروں۔ انشاء اللہ آپ کو میری طرف سے کوئی شکایت باقی نہیں رہے گی۔ اس مہینے آپ کے دو عنایت نامے مجھے وصول ہوئے جن کے جواب تو میں نے بروقت ارسال کردیے اس کے بعد کوئی خط نہیں ملا یا تو ڈاک والوں نے خط پہنچانے میں غلطی کی یا آپ ہی نے مجھے مخاطب نہ فرمایا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ قاری کلیم اللہ صاحب بھی انگلستان گئے ہیں۔ یہاں اس وقت دو جائدادیں تقرر طلب ہیں اور درخواستیں کچھ عجیب گول مول طریقے پر لی گئی ہیں۔ قاری صاحب کی جگہ سروری صاحب منصرمانہ کارگزار ہیں اور وہ جگہ انہی کو ملنی چاہیے مگر عام طور پر درخواستیں طلب کی گئیں۔ میں نے اپنے لیے ہرگز مناسب نہیں سمجھا کہ سروری صاحب کے مستحق ہوتے ہوئے خواہ مخواہ اپنی درخواست پیش کر کے کارروائی خراب کروں اور اس محلے میں غیر ملکی امیدوار اپنے اثرات سے بازی لے جائے۔ حسنِ اتفاق سے میرا تقرر سٹی کالج میں ہوگیا اور میں اس پر قانع ہوں۔ انشاء اللہ بروقت ترقی ہوجائے گی۔ سروری صاحب کے ساتھ وقار احمد صاحب، لطیف احمد صاحب، قریشی صاحب، صدیق جائسی وغیرہ اس جگہ کے امیدوار ہیں۔ سلیم صاحب کی جگہ کے لیے سجاد صاحب پوری کوشش کر رہے ہوں گے۔ شمالی ہند سے بھی سنا ہے کہ کئی درخواستیں آئی ہیں۔ اچھا ہوا کہ آپ کی درخواست بھی آگئی اور غالباً آپ نے انگلستان کے پروفیسروں سے اپنے متعلق عمدہ رائیں بھی اس کے ساتھ منسلک کردی ہوں گی۔ عمر یافعی صاحب کو جو نقل تصدیق پروفیسر ہیلی بھیجی ہے وہ میں نے دیکھی۔ میں نے ایڈیٹر صاحب رہبرِ دکن سے آپ کی تائید کرنے کے لیے گفتگو کی ہے اور یہ تصدیق

مع دیگر آرا متعلقہ روحِ تنقید کو پیش کر کے آپ کی تائید میں انشاء اللہ اس ہفتہ ایک ایڈیٹوریل شائع ہوگا ۔ اس میں سرسری طور پر دوسرے امیدواروں کا ذکر کر کے آپ کو مدلل طریقہ پر مرجح بتایا جائے گا ۔ نیز مشیرِ دکن اور صبح دکن نے عبداللہ عمادی صاحب اور عبدالحق صاحب کے لیے جو رائیں لکھی ہیں اس کی تنقیص بھی کی جائے گی ۔ صدر صاحب سروری صاحب کے لیے کافی کوشش فرما رہے ہیں ۔ اور انشاء اللہ آپ کے لیے بھی وہ ضرور کوشش کریں گے ۔ خدا کرے کہ انھیں اس میں کامیابی حاصل ہو ۔

میں نے سابق خط میں برٹش میوزیم سے شعرائے دکن کی تصاویر لینے کے لیے لکھا تھا ۔ آپ اس کی ضرور کوشش فرمائیے ۔ آج ہی مکتبہ کا ساتواں نمبر شائع ہوا اس میں مولوی سلیم صاحب اور عزیزیار جنگ کی تصاویر ہیں ۔ ہم نے نوری صاحب ، شائق صاحب ، مائل صاحب کی تصاویر تیار کرلی ہیں اور دیگر مشاہیر شعرا و امرائے دکن کی تصاویر کی فراہمی میں کوشاں ہیں ۔ ہندستان کے دوسرے رسائل بھی اب اس طرف مائل نظر آتے ہیں اور ان میں بھی تاریخی شخصیتوں اور ادیبوں کی تصاویر خوب نکل رہی ہیں ۔ اگر آپ کی توجہ سے مکتبہ میں قدیم شعرائے دکن کی تصاویر شائع ہوجائیں تو رسالے کا پایہ بہت بلند ہوجائے گا ۔ مضامین کی نسبت بھی ہم کافی توجہ اور کوشش کر رہے ہیں ۔ روز بہ روز پرچہ کو بہتر بنانا ہمارے پیشِ نظر ہے اور ہم اپنے اس فرض سے کسی طرح غفلت نہیں برتتے ۔ آپ نے مکتبے کے لیے جو مضمون بھیجا ہے وہ دوسری اشاعت میں چھپ جائے گا ۔ آپ کی مساعی اور وطن دوستی کے جذبات سے میں بے حد مسرور ہوں ۔ انشاء اللہ آپ کے حیدرآباد آجانے پر یہاں بھی نوجوانوں میں یہی جوش پیدا ہوجائے گا ۔ فقط

آپ کا

سید محمد

<<< ۱۰ >>>

سید محمد قادری بی ۔ اے (عثمانیہ)

بہادر منزل ، گھانسی بازار ،   ۸ / نومبر ۱۹۲۸ء

حیدرآباد دکن ۔

ڈیر زور صاحب ــــ السلام و علیکم ــــ گذشتہ دو ہفتے سے آپ کا کوئی عنایت نامہ نہیں ملا ۔ میں نے پیوستہ ہفتہ ایک خط لکھا تھا ۔ گذشتہ جمعرات کو ڈاک کا دن تھا لیکن اس روز یہاں " تعلیمی کانفرنس رعایائے حیدرآباد " کے اجلاس شروع ہوئی ۔ یہ کانفرنس یہاں کے ہندوؤں نے قدیم حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے علی الرغم قائم کی ہے ۔ میرا اس میں شریک ہونا ضروری تھا ۔ اس لیے وہاں چلا گیا ۔ اس کانفرنس کا حال مختصراً یہ ہے کہ صدارت کے لیے یو ۔ پی سے ایک مہاراج پنڈت ہردیانند کنورو کو بلایا گیا ۔ اس میں بعض قرار دادیں عثمانیہ یونیورسٹی کے خلاف پاس ہوئیں ۔ بعض مطالبے بجا بھی تھے ۔ رہبر میں اس کی تفصیل رپورٹ شائع کرادی گئی ۔ بعدازاں بعد اس پر تبصرہ شروع ہوا جو ہنوز جاری ہے ۔ یہ معاملہ نہایت نازک ہے ۔ حیدرآباد کے ہندوؤں میں بیداری پیدا ہوچلی ہے ۔ وہ حقوق حقوق کی فریاد کررہے ہیں ۔ رہبر نے اس پر کافی بحث مباحثہ کیا اور کر رہا ہے ۔ خدا حیدرآباد کو فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضا سے محفوظ رکھے ۔ چند روز پہلے نانڈیڑ میں ہندو مسلم فساد ہوا جس کی تحقیقات ہورہی ہیں ۔ آپ کی

نسبت جو مضمون رہبر میں آپ نے لکھا ہے وہ میں نے بھی لکھا مگر اس میں صرف آپ کے محاسن بیان ہوئے ایسے مضمون سے کھلا پروپاگینڈہ سمجھتے ہیں اس لیے ایڈیٹر صاحب کی رائے سے قرار پایا کہ ایک دو اور امیدواروں کے محاسن بھی بیان (کرکے) آپ کو بالآخر ترجیح دی جائے۔ اس وقت خود عثمانیہ یونیورسٹی کے خلاف مضامین کے جواب بھی دینے ہیں اس لیے اب تک آپ کے متعلق مضمون شائع نہ ہوسکا۔ انشاء اللہ قریب میں شائع ہوجائے گا اور عمدگی کے ساتھ۔

آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ گذشتہ جمعرات کو اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی دہلی روانہ ہوئے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہوسکا آپ کا سفر بالکل غیر سیاسی اور تفریحی ہے۔ دہلی میں آپ نے وائسرائے بہادر کے ہاں دعوتیں کھائیں اپنے ہی قصر میں قیام ہے۔ یہ قصر حال ہی میں کئی لاکھ روپیہ کی مصارف سے تیار ہوا ہے۔ رہبر نے پہلے سے بذریعہ تار خبریں منگوانے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ تازہ ترین تاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کل جمعہ کی نماز دہلی کی جامع مسجد میں ادا فرمائیں گے۔ ایک روز وائسرائے بہادر قصر شاہی میں آئے اور چائے پی۔ اعلیٰ حضرت نے عمائد و روسا۔ دہلی کو بھی چائے نوش کی دعوت دی۔ ایک جوہری کی دوکان سے کئی ہزار کے اشیائے طلائی خرید فرمائیں۔ دہلی میں (سنا ہے کہ) آپ کا قیام ۲۰ / نومبر تک ہوگا۔ میں سٹی کالج میں کارگزار ہوں۔ سکنڈ فارم اور عثمانیہ میٹرک کی اردو اور ترجمہ میرے ذمے ہے۔ یہاں سے اجرائی رسالہ کی کوئی کارروائی ہنوز نہیں ہوئی۔ آج کل اخبار کا کام میرے لیے کسی قدر تکلیف دہ ہوگیا ہے۔ دوسرے ادبی کام اور مضمون نویسی کی فرصت نہیں ملتی۔ ارادہ ہے کہ چند روز میں روزانہ کا کام ترک کردوں۔ آج رسالہ اردو وصول ہوا۔ اس میں آپ کا مضمون تذکرہ۔ گلزار ابراہیم۔ میری کتاب پہ تنقید بھی چھپی ہے۔ عبدالحق صاحب کے پرانے اسٹائل میں۔ خیر زیادہ بری نہیں۔ آپ نے مکتبہ کے لیے ابھی تک تصویریں نہیں بھیجیں۔ توجہ فرمائیے۔

میں نے چند روز قبل یہاں ایک اخبار "لندن لائف" کے دو ماہ کے پرچے اکٹھے خریدے۔ اس میں کچھ افسانے ہیں لیکن زیادہ دلچسپ نہیں۔ انگلستان سے جو رسالے افسانوں کے لیے شائع ہوتے ہیں ان میں سے کسی ایک بہترین رسالے کا انتخاب کر کے بہ طور نمونہ ایک پرچہ مجھے روانہ فرمائیے۔ نیز قیمت بھی لکھیے تاکہ سال بھر کے لیے جاری کرالوں۔

قاری کلیم اللہ صاحب کی جگہ منصرمانہ تقرر کے لیے قریشی صاحب، وقار صاحب، لطیف احمد صاحب اور صدق جائسی کا امتحانی مقابلہ ہوا۔ اول الذکر دونوں بالکل ثابت ہوے اور اچھی طرح پڑھا نہ سکے۔ لطیف احمد صاحب نے فارسی اردو ٹھیک پڑھائی۔ صدق جائسی کی تائید میں سید سجاد صاحب اور عبدالحق صاحب نے زور لاکر انھیں بھی پاس کردیا۔ ابھی تصفیہ نہیں ہوا لیکن قرائن لطیف احمد صاحب کے تقرر کے ہیں۔ سروری صاحب تمام امتحانات سے مستثنیٰ ہوگئے اور قرار پایا کہ جو سلسلہ منصری زیادہ طویل ہے ان کو دیا جائے۔ حیدرآباد کا یہ حال ہے۔ آپ انگلستان (کے بارے) میں اپنے خیالات کا بیان فرمائیے۔

آپ کا

سید محمد

محمد اسلم



مجتبیٰ حسین ـــ سوانحی حالات

مجتبیٰ حسین ۱۵ / جولائی ۱۹۳۶ء کو موجودہ ریاست کرناٹک کے ضلع گلبرگہ کی تحصیل چنچولی میں پیدا ہوئے لیکن ان کے تعلیمی صداقت نامے میں تاریخ پیدائش ۱۵ / جولائی ۱۹۳۳ء درج ہے جو غلط ہے۔ ان کے والد محترم مولوی احمد حسین ضلع عثمان آباد کے رہنے والے تھے اور وہ تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔ مولوی احمد حسین ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ مجتبیٰ حسین کو ادب سے یہ لگاؤ ورثے میں ملا ہے۔ ان کے دو بڑے بھائی محبوب حسین جگر مرحوم، جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" حیدرآباد اور جناب ابراہیم جلیس (مرحوم) اردو دنیا کی اہم شخصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ موجودہ اردو صحافت کو ایک نیا آہنگ اور اعتبار عطا کرنے میں محبوب حسین جگر کی کوششوں کو بڑا دخل رہا ہے۔ انھوں نے ۱۹۴۹ء میں جناب عابد علی خاں کی رفاقت میں روزنامہ "سیاست" کے اجرا کے ذریعے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ لگ بھگ پچھلے پانچ دہوں میں جناب محبوب حسین جگر نے سینکڑوں صحافیوں اور ادیبوں کی ذہنی تربیت کی جن میں مجتبیٰ حسین بھی شامل ہیں۔ وہ حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں رہے ہیں۔

ابراہیم جلیس ان کے دوسرے بڑے بھائی ہیں۔ ابراہیم جلیس نے برِ صغیر ہند و پاک کے صفِ اول کے افسانہ نگار اور طنز نگار کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ابراہیم جلیس ان گنے چنے ادیبوں میں سے ہیں جنھیں نہایت کم عمری میں بے پناہ شہرت ملی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے اور وہاں بھی انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔

اس خاندانی منظر میں مجتبیٰ حسین کا ادب سے لگاؤ ایک فطری بات نظر آتی ہے۔ ملک کی تقسیم اور سابق ریاست حیدرآباد کے خاتمہ کے وقت وہ آٹھویں جماعت کے طالبِ علم تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گلبرگہ میں ہوئی۔ اپنی طالبِ علمی کا زیادہ عرصہ انھوں نے ہوسٹلوں میں ہی گزارا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ دوستوں کے رسیا ہیں اور اپنا زیادہ وقت دوستوں کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۵۲ء میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا۔ وہ گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج کی بزم اردو کے جنرل سکریٹری بھی رہے اور ۱۹۵۲ء میں گلبرگہ میں ایک تاریخی مشاعرہ بھی منعقد کیا جس میں مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، جگن ناتھ آزاد، سلیمان اریب اور شاہد صدیقی وغیرہ جیسے اہم شاعروں نے شرکت کی تھی۔ مجتبیٰ حسین نے گلبرگہ کے زمانہ طالبِ علمی میں تہذیبی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خاص طور پر ایک اداکار اور گلوکار کی حیثیت سے کالج کے طلباء میں بے حد مقبول رہے۔ خواجہ احمد عباس کے ڈرامے "یہ امرت ہے" میں انھوں نے مزدور کا کلیدی رول ادا کیا تھا اور انعامِ اول کے مستحق قرار پائے۔ ۱۹۵۲ء میں گریجویشن کی تکمیل کے لیے حیدرآباد آ گئے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں داخلہ لے لیا۔ گو کہ وہ گلبرگہ سے حیدرآباد آئے تھے۔ لیکن پھر بھی بہت جلد آرٹس کالج میں ان کا حلقہ احباب بہت وسیع ہو گیا اور وہ بزمِ ادب کے انتخابات میں جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ اس طرح اس وقت کے آرٹس کالج کی ادبی و تہذیبی زندگی میں مجتبیٰ حسین نے بہت اہم رول ادا کیا۔ گریجویشن کی تکمیل کے

۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں ان کی شادی اپنی چچازاد بہن ناصرہ رئیس کے ساتھ ہوئی۔ اسی دوران انھوں نے ایوننگ کالج سے ڈپلوما ان پبلک ڈمنسٹریشن کا امتحان بھی کامیاب کیا۔ اسی سال وہ روزنامہ "سیاست" سے وابستہ ہوگئے۔

لکھنے پڑھنے کا آغاز انھوں نے صحافت سے کیا اور سخت جاں فشانی کے ساتھ صحافت کے پیشے کو اپنایا۔ صحافت کے میدان ں ان کی تربیت ان کے بڑے بھائی جناب محبوب حسین جگر کے ہاتھوں ہوئی۔ تقریباً سات برسوں تک وہ صحافی کی حیثیت سے نے اور پہچانے جاتے رہے۔ اکتیس جولائی ۱۹۶۲ء کو روزنامہ "سیاست" کے مشہور کالم نگار شاہد صدیقی کا انتقال ہوا تو "سیاست" کے نظامیہ کو ایک ایسے ادیب کی ضرورت لاحق ہوئی جو اخبار کا طنزیہ کالم لکھ سکے۔ شاہد صدیقی اپنے وقت کے بے حد مقبول کالم نویس ۔ بالآخر قرعہ فال مجتبیٰ حسین کے نام نکلا اور ۱۲/اگست ۱۹۶۲ء کو صبح جب وہ اپنے دفتر پہنچے تو محبوب حسین جگر نے حکم دیا کہ وہ سی دن کا مزاحیہ کالم لکھیں۔ یہیں سے مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کالم میں ان کا فرضی نام "کوہ پیما" تھا۔ بیٰ حسین کا کالم دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہوتا چلا گیا اور نہ صرف ہندستان بلکہ پاکستان کے اخبارات میں بھی نقل کیا جانے لگا۔ مولانا بدالماجد دریابادی جیسے صاحب طرز ادیب اور عالم نے اپنے اخبار "صدقِ جدید" میں ان کے کالم کی تعریف کی تھی۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے اصلی نام کے ساتھ پہلا مزاحیہ مضمون "ہم طرف دار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں" ۱۹۶۳ء میں لکھا۔ جسے ی حلقوں نے بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد سے آج تک انھوں نے مزاح نگاری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ ۱۹۶۶ء کے اوائل میں ں کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ ہندستان کے سارے اردو مزاح نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ ان کے قریبی ست حنیظ قیصر نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں پوری مدد کی۔ اس طرح زندہ دلانِ حیدرآباد کے بینر تلے ۱۳/۱۴/۱۵/مئی ۱۹۶۶ء حیدرآباد میں اردو کے مزاح نگاروں کی وہ تاریخی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی۔ جسے آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین اس فرنس کے جنرل سکریٹری اور بھارت چند کھنہ اس کے صدر تھے۔ برِ صغیر ہند و پاک کی تاریخ میں مزاح نگاروں کا اس سے بڑا تماع کبھی منعقد نہیں ہوا تھا۔ کرشن چندر نے اس کانفرنس کی صدارت کی تھی اور مخدوم محی الدین نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ اتنے ے پیمانے پر نثری ادب کو اسٹیج پر پیش کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ہزاروں سامعین نے دو دنوں تک نہایت ذوق و شوق کے ساتھ حیہ مضامین کو سنا۔ اس کانفرنس میں مجتبیٰ حسین نہ صرف ایک کامیاب منتظم کے روپ میں ابھر کر سامنے آئے بلکہ ایک کامیاب ح نگار کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت عام ہوئی۔ کانفرنس کے نثری اجلاسوں میں ان کا ہر مضمون قہقہوں اور تالیوں کی گونج میں گیا۔ اس کانفرنس کے باعث آنجہانی کرشن چندر سے ان کا وہ گہرا ربط استوار ہوا جو کرشن چندر کے مرنے تک برقرار رہا۔ اس فرنس کی کامیابی کے بعد مجتبیٰ حسین نے انجانے طور پر مزاح کو ایک تحریک کی شکل دے دی۔ ہندستان کے کئی شہروں میں اس ح کے اجتماعات منعقد ہونے لگے اور دوسری زبانیں بھی اس سے متاثر ہوئیں۔ مجتبیٰ حسین سات برس تک زندہ دلانِ حیدرآباد کے ل سکریٹری رہے اور آج بھی زندہ دلانِ حیدرآباد کی ساری سرگرمیوں سے ان کا ربط قائم ہے۔ ۱۹۶۸ء میں بمبئی کی تنظیم "سر ر سمبد" نے حیدرآباد کے تجربے کی تقلید میں طنز و مزاح کا ایک اہم پروگرام "قہقہہ" کے عنوان سے آراستہ کیا۔ مجتبیٰ حسین اس میں رکت کے لیے گئے تو ہندی کے کئی مشہور ادیبوں کو انھیں سننے کا موقع ملا۔ ہندی کے ادیب اور صحافی کنھیالال نندن اور ممتاز ادیب ہندی رسالہ "دھرم یگ" کے ایڈیٹر ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی نے سیدھی سادی زبان میں لکھے گئے ان کے مضامین کو بے حد پسند کیا اپنے رسالہ میں لگاتار کئی برسوں تک انھیں چھاپتے رہے اور اس طرح ہندستان کی دیگر زبانوں میں انھیں منتقل کیا جانے لگا۔

مجتبیٰ حسین ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء تک حکومت آندھرا پردیش کے محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ سے بھی وابستہ رہے۔ حکومت ہند نے جب اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے "گجرال کمیٹی" تشکیل دی تو انھیں اس کمیٹی کے شعبہ ریسرچ میں کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ ۱۰ / نومبر ۱۹۷۲ء کو مجتبیٰ حسین اپنی نئی خدمت کا جائزہ حاصل کرنے کی غرض سے دلی گئے اور تب سے دلی میں مقیم ہیں۔ کمیٹی کا جب کام ختم ہوا تو وہ ۱۹ / ستمبر ۱۹۷۴ء کو نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ سے وابستہ ہوگئے۔ بہ حیثیت ایڈیٹر خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۹۲ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہوئے۔ مجتبیٰ حسین نے دلی میں بھی طنز و مزاح کی محفلوں کے انعقاد کی طرف توجہ کی۔ ۱۹۷۳ء میں انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم اور سمدرا جوشی کے رسالے "سیکولر ڈیموکریسی" کے تعاون سے لال قلعہ کے میدان میں ایک کل ہند مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد بھی کیا۔ جسے لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے کئی مزاحیہ شعرا اسی مشاعرے کے ذریعے شمال میں روشناس ہوئے اور مقبولیت حاصل کی۔

اکتوبر ۱۹۸۰ء میں ٹوکیو میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی جانب سے طباعت و اشاعت کے موضوع پر ایک سمینار اور ورک شاپ میں شرکت کے لیے ہندستان سے کسی ایک نمائندہ کو روانہ کرنے کی دعوت دی گئی تو اس سمینار کے لیے مجتبیٰ حسین کا انتخاب عمل میں آیا۔ یونیسکو کی دعوت پر انھوں نے لگ بھگ سوا مہینے تک جاپان کا دورہ کیا۔ ٹوکیو کی یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات نے ان کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی تقریب کا بھی اہتمام کیا۔ جاپان کے اس کامیاب دورے کی روداد انھوں نے اپنے دل چسپ سفر نامے "جاپان چلو، جاپان چلو" میں بیان کی ہے۔ ان کا یہ پہلا بیرونی دورہ تھا۔ ۱۹۸۴ء میں وہ "اردو مجلس" برطانیہ کی دعوت پر انگلستان گئے جہاں ان کے اعزاز میں کئی ادبی محفلیں آراستہ کی گئیں۔ برطانیہ کے مختلف شہروں کا دورہ کرنے کے علاوہ وہ ایک ہفتے کے لیے پیرس بھی گئے۔ یورپ میں ایک مہینہ کے قیام کے بعد وہ امریکہ چلے گئے جہاں ان کے اعزاز میں واشنگٹن، شکاگو اور ڈیٹرائٹ میں کئی ادبی محفلیں آراستہ کی گئیں۔ بعد میں انھوں نے کینیڈا کا بھی دورہ کیا۔

ستمبر ۱۹۸۹ء میں روس ہند دوستی کی انجمن کی دعوت پر اردو ادیبوں کے دو رکنی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے وہ سابق سوویت یونین کے دورے پر گئے۔ سوویت یونین کے دورے میں وہ تاشقند، سمرقند، بخارا، لینن گراڈ اور ماسکو گئے۔ سوویت یونین میں انھوں نے کئی روسی ادیبوں اور اردو اسکالروں سے ملاقاتیں کیں۔ ۱۹۸۸ء میں پاکستان اور ۱۹۸۹ء میں سعودی عرب بھی گئے بعد میں وہ مسقط کے علاوہ ۱۹۹۷ء میں دوبئی گئے جہاں "جشن مجتبیٰ حسین" منایا گیا۔

جہاں تک اعزاز کا تعلق ہے یہ بات قابلِ غور ہے کہ مجتبیٰ حسین کو پہلا اعزاز کسی اردو تنظیم کی طرف سے نہیں بلکہ اڑیا زبان کے ادیبوں کی تنظیم "سرس ساہتیہ سمیتی" کی جانب سے دیا گیا۔ اس تنظیم نے ۱۹۸۰ء میں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ اڑیا زبان میں شائع کیا اور انھیں بہ طور خاص کٹک بلوا کر ایک خصوصی تقریب میں "ہاسیہ رتن" کے خطاب سے بھی نوازا۔ انھیں یہ اعزاز ہندستانی ادب میں طنز و مزاح کے فروغ کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا گیا۔ مجتبیٰ حسین کی تقریباً ساری تخلیقات ہندی میں چھپ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی دیگر ہندستانی زبانوں میں ان کے ترجمے ہوچکے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں ان کے سفر نامے "جاپان چلو، جاپان چلو" کا جاپانی میں ترجمہ شائع ہوا۔ جسے جاپان کے ادبی حلقوں نے بے حد سراہا۔ اس سفرنامے کا ترجمہ جاپان کی مشہور اردو اسکالر مسز شاشورے نے کیا۔

۱۹۸۴ء میں دلی کے غالب انسٹی ٹیوٹ نے جب طنز و مزاح کے لیے بھی غالب انعام دینے کا فیصلہ کیا تو اس سلسلے کا پہلا انعام

مجتبیٰ حسین کو دیا گیا۔

دلی کی ایک ادبی تنظیم بزمِ ساز و ادب نے ۱۹۸۲ء میں انھیں "نشانِ امتیاز" سے نوازا۔

۱۹۸۸ء میں پہلی "پاک ہند طنز و مزاح کانفرنس" میں بہ حیثیت مہمان خصوصی مدعو کیے گئے جہاں انھوں نے کراچی، لاہور اور راولپنڈی کی متعدد ادبی انجمنوں میں اظہار خیال کیا اور مضامین سنائے۔

۱۹۸۹ء میں بزم اردو جدہ (سعودی عرب) کی دعوت پر ہند پاک طنز و مزاح کانفرنس میں بہ حیثیت صدر شرکت کی اور مکہ و مدینہ کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔

۱۹۸۹ء میں اردو اکیڈمی دلی نے تخلیقی ادب کے لیے اپنا سب سے بڑا ایوارڈ عطا کیا۔

۱۹۹۴ء میں اردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے پہلا کل ہند طنز و مزاح ایوارڈ عطا کیا جو مخدوم محی الدین سے منسوب ہے۔

ان اعزازات کے علاوہ ان کی ساری تصانیف کو ہندستان کی تمام اردو اکیڈمیوں نے انعامات عطا کیے۔

۱۹۹۵ء میں "آل انڈیا رائٹر کانفرنس" نے انھیں بہ حیثیت مہمان خصوصی مدعو کیا۔

۱۹۹۹ء میں ہریانہ اردو اکیڈمی کا "کل ہند ایوارڈ برائے طنز و مزاح" دیا گیا۔

مجتبیٰ حسین کی چار اولادیں ہیں۔ بڑی لڑکی راشدہ گلبرگہ میں تاریخ کی لکچرر ہیں۔ بڑے داماد غلام صمدانی الکٹریکل انجینیر ہیں اور گلبرگہ میں مقیم ہیں۔ بڑا لڑکا ہادی حسین ریاض میں سیول انجینیر ہے۔ چھوٹے بیٹے مصباح حسین نے ماسکو کی لومبا یونیورسٹی سے میکانیکل انجینیرنگ میں ایم ایس کی ڈگری لی۔ آج کل وہ دمام (سعودی عرب) کی ایک بڑی فرم میں ملازم ہیں۔ چھوٹی بیٹی نجیبہ نے بی۔ اے، بی ایڈ کیا ہے۔ دلی میں مقیم ہیں۔ چھوٹے داماد لیاقت علی خان مرکزی وزارتِ فینانس میں ملازم ہیں اور دلی میں سکونت پذیر ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱	تکلف برطرف		سالِ اشاعت : ۱۹۶۸ء	ناشر : نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد۔
	" "	دوسرا ایڈیشن	" " : ۱۹۸۳ء	" : حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔
۲	قطعِ کلام		" " : ۱۹۶۹ء	" : نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد۔
	" "	دوسرا ایڈیشن	" " : ۱۹۸۳ء	" : حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔
۳	قصہ مختصر		" " : ۱۹۷۲ء	" : حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔
	" "	دوسرا ایڈیشن	" " : ۱۹۸۳ء	" : حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔
۴	بہ ہر حال		" " : ۱۹۷۴ء	" : حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔
	" "	دوسرا ایڈیشن	" " : ۱۹۸۶ء	" : حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔
۵	آدمی نامہ (خاکے)		" " : ۱۹۸۱ء	" : حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔
	" "	دوسرا ایڈیشن	" " : ۱۹۸۳ء	" : حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔
۶	بالآخر		" " : ۱۹۸۲ء	" : حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔
	"	دوسرا ایڈیشن	" " : ۱۹۸۳ء	" : حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔

۷	جاپان چلو، جاپان چلو (سفر نامہ)	"	"	۱۹۸۳ء	"	حسامی بک ڈپو، حیدر آباد۔
	" " " دوسرا ایڈیشن	"	"	۱۹۹۳ء	"	حسامی بک ڈپو، حیدر آباد۔
۸	الغرض	"	"	۱۹۸۶ء	"	حسامی بک ڈپو، حیدر آباد۔
۹	سو ہے وہ بھی آدمی (خاکے)	"	"	۱۹۸۷ء	"	حسامی بک ڈپو، حیدر آباد۔
۱۰	چہرہ در چہرہ (خاکے)	"	"	۱۹۹۳ء	"	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔
۱۱	سفر لخت لخت (سفر نامہ)	"	"	۱۹۹۵ء	"	حسامی بک ڈپو، حیدر آباد۔
۱۲	آخر کار	"	"	۱۹۹۶ء	"	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔
۱۳	میرا کالم	"	"	۱۹۹۹ء	"	حسامی بک ڈپو، حیدر آباد۔
۱۴	ہوئے ہم دوست جس کے (خاکے)	"	"	۱۹۹۹ء	"	تخلیق کار پبلیشرز، نئی دہلی۔
۱۵	مضامین کا انتخاب (قطع کلام)	"	"	۱۹۹۰ء	"	رعنا فاروقی، کراچی، پاکستان۔

ہندی میں شائع شدہ تصانیف :

۱	قصہ آرام کرسی کا	"	"	۱۹۸۷ء	"	پستکائن، نئی دہلی۔
۲	جاپان چلو، جاپان چلو	"	"	۱۹۸۸ء	"	پستکائن، نئی دہلی۔
۳	سوئز بینک میں کھاتہ ہمارا ہے	"	"	۱۹۹۰ء	"	پستکائن، نئی دہلی۔
۴	سندباد کا سفر نامہ	"	"	۱۹۹۳ء	"	راج کمل، پرکاشن، نئی دہلی۔
۵	چہرہ در چہرہ (خاکے)	"	"	۱۹۹۹ء	"	سارانش پبلیشرز، نئی دہلی۔

زیرِ طبع تصانیف :

۱	مجتبیٰ رچناولی (چار جلدوں میں)	"	سارانش پبلیشرز، نئی دہلی۔

ooo

☆ مجتبیٰ حسین کی ۲۵ سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں مزاحیہ ماہنامہ شگوفہ نے ایک ضخیم خصوصی شمارہ مجتبیٰ حسین نمبر (فن اور شخصیت) ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ ☆ پروفیسر شکیل الرحمن سابق وائس چانسلر، بہار یونیورسٹی نے "مجتبیٰ حسین — فن اور شخصیت" کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ ☆ مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر مرہٹواڑہ یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد وغیرہ میں پی ایچ۔ ڈی کے لیے کام ہورہا ہے جن میں سے رانچی یونیورسٹی نے افسر کاظمی کو ان کے مقالے "مجتبیٰ حسین بہ حیثیت طنز نگار" کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔ ☆ مجتبیٰ حسین نے کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ انھوں نے ماہ نامہ "آج کل" نئی دہلی کا "طنز و مزاح نمبر" دو جلدوں میں مرتب کیا۔ سنِ اشاعت ۱۹۷۴ء۔

☆ مجتبیٰ حسین کے کئی مضامین مختلف ریاستوں کی نصابی کتابوں میں شامل ہیں۔

o●o

طاہر مسعود

مصاحبہ

مجتبیٰ حسین سے ایک ملاقات

مجتبیٰ حسین برِ صغیر کے معروف مزاح نگار، کالم نگار اور سفرنامہ نگار ہیں۔ ان کا تعلق حیدرآباد دکن کے ایک مشہور ادبی اور صحافتی خانوادے سے ہے۔ ابراہیم جلیس اور محبوب حسین جگر (جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست) ان کے بڑے بھائی ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے طبعی استعداد اور ماحول کے زیرِ اثر ادب و صحافت کی دنیا میں قدم رکھا۔ ۱۹۶۲ء میں پہلا مزاحیہ مضمون تحریر کیا۔ ابتدا میں افسانے بھی لکھے۔ روزنامہ سیاست کے کالم نگار شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد "کوہ پیما" کے قلمی نام سے کالم نگاری کی ابتدا کی اور سترہ سال تک باقاعدگی سے یہ مقبول کالم لکھتے رہے۔

مجتبیٰ حسین کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے گیارہ مجموعے شائع ہوچکے ہیں ان میں ظریفانہ اسلوب میں لکھے گئے سفرنامے اور شخصی خاکے بھی شامل ہیں۔ طنزومزاح کے میدان میں ان کی خدمات کے پیشِ نظر ۱۹۸۴ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے انھیں غالب انعام برائے طنز و مزاح دیا۔ بھارت کے ایک جریدے "شگوفہ" نے ۱۹۸۷ء میں اپنا ضخیم خصوصی شمارہ "مجتبیٰ حسین نمبر" بھی شائع کیا۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے آپ کو صرف لکھنے کی حد تک محدود نہیں رکھا، حیدرآباد دکن میں رہتے ہوئے انھوں نے انجمن زندہ دلانِ حیدرآباد نامی تنظیم کے زیرِ اہتمام طنزومزاح کانفرنس کا انعقاد کیا۔ یہ کانفرنس اتنی کامیاب رہی کہ ہندستان کے مختلف شہروں میں اسی نوعیت کی کانفرنسوں کے کامیاب تجربے کیے گئے۔ پاکستان میں بھی وہ طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کے لیے پچھلے دنوں تشریف لائے۔

مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ آپ اب تک روس، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا، جاپان اور سعودی عرب وغیرہ کا دورہ کرچکے ہیں۔ ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔ تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بہرحال، آدمی نامہ: جاپان چلو جاپان چلو، الغرض، سو ہے وہ بھی آدمی، آدمی نامہ، چہرہ در چہرہ، سفر لخت لخت، بالآخر، آخرکار، میرا کالم، ہوئے ہم دوست جس کے۔

سوال: آپ پہلی بار پاکستان آئے ہیں۔ ممکن ہے یہاں کی گلیاں اور محلے آپ کے لیے اجنبی ہوں لیکن یہاں کے ادیب اور یہاں لکھا جانے والا ادب یقیناً آپ کے لیے نامانوس نہیں ہوں گے۔ اس حوالے سے گو بڑا رسمی سوال سہی، لیکن میں جاننا چاہوں گا کہ آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب: ہندستان میں رہتے ہوئے پاکستانی مزاح نگاروں کا جہاں تک تعلق ہے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ بھارت کے مقابلے میں آپ کے ہاں مزاح نگاری کی روایت زیادہ مضبوط ہے۔ ممکن ہے اس سے بہت سے لوگ اختلاف کریں۔ لیکن میری رائے میں پاکستان میں بڑے مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً مشتاق احمد یوسفی جو اب کم لکھ رہے ہیں، کرنل محمد خاں جو کبھی کبھی لکھتے ہیں، شفیق الرحمٰن تو شاید لکھنا ہی ترک کرچکے ہیں۔ سید ضمیر جعفری میں البتہ ابھی تازگی ہے۔ محمد خالد اختر مجھے بے حد پسند ہیں، حالانکہ وہ سوچتے انگریزی میں اور لکھتے اردو میں ہیں۔ چوں کہ میں ایک طویل عرصہ تک اخبار سے وابستہ رہا ہوں۔ اس لحاظ سے پاکستانی اخبارات

بھی باقاعدگی سے میرے زیرِ مطالعہ رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ "جنگ" اخبار میں شوکت تھانوی ابنِ انشا اور ابراہیم جلیس کے ایک ساتھ کالم چھپتے تھے انھیں پڑھ کر بہت لطف آتا تھا۔ یوں بھی یہاں چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک اور مجید لاہوری نے اردو کالم نگاری کی روایت کو اتنا مضبوط بنادیا تھا کہ بعد میں آنے والوں کے لیے راستہ ہموار تھا۔ اس وقت جو لوگ کالم لکھ رہے ہیں ان میں انتظار حسین اور منو بھائی کے کالم، مزاحیہ کالم کے ذیل میں نہیں آتے۔ کسی زمانہ میں احمد ندیم قاسمی "حرف و حکایت" لکھتے تھے ان کے کالم سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا، کیوں کہ مجھے خود بھی کالم نویسی کرنی تھی۔ مجھے ان کے کالم بہت پسند بھی تھے لیکن اب ادھر میں نے ان کے کالم دیکھے تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کے ہاں Readability کم ہوگئی ہے۔ شاید ان کی عمر کا تقاضا ہے۔ ادبی کالم نگاری کے میدان میں آپ کے ہاں مشفق خواجہ کا کوئی حریف نہیں۔ ان کے کالم ہندستان کے متعدد رسائل و اخبارات میں نقل ہوتے ہیں ان کی نگاہ ہندستانی ادیبوں کے رجحانات پر بہت گہری ہے۔ عطاء الحق قاسمی باقاعدہ تو لکھتے نہیں ہیں مگر خوب لکھتے ہیں۔
اس کے باوجود ابنِ انشا اور ابراہیم جلیس جیسے کالم نگاروں کی جگہ اب بھی خالی ہے اور ان جیسے کالم نگار ابھر کر سامنے نہیں آئے۔

سوال: ہندستان کے اردو اخبارات میں کالم نگاری کیسی ہورہی ہے ؟

جواب: ہندستان میں اردو کالم نویسی بالکل ختم ہوگئی ہے۔ آخری آدمی فکر تونسوی تھے جن کا کالم "پیاز کے چھلکے" ملاپ، اخبار میں شائع ہوتا تھا اور صرف ان کے کالم کی وجہ سے اس اخبار کی پانچ چھے ہزار کاپیاں زیادہ فروخت ہوجایا کرتی تھیں۔ فکر تونسوی عام آدمی کے لیے لکھتے تھے۔ اس کے دکھ درد کو بیان کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد "ملاپ" اخبار کی اشاعت ایک دم نیچے آگئی۔ فکر تونسوی کے کالموں کی ادبی حیثیت ویسی نہیں تھی لیکن وہ بہت پڑھے جانے والے کالم نگار تھے۔ آپ کے ہاں کالموں کی ایک ادبی قدر و قیمت بھی ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے مخصوص سیاسی اور معاشرتی حالات میں اپنی بات اشاروں اور کنایوں میں کہنی پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے کالموں میں ادبی رنگ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس ہندستان میں آپ کھل کر سب کچھ کہہ سکتے ہیں اور جب بات کو راست طریقے سے کہا جائے تو فن کارانہ اظہار دب جاتا ہے۔

سوال: عام طور پر اخباری کالم وقتی اور ہنگامی موضوعات پر لکھے جاتے ہیں اور وقت گزر جانے پر باسی ہوجاتے ہیں۔ لیکن کالموں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جس کی تازگی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ آپ کے خیال میں وہ کون سے عناصر ہیں جو ایک کالم کو مستقل دل چسپی کا حامل بنادیتے ہیں ؟

جواب: یہ صحیح ہے کہ صحافتی کالم روز مرہ کے موضوعات پر لکھے جاتے ہیں اور موضوع کی اہمیت کے ختم ہوتے ہی کالم بھی اپنا اثر کھو بیٹھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے چالیس برس پہلے جب ہندستان میں ٹریفک سگنلز نصب کیے جارہے تھے تو ان کی شدید مخالفت ہوئی تھی اور عام رائے یہ تھی کہ یہ سگنلز اپنی سرخ و سبز بتیوں کے ذریعے ٹریفک کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہوجائیں گے۔ اس موضوع پر رائے عامہ کے زیرِ اثر میں نے بھی کئی کالم لکھے جنھیں اس وقت بہت سراہا گیا۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں تو مجھے اپنے وہ کالم نہایت احمقانہ محسوس ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود لکھنے والے کی اپنی نگاہ میں اپنے کالموں کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے اس کے برعکس اب بھی میں عبدالمجید سالک صاحب کے کالم پڑھتا ہوں تو اس میں ایک ادبی شان دکھائی دیتی ہے۔ چراغ حسن حسرت کے بعض کالموں کی تازگی آج بھی باقی ہے۔

سوال: میں آپ سے یہی پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ کالموں میں تازگی کیسے باقی رہتی ہے کیا ایسے موضوعات پر لکھنے سے جن

میں دل چسپی کا عنصر ہمیشہ باقی رہے یا ان موضوعات کو برتنے کے طریقۂ کار سے۔

جواب: تازگی لکھنے والے کے زاویۂ نگاہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر زاویۂ نگاہ وسیع ہو تو تحریر میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ بیش تر کالم نگاروں کے بہت محدود تعداد میں کالم ایسے ہوتے ہیں جن میں تازگی کا عنصر باقی رہتا ہے آپ کے ہاں کالم مضمون کی صورت میں لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً ابنِ انشا کے بہت سے کالم ایسے ہیں جو در حقیقت مضمون ہیں اور انھیں کالم قرار دینا درست نہیں ہوگا۔

سوال: آپ کالم اور مضمون میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں۔ کیا محض یہ کہ کالم مختصر ہوتا ہے اور مضمون طویل ہوتا ہے؟

جواب: طوالت ہی واحد معیار نہیں ہے بعض مضمون چھوٹے بھی ہوسکتے ہیں۔ پھر کالم کی طرح مضمون بھی آپ روزمرہ کے موضوعات پر لکھ سکتے ہیں مثلاً میری کتابوں میں جتنے مضامین ہیں ان میں سے کوئی بھی اخبار میں بہ طور کالم شائع نہیں ہوا۔

سوال: اگر صرف مزاح کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو آپ کے خیال میں پاکستان اور ہندستان کے مزاح اور مزاح کو برتنے کے رویے میں کیا فرق پایا جاتا ہے؟

جواب: آزادی کے بعد دونوں ممالک میں مزاح لکھنے کے رویے تقریباً وہی ہیں جو تقسیم سے پہلے تھے۔ سوچ کا انداز وہی ہے۔ سیاسی اور معاشرتی مسائل مختلف ہیں لیکن رویے زندگی کے تعلق سے۔ دکھوں کا جس طرح ادراک کرتے ہیں۔ وہ بہت مختلف نہیں۔ مگر ہمارے ہاں سیاسی موضوعات اردو میں کم اور ہندی میں زیادہ ہیں۔ ہندی کے ادیب سیاسی موضوعات کی طرف راغب ہیں۔ اردو کے لکھنے والے سیاسی موضوعات پر لکھتے تو ہیں لیکن ان کے طنز میں شدت نہیں ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ ممکن ہے وہ معاشرے میں پوری طرح Involved نہ ہوں۔ مختصر یہ کہ سیاسی طنز کم ہوتا جارہا ہے جب کہ ہندی میں اچھے قسم کا طنز ہے۔ آپ کو پتہ ہے ہمارے ہاں جہیز کی لعنت پر اکثر اموات ہوجاتی ہیں۔ ایک واقعہ تو ایسا ہولناک تھا کہ تین لڑکیوں نے جہیز نہ ہونے کی بنا پر خودکشی کرلی تھی۔ مجھے اس سانحے نے دہلادیا لیکن میں نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا نہ ہی اردو کے کسی اور مزاح نگار نے اس پر لکھا۔ ایسا لگتا ہے کہ زندگی کے سلسلے میں ہم لوگ بے حسی کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ ہمارے ہاں سیاسی طنز کنہیا لال کپور سے شروع ہوتا ہے۔

سوال: شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" بھی تو سیاسی طنز کی ایک اعلیٰ مثال ہے؟

جواب: جی ہاں لیکن دیکھا جائے تو "سودیشی ریل" سیاسی طنز کی منفی مثال ہے۔ کیوں کہ یہ طنز انگریزی اقتدار کے حق میں تھا۔ لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ شوکت تھانوی نے پہلی بار اپنے معاشرے کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ یعنی اپنے اوپر ہنسنے کی ایک کوشش۔ اکبر الہ آبادی کو دیکھیے۔ ان کی شاعری سرسید کی تحریک کے خلاف تھی۔ انھوں نے ترقی کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے یہ کام جس فن کارانہ طریقے سے انجام دیا اصل اہمیت اس کی ہے۔ پطرس بخاری اور مشتاق احمد یوسفی دونوں بڑے مزاح نگار ہیں۔ اگرچہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن جتنا لکھا ہے بہت ہی خوب ہے۔ ادبی لحاظ سے تعین کریں تو پطرس اور رشید احمد صدیقی کے بعد مشتاق احمد یوسفی ہی کا نام آئے گا لیکن یہ تعین کرے کون۔ اردو میں طنز و مزاح کا کوئی ناقد ہی نہیں ہے۔

سوال: کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہمارے ہاں طنز و مزاح کو دوسرے درجے کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ مزاح نگاروں کو اشرٹیز سے زیادہ اہمیت نہیں جاتی۔

جواب: یہ بات بالکل درست ہے۔ ہمارے ہندستانی نقاد شمس الرحمن فاروقی طنز و مزاح کو اس لائق ہی نہیں سمجھتے تھے کہ اس پر سنجیدگی سے کوئی بات کی جائے۔ لیکن اب ان کا رویہ تبدیل ہوا ہے۔ یہ طنز کا عہد ہے معاشرے میں اتنے تضادات پائے جاتے ہیں کہ ان کی نشان دہی کے لیے طنز سے بہتر کوئی اور صنف نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں ہنسنے ہنسانے والوں کو ابتدا ہی سے انٹرٹینر سمجھنے کی روایت رہی ہے۔

سوال: نقادوں کے اس رویے کی آپ کیا توجیہہ کریں گے؟

جواب: مسئلہ یہ ہے کہ جو صاحب بھی ایم۔اے پاس کرکے اردو کے استاد ہوجاتے ہیں وہ لازماً نقاد بھی بن جاتے ہیں۔ حالاں کہ استاد انگریزی کے بھی ہوتے ہیں لیکن وہ تو نقاد نہیں بنتے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ہمارے انگریزی کے ایک استاد تھے دورے سوامی۔ انھوں نے ایک بھی تنقیدی مضمون نہیں لکھا لیکن استاد وہ بڑے تھے۔ ان کا لکچر سننے کے لیے کلاس روم میں طلبا کی ایک بھیڑ اکٹھی ہوجاتی تھی۔ لیکن یہاں حال یہ ہے کہ یونیورسٹی میں اردو پڑھانے والا ہر ٹیچر فلیپ نگاری شروع کردیتا ہے۔

سوال: لیکن استادوں کے پاس فلیپ لکھوانے کے لیے بھی تو ادیب ہی جاتے ہیں۔

جواب: جی ہاں ادیب ہی انھیں نقاد بناتے ہیں اور پھر ادیب ہی ان کی شکایت بھی کرتے ہیں۔ ہندستان کی صورت حال میں آپ کو بتاؤں کہ نقادوں نے تحسینِ باہمی کو اپنا مذہب و ایمان بنالیا ہے اور پھر اکیڈمیوں نے صورت حال اور برباد کر رکھی ہے۔ حکومت ان اکیڈمیوں کو بے تحاشا پیسہ دیتی ہے اور ان اکیڈمیوں پر چند پروفیسر حضرات قابض ہیں۔ ان اکیڈمیوں سے انعام اور گرانٹ حاصل کرنے کے لیے ادیب و نقاد حضرات ان پروفیسروں کے آگے پیچھے گھومتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح ان اکیڈمیوں کی کمیٹی میں شامل ہوجائیں۔ حکومت سنجیدگی سے کچھ کرنا چاہتی ہے لیکن خود اردو والے آپس کے جھگڑوں میں الجھے رہتے ہیں۔ سب اپنے اپنے گروپ کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ اردو میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب چھپتی ہو جسے انعام نہ ملتا ہو۔ ہماری اترپردیش اکیڈمی تو سال بھر میں ستراسی کتابوں کو ایوارڈ دیتی ہے۔ جب اکیڈمی میں کتاب داخل کرنے کی تاریخ آتی ہے تو پھر کوئی پریس خالی نہیں ملتا کیوں کہ صرف انعام حاصل کرنے کے لیے دھڑا دھڑ کتابیں چھپنی شروع ہوجاتی ہیں۔ اس ماحول میں کوئی بھی جینوئن ناقد نہیں ابھرتا۔ شمس الرحمن فاروقی جیسے نقاد بہت کم ہیں جو لکھتے پڑھتے ہیں اور جلسے جلوس، سلیکشن کمیٹی وغیرہ میں جانے کی کوشش نہیں کرتے۔ باقی جتنے تدریسی نقاد ہیں وہ صبح سے شام تک لکھنے پڑھنے کا کام چھوڑ کر اسی گٹھ جوڑ میں لگے رہتے ہیں۔

سوال: کہتے ہیں کہ ہر ہنسی کے پیچھے غم کا سایہ ہوتا ہے۔ ایک مزاح نگار کی حیثیت سے آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: میں بنیادی طور پر بے حد غمگین آدمی ہوں۔ میں نے محض اتفاقیہ طور پر "سیاست" حیدرآباد میں کالم نگاری شروع کی۔ اس کے لیے میں نے باقاعدہ ریاض کیا۔ اردو کے تمام مزاح نگاروں کو پڑھا، پاکستانی اخبارات میں چھپنے والے کالم نگاروں کا مطالعہ کیا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا غم سماج کا غم بنے۔ بلکہ آپ حیرت کریں گے کہ میں نے ابتدا میں جتنے افسانے لکھے تھے وہ سب کے سب موت کے موضوع پر تھے۔ پروفیسر حسن عسکری (لندن) نے مجھے فلسفے کی طرف راغب کیا۔ ان کے زیرِ اثر میں نے نطشے، برگساں وغیرہ کو پڑھا لیکن شاید انھیں ہضم نہیں کرپایا۔ نطشے کے فلسفے نے تو مجھے بہت غمگین مزاج بنادیا ان دنوں میں دفتر سے ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد ایک کرسچن قبرستان میں جاکر بیٹھا رہتا تھا۔ اسی زمانے میں میں نے موت کے موضوع پر دس افسانے لکھے۔ پھر میں نے اپنی شخصیت کو منقسم کیا۔ میری تحریروں میں اب بھی غم جھلک جاتا ہے "کتاب نما" میں میں نے لکھا تھا کہ جب میری

چھ سالہ بیٹی کا انتقال ہوا تو اسے دلخراش سانحے کے بعد میں نے مزاحیہ کالم لکھا اور اسی لیے لکھنا پڑا کہ پڑھنے والوں کو اس سے محروم نہ رکھوں اور کالم ایسا تھا کہ ایک دن بھی رک نہیں سکتا تھا۔ جمیل الدین عالی صاحب نے یہ پڑھ کر مجھے ناراضگی کا ایک خط لکھا اور اسے ایک سنگ دلانہ فعل قرار دیا لیکن ظاہر ہے میں کیا کر سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح میں نے کالم لکھنے کے لیے خود کو تیار کیا تھا۔ میری رائے میں مزاح نگار بہت غمگین آدمی ہوتا ہے۔ ابنِ انشا اور یوسفی صاحب کے پاس آپ کو اس کی جھلک نظر آئے گی۔ میں نے کہیں لکھا تھا کہ سچا مزاح سچے غم کو انگیز کرلینے کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔

سوال: آپ کے لکھنے کا طریقۂ کار کیا ہے؟ لکھنے میں ارادے اور منصوبہ بندی کا دخل زیادہ ہوتا ہے یا کسی خاص لمحے کی گرفت میں آکر آپ لکھنا شروع کردیتے ہیں؟

جواب: مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ کبھی موضوع اچانک مجھے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ کچھ اچھے جملوں کے حوالے سے موضوع مل جاتا ہے اور کبھی کوئی خاص واقعہ متاثر کردیتا ہے۔ مثلاً مجھے ایک مرتبہ بمبئی کے جلسے میں جانا تھا۔ اس میں شرکت کے لیے میں حیدرآباد سے ٹرین پر پہنچا۔ اگلے دن اجلاس تھا۔ اخبار سے پتہ چلا کہ ریلوے منسٹر نے عام مسافر کی طرح تھرڈ کلاس میں سفر کیا۔ انہی منسٹر صاحب کو ہماری کانفرنس کی صدارت کرنی تھی۔ چناں چہ اس موضوع پر میں نے چار پانچ گھنٹے میں مضمون مکمل کرلیا اور جب سے کانفرنس میں سنایا تو اسے بہت پسند کیا گیا۔ اپنی سرکاری ملازمت کی وجہ سے بھی بعض اوقات لکھتے وقت محتاط رہنا پڑتا ہے۔

سوال: کیا آپ کو لکھنے میں بہت محنت کرنی پڑتی ہے جیسا کہ یوسفی صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک ایک جملہ کو دس دس مرتبہ کاٹتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں۔

جواب: اسی لیے یوسفی صاحب کو اب تک ہندی والے ترجمہ نہیں کرسکے ہیں کیوں کہ ان کی مزاح میں زبان کا مزاح گھلا ملا ہوجاتا ہے۔ لکشمی چندر گپت جو ٹائمز آف انڈیا کے لیے ترجمہ کرتے ہیں انھوں نے مجھے بتایا کہ یوسفی صاحب کا ترجمہ کرتے وقت میں بے بس ہوگیا۔ کیوں کہ اردو زبان سے ان کا ہیومر جڑا ہوا ہے ابنِ انشا کو تو ہندی میں ترجمہ نہیں صرف نقل کرنا پڑتا ہے۔ یوسفی صاحب مضمون میں جابہ جا اشعار کی پیروڈی یا ان کا استعمال کرتے ہیں مثلاً شبلی نعمانی کے عطیہ فیضی سے مراسم کے حوالے سے انھوں نے اقبال کا یہ مصرعہ لکھا ہے کہ "مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"

اب جو شخص اس پس منظر سے واقف نہیں ہوگا اس کے لیے یوسفی صاحب کی تحریر کا ترجمہ ممکن نہیں ہوگا۔ یوسفی صاحب کا تو انگریزی میں بھی ترجمہ کرنا مشکل ہے۔

سوال: آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یوسفی صاحب کے یہاں کرافٹ پر بہت زور ہے۔

جواب: کرافٹ مین شپ کی اپنی اہمیت ہے۔ راجندر سنگھ بیدی ایک افسانے کو بیس مرتبہ لکھتے تھے۔ میں کرشن چندر کے بہت قریب رہا ہوں۔ وہ اپنی تحریروں پر اتنی محنت نہیں کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ صبح دس بجے سے دوپہر تک روزانہ لکھتے تھے اور اس دوران ان کے کمرے میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ لکھتے تھے اور لکھ کر دے دیتے تھے۔ مسودے کو دوبارہ پڑھنے کی انھوں نے شاید کبھی زحمت نہیں کی۔

سوال: ابراہیم جلیس مرحوم سے آپ کے دو رشتے ہیں ایک بھائی کا دوسرے قلم کار کا۔ ان کی یادوں کے حوالے سے آپ کچھ کہنا پسند کریں گے؟

جواب: ظاہر ہے میں نے سب سے پہلے ابراہیم جلیس کو پڑھا۔ ان کے ہاں بے پناہ طنز تھا۔ کرشن چندر اور ابراہیم جلیس میں مجھے طنز یکساں سطح پر نظر آتا ہے۔ وہ طنز مجھے بنیادی طور پر پسند بھی تھا لیکن مجھے حالات نے مجبور کیا کہ میں مزاح کی طرف جاؤں اور اسی لیے میں نے طنز کے بجائے مزاح کا راستہ اختیار کیا۔

سوال: ہندستان میں جو لوگ مزاح لکھ رہے ہیں آپ ان میں کس کو اہمیت دیتے ہیں؟

جواب: ادھر پچیس برسوں میں ہندستان میں مزاح کا ایک خاص ماحول بنا ہے۔ حیدرآباد دکن میں ہم نے زندہ دلانِ حیدرآباد کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی اور ۱۹۶۶ء میں ایک طنز و مزاح کانفرنس منعقد کی۔ نثر کو اسٹیج پر پیش کرنے کا تجربہ اس سے پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ دو تین ہزار کے مجمع میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین پڑھے گئے۔ کرشن چندر اس تجربے سے بہت متاثر ہوئے۔ کانفرنس کا افتتاح مخدوم محی الدین نے کیا تھا۔ اس وقت بھی کہا گیا تھا کہ ان مسخروں کو کیوں اہمیت دی جارہی ہے۔ مخدوم صاحب پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اس کانفرنس میں شرکت نہ کریں۔ سنجیدہ شاعروں نے اس کانفرنس کا باقاعدہ بائیکاٹ کیا۔ لیکن یہ کانفرنس کامیاب رہی۔ پھر یہ ہندستان کے مختلف شہروں میں ہوئی اور اب پاکستان میں طنزومزاح کانفرنس ہوئی جس میں شرکت کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ ہماری یہ کانفرنس ہندی والوں کو بہت پسند آئی۔ انھوں نے ۱۹۶۸ء میں "قہقہے" کے نام سے کانفرنس منعقد کی۔ ہماری کانفرنسوں میں لوگ ٹکٹ خرید کر آتے ہیں۔ یہی حال مشاعروں کا ہے جس میں بارہ پندرہ ہزار کا مجمع ہوتا ہے۔

جہاں تک آپ کا یہ سوال ہے کہ مزاح کون لوگ لکھ رہے ہیں تو ایک ہمارے یوسف ناظم صاحب ہیں جنھوں نے بہت لکھا ہے۔ پھر ہم نے بہت سے سنجیدہ لکھنے والوں کو مزاح لکھنے کی طرف مائل کیا ہے۔ نئے لکھنے والوں میں مسیح انجم، نریندر لوتھر، رشید قریشی، پرویز یداللہ مہدی اور فیاض احمد فیضی وغیرہ ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان میں ہندستان سے زیادہ اچھا مزاح لکھنے والے موجود ہیں اور ہاں آپ نے جو پوچھا تھا کہ پاکستانی اور ہندستانی مزاح میں فرق کیا ہے؟ میرے خیال میں ہندستان میں طنزومزاح عام فہم ہوتا جارہا ہے۔ کچھ وہاں کے لسانی حالات بھی ایسے ہوتے جارہے ہیں مثلاً یوسفی صاحب کی طرح زبان اب وہاں نہیں لکھی جاسکتی۔ ابراہیم جلیس، ابنِ انشا کی زبان چل جائے گی۔ پطرس کی زبان بھی لکھی جاسکتی ہے۔ لیکن رشید احمد صدیقی کی زبان اب نہیں لکھی جاسکتی۔ خامہ بگوش (مشفق خواجہ) ہندستان کے مقبول ترین کالم نگار ہیں۔

سوال: کوئی اور بات جو آپ کہنا چاہیں؟

جواب: پاکستان میں انشائیہ پر جو بحث جاری ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔

○●○

پروفیسر نثار احمد فاروقی

مجتبیٰ حسین (مشتبہ آدمی)

کنور مہیندر سنگھ بیدی جہاں دیدہ آدمی تھے، مجسٹریٹ بھی رہ چکے تھے، وہ مجتبیٰ حسین کو "مشتبہ حسین" کہا کرتے تھے۔ میں نے اس پر غور کیا تو واقعی ہر اعتبار سے مجتبیٰ کو "مشتبہ" ہی پایا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے لیے شوکت تھانوی نے لکھا تھا کہ اردو کے مشہور مزاح نگار ہیں مگر شکل و صورت سے مرثیہ گو معلوم ہوتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی صورت بھی خالقِ کائنات نے سوزخوانی کے لیے بنائی تھی۔ انھوں نے اس کا ناجائز استعمال شروع کردیا۔ مگر ان کی مزاح نگاری بھی خاصی "مشتبہ" ہے۔ یعنی مجھے ان کی ہنسی بھی "اشک آلود" نظر آتی ہے۔ ان کے فن کا کمال یہی ہے کہ آپ کو ہنساتے ہیں، خود نہیں ہنستے۔ لیکن اگر ہنسی کے ساتھ آپ کی آنکھیں نم ہوجائیں تو یہ ہنسنا شروع کردیتے ہیں۔ طنز و مزاح دونوں الگ الگ شعبے ہیں، یہ ایک دوسرے سے مخلوط بھی ہوجاتے ہیں، ایک دوسرے میں کھو بھی جاتے ہیں۔ کبھی ان کو الگ پہچانتا بہت آسان، کبھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ طنز یہی نہیں ہے کہ آپ اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی کائنات کے بے ہنگم پن کو نمایاں کردیں، مزاح بھی صرف پگڑی اچھالنا نہیں ہے، ہنسنا اچھا مشغلہ ہے۔ صحت کے لیے بھی ممکن ہے مفید ہو (اگرچہ یہ بات بھی مشتبہ ہے) مگر ہر فن کا ایک نقطہ کمال ہوتا ہے، طنز و مزاح کا نقطہ عروج یہ ہے کہ وہ ہنسنے میں رلادے۔ خواجہ میر درد نے کہا تھا:

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا   کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

مجتبیٰ حسین ایک متوسط طبقے کا اوسط درجے کا انسان ہے، مگر وہ ایک اعلیٰ درجے کا مزاح نگار کیسے بن گیا، یہ بھی غور کرنے والی بات ہے۔ وہ صحافت کے راستے سے ادب کی دنیا میں آیا، اس راہ کے پیچ و خم میں بہت سے لکھنے والے کھو بھی گئے ہیں۔ بہ قول میر:

وصل و ہجراں یہ جو دو راہیں ہیں شہرِ عشق میں   دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

مگر مجتبیٰ اس شہرِ عشق کی راہوں میں خوب گھوما پھرا ہے، خوب سَرگشت کی ہے اور شہر کو اس نے اپنے وجود میں بسالیا ہے، اب تو خطرہ خود شہرِ عشق کے بھٹکنے کا ہوگیا۔ دراصل مجتبیٰ نے ایک عام اور معمولی انسان سے اپنا ذہنی و جذباتی رشتہ ہمیشہ باقی رکھا ہے، اس کے دکھ سکھ کو سمجھا ہے، اس کی بھولی بھالی نیم پختہ نیم رس آرزوؤں اور تمناؤں سے یگانگت پیدا کی ہے۔ اس کی حسرتوں اور ناکامیوں کا ہنس ہنس کر بیان کیا ہے۔ اسی پردے میں وہ اپنے ماحول اور معاشرت پر بھرپور وار کرتا ہے اور اس کا کوئی وار اوچھا نہیں پڑتا۔

مزاح میں کبھی واقعات کا سہارا لیا جاتا ہے، کچھ واقعات تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں چٹخارا پیدا کرنے کے لیے نمک مرچ لگانے یا کل پھندنے سجانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ بعض واقعات کے بیان میں ذرا سا زاویہ تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ کبھی اس میں مبالغے کی لاگ دی جاتی ہے۔ کبھی انھیں الٹے زاویے سے دیکھا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں مزاح نگاری لفظوں کا کھیل ہوتی ہے۔ الفاظ کے گھروندے اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ ان میں واقعات چھپ جاتے ہیں۔ صرف ان کے بیان کا لطف رہ جاتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کے فن میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۹۵ء تک ۳۳ برس کی مدت میں نمایاں طور پر تدریجی ترقی ہوئی ہے۔ اس نے واقعات

اور اسلوب نگارش دونوں سے کام لیا ہے۔ مگر اس کی خندہ آفرینی بے حسی اور غفلت کا قہقہہ نہیں ہے۔ یہ وہ خندہ دنداں نما ہے جو ہمیں ہماری محرومیاں اور نارسائیاں دکھا کر یہ حوصلہ بھی دیتا ہے کہ ہم انھیں دیکھتے رہیں اور ہنستے رہیں۔

"جب ہم اپنی مصنوعی بتیسی نکال کر سوجاتے ہیں تو بچے اس بتیسی کو کھلونے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ گھنٹوں یہ اپنے ڈیڈی کے دانتوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ہم پوپلی شکایت کرتے ہیں تو بیوی کہتی ہے: ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کھانا تو دس بجے کھاتے ہو۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اگر بچے آپ کی مصنوعی بتیسی سے کھیل لیتے ہیں تو ایسی کون سی آفت آجاتی ہے، کبھی تمھیں اتنی تو توفیق نہیں ہوتی کہ بچوں کے لیے کھلونے ہی لے آؤ۔" (قصہ داڑھ کے درد کا)

کیا اس میں ایک عام آدمی کی معمولی زندگی کا غیر معمولی نقشہ نظر نہیں آتا؟

مجتبیٰ حسین کو اپنی اور اپنے مزاح کی صفات کا علم ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"میرے نزدیک مزاح انسان کے پیمانہ وجود کے لبریز ہوکر چھلک پڑنے کا نام ہے۔ جب انسان کے وجود کا پیمانہ لبریز ہوجاتا ہے تو وہ قہقہوں کی شکل میں چھلکنے لگتا ہے۔ اسی لیے کھوکھلے آدمی اول تو قہقہے نہیں لگاتے اور اگر قہقہے لگاتے بھی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے یہ قہقہے کسی اندھے کنوئیں کی گہرائیوں میں سے ابھر رہے ہوں۔"

"بعض لوگ مزاح کی کیفیت کو بہت معمولی کیفیت سمجھتے ہیں حالاں کہ سچا مزاح وہی ہے جس کی حدیں سچے غم کی حدوں کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ زندگی کی ساری تلخیوں اور اس کی تیزابیت کو اپنے اندر جذب کرلینے کے بعد جو آدمی قہقہے کی طرف جست لگاتا ہے وہی سچا اور باشعور قہقہہ لگا سکتا ہے۔ ہنسنے کے لیے جس قدر گہرے شعور اور ادراک کی ضرورت ہوتی ہے اتنے گہرے شعور کی ضرورت شاید رونے کے لیے درکار نہیں ہوتی۔" (میں اور میرا مزاح)

اقتباس ذرا سا طویل ہوگیا، مگر میں جس پہلو کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے مجتبیٰ کی چند سطروں کو دہرانا ضروری ہے:

"دوستوں کی محفل میں جی بھر کر ہنس لینے، دن بھر قدم قدم پر سماج کی پستیوں سے ہنستے ہنستے مفاہمت کرلینے اور اپنی حقیر سی زندگی کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کے بعد جب رات کے پچھلے پہر اپنے بستر پر پہنچتا ہوں اور جب سارا ماحول سوجاتا ہے تو میں جاگنے لگتا ہوں۔ تب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری کائنات قدرت کی مزاح نگاری کا ایک شاہکار ہے۔ اور اس شاہکار کے بارے میں سوچتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ مجھے یہ وہم سا ہوتا ہے کہ یہ میری آنکھوں سے نہیں بہہ رہے ہیں بلکہ یہ آنسو اس انسان کی آنکھوں سے میری آنکھوں میں بس یوں ہی چلے آئے ہیں جس نے شاید آج سے دو ہزار سال پہلے یا اس سے بھی کئی ہزار سال پہلے انھیں اپنی آنکھوں سے بہایا ہوگا۔ میں انھیں اپنی تاریخ اور ثقافت کی امانت سمجھ کر اپنی آنکھوں میں چھپالیتا ہوں، مگر میں ان آنسوؤں کو آنے والی صدیوں کا حصہ بننے دینا نہیں چاہتا۔ میں ماضی کے انسان کے آنسوؤں اور آنے والی صدیوں کے انسان کی

آنکھوں کے درمیان ایک حد فاصل بنتا چاہتا ہوں۔" (میں اور میرا مزاح)

مجتبیٰ کی ان عبارتوں سے اس کے فن کی قدروقیمت کا اندازہ کرلینا دشوار نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے فن کے عناصرِ ترکیبی میں اول جلول قسم کے واقعات بھی ہیں، معمولی سانحوں کا غیر معمولی اور مبالغہ آمیز بیان بھی ہے۔ زبان کی سادگی، شیرینی، بہاؤ اور بے تکلفی بھی ہے، مگر جس طرح کسی مرکب دوا میں ایک جزو اعظم ہوتا ہے اور باقی اجزاء صرف اس کی تاثیر کو ابھارنے اور قوت دینے کے لیے اضافہ کیے جاتے ہیں، اسی طرح مجتبیٰ کے مزاح میں بنیادی عنصر یا جزو اعظم اس کا وہ گہرا شعور ہے جو معمولی انسان کے دکھوں سے خود کو جوڑے رہتا ہے۔ اس کی ہنسی محض ایک فریب ہے، مقصود اصلی کچھ اور ہے جسے ایک باشعور قاری ہی پاسکتا ہے اور جب وہ اس مقصود کو پالے گا تو وہ بھی مجتبیٰ حسین کو "مشتبہ حسین" ہی سمجھنے لگے گا۔

انشائیہ (Essay) کیا ہے اور یہ اردو زبان میں پایا جاتا ہے یا نہیں اس پر کچھ بحث و تکرار تو ہوچکی ہے، مجھے اس سے کچھ غرض نہیں، مگر مجتبیٰ کے مضامین پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمارے ہم عصروں میں انشائیہ نگاری کے بعض دل کش نمونے مجتبیٰ حسین کے قلم سے نکلے ہیں۔ "قصہ داڑھ کے درد کا" "چینی ایش ٹرے کی یاد میں، جناب صدر، شاعروں کی حکومت، میں نہیں آؤں گا، خوشامد کا فن، انشائیہ کی تعریف پر بھی پورے اترتے ہیں۔

مزاح کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بات کا بتنگڑ بنانا ہوتا ہے، بات سے بات نکلتی ہے اور بے بات کی بات کی جاتی ہے، یوں باتوں باتوں میں کام کی بات بھی ہوجاتی ہے۔ مجتبیٰ کا اسلوب نثر سادہ، بے تکلف، آورد سے پاک اور ہلکا پھلکا ہے، اس میں ادبی چاشنی بھی ہے اور سنجیدہ شوخی یا شوخ سنجیدگی بھی۔ اسلوب کی بنیادی صفات سلاست، شائستگی اور اختصار بیان کی گئی ہیں، انھیں خوبیوں سے اسلوب نکھرتا ہے اور جان دار ہوتا ہے، اسلوب کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب خود لکھنے والے کو یہ احساس نہ رہے کہ اس کا کوئی وقت منفرد اسلوب بھی ہے اور اس کی پڑھنے والے اس کے انداز قد اور لب و لہجے سے پہچاننے میں دھوکا نہ کھائیں۔ مجتبیٰ کا اسلوب خوب رچ بس گیا ہے، اس کی شائستگی اور پختگی نے بھی اس کے مزاج کو قدرِ اول کی چیز بنادیا ہے۔

مجتبیٰ کی ادبی کاوش کا دوسرا میدان، جو دراصل مزاح کی ہی توسیع ہے، خاکہ نگاری بھی ہے۔ یہ بڑی آزمائش کا فن ہے، تلوار کی دھار پر چلنے کے برابر ہے، اس میں اگر شخصیت کے صرف مثبت اور روشن پہلو دکھائے جائیں تو یہ "مدلل مداحی" یا قصیدہ خوانی بن جاتا ہے اور منفی پہلوؤں پر نظر رکھی جائے تو ہجو گوئی یا کردار کشی کے ذیل میں آتا ہے۔ بھرپور شخصیت سب مثبت اور منفی پہلوؤں کا مجموعہ ہوتی ہے اور ان میں توازن برقرار رکھنا ہی خاکہ نگاری کا فن ہے۔ مجتبیٰ حسین نے کئی درجن خاکے لکھے ہیں، ان میں سے ۱۵ خاکے ان کی کتاب "آدمی نامہ" میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ چار خاکے "بہرحال" میں، تین خاکے "قصہ مختصر" میں اور (۱۴) خاکے دوسرے مجموعے "سو ہے وہ بھی آدمی" اور (۱۸) خاکے تیسرے مجموعے "چہرہ در چہرہ" میں شامل ہیں۔ بعض مضامین مثلاً "بلراج ورما نے تناظر نکالا اور "دنیا کے حضور و ایک ہوجاؤ" بھی خاکہ نگاری ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔

مجتبیٰ کے اسلوب میں بڑی نرمی اور دھیما پن ہے، ان کے قلم میں کاٹ نہیں ہے۔ وہ حد ادب سے کبھی تجاوز نہیں کرتا اور بعض ناگفتنی باتیں بھی ہنسی ہنسی میں نہایت شائستہ انداز میں کہہ گزرتا ہے۔ اس کی خاکہ نگاری کے یہ چند نمونے میرے مدعا کو زیادہ وضاحت سے بیان کرسکتے ہیں۔

"بیدی صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کا حافظہ خاصہ کمزور ہے وہ اپنے قریبی دوستوں کے

نام بھی بھول جاتے ہیں۔ اس لیے یوسف ناظم نے بیدی صاحب کی شخصیت پر اپنے بھرپور مضمون میں بیدی صاحب کے دوستوں کو یہ مشورہ دے رکھا ہے کہ وہ جب بھی ان سے ملیں تو حفظ ماتقدم کے طور پر اپنا نام ضرور بتادیں۔ اس میں دونوں فریقوں کی عافیت ہے۔ اس مخلصانہ مشورے پر عمل کرتے ہوئے جب ہم نے پچھلی بار دلی میں بیدی صاحب سے ملنے کے بعد اپنا نام بھی بتادیا تو بولے " میں جانتا ہوں آپ مجھ پر لکھے گئے ایک مزاحیہ خاکے کی بنا پر یہ حرکت کررہے ہیں جب کہ بات ایسی نہیں ہے۔ میرا حافظہ اتنا خراب نہیں ہے۔"

ہم نے پوچھا: " بیدی صاحب یہ خاکہ کس نے لکھا تھا؟ " بولے " اس وقت لکھنے والے کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔"

ooo

" ان کی باتیں بہت دل چسپ اور بے ساختہ ہوتی تھیں۔ ایک بار دلی کی ایک محفل میں وہ میرے برابر بیٹھے تھے۔ اچانک میرے کان میں کہا: یار ہم نے در بہ در اور شہر بدر تو سنا تھا یہ بشیر بدر کیا ہوتا ہے۔ (راجندر سنگھ بیدی)

ooo

" بالآخر مجھے ایک پنواڑی کی دکان نظر آگئی جس پر جا بجا اردو شعر لکھے ہوئے تھے۔۔۔ میں نے بڑی پُر امید نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: بھئی یہاں " شاعر " کا دفتر کہاں ہے؟ پنواڑی نے بڑی بے نیازی کے ساتھ جواب دیا " حضور آپ کہاں " شاعر " کو تلاش کرنے آئے ہیں۔ یہاں کوئی شاعر داعر نہیں رہتا یہاں تو صرف " غزلیں " رہتی ہیں اور وہ بھی بغیر مقطع والی۔" (اعجاز صدیقی)

" جب ہم نے ہوش سنبھالنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ مخدوم بڑی تیزی سے ہمارے شعور کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔ پھر حصہ بنتے بنتے وہ مکمل شعور ہی بن گئے۔ مخدوم سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ میرے ایک دوست مخدوم کے مجموعہ کلام " سرخ سویرا " کو رحل پر رکھ کر نہ صرف پڑھا کرتے تھے بلکہ مطالعہ کے دوران آگے اور پیچھے جھولتے بھی تھے۔"

" ان کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی چبھتا ہوا فقرہ کہتے، جو وہ اکثر کہتے تھے اور مذاق کی کوئی بات کرتے جو اکثر کرتے تھے تو مخاطب سے مصافحہ ضرور کرلیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی مخدوم رو بہ رو ہوتے تو میں بائیں ہاتھ سے سگریٹ پیتا تھا اور دائیں ہاتھ کو مصافحے کے لیے خالی رکھتا تھا۔ ایک بار مجھے اور مخدوم کو ایک ادبی تقریب میں شرکت کے لیے بمبئی جانا پڑگیا۔ حیدرآباد کے اسٹیشن پر میں پہنچا تو میرے ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا اور دوسرے میں ہولڈال۔ مخدوم نے مجھے دیکھتے ہی مصافحہ والا فقرہ کہہ دیا اور میں نے اٹیچی کیس کو نیچے رکھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ پھر انھوں نے تابڑتوڑ کئی بار بامصافحہ فقرے کہہ کر مجھ سے اٹیچی کیس کو نیچے رکھوایا۔ میں ان کے فقروں سے ایسا الرجک ہوا کہ ابھی وہ آدھا فقرہ ہی کہتے تھے کہ میں اٹیچی کیس کو نیچے رکھ دیتا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر بولے: " بیٹا اب تو تم میرے ایسے فقروں پر بھی اٹیچی کیس نیچے رکھنے لگے ہو جن پر میں مصافحہ نہیں کرتا۔ تم خود ورزش کرنا چاہتے ہو تو کرو۔"

"۔۔۔ ایک بار یہ ایک برہمن دوست کے گھر روپوش ہوگئے۔ ان کا برہمن دوست بھی پارٹی کا ممبر تھا۔ ان کے دوست نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ مخدوم بھائی میرے والد بڑے قدامت پرست ہیں اسی لیے ان پر کبھی یہ ظاہر نہ کرنا کہ آپ برہمن نہیں ہیں، اپنی برہمنیت کی لاج رکھنا۔ ایک دن ان کے دوست کے والد نے مخدوم سے پوچھا: "بھئی تم لوگ کمیونسٹ پارٹی میں ہو۔ تمہارے دھرم کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کہیں تم گوشت تو نہیں کھاتے؟

مخدوم نے جھٹ سے کہا: "لاحول ولاقوۃ۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں گوشت کھاتا ہوں۔ نعوذباللہ یہ تو مجھ پر سراسر تہمت ہے۔" (مخدوم محی الدین)

"ان کے چلنے کے انداز میں ایسی نرمی، آہستگی، ٹھہراؤ اور دھیما پن تھا کہ یک بارگی مجھے یہ وجہ سمجھ میں آگئی کہ ہمارے ملک میں انقلاب کے آنے میں اتنی دیر کیوں ہورہی ہے۔۔۔ حکومت پر بھی ترس آیا کہ کیسی کیسی معصوم اور بے ضرر شخصیتوں سے خوف زدہ رہتی ہے۔" (سجاد ظہیر)

ооо

"میں نے فکر تونسوی کو جس قدر قریب سے دیکھا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ اردو کے اس بڑے طنز نگار کے اندر ایک معصوم گنوار بیٹھا ہے۔ یہ گنوار انھیں اپنے گھر کے خوب صورت صوفے پر اوکڑوں بٹھواتا ہے۔ یہی گنوار ان کے کان میں سگریٹ کا ادھ جلا ٹکڑا رکھوا دیتا ہے۔ یہی گنوار انھیں چائے کی پیالی میں سگریٹ کی راکھ جھاڑنے پر مجبور کرتا ہے اور تو اور یہی گنوار ان سے ریفریجریٹر میں "بدنام کتاب" کے نسخے رکھواتا ہے۔ پرسوں میں نے ان کے گھر کا فریج کھولا تو دیکھا کہ "بدنام کتاب" کے دو نسخے بڑی قابلِ رحم حالت میں وہاں پڑے تھے۔ میں ریفریجریٹر میں کتابیں دیکھ کر ہنسنے لگا تو خفت مٹانے کے لیے بولے "بھئی میں نے اصل میں پانی پینے کے لیے فریج کھولا تھا۔ شاید غلطی سے یہ نسخے وہاں رہ گئے، ایمان سے۔ "۔۔۔ ان کی ایک کمزوری لاہور ہے جسے وہ پیار سے "لور" کہتے ہیں۔"۔۔۔ ایک بار پاکستانی نوجوان ادیب پاکستان سے ہندستان آیا۔۔۔ لاہور کے ایک ایک ادیب شاعر کے بارے میں تفصیل سے پوچھا، پھر لاہور کی سڑکوں کی جانب متوجہ ہوئے۔۔۔ یار یہ بتا کہ انار کلی کے چوراہے پر ایک بھوری گائے بیٹھا کرتی تھی میں اسے روز روٹی کھلایا کرتا تھا، کیا وہ اب بھی وہاں بیٹھتی ہے؟ (فکر تونسوی)

مجتبیٰ کے اسلوب میں شگفتگی بھی ہے اور تازگی و تازہ کاری بھی۔ وہ معمولی سی بات کو غیر معمولی اور غیر معمولی بات کو بالکل معمولی، مانوس کو نامانوس اور نامانوس کو مانوس بنانا جانتا ہے۔ اس کی شخصیت پوری طرح اسلوب نگارش میں جھلملاتی ہے، وہ نہ کبھی خود بور ہوتا ہے نہ دوسروں کو بور کرتا ہے۔ اسی لیے اس کے دوستوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے جس میں اعلیٰ و ادنیٰ سب سمائے ہوئے ہیں، فارسی کا ایک محاورہ ہے کہ "آشنا چوب خشک می تراشد" یعنی فلاں شخص سوکھی لکڑی سے بھی اپنا دوست گھڑ لیتا ہے۔ مجتبیٰ بھی پانی کی طرح ہر ظرف میں ڈھل جاتا ہے۔ ان کی حس مزاح کے ساتھ مشاہدہ بھی بہت قوی اور دقیق ہے: کسی شخص سے برسوں ملنے کے بعد بھی ہم اس کی جن اداؤں پر غور نہیں کر پاتے، مجتبیٰ کی نظر پہلی ہی ملاقات میں وہاں پہنچ جاتی ہے۔

"خورشید صاحب کی ایک خاص عادت یہ ہے کہ جب بھی کسی موضوع پر اپنے عالمانہ خیالات کا اظہار کرنے لگتے ہیں تو ان کے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا خود بہ خود ہلنے لگتا ہے۔ بات جتنی عالمانہ ہوگی انگوٹھا اتنا ہی ہلے گا۔ بات بہت عالمانہ ہو جائے اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں "حسب علمیت" ہلنے کی گنجائش باقی نہ رہے تو دائیں ہاتھ کا انگوٹھا بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کی تائید میں ہلنے لگ جاتا ہے۔" (خورشید الاسلام)

"صادقین کی حس مزاح بہت تیز تھی۔۔۔ لطیفے کی جگالی کرتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ مذاق خود ان کے بارے میں ہوتا تو اور بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ ایک رات ان کے مکان پر خوش باشوں کی محفل گرم تھی، امیر قزلباش بھی موجود تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں پوچھا: صادقین صاحب آپ کا نام جمع کے صیغے میں کیوں رکھا گیا ہے؟ صرف صادق کافی تھا، صادقین کی کیا ضرورت ہے؟"

بولے: صادقین میرے والدین کی دین ہے۔ میں کیا کرسکتا ہوں؟ اسی اثنا میں بجلی اچانک فیل ہوگئی تو میں نے امیر آغا سے کہا: "میاں امیرین، جلدؤ اسی بات پر ماچسین اور کرو روشن لالٹین، اٹھاؤ اپنے نعلین اور دباؤ انھیں در بغلین۔ آؤ میاں انورین، چلیں ہم سب ہوٹلین اور کھانا کھائیں ساتھ میں صادقین۔"

ایک ہی سانس میں جب نے یہ فقرہ مکمل کیا تو صادقین کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔" (صادقین)

ooo

"ایک دن پرانی باتوں کا ذکر چل نکلا تو میں نے ان سے پوچھا: ساحر صاحب آپ کی پہلی شعری تخلیق کون سی ہے؟

ایک آہ بھر کے بولے۔ "میری پہلی شعری تخلیق ایک نظم تھی جس کا عنوان تھا اصطلز۔ میں نے کہا: مکرر ارشاد ہو، عنوان میں نے ٹھیک سے نہیں سنا۔"

بولے: اصطلز۔ اصطلز۔ الف۔ ص۔ ط۔ غ۔ ر۔ میں نے اپنے سینے کے اندر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا: اصطلز۔ واہ اصطلز۔ کیا بات ہے اصطلز کی۔ اصطلز میں ایک عجیب کیفیت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اصطلز ہی سب کچھ ہے۔ اصطلز نہ ہو تو دنیا بے معنی ہے۔ زندگی کے اصطلز کو آپ نے جس طرح ادب کے اصطلز سے جوڑا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ سبحان اللہ اصطلز مرحبا اصطلز۔"

ساحر ہوشیار پوری نے میری اس بے ساختہ داد کے جواب میں پوری انکساری کے ساتھ سلام کرتے ہوئے کہا: "نوازش، عنایت، کرم، شکریہ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اصطلز کو سمجھا۔ تمھاری اصطلز فہمی کا میں قائل ہوگیا، ورنہ ان دنوں ہر طرف جہلا پھیلے ہوئے ہیں، کسی کو اصطلز کے معنی نہیں معلوم۔" (ساحر ہوشیار پوری)

مجتبیٰ نے جس شخصیت پر بھی لکھا ہے اس کی خوبیاں تلاش کی ہیں اور خامیوں پر مزاح کا پردہ ڈال دیا ہے۔ اس نے جتنے خاکے بھی لکھے ہیں وہ ایسی ہی شخصیات کے ہیں جن میں خاکہ نگار کا تختۂ مشق بننے کے لوازم موجود تھے۔

اردو زبان خود ابھی کم سن ہے، اس میں طنز و مزاح کی عمر تو اور بھی کم ہے۔ ابتدائی دور میں کچھ ہجویات کا کچھ فحشیات کا

منظوم ذخیرہ ضرور ملتا ہے مگر نثر میں شگفتہ نگاری کی طرح مرزا غالب نے اپنے بے تکلف خطوں سے ڈالی تھی۔ اودھ پنچ اور اس خانوادے کے اخباروں نے اسے مقبول عام بنایا۔ جب اردو نثر کو اس کا آب و رنگ مل گیا تو ہمیں پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور، احمد جمال پاشا، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں، ابن انشاء، مشفق خواجہ، عطاء الحق قاسمی، کرنل شفیق الرحمٰن، شوکت تھانوی جیسے منجھے ہوئے طنز و مزاح نگار ملے جن کی تحریریں پڑھ کر اردو زبان کی وسعت، قوت، تاثیر اور شگفتگی و شادابی کا احساس ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین بھی ہمارے ان مزاح نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ ان کی اولاد معنوی بھی ماشاء اللہ بہت ہے اور اس اعتبار سے کثیر العیال آدمی ہیں۔

مجتبیٰ کی تحریروں کے دو رخ اور بھی ہیں۔ ان کے دو سفرنامے بھی شائع ہوئے ہیں۔ پہلا سفرنامہ "جاپان چلو، جاپان چلو" ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ ان کے سفر جاپان کی نہایت دل کش داستان ہے۔ اس میں بھی ان کا اسلوب پوری طرح رچا ہوا ہے۔ دوسرا سفر نامہ "سفر لخت لخت" کے عنوان سے اسی سال (۱۹۹۵ء) منظر عام پر آیا ہے جو متعدد اسفار کے احوال پر مشتمل ہے۔

دوسرا رخ ان کی کالم نویسی کا ہے۔ کالم نویسی پاکستان میں تو باقاعدہ ایک صنف بن گئی ہے اور بعض کالم بہت ہی پُر لطف اور مسرت انگیز لکھے جاتے ہیں، ہندستان میں اس کا ایسا چلن نہیں ہوا، مگر مجتبیٰ نے اس فن میں بھی میدان مار لیا ہے۔ ان کے کالم ایسے نہیں ہوتے کہ روزانہ اخبار کی ردی کے ساتھ بک جائیں۔ ایک پرانے صحافی بہت دل چسپ کالم لکھا کرتے تھے، ان کے بارے میں ایک بزرگ نقاد کے سامنے میں نے تعریف و تحسین کی تو انھوں نے مختصر سا تبصرہ کیا تھا اور کہا تھا: "جی ہاں کالم دل چسپ ہوتے ہیں مگر وہ "ادب" نہیں ہے۔" بعد کو میں نے غور کیا تو یہ نہایت بھرپور تبصرہ تھا۔ مجتبیٰ کے کالموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں "ادب" بھی ہوتا ہے اس لیے ان کا ایک حصہ تو یقیناً زندہ رہے گا اور ہمیشہ دل چسپی سے پڑھا جائے گا۔

اتنا لکھنے کے بعد اپنی ہی تحریر کو پلٹ کر دیکھتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں بہت سے طویل اقتباسات آگئے ہیں انھیں کم کرنا چاہتا ہوں، قلم کسی بھی جملے کو کاٹنے سے انکار کرتا ہے اور دوسرے بہت سے اقتباسات میری طرف ایسی التجا بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں بھی، کہیں کھپادو، مگر میں ان سے نگاہ بچا بچا کر گزر جاتا ہوں۔ مجتبیٰ کے کئی پہلو ایسے ہیں جن مستقل کتاب کی ضرورت ہے، یعنی اس کا اسلوب نثر، اس کی خاکہ نگاری، اس مزاح نگاری اور کالم نگاری۔ میں ان کی طرف صرف اشارے ہی کرسکا ہوں۔

○●○

سید خالد قادری

مجتبیٰ حسین

(اردو کا شریر ادیب)

اردو ادب سے عموماً شریف ادیب اور آوارہ شاعر منسوب کیے جاتے رہے ہیں گو کہ تاریخ میں کہیں کہیں بد نام (Notorious) ادیبوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جیسے کہ سعادت حسن منٹو یا عصمت چغتائی وغیرہ مگر Naughty یا (شریر) ادیبوں کی کوئی خاص روایت نہیں پائی جاتی۔ یہاں تک کہ پطرس بخاری، فرحت اللہ بیگ، شفیق الرحمان اور مشتاق احمد یوسفی وغیرہ جو بہ ظاہر اپنی تحریروں میں بلا کے فقرے باز اور چرب زبان دکھائی دیتے ہیں نجی زندگی میں انتہائی شریف، وضع دار اور نیک طینت بتائے جاتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین ہی میرے خیال میں شاید موجود دور کے اردو کے وہ تنہا ادیب ہیں جنھیں Naughty یا شریر کہا جاسکتا ہے۔ وہ تمام لوگ میری اس بات سے اتفاق کریں گے جو ان کے ماضی سے واقف ہیں یا جنھوں نے ان کی صحبت میں کچھ وقت گزارا ہے۔

خود میرے ذہن میں ان کی یہ امیج ابھارنے کے ذمے دار مجتبیٰ حسین کے نوجوانی کے دنوں کے دوست شاذ تمکنت، اقبال متین اور عوض سعید وغیرہ ہیں۔ یہ لوگ جب کبھی ماضی کی راکھ کریدنے کے موڈ میں ہوتے تو اپنے ان ساتھیوں کا ذکر کرتے جو اس وقت تک حیدرآباد سے جاچکے تھے۔ جیسے وحید اختر، حفیظ قیصر، سردار سلیم، زبیر رضوی اور عزیز قیسی وغیرہ۔ واجدہ تبسم کے لمبے سیاہ گیسو بھی کبھی کبھی ان یادوں میں رنگ بھردیتے تھے۔ ایسے موقعوں پر مجتبیٰ حسین کا ذکر بھی آتا مگر ایک بے حد فطین اور شرارتی دوست کے طور پر جس کی قربت گو کہ دل چسپ ہونے سے زیادہ پریشان کن ہوا کرتی تھی مگر جس کی دوری نے اسے دل سے قریب تر کردیا ہو۔

شاید یہی وجہ ہوگی کہ مجتبیٰ حسین سے میری ملاقات حال میں ہونے کے باوجود ایسا لگتا ہے جیسے میں انھیں برسوں سے جانتا ہوں۔

"مجتبیٰ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔"

"مجتبیٰ نہایت شریف آدمی ہے!"

"مجتبیٰ کمال کا آدمی ہے!"

"مجتبیٰ عجیب و غریب آدمی ہے!"

مجتبیٰ حسین کے تعلق سے ان کے دوستوں کے ایسے کتنے ہی جملے پچھلے دس بیس برسوں میں میں اتنی بار سن چکا ہوں کہ ان سے رسمی ملاقات نہ ہوتے ہوئے بھی وہ میرے ذہن کے کسی حصے میں ایک "خاص آدمی" کی طرح موجود رہے ہیں۔

ویسے تو ان کے مداحوں کی تعداد لسانی اور جغرافیائی حدوں کو توڑتے ہوئے ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں یا کروڑوں میں ہوگی مگر کچھ عرصہ قبل مجھ سے پہلی بار وہ اس طرح ملے جیسے وہ خود میرے مداح ہوں۔ ان کی پندرہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور میں نے شاید اب تک پندرہ ڈھنگ کے مضامین بھی نہیں لکھے۔ بہ حیثیت ادیب وہ بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں جب کہ مجھے خود اپنے شہر حیدرآباد

میں بھی گنتی کے چند دوستوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ میں اپنے بارے میں ان کے توصیفی کلمات سن کر حیرت میں پڑ گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال کر محظوظ ہونا تو ان کا وطیرہ رہا ہے۔ مگر انھوں نے اس بات کو بھی یہ وضاحت کرکے غلط ثابت کردیا کہ وہ ایسی شرارتیں صرف دیرینہ احباب کے ساتھ ہی کرتے ہیں۔ جب میں نے اسے ان کی ذرہ نوازی کہا تو انھوں نے " ذرا نوازی " اور " بہت نوازی " کے بارے میں دلی کے ایک پنجابی دوست کا لطیفہ سنا ڈالا۔ بہر حال مجتبیٰ حسین نے ان سے میری پہلی ملاقات کے پہلے ہی دن میری چند گم نام تحریروں کی ان گنت بار تعریفیں کرکے صورتِ حال کو یک سر بدل دیا۔ یعنی یہ کہ صبح وہ میرے مداح کی طرح مجھ سے ملے تھے اور شام تک میں ان کا مداح بننے پر مجبور ہوچکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ واقعی مجتبیٰ صاحب کمال کے آدمی ہیں۔ ان سے تو بہت پہلے ملاقات ہونا چاہیے تھی۔ تقریباً ،، کے دہے میں جب میں حیدرآباد نیا نیا آیا تھا اور شاذ تمکنت کے ہمراہ پہلی بار اورینٹ ہوٹل گیا تھا تو ہوٹل کے لاؤنج سے گزرتے ہوئے میں نے ایک سانولے سے لمبے قد کے شخص کو اختر حسن (پیام اور بلٹز کے سابق ایڈیٹر) سے بڑی بے تکلفی سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف پایا۔ اطراف دو چار لوگ اور بھی جمع ہوکر قہقہے لگا رہے تھے۔ شاید ان کی کوئی نظم تھی جس میں " گھن " ، " دھن " ، " ٹھن " قسم کے کچھ الفاظ قافیے کے طور پر استعمال ہوئے تھے۔ یہ صاحب کچھ اس انداز سے انھیں اسی طرح کے مزید قافیے جیسے لندن ، واشنگٹن اور ابراہم لنکن ، کونڈہ لکشمن وغیرہ تجویز کررہے تھے کہ خود اختر حسن کو بھی دوسروں کے ساتھ قہقہوں میں شامل ہونا پڑا تھا۔

" یہ کون صاحب ہیں جو اختر حسن جیسے سینئر آدمی سے اتنی بے تکلفی برت رہے ہیں ؟ " میں نے شاذ سے دریافت کیا تھا۔

" ارے یار ! یہ اپنا پرانا دوست ہے مجتبیٰ ! مجتبیٰ حسین۔ نہایت شریر آدمی ہے۔ چھٹا ہوا فقرے باز اور فطین۔ مجھ سے تو خیر اسس کی دال نہیں گلتی مگر دوسرے معصوم دوستوں کو اپنی فقرے بازیوں سے تنگ کرتا رہتا ہے۔ کبھی تم سے ملواؤں گا ویسے آدمی دل چسپ ہے۔ جتنی دیر ساتھ رہے گا ہنسا ہنسا کر ناطقہ بند کردے گا "۔

میں نے کہا۔ " شاذ صاحب رہنے دیجیے۔ مجھے ایسے لوگوں سے ملنا پسند نہیں جو تھوڑی بہت ملاقات میں ہی بے تکلفی برتنا شروع کردیں یہاں تک کہ مذاق اڑانے پر اتر آئیں "۔

شاذ صاحب کہنے لگے " میاں ڈرو نہیں۔ اپنا دوست اچھی خاصی جمالیاتی حِس رکھتا ہے۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف اچھی شاعری بلکہ اچھی صورت کا بھی شیدائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم سے ملنے پر وہ سنجیدگی سے پیش آئے گا "۔

مجتبیٰ حسین کے تعلق سے شاذ کی دی گئی اس تسلی کے باوجود عرصے تک مری تشویش ختم نہ ہوسکی اور میں ہر اس موقع اور محل سے گریزاں رہا جہاں ان سے ملنے یا ملوائے جانے کا اندیشہ ہو۔ ابھی کچھ عرصہ قبل اورینٹ ہوٹل کا ذکر آنے پر مصحف اقبال توصیفی نے جو کبھی شاذ کے ہمراہ پابندی سے وہاں جاکر بیگم اختر کی غزلیں سنا کرتے تھے مجھے بتایا تھا کہ ان دنوں مجتبیٰ حسین کی اورینٹ میں آمد کا منظر کچھ ویسا ہی ہوا کرتا تھا جیسا شکیل بدایونی کی ایک پرانی غزل کے اس شعر میں بیان گیا ہے جو کچھ یوں ہے کہ

اٹھا جو مینا بہ دستِ ساقی تمام میکش پکار اٹھے

ادھر سے پہلے ، ادھر سے پہلے ، ادھر سے پہلے ، ادھر سے پہلے

اقبال کے خیال میں اورینٹ ہوٹل میں مجتبیٰ کی حیثیت بھی کسی ایسے ساقی سے کم نہ تھی جس کے پیمانے وہاں مدتوں گردش میں رہے ہوں۔ ان کے ہوٹل کے لاؤنج میں آتے ہی وہاں پڑی میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے سیاست داں ، آرٹسٹ ، ادیب اور شاعر

سبھی کرسیوں سے اٹھ اٹھ کر انھیں اپنی طرف ہاتھ ہلا ہلا کر بلانے لگتے۔ خود مجتبیٰ ایسے موقعوں پر تھوڑی دیر کے لیے اپنی جگہ پر ٹھہر کر حالات کا جائزہ لیتے پھر لوگوں کی چیخ و پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی ایسی میز کی طرف بڑھ جاتے جس پر انھیں اپنا اس دن کا شکار نظر آجاتا۔ کچھ دیر بعد کتنی ہی میزیں خالی دکھائی دیتیں اور تمام قہقہے اس ایک میز کے اطراف گونجتے سنائی دینے لگتے جس پر وہ بیٹھے ہوتے۔

مجتبیٰ کے پرانے دوستوں کا خیال ہے کہ وہ سادہ اور شریف لوگوں کی زندگیوں میں ہلچل مچاکر بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ کسی کو آواز بدل کر فون کرکے مغالطے میں ڈال دینا، کسی دوسرے سے منسوب کرکے کوئی ایسی بات کہہ دینا جس سے مخاطب Provoke (مشتعل) یا ہراساں ہوجائے یا پھر کوئی اور ایسی حرکت جو باعث شر ہوسکے جیسی کہ بچوں کے لیے لکھی گئی ایک کہانی میں بیان کی گئی ہے جہاں شیطان انسان کا بھیس بدل کر ایک مٹھائی کی دکان سے صرف تھوڑا سا شیرا لےکر دیوار پر لگادیتا ہے جس کے بعد کا سارا ہنگامہ خود بہ خود وجود میں آتا ہے۔ مجتبیٰ حسین اردو کے روایتی شاعروں کی عادات اور ہیئت پر ایسی پھبتیاں کستے ہیں کہ بزرگ شعرا برہم ہوکر ان کی ہجو لکھنے کی سوچنے لگتے ہیں اور نوجوان انھیں دیکھ کر راستہ بدل دیتے ہیں مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس کا مقصد شاعری یا شاعروں کی تحقیر نہیں بلکہ ان سے اپنی محبت کا اظہار کرنا ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کچھ لوگ پرانے دوستوں سے خلوص کا اظہار گالی گلوج اور دھول دھپے کے بغیر نہیں کرسکتے۔ اگر وہ آپ سے ادب سے پیش آئیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ ان لوگوں میں سے نہیں جو ان کے دل کے قریب ہیں۔ ان کو اپنا فون نمبر دیتے ہوئے جب میں نے اس تشویش کا اظہار کیا کہ کہیں وہ اس کا استعمال مجھے پریشان کرنے کے لیے اس طرح تو نہ کریں گے جیسا کہ انھوں نے شاذ تمکنت اور قدیر زماں کے ساتھ کیا تھا تو انھوں نے نہایت سنجیدگی سے مجھے بتایا کہ ویسی بے تکلفی وہ صرف قریبی دوستوں سے ہی برتتے ہیں۔

عرصہ پہلے مجتبیٰ کے ایسے ہی ایک پرانے دوست نے ان کے نوجوانی کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

"یار! اپنا ایک دوست مجتبیٰ تھا۔ آج کل دلی میں ہے۔ بلا کا ذہین تھا اور تو اور عشق و محبت کے بھی ایسے نئے اور انوکھے طریقے ایجاد کرلیتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔"

میرا استعجاب بڑھنے پر اس نے مجھے بتایا کہ دراصل اس کی ایک محبوبہ تھی جس کی فطرت میں بےحد جذباتیت اور خود سپردگی تھی۔ ان دنوں حیدرآباد میں لڑکیوں سے ملنے جلنے کے کھلم کھلا مواقع نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ایک نیا طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ وہ رکشہ میں پردہ لگاکر اپنی محبوبہ کے ساتھ بیٹھ جایا کرتا تھا اور رکشے والے سے ناملی سے حسین ساگر تک کے کئی چکر لگواتا تھا تاآں کہ اس در پردہ وصال سے اس کا یا پھر اس کی محبوبہ کا جی نہ بھر جائے۔ بعد میں اس بات کی تصدیق شاذ اور عوض سعید نے بھی یہ کہتے ہوئے کی تھی کہ "یار سچ مانو ان دنوں ہم لوگ مجتبیٰ کی قسمت پر رشک کیا کرتے تھے۔ اس کا عشق اس عمر میں بھی پوری طرح مادی اور زمینی تھا جس عمر میں ہمارے عشق مابعد الطبیعیاتی اور ماورائی ہوا کرتے تھے۔" گو کہ مجتبیٰ حسین نے عہد شباب میں اپنے اس عشق کے سلسلے میں خاصی جراءت رندانہ سے کام لیا تھا اور رکشہ پر پردہ بندھوانے کو چھوڑ کر کسی اور طرح سے اس کی پردہ پوشی کی کوشش نہیں کی تھی مگر نہ جانے کیوں اپنی تحریروں میں وہ اس موضوع کے در پردہ ذکر تک سے بھی گریز کرتے آئے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اس موقع پر بھی ٹال مٹول سے کام لیا جب زبیر رضوی، کمار پاشی اور مخمور سعیدی نے ان سے لیے گئے ایک طویل انٹرویو میں اس موضوع پر ان سے ایک سیدھا سوال کر ڈالا۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی نیک نفسی کو کسی پردہ نشین کی بےپردگی منظور نہ ہو یا پھر خود اپنے اندر چھپ کر بیٹھے ہوئے عاشق کا پردہ، مجاز سے نکل کر باہر آنا! البتہ چند دنوں پہلے "سیاست" کے کالم میں حیدرآباد کی چٹانوں پر بنائی گئی

لوتھر صاحب کی ڈاکو منٹری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جب وہ حسین ساگر کے سرے پر کبھی واقع اس چٹان کے کاٹ دیے جانے کا ماتم کرنے سے اپنے آپ کو نہ روک سکے جو ان کی الفت رفتہ کی گواہ تھی تو مجھے یوں لگا جیسے خرابی صحت اور ناپائیداری دنیا کے ہر پل بڑھتے احساس نے شاید اب مجتبیٰ حسین سے ان کا ضبط و احتیاط چھین کر انھیں عمرِ گزشتہ کو آواز دینے پر مجبور کردیا ہے۔

مجتبیٰ حسین کا میرے ذہن میں رومانی یا غیر رومانی، مثبت یا منفی جیسا بھی خاکہ رہا ہو میں اس بات کا بہت عرصہ پہلے ہی قائل ہوچکا تھا کہ اس شخص کی تحریریں قاری کو اپنی طرف راغب کرنے کی ایسی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہیں کہ اسے محض مزاح نگار کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی تحریروں میں مجھے زندگی کی حرارت اور فن کی صداقت دونوں کا وہ امتزاج دکھائی دیتا ہے جو ایک سچے فن کار کی شناخت کرواتا ہے اور شاید اسی لیے میں سوچتا ہوں کہ ان کا دنیائے ادب میں وارد ہونا اور پھر بہت جلد ہی مقبولیت اور شہرت کی بلندیوں کو چھولینا محض ایک اتفاق نہیں۔

انوکھا اور دلچسپ اسلوب، رعایت لفظی، قصہ گوئی، مرقع کشی، واقعہ نگاری اور بات میں بات پیدا کردینے کے ہنر میں مجتبیٰ حسین اپنی مثال آپ ہیں۔ Humour اور Pathos کو ایک دوسرے میں ضم (Mingle) کردینے کے سلسلے میں انگریزی انشاء پردازوں میں Charles Lamb کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ اردو میں کرشن چندر کے بعد یہ وصف مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ بانی کے بارے میں، جو ایک طویل علالت کا شکار رہے اور جن کے مجموعے کا نام "حساب رنگ" ہے، ان کی یہ سطریں اس کا بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہیں۔

"بانی ان دنوں چھوٹی بحر کا مصرع بن گئے تھے۔ ہاتھ میں چھڑی آگئی تھی جو اس مصرعے کو وزن سے گرنے نہیں دیتی تھی۔ چھڑی کیا تھی اچھی خاصی ضرورت شعری تھی۔ اس وقت بانی کے "حسابِ رنگ" میں ایک ہی رنگ جڑا ہوا تھا اور وہ تھا زرد رنگ جیسے بانی بانی نہ ہوں ہلدی کی گانٹھ ہوں۔"

سلیمان اریب پر لکھا ہوا ان کا خاکہ بھی اسی ضمن میں آتا ہے جسے ان کے بہترین خاکوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ خود اپنے آپ پر ہنستے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"پچیس چھبیس برس ادھر کی بات ہے مخدوم محی الدین انڈر گراؤنڈ تھے اور میں مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔ ان دنوں بھی مجھے اتنی ہی انگریزی اور اردو آتی تھی جتنی اب آتی ہے۔ لہٰذا میں اپنے تئیں انڈر گراؤنڈ کا آسان ترجمہ "زیرِ زمین" کرکے گھنٹوں حیران رہا کرتا تھا کہ مخدوم بھائی آخر زیرِ زمین رہ کر کیا کرتے رہتے ہیں۔"

مجتبیٰ کی ان سطروں کو پڑھ کر مجھے ان کے گلبرگہ کالج کے دنوں کے ہم نشیں قدیر زماں کا خیال آگیا جنھوں نے چند برس پہلے مشہور روسی ادیب دوستو سکی کی تصنیف Notes From The Underground کا ایسا ہی آسان ترجمہ "زیرِ زمین کے خطوط" کر ڈالا تھا مگر مجتبیٰ کی طرح حیران رہنے کے بجائے، کہ زیرِ زمین سے خطوط کیسے آتے ہوں گے، انھوں نے مغنی صاحب سے مشورہ لینا مناسب سمجھا جنھوں نے اسے "روپوشی کی تحریریں" میں تبدیل کرکے ان کی مشکل آسان کردی۔ (عنوان کی اس مشکل سے قطع نظر، قدیر زماں کا یہ ترجمہ عمدہ تھا) میں نے بچپن میں کبھی ایک شعر سنا تھا۔

مسکرا کر غم کی راہوں سے گزر زندگی زندہ دلی کا نام ہے

سوچتا تھا پنجاب کے کسی شاعر کا ہوگا۔ یہ تو آج بھی معلوم نہیں کہ یہ شعر کس کا ہے مگر زندہ دلی کے معنی و مفہوم جس پر

ان دنوں غور کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی تھی اب اتنے برسوں بعد زندہ دلانِ حیدرآباد کے توسط سے سمجھ میں آسکے۔ کئی سال پہلے جب اس انجمن کی کوئی اہم کانفرنس تھی، یعنی سلور جوبلی یا گولڈن جوبلی قسم کی اور میں اس کے بارے میں زیادہ نہ جانتا تھا تو ایک ادیب دوست نے جو مزاحیہ ادب اور مصطفیٰ کمال دونوں کے قائل نہ تھے مجھے خبر دی تھی کہ اگلے دو تین دنوں تک حیدرآباد میں مسخروں کی کانفرنس ہے۔ میرے اس سوال پر کہ اس میں کیا کیا ہوگا انھوں نے بتایا تھا کہ بس دو تین دنوں تک خوب غل غپاڑہ، لطیفہ بازی، قہقہے اور ہوبڑنگ رہے گی۔ مسخروں کے اس گروہ کے سرغنہ کے طور پر انھوں نے مجتبیٰ حسین اور ان کے ساتھیوں کے طور پر حمایت اللہ، مصطفیٰ کمال، نریندر لوتھر اور طالب خوندمیری وغیرہ کی شناخت کرائی تھی۔ بعد کے سالوں میں جوں جوں زندہ دلانِ حیدرآباد کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا میرے ان ادیب دوست نے بھی نہ صرف اس کے تعلق سے اپنے متعصبانہ رویے میں تبدیلی پیدا کرلی بلکہ خود اپنی سنجیدہ تحریروں میں بھی طنز و مزاح کی گنجائش نکالنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دن جب بچلرس کوارٹر کی سیڑھیوں پر پسینے میں شرابور میری ان سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی اور میں نے ان سے ان کے اس حال اور محلِ وقوع کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ دل کا عارضہ ہونے کی وجہ سے وہ وہاں از راہ احتیاط تھوڑی دیر سستانے کے لیے ٹھہر گئے ہیں دراصل وہ مصطفیٰ کمال کے شگوفہ کے دفتر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں سے انھیں زندہ دلانِ حیدرآباد کے جلسوں کا دعوت نامہ حاصل کرنا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے بہ حیثیت مزاح نگار اپنی فطری ذہانت اور منفرد طرزِ تحریر کے بل بوتے پر جیسی ہمہ گیر مقبولیت حاصل کی ہے وہ کم ہی لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ زبان پر ان کی مضبوط گرفت کے علاوہ اس کی ایک وجہ ان کا وہ مخصوص Comic Vision بھی ہے جو ان کی تحریروں میں خود بہ خود ظرافت کے رنگ بھرتا چلا جاتا ہے۔

ویسے تو شاعری ہمیشہ ہی مذہبی، سماجی یا لسانی حدبندیوں کو توڑ کر عوام کے دلوں میں جگہ بناتی رہی ہے مگر نثرنگاروں کے لیے یہ کام دشوار رہا ہے۔ مجتبیٰ حسین میرے خیال میں اردو کے ان گنے چنے ادیبوں میں شامل کیے جاسکتے ہیں جنھیں اس ملک میں ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں کے قارئین نے بلا جھجک اپنالیا ہے اور ان کی تحریریں پڑھنے کے اسی طرح مشتاق رہتے ہیں جیسے خود اپنی زبان کے لکھنے والوں کی۔ اس کی کئی دوسری وجوہات کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اپنے اسلوب اور موضوع دونوں کے لحاظ سے مجتبیٰ حسین پطرس یا مشتاق احمد یوسفی کی طرح صرف اردو کے ایک Elitist طبقہ یا "مہذب آدمی" کے ادیب ہی نہیں بلکہ ایک عام آدمی Common man کے ادیب بھی ہیں۔ بلکہ اسے اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی تحریریں عام آدمی کی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو کا احاطہ از راہِ مذاق کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

نطشے نے جو عیسائیت دشمنی کے لیے بدنامی کی حد تک مشہور رہا ہے صلیب پر لٹکائے گئے عیسیٰ مسیح کی مظلوم اور Morbid امیج پر طنز کرتے ہوئے کہیں لکھا تھا۔ I wish Christ would have learnt to laugh آج جب کہ خود انسانیت جگہ جگہ سولی پر لٹکی دکھائی دے رہی ہے جنگ و جدال اور حرص و ہوس کے نرغے میں گھرے انسان کے لیے شاید مجتبیٰ حسین بھی کچھ ایسی ہی تمنا کرنا چاہیں گے۔

لوگ کہتے ہیں کہ مجتبیٰ جہاں بھی ہوں وہیں اپنی بزم سجالیتے ہیں۔ شاید اسی لیے ان کے حیدرآباد سے دہلی منتقل ہونے کے بارے میں ان کے ایک پرانے دوست نے Nostalgic ہوتے ہوئے کہیں لکھا تھا کہ اورینٹ ہوٹل سے اپنے تمام قہقہے سمیٹ کر

مجتبیٰ دہلی اٹھالے گئے اور اب وہی قہقہے دہلی کے پریس کلب اور کافی ہاؤس میں گونجتے سنائی دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے جلو میں جو قہقہے لے کر چلتے ہیں دہلی کے ادیبوں کی کتنی ہی محفلوں میں ان کے دم سے گہما گہمی رہی ہوگی مگر میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ عابد روڈ کے اورینٹ ہوٹل سے دہلی کے پریس کلب تک پہنچنے میں ان قہقہوں کی بے ساختگی اور افادیت میں کتنی کمی یا زیادتی واقع ہوئی ہے اس کا حساب خود مجتبیٰ سے بہتر شاید کوئی اور نہیں کرسکتا۔

زندگی کے بے پناہ غموں میں گھرے رہنے کے باوجود انسانوں کے قہقہہ لگانے کو وہ یوں سمجھتے ہیں جیسے وسیع سمندر میں بھٹکے ہوئے جہاز کو اچانک کوئی جزیرہ مل جائے۔ میری نظر میں مجتبیٰ کی بے شمار تحریریں ان کے قارئین کے لیے ایسے ہی خوش آئند جزیرے ہیں۔ مگر کیا یہ اپنے آپ میں ایک المیہ نہیں کہ جو انسان ہمیں اس لیے قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے کہ اسے ہماری زندگی کی پرتوں میں چھپے ہوئے محرومیوں اور ناآسودگیوں کے آنسو صاف نظر آتے ہیں ہم خود اس کی ہنسی کا آنکھ سے آنسو بن کر ٹپکنا کبھی نہیں دیکھ پاتے۔

میرا خیال ہے کہ مجتبیٰ حسین کا باطن ان کی ہنسی کی پھلجھڑیوں اور قہقہوں کی گونج کے پیچھے کہیں گہرائی میں دبا پڑا ہے۔ اسے ان کے بچپن اور جوانی کے ان ایام میں ڈھونڈنا ہوگا جن کے پس منظر میں ان کی ذہنی اور جذباتی زندگی کی نشوونما ہوئی ہے۔ اس کے لیے اس مجتبیٰ حسین سے بھی ملنا ہوگا جو اپنے بے قرار دل کے قرار کے لیے پنکج ملک اور سہگل کے گانے اور مجاز کی غزل:

سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

سرد شاموں اور چاندنی راتوں میں دوستوں کو گا کر سنایا کرتا تھا اور شاید اس مجتبیٰ حسین سے بھی جسے دنیا کبھی سگریٹ کے گہرے اور کثیف دھوئیں کے پیچھے سے ابھرتی دکھائی دیتی تھی اور پھر آخر میں مجتبیٰ حسین کو جاننے کے لیے ہمیں انھیں ڈھونڈنا ہوگا۔ ان کی ان گم شدہ اور بے نام تحریروں میں جو طنز و مزاح نہیں شاعری کے زمرے میں آتی ہیں اور جنھیں انھوں نے کبھی دل کی انگلیوں سے لکھا ہوگا۔ مگر پھر میں سوچنے لگتا ہوں کہ جو شخص مدتیں گزریں قہقہوں کے طوفان میں روپوش ہوچکا ہے اسے اس کی پناہ گاہوں سے نکال کر باہر لانا کیا ایک طرح کی ستم ظریفی نہ ہوگی۔۔۔۔

○●○

(سلسلہ صفحہ ۱۱۰ سے)

دو بڑی بڑی مانوس آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔

فوراً ہی تانگا چل پڑا اور تب سنبل نے ایک بار سر سے پاؤں تک شہناز کو دیکھا اور رخ بدل کر بے بی کو سینے سے چمٹا لیا۔

"کیا ہوگیا ہے آپ کو؟" شہناز نے اسے بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔"

وہ بہ دستور ادھر دیکھتا رہا۔

"کمال ہے بھئی۔۔۔ یہ آپ کیا تکے جارہے ہیں ادھر اتنی دیر سے۔ کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے۔"

"وہ۔۔۔ وہ کھلونا۔۔۔ دیکھ رہا تھا۔"

"کھلونا۔۔۔ یا عورت؟"

"وہ بھی تو ایک کھلونا ہی ہے اپنے شوہر کے لیے" وہ شہناز کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "جیسے تم میرے لیے ایک پیارا سا کھلونا ہو"

پھر وہ فوراً ہی ایک خالی تانگے کی طرف بڑھ گیا۔

○○

انتظار حسین (لاہور، پاکستان)

مجتبیٰ حسین کے لیے دو کالم

ابھی پچھلے دنوں کراچی میں جو ایک طنز و مزاح کانفرنس ہوئی ہے اس کی خوش بو ہمیں لاہور میں اس طرح سے پہنچی کہ ہندستان سے آئے ہوئے ایک مہمان کانفرنس سے نکل کر سیدھے لاہور پہنچے۔ یہ اپنے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین تھے۔ تعجب سے کہنے لگے کہ اس کانفرنس میں ہندستان کے مزاح نگار تو بہت نظر آرہے تھے مگر پاکستان کے مزاح نگار دکھائی نہیں دیے۔

ہم اس پر کچھ گزارش کرنے لگے تھے کہ ایک دوست نے اس محفل میں ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیا اور کہنے لگا۔ حضرت آپ نے کالم میں لکھا ہے کہ پاکستان میں رونما ہونے والے حادثوں کی وجہ سے کون کون سی تقریب ملتوی ہوئی اور ہوتی چلی جارہی ہے کراچی کے ایک شاعر کا بھی ذکر کیا جب وہ اپنے مجموعہ کلام کی افتتاحی تقریب کی تاریخ طے کرتا ہے تو مہاجر اور پٹھان آپس میں لڑنا شروع کردیتے ہیں۔ مگر دیکھیے طنز و مزاح کانفرنس کو تو شہر کی کوئی آفت اور ملک کا کوئی سانحہ منعقد ہونے سے پہلے روک سکا۔ مطلب ہے کہ کوئی واقعہ آدمی کو کوئی کام کرنے سے نہیں روک سکتا۔ بس ہمت شرط ہے۔

یہ بات سنتے ہوئے ہمیں شیخ سعدی کا وہ مشہور شعر یاد آگیا۔

چناں قحط سالے شد اندر دمشق — کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس شعر میں جو سچائی بیان کی گئی ہے اس کا مظاہرہ ہم پچھلے سالوں میں کراچی میں دیکھ چکے ہیں۔ سہراب گوٹھ کے سانحہ کے آس پاس کے دنوں میں مت پوچھیے کہ کتنی تقریبیں ملتوی ہوئیں۔ انھیں تاریخوں میں ایک ادبی تقریب میں ہمیں بھی اس شہر میں جانا تھا ادھر سے ہمیں تار آگیا کہ شہر کے حالات ناسازگار ہیں اس لیے تقریب ملتوی ہوگئی ہے۔ ہمیں یہ التوا بہت جائز نظر آیا۔

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل — کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

ایسے پُرآشوب وقت میں ادب اور عشق کا کسے ہوش ہوتا ہے۔ شعر و ادب عشق و عاشقی ایسے سب معاملات موقوف ٹھہرتے ہیں۔

مگر اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ آفت اگر طول کھینچ جائے تو پھر ردِ عمل الٹ ہوجاتا ہے۔ مصیبت زدہ یار سوچتے ہیں کہ آؤ غم غلط کریں اور عشق کریں۔ ٹھیک سوچتے ہیں کہ غمِ روزگار کا اگر کوئی توڑ ہے تو غمِ عشق ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کراچی والے قحط زدہ دمشق والے ردِ عمل سے اب آگے نکل گئے ہیں۔ کتنے دنوں تک اس شہر میں کاروبار معطل رہے۔ سب کاروبار معہ کاروبارِ عشق کے۔ دردمندوں نے گریہ بھی کیا۔ اب وہ فراموشیٔ عشق اور گریہ دونوں منزلوں سے گزر گئے ہیں۔ رو دھو کر دیکھ لیا۔ اب ہنس کر بھی دیکھ لیں۔ بالکل ٹھیک ہے آدمی کچھ نہ کرسکے تو پھر اسے ہنسنا چاہیے۔ جانوں پر جو کچھ بھی گزرے ذہنی صحت تو سلامت رہنی چاہیے اور ہمیں حفیظ جالندھری کا ایک مصرعہ بے ساختہ یاد آیا ہے۔ "اب خوب ہنسے گا دیوانہ" ہاں لیجیے مجتبیٰ حسین کی بات تو بیچ ہی میں رہ گئی۔ ان کے تعجب کا ہم کیا جواب دیں۔ مجتبیٰ حسین کا حیدرآباد دکن سے تعلق ہے۔ اس کانفرنس میں وہ اکیلے نہیں آئے وہاں سے اور مزاح نگاروں کو بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ جس بزرگ نے اس طنز و مزاح کانفرنس کا ڈول ڈالا تھا ان کا تعلق بھی حیدرآباد دکن ہی سے ہے اور طنز و مزاح تو اصل میں حیدرآباد ہی کی ایجاد ہے۔ ابھی پچھلے برسوں میں ہم کچھ ایسے ہی موقع پر حیدرآباد جا نکلے تھے۔ ار

کانفرنس کا رنگ دیکھا۔ یاروں کا رنگ ڈھنگ دیکھا۔ اس کانفرنس کے زیرِ اہتمام ایک مشاعرہ ہوا۔ مزاحیہ شاعروں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی اور یہ سب شاعر حیدرآباد ہی کے تھے اور ہم حیران کہ یااللہ حیدرآباد میں کیا سب شاعر مزاحیہ شاعری ہوتے ہیں۔

تو ہمارے جس حیدرآبادی بزرگ نے یعنی کہ حمیدالدین شاہد صاحب نے اس کانفرنس کا اہتمام کیا انھوں نے بجا سوچا کہ پاکستان میں مزاحیہ شاعر بلکہ نظم و نثر دونوں میں ملاکر مزاح نگار ہیں کتنے۔ ڈھائی تین جتنے ہیں وہ کیا بھاڑ کو جھونکیں گے۔ پڑپڑ کر کے ٹھنڈے ہوجائیں گے۔ اس کے لیے جس ایندھن کی ضرورت ہے وہ تو حیدرآباد ہی سپلائی کرسکتا ہے۔ سو انھوں نے حیدرآباد سے ایندھن وافر مقدار میں مہیا کیا اور گرمیِ محفل کا بندوبست کرلیا۔ مجتبیٰ حسین ہی بتارہے تھے کہ طنز و مزاح کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ جس میں پاکستانی مزاح نگاروں کی کمی محسوس ہورہی تھی۔

ایک تن جلا کہنے لگا کہ وہ موجود ہوتے تو پھر ہمیں طنز و مزاح کی کمی محسوس ہوتی۔

اس پر ہم سوچ میں پڑگئے۔ کیا فی زمانہ طنز و مزاح اکیلے حیدرآباد کی جاگیر ہے۔

مجتبیٰ حسین بھی تو اسی حیدرآباد سے منجھ کر نکلے ہیں اور کیا خوب نکلے ہیں۔ حیدرآباد کو یہاں اہلِ دل رو دھو بیٹھے تھے۔ سوچتے تھے کہ اپنے زوال کے ساتھ وہ شہر ٹھنڈا ہوگیا مگر دیکھیے اسی خاک سے یہ چنگاری برآمد ہوئی ہے۔ بلکہ اس شہر میں ظرافت کی فصل پھولتے دیکھ کر اسے زعفران زار حیدرآباد کہنے کو جی چاہتا ہے اور زعفران زار حیدرآباد سے کیا شگوفہ پھوٹا ہے کہ رنگ مزاح میں اس وقت اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

مجتبیٰ حسین کے اعزاز میں شیزان میں جو ایک تقریب ہوئی وہ کسی بھی نام سے ہوئی ہو یاروں نے اسے عطاء الحق قاسمی ہی کی طرف سے جانا۔ عطاء الحق قاسمی ہی کے وہ اس شہر میں مہمان تھے۔ تقریب میں انھوں نے ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا کہ "دنیا کے عفورو ایک ہوجاؤ"۔

اس پر کسی نے مہمان اور میزبان کی سنگت کو دیکھا اور کہا کہ دنیا کے مزاح نگارو ایک ہوجاؤ۔

مجتبیٰ حسین کا ذکر ہم کریں تو سہی مگر اس میں دقت بہت ہے۔ یوں اس دقت میں ایک خیر کا پہلو بھی ہے۔ ہماری دقت کا اس سے اندازہ لگایئے کہ ہم نے جن دوستوں کو مجتبیٰ حسین کی آمد کی خبر دی انھیں یہ بھی بتانا پڑا کہ یہ کون سے مجتبیٰ حسین ہیں۔

ہماری وضاحت کے بعد ایک دوست نے اپنے مزید اطمینان کے لیے پوچھا "تو گویا یہ وہ مجتبیٰ حسین نہیں ہیں"۔

"نہیں"۔

"پھر ٹھیک ہے"۔

ایک دوست کو یہ سمجھاتے ہوئے کہ یہ وہ مجتبیٰ حسین نہیں ہیں ہم نے کہا کہ "یہ مزاح نگار مجتبیٰ حسین ہیں"۔

وہ ہنسا۔ "مجتبیٰ حسین اور مزاح؟ کیسی باتیں کرتے ہو۔ اس کے بعد تم ممتاز حسین کو مزاح نگار بتاؤ گے"۔

وہ تو یہ کہیے کہ مجتبیٰ حسین کا نام اس طرح سے نہیں نکلا تھا جیسے ممتاز حسین کا نام اپنی تنقید کی دقت کے باوجود نکل گیا تھا۔ اسی لیے آج کل کے یارانِ ادب نے ہمارے لیے اس قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا کہ ہمیں سمجھانا پڑتا کہ یہ کون سے مجتبیٰ حسین ہیں۔ بلکہ انھیں تو اپنی طرف سے بتانا پڑتا ہے کہ ایک مجتبیٰ حسین اس سے پہلے بھی گزر چکے ہیں جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ رفت گزشت ہوگئے۔ مگر جو دوست پاکستان کے پہلے عشرے سے ادب کے ساتھ الجھے چلے آرہے ہیں انھوں نے بے شک پچھلے تیس بتیس

سال سے کبھی گزشتہ مجتبیٰ حسین کو ان کی کسی تحریر کو بھولے سے بھی یاد نہ کیا ہو ۔ مگر حالیہ مجتبیٰ حسین کے ذکر پر انھوں نے اوبدا کر پوچھا کہ "اچھا مجتبیٰ حسین کس کھوہ سے نکل آئے ۔"

جب کوئی نام دہرایا جاتا ہے تو اسی قسم کی دقتیں اور قباحتیں پیدا ہوتی ہیں ۔ ادیب کا نام ابھی فضا میں گونج رہا ہو اور کوئی دوسرا ادیب اسی نام کا پیدا ہوجائے تو کئی قسم کی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں ۔ ادیب گوشہ ، گم نامی میں چلا جائے اور پھر اس نام کے ساتھ کوئی دوسرا ادیب سر اٹھائے تو دوسری قسم کی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں ۔

ابھی تھوڑے مہینے کی بات ہے کہ ہمیں ایک ٹیلی فون آیا ۔ مانوس سی آواز آئی "میں محمود ہاشمی بول رہا ہوں ۔" پھر رک کر "دلی والا محمود ہاشمی نہیں ۔" ۔۔۔

ہم نے کہا کہ "حضرت آپ نے کیسے گمان کیا کہ ہم آپ پر دلی والے محمود ہاشمی کا شک کریں گے ۔" وہ بولے "بھائی وہ محمود ہاشمی آج کل لندن ہی میں ہیں ۔ میں بہت مشکل میں ہوں ۔ ادبی حلقوں میں تو آج کل ان ہی کی مشہوری ہے ۔"

یہ "کشمیر اداس ہے" والے محمود ہاشمی تھے ۔ جب مسئلہ کشمیر زندہ تھا تو کشمیر سے متعلق رپورتاژوں کی نسبت سے ان کا نام بھی پاکستان کے ادبی حلقوں میں زندہ و تازہ تھا ۔ اب دلی والے محمود ہاشمی نے نام پایا ہے اور نام سا نام کہ دلی سے جو بھی آتا ہے اس سے پوچھیں نہ پوچھیں وہ آپ کو محمود ہاشمی کی خیریت ضرور سناتا ہے ۔

خیر ذکر تو مجتبیٰ حسین کا مقصود تھا ۔ ان مجتبیٰ حسین کا جو ہمارے زمانے کے صفِ اول کے مزاح نگار ہیں ۔ حیدرآباد دکن کی مٹی ہیں ۔ دلی میں پائے جاتے ہیں ۔ اصل میں وہ ان پچھلی دہائیوں میں ابھرے اور نام ور ہوئے ہیں ۔ جب ہندستان اور پاکستان کے درمیان کتابوں اور رسالوں کا تبادلہ یک سر موقوف تھا ۔ جاری تو اب بھی نہیں ہوا ہے ۔ مگر اتنا ہے کہ اب چوں کہ ادیبوں کا تبادلہ بڑے پیمانے پر شروع ہوچکا ہے تو ان کے واسطے سے کتابیں اور رسالے بھی کسی نہ کسی صورت ادھر کے ادھر پہنچنے لگے ہیں اور ادھر سے ادھر آنے لگے ہیں ۔ سو مجتبیٰ حسین کا مزاح ادھر اب جاکر پہنچنا شروع ہوا ہے اور اب وہ یہاں کے قارئین پر اپنا جادو چلا رہا ہے ۔ مگر قصہ یہ ہے کہ ادب میں جو پرانے ہوجاتے ہیں خواہ لکھنے والے ہوں خواہ خالی پڑھنے والے ان کا مطالعہ اور اس کے ساتھ ان کا ادبی شعورِ عصری ادب کے ساتھ چلتے چلتے کسی موڑ پر آکر اٹک جاتا ہے ۔ پھر ادب کی فضا اور سے اور ہوجاتی ہے اور وہ اسی موڑ پر بھٹکے کھڑے رہتے ہیں ۔ ان ہی دنوں کی بات ہے ۔ ہم نے سنا ہے کہ لندن سے ایک بزرگ آئے کہ کبھی ادب میں ان کا قدم ہوا کرتا تھا ۔ ایک محفل میں باتیں کرتے ہوئے ٹھنڈا سانس بھرا اور افسوس بھرے لہجے میں بولے کہ شاعری میں راشد اور فیض کے بعد اور ادھر افسانے میں منٹو اور کرشن چندر کے بعد کوئی پیدا ہی نہیں ہوا ۔

بس اسی قسم کے دوست تھے جنھوں نے مجتبیٰ حسین کے ذکر پر ہمارے لیے مشکلات پیدا کیں ۔ ان دوست کا ادبی مطالعہ اور ادبی حافظہ کہیں ترقی پسند تحریک کے آخری ایام کے آس پاس آکر ٹھٹکا ہوا تھا ۔

"بس ادب تو اس زمانے میں تھا ۔" ایک دوست کی یادوں نے زور مارا اور شروع ہوگئے "کیا گہما گہمی تھی ۔ کیا زمانہ تھا ۔ کیا لوگ تھے ۔"

ایک نوخیز ادیب مبہوت ہوکر یہ سنتا رہا ۔ پھر اس نے ہماری طرف دیکھا جیسے ہم سے اس بیان کی تصدیق چاہتا ہو ۔ ہم نے پوچھا "تم نے کبھی دلی کے کسی پرانے بزرگ کی باتیں سنی ہیں ؟"

"نہیں ۔"

"پھر تم اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔" اور ہم اسے بتانے لگے کہ دلی کے پرانے بزرگ دلی کو اس طرح یاد کرتے ہیں کہ "ا، جی کے دن تھے۔ سستے کے زمانے تھے۔ آم گدھوں کے حساب بکتے تھے۔ گدھوں پر لدے آموں کو دیکھ کر بھاؤ تاؤ اس طرح کیا جاتا تھا کہ کتنے ٹکے کا گدھا دیا ہے۔" "گویا ترقی پسند تحریک کے زمانوں میں بھی ادب کی اتنی ہی افراط تھی۔ وہ سب ادیب جو اتنی افراط سے ادب پیدا کر رہے تھے کہاں گئے۔"

اب ہم نے ٹھنڈا سانس بھرا "میرے دوست کیا پوچھتے ہو۔"

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

اب جو تم ترقی پسند ادیب دیکھتے سو یہ تو باقیات الصالحات ہیں اور جب ہم نے اس عہد کے نام گنانے شروع کیے تو وہ جوان ہر نام پر حیران ہوا کہ اچھا اس زمانے میں یہ ادیب تھے۔ ایک نام سن کر بہت چونکا۔

"عارف عبدالمتین۔ اچھا تو وہ ترقی پسند ہوا کرتے تھے۔ واقعی ؟"

ہم نے کہا "عزیز اگر تم نے عارف عبدالمتین کی ترقی پسندی نہیں دیکھی تو اس دنیا میں آکر کیا دیکھا۔"

لیجیے بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ ذکر تو مجتبیٰ حسین کا تھا۔ مجتبیٰ حسین کے بارے میں ایک تو یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ وہ براہ راست مزاح نگار ہیں۔ مطلب یہ کہ صحافت کے راستے مزاحیہ ادب کی اقلیم میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔ شاید اس کا انھیں احساس بھی ہے پہلے نہیں تھا تو پاکستان آکر ہوگیا۔ باتیں کرتے کرتے کہنے لگے کہ "پاکستان میں ہم نے عجب بات دیکھی۔"

ہم نے عرض کیا کہ پاکستان میں تو بہت سی عجب باتیں دیکھنے والی ہیں۔ آپ نے کون سی عجب بات دیکھی۔"

بولے "ہم نے یہ عجب بات دیکھی کہ یہاں اخبار کے کالموں کو بھی مزاحیہ ادب میں شمار کیا جاتا ہے اور مزاحیہ ادب کو فکاہی الم سمجھا جاتا ہے۔ پتہ ہے میرے ساتھ تمھاری کراچی والی طنز و مزاح کانفرنس میں کیا ہوا ؟"

ہم نے پوچھا "بتاؤ کیا ہوا ؟"

بولے "میں جب اپنا مضمون پڑھ چکا تو ایک صاحب آئے۔ شاید کسی پرچے کے ایڈیٹر تھے۔ کہنے لگے کہ اپنا یہ کالم ہمارے پرچے کے لیے عنایت کر دیجیے۔" میں سٹپٹایا پوچھا "کون سا کالم ؟ یہ تو میرا مضمون ہے۔" اب ان کے سٹپٹانے کی باری تھی۔

مجتبیٰ حسین کے اس تعجب میں تھوڑا دخل شاید اس بات کا بھی ہے کہ ہندستان میں کالم نگاری نے زیادہ فروغ ہی نہیں پایا۔ مزاحیہ ادب میں اس کے شامل ہونے نہ ہونے کا سوال پیدا ہوتا۔ اور اردو اخباروں میں وہاں کالموں کا زیادہ چلن نہیں ہے۔ صحافت کی پرانی روایت کے مطابق ایک اخبار میں ایک فکاہی کالم کی گنجائش رکھی جاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین بتاتے تھے کہ ہندی اخباروں میں بھی وہاں کالم نگاری کو وہ فروغ نہیں ملا ہے جو پاکستان میں ملا ہے۔ بلکہ ہندی میں تو مزاحیہ ادب بھی واجبی واجبی ہے اور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی زبان جب بہت ترقی کر لیتی ہے، اظہار کی صورتیں بن سنور چکتی ہیں، تب اس زبان میں مزاح پیدا ہوتا ہے۔

خیر مطلب یہ ہے کہ ہندستان میں تو کالم نگاری نے وہ فروغ ہی نہیں پایا کہ مزاحیہ ادب کے لیے خطرہ بن جاتی اور کالم نگار مزاح نگاروں کے لیے چیلنج بنتے۔ مجتبیٰ حسین تعجب نہ کریں، شکر کریں کہ ان کے یہاں مزاحیہ ادب کی سرحدیں محفوظ ہیں اور وہ کالم نگاروں کے خوف اور خطرے سے آزاد اپنی مزاح نگاری میں مصروف اور مگن ہیں۔

○●○

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

مجتبیٰ حسین کی کالم نگاری

گلبرگہ نے اردو ادب، حیدرآباد اور صحافت کو تین گراں قدر تحفے دیے۔ محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین۔ یہ تینوں بھائی ہیں اور تینوں ادب و صحافت کے جنید سورما۔ بہ قول مرزا ظفرالحسن:

"کم خاندان ایسے ملیں گے جن کے تین افراد اور تین بھائی ایک ہی راستے پر گام زن ہوں اور وہ راستہ بھی علم و ادب اور صحافت کا ہو۔" (تین بھائی، تینوں ادیب، تینوں صحافی، مشمولہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر ص: ۱۵۰)

محبوب حسین جگر نے ابتدا افسانہ نگاری سے کی اور پھر صحافت میں انھوں نے جو نام پیدا کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ ابراہیم جلیس کے قلم کی کاٹ آج تک محسوس کی جاسکتی ہے۔ ترنگے کی چھاؤں میں چالیس کروڑ بھکاری، دو ملک ایک کہانی اور بے شمار مضامین ان کے تلخ ترش لہجہ کے آئینہ دار ہیں۔ پاکستان منتقل ہوجانے کے بعد ابراہیم جلیس باضابطہ طور پر صحافت سے وابستہ ہوگئے۔ ان کے کالم ایک صرف ایوانِ مملکت میں ہل چل بپا کردیتے تھے تو دوسری طرف عوام کے دلوں کی دھڑکن تھے۔ ان دو قدآور شخصیتوں کے چھوٹے بھائی مجتبیٰ حسین ہیں جنھوں نے روزنامہ سیاست کی کالم نگاری سے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ مجتبیٰ نے اپنے پہلے مزاحیہ مضمون "ہم طرف دار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں" سے ہی مقبولیت کی سیڑھی پر قدم رکھا اور بڑی تیزی سے ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ ان کو دیکھنے کے لیے سر اٹھائیں تو ٹوپی گرنے کا خدشہ رہتا ہے۔

اردو میں کالم نگاری کا آغاز مرزا مچھو بیگ نے کیا۔ جو "ستم ظریف" کے قلمی نام سے کئی برس تک اودھ پنچ میں لکھتے رہے۔ اودھ پنچ میں مرزا مچھو بیگ کے علاوہ سید محمد آزاد، احمد علی شوق کسمنڈوی، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق اور خود اودھ پنچ کے ایڈیٹر سجاد حسین نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے ہیں لیکن ڈاکٹر وزیر آغا اودھ پنچ کی ظرافت کو بلند پایہ ظرافت نہیں قرار دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اودھ پنچ کی تحریروں میں تمسخر، تضحیک، پھکڑپن، ابتذال اور ہجویانہ لب و لہجہ نمایاں تھا۔

اودھ پنچ کے بعد مزاحیہ کالم کے ضمن میں زمین دار کا نام لیا جاسکتا ہے جس کا کالم "افکار و حوادث" بڑی دل چسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ یہ کالم لکھنے والوں میں عبدالمجید سالک کا نام بہت اہم ہے۔ یہی عنوان یعنی "افکار و حوادث" مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اخبار "الہلال" کے لیے بھی منتخب کیا لیکن اس میں سیاسی مباحث زیادہ اور طنز و مزاح نہ ہونے کے برابر تھا۔ صرف چند موقعوں پر مولانا آزاد نے قدرے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔

عبدالمجید سالک زمین دار سے علاحدہ ہوئے تو انھوں نے خود اپنا اخبار انقلاب جاری کیا اور اس کے طنزیہ و مزاحیہ کالم کے لیے یہی نام "افکار و حوادث" قائم رکھا۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے کلکتہ سے نکلنے والے اخبار نئی دنیا کے لیے کولمبس کے نام سے کالم لکھے اور جب زمین دار سے وابستہ ہوئے تو سند باد جہازی کا قلمی نام اپناکر کالم نگاری کی۔

تقسیمِ ہند کے بعد اردو صحافت اور اردو اخبارات کی پالیسی میں نمایاں تبدیلی آئی۔ لیکن وہ عارضی تھی۔ آہستہ آہستہ طنز کی کاٹ

میں اضافہ ہوتا گیا۔ اگرچہ بیش تر اخباروں کے کالم اخبار کی پالیسی کے مطابق ہوا کرتے تھے لیکن فکر تونسوی نے "ملاپ" میں مستقل کالم "پیاز کے چھلکے" لکھ کر طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری کو ایک اعتبار عطا کیا۔ فکر تونسوی سے قبل شوکت تھانوی نے بھی ہندوستان میں اور بعد میں پاکستان میں کالم لکھے۔ جو کافی مقبول تھے۔ خواجہ احمد عباس "اردو بلٹز" کے لیے ہر ہفتہ کالم لکھا کرتے تھے۔ "اردو بلٹز" کا آخری صفحہ خواجہ احمد عباس کے لیے وقف ہوتا تھا۔ راجہ مہدی علی خان نے بھی متعدد اخباروں کے لیے کالم لکھے۔ احمد جمال پاشا نے "قومی آواز" کے لیے کالم نگاری کی۔ خوشتر گرامی نے اپنے رسالے "بیسویں صدی" میں تیر و نشتر کے عنوان سے ایک مستقل کالم شامل کیا۔ یہ کالم خوشتر گرامی ہی کے نام سے چھپتا تھا لیکن اس کے لکھنے والوں میں کرشن چندر، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی بھی شامل تھے۔ بعد میں مجتبیٰ حسین نے بھی کچھ کالم تحریر کیے۔ اگرچہ ان میں سے کسی کا نام شائع نہ ہو سکا۔

کالم نگاری کے فن کو پاکستان میں بے حد ترقی ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی، عطاالحق قاسمی، مشفق خواجہ اور دوسرے نامی قلم کاروں نے کالم نگاری کی لیکن پاکستان کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہاں اخبار لاکھوں کی تعداد میں چھپتے اور بکتے ہیں۔ اسی لیے ان اخبارات کے معاونین کو معاوضہ بھی اچھا خاصہ ملتا ہے۔ مغرب میں تو ہفتہ میں ایک کالم لکھنا قلم کار کے لیے مہینہ بھر آسائش سے بھرپور زندگی گزارنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں یہ بات نہیں۔ شاید اسی لیے ہندوستان میں قلم کاروں نے کالم نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

فکر تونسوی کے بعد ہندوستان میں شاہد صدیقی کا نام آتا ہے جنھوں نے روزنامہ "سیاست" میں شیشہ و تیشہ کے عنوان سے "کوہکن" کا قلمی نام اختیار کر کے کالم لکھے۔ "کوہکن" کے انتقال کے بعد شیشہ و تیشہ کی جھنکار شاید ختم ہو گئی ہوتی لیکن جگر صاحب نے کوہ پیما کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ کوئی اور نہیں خود ان کا بھائی مجتبیٰ حسین تھا۔ جگر صاحب نے شاہد صدیقی کے انتقال سے پیدا ہونے والے خلا کو اس طرح پر کیا کہ مجتبیٰ کے ہاتھوں میں قلم دے کر کہا "لکھ" اور پھر مجتبیٰ کی شخصیت میں پوشیدہ سیماب صفت طنز و مزاح نگار جاگ اٹھا اور آہستہ آہستہ ایک ایسے اژدہے میں تبدیل ہو گیا جو کیڑے مکوڑوں کو نگل جانے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن مجتبیٰ نے دوسرے مزاح نگاروں کو نگلا نہیں بلکہ انھیں بھی اپنے ساتھ لیے طنز و مزاح کے تخلیقی سفر پر چل پڑا۔ عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب نے اخبار سیاست کی جو پالیسی بنائی تھی وہ کچھ غیر جانب دار قسم کی تھی۔ اس اخبار نے کسی سیاسی جماعت، یا شخصیت کا آرگن بننے کی بجائے خود اپنی شناخت بنائی۔ ایسے اخبار کے لیے کالم لکھنا اور بھی دشوار تھا۔ چناں چہ ابتدا میں مجتبیٰ کے تحریر کردہ کئی کالم جگر صاحب نے رد کرائے اور دوبارہ لکھوائے۔ مجتبیٰ حسین نے اس دشواری پر یوں قابو پایا کہ اپنی تحریروں کا موضوع سیاست کی بجائے سماجی عوامل کو بنایا اور سماجی ناہمواریوں پر طنز کے تیر برسائے یا پھر خالص مزاح لکھا۔ اختر حسن لکھتے ہیں:

> "پہلے تو مجتبیٰ کو انھوں نے (جگر صاحب نے) راہ طباعت کا سالک بنایا، پھر مسلکِ صحافت و سیاست کے رموز و نکات کو سمجھایا اور بالآخر شیشہ و تیشہ کے دمِ شمشیر پر چلنے کی ہدایت فرما کر منزلِ سلوک پر پہنچایا۔۔۔ (شگوفہ۔ مجتبیٰ حسین نمبر ص: ۲۹۳)

ظاہر ہے کہ جب جگر صاحب جیسا مرشد ہو اور مجتبیٰ جیسا سالک تو راہِ سلوک کی تمام منزلیں چشم زدن میں طے ہو جاتی ہیں۔ تقریباً پندرہ برس تک مجتبیٰ حسین نے "شیشہ و تیشہ" روزانہ پابندی سے لکھا۔

یہ دو بھائی بھی عجیب ہیں۔ ایک جگر صاحب تھے کہ بہن کی جان لیوا بیماری کے باوجود حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کے انعقاد میں مصروف رہے۔ بہن کا انتقال ہو گیا لیکن کانفرنس کے پروگرام میں کسی طرح کا خلل پیدا نہ ہوا۔۔۔ اور مجتبیٰ حسین۔۔۔ اپنی چھ سالہ

بیٹی ذکیہ کے انتقال کے بعد تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے تو اپنا کالم شیشہ و تیشہ لکھنے بیٹھ گئے۔ اپنے فن، اپنے کام اور اپنے مقصد سے اتنا ہرا devotion شاید ہی دیکھنے کو ملے۔

۱۵ برس تک مسلسل شیشہ پر تیشہ کی ضرب سے جھنکار پیدا کرنے کے بعد جب مجتبیٰ حسین ملازمت کے سلسلے میں دلی چلے گئے تو س کالم میں رخنہ پڑ گیا۔ پھر بھی دلی سے وہ سیاست کے لیے پابندی سے نہ سہی لیکن اکثر اپنی تحریریں بھیج دیا کرتے تھے ۱۲ / اگست ۱۹۹۲ء سے یہ سلسلہ پھر سے چل پڑا چناں چہ "میرا کالم" کے عنوان سے وہ ہر ہفتہ ایک مختصر مضمون روزنامہ "سیاست" کے لیے پابندی سے لکھ رہے ہیں۔ اس کالم کا انتخاب " میرا کالم " کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوا ہے۔

مزاحیہ کالم نگاری کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ جو بات کہی جائے وہ عام فہم ہو، دل چسپ ہو اور قاری کو نہ صرف ہنسنے پر مجبور کرے بلکہ غور و فکر کے لیے بھی دعوت دے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کالم نگار کے مزاج اور اس کے قلم میں جولانی اور شگفتگی ہو۔ مجتبیٰ حسین میں یہ خصوصیت بے پناہ ہے۔ وہ لطیفہ ڈھالنے کا فن جانتے ہیں۔ کسی طرح بھی بہ ظاہر معمولی سی بات میں لطیفہ پیدا کر لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بے حد تلخ بات کو بھی وہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ایک طرف دل پر آری چل جائے اور دوسری طرف دل پر تبسم رقص کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محفل احباب میں ہمیشہ مرکزِ نگاہ بنے رہے۔ انھوں نے زندگی کی تلخیوں کو پورے شعور اور ادراک کے ساتھ اپنے اندر سمو لیا اور اسی لیے ان کے اظہار میں ایک انوکھا پن نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک " مزاح انسان کے پیمانہ وجود کے لبریز ہو کر چھلک پڑنے کا نام ہے۔ جب انسان کے وجود کا پیمانہ لب ریز ہوتا ہے تو وہ قہقہوں کی شکل میں چھلکنے لگتا ہے۔" وہ کہتے ہیں:

> "زندگی کی ساری تلخیوں اور اس کی تیزابیت کو اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد جو آدمی قہقہہ کی طرف جست لگاتا ہے، وہی سچا اور باشعور قہقہہ لگا سکتا ہے۔ ہنسنے کے لیے جس قدر گہرے شعور اور ادراک کی ضرورت ہوتی ہے اتنے گہرے شعور کی ضرورت شاید رونے کے لیے بھی نہیں ہوتی۔۔۔" (قہقہوں کا سوداگر۔ مشمولہ شگوفہ۔ مجتبیٰ حسین نمبر ص: ۲۲۹)

نوابِ اودھ سعادت علی خاں نے اپنے مصاحب انشاء اللہ خان انشاء کو حکم دیا تھا کہ وہ ہر روز ایک نیا لطیفہ سنائیں۔ شروع میں نشاء نے اپنی طباعی کے زور پر کام چلایا۔ لیکن کچھ دن بعد ذخیرہ ختم ہوا تو ان کا یہ حال تھا کہ راستہ چلتے ہوئے کوئی واقف کار مل جاتا تو اس سے کسی نئے لطیفے کی فرمائش کرتے تاکہ وہ اسے دربار میں سنا سکیں۔ مجتبیٰ کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ پندرہ برس کوہ کنی کرتے کرتے وہ اتنے مشاق ہو چکے ہیں کہ موضوع ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ جوش ملیح آبادی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ الفاظ ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ یہی بات مجتبیٰ پر بھی صادق آتی ہے۔ ان کے آگے موضوعات ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ گرد و پیش کے واقعات و حادثات مجتبیٰ حسین کی قوت مشاہدہ سے بچ نہیں سکتے۔ " میرا کالم " میں مجتبیٰ نے جو کچھ لکھا وہ اپنے گرد و پیش سے ہی حاصل کیا لیکن ان کے اظہار میں جارحانہ پن نہیں جیسے فکر تونسوی کے ہاں نظر آتا ہے۔ مجتبیٰ کی تحریر کی بے ساختگی، شائستگی، روانی، اور تازگی قاری کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ بعض قارئین کے لیے اخبار میں صرف چند چیزیں پڑھنے کے قابل ہوتی ہیں حادثات و جرائم کی خبریں، فلمی اشتہارات اور مجتبیٰ حسین کا کالم۔!!

> یوسف ناظم لکھتے ہیں کہ "اگر وہ (یعنی مجتبیٰ حسین) کالم نگاری سے ادب نگاری کی طرف نہ آتے تو چھوٹی پٹری پر ہی رہتے۔ نقصان ان کا نہیں، بڑی پٹری کا ہوتا۔ (شگوفہ۔ ص: ۱۴۸، مجتبیٰ حسین نمبر)

جس پٹری کا ذکر یوسف ناظم کر رہے ہیں مجتبیٰ تو اس کے بلا شرکت غیرے مالک ہیں۔ کس کی ہمت ہے کہ وہ اس پٹری پر اپنی

ٹرین دوڑائے۔ کالم نگاری تو مجتبیٰ کی رگ و پے میں سما گئی ہے اور پھر کیا چھوٹی پٹڑی اور کیا بڑی پٹڑی، مجتبیٰ کا معاملہ تو اس جنگل کے راجہ شیر کا سا ہے جس کے بارے میں کسی سردار جی سے یہ سوال کیا گیا کہ شیر انڈے دیتا ہے یا بچے تو سردار جی نے مسکرا کر کہا "بادشاہو! شیر تو جنگل کا راجہ ہے۔ وہ تو جب چاہے انڈے دے اور جب چاہے بچے دے"۔

مجتبیٰ بھی کبھی انڈے دیتے ہیں کبھی بچے۔ چناں چہ کالم لکھتے ہیں تو اس میں بھی مزاحیہ مضمون کا سا لطف ہوتا ہے مرا کالم کے عنوان سے لکھی گئی تحریریں مزاحیہ مضامین ہی کے زمرے میں آتی ہیں۔

حیدر آباد مجتبیٰ کی کمزوری ہے۔ آج کل تو ہر آٹھ پندرہ دن بعد حیدر آباد میں نظر آتے ہیں۔ دلی میں ہوتے ہیں تو ان پر "حیدر آباد فوبیا" سوار رہتا ہے اور جب ملک سے باہر جاتے ہیں تو "انڈو فوبیا" کے شکار نظر آتے ہیں۔ یہ وہ نازک موقعہ ہوتا ہے جب ان کے اندر مزاح کم اور طنز زیادہ چھلکنے لگتا ہے۔ حیدر آباد سے اور حیدر آباد میں رہنے والے احباب سے مجتبیٰ کو اتنی محبت ہے کہ اگر کسی کو کانٹا چبھ جائے تو درد مجتبیٰ محسوس کرتے ہیں۔ حیدر آباد ہندوستان کے نقشے میں رقمی کاروبار (Money Business) کے لیے عجیب و غریب شہرت رکھتا ہے۔ یہاں کے لوگ شاید کچھ زیادہ ہی بھولے بھالے اور سیدھے سادے واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی سبز باغ دکھاتا ہے تو بڑی آسانی سے اس کے چکر میں آجاتے ہیں۔ چٹ فنڈوں کے شعبدے، بیرونی ممالک کو بھیجنے کے ہتھکنڈے، امانتوں پر غیر معمولی منافع دینے کے جھانسے حیدر آباد کے معصوم صفت لوگوں کو لوٹنے میں ہمیشہ سے ہی معاون ثابت ہوتے رہے۔ "المجتبیٰ والحسین" کا قلم اس بات کو کیسے نظر انداز کر دیتا جب کہ ان کے قریبی احباب اس چکر میں اپنی گاڑھی محنت کی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اپنے ایک کالم میں مجتبیٰ نے الطنز اور المزاح کے ایسے تیر برسائے کہ اب "ال" کا سابقہ استعمال کرتے ہوئے ہر کوئی خوف کھانے لگا ہے کہ کہیں اسے بھی دھوکہ باز نہ سمجھ لیا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ اس مضمون میں شعور کی رو انھیں الفلاح سے تہذیبی سفیروں اور تہذیبی پرنسوں کو تک بہا لے گئی۔ میرے دوست خالد قادری نے مجھ سے اس بات کی شکایت بھی کی لیکن شعور کی رو بہر حال بے لگام ہوتی ہے۔

حیدر آباد کے اخبارات میں ایک واقعے کی اطلاع چھپی کہ ایک معصوم بچی کو سڑک کے آوارہ کتے نوچ نوچ کر کھا گئے۔ ایسی رونگٹے کھڑے کر دینے والی خبر پڑھ کر ہر ایک یقیناً تھرا گیا ہوگا۔ مجتبیٰ حسین بھی تھرا گئے۔ اور جب ان کا قلم جاگا تو انھوں نے مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "کتو! انسانوں سے خبردار رہو"۔ اس مضمون کو پڑھ کر کبھی دہشت طاری ہو جاتی ہے اور کبھی ایک سرد آہ سی نکل پڑتی ہے اور کبھی بے ساختہ ہنسی کا فوارا ابل پڑنے کو بے چین ہو جاتا ہے۔ فسادات پر طنز کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> "اب تو یہ ہماری روز مرہ زندگی کا معمول بن گئے ہیں۔ بعض لوگ تو ان فسادات کو "گھریلو صنعت کا درجہ بھی دینے لگے ہیں"۔ (میرا کالم ص: ۸۱)

کتوں کے بارے میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

> "ہم نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کتے یوں انسانیت کی سطح سے نیچے گر جائیں گے۔ ہمیں کتوں سے بالکل یہ امید نہیں تھی کہ وہ ایسی غیر انسانی حرکت کے مرتکب ہوں گے۔ سچ پوچھیے تو جب سے انسان انسانیت سے دست بردار ہوا ہے تب سے ہم کتوں میں ہی کچھ انسانیت دیکھ دیکھ کر مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔۔۔" (میرا کالم ص: ۱۸ تا ۱۹)

اپنے مضمون میں کتوں سے متعلق چند دل چسپ فقروں کے بعد وہ آگے لکھتے ہیں:

> "حیدر آباد کے کتوں کو نہ جانے کیا ہو گیا کہ انھوں نے اچانک انسانیت کا لبادہ اتار پھینکا۔ یہ سب آج کے

انسانوں کی صحبت میں رہنے کا نتیجہ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر حیدرآباد میں فسادات نہ ہوتے تو کتوں کو کبھی پتہ نہ چلتا کہ ایک معصوم بچی کو بلاوجہ اس طرح چیرا پھاڑا جاسکتا ہے۔۔۔" (ص: ۲۲ میرا کالم)

اور ان سطور کو پڑھنے کے بعد جسم کے اندر ایک سرد سی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہی مجتبیٰ کا کمال ہے۔ رشوت ستانی ایک سنگین مسئلہ ہے۔ یہ موضوع بھی اکثر مجتبیٰ کی تحریروں میں جھلک جاتا ہے۔ محکمۂ موسمیات مجتبیٰ کو اسی لیے پسند ہے کہ ان کے خیال میں یہی ایک محکمہ ایسا ہے جہاں رشوت کا چلن نہیں۔ (محکمہ موسمیات کی حمایت میں۔ میرا کالم ص: ۹۵) اور جب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی وزیرِ توانائی کے لیے بیٹے کو تک بجلی کے ملازمین کو رشوت دینی پڑی تھی تو وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں

کہ "جب رشوت ہمارے سماج کا لازمی حصہ بن جائے تو اسے لعنت کے طور پر نہیں بلکہ ایک نعمت کے طور پر قبول کرلینا چاہیے۔" (منسٹر کے بیٹے نے رشوت دی _ "میرا کالم" ص: ۱۹۳)

اس لیے جب قدیرزماں "رشوت ستانی" کے عنوان پر انگریزی میں کتاب لکھتے ہیں تو مجتبیٰ حسین کی رگ ظرافت پھڑک اٹھتی ہے۔ (قدیرزماں کا رشوت نامہ "میرا کالم")

یہ نہیں ہے کہ مجتبیٰ صرف کالم یا مزاحیہ مضمون ہی لکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ دوستوں پر جان دینے والا اور ہر ممکنہ طریقے سے ان کی مدد کرنے والا مجتبیٰ حسین ایک بہترین (آرگنائزر) منتظم بھی ہے۔ ملک بھر میں کل ہند مزاحیہ کانفرنسوں کا انعقاد ان کی تنظیمی صلاحیتوں کا غماز ہے۔ وہ کسی کام کو لیتے ہیں تو ہاتھ دھو کر بلکہ بغیر ہاتھ دھوئے ہی اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ یہ مجتبیٰ ہی کا کارنامہ ہے کہ ہندستان بھر میں طنز و مزاح کا سیلاب سا آگیا ہے۔ شگوفہ کمال یعنی مصطفیٰ کمال نے شگوفہ جاری کرکے ایک طرف نئے اور پرانے لکھنے والوں کو طنز و مزاح کی طرف مائل کیا تو دوسری طرف مجتبیٰ نے ان لکھنے والوں کو اتنا اچھالا کہ ان میں سے چند تو آسمان میں اٹک گئے۔ اور تو اور صدیوں سے اجڑتے اور بستے شہر پُرآشوب دلی میں بھی مجتبیٰ نے طنز و مزاح کو فروغ دیا۔ محفلیں آراستہ کیں۔ مشاعرے منعقد کیے۔ عالمی سطح پر بھی مجتبیٰ نے اردو طنز و مزاح کو اعتبار عطا کیا۔ برطانیہ ہو کہ امریکہ، جاپان ہو کہ روس، جہاں جہاں مجتبیٰ کے قدم پڑے، طنز و مزاح کے چشمے ابلنے لگے۔ شاید اسی لیے مجتبیٰ کے جاپان کے سفر کے بارے میں نریندر لوتھر لکھتے ہیں:

"حکومت نے اسے بھیجا تو کچھ سیکھنے کے لیے تھا لیکن وہ وہاں جاپانیوں کو اردو مزاح سکھا آیا۔" (انڈرا کلیس حسین _ مشمولہ شگوفہ "مجتبیٰ حسین نمبر" ص: ۱۰۵)

مجتبیٰ حسین وہ معشوق ہے جس کی زلف گرہ گیر کا ہر کوئی اسیر ہے۔ ہوٹلوں اور کلبوں کے بیرے اور معظم جاہی مارکٹ سے حسین ساگر تک To & Fro کرنے والے رکشہ راں سے لے کر ادیب، شاعر، مصور، سنگ تراش، موسیقار، سرکاری عہدہ دار، سیاست داں، تاجر سبھی مجتبیٰ کے عاشق ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی مجتبیٰ حسین کو پارس کی کرسی کی طرف بڑھتے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ پارس بخاری کی کرسی نہ جانے کہاں رہ گئی۔ اب تو وہ طنز و مزاح کے ایسے تخت طاؤس پر براجمان ہیں جس کی آب و تاب سے آنکھیں چندھیا جائیں۔

کون کہتا ہے کہ اردو ختم ہورہی ہے۔ جس زبان میں مجتبیٰ جیسا ادیب ہو، اس زبان کی موت ممکن نہیں۔ اردو کے ایک بہت مشہور ناول نگار تھے ابنِ صفی۔ مجھے یاد ہے کہ کئی لوگوں نے صرف ابنِ صفی کو پڑھنے کے لیے اردو سیکھی اور اسے پڑھ کر اس زبان پر اس قدر عبور حاصل کیا کہ خود ادیب اور شاعر بن گئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہی لوگ اب ابنِ صفی کا نام لینے سے بھی شرماتے ہیں۔ کچھ یہی حال مجتبیٰ حسین کا بھی ہے۔ دنیا بھر میں کئی چاہنے والوں نے مجتبیٰ حسین کو پڑھنے کے لیے اردو سیکھی اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ دل چسپ پہلو یہ

(باقی ص: ۶۷ پر)

قدیر زماں

مطالعہ

مجتبیٰ حسین کی کتاب "میرا کالم"

ناقدانِ ادب کا خیال ہے کہ اچھے مزاح نگار کے لیے اس کی طبیعت میں جودت، طنز و مزاح اور ژرف نگاہی کا پایا جانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کی تحریروں میں اختصار لے ساتھ تحریف نگاری اور پیکر تراشی بھی ضروری ہے۔ اسے زبان و بیان پر مکمل قدرت ہو اور وہ تضاد و تناسب کو برتنے کے فن سے بھی واقف ہو۔ میرے خیال میں ان کے علاوہ ایک اور صفت کا موجود ہونا ازبس ضروری ہے۔ میں اسے ایک بنیادی ضرورت سمجھتا ہوں۔ اس کے بغیر مزاحیہ تحریر کا ایک خوب صورت مرقع تو تیار کیا جاسکتا ہے لیکن وہ مرقع بے جان ہوگا اگر اس میں حزن و ملال کی کیفیت نہ ہو۔ ایک مزاح نگار کا حزن و ملال سے خود آشنا ہونا ضروری ہے اور وہ حزن و ملال کو اس طرح برتے کہ جس ہم دردی کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہو اسی ہم دردی کو دوسروں کے لیے روا رکھے۔ مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں یہ صفت کچھ زیادہ ہی نمایاں ہے۔ ان کے کرداروں اور خود مصنف کے درمیان کوئی خلیج نہیں ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے بارے میں لکھتے ہوئے خود اپنے بارے میں لکھنے لگ جاتے ہیں۔ جیسے جیسے مضمون آگے بڑھتا ہے ان دونوں کے درمیان کا فرق گھٹ جاتا ہے۔ بعض مزاح نگاروں کو پڑھ کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کی پستی کی باتیں تو کرتے ہیں لیکن خود کسی اونچے ٹیلے پہ بیٹھے نظر آتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر قاری مزے تو لے سکتا ہے لیکن اپنے آپ کو ان میں شامل نہیں کرپاتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا ٹکراؤ ہے۔ ان اصطلاحوں کو چاہے آپ قبول نہ کریں مجتبیٰ کی تحریریں ادب برائے زندگی کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں مجتبیٰ کے صرف ستاون منتخب کالم ہیں جو گزشتہ تین چار سال میں روزنامہ "سیاست" کے قارئین کے لیے لکھے گئے۔ اس مضمون میں تمام کالموں کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے بلکہ مجتبیٰ کے دو ایک ایسے اوصاف بیان کیے ہیں جنھیں میں نے نمایاں طور پر محسوس کیا ہے۔

"کہانی کب ختم ہونی چاہیے" ایک ایسا عنوان ہے جو ہر شخص کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے لیے آدمی کا زیادہ پڑھا لکھا یا کہانی کار ہونا ضروری نہیں ہے۔ مجتبیٰ ایک ادبی محفل میں پہنچے تو کسی افسانہ نگار نے اپنی کہانی ختم کی تھی اور بحث اس بات پر تھی کہ کہانی اور جاری رہ سکتی تھی۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجتبیٰ نے کہا ہے۔ "اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ کوئی کہانی کار اپنی کہانی کو کہیں بھی ختم کردے زندگی کی کہانی کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔" پھر انھیں اس بات کا دکھ ہے کہ ماہ و سال کی گردش کے ساتھ بعض کہانیاں ہمارے بیچ میں سے غائب ہوتی جارہی ہیں۔ اس رات انھیں نیند نہیں آئی اور انھوں نے محسوس کیا کہ چاند میں چرخا چلانے والی بڑھیا ان کے وجود میں کچھ زیادہ ہی چرخا چلارہی ہے۔ اسے پڑھ کر ایک قاری اس چرخے کو اپنے وجود میں کچھ اور بھی زیادہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ مضمون میں مجتبیٰ نے ایک ادبی محفل میں اپنی آمد کا ذکر کرتے ہوئے وہاں پر جو چند کرداروں کو ہی نہیں بلکہ

ان کے متعلقین اور دیگر کرداروں کو بھی قاری کے سامنے پیش کرتے ہوئے اسے چاند کی بڑھیا کے چرخے تک پہنچادیا۔

ادب کے مطالعے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ قاری اپنے آپ کو شہ پاروں سے الگ رکھے اور اپنے مطالعے کی لذت یا کیفیت حاصل کرے اور اس سے مستفید ہو۔ یہ طریقہ، کار تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین بلکہ انشائیوں کے لیے بھی مناسب ہوسکتا ہے لیکن وہ جو قاری کی اپنے آپ کو ادبی فن پارے کے کرداروں سے مشابہت، مماثلت یا مخالفت رکھنے والی بات ہے وہ ایک بے ساختہ عمل ہے۔ اس کی کیفیت چیزِ دیگراست والی بات ہے۔ یہ بے ساختہ عمل ناولوں، افسانوں اور مزاحیہ مضامین کے مطالعے کے ساتھ خود بہ خود وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے کہ خود فن کار کی تحریر میں بے ساختگی موجود ہو۔

مجتبیٰ کا مضمون "ایک مختلف دن" اس کی اچھی مثال ہے مضمون تو شروع ہوتا ہے کسی صاحب کے سیر کے ارادے سے دلی آنے اور ان کا ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں مقیم ہونے سے۔ پھر ہوٹل کا بیرا انھیں ناشتے، لنچ اور رات کے کھانے کے اوقات میں الجھا دیتا ہے۔ مسافر دلی کی سیر کو نکلتا ہے کہ نہیں خود مجتبیٰ سیر کو نکلنے سے پہلے قاری کو چند اور کرداروں سے ملاتے ہیں۔ گھپلوں میں ملوث حوالات سے بچنے والا سیاسی لیڈر، دودھ کے راتب کا لڑکا، صابن کی ٹکیہ بیچنے والی سیلز گرل، ڈیگال اور جمال عبدالناصر جیسے حکومتی سربراہ، مجتبیٰ کا اپنی اہلیہ سے مکالمہ۔ اس کے بعد کندن لال سہگل کی موسیقی۔ ان سب سے گذر کر آپ سیتارام کیسری کے انتخابی نتیجہ تک صرف چند صفحات میں پہنچ جاتے ہیں۔ مجتبیٰ اپنے دوست کی گاڑی میں سیر کو نکلے ہیں تو باتوں باتوں میں قاری کو پریس کلب آف انڈیا، کناٹ پلیس، کافی ہاؤس اور بنگال مارکٹ کی سیر کرادیتے ہیں۔ جب وہ انڈیا انٹرنیشنل پر ٹھہر جاتے ہیں تو کوکب دری مرحوم کی یاد دلاتے ہیں۔ پھر ذوق، مجاز، فیض اور مخدوم کے گانے سدیپ گلوکار سے سنوادیتے ہیں۔ وہاں سے نکل کر موٹر گاڑی جب سیتارام کیسری کے گھر کے سامنے سے گزرتی ہے تو وہاں لوگوں کی بھیڑ ہے جو "زندہ باد" کے نعرے لگارہی ہے۔ یہاں کار کا ڈرائیور مجتبیٰ کو سیتارام کیسری کے انتخاب جیتنے کی خبر سناتا ہے تو مجتبیٰ پوچھتے ہیں "کون سیتارام کیسری؟" یہاں ڈرائیور کی غیرت کو (قاری کو بھی شامل کرلیں) للکارنے کے بعد اس مختلف دن کے گزرنے کا اظہار مجتبیٰ ان الفاظ میں کرتے ہیں: "اس دن ہماری روح بھی صاف و شفاف، پاکیزہ اجلی اور سبک محسوس ہوئی۔"

مجتبیٰ کی تحریروں میں دل سوزی، دکھ، انسان دوستی، جیسے احساسات جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ ہنستے ہیں تو بھی اس میں ایک حزن پوشیدہ ہوتا ہے۔ ایک کشاکشِ روزگار کا غم۔ روزگار کے تصور کے ساتھ ہم اس بینا بھکاری کو بھول نہیں سکتے جو مجتبیٰ کے ایک مضمون میں چشمہ لگاکر بھیک مانگتا ہوا ملتا ہے۔ لوگوں پر جب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ایک اچھا خاصا بھلا چنگا بصارت رکھنے والا شخص ڈھونگ رچا کر سیاہ چشمہ اپنی آنکھوں پر لگائے بھیک مانگ رہا ہے تو وہ اسے دھتکارتے ہیں اور منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں لیکن اسی آدمی پر جب مجتبیٰ کی نظر پڑتی ہے تو وہ اس سے یہ باتیں کہلواتے ہیں۔ "بھائی صاحب مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں چشمہ لگائے بغیر سورج کی طرف دیکھوں تو کہیں میری آنکھوں میں بینائی نہ آجائے۔ میرا ذریعہ، معاش تو یہی اندھاپن ہے۔ اگر یہ چلاگیا تو بھوکوں مرجاؤں گا میں تو دنیا کو اپنی آنکھوں سے نہیں پیٹ کی نظر سے دیکھتا ہوں۔"

بھیک مانگنے والوں، بے سہارا اور سڑک پر پڑے آدمیوں کا دھیان آتا ہے تو پھر ہمیں مجتبیٰ سے مل کر "مدر ٹریسا کے ساتھ چند ساعتیں" گزارنا چاہیے۔ مدر ٹریسا کا ایک پہلو تو ہمارے سامنے ہے کہ انھوں نے بے سہارا لوگوں کے لیے ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک میں یتیم خانے کھولے، سڑکوں پر پڑے ہوئے مریضوں اور بے سہارا لوگوں کو اٹھا اٹھا کر رسکیو ہوم اور ہسپتال تک پہنچایا اور ان کی

تیمارداری اور خدمت کی۔ لیکن مدر ٹریسا کا ذکر مجتبیٰ جن الفاظ میں کرتے ہیں اس سے خود مجتبیٰ کے اندر چھپے ہوئے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ انعامی کمیٹی کے ارکان نے جب کھانے کی بات کی تو مدر ٹریسا نے کہا۔ "جو کھانا آپ مجھے کھلانے والے ہیں وہی کھانا میرے چیریٹی ہوم پر بھیج دیں۔ میں اس کھانے کو یتیم خانے میں یتیم بچوں کے ساتھ کھانا پسند کروں گی۔" خیر یہ تو مدر ٹریسا کا جذبہ تھا۔

اب دیکھیے کہ مجتبیٰ حسین نے کس دل سوزی کے ساتھ اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ "یہ وہ ہاتھ ہیں جو کسی بے سہارا کے سر پر ہوں تو ایک وشال سہارا بن جاتے ہیں۔ کسی یتیم کے سر پر ہوں تو ممتا کا روپ دھارن کرلیتے ہیں۔ کسی زخم کو چھولیں تو مرہم بن جائیں۔ کسی کانٹے کو چھولیں تو یہ پھول بن جائیں اور پھول کو چھولیں تو وہ خوشبو بن جائیں اور خوشبو کو چھولیں تو بادِصبا بن کر خوش بو کی مہک کو سارے ماحول میں پھیلادیں۔"

مجتبیٰ تو انعام دینے والوں کی کمیٹی کے ممبر تھے اور تقسیمِ انعامات کے لیے انھوں نے مدر ٹریسا کو مدعو کیا تھا لیکن خود انھیں کوئی بڑا انعام نہیں ملا۔ (بعد میں انھیں بھی ملا) ۔ اس کا انھیں دکھ بھی نہیں ہے۔ وہ انعام پانے والے ادیبوں کی خوشی میں دل کھول کر شریک ہوتے ہیں اور کہتے ہیں "بھلے سے ہم دوستوں کا دکھ درد بھی نہ بانٹ سکیں ان کی خوشیوں میں تو بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ خود ہمیں کوئی بڑا انعام آج تک نہیں ملا۔ جو دے اس کا بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔"

مجتبیٰ حسین کی دردمندی اور ان کے اس تعلقِ خاطر کو جو سماج کے پس ماندہ اور دکھی طبقے سے ہے نقادوں نے بہ طورِ خاص سراہا ہے۔ مغنی تبسم لکھتے ہیں کہ

> "مجتبیٰ کا موضوع انسان ہے اور وہ اسے سماج کے چوکھٹے میں دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ مختلف طبقوں کے انسانوں کی عادتوں اور ان کے خصائل کا مجتبیٰ نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے کرداروں کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دینا مجتبیٰ کا خاص وصف ہے۔"

نامی انصاری نے لکھا کہ

> "مجتبیٰ نے زندگی کو ایک عام آدمی کی طرح برتا ہے اور اس کی کھٹاس مٹھاس کا ذائقہ چکھا ہے۔ ان کے طنز میں ایک قسم کی دل سوزی اور دردمندی کا گمان ہوتا ہے۔"

وہاب عندلیب کو بھی مجتبیٰ کی تحریروں میں یہی وصف نمایاں نظر آتا ہے۔

> "دردمندی اور انسان دوستی نے مجتبیٰ کو ایک کامیاب مزاح نگار بنادیا ہے۔"

مجتبیٰ کی تحریروں میں زندگی کا المیہ احساس جا بہ جا جھلکتا ہے۔ ہم دردی فطری تقاضا بھی ہے اور جب ان غمِ روزگار اور غمِ جاناں کے مارے ہوئے لوگوں پر مجتبیٰ کا قلم اٹھتا ہے وہ ایک دبی دبی چیخ بن جاتا ہے تب ہی وہ کہتے ہیں۔ "میرے نزدیک مزاح انسان کے پیمانہ وجود کے لب ریز ہو کر چھلک پڑنے کا نام ہے۔ مزید وہ یہ کہتے ہیں کہ "اوپر والے کو تو سب کچھ پتا ہے۔ اسے تو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم دھاڑیں مار مار کر قہقہے لگاتے ہیں اور پھوٹ پھوٹ کر ہنستے ہیں تو ہمارے دل پر کیا گزرتی ہے اور اس ہنسی کے پیچھے کتنے آنسو چھپے ہوتے ہیں۔" لکھتے ہیں کہ

> "اب جو ہنستے ہیں تو اس طرح ہنستے ہیں جس طرح کوئی کشاکشِ روزگار کے لیے روتا ہے۔۔۔ برسوں کی اس کشاکش اور ریاض کی وجہ ہمارے جسم میں رونے کے جو غدود ہیں انھوں نے کام

کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

مجتبیٰ حسین کی اس دردمندی میں ہوسکتا ہے کہ ان حالات کا بھی دخل ہو جن سے وہ گزرے ہیں ان میں ان کے ماموں کا ان کی آنکھوں کے سامنے قتل ہونا شامل ہے۔ اسی دور میں انھوں نے اپنے وطن اور آس پاس کے علاقوں میں جا بہ جا انسانی نعشیں اور اجڑے ہوئے گھروں کی ویرانی دیکھی۔ "اتنے دکھ جھیلے ہیں کہ اب ہنسنے ہنسانے کے سوائے ہمیں اور کام نہیں آتا۔"

ذرا بڑے ہوئے تو وہ اور بھی سنگین حالات سے گزرے "۔۔۔ کھانے کو نہیں ملا تو رو دیے؛ نوکری نہیں ملی تو رو دیے، کسی نے ذرا سی بے عزتی کی اور ہماری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ ہم چھپ کر یوں روتے تھے جیسے کوئی جرم کررہے ہوں۔ ہمارے یہ آنسو کسی نے نہیں دیکھے۔"

ایک اور جگہ اپنا کیری کیچر انھوں نے جس بے دردی سے لکھا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

ایک کتے کے پلے کو مجتبیٰ اپنے گھر لے آتے ہیں۔ کتا گھر میں پرورش پارہا ہے۔ ایک دن ان کی اہلیہ کتے کی سمجھ داری کی تعریف کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ وہ کسی بھی نووارد کو دیکھ کر ان کے پاس بھاگ کر چلے آتا ہے اور چھپ جاتا ہے۔ ان کا آخری جملہ ہے۔ "اس کے خوف سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ باہر کوئی مشکوک قسم کا کردار سڑک سے گزر رہا ہے۔ اس انکشاف کے بعد ہمیں اس کتے پر پیار سا آگیا۔ اس کی طرف دیکھا تو یوں لگا جیسے آئینے میں ہم اپنے آپ کو دیکھ رہے ہیں۔"

مجتبیٰ حسین کسی کی دکھتی رگوں پر ہاتھ نہیں رکھتے بلکہ خود اپنی دکھتی رگوں سے قاری کی دکھتی رگوں کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ دلی میں رہتے ہوئے مجتبیٰ اپنے آپ کو بس میں لٹکتے ہوئے پاتے ہیں تو وہ دلی میں رہنے والوں کی بات کررہے ہوتے ہیں اور دلی والوں کی بات کرتے ہیں تو ان میں وہ خود بھی شامل ہیں۔ کہتے ہیں: "یہاں آدمی رہتا کم اور لٹکتا ہوا زیادہ پایا جاتا ہے۔" بات تو وہ ملکہ الزبتھ کے دورے کی کررہے تھے لیکن ان کا خیال الزبتھ سے زیادہ اس شہر کے عام آدمی اور اس کے لٹکتے رہنے کی طرف تھا۔ اسی طرح اکیسویں صدی میں پہنچنے والے انسان کے لیے وہ دعا کرتے ہیں کہ اسے بس میں بیٹھنے کے لیے آسانی سے جگہ مل جائے تو یہی غنیمت ہے کیوں کہ "پچھلے کئی برسوں سے وہ ڈنڈے سے لٹک کر سفر کررہا ہے۔" مجتبیٰ کی خواہش ہے کہ اکیسویں صدی جو تھکے ہوئے وقت کے آگے دستک دینے لگی ہے ایسی ہو کہ اس میں دکانیں تو بہت سی ہوں لیکن دکان دار کوئی نہ ہو۔ ان کی یہ خواہش اس لیے ہے کہ وہ گلبرگہ میں چار دن گزارتے ہوئے دلی کے دنوں کو یاد کرتے ہیں تو انھیں وہ تمام لوگ یاد آتے ہیں جو ان کے مشاہدے میں آئے ہیں۔ ان لوگوں میں وہ خود بھی شامل ہیں۔ "۔۔۔ سیاسی چکر بازی، سپریم کورٹ، قتل و غارت گری، فرقہ وارانہ فسادات، مکانات کی قلت، پانی، لائٹ، ٹرافک، تعلیمی ادارے، پھر لوگوں کے دہرے معیارات۔۔۔۔"

انسانی مصائب و آلام کی بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ "اردو پہ مرنا اور اردو میں مرنا" والے مضمون میں مجتبیٰ نے ایک شکاری کا لطیفہ بیان کیا ہے۔ یہاں میں یہ عرض کردوں کہ لطیفہ گوئی مزاح نگاری کا کم زور پہلو سمجھا گیا ہے۔ مجتبیٰ نے "میرا کالم" کے ان مضامین میں لطیفہ گوئی کو خال خال ہی استعمال کیا ہے۔ وہ بھی چند ناگزیر صورتوں میں۔ بزرگ شکاری جب قصہ سناچکے کہ ایک شیر سے کس طرح ان کی مڈبھیڑ ہوئی تھی اور وہ شیر چیر پھاڑ کر ان کا خون پی گیا تھا اور وہ مرچکے تھے تو سننے والے نے پوچھا "آپ تو ابھی زندہ ہیں! تب شکاری نے سرد آہ بھر کر کہا "میاں یہ بھی کوئی زندگی ہے۔" اس طرح لطیفہ کے انتخاب میں بھی زندگی سے شدید بیزاری کا اظہار ہے۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں "۔۔۔ آج ہم جس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں اسے اور تو سب کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن زندگی نہیں

سمجھا جاسکتا۔۔۔" اور یہ کہ "ہمارا ملک آزادی کے پچاسویں برس میں جس دور سے گزر رہا ہے ہاں کسی شہری کا ایک دن بھی خیر و خوبی اور حرمت و نیک نامی کے ساتھ گزر جائے تو اس ایک دن کو سیلی بریٹ کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں طنز و مزاح کے کئی پہلو ہیں۔ مجتبیٰ کے مضامین میں صرف حزن و ملال کی کیفیت ہی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ان کے بیان میں روانی بھی ہے اور اس کے علاوہ قاری کو چٹخارہ دینے والے مضامین ہیں۔ "قصہ ایک اہم شکل کا"، "ہمارے گھر پر چھاپہ"، "مزاج پرسی کرنا ایک مشکل فن ہے۔" "ابرہیم لنکن نرالا بن گئے"، "بجلی، بجلی بورڈ اور اردو ادب" اس قبیل کی چند مثالیں ہیں۔ تجرید اور علامت مزاح نگاری کے فن پر گراں پڑتے ہیں لیکن تہہ داری، رمز و کنایہ مزاح نگار کا مرتبہ بڑھاتے ہیں۔ قاری بھی سوچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ "کتو انسانوں سے خبردار رہو"، "آم اب عام نہیں ہے" اور "محکمہ موسمیات کی حمایت میں" جیسے مضامین ان کی عمدہ مثالیں ہیں۔

آخرالذکر مضمون میں یہ جملہ قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ "محکمہ موسمیات کی بالائی آمدنی وہی ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے انھیں ملتی ہے۔ ان کے جانب سے کی جانے والی پیش قیاسیاں جب غلط ثابت ہوتی ہیں تو ان کا ایمان کچھ اور بھی مستحکم ہوجاتا ہے۔" دوسرے دو مضامین سے یہ جملے ملاحظہ ہوں۔ "کتوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شہروں میں رہ کر وحشی انسانوں کی سی حرکت کریں" اور "آج نہ تو کشمیر میں ٹھنڈی ہوائیں ہیں اور نہ ہی الہ آباد میں دسہری اور ثمرِ بہشت" ان جملوں میں کنایے کی مدد سے مجتبیٰ نے بھرپور طنز کا وار جن لوگوں پر کیا ہے اسے ایک قاری خوب جانتا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے کسی مضمون کو بے جا طوالت نہیں دی ہے۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں شروع سے آخر تک اسی موضوع کے دائرے میں رہتے ہیں۔ انھیں زندگی کا وسیع تجربہ ہے۔ ان کے ملنے والوں میں طرح طرح کے مزاج اور مرتبے کے لوگ ہیں۔ ان سب کی نفسیات کے مطالعے کا انھیں موقع ملتا رہا ہے اور خود ان کی اپنی زندگی کے حادثات و واقعات بھی اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ ایک عام آدمی کو ایسے مواقع کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔ آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ مجتبیٰ نے لوگوں کو ہنسا کر اور ان میں خوشیوں کو بانٹ کر نیک کام ہی کیا ہے (وہ ایسا نہیں سمجھتے) لوگوں کے ساتھ مل کر ہنسنے کی نہ کوئی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے نہ اس میں محنت لگتی ہے۔ لیکن دوسروں کو ہنسانا ایک مشکل کام ہے۔ اس لیے یہ ایک نیکی ہے۔ اس سے بڑی نیکی لوگوں کے غم میں شریک ہونا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی تحریریں گواہ ہیں کہ وہ یہ کام گذشتہ پچاس سال سے کرتے آرہے ہیں۔

"دو چار برس کی بات نہیں نصف صدی کا قصہ ہے۔"

○●○

(سلسلہ ص: ۶۲ سے)

ہے کہ وہ اس بات پر فخر بھی محسوس کرتی ہیں۔ چناں چہ جب تک مجتبیٰ کی تحریریں موجود رہیں گی اردو باقی رہے گی۔ چوں کہ مجتبیٰ کی تحریروں میں ان کا اپنا عہد اور اس عہد کے مسائل کی چبھن موجود ہے اس لیے یہ تحریریں ایک طرح سے دستاویزی حیثیت کی حامل بھی ہیں اور اسی لیے مجتبیٰ کے ان کالموں کے ذریعے آنے والے عہد میں اس عہد کو، اس شہر کو، اس ملک کو، یہاں کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو، یہاں کی تہذیب و ثقافت کو سمجھا جاسکے گا۔

○●○

مظہر امام

مجتبیٰ حسین کی سفرنامہ نگاری

شاید اس باب میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ مجتبیٰ حسین اس دور کے ایک نہایت ممتاز اور مقتدر مزاح نگار ہیں۔ ان کی مزاح نگاری کی عمر تو تیس سال سے تجاوز کرچکی ہے، لیکن ہمارے ادب میں انھیں درجہ اعتبار حاصل ہوئے بھی اب چوتھائی صدی کا عرصہ ہورہا ہے۔ اب تک ان کے مضامین اور خاکوں کے نو مجموعے شائع ہوچکے ہیں اور ان پر مستزاد ان کے دو سفرنامے "جاپان چلو، جاپان چلو" اور "سفر لخت لخت" ہیں۔ آخر الذکر کی اشاعت ابھی ابھی ہوئی ہے۔

ایک شائستہ انسان کی پہچان اس کی حس مزاح سے بھی ہوتی ہے۔ کرشن چندر تو انسان کو اشرف المخلوقات اسی لیے مانتے ہیں کہ وہ ہنستا ہے۔ مزاح کا وصف یہ ہے کہ اس میں خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہو اور اس کی ادبی اور تخلیقی حیثیت مستحکم ہو۔

ہمارے یہاں طنز اور مزاح کی ماہیت اور اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کم ہی کی گئی ہے۔ اکثر لکھنے والوں نے مزاح کو پھکڑ پن کا درجہ دے دیا ہے اور بعض محققین نے طنز کو سفاکانہ نشتر زنی کا مترادف سمجھا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے طنز اور حقیقت کے تعلق کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> "طنز کا مقصد تلقین حقیقت ہوتا ہے اور حقیقت بلاشبہ ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔ اس تلخی کو ایسے الفاظ میں بیان کرنا کہ اس شخص اور سماج کو تو کم نقصان پہنچے لیکن غیر شعوری طور پر اس کی اصلاح ہوجائے کہ جس پر وار کیا گیا ہے، حقیقی طنز ہے۔"

احتشام حسین بھی طنز اور حقیقت کے رشتے پر زور دیتے ہیں:

> "حقیقت کا ادراک کیے بغیر طنز پیدا ہی نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ اگر کسی کے پاس حقیقت کا کوئی تصور نہیں ہے تو وہ کسی قسم کے توازن کی جستجو کر ہی نہیں سکتا۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص طنز کا حربہ استعمال نہیں کرسکتا۔"

واقعہ ہے کہ حقیقت کے بغیر طنز ممکن نہیں۔ یعنی آپ کسی فرضی، غیر حقیقی شے، وجود یا واقعے پر طنز نہیں کرسکتے۔ آپ اپنے تخیل کی مدد سے کوئی مفروضہ گڑھ لیں اور اس پر طنز کرنا شروع کردیں تو یہ ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہوگا اور ممکن ہے کچھ غیر سنجیدہ لوگ اس میں بھی اپنے لیے تفریح طبع کا سامان تلاش کرلیں، لیکن یہ طنز غیر معیاری ہوگا۔ ایسا طنز نجی تعصبات کا پروردہ ہوتا ہے اور ذاتی نفرت کی آئینہ داری کرتا ہے۔ ادب میں اس کی حیثیت پر کاہ کے برابر بھی نہیں ہوتی۔

مجتبیٰ حسین بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں، لیکن وہ طنز سے بھی بے حد خوب صورت مصرف لیتے ہیں۔ یوں بھی مزاح اور طنز میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مجتبیٰ حسین طنز بھی کررہے ہوں تو وہ تعصب یا بغض و عناد سے عاری ہوتا ہے، ان کے فن کا غالب عنصر انسانی ہم دردی ہے۔

مزاحیہ ادب کو مزاحیہ ہونے سے پہلے ادب ہونا چاہیے۔ ہمارے اکثر مزاح نگار اس شرط کو فراموش کرجاتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی تحریریں اپنے اسلوب، طریقۂ اظہار اور زبان و بیان کی جمال آفرینی کے باعث ادب کے بلند درجے پر فائز ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی مزاحیہ تحریروں کی تعداد خاصی بڑی ہے۔ ان میں ان کے مضامین کے علاوہ خاکے بھی شامل ہیں۔ ان کے مضمون "اردو کا آخری قاری" کو ان کی زندگی میں ہی کلاسیکی درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ ان کے بعض پرانے شخصی خاکوں کا ذکر آج بھی لوگ مزے لے لے کر کرتے ہیں۔

ان کے سفر نامے "جاپان چلو، جاپان چلو" کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مجتبیٰ حسین نے جاپان کا سفر ۱۹۸۲ء کے اواخر میں کیا تھا۔ واپسی پر انھوں نے وہاں کا سفر نامہ "سیاست" حیدرآباد کے لیے قسطوں میں لکھا، جو کتابی صورت میں ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ ہندی کے مشہور رسالے "ساریکا" میں بھی یہ قسط وار شائع ہوا اور پھر کتاب کی شکل میں ۱۹۸۶ء میں چھپ گیا۔ اردو اور ہندی زبانیں تو مشترک خصوصیات کی حامل ہیں اور ایک زبان کا مزاح دوسری زبان میں منتقل ہوسکتا ہے، مگر حیرت ہوتی ہے کہ یہ سفرنامہ اپنی صنفی اور ادبی خصوصیات کے ساتھ جاپانی زبان میں بھی منتقل ہوا اور اس کا جاپانی ترجمہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوگیا۔ جاپان کا سفر مجتبیٰ حسین کے لیے ہیچ وسیلہ، ظفر ثابت ہوا اور اس کے بعد ہی وہ برطانیہ، فرانس، امریکہ، کناڈا، روس، سعودی عرب اور پاکستان کے ممالک سے بھی "مشرف بہ سیاحت" ہوئے۔ ان سب کے الگ الگ سفر نامے تو انھوں نے نہیں لکھے، البتہ لندن، پیرس، شکاگو اور تاشقند کے سفر کے احوال انھوں نے "سفر لخت لخت" میں جمع کردیے ہیں۔ برطانیہ یا لندن کا سفر نامہ تو خیر ساٹھ پینسٹھ صفحات کو محیط ہے، لیکن پیرس کے احوال مختصراً بیان کیے گئے ہیں۔ امریکہ تو تین صفحات میں نپٹا دیا گیا ہے۔ البتہ روس یعنی تاشقند (ازبکستان) کا سفر نامہ ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ جدہ (سعودی عرب) کے حوالے سے کوئی سفرنامہ یا مضمون نہیں ہے بلکہ مزاح نگاروں کی ایک مجلس کا خطبہ، صدارت ہے۔ آخر میں رام پور کے سفر کی روداد پانچ صفحات میں بیان کی گئی ہے۔

بہتر ہے کہ آج کی صحبت میں مجتبیٰ حسین کی تمام تحریروں کو سامنے رکھنے کی بہ جائے صرف ان کے سفرناموں کے حوالے سے گفتگو کی جائے۔

اردو میں سفرناموں کی روایت خاصی پرانی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یوسف خاں کمبل پوش کا "عجائبات فرنگ" اردو کا پہلا سفرنامہ ہے جو انیسویں صدی کے نصف اول میں لکھا گیا۔ بعض محققین نے اولیت کا سہرا اس کے سر باندھنے سے انکار کیا ہے۔ بعض ممالک کے تعلق سے لکھے ہوئے سفرناموں میں سرسید کا "مسافرانِ لندن"، شبلی نعمانی کا "سفرنامہ مصر و روم و شام"، قاضی عبدالغفار کا "نقش فرنگ"، بیگم حسرت موہانی کا "سفرنامہ عراق" اور سید سلیمان ندوی کا "سیرِ افغانستان" معروف ہیں۔ لیکن سفرنامے لکھنے کا رجحان گزشتہ تین برسوں کے دوران زیادہ بڑھا ہے۔ بعض ادبی مبصرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اردو افسانے میں تجریدیت اور علامت کے گہرے اثرات سے پیدا شدہ ابہام سے بیزاری نے بہ طورِ خاص پاکستان میں "سفرنامہ نگاری" کے لیے فضا ہموار کی۔ شاید اسی لیے اکثر سفرناموں میں حقیقت کے ساتھ تخیل کی افسانوی رنگ آمیزی بھی شامل ہوگئی۔ اس سلسلے میں محمود نظامی اور مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ پاکستان میں اس صنف کو مقبول بنانے والوں میں ابنِ انشاء، اخترِ ریاض الدین، محمد خالد اختر، عطاء الحق قاسمی، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، پروین عاطف، ذوالفقار احمد تابش وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ہندستان میں احتشام حسین کے سفرنامے "ساحل اور سمندر" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ لیکن یہاں یہ روایت کچھ زیادہ

پروان نہیں چڑھ سکی۔ ادھر دس پندرہ سال کے دوران جو سفر نامے سامنے آئے ہیں، ان میں رام لعل، گوپی چند نارنگ، جگن ناتھ آزاد اور مجتبیٰ حسین کے سفرنامے فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔

یوں تو سفرناموں میں مزاح کا عنصر اکثر و بیش تر شامل ہو ہی جاتا ہے، لیکن اردو میں باقاعدہ مزاحیہ سفر نامے شاید پہلی بار ابن انشاء نے لکھے۔ "دنیا گول ہے"، "چلتے ہو تو چین کو چلیے" اور "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" اس نوع کے کامیاب سفرنامے ہیں۔ دوسری بار اس طرح کا سفر نامہ مجتبیٰ حسین نے ہی لکھا۔ مزاحیہ سفرنامے کو درجہ۔ اعتبار عطا کرنے میں ان کے "جاپان چلو، جاپان چلو" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

شاید بہتوں کے لیے یہ امر باعث دل چسپی ہو کہ اب سے بہت پہلے "۱۹۰۷ء کا جاپان" کے عنوان سے ایک سفر نامہ ڈاکٹر محمد حسین نے لکھا تھا۔ اس سفرنامے کو طفیل احمد منگلوری نے دریافت کیا اور یہ پہلی دفعہ "ادبی دنیا" لاہور کے فروری ۱۹۴۳ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ جاپان کے سفر کا حال اختر ریاض الدین کے یہاں بھی ملتا ہے۔ پروین عاطف نے بھی "خوابوں کے جزیرے" کے نام سے "جاپان کا سفر نامہ" لکھا ہے۔

مجتبیٰ حسین کا سفر نامہ جاپان ایک بالکل ہی نئے اور منفرد ذائقے سے روشناس کراتا ہے۔ ہر ادیب اپنے اپنے طور پر سفر کی روداد بیان کرتا ہے۔ اس میں کہیں مشاہدات اور محسوسات کا بیانیہ ہوتا ہے، کہیں تاریخی واقعات ہوتے ہیں، کہیں جغرافیائی معلومات۔ مجتبیٰ حسین کے یہاں بھی یہ سب ہے، لیکن انھیں تاریخ اور جغرافیہ سے زیادہ انسانوں کے عادات و اطوار، ان کے مزاج اور خصائل، ان کی رفتار و گفتار سے دل چسپی ہے۔ زندگی کی بابت ان کے رویوں سے دل چسپی ہے۔

مجتبیٰ حسین افسانہ نگار نہ سہی، قصہ گو ضرور ہیں۔ انھیں قصہ "بنانے" اور لطیفے گڑھنے میں خاص لطف آتا ہے اور اسی سے وہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی لطف اندوز کرتے ہیں۔ وہ فرد کو کردار کا تشخص عطا کرکے اس کی عادتوں اور محبتوں کا ذکر اس طرح مزے لے لے کر کرتے ہیں کہ قاری اس میں گم ہوجاتا ہے۔

جاپان میں مجتبیٰ حسین نے ایک ماہ سے کچھ زیادہ یعنی ۳۵ دن قیام کیا اور اس دوران انھوں۔ نے اس سرزمین کو اس کی تہذیب و ثقافت کو وہاں کی شخصیتوں کو اچھی طرح اپنے آپ میں جذب کیا اور اپنی فطری شوخی سے ان میں ایسا رنگ بھرا کہ ان کا سفر نامہ اپنی لطافت اور نفاست کے اعتبار سے ایک یادگار حیثیت اختیار کرگیا۔

لطیفے خلق کرنا مجتبیٰ حسین کے مزاج میں ہے۔ ان کی لطیفہ گوئی کی مثالیں ان کے مضامین اور سفرناموں سے پیش کی جائیں تو کئی صفحے رنگین ہوجائیں ("سیاہ ہوجائیں" کا محاورہ یہاں موزوں نہیں)۔ "جاپان چلو جاپان چلو" سے صرف ایک مثال:

> "چوں کہ ہانگ کانگ کی بندرگاہ فری پورٹ ہے، اس لیے ہر کوئی منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔
> یہاں ہر چیز بکتی ہے۔ ہمارے ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دو سال پہلے ہانگ کانگ کے ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں سامان خریدنے گئے۔ چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھیں۔ کوئی شے پسند نہ آئی۔ اچانک سیلز گرل پر جو نظر پڑی تو وہ پسند آگئی۔ لہذا سیلز گرل کو خرید کر لے گئے۔"

میں نے ایک جگہ لکھا ہے ہمارے یہاں اردو میں لکھنے والے بہت ہیں لیکن "اردو لکھنے والے" خال خال ہیں۔ زبان جانے بغیر آپ شاعر، افسانہ نگار، نقاد سب بن سکتے ہیں، لیکن مزاح نگار کے لیے تو لازمی شرط یہی ہے کہ وہ زبان کا مزاج داں ہو۔ مجتبیٰ

حسین کے یہاں محاورہ اور تشبیہ کا یہ خوب صورت امتزاج دیکھیے۔ کیا زبان پر دسترس کے بغیر یہ کمال پیدا کیا جاسکتا ہے:

"شاپنگ کے میدان میں ہمارا کوئی عملی تجربہ نہیں ہے۔ لہذا ہر دکان کے سامنے یوں کھڑے رہے جیسے بین کے سامنے بھینس کھڑی ہوتی ہے۔

جاپانیوں کو اندھیرے سے سخت نفرت ہے۔ لہذا اپنی سڑکوں اور گھروں کو اتنا روشن رکھتے ہیں کہ آدمی کو اپنی روشنی طبع کا استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔"

جب ہم اپنے کمرے کی طرف جانے لگے تو مس پرینیا نے انگریزی آداب کے مطابق ہم سے کہا "آج رات کوئی اچھا سا خواب دیکھیے۔" ہم نے کہا "مس پرینیا، کیا کریں کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔"

خالص مزاح سے لطف اندوز ہونا ہو تو اس سے زیادہ آگے بڑھیے مجتبیٰ حسین کو یہ کمرہ پانچ ہزار ین میں ملا ہوا تھا۔ اس جملے کی اطلاع ہوٹل مینیجمنٹ تک پہنچی تو اس کے ایک فرد نے مجتبیٰ حسین سے کہا:

"اگر آپ کو خواب دیکھنے کے لیے بڑے کمرے کی ضرورت ہے تو وہ آپ کو مل جائے گا۔ دس ہزار ین کرایہ دینا ہوگا۔"

مجتبیٰ حسین کا اسلوب تبسم آفریں ہے۔ وہ روز مرہ زندگی کے مضحک زاویے تلاش کرتے ہیں، لیکن ان کا طنز کبھی غم و غصہ کا شکار نہیں ہوتا، وہ کلبیت کے عنصر سے پاک ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین زندگی کو ایک خوش مزاج انسان کی نظر سے دیکھتے ہیں اور مسرتیں تقسیم کرنے میں بڑے فراخ دل ہیں۔ ان کا مزاح سبک اور طنز لطیف ہے۔

مجتبیٰ حسین اپنے ملک کے مزاج، حالات و خصائل کا مقابلہ جب دوسرے ملک سے کرتے ہیں، تب بھی ان کا طنز اپنی شائستگی برقرار رکھتا ہے۔ ایک جاپانی خاتون مجتبیٰ حسین سے کہتی ہیں:

"ہمارے یہاں عمارتوں کو تصنیف و تالیف کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔۔۔ میں نے بھی چار مینار پر اپنا نام محض اس لیے لکھا تھا کہ وہاں چار پانچ اصحاب پہلے ہی سے اپنے ناموں کو کندہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید آپ کے یہاں ایسا کرنے کا دستور ہے۔"

اب ایک نسبتاً طویل اقتباس جس طنز کی کاٹ دیکھیے۔ لیکن یہاں بھی لہجے کی شرافت ساتھ نہیں چھوڑتی:

"ہم نے کہا۔۔۔ مسٹر تاجا! آپ ہندستان کی ٹرینوں میں سفر کرچکے ہیں۔ ہماری ٹرینوں میں جو سہولتیں ہیں وہ آپ کے یہاں کہاں۔ وہ سفر ہی کیا جس میں آدمی کو دھکا نہ لگے۔ ہم نے تین گھنٹے آپ کی ٹرین میں سفر کیا کسی نے ہمارے سر پر صندوق نہیں رکھا۔ کسی کا ہولڈال ہمارے پاؤں پر نہیں گرا۔ کسی مسافر نے نشست کے لیے دوسرے مسافر سے لڑائی نہیں کی اور پھر وہ ہر اسٹیشن پر چائے کو، پان بیڑی سگریٹ والی مانوس آوازیں نہیں سنائی دیں۔ بھلا یہ بھی کوئی ٹرین کا سفر ہے۔"

تاجا نے شرم کے مارے نظریں نیچی کرلیں۔ بولے۔۔۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں ہمیں آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ یوں بھی جاپان اور ہندستان کا کیا مقابلہ۔ ہمارا ملک چھوٹا ہے اور آپ کا ملک عظیم۔ اور تاجا کی یہ بات سن کر ہمارا سر فخر سے اونچا ہوگیا۔

اقتباس کا یہ سلسلہ موقوف کرنا ہی بہتر ہے۔ کیوں کہ "جاپان چلو، جاپان چلو" کے ہر صفحے سے کوئی نہ کوئی جملہ، فقرہ، بیان

واقعہ نقل کرنے کے لیے منتخب کیا جاسکتا ہے۔ اس سفرنامے کا سب سے اچھا اور اہم باب میرے خیال میں "حرفِ آخر" ہے۔ ا
اس میں سنجیدگی اور ظرافت کا اتنا خوب صورت امتزاج ہے کہ اس کی مثال ہمارے یہاں کم ہی ملے گی۔ یہ بات کسی نقاد نے نہ
لکھی لیکن مجھے مجتبیٰ حسین کو پڑھتے ہوئے اکثر خیال آیا ہے کہ وہ کرشن چندر کی مزاح نگاری کے بہت قریب ہیں۔ کرشن چندر سے ذا
قربت کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔ کرشن چندر طنز و مزاح سے کام لیتے لیتے اکثر سنجیدہ اور جذباتی ہوجاتے ہیں اور پڑھنے
والوں کے ہونٹوں پر ہنسی ہوتی ہے لیکن آنکھیں نم ہوتی ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے یہاں بھی مجھے یہ خصوصیت نظر آئی۔

جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں "سفر لخت لخت" کے مضامین باقاعدہ سفرنامے نہیں ہیں۔ ان میں سفر کم ہے، مسافر نواز
زیادہ ہے اور شاید یہی ان مضامین کی خوبی بھی ہے۔ "جاپان چلو، جاپان چلو" کی مقبولیت نے مجتبیٰ حسین کو "سفر نامہ نگار" بناد
ورنہ وہ پیشہ ور سفرنامہ نگار نہیں ہیں، کیوں کہ اب تو سفرنامہ لکھنے کے لیے باقاعدہ سفر کرنا بھی ضروری نہیں رہا۔ "سفر لخت لخت
کے مضامین کو شگفتہ نگاری اور اچھے ادب کے نمونے کے طور پر پڑھنا چاہیے۔ بلکہ ان مضامین میں طنز و مزاح کا ارتکاز کچھ زیادہ
کیف آفریں ہے۔ ایک مختصر سی مثال:

"ہمیں لندن کی تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کی تمنا ہے جہاں بیٹھ کر انگریزوں نے اپنی تاریخ تو بنائی مگر دوسروں کا جغرافیہ بگاڑا۔"

اپنے ایک حیدرآبادی دوست کا جنھوں نے لندن کو اپنا مستقر بنالیا تھا، ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انگریزی کی بہت سی گالیاں ہم نے انھیں سے سیکھیں۔ خاص بے ضرر گالیاں ہیں جن سے اس زبان کا جس میں کہ یہ دی جارہی ہوں اور اس شخص کا جس کو یہ دی جارہی ہوں، کچھ بھی نہیں بگڑتا۔"

لندن میں مقیم ایک شاعر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس قدر ٹوٹ کر ملتے ہیں کہ ملنے والا ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ ان کی شاعری ہمیں بہت پسند ہے کیوں کہ ان کی شاعری کو پڑھنے کے بعد آدمی کو چڑیا گھر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

برطانیہ اور ہندستان کے اردو شاعروں کے فرق کو ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"برطانیہ کے اردو شاعر ہمارے شاعروں کی طرح "ہمہ وقتی شاعر" نہیں ہیں بلکہ ہفتہ کے پانچ دن کچھ کام بھی کرتے ہیں۔ البتہ جمعہ کی شام سے اتوار کی رات تک "عرض کیا ہے" اور "ذرہ نوازی کا شکریہ" وغیرہ میں لگے رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں خدا نخواستہ کسی شاعر کا کلام اچھا ہو تو وہ مشاعرہ میں شرکت کے لیے رکشا کا کرایہ بھی مانگ لیتا ہے۔ برطانیہ کا اردو شاعر رکشا کا کرایہ نہیں مانگتا بلکہ اپنی موٹر میں جاتا ہے چاہے اس کا کلام اچھا ہی کیوں نہ ہو۔"

اردو اور حیدرآباد مجتبیٰ حسین کی تحریروں کے لیے خام مواد کا کام کرتے ہیں۔ اردو اور اردو والوں سے ان کی محبت ہی اس نوع کے
کی خالق ہے:

"برطانیہ کے اردو شاعروں اور ادیبوں کو دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کہ برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہنے کے باوجود انھوں نے اپنے اندر حسد، رقابت، غیبت اور معاصرانہ چشمک جیسے ضروری جذبوں کو اپنے سینوں

سے لگا رکھا ہے۔ یوں بھی ان ضروری جزیوں کے بغیر اردو تہذیب کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔"

لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

حیدرآبادی ہر جگہ حیدرآبادی ہی رہتا ہے اور وہ اپنی حیدرآبادی تہذیب نہ سہی، اپنے بگھارے بیگن سے ہرگز نہیں شرماتا۔

مجتبیٰ حسین لندن میں، پیرس میں، شکاگو میں، جہاں جہاں بھی اپنے حیدرآبادی دوستوں سے ملتے ہیں، وہاں وہاں انھیں حیدرآبادی کھانے کھانے کو ملتے ہیں اور حیدرآبادی شاعروں کا کلام سننے کو۔ مجتبیٰ حسین جب وطن سے دور ہوتے ہیں، وطن ان کے نزدیک آجاتا ہے۔ مگر وطن ان کے لیے انسانی محبت اور اخوت کا کفن نہیں بنتا۔ اس میں کسی نوع کی علاقائی عصبیت کا عمل دخل نہیں۔ زندگی کے ساتھ حیدرآباد بھی ان کے لیے ہنسنے ہنسانے کا بہانہ ہے!

جی چاہتا ہے کہ مجتبیٰ حسین کے ان سفرناموں سے اور بہت سے اقتباسات پیش کیے جائیں۔ کیوں کہ سفر کے دوران بہت سے مقامات آتے ہیں جنھیں دل کش بنانے کا ہنر انھیں معلوم ہے۔ لیکن یہ جائے اس کے کہ میں ان سفرناموں کے نئے اڈیشن مرتب کردوں، بہتر ہے آپ خود متداول اڈیشنوں کا مطالعہ کریں اور میں نے جو کچھ کہا ہے، اس میں اپنے مزید توصیفی کلمات شامل کردیں۔

رشید احمد صدیقی اور پطرس کے اسالیب کے امتزاج اور ارتفاع سے مزاح کا جو معیار بنا ہے، اس کا نقطۂ عروج مشتاق احمد یوسفی ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا تعلق بھی اسی قبیلے سے ہے انھوں نے نہ صرف رشید احمد صدیقی اور پطرس کی روایت کو آگے بڑھایا ہے بلکہ مشتاق احمد یوسفی کی موجودگی میں اپنی انفرادیت کے نقوش ثبت کیے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے یہاں درد مندی اور انسانی محبت کی خوش بو ہے جو ان کی تحریروں کو معطر کرتی ہے۔ ان کے مزاح میں ایک دل نوازی ایک قوت شفا ہے جو آسانی سے کسی کے حصے میں نہیں آتی!

○●○

(سلسلہ ص: ۱۰۳ سے)

ادبی۔ بوڑد: بڑا۔ شرب: فوراً۔ تندور: تنور۔ ہندستانی، تاجک: تنور۔ مری / مُڑی / موری: چھید، سوراخ۔ ہندستانی: موری۔ تاجک: موری بہ معنی دودکش۔ تندور کو موری: تنور کا دودکش۔ زرے: بچے (؟) پنچسٹرد: توڑنا۔ سنسکرت: بھنجن۔ تم کلنو: چلانا، پکارنا۔ (تم: دھوم)۔ دَن / دِن: دِن۔ دُوت: دودھ۔ ہندستانی، گجراتی: دودھ۔ پنجابی، لندا: دُدّھ۔ سنسکرت: دُگدھا۔ خمیرا / خمرد: ہانڈی، دودھ کا جنڈا۔ تاجک: خُرما (؟) خُم (؟)۔ ہندستانی: خُمرا۔ کِتک / کتک: خاص طور سے خمیر دیا ہوا دودھ، دہی۔ علاقائی تاجک، ازبکی: قتق۔ کتک کرنو: دہی جمانا۔ اُستا: لوہار، ہنرمند، جراح۔ ہندستانی، تاجک: اُستاد۔ پولاد / پولد: فولاد۔ تاجک، ازبکی: پولاد۔ ہگرِد: ہگنا، پاخانہ کرنا۔ ہندستانی: ہگنا۔ پنجابی: ہگڑا۔ بوسرد: بہت سارا۔ (بوت + سارا: بہت سارا ؟)۔ اوّل ور: پہلی بار، پہلے۔ تاجک، ہندستانی: اوّل۔ ور: بار۔ تاجک، ہندستانی: بار۔ پنجابی، لندا: وار۔ انبور: سنٹنی، زنبور۔ تاجک: انبور۔ کدنٹرد / کڈنٹرد / کڑنو: نکالنا، کاڑھنا، (دانت) اکھاڑنا۔ ہندستانی: کاڑھنا۔ پنجابی: کڈھنڑا۔ لندا: کدھنٹر۔ کمُر / کومر / کمَر: کوئلہ۔ علاقائی تاجک: کومُر۔ ترزنو / ترزکرنو: تراشنا۔ تاجک: تراشیدن۔ مقوبل آنو: (ایک دوسرے کے) مقابل ہونا۔ ہندستانی، تاجک: مقابل۔ مُھو: مُنھ۔ تیپرنو / تیپرنو ہگرنا۔ پیرٹ / پھیٹ: پھیٹ۔ پِربکانو: چیر ڈالنا۔ چِرنو: چیرنا، پھاڑنا۔ کس / قصد: بدلہ۔ کس لینو: بدلہ لینا۔ تاجک، ہندستانی: قصد۔

○●○

مجتبیٰ حسین

ح سے حیدرآباد، حمایت اللہ اور حسِ مزاح

حیدرآباد مزاح کی انفرادیت کو واضح کرنے کے لیے میں ایک واقعے کا اکثر ذکر کرتا ہوں جو چالیس برس پہلے میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ نئے پل کے پاس دو ہوٹلیں ہوا کرتی تھیں تفریحِ دکن اور ممتاز ہوٹل۔ ظاہر ہے کہ دونوں کے بیچ خاصی کاروباری رقابت اور مسابقت رہا کرتی تھی۔ ایک دن میں نے تفریحِ دکن میں بیٹھ کر چائے منگائی تو دیکھا کہ پیالی میں مکھی گری ہوئی ہے۔ میں نے بیرے کو بلاکر ڈانٹا تو اس نے بجائے معذرت کرنے کے مکھی کو بڑے اہتمام کے ساتھ پیالی میں سے نکالا، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور اسے پیالی میں واپس چھوڑتے ہوئے بولا "حضور! یہ ہمارے ہوٹل کی مکھی نہیں۔ یہ تو ممتاز ہوٹل کی مکھی ہے۔ آپ میں مکھی کو ڈانٹنے کی ہمت تو ہے نہیں سارا غصہ مجھ غریب پر اتارا جارہا ہے۔ آدمی کی حیثیت جب مکھی اور مچھر سے بھی بدتر ہوجاتی ہے تو وہ بیرا بن جاتا ہے"۔ وہ مکھی چاہے جس ہوٹل کی بھی رہی ہو، اسی وقت مرگئی تھی۔ بعد میں یہ دونوں ہوٹلیں بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ وہ بیرا اب نہ جانے کہاں ہوگا مگر میں موجود ہوں، یہ واقعہ موجود ہے اور اس واقعے میں چھپی ہوئی وہ حسِ مزاح بھی موجود ہے جو حیدرآبادی مزاح کی بنیادی پہچان ہے۔ ایک ایسی حسِ مزاح جو ناخوش گواری کو خوش گواری میں، کثافت کو لطافت میں اور بے رحمی کو ہم دردی میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ یہی وہ حسِ مزاح ہے جو حیدرآبادیوں کو اپنے پر ہنسنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے اور سنگینی کو رنگینی میں بدل دیتی ہے۔

پچیس تیس برس پہلے رشید قریشی مرحوم نے مجھے ایک پرانی فائیل دکھائی تھی جو ۱۹۲۰ء کی دہائی کے زمانے کی تھی یعنی آج سے کم و بیش اسی برس پرانی۔ اس زمانے میں حیدرآباد کے سرکاری دفتروں میں بعض ایسے لوگ بھی کام کیا تھا جو "امیدوار" کہلاتے تھے۔ یہ دفتر کے مستقل ملازم تو نہیں ہوتے تھے لیکن ملازمت کی امید میں کسی تنخواہ کے بغیر دفتری فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ بعض امیدوار دفتری کام کرتے کرتے اتنے تجربہ کار ہوجاتے تھے کہ مستقل ملازم بھی ان سے شرماتے تھے۔ اس فائیل کا قصہ یہ ہے کہ ایک امیدوار نے اس فائیل میں ایک خط کا مسودہ تیار کیا تھا جو اس کے مدارالمہام کو پسند نہ آیا تو انھوں نے غصے میں آکر خط کا مسودہ تیار کرنے والے پر پانچ روپے جرمانہ عائد کرنے کا حکم صادر فرمادیا۔ فائیل نیچے آئی تو معلوم ہوا کہ یہ مسودہ تو امیدوار نے تیار کیا ہے جس سے جرمانہ وصول نہیں کیا جاسکتا۔ بالآخر مدار المہام کی خدمت میں معروضہ پیش کیا گیا کہ چوں کہ امیدوار کوئی تنخواہ نہیں پاتا اسی لیے جرمانے کی رقم وصول کرنے میں معذوری ہے۔ اس پر مدارالمہام نے پوچھا کہ کیا دفتر میں کوئی پوسٹ یا آسامی خالی ہے؟ بتایا گیا کہ ایک جگہ خالی ہے۔ اس پر حکم ہوا "اس جگہ پر اس امیدوار کا فوراً تقرر کیا جائے اور پہلی تنخواہ پر اس سے پانچ روپے کا جرمانہ وصول کیا جائے"۔ دیکھا آپ نے کس طرح آگ پانی میں تبدیل ہوگئی۔

ایک اور پرانی بات سن لیجیے۔ ایک بار میں نے ایک بزرگ خاتون کے سامنے وٹھل راؤ کے گانے کی تعریف کرتے ہوئے کہا "وٹھل راؤ کے گلے میں بڑا سوز اور بڑا درد ہے۔" خاتون نے بے ساختہ کہا "بیٹا! یہ وٹھل راؤ کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنا علاج کیوں نہیں کراتا۔ گلے کا درد کوئی اچھی چیز تھوڑا ہی ہوتا ہے"۔

حیدرآباد ایسی ہی بے ربط اور بے جوڑ باتوں کے درمیان ایک خوب صورت اور خوش گوار تعلق پیدا کر کے ایک ایسا بے ضرر اور معصوم مزاح تخلیق کرتا ہے جو کینہ، بغض، عناد، بدنیتی اور دل آزاری جیسے رکیک جذبوں سے پاک ہوتا ہے اور یہی خصوصیت حیدرآبادی مزاح کی شائستگی اور اس کے اعلیٰ و ارفع ہونے کی دلیل ہے۔ حیدرآباد پچھلی چار صدیوں سے ہنستا چلا آرہا ہے اور اب جب کہ اکیسویں صدی کے آنے میں ڈیڑھ مہینہ باقی رہ گیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ یہ اکیسویں صدی میں بھی ہنستا ہوا ہی داخل ہوگا۔ مگر دو صدیوں کے اس ملاپ کی گھڑی میں میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ حیدرآبادی مزاح کی چار سو سالہ پرانی تاریخ میں پچھلی نصف صدی کا عرصہ اپنے تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات، واقعات، حوادث اور عہد جدید کی تیز رفتار تبدیلیوں کے باعث ایک الگ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب کو بھی ۱۸۵۷ء کے بعد کم و بیش ایسے ہی حالات سے گزرنا پڑا تھا اور اس کے جواب میں غالب نے اپنی شاعری کو پسِ پشت ڈال کر اپنا جی بہلانے کی غرض سے اپنے دوستوں کو بے تکلف خط لکھنے شروع کر دیے تھے جن میں وہ بسا اوقات اپنا مذاق آپ اڑاتا ہے اور آج غالب کے یہ خطوط اردو طنز و مزاح کا عظیم سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔ کرب جب حد سے سوا ہوجاتا ہے اور آفاتِ ارضی و سماوی انسان کے قابو میں نہیں رہتے تو مجبور و بے بس اور ہر طرف سے مایوس انسان اپنے آپ پر قابو پانے کی جستجو میں ایک ایسی ہنسی کی طرف جست لگاتا ہے جو اس کی بے بسی کو ایک راحت، بے سہارگی کو سہارا اور اس کی مجبوری اور اداسی کو ایک شعوری حوصلہ عطا کرتی ہے اور ہنسی جب یہ رخ اختیار کرتی ہے تو اس میں ایک نئی طرح داری، ایک نئی جہت اور ایک نئی شانِ بے نیازی پیدا ہوجاتی ہے۔

حیدرآباد پچھلی نصف صدی سے ایسی ہی ہنسی ہنستا چلا آرہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج اسے طنز و مزاح کے سب سے بڑے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ حیدرآباد کا کوئی سنجیدہ شاعر جب کسی بیرونی مشاعرے میں کلام سناتا ہے تو لوگ غلط فہمی میں اسے بھی مزاحیہ شاعر سمجھ لیتے ہیں اور ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔

حضرات! پچھلی نصف صدی کے حیدرآباد کی اس ہنسی کا میں چشم دید گواہ رہا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ہنسی کے اس سفر کو آگے بڑھانے میں حیدرآباد کے سینکڑوں مزاحیہ فن کاروں، اداکاروں، ادیبوں، اور شاعروں کے علاوہ کئی گم نام خوش باشوں اور منچلوں نے حصہ لیا ہے۔ لیکن اس ہنسی کو ایک اجتماعی روپ دینے اور اسے ایک مرکز پر لانے کا سہرا اگر کسی کے سر جاتا ہے تو وہ ہمارے دوست حمایت اللہ کا سر ہے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ایک لمبی عمر تک اپنے سر پر شادی کا سہرا بندھوانا بھی گوارا نہ کیا حالاں کہ ان دنوں ان کے سر پر اچھے خاصے بال ہوا کرتے تھے۔ آج میں حیدرآباد کے اسی "شیطانِ ظریف" کے بارے میں بہ طور خراجِ تحسین کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ وقت کی ترازو پر جب صدیوں کا حساب کتاب ہونے لگے تو ہماری نصف صدی کے حساب میں کوئی گھپلا نہ ہو۔

میں نے حمایت اللہ کو پہلے پہل ۱۹۵۲ء میں عوامی جمہوری محاذ کے ایک جلوس میں دیگر فن کاروں کے ساتھ لوگوں کا دل بہلاتے اور ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت تو مجھے ان کا قد بھی خاصا بلند نظر آیا تھا حالاں کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں ان کے قد میں کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوئی لیکن مجھے غالباً اس لیے غلط فہمی ہوئی کہ اس وقت وہ ایک لاری پر سوار تھے اور میں نے شاید بے خیالی میں ان کے قد میں لاری کے قد کو بھی شامل کر دیا تھا۔ ماشاء اللہ حمایت اللہ نے ایسا دراز قد پایا ہے کہ جو کوئی بھی ان کے ساتھ کھڑا ہوجاتا ہے احساسِ کمتری میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا (سوائے قطب مینار کے)۔ یہی وجہ

کہ میں ان سے اسی وقت ملتا ہوں جب وہ بیٹھے ہوئے ہوں۔ وہ نہ صرف خود مزاح پیدا کرتے ہیں بلکہ جہاں کہیں بھی انھیں کوئی شخص مزاح پیدا کرتا ہوا نظر آتا ہے تو وہ اس کی اتنی ہمت افزائی کرتے ہیں کہ بعد میں ایک منزل وہ آتی ہے جب یہ شخص اپنے آپ کو خود حمایت اللہ کی ہمت افزائی کرنے کا اہل سمجھ بیٹھتا ہے۔ یقین نہ آئے تو مجھے دیکھ لیجیے کہ آج کس طرح چار لوگوں کے سامنے حمایت اللہ کی ہمت افزائی کررہا ہوں۔ کوئی فن کار کہیں نظر آجائے، کوئی مزاحیہ واقعہ، صورت حال یا کردار مل جائے تو وہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر قائن آرٹس اکیڈیمی اور زندہ دلانِ حیدرآباد کی معرفت عوام تک پہنچا کر اسے حیدرآباد کی مجلسی زندگی کا حصہ بنادیتے ہیں۔

غالب نے کہا ہے کہ سو پشت سے ان کا پیشہ، آبا سپہ گری رہا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے لمبے عرصے تک جنگیں لڑنے کے باوجود ان کے آبا کی پشتیں نہ صرف پیدا ہوتی رہیں بلکہ ان کی سنچری تک بن گئی اور اگر اتنے خون خرابے کے بعد آخر میں غالب کو ہی پیدا کرنا تھا تو اس کے لیے سپہ گری کے پیشے کو اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سنا ہے کہ سات پشتوں تک ہمارے حمایت اللہ کے آبا کا پیشہ بھی سپہ گری ہی رہا ہے (یہ نہ سمجھیے کہ ان کے آبا کی اس سے پہلے کی پشتیں بے روزگار تھیں۔ کوئی نہ کوئی کام تو کرتی ہی ہوں گی۔ کیا کام کرتی تھیں اس کے بارے میں حمایت اللہ کچھ بتانا نہیں چاہتے)۔ تاہم اتنا ضرور جانتا ہوں کہ حمایت اللہ تک آتے آتے ان کے سپہ گر خاندان میں اصلی تلواروں کی جگہ لکڑی کی تلواروں نے لے لی تھی۔ چناں چہ کئی برس پہلے میں نے خود حمایت اللہ کو ایک ڈرامے میں لکڑی کی تلوار ہاتھ میں تھامے اور ڈالڈا گھی کے پانچ کیلو والے ڈبہ کی مدد سے بنائے گئے ایک خوش نما شاہی تاج کو اپنے سر پر سجائے، جو ان کے کانوں تک آرہا تھا، ایک ظالم و جابر بادشاہ کا لاجواب رول ادا کرتے دیکھا ہے۔

اگرچہ کہ خاندان کی عزت و ناموس کو برقرار رکھنے کی خاطر بعد میں حمایت اللہ نے یہ لکڑی کی تلوار بھی پھینک دی اور طنز و مزاح کے تیر اور خنجر وغیرہ اٹھالیے کیوں کہ یہ اصلی ہتھیاروں سے کہیں زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ حمایت اللہ ایک ایسے چلبلے شخص کا نام ہے جس نے نچلا بیٹھنا سیکھا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نخواستہ اگر کسی کے جنازے میں شرکت کرنا پڑ جائے تو میں میت اور حمایت دونوں سے حتی الامکان دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے باوجود ایک بار ایسا ہوا کہ میت کو قبر میں اتارنے کے بعد آخری دیدار کے لیے جب کفن سرکایا گیا تو مرحوم کے کسی بہی خواہ نے کہا "ذرا چہرہ تو دیکھیے، لگتا ہے مرحوم کسی بات پر مسکرارہے ہیں"۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ عین اسی وقت حمایت اللہ بھی میرے پیچھے کھڑے زراف کی طرح اپنی گردن نکالے میت کا آخری دیدار کرنے میں مصروف ہیں جو ان کے بیان کے مطابق ان کے لیے تو یہ پہلا دیدار ہی تھا۔ فوراً سرگوشی کے انداز میں میت کے بہی خواہ سے بولے "جی ہاں! یقیناً مسکرارہے ہیں بلکہ اس بات پر خوش ہیں کہ آپ جیسے اوباشوں سے نجات مل گئی۔" اور وہ مسکراہٹ جو ابھی کچھ دیر پہلے تک میت کے ہونٹوں پر بھی ہوئی تھی وہ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ عصمت صرف خواتین کے پاس ہوتی ہے لیکن میرے دوستوں میں حمایت اللہ اکیلے ایسے مرد ہیں جو باعصمت بھی ہیں۔ میں یہ ان دنوں کی بات کررہا ہوں جب ان کے پاس واقعی عصمت ہوا کرتی تھی۔ یہ ہر دم اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کہیں کوئی حسینہ ان کی عصمت پر ڈاکا نہ ڈال دے۔ ان گنت کلچرل پروگراموں اور ڈراموں میں کئی نازنینوں کے ساتھ کام کرنے کے باوجود انھوں نے "کلچر" اور "عصمت" کے بیچ ہمیشہ ایک "لکشمن ریکھا" قائم رکھی۔ اوروں کی طرح نہیں کہ پہلے تو کسی فن کارہ کے فن میں دل چسپی لیتے ہیں اور جب راہ و رسم بڑھنے لگتی ہے تو فن کو یکسر بھول کر صرف فن کارہ ہی سے مطلب رکھنے کو ضروری جانتے ہیں۔ ایک زمانے میں فائن آرٹس اکیڈیمی کے پروگراموں میں یہ جو خواتین آرٹسٹ سرگرمی سے حصہ لیا کرتی تھیں تو اس کی وجہ یہ

تھی کہ ان کے سرپرستوں کو بہ خوبی اندازہ تھا کہ وہ حمایت اللہ کے "محفوظ ہاتھوں" میں ہیں۔ ایسے محفوظ ہاتھ جو کلچر کو تو چھیڑ سکتے ہیں لیکن خواتین کو بالکل نہیں چھیڑ سکتے۔ بہت عرصہ پہلے میں نے ایک بار ان سے کہا تھا "حمایت بھائی! بے شک خواتین پر لازم ہے کہ وہ اپنی عصمت کی حفاظت کریں۔ لیکن یہ کام آپ نے اپنے ذمے کیوں لے رکھا ہے۔ انھیں کرنے دیجیے حفاظت۔ پھر اس حفاظت کی بھی ایک حد ہوتی ہے یہ حد پار ہو تو قدرت کا اتنا بڑا کارخانہ، جو روز بہ روز بڑا ہی ہوتا جارہا ہے، کیسے چلے گا؟"

بولے "بچوں کو بڑوں کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔"

حمایت اللہ کی پاکیِ داماں کی حکایت کو بیان کرنے کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ وہ رموزِ مملکتِ حسن و عشق سے یکسر نابلد ہیں۔ وہ اس معاملے میں بھی بڑے طاق ہیں۔

بڑے بھولے بھالے، بڑے پاک باطن ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

اب آپ سے کیا چھپانا کہ یہ خاکسار خود ایک بار اپنے معاملات دل کے ہاتھوں پریشان ہوکر ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے پر مجبور ہوچکا ہے۔ جب میں نے اپنا حالِ دل بیان کیا تو بہت غور و خوض کے بعد انھوں نے مجھے بعض ایسے مفید مگر ناقابلِ اشاعت مشورے دیے جن پر عمل کرنے کے بعد مجھے سچ مچ "گوہرِ مقصود" حاصل ہوگیا اور یوں میں نے دل و جان سے انھیں اپنا گرو مان لیا۔ ایک دن موقع پاکر عرض کیا "گروجی مہاراج! آپ اپنے ششیوں کو جو اپدیش دیتے رہتے ہیں ان پر عمل کرنے سے نہ کیول ان کا جیون سپھل ہوتا جارہا ہے بلکہ ان کی منوکامنائیں بھی پوری ہوتی جارہی ہیں۔ مہاراج! سوئم آپ اپنے ان اپدیشوں پر کیوں عمل نہیں کرتے؟" کچھ دیر سوچ کر بولے "بالک! دھیرج رکھو۔ ہم شیگرہ ہی تمھاری اچھا کا پالن کریں گے۔"

اور اس کے کچھ ہی دن بعد معلوم ہوا کہ حمایت اللہ نے ڈاکٹر رشید موسوی سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ان کی شادی کی تقریب میں اشفاق حسین مرحوم نے مجھ سے کہا تھا۔ "مجتبیٰ! میں اسے حمایت اور رشید موسوی کی شادی نہیں سمجھتا بلکہ اسے مرثیے اور مزاح کا ملاپ تصور کرتا ہوں۔" ان دنوں ڈاکٹر رشید موسوی کی کتاب "دکن میں مرثیہ اور عزاداری" کا خاصا چرچا تھا۔ اشفاق حسین جہاں دیدہ اور مردم شناس آدمی تھے۔ ان کے اس بلیغ تبصرے میں حیدرآبادی مزاح کا یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ اچھا اور سچا مزاح وہی ہوتا ہے جو غموں اور مصائب کو اپنی ذات میں انگیز کرلینے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ ایک ایسا مزاح جس سے پیدا ہونے والے قہقہے کی پرتوں کو آپ کھولنے لگیں تو آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو ٹپک پڑیں۔ بعد میں مرثیہ اور مزاح کے ملاپ کا یہ تجربہ اتنا کامیاب ہوا کہ آج حمایت اللہ نہ صرف ایک فرماں بردار مزاح نگار اور مزاح کار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں بلکہ ایک فرماں بردار شوہر کی حیثیت سے بھی ان کا رتبہ بہت بلند ہے۔ خدا مرثیے اور مزاح کے اس ملاپ کو برسوں قائم و دائم رکھے۔ کہتے ہیں کہ ہر بڑے آدمی کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے (یہ اور بات ہے کہ اس بڑے آدمی کی بربادی کے لیے ایک عورت کے ہاتھ کی نہیں بلکہ کئی عورتوں کے ہاتھوں کی ضرورت پیش آتی ہے)۔ ڈاکٹر رشید موسوی خوش قسمت ہیں کہ انھیں حمایت اللہ کو بڑا آدمی بنانے میں اپنے ہاتھوں کو زیادہ زحمت نہیں دینی پڑی کیوں کہ یہ شادی اتنی دیر سے ہوئی کہ اس وقت حمایت اللہ خود اپنے بل بوتے پر بڑے آدمی بن چکے تھے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ حمایت اللہ نہ صرف خودساختہ انسان ہیں بلکہ خود ساختہ شوہر بھی ہیں۔ آپ چاہیں تو اس میں بے ساختہ کا اضافہ بھی فرماسکتے ہیں۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

تاہم انھیں جب بھی دیکھا "تعمیری مزاح" کو فروغ دیتے ہوئے ہی دیکھا۔ کیا یہ کوئی معمولی تعمیری کام ہے ؟ پچھلے کچھ برسوں سے حمایت اللہ کی ایک نئی پہچان بھی بن گئی ہے یعنی وہ بعض مقبول ٹیلی ویژن سیریلوں میں "کیریکٹر ایکٹر" کا رول انجام دے رہے ہیں۔ کیریکٹر ایکٹر، اس عمر رسیدہ ایکٹر کو کہتے ہیں جس کے کیریکٹر کے بگڑنے کی دور دور تک کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یوں بھی حمایت اللہ کا کیریکٹر بھری جوانی میں نہیں بگڑا تو اب ستر برس کی عمر میں کیا بگڑے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فلموں میں کھری اور نری اداکاری تو کیریکٹر ایکٹر ہی کرتا ہے، ہیرو تو اپنی جسمانی وجاہت، اچھل کود اور مار دھاڑ کے بل بوتے پر کام چلالیتا ہے ہیروئنیں اپنے عشوہ و غمزہ ادا کے ذریعے ناظرین کا کلیجہ چھلنی چھلنی کردیتی ہیں۔ لے دے کے کیریکٹر ایکٹر ہی ہوتا ہے جسے اصلی اداکاری کے جوہر دکھانے پڑتے ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہمارے حمایت اللہ پیدائشی اداکار ہیں۔ لہذا اب ہر جگہ ان کی اداکاری کے چرچے عام ہیں۔ یہ جہاں بھی جاتے ہیں لوگ انھیں پہچان کر سرگوشی کے انداز میں کچھ نہ کچھ کہنے لگ جاتے ہیں۔ پچھلے مہینے میں اور وہ کاماتھ ہوٹل میں کھانا کھارہے تھے کہ تین ٹیبل چھوڑ کر دو نوجوانوں نے ان کے بارے میں گفتگو شروع کردی۔ ایک نے ان کی اداکاری کے بے پناہ تعریف کی تو دوسرے نے ان کے تازہ سیریل کے فلمی رشتہ داروں یعنی ان کی فلمی بیٹی، ان کے ہونے والے داماد اور سمدھی کو گالیاں دینی شروع کردیں کہ ان بدمعاشوں نے اس بڈھے کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس گفتگو کو سن کر ان کا چہرہ لال پیلا ہورہا ہے۔ میں نے انھیں سمجھایا "حمایت بھائی ! اگر یہ نوجوان آپ کے فلمی رشتے داروں کو گالیاں دے رہے ہیں تو اس میں آپ کو ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ آپ کے اصلی رشتہ دار تھوڑے ہی ہیں۔"

بولے "اگر وہ میرے اصلی رشتہ داروں کو بھی گالیاں دیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن ان کی بدتمیزی دیکھو کہ مجھے بڈھا کہہ رہے ہیں۔ ابھی کھانا ختم کرکے انھیں مزہ بتاتا ہوں۔" لیکن مزہ بتانے کی یہ نوبت اس لیے نہیں آئی کہ اتنے میں دوسرے نوجوان نے میری طرف اشارہ کرکے اپنے ساتھی سے پوچھا "مگر اس کے ساتھ یہ دوسرا بڈھا کون ہے ؟" پہلے نوجوان نے کہا "یہ سیریل میں تو کام نہیں کرتا۔ لگتا ہے اس بڈھے کا بڑا بھائی ہے۔" اور جب میں بڈھے کا بڑا بھائی بن گیا تو حمایت اللہ نے اطمینان کا لمبا سانس لے کر کہا۔ "بڑے بھائی۔ میرا غصہ تو ٹھنڈا ہوگیا، اب آپ کے غصے کی باری ہے۔" اس دن مجھے بزرگوں کی بات رہ رہ کر یاد آئی کہ آدمی کو ہمیشہ اچھی صحبت میں رہنا چاہیے۔

ایک بات اور عرض کردوں کہ ان کا مشاہدہ نہایت تیز ہے اور کسی کی نقل اتارنے میں ان کا کوئی ثانی میں نے نہیں دیکھا۔ بہ ظاہر محفل میں یوں انجان بنے بیٹھے رہتے ہیں جیسے کچھ نہ دیکھ رہے ہوں جب کہ ان کی نظر ہر ایک کی حرکات و سکنات کا بہ غور جائزہ لیتی رہتی ہے جس کا وہ بعد میں Action Replay پیش کرتے رہتے ہیں۔ سلیمان اریب کے انتقال کے بعد یہ بمبئی گئے تو وہاں سلیمان اریب کی یاد میں منعقدہ ایک تعزیتی نشست میں بھی شرکت کی جس میں یوسف ناظم کو بھی مضمون پڑھنا تھا۔ مگر جیسے ہی یوسف ناظم مائیکروفون پر آئے بجلی فیل ہوگئی۔ اب جو یوسف ناظم نے اپنی منحنی آواز میں مضمون پڑھنا شروع کیا تو کسی کو کچھ سنائی نہ دیا۔ البتہ بیچ بیچ میں "اریب، اریب، اریب" کا نام واضح طور پر سنائی دے جاتا تھا کیوں کہ تعزیتی جلسہ اریب ہی سے منسوب تھا۔ بمبئی سے واپس آکر حمایت اللہ نے پورے دس منٹ یوسف ناظم کی ناشنیدہ تقریر لوگوں کو سنائی جس کی خوبی یہ تھی کہ "اریب" کے سوائے کوئی اور لفظ سنائی نہیں دیتا تھا لیکن آواز کے اتار چڑھاؤ سے بہ خوبی سمجھ میں آجاتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بعد میں انھوں نے یہ معمول سا بنالیا تھا کہ ادھر کسی کا انتقال ہوا اور ادھر انھوں نے یوسف ناظم کا مذکورہ تعزیتی مضمون مائیکروفون کے بغیر سنانا شروع کردیا۔ بس

اتنی سی تبدیلی کے ساتھ کہ ادیب کے نام کی جگہ نو مرحوم شخص کا نام بار بار لیا جاتا تھا۔

حمایت اللہ پریم، محبت، رواداری، یگانگت اور صلح کل کی پالیسی پر یقین رکھتے ہیں۔ کہیں دو دوستوں میں لڑائی ہوجائے تو یہ فوراً ان کے بیچ صلح صفائی کرانے کو کود پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دولت رام انھیں حیدرآباد کے زندہ دلوں کا گاندھی جی کہتا ہے۔ ایک دن میں نے دولت رام سے پوچھا "اگر یہ گاندھی جی ہیں تو انھیں اب تک کسی نے گولی کیوں نہیں ماری۔ جب کہ گاندھی اور گولی دونوں ہی لازم و ملزوم ہیں۔"

بولا "استاد! ان کا جو گوڈسے ہے اس کے پاس پستول خریدنے کے پیسے نہیں ہیں۔ بے چارہ غریب آدمی ہے۔ ایک بار تو خود حمایت بھائی سے اس کام کے لیے پیسے مانگ چکا ہے۔ مگر ہمارے حمایت بھائی بھی تو ہم غریبوں کے گاندھی جی ہیں۔ آپ گولی بیچ میں کیوں لاتے ہیں۔ کیا اس ملک میں کسی ایک گاندھی کو گولی کھائے بنا جینے کا حق نہیں ہے۔"

حیدرآباد کے سارے فن کار ان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور وہ صحیح معنوں میں دوستوں کے دوست ہیں۔ کسی دوست کی طبیعت خراب ہوجائے یا کوئی دوست مشکل میں گرفتار ہو تو یہ اس وقت تک مشکل کشائی فرماتے رہتے ہیں جب تک کہ دوست کی مشکلات میں کمی اور خود ان کی مشکلات میں اضافہ نہ ہوجائے۔

حیدرآباد اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ یہاں ایک ایسا فن کار موجود ہے جس نے مزاح پیدا کرنے کے سارے حربوں کو اختیار کر رکھا ہے۔ وہ ایک بہترین اداکار اور بہترین مزاح کار تو ہیں ہی ایک بہترین مزاحیہ شاعر بھی ہیں بلکہ میں تو انھیں دکنی زبان کا آخری مستند مزاحیہ شاعر تسلیم کرتا ہوں۔ پچھلی نصف صدی کے حیدرآبادی مزاح کو وہ اپنے ساتھیوں کے ہم راہ اکیسویں صدی کے دروازے تک لے آئے ہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ مزاح کے اس بے لوث کاروبار کو نہ صرف اکیسویں صدی میں چلاتے رہیں بلکہ ہوسکے تو اسے بائیسویں صدی میں بھی لے جائیں۔ یوں بھی بائیسویں صدی کے آنے میں اب دن ہی کتنے باقی رہ گئے ہیں۔ صرف سو برس! انسان کے پاس خوش وقتی ہو تو وقت چٹکی بجاتے ہیں بیت جاتا ہے۔ خدا کرے حیدرآباد کو یہ خوش وقتی اور خوش ذوقی تاقیامت میسر آتی رہے (آمین ثم آمین)۔

○●○

(سلسلہ ص: ۱۲۲ سے)

جاری ہیں۔

"اگر مسیح یا مریم اس گھر میں ہوتے تو ضرور دکھائی دیتے۔ ادھیڑ عمر کے مرد نے ان بچوں کے قریب آکر کہا۔ شاید سب کے سب اس مکان سے باہر نکل گئے ہیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور حیرت سے کہا۔

"لیکن باہر نکلنے کا دروازہ تو بند ہے کہ کسی نے صدر دروازے پر باہر سے تالا لگادیا ہے تاکہ کوئی اندر آسکے اور نہ کوئی باہر نکل سکے۔ پھر یہ مسیح، محسن، سالار، خضر اور مریم کہاں چلے گئے۔ کہ مسلسل ڈھونڈنے کے باوجود کہیں دکھائی ہی نہیں دیتے۔ آؤ انھیں پھر سے تلاشتے ہیں اور تبھی گھر کے بند دروازوں نے ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے کہا۔" بڑے عجیب لوگ ہیں کہ اپنے ہی نام اور اپنی ہی کھوئی ہوئی کہانیوں کو تلاش رہے ہیں جب کہ آخری صدی کی لہولہان دیوار بس گرنے کو ہے۔ آؤ ہم سب مل کر ان کی ادھوری کہانیوں کو تابوت میں رکھ کر آخری کیل ٹھونک دیں۔

○●○

مجتبیٰ حسین

مظہر امام تم ہی ہو؟

میں نے ۱۹۷۰ء میں کشمیر اور مظہر امام دونوں کو پہلی بار سری نگر میں دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں دونوں کو ہی جی بھر کے نہیں دیکھ پایا کیوں کہ مظہر امام کو اطمینان سے دیکھنے کی کوشش کرتا تو کشمیر کے حسین نظارے مجھے اپنی طرف بلاتے تھے اور کشمیر کے حسن میں کھو جاتا تو مظہر امام کی شخصیت مجھے اپنی طرف بلاتی تھی۔ لہٰذا میں نے اس کش مکش کا پرامن حل یہ نکالا کہ دن میں تو کشمیر کو دیکھتا تھا اور شاموں میں مظہر امام کے شربتِ دیدار سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ کشمیر میں رہتے رہتے مظہر امام خود بھی کشمیریوں کی طرح ہی ہو گئے تھے۔ وہی رنگ ڈھنگ، وہی طور طریقے بلکہ ناک نقشہ بھی وہی۔ ماشاءاللہ رنگ بھی بالکل کشمیریوں کا سا۔ شاید ان کے رخساروں پر کشمیری سیبوں کی لالی بھی نکھر آئی تھی مگر میں نے ان کے رخساروں میں کشمیری سیبوں کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی کیوں کہ جہاں سیبوں کی اتنی افراط ہو وہاں میں ان کے رخساروں کے سیبوں کو لے کر کیا کرتا۔ ماشاءاللہ قد بھی انھوں نے چناروں کا سا پایا ہے۔ چناں چہ "چار چنار" کی سیر کے وقت ان کی موجودگی کی وجہ سے مجھے چار چناروں کی بجائے پورے پانچ چنار نظر آئے۔ غرض مظہر امام کشمیر اور کشمیریوں میں کچھ اتنے رچ بس گئے تھے کہ جب جب انھیں دیکھتا میرا یہ یقین پختہ ہو جاتا تھا کہ کشمیر ہندستان کا اٹوٹ حصہ ہے۔ جن لوگوں نے اس وقت کے اٹوٹ مظہر امام کو کشمیر میں دیکھا ہے وہ میرے اس دعوے کی تصدیق کریں گے۔ یہ اور بات ہے کہ امتدادِ زمانہ کے باعث آج مجھے مظہر امام خود کشمیر کی موجودہ صورتِ حال کی طرح اور کشمیر کی صورتِ حال موجودہ مظہر امام کی طرح دکھائی دینے لگی ہے۔

بہ ہر حال ۱۹۷۰ء میں پہلی بار تھوڑے سے مظہر امام اور تھوڑے سے کشمیر کو دیکھ کر واپس چلا آیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کچھ عرصہ بعد میں پھر سری نگر گیا تو معلوم ہوا کہ مظہر امام دربھنگہ گئے ہوئے ہیں۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے دربھنگہ جیسی بستی بسائی ورنہ میں کشمیر کو جی بھر کے کہاں دیکھ پاتا۔ کسی نے بتایا کہ مظہر امام سری نگر سے نکلتے ہیں تو کہیں رکے بغیر سیدھے دربھنگہ چلے جاتے ہیں جو ان کا وطن مالوف ہے۔ سفر کے معاملے میں فیض احمد فیض کا بھی یہی حال تھا کہ کوئے یار سے نکلتے تھے تو راہ میں کوئی مقام انھیں جچتا ہی نہیں تھا اور وہ سیدھے کوئے دار پہنچ کر ہی دم لیتے تھے۔ لیکن سفر کی یہ نان اسٹاپ منزل فیض کی سیاسی مجبوری تھی کیوں کہ وہ انقلابی تھے۔ کوئے یار سے نکل کر کوئے دار نہ جاتے تو لوگ کیا کہتے بلکہ راولپنڈی سازش نے تو بعد میں یہ ثابت بھی کیا کہ فیض تو اپنے طور پر کوئے یار کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن بدخواہوں نے انھیں زبردستی اٹھا کر کوئے دار تک پہنچا دیا تھا۔ بہ ہر حال سفر کے معاملے میں ہمارے مظہر امام اس بات کے قائل ہیں کہ ایک کوئے یار سے نکلتے ہیں تو دوسرے کوئے یار کی طرف چلے جاتے ہیں۔ یوں بھی دربھنگہ ان کے لیے کوئے یار کی حیثیت ہی رکھتا ہے کیوں کہ اپنی نوجوانی تک کے ابتدائی دن انھوں نے وہیں گزارے تھے۔ پھر ہر آدمی کا اپنا ایک دربھنگہ ہوتا ہے بلکہ بعض لوگوں کا تو دربھنگہ در دربھنگہ بھی ہوتا ہے۔

مظہر امام کا نام میں نے بچپن سے سنا ہے اور نوجوانوں کے دنوں سے انھیں پڑھا بھی ہے اور اب جب کہ زندگی کی شام کے سائے بڑھنے لگے ہیں تو میں انھیں اپنے سے بہت قریب محسوس کرنے لگا ہوں کیوں کہ جب سے وہ میور وہار میں اور میں اندر پرستھ

پکستنش میں رہنے لگا ہوں تب سے سری نگر، دربھنگہ اور دلی کے فاصلے سمٹ گئے ہیں اور میرے اور ان کے بیچ اب صرف ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔ جب تک مجھے ان کی اس وضع کی ہمسائگی میسر نہیں آئی تھی تب تک مجھے اڑوسی اور پڑوسی کا فرق بالکل معلوم نہیں تھا۔ مظہر امام کو اب میں بڑے اطمینان سے اپنا اڑوسی ماننے لگا ہوں کیوں کہ پڑوسی تو وہ ہوتا ہے جس سے آپ یا خود پڑوسی بہ قدر ظرف اور بہ وقت ضرورت چائے کی پتی، دودھ اور چینی وغیرہ بلا تکلف مانگ سکیں۔ میرے پڑوسی تو مجھ سے اکثر مانگتے ہیں۔ میں نہیں مانگتا یہ الگ بات ہے۔ یوں بھی میں اپنے اور پڑوسیوں کے درمیان ایک شریفانہ فاصلہ قائم رکھنے کا اس درجہ قائل ہوں کہ پچھلے دنوں میرے ایک دس سالہ پڑوسی کا ایک سفر میں اچانک ساتھ ہو گیا تو مجھے پہچان کر بولے "حضور! میں نے آپ کو اکثر اپنی ہاؤسنگ سوسائٹی میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ آپ وہاں کس سے ملنے آتے ہیں؟" اب میں انھیں کیسے سمجھاتا کہ میں اصل میں اپنے آپ سے ملنے کے لیے ہی ان کی ہاؤسنگ سوسائٹی میں آتا ہوں۔ ایسی ہی باتوں کی وجہ سے مجھے اڑوسی پڑوسیوں کے مقابلے میں بہت اچھے لگتے ہیں۔ اب مظہر امام کو ہی لیجیے۔ انھوں نے کبھی مجھ سے چائے کی پتی مانگی اور نہ ہی میں نے ان سے چینی۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی آزاد غزل سننے کو جی چاہا تو ان کی طرف چلے گئے۔ کبھی کوئی رسالہ یا کتاب مانگ کر لے آئے۔ طبیعت ناساز ہو تو اپنے ادیب دوستوں کی غیبت کرنے کے لیے ان کے ہاں جا دھمکے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ پڑوسیوں سے آپ کے تعلقات مادی اور افادی ہوتے ہیں جب کہ اڑوسیوں سے آپ کے تعلقات کی نوعیت ثقافتی ہوتی ہے اور جسے مظہر امام جیسا عالم و فاضل اور صاحبِ علم و دانش اڑوسی مل جائے اس کی خوش بختی کے کیا کہنے۔

مظہر امام ہمارے عہد کے بے حد ممتاز شاعر، ادیب، دانش ور اور نقاد وغیرہ ہیں اور ان کا شمار اردو کے مستند اور سینئر ترین شعرا کی صف میں ہوتا ہے لیکن میں جب بھی انھیں بڑے شعرا کی صف میں بیٹھا ہوا دیکھتا ہوں تو کوفت ہوتی ہے کہ یہ غفلت میں کہاں جا کر بیٹھ گئے۔ انھیں تو اصولاً مارکونی، ایڈیسن، رائٹ برادران، نیوٹن وغیرہ کی صف ہونا چاہیے کیوں کہ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ آزاد غزل کے موجد ہیں اور ہمارے ہاں موجدوں کا رتبہ شاعروں اور ادیبوں سے ہمیشہ بلند سمجھا جاتا ہے۔ آپ حیرت کریں گے کہ ۱۹۴۵ء میں ہمارا ملک ابھی آزاد بھی نہیں ہوا تھا کہ مظہر امام نے اپنے بل بوتے پر غزل کو آزاد کرا لیا تھا اور لطف کی بات یہ کہ انھوں نے یہ عظیم کارنامہ صرف پندرہ برس کی عمر میں انجام دیا تھا۔ اس اعتبار سے بھی یہ دنیا کے سب سے کمسن موجد قرار پاتے ہیں۔ ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست۔

میں اپنے آپ کو اس اہل نہیں پاتا کہ مظہر امام کی اس ایجاد کے بارے میں اظہارِ خیال کروں کیوں کہ جب میں پابند غزل کے بارے میں ہی کچھ نہیں جانتا تو آزاد غزل کے بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ تاہم میں نے انھیں ہمیشہ یہ شکایت کرتے ہوئے پایا کہ اہلِ ادب نے ان کی اس بیش قیمت ایجاد سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا۔ اب میں انھیں کیسے دلاسا دوں کہ ایٹم بم کے موجد نے بھی بڑی لگن اور جستجو کے ساتھ ایٹم بم بنایا تھا۔ (اگرچہ پندرہ برس کی عمر میں نہیں بنایا تھا اس لیے کہ بچوں سے ایسی چیزیں بنتی نہیں۔ پھر ہر کوئی مظہر امام کی طرح خدا داد صلاحیت لے کر تھوڑی پیدا ہوتا ہے۔) لیکن ایٹم بم کی ایجاد کا مطلب یہ بھی تو نہیں کہ دنیا میں اسے جگہ جگہ پھینکا جائے اور اسے عوام میں مقبول بنایا جائے۔ موجد کا کام فقط کسی چیز کو ایجاد کرنا ہوتا ہے۔ اسے اپنی ایجاد کے استعمال کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ہر چیز کے استعمال کا ایک وقت ہوتا ہے۔ مثال آپ کے سامنے ہے کہ جب وقت آیا تو بتائیے ایٹم بم ہیروشیما اور ناگاساکی میں استعمال ہوا یا نہیں؟ خدا پر بھروسہ رکھیں۔ آزاد غزل کو بھی ایک دن

اس کے ہیروشیما اور ناگاساکی ضرور مل جائیں گے۔

ادب مظہر امام کی زندگی کا نہ صرف بنیادی کام ہے بلکہ اسے ان کا جزو ایمان کہیے۔ ادب سے ایسا والہانہ سروکار میں نے کسی اور ادیب میں نہیں پایا۔ آپ کسی بھی وقت ان کے گھر چلے جائیں انھیں ادب کی تخلیق کرتے ہوئے یا پہلے سے تخلیق شدہ ادب کو پھر سے سجاتے اور سنوارتے ہوئے پائیے گا۔ سب سے اہم بات یہ کہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے باوجود انھوں نے ادب سے اپنے سروکار میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ میں ایسے کئی عہدیدار ادیبوں کو جانتا ہوں جو جب تک برسرِ کار رہے اپنے دفتر کی اسٹیشنری کے بل بوتے پر ادب سے اپنے سروکار کو خوب پھیلائے رکھا۔ لیکن جیسے ہی ریٹائر ہوئے اس سروکار کی لگام کھینچ لی۔ بعض اوقات مجھے بھی مظہر امام کی ڈاک کو دیکھنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ اردو کے بے شمار ناقابلِ مطالعہ رسائل اور اخبارات کے علاوہ روزانہ ان کے پاس دس پندرہ خط تو ضرور آتے ہیں اور کم و بیش اتنے ہی خط مظہر امام کی طرف سے جواباً جاتے ہیں۔ مظہر امام کے نام آنے والے خطوط کو میں عموماً مشاہیر کے خطوط کہتا ہوں کیوں کہ ان کے نام آئے ہوئے بعض مشاہیر کے خطوط کا مجموعہ کچھ عرصہ پہلے "نصف ملاقات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ غالباً اسی خوف کے مارے میں نے مظہر امام کو کبھی کوئی خط نہیں لکھا کہ خدا نہ خواستہ کہیں میرا شمار بھی مشاہیر میں نہ ہونے لگ جائے۔ بہ ہر حال ان کے ہاں ڈاک کی اتنی آمد و رفت ہوتی ہے کہ ہمارے بعض سرکاری محکموں میں بھی نہ ہوتی ہوگی اور مزے کی بات یہ کہ ادب سے اس سارے سروکار کا سارا خرچ وہ سراسر اپنی جیب سے برداشت کرتے ہیں۔ ہے کوئی ہمارے درمیان ایسا ادیب جو اپنی پنشن کو یوں ادب کی راہ میں بے دریغ لٹانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

وہ بے حد منظم اور ڈسپلن کے پابند آدمی ہیں۔ ان کے لکھنے پڑھنے کا ایک الگ کمرہ ہے جہاں وہ رجسٹر بھی رکھا ہوتا ہے جس میں وہ اپنی حاضری لگوانے کے علاوہ روز کے روز آنے والے خطوط معہ تاریخ اور لکھنے والے کے نام اور خط کے نفسِ مضمون کے خلاصے کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔ اس رجسٹر کے ایک خانے میں جواب دینے کی تاریخ بھی لکھی جاتی ہے۔ پھر الماریاں ہیں کہ کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔ ایسی کتابیں جنھیں آپ ناک پر رومال رکھ کر چمٹے سے پکڑنا بھی گوارا نہ کریں گے انھیں بھی سینت سینت کر ان الماریوں میں نہایت قرینے سے صاف ستھری کتابوں کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ سچ پوچھیے تو انھوں نے اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے کو بالکل دفتر کی طرح بنا رکھا ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ کسی کو بلانا بھی ہو تو سیدھے سیدھے آواز نہیں لگاتے بلکہ وہیں میز پر بیٹھے بیٹھے گھنٹی بجادیتے ہیں۔ شاید اسی گھنٹی کا فیض ہے کہ بیگم مظہر امام جب بھی مظہر امام سے مخاطب ہوتی ہیں تو انھیں "صاحب صاحب" کہہ کر ہی بلاتی ہیں۔ گویا ادھر گھنٹی بجی اور وہ ادھر "صاحب صاحب" کہتی ہوئی پہنچ جاتی ہیں۔ دفتر کی طرح ہی وہ ٹھیک وقت پر اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ چوں کہ گھڑی نہیں دیکھتے اسی لیے دیر تک کام کرتے ہیں اور اوپر سے اوور ٹائم کا مطالبہ بھی نہیں کرتے۔ سردی کے موسم میں باضابطہ سوٹ بھی پہنے رہتے ہیں ٹائی کے ساتھ۔ ادب کے کام کو اس اہتمام سے انجام دینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

مظہر امام ایک شخصیت نہیں بلکہ انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ جتنی معلومات ان کی الماریوں میں رکھی ہوئی کتابوں میں بند ہیں ان سے کہیں زیادہ معلومات خود مظہر امام کی ذات میں بند ہیں۔ کسی بھی موضوع پر ان سے سوال کیجیے تو وہ اس کی پوری تاریخ اس کے سالم جغرافیے کے ساتھ بیان کردیں گے۔ کسی کتاب کے بارے میں پوچھیں تو بتادیں گے کہ اس کتاب کے کون سے صفحے کی کونسی سطر میں کیا لکھا ہوا ہے۔ ایسا حیرت انگیز حافظہ میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے۔ میں اکثر ان سے کہتا ہوں کہ جب آپ کی ذات میں خود اتنا

علم پوشیدہ ہے تو گھر میں اتنی ساری کتابیں رکھنے کا تکلف کیوں کرتے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ جب سے مظہر امام میرے اڑوسی بنے ہیں تب سے میں نے بیش تر کتابیں انجمن ترقی اردو کو دے دی ہیں۔ اب اپنی لکھی ہوئی کتابوں کے علاوہ کوئی اور کتاب نہیں رکھتا کیوں کہ مظہر امام جیسا اڑوسی کسی کو مل جائے تو اسے اپنے پاس کتاب رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر کسی حوالے کے لیے کتاب کو کھولنا پڑ جائے تو اس کی گرد بھی جھاڑنی پڑتی ہے اور اردو کتابوں پر تو ان دنوں کچھ زیادہ ہی گرد پائی جاتی ہے بلکہ ان کے اوپر اتنی گرد نہیں ہوتی جتنی کہ اندر پائی جاتی ہے۔ چناں چہ جب بھی کسی حوالے کے لیے کسی کتاب کی ضرورت پیش آتی ہے تو فوراً مظہر امام کو فون کردیتا ہوں یا ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ مجھے کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔ بلکہ کتاب کی گرد بھی وہی جھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ نہ صرف ادب کے بارے میں بلکہ ادیبوں اور فن کاروں کے بارے میں بھی گہری معلومات رکھتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ کرشن چندر سے سلمیٰ صدیقی کی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ کیفی اعظمی نے شوکت کیفی کو پہلے پہل کب دیکھا تھا۔ حد ہو گئی کہ ایک بار مجھ ناچیز کے بارے میں بھی بعض ایسے حیرت انگیز انکشافات کر چکے ہیں جن کے تعلق سے مجھے یہ گمان تھا کہ انھیں میرے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا۔

ہمارے مظہر امام کے بارے میں ایک بات اور بتادوں کہ بلا کے حسن پرست واقع ہوئے ہیں۔ اتفاق سے کہیں سچ مچ حسن دست یاب ہوجائے اور ایسے میں مظہر امام ساتھ میں ہوں تو میں حسن کو نہیں دیکھتا بلکہ مظہر امام کو دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ اگر حسن کا شمار دیکھنے کی بجائے کھانے کی چیزوں میں ہوتا تو بلاشبہ مظہر امام دائمی بد ہضمی کے شکار رہتے۔ مانا کہ ان کا حافظہ بہت غضب کا ہے لیکن اگر کہیں حسن اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ ہویدا ہوجائے تو انھیں یہ تک یاد نہیں رہتا کہ وہ شادی شدہ ہیں اور یہ کہ بیگم مظہر امام بھی ان کے ساتھ ہیں۔ اگر چہ لڑکپن سے ان کا مزاج عاشقانہ رہا ہے لیکن آفریں ہے ان پر کہ آج بھی اپنے لڑکپن سے دست بردار نہیں ہوئے۔ یہ تو خود انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ پندرہ برس کی عمر میں جب انھوں نے نرگس کی پہلی فلم دیکھی تو اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہوگئے اور اس سے شادی کرنے کی ٹھان لی۔ نرگس کے عشق میں اپنا اور اردو شاعری دونوں کا برا حال کرلیا یعنی نرگس کی یاد میں شعر تک کہنے لگے۔ (خیال رہے کہ انھوں نے آزاد غزل کا تجربہ بھی پندرہ برس کی عمر میں کیا تھا)۔ اس والہانہ عشق کی خوبی یہ تھی کہ جس سے عشق فرماتے تھے اسے کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ ہجر اور وصال دونوں ہی کیفیتوں کا بوجھ اکیلے ہی چپ چاپ برداشت کرتے رہے۔ ان کے اس بے لوث اور بے ضرر افلاطونی عشق نے یہ تک گوارا نہ کیا کہ دربھنگہ سے نکل کر بمبئی ہی چلے جاتے اور اپنے محبوب سے اپنے دل کا حال بیان فرماتے۔ اندیشہ تھا کہ کہیں ان کی غیرتِ عشق کو رسوائی کا منھ نہ دیکھنا پڑ جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگر یہ دربھنگہ سے بمبئی چلے جاتے تو نرگس سے ان کی شادی ہوجاتی۔ البتہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ ان کا شمار بھی اس وقت کے مقبول فلمی ہیروؤں میں ہونے لگتا۔ جن لوگوں نے مظہر امام کی نوجوانی کی تصویریں دیکھی ہیں وہ اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اس زمانے میں وہ اس وقت کے بعض مروجہ اداکاروں جیسے بھارت بھوشن اور کرن دیوان سے تو بہ درجہ خوب رو اور وجیہہ تھے۔ بہ ہر حال نرگس سے عشق کے معاملے میں جب راج کپور نے ان کے دل کو چھلنی چھلنی کرنا شروع کیا تو انھوں نے بادلِ ناخواستہ اپنے بے لوث عشق کا رخ اداؤں کی طرف پھیر دیا۔ مگر یہاں بھی وہی دشواری پیش آئی کہ کہیں کشور کمار نے راستہ کاٹا، کہیں کمال امروہوی خم ٹھونک کر ان کے مدِ مقابل آگئے۔ مگر جب کامیڈین محمود نے تک انھیں آنکھیں دکھانی شروع کردیں تو چار و ناچار مینہ بھابی سے شادی کرلی۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

فلموں سے مظہر امام کی دل چسپی بھی کچھ کم دل چسپ نہیں ہے۔ ایک بار ان کی کتابوں میں سے مجھے ریاضی کے مضمون کی

ایک کاپی مل گئی ۔ ۱۹۴۴ء کی ۔ جب وہ نویں یا دسویں جماعت کے طالب علم تھے ۔ بہت خوب صورت ہینڈ رائٹنگ میں انھوں نے ریاضی کے سوالوں کے غلط جوابات نہایت فصیح و بلیغ اردو میں لکھ رکھے تھے ۔ البتہ کاپی کے بائیں جانب والے صفحات پر جا بہ جا نہایت خوب صورت انگریزی ہینڈ رائٹنگ میں فلموں کے نام، اداکاروں کے نام، فلم دیکھنے کی تاریخ، اس سنیما گھر کا نام جہاں فلم دیکھی گئی تھی اور متعلقہ فلم کی کہانی کی تفصیلات درج تھیں ۔ پھر ہر قسم کی تفصیل کے نیچے فلمی ہیروئنوں کی اداکاری سے کہیں زیادہ ان کے حسنِ جہاں سوز کی تعریف کچھ اس ڈھنگ سے کی گئی تھی کہ ۱۹۴۴ء میں چھوڑے گئے ان کے تیروں سے میرا ۱۹۹۹ کا کلیجہ تک چھلنی چھلنی ہونے لگا ۔ میں نے انھیں کاپی دکھائی تو بولے "یہ آپ کو کہاں سے مل گئی ۔ اصل میں مجھے ان دنوں فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا ۔"

میں نے کہا "آپ کے کہنے کی ضرورت نہیں، وہ تو آپ کے غلط جوابات سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے ۔"

جھینپ کر بولے "میں جب بھی کوئی فلم دیکھتا تو اس کے بارے میں اپنے تاثرات کاپی میں لکھ لیتا تھا ۔"

میں نے پوچھا "مگر یہ تاثرات آپ انگریزی میں کیوں لکھتے تھے ؟"

معصومیت سے بولے "تاکہ گھر والوں کو پتہ نہ چلے کہ کیا لکھا ہے ۔"

اللہ اللہ وقت بھی کیا ظالم شئے ہے ۔ ایک زمانے میں کسی چیز کو پوشیدہ رکھنا ہوتا تھا تو اسے انگریزی میں لکھا جاتا تھا اور اب اس مقصد کے لیے بےچاری اردو زبان کو زحمت دی جاتی ہے ۔

فلموں کی بات چل نکلی ہے تو ایک واقعہ یاد آگیا ۔ مظہرامام نے پندرہ برس پہلے سری نگر ٹیلی ویژن کے لیے دلیپ کمار سے ایک طویل انٹرویو لیا تھا ۔ اتفاق سے ٹیلی ویژن کے لیے دلیپ کمار کا یہ پہلا انٹرویو بھی تھا ۔ مظہرامام کے پاس اس انٹرویو کا کوئی کیسٹ نہیں تھا جس پر یہ ہمیشہ دکھ کا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے ۔ ایک دن انھیں کہیں سے یہ کیسٹ مل گیا اور اسے دیکھنے کے لیے انھوں نے وی ۔ سی ۔ آر چلایا ہی تھا کہ میں ان کے ہاں جا دھمکا ۔ پندرہ برس پرانے اس انٹرویو کو دیکھنے میں ان کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ میری آمد پر مجھ سے مصافحہ کرنا تو دور کی بات رہی زبان سے علیک سلیک تک نہ کی ۔ میری طرف دیکھے بغیر صرف ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا اور خود انٹرویو کو دیکھنے میں مصروف ہوگئے ۔ کچھ دیر میں خاموش رہا ۔ پھر خیال آیا کہ ایسا بھی کیا دلیپ کمار کہ ایک دوست کی خاطر، کچھ دیر کے لیے ہی سہی، کیسٹ کو روکا نہ جاسکے ۔ لہذا میں نے انھیں جان بوجھ کر ڈسٹرب کرنے کی غرض سے پوچھا ۔ "جناب یہ کیا دیکھا جارہا ہے ؟"

نظریں ہٹائے بغیر بہ عجلت ممکنہ بولے "دلیپ کمار اور میں یعنی میں اور دلیپ کمار" ۔ جب انھوں نے پھر چپ سادھ لی تو میں نے اب کے شرارتاً پوچھا "مگر یہ تو بتائیے کہ ان دونوں میں دلیپ کمار کون ہے ؟"

بڑے گہرے انہماک کے ساتھ بولے "دائیں طرف میں ہوں اور بائیں طرف دلیپ کمار" بہ خدا ان کے اس صحیح جواب کے بعد میری ہمت نہیں پڑی کہ ان کے انہماک کو بھنگ کروں کیوں کہ مجھے یہ شبہ ہوگیا تھا کہ کہیں وہ خود کو دلیپ کمار اور دلیپ کمار کو مظہرامام سمجھ کر تو یہ انٹرویو نہیں دیکھ رہے ہیں ۔ مظہرامام کے ایسے ہی معصوم رویے مجھے بہت بھلے لگتے ہیں ۔

انھوں نے جب اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا تو وہ اردو زبان و ادب کے عروج کا زمانہ تھا ۔ آج اردو کا دائرہ سمٹتا جارہا ہے تو تب بھی وہ اسی زور و شور، رفتار اور مقدار کے ساتھ اردو ادب تخلیق کیے چلے جارہے ہیں جب کہ میں کبھی کبھی اردو کے تعلق سے مایوس ہوجاتا ہوں ۔ کچھ برس پہلے کی بات ہے کہ مظہرامام ایک لڑکے کو گھر کے کام کاج کے لیے بہار سے لے آئے تھے ۔ نو دس برس

کا ہوگا۔ مظہرامام اور بیگم مظہرامام اسے اپنے بچے کی طرح چاہتے تھے۔ جب بھی وقت ملتا دونوں اسے اردو پڑھایا کرتے تھے۔ چوں کہ گھر میں کام کاج زیادہ نہیں تھا۔ لہذا دیکھتے ہی دیکھتے وہ اردو پر حاوی ہوگیا۔ بڑی روانی کے ساتھ اردو پڑھنے اور لکھنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے مظہرامام نے اسے اردو لکھنے پڑھنے کے کام پر ہی اپنے ہاں نوکر رکھ چھوڑا ہے۔ اس نے آداب بھی مظہرامام کے سے اپنا لیے تھے۔ سلام بھی اس طرح کرتا تھا جیسے کسی نے اس کے شعر پر داد دی ہو۔ اردو کے لیے مظہرامام کے اس بے لوث جذبے کی میں دل سے قدر کرنے لگا تھا۔ میں جب بھی اس لڑکے کو دیکھتا اپنے آپ پر لعنت بھیجتا کہ مجھے تو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنے نواسوں اور پوتوں کو ہی اردو پڑھادوں۔ مظہرامام کو دیکھو غیروں تک کو اردو پڑھا رہے ہیں۔ بے شک اردو کو ایسے ہی بے لوث قدردانوں کی ضرورت ہے۔ مگر ایک دن یوں ہوا کہ مظہرامام کے ہاں گیا تو یہ لڑکا گھر پر اکیلا موجود تھا۔ پتہ چلا کہ مظہرامام اور بیگم مظہرامام مارکیٹ تک گئے ہیں اور ابھی آنے والے ہیں۔ میں ان کی واپسی کے انتظار میں رک گیا تو سوچا کہ کیوں نہ اس لڑکے کی اردو دانی کا امتحان لیا جائے۔ میں نے کہا "اردو کے کچھ اچھے شعر یاد ہوں تو سناؤ"۔ جواب میں اس نے چار شعر سنائے جب سب کے سب مظہرامام کے تھے۔ میں نے کہا "اردو کی ان کتابوں کے نام بتاؤ جنھیں تم پڑھ چکے ہو۔"

رٹا لگانے والے طالبِ علم کی طرح جھٹ سے بولا "زخمِ تمنا، رشتہ گونگے سفر کا، پچھلے موسم کا پھول، بند ہوتا ہوا بازار، آتی جاتی لہریں، اکثر یاد آتے ہیں، ایک لہر آتی ہوئی"۔

مجھے اچانک احساس ہوا کہ جسے میں اردو کے لیے مظہرامام کا بے لوث جذبہ سمجھ رہا تھا وہ اتنا بے لوث بھی نہیں ہے بلکہ بالوث زیادہ ہے۔ کیوں کہ وہ تو اردو کا نہیں بلکہ اپنا ذاتی قاری پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ لیکن اب میں اس بات کو بھی برا نہیں سمجھتا کیوں کہ یہ لڑکا اب اردو لکھنا پڑھنا سیکھ کر اپنے وطن واپس چلا گیا ہے۔ وہاں اس پر یہ پابندی تھوڑا ہی ہے کہ وہ ہردم اپنے مالک کی کتابیں ہی پڑھتا رہے۔ پھر ایک نہ ایک دن اسے اچھے برے کی تمیز بھی تو ہوجائے گی اور کیا عجب کہ وہ ہم جیسوں کی کتابیں بھی پڑھنا شروع کردے۔

مظہرامام کی کتابوں کا ذکر آہی گیا ہے تو مجھے ایک بات یاد آگئی۔ ابھی پچھلے مہینے کی بات ہے۔ مظہرامام اور جوگیندر پال دونوں مل کر کسی ادبی تقریب میں شرکت کے لیے پٹنہ گئے تھے۔ وہاں سے ان دونوں کا ارادہ مظہرامام کے آبائی شہر دربھنگہ بھی جانے کا تھا لیکن عین وقت پر پورا دربھنگہ سیلاب کی زد میں آگیا اور یہ وہاں نہ جاسکے۔ واپس آکر اپنی مجبوری بتائی تو میں نے کہا "حضور! یہ سب آپ کی کتابوں کی دین ہے۔"

پوچھا "وہ کیسے؟"

میں نے کہا "دیکھ لیجیے آپ نے اپنی کتابوں کے نام کیسے رکھ چھوڑے ہیں۔ "آتی جاتی لہریں" اور "ایک لہر آتی ہوئی"۔
اگر آپ اپنی کسی کتاب کا نام "ایک لہر جاتی ہوئی" ہی رکھ دیتے تو شاید دربھنگہ سیلاب کے عذاب سے بچ جاتا۔"

مظہرامام کی حسِ مزاح بہت تیز ہے اور وہ ایسی باتوں پر بھی کھل کر قہقہہ لگانا جانتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک نہایت معصوم اور سادہ لوح انسان ہیں اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ستر برس کے ہوجانے کے باوجود آج بھی ان کے اندر ایک بچہ بیٹھا ہوا ہے جسے وہ پال پوس کر دن بہ دن چھوٹا کرتے چلے جارہے ہیں۔ ان کے اندر بیٹھے ہوئے لڑکے کے تیور اخترالایمان کے لڑکے کی طرح نہیں ہیں جو بات بات پر اخترالایمان سے پوچھ بیٹھتا ہے۔ "اخترالایمان تم ہی ہو؟" مظہرامام کا لڑکا تو اتنا خوش مزاج ہے اور ان

(باقی صفحہ ۹۰ پر)

مجتبیٰ حسین

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

(ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی پچھترویں سال گرہ کے موقع پر ۱۹۹۳ء میں دہلی میں منعقدہ ایک تہنیتی تقریب میں پڑھا گیا خاکہ)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ پچھتر برس کے ہوگئے۔ یہ بات آپ اور ہم تو اس لیے مان لیں گے کہ وہ 1918ء میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن شاید خود ڈاکٹر گوڑ اس بات کو نہ مانیں کیوں کہ راج بہادر گوڑ کسی بھی بات کو اتنی آسانی سے نہیں مانتے۔ مجھے اس وقت اپنے خاندان کے ایک بزرگ یاد آگئے جنھوں نے ساری زندگی ہنستے کھیلتے، دھومیں مچاتے ہوئے گزاردی۔ نوے سال کی عمر میں بھی ان کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ کھلی رہتی تھی جو عموماً نو سال کے بچے کے ہونٹوں پر دکھائی دیتی ہے۔ سچی اور خالص مسکراہٹ۔ مگر جب وہ اکیانوے برس کے ہوگئے اور میں ان کی سال گرہ پر مبارک باد دینے گیا تو اداس سے نظر آئے۔ اداسی کا سبب پوچھا تو کہنے لگے "میاں! زندگی کے اکیانوے برس تو چٹکی بجاتے میں گزار دیے لیکن اب احساس ہونے لگا ہے کہ مجھ میں مزید بوڑھا ہونے کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔" ۔۔۔ اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس جملہ کو ادا کرنے کے بعد بھی وہ مزید چار برس تک زندہ رہنے کی گنجائش نکالتے رہے۔ اصل میں انسان کی عمر کیلنڈروں سے طے نہیں ہوتی بلکہ اس کے اپنے احساس اور رویہ سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اپنے جذبے اور احساس کی سطح پر عمر کی اس منزل سے گزر رہے ہیں جہاں ان میں مزید جوان بنے رہنے کی خاصی گنجائشیں موجود ہیں۔
میرا اپنا حال بلکہ حالت یہ ہوگئی ہے کہ میں کبھی کبھی اپنے آپ کو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا بزرگ سمجھ بیٹھتا ہوں۔ حالاں کہ ڈاکٹر گوڑ ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں میں نے غالباً اس وقت دیکھا تھا جب میں خود نو برس کا تھا۔ یہاں غالباً کا استعمال میں نے اس لیے کیا ہے کہ میں ان دنوں سابق ریاست حیدرآباد کے شہر گلبرگہ میں رہتا تھا اور اپنے بڑے بھائیوں سے ملنے کے لیے کبھی کبھار حیدرآباد آجاتا تھا۔ میرے بڑے بھائی حیدرگوڑے کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ ایک رات مجھے بلا کر تاکید کی گئی کہ میں مکان کے اس کمرہ میں بالکل نہ جاؤں جو مکان کے پچھلے حصہ میں واقع تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ وہاں ایک مہمان آیا ہوا ہے اور اسے آرام کی سخت ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی کہا گیا کہ اگر کوئی یہ پوچھے کہ گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا ہے تو جواب میں یہ کہہ دوں کہ کوئی بھی نہیں آیا ہے۔ ایسے مہمان کو دیکھنے کی تمنا بھلا کس بچہ کے دل میں پیدا نہیں ہوگی۔ لہٰذا سخت تاکید کے باوجود میں نے چوری چھپے درازوں میں سے جھانک کر اس مہمان کو دیکھا۔ آرام تو خیر وہ کیا کرتا کچھ لکھنے پڑھنے میں ضرور مصروف تھا۔ اس نے ایک لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ مونچھیں شاید تھیں جو پتہ نہیں اصلی تھیں یا نقلی۔ یہ غالباً ۱۹۴۷ء کی بات ہے جب مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ اور ان کے دیگر کمیونسٹ ساتھی تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کے سلسلے میں روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے اور اپنے ٹھکانے بدل بدل کر اپنے آپ کو گرفتار ہونے سے بچا رہے تھے۔ میں نے اوپر جس مہمان کا ذکر کیا ہے وہ ہمارے گھر میں رہا تو صرف ایک ہی دن لیکن اس کے گھر سے چلے جانے کے پانچ چھ برس بعد کسی نے بتایا کہ اس دن جو مہمان ہمارے گھر میں رکا تھا اس کا نام ڈاکٹر راج بہادر گوڑ تھا۔ جب مجھے اس کا پتہ چلا تو میں چودہ پندرہ

برس کا ہوچکا تھا اور اس وقت تک ڈاکٹر گوڑ جیل سے رہا ہوچکے تھے۔ میں اپنے دوستوں کو بڑے فخر کے ساتھ اس وقت بھی بتایا کرتا تھا اور آج بھی بتایا کرتا ہوں کہ ڈاکٹر گوڑ نے کبھی ہمارے گھر میں بھی پناہ لی تھی۔ اگرچہ میں آج بھی پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آج سے پچاس برس پہلے جس مہمان نے ہمارے گھر میں پناہ لی تھی کیا وہ بچ مچ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ تھے۔ میں چاہتا تو پچھلے پچاس برسوں میں اپنے بڑے بھائیوں سے اس کے بارے میں پوچھ سکتا تھا بلکہ خود ڈاکٹر گوڑ سے اس کی توثیق حاصل کرسکتا تھا۔ مگر میں نے کبھی نہیں پوچھا اور آج بھی پوچھنا نہیں چاہوں گا۔ اس لیے کہ اگر خدانخواستہ جواب نفی میں ملے تو میری زندگی میں سے ان سے رابطہ کے عرصے میں اچانک پانچ چھ برسوں کی کمی ہوجائے گی اور میں عمر کی اس منزل میں ہوں جہاں سینت سینت کر جمع کیے ہوئے لمحوں کو تفریق کے عمل سے گزارنا میرے لیے گھاٹے کا سودا ہوگا۔ فراق نے کچھ ایسی ہی ذہنی کیفیت کے بارے میں کہا تھا:

خود اپنے خیالوں کو ہم دم میں ہاتھ لگاتے ڈرتا ہوں

قصہ دراصل یہ ہے کہ راج بہادر گوڑ میرے لیے افسانہ بھی ہیں اور حقیقت بھی۔ یہ معاملہ صرف میرا ہی نہیں ہر اس شخص کا ہے جس نے ملک کی آزادی سے پندرہ سولہ برس پہلے سابق ریاست حیدرآباد کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ شخصی حکم رانی کے اس دور میں جب اچھے اچھوں کے منھ بند رہتے تھے مخدوم محی الدین، روی نارائن ریڈی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں نے تلنگانہ کے کسانوں اور مزدوروں کو ساتھ لے کر مسلح جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ اس تحریک نے اس وقت کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی پیدا کردی تھی۔ مخدوم محی الدین کا ترانہ:

لو سرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا گل نار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا

اس وقت کے نوجوانوں میں بے پناہ مقبول ہوچکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جیل سے رہائی کے بعد مخدوم محی الدین کا جو جلوس نکلا تھا اس سے بڑا جلوس میں نے آج تک نہیں دیکھا بلکہ جوں جوں میری عمر میں اضافہ ہوتا جارہا ہے میرے حافظے میں اس جلوس کی لمبائی بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔

مخدوم اور ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں اور یہ دونوں کسی افسانے کے کردار لگتے تھے۔ ان لوگوں کی روپوشی کے بارے میں بھی طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ جنھیں سن کر احساس ہوتا تھا کہ یہ اس دھرتی کے باسی نہیں ہیں۔ مثلاً مخدوم نے ایک بار اپنے ایک برہمن دوست کے گھر میں پناہ لی۔ ان کا برہمن دوست تھا تو کمیونسٹ پارٹی کا ہم درد لیکن اس کے والدین رہن سہن اور کھانے پینے کے معاملے میں بڑے کٹر واقع ہوئے تھے۔ مخدوم کے دوست نے مخدوم کو سمجھا رکھا تھا کہ اس کے والدین کو ہرگز یہ پتہ نہ چلنے پائے کہ وہ مسلمان ہیں۔ مخدوم اس پر سختی سے عمل بھی کرتے رہے۔ ایک دن کھانے کی میز پر ان کے دوست کے والد نے باتوں باتوں میں مخدوم سے کہا "تم لوگ کمیونسٹ پارٹی میں کام کرتے ہو۔ تم لوگوں کے دین و ایمان کا کیا بھروسہ۔ کہیں تم لوگ گوشت وغیرہ تو نہیں کھاتے؟"

اتنا سنتے ہی مخدوم نے منھ میں جاتے ہوئے نوالے کو روکا اور کہا "نعوذ باللہ، لاحول ولاقوۃ! چھی چھی۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہم گوشت کھاتے ہیں۔"

ڈاکٹر گوڑ بھی کئی نام اور کئی بھیس بدل کر روپوش رہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ یہ بھی غالباً ۱۹۴۵ء کی بات ہے کہ راج بہادر گوڑ ایسی ہی کسی "نعوذ باللہ" والی بات پر دھر لیے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ جیل میں پہنچ کر انھوں نے کسی بیماری کا بہانہ کیا۔

(میڈیسن کے ڈاکٹر ہونے کا اتنا فائدہ تو وہ اٹھانا جانتے ہی تھے)۔ پھر یہ اکیلے بیمار نہیں پڑے بلکہ اپنے ایک ساتھی کامریڈ جواد رضوی کو بھی ساتھ لے کر بیمار پڑے ("حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو" اسی کو کہتے ہیں) نتیجہ میں دونوں قیدی علاج کے لیے عثمانیہ ہسپتال لائے گئے۔ اپنا علاج کرنا وہ خود تو جانتے ہی تھے۔ لہٰذا دونوں کچھ ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ ہسپتال سے فرار ہوگئے کہ ان کے فرار ہونے کے ڈرامے کا ذکر کئی دنوں تک حیدرآباد کے گلی کوچوں میں ہوتا رہا۔ ہماری فلموں میں بھی قیدی اس طرح فرار نہیں ہوتے جیسے یہ دونوں ہوئے تھے۔ میری نسل کے لوگوں کے ذہنوں میں مخدوم اور راج بہادر گوڑ ایک عرصے تک افسانوی کردار کی طرح ہی رہے۔

۱۹۵۲ء میں جب یہ رہا ہوئے اور جب پہلی بار انھیں اصلی روپ میں دیکھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ کیا یہی وہ راج بہادر گوڑ ہیں جن کے قصے الف لیلیٰ کی داستانوں کی طرح مشہور ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اصل راج بہادر گوڑ تو وہی تھے اور ۱۹۵۲ء کے بعد سے ہم جس ڈاکٹر گوڑ کو دیکھ رہے ہیں وہ اصل میں ایک بھیس بدلی ہوئی شخصیت ہے۔

معزز حضرات! آج کی محفل میں ہم جن بزرگ کی پچھتر ویں سال گرہ منا رہے ہیں ذرا آپ ان کے ہاتھوں کی طرف غور سے دیکھیں اور بتائیں کہ کیا کبھی ان ہاتھوں نے ہتھیار اٹھائے ہوں گے۔ ان کے قریبی جاننے والے کہتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں نے ضرور ہتھیار اٹھائے تھے۔ پتہ نہیں کیوں اٹھائے تھے۔ میرے پاس ایک نہایت بوسیدہ اور پرانی گھڑی تھی۔ ایک بار وہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی میں اسے ٹھیک کرانے کے لیے گھڑی ساز کے پاس گیا۔ گھڑی ساز نے پہلے تو اسے حقارت سے دیکھا اور پوچھا "کیا ہوا ہے اسے؟" میں نے کہا "یہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی تھی۔" گھڑی ساز نے کہا "جب یہ زمین پر گر گئی تھی تو آپ نے اسے اٹھایا ہی کیوں۔ وہیں پڑی رہنے دیتے۔" ایسی ہی بات ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں ذہن میں آتی ہے کہ جب آپ کو ہتھیار ڈالنے ہی تھے تو انھیں اٹھانے کی زحمت ہی کیوں کی تھی۔ پھر ذرا سوچیے کہ کیا ان ہاتھوں نے کبھی کسی پر گولی چلائی ہوگی۔ اور اگر چلائی بھی ہوگی تو کیا گولی نشانے پر لگی ہوگی۔ آج ان ہاتھوں کو دیکھ کر ان کہانیوں پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا جو ان ہاتھوں سے منسوب رہی ہیں اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ بارہ برس پہلے جب مجھے جاپان جانے کا موقع ملا تو ڈاکٹر گوڑ کے تعلق سے میری غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگیا۔ جاپانیوں کے ہاتھ بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ میں ان کے ہاتھوں کو دیکھتا جاتا تھا اور گھنٹوں حیرت میں مبتلا رہتا تھا کہ کیا سچ مچ ان ہاتھوں نے دوسری جنگ عظیم میں گولیاں چلائی تھیں اور بم پھینکے تھے۔ اصل میں تاریخ مختلف ادوار میں ہاتھوں سے مختلف کام لیتی ہے اور ان کے کاموں کی نوعیت کو تبدیل کرتی رہتی ہے۔ چناں چہ تاریخ نے ڈاکٹر گوڑ کے ہاتھوں سے اب ہتھیار چھین لیے ہیں اور ان میں ایک قلم تھما دیا ہے تاکہ وہ اسے چلاتے رہیں۔ اس سے پہلے قدرت ان کے ہاتھوں میں اسٹیتھ سکوپ تھمانا چاہتی تھی جسے پھینک کر انھوں نے ہتھیار اٹھا لیے تھے۔

مجھے اس وقت اپنے ایک دوست کی یاد آرہی ہے جو نہایت کم عمری میں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ ان کے ذمہ کام یہ تھا کہ راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں کو ہتھیار فراہم کرتے رہیں۔ ایک بار یہ اسلحہ لے جاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ بعد میں پولیس نے ایسی کڑی تفتیش کی کہ بے چارے کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس واقعے کے کئی برس بعد انھیں علاج کے لیے سوویت یونین روانہ کیا گیا جہاں ان کی ریڑھ کی ہڈی کی مرمت کی گئی۔ وہ علاج سے مطمئن ہو کر خوش خوش واپس تو ہوگئے لیکن چند ہی برسوں میں خود سوویت یونین کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ان پچھتر برسوں میں نہ جانے کتنوں کی ریڑھ کی ہڈیاں ٹوٹیں لیکن ہمارے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ریڑھ کی ہڈی اب بھی صحیح و سالم ہے۔ ورنہ ہمارے کتنے محبوب تھے جن کا حشر نہ جانے کیا ہوگیا۔

ایک شعر یاد آگیا:

زمانہ کس قدر پامال کردیتا ہے انساں کو
ہمارے دور کے محبوب پہچانے نہیں جاتے

اصل میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے لمحۂ موجود میں پوری شدت کے ساتھ جینے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ ہم جیسے تو ابھی سے ساحل پر بیٹھ کر زندگی کے منجدھار کا تماشا دیکھنے لگے ہیں۔ لیکن راج بہادر گوڑ ہیں کہ اب بھی اس منجدھار میں بہتے چلے جارہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہوئے پورے پچاس برس بیت گئے۔ پچاس برس پہلے ان میں جو چیز دیکھی تھی وہ آج بھی ان کی ذات میں موجود و محفوظ ہے اور اس شئے کو سیماب صفتی کہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے ایک لمحے کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتے۔ نتیجے میں ان کے مزاج میں بلا کی تیزی، چستی اور پھرتی نظر آتی ہے۔ جلد بازی اور عجلت ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مجھے یاد ہے پچھلے سال کے اواخر میں ایک دن صبح صبح چھ بجے میرے گھر کے آس پاس اچانک کسی کے پکارنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تو محسوس ہوا کہ کوئی بڑی تیزی کے ساتھ میرے فلیٹ تک آنے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ میرا مکان چوتھی منزل پر تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کی رفتار اور میرا نام پکارنے کی تکرار سے یوں لگتا تھا جیسے کوئی بھونچال سا آنے والا ہو۔ میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اپنی کزن مسز اودیش رانی کے ساتھ کھڑے ہیں۔ بولے "ابے مسخرے اتنی دیر تک سوتا ہے۔"

میں نے کہا "ایک زمانے تک "سرخ سویرے" کے آنے کی امید میں بہت جلدی بیدار ہوجایا کرتا تھا۔ یہ تو نہیں آیا۔ اب جلدی جاگ کر کیا کروں گا۔"

یہ سن کر ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی پیشانی پر ایک ہلکی سی چوٹ تھی جسے وہ بار بار سہلارہے تھے۔ میں نے پوچھا "یہ کیا ہوگیا؟"

بولے "تمھارے گھر کے زینے کو تیزی سے طے کرنے کی کوشش میں میری پیشانی ریلنگ سے ٹکرا گئی اور کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "آپ کو اتنی عجلت سے سیڑھیاں چڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

بولے "ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ اودیش رانی نے بالآخر شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ چناں چہ آج سے پانچ دن بعد ان کے دولہا میاں آنے والے ہیں اور چھٹے دن ہر حالت میں ان کی شادی ہوجانی چاہیے۔ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے شادی میں شرکت نہ کرسکوں گا۔ لہٰذا "کورٹ میریج" کے سارے امور تمھیں طے کرنے ہوں گے۔ کنیادان بھی تمھیں کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا "گوڑ بھائی! یہ تو سب ہوجائے گا، مگر آپ کو سیڑھیاں چڑھنے میں اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں بھی اودیش رانی کی عمر اب پچاس برس ہوگئی ہے۔ جہاں اتنی تاخیر ہوئی ہے وہاں پانچ دس منٹ کی اور تاخیر ہوجاتی تو کیا فرق پڑتا۔"

ہنس کر بولے "پیارے! پچاس برس کی عمر ہوگئی ہے اسی لیے تو عجلت نہایت ضروری تھی ورنہ تیس پینتیس برس کی عمر ہوتی تو مزید سال دو سال انتظار کرنے میں قباحت نہیں تھی۔"

یہ کہہ کر وہ فوراً واپس جانے لگے۔ میں نے انھیں بہت روکا کہ ناشتہ کرکے جائیں لیکن وہ بالکل نہیں رکے۔ جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے چلے بھی گئے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ایک اور خرابی نما خوبی یہ ہے کہ یہ اپنے سے چھوٹوں کا بہت خیال رکھتے ہیں بلکہ اتنا خیال رکھتے ہیں کہ کچھ عرصے بعد چھوٹے اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھنے کی غلطی کرنے لگ جاتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ چھوٹے آدمی کا بڑا پن کتنا کھوکھلا ہوتا ہے۔ یہ جب کسی کی ہمت افزائی کرتے ہیں تو زمین آسمان کے قلابے ملادیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۸ء میں جب میرے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو ڈاکٹر گوڑ نے میری مزاح نگاری کے بارے میں ایک طویل اور جامع مقالہ لکھا۔ میری مزاح نگاری کے بارے میں اس وقت تک کسی نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ مگر ان کا مضمون سن کر میں ہکا بکا سا رہ گیا کیوں کہ انھوں نے میری مزاح نگاری میں جو خوبیاں تلاش کی تھیں وہ خود مجھے نظر نہیں آرہی تھیں۔ چناں چہ جلسے کے بعد میں نے ان سے شکایت کی کہ "حضور آپ نے میری بہت زیادہ تعریف کردی جس کا میں مستحق نہیں تھا۔"

بولے "میاں! اس کو تعریف نہیں کہتے۔ ہمت افزائی کہتے ہیں ہمت افزائی۔"

میں نے کہا "مگر مجھ میں اتنی ہمت افزائی کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔"

ہنس کر بولے "اپنی ذات میں تھوڑی سی خوش فہمی پیدا کرلو تو یہ ہمت بھی آجائے گی۔"

چناں چہ ڈاکٹر گوڑ کا یہ مضمون اب بھی میرے پاس محفوظ ہے جسے میں اکثر اوقات اپنے میں خوش فہمی پیدا کرنے کے خیال سے پڑھ لیتا ہوں اور میری نااہلی دیکھیے کہ یہ خوش فہمی آج تک مجھ میں پیدا نہیں ہوئی۔ یہ نہ سمجھیے کہ ڈاکٹر گوڑ نے میرے ساتھ یہ خصوصی سلوک کیا تھا۔ پچھلے تین چار دہوں میں ڈاکٹر گوڑ نے سیکڑوں ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کی ہے اور حتی المقدور انھیں خوش فہمی میں مبتلا کیا ہے۔ ہر کوئی میری طرح نااہل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں کہنے کو میرے پاس بہت سی باتیں ہیں۔ لیکن اس وقت مجھے ایک سال پہلے کے دسمبر کی ایک شام یاد آرہی ہے۔ حیدرآباد میں ایک دوست کی بیٹی کی شادی میں ڈاکٹر گوڑ سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ بابری مسجد کو گرے ہوئے سات آٹھ دن ہی بیتے تھے۔ ڈاکٹر گوڑ نے آتے ہی میزبان سے کہا "بھئی کھانا جلدی لگوادو۔ میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔"

میں نے کہا۔ "گوڑ بھائی! یہ آپ نے کب سے کھانے میں دل چسپی لینی شروع کردی؟"

بولے "نہیں! مجھے پرانے شہر میں ایک میٹنگ میں جانا ہے۔"

میں نے پوچھا "کوئی ادبی محفل ہے؟"

بولے "دیکھ نہیں رہے ہو ملک میں کیا ہورہا ہے اور تمھیں ادبی محفل کی سوجھ رہی ہے۔ پرانے شہر میں ایک میٹنگ ہے بابری مسجد کے انہدام کے خلاف۔"

میں نے کہا "گوڑ بھائی! بابری مسجد کے انہدام کے خلاف آپ کیا کہیں گے یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن یہ بتائیے کہ آج کے حالات میں کون آپ کی عقل مندی اور ہوش مندی کی باتیں سنے گا۔"

غصے سے بولے۔ "کسی کو نہ سننا ہو تو نہ سنے۔ مگر مجھے جو کہنا ہے وہ تو میں کہتا رہوں گا۔ اگر کوئی مجھے نہیں سننا چاہتا تو میں ہی اپنے کو اپنی باتیں سناتا رہوں گا۔"

ایسے موڈ میں ان سے بحث کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے عافیت اس میں جانی کہ اپنے حلوے مانڈے سے مطلب رکھوں۔

ڈاکٹر گوڑ نے آج سے پچاس پچپن برس پہلے جس عقیدے اور مسلک کو اپنایا تھا اس پر آج تک اسی طرح قائم ہیں۔ انسان

دوستی، محبت، پیار اور رواداری کا مسلک۔۔۔ دنیا میں کیا نہیں ہوا۔ لیکن یہ بدستور اپنے مسلک کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ دامن بھلے ہی چاک ہوگیا ہو لیکن انھوں نے اپنے مسلک کو چاک نہیں ہونے دیا۔ کبھی کبھی ڈاکٹر گوڑ مجھے ایک ایسے عوامی رہنما نظر آتے ہیں جو انسانوں کی بھیڑ میں تنہا رہ گئے ہیں۔ ہجوم کی تنہائی کو جو لوگ محسوس کرسکتے ہیں وہ اس نکتے کو بہ خوبی سمجھ پائیں گے۔ میں انھیں سچے، مخلص، بے لوث اور بے غرض رہنماؤں کی نسل کی آخری نشانی سمجھتا ہوں۔

اگر میں صاحبِ اقتدار ہوتا تو ایسے بچے کھچے رہنماؤں کی ایک سینکچوری Sanctuary بناتا تاکہ یہ وہاں محفوظ رہیں اور ہمارے موجودہ رہنما انھیں دیکھ لیا کریں۔ کوئی سبق تو وہ خیر کیا حاصل کر پائیں گے مگر انھیں دیکھ لینے میں کیا قباحت ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہندوستان کی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر رہے ہیں۔ ایک سوال میں ڈاکٹر گوڑ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ آج کے حالات میں پھر پارلیمنٹ کے ممبر بننا پسند کریں گے؟۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر کوئی انھیں پھر سے پارلیمنٹ میں بھیجنے کی کوشش کرے تو کہیں وہ پھر سے ہتھیار نہ اٹھالیں۔

میری دعا ہے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ برسوں ہمارے درمیان رہیں اور ہماری ہمت افزائی کرتے رہیں اور ہم میں وہ خوش فہمی پیدا کرتے رہیں جس کے بغیر آج کے دور میں زندہ رہنا دشوار نظر آنے لگا ہے۔

○●○

(سلسلہ ص: ۸۰ سے)

سے اتنا بے تکلف ہے کہ آنکھ مار کر مظہرامام سے پوچھتا ہے۔ "پیارے مظہرامام کیسے ہو؟ کس حال میں ہو؟ خوش تو ہو نا۔" اور اس کے جواب میں مظہرامام تحیّر اور تجسس کی رنگ بہ رنگی تتلیوں کو پکڑنے کے لیے ان مانوس راستوں پر نکل پڑتے ہیں جو انھیں ان کے بچپن کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے اندر زندگی جینے کے لیے ایک بچے کی طرح ہمک، للک اور چہک موجود ہے۔ وہ نہایت نفیس، مہذب، شائستہ اور سلیقہ مند انسان ہیں۔ بھلے ہی کوئی انھیں اپنی خوشیوں میں شامل نہ کرے لیکن یہ گھس گھسا کر ہر ایک کے دکھ درد میں ضرور شریک ہوجاتے ہیں اور یہی رویہ ایک سچے فن کار کا طرہ امتیاز ہے۔ جوں جوں میں اپنی تاریخِ پیدائش سے دور اور اپنی تاریخِ وفات سے قریب ہوتا جارہا ہوں اور اب جب کہ میں نے اپنا آخری پڑاؤ ڈال دیا ہے تو اپنے آپ کو اس لحاظ سے خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ اس آخری پڑاؤ میں مجھے مظہرامام کی رفاقت میسر آگئی ہے۔ یہ ایک ایسی نعمتِ غیر مترقبہ ہے جو مجھے ڈیڑھ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہی مل جاتی ہے۔ جہاں علم و فضل اور شعر و ادب تو ہے ہی، پیار اور خلوص کے علاوہ محبت اور یگانگت بھی ہے۔ ذرا سوچیے کہ یہ چیزیں مجھے زندگی میں کتنی دیر سے میسر آئی ہیں۔ اسی لیے ان چیزوں سے بھرپور استفادہ کرنے کا جب بھی خیال آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ میری عمر اور بھی دراز ہو بشرطیکہ ساتھ میں مظہرامام کی عمر بھی دراز ہو ورنہ میں اس عمرِ طویل کو لے کر کیا کروں گا۔ مانا کہ غالب کی ریاضی کم زور تھی اور وہ ضرورتِ شعری کے تحت ایک سال میں سے پچاس ہزار دن تک برآمد کرلیا کرتے تھے۔ میری دعا ہے کہ مظہرامام برس ہا برس ہمارے درمیان رہیں۔ چاہے ہر برس کے ۳۶۵ دن ہی کیوں نہ ہوں (اکتوبر ۱۹۹۹ء)

○●○

پون ورما
ترجمہ: اسامہ فاروقی

ضمیمہ

[اسداللہ کے مقدمے پر حکومت کے
چیف سکریٹری (جارج سوئنٹن) کا نوٹ]



پون کمار ورما

"سب رس" کے اس شمارے میں آپ کی کتاب "غالب، شخصیت اور عہد" کا ضمیمہ اور کتابیات پیش خدمت ہیں۔ ترجمہ کتابی شکل میں بہت جلد منظر عام پر آجائے گا۔

۱۹/ اگست ۱۸۳۰ء

اسداللہ خود کو ان متوفی نواب نصراللہ خاں کا بھتیجہ بتاتے ہیں جو جنرل پیروں کے تحت ضلع آگرہ کے حاکم تھے اور جو جنگِ مرہٹہ میں لارڈ لیک سے آملے تھے، جب ان کی پسندیدہ خدمات کے صلے میں ان کو ضلع آگرہ میں استمراری ملکیت میں پندرہ ہزار روپے سالانہ لگان جمع کروانے کی شرط پر بعض علاقے عطا کیے گئے تھے۔ یہ سونک اور سرسہ کے پرگنے تھے جن کی کل آمدنی، جیسا کہ اسداللہ اپنی درخواست میں بیان کرتے ہیں ایک لاکھ روپے سے زائد تھی۔

نصراللہ خاں، متوفی نواب احمد بخش خاں، رئیس فیروزپور وغیرہ کے داماد تھے۔

نصراللہ خاں کے انتقال پر ان کے پس ماندگان ان کی ماں، ان کی بیوہ، تین بہنیں اور دو بیٹے یعنی درخواست گزار اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف علی خاں (یا مرزا یوسف) تھے۔

درخواست گزار مزید بیان کرتا ہے کہ ایک اور شخص خواجہ حاجی نامی تھا جو نصراللہ خاں کے خاندان سے نہیں بلکہ نصراللہ خاں کی پھپھی کا رشتے کا بھانجہ اور اس طرح ان کا سببی رشتہ دار تھا۔ تاہم بادی النظر میں اس شخص نے نصراللہ خاں کے تمام معاملات ناجائز طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے اور ان کی وفات کے بعد مبینہ طور پر اس نے متوفی کے اہلِ خاندان کا حق مارنے کی غرض سے احمد بخش خاں کے ساتھ سازش کی۔ نصراللہ خاں کے خسر اور فطری طور پر ان کے اہلِ خاندان کے سرپرست کی حیثیت سے احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے فیروزپور نے حق سے اپنے ذمے کے زرِ استثنٰی میں نصراللہ خاں کے اہلِ خاندان کی کفالت کا ذمہ لینے کی شرط پر تخفیف حاصل کی اور درخواست گزار کا ادعا ہے کہ نواب نے غیر منصفانہ طور پر خواجہ حاجی کو نصراللہ خاں کے خاندان کا اصل شخص مقرر کیا اور اہلِ خاندان کی عمومی کفالت کے لیے پانچ ہزار روپے کی رقم مختص کرتے ہوئے اس کو مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم کیا:

خواجہ حاجی کو	دو ہزار روپے

نصراللہ خاں کی والدہ کو	ڈیڑھ ہزار روپے
درخواست گزار کو	ڈیڑھ ہزار روپے

اجہ حاجی کے انتقال کے بعد احمد بخش خاں نے دو ہزار روپے کا حصہ متوفی کی اولاد کے نام جاری رکھا۔ جب (نصراللہ خاں کی) والدہ انتقال ہوا تو ان کا حصہ ان کی سب سے بڑی بیٹی (یعنی نصراللہ خاں کی بہن) کے نام منتقل ہوا جو اس میں سے اپنی دو چھوٹی بہنوں کی الت کرتی رہیں۔

درخواست گزار کا بیان ہے کہ اپنے حصے کی رقم سے وہ اپنے چھوٹے بھائی کی کفالت کرتے رہے ہیں۔ جن کے لیے درخواست گزار شکایت ہے کہ احمد بخش خاں نے کفالت کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ تاہم غالباً امر واقعہ یہ ہے کہ اسداللہ خاں کے نام مقررہ ڈیڑھ ار روپے کی رقم دونوں بھائیوں کی مشترکہ کفالت کے لیے مخصوص کی گئی تھی جس طرح سے کہ بادی النظر میں ڈیڑھ ہزار روپے کی سری رقم عورتوں یعنی درخواست گزار کی تین پھپھیوں کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔

اب یہ تحقیق کرنا بے فائدہ ہوگا کہ آیا خواجہ حاجی، نصراللہ خاں کے ورثا کے حصہ دار ہونے کے مستحق تھے یا نہیں کیوں کہ / مئی ۱۸۰۶ء کے پروانہ میں جو احمد بخش خاں نے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے دست خط اور مہر سے حاصل کیا انھیں ایک فرد ندان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن اس امر کی تحقیق فائدہ مند ہوگی کہ آیا جب احمد بخش خاں نے نصراللہ خاں کے اہلِ خاندان شمول خواجہ حاجی کی کفالت کے لیے صرف پانچ ہزار روپے سالانہ کی رقم مختص کی تو کیا یہ عمل ان کی سند کے بہ موجب تھا اور آیا ان ، وارث اور جانشین شمس الدین خاں پر واجب ہے کہ وہاں کی کفالت کے لیے زیادہ رقم کا انتظام کریں۔

اس امر کی تحقیق بھی فائدہ مند ہوگی کہ آیا درخواست گزار کے ادعا کے بہ موجب لارڈ لیک کی سند مورخہ ۶ / جون ۱۸۰۶ء جعلی ہے . آیا اس معاملے کی پوری طرح چھان بین کی گئی ہے۔

چناں چہ درخواست گزار کی اپنی متعدد عرض داشتوں میں بیان کردہ تمام جزئیات میں گئے بغیر، جنھیں تاہم برائے مہربانی نظرِ مان سے دیکھ لیا جائے کیوں کہ ان میں بہتیری ایسی معلومات دست یاب ہیں جو میرے خیالِ واثق میں حکومت کے علم میں ہیں، میں ل محض ان امور کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو حال میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔

اسداللہ ۱۸۲۸ء میں کلکتہ آئے اور پرشین سکریٹری کے حضور میں ایک عرض داشت پیش کی، ملاحظہ ہو عرض داشت موصولہ / اپریل ۱۸۲۸ء، اندراج مورخہ ۲ / مئی، نمبر ۳۶۔

اس عرض داشت پر یہ حکم صادر ہوا تھا کہ "حکم دیا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا درخواست رزیڈنٹ دہلی کے حضور میں پیش کی جانی چاہیے۔"

۲۴ / فروری ۱۸۲۹ء کو رزیڈنٹ دہلی سر ایڈورڈ کول بروک نے حکومت کو اطلاع دی کہ اسداللہ نے میرے ہاں اس مضمون کی ب درخواست پیش کی کہ "نصراللہ خاں کے انتقال کے بعد، جو تحریست مقرری پندرہ ہزار روپے زرِ استمراری کے عوض پرگنہ سونگ اور سہ کے مالک تھے، علاقہ جات فیروزپور وغیرہ کے رئیس متوفی احمد بخش خاں سے وصول شدنی زرِ استمراری بیس تا تیس ہزار روپے اس بل پر معاف کیا گیا تھا کہ احمد بخش خاں، نصراللہ بیگ خاں کے اہلِ خاندان کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے اور یہ کہ اس کفالت کے ، احمد بخش خاں نے کبھی بھی سالانہ پانچ ہزار روپے سے زاید ادا نہیں کیے، جس میں سے دو ہزار روپے درخواست گزار کی ایک بہن کو کرتے تھے اور درخواست گزار کے بھائی اور پھپھیوں کی کفالت کے لیے کوئی بھی رقم نہیں ادا کرتے تھے۔"

سر ایڈورڈ کول بروک آگے لکھتے ہیں: "احمد بخش خاں کے نام حکومت کی سند مورخہ ۴ / مئی ۱۸۰۶ء میں صرف حسبِ ذیل دفعہ کو موضوعِ بحث سے متعلقہ قرار دیا جاسکتا ہے: " خواجہ حاجی اور متوفی مرزا نصراللہ بیگ کے دیگر متعلقین کی پرورش اور کفالت تمھاری ذمہ داری ہے اور تم وقتِ ضرورت حکم صادر ہونے کے صورت میں سرکار کو مہیا کرنے کی غرض سے پچاس گھڑسوار تیار رکھو گے۔"

اپنی رپورٹ کے اختتام پر سر ایڈورڈ کول بروک نے استدعا کی کہ اگر حکومت کے محافظ خانے میں اس معاملے سے متعلق کوئی دستاویزات ہوں تو انھیں ان کی نقل فراہم کی جائیں۔

جواب میں لفٹنٹ کرنل میلکم کے نواب احمد بخش خاں سے طے شدہ معاملے سے متعلق مراسلے مورخہ ۴ / مئی ۱۸۰۶ء کا ایک اقتباس ۱۳ / مارچ ۱۸۲۹ء کو رزیڈنٹ دلی کے ہاں بھیجا گیا اور ان سے درخواست گزار کی پیش کی ہوئی شکایت کی جانچ پڑتال کرنے اور اس کے بارے میں اپنی رائے لکھ کر بھیجنے کو کہا گیا۔

۵ / دسمبر ۱۸۲۹ء کو قائم مقام رزیڈنٹ دلی مسٹر ہاکنس نے حکومت کی توجہ سر ایڈورڈ کول بروک کے مراسلے مورخہ ۲۴ / فروری کی طرف مبذول کروائی اور مطلع کیا کہ اس کا جواب ابھی تک موصول نہیں ہوا ہے۔ جواب میں انھیں مطلع کیا گیا کہ جواب ۱۳ / مارچ کو بھیج دیا گیا تھا جس کے بعد سے معاملے کے بارے میں کوئی رائے موصول نہیں ہوئی اور اس خیال سے کہ اصل مراسلہ کہیں بے جگہ نہ رکھ دیا گیا ہو انھیں اس کی ایک نقل فراہم کی گئی۔

گذشتہ ۵ / مئی کو مسٹر ہاکنس نے اسداللہ کے معاملے میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ معلوم پڑتا ہے کہ انھوں نے اسداللہ کی درخواست کو متوفی احمد بخش خاں کے بیٹے اور جانشین نواب شمس الدین خاں کے پاس شکایت کے تعلق سے اپنا جواب دینے کی غرض سے بھیجا تھا۔ شمس الدین کے جواب کا ترجمہ اور لارڈ لیک کا مبینہ شقہ مورخہ ۷ / جون ۱۸۰۶ء جس میں ان اشخاص کی صراحت کی گئی ہے جنھیں پانچ ہزار روپے سالانہ کی رقم ادا کی جانی چاہیے، مسٹر ہاکنس کی رپورٹ کے ساتھ منسلک تھا، جس میں وہ اپنی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ مدعی کو اس کے اور اس کے بھائی مرزا یوسف کے لیے جو کچھ صراحت کے ساتھ لارڈ لیک نے مقرر کیا ہے اور جو، جیسا کہ وہ کہتے ہیں، نواب شمس الدین ہمہ وقت ادا کرنے کے لیے رضامند رہے ہیں، یعنی ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ کی رقم سے زائد کا کوئی حق نہیں ہے۔

جواب میں گذشتہ ۲۸ / مئی کو حکومت نے واضح کردیا کہ وہ مسٹر ہاکنس کے فیصلے سے متفق ہے۔

۷ / جولائی کو اسداللہ نے ایک عرض داشت بہ زبان انگریزی اس سند کی بنا پر دیے گئے مسٹر ہاکنس کے فیصلے کے خلاف پیش کی جس کے بارے میں درخواست گزار کا ادعا ہے کہ یہ جعلی ہے، جس کے ثبوت میں اس کی استدعا ہے کہ حکومت کے محافظ خانے میں دستاویزات تلاش کی جائیں۔

۲۸ / جولائی کو درخواست گزار نے پھر مسٹر ہاکنس کی کارروائی کے خلاف اس ادعا کے ساتھ شکایت کی کہ اس سے نواب شمس الدین کے حق میں جانب داری کا اظہار ہوتا ہے اور یہ استدعا کی کہ اسے حکومت کے احکام کی ایک نقل عنایت کی جائے۔ اس کے ساتھ اس نے میرے نام ایک مکتوب بھی ارسال کیا، جس کا ترجمہ منسلک ہے اور براہ راست میرے نام اس مکرر التماس کے پیشِ نظر میں نے تمام کاغذات کی جانچ پڑتال کی ہے اور حکومت کو مذکورہ۔ صدر بیان کے ملاحظے کی زحمت دی ہے، بالخصوص اس لیے کہ میرے خیال میں ایسا سمجھنے کی وجوہ ہیں کہ اسداللہ کی شکایت بالکل بے بنیاد نہیں ہے۔

حکومت کے کاغذات میں لارڈلیک کا کوئی شقہ مورخہ ، / جون ۱۸۰۶ء دست یاب نہیں ہے۔

ایسا نہیں دکھائی دیتا کہ اصل شقہ مسٹر ہاکنس کے ملاحظے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

مناسب ہوگا کہ ، / جون کا شقہ معائنے کے لیے پیش کیا جائے اور اگر اس کے اصلی ہونے کے بارے میں دلی میں کوئی شک ہو تو اسے صدر کو بھیجا جائے۔

اگر شمس الدین خاں اس مطالبے کو یہ کہہ کر ٹال جانے کی کوشش کریں کہ اصل شقہ تلف ہوگیا ہے تو یہ امر ان کے خلاف قویِ بنائے قیاس ہوگا۔

ہاکنس کے گذشتہ ۵ / مئی کے مراسلے میں پیش کردہ شمس الدین خاں کا جواب نہایت غیر سنجیدہ طرز میں لکھا گیا ہے اور اس میں اسداللہ کے ادعا کی یہ کہہ کر تردید کی گئی ہے کہ وہ تو ایک شاعر ہیں اور ایک شاعر کے لیے مخصوص خیال آرائی کے حق کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

لیکن مناسب ہوگا کہ ہم معاملے پر سنجیدگی سے غور کریں۔

مناسب ہوگا کہ ہم احمد بخش خاں کے نام سند مورخہ ۴ / مئی ۱۸۰۶ء کی جانچ پڑتال کریں، جو اصلی ہے اور جس کی گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے توثیق کی ہے۔ اس کی ایک نقل سرجان میلکم کے اسی تاریخ کے مراسلے کے ساتھ بہ طور ضمیمہ منسلک ہے۔ اس عطیے کے ذریعے فی الواقع نصراللہ بیگ کے اہلِ خاندان کے لیے سالانہ دس ہزار روپے کی رقم مقرر کی گئی ہے گو کہ بد قسمتی سے سند کے غیر واضح طرزِ بیان کی وجہ سے رقم کا صاف طور پر ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس سند کے ذریعے ایک خاص مقصد یعنی نصراللہ بیگ کے اہلِ خاندان کی پرورش اور کفالت کے عوض میں زرِ استثنا کو پچیس ہزار روپے سے گھٹا کر پندرہ ہزار مقرر کرنے کی منظوری دی گئی ہے۔ اس میں "مذکورہ صدر منہائیوں اور شرائط" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اوپر ان منہائیوں اور شرائط کا ذکر محض عمومی پیرایہ بیان میں کیا گیا ہے۔ لیکن جب لارڈلیک نے ۴ / مئی کو یہ پروانہ عطا کیا اور جب اسی مہینے کی ۱۶ / تاریخ کو اس عمل کی توثیق میں حکومت کی طرف سے جواب آگیا تو کیا یہ قرینِ قیاس ہے کہ لارڈ موصوف نے جو اس وقت کان پور میں فروکش تھے ، / جون کو احمد بخش کو ایک اور شقے کے ذریعے ماہ گزشتہ کی ۱۶ / تاریخ کے احکام کی رو سے جو کچھ طے ہوا اس کے بارے میں مطلع کیا ہو؟

تاہم اگر نواب احمد بخش خاں کی درخواست پر (جو اس وقت کان پور میں لارڈلیک کی خدمت میں حاضر تھے) لارڈ موصوف نے ، / جون کا شقہ لکھا بھی ہو تو کیا چند دنوں بعد (یعنی ۱۰ / جون کو) حکومت کے احکام مورخہ ۱۶ / مئی کی وصول یابی کی اطلاع دیتے ہوئے کرنل میلکم یہ رپورٹ نہ بھیجتے کہ نصراللہ کے اہلِ خاندان کی کفالت کے لیے پانچ ہزار روپے کی مختص رقم مقرر کرتے ہوئے احمد بخش خاں کے نام ایک شقہ جاری کیا گیا ہے اور کیا وہ اس کی توضیح نہ کرتے کہ کس بنا پر معاف شدہ زرِ استثنا کی بقیہ پانچ ہزار کی رقم نواب کی جاگیر سے واجب الادا رقم میں دوبارہ نہیں جوڑی گئی؟ لیکن ایسی کوئی رپورٹ دستیاب نہیں ہے۔ اگر دستاویز اصلی ہے تو بعید از قیاس نہیں کہ احمد بخش خاں نے اسے کسی طرح دھوکے یا فریب سے حاصل کیا۔ لیکن اگر اسے لارڈلیک کی طرف سے جان بوجھ کر صادر کیا ہوا حکم تسلیم بھی کرلیں تو سوال یہ ہے کہ آیا لارڈ موصوف گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے قبل ازیں منظور کیے ہوئے تصفیے میں تبدیلی کے مجاز تھے اور آیا حکومت پر اس کی پابندی لازم ہے؟ میرے خیال میں اس کا جواب نفی میں ہے اور شقہ چاہے اصلی ہو یا جعلی بادی النظر میں نصراللہ خاں کے اہلِ خاندان بہ طور وظیفہ زیادہ بڑی رقم کے مستحق ہیں۔

اسس نوٹ میں محولہ تمام کاغذات ملاحظے کے لیے منسلک ہیں۔

شرح دست خط
جارج سوئٹن
چیف سکریٹری، حکومت

۱۴/اگست ۱۸۳۰ء

بہ خدمت:

جناب سی۔ نارسس،
چیف سکریٹری حکومت بمبئی، محکمہ امورِ سیاسی۔

جنابِ والا۔

مجھے عزت مآب نائب صدر کونسل کی طرف سے منسلکہ دستاویزات آپ کے ہاں ارسال کرنے اور یہ استدعا کرنے کی ہدایت دی گئی ہے کہ اصل فارسی دستاویز کے معائنے کے بعد، جس کے بارے میں ایک فریق کا کہنا ہے کہ یہ لارڈلیک کا اصل شقہ ہے اور دوسرا فریق اسے حتمی طور پر جعلی قرار دیتا ہے، عزت مآب گورنر جنرل صاحب اسداللہ کے دعوے کی حقیقت حال اور اس شخص کے اس ادعا کے تعلق سے کہ یہ دستاویز یا تو جعلی ہے یا دھوکے فریب سے حاصل کی گئی ہے، براہ کرم اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

۲ عزت مآب گورنر صاحب ملاحظہ فرمائیں کہ مذکورہ صدر فارسی شقے کی پشت پر پرشین سکریٹری کے دفتر سے جاری کیے جانے والے مراسلوں کے ساتھ کیے جانے والے عمل درآمد کے برخلاف انگریزی میں کوئی نشانِ تصدیق نہیں ہے۔

۳ مجھے یہ استدعا کرنے کی ہدایت دی گئی ہے کہ اصل کاغذات میرے ہاں واپس بھجوا دیے جائیں اور یہ کہ لارڈلیک کے بینہ اصل شقے کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ اسے نواب شمس الدین کے ہاں واپس بھیجا جاسکے۔

شرح دست خط
جارج سوئٹن
چیف سکریٹری حکومت

فورٹ ولیم
۲۲/اکتوبر ۱۸۳۰ء

بہ خدمت:

جارج سوئٹن
چیف سکریٹری حکومتِ عالیہ، مورخہ فورٹ ولیم، محکمہ امورِ سیاسی۔

جنابِ والا!

مجھے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ میں جناب کے اس مراسلے مورخہ ۲۲/اکتوبر بہ شمول متعدد منسلکات بابتہ دعویِ سداللہ خاں کی وصول یابی سے آپ کو مطلع کروں جس میں اس کے بارے میں عزت مآب گورنر صاحب سے ان کی رائے طلب کی گئی ہے۔ جواب میں مجھے ہدایت دی گئی ہے کہ عزت مآب نائب صدر کونسل کے ملاحظے میں پیش کرنے کی غرض سے عزت مآب گورنر

صاحب کی تجویز مورخہ ۳۰ / نومبر کی منسلکہ نقل ارسال کروں جس میں انھوں نے امرِ بحث طلب کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

بمبئی محل

شرح دست خط
سی۔ نارسس
چیف سکریٹری حکومت

عزت مآب گورنر صاحب کی تجویز مورخہ ۳۰ / نومبر ۱۸۳۰ء

میرے خیال میں سند پر لارڈلیک کے دست خط ثبت ہیں۔ یہ سند اس وقت حاصل کی گئی تھی جب بہتیرے ایسے امور جو فوجی کارروائی کی وجہ سے معرضِ التوا میں تھے فیصل کیے گئے۔ شریف النفس امیر احمد بخش خاں پر بہ جا طور پر لارڈلیک اور ان کی جان پہچان کے سبھی لوگوں کو اتنا بھروسہ تھا اور نیز مقامی باشندے ان کی اتنی عزت کرتے تھے اور مزید برآں وہ اتنے فراخ دل تھے کہ ان کی سیرت ہی کو مبینہ طور پر اصول اخلاق کے خلاف ان کے کسی فعل کی تردید میں بہ طور دلیل پیش کیا جاسکتا ہے۔ اگر ان سے ایسے افعال سرزد ہوتے ہوتے تو میرے خیال میں بعض متعلقہ فریقوں کی طرف سے شکایتیں ضرور پیش ہوتیں۔

شرح دست خط
جارج میلکم

○●○

کتابیات

BIBLOGRAPHY(ENGLISH) کتابیات (انگریزی)

1. Ralph Russel & Khurshidul Islam : "Ghalib, Life & Letters. (London 1969).
2. Akhtar Qamber : "The Last Mushairah of Delhi (a translation of Farhatullah Baig's Delhi ki Ahkri Shama). (New Delhi 1979).
3. Captain Mundy : The Journal of a Tour in India. Vol.1 (London 1832).
4. William Knighton : Tropical Sketches or Reminiscences of an Indian Journalist. Vol.1(London.1855).
5. W.H. Sleeman : Rambles and Recollections of an Indian Official. Vol. 2 (London. 1844)
6. National Archives of India (N.A.I.). Foreign Department Miscellaneous. No.208,
7. Ibid.. Foreign Political Consultations 23 April 1833, Nos.80 - 81.
8. S.A.I. Tirmizi : Persian Letters of Ghalib (New Delhi, 1969).
9. P. Spear : Twilight of the Mughals. (London 1951).
10. Yousuf Hussain : Persian Ghazals of Ghalib. (Ghalib Institute, 1980).

11. Q. Hyder, S. Jafri : Ghalib And His Poetry. (Bombay, 1970).

12. Emily Bayley : Memoirs. quotd in M.M. Kaye. The Golden Calm. (New York, 1980).

13. M. Dayal : Rediscovering Delhi. (New Delhi, 1982).

14. Bipan Chandra : Communalism in Modern India. (Delhi, 1984).

15. C.F. Andrews : Zakhullah of Delhi. (London 1929).

16. Philip Woodruffe : Men Who Ruled India. Vol. 1 (London, 1953).

17. Pat Barr : Memsahibs. (London. 1976, New Delhi reprint).

18. M. Sadiq : A History of Urdu Literature (Oxford, 2nd edition).

19. M. Mujeeb : Ghalib (Sahitya Academy, 1970).

20. H. Trevelyan : The India We Left (London, 1974).

21. N. Gupta : Delhi Between Two Empires (Oxford, 1981).

22. Veena Talwar Oldenberg : The Making of Colonial Lucknow. (Princeton, 1984).

23. Meenakshi Mukerjee : Reality And Realism. Indian Women As Prostagonists in Four Novels. Econimic And Political Weekly, January, 14th 1984. Vol. XIX. No.2,

24. Annemarie Schimmel : A Dance of Sparks (Vikas, 1979).

25. Mahdi Hussain : Bahadur Shah II and the War of 1857 in Delhi. (Delhi, 1958).

26. Syed Mobarak Shah's narrative (trans. R.M. Edwards).

27 Curzon. Speeches. (Calcutta, 1900). Vol.I,

28. E. Hare : Memo of the Siege of Delhi. Kaye manuscripts. Commonwealth Office Library. Home Miscellaneous. No.726.

29. C.J. Griffith : Narrative of the Siege of Delhi. ed. H.J. Yonge. (London, 1914).

30. Charles Raikes : Notes on the revolt in the N. Western provinces of India. (London. 1858).

31. N. Gupta : Military Security and Urban Development.

32. By An Old Indian : Calcutta to the Snowy Range. (London, 1866).

33. A. A Beg : Life and Odes of Ghalib. (Lahore, 1940).

(باقی ص : ۱۵ پر)

یوسف میخائلووچ ارانسکی
ترجمہ: اسامہ فاروقی



حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان

(وسط ایشیا) ماسکو ۱۹۷۷ء

حصاری پریا لوگوں کی زبان، ہند آریائی زبانوں کے
وسطی زمرے کی ایک بولی

(قسط: ۱۰)

• یوسف میخائلووچ ارانسکی (۱۹۲۳ء تا ۱۹۷۷ء)

[ممتاز ایران شناس جن کی علمی کاوش "حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان" کا اردو ترجمہ ماہ نامہ "سب رس" میں اگست ۱۹۹۸ء سے بالاقساط شائع کیا جارہا ہے۔ تصویر کے لیے ہم مصنف کتاب کی صاحب زادی تاتیانا ارانسکیا کے شکر گزار ہیں جو آج کل ہیم برگ یونیورسٹی، جرمنی میں اردو اور ہندی زبان و ادب کی تدریس کا کام انجام دے رہی ہیں۔]

IV (Amyp.)
amsona (kapi)

(1) čo ni-čo, yek ganjo čo. (2) o ganjo bak°ri raka čo. (3) us bak°ri-ta ruți duva čo, us bak°ri táza hila bagayo čo.

(4) yek din k-oyo, o bakari janiyó. (5) is ganje-yo-ko ruți-si unya rake čo. (6) is bakri-na ruți-ta ka liayo.

(7) ya čopan ayó, dekyo, ke ruți ni. (8) is bak°ri-tá xub maryó. (9) ya bak°ri darki mari pake jar-mo varyó.

(10) ya ganjo ba kurun-ta leke čarayo kar-a-ma, dekyo, ke bak°ri gaban či.

(11) is Čol-i malik-ma bak°ri jan giyo. (12) is bak°ri tundyo, na-ladyo.

(13) yek vaxt oyó, ya bak°ri dašt-a čarai, yake ovai šax-pare-ma pani lovai, dan-pare-ma kas lovai.

(14) in yeke ovai bača-pare-ke na-ta rakai: yek-e na Bangak, yek-e na Sangak, yek-e na Kulolasangak. (15) dašt-(t)e ke ayó: Angak-ę ma, Bangak-ę ma, Kulolasangak-ę ma, dar varda-ta (darváza-ta?) vaz kun, yek šax am pani lyao, dan-pare-ma kas lyao, darváza-ta koli (16) ya bača darváza-ta koliyo.

(17) ya pegar xabar-o go, yek dan pegar dekiyo, ke bak°ri isi gal-ta karyo. (18) ya pegar be-ta marái, . . l ni-sakta. (19) pegar kovai ke: Angak-ę man, Bangak-ę man, Kulolasangak-ę man, yek šax-pare-ma pani lyao, yek dan-pare-ma kas lyao, be-ta koli

(20) ya Angak-so kóvai ke: miri ayi ne. (21) Sangak-e-só kóvai ke: miri ayi če. (22) o Bangak-e-so kóvai: miri ayi ni. (23) o borro-so kóvai: be-ta koli

(24) ya Bangak-a-sō šarab tandur-ke muri-ma varjovai. (25) Angak Sangak pegar-na kayo, do-se-ta kayo. (26) yek-u-sō muri-mo vargiyo, do-se-ta pegar-na ka liniyo. (27) pegar čalo go.

(28) ayi-si ayó, har čand ke zare-pare-ta tai kovai, ye be-ta ni-kolta, darke mari be-ta ni-kolta. (29) bakᵊri dur jovai, šax-nala marái, be-ta penčataj.

(30) bakᵊri kar-mâ varaj, tumkalai ke: «o Angak!» (31) ni-čo.

(32) ō-si muri-mata hara jakariyó. (33) bakᵊri pišnâ karyo: Angak-nala Bangak kigi čalo go? (34)—yek pegar-na ka linyo,— iz-ne kẹyo kẹ,— usi pegar-na kayi.

(35) iz-na ka karyo? tin dan dut-pəre-ta rakeyo, xumera katak karyo, legyo ustâ-kula, kẹyo ke: «e, ustâ, mare šax-ta pōlâd kar».

(36) pegar-na gẹyo usta-kula, kẹyo ke: «usta, mare dan-ta pōlâd kar». (37) iz-na ka karyo? hagiyo, bosaro usta-ɣama iyao, kẹyo ke: «is-ta le, mare dan pōlâd kar».

(38) kẹyo ke: «xub»,— keyo kẹ. (39) avval var takᵊriki šax-ta pōlâd karyo, kẹyo ke: «tu ja». (40) ebe pegar-ta balayó, anbur-ta lineo, pegar-ta dan-ta kadyo, torаro kumur lataz karyo. (41) ō dan rakaj kumur, kẹyo ke: «ol». pegar-ta dan rakeyo ku-mur-mata.

(42) ebé muqobil-o oyó. (43) pegar-ne kẹyo ke: «mar, takᵊri!» (44) bakᵊri-ne kẹyo kẹ: «var-tiri». (45) pegar-ne yek mo kolyo, dand-i-se tepar giyo. (46) var takᵊri pər ayo. (47) takᵊri-ne yek maryo, pert-u-sō čir baga, tačo pegar-mata le lineo, fer murke siyan-pəre-ke kar-a čala go.

(48) kas-pər-ta lineo, pegar-mata kas-pəre-ta takri-na lineo. (49) tamâm.

(اسونا ـ کانٹری - ۴)

چونی چو ، یک گنجو چو ـ او گنجو بکیری رکاچو ـ اس بکیری تارُٹی دُوا چو ، اس بکیری تازا بلا بگایو چو ـ

یک دن کویو ، او بکیری جنیو ـ اس گنجے یوکو رُٹی سی اُنیارَ کے چو ـ اسس بکری نارُٹی تا کالنیو ـ یا چوپن ایو ، دیکیو ، کہ رُٹی نی ـ اس بکیری تا خوب مریو ـ با بکیری ڈرکی مری پاکے جرمو دریو ـ

(افسانہ ـ کہانی - ۴)

تھا ، نہیں تھا ، ایک گنجا تھا ـ اس گنجے کے پاس (ایک) بکری تھی / وہ گنجا ایک بکری رکھتا تھا / اس بکری کو کھلاتا پلاتا تھا (لفظی ترجمہ : روٹی دیتا تھا) ، اُس بکری کو صفائی کی عادت ڈلوادی تھی ـ

ایک دن آیا (اور) اس بکری نے بچّے دیے / جنے / ـ اس گنجے کی روٹی وہاں رکھی تھی ـ اس بکری نے روٹی کھالی ـ یہ چرواہا (شبان) آیا ، دیکھا کہ روٹی نہیں ہے ـ اس بکری کو خوب مارا ـ یہ بکری ڈر کے مارے بھاگ کر (ایک) گڑھے میں گھس گئی (چھپ گئی) ـ

●

یا گنجو باگُون تالے کے چرانیو کراما ، دیکیو کہ بکیری گبن چی ـ

یہ گنجا بعد میں (۹) گھوڑوں کو لے کر گھر چلا آیا ، دیکھا کہ بکری گابھن ہے ـ

اسس چلِ ملک مابکیری جن گیو۔ اسس بکیری ڈھنڈیو۔ نہ لدیو۔
یک وخت ادیو۔ یا بکیری دشتاچرئی۔ یکے اودئی شاخ پیرے ما پٹری لودئی۔ دَن پیرے ماکس لودئی۔

اسس (مقام) چول ملک (دشتِ ملک) میں بکری نے بچے دیے۔ (اسس نے) اس بکری کو ڈھونڈا (لیکن) پایا نہیں۔
ایک وقت آیا۔ یہ بکری دشت میں چرتی۔ جب آتی، اپنے سینگھوں پر پانی لاتی۔ اپنے دانتوں میں گھانس لاتی۔

●

ان یکے اودئی بچہ پیرے کے ناتا رکئی: یکے نا بَن گاک۔ یکے نا سَن گاک۔ یکے نا کُلواسَن گاک۔ دشت تے کہ الیو: ان گاکِ ما۔ بن گاک ما۔ کُلُولا سن گاکِ ما در و رواتا (دروازہ تا؟) واز کُن۔ یک شاخَم پٹری لیو۔ دن پیرے ماکس لیو۔ دروازہ تا کول! بے بچا دروازہ تا کولیو۔

(وقت) آتا ہے (اور بکری) اپنے بچوں کا نام رکھتی ہے: ایک کا نام بن گاک، ایک کا نام سن گاک، ایک کا نام کُلواسن گاک۔ (یہاں اور آگے کہانی سنانے والا بکری کے بچّوں کے نام بعض جگہ غلط بھی لیتا ہے۔ مصنفِ کتاب)۔
جب دشت سے آتی (تو پکارتی): "ان گاک میرے، بن گاک میرے، کُلواسَن گاک میرے، دروازہ کھول (باز کن!) (میں) اپنی سینگھوں پر پانی لائی، اپنے دانتوں میں گھاس لائی، دروازہ کھول!" یہ بچے دروازہ کھولتے۔

●

یا پیگڑ خبردگو۔ یک دَن پیگڑ دیکیو۔ کہ بکیری اسی گل تا کریو۔ یا پیگڑ بے تا مرائی۔ کول نی سکتا۔ پیگر کو دئی کہ: ان گاکِ من۔ بن گاکِ من۔ کُلولاسن گاکِ من۔ یک شاخ پیرے ما پٹری لَیو۔ یک دن پیرے ماکس لیو۔ بے تاکول!

اس کی بھیڑیے کو خبر ہو گئی۔ ایک دن بھیڑیے نے دیکھا کہ بکری نے کیسے یہ الفاظ کہے۔
یہ بھیڑیا دروازہ پیٹتا ہے۔ کھول نہیں پاتا۔ (تب) بھیڑیا کہتا ہے: "ان گاک میرے، بن گاک میرے، کُلواسَن گاک میرے، (میں) اپنی سینگھوں پر پانی لائی، اپنے دانتوں میں گھاس لائی، دروازہ کھول!"۔

●

یا ان گاک سو کودئی: میری اَیی نے۔ سن گاکے سو کوئی کہ: میری اَیی ہے۔ ادبن گاکے سو کودئی: میری اَیی نی۔ او بوڈو سو کودئی: بے تاکول!
یا بِن گاکا سو شرب تندور کو موری ما درجودئی۔ ان گاک سَن گاکِ پیگڑنا کایو۔ دوسے تا کایو۔ یکو سو موری سو در گیو۔ دوسے تا پیگڑنا کالیو۔ پیگڑ چلوگو۔

یہ ان گاک کہتا ہے: "(یہ) میری ماں نہیں ہے۔" سن گاک کہتا ہے کہ: "(یہ) میری ماں ہے۔" وہ بن گاک کہتا ہے: "(یہ) میری ماں نہیں ہے۔" ان میں کا بڑا کہتا ہے: "دروازہ کھول!"
یہ بَن گاک جلدی سے تنّور کے دودکش میں گھس جاتا ہے۔ ان گاک اور سن گاک کو بھیڑیے نے کھالیا۔ دونوں

آئی سی اوی، ہر چند کہ زرے پیرے تاتیل کو وئی۔ یے بے تانی کولتا، ور کے مری بے تانی کو لتا۔ بکیری دور جوئی، شاخ نلامرائی، بے تا پنچی۔

•

بکیرم کرا ورئی، توم کلی کہ: "اوآن گاک!" نی چو۔ او سی مودی متا بارا لگریو۔ بکیری پشنا کریو: آن گاک نلا بن گاک گی چلو گو؟ "یک بیگڑنا کالنیو" ازنے کے یو کہ "اسی بیگڑنا کاپی۔"

•

ازنا کاکریو؟ تن دَن دوت پیرے تار کے یو، خمیرا کتک کریو، لے گیو اُستا کلا، کے یو کہ: "یے، اُستا، میرے شاخ تا پولاد کر۔"

•

بیگڑنا گے یو اُستا کلا، کے یو کہ: "اُستا میرے دَن تا پولاد کر" ازنا کا کریو؟ ہگیو، بوسرو اُستا غما لایو، کے یو کہ: "اس تالے، مرے دَن پولاد کر۔"

•

گے یو کہ: "خوب" کے یو کہ۔ اَوّل وَر بکیری کی شاخ تا پولاد کریو، کے یو کہ: "تو جا۔"

یے بے بیگڑنا بلایو، انبور تالنے یو، بیگڑنا دن تا کدیو۔ بوسرو کومود ترز کریو۔ او دَن رَنگے کومور، گے یو کہ: "او!"

کو کھالیا۔ ایک دودکش میں گھس گیا، دو کو بھیڑیے نے کھالیا۔ بھیڑیا چلا گیا۔

•

ان کی ماں آئی، کتنا بھی اپنے بچوں (؟) کو آواز دیتی ہے، یہ دروازہ نہیں کھولتے، ڈر کے مارنے دروازہ نہیں کھولتے۔ بکری دور جاتی ہے (یعنی پیچھے ہٹتی ہے، پھر دوڑتی ہوئی آکر)، سینگھوں سے مارتی ہے، دروازے کو توڑ دیتی ہے۔

•

بکری گھر میں داخل ہوتی ہے، پکارتی ہے کہ: "او آن گاک!" (مگر آن گاک) نہیں ہے۔

وہ (یعنی بن گاک) دودکش میں سے باہر نکلا۔

بکری نے پوچھا: "آن گاک اور بن گاک کہاں گئے؟" اس نے کہا کہ: "ایک بھیڑیے نے کھالیا، انھیں اس بھیڑیے نے کھالیا۔"

•

اس نے (یعنی بکری نے) کیا کیا؟ تین دن اپنا دودھ جمع کیا، ہانڈی بھر قیق (خاص طریقے سے خمیر دیا ہوا دودھ) تیار کیا / دہی جمایا /، لوہار (اُستاد!) کے پاس لے گئی اور کہا کہ: "اے اُستاد، میرے سینگھ فولاد کے بنادے!"

•

بھیڑیا (بھی) گیا لوہار کے پاس (اور) کہا کہ: استاد، میرے دانت فولاد کے بنادے!" اس نے (یعنی بھیڑیے نے) کیا کیا؟ ہگا، بہت سارا (گوہ) لوہار کے پاس لایا، کہا کہ: "اسے لے، میرے دانت فولاد کے بنادے!"

•

(لوہار نے) کہا کہ: "خوب"۔ کہا کہ۔ پہلے بکری کے سینگھ فولاد کے بنائے، (اور بکری سے) کہا کہ: "تو جا!" پھر بھیڑیے کو بلایا، سنسی لی، بھیڑیے کے دانت گھیڑے، بہت سارا کوئلہ تراشا۔ وہ کوئلے کے دانت لگاتا ہے، کہا کہ:

پیگڑتا دن رکے یو کو مورمتا ۔

●

یےبے مقوبل ادیو۔ پیگڑنے کے یو کہ: "مار ۔ بنیرمی ۔ بکیری نے کے یو کہ : "وَرتری "پیگڑ نے یک مو کولیو موندی سے ٹیپر گیو۔ ور بکیری پیر ایو۔ بکیری نے یک ماریو پیر ٹوسو چِربگا، بچو پیگڑمتالے لنے یو، فیر مُڑکے سِیَن پیرے کے کرا چلاگو۔

کس پیر تالِنے یو، پیگڑمتا کس پیرے تا بکری نالِنے یو۔ تمام۔

○●○

"واہ !" بھیڑیے کو کوئلے کے دانت لگا دیے ۔

●

اب (بھیڑیا اور بکری ایک دوسرے کے) مقابل ہوئے ۔ بھیڑیے نے کہا کہ : "مار ، بکری !"۔ بکری نے کہا کہ "باری تیری ہے"۔ بھیڑیے نے جیسے ہی منہ کھولا ، اُس کے دانت گر پڑے ۔ (اب) بکری کی باری آئی ۔ بکری نے جیسے ہی (سینگھ) مارا ، اُس کا (یعنی بھیڑیے کا) پیٹ چیر ڈالا ، بھیڑیے کے پیٹ سے اپنے) بچے لیے ، پھر مڑکر اپنے مالک کے گھر چلی گئی ۔

بدلہ لیو ۔ بکری نے بھیڑیے سے بدلہ لیا ۔ تمام (شُد) ۔

○●

حلِ لغات

(نوٹ : قارئین سے گزارش ہے کہ اس سے قبل کی کہانیوں کے ذیل میں دیے گئے حلِ لغات کو بھی پیشِ نظر رکھیں ۔ مترجم ۔)

اسونا : کہانی ۔ ہندستانی ، تاجک : افسانہ ۔ کانٹری / کنڑی : کہانی ۔ ہندستانی : کہانی ، پنجابی ، گجراتی : کہانڑی ۔ سندھی ، لہندا : کہانڑی ۔ گنجو : گنجا ۔ ہندستانی : گنجا ۔ رکنڑو / رکھنڑو : رکھنا ، جمع کرنا ۔ ہندستانی : رکھنا ۔ پنجابی : رکھنڑا ۔ لہندا : رکھنڑ ۔ رٹی : روٹی ، کھانا ، خوراک ۔ ہندستانی ، لہندا ، گجراتی : روٹی ۔ تازا / تازو / تَزو : صاف ، ستھرا ۔ ہیلنو : سکھانا ، سکھنا ۔ ہندستانی : ، : ہلنا ۔ لہندا : ہلنٹر ۔ بلابگانو : سِکھانا ، عادت ڈلوانا ۔ جَنو / جَنٹرو : جننا ، بچہ پیدا کرنا ، بچے دینا ، بیانا ، ہندستانی : جننا ۔ پنجابی ، لہندا : جنٹرا ۔ رکنو / رکھنو : رکھنا ۔ ہندستانی : رکھنا ۔ پنجابی ، رکھنڑا ۔ لہندا : رکھنٹر ۔ کانٹرو / کھانٹرو : کھانا ۔ ہندستانی : کھانا ۔ پنجابی : کھانٹرا ۔ لہندا : کھاؤنٹر ۔ چوپَن : چرواہا ۔ تاجک : چوپان ۔ در : ڈر ۔ ذرکی مَری / در کے مَرے : ڈر کے مارے ۔ پگنڑو / پکنڑو / بھاگنٹرو : بھاگنا ۔ ہندستانی : بھاگنا ۔ پنجابی : بگھنٹر ۔ تَبر : گڑھا ۔ تاجک : تبر ۔ تبڑانو : چڑھانا ۔ گبَن / گبان : گابھن ۔ ہندستانی : گابھن ، گابھن ۔ پنجابی ، لہندا ، گبھنٹر ۔ سنسکرت : گربھنٹری ۔ چول : دشت ۔ تاجک : چول ۔ ٹنڈلو : ڈھونڈھنا ۔ پنجابی : ڈھونڈھنٹرا ۔ لہندا : ڈھنڈھنٹر ۔ لدنٹرو / لنٹرو : پانا ۔ ہندستانی : لادھنا ۔ پنجابی : لدھنٹرا ۔ دَشت / دَس : دَشت ۔ ہندستانی ، تاجک : دشت ۔ چَرنو : چرنا ۔ ہندستانی ، پنجابی : چرنا ۔ لہندا : چرنٹر ۔ شاخ / شَخ : سینگھ ۔ تاجک ، ہندستانی : شاخ ۔ پنٹری / پانٹری / پونی : پانی ۔ ہندستانی : پانی ۔ سندھی ، پنجابی ، لہندا : پانٹری ۔ سنسکرت : پانیہ ۔ دَن / دان : دانت ۔ کس / کاس : گھاس ۔ ما / مَن : میرا ، میرے ۔ تاجک : من (اضافت کے بعد ، مثلاً بن گاک من : میرے بن گاک) ۔ جدوازہ / درد زد : دروازہ ۔ ہندستانی ، تاجک : دروازہ ۔ داز کن : کھولو (تاجک سے مستعار : باز کن) ۔ کولنو / کھولنو : کھولنا ۔ ہندستانی : کھولنا ۔ پنجابی : کھولنٹرا ۔ لہندا : کھولنٹر ۔ بچا / بچو : بچۂ ، بچے ۔ ہندستانی : بچۂ ۔ تاجک : بچہ ۔ پیگڑ : بھیڑیا ۔ ملتانی : بگھیار ۔ اودھی : ہگوا : خبر : خبر ۔ تاجک ، ہندستانی : خبر : خبر ہونو : خبر ہونا ۔ گل : لفظ ، الفاظ ، بات ۔ پنجابی ، لہندا : گل ۔ بے / ہیو : دروازہ آئی : ماں ۔ گجراتی آئی وغیرہ ۔ ازبکی :

(باقی ص : ۷۳ پر)

مصطفیٰ شہاب

خواب گر

□

میں اس کو دیکھتا آیا تھا برسوں سے
گلی کے موڑ پر
چھجے کے نیچے
اک پھٹے قالین پر
ٹوٹا کٹورا سامنے رکھے
خموشی کی گھنی چادر کو اوڑھے
سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا
کبھی اس کو کسی نے ہاتھ پھیلاتے نہیں دیکھا
ہمیشہ اس کی آنکھیں بند رہتی تھیں
عجب سا ٹیڑھا میڑھا جسم تھا
اس کے بدن پر کالے کالے نیلے نیلے
ان گنت دھبے تھے
یوں لگتا تھا جیسے
اس کو اک جلتے ہوئے سگریٹ سے داغا گیا ہو
اندھیری رات ہو دن ہو
کڑی سردی کا موسم ہو
جھڑی ساون کی ہو
یا چار جانب لو برستی ہو
اسی پہلو پہ بیٹھا
وہ وہیں ملتا۔۔۔۔
سڑک پر مانگنے والے کئی تھے
پر نہ جانے کیوں مجھے
اس پر ہمیشہ رحم آتا تھا

○

وہ اک بارش میں ڈوبی دوپہر تھی
اور مجھے کالج پہنچنا تھا
میں اس کے پاس سے گزرا
تو بارش کا اچانک زور دونا ہو گیا
مجھ کو وہیں رکنا پڑا اور
میں نے پہلی بار اس کو جاگتا پایا
وہ مجھ کو دیکھ کر یوں مسکرائے جارہا تھا
جیسے مجھ سے خوب واقف ہو
اسی دم بات جو برسوں سے سینے میں کھٹکتی تھی
زباں پر آگئی اور میں نے پوچھا
"تم کو بابا کیا کوئی موسم نہیں کھلتا
کہ اتنے جسم کے آزار لے کر
ایک ہی حالت میں برسوں سے پڑے ہو
کس طرح اس زندگی کو جھیل لیتے ہو؟"

○

وہ میری بات سن کر یوں ہنسا
جیسے کسی نے گدگدی کی ہو
یکایک بدنما چہرے کے سارے داغ روشن ہو گئے

آنکھیں چمک اٹھیں
مری جانب بڑی وقت سے جھک کر
جیسے کوئی راز کہتا ہے
بہت دھیرے سے بولا
"میں تمھیں اک گُر بتاتا ہوں
کوئی تکلیف ہو جائے، پریشانی میں گھر جاؤ
تو آنکھیں بند کر لو
اور تصور کی مدد سے اس جگہ پہنچو
جہاں بس راحتیں ہی راحتیں ہوں
اور دل کو چین آ جائے
تصور، خواب ہے ایسا
جو انساں چلتے پھرتے، جاگتے میں دیکھ سکتا ہے"

o

بہت رک رک کے پھر کہنے لگا
"جھگی کے نیچے یہ محل میرا ہے
اس کے در
کسی بھی سخت موسم پر نہیں کھُلتے
سحر سے شام تک دولت برستی ہے
کئی جن میری خدمت کرتے رہتے ہیں
میں دن بھر کاروبارِ زندگی میں غرق رہتا ہوں
یوں ہی دن بیت جاتا ہے
مگر جب رات آتی ہے
تو اپنے ساتھ گاتی ناچتی پریوں کو لاتی ہے
میں اٹھ کر غسل کرتا
اور خوش بو میں بسا کم خواب و ریشم کا لبادہ اوڑھ لیتا ہوں
تب اک سونے کے برتن سے
مجھے نیلم پری خود اپنے نازک ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہے
کوئی جن دف بجاتا ہے
تو پریاں میری دل جوئی کی خاطر رقص کرتی ہیں
مجھے سونے نہیں دیتیں۔۔۔۔
مگر۔۔۔ مجھ کو۔۔۔۔"

o

یکایک بوندا باندی تھم گئی
سورج نکل آیا
میں اس کے پاس سے آگے بڑھا تو
اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ ہلتے تھے۔۔۔۔

ooo

مصطفیٰ شہاب

آدمی کب مرجاتا ہے

□

آدمی جب مرجاتا ہے
خوں کی ندی سوجاتی ہے
دل کی دھڑکن رک جاتی ہے
اس کی بیوہ، اس کے بچے
اس کے سارے چاہنے والے
روتے ہیں، ماتم کرتے ہیں
(وہ ان کے اشکوں میں زندہ رہتا ہے)

○

آدمی جب مرجاتا ہے
لوگ اسے نہلاتے ہیں
کورا کپڑا پہناتے ہیں
سبھی قرابت دار، محلے والے
برسوں کے دکھ سکھ کے ساتھی
نوکر چاکر، ٹھیلے والے
نئے پرانے کچھ افسانے
کچھ جھوٹے، کچھ سچے قصے
گھنٹوں بیٹھے دہراتے ہیں
(وہ اپنے قصوں میں زندہ رہتا ہے)

○

آدمی جب مرجاتا ہے
مسجد سے پھر قبرستان کو
کاندھے سے کاندھے کو جوڑے
لوگ اسے لے جاتے ہیں
مٹی کی سوندھی خوش بو میں
پھر اس کو دفناتے ہیں
قبر اٹھائی جاتی ہے
اور پھول بچھائے جاتے ہیں
(لیکن وہ پھولوں میں زندہ رہتا ہے)

○

آدمی جب مرجاتا ہے
اور کئی دن ہو جاتے ہیں
رفتہ رفتہ اس کے قصے
ساری لذت کھو دیتے ہیں
اس کے سارے رونے والے
اپنا رونا رولیتے ہیں
یادیں مدھم پڑ جاتی ہیں
(وہ مٹی یادوں میں زندہ رہتا ہے)

○

اور جب آخر کار
اک اس کا آخری ساتھی
آخری مہماں
بڑھتی گھاس پہ
آخری پھول کا تحفہ رکھ کر
لوٹ کے واپس گھر آتا ہے
آدمی تب مرجاتا ہے۔۔۔

○●○

حسن داد خاں

□

میری سوچ

یہ ننھے، معصوم سے بچے
بھولے، بھالے، شوخ، نٹیلے
دیکھ کے ان کو سوچ رہا ہوں
ان کی دنیا کیسی ہوگی
ان کا مستقبل کیا ہوگا
اس دنیا میں کس کا کتنا حصہ ہوگا
اس دنیا سے ٹکرانے کی کس میں کتنی ہمت ہوگی
کس کی راہ میں کانٹے ہوں گے
کس کے گھر میں پھول کھلیں گے
کس کو کتنی دانش، کتنا علم ملے گا
ان میں کتنے حق پر ہوں گے
کتنوں کو حالات کی پیچیدہ راہیں گم راہ کریں گی
ان دیکھی تقدیر کا یہ گمبھیر اندھیرا
مجھ کو بے کل کر دیتا ہے
اور میں اپنی ان سوچوں کے دروازوں پر قفل لگا کر
خوش فہمی کے قفل لگا کر
سوجاتا ہوں۔

○●○

مغل فاروق پرواز

□

وژن

بیس برس دہلیز پہ میں نے
سانس ہوا سے ہاتھ ملا کر
بدن سفر کے موڑ پہ یارو
خواب نجومی آنکھ سے دیکھا
دنیا کچھ کچھ بدل رہی تھی

○●○

مظہر مہدی

حصارِ ذات سے مبرا

ذائقہ زبان کا صرف ان اشیا تک محدود ہے
جن کا ذائقہ پہلے سے موجود ہے
پانی کا ذائقہ کیا وہ بتا سکتی ہے ؟
لمس کا احساس صرف ان چیزوں تک محدود ہے
جن کا لمس
سخت ، نرم ، دھار سے تیز ہو
جو نہ سخت ہو ، نہ نرم
کیا اسے لمس کا اندازہ ہے ؟
قوتِ شامہ بھی بڑی ناتواں
اسے صرف بو اور خوش بو کی پہچان ہے
جو نہ بو ہے اور نہ خوش بو
کیا اسے اس کا علم ہے ؟
آنکھ جو سمندر ، کوہسار ، صحرا کو تو دیکھ سکتی ہے
صرف انھیں کو دیکھ سکتی ہے جن میں رنگ ہو
کیوں کہ وہ بے رنگی نہیں دیکھ سکتی ؟
گوششِ ناتواں بھی صرف
آوازوں کا مرہونِ منت ہے
کیوں سکوت سے بہرہ مند نہیں
وہ جو بے ذائقہ ہے
نہ نرم ہے نہ سخت ہے
جس کی کوئی بو نہیں
جس کا کوئی رنگ نہیں
جس کی کوئی آواز نہیں
حصارِ ذات سے مبرا ہے !

○●○

تسکین جو دو بول میں بند ہے

تم بڑی خوش حال ہو گئی ہو
یوں تمھیں کچھ کمی بھی نہیں
گھر آسائشوں سے بھرا پڑا ہے
اب کسی مشین کو بند کرنے
جانا بھی نہیں پڑتا ہے
بچے بھی کالج میں پڑھتے ہیں
کتنی آرام سے گزر ہوتی ہے
صرف چہل قدمی کے لیے پیدل چلتی ہو
اس کے باوجود مجھے معلوم ہے
ایک بوجھ تم اٹھائے پھر رہی ہو
وہ تسکین جو دو بول میں بند ہے
وہ اظہار جو ساقط ہو گیا
وہ اضطراب
جس کا حل کسی ریموٹ میں نہیں
ایسے میں مجھے فون کرو
میں تمھیں کچھ دے نہیں سکتا
تم خود کتنی ہو گئی ہو
پر اب بھی میری باتیں
میری نظمیں
ایک لمحے کا سکون بھی دے دیں
تو میں یہ سمجھوں گا
کہ ابھی میرا وجود
معنی نہیں کھو رہا ہے

○●○

مظفر حنفی

☆

تختِ طاؤس پہ آ بیٹھا میں
سرمہ ۔ مفت نظر جیسا میں

زیرِ شمشیر مری گردن تھی
اور شمشیر بکف میں تھا میں

بادباں عرش ، زمیں لنگر ہے
ناخدا ایسے سفینے کا میں

آسمانوں پہ سبھی رقصندہ
زیرِ افلاک دکھی ، تنہا میں

جب سے نیزوں پہ کٹے سر دیکھے
نیزہ بردار ہوں سر والا میں

ریت ہی ریت وہاں پھیلی تھی
روکتا کون مجھے ؟ دریا میں

کون ہے ، کیا ہے مظفر حنفی
ساٹھ برسوں میں نہیں سمجھا میں

○●○

☆

خفا کیوں ہو اگر تلوار تک ہم سے نہیں اٹھتی
عزیزو ، سر پہ اب دستار تک ہم سے نہیں اٹھتی

کسی کو نذر کر دینی تھی اب تک اشرفی جاں کی
مگر یہ اشرفی دربار تک ہم سے نہیں اٹھتی

ہماری جان پھر بخشی گئی ، اے وائے محرومی
کہ گردن نیزہ ، دل دار تک ہم سے نہیں اٹھتی

ادھر اعلان ہوتا ہے کہ موسم فائدے کا ہے
یہاں لنگر تو کیا پتوار تک ہم سے نہیں اٹھتی

کوئی ہے جو بچھادے دھوپ لے جاکر کنارے پر
اٹھا تو لائے ہیں اس پار تک ہم سے نہیں اٹھتی

کبھی دامن جھٹک دیتا ہے ہم کو دیکھتے ہی تو
کبھی جھولی ترے دینار تک ہم سے نہیں اٹھتی

مظفر نے کہا تھا جان لب پر تشنہ لب کی ہے
کہا ، بوتل لبِ بیمار تک ہم سے نہیں اٹھتی

○●○

حسن داد خاں

□

ٹوٹ رہی ہیں شمس و قمر کی دیواریں
اونچی کرلو اپنے گھر کی دیواریں
روز اٹھائی جاتی ہیں گر جاتی ہیں
حرص و ہوس کی ، دولت و زر کی دیواریں
بارش سے تالاب کا پشتہ ٹوٹ گیا
اب وہ گاؤں نہ گاؤں کے گھر کی دیواریں
اب لفظوں سے معنی بھی آزاد ہوئے
دور کھڑی ہیں زیر و زبر کی دیواریں
یہ دیمک تو سارا شہر ہی چاٹ گئی
کیسی فصیلیں اور کدھر کی دیواریں
جہل کے ہاتھوں میں دے دیجے ایک کدال
ڈھانے دیجے علم و ہنر کی دیواریں
تنہائی میں کھل کر باتیں کرتی ہیں
زنداں کی ہوں یا ہوں گھر کی دیواریں
میرا رستہ روک رہی ہیں مدت سے
تیری باتیں ، شہد و شکر کی دیواریں
جو کہنا ہے صاف دلی سے کہہ دے یار
پھاند "اگر" کی اور "مگر" کی دیواریں
اس کو حسن میں کیسے جی بھر دیکھ سکوں
حائل ہیں خود اپنی نظر کی دیواریں

○●○

حنیف کیفی

□

حاکم کو حکم نہ کہہ سکا میں
گستاخ تھا دار پر چڑھا میں

آیا تھا کہ زندگی سنواروں
طاقوں میں سجادیا گیا میں

کس زور پر آندھیوں سے لڑتا
کم زور و نحیف اک دیا میں

ہر سانس نے میخ کا کیا کام
ہر لمحہ صلیب پر چڑھا میں

انجام ہنسی کا سامنے تھا
آئی جو ہنسی تو رو پڑا میں

حاصل یہ تری تلاش کا ہے
پایا تجھے تو کھو گیا میں

اک عمر گزار کر بھی کیفی
اس شہر میں اجنبی رہا میں

○●○

کاوش عباسی

□

اداسی کی اک لہر چلتی رہی
تڑپ تیری پہلو بدلتی رہی
رہا گرم دن کام کے شور میں
محبت کی جھنکار جلتی رہی
میں مصروفیت میں بھی بکھرا رہا
تصور میں تصویر چلتی رہی
لگن شہر کی ، تیرے جانے کے بعد
میری اجنبیت میں ڈھلتی رہی
مجھے دیکھ تنہا ، مرے ساتھ ساتھ
عمارت میں غمگینی چلتی رہی
کسی بوڑھے بیمار سی میری رات
بگڑتی رہی ، خود سنبھلتی رہی
زمیں زاد تعمیر کرتا رہا
زمیں اپنا لاوا اگلتی رہی

○●○

□

کچھ نہ کچھ کہہ خفا تو کر ہی دیا
تم نے ہم کو جدا تو کر ہی دیا

کچھ دنوں کا جنوں سہی ہم نے
حقِ الفت ادا تو کر ہی دیا

نامِ الفت ہمارے جینے کو
آپ نے اک سزا تو کر ہی دیا

شوق نے تیرے میرے جیون کے
راستے کو ہرا تو کر ہی دیا

ہر سو بکھری میری شکستوں نے
دل کو بے حوصلہ تو کر ہی دیا

○●○

کاوش عباسی

□

جس ہوا میں ہوئے تھے وہ تعمیر
اس ہوا میں بکھر گئے وہ پل

یونہی محسوس سے ہوئے تھے مجھے
یونہی چھو کر گزر گئے وہ پل

بند حرفوں کو کھولتے ہی نہ تھے
اپنے جادو میں مر گئے وہ پل

سب نشاں کھوئے اس کے چہرے پر
ڈھونڈتا ہوں کدھر گئے وہ پل

تم نے چھوڑا کہ خود گئے کاوشؔ
تم کو تنہا تو کر گئے وہ پل

○●○

مریم غزالہ

□

نیند گہری ہے سحر ڈھونڈ کے لایا نہ کرو
خواب ہی میں مجھے رہنے دو جگایا نہ کرو
میری آنکھیں نہیں شیشہ ہے کوئی کالاسا
میری تصویر بھی اب مجھ کو دکھایا نہ کرو
میں بہا آئی ہوں گنگا میں کئی صدیوں کو
تم مرے کھوکھلے لمحوں کو جلایا نہ کرو
ریت ہی ریت اگر ہوں تو بہل جائے گا دل
ایسے صحرا میں سرابوں کو دکھایا نہ کرو
ان خلاؤں میں ستارے بھی ہیں جگنو کی طرح
دیپ اب تم مری راہوں میں جلایا نہ کرو
راستہ پوچھتا کون اب آئے گا یہاں
شمعِ امید سرِ شام جلایا نہ کرو
عمر جب دے گی اجازت تو چلے آئیں گے
ہمیں اس پار سمندر سے بلایا نہ کرو
ورنہ چھن جائے گا کردار غزالہؔ خود کا
دل نہ ملتا ہو تو پھر ہاتھ ملایا نہ کرو

○●○

انیس پروین

□

نقش سارے مٹا دیے ہم نے
سب صحیفے جلا دیے ہم نے

جب کسی پر ، یقین ہی نہ رہا
سچ پہ پردے گرا دیے ہم نے

آتشِ دل ، کسی طرح نہ بجھی
کتنے دریا ، بہا دیے ہم نے

وہ کہیں بے وفا نہ کہلائے
خود ہی وعدے بھلا دیے ہم نے

وہ جہاں چھوڑ کر گیا تھا ہمیں
وہیں خیمے لگا دیے ہم نے

اس کی رسوائیاں تھی پیشِ نظر
راز کتنے چھپا دیے ہم نے

زندگی ہے تو غم بھی ہیں پروین
غم سے رشتے نبھا دیے ہم نے

○●○

□

رفاقتوں کے تھے لمحے ، ترا جمال بھی تھا
ملن کے ساتھ ، جدا ہونے کا ملال بھی تھا

امیرِ شہر بہت خوش ہے قتل کر کے اسے
جو امن کا تھا پیمبر ، جو بے مثال بھی تھا

تمھاری یاد کی بانہوں سے ہم نکل آئے
سفر طویل تھا ، رکنا ہمیں محال بھی تھا

شبِ فراق ہی گل ہوگئیں ، سبھی شمعیں
خود اپنی آگ میں جلنے کا احتمال بھی تھا

ہے ساتھ ساتھ ہمیشہ سے تیرگی اپنے
اکیلے پن کا مرے ، کچھ اسے خیال بھی تھا

ہمیں بھلا کہ بہت خوش ہے آج وہ پروین
ہمارے بن کبھی جینا ، اسے محال بھی تھا

○●○

اقبال متین

ایک غزل ـــ رضی الدین علی اکبر مرحوم کی نذر

[رضی الدین علی اکبر مرحوم میری بیوی منیرہ مرحومہ کے چچازاد بھائی تھے۔ اس رشتے سے میرے برادر نسبتی یعنی سالے تھے۔ میری سب سے چھوٹی بہن ناہید کے شوہر ہونے کے ناتے میرے بہنوئی تھے۔ میرے بیٹے نوید اقبال کے خسر اور میری بہو اسما کے والد ہونے کے سبب میرے سمدھی بھی تھے۔ ان سارے رشتوں ناتوں سے قطع نظر میرے یار جانی تھے اس پر مستزاد بے حد شریف اور حقیقی انسان تھے۔ کبھی مذاق میں بھی دل شکنی کردی اور میں موقع محل دیکھ کر نرمی سے سہی شکوہ سنج ہوا تو کچھ دیر گم صم ہوجاتے۔ پھر کہتے ایسا کہا میں نے۔ اللہ یاد آگیا۔ آب دیدہ ہوکر پیر چھولیتے۔ کہتے مجھے معاف کر دیجیے بڑے صاب۔

میں کہتا تم بات کرنے سے پہلے سوچتے نہیں ہو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ جواب میں اس طرح بولتے گویا بھیگی ہوئی آنکھوں سے بول رہے ہوں۔ تو پھر مجھے سوچنا سکھاتے کیوں نہیں آپ ... میں ہنس دیتا۔

بہت اچھے اسپورٹس مین "Sports man" بھی تھے۔ ٹینس، کرکٹ اور پنگ پانگ کا ایسا Stylish کھلاڑی میں نے نہیں دیکھا۔ ٹی۔ وی پر بہت بڑے کھلاڑی بہت دیکھے ہیں۔ لیکن وہ کچھ اس ڈھب سے کھیلتے تھے کہ کھیلتے ہوئے آنکھوں کو بھلے لگتے تھے۔

سنگارینی کالریز کے دوران ملازمت میں تہذیبی سرگرمیوں کی روح رواں تھے۔ صدر جمہوریہ راجندر پرشاد جب حیدرآباد آئے تھے تو ان کی پذیرائی کے لیے نمائش کلب میں ایک ڈرامہ "جنگ کے بعد" میں رضی الدین نے ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ راجندر پرشاد (حضرت مآب) ان کی اداکاری سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ ایوارڈ کا اعلان کیا تھا۔ مشہور ادیبہ زینت ساجدہ اور ناہید رضی نے فضل الرحمن صاحب کے ڈراموں میں ان کے ساتھ کام کیا ہے۔

سر، سرود، راگ راگنی کی جان کاری کے ساتھ آواز بھی ایسی سریلی پائی تھی

کہ ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے تو سماں باندھ دیتے۔

پنڈت جَس راج جب بھی حیدرآباد آتے اپنے آبائی تعلقات کی بنیاد پر رضی الدین سے ضرور ملتے۔ اپنی گائیکی کے پروگرام میں رضی الدین کو بڑے بھائی کے مانند مدعو کرتے۔ وہ شرکت کریں تو پہلی صف میں ان کو لے جاکر بٹھاتے اور پروگرام کے آغاز سے قبل ہاتھ جوڑ کر ان سے اجازت لیے بغیر پنڈت جی سازندوں کو اشارہ نہ کرتے۔ یہ پنڈت جی کی وضع داری اور بڑائی تھی۔ جب رضی الدین کا مرض الموت ان کی جان کے درپے تھا تو پنڈت جَس راج عیادت کی غرض سے دو تین بار کیر "Care" ہاسپٹل آئے تھے۔

رضی الدین فطری طور پر بہت تساہل پسند اور آرام کے دل دادہ شخص تھے۔ اتنی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود وہ کسی ہنر میں یکتا نہ ہوسکے اس لیے کہ کبھی ریاضت کش ہونے کا خیال ہی ان کے دل میں نہ آسکا۔ ساری زندگی اپنی بے مثال خدمت گزار بیوی کے رہینِ منت رہے۔ ہل کر پانی نہ پیا۔ امریکہ میں بائی پاس سرجری کے بعد تو انھیں اپنی آرام طلبی کا ان کی بیوی نے جیسے پروانہ دے رکھا تھا۔ یوں زندگی کی جیسے دوسروں پر رحم کررہے ہوں۔ اپنی طویل بیماری میں بہت جسمانی اذیت اٹھائی۔ ذہنی سکون آخری وقت تک ان کی ہمت بنا رہا۔ امریکہ میں مقیم چھوٹے داماد اور بیٹی نے ان کی بیماری میں بے دریغ پیسہ لٹایا تو یہاں دو بیٹیوں اور بیٹوں نے اپنی راتوں کی نیند حرام کرلی اور اپنی اپنی صحت انھیں تج کر بھی نہ بچاسکیں۔ رہے نام اللہ کا۔

آخر شمس اکبر جنگ، اکبرالملک سابق کوتوال یعنی وہ شحنہ، ریاست جس کے اشارے و اجازت کے بغیر حضور آصف سادس میر محبوب علی خاں پلیٹ میں دھری نعمتوں کے باوجود ایک نوالہ نہیں اٹھاسکتے تھے۔ کبھی شاہ کے لیے وہ سازشی دور بھی تھا اور اکبرالملک نے جاں سپاری کی انتہا کردی تھی۔ انھیں اکبرالملک کا پوترا، ملک یار جنگ اول تعلق دار وقت کا سب سے چھوٹا اور سب سے چہیتا بیٹا، ناز و نعم میں پلا ہوا، اچھی غذاؤں کا والہ و شیدا، نہایت جامہ زیب شخص کہ دور سے اپنی پوشاک اور چال ڈھال کے بانکپن سے پہچانا جائے آخرش ۱۷ مارچ ۱۹۹۹ کو چھ ماہ کی صبر آزما بیماری کے بعد اسی نارائن گوڑہ سے جہاں سے کبھی اکبرالملک کا جسدِ خاکی سرکاری اعزاز و کروفر کے ساتھ اکبر باغ کے قبرستان لے جایا گیا تھا، رضی الدین کا جنازہ بھی اپنے چاہنے والوں کو بادیدہ نم ساتھ لیے روانہ ہوا جس میں افرادِ خاندان بھی تھے، محلے اور مسجد کے ساتھی بھی۔

میں یہ غزل ان کی تاکید پر ان کی نذر کرتا ہوں۔]

□

اور بھی ہوں گے زمانے میں ہمارے کوئی
ہائے ننگے سے ، بڑے صاب ، پکارے کوئی،
اس کی ہر سانس میں موہوم سی جینے کی لگن
اب تو لے آئے اندھیروں میں ستارے کوئی
دل کی تکلیف کو اوسان کا جزیہ سمجھے
ان شب و روز کو مر مر کے گزارے کوئی
نظریں اٹھیں تو کسی سے بھی نہ پوچھا یہ تک
ہم سمندر میں ہیں دکھلائے کنارے کوئی
اب نہ کرکٹ ہے ، نہ ٹینس ہے ، نہ سرگم نہ الاپ
اب تو پتھر ہی اسے کھینچ کے مارے کوئی
مجھ سے کہتا تھا " بڑے صاب " ہماری وحشت
تیری تحریر کا فانوس نکھارے کوئی
دیدنی تھی صفِ مژگاں پہ کراہوں کی تھکن
ہائے اس درد سے اللہ کو ہارے کوئی
ڈوبتی ناؤ میں پتوار بھی رکھ دی اس نے
ڈوبتی ناؤ کو اب پار اتارے کوئی
موت کا مژدہ اسے بھا گیا اتنا کہ متین
اس نے دیکھے ہی نہیں اور نظارے کوئی

○●○

اقبال متین

غزل

[۱۱ ستمبر ۱۹۹۹ء کی صبح سے ۱۲ ستمبر ۱۹۹۹ء کی شب تک میں نے کسی سے کچھ کہے بغیر
اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ خاندان بھر میں چٹس اٹھ گئی تھی۔ یادوں کے نام]

ہم کو اپنے غم ہی بہت تھے ، لوگ برا بھی مان گئے
ہم بھی اپنی غم آنکھوں سے اک اک کو پہچان گئے
آٹو ، موٹرسیکل ، کاریں ، بھیڑ بہت تھی بیگھے من
بیچ سڑک پر آکر اپنے جو بھی تھے ، اوسان گئے
ہم نے گھر کے دیے جلاکر سب کونوں میں رکھ چھوڑ دیے
گھر جگ مگ جب ہوا تو ہم ہی خود کو اندھیرا جان گئے
جینے کی اب کون ڈگر ہے ، دھیان نہیں ، اوسان نہیں
ارمانوں کی بستی لےکر سارے ہی ارمان گئے
نشو[1] ، یاد بہت آتا ہے ، اور پپن[2] بھی چھوٹا تھا
نیرو[3] جانی تم کو کھوکر جنجھی[4] کے بھی دھیان گئے
بھائی بہنوں نے یہ سمجھا ، ہم جب بیٹوں سے روٹھے
گیارہ سپٹمبر کی صبح کو ان کے بھائی جان گئے
اپنے قدموں کے نیچے تو دھرتی تھی اقبال متین
دھرتی جب آکاش بنی تو ہم بھی لمبی تان گئے

○●○

۱۔ نشو : نشید اقبال مرحوم ۱۰ سال
۲۔ پپن : معید اقبال مرحوم ۱۰ سال
۳۔ نیرو : فرید اقبال مرحوم ۱۳ سال (گھر کا پہلا چراغ، بڑا بیٹا)
۴۔ جنجھی : نوید اقبال، اللہ سوا سو برس سلامت رکھے۔ آمین۔

○●○

قیوم راہی

کھلونا

اچانک بس میں ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ گھسٹتی چلی گئی۔

شہناز فوراً ہی نبیل سے چمٹ گئی تھی۔ نبیل بھی دہل کر رہ گیا اور بچوں کی چیخ و پکار نے تو گویا سب ہی کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

دوسرے ہی لمحے مخالف سمت سے آنے والی برق رفتار بس فراٹے بھرتی ہوئی انتہائی قریب سے گزر گئی اور یوں ایک دل خراش بلکہ المناک حادثہ رونما ہوتے ہوتے رہ گیا۔

بس کے ڈرائیور نے فاتحانہ انداز میں گردن کو پیچھے کی طرف گھمایا۔ جب دیکھا کہ سب خیریت ہے تو اطمینان کی سانس لے کر بس اسٹارٹ کر دی۔

بس نہ رکتی تو واقعی قیامت برپا ہو جاتی اور لائل پور جانے والے کتنے ہی مسافر اگلے جہان کو سدھار جاتے۔ شہناز ابھی تک سہمی سہمی سی بیٹھی تھی۔

لیکن اس وقت تک اس کے شوہر نبیل کے چہرے پر پھیلی ہوئی خوف اور گھبراہٹ کی دھند بالکل معدوم ہو چکی تھی اور وہ سوچ کی پرواز پر کہیں اور پہنچ گیا تھا۔

ایک اور بس مال روڈ پر جی۔ پی۔ او کے سامنے موڑ مڑتے ہوئے بے قابو ہو گئی۔ ایک جھٹکا لگا اور بس میں کھلبلی مچ گئی اور اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی سنبل اس سے لپٹ گئی۔ بائیں جانب سے آنے والا اسکوٹر معجزانہ طور پر تیز ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گیا۔۔ ۔۔۔ اور یہ نازک ترین لمحہ خیریت سے گزر گیا۔

سنبل۔۔۔!

مدت ہوئی دونوں کی راہیں جدا ہو گئی تھیں اور وہ سفینہ۔ رنگ و نور نگاہوں سے اوجھل ہو کر اس کی دست رس سے باہر ہو گیا تھا۔ پھر شہناز سے شادی کے بعد تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ کسی مرحلے پر سنبل کی یاد اس کے درِ دل پر دستک دے گی۔ وہ جو دل کو لبھانے والی ایک تصویر اس کے تصور کے کینوس پر نقش ہو گئی تھی کبھی کی مٹ چکی تھی۔ وہ شہناز کے ساتھ بڑی خوش حال اور پُر لطف و پُر سکون زندگی گزار رہا تھا۔

کھڑکی کے باہر اس کی نگاہوں کے سامنے سرسبز و شاداب کھیت، ہرے بھرے درخت اور کچے پکے مکان پیچھے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ایسے قدرتی مناظر میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہوتی ہے اور دل فریبی۔ وہ بھی ان میں ڈوب سا جاتا تھا۔

پچھلی سیٹ پر ایک نوجوان اپنے ساتھی کو لاہور کی سیر کا حال بتا رہا تھا۔ جب باغِ جناح کا ذکر ہوا تو اسے ایک جھل مل کرتی ہوئی سہ پہر آواز دینے لگی۔ اس دن اس نے سنبل کے ساتھ باغِ جناح کی بڑی طویل چہل قدمی کی تھی اور جب دونوں تھکن سے چور ہو گئے تھے تو ایک کیفے میں چلے گئے تھے جہاں آنکھوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ ڈالا تھا۔ وہ سب کچھ جو وہ زبان سے نہ کہہ پائے تھے۔

بائیں طرف ایک شیر خوار بچہ اچانک رونے لگا۔ اس نے پل بھر کے لیے اس طرف دیکھا اور پھر اپنی دنیا میں لوٹ آیا۔

نوجوان اب اپنے ساتھی کو شالیمار باغ کی تفریح کا حال بتا رہا تھا۔

شالیمار!

موسم بہار کی وہ دوپہر کتنی اجلی اور مہکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر سنبل کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو تازہ کیا کہ وہ زندگی کا باقی سفر سنبل کا ہاتھ تھام کر اس کے دوش بہ دوش طے کرے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو زندگی اندھیر ہو جائے گی اور اسے ساری عمر اندھیروں میں ہی بھٹکنا پڑے گا اکیلا۔۔۔ بے بس۔

سنبل نے بھی ایسی ہی خواہش اور عزم کا پُرجوش اظہار کیا تھا۔

دونوں کا ایک ہی فیصلہ تھا کہ اب انھیں وادیٔ نشاط انگیز میں جلد قدم رکھ دینا چاہیے۔ کیوں کہ ایک دوسرے کے بغیر جینا دوبھر ہوتا جارہا تھا۔

بچہ ابھی تک رورہا تھا اور مچل رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا تکلیف تھی اس بے چارے کو۔

وہ بھی تو بلک بلک ہی رویا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ بچہ چیخ رہا تھا اور اس کے لب جیسے سلے ہوئے تھے۔ سنبل کے والد نے اسے رشتہ دینے سے انکار کردیا تھا۔ سنبل کی شادی وہ خاندان سے باہر نہیں کرنا چاہتے تھے اور تب وہ کچھ اس طرح بے حال اور اداس ہوا جیسے دل کے شجر پر بسیرا لیے ہوئے خواہشوں کے سارے پرندے اڑ گئے ہوں۔ چھوڑ کر چلے گئے ہوں اسے۔

یکایک بچہ روتے روتے خاموش ہوگیا تھا۔ اس کی ماں نے اس کے ہاتھ میں گڑیا تھما دی تھی۔ وہ اسے ہلا ہلا کر خوش ہورہا تھا۔ جوش جب بڑھتا تو اس کی ٹانگیں بھی خاص انداز میں ہلنے لگتیں۔

باپ کے عہدے میں ترقی کے باعث جلد ہی سنبل کے خاندان نے اس شہر کو خیرباد کہہ دیا۔

"آپ نے باجی شائستہ کو خط تو لکھ دیا تھا نا؟" شہناز نے ٹھوکا دیا۔

"ہاں۔۔۔ لکھ دیا تھا۔" اس نے سر کو جنبش دے کر جواب دیا۔

"پھر تو وہ ضرور لاری اڈے پر ہمیں لینے آئیں گی۔"

بس کی رفتار کچھ تیز ہو گئی تھی۔

شہناز نے دائیں جانب سیٹ پر رکھے ہوئے اٹیچی کیس کو پیچھے سرکا دیا جو اپنی جگہ سے تھوڑا سا کھسک گیا تھا۔

بس میں چند لوگ اخبار پڑھ رہے تھے۔ کچھ چپ چاپ باہر کے مناظر میں کھوئے ہوئے تھے۔ کچھ چہرے اداس تھے، کچھ سپاٹ اور کچھ شاداب و مسرور۔

پتہ نہیں سنبل کس حال میں ہوگی بے چاری۔ اس پر کیا بیتی ہوگی۔ بڑی جذباتی لڑکی تھی نا۔ اس کے تصور میں بار بار سنبل کا سوگوار چہرہ ابھر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے اخبار کھول لیا اور سرسری طور پر سارا اخبار دیکھ ڈالا۔ پھر اس نے اخبار تہہ کرکے شہناز کو دے دیا۔ اور بس کے اندر ایک سرے سے دوسرے تک دیکھا۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ نہ کوئی مسافر اترا تھا نہ کوئی نیا مسافر سوار ہوا تھا۔ سامنے چند سیٹوں کے فاصلے پر ایک خوب صورت معصوم بچی سیٹ کی پشت کا سہارا لیے کھڑی تھی، اسے ہمک ہمک کر دیکھے

جارہی تھی ۔ داہنی طرف اس کی ماں بیٹھی تھی ۔ سیاہ برقع پہنے ہوئے ۔ اور بائیں جانب اس کا باپ ۔ ۔ ۔ ایک خوش شکیل اور خوش پوش نوجوان ۔ بچی کی نگاہیں بار بار اس کی سفید براق اونی ٹوپی پر ٹھہر جاتی تھیں ۔ کئی بار بچی نے اس کی طرف اپنا ننھا منا ہاتھ بھی بڑھایا تھا ۔ اس نے بھی مسکرا کر دیکھا تھا ۔ بچی کا باپ بھی اشتیاق کے ساتھ اس منظر کو دیکھ رہا تھا ۔

اس نے شہناز کی توجہ بچی کی طرف مبذول کرائی ۔

"اللہ ، کتنی پیاری بچی ہے ۔" شہناز نے دھیمی آواز میں کہا ۔ اور وہ فوراً ہی کھڑا ہو گیا ۔ تھوڑا سا آگے چلا اور بچی کی طرف دونوں بازو پھیلا کر اپنے پاس بلانے کا اشارہ کرنے لگا ۔ نوجوان نے بچی کے ردِ عمل کا جائزہ لیا ۔ وہ کودنے لگی تو نوجوان نے بچی کو اسے دے دیا ۔

بچی کچھ دیر آرام سے اس کی گود میں بیٹھی رہی ۔ شہناز پیار سے اس کے گلابی گلابی رخساروں کو ہاتھوں سے تھپتھپاتی رہی ۔ پھر بے بی کھڑی ہو گئی اور اس کی نرم نرم سفید ٹوپی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے ٹوپی اتار لی اور اس کی گود میں بیٹھ گئی اور ٹوپی کو الٹ پلٹ کرنے لگی جیسے کوئی انوکھا کھلونا ہو ۔

شہناز نے بچی کو گود میں لینا چاہا لیکن وہ مچل گئی ۔

"ذرا اٹیچی تو کھولنا" اس نے شہناز کو اپنی طرف متوجہ کیا ۔

"کیوں ؟"

"کھولو تو ۔"

اور شہناز نے اٹیچی اپنی گود میں رکھ کر کھول دی اور اس نے نائلن کی ایک خوب صورت گڑیا نکال کر شہناز کے ہاتھ میں تھما دی "لو اب تم بے بی کو اپنے ہاتھ سے دے دو یہ گڑیا ۔" پھر بچی سے بولا "لے لو بے بی آنٹی سے اپنا کھلونا ۔"

شہناز نے ہاتھ ذرا ہی آگے کیا تو بچی ٹوپی چھوڑ کر گڑیا پر جھپٹ پڑی ۔ بہت خوش ہوئی تھی وہ گڑیا چھین کر ۔ ٹوپی کی طرف اب اس کا دھیان ہی نہ رہا تھا ۔

اس نے ٹوپی پہن لی اور ٹافیوں کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکال کر اٹیچی بند کر دی ۔ وہ ٹافیوں کی تھیلی بے بی کے منہ کے پاس لے جا کر ہلانے لگا ۔ لیکن بے بی شاید ٹافیوں کی خاطر گڑیا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی ۔

اس نے بچی کو اپنی کلائی پر بٹھا لیا ۔ اٹھا اور سنبھل کر اس کے باپ کی طرف چلا ۔ بے بی چپ چاپ باپ کی گود میں چلی گئی تو اس نے ٹافیوں کی تھیلی بھی آگے بڑھا دی ۔ بچی کا باپ کہتا ہی رہا "نہیں بے بی ، بری بات" لیکن بے بی نے کوئی پروا نہ کی اور گڑیا نیچے رکھ کر ٹافیوں کی تھیلی لے لی اور وہ مسرور اپنی سیٹ پر آن بیٹھا ۔

منزل نزدیک آچکی تھی ۔ بس میں بیٹھے ہوئے افراد اپنی اپنی اشیا کا جائزہ لے کر خود کو بس سے اترنے کے لیے تیار کر رہے تھے ۔ بس لاری اڈے پر رک گئی تب بھی وہ اطمینان سے بیٹھا رہا ۔ بھیڑ کم ہونے کے بعد اس نے اٹیچی اٹھائی اور نیچے اتر گیا ۔ شہناز اس کے ساتھ کھڑی بے چینی سے ادھر ادھر دیکھے جارہی تھی ۔ لیکن شائستہ باجی کا کہیں نام و نشان نہ تھا ۔ سامنے بے بی اور اس کے ماں باپ تانگے میں بیٹھ چکے تھے ۔ بے بی کے ہاتھ میں ابھی تک اس کی دی ہوئی گڑیا موجود تھی اور وہ اپنی ماں کی گود میں بیٹھی کھیل رہی تھی ۔ جب اس کا دھیان بے بی کی ماں کی طرف گیا تو وہ دیکھتا ہی رہ گیا ۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ۔ ۔ ۔ برقعے کی نقاب اٹھی ہوئی تھی اور

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

مظہر الزماں خان

کہانی جو کبھی ہماری تھی

وہ بڑی دیر سے سارے گھر میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر مسلسل گھوم رہا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی اس کے پیروں کو قرار نہ تھا۔ بس مسلسل گھوم رہا تھا بلکہ وہی نہیں اس مکان کے سارے مکین ادھر سے ادھر ہو رہے تھے جیسے انھیں کسی چیز کی تلاش ہو۔

"کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟ ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے متلاشی نوجوان سے پوچھا۔ وہ بولا: محسن کو تلاش رہا ہوں کہ وہ مجھے اس پورے گھر میں کہیں نظر نہیں آتا۔ پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے یا کہاں چھپ کر بیٹھ گیا ہے کہ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ کیا آپ نے اسے کہیں دیکھا ہے کہ اب دیکھنے والی آنکھ میرے اندر سو گئی ہے۔" نہیں! ادھیڑ عمر کے شخص نے آہستہ سے کہا: میں خود بھی مسیح کو ڈھونڈ رہا ہوں کہ مجھے اب مسیح کی بڑی ضرورت ہے۔ لیکن وہ مجھے اس پورے اداس گھر میں کہیں نظر ہی نہیں آیا۔ حالاں کہ چھت پر جاکر بھی میں اسے دیکھ چکا ہوں۔ جہاں وہ اکثر بیٹھ کر ڈوبتے اور نکلتے ہوئے سورج کو دیکھا کرتا تھا یا فضا میں آزادی سے اڑتے ہوئے پرندوں سے لطف اٹھایا کرتا تھا۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہے۔ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے" شاید محسن کی طرح وہ بھی کہیں کھو گیا ہے۔ متلاشی نوجوان نے کہا کہ اب ایک ایک کر کے محلے، گلیاں، شہر سب غائب ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر ملتی ہی نہیں ہے۔ چلیے اس عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ عورت سے پوچھتے ہیں جو ہماری ہی طرف آ رہی ہے لیکن اس کی آنکھوں میں بھی حیرانی سی حیرانی ہے۔

"تم جاؤ! ادھیڑ عمر کے شخص نے کہا کہ مجھے دیر سے مسیح کی تلاش ہے کہ وہ روشنی کو پی چکا ہے۔

"ٹھیک ہے! متلاشی نوجوان نے کہا اور پھر اس عورت کے قریب جا کر کہا جس کی آنکھیں تھرتھرا رہی تھیں۔

"کیا آپ نے محسن کو کہیں آتے یا جاتے ہوئے دیکھا ہے؟ میں ایک عرصے سے اسے تلاش رہا ہوں۔ لیکن وہ مجھے اس پورے آسیب زدہ گھر میں کہیں بھی نہیں ملا اور میں ایک تقسیم شدہ آدمی اس پورے گھر میں اسے کھوج رہا ہوں۔

"نہیں! ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔ مجھے کوئی بھی محسن کہیں دکھائی نہیں دیا۔ کیوں کہ میں خود اپنی مریم کی تلاش میں ہوں۔ لیکن مریم کا کہیں پتہ ہی نہیں چلتا حالاں کہ وہ میرے منع کرنے کے باوجود اس دریچے کے پاس کھڑی ذبح کیے ہوئے بھیڑوں کے گوشت کی تقسیم کا تماشا ہر روز دیکھا کرتی تھی اور اس کا یہ عمل برسوں سے چل رہا تھا۔ مگر وہ اس دریچے کے پاس بھی موجود نہیں ہے بلکہ وہ دریچہ ہی وہاں باقی نہیں ہے۔ پتہ نہیں اس آخری صدی میں دریچے کیوں غائب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

"آپ دریچوں کی بات کر رہی ہیں جب کہ اس مکان کی ہر چیز اب غائب ہونے لگی ہے۔ سنا ہے کہ عورتوں کے پیٹ کے اندر کے بچے بھی غائب ہونے لگے ہیں۔ متلاشی نوجوان نے کہا۔ میں کب سے اپنی جانماز کو تلاش کر رہا ہوں کہ محسن کی طرح میری جانماز بھی مجھے مل نہیں رہی ہے۔ پتہ نہیں کون اٹھا کر لے گیا اور لے جا کر کہاں رکھ دیا کہ ان دونوں جانمازوں کو بھی ان کے مقام سے اٹھا

کر ادھر ادھر رکھا جارہا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا۔ ابھی کچھ دیر پہلے حوض پر گیا کہ وضو بنا لوں لیکن حوض میں پانی ہی موجود نہیں تھا کہ سارے حوض کا پانی غائب کر دیا گیا ہے اور میری ہی طرح ان گنت کاسنی رنگ کے کبوتر بھی حوض کے کناروں پر بیٹھے پانی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور آپ کی نظر کے سامنے وہ جو سرخ دیوار بنی ہوئی ہے۔ اس کی منڈیروں پر مختلف رنگوں کے کانچ کے لہولہان ٹکڑے اس لیے لگائے گئے ہیں کہ ادھر ادھر کا پرندہ آکر نہ بیٹھ جائے اور اسی دیوار پر ایک گم شدہ مصنف کی کہانی کچھ اس قدر مبہم لکھی ہوئی ہے کہ دونوں طرف کے مکیں پڑھ کر سمجھ ہی نہیں سکتے۔

"کہانی تقسیم ہو گئی ہے نا۔ ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔" اور اسی بے نام کہانی کا کچھ حصہ ادھر کی دیوار پر لکھا ہوا ہے اور کچھ ادھر کی دیوار پر لکھا ہوا ہے پھر بھلا کہانی کسی کی سمجھ میں کیسے آئے گی جب کہ کہانی کا آدھا جسم ادھر رہ گیا ہے اور آدھا جسم ادھر رہ گیا ہے۔

"سنیے! ایک سانولے لڑکے نے جس کی عمر چودہ (۱۴) پندرہ (۱۵) سال تھی درمیان میں آکر مداخلت کی۔ کیا تم نے سالار کو کہیں دیکھا ہے؟ میں بڑی دیر سے اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ معلوم نہیں وہ کہاں جا کر بیٹھ گیا ہے یا پھر بیٹھا بھی ہے کہ نہیں کیوں کہ مسلسل آواز دینے پر بھی کوئی جواب نہیں دیتا۔ لگتا ہے کہ میری آواز اس تک پہنچ نہیں رہی یا پہنچنے کے باوجود وہ جواب دینا نہیں چاہتا یا پھر میری آواز ہی سنسر ہو گئی ہے۔

"یہ بھی اپنے محسن کو تلاش رہے ہیں۔ ادھیڑ عمر کی عورت نے متلاشی نوجوان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا اور مجھے مریم کی تلاش ہے۔

"ہم لوگ کسی نہ کسی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن کوئی بھی کہیں نہیں مل رہا ہے کہ ہم سب کے سب تقسیم ہو کر رہ گئے ہیں یا پھر دیوار پر لکھی ہوئی ادھوری کہانی بن کر رہ گئے ہیں جس کا کوئی انجام ہی نہیں ہے کہ ایک کہانی کے دو ٹکڑے ہیں ہم۔

"کیا آپ نے دالان میں لگی صدی کی تصویر کو دیکھا ہے؟ سانولے رنگ کے لڑکے نے دیوار کی طرف شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے حیرت سے کہا، جسے ایک انگریز مصور نے پینٹ کیا ہے۔ بڑی عجیب و غریب تصویر ہے کہ لاکھ کوشش کے باوجود سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ اس کی کوئی بھی لکیر سیدھی نہیں ہے اور تمام رنگ مسخ ہو کر رہ گئے ہیں البتہ گہرے سرخ اور سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے چھینٹے جگہ جگہ ڈال دیے گئے ہیں اور ان گنت کیڑے مکوڑوں میں جنگ جاری ہے الغرض اس پینٹنگ کی کوئی شکل ہی نہیں ہے۔ ایسی مسخ شدہ پینٹنگ صدیوں سے آج تک کسی مصور نے بنائی نہیں ہوگی۔

"ہاں! ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔ میری عمر اتنی ہو چکی ہے۔ لیکن میں نے ایسی خراب تصویر آج تک نہیں دیکھی کہ اس تصویر کا کوئی رنگ صحیح نہیں ہے لیکن انگریز آرٹسٹ نے دالان کی دیوار پر لگا دی ہے۔"

"میں محسن کے متعلق سے پوچھ رہا تھا۔ متلاشی نوجوان نے ٹوکتے ہوئے کہا اور آپ لوگ اپنے اپنے مسائل چھوڑ کر تصویر میں الجھ گئے ہیں حالاں کہ یہ آخر صدی لاکھوں لہولہان مناظر اور تصویروں کا ایک بدشکل البم ہے۔ مجھے محسن کا پتہ چاہیے کہ وہ رنگوں کی منزل ہے۔ اور میں تو صرف سرخ کینوس پر خالی قوسین کی طرح ہوں۔

"اور مجھے مریم کی تلاش ہے کہ مریم تقدس کی علامت ہے اور وہ میری ہی عمر کا مرد جو اس وقت ہماری ہی طرف آرہا ہے، اسے مسیح کی تلاش ہے۔ غرض کہ ہم سب کسی نہ کسی کھوئے ہوئے کی تلاش میں ہیں اور اس مشترکہ مکان کی دیواریں مسلسل بلند ہوتی چلی

(باقی ....)

آر۔کے نارائن

ترجمہ: یوسف کمال

وہ دن نجومی کی زندگی کا!

روز، دوپہر وہ اپنی تھیلی کھولتا اور ساز و سامان نکال کر پھیلا دیتا جو درجن بھر کوڑیوں، ایک چوکور کپڑے، جس پر عجیب و غریب نقوش بنے تھے، ایک چھوٹی سی کتاب اور کھجور کے نوشتہ پتوں پر مشتمل تھا۔ اس کی پیشانی متبرک راکھ اور شنگرفی رنگ کے سفوف سے چمک رہی ہوتی اور اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی تیز چمک بھی ہوتی جو گاہکوں کو مستقل تلاشنے کا نتیجہ تھی اور جسے گاہک لوگ اس کی عارفانہ نظر سمجھتے۔ سفوف سے اٹی پیشانی اور سیاہ لہراتی مونچھوں کے درمیان اس کی چمکتی آنکھیں بہت پُراثر تھیں۔ چہرے کی اس کیفیت میں تو ایک احمق کی بھی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ اس کیفیت کو دوبالا کرنے کے لیے اس نے سر پر ایک زعفرانی رنگ کا شملہ بھی باندھ رکھا تھا۔ ظاہر ہے رنگوں کی یہ ترتیب کبھی ناکام نہیں ہو سکتی۔ چناں چہ لوگ کشاں کشاں اس کی طرف چلے آتے جیسے شہد کی مکھیاں چھتے پر جمع ہوجاتی ہیں۔

وہ اس راستے پر سایہ فگن ایک پھیلے ہوئے املی کے درخت کی شاخوں تلے بیٹھا رہتا، جو ٹاؤن ہال سے ہو کر گزرتا ہے۔ مختلف امور کے لحاظ سے یہ مقام بہ جائے خود بڑا عجب و غریب تھا۔ صبح سے شام تک اس تنگ سڑک پر آنے جانے والوں کا سیلاب سا اُمڈتا رہتا اور سڑک کے دونوں کناروں پر مختلف قسم کے پیشہ ور لوگ اور کاروبار کرنے والے مصروف رہتے۔ دوائیاں فروخت کرنے والے، مسروقہ مال اور پرانا سامان بیچنے والے، جادو ٹونے والے اور ان سب سے اہم سستے قسم کا ایک پارچہ نیلام کرنے والا، جو قصبے کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہاں دن بھر شور مچاتا رہتا۔ غل غپاڑہ کرنے والوں میں دوسرے نمبر پر بھنی ہوئی مونگ پھلی فروخت کرنے والا تھا۔ یہ ہر دن بھنی ہوئی مونگ پھلی کو ایک نیا پُرکشش نام دیتا۔ "بمبئی کی آئس کریم"، "دلی کا بادام"، "مہاراجاؤں کی پسند" اور نہ جانے کیا کیا۔ لوگ اس کے اطراف جمع ہوجاتے۔ ہجوم کا ایک قابلِ لحاظ حصہ نجومی کے اطراف بھی گھومتا رہتا۔ نجومی اپنا سارا کاروبار اسی روشنی میں انجام دیتا جو جلتے ہوئے مونگ پھلی کے ڈھیر سے نکلنے والے دھویں کے درمیان چنگاریوں کی صورت پھوٹتی رہتی۔ اس مقام کا آدھا مزہ تو اس بات میں ہی تھا کہ وہ میونسپلٹی کی روشنی کی سہولتوں سے یک سر محروم تھا۔ یہاں روشنی صرف دکانوں کی بہ دولت تھی۔ ایک یا دو دکانوں میں سیاتی گیس لائیٹ، کچھ میں کھمبوں پر منجمد تنگ دھڑنگ شعلے، کچھ دکانوں میں پرانی سیکلوں کی قندیلیں اور کچھ دکانوں میں یہ بھی نہیں۔ جیسا کہ خود نجومی تھا جو بغیر کسی چراغ کے کاروبار کر رہا تھا۔ دراصل یہ مقام آڑی ترچھی کرنوں اور متحرک سایوں کا ایک جال سا لگتا تھا۔ اور یہ جگہ نجومی کے لیے بہت مناسب بھی تھی کیوں کہ اس نے جب زندگی شروع کی تھی اسے یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ وہ ایک دن نجومی بنے گا۔ وہ دوسروں کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات سے اتنا ہی بے خبر تھا جتنا کہ خود اپنی زندگی کے واقعات سے۔ ستاروں کے علم سے وہ اتنا ہی ناواقف تھا جتنا کہ خود اس کے گاہک۔ اس کے باوجود ہر کوئی اس کی باتوں پر حیران بھی ہوتا اور خوش بھی جو غالباً مشاہدے، مشق اور شاطرانہ قسم کی اٹکل بازی کی دین تھیں۔ ویسے بھی یہ سب کچھ ایک

دیانت دار آدمی کی محنت کے برابر ہی تو تھا اور وہ اس اجرت کا بھی مستحق تھا جسے وہ دن ڈھلے سمیٹ کر اپنے گھر لے جاتا۔

نجومی بغیر کسی منصوبے کے اپنے گاؤں سے چل پڑا تھا۔ اگر وہ وہیں رہ جاتا تو پھر وہی کرتا جو اس کے آبا و اجداد کرتے آئے تھے۔ کھیتی باڑی کرتا، شادی رچاتا اور اپنے خاندانی گھر میں ہی بس رہتا۔ لیکن ایسا ہونا نہیں تھا۔۔۔ بغیر کسی کی علم و اطلاع کے، اسے یکایک گھر چھوڑنا پڑا تھا اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا جب تک کہ وہ کچھ سو میل کا سفر طے نہ کرلے۔ اور فی الواقعی ایک دیہاتی کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی جیسے وہ ایک سمندر پھلانگ گیا ہو۔

نجومی انسانوں کی عملی دشواریوں کا تجزیہ کرنے پر قادر تھا۔ شادی بیاہ، روپیہ پیسہ اور انسانی رشتوں کی کش مکش جیسے مسائل سے وہ خوب واقف تھا۔ طویل مدت کی مشق و مزاولت نے بھی اس کی فہم کو تیز کردیا تھا۔ بس پانچ ہی منٹ میں وہ بات کی تہہ تک پہنچ جاتا۔ فی سوال وہ تین پیسے وصول کرتا۔ وہ کبھی منہ نہ کھولتا تاآنکہ گاہک کم سے کم دس منٹ تک نہ بول جائے۔ اس طرح اسے کافی مواد مل جاتا۔ پھر وہ درجن بھر سوالوں کے جوابات دیتا اور مشورے بھی۔ سامنے بیٹھے ہوئے کسی شخص کی ہتھیلی گھور کر جب وہ یہ کہتا "تمہیں، تمہاری کوششوں کا فائدہ نہیں مل رہا ہے۔" تو بیش تر لوگ، اس سے اتفاق ہی کرتے۔ یا پھر یہ کہ "تمہارے کنبے میں کوئی عورت ہے دور کی رشتہ دار۔۔۔ جو تم سے صاف نہیں" یا جب وہ یہ کہتا "تمہاری مصیبتیں زیادہ تر تمہارے مزاج کی دین ہیں، ورنہ تم جہاں ہو وہاں ڈھل کیوں ہوتا؟۔۔۔ تم بہت تند خو اور سخت مزاج آدمی ہو"۔۔۔ ایسی تمام باتیں فوراً گاہکوں کے دلوں میں گھر کر جاتیں اور وہ سب اس کے قریب ہوجاتے۔ ویسے بھی ہم میں سے اکثر یہ ماننے کے لیے ہمیشہ ہی تیار رہتے ہیں کہ بہرحال ہم مزاجاً ترش رو اور قصور وار ہیں یا ایسے ہو بھی سکتے ہیں۔

شام ہوچکی تھی، کل پرزے بیچنے والا اٹھا، اس نے آگ بجھائی اور گھر جانے کے لیے نکل پڑا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ نجومی بھی اپنا کاروبار بند کردے گا کیوں کہ اب وہاں مکمل تاریکی چھا چکی تھی سوائے اس سبز روشنی کی ایک لکیر کے جو کہیں سے نکل کر زمین کو چھورہی تھی۔ نجومی نے بھی کوڑیاں چن لیں اور دوسرا سازوسامان اٹھاکر تھیلی میں واپس جا ہی رہا تھا کہ یکایک سبز روشنی کی لکیر غائب ہوگئی۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ ایک شخص اس کے سامنے کھڑا تھا، نجومی نے اندازہ لگایا کہ شاید کوئی گاہک ہو اور اس نے کہا "تم بہت فکر مند معلوم ہوتے ہو۔ یہ اچھا ہوگا کہ تم یہاں بیٹھ جاؤ اور کچھ دیر مجھ سے بات چیت کرلو۔" جب نجومی نے اصرار کیا تو اس شخص نے ایک جھٹکے سے اپنی ہتھیلی اس کی ناک کے قریب بڑھادی اور کہنے لگا "تم خود کو نجومی کہلاتے ہو؟"۔۔۔ نجومی کو معاً احساس ہوا کہ یہ شخص تو مجھے چیلنج کررہا ہے۔ اس شخص کے ہاتھ کو سبز روشنی کی طرف جھکاتے ہوئے نجومی نے کہا "تم مزاجاً۔۔۔" "اوہ۔۔۔! یہ سب بند کرو" اس شخص نے کہا "کوئی اور کام کی بات کرو۔"

نجومی برہم سا ہوا اور اس نے کہا "میں ہر سوال کے تین پیسے لیتا ہوں۔۔۔ اور جو بھی تم کو مجھ سے ملے گا وہ تمہاری فیس کے برابر ہی ہوگا، اس پر اس شخص نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا ایک آنہ نکالا اور اس کی طرف پھینک دیا "میں سوالات پوچھوں گا۔۔۔ اور اگر یہ ثابت ہوجائے کہ تم جھوٹ کہہ رہے تھے تو تم میرے پیسے سود کے ساتھ لوٹا دو۔"

"اگر میرے جوابات اطمینان بخش ہوں تو کیا تم مجھے پانچ روپے دو گے؟"

"نہیں۔"

"خیر۔۔۔ تو کیا تم مجھے آٹھ آنے ادا کرو گے۔"

"ہاں مجھے یہ منظور ہے مگر۔۔۔اس شرط پر کہ اگر تمہاری باتیں غلط نکلیں تو پھر تم مجھے دوگنی رقم ادا کروگے۔"

ذرا سی بحث و تمحیص کے بعد یہ شرط منظور کرلی گئی۔ نجومی نے کچھ دعائیں پڑھیں اس دوران اجنبی نے چرٹ جلائی۔ جیسے ہی اس نے چرٹ جلائی، دیا سلائی کے شعلے کی روشنی میں اس کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دی۔ کچھ لمحوں کے لیے دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ اس اثنا میں سڑک پر گاڑیوں کی آوازوں، جھٹکے والوں کی گھوڑوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور ہجوم کے شور شرابے سے چمن کی نیم تاریک فضا مشتعل ہوتی رہی۔۔۔ اور وہ شخص چرٹ منہ میں چباتے ہوئے بڑے غیر شائستہ انداز میں بیٹھا رہا۔ نجومی اب کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ "یہ رہا آپ کا ایک آنہ۔۔۔ میں اس قسم کے چیلنج کا عادی نہیں اور ویسے بھی مجھے بہت دیر ہوچکی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنا باقی سامان اٹھا کر تھیلی میں رکھنے لگا کہ وہاں سے روانہ ہوجائے کہ اچانک اجنبی اٹھا اور نجومی کی کلائی پکڑ کر کہنے لگا "تم اب واپس نہیں جاسکتے۔ تم نے خواہ مخواہ مجھے اپنی طرف گھسیٹا جب کہ میں سیدھا اپنے گھر جارہا تھا"۔۔۔ نجومی کی کلائی کانپ رہی تھی اور اس کی آواز بھی۔ اب وہ تقریباً نیم بے ہوش سا ہوگیا تھا۔ "اچھا، آج تو مجھے جانے دو، کل میں پھر تم سے بات کروں گا" مگر اجنبی نے بڑے زور سے اپنی ہتھیلی نجومی کے چہرے تک بڑھا دی اور کہنے لگا۔ "چیلنج" "چیلنج ہوتا ہے جناب! اب اس معاملے کو آگے بڑھائیے"۔۔۔ خشک حلق کے ساتھ نجومی کہنے لگا "ہاں تمہارے یہاں، ایک عورت کا بھی چکر۔۔۔"

"یہ سب بکواس بند کرو" اس شخص نے کہا "کیا میں اپنی موجودہ تلاش جاری رکھوں یا ترک کردوں؟ مجھے بس اسی ایک سوال کا جواب چاہیے۔ پھر تم جاسکتے ہو۔۔۔ ورنہ اپنی تھیلی کے سارے سکے یہاں میرے آگے انڈیل دو۔"

کچھ منترجپنے کے بعد نجومی نے کہا "ٹھیک ہے، میں ضرور تمہارے سوالوں کا جواب دوں گا۔ لیکن کیا میری ہر سچ بات پر تم مجھے ایک روپیہ دوگے؟" بحث و تکرار کے بعد وہ اس شرط پر راضی ہوگیا۔

"کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تمھیں کبھی مُردوں کی نذر کردیا گیا تھا؟"

"اوہ! کچھ اور بھی بتلاؤ"

"تمہارے جسم میں کبھی ایک چاقو اتر گیا تھا؟"

"یار، بڑے زور دار آدمی ہو" یہ کہتے ہوئے وہ اپنا گریباں اٹھا کر سینے کے زخم دکھانے لگا "اور کچھ کہو؟"

"تمھیں ایک کھیت کے کنویں میں پھینک دیا گیا تھا، مرحوموں کی قربانی کے طور پر؟"

"ہاں بالکل صحیح۔۔۔ میں مرگیا ہوتا اگر راہ گیر کنویں میں جھانک کر نہ دیکھتے۔" جذبات سے مغلوب ہوکر اجنبی نے حیرانی میں کہا۔

"اچھا یہ بتلاؤ، میں کب اس شخص سے بدلہ لے سکوں گا؟" اپنی مٹھیوں کو بھینچتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "بس اب دوسری دنیا میں ہی" نجومی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "دراصل ایک دور افتادہ گاؤں میں وہ کبھی کا مرچکا ہے۔ اسے مرے ہوئے چار ماہ ہوچکے ہیں، اب تم اس سے کبھی نہیں مل سکتے۔"

اجنبی اب کراہنے لگا تھا۔۔۔ نجومی نے سلسلہ، کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "گرونائک"

"اچھا! تو تم میرا نام بھی جانتے ہو" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ گرونائک اب تم پوری توجہ سے میری باتیں سنو۔۔۔ تمہارا گاؤں شمال میں یہاں سے دو دن کے سفر پر واقع ہے۔۔۔ میری بات مانو تم یہاں سے ریل پکڑو اور اپنے گھر چلے جاؤ۔۔۔ اگر تم گھر سے دور رہے تو تمہاری

زندگی کو پھر ایک اور خطرہ ہے "

نجومی نے چٹکی بھر مقدس راکھ اس کی طرف بڑھا دی "اسے اپنے ماتھے پر لگاؤ اور سیدھے گھر کی طرف چل پڑو۔۔۔ اور ہاں، پھر کبھی بھول کر بھی جنوب کا رخ نہ کرنا۔۔۔ مجھے یقین ہے تم سو (۱۰۰) برس کی عمر پاؤ گے۔۔۔"

"میں اب گھر سے کیوں نکلوں گا؟" اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا "میں تو نکلا تھا کہ اس کی تلاش کروں اور اگر وہ مل جائے تو پھر اسے مزہ چکھاؤں" تاسف کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا "خیر! اب تو وہ مجھ سے بچ نکلا، لیکن میں سمجھتا ہوں اسے ویسی ہی موت ملی ہوگی جس کا کہ وہ مستحق تھا۔"

"ہاں" نجومی نے کہا "وہ ایک لاری کی نیچے کچلا گیا۔"

اجنبی نے تشکر بھر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔

اب وہ جگہ سنسان ہوچکی تھی۔ نجومی نے اپنا ساز و سامان تھیلی میں بھر لیا۔ وہ سبز روشنی بھی غائب ہوچکی تھی اور سارا ماحول خاموش اور تاریک ہوچکا تھا۔ اجنبی بھی رات کی تاریکی میں غائب ہوچکا تھا اور جاتے جاتے اس نے مٹھی بھر سکے نجومی کے ہاتھ میں تھما دیے۔

نجومی جب اپنے گھر لوٹا، آدھی رات ہوچکی تھی۔ اس کی بیوی دروازے پر ہی اس کی راہ تک رہی تھی۔ اتنی رات دیر گئے لوٹنے پر وہ سوالات کرنے لگی۔ اس نے سکے بیوی کی طرف بکھیرتے ہوئے کہا "انھیں گن لو، ایک شخص مجھے یہ سب دے گیا۔"

"جملہ ساڑھے بارہ آنے" اس نے کہا "میں کل ہی گڑ اور ناریل خریدوں گی۔ بیٹی بہت دن سے مٹھائی کے لیے ضد کر رہی تھی" اس نے بڑی خوشی سے کہا۔

"اس کم بخت نے مجھے دھوکا دیا" نجومی جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

بیوی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہو۔ آخر کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں"

کھانے کے بعد، پلنگ پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا "تم جانتی ہو؟ آج میرے سینے سے ایک بوجھ اتر گیا۔ برسوں میں یہی سمجھتا رہا کہ میرے ہاتھ کسی کے خون سے رنگے ہوئے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ میں گھر سے فرار ہوکر یہاں آبسا اور تم سے شادی رچالی مگر۔۔۔ وہ زندہ نکلا۔"

"کیا تم نے واقعی کسی کا خون کیا تھا" بیوی نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں برسوں پہلے جب کہ میں جوان تھا۔۔۔ گاؤں میں دارو پی کر جوا کھیلتے ہوئے میں نے ایک شخص سے خوب جھگڑا کیا تھا۔۔۔ مگر اب کیوں ان باتوں کو یاد کروں، یہ تو سونے کا وقت ہے" یہ کہتے ہوئے نجومی نے جماہی لی اور بستر پر لیٹ گیا۔

○●○

سب رس کتاب گھر کی کتابیں

ایوانِ اردو · پنجہ گٹہ · حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
	شاعری	
[illegible] میرا دل	مغنی تبسم	50=00
[illegible]سم کا انتظار	اسلم عمادی	16 00
[illegible]کر	اسلم عمادی	[illegible]
[illegible]	صدیقہ شبنم	55=00
انا	راشد آزر	10=00
[illegible]دیدہ	راشد آزر	15=00
[illegible]وق	راشد آزر	25=00
[illegible]فریحِ وفا	راشد آزر	16=00
[illegible]	راشد آزر	150=00
[illegible]ں فروش	سعید شہیدی	50=00
[illegible]	بشارت علی بشارت	80=00
[illegible]تِ زہرہ	صبیحہ نسرین	70=00
[illegible] دھواں چراغِ جاں	علی الدین نوید	60=00
تنہائی	علی اصغر	50=00
[illegible] صحرا	مصحف اقبال توصیفی	80=00
[illegible]طے سویرا	مصطفیٰ شباب	65=00
[illegible]نائیں	حمید رونق	60=00
[illegible]نے کا چراغ	مزید تمنائی	50=00
[illegible]بنا	برق موسوی	100=00
آنگن . دکھ کے پیڑ	سلیمان اطہر جاوید	50=00
[illegible]س حیات	ریاست علی تاج	80=00
[illegible] مسعود	مسعود صدیقی	25=00
شیرازہ، افکار	حکیم طوری	75=00
رنگ و آہنگ	سعید بن محمد نقش	15=00
موجوں کا مکاں	وقار لطیف	30=00
شہ زور کشمیری	فرید پربتی	125=00
آبگینہ، شعر	بشیر النساء بشیر	60=00
نا تمام	حسن داد خان	60=00
کمالِ سخن	الحاج کمال حیدرآبادی	20=00
ذکر و فکر	ساجدہ خاتون	200=00
اظہار آرزو	عبدالرحیم آرزو	20=00
بادہ، گل	شیخ حسین سالک	40=00
متاعِ حیات	-	20=00
غزال	خورشید حسین معطر	60=00
دکنی کی تین مثنویاں	ڈاکٹر محمد علی اثر	15=00
	افسانے	
تیسرا مجسمہ	عوض سعید	15=00
بے نام موسموں کا نوحہ	عوض سعید	30=00
میں کتھا سناتا ہوں	عاتق شاہ	35=00
سونے چاندی کے بت	خواجہ احمد عباس	35=00
ادھورا سفر	قدیر زماں	60=00
آٹھواں سفر	غلام جیلانی	50=00
حنظل	بیگ احساس	60=00
جینے والے	عابد سہیل	80=00
حیات کا رقص	وسیم عباس	70=00

ooo

ناول

بڑا آدمی	محسن علی	200=00
کسی دن	اقبال مجید	80=00
نمک	اقبال مجید	100=00
حیات کا رقص	وسیم عباس	70=00

ڈرامے

ماورا	قدیر زماں	100=00

خاکے

سوگند مٹی کے بت	اقبال متین	97=00
رہ و رسم آشنائی	عبدالقادر حبیب حیدرآبادی	30=00

تحقیق و تنقید

لفظوں سے آگے	پروفیسر مغنی تبسم	60=00
تحقیقی نقوش	ڈاکٹر محمد علی اثر	75=00
پسِ پردہ	آغا حیدر حسن دہلوی	25=00
تحقیق و تجزیہ	وہاب عندلیب	50=00
مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے	ڈاکٹر شاذ تمکنت	50=00
مبادیاتِ تحقیق	ڈاکٹر جاوید حیات	60=00
نوادراتِ تحقیق	ڈاکٹر محمد علی اثر	100=00
صاحب زادہ میکش	سید جلیل الدین	40=00
وصیت النور	صبیحہ نسرین	40=00
حیدرآباد کے علمی اور ادبی رسالے	ڈاکٹر محمد انوار الدین	250=00
شیخ چاند حیات اور ادبی خدمات	ڈاکٹر سحر سعیدی	200=00
جدید اردو افسانے میں عصری حسیت	یاسمین فاطمہ	25=00
فنِ تاریخ گوئی	ڈاکٹر مسعود سراج	30=00
دبستانِ گولکنڈہ	ڈاکٹر عبدالستار ساحر	120=00

تراجم

مخدوم محی الدین	اسامہ فاروقی	100=00
پیامِ مشرق	سید احمد ایثار	220=00

تاریخ

تاریخ یورپ عہدِ جدید	سید علی محسن	150=00

سیاسیات

برطانیہ کی سیاسی جماعتیں اور پارلیمنٹ	حبیب حیدرآبادی	75=00

تذکرہ اور آپ بیتی

یادوں کی : نذر	کے۔ ایس۔ شفیق	125=00
فضائلِ سید المرسلین	سید علی حسینی	25=00
ولا اکیڈمی	ادارہ اوپا	10=00
بہار میں اردو ظرافت	سلطان آزاد	50=00
حیدرآباد کے بنسی راجہ	بھاسکر راج سکسینہ	100=00

سائنس

سائنس کے نئے افق	وہاب قیصر	80=00

مجلہ

شعر و حکمت	پروفیسر مغنی تبسم	100=00

ooo

کتابیں ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲

ooo

دارہ ادبیاتِ اردو



ایوانِ اردو

پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲

فون: ۳۳۱۰۳۶۹

کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو

"ایوانِ اردو" پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲

آندھرا پردیش، انڈیا۔

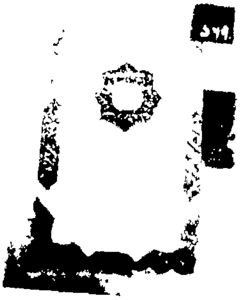
کتاب کی سرپرستی قبول کرنے کی اپیل



ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد کے کتب خانے کو ہمارے ملک بلکہ سارے برِ صغیر میں امتیازی حیثیت حاصل ہے، جہاں اردو، فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کی تقریباً پچاس ہزار مطبوعہ کتابیں اور چھ ہزار نادر و بیش قیمت مخطوطات ذخیرہ کیے گئے ہیں، جن کی نگہداشت کا معقول انتظام کیا گیا ہے۔ یہ مطبوعات و مخطوطات اسلامی علوم، قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، تاریخِ اسلام، مذاہبِ عالم، فلسفہ، جمالیات، ریاضی، سائنس، طب، سیاسیات، تاریخ، ادبیات، لسانیات اور دیگر کئی موضوعات

پر پھیلا ہیں اور ان سے سارے ملک اور ممالکِ غیر کے ریسرچ اسکالر خصوصاً دکنی زبان و ادب پر تحقیقی کام کرنے والے استفادہ کرتے ہیں۔

مرور زمانہ اور استعمال کی وجہ سے پرانی کتابوں اور حال کی چھپی ہوئی ان کتابوں کی حالت بھی ابتر ہوتی جارہی ہے جو غیر مجلد ہیں اور جن میں اچھی قسم کا کاغذ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔



ہم نے اپنے موجودہ وسائل سے مخطوطات کی حفاظت کا انتظام کیا ہے اور جلد بندی کے ذریعے اپنی بساط کے مطابق مطبوعہ کتابوں کی حفاظت کا بھی انتظام کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ادارے کے وسائل اس کام سے عہدہ برا ہونے کے لیے کافی نہیں ہیں اور موجودہ رفتار سے بقایا کام سے نبٹنے ہی میں سال ہا سال لگ جائیں گے

جب کہ ہر سال نئی کتابوں کے داخلے کا سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔

اس مسئلے کے حل کے لیے ہماری آپ سے پرجوش استدعا ہے کہ آپ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو کی کسی ایک کتاب متعدد کتابوں کو اپنالیں یا بہ الفاظ دیگر کسی ایک کتاب یا متعدد کتابوں کی خصوصی حفاظت کا انتظام فرما کر انہیں اپنی سرپرستی میں لے لیں۔

کتاب کو اپنانے کی اس استدعا کے جواب میں عطیہ دے کر آپ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو کی کسی ایک یا متعدد کتابوں کے سرپرست بن جائیں گے اور ہمارے قومی ورثے کے تحفظ میں ایک اہم کردار ادا کریں گے۔



اس استدعا کے جواب میں وصول ہونے والے تمام عطیات کا ہم خیرمقدم کرتے ہیں۔ انہیں انتہائی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں

Adopt a book appeal

Deed of Covenant

I (full name in capitals)______________________________

of (address)______________________________

____

________________ Postcode.____________ do execute this covenant with the Library of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu that for _______ years *(minimum period 4 years)*, from the present date or during my lifetime (whichever period shall be the shorter) I will pay the Library of Idara in every year such a sum as, amounts to Rs.______________ or $_________

(please insert the actual amount of your annual donation.)

Signed, sealed and delivered by me this ______ day of __________________ / 19____ / 20____

Signature ______________________________

In the presence of:

(Signature of Witness) ______________________________

Please complete the form below and send with the Deed of Covenant to: Idara-e-Adabiyat-e-Urdu, Panjagutta Road, Hyderabad – 500 082, Andhra Pradesh, India.

Standing Order

To ______________________ Bank ______________

Address ______________________________

____

Please pay the hereof, and thereafter annually until further notice *(minimum period 4 years)*, the sum of Rs.__________ to the credit of Saving Bank Account number 104030 State Bank of Hyderabad Panjagutta Branch, Hyderabad and charge the same to my account.

Signature Date ____________

Name of account holder ______________________________

Bank account number ______________________________

☆ سو روپے یا پانچ ڈالر کے عطیے سے
تاب کی دوبارہ جلد بندی کروائی جائے گی۔

☆ دو ہزار روپے یا سو ڈالر کے عطیے سے
کے تحفظ کی مکمل تدبیر روبہ عمل لائی جائے گی جس میں کاغذ
تحکام اور جلد کی مرمت کا کام بھی شامل رہے گا۔

سبھی سرپرستوں کی خدمت میں
ے عطیے کی وصول یابی اور اس کتاب کے
کی اطلاع ، جس کی انھوں نے سرپرستی
کی ہے ، ایک مطلاً مکتوب کے ذریعے
ل کی جائے گی۔ محفوظ شدہ کتاب کے اندر
رست کے نام کی ایک پرچی چسپاں کی جائے
یا اس پرچی پر آپ کا منتخب کیا ہوا کوئی
درج رہے گا۔

پیدائش کی سال گرہ، عید وغیرہ کے مبارک موقع
کے طور یا اپنے اعزہ کی یادگار کے طور پر بھی آپ ادارے کی
تاب کی سرپرستی قبول فرمائیں تو مناسب ہوگا۔

ہ مندرجہ ذیل پتے پر ارسال فرمائیں:

ادارہ ادبیاتِ اردو، ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ،
حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۸۲، آندھرا پردیش، انڈیا۔

ے۔ بینک ڈرافٹ:

ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد، آندھرا پردیش، انڈیا۔
ا پر جاری فرمائیں۔

○●○



THE LIBRARY
IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Adopt a book appeal

- I would like to adopt a book
- I would like the bookplate to be inscribed with my name or chosen inscription.
- I enclose my cheque made payable to the Idara-e-Adabiyat-e-Urdu, for Rs.__________ or $ __________

Block capitals please.

- Name :
- Signature :
- Date :
- Address :

  :
- Postcode :
- Telephone :

Please return this form to:

The Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Aiwan-e-Urdu,
Panjagutta Road,
Hyderabad – 500 082. (A.P.) INDIA.

Thank you

We will contact you about your wishes and preferences as soon as possible.

NOV, DEC, 1999 R.No. 10922 / 57.
Regd. H / HD. 134.

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA – E – ADABIYAT – E – URDU,
AIWAN-E-URDU, PANJAGUTTA ROAD, HYDERABAD – 500 082 (A.P.) INDIA.